



ایمداد الاحکام

ایمداد الفتاویٰ کا ششمہ جو ۱۳۴۰ھ کے بعد کے فتاویٰ پر مشتمل ہے

تالیف

حضرت مولانا فطرحمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ

زیر نگرانی

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ

مکتبہ تہذیبیہ دارالعلوم کراچی

فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ



إِمْدَادُ الْأَحْكَامِ

امداد الفتاویٰ کا تکملہ جو ۳۴۲ م کے بعد کے تقریباً سوا دو ہزار
فتاویٰ پر مشتمل ہے،

تالیف

حضرت مولانا ظفر احمد رضا عثمانیؒ ① حضرت مولانا مفتی عبدالکریم رضا گتھویؒ

زیر نگرانی و رہنمائی

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحبہا پوری قدس سرہ



ناشر

مکتبہ دار العلوم کراچی ۱۲

طبع جدید..... محرم الحرام ۱۴۳۰ھ
جنوری ۲۰۰۹ء

باہتمام..... محمد قاسم گلگتی

ملنے کے پتے



- ✱ - مکتبہ معارف القرآن، احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی
- ✱ - ادارۃ المعارف، احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی
- ✱ - دارالاشاعت، اردو بازار کراچی
- ✱ - ادارہ اسلامیات، اردو بازار کراچی
- ✱ - بیت القرآن، اردو بازار کراچی
- ✱ - بیت الکتب، بالمقابل اشرف المدارس گلشن اقبال کراچی
- ✱ - ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور

✱ - مکتبہ دارالعلوم کراچی
احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی
فون نمبر

021-5042280

021-5049455

ای میل

mdukhi@cyber.net.pk

فہرست مضامین امداد الاحکام جلد اول

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۳	ردائل	۲۳	دیباچہ طبع اول
۲۶	تصوف اور علم تصوف کی اصلاحی تعریف	۲۵	دیباچہ طبع دوم
۲۷	فقہ کی طرح علم تصوف کا بھی ایک حقہ فرض	۲۷	مقدمہ
۲۷	عین اور پورا علم حاصل کرنا فرض کفایہ ہے	۲۷	فقہ کے لغوی معنی
۲۸	صوفی و مرشد	۲۷	فقہ کے قدیم اصطلاحی معنی
۲۸	بیعت سنت ہے فرض و واجب نہیں	۲۸	دینی احکام کی قسمیں
۲۸	کشف و کرامات مقصود نہیں	۲۸	قرآن و سنت میں ان سب قسموں کا بیان
۲۹	مقصود صرف اتباع شریعت اور اللہ کی رضا ہے	۲۹	فقہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک
۵۲	آمدن برسر مطلب	۳۰	فقہ حضرت حسن بصریؒ کے نزدیک
۵۲	احکام شرعیہ کے دلائل	۳۰	مسائل کی کثرت اور مباحث کا پھیلاؤ
۵۲	پہلا ماخذ قرآن حکیم	۳۱	ترتیب و تدوین
۵۳	وحی کی دو قسمیں	۳۱	دینی احکام کی تقسیم تین الگ الگ فنون
۵۴	تواتر - دوسرا ماخذ سنت	۳۱	کی حیثیت
۵۵	سنت کو خود قرآن نے حجت قرار دیا ہے	۳۲	علم کلام، فقہ، تصوف
۵۶	آثار صحابہ کی فقہی حیثیت	۳۲	فقہ کی جدید اصطلاحی تعریف
۵۸	قرآن و سنت کے درمیان درجہ کا تفاوت	۳۳	تشریح : ظاہری اعمال
۵۸	ظن غالب کی حقیقت اور اس کا درجہ	۳۵	احکام شرعیہ کا علم تفصیلی دلائل
۵۹	دلیل قطعی اور دلیل ظنی کے فرق کا اثر احکام پر	۳۶	تعریف و تشریح کا حاصل
۶۰	فقہ کا تیسرا ماخذ اجماع	۳۶	فقہ کا موضوع
۶۰	اجماع کو خود قرآن و سنت نے حجت قرار دیا ہے	۳۷	قدیم اصطلاحی فقہ کا موضوع
۶۲	اس سلسلہ میں چند آیات قرآنیہ	۳۸	تفہیم فی الدین فرض کفایہ ہے
۶۲	چند احادیث	۳۸	تصوف کی حقیقت
۷۷	الجماعۃ اور سواد اعظم سے کیا مراد ہے	۴۱	فضائل

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۱۸	رسالۃ الازدراک فی اقسام الاشراک	۸۰	حجیت اجماع پر چند آثار صحابہ
۱۲۳	تمتہ الرسالۃ المساء بنہایۃ الازدراک فی اقسام الاشراک	۸۲	اجماع کا فائدہ اور سند اجماع
۱۳۲	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا جیسا بشر سمجھنے کا حکم،	۸۳	چند مثالیں
"	احکام شرعیہ سے استہزاء کفر ہے،	۸۵	اجماع کن لوگوں کا معتبر ہے
۱۳۳	تارک نماز کافر ہے یا نہیں؟	۸۷	جاہل، فاسق اور اہل بدعت کے اختلاف
"	حضرت عباسؓ کو وسیلہ بنانا تو تسل بالاموات کے لئے مانع نہیں ہے،	۹۱	سے اجماع باطل نہیں ہوتا
۱۳۴	توحید کے معنی اور موجد کی تعریف	۹۲	اجماع کی قسمیں
۱۳۵	حکم عادم اعتقاد خلود نار برائے کفار		اجماع کے مراتب
"	ثبوت شفاعت اولیاء اللہ		
۱۳۶	تحقیق عرض ... اعمال علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم	۱۱۲	کتاب الایمان
۱۳۷	کیا بخیل کی بخشش نہیں ہوگی؟		فصل فی المتفرقات
۱۳۸	روزِ محشر صاحب حق کے معاذ کرے سزا ہوگی یا نہیں؟	"	حضرت حلیمہ سعدیہ کب ایمان لائیں؟
"	کسی جگہ میں نخوت کا اعتقاد رکھنا جائز ہے یا نہیں؟	"	تارک صلوٰۃ کافر ہے یا نہیں؟
۱۳۹	اپنے والد کے لئے استغفار کرنے کا عقیدہ	۱۱۳	میت کو پکارنے کا حکم
"	شوہر کے جواب میں عورت کا نماز پڑھنے سے انکار کرنا	"	تائب سے قیامت میں حساب لوحِ نہ کا حکم
۱۴۰	عورت کا بطور عادت کے نماز کو روگ اور بھارڈ مار دیکھنے کا حکم،	"	سجدة تعظیم کی حرمت
۱۴۱	لا الہ پر بدون الا اللہ کہے دم نکل جائے تو کافر مرنے کا یا مسلم؟	۱۱۴	مسئلہ تقدیر پر ایک اشکال کا جواب
"	نماز سے تمسخر اور استخفاف کفر ہے،	"	جو شخص نشہ کی حالت میں مرجائے اس کے
۱۴۲	دنیوی معاملات میں عالم سے لڑائی اور اس کو سب و شتم کرنا،	۱۱۷	ایمان اور اس پر نماز جنازہ کا حکم
		"	جو مسلمان ڈاکہ زنی یا زنا کاری کی حالت میں
		"	مر جائے اس کے ایمان کا حکم
		"	کیا علماء کو گالیاں دینے والا کافر ہے؟
		۱۱۸	اس شخص کا حکم جو فال کے ذریعہ غیب کی
			باتیں بیان کرتا ہو،

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۸۰	تعزیه بنانے اور اس کو مسجد میں رکھنے کا حکم	۱۴۵	یہ الفاظ کہ ”اگر کوئی اس کی خدمت کرتا تو نہ مرنے نہ جانی“ موجب کفر و ارتداد نہیں،
۱۸۲	حیلہ اسقاط کا حکم اور اس کی دوسری صحیح صورت	۱۴۶	میں اپنا مذہب تبدیل کر لوں گی،
۱۸۴	غیر نبی پر درود کا حکم،	۱۴۷	اس شخص کا حکم جو یہ کہے کہ میں فتویٰ پر پیشاب کرتا ہوں،
۱۸۶	قبر اور جنازہ پر تخفیف عذاب کیلئے پھول ڈالنے کا حکم	۱۵۰	حکم بعض الفاظ کفریہ،
۱۸۷	تعزیه سازی اور اس پر نذر و منت ماننے کا حکم		فصل فی الفرق الباطلہ
۱۸۸	مجلس مولود مسجد میں منع کرنا،	۱۵۱	قادیانی کی توبہ اور اس کی وراثت کا حکم
۱۸۹	قبروں کے گرد چار دیواری بنانا کیسا ہے؟	۱۶۰	ازالہ الادہام عن ختم النبوة والرسالة ومعنی الوحی والالہام
۱۹۰	نماز عیدین کے بعد مصافحہ بدعت ہے،	۱۶۱	فرقہ قادیانیہ کے اقوال کی تردید
۱۹۱	آنحضرت کا نام بیکراٹگوٹھے چومنا،	۱۶۲	مرزا غلام احمد قادیانی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزہ احیاء موتی کا کیونکر منکر تھا؟
۱۹۲	میت کے گھر کا کھانا کتنے عرصہ تک نہیں کھانا چاہی؟		فصل فی الفرق الاسلامیۃ
۱۹۳	طعام میت کے متعلق ایک سوال کا جواب،	۱۶۸	جماعت اہل حدیث کا حکم
۱۹۴	فاتحہ خوانی کا مسنون طریقہ،	۱۶۹	اہل سنت والجماعت کی تعریف
۱۹۵	طرہ نوم کیلئے درود شریف پڑھنا پڑھوانا،	۱۷۰	غیر مقلدین کی مذمت کا حکم
۱۹۶	نماز جنازہ کے بعد دعا بدعت ہے،		کتاب التقلید والاجتہاد
۱۹۷	نماز کے بعد مصافحہ کی گراہیت کی دلیل،	۱۷۱	بغیر دروس امام کی تقلید جائز نہ رہے یا نہیں؟
۱۹۸	تہنیز و تکفین سے قبل گھٹیلوں پر کلمہ طیبہ پڑھوانا	۱۷۲	جو شخص مجبور تہنیز مجھے کی لیاقت نہ رکھتا ہو،
۱۹۹	موتے مبارک نبوی کی زیارت کا مشروع طریقہ،	۱۷۳	اس کیلئے کسی ایسے جزئیہ میں ایک قول پر از خود عمل کرنا
۲۰۰	مشکل پر بدعت و افعال شرکیہ ایک عمل،		کتاب السنۃ والبدعۃ
۲۰۱	قبروں پر چڑھنا اور چڑھانا اور اس کے لینے کا حکم	۱۷۴	سنن ابو زہرہ کے بعد امام اور مقتدیوں کا بالالزام دعا پڑھنا کرنا
۲۰۲	دو لہا کا نکاح کے بعد اور مولود خواں کا مناجات		
۲۰۳	کے بعد مجلس کو سلام کرنا بدعت ہے،		
۲۰۴	غلاف کعبہ اور پیرکار و مال قبر میں رکھنا،		
۲۰۵	حکم چہلم بطریق خاص،		
۲۰۶	ایضاً ایضاً ایضاً		
۲۰۷	طریقۃ ایصالِ ثواب،		
۲۰۸	گھر پر اور قبرستان میں جا کر قرآن مجید پڑھکر		
۲۰۹	ایصالِ ثواب میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟		
۲۱۰	دفن میت کے بعد قبرستان میں اقارب میت کو گونہ گونہ دینا		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۳۰	قرآن مجید کو لیٹ کر پڑھنا،	۲۰۷	تلقین میت کے لئے ایک سوال
۲۳۱	قرآن مجید غلط پڑھنے، اوقات نہ کرنے اور نماز	۲۱۲	مولود خوانی، ختم خوانی وغیرہ کو ذریعہ معاش بنانا
۲۳۲	اور خراج نماز قرأت شاذہ پڑھنے کا حکم،	۲۱۳	موتے مبارک کی زیارت کے واسطے زیارت گاہیں
۲۳۳	قرآن مجید کی کتابت میں خط عثمانی کا واجب	۲۱۴	بنانا اور اس کیلئے ایام مخصوص کرنا،
۲۳۴	ہونا اور ترجمہ قرآن کو علاحدہ چھاپنے کا حکم،	۲۱۵	بینجری سے محفل میلاد میں جانیکے بعد بلا شرکت
۲۳۵	خط ناگری میں نشر آن مجید لکھنے کا حکم،	۲۱۶	اٹھ جانے پر فساد کا خوف ہو تو کیا حکم ہے؟
۲۳۶	تاجر کتب کیلئے بلا و ضو قرآن مجید چھونا،	۲۱۷	
۲۳۷	ہیئت اجتماعی سے تلاوت قرآن کا حکم،	۲۱۸	
۲۳۸	غلط قرآن پڑھنے والے کیلئے تلاوت اولیٰ ہی یا ترک؟	۲۱۹	
۲۳۹	قرآن حدیث و اسم الہی دوسری زبانوں میں تحریر	۲۲۰	
۲۴۰	ہوں تو وہ بھی واجب لتعلیم ہیں؟	۲۲۱	
۲۴۱	تعلیم کی وقت معلوم کا ادنیٰ جگہ اور متعلین کا بھی جگہ بیٹھنا،	۲۲۲	
۲۴۲	ایصال ثواب کیلئے تلاوت قرآن پر اجرت لینا،	۲۲۳	
۲۴۳	قرآن مجید کے شفاعت جہانی ہونے پر شبہ ناجواب	۲۲۴	
۲۴۴	انیس اوعظین کی ایک روایت متعلق فضائل عن نبوت	۲۲۵	
۲۴۵	قرآن مجید اور رد و شریف ل میں پڑھنا بھی با ثواب ہے	۲۲۶	
۲۴۶	چار پائی کے نیچے بکس میں قرآن مجید بند ہو چار پائی	۲۲۷	
۲۴۷	پر لیٹنا جائز ہے یا نہیں؟	۲۲۸	
۲۴۸	حامل شریف جیب میں رکھ کر پیشاب وغیرہ کرنا،	۲۲۹	
۲۴۹	چند اموات کو ایصال ثواب میں شریک کرنے	۲۳۰	
۲۵۰	سے ثواب پورا ملے گا یا تقسیم ہو کر؟	۲۳۱	
۲۵۱	بوسید قرآن مجید کو دفن کرنا چاہیے جلانا صحیح نہیں	۲۳۲	
۲۵۲	گراموفون باجہ میں نشر آن مجید سننا،	۲۳۳	
۲۵۳	دستانے پہن کر بلا و ضو قرآن پاک چھونا،	۲۳۴	
۲۵۴	سورۃ برآۃ کے شروع میں بسم اللہ پڑھنے کا حکم	۲۳۵	
۲۵۵	ملا لاطاۃ کناہ کو ملا لاطاۃ کناہ پڑھنے کا حکم	۲۳۶	
۲۵۶	اجزاء قواعد ضرر و تخفیف اسقاط ہمزہ متحرکہ در قرآن	۲۳۷	
	خلات قرأت حفص درست یا نہ؟	۲۳۸	

کتاب العلم

فصل فی المتفرقات

اگر کلاس کے لڑکوں نے سبق یاد نہ کیا ہو تو کیا آگے پڑھا سکتا ہے؟
عموم بلوی کے معنی،
کشف الغطاء عن کتابۃ النساء
متعلق تعلیم کتابت نسوان
لڑکیوں کی تعلیم کے متعلق ایک فتویٰ،
جاہل کو وعظ کہنا جائز نہیں،
حدیث طلب العلم فریضۃ کے متعلق چند سوالات

فصل فی تعظیم العلماء و آداب التواضع

علوم دینیہ کی تعلیم و تحصیل کی ضرورت اور اس پر اہل دنیا کے اعتراضات کا جواب،
علماء کے اختلاف کی صورت میں عام کو کیا کرنا چاہیے؟
علم، پیر اور استاد کے ہاتھ پر چومنے کا حکم،

فصل فی تعلیم القرآن و تلاوتہ و متعلقاتہ

قرآن مجید کا منظوم ترجمہ کرنا کیسا ہے؟
بوسید قرآن مجید اور دینی کتب کو دفن کرنا چاہیے جلانا صحیح نہیں،

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۹۴	تحقیق حدیث کنت کثرًا مخفیًا،	۲۵۶	نقد بناء کم میں ادغام واجب یا نہیں؟
۲۹۵	حدیث النجوم علی من سمع الذی اراد الجمعہ	۲۵۷	مکرر سوال متعلق سوال مذکور
	علی من آواہ اللیل کی تحقیق،	۲۵۸	تشیف لسمع بمعنی الاحرف السبع و
۲۹۶	تحقیق معنی حدیث الاسلام یهدم ما کان قبلہ		تکمیل الوقوف فی تفصیل سبعہ حروف،
۲۹۷	حدیث من قسر القرآن برأیه کی تحقیق،	۲۶۲	ہر ہر آیت پر وقف کرنا،
۲۹۸	عوارف المغارف کی ایک حدیث کی متعلق استفاء		
	آیت فتلقى آدم من ربه کلمات کتاب علیہ	۲۶۳	کتاب التفسیر
	سے متعلق ایک روایت کی تحقیق،		تحقیق معنی آیت فابعدوا حکما من اہلہ و حکما
۲۹۹	کتاب التصوف		من اہلہا، الآیہ،
	الحب فی اللہ کی حقیقت اور اس کی علامت	۲۷۵	الجواب الملقب بیدایۃ الامم فی ولایۃ لحکم
۳۰۰	فاسق پر طریقت نہیں ہو سکتا،	۲۸۰	تحقیق معنی الی بمعنی مع فی آیۃ الوضوء،
۳۰۱	مسئلہ سلوک،	۲۸۱	آیت ولتکون آیۃ من خلفک کی تفسیر پر
	وہی ظائف زیادہ مفید ہیں مرشد متبع شریعت تعلیم کری		ایک مشبہ کا جواب،
۳۰۲	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی کو خرقہ دینا	۲۸۳	کتاب متعلق بالحديث و السنة
	ثابت ہے؟ نیز اصطلاح صوفیہ میں اس کی وجہ		سرخاب اور گائے کا گوشت کھانا حضور
	تسمیہ کیا ہے؟		صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے یا نہیں؟
۳۰۳	نسبت مصالحت کی حقیقت،		نقد ہدیہ لینے کا احادیث سے ثبوت،
	نسبت تلقین کی حقیقت،	۲۸۵	من تشبه بقوم فهو منهم کی تشریح،
۳۰۵	کتاب الذکر والدعاء والتعویذات	۲۸۷	حیوان کے اجزاء سبعہ کی حرمت کا حدیث سے ثبوت
	کھڑی ہو کر ذکر کرنا افضل ہے یا بیٹھ کر؟		میت کے سر ہانے قل ہو اللہ پر صکر ڈھیلے
	وتر کی نماز کے بعد سبحان الملیک لقدوس		رکھنے کے سلسلہ میں ایک حدیث کی تحقیق،
	کتنی مرتبہ کہنا چاہئے؟	۲۸۸	حدیث الزواق المنکب بالمنکب والذواق
۳۰۷	فرض نمازوں کے بعد باوازل بند تکبیر کہنے کا		الکعب بالکعب کے معنی کے تحقیق،
	حکم اور اس کی تحقیق،	۲۹۱	حدیث کان الیقینی صلی اللہ علیہ وسلم یزود
۳۱۵	فرض نمازوں کے بعد اللهم انت السلام الوہیٰ پڑھنا	۲۹۲	الشہداء باحد کل حول الخ کی تحقیق،
		۲۹۳	رفع یدین متعلق ابوداؤد کی ایک حدیث کی تحقیق
			توشیح ابوبکرہ شرح طحاوی،

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۳۲	بذریعہ عمل محبوب کو سرگرداں و مطیع بنانا،	۳۱۵	فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا
۳۳۳	فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا	۳۱۶	صلوۃ خمسہ بعد کر یا بچہ کا الزام درست یا نہیں؟
"	حکم بعض عملیات،	"	جس درود میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نذر
۳۳۵	ذکر اسم ذات میں اگر "اے" رہ جائے تو کوئی حرج ہے یا نہیں؟	۳۱۷	ذاتی کہا گیا ہو اس کا پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟
۳۳۶	نماز ظہر، مغرب اور عشاء کے فرض کے بعد کس قدر دعا مانگنی چاہیے؟	۳۱۸	بلا وضو فاتحہ خوانی اور قیروں پر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کا حکم،
"	میت اور عباد بدنبہ کا ثواب بخش سکتے ہیں؟	۳۱۹	بغرض ایقان نامیں باواز بلند درود پڑھوانے کا حکم،
"	تبلیغ اسلام کا کام انضالی اور ظاہری کا شغل کہنا	"	ملفوظ تعویذ کو پاخانہ وغیرہ میں ساتھ لجانا،
"	رقیہ بالقرآن اور اس پر اجرت لینے کا حکم،	۳۲۰	کافر کو تعویذ دینا کیسا ہے؟
۳۳۷	کتاب التبر والمناقب	۳۲۱	تحقیق ذکر یا بچہ
"	حضرت مولانا امجد علی شہید کا حال،	۳۲۲	الزما و اہم کیسا تھا نماز کے بعد کر جہر بدعت ہے
"	کیا واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ تھا؟	۳۲۳	جو شخص جماعت کے نماز پڑھ کر بلا دعا مانگے
۳۳۸	کھجور کے عوص حضرت علیؑ کا سقی مار کی اجرت کرنے کے قصہ کی تحقیق،	۳۲۴	چلا جائے تو کیا حکم ہے؟
۳۳۹	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ نہونکی تحقیق،	۳۲۵	اسم ذات کی قرأت کی تحقیق،
۳۴۰	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کا بعد وفات زندہ ہو کر مسلمان ہونے کی تحقیق،	۳۲۶	اذان خطبہ جمعہ کے بعد دعا مکر وہ ہے،
۳۴۱	ایض ایض ایض ایض	۳۲۷	دفع طاعون کیلئے "بی خمسہ" اُٹھنی بہا الخ
"	مسئلہ حیات انبیاء علیہم السلام	۳۲۸	پڑھنا یا بطور تعویذ لکھنا جائز ہے یا نہیں؟
۳۴۲	ایک صحابی کے ہر نبوت چھوٹنے کے واقعہ کی تحقیق	۳۲۹	قرآن مجید کے شفاء جسمانی ہو پر شبہ کا جواب،
۳۴۳	کتاب الطہارۃ	۳۳۰	حرمت حصار و وجہ بنگال برادر دفع و بار و غیرہ
"	فصل فی فرائض ووضو	"	کیا فرائض کے بعد استغفار ممنوع ہے؟
"	چہرے کی حد کہاں سے کہاں تک ہے؟	۳۳۱	رفع اشکال بر جواب مذکور
"	وضو میں چہرے کی حد کہاں سے کہاں تک ہے؟	۳۳۲	فرائض و عیدین کے بعد کس قدر طویل دعا مانگنی چاہیے؟
۳۴۴	گھنی ڈاڑھی دھونے کا حکم،	۳۳۳	فرض نمازوں کے بعد مقدم راس پر ہاتھ رکھ کر پڑھی جانے والی دعا کونسی ہے؟
		۳۳۴	آیات قرآنی اور ادعیہ ماثورہ سے تعویذ اور گنڈے کرنا،
		۳۳۵	رقیہ بالقرآن اور اس پر اجرت کا حکم،

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۵۹	عورت کچھ اندام ہنانی میں بے شہوت یا بغیر شہوت انگلی داخل کرنے کا حکم۔	۳۴۵	دوار اگر اس طرح چمٹ جائے کہ چھڑانا مشکل ہو تو عصو کس طرح دھویا جائے؟
"	غسل جمعہ کے بجائے معذور یا غیر معذور تیمم کر لے تو مؤذی بالسنۃ ہو گا یا نہیں؟	۳۴۶	ناپاک دوا زخم پر لگانے کے بعد اس پر مسح کا حکم،
۳۶۰	غسل کے لئے نیت شرط نہیں ہے۔	۳۴۶	فصل فی سنن الوضوء آدابہ مکروہاتہ
۳۶۲	فصل فی احسن التفاسیر الاستحسانۃ	"	وضو میں بات چیت کرنا، اور کسی شخص کی بات کا جواب دینا کیسا ہے؟
"	حالت حیض میں جماع کرنا حرام ہے،	۳۴۷	وضو میں ایک ہاتھ سے منہ دھونا اور مسح کرنا
۳۶۳	دم نفاس اگر چالیس روز سے بڑھ جائے؟	۳۴۸	فصل فی لزوم اقصاء الوضوء
"	عدم جواز مس بین السرة والركبة بدین حالت در حالت حیض،	"	بواسیر کے مسوں پر تیل لگاتے ہوئے ترانگلی اندر داخل کر لینا،
۳۶۴	ولادت سے قبل خروج ماہ کا حکم،	۳۴۹	استنجہ کے بعد قطرہ کا شبہ ہونا،
"	اکثر مدت نفاس گزرنے کے بعد فرج سے پانی نکلے تو یہ نفاس شمار ہو گا یا نہیں؟	۳۵۰	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل کی طہارت اور آپ کے حق میں انکے ناقض وضو ہونے کی تحقیق
"	مسئلہ نفاس	۳۵۱	شفاء الاسقام فی احکام الزکام،
۳۶۵	مسئلہ نفاس کی ایک صورت،	"	زکام میں رطوبات سائلہ کی طہارت اور ناقض الوضوء نہ ہونے کی تحقیق،
۳۶۸	جس عورت کو ایام حیض کے عدد اور تاریخ دونوں یا تاریخ یاد نہ ہو تو اس کا حکم،	۳۵۲	تتمۃ الکلام،
۳۷۱	جس عورت کے ایام حیض پانچ دن ہوں اگر اس کے بعد بھی خون آنے لگے تو یہ حیض ہی یا استحاضہ؟	۳۵۶	درمیان نماز قطرہ آجائے تو وضو ٹوٹ جائے گا،
۳۷۱	فصل فی احکام المعذور	"	گالی اور فحش گوئی سے وضو نہیں ٹوٹتا،
"	معذور کی ایک صورت کا حکم	۳۵۷	بچہ کو دودھ پلانے سے وضو نہیں ٹوٹتا،
۳۷۲	معذور کی نماز کا حکم، اور کپڑوں کے پاک کرنا کا طریقہ	"	عورت پر نظر پڑ جانے سے وضو نہیں ٹوٹتا،
"	معذور کے وضو کی ایک صورت کا حکم،	۳۵۸	فصل فی وجبات الغسل فی السنۃ و آدابہ
۳۷۴	حکم نماز برائے مریض کہ معذور یا از قہر یا سبب بدن	"	غسل کے وقت کھوکھلے دانت میں پانی پہنچانا
۳۷۵	حکم استنجاء وضو، مریض رعشہ، جو وضو اور استنجہ پر قادر نہ ہو،	۳۵۹	فرج ہے یا نہیں؟ عورت کا فرج میں دوا رکھنا موجب غسل ہی یا نہیں؟

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۸۸	فصل فی المسح علی الخفین	۳۷۶	فصل فی احکام المیاء
"	کرمج کے موزہ پر مسح درست ہے ؟	"	کنویں میں مینگنی گرجانے کا حکم
"	مسح علی الخفین،	"	ایک بڑے حوض سے چھوٹا حوض نکالا جاگا تو کیا چھوٹے حوض سے وضو کرنا جائز ہے ؟
۳۹۳	فصل فی النجاسة احکام التیمم	۳۷۸	گوبر لگا ہوا کپڑا اگر کنویں میں گرجاے تو کیا حکم ہے ؟
"	جس کپڑے کے ایک حصہ پر نجاست لگی ہو تو اس کا بقیہ حصہ پاک ہے،	"	کنویں کو پاک کرنیکی ایک صورت،
۳۹۴	بھنگل کے چھوٹے کا حکم،	۳۷۹	کنویں میں مرغی کا بچہ گر کر زندہ نکالا گیا تو تو کنواں پاک ہے یا ناپاک ؟
"	ناپاک تہبند باندھ کر غسل کرنا،	"	ہل یمار الوضوء حرمتہ فی الشرع ؟
"	نشاستہ گندم میں کتائمنہ ڈال دی تو اسکی طہارت کا طریقہ،	۳۸۰	حکم آب تالاب
۳۹۵	نجاست غیر مرئیہ دھونے کا طریقہ،	۳۸۱	کنویں میں جب تک ناپاکی کا گڑنا متیقن نہ ہو اسے پاک سمجھا جائے گا،
"	طہارت بدن میں انقطاع تقاطع شرط نہیں،	۳۸۲	ناپاک کنویں کا پانی جس برتن اور جگہ پر گرے اس کا پاک کرنا ضروری ہے،
۳۹۶	طریقہ طہارت کپڑا،	۳۸۳	کنویں میں چھوٹی یا بڑی چھپکلی گرنے کا حکم،
۳۹۷	پانی سے بھرا ہوا مٹی کا برتن ناپاک زمین پر رکھا رہے تو پانی اور برتن ناپاک ہونگے یا نہیں ؟	۳۸۵	ایسے کتے کورسی سے باندھ کر کنویں میں لٹکانا جس کے جسم پر نجاست نہ ہو،
۳۹۸	گھوڑے کا پسینہ پاک ہے،	"	کنویں میں پیشاب پاخانہ گرجانے کا حکم،
"	چمکا ڈر کی بیٹ پاک ہے یا نجس ؟	"	چھوٹے برتن میں پانی کے اندر ہاتھ یا انگلی ڈوب جا تو یہ پانی مستعمل کہلائے گا یا نہیں ؟
۳۹۹	ہندو کی بنائی ہوئی صفوں پر بغیر دھوئے نماز پڑھنا ؟	۳۸۶	فصل فی التیمم
"	بیل وغیرہ غلہ گاہنے میں پیشاب کرے تو اس کا کیا حکم ہے ؟	"	تیمم میں کم از کم کتنا بڑا ڈھیلا ہونا چاہیے ؟
۴۰۰	دودھ نکالنے وقت تین مینگنی کے برابر چوڑا بھینس کے بدن سے دودھ میں گرجاے تو کیا حکم ہے ؟	۳۸۷	اور کلورخ تیمم سے استنجا کا حکم،
"	صرف پانی سے استنجا کرنا،	۳۸۸	حکم تیمم برائے حافظ کلمہ دربیاباں،

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۱۷	اذان اور اقامت میں جزم اور ہر کلمہ پر وقف کا سنون ہونا،	۴۰۱	کتاب الصلوة فصل فی المواقیت
۴۱۸	مسجد کی چھت پر اذان کہنا سنت ہی یا واجب؟	۴۰۲	صبح صادق اور صبح کاذب کی علامت،
۴۱۹	جمعہ کے روز اذان ثانی کا جواب دینا جائز ہی یا نہیں؟	۴۰۳	عصر کے وقت کی ابتداء کی تحقیق،
۴۲۰	مرض طاعون میں اذان دینا مشروع ہی یا نہیں؟	۴۰۴	سایہ اصلی اور مثلین کا بیان
۴۲۱	مسجد میں تلاوت کرنے والے کے لئے اذان کا جواب دینا افضل ہی یا تلاوت؟	۴۰۵	سایہ اصلی کے متعلق فتویٰ کس پر ہی؟
۴۲۲	تحقیق وقت قیام امام و قوم،	۴۰۶	جہاں چھ ماہ کا دن اور چھ ماہ کی رات ہو وہاں نماز کس طرح ادا کی جائے؟
۴۲۳	تفصیل الجواب و تحقیق الصواب،	۴۰۷	لندن میں نماز عشاء اور نماز فجر کے متعلق ایک سوال،
۴۲۴	جمعہ کی اذان ثانی کا جواب دینا جائز ہے مگر دُعا کرنا جائز نہیں،	۴۰۸	نصف شب کے بعد عشاء کی نماز ادا کرنے کا حکم
۴۲۵	استفتاء متعلق ادائیگی کلمات اذان و اقامت	۴۰۹	غروب آفتاب سے ڈیڑھ گھنٹہ بعد عشاء پڑھنا
۴۲۶	رفع طاعون کے لئے اذانیں دینا مشروع ہے یا نہیں؟	۴۱۰	نماز عیدین کا مستحب وقت کونسا ہے؟
۴۲۷	اذان جمعہ کے لئے تقارہ بجانا،	۴۱۱	جمعہ کے دن ٹھیک دوپہر کو صلوٰۃ تسبیح پڑھنے کا حکم،
۴۲۸	اذان میں تثنیہ کی کیا صورت ہے؟	۴۱۲	آخر عصر میں اسی روز کی عصر ادا کرنا،
۴۲۹	جو شخص مسجد میں ہو اس کو اذان کا جواب دینا واجب ہی یا نہیں؟	۴۱۳	وقت عشاء و فجر کے بارے میں،
۴۳۰	ایک شخص کا دو مسجدوں میں اذان دینا،	۴۱۴	جمعہ کے دن زوال کے وقت نماز پڑھنے کا حکم
۴۳۱	اذان سے متعلق چند سوالوں پر مشتمل ایک استفتاء،	۴۱۵	صلوٰۃ خمسہ کے اوقاتِ مستحبہ،
۴۳۲	اذان کے بعد گھنٹہ بجا کر لوگوں کو نماز کیلئے بلانا	۴۱۶	غروب آفتاب اور غروب شفقِ ابیض میں تفاوت کی تحقیق،
۴۳۳	فصل فی احکام المسجد و آدابہ	۴۱۷	فصل فی الاذان و الاقامۃ
۴۳۴	مسجد میں سونے کا حکم،	۴۱۸	اذان کے جواب میں اللہ اکبر کی بجائے
۴۳۵	مسجد میں ورزش کرنے کا حکم،	۴۱۹	جل جلالہ کہنا،
۴۳۶	مسجد کی دوسری منزل میں نماز پڑھنا بلا کراہت صحیح ہے،	۴۲۰	بچہ کے کان میں سرّاً اذان دینی چاہئے یا جہراً؟
۴۳۷	مسجد کی دیوار پر تمیم کرنا مکروہ ہے،		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۵۹	مذہب حنفی میں نماز جنازہ مسجد میں مطلقاً مکروہ ہے؟	۲۴۰	طوائف کی بنائی ہوئی مسجد میں نماز کا حکم،
۲۶۱	بعد از مسجد میں لالٹین جلانا کیسا ہے؟	۲۴۱	مسجد میں دنیا کی باتیں کرنا مکروہ ہے،
"	مسجد صزار کی تعریف،	"	حکم تعلیم مدرسہ در مسجد
"	مسجد کا فرش اور منبر عید گاہ میں لے جانا،	۲۴۳	مسجد کے اندر اور مسجد کے صحن یا چھت پر نماز
۲۶۲	مسجد میں تمباکو کھانا اور نسوار لینا کیسا ہے؟	"	پڑھنا ثواب کے اعتبار سے برابر ہے؟
"	مسجد میں اخراج ریح کا حکم،	"	مسجد میں جوتے رکھنے اور اخبار پڑھنے کا حکم
۲۶۳	نمازی کے سامنے کئے فاسلے پر گزرنے کی درست ہے؟	۲۴۴	محکمہ کی مسجد میں پخوفہ نماز کی فضیلت
"	اس مسجد کا حکم جس کا رخ قبلہ سے ہیں درجہ	"	نماز کے سامنے گزرنے میں مسجد کبیرہ صغیرہ کی تحقیق
"	تک مخوف ہو؟	۲۴۶	مسجد کا چراغ حجرہ میں جلانا درست نہیں
۲۶۴	فصل فی شروط الصلوۃ اركانها واجباتها	۲۴۷	مسجد میں نماز کی فضیلت واردہ اس وقت ہے
"	دستبہا و آدابہا	۲۴۸	جبکہ مسجد وقت ہو،
"	رفع ستابہ کے وقت نگاہ کہاں ہونی چاہئے	"	مسجد میں اخراج ریح کرنے والے شخص کی
۲۶۵	التحیات سے قبل بسم اللہ پڑھنے کا حکم،	۲۴۹	اقتدار کا حکم،
"	تکبیر تحریمہ کہنے کے وقت قیام فرض ہے،	۲۵۰	مسجد بنانا فرض ہی یا واجب؟
"	وضو میں کوئی عضو خشک رہ گیا اور نماز	۲۵۱	ہندوؤں کو مسجد کیسا منے گانے بجانیے وکنا،
"	پڑھ لی تو کیا حکم ہے؟	۲۵۲	مسجد میں کھڑکیاں کھولنے کا حکم،
۲۶۶	عورت قیام کی وقت دونوں پاؤں میں کتنا فاصلہ رکھنی	"	مسجد میں نمازیوں کیلئے بانی کا گھڑا رکھنا،
"	تشہد میں رفع ستابہ کا اثبات،	۲۵۳	بضرورت مسجد میں دنیا کی باتیں کرنا مباح ہے،
۲۶۸	عورت سجدہ کے وقت پاؤں کیسے رکھے؟	۲۵۴	مسجد میں افطار کرنا جائز ہی یا نہیں؟
۲۶۹	اقامت کی وقت امام اور مقتدی کب کھڑا ہونا چاہئے؟	"	ایضاً ایضاً ایضاً
۲۷۰	حق علی الفلاح کہنے کے وقت امام کا کھڑا ہونا،	۲۵۵	قربانی میں مسجد کی چٹائی استعمال کرنا،
۲۷۱	اقامت کی وقت امام اور مقتدی کب کھڑے ہوں؟	۲۵۶	عید گاہ کو مستحق کرنا کیسا ہے؟
۲۷۳	ایضاً ایضاً ایضاً	"	مسجد میں کھانا کھانا اور کھانا مکروہ ہے،
"	ایضاً ایضاً ایضاً	"	جنازہ مسجد باہر ہوا امام اور مقتدی مسجد کے
۲۷۶	تکبیر تحریمہ اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ دھکا کر باندھ جائیے	۲۵۸	اندر ہوں تو نماز جنازہ کی یہ صورت مکروہ ہی یا نہیں؟
"	یا بغیر دھکے باندھے جائیں؟	"	قرب و جوار میں متعدد مسجد ہوں تو.....
۲۷۷	نماز میں تکبیرات کہنا واجب ہی یا سنت؟	"	مسجد محکمہ میں نماز افضل ہی یا سب کا
"		"	حکم برابر ہے؟

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۰۰	امام کا کتنا کھڑا ہونا مکروہ ہے؟	۴۷۷	نماز میں الصاقِ رجليں سنت ہو یا نہیں؟
۵۰۲	غیر مقلد کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم،	۴۷۸	مسئلہ رفع یدین،
"	امامت کی فضیلت کا حکم	۴۷۹	رفع یدین در قنوت وتر،
۵۰۳	اگر نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہو تو محذور کا	۴۸۱	جماعت میں اگر مقتدی سے کوئی فرض یا
"	گھر میں نماز پڑھنا بہتر ہے،	"	واجب فوت ہو جا تو کیا کرنا چاہئے؟
۵۰۴	بیٹھ کر نماز پڑھنے والے امام کی اقتدار کا حکم،	"	نماز میں نیت کرتے وقت نیچا عصر کے مغرب
۵۰۵	احق بالامامت کو مقدم کرنا سنت ہو یا مستحب؟	"	کی نیت کر لی تو نماز ہو جائیگی یا نہیں؟
۵۰۸	امامت کے لئے عمامہ باندھنا،	"	کوئلہ کی کان میں نماز پڑھنا،
۵۰۹	امام عظم کو برا بھلا کہنے والے کے پیچھے نماز کا حکم،	۴۸۳	مقتدی اگر قعدۂ اخیرہ میں اتھکات، درود
۵۱۰	امام کا سجدہ کر کے بیٹھ جانا،	"	اور رد عا ترک کر دے تو نماز واجب الاعداد
"	صفوں کا قبلہ کی جانب سے ٹیڑھا بچھانا،	"	ہوگی یا نہیں؟
"	اعرج کے لئے صف اول میں بیٹھا نماز	"	نا پاک دُعا در پیش لگی ہوئی میز پر نماز پڑھنا،
"	پڑھنا جائز ہے،	۴۸۴	نماز کی حالت میں بارش ہونے لگے تو کیا کرنا چاہئے؟
"	دو منزلہ مسجد میں اوپر نیچے جماعت کرنے کا حکم،	"	جسکو ترجمہ قرآن پاک آتا ہو کیا اسکی نماز نہیں ہوتی؟
۵۱۱	طاق اور محراب میں امام کا کھڑا ہونا،	"	سجدہ میں جا ہو کر پہلے سر ٹیکے یا ناک؟
"	اعرج کے پیچھے نماز کا حکم،	۴۸۵	بدون عذر فرض وتر اور فجر کی سنت بیٹھ کر پڑھنا
۵۱۲	بدعتی امام ہونے کی وجہ سے جماعت ترک کرنا،	"	مسئلہ سمت قبلہ،
۵۱۴	تجوید سے قرآن پڑھنے والے کا غیر مجزوء کے	۴۸۶	فرض نماز، جنازہ وضو سے پڑھنا،
"	پیچھے نماز پڑھنا،	"	چوتھی رکعت کو تیسری خیال کر کے کھڑے
"	صحیح خوان کی غلط خوان امام کے پیچھے نماز کا حکم	"	ہونے کے بعد کیا کرنا چاہئے؟
"	اعرج کی امامت کا حکم،	۴۸۷	عورت سجدہ میں پاؤں کس طرح رکھے؟
۵۱۶	اس شخص کی امامت کا حکم جسکی بیوی بے پردہ نکلتی ہو،	۴۹۰	فصل فی الامامة والجماعة
"	عورتوں کی تنہا جماعت کا حکم،	"	جماعت ثانیہ کا حکم،
۵۱۸	تجسیر تحریمیہ کہہ کر مقتدی کا رکوع میں شریک ہونا	"	جسکی بیوی بدکار اور فاسق ہو اسکی امامت کا حکم
"	جماعت ثانیہ،	۴۹۱	بد چلن عورت کے شوہر کے پیچھے نماز کا حکم،
۵۲۲	حکم نماز امام بلا عمامہ،	۴۹۹	غلط قرآن پڑھنے والے کے پیچھے نماز کا حکم
"	ولد الزنا کی امامت مکروہ ہے،	"	محله کی مسجد میں جماعت فوت ہو جا تو کیا کری؟
۵۲۳	ستونوں کے درمیان صفیں بنانا مکروہ ہے،	۵۰۰	

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۲۱	مواضع وقت کے علاوہ وقت کرنے والے کی نماز کا حکم،	۵۲۳	مقتدی نابالغ ہوں تو جماعت ہو سکتی ہو یا نہیں؟
۵۲۳	مسجد کی چھت پر بلا ضرورت جماعت کرنا مکروہ ہے	"	بلا عذر جماعت چھوڑنا،
"	عذر کی وجہ سے توڑک اور اعتماد کرنیوالے امام کا حکم،	۵۲۵	محراب اور در میں امام کا کھڑا ہونا،
۵۲۴	فصل فی المسبوق واللاحق	"	امام نے سہواً بغیر وضو نماز پڑھ ساری؟
"	مسبوق کی نماز کا حکم جبکہ وہ سجدہ سہویں شریک ہو،	"	امرو کی امامت مکروہ ہے،
۵۲۵	مسبوق کا غلطی سے سلام پھیر دینا،	"	ایضاً ایضاً ایضاً
۵۲۶	مسبوق اگر امام کے ساتھ سلام پھیر دے تو کیا حکم ہے؟	۵۲۶	داڑھی کے سفیر یا لاکھڑولنے والے کی اقتدار
"	امام کے ساتھ ایک رکعت پانے والے مسبق پر دوسری رکعت میں قعدہ لازم ہے یا نہیں؟	"	تراویح میں ختم قرآن پر اجرت لینا،
۵۲۸	امام اگر چار رکعت کے بعد سہواً کھڑا ہو جائے تو کیا مسبق اس کی اقتدار کرے؟	۵۲۷	صحبت اقتدار کے لئے علم باتقالات امام شرط ہے، رویت نہیں،
"	مسبق کا امام کے ساتھ سجدہ سہو کرنا جبکہ امام پر سجدہ واجب نہ تھا،	۵۳۱	جو شخص قطعہ آنے کا مرید ہو اس کی اقتدار جائز ہے یا نہیں؟
"	مغرب کی نماز میں امام نے سہواً جو تھی رکعت ملا کر سلام پھیر دیا اور نماز دوبارہ پڑھائی تو دوسری اور بعد کی رکعتوں میں شریک ہونے والوں کا حکم،	"	لواطت سے تائب کی اقتدار کا حکم،
۵۲۹	حکم اقتدار مسبق بوقت سلام امام،	۵۳۲	جس لڑکے کی عمر پندرہ سال ہو اس کی اقتدار میں تراویح بلا کراہت جائز ہے،
۵۵۰	مسبق امام کے قعدہ اخیرہ میں تشہد درود دونوں پڑھے یا فقط تشہد؟	۵۳۳	سنت مؤکدہ کے قریب من الواجب ہونے کا مطلب،
"	قعدہ اخیرہ کے بعد سہواً پانچویں رکعت کیلئے امام کھڑا ہو جائے تو مسبق کیا کرے؟	۵۳۶	بدعتی اور غیر مقلد کی اقتدار کا حکم،
۵۵۱	مسبق کے شامل ہوتے ہی امام کا سلام پھیر دینا،	۵۳۸	اگلی صف پڑھنے کے بعد اکیلا آدمی کیا کرے؟
		"	حکم نزاع در امامت،
		۵۳۹	صف اول میں امام کے پیچھے پھر دائیں اور بائیں جانب کھڑے ہونے کی فضیلت
		۵۴۰	صحبت اقتدار کے لئے علم بحال وانتقالات امام شرط ہے،
		۵۴۱	محکمہ کی مسجد میں جماعت ثانیہ مکروہ ہے،
		"	امام تیمم سے جماعت کرا سکتا ہے یا نہیں؟

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۶۳	واجب الاعداد نماز کی جماعت نامیہ میں شرکت کا حکم، مسئلہ تخفیف صلوٰۃ،	۵۵۲	فصل فی الحکث فی الصلوٰۃ
۵۶۴	لنگوٹ پر تہبند یا یا تجامہ پہن کر نماز پڑھنا	"	ناک غیر سائل خون کا نکلنا اور آخر نماز تک ہاتھ پر لگا رہنا،
۵۶۵	معذور کی نماز کی ایک صورت، نماز میں پا جامہ ٹخنوں سے نیچے رکھنا،	"	فصل فیما یفسد الصلوٰۃ وما یکرہ فیہا،
۵۶۶	ساڑی میں نماز پڑھنے کا حکم،	"	نماز میں جینے چلانے اور اچھلنے کو دنیا کا حکم،
"	فصل فی لقیرۃ و مسائل فی الفارقی،	۵۵۴	بغیر ضرورت صرف بنیان پہنکر نماز پڑھنا،
"	فاتحہ خلف الامام	۵۵۵	ناہنیا کو نماز میں قبلہ رخ کر دینا درست ہے یا نہیں؟
"	صحیح ضاد پڑھنے والے کی غلط ضاد پڑھنے والے کے پیچھے اقتدار کا حکم،	"	منبر کی سیڑھی پر سجدہ کرنا،
۵۶۸	فرض نمازوں میں دوسو تین کامل یا کچھ کم پڑھنا،	۵۵۶	قعدہ اخیرہ میں تشہد کے بعد امام سہوا کھڑا ہو کر بیٹھ گیا اور سجدہ سہو کر لیا، نماز ہوئی یا نہیں؟
"	نوافل میں جہر کا حکم،	"	نماز میں عورتوں کے لئے عقیق شعیر مکروہ ہے یا نہیں؟
۵۶۹	ضاد کو دو آد پر پڑھنا یا ظا پر پڑھنا، اور صحیح خواں کا اس کی اقتدار کرنا،	"	نماز میں رونے کے متعلق بہشتی زیور کی ایک عبارت کی وضاحت،
۵۷۱	ضاد کو آل یا مشابہ آل یا مشابہ ظا پڑھنا، والے کی اقتدار،	۵۵۸	مسجد کی چھت پر نماز پڑھنا،
۵۷۲	ضاد کے بجائے آل پڑھنا، تحقیق حرث ضاد،	۵۶۱	مجنونہ کی محاذات مفسد نماز نہیں، بلا ضرورت بنیان یا نیم آستین قمیض پہنکر نماز پڑھنا،
۵۷۷	نفل کی سب رکعتوں میں اور فرض کی دو رکعتوں میں قرأت فرض ہونے کا مطلب، حکم جہر منفرد و تکبیرات صلوٰۃ،	"	رکعت ثانی کی طوالت کے خوف سے سامع کا اللہ اکبر کہنا،
۵۷۸	قرأت خفی کی حالت میں سانس لینے ہوتے قرأت جاری رکھنا،	۵۶۲	جس پر سجدہ سہو لازم نہ ہو اور وہ لازم سمجھ کر کر لے تو اس کی نماز کا حکم،
۵۷۹	قرأت فاتحہ کے بعد بجائے کسی اور سورۃ کے سورۃ فاتحہ کا قصد آیا سہوا ضم کرنا،	"	چار پائی پر نماز پڑھنے کا حکم، نیم آستین واسکٹ میں نماز پڑھنا،

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۶۰۰	صلوٰۃ وتر سے قبل آیت ”رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ہَذَا بَاطِلًا یُزْہِنَا،	۵۸۰	تراویح میں ختم قرآن کے موقع پر قل ھو اللہ کو مکر رہنا،
۶۰۱	جس نے عشاء کی نماز تہنا ادا کی ہو تو تر عجا سے ادا کرے یا تہنا؟	۵۸۱	دوسو رتوں کے درمیان ترک سورۃ مکروہہ؟ سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ”سنۃ قد رسلنا قبلک من رسلنا“ سے قرأت کی ابتداء کرنا،
۶۰۳	وتر وہی شخص پڑھائے جس نے فرض عشاء پڑھائی ہو یا دوسرا شخص بھی پڑھا سکتا ہے؟	۵۸۲	قرأت میں قصار و ساط اور طوال کی رعایت مسنون ہے یا مستحب؟
۶۰۴	نماز وتر میں شوافع کی اقتدار کا حکم،		نماز میں سورۃ الشقاق پڑھنا،
۶۰۵	فصل فی السنن النوافل		فاتحہ اور سورۃ کے درمیان بسم اللہ پڑھنا،
۶۰۶	سنن مؤکدہ کا ثبوت،		مناد کو دال پڑھنے والے کی اقتدار کا حکم،
۶۰۷	نماز تہجد سنت مؤکدہ ہے یا مستحب؟		قرأت کی بعض غلطیوں کا حکم،
۶۰۸	سنن مؤکدہ کے تارک کا حکم،		حکم جہر بسم اللہ در سورۃ اقترا،
۶۰۹	صلوٰۃ التبلیغ میں ”سَمَّحَ اللہُ لِمَنْ حَمَدَہُ“ کے بعد ہاتھ باندھے یا کھلے رکھے؟		دو رکعتوں میں ایک چھوٹی سورۃ پڑھنا حکم تکرار قل ھو اللہ،
۶۱۰	تحتیہ الوضوء اور تحتیہ المسجد سنت ہے یا مستحب؟		مسئلہ قرأت،
۶۱۱	رکعتیں بعد الوتر کے متعلق ٹہشتی زیور“		فصل فی الوتر و دعاء القنوت
۶۱۲	۵۹۱ کے ایک مسئلہ پر شبہ کا جواب،		نماز فجر میں دعاء قنوت پڑھنا،
۶۱۳	نوافل میں دوسو رتوں کے درمیان ایک سورۃ کا چھوڑنا مکروہ نہیں،		وتر میں مطلق وتر کی نیکت یا وتر واجب کی؟ وتر کا قعدہ اولیٰ فرض ہے یا واجب؟ وتر میں حنفی کا شافعی کی اقتدار کرنا، وتر میں شافعیہ کی اقتدار کرنا درست ہے یا نہیں؟
۶۱۴	سنن رواتب کے ترک کرنے کا حکم،		رمضان میں وتر یا جماعت افضل ہے یا بغیر جماعت؟
۶۱۵	طالب علم، قاضی، مفتی کو درس، فتویٰ اور قضاء میں مشغول رہنے کی وجہ سے سنن رواتب کا چھوڑنا،		فضیلت تاخیر وتر در آخر شب،
۶۱۶	قبل عشاء چار رکعت والی سنت کے قعدہ اولیٰ میں تردد شریف اور تیسری رکعت میں ثناء و تَعَوُّد پڑھنا جائز ہے،		جس نے عشاء کی نماز جماعت سے نہیں پڑھی وہ وتر جماعت پڑھے یا تہنا؟
۶۱۷	ایضاً ایضاً ایضاً		
۶۱۸	نفل جماعت سے پڑھنا،		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۶۳۰	تراویح کی ترویج میں تمام جماعت کو جگہ پلانا،	۶۱۲	چھوٹی مسجد میں جماعت کھڑی ہونے کے
۶۳۱	نماز تراویح میں چار رکعت کے بعد امام کس		بعد سنت فجر ادا کرے یا چھوڑ دے ؟
	ہدیت سے بیٹھے ؟	۶۱۳	سامع کا تراویح سے قبل قرآن سننا جو
۶۳۲	نماز تراویح میں دو رکعت افضل ہے یا چار چار ؟		مشغولین فی السنن کے لئے باعث تشویش ہو
۶۳۳	تراویح کی جماعت ثانیہ کی ایک صورت،		جائز ہے یا نہیں ؟
۶۳۴	کیا ایک مسجد میں دو مرتبہ تراویح کی جماعت	۶۱۴	اضطباع بعد قیام اللیل سنت ہے یا نہیں ؟
	مکروہ ہے ؟	۶۱۵	جمعہ کا خطبہ مشروع ہونے کے بعد آنے والا
۶۳۵	بہشتی گوہر کے ایک مسئلہ کے متعلق تقدیم		سنن کب ادا کرے ؟
	و تر علی التراویح پر شبہ کا جواب،		استحارہ میں دونوں شقیں برابر ہوں تو کیا
۶۳۶	تراویح کی بیس رکعت ہونیکے دلائل،		کرنا چاہئے ؟
۶۳۷	المفاتیح لبواب التراویح	۶۱۶	صلوة التسبیح کی دوسری رکعت کی تسبیح
	بحوالہ شہار الحق فی اعداد التراویح،		میں راجح قول کونسا ہے ؟
۶۵۴	نابالغ بچے اور اجرت پر قرآن پاک سنانیوالے	۶۱۸	فصل فی التراویح
	کی اقتدار کرنا،		تراویح کی چار رکعت میں اگر قعدہ اولیٰ
۶۵۶	دو مسجدوں میں تراویح پڑھانے والے کا حکم،		بھول گیا تو کیا حکم ہے ؟
	چار رکعت تراویح کی نیت کی اور چوتھی میں	۶۲۰	ایک حافظ کا ایک رمضان میں تین چار جگہ
	بیٹھنا بھول گیا،		قرآن ختم کرنا،
	دو مسجدوں میں جماعت تراویح کرانیکا حکم،	۶۲۱	روزہ اور تراویح لازم و ملزوم ہیں یا نہیں ؟
۶۶۲	تراویح میں ختم قرآن کا ثبوت،		فصل کی کٹائی کی وجہ سے روزہ افطار کرنے
۶۶۳	تراویح کی بیس رکعت کا ثبوت،		دلے کی اقتدار کا حکم،
	نماز تراویح میں ایک غلطی کا حکم،		نماز تراویح میں قرآن کی سورت کی ترتیب کا حکم،
۶۶۴	صرف رمضان میں ختم قرآن کے لئے امام	۶۲۲	نماز تراویح میں ہر چار رکعت کے بعد عار مانگنا
	مقرر کرنا،	۶۲۶	ایک مسجد میں قرآن ختم کرنے کے بعد دوسری
۶۶۵	تراویح میں تکرار قل هو اللہ الخ		مسجد میں قرآن سننا،
	فصل فی ادراک الفریضۃ		فاسق امام کے پیچھے نماز تراویح پڑھنا،
	ادراک فریضہ کے متعلق بہشتی گوہر کے ایک مسئلہ پر شبہ کا جواب	۶۲۸	نابالغ بچے کے پیچھے تراویح کا حکم،
		۶۲۹	تراویح میں ہر سورۃ پر بسم اللہ پڑھنا،

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۶۸۱	منفرد سجدہ سہو کیلئے ایک طرف سلام پھیرے یا دونوں طرف؟	۶۶۵	فصل فی قضاء الفوائت
۶۸۲	شبہ ترک واجب بر سجدہ سہو واجب ہے یا نہیں؟	۶۶۶	ایک دن رات اگر کوئی بیہوش رہا تو نمازوں کی قضاء اس پر واجب نہیں،
۶۸۳	فرض اور نفل کے قعدہ اخیرہ میں تکرار تشہد پر وجوب سجدہ سہو کے متعلق ... بہشتی زیور اور الامداد کی عبارتوں میں اختلاف کی تطبیق،	۶۶۷	بغیر وصیت کے قضاء نمازوں کا فدیہ ادا کرنا،
۶۸۴	مبسوق نے نماز مغرب میں درمیانی قعدہ کر دیا تو اس پر سجدہ سہو ہے یا نہیں؟	۶۶۸	استفتاء متعلق فدیہ نماز،
۶۸۵	امام دعا بقنوت چھوڑ کر رکوع کو جائے تو کیا کرنا چاہئے؟	۶۶۹	چھ یا اس سے زیادہ نمازیں قضاء ہوں تو ترتیب واجب نہیں،
۶۸۶	وتر میں سہو کی ایک صورت،	۶۷۰	قضاء نماز روزہ کا کفارہ اور فوت شدہ نمازوں کی تعین کا حکم جبکہ صحیح تعداد معلوم ہو
۶۸۷	قعدہ اولیٰ یا ثانیہ میں قیل تشہد یا اس کے بعد فاتحہ وغیرہ پڑھنے سے سجدہ سہو لازم آئے گا یا نہیں؟	۶۷۱	میت کی طرف سے قضاء نمازیں ادا کرنا حکم قضاء نماز جماعت سے ہو سکتی ہے یا نہیں؟
۶۸۸	فصل فی سجود التلاوة	۶۷۲	فصل فی سجود لسہو
۶۸۹	نماز میں سجدہ تلاوت کے بجائے رکوع کا کافی ہونا،	۶۷۳	سلام پھیرنے کے بعد سجدہ سہو یا دانا،
۶۹۰	تحقیق محل سجدہ سورہ ص،	۶۷۴	القول الحری فی مسئلۃ السجود الخیری
۶۹۱	نماز میں سجدہ تلاوت کو اپنے مقام سے مؤخر کرنا اقرب للناس کے دوسرے سجدہ تلاوت پر سجدہ کرنے کا حکم،	۶۷۵	بہشتی زیور کے ایک مسئلہ پر اشکال کا جواب،
۶۹۲	حکم سجدہ تلاوت بغیر تلاوت آیت سجدہ،	۶۷۶	سجدہ سہو میں تسبیح پڑھنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟
۶۹۳	قرأت آیت سجدہ پر ختم ہو تو رکوع یا سجدہ میں سجدہ تلاوت ادا ہو جائے گا،	۶۷۷	قعدہ اخیرہ میں تکرار تشہد اور رکعت اولیٰ وثالثہ میں جلسہ خیفہ سے سجدہ سہو واجب ہوتا ہے یا نہیں؟
۶۹۴	احکام سجدہ تلاوت برتالی و سامع،	۶۷۸	مغرب کی نماز میں امام کا بھول کر چوتھی رکعت کے لئے قیام کرنا،
۶۹۵	آیت سجدہ کا ترجمہ پڑھنے سے وجوب سجدہ کا حکم،	۶۷۹	امام نے بدوین وجوب کے سجدہ سہو کیا تو نماز فاسد ہوگی یا نہیں؟
۶۹۶	نماز میں سورہ انشقاق پڑھنا،	۶۸۰	تشہد میں سہو البسم اللہ پڑھنا،
		۶۸۱	تکرار اکثر فاتحہ اور اعادہ تشہد سے سجدہ سہو کا واجب ہونا،

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۷۳۳	عید گاہ کو بچہ تعمیر کرنا جائز ہے،	۶۹۳	فصل في صلاة المرافق
۷۳۴	عید الاضحیٰ کی نماز کے بعد تکبیر کہنے کا حکم،	۷۰۱	زوجہ کے وطن میں قصر کرے یا نہیں؟
۷۳۵	جمعہ میں ایک آدمی کا خطبہ اور دوسرے کا نماز پڑھانا	۷۰۲	وطن اصلی کے متعدد ہونے اور وطن زوجہ کے
۷۳۶	نماز عیدین کے بعد رفع یدین کیسے مناجات کا حکم،	۷۰۳	وطن اصلی ہونے کی تحقیق،
۷۳۷	خطبہ کے وقت ہاتھ میں عصا لینا،	۷۰۴	معذر کیلئے استقبال قبلہ کی شرط کا ساقط ہونا
۷۳۸	مذہب عداوت کے دوسری مسجد میں جمعہ قائم کرنا،	۷۰۵	اس سفر کا حکم جس کے درمیان میں وطن اقامت واقع ہو
۷۳۹	وہ کارخانہ جو شہر میں منہل ہو اس میں نماز جمعہ کا حکم،	۷۰۶	بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کیلئے رکوع کا طریقہ
۷۴۰	نماز عید کے بعد عار مانگنے کا حکم،	۷۰۷	کشتی اور جہاز کے ملاحوں کیلئے نماز قصر کی تحقیق
۷۴۱	ایک عید گاہ میں عید کی دو جماعت کرنا،	۷۰۸	کشتی میں نماز پڑھنے کے متعلق ایک سوال جواب
۷۴۲	نماز عید ایسی جگہ ادا کرنا جہاں سامنے قبرستان ہو،	۷۰۹	جہاز کے ملازمین کے لئے قصر کا حکم،
۷۴۳	امام کا لوگوں کے بیچ میں کھڑے ہو کر خطبہ دینا کا حکم،	۷۱۰	حکم سیلان زخمیکہ از خود پیدا کردہ شود یا نل
۷۴۴	عید فطر میں تکبیر تشریف جہرا کہنے کا حکم،	۷۱۱	زخمی ہست کہ بآفت سماویہ پیدا گشت
۷۴۵	نماز عیدین کے بعد عار مانگنے کا حکم،	۷۱۲	بعض مسائل متعلق نماز قصر
۷۴۶	نماز جمعہ اور بعد جمعہ کی تحقیق،	۷۱۳	بیوی ایک ماہ کیلئے وطن اصلی کے علاوہ کہیں
۷۴۷	گاؤں میں جمعہ کا حکم،	۷۱۴	اقامت اختیار کرے اور شوہر وہاں آئے تو اس
۷۴۸	اس جزیرہ میں جمعہ کا حکم جو متعدد مواضع پر مشتمل ہو	۷۱۵	کیلئے بھی وطن اقامت ہو جائے گا یا نہیں؟
۷۴۹	سرکاری قلعہ میں نماز جمعہ کا حکم،	۷۱۶	مقیم ہو کیلئے کسی خاص جگہ میں نیست اقامت ضروری
۷۵۰	خطبہ جمعہ میں غیر عربی میں مسائل کی تعلیم درست ہے	۷۱۷	فصل في الجمعة والعیدین
۷۵۱	نثر یا نظم میں ترجمہ خطبہ سننے کے بعد عربی میں	۷۱۸	دو ہزار کی آبادی والے گاؤں میں جمعہ کا حکم،
۷۵۲	خطبہ پڑھنا،	۷۱۹	غیر عربی میں خطبہ دینے کے مسئلہ میں ملو الفقہاء
۷۵۳	خطبہ کی وقت ہاتھ میں عصا لینا خلا سنت نہیں،	۷۲۰	اور تہنیتی گوہر کی عبارتوں میں تطبیق،
۷۵۴	مسجد واحد میں بعد جمعہ جائز نہیں،	۷۲۱	جمعہ کی نماز کے بعد احتیاط نظر پڑنے کا حکم،
۷۵۵	احکام خطبہ عید،	۷۲۲	گاؤں میں جمعہ صبح نہ ہونے کا بیان،
۷۵۶	اختتام خطبہ کے بعد متصل اقامت شروع ہو	۷۲۳	غیر عربی زبان میں خطبہ کی متعلق بعض فقہاء
۷۵۷	توام سماع اقامت کیلئے بیٹھے یا نہیں؟	۷۲۴	کی عبارات کا مطلب،
۷۵۸	حکم نماز جمعہ پر کاشتکاران بادیہ نشین،	۷۲۵	نماز عیدین کا عید گاہ میں پڑھنا سنت ہے،
۷۵۹	چرواہے پر نماز جمعہ فرض ہے یا نہیں؟	۷۲۶	
۷۶۰	گاؤں اور قصبہ کی تعریف،	۷۲۷	

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۷۸۱	جو شخص یہ کہتا ہو کہ ہندوستان میں جمعہ ادا نہیں ہوتا اس لئے ہم ظہر احتیاطی ادا کرتے ہیں اس کے پیچھے جمعہ جائز ہے یا نہیں؟	۷۵۷	جیل میں نماز جمعہ کا حکم،
۷۸۲	مسجد محلہ میں بانی یا کسی دوسرے شخص کا نماز جمعہ ادا کرنے سے منع کرنا،	۷۵۹	مصر کی تعریف،
۷۸۳	جہاں ایک ہی جگہ نماز جمعہ ہوتی ہو وہاں بعض افراد سے جمعہ فوت ہو جائے تو ان کو کیا کرنا چاہئے؟	۷۶۰	خطبہ کے وقت ہاتھ میں عصا لینا،
۷۸۵	قنارہ مصر میں نماز جمعہ کی ایک صورت،	۷۶۱	جمعہ کی دونوں اذانوں کے درمیان کھانا پینا کیا ناجائز پر نماز جمعہ واجب ہے؟
۷۸۷	آبادی سے باہر تعمیر کی ہوئی عید گاہ جب آبادی میں آجائے تو اسکی صحرائیت باطل ہوگی یا نہیں؟	۷۶۲	شہر یا قصبہ میں نماز جمعہ پڑھ کر شام تک گاؤں واپس آسکتے ہو تو ایسے گاؤں اور نماز جمعہ فرض ہے یا نہیں؟
۷۸۹	جمعہ فی القریٰ کے متعلق امام اعظمؒ کی تحقیق،	۷۶۳	حضرت تھانویؒ کے قول اور احسن لغت کی عبارت دربارہ تعریف مصر میں رفع خلاف کے متعلق ایک سوال کا جواب،
۷۹۵	آبادی متفرقہ متصلہ کے مجموعہ میں جو بجمعہ کی ایک صورت گاؤں میں جمعہ کا حکم،	۷۶۴	تکبیرات ایام تشریق کن پر واجب ہیں؟
۷۹۷	حضرت نانوتویؒ کے ایک فتویٰ سے جواز جمعہ فی القریٰ کے شبہ کا ازالہ،	۷۶۵	مفتی بہ قول امام ابو حنیفہؒ کا، یا صاحبینؒ کا؟
۷۹۹	اذن الحکم بالجمعة یبقی بعد موتہ او عزلہ ام لا؟	۷۶۶	تعریف مصر،
۸۰۲	جس جگہ آبادی تین ہزار سے زائد ہو اور ضروریات زندگی دستیاب ہوں وہاں نماز جمعہ کا حکم،	۷۶۷	صحرا جہاں عیدین کی نماز پڑھنا سنت ہے،
۸۰۳	خطبہ جمعہ میں تطویل مکروہ ہے،	۷۶۸	خطبہ سے پہلے وعظ کہنے کا حکم،
۸۰۴	تحقیق کراہۃ الخطبۃ یوم الجمعة بغیر العربیۃ،	۷۶۹	المنبر اذا مینی فی المہراب بل یجوز الخطبۃ علیہ ام لا؟
۸۰۵	فصل فی صلوٰۃ الکسوف والاستسقاء و متعلقا بہما	۷۷۰	خطبہ جمعہ شروع کرنے سے قبل اعوذ باللہ بسم اللہ چہرا پڑھے یا آہستہ؟
۸۰۶	کسوا و خضوع کے وقت کھانے پینے کا حکم،	۷۷۱	جمعہ کے دن آخر ظہر پڑھنے کا حکم،
۸۰۷	مسائل متفرقہ کتاب الصلوٰۃ،	۷۷۲	اذان جمعہ سے قبل وعظ کی ایک صورت کا حکم
۸۰۸	نمازی کے آگے سے گزرنا،	۷۷۳	گاؤں میں نماز جمعہ و عیدین درست نہیں،
۸۰۹	اندھیرے میں تہجد پڑھنے کا حکم،	۷۷۴	خطبہ کے وقت ہاتھ میں عصا لینا،
۸۱۰		۷۷۵	عید جب جمعہ کے روز ہو تو جمعہ اور عیدین دونوں واجب ہیں،
۸۱۱		۷۷۶	تکبیرات ایام تشریق جماعت کے نماز پڑھنے والوں کے ساتھ خاص ہی یا یہ حکم عام ہے؟

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۸۲۲	جنازہ کا کپڑا پھاڑ دینے سے متعلق فتاویٰ عالمگیری کی ایک عبارت کا صحیح مطلب،	۸۰۹	جو شخص بالکل نمازی کے سامنے بیٹھا ہو، اس کو کسی طرف سرک جانا جائز ہے؟
۸۲۳	کیا شوہر بیوی کے مرنے کے بعد غسل دے سکتا ہے؟	"	نمازی کے سامنے سے ہٹنے کا حکم،
۸۲۴	کوئی عورت غاسلہ موجود ہو تو بیٹے کو غسل دینا جائز نہیں،	"	درود ابراہیمی میں کما صلیت علی ابراہیم میں تشبیہ کی تحقیق،
۸۲۵	غسل میت کے متعلق بہشتی زیورہ کہ ایک عبارت پر شبہ کا جواب،	۸۱۱	نماز باجماعت کیلئے لوگوں کی حاضری لینا حکم،
۸۲۶	میت پھول جائے اور ہاتھ لگانے کے قابل نہ رہی تو کس طرح غسل دیا جائے؟	"	خانقاہ امدادیہ کے حوض پر بلاسترہ نماز پڑھنے والوں کے آگے سے گزرنے کے متعلق حکم،
"	فصل فی الصلوٰۃ علی المیت	۸۱۲	کتاب الجنائز فصل فی احوال الموتی فی القبور؛
"	نماز جنازہ کے اندر شمار، درود اور دعا، میں تقدیم و تاخیر کرنا،	"	عورتوں کے لئے زیارت قبور کا حکم،
۸۲۷	نماز جنازہ کو نماز جمعہ سے مقدم کرنے کا حکم،	۸۱۳	قبر پر کتبہ لگانا مکروہ ہے،
"	نماز جنازہ کی تکرار بدعت اور مکروہ تحریمی ہے،	"	میت کے بعض رسومات کا حکم اور غسل اور کفن و دفن کا طریقہ،
۸۲۸	نماز جنازہ میں سلام کے بعد ہاتھ چھوڑے یا پہلے؟	۸۱۶	زوج کے لئے مردہ بیوی کو بلا حائل ہاتھ لگانا جائز نہیں،
"	فرقہ قرآنیہ پر نماز جنازہ کا حکم،	"	ایم مخصوصہ میں ارواح کا گھروں میں آنا،
۸۲۹	متعدد جنازوں پر ایک نماز بھی کافی ہے،	۸۱۸	حالت نزع میں محضر کو پانی پلانا مستحب ہے،
۸۳۰	دریا سے ایسی حالت میں لاش برآمد ہوئی کہ جسم کی صرف ہڈیاں باقی ہوں تو ان پر نماز جنازہ پڑھی جائے یا نہیں؟	۸۱۹	حکم تحویل عظام میت،
"	میت کا جسم پھول اور پھٹ جائے تو نماز جنازہ ساقط ہو جاتی ہے،	۸۲۰	قبرستان میں لوہان سلگانا جائز ہے یا نہیں؟
"	اگر میت کے جسم سے نجاست نکلنا بند نہ ہو، تو اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے یا نہیں؟	"	محضر کے لٹانے کا مسنون طریقہ،
۸۳۱	جنازہ مشرقاً وغیرہ رکھ کر نماز جنازہ پڑھنا کیسا ہے؟	۸۲۱	کیا باپ کی موجودگی میں شوہر میت کا ولی ہو سکتا ہے؟
"	بے نمازی پر نماز جنازہ پڑھی جائے یا نہیں؟	۸۲۲	مرنے کے بعد بیوی کو دیکھنا اور ہاتھ لگانا
"		"	فصل فی الغسل و الکفن
"		"	میت کو غسل دینے کا وقت کس طرح لٹایا جائے؟

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۸۳۷	تدفین کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا،	۸۳۲	جوتوں کے ساتھ نماز جنازہ پڑھنا،
۸۳۸	میت کو قبر میں داتیں پہلو پر لٹانا چاہیے،	۸۳۳	نماز جنازہ نماز عیدین سے مؤخر اور خطبہ عید سے مقدم کرنا چاہیے،
۸۳۸	صندوقی قبر کی گہرائی کتنی ہونی چاہیے؟	۸۳۳	جس کی خلت نہ ہوئی ہو اس کی نماز جنازہ پڑھنا
۸۳۸	قبر میں مردے بٹھائے جانے کی وجہ سے قبر کو گہرا کرنے کا حکم،	۸۳۴	غائبہ نماز جنازہ کا حکم،
۸۳۹	میت کو قبر میں رکھنے کا مسنون طریقہ،	۸۳۵	شوافع بلا عذر نماز جنازہ مسجد میں پڑھائیں تو حنفیوں کو انکی اتباع کرنی چاہیے یا نہیں؟
۸۳۹	میت کو قبر میں رکھنے کے بعد سب بند کھول دینے چاہئیں،	۸۳۵	غیر مستحق نے نماز جنازہ پڑھا دی، اعادہ کے وقت ولی کی نماز فرض ہوگی یا نفل؟
۸۴۰	فصل فی الشہید	۸۳۷	ایک ہی مکان میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی جل کر مرجائیں اور تمیز ممکن نہ ہو تو ان پر نماز جنازہ کا حکم،
۸۴۰	جس شخص نے مرض ضیق النفس میں وفات پائی وہ شہید کہلائے گا یا نہیں؟	۸۳۷	فصل فی حمل الجنازۃ ودفنها
۸۴۱	حکم حریق فی النار،	۸۳۷	تختے رکھ دینے کے بعد قبر پر مٹی ڈالنا خوب ہے اور اس سے پہلے مکروہ ہے،
۸۴۱	جلد اول تمام شد	۸۳۷	

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

دیباچہ طبع اول

اُمَدُ الْاَحْکَامِ جو اس صدی کا عظیم فقہی کارنامہ ہے، اس کے مقدمہ میں دُرُ چیزیں بیان کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی، ایک فقہ کے متعلق ضروری معلومات، مثلاً فقہ اور اس کے مآخذ کا تعارف، فقہی مسائل میں عہد صحابہؓ سے اب تک اختلافات کے وجوہ و اسباب، ائمہ اربعہ کے مذاہب کی بنیادی خصوصیات، تقلید اجتہاد کی حدود، اختلافی مسائل میں علماء اہل فتویٰ کس طرح کسی قول کو اختیار کریں، اور موجودہ علماء کے فتاویٰ مختلف ہو جائیں تو عوام کیا صورت اختیار کریں، فتویٰ طلب کرنے والوں کو کن آداب کا لحاظ ضروری ہے اور فتویٰ دینے کے آداب اور اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ اور دوسری چیز کتاب امداد الاحکام کا تعارف اور اس کے مؤلفین کے مختصر حالات زندگی۔

اول الذکر مباحث کو والد ماجد مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ "امداد الفتاویٰ" کے مقدمہ میں بیان فرمانا چاہتے تھے، مگر موقع نہ مل سکا، جب زیر نظر کتاب "امداد الاحکام" کی جلد اول طباعت کے مراحل میں پہنچی، اور اس پر مقدمہ لکھنے کی ضرورت سامنے آئی تو حضرت والد ماجدؒ کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا، ————— احقر نے علی کم ہائیلی اور دارالعلوم کراچی کی ہمہ وقتی مصروفیات کے باوجود بنام خدا تعالیٰ مقدمہ لکھنے کا ارادہ کیا، اور بے اختیار دل چاہا کہ

فقہ کے متعلق جن مباحث کی ضرورت والد ماجدؒ کے پیش نظر تھی وہ بھی اس مقدمہ میں اپنی بساط کے مطابق بیان کر دیئے جائیں، تاکہ بہت سے باذوق حضرات جو فقہ کی طرف نئے نئے متوجہ ہو رہے ہیں اور اس فن کے متعلق ابتدائی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں اُن کو سہولت ہو۔

ناچیز راقم المحروف نے بنام خدا تعالیٰ اُن مباحث کو لکھنا شروع کیا، مگر اختصار کی پوری کوشش کے باوجود فقہ اور اسکے مآخذ ہی کے تعارف میں اجماع کے بیان تک تقریباً ستر صفحات ہو گئے، اور اندازہ یہ ہوا کہ باقی مباحث کی تکمیل تک ضخامت دو سو صفحات تک جا پہنچے گی اور وقت بھی کافی لگ جائے گا، ادھر کتاب کی جلد اول طبع ہو چکی تھی، صرف مقدمہ کے انتظار میں اس کی اشاعت رُک رہی تھی، مجبوراً یہ طے کیا کہ یہ مباحث تکمیل کے بعد مستقل کتابی صورت میں جداگانہ شائع کئے جائیں، اور مقدمہ میں صرف کتاب ”امداد الاحکام“ کا تعارف و خصوصیات اور اس کے مولفین کرام کے مختصر حالات زندگی بیان کر دیئے جائیں، واللہ المستعان۔

محمد رفیع عثمانی

خادم دارالعلوم کراچی

صفر ۱۴۲۰ھ



دیباچہ طبع دوم

حائد اومصلیا۔ اب جبکہ "امداد الاحکام" جلد اول کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو رہا ہے، ناظم مکتبہ دارالعلوم کراچی اور کئی دیگر اہل علم کی رائے یہ ہوئی کہ فقہ اور اُسکے مآخذ کے تعارف سے متعلق جو مضمون احقر نے طبع اول کے موقع پر لکھا تھا اور جس کا ذکر دیباچہ طبع اول میں کیا گیا ہے، اُس میں اگرچہ احقر کے عوارض کے باعث بعد میں بھی کوئی اضافہ نہ ہو سکا، لیکن جتنا لکھا جا چکا ہے انکی رائے میں "وہ بھی بہت اہم معلومات پر مشتمل ہے اور قارئین کیلئے انشاء اللہ مفید ہوگا" اس لئے اب بنام خدا تعالیٰ طبع دوم کے مقدمہ میں اس کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔

امید ہے کہ یہ اضافہ اُن قارئین کے لئے خصوصیت سے مفید ہوگا جو فقہ کی حقیقت اور اس فن کے متعلق بنیادی اور ابتدائی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اسمیں فقہ کے ساتھ تصوف کا تعارف بھی کافی تفصیل سے آیا ہے، جس میں یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ "شریعت و طریقت" ایک دوسرے کے لئے ناگزیر اور لازم و ملزوم ہیں، اور تصوف بھی درحقیقت فقہ ہی کا ایک بنیادی حصہ ہے۔ — نیز فقہ کے چار مآخذ میں سے قرآن کریم، سنت اور اجماع کے بارے میں بھی ضروری معلومات درج کی گئی ہیں، جن میں حدیث کی حجت پر مختصر، اور اجماع کی حجت پر خاصی مفصل بحث بھی شامل ہے۔ — و بئرا الحمد۔

فقہ کے چوتھے مأخذ ”قیاس“ کا تعارف اور فقہ سے متعلق باقی معلومات جو حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرمانا چاہتے تھے، افسوس کہ وہ ابھی تک نہیں لکھی جاسکیں۔ دے لے کہ اللہ تعالیٰ اگلی اشاعت تک اس کی بھی توفیق عطا فرمادیں۔ وہوالمستعان۔

محمد رفیع عثمانی

خادم دارالعلوم کراچی

۸، جمادی الاولیٰ ۱۴۱۲ھ

۱۶، نومبر ۱۹۹۱ء



مقدمہ

از مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی صدر دارالعلوم کراچی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفَى وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰ

کتاب اور اسکے مؤلفین رحمۃ اللہ علیہم کے تعارف سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فقہ اور اسکے مآخذ کا تعارف ہدیہ ناظرین کر دیا جائے۔

ففت

فقہ کے لغوی معنی | لغت میں فقہ ”فہم، سمجھداری اور ذہانت“ کو کہتے ہیں، اور فقیہ ذہین اور سمجدار شخص کو کہا جاتا ہے، اور تفقہ فقیہ ہونے، فقہ حاصل کرنے اور اس میں غور و خوض کرنے کا نام ہے۔

فقہ کے قدیم اصطلاحی معنی | اسلام کے قرونِ اولیٰ کی اصطلاح میں فقہ سے مراد ”پورے دین کی گہری سمجھ“ ہے، یعنی دین کی تمام تعلیمات خواہ ان کا تعلق کسی بھی شعبہ زندگی سے ہو ان کی گہری بصیرت و مہارت کو ”فقہ“ کہا جاتا تھا، اور فقیہ اس شخص کو کہتے تھے جو پورے دین کی گہری بصیرت و مہارت رکھتا ہو، اور اپنی پوری زندگی کو دین کے سانچے میں ڈھال چکا ہو۔

۱۵ الصحاح للجوہری، ص ۲۲۴۳، ج ۶ ۱۵ رد المحتار، ص ۳۸ ج ۱ ۱۵ الصحاح۔

۱۶ قرونِ اولیٰ سے مراد عہدِ رسالت اور اس کے بعد تابعین تک کا زمانہ ہے۔

دینی احکام کی قسمیں تفصیل اس کی یہ ہے کہ امت کو قرآن و سنت میں جو احکام دیئے گئے اُن کی تین قسمیں ہیں :-

اول :- وہ احکام جن کا تعلق عقائد سے ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور توحید پر ایمان، اللہ تعالیٰ کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے تمام رسولوں پر ایمان، یوم آخرت اور اچھی بُری تقدیر پر ایمان اور ہر قسم کے کفر و شرک سے اجتناب وغیرہ،
دوم :- وہ احکام جن کا تعلق بندے کے اُن افعال سے ہے جو جسم کے ظاہری اعضاء، مثلاً ہاتھ، پاؤں، کان، ناک، حلق، زبان وغیرہ سے انجام دیئے جاتے ہیں، جیسے نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد اور نکاح و طلاق، قسم و کفارہ اور جیسے معیشت و تجارت، سیاست حکومت، میراث و وصیت، دعویٰ اور قصاص و شہادت و جرائم اور ان کی سزائیں اور جیسے سلام و کلام، کھانا پینا، سونا، اٹھنا، نشست و برخاست، ہمائی و میزبانی وغیرہ۔

سوم :- وہ احکام جن کا تعلق باطنی اخلاق و عادات سے یعنی بندے کے ان اعمال سے ہے جو وہ اپنے باطن اور قلب سے انجام دیتا ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھنا، اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور اسے یاد رکھنا، دنیا سے محبت کم کرنا، اللہ تعالیٰ کی مرضی پر راضی رہنا، ہر حالت میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا، عبادت میں دل کا حاضر رکھنا، دین کے ہر کام میں اللہ تعالیٰ کے لئے نیت کو خالص رکھنا، کسی کو حقیر سمجھنا خود پسندی سے پرہیز کرنا، صبر کرنا اور غصہ کو ضبط کرنا وغیرہ۔

قرآن و سنت میں ان سب قسموں کا بیان چونکہ یہ تینوں قسم کے احکام دین کے لازمی اجزاء، باہم مربوط اور ایک

دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں، اس لئے قرآن حکیم نے اُن کو الگ الگ قسموں میں بیان کرنے کی بجائے ایک ساتھ ملا جلا کر بیان کیا ہے، یہ نہیں کیا کہ ہر ایک قسم کو دوسری سے ممتاز کرنے کے لئے قرآن شریف کے الگ الگ تین حصے مقرر کر دیئے گئے ہوں، اور ہر حصہ میں صرف ایک ہی قسم کے احکام بیان کئے گئے ہوں، بہت مقامات پر تو ایک ہی آیت میں تینوں قسم کے احکام حسب موقع ذکر فرما دیئے گئے ہیں، مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے :-

۱۔ غلامہ تہلیل قصہ ہیل، ص ۶، اور البحر الرائق، ص ۶ ج ۱،

وَالْعَصْرَ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ إِلَّا
الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ
”قسم ہر زمانہ کی کہ انسان بڑے خسارہ میں ہے
سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے، اور
انہوں نے اچھے کام کئے اور ایک دوسرے
کو حق پر قائم رہنے کی تلقین کرتے رہے، اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہے۔“
اس میں ”ایمان“ کا تعلق قسم اول سے، ”اچھے کام“ کا تعلق قسم دوم سے، ”حق پر قائم رہنے“ کا تعلق
تینوں قسموں سے اور ”صبر“ کا تعلق قسم سوم سے ہے۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں یہ تینوں قسموں کے احکام ملے جلتے تھے، جو
آپ نے حسب ضرورت صحابہ کرامؓ کو تعلیم فرمائے، بسا اوقات ایک ہی حدیث میں کچھ احکام عقائد سے
متعلق ہوتے ہیں، کچھ ظاہری اعمال سے اور کچھ باطنی اخلاق و عادات یعنی اعمالِ قلب سے۔
دین ان تینوں قسموں کے احکام کو بجالانے کا نام ہے، چنانچہ صحیح مسلم شریف کی سب سے پہلی حدیث
میں جو حدیث جبریلؑ کے نام سے معدون ہے آپ نے ان تینوں پر عمل کو ”دین“ قرار دیا ہے۔
پس ان میں سے کسی قسم کے احکام کو نظر انداز کر دینے سے دین مکمل نہیں ہو سکتا، اور انہی
تینوں قسم کے احکام میں گہری بصیرت و مہارت کو قرونِ اولیٰ میں ”فقہ“ کہا جاتا تھا۔
اسی لئے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے جو تابعین کے آخری دور سے
تعلق رکھتے ہیں فقہ کی تعریف یہ کی ہے کہ:-

هُوَ مَعْرِفَةُ النَّفْسِ مَالِهَا وَ
مَاعِلِيهَا،
”یعنی فقہ ان امور کی بصیرت کا نام ہے
جو بندہ کے لئے جائز یا ناجائز ہیں“

یہ تعریف علمِ دین کی تینوں اقسام کو شامل ہے، چنانچہ امام صاحب موصوف نے جو کتاب عقائد
پر تصنیف فرمائی تھی اس کا نام ”الفقہ الاکبر“ رکھا تھا، جس سے معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک بھی علم
عقائد فقہ ہی کا ایک اہم ترین شعبہ تھا۔
خلاصہ یہ کہ متقدمین کی اصطلاح میں پورے دین کی گہری بصیرت و مہارت کو ”فقہ“ کہا جاتا
تھا، اور ”فقہ“ اس شخص کو کہتے تھے جو پورے دین کی گہری بصیرت و مہارت رکھتا ہو، اور اپنی پوری
زندگی اس کے سانچے میں ڈھال چکا ہو۔

۱۔ جامع بیانِ احکام لابن عبد البر المالکیؒ، ص

۲۔ التوضیح، ص ۱۰۰ ج اول (مطبوعہ مصر) اور البحر الرائق، ص ۶ ج ۱۔

فقیہ حضرت حسن بصریؒ کے نزدیک

مشہور تابعی اور فقیہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے ایک صاحب نے کہا کہ فلاں مسئلہ میں فقہاء آپ کے خلاف

کہتے ہیں، تو آپ نے فرمایا:-

تَمَّ نِيْ اَنْكُھُ سَے کبھی کوئی فقیہ دیکھا بھی ہے؟
فقیہ تو وہ ہوتا ہی جو دنیا سے بے رغبت ہو
آخرت کا طلب گار ہو، اپنے دین کی بصیرت
رکھتا ہو، اپنے رب کی عبادت میں لگا رہے،
مستقی ہو، مسلمانوں کی عزت و آبرو کو نقصاً
پہنچانے سے پرہیز کرتا ہو، ان کے مال و

وہل رَأَيْتَ فَقِيْہًا بَعِيْثًا؟ اِنَّمَا
الْفَقِيْہُ الزَّاهِدُ فِی الدُّنْیَا الرَّاْغِبُ
فِی الْاٰخِرَةِ الْبَصِيْرُ بَدِيْنِهٖ الْمَدَامُ
عَلٰی عِبَادَةِ رَبِّہٖ اَلْوَرَعُ الْکَاتِبُ عَنْ
اَعْرَاضِ الْمَسٰلِمِ الْعَفِیْفُ عَنْ
اَمْوَالِہِمُ النَّاصِحُ لْجَمَاعَتِہِمُ۔

دولت سے بے تعلق ہو، اور جماعتِ مسلمین کا خیر خواہ ہو۔

معلوم ہوا کہ ”فقیہ“ ہونے کے لئے تمام دینی احکام کا محض علم بمعنی ”وِاسْتَنْ“ کافی نہ تھا، بلکہ اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنا بھی فقیہ کی تعریف میں شامل تھا، جس کے بغیر کوئی خواہ کتنا ہی بڑا عالم ہو ”فقیہ“ کہلانے کا مستحق نہ سمجھا جاتا تھا۔

احادیث میں فقہ اور فقیہ کے جو فضائل آئے ہیں وہ اسی قدیم معنی کے فقہ اور فقیہ سے متعلق ہیں، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

”جس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا
ارادہ کرنا ہو اسے دین کا فقہ (سمجھ) عطا
فرمادیتا ہے“

مَنْ يُرِدِ اللّٰہُ بِہٖ خَیْرًا یُّفَقِّہْہُ
فِی الدِّیْنِ۔

اس میں دین کے کسی شعبہ کی تخصیص نہیں کی گئی، بلکہ علم دین کی تینوں اقسام کی فضیلت بیان کی گئی ہے، لہذا یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ احادیث میں فقہ اور فقیہ کے فضائل صرف اسی جدید اصطلاحی معنی کے ساتھ خاص ہیں جو اب معروف ہیں، اور جن کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

قرآن و سنت میں ہر زمانہ اور ہر مقام میں پیدا ہونے والے تمام
مسائل کا حکم الگ الگ صریح طور پر بیان نہیں کیا گیا، فردعی اور
جزئی احکام وہی بیان کئے گئے ہیں جن کی عہد رسالت میں ضرورت

مسائل کی کثرت اور
مباحث کا پھیلاؤ

تھی، البتہ ایسے اصولی احکام بیان کر دیئے گئے ہیں جو قیامت تک کی ضرورت کے لئے کافی ہیں، اور ان اصولوں کی روشنی میں ہر زمانہ اور ہر حالت کے فردعی احکام مستنبط کئے جاسکتے ہیں۔

عہد رسالت کے بعد جب اسلام کی فتوحات دنیا میں پھیلیں، بڑے بڑے متمدن ممالک اسلام کے زیر حکومت آئے، دوسری قوموں کے بے شمار لوگ اسلام میں داخل ہوئے مسلمانوں کو مختلف تہذیبوں سے واسطہ پڑا، نئی نئی چیزیں ایجاد ہوئیں، اور نئے نئے حالات و نظریات سامنے آئے تو ہر زمانہ کے فقہاء مجتہدین نے ان کے شرعی احکام قرآن و سنت ہی کے ابدی اصولوں سے مستنبط کئے، اور امت کو بتائے، اس طرح ہر زمانہ میں قرآن و سنت سے حاصل کئے ہوئے جزئی اور فردعی احکام میں اضافہ ہوتا رہا۔

چونکہ قرآن و سنت سے نئے مسائل کا حکم معلوم کرنے اور اس کے طریق کار میں فقہاء کا بہت مواقع میں اختلاف رائے بھی ہوا، جو شرعی دلائل پر مبنی ہوتا تھا، اور عقل و دیانت کی رُو سے ناگزیر تھا، اس لئے ہر حکم کے شرعی دلائل کو بھی خوب خوب واضح کرنا پڑا، اس طرح تینوں قسم کے احکام و مسائل میں دلائل اور متعلقہ مباحث کا اضافہ بھی قرآن و سنت کے ہی بیان کردہ اصولوں کی بنیاد پر ہوتا رہا، اور علم دین کا نہایت قیمتی ذخیرہ جمع ہوتا گیا، جسے منضبط کرنا بعد کے لوگوں کے لئے آسان نہ تھا۔

ترتیب تدوین اب ضرورت ہوئی کہ تمام دینی احکام کو دلائل اور متعلقہ مباحث کے ساتھ مرتب اور مدون کر دیا جائے، تاکہ بعد کی نسلوں میں ان کی تعلیم و تدریس آسان ہو، یہ کارنامہ متاخرین یعنی تابعین کے بعد آنے والے علماء کرام نے انجام دیا۔

دینی احکام کی تقسیم تین ان حضرات نے سہولت پیدا کرنے کے لئے دینی احکام کی تینوں قسموں کو ایک دوسرے سے ممتاز کر کے الگ الگ مرتب کیا، کچھ حضرات نے صرف عقائد اور متعلقہ مباحث پر مشتمل کتابیں تصنیف کیں، کچھ

علماء نے صرف ظاہری اعمال کے احکام اور متعلقہ مباحث کو اپنی کتابوں میں مرتب کیا، اور کچھ بزرگوں نے باطنی اعمال کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا، اور اس کے احکام و مباحث کو اپنی کتابوں میں جمع کر دیا، اس طرح رفتہ رفتہ دینی احکام کی یہ تینوں قسمیں الگ الگ علم دین کی حیثیت اختیار کر گئیں، یعنی علم فقہ تین علوم میں تقسیم ہو گیا، اور ہر علم کا الگ نام رکھ دیا گیا۔

علم کلام، فقہ، تصوف عقائد اور متعلقہ تفصیلات و مباحث کے علم کا نام ”علم کلام“ رکھ دیا گیا، اعمال ظاہرہ، نماز، روزہ، نکاح و طلاق، تجارت و سیاست اور

معاشرت وغیرہ کے احکام و دلائل کے علم کا نام ”فقہ“ رکھ دیا گیا اور اعمال باطنہ، تقویٰ و توکل، اخلاص و تواضع، صبر و شکر اور زہد و قناعت وغیرہ کی بصیرت و مہارت کو ”تصوف“ اور ”سلوک“ اور ”طریقت“ کہا جانے لگا۔

فقہ کی جدید اصطلاحی تعریف | اس تقسیم میں دینی احکام کی دو قسمیں چونکہ فقہ سے الگ کر دی گئیں، لہذا فقہ کا موضوع اور دائرہ کار نسبتاً کافی محدود ہو گیا اسی وجہ سے متاخرین کو ایک مستقل علم و فن کی حیثیت سے فقہ کی تعریف بھی از سر نو کرنی پڑی، اب ”فقہ“ کی اصطلاحی تعریف یہ ہو گئی کہ:

”فقہ ظاہری اعمال کے متعلق تمام احکام شرعیہ کا علم ہے جو ان کے تفصیلی دلائل سے حاصل کیا جائے“

جدید اصطلاح کے اعتبار سے یہ فقہ کی نہایت جامع، مانع اور مکمل تعریف ہے، اور اب فقہ کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے، اسے پوری طرح سمجھنے اور سمجھانے کے لئے فقہائے کرام نے تو اپنی عادت کے مطابق نہایت باریک بینی اور خوب تفصیل سے کام لیا ہے، کئی کئی صفحات میں اس کے ایک ایک لفظ کی تشریح اس طرح فرمائی ہے کہ کوئی پہلو تشنہ نہیں رہتا، یہاں اس تعریف کے اہم حصوں کی تشریح کی جاتی ہے۔

تشریح

ظاہری اعمال | سے مراد وہ اچھے یا بُرے کام ہیں جو بدن کے ظاہری اعضاء مثلاً ہاتھ پاؤں، کان، ناک، حلق وغیرہ سے انجام دیئے جاتے ہیں، جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، تلاوت، کھانا، پینا، سننا، سونگھنا، چھونا، پہننا، زنا، چوری وغیرہ۔

۱۔ البحر الرائق ص ۶ ج ۱، والتوضیح مع التلویح ص ۱۱ ج ۱، ودر المختار ص ۳۲ ج ۱ (نسخہ استنبول)
۲۔ عربی میں تعریف کے الفاظ یہ ہیں: ”هو العلم بالاحکام الشرعیۃ العملیۃ المكتسب من ادلتها التفصیلیۃ“ فقہاء کرام نے مراحت کی ہے کہ اس تعریف کے لفظ ”عملیۃ“ میں اعمال سے مراد ظاہری اعمال ہیں، اسی لئے احقر نے اردو میں لفظ ”ظاہری“ کو صریح طور پر ذکر کیا ہے، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو التوضیح مع التلویح ص ۱۹ ج ۱، ودر المختار ص ۳۳ ج ۱، مع حاشیہ منخہ الخالق، و تسہیل الوصول ص ۳۳ ج ۱، ودر المختار مع الدر المختار ص ۳۳ ج ۱۔

ظاہری اعمال“ کے لفظ سے فقہ کو تصوف اور علم کلام سے ممتاز کرنا مقصود ہے، کیونکہ علم کلام میں عقائد کا بیان ہوتا ہے، اور تصوف میں باطنی اعمال کا، برخلاف فقہ کے کہ اس میں صرف ظاہری اعمال کے احکام بتائے جاتے ہیں، اس میں اگر کہیں عقائد یا باطنی اعمال کا ذکر آتا بھی ہے تو ضمناً آتا ہے، اصل مقصود ظاہری اعمال کا بیان ہوتا ہے۔

احکام شرعیہ کا علم | احکام“ حکم کی جمع ہے، اور ”شرعیہ“ شریعت کی طرف منسوب ہے، ”احکام شرعیہ“ ان احکام... کو کہا جاتا ہے جو شریعت کی طرف منسوب یعنی شریعت سے

اخوذ ہوں تفصیل اس کی یہ ہے کہ شریعت میں انسان کے سب کاموں کی کچھ صفات مقرر کر دی گئی ہیں جو کل ساٹھ ہیں، فرض، واجب، مندوب، (مستحب) مباح، حرام، مکروہ تحریمی، مکروہ تنزیہی، ان صفات کو ”احکام شرعیہ“ کہا جاتا ہے، انسان کے ہر کام کے لئے ان میں سے کوئی نہ کوئی حکم شرعی ضرور مقرر ہے، یعنی بندے کا ہر عمل شریعت کی رو سے یا فرض ہے یا واجب یا مندوب یا مباح، یا حرام یا مکروہ تحریمی یا مکروہ تنزیہی، پس ہر اچھے بُرے کام کے متعلق یہ جاننا کہ اس پر شریعت نے ان میں سے کونسا حکم لگایا ہے، یہ ”احکام شرعیہ کا علم“ ہے، مثلاً یہ جاننا کہ زکوٰۃ فرض ہے، سلام کا جواب دینا واجب، کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا مندوب (مستحب) ہے، ریل میں سفر کرنا مباح (جائز) ہے، چوری حرام ہے، بازار میں جب غلام اشیا ضرورت کی قلت ہو تو انکی ذخیرہ اندوزی مکروہ تحریمی ہے، کھڑے ہو کر پانی پینا مکروہ تنزیہی ہے، اسی طرح تمام اعمال کے متعلق ان کا الگ الگ شرعی حکم جاننا ”احکام شرعیہ کا علم“ ہے، احکام اگرچہ صرف ساٹھ ہیں، مگر انسان کے اعمال بے شمار ہیں، اور ہر عمل کے لئے ان ساٹھ میں ایک حکم مقرر ہے، اس لئے اعمال کی نسبت سے شریعت کے احکام بھی بے شمار ہو جاتے ہیں۔

تفصیلی دلائل | ”دلائل“ دلیل کی جمع ہے، یہاں احکام شرعیہ کی دلیلیں مراد ہیں، علم کبھی دلیل سے حاصل ہوتا ہے کبھی بغیر دلیل کے، احکام شرعیہ کا علم اگر دلائل کے بغیر ہو جیسے بہت سے لوگوں کو ہزار ہا شرعی احکام کا علم فقہاء سے سُن کر یا اُن کی کتابوں میں پڑھ کر حاصل ہو جاتا ہے۔ تو وہ فقہ نہیں، فقہ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ علم احکام شرعیہ کے تفصیلی دلائل سے حاصل کیا گیا ہو، عوام کو بلکہ بہت سے علماء کو بھی ”فقیہ“ اسی لئے نہیں کہتے کہ انھوں نے یہ علم ”احکام شرعیہ کے دلائل“ سے مستنبط نہیں کیا۔

”احکام شرعیہ کے دلائل“ صرف چار ہیں، قرآن، سنت، اجماع، قیاس، ہر عمل کا حکم

مباح وہ عمل ہی جس کے کرنے میں کوئی ثواب نہیں، اور ترک کرنے میں کوئی گناہ نہیں۔ (رفیع)

شرعی انہی چار میں سے کسی نہ کسی دلیل سے ثابت ہوتا ہے، یعنی انسان کے کسی بھی عمل کے متعلق یہ بات کہ وہ فرض ہے یا واجب یا مندوب یا مباح یا حرام یا مکروہ، ثابت کرنے کا ذریعہ یا تو قرآن حکیم ہے یا سنت نبویہ، یا اجماع یا قیاس، ان کے علاوہ حکم شرعی ثابت یا مستنبط کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں، ان چاروں دلائل کا تعارف آگے آئے گا۔

فقہ کی تعریف میں ”دلائل“ کی قید لگا کر یہ بتانا مقصود ہے کہ کسی فقیہ (مجتہد) کے علم و تقویٰ پر اعتماد کر کے اس کی تقلید کرنے والے عوام یا علماء کو جو احکام شرعیہ کا علم ہوتا ہے ان کے اس علم کو فقہ نہیں کہہ سکتے، کیونکہ انھوں نے یہ علم قرآن، سنت، اجماع یا قیاس سے خود مستنبط نہیں کیا، بلکہ جس امام مجتہد کی وہ تقلید کرتے ہیں اس کے بتانے سے حاصل ہوا ہے، حالانکہ فقہ شرعی احکام کے صرف اسی علم کو کہا جاتا ہے جو احکام شرعیہ کے دلائل سے حاصل کیا جائے۔

یہاں قارئین کرام کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہوگا کہ عوام کے حق میں تو یہ بات درست ہے، کیونکہ انھیں دلائل معلوم نہیں ہوتے، مگر علماء دین اگرچہ کسی امام مجتہد کی تقلید کرتے ہوں، مگر انھیں تو احکام شرعیہ کے دلائل بھی معلوم ہوتے ہیں، لہذا ان کو فقیہ اور ان کے علم کو فقہ کہنا چاہیے؟

جواب یہ ہے کہ احکام شرعیہ مع ان کے دلائل کے جاننا اور چہیز ہے، اور دلائل سے احکام شرعیہ کو معلوم کرنا یعنی مستنبط کرنا بالکل دوسری چیز، تقلید کرنے والے علماء کرام کو احکام شرعیہ کا علم دلائل کے ساتھ تو ہوتا ہے، مگر دلائل سے حاصل کیا ہوا نہیں ہوتا، یعنی احکام شرعیہ کا علم تو انھیں صرف امام مجتہد کے قول سے حاصل ہو جاتا ہے، پھر وہ تحقیق کرتے ہیں کہ ان کے امام نے یہ حکم کس دلیل شرعی سے حاصل کیا ہے؟ تو احکام کے بعد دلائل کا علم بھی حاصل کر لیتے ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ احکام شرعیہ کو خود انھوں نے قرآن و سنت یا اجماع و قیاس سے مستنبط کیا ہو، برخلاف مجتہد کے کہ وہ براہ راست ان چاروں دلائل سے احکام کو مستنبط اور معلوم کرتا ہے، یعنی وہ دلائل کو پہلے سمجھتا ہے اور پھر گہرے غور و خوض کے بعد یہ معلوم کرتا ہے کہ ان سے کیا شرعی احکام ثابت ہوئے، اور عالم مقلد پہلے احکام معلوم کرتا ہے پھر دلائل کی تحقیق کرتا ہے، لہذا عالم مقلد کو حقیقتہً فقیہ نہیں کہہ سکتے۔

اس تفصیل سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ فقیہ درحقیقت صرف مجتہد ہی کو کہہ سکتے ہیں، غیر مجتہد کو خواہ ہزار احکام شرعیہ مع ان کے دلائل کے معلوم ہوں تب بھی وہ فقیہ نہیں، یہ اور بات

ہے کہ عرف عام میں ایسے عالم مقلد کو بھی ”فقہ“ کہہ دیتے ہیں، مگر یہ کہنا مجازاً ہی حقیقت اور اصطلاحاً وہ فقہ نہیں۔^۱

تعریف میں ”دلائل“ کے ساتھ ”تفصیل“ کی قید بھی لگی ہوئی ہے، کیونکہ دلیل کی دو قسمیں ہیں اجمالی اور تفصیلی، ”دلیل اجمالی“ مبہم اور نامکمل دلیل کو کہتے ہیں، مثلاً ”نماز قائم کرنا فرض ہے“ یہ ایک حکم شرعی ہے، اس کی دلیل کے طور پر صرف اتنا معلوم کر لیا جائے کہ ”یہ حکم قرآن شریف سے ثابت ہے“

وہ آیت اور لفظ متعین نہ کیا جائے جس سے یہ حکم ثابت ہوا ہے، نہ یہ تحقیق کی جائے کہ اس لفظ کے معنی کیا ہیں، اور فرضیت اس سے کیونکر ثابت ہوتی، نہ یہ تحقیق کی جائے کہ فرضیت صلوٰۃ کے خلاف کوئی اور آیت یا حدیث مشہور تو موجود نہیں، ظاہر ہے کہ ایسی نامکمل اور مبہم دلیل سے کوئی حکم ثابت نہیں ہو سکتا، اور ایسی دلیل سے بالفرض کوئی علم حاصل ہو بھی تو اسے ”فقہ“ نہیں کہا جاسکتا۔ اور ”دلیل تفصیلی“ وہ ہے جس میں مذکورہ بالا تفصیل بدرجہ اتم موجود ہو، مثلاً فرضیت صلوٰۃ کی دلیل یوں بیان کی جائے کہ:

”قرآن حکیم کے ارشاد ”اقیموا الصلوٰۃ“ کے معنی ہیں ”نماز قائم کرو“ اس میں لوگوں سے نماز قائم کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے، اور جس کا مطالبہ قرآن حکیم میں کیا گیا ہو وہ فرض ہوتا ہے، بشرطیکہ وہ مطالبہ منسوخ نہ ہوا ہو، اور فرضیت کے منافی کوئی اور آیت یا حدیث مشہور موجود نہ ہو، اور اس ارشادِ قرآنی کا یہی حال ہے کہ نہ اس کے منسوخ ہونے کی کوئی دلیل ہے، نہ فرضیت صلوٰۃ کے منافی کوئی آیت پورے قرآن حکیم میں موجود ہے، نہ کوئی حدیث مشہور پورے ذخیرہ احادیث میں اس کے منافی موجود ہے، لہذا نماز قائم کرنا فرض ہے“

”دلائل“ کے ساتھ ”تفصیل“ کی قید لگا کر یہی بتانا مقصود ہے کہ ظاہری اعمال کے متعلق احکام شرعیہ کے صرف اسی علم کو ”فقہ“ کہا جائے گا جو احکام شرعیہ کے تفصیلی دلائل سے حاصل کیا جائے ”اجمالی دلائل“ سے اول تو علم حاصل ہوتا نہیں، اگر حاصل ہونا فرض کر لیا جائے تب بھی وہ فقہ نہیں۔

فقہ کی تعریف تو مختصر تھی، تشریح میں بہت سی دقیق بحثوں کو چھوڑنے اور اختصار کی حتی الامکان کوشش کے باوجود تشریح

تعریف تشریح کا حاصل

۱۔ رد المحتار، ص ۳۵ ج اول، نسخہ استنبول، والحوارائق، ص، ج اول۔

۲۔ تسہیل الوصول، ص، ۷۔

خاصی طویل ہو گئی ہے، مجبوری یہ تھی کہ فقہ کی تعریف کو ضروری حد تک سمجھنا اس کے بغیر ممکن نہ تھا، بہر حال اب فقہ کی تعریف و تشریح کا حاصل یہ نکل آیا کہ:

”بندے کے ظاہری اعضاء سے ہونے والے ہر کام کے متعلق قرآن، سنت، اجماع یا قیاس کے مفصل دلائل کے ذریعہ یہ جاننے کو فقہ کہا جاتا ہے، کہ وہ کام فرض ہے یا واجب یا مستحب یا حرام یا مکروہ (تحریمی یا تنزیہی)۔“

فقہ کا موضوع | کسی علم میں جس چیز کے حالات و صفات سے بحث کی جاتی ہے، وہی چیز اس علم کا موضوع ہوتی ہے، اور بحث کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان حالات و صفات کو موضوع کے لئے ثابت کیا جاتا ہے۔

علم طب میں بدنِ انسانی کے ان حالات سے بحث کی جاتی ہے جن کا تعلق اس کی صحت اور بیماری سے ہے، اس لحاظ سے علم طب کا موضوع انسانی بدن ہے۔

اسی طرح فقہ میں چونکہ انسان کے ظاہری افعال کی کچھ صفات (احکامِ شرعیہ) سے بحث کی جاتی ہے، لہذا فقہ کا موضوع انسان کے ظاہری افعال ہیں، یعنی انسان کے صرف ظاہری افعال کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کے شرعی احکام کیا ہیں۔

غرض فقہ کی جدید اصطلاحی تعریف کی رُو سے نہ عقائد فقہ کا موضوع ہیں نہ باطنی اعمال و اخلاق بلکہ عقائدِ علمِ کلام کا موضوع ہیں اور باطنی اعمال و اخلاق تصوف کا، فقہ کا موضوع انسان کے صرف ظاہری افعال ہیں۔

قدیم اصطلاحی فقہ کا موضوع | مگر ظاہر ہے کہ یہ سب تفصیل فقہ کی جدید اصطلاحی تعریف کی بنیاد پر ہے، جس میں عقائد اور تصوف کو فقہ سے الگ کر دیا گیا ہے، ورنہ جہاں تک قدیم اصطلاحی فقہ (پورے دین کی گہری بصیرت و مہارت) کا تعلق

لے رد المحتار، ص ۳۲، ۳۵، ۳۶ ج اول و بحر الرائق ص ۷ ج اول۔

لے یہاں انسان سے صرف عاقل بالغ مراد ہے، مجنون یا نابالغ پر چونکہ شرعی احکام کی ذمہ داریاں نہیں، لہذا ان کے اعمال فقہ کا موضوع نہیں، یعنی ان کے کسی فعل کو فرض، واجب یا حرام و مکروہ نہیں کہہ سکتے، اور فقہ میں جو مسائل مجنون یا نابالغ کے افعال سے متعلق ذکر کئے جاتے ہیں ان کا مقصد صرف یہ بتانا ہوتا ہے کہ ان افعال کی بناء پر اس کے ولی اور سرپرست کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔

ہے، اس میں نہ عقائد و اعمال کی تفریق ہے نہ ظاہر و باطن کی، عقائد ہوں یا اعمال، اعمال بھی ظاہر کے ہوں یا باطن کے، سب ہی میں شریعت کے احکام کو بجالانا دین ہے، اور ان سب کے شرعی احکام کو دلیل سے جاننا علم دین، اسی علم دین کو قرآن و سنت میں ”فقہ“ اور ”تفقہ فی الدین“ کا نام دیا گیا ہے، اور اس کا موضوع صرف ظاہری اعمال نہیں بلکہ عقائد اور تمام ظاہری و باطنی اعمال اس کا موضوع ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ جدید اصطلاحی فقہ پورا علم دین نہیں بلکہ علم دین کا ہتھائی حصہ ہے، اور یہ ہتھائی بھی عقائد اور تصوف کی مدد کے بغیر حاصل نہیں ہوتا، جیسا کہ اگلے مباحث سے معلوم ہوگا۔

تفقہ فی الدین فرض کفایہ ہے | پورا علم دین قدیم اصطلاحی فقہ ہے، جسے قرآن حکیم نے ”تفقہ فی الدین“ (پورے دین کی سمجھ بوجھ) کے لفظ سے تعبیر کیا

ہے، اور فرض کفایہ قرار دیا ہے، ارشاد ہے:

فَلَوْلَا نَفَسٌ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ

مَكَانَهُ لَيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ،

(توبہ: ۱۲۲)

”ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ مسلمانوں کی

ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت

رجہاد میں اجماع کرے، تاکہ باقی ماندہ لوگ

”دین کی سمجھ“ حاصل کرتے رہیں۔“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے لئے جس فقہ کی دعا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی کہ: **اللَّهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّينِ**،

”اے اللہ! کو دین کی سمجھ بوجھ عطا فرما“

وہ بھی یہی ”تفقہ فی الدین“ ہے، جس کی وسعت دین کی تینوں شاخوں عقائد، تصوف اور ”جدید اصطلاحی فقہ“ کو سمیٹے ہوئے ہے، دور تا بعین تک فقہ کا لفظ اسی وسیع مفہوم میں استعمال ہوتا تھا، بعد میں متاخرین نے محض درس و تدریس وغیرہ میں سہولت کے لئے دین کی ان تینوں شاخوں کو الگ الگ مرتب اور مدون کر کے ہر شاخ کا الگ الگ نام رکھ دیا، جس کے نتیجے میں ہر شاخ کی تعریف بھی الگ الگ کرنی پڑی، چنانچہ اس مضمون میں بھی آگے لفظ ”فقہ“ اسی دوہرے معنی میں استعمال ہوگا، جو متاخرین کی اصطلاح ہے۔

۱۵ تفسیر معارف القرآن، ص ۸۹، ج ۲۔

۱۶ صحیح بخاری، ص ۲۶، ج اول، باب وضع الماء عند الخلاء، کتاب الوضوء۔

تصوف کی حقیقت

تصوف بھی چونکہ دین کا ایسا ہی اہم شعبہ ہے جیسا فقہ، اور دونوں میں ربط اتنا گہرا ہے کہ فقہ پر عمل تصوف کے بغیر اور تصوف پر عمل فقہ کے بغیر ممکن نہیں، جیسا کہ آگے معلوم ہوگا، بلکہ جو فقہ قرآن و سنت کا مطلوب ہو وہ تو تصوف کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا، اس لئے یہاں تصوف کی حقیقت کا مختصر بیان بھی ضروری معلوم ہوتا ہے، اس کے بغیر درحقیقت فقہ کا تعارف بھی تشنہ ہی رہے گا۔

تصوف کے کئی نام ہیں؛ علم القلب، علم الاخلاق، احسان، سلوک اور طریقت، یہ سب ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں، قرآن و سنت میں اس کے لئے زیادہ تر ”احسان“ کا لفظ استعمال ہوا ہے، اور ہمارے زمانہ میں لفظ ”تصوف“ زیادہ مشہور ہو گیا ہے، بہر حال حقیقت ان سب کی ایک ہے، اور وہ یہ کہ ہمارے بہت سے افعال جس طرح ہمارے ظاہری اعضاء سے انجام پاتے ہیں، اسی طرح بہت سے اعمال ہمارا قلب انجام دیتا ہے جن کو ”اعمال باطنہ“ کہا جاتا ہے، جس طرح ہمارے ظاہری افعال شریعت کی نظر میں کچھ اچھے اور فرض و واجب ہیں، اور کچھ ناپسندیدہ اور حرام و مکروہ، اسی طرح باطنی اعمال قرآن و سنت کی نظر میں کچھ پسندیدہ اور فرض و واجب ہیں، جیسے تقویٰ، اللہ کی محبت، اخلاص، توکل، صبر و مشکر، تواضع، خشوع، قناعت، حلم، سخاوت، حیا، رحم دلی وغیرہ، ان باطنی پسندیدہ اخلاق کو ”فضائل“ اور ”اخلاق حمیدہ“ کہا جاتا ہے، اور کچھ باطنی اعمال برے اور حرام ہیں، جیسے تکبر، عجب، غرور، ریا، حُب مال، حُب جاہ، بخل، بزدلی، لالچ، دشمنی، حسد، کینہ، سنگدلی، اور بے محل یا حد سے زیادہ غصہ وغیرہ، ان کو ”ذائل“ یا ”اخلاق رذیلہ“ کہا جاتا ہے۔ ”فضائل“ اور ”ذائل“ دونوں کا تمام تر تعلق قلبی احوال اور نفس کی اندرونی کیفیتوں سے ہے مگر ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے یہی قلبی احوال اور اندرونی کیفیتیں درحقیقت ہمارے تمام ظاہری افعال کی بنیاد اور اساس ہیں، ظاہری اعضاء سے ہم اچھا یا بُرا جو کام بھی کرتے ہیں، درحقیقت وہ انہی باطنی ”فضائل یا رذائل“ کا نتیجہ ہوتا ہے۔

مثلاً تقویٰ (خوفِ خدا) اور اللہ کی محبت، یہ قلب کی اندرونی کیفیتیں ہیں، مگر ان کا اثر ہمارے تمام ظاہری اعمال پر پڑتا ہے، ہماری ہر عبادت، نماز روزہ وغیرہ انہی دو باطنی اخلاق کی پیداوار ہے، ہم نفسانی اور شیطانی تقاضوں کے باوجود اگر بد نظری، لطافتی جھگڑے اور جھوٹ

وغیرہ گناہوں سے اجتناب کرتے ہیں، تو اس اجتناب کا اصل محرک بھی یہی تقویٰ اور اللہ کی محبت ہے۔ اسی طرح ظاہری اعضاء سے ہم جو گناہ بھی کرتے ہیں اس کا سبب بھی کوئی نہ کوئی باطنی خصلت ہوتی ہے، مثلاً مال کی محبت یا جاہ پسندی یا عداوت یا حسد یا غصہ یا آرام طلبی یا تکبر وغیرہ۔ تمام ظاہری اعمال کا حسن و قبح اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اُن کا مقبول یا مردود ہونا بھی ہمارے باطنی اخلاق پر موقوف ہے، مثلاً اخلاص و ریاء یہ قلب ہی کے متضاد اعمال ہیں، مگر ہمارے تمام ظاہری اعمال کا حسن و قبح ان سے وابستہ ہی، کوئی بھی عبادت نماز، حج وغیرہ جو محض ریاء کے طور پر دنیا کی شہرت حاصل کرنے کے لئے کی جائے عبادت نہیں رہتی، اور تجارت و مزدوری جو اپنی اصل کے اعتبار سے دنیا داری کا کام ہے مگر حکیم خداوندی کی تعمیل میں اللہ کی رضا کی نیت سے کی جائے تو یہی تجارت و مزدوری باعث اجر و ثواب اور عبادت بن جاتی ہے، یہ ریاء اور اخلاص ہی کا اثر ہے جس نے عبادت کو دنیا داری اور دنیا داری کو اللہ کی عبادت بنا دیا ہے، یہی مطلب ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا کہ:-

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، | تمام اعمال کا ثواب نیتوں پر موقوف ہے۔
تقریباً یہی حال تمام باطنی فضائل و رذائل کا ہے کہ ہمارے ظاہری اعمال کے حسن و قبح، رد و قبول اور اجر و ثواب، بلکہ بہت سے اعمال کا وجود بھی انہی کارہین منت ہے، یہی وہ حقیقت ہے جس کی نشان دہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد میں فرمائی ہے کہ:-

اَلَا اِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً، اِذَا	ہو شیار ہو کہ بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا
صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، وَاِذَا	ایسا ہو کہ جب وہ درست ہو تو سارا بدن درست
فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، اَلَا	ہو تلہے، اور وہ خراب ہو تو سارا بدن خراب
وَهِيَ الْقَلْبُ،	ہو جاتا ہی، ہو شیار ہو کہ وہ دل ہے۔

اسی لئے تمام علماء و فقہاء کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ ”رذائل“ سے بچنا اور ”فضائل“ کو حاصل کرنا ہر عاقل بالغ پر فرض ہے، یہی فریضہ ہے جس کو اصلاح نفس، یا تزکیہ نفس اور تزکیہ اخلاق یا

۱۔ یہ مشکوٰۃ شریف کی سب سے پہلی حدیث ہے۔

۲۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان ”باب من استبرأ لدينه“ صحیح مسلم باب اخذ الحلال وترك الشبهات،

۳۔ رد المحتار مع الدر المختار، ص ۴۴ ج اول،

ہندیب اخلاق" کہا جاتا ہے، اور یہی تصوف کا حاصل و مقصود ہے۔

دل کی پاک، روح کی صفائی اور نفس کی طہارت ہر مذہب کی جان اور نبوتوں کا مقصود رہا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے جو چار مقاصد شرآن حکیم میں بتائے گئے اُن میں دوسرا یہ ہے کہ:

وَيُزَكِّهِمْ،

(بقرة، آل عمران، جمعہ)

”آپ مسلمانوں کے اخلاق و اعمال کا تزکیہ فرماتے ہیں“

قرآن نے ہر انسان کی کامیابی و نامرادی کا مدار بھی اسی تزکیہ نفس پر رکھا ہے:

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهُ وَقَدْ خَابَ

مَنْ دَسَّاهُ

(الشمس: ۱۰، ۹)

”یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے نفس کو پاک

کر لیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اسے (رذائل

میں) دھنسا دیا“

اور بتایا کہ گناہ ظاہری اعضاء ہی سے نہیں ہوتے، بلکہ باطن کے بھی گناہ ہیں، دونوں سے بچنا فرض عین ہے، اور ہر گناہ موجب عذاب خواہ ظاہر کا ہو یا باطن کا، ارشادِ ربانی ہے:-

وَذُرُوا ظَاهِرَ الْأَيْمَنِ وَبَاطِنَهُ

إِنَّ الَّذِينَ يَكْسِبُونَ الْأَيْمَنَ

سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوا يَعْتَرِفُونَ

(النعام: ۱۲۰)

”تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑ دو اور باطنی گناہ

کو بھی، بلاشبہ جو لوگ گناہ (ظاہر کا یا باطن کا)

کر رہے ہیں اُن کو اُن کے کئے کی سزا عنقریب

ملے گی“

باطنی گناہ قلب کے وہی گناہ ہیں جن کے متعلق پیچھے عرض کیا گیا ہے کہ وہ ہمارے تمام ظاہری گناہوں کا منبع ہیں، ہمارے ہر گناہ کا سونٹا وہیں سے پھوٹتا ہے، تصوف کی اصطلاح میں انہی کو ”رذائل یا اخلاقِ رذیلہ“ کہا جاتا ہے، ان کے بالمقابل دل کی نیکیاں اور عبادتیں ہیں جو ہماری تمام ظاہری عبادتوں اور نیکیوں کا سرچشمہ ہیں، ہر عبادت اور ہر نیکی انہی کی مرہون منت ہے، قلب کے ان نیک اعمال کو تصوف کی اصطلاح میں ”فضائل یا اخلاقِ حمیدہ“ کہا جاتا ہے۔

جس طرح اچھے بُرے ظاہری اعمال کی ایک طویل فہرست ہی جن کے شرعی احکام فقہ میں بتائے جلتے ہیں، اسی طرح باطنی اعمال یعنی ”رذائل اور فضائل“ کی تعداد بھی بہت ہے جو تصوف کا موضوع

۱۔ تصوف کے مشہور امام حضرت عبدالقادر سہروردیؒ نے اپنی کتاب ”عوارف المعارف“ میں تصوف کی جو حقیقت تفصیل سے بیان فرمائی ہے اس کا خلاصہ یہی ہے، دیکھئے ”عوارف المعارف“ ص ۲۹۰ ج اول برجیہ احیاء العلوم للفرالیؒ۔

ہیں، یہاں چند فضائل اور چند زائل بطور مثال ذکر کئے جاتے ہیں، جن سے اندازہ ہوگا کہ قرآن و سنت نے فضائل کی تاکید اور زائل کی ممانعت کتنے شد و مد سے کی ہے، اور یہ تاکید کسی طرح اس تاکید سے کم نہیں جو ظاہری اعمال کی اصلاح کے لئے قرآن و سنت میں کی گئی ہے۔

فضائل | ایک باطنی عمل تقویٰ ہی، و سترآن حکیم نے اپنی دوسری ہی سورۃ میں اعلان کیا ہے کہ اس کی تعلیم سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جو تقویٰ والے ہیں، ارشاد ہے:

هُدًى يَلْتَمِثِينَ،

یہ کتاب (قرآن) تقویٰ والوں کو راہ دکھاتی

ہے

(بقرہ: ۲)

تقویٰ والوں کے لئے آخرت کی لازوال نعمتوں کی جگہ جگہ بشارت ہے، مثلاً:

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُنٍ،

”بے شک تقویٰ والے باغوں میں اور نعمت

میں ہوں گے“

(طور: ۱۰)

سترآن نے جا بجا تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، اور اس کے حاصل کرنے کا طریقہ بھی بتا دیا کہ سچے لوگوں کی معیت و صحبت اختیار کرو:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ
وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ۔

”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور سچے لوگوں
کے ساتھ یعنی ایسے لوگوں کے ساتھ رہو جو
اور بات میں سچے ہیں“

(توبہ: ۱۱۹)

اللہ کے نزدیک ہر عزت و برتری کا معیار بھی یہی تقویٰ ہے، ارشاد ہے:-

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ

”اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا
وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ والا ہو“

(حجرات: ۱۳)

یہ چند آیات محض بطور نمونہ ہیں، سب آیات جمع کی جائیں تو کئی ورق درکار ہوں گے۔

اسی طرح اخلاص“ دل کا عمل ہے، و سترآن حکیم نے اس کی تاکید میں بھی کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ:-

قَاعِبِدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ ۝

”سو آپ اللہ کی عبادت کیجئے، اسی کے لئے
عبادت کو خالص کرتے ہوئے“

(زم: ۱۱)

قُلْ إِنِّي أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ

”آپ کہہ دیجئے کہ مجھ کو حکم ہوا ہے کہ میں اللہ
کی اس طرح عبادت کروں کہ عبادت کو

مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ،

<p>اسی کے لئے خالص رکھوں۔</p>	<p>رہنا، ۱۱) قرآن پاک میں سات جگہ یہ ارشاد ہے:-</p>
<p>اطاعت گزاری کو اللہ کے لئے خالص کرتے ہوئے</p>	<p>مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ،</p>
<p>اسی طرح توکل جو نفس کا اندرونی عمل ہے اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا اور ساتھ ہی بشارت سنائی گئی کہ:-</p>	<p>فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ۝ (آل عمران: ۱۵۹)</p>
<p>”تو آپ اللہ پر بھروسہ کریں، بے شک اللہ تم کوکل کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے“</p>	<p>سب مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ:-</p>
<p>پس مسلمان تو اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ رکھیں</p>	<p>عَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝ (آل عمران: ۱۲۲)</p>
<p>قرآن پاک نے بتایا کہ پچھلے انبیاء کرام علیہم السلام بھی اپنی امتوں کو توکل کی تعلیم دیتے رہے، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے خطاب فرمایا کہ:-</p>	<p>يَقُولُ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ (آل عمران: ۳۲)</p>
<p>”اے میری قوم! اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اسی پر توکل کرو، اگر تم (اس کی) اطاعت کرنے والے ہو“</p>	<p>اللہ تعالیٰ نے اپنے اس اصول کا اعلان عام فرمادیا ہے کہ:-</p>
<p>جو شخص اللہ پر توکل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے کافی ہے</p>	<p>مَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ۚ (طلاق: ۳)</p>
<p>ابھی طرح ”صبر“ باطنی فضائل میں سے ہے، جس کے معنی ہیں ”طبیعت کے خلاف باتیں پیش آنے پر نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا، اور ثابت قدم رکھنا“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیات طیبہ اس صبر کا جیتا جاگتا نمونہ ہے، قرآن حکیم میں آپ کو ہدایت کی گئی کہ:-</p>	<p>فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ ۚ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ أَخْرَجْنَاكَ مِنَ الْبَلَدِ لَمْ يَفْقَهُوا سَبَبَ الْبَرْءِ مِنْكَ لَبَدَّلْنَا بَكَ الْهَلَكَ ۚ (احقاف: ۳۵)</p>
<p>”تو آپ (ویسا ہی) صبر کیجیے جیسا ہمت والے رسولوں نے صبر کیا تھا“</p>	<p>مسلمانوں کو بتایا گیا کہ:-</p>

<p>صبر کر دو تو یہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہت ہی اچھا ہے</p>	<p>وَلَيِّنْ صَبْرُكُمْ لَكُمْ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ ۝ (نحل: ۱۲۶) اور حکم کے ساتھ بشارت دی گئی کہ:-</p>
<p>”اور صبر کرو بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے“</p>	<p>وَاصْبِرْ وَاطِئِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝ (انفال: ۴۶)</p>
<p>”کیا تم خیال کرتے ہو کہ جنت میں داخل ہو گے؟ حالانکہ ابھی اللہ تعالیٰ نے تم میں ان لوگوں کو (آزمائے) نہیں دیکھا، جنہوں نے خوب جہاد کیا ہو اور جو صبر کرنے والے ہوں“</p>	<p>جنت کی نعمت عظمیٰ بھی صبر کرنے والوں ہی کا حصہ ہے، ارشاد ہے:- اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمْ يَلْعَلِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمُ الصَّابِرِينَ ۝ (ال عمران: ۱۴۲)</p>
<p>یہ صرف چار فضائل کے متعلق آیات قرآنیہ کی چند مثالیں ہیں، تمام آیات و احادیث جسیع کی جائیں تو ضخیم کتاب تیار ہو جائے، ان مثالوں سے بتانا یہ مقصود ہے کہ شرعی فرائض صرف ظاہری اعمال میں منحصر نہیں، فضائل کا حاصل کرنا بھی نماز روزہ وغیرہ کی طرح فرض ہے، بلکہ خود نماز روزہ وغیرہ بھی ان کے بغیر مکمل نہیں ہوتے۔</p>	
<p>رذائل وہ ناپاک باطنی اخلاق و اعمال ہیں جن کو شرآن و سنت میں حرام و شرار دیا گیا ہے، ان کی بھی یہاں فہرست دینا نہ ممکن ہے نہ مقصود، چند مثالیں یہ ہیں: تکبر کے بارے میں شرآن حکیم نے صاف الفاظ میں اعلان کیا ہے کہ:- اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُتَكَبِّرِينَ ۝ بے شک اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ اور جسے اللہ پسند نہ کرے اس کا ٹھکانا جہنم کے سوا کہاں ہو گا؟ چنانچہ ارشاد ہے: اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ؟ ”کیا ان متکبرین کا ٹھکانا جہنم میں نہیں ہے؟“ (زمر: ۶۰)</p>	<p>رذائل</p>
<p>شافع محشر رحمۃ اللہ علیہ وسلم نے بھی صاف صاف بتا دیا کہ:- جس شخص کے دل میں ذرہ برابر تکبر ہو وہ جنت میں داخل نہیں ہو گا۔</p>	<p>لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبَرٍ ۝</p>
<p>۱۔ مسلم شریف، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر و بیانہ ص ۶۵ ج ۱۔</p>	

ریا، ایسا خطرناک باطنی رذیلہ ہے کہ وہ انسان کی بہتر سے بہتر عبادت کو تباہ کرتا بلکہ اللہ عذاب میں گرفتار کر کے چھوڑتا ہے، وقرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ:

”بڑا عذاب ہے ایسے نمازیوں کے لئے جو اپنی نماز کو بھلا بیٹھے ہیں، جو ریا کاری کرتے ہیں“

قَوْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ۚ الَّذِي يَنْهَىٰ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۚ الَّذِينَ هُمْ يُرَآءُونَ ۚ (ماعون،)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ریا کو ”چھوٹی قسم کا شرک“ قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ :-

”تھوڑے متعلق جن چیزوں کا مجھے طہرہ ہے ان میں سب سے زیادہ خوفناک ”چھوٹا شرک“ کیا ہے، صحابہؓ نے دریافت کیا ”چھوٹا شرک“ کیا ہے یا رسول اللہ؟ آپؐ نے فرمایا، ریا، قیامت کے دن جب اللہ عزوجل اپنے بندوں کو ان کے کاموں کا ثواب عطا فرمائے گا تو دکھاؤ گے لئے کام کرنا والوں کے فرمائے گا کہ جاؤ ان لوگوں کے پاس جاؤ جنہیں دکھانے کے لئے تم دنیا میں کام کرتے تھے، اور دیکھو ان سے نہیں اب ملتا ہی یا نہیں؟“

اِنَّ اخوف ما اخاف عليكم الشرك الاصغر، قالوا: وما الشرك الاصغر يا رسول الله! قال الرياء يقول الله عز وجل يوم القيامة اذا جازى العباد باعمالهم، اذهبوا الى الذين كنتم تراءون في الدنيا، فانظروا هل تجدون عندهم الجزاء (مسند احمد، طبرانی، بیہقی، شعب الایمان)

حسد؛ وہ باطنی بیماری ہے کہ اس کا بیمار دنیا میں تو چین پاتا ہی نہیں، اس کی آخرت بھی برباد ہو کر رہتی ہے، قرآن پاک کے بیان کردہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب سے پہلا گناہ ہے جو آسمان میں کیا گیا، اور سب سے پہلا گناہ ہے جو زمین پر کیا گیا، کیونکہ آسمان پر ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام سے حسد کیا، اور زمین پر سب سے پہلا قتل جو قابیل نے ہابیل کا کیا تھا وہ بھی اسی حسد کا شاخسانہ تھا۔

۱۵ حافظ زین الدین عراقیؒ نے شرح احیاء العلوم میں کہا ہے کہ اس حدیث کے سب راوی ثقہ ہیں، دیکھئے احیاء العلوم مع شرح، ص ۲۵۴، ج ۳۔

۱۶ احیاء العلوم، ص ۳ و تفسیر معارف القرآن، ص ۸۲۵ ج ۸ بحوالہ تفسیر سترپی۔

حاسد کا شر اتنا خطرناک ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تلقین کی گئی کہ آپ اس کے شر سے پناہ مانگیں:-

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ ۝
(الفلق: ۵)

اور (آپ کہتے ہیں کہ میں پناہ مانگتا ہوں) حسد کرنے والے کے شر سے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی کہ:-

إِيَّاكُمْ وَالْحَسَدَ، فَإِنَّ الْحَسَدَ
يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا يَأْكُلُ
النَّارُ الْخَطْبَ،

تم حسد سے بچو، اس لئے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا... (برباد کر دیتا) ہو جس طرح آگ لکڑی کو کھاتی ہے

اسی طرح بخل باطن کی وہ روزیل خصلت ہے جو انسان کو ہر مالی ایثار و قربانی سے روکتی ہے، اس باطنی بیماری کا ذکر قرآن حکیم نے ان خصلتوں کے ساتھ کیا ہے جو کافروں کا خاصہ ہیں، ارشاد ہے:-

وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنَى ۝
وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَى ۝ فَسَلِيسُهُ
لِلْعُسْرَى ۝ وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ
إِذَا تَرَدَّى ۝
(اللیل: ۸ تا ۱۱)

اور جس نے بخل کیا، اور بے پردائی اختیار کی اور اچھی بات کو جھٹلایا، ہم اس کو رفتہ رفتہ سختی میں پہنچا دیں گے، اور اس کا مال اس کے کچھ کام نہ آئے گا، جب وہ (جہنم) کے گڑھے میں گرے گا

جس شخص کا بخل اس حد تک پہنچ گیا ہو کہ شریعت نے جو مالی واجبات اس کے ذمہ کئے ہیں ان کی ادائیگی سے بھی محروم ہو جائے، اس کیلئے قرآن حکیم میں سخت عذاب کی خبر دی گئی ہے:-

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخُلُونَ
بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ
هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۖ
سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ
الْقِيَمَةِ ط

جو لوگ ایسی چیز میں بخل کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے دی ہو وہ ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ یہ بات ان کے لئے کچھ اچھی ہوگی، بلکہ یہ بات ان کے لئے بہت ہی بُری ہے، اُن لوگوں کو قیامت

۱۔ ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی الحسد، ص ۶۷ ج ۲، صحیح المطالع۔

کے دن اس مال کا (سانپ بنا کر) طوق پہنایا جائے گا، جس میں انھوں نے بخل کیا تھا“
 بخل کا بیمار دوسروں کے ساتھ نہیں بلکہ درحقیقت وہ خود اپنے ساتھ بخل کرتا ہے، وہ
 اس کی بدولت اس دنیا میں اپنے آپ کو ہر دسزیزی اور نیک نامی بلکہ جائز آرام و راحت
 تک سے، اور آخرت میں ثواب کی نعمت سے محروم رکھتا ہے، قرآن حکیم نے اسی حقیقت کی
 طرف توجہ دلائی ہے کہ:

فَمِنْكُمْ مَّنْ يَبْخُلُ ۖ وَمَنْ يَبْخُلْ
 فَإِنَّمَا يَبْخُلْ عَن نَّفْسِهِ ۚ
 (محمد: ۳۸)

”پس تم میں سے بعض وہ ہیں جو بخل
 کرتے ہیں، اور جو بخل کرتا ہے وہ اپنی آپ
 ہی سے بخل کرتا ہے“

بخل ہی کے بدترین درجہ کا نام ”شُحّ“ ہے، قرآن پاک نے بتایا کہ فلاح و کامیابی
 اپنی لوگوں کا مقدر ہے جو شُحّ سے محفوظ ہوں، :-

وَمَنْ يُؤْتِ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ
 هُمُ الْمُفْلِكُونَ ۚ
 (حشر: ۹)

”اور جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے
 محفوظ رکھا جائے تو وہی لوگ فلاح
 پانے والے ہیں“

تصوّف اور علم تصوّف
 کی اصطلاحی تعریف

غرض ”فضائل“ اور ”ذائل“ کی ایک طویل فہرست ہے، تمام
 باطنی خصلتوں کا الگ الگ بیان، ہر ایک کی حقیقت و
 ماہیت، اس کے اسباب و علامات، فضائل حاصل
 کرنے کے طریقے اور ذائل سے چھٹکارا پانے کی تدابیر، یہ تفصیلات تو تصوّف کی کتابوں اور
 صوفیاء کرام کی مجلسوں میں ملیں گی، یہاں ان مثالوں سے صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ
 جس طرح ظاہر کے کچھ اعمال فرض عین اور کچھ حرام ہیں اسی طرح باطن کے اعمال میں بھی کچھ
 فرض عین ہیں، اور کچھ حرام، اور ان باطنی فرائض پر عمل کرنا اور باطن کی حرام خصلتوں سے
 اجتناب کرنا ہی تصوّف ہے، چنانچہ علم تصوّف کی اصطلاحی تعریف جو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ

۱۔ مثلاً امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی ”احیاء العلوم جلد ثالث“ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صا
 تھانویؒ کی ”التشرّف“ اور ”تعلیم الدین“ اور ”روح تصوّف“ و ”قصیدہ سبیل“ وغیرہ۔
 ۲۔ دیکھئے احیاء العلوم، ص ۱۹، ج اول (مطبوعہ مصر)۔

نے تفصیل سے بیان کی ہے، اس کا جامع مانع خلاصہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ لکھا ہے کہ:-

هُوَ عِلْمٌ يُعْرِفُ بِهِ النَّوَاعِ الْفَضَائِلَ وَكَيْفِيَّةُ اكْتِسَابِهَا، وَالنَّوَاعِ الزَّادَاتِ وَكَيْفِيَّةُ الْجِتْنَابِهَا،	تصوّف وہ علم ہے جس سے اخلاق حمیدہ کی قسمیں اور ان کو حاصل کرنے کا طریقہ اور اخلاقِ رذیلہ کی قسمیں اور ان سے بچنے کا طریقہ معلوم ہوتا ہے ۛ
---	--

فقہ کی طرح علم تصوّف کا بھی ایک حصہ جس طرح ہر مرد و عورت پر اپنے اپنے حالات و مشاغل کی حد تک اُن کے فقہی مسائل جانتا فرض ہے اور پورے

فقہ کے مسائل میں بصیرت و مہارت پیدا کرنا اور مفتی بننا سب پر فرض نہیں بلکہ فرض کفایہ ہے، اسی طرح جو اخلاق حمیدہ کسی میں موجود نہیں انھیں حاصل کرنا اور جو رذائل اس کے نفس میں چھپے ہوئے ہیں ان سے بچنا تصوّف کے جتنے علم پر موقوف ہے اس کا علم حاصل کرنا فرض عین ہے اور پورے علم تصوّف میں بصیرت و مہارت پیدا کرنا کہ دوسروں کی تربیت بھی کر سکے، یہ فرض کفایہ ہے۔

۱۵ رد المحتار مع الدر المختار، ص ۴۰ ج اول -

۱۶ فرض کی دو قسمیں ہیں؛ فرض عین اور فرض کفایہ، فرض عین اُس فرض کو کہا جاتا ہے جس کا ادا کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر ضروری ہے، بعض مسلمانوں کے کر لینے سے باقی مسلمان سبکدوش نہیں ہوتے جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ، اور فرض کفایہ وہ فرض ہے جو بعض لوگوں کے بقدر ضرورت ادا کرنے سے باقی مسلمانوں کے ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے، جیسے مسلمان میت کے کفن و دفن کا انتظام، نماز جنازہ اور جہاد وغیرہ، پورے فقہ اور پورے علم تصوّف میں بصیرت و مہارت پیدا کرنا بھی فرض کفایہ ہے کہ اگر کسی بستی میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ ہو جو وہاں کے مسلمانوں کو پیش آنے والے شرعی مسائل بتا سکے اور اُن کے تزکیہ اخلاق کا کام بقدر ضرورت کر سکے تو اس بستی کے باقی مسلمانوں کے ذمہ سے یہ فرض ساقط ہو جاتا ہے، اور اگر اس شہر میں ایک شخص بھی ایسا موجود نہ ہو تو وہاں کے لوگوں پر فرض ہے کہ ایسا عالم اپنے یہاں تیار کریں یا کہیں اور سے بلا کر رکھیں ورنہ سب اہل شہر گنہگار ہوں گے (تفسیر معارف القرآن؛ ص ۲۸۷ تا ۲۹۰ ج ۲)۔

۱۷ رد المحتار مع الدر المختار، ص ۴۰ ج اول، و تفسیر معارف القرآن سورۃ توبہ آیت ۱۲۲ ص ۲۹۰ ج ۲۔

صوفی و مرشد

جس طرح فقہ کے ماہر کو ”فقیہ“، مفتی“ اور ”مجتہد“ کہتے ہیں اسی طرح تصوف و سلوک کے ماہر کو ”صوفی“، ”شیخ“، ”مرشد“ اور عام زبان میں ”پیر“

کہا جاتا ہے، جس طرح قرآن و سنت سے فقہی مسائل و احکام نکالنا اور حسب حال شرعی حکم معلوم کرنا ہر ایک کے بس کا کام نہیں، بلکہ رہنمائی کیلئے ”استاذ“ یا ”فقیہ اور مفتی“ کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے اسی طرح باطنی اخلاق کو قرآن و سنت کے مطابق ڈھالنا ایک نازک اور ذریعہ مشکل کام ہے، جس میں بسا اوقات مجاہدوں، ریاضتوں اور طرح طرح کے نفسیاتی علاجوں کی ضرورت پیش آتی ہے، اور کسی ماہر کی رہنمائی کے بغیر چارہ کار نہیں ہوتا، اس نفسیاتی علاج اور رہنمائی کا فریضہ شیخ و مرشد انجام دیتا ہے۔

اسی لئے ہر عاقل و بالغ مرد و عورت کو اپنے تزکیۂ اخلاق کے لئے ایسے شیخ و مرشد کا انتخاب کرنا پڑتا ہے جو قرآن و سنت کا متبع ہو، اور باطنی اخلاق کی تربیت کسی مستند شیخ کی صحبت میں رہ کر حاصل کر چکا ہو۔

بیعت سنت ہی فرض واجب نہیں | بیعت کی حقیقت یہ ہے کہ وہ مرشد اور اس کے شاگرد (مرید) کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے، مرشد یہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ اس کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق زندگی گزارنا سکھائے گا، اور مرید

وعدہ کرتا ہے کہ مرشد جو بتلائے گا اس پر عمل ضرور کرے گا، یہ بیعت فرض و واجب تو نہیں، اس کے بغیر بھی مرشد کی رہنمائی میں اصلاح نفس کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے، لیکن بیعت چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سنت ہی اور معاہدہ کی وجہ سے فریقین کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس بھی قوی رہتا ہے، اس لئے بیعت سے اس مقصد کے حصول میں بہت برکت اور آسانی ہو جاتی ہے۔

کشف کرامات مقصود نہیں | جب اصلاح نفس کا مقصد ضروری حد تک حاصل ہو جاتا ہے، یعنی اپنے ظاہری اور باطنی اعمال

قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت

لے شیخ میں کن شرائط کا پایا جانا ضروری ہو اس کے لئے ملاحظہ فرمائیے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا رسالہ ”قصد السبیل“ ہدایت سوم ص ۵۔

کی پیروی زندگی کے ہر گوشہ میں ہونے لگتی ہے، تو ایسے بعض لوگوں پر بعض حالات میں کشف والہام اور کرامات کا ظہور بھی ہو جاتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کا انعام ہوتا ہے، جیسا کہ متعدد صحابہ کرامؓ اور اولیاء اللہ کے واقعات معروف ہیں، مگر یہ کشف و کرامات نہ فقہ کا مقصود ہیں نہ تصوف کا، نہ ان پر دین کا کمال موقوف ہے نہ علم دین کا بلکہ بعض پوشیدہ یا آئندہ پیش آنے والی باتیں معلوم ہو جانا یا عجیب و غریب واقعات کا پیش آ جانا تو کمال دین کی دلیل بھی نہیں، کیونکہ اس قسم کی چیزیں تو مشق کرنے سے بعض اوقات ایسے لوگوں کو بھی پیش آ جاتی ہیں جو دین کے پابند نہ ہوں، مسمریم اور جادو کرنے والوں کی شعبدہ بازیاں بھی دیکھنے میں تو عجیب و غریب ہی ہوتی ہیں، مگر ان کے لئے مسلمان ہونا بھی شرط نہیں، خلاصہ یہ کہ کشف و کرامات شعبدہ بازی نہیں ہوتی، بلکہ محض اللہ جل شانہ کا عطیہ ہے جو وہ اپنے کسی نیک بندے کو بعض حالات میں دیدیتا ہے، مگر یہ تصوف کا مقصود نہیں اور دین کا کوئی کمال اس پر موقوف نہیں۔

مقصود صرف اتباع شریعت
اور اللہ کی رضا ہے

دین کا کمال تو اپنے ظاہر و باطن میں شریعت پر ٹھیک ٹھیک عمل کرنے میں ہے، اسی سے اللہ کی رضا حاصل ہوتی ہے، اور یہی فقہ اور تصوف کا

حاصل و مقصود ہے، یہ مقصود نہ فقہ پر عمل کے بغیر حاصل ہو سکتا ہے نہ تصوف کے بغیر، تصوف کا مقصود نہ بیعت ہے نہ ریاضتیں اور مجاہدے ہیں، اور نہ کشف و کرامات، بیعت اور مجاہدے مقصود حاصل کرنے کے ذرائع ہیں، اور کشف و کرامات مقصود حاصل ہو جانے کے بعد اللہ کی طرف سے ایک قسم کا مزید انعام ہیں، کسی کو یہ انعام ملتا ہے، کسی کو کسی اور انعام سے نوازا دیا جاتا ہے، بالعرض جسے مجاہدوں اور ریاضتوں کے بغیر ہی اپنے ظاہر و باطن کی اصلاح نصیب ہو جائے اور زندگی بھر ایک بار بھی سچا خواب نظر نہ آئے، نہ کسی کشف و کرامت کا ظہور ہو اس کے بھی ولی اللہ اور مؤمن کامل ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں، اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جس سے کشف و کرامت کا ظہور ہوتا ہو وہ اس کے مقابلہ میں زیادہ کامل و افضل ہو، مدار کمال و فضیلت تو صرف اور صرف تقویٰ پر ہے، جس میں زیادہ تقویٰ ہے وہی زیادہ افضل اور اللہ عز و جل کا زیادہ مقرب ہے، قرآن مجید کا فیصلہ ہے کہ :-

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ

(حجرات: ۱۳)

اللہ کے نزدیک تم سب میں بڑا شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔

تصوف کی حقیقت جو ان صفحات میں بیان کی گئی، تصوف کی تمام مستند کتابیں اسی اجمال کی تفصیل ہیں، تمام فقہاء اور صوفیاء کرام اس کی تعلیم و تربیت کرتے رہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیات طیبہ اسی تصوف اور اسی فقہ پر عمل کا کامل نمونہ ہے، اور یہی ایمان کے بعد قرآن و سنت کی تعلیمات کا حاصل ہے۔

اس سلسلہ میں شرط و تفریط اور گمراہیاں

فقہ اور تصوف کی جو حقیقت پچھلے صفحات میں بیان ہوئی اور انہیں جو گہرا ربط قرآن و سنت کی روشنی میں بیان کیا گیا یہ اتنا صاف اور واضح ہے کہ اُمت کے تمام مفسرین و محدثین اور تمام صوفیاء و عارفین کا اس پر اجماع و اتفاق چلا آ رہا ہے، جس نے قرآن و سنت یا فقہ و تصوف کا مطالعہ کیا ہو اس کے لئے اس میں کسی شبہ یا تردد کی گنجائش نہیں۔

مگر نہ جانے کیوں فقہ اور تصوف کے سلسلہ میں مسلمانوں کا خاصا بڑا طبقہ افراط و تفریط بلکہ طرح طرح کی گمراہیوں کا شکار ہو گیا، ان لوگوں نے فقہ اور تصوف کو سمجھے بغیر ان کے بارے میں عجیب و غریب مزعومات قائم کر لئے، جنہیں صرف فقہ کی کتابیں ہاتھ لگیں، مگر نہ علماء اصحاء کی تعلیم و تربیت ملی، نہ تصوف کی مستند کتابوں تک رسائی ہوئی، بلکہ جاہل مدعیان تصوف کی خود ساختہ غلط روش دیکھ کر اس کو تصوف سمجھ بیٹھے، انہوں نے دین اور احکام دین کو صرف فقہ میں منحصر جان کر سرے سے تصوف ہی سے بیزاری اختیار کر لی، اور تصوف کو دین سے خارج بلکہ الحاد و زندقہ قرار دے لیا یہ ایک شدید گمراہی ہے جو خالص بڑے طبقہ میں پائی جاتی ہے۔

ایک اور گمراہی اس سے کم درجہ کی مگر اس لحاظ سے نہایت تشویشناک ہے کہ وہ علم دین کے بعض طلبہ بلکہ بعض نام نہاد اہل علم میں بھی پائی جاتی ہے کہ انہوں نے تصوف کو دین سے خارج تو نہیں سمجھا، مگر نہ جانے کیوں یہ خیال کر بیٹھے کہ اس کا حاصل کرنا محض مباح یا مستحب ہی شرعاً فرض و واجب نہیں، اصلاح باطن بھی ہو گئی تو جنت میں درجات بڑھ جائیں گے، نہ ہوئی تو جنت میں جانے کے لئے ظاہری اعمال کافی ہیں۔

دوسری طرف جاہل مدعیان تصوف کی گرم بازاری ہے، جنہوں نے تصوف و طریقت کی اہمیت کو تو تسلیم کیا مگر اس کی حقیقت کو گم گم کر ڈالا، کسی نے کہا ”طریقت اور ہے شریعت اور،

فلاں بات اگرچہ شرع میں ناجائز ہے مگر فقیری میں جائز ہے، ان لوگوں نے تصوف کو ”رازِ سنہ“ قرار دے کر اس میں گھڑت ”راز“ کی بنیاد پر دین کے کتنے ہی حرام کاموں کو حلال کر ڈالا، اور دین و تصوف کے نام پر الحاد و بے دینی کا شکار ہو گئے۔

کسی نے تعویذ گندوں کا اور کسی نے مریدوں سے تذرانے وصول کرنے کا نام تصوف رکھ لیا، کسی نے پیر صاحب سے بیعت ہونے ہی کو جنت کا پروانہ سمجھا، اور اصلاحِ نفس و اعمال سے غافل ہو کر مطمئن ہو گئے، کہ ”پیر صاحب بخشش کر دیں گے“ کسی نے دل کی خاص قسم کی دھڑکنوں کو اور کسی نے ”غیب کی باتیں“ بتلانے کو تصوف کا کمال سمجھ لیا، کسی نے صرف تسبیحات و وظائف اور نوافل کو تصوف و طریقت کا نام دے لیا، اور ظاہر و باطن کی اصلاح سے بے فکر ہو کر کتنے ہی فرائض اور حقوق العباد کو یا مال کر ڈالا، کسی نے مجاہدوں، ریاضتوں، چلہ کشی، رہبانیت اور ترک دنیا کو طریقت و سلوک کی معراج قرار دے کر بال بچوں، ماں باپ اور اعزہ و اقارب سے کنارہ کشی اختیار کر لی، اور جنگلوں اور غاروں میں زندگی گزارنے ہی کو دین کا مقصود سمجھ بیٹھے۔

غرض یہ اور اسی طرح کی بہت سی گرامیاں تصوف اور فقہ کے بارے میں پھیلی ہوئی ہیں، ... انتہاء پسندی کا دور دورہ ہے، ایک جانب افراط ہے دوسری جانب تفریط اور رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین افسراط و تفریط کے بچوں بیچ راہِ اعتدال ہے، وہ ترک دنیا کو دین نہیں کہتا، بلکہ دنیا کے تمام کار و بار کو شریعت کے قالب میں ڈھال کر تصوف کی راہ سے کارِ ثواب بنا دینا چاہتا ہے، وہ شریعت و طریقت کے تضاد کو نہیں مانتا، بلکہ دونوں کو ساتھ لے کر چلنے کا قائل ہے، شریعت جسم ہے تو طریقت اس کی روح، تصوف فقہ کے بغیر ناکارہ ہے اور فقہ تصوف کے بغیر بے جان، حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کا ارشاد ہے کہ:-

”شریعت بغیر طریقت کے ترا فلسفہ ہے، اور طریقت بغیر شریعت

کے زندقہ و الحاد“

مشہور مفسرِ قرآن حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ جو بڑے درجہ کے صوفی بھی ہیں فرماتے ہیں کہ:-

”جس شخص کا ظاہر پاک نہ ہو اس کا باطن پاک ہو ہی نہیں سکتا“

۱۰ تہسیل قصہ سبیل، ص ۸۔

چھٹی صدی ہجری کے تصوف کے مشہور امام شیخ عبدالقادر سہروردی رحمۃ اللہ علیہ (پہلی بانی سلسلہ سہروردیہ ہیں) نے حضرت سہل بن عبداللہ کا یہ ارشاد اپنی کتاب میں نقل فرمایا ہے کہ:-

كُلُّ وَجَدٍ لَا يَشْهَدُ لَهُ الْكِتَابُ وَالسُّنَّةُ قَبَاطِلٌ | جس وجدی کیفیت کی کوئی شہادت قرآن و سنت میں موجود نہ ہو وہ باطل ہے

یہی وہ حقیقت ہے جس کے بر ملا اظہار کے لئے ہمیں فقہ کے تعارف میں تصوف کا تعارف بھی خاصی تفصیل سے کرنا پڑا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان شرائط و تفریط کی بھول بھلیاں سے محفوظ و مامون فرمائے، اور قرآن و سنت کی صراط مستقیم پر گامزن فرما کر جنت کی لازوال نعمتوں سے مالا مال فرمائے، آمین۔

آدم بر سر مطلب | اب ہم اپنے اصل موضوع ”فقہ“ کی جانب لوٹتے ہیں، فقہ کی تعریف پیچھے ضروری تفصیل کے ساتھ سامنے آچکی ہے، جس کا حاصل متاخرین کی اصطلاح کی روش سے یہ ہے کہ:-

”انسان کے ظاہری اعضاء سے کئے جانے والے ہر کام کے متعلق قرآن، سنت، اجماع یا قیاس کے تفصیلی دلائل کے ذریعہ یہ جاننے کو فقہ کہا جاتا ہے، کہ وہ کام فرض ہے یا واجب یا محبت یا مباح یا حرام یا مکروہ“

موضوع بھی پیچھے معلوم ہو چکا ہے کہ ”انسان کے ظاہری اعمال“ فقہ کا موضوع ہیں۔ فقہ کے مآخذ یعنی فقہ کی تعریف کے ذیل میں کئی درجے پر عرض کیا جا چکا ہے کہ احکام شرعیہ کے دلائل صرف چار ہیں، قرآن، سنت، اجماع، قیاس، تمام شرعی احکام انہی میں سے کسی نہ کسی دلیل سے حاصل کئے جاتے ہیں، اسی لئے ان کو ”فقہ کے مآخذ“ بھی کہا جاتا ہے، یہاں ان چاروں مآخذ کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے:-

۱۔ پہلا مآخذ قرآن حکیم | قرآن حکیم کے نام یوں تو بعض علماء کرام نے نوٹے سے بھی اور پر بتائے ہیں، مگر مشہور نام جو خود قرآن نے بتائے پانچ ہیں:-

۱۔ عوارف المعارف، ۲۔ حاشیہ احیاء العلوم، ص ۲۸۰ ج اول، مطبوعہ مصر۔

۳۔ منہل العرفان للزرقانی، ص ۸ ج اول، مطبوعہ مصر۔

القرآن، الفرقان، الکتاب، الذکر، التزئیل، ان میں بھی سب سے زیادہ مشہور نام "القرآن" ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس کتاب کو کم از کم اکتھ مقامات پر اسی نام سے یاد کیا ہے، مگر اصول فقہ کی کتابوں میں جس نام کا زیادہ استعمال ہوا وہ "الکتاب" ہے۔ جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ قرآن نے سورۃ فاتحہ کے بعد سب سے پہلی سورت کے بالکل شروع میں اپنا ہی نام بتایا ہے، ارشاد ہے:-

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِیْهِ ۚ | یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں
 قرآن حکیم اس کائنات کی مشہور ترین کتاب ہونے کے باعث درحقیقت تو کسی تعارف کا محتاج نہیں، مگر علماء اصول فقہ جن کا منصب ہی یہ ہے کہ جو بات بھی فقہ کے دلائل سے متعلق ہو اسے قاعدہ ضابطہ میں لے آئیں، جو بات کہیں چھی تلی ہو، انھوں نے قرآن حکیم جیسی بدیہی کتاب کی بھی تعریف کی ہے، تعریف بیان کر دینے میں بعض مصلحتیں ان کے پیش نظر تھیں جن کے ذکر کرنے کا یہاں فائدہ نہیں، بہر حال قرآن حکیم کی جو اصطلاحی تعریف کی گئی ہے یہ ہے کہ:-
 "قرآن اللہ تعالیٰ کا وہ کلام ہے جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لفظ بہ لفظ نازل ہوا، مصاحف میں لکھا گیا، اور آپ سے بغیر کسی شبہ کے تواتر کے ساتھ منقول ہے"

وحی کی دو قسمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی بھی گئی وہ دو قسم کی تھی، ایک تو یہی قرآن حکیم جس کے الفاظ اور معنی دونوں اللہ جل شانہ کی طرف سے ہیں، یعنی جس طرح اس کے مضامین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اسی طرح اس کے الفاظ بھی بعینہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں، الفاظ کے انتخاب، ترکیب، یا اسلوب و انشاء میں نہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا کوئی دخل ہے نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا، اس وحی کو "وحی متلو" کہا جاتا ہے، یعنی ایسی وحی جس کی تلاوت کی جاتی ہے، وحی کی یہ قسم پوری کی پوری حفاظ قرآن کے سینوں میں اور قرآنی مصاحف میں ہمیشہ کے لئے اس طرح محفوظ کر دی گئی ہے کہ اس کا ایک حرف بلکہ کوئی نقطہ بھی نہ بدلا جاسکے نہ بدلا جاسکے گا۔

۱۵ التلویح مع التوضیح، ص ۲۶، ج اول مطبوعہ مصر۔

۱۶ تسہیل الوصول الی علم الاصول، ص ۳۴ تا ۳۵، مطبوعہ ملتان۔

دوسری قسم وحی کی وہ ہے جو قرآن پاک کا جزء بنا کر نازل نہیں کی گئی، اس کے ذریعہ آپ کو بہت سی تعلیمات اور شریعت کے احکام اس طرح بتائے گئے ہیں کہ آپ کے قلب مبارک پر صرف معانی و مضامین کا القاء ہوتا تھا، الفاظ اس کے ساتھ نہ ہوتے تھے، اُن معانی و مضامین کو آپ نے صحابہ کرامؓ کے سامنے کبھی اپنے الفاظ سے کبھی اپنے افعال اور کبھی دونوں کے بیان فرمایا، وحی کی اس قسم کا نام ”وحی غیر متلو“ ہے، یعنی ایسی وحی جس کی تلاوت نہیں کی جاتی، اسی وحی کو ”حدیث“ اور ”سنت“ کہا جاتا ہے، جس کا مفصل تعارف آگے آ رہا ہے۔

تواتر | تواتر کسی خبر کے اس طرح پے درپے نقل ہونے کو کہتے ہیں کہ جب سے وہ خبر وجود میں آئی اس وقت سے اُسے ہر زمانے میں لوگوں کی اتنی بڑی تعداد بلا اختلاف نقل کرتی چلی آئی ہو کہ عقل یہ باور نہ کرے کہ ان سب نے سازش کر کے جھوٹ بولا ہوگا یا سب کو مغالطہ لگ گیا ہوگا، جو خبر اس طرح سے تواتر کے ساتھ منقول ہو اسے ”متواتر“ کہتے ہیں، ایسی خبر دنیا کے تمام قابل ذکر اہل عقل اور ادیان و مذاہب کے نزدیک ہمیشہ قطعی اور ہر شک و شبہ سے بالاتر سمجھی جاتی ہے، اس کے ایسا ہی یقین حاصل ہوتا ہے جیسا مشاہدے ہوتا ہے، ہم نے شہر نیویارک کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا مگر امریکہ کے اس شہر کا ذکر اور اس کی متفرق تفصیلات تو بیشمار انسانوں سے سنی ہیں کہ عقل یہ باور نہیں کر سکتی کہ نیویارک امریکہ کا کوئی شہر ہی ہو، اور جتنے لوگوں نے اخبار اور سائل سے ہمیں اس کے حالات بتائے ان سب نے سازش کر کے متفقہ طور پر جھوٹ بولا ہوگا یا سب ہی کو مغالطہ لگ گیا ہو اور وہ پاکستان کے کسی گاؤں کو امریکہ کا عظیم شہر نیویارک سمجھ بیٹھے ہوں یہ تو اتنی ہی ہے جسکی بنا پر ہم نیویارک کو اپنی آنکھوں سے دیکھ بغیر امریکہ کا بڑا شہر یقین کرنے پر مجبور ہیں، اس یقین کو اگر ہم اپنے ذہن اور حافظہ سے کھرچنے کی کتنی بھی کوشش کریں تو ظاہر ہے کہ بے سود ہوگی۔

تواتر کی یہی وہ قوت ہے جسے اسلام بھی تسلیم کیا ہے، اور خبر متواتر کے ثبوت کو ہر قسم کے جھوٹ اور بھول چوک کے شبہ سے بالاتر قرار دیا ہے، قرآن کریم بھی حرف بہ حرف تواتر ہی کیساتھ منقول ہے، بلکہ اس کے تواتر کا تو حیل ہے کہ جب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اللہ کا کلام بتا کر امت کے سامنے پیش کیا اس وقت سے اب تک اُسے جو نقل کر نیوالوں اور حفظ کر نیوالوں کی اتنی بڑی تعداد ہر زمانہ میں ہے کہ کسی بھی زمانہ میں اُن کو شمار نہیں کیا جاسکا، ایک نسل دوسری نسل کو اور دوسری تیسری کو اللہ کا یہ پیغام حرف بہ حرف پہنچاتی رہی اور قیامت تک پہنچاتی رہے گی۔

۲۔ دوسرا ماخذ سنت | لفظ ”سنت“ لغت عرب میں ”طریقہ اور عادت“ کے لئے اور فقہ میں ایسی عبادت کے لئے استعمال ہوتا ہے جو فرض یا واجب ہو، اور علم حدیث اور اصول فقہ کی

اصطلاح میں ”حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو سنت کہا جاتا ہے“ یہاں یہی اصطلاحی معنی مراد ہیں، سنت اور حدیث میں یہ فرق ہے کہ حدیث ”تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کا نام ہے اور ”سنت“ آپ کے اقوال و افعال دونوں کا۔ اقوال کی طرح آپ کے افعال بھی حجت ہیں، یعنی احکام شرعیہ کی دلیل صرف حدیث

نہیں، بلکہ سنت ہی جس طرح قرآن حکیم پورا کا پورا وحی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بھی امور دین کے متعلق سب کی سب وحی ہیں، اور آپ کے تمام اعمال و اخلاق وحی کے عین مطابق، اس لئے قرآن پاک کے بعد شرعی احکام کا سب سے بڑا مآخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔

سنت کو خود قرآن نے
حجت قرار دیا ہے

وَالتَّجْمُ
إِذَا هَوَىٰ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ
وَمَا غَوَىٰ وَمَا يَنْطُوقُ عَنِ الْحَقِّ
إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ
(التجم: ۴۱)

”قسم ہے ستارہ کی جب وہ غروب
ہونے لگے، یہ تھا کہ ساتھ رہنے والے
(پیغمبر) نہ راہ حق سے بھٹکے اور نہ غلط راستہ
ہوئے اور نہ آپ اپنی نفسانی خواہش سے
باتیں بنتے ہیں، ان کا ارشاد نری وحی ہے

جو ان پر وحی بھیجی جاتی ہے (خواہ الفاظ کی بھی وحی ہو جو قرآن کہلاتی ہے، خواہ صرف
معانی کی ہو جو سنت کہلاتی ہے، اور خواہ وحی جسزنی ہو یا کسی قاعدہ کلیہ کی ہو جس سے
اجتہاد فرماتے ہوں)۔“

سورہ قلم میں بھی آپ کے اخلاق و عادات کی عظمت کا اعلان قسم کھا کر کیا گیا ہے:-
وَأَنَّكَ تَعَلَّىٰ خَلْقٍ عَظِيمٍ
(العلم: ۴)

قرآن ہی نے آپ کے پورے طرز زندگی کو سب مسلمانوں کے لئے اللہ کا پسندیدہ نمونہ
بنا کر پیش کیا:

تَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ
أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب: ۲۰)

تم لوگوں کے لئے رسول اللہ (صلی اللہ
علیہ وسلم) میں ایک عمدہ نمونہ تھا۔“

اسی نمونہ کو اللہ کی محبت کا معیار ٹھہرا کر مسلمانوں کو یہ مرزہ سنایا کہ:-

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ
فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ
وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ

آپ فرما دیجئے کہ اگر تم خدا تعالیٰ سے
محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتباع کرو
خدا تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے،

(زال عمران: ۳۱)

اور صاف الفاظ میں حکم دیا کہ :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا
اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ،

(نساء: ۵۹)

اور تمہاری سب گناہوں کو معاف کر دیں گے

لے ایمان والو! تم اللہ تعالیٰ کا کہنا
مانو اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا
کہنا مانو!

اور بتایا کہ آپ کی اطاعت بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے :-

مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ
اللَّهَ،

(نساء: ۸۰)

جس شخص نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ
وسلم) کی اطاعت کی اُس نے خدا تعالیٰ کی
اطاعت کی!غرض وحی ہونے کے اعتبار سے قرآن و سنت میں کوئی فرق نہیں، دونوں کی اطاعت
واجب ہے، جو درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے۔یہاں ایک اور بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے، اور وہ یہ کہ
بعض شرائط کے ساتھ صحابہ کرامؓ کے آثار یعنی اقوال و افعال

آثار صحابہ کی فقہی حیثیت

سے بھی شرعی احکام ثابت کرنے میں ایک حد تک استدلال کیا جاتا ہے، مگر ان کے سب اقوال و افعال
مکمل دلیل فقہ کی حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ ان میں کچھ تفصیل ہے جو اصول فقہ اور اصول حدیث کی
کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے، چونکہ یہ کوئی مستقل دلیل نہیں بلکہ سنت ہی کے تابع ہے، لہذا
اس دلیل کو الگ شمار نہیں کیا جاتا۔

قرآن اور سنت کے درمیان درجہ کا تفاوت

یہ بات سچھے واضح ہو چکی ہے کہ وحی ہونے
کے اعتبار سے قرآن و سنت میں کوئی فرقنہیں، اور دونوں ہی کی اطاعت لازم ہے، مگر اس کے باوجود دو بنیادی فرق ایسے ہیں جن کا اثر
فقہ کے بہت سے احکام پر پڑتا ہے؛(۱) ایک یہ کہ قرآن کریم "وحی متلو" ہے اور سنت "وحی غیر متلو" یعنی جیسا کہ سچھے بیان ہوا
قرآن کریم کے الفاظ اور معنی دونوں وحی ہیں، اور سنت کے صرف معنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے
وحی کئے گئے ہیں، الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کو بلا وضو
پھونکا جائز نہیں جبکہ حدیث شریف کو بلا وضو بھی پھونکا جاسکتا ہے، اگرچہ بہتر یہی ہے کہ با وضو ہو کر

چھو یا جائے، نیز قراءت قرآن جو نماز میں فرض ہے وہ فرض حدیث کے پڑھ لینے سے ادا نہیں ہو سکتا۔
۲۔ قرآن و سنت میں دوسرا فرق یہ ہے کہ قرآن کریم تو پورا پورا متواتر ہونے کی وجہ سے
قطعی الثبوت (قطعی اور بالکل یقینی طور پر ثابت شدہ) ہے، اور سنت کی تعلیمات چونکہ سب کی سب
تواتر سے ثابت نہیں، لہذا اس کی جو تعلیمات تواتر سے ثابت ہو گئیں وہ تو قطعی الثبوت ہیں اور
جو تعلیمات ہم تک بغیر تواتر کے مگر قابل اعتماد سند کے ذریعہ پہنچی ہیں وہ ”ظنی الثبوت“ دظنی طور
پر ثابت شدہ ہیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ قرآن کریم کا تو ایک ایک حرف بلکہ زیر زیر پیش بھی ہم تک تواتر
سے پہنچا ہے، لہذا اس کے متعلق ہمیں قطعی علم اور پختہ یقین ہے کہ یہی وہ بعینہ کلام ہے، جسے
حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے اللہ کا کلام بتا کر پیش کیا تھا، تواتر کی
وجہ سے ہمیں اس کے ثبوت کے لئے سند اور راویوں کے حالات کی جانچ پڑتال کی ضرورت نہیں،
کیونکہ سند اور راویوں کے حالات کی چھان بین کی ضرورت تو وہاں ہوتی ہے جہاں روایت کو پیوالے
تھوڑی تعداد میں ہوں، اور جہاں روایت کرنے والوں کی تعداد ہر زمانہ میں تواتر تک پہنچی ہوئی ہو
وہاں سند اور راویوں کی تحقیق کا مطالبہ وہی شخص کر سکتا ہے جو دوپہر کی چھپلائی دھوپ میں کھڑا ہو
اور لوگوں سے وجود آفتاب کی دلیل مانگ رہا ہو۔

برخلاف سنت کے کہ وہ ہم تک سب کی سب تواتر سے نہیں پہنچی، بلکہ سنت کی کچھ تعلیمات
تواتر سے اور کچھ بغیر تواتر کے سند کے ذریعہ پہنچی ہیں، جو تعلیمات بغیر تواتر کے پہنچی ہیں ان کے متعلق
یہ علم حاصل کرنے کے لئے کہ یہ واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ تعلیمات ہیں سند
کے ایک ایک راوی کے حالات کی مکمل چھان بین اور سند کی نہایت دقیق اور پیچیدہ تحقیقات
سے گزرنا پڑتا ہے، جن کے اصول ”علم روایت حدیث“ ”فن اصول حدیث“ ”فن اسما الرجال“
اور ”فن اصول فقہ“ میں بیان کئے گئے ہیں، ان تمام تحقیقات میں جو حدیث (غیر متواتر) سند کے
اعتبار سے قابل اعتماد ثابت ہو اس سے ایک گونہ یقین اس بات کا حاصل ہو جاتا ہے کہ واقعی
یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، مگر اس ”ایک گونہ یقین“ کے باوجود بھی ضعیف سا
احتمال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ سند کے راویوں سے پوری کوشش اور احتیاط کے باوجود
بھول چوک ہو گئی ہو، اس لئے ایک گونہ یقین قوت میں اس یقین کے برابر نہیں ہوتا، جو...
قرآن کریم یا سنت متواترہ سے حاصل ہوتا ہے۔

ظن غالب کی حقیقت اور اس کا درجہ تو اترے ہونے والے یقین کو ”علم قطعی“ کہا جاتا ہے،

اور اس کا انکار کفر ہے، اور جو یقین تو اتر کے بغیر

سند سے حاصل ہوا اسے اصطلاح میں ”ظن“ کہتے ہیں، اس کا انکار گناہ ہی مگر کفر نہیں۔

عام طور پر ظن کا اردو ترجمہ صرف ”گمان“ سے کر دیا جاتا ہے، مگر یاد رہے کہ اصول فقہ کی اصطلاح میں ”ظن“ سے مراد صرف گمان نہیں بلکہ ایک درجہ کا یقین مراد ہے، جسے ”ظن غالب“ کہا جاتا ہے، اور ”ظن غالب“ دنیا کے تمام ادیان و مذاہب، ہر ملک کے قوانین اور روزمرہ کے معاملات میں قابل اعتماد اور قابل استدلال قرار دیا جاتا ہے، دنیا بھر کی عدالتیں گواہیوں کی بنیاد پر بڑے بڑے فیصلے کرتی ہیں، ظاہر ہے کہ محض دو چار گواہوں کا بیان حد تو اتر کو نہیں پہنچاتا، اور نہ اس کے بالکل سچ اور درست ہونے کا علم قطعی حاصل ہو سکتا ہے، کیونکہ یہ احتمال عقلی طور پر موجود رہتا ہے کہ ان چاروں گواہوں نے سازش کر کے جھوٹ بولا ہو یا ان سب کو مغالطہ لگ گیا ہو، لہذا ان گواہیوں سے حاصل ہونے والا علم ظن غالب ہی ہے علم قطعی نہیں،

علم قطعی تو وہ ہے جس میں عقل کے نزدیک جھوٹ یا مغالطہ کا کوئی احتمال سکر سے باقی ہی نہ رہے، غرض دنیا بھر کی عدالتوں میں گواہیوں پر اعتماد کر کے جو فیصلے کئے جاتے ہیں، وہ ”ظن غالب“ ہی کی بنیاد پر ہوتے ہیں، اسی طرح جو سنت تو اترے تو ثابت نہ ہو، مگر ایسی قابل اعتماد سند کے ذریعہ پہنچی ہو کہ اس کے درست ہونے کا ظن غالب حاصل ہو جائے، شریعت میں اس کو حجت (یعنی فقہی دلیل) قرار دیا گیا ہے، یہ اور بات ہے کہ یہ دلیل ”ظنی“ ہونے کے باعث ”قطعی“ سے کم درجہ کی ہو خلاصہ کلام یہ کہ قرآن و سنت کے درمیان دو سرفرق یہ ہے کہ قرآن کریم تو پورا کا پورا متواتر ہونے کی وجہ سے قطعی ہے، اور سنت کی تمام تعلیمات چونکہ تو اترے ثابت نہیں، اس لئے سنت متواترہ قطعی ہے اور سنت غیر متواترہ جو قابل اعتماد سند سے ثابت ہوئی ہو وہ ظنی ہے۔

دلیل قطعی اور دلیل ظنی میں چونکہ قوت کے اعتبار سے تفاوت ہے لہذا ان سے ثابت ہونے والے احکام پر بھی اس تفاوت کا اثر ظاہر ہوتا ہے، اور وہ یہ کہ سچے احکام شرعیہ کی جو سات قسمیں

دلیل قطعی اور دلیل ظنی کے فرق کا اثر احکام پر

بیان ہوتی ہیں، یعنی فرض، واجب، مستحب، مباح، حرام، مکروہ تحریمی، مکروہ تنزیہی، ان میں فرض اور حرام کا ثبوت صرف دلیل قطعی سے ہو سکتا ہے، دلیل ظنی کسی فعل کی فرضیت یا حرمت ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں، اور باقی پانچ قسم کے احکام یعنی واجب، مستحب

مباح، مکروہ تحریمی اور مکروہ تنزیہی کا ثبوت ”دلیل ظنی“ سے بھی ہو سکتا ہے، قرآن کریم اور سنت متواترہ دونوں ”قطعی الثبوت“ ہیں، لہذا ان سے ساتوں قسم کے احکام ثابت ہو سکتے ہیں، اور سنت غیر متواترہ دلیل ظنی ہے، لہذا اس سے کسی فعل کا فرض یا حرام ہونا ثابت نہیں کیا جاسکتا، البتہ باقی پانچ قسم کے احکام اس سے بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔

مثلاً نماز اس لئے فرض ہے کہ قرآن کریم میں اس کا مطالبہ صراحت سے کیا گیا ہے، اسی طرح مثلاً ہر نماز میں رکعتوں کی ایک خاص تعداد یعنی فجر کی دو، مغرب کی تین، اور باقی تین نمازوں میں چار چار رکعتیں اگرچہ قرآن کریم سے صراحتہً ثابت نہیں مگر سنت متواترہ سے ان کی پابندی ثابت ہے، لہذا اس تعداد کی پابندی بھی فرض اور اس میں کمی بیشی حرام ہے، اور نماز کی پہلی دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ کے بعد کوئی سورت یا چند آیات پابندی سے پڑھنے کا مطالبہ نہ قرآن کریم سے صراحتہً ثابت ہے نہ سنت متواترہ سے، بلکہ اس کا ثبوت صرف سنت غیر متواترہ سے ہوا ہی لہذا یہ واجب ہے فرض نہیں۔

فرض اور واجب میں یہی فرق ہے کہ فرض کا مطالبہ دلیل قطعی سے ہوتا ہے اور واجب کا مطالبہ دلیل ظنی سے، لہذا عمل تو دونوں پر ضروری ہے، اور خلاف ورزی بھی دونوں کی گناہ ہے، مگر فرض کا انکار کفر ہے، واجب کا انکار کفر نہیں، اسی طرح حرام اور مکروہ تحریمی میں یہ فرق ہے کہ حرام کی ممانعت دلیل قطعی سے ثابت ہوتی ہے، اور مکروہ تحریمی کی ممانعت دلیل ظنی سے، دونوں کا ارتکاب گناہ ہے مگر حرام کی ممانعت کا انکار کفر ہے، مکروہ تحریمی کی ممانعت کا انکار کفر نہیں۔

فقہ کا تیسرا مأخذ ”اجماع“ لفظ میں ”اجماع“ متفق ہونے کو کہتے ہیں، لغوی معنی کے اعتبار سے اتفاق اور اجماع ایک ہی چیز ہے، مگر اصطلاح شریعت

میں ایک خاص قسم کے اتفاق کو ”اجماع“ کہا جاتا ہے، جس کی تعریف یہ ہے کہ:-

”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کسی زمانہ کے تمام فقہاء

مجتہدین کا کسی حکم شرعی پر متفق ہو جانا ”اجماع“ ہے۔“

یہ ”اجماع“ فقہ کا تیسرا مأخذ اور احکام شرعیہ کے چار دلائل میں سے ایک ہے، جس مسئلہ کے

شرعی حکم پر اجماع منعقد ہو گیا ہے اسے ”اجماعی فیصلہ“ یا ”مسئلہ اجماعیہ“ یا ”مسئلہ مجمع علیہا“ کہا جاتا

ہے، اس کی حیثیت احکام شرعیہ کی دلیل اور فقہ کا مأخذ ہونے کے اعتبار سے وہی ہے جو آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی ہے، کہ جس طرح سنت متواترہ دلیل قطعی ہے اور سنت غیر متواترہ

دلیل ظنی، اسی طرح جو اجماعی فیصلہ ہم تک تو اتر سے پہنچا ہو وہ فقہی احکام کے لئے دلیل قطعی ہے، اور جو تو اتر کے بغیر قابل اعتماد روایت سے پہنچا ہو وہ دلیل ظنی۔

اجماع کو خود قرآن و سنت | قرآن و سنت نے مسلمانوں پر اجماع کی پیروی ایسی ہی لازمی قرار دی ہے، جیسی وحی سے ثابت شدہ احکام کی پیروی لازم ہے، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کی وفات پر شریعت کے احکام بذریعہ وحی آنے کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جانے والا تھا، اور یہ شریعت قیامت تک نافذ رہنے والی اور طرح طرح کے نئے مسائل امت کو قیامت تک پیش آنے والے تھے، لہذا آئندہ کے مسائل شرعی اصول پر حل کرنے کا انتظام اللہ جل شانہ نے یہ فرما دیا کہ خود قرآن و سنت میں ایسے اصول اور نظائر رکھ دیئے جن کی روشنی میں غور و فکر کر کے ہر زمانہ کے مجتہدین اس وقت کے پیدا شدہ مسائل کا شرعی حکم معلوم کر سکیں، اور جو فیصلہ قرآن و سنت کی روشنی میں وہ اپنے متفقہ اقوال یا افعال سے کر دیں، اس کی پیروی بعد کے تمام مسلمانوں پر خود قرآن و سنت کے ذریعہ لازم اور اس کی خلاف ورزی حرام قرار دیدی گئی۔

قرآن و سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اعزاز صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی امت کو ملا ہے، کہ اس کے مجموعہ کو اللہ تعالیٰ نے دینی امور میں ہر خطا، دلغزش سے معصوم اور محفوظ فرما دیا ہے، یہ مطلب نہیں کہ اس امت کے کسی فرد سے دینی امور میں غلطی نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ بات تو ہر وقت مشاہدہ میں آتی ہے کہ اس امت میں بھی ہر قسم کے لوگ ہیں، نیکوکار متقی بھی ہیں، فاسق و فاجر بھی، ہر مسلمان سے بلکہ علماء و صلحاء سے بھی فرداً فرداً بہت سے دینی امور میں غلطی ہو جاتی ہے، لہذا امت کا ہر فرد تو خطا، دلغزش سے معصوم نہیں، مگر امت کا مجموعہ معصوم ہے، یعنی پوری امت بحیثیت مجموعی متفقہ طور پر کوئی ایسا فیصلہ یا عمل نہیں کر سکتی جو قرآن و سنت اور اللہ کی مرضی کے خلاف ہو، جس طرح قرآن و سنت کا کوئی فیصلہ غلط نہیں ہو سکتا اسی طرح کسی زمانہ کے تمام مسلمانوں کا متفقہ فیصلہ جو کسی دینی مسئلہ میں ہوا ہو غلط نہیں ہو سکتا، بعد کے تمام مسلمانوں پر اس کی پابندی لازم ہے۔

اس سلسلہ میں چند آیات قرآنیہ | چنانچہ قرآن کریم نے بتایا کہ آخرت میں جو سزا کوٹے گی وہی سزا ان لوگوں کو دی جائے گی جو مسلمانوں کا متفقہ دینی طریقہ چھوڑ کر کوئی دوسرا

راستہ اختیار کریں گے، ارشاد ہے:-

(۱) وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمَوْعِظَةِ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۝

(نساء: ۱۱۵)

”اور جو شخص رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت کرے گا بعد اس کے کہ حق راستہ اس پر ظاہر ہو چکا ہو اور سب مسلمانوں کے (دینی) راستہ کے خلاف چلے گا تو ہم اس کو (دنیا میں) جو کچھ وہ کرتا ہی کرنے دیں گے، اور (آخرت میں) اسکو

جہنم میں داخل کریں گے، اور وہ بہت بُری جگہ ہے۔“

معلوم ہوا کہ اُمت کے متفقہ فیصلے (اجماع) کی مخالفت گناہ عظیم ہے۔

(۲) قرآن کریم نے اس اُمت کے مجموعہ کو یہ مشورہ سنایا ہے کہ:-

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَتَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۝

(مائدہ: ۲۴۳)

”اور اسی طرح ہم نے تم کو ایسی اُمت بنایا ہے جو نہایت اعتدال پر ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور تمھارے (قابل شہادت اور معتبر ہونے کے) لئے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) گواہ بنیں۔“

معلوم ہوا کہ اس اُمت کے جو اقوال و اعمال متفقہ طور پر ہوں وہ سب اللہ تعالیٰ کے نزدیک درست اور حق ہیں، کیونکہ اگر سب کا اتفاق کسی غلط بات پر تسلیم کیا جائے تو اس ارشاد کے کوئی معنی نہیں رہتے کہ ”یہ اُمت نہایت اعتدال پر ہے“ نیز اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو گواہ قرار دے کر دوسرے لوگوں پر اس کی بات کو حجت قرار دیا ہے، اس سے بھی یہی ثابت ہوا کہ اس اُمت کا اجماع حجت ہے، اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اجماع کا حجت ہونا صرف صحابہ یا تابعین کے زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ ہر زمانہ کے مسلمانوں کا اجماع معتبر ہے، کیونکہ آیت میں پوری اُمت کو خطاب ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت صرف صحابہ و تابعین نہ تھے، بلکہ قیامت تک آنے والی نسلیں جو مسلمان ہیں وہ سب آپ کی اُمت ہیں تو ہر زمانہ کے مسلمان اللہ کے گواہ ہو گئے، جن کا قول حجت ہے، وہ سب کسی غلط کاری یا گمراہی پر

۱۔ تفصیل کے لئے دیکھئے علامہ آمدی کی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام، ص ۱۰۳ تا ص ۱۰۷ ج ۱،

وتفسیر معارف القرآن، ص ۵۴۶ تا ص ۵۴۷ ج دوم۔

متفق نہیں ہو سکتے۔

(۳) قرآن حکیم ہی نے اس امت کو ”خیر الامم“ قرار دے کر اس کی صفت یہ بتائی ہے کہ وہ اچھے کاموں کا حکم دیتی اور بُرے کاموں سے منع کرتی ہے، ارشاد ہے:-

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ
الْمُنْكَرِ وَتُؤْتُونَ بِأَدْنَىٰ

”تم سب سے بہتر امت ہو جو لوگوں کے رافع ہدایت
پہنچانے کے لئے ظاہر کی گئی ہے، تم نیک کاموں کا
حکم دیتے ہو اور بُرے کاموں سے منع کرتے ہو، اور
اللہ پر ایمان رکھتے ہو“

پہلی آیت کی طرح اس آیت میں بھی پوری امت سے ہمیشہ مجموعی خطاب ہے، اور اس میں
تین طریقوں سے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ اس امت کا اجماع شرعی حجت اور فقہی دلیل ہے۔
اول یہ کہ اس امت کو ظاہر ہے کہ بہترین امت اس لئے کہا گیا ہے کہ اس امت کا مجموعہ
دین کی صحیح تعلیمات پر قائم رہے گا، اگرچہ اس کے بہت سے افراد الگ الگ دین میں کمزور بلکہ بہت
کمزور ہوں، مگر ہر زمانہ میں اس امت کا مجموعہ مل کر اللہ کے دین کو مکمل طور پر تھامے رہے گا، پورا
مجموعہ کبھی گمراہ نہ ہوگا، لہذا ان کا اجماع بھی لامحالہ حجت ہوگا، اس لئے کہ اگر ان سب کا اتفاق
کسی غلط بات پر تسلیم کیا جائے تو وہ اتفاق گمراہی پر ہوگا، پھر ایک گمراہ امت بہترین امت
کیسے ہو سکتی ہے؟

دوسرا اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس امت کے متعلق یہ تصدیق فرمادی ہے کہ ”یہ
نیک کاموں کا حکم دیتی ہے“ معلوم ہوا کہ جس کام کا یہ حکم دے گی وہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ اور
نیک کام ہوگا، اس کا حامل بھی یہی ہے کہ یہ امت متفقہ طور پر جس کام کا حکم دے گی چونکہ وہ
اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہے لہذا اس کی پابندی سب پر لازم ہوگی۔

تیسرے اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ ”یہ امت بُرے کاموں سے منع کرتی ہے“ معلوم ہوا کہ

۱۔ تفصیل کے لئے دیکھئے احکام بہتر آن للخصاص، ص ۱۰۱ تا، ص ۱۰۲، ج اول مطبوعہ مصر ۱۳۴۲ھ
و تفسیر معارف القرآن، ص ۳۷۲ تا ص ۳۷۳، ج اول۔

۲۔ دیکھئے شیخ ابوبکر جصاص رازی کی مشہور کتاب ”احکام القرآن“ ص ۲۱ ج ۲، طبع مصر،
اور تہذیب الوصول ص ۳۷۴، طبع لبنان۔

جس کام سے یہ امت متفقہ طور پر منع کر دیے وہ کام اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ اور بُرا کہ اور اس سے اجتناب لازم ہے۔

الحاصل اس امت کا اجماعی فیصلہ خواہ کسی کام کے کرنے کا ہو یا کسی کام سے باز رہنے کا، ہر صورت میں وہ فیصلہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہوگا، ورنہ اگر ان کے فیصلہ کو غلط قرار دیا جائے، یعنی جس کام کا اس نے حکم دیا اسے بُرا سمجھا جائے اور جس کام سے منع کیا اسے اچھا سمجھا جائے تو لازم آئے گا کہ یہ امت بُرائی کا حکم دینے والی اور اچھائی سے منع کرنے والی ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ بات اس آیت کے صریح خلاف ہے۔^۱

(۴) نیز تفسیر آن کریم کا حکم ہے کہ:-

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ (آل عمران: ۱۰۳) | اور اللہ کی رسی (دین) کو سب مل کر مضبوطی پکڑے رہو، اور آپس میں بھوٹ نہ ڈالو،

اور ظاہر ہے کہ تمام مسلمانوں کے متفقہ دینی فیصلے (اجماع) کی مخالفت امت میں بھوٹ ہی ڈالنا ہے جس سے قرآن کریم نے واضح طور پر ممانعت فرمائی ہے۔^۲

رہا یہ سوال کہ فقہ کے بے شمار مسائل میں فقہاء کا آپس میں اختلاف ہوا ہے، لہذا وہ بھی اس آیت کی رو سے ناجائز ہونا چاہتے؟ جواب یہ ہے کہ فقہاء کا اختلاف جن مسائل میں ہوا ہے ان میں سے کوئی بھی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کا صریح فیصلہ قطعی طور پر قرآن و سنت سے یا اجماع امت سے ثابت ہو چکا ہو، فقہاء کا اختلاف صرف اُن فروعی مسائل میں ہوا، جو جن میں قرآن و سنت کا کوئی صریح اور قطعی فیصلہ موجود نہیں تھا، یا جن کے متعلق خود احادیث میں اختلاف پایا جاتا تھا، اور اُن پر امت کا اجماع بھی منعقد نہیں ہوا تھا، لہذا فقہاء کا یہ اختلاف اس آیت کی ممانعت میں داخل نہیں، بلکہ ان کا اختلاف فروعی مسائل میں اجتہادی نوعیت کا ہے، جو صحابہ کرام کے زمانہ سے چلا آ رہا ہے، خود عہد رسالت میں بھی فروعی مسائل میں صحابہ کا اختلاف ہوا ہے، جس کی بہت سی مثالیں کتب حدیث میں موجود ہیں، اور آنحضرت

۱۔ یہ سب تفصیل بھی شیخ ابو بکر جصاص رازیؒ نے "احکام القرآن" میں ذکر فرمائی ہے، ص ۴۱ ج ۲۔

۲۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے علامہ آمدیؒ کی "الاحکام فی اصول الاحکام" ص ۱۰۹ تا ۱۱۱ ج اول مطبوعہ مصر۔

۳۔ حوالہ بالا، ص ۱۱۱ ج اول و تفسیر تشرطی، ص ۱۶۲ ج ۲، مطبوعہ مصر۔

صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کبھی مذمت نہیں فرمائی، بلکہ ایسے اختلاف کو امت کے لئے رحمت قرار دیا ہی، اور جس مسئلہ پر اجماع منعقد ہو چکا ہو وہ مسئلہ ظنی یا اجتہادی نہیں رہتا، بلکہ قطعی ہو جاتا ہے، اس سے اختلاف کرنا فقہاء مجتہدین کو بھی جائز نہیں، کیونکہ اس کی مخالفت درحقیقت امت میں پھوٹ ڈالنا ہے، جسے قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے۔

(۵) یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ،
وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ۝ (توبہ: ۱۱۹)

”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو۔“

اس آیت میں ہر زمانہ کے مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ سچے لوگوں ”الصادقین“ کے ساتھ رہیں، جس کا مقصد ظاہری یہ ہے کہ اعمال میں اُن کی پیروی کی جائے، رہا یہ سوال کہ صادقین سے کیسے لوگ مراد ہیں؟ تو اس کا جواب خود قرآن کریم ہی نے سورۃ بقرہ کی آیت (نمبر ۱۱۹) لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُوا وَجُوهَكُمْ تَا— أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۝ میں دیا ہے، وہاں صادقین کی صفات تفصیل سے بیان کی گئی ہیں، جن کا حاصل یہ ہے کہ صادقین وہ حضرات ہیں جو اعتقاد کے بھی سچے ہوں، قول و عمل کے بھی سچے ہوں اور ظاہر و باطن کے بھی سچے ہوں۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ صادقین کا وجود ہر زمانہ میں باقی رہے گا، ورنہ اُن کے ساتھ رہنے کا حکم ہر زمانہ کے تمام مسلمانوں کو نہ دیا جاتا، کیونکہ اسلام نے کسی کو ایسا حکم نہیں دیا جس پر عمل کرنا اس کی قدرت سے باہر ہو، تو اس آیت سے جب یہ ثابت ہو گیا کہ صادقین ہر زمانہ میں موجود رہیں گے تو یہ خود بخود ثابت ہو گیا کہ کسی زمانہ کے سب مسلمان کسی غلط کاری یا گمراہی پر متفق نہیں ہو سکتے، کیونکہ کچھ لوگ بلکہ اکثر لوگ بھی اگر کوئی غلط کام یا فیصلہ کرنا چاہیں گے تو اس زمانہ کے صادقین اس سے اتفاق نہیں کر سکتے معلوم ہوا کہ امت کا اجماعی فیصلہ کبھی گمراہی اور بے دینی کی بات پر یا حق کے خلاف نہیں ہو سکتا۔

چند احادیث

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں اجماع کی حقانیت کو اور زیادہ صراحت اور تاکید سے بیان فرمایا، اس سلسلہ کی احادیث اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا مجموعہ تواتر کو پہنچا ہوا ہے، فقہاء و محدثین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جن احادیث سے اجماع کے حجت بننے پر

استدلال کیا ہر ان میں سے صرف وہ حدیثیں جو احقر کو سرسری تلاش سے دستیاب ہو گئیں اپنی کور وایت کرنے والے صحابہ کرام کی تعداد مجموعی طور پر یہاں لیں ہے، ذرا اہتمام سے جستجو کی جائے تو اس مضمون کی نہ جانے کتنی حدیثیں جو کتنے ہی مزید صحابہ کرامؓ نے روایت کی ہوں گی اور مل جائیں۔ بہر حال جن صحابہ کرامؓ کی روایتیں اس ناچیز کو چند روز کی سرسری تلاش میں ملی ہیں انکے اسمائے گرامی یہ ہیں:

(۱) حضرت ابو بکر (۲) حضرت عمر (۳) حضرت علی (۴) حضرت عبداللہ بن مسعود (۵) حضرت ابن عباس (۶) حضرت عبداللہ بن عمر (۷) حضرت انس (۸) حضرت ابوسعید خدری (۹) حضرت ابو ہریرہ (۱۰) حضرت حذیفہ بن الیمان (۱۱) حضرت میسرہ بن شعبہ (۱۲) حضرت معاویہ (۱۳) حضرت جابر بن عبداللہ (۱۴) حضرت ابوسعود انصاری (۱۵) حضرت ابوذر غفاری (۱۶) حضرت ثوبان (۱۷) حضرت قتادہ بن عبد اللہ بن عمار الکلابی (۱۸) حضرت ابومالک اشجری (۱۹) حضرت عرفہ (۲۰) حضرت حارث اشجری (۲۱) حضرت عامر بن ربیعہ (۲۲) حضرت فضالہ بن عبید (۲۳) حضرت ابولبرصہ (۲۴) حضرت زید بن ارقم (۲۵) حضرت جابر بن سمرہ (۲۶) حضرت ابوامامہ (۲۷) حضرت سعد ابن ابی وقاص (۲۸) حضرت قرقہ البہزی (۲۹) حضرت قرقہ (۳۰) حضرت عتبہ بن عامر (۳۱) حضرت معاذ ابن جبل (۳۲) حضرت مجیر بن مطعم (۳۳) حضرت زید بن ثابت (۳۴) حضرت نعمان بن بشیر (۳۵) حضرت ابوالدرداء (۳۶) حضرت ابو قریصافہ (۳۷) حضرت اسامہ بن شریک (۳۸) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص (۳۹) حضرت عوف بن مالک (۴۰) حضرت عمرو بن شحو (۴۱) حضرت عثمان غنی (۴۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

ان حضرات میں بعض صحابہ کرامؓ نے تو مذکور بالا مضمون کی کئی کئی حدیثیں روایت کی ہیں، لہذا جمعیت اجماع پر دلالت کرنیوالی احادیث کی تعداد تو بہت ہی زیادہ ہو جاتی ہے، پھر صحابہ کرامؓ کے بعد ان احادیث کے راویوں کی تعداد ہر زمانہ میں بڑھتی ہی چلی گئی ہے، ان میں ہر حدیث اگرچہ الگ الگ خبر واحد (غیر متواتر) ہے، اور انکے الفاظ بھی باہم مختلف ہیں مگر اتنی بات ان سب احادیث میں مشترک اور متواتر پائی جاتی ہے کہ اس امت کا متفقہ فیصلہ یا عمل ہر خطا و لغزش سے پاک ہے، اس طرح اجماع کا حجت ہونا تو اتر سے روز روشن کی طرح ثابت ہو جاتا ہے، یہاں سب احادیث نقل کرنے کا تو موقع نہیں، مثال کے طور پر چند ذکر کی جاتی ہیں:-

(۱) حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر ہمیں کوئی ایسا معاملہ پیش آئے جس کے متعلق کوئی صریح حکم یا ممانعت (قرآن و سنت میں) موجود نہ ہو تو میرے لئے آپ کا کیا حکم ہے؟ تو آپ نے فرمایا:-

لے ان سب صحابہ کرامؓ کی روایتوں کے مفصل حوالے آگے احادیث کے ذیل میں تفصیل سے آئیں گے۔

لے دیکھئے علامہ ابن الہمام کی کتاب "التحریر" کی شرح "التقریر" لابن امیر الحاج، ص ۸۵ ج ۳ مطبوعہ مصر ۱۳۱ھ۔

شاو روافیه الفقهاء والعابدين
ولا تمنوا فيه رأى خاصة،
والطبرانی فی الأوسط رجاله موثقون من اهل الصحيح کذا فی مجمع الزوائد
معلوم ہوا کہ کسی زمانہ کے فقہاء و عابدین متفقہ طور پر جس چیز کا حکم دیں یا ممانعت کریں،
اس کی مخالفت جائز نہیں، کیونکہ ان کا متفقہ فیصلہ غلط نہیں ہو سکتا۔
(۲) حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے
ہوتے سنا ہے کہ:

لا تزال طائفة من امتی یقاتلون
على الحق ظاهرين الى يوم القیامۃ
میری امت میں ایک جماعت (قرب)
قیامت تک حق کے لئے سر بلندی کے ساتھ
برسر پیکار رہے گی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے علاوہ مزید آٹھ صحابہ کرام
نے بھی تھوڑے تھوڑے لفظی فرق کے ساتھ (جس سے معنی نہیں بدلتے) روایت کیا ہے، ان
حضرات کی روایتیں صحیح اور قوی سندوں کے ساتھ مستند کتب حدیث میں مذکور ہیں، وہ آٹھ
صحابہ کرام یہ ہیں:-

(۱) حضرت مغیرہ بن شعبہ (۲) حضرت ثویان (۳) حضرت عمر فاروق (۴) حضرت جابر
ابن سمرہ (۵) حضرت ابو ہریرہ (۶) حضرت زید بن ارقم (۷) حضرت ابوامامہ (۸) حضرت مرہ
البہزی رضی اللہ عنہم اجمعین۔

۱۔ مجمع الزوائد باب فی الاجماع، ص ۸، ج اول، طبع بیروت۔
۲۔ مسلم شریف، کتاب الایمان، باب نزول عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام، ص ۸، ج اول، طبع کراچی۔
۳۔ صحیح بخاری، کتاب الاعتقاد باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم "لا تزال طائفة من امتی الخ" ص ۱۰۸، ج ۲، طبع کراچی۔
۴۔ سنن ابی داؤد، کتاب الفتن، ص ۵۸۳، ۵۸۴، ج ۲، طبع کراچی، سنن ابن جمہ
ابواب الفتن باب ما یكون من الفتن، ص ۲۸۳، طبع کراچی۔
۵۔ صحیح بخاری کتاب العلم باب "من یرشد
بخیرالکم" ص ۱۶، ج اول۔
۶۔ حضرت عمرؓ حضرت مرہ البہزی رضی اللہ عنہما تک چھ حضرات صحابہ
کی روایتیں علامہ ہیثمیؒ نے مجمع الزوائد میں اسانید و متون اور اصل مآخذ کے حوالوں کیساتھ (باقی اگلے صفحہ)

امام بخاریؒ کی رائے ہے کہ اس حدیث میں جس جماعت کا ذکر ہے اس سے مراد اہل علم ہیں، ... بہر حال اس حدیث میں صراحت ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت ہر زمانے میں حق پر قائم رہے گی، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس امت کا مجموعہ کبھی کسی گمراہی یا غلط کاری پر متفق نہیں ہو سکتا۔

(۳) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد خطبہ دیتے ہوئے مجمع عام میں سنایا کہ :-

لن یزال امر هذه الامة مستقیماً	اُس امت کی حالت قیامت تک سیدھی
حتی تقوم الساعة،	اور درست رہے گی۔

معلوم ہوا کہ پوری امت کا مجموعہ کبھی کسی غلط بات پر متفق نہیں ہو سکتا۔

(۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اجماع کے حجت ہونے پر سب سے زیادہ صریح ہے کہ :-

ان الله لا یجمع اقلی او قال اُمت محمد علی ضلالة، وید الله علی الجماعة ومن شد شد علی لنا	اللہ میری امت کو کسی گمراہی پر متفق نہیں کرے گا، اور اللہ کا ہاتھ جماعت (مسلمین) پر ہے اور جو الگ راستہ اختیار کرے گا جہنم کی طرف جائے گا۔
---	--

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد آٹھ صحابہ کرامؓ نے تھوڑے تھوڑے لفظی فرق کے ساتھ نقل کیا ہے، کسی نے تفصیل سے کام لیا ہے کسی نے اختصار سے، مگر اتنا جملہ سب صحابہ کرامؓ نے نقل فرمایا ہے کہ: "امت محمدیہ کو اللہ تعالیٰ گمراہی پر متفق نہیں کرے گا۔"

ادھر حدیث کے جو الفاظ لکھے گئے ہیں یہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے روایت کردہ ہیں، باقی سات صحابہ کرامؓ جنہوں نے یہ حدیث روایت کی ہے یہ ہیں :-

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) نقل فرما کر سب کی سندوں کی توثیق فرمائی ہے، البتہ صرف حضرت مرقۃ البہزی رضی اللہ عنہ کی روایت جو طبرانی کے حوالہ سے نقل کی ہے، اُس کی سند کے متعلق یہ کہا ہے کہ "وفیہ جماعة لم اعرفہم" دیکھتے مجمع الزوائد، ص ۲۸، تا ص ۲۸۹ ج ۲، طبع بیروت ۱۹۶۷ء۔

۱۔ صحیح بخاری کتاب العلم باب "من یرد اللہ بہ خیراً" الخ ص ۱۶ ج اول۔

۲۔ جامع ترمذی، ابواب الفتن، باب لزوم الجماعة، ص ۴۹ ج ۲، طبع کراچی و مستدرک حاکم کتاب کتاب العلم، ص ۱۱۵ تا ص ۱۱۶ ج اول، طبع دکن ۱۳۳۴ھ، ترمذی نے اس حدیث کو "حدیث غریب" من ہذا الوجه" کہا ہے، مگر یہ "غریب" کہنا سند کے ایک خاص طریق کی بناء پر ہے۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

(۱) حضرت ابن عباس (۲) حضرت انس (۳) حضرت ابومالک اشعری (۴) حضرت ابوبصرہ
(۵) حضرت قدامہ بن عبد اللہ بن عمار الکلابی،

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ورنہ حاکم نے اسی حدیث کی سند شات مختلف طرق سے بیان کی ہے، ان سب
طرق کا مدار معمر بن سلیمان پر ہے، جو ائمہ حدیث میں سے ہیں، اور ان میں کئی طریق سند کے لحاظ سے صحیح ہیں
چنانچہ طریق اول میں معمر کے شاگرد خالد کے متعلق حاکم فرماتے ہیں کہ ”خالد بن یزید یسری شیخ قدیم للبغداد
وہو حفظ ہذا الحدیث لکھنا، بالیقین“ پانچواں طریق جس میں معمر کے شیخ سالم بن ابی الذیال ہیں اس کے متعلق
فرماتے ہیں کہ ”ہذا لو کان محفوظاً من الراوی لکان من شرط الصحیح“ کیونکہ بقول حافظ ابن حجر سلم بن ابی الذیال
ثقہ ہیں، اور ان سے ایک حدیث صحیح مسلم میں مروی ہے (تقریب التہذیب، ص ۳۱۳ ج اول)

حاکم نے ساتوں طرق بیان کرنے کے بعد کہا ہے کہ ”ان المعمر بن سلیمان احداً من ائمہ الحدیث وقد رُعی
عزاً الحدیث باسانید صحیح بمثلها الحدیث فلا بد ان یکون له اصل باحد ہذہ الاسانید (حاکم کی اس پوری
تحقیق پر حافظ ذہبیؒ نے سکوت فرمایا ہے جو ان کی توثیق کی علامت ہے)۔

۱۰ جامع ترمذی حوالہ بالا و مستدرک حاکم حوالہ بالا، ص ۱۱۶ ج اول۔

۱۱ سنن ابن ماجہ ابواب الفتن، باب السواد الاعظم، ص ۲۸۳، طبع کراچی و مستدرک کتاب العلم
ص ۱۱۶ ج اول و کتاب الفقیہ والمتفقہ للخطیب ص ۱۶۱ جز و پنجم مطبوعہ ریاض، ۱۳۸۹ھ۔

۱۲ سنن ابی داؤد، کتاب الفتن، ص ۵۸۲، ج ۲، طبع کراچی، و جمع الفوائد، ص ۵۸۲ ج ۲،
طبع المدینۃ المنورۃ، ابو داؤد نے ابومالک اشعری کی اس روایت پر سکوت کیا، جو اس بات کی علامت
ہے کہ اس کی سند ان کے نزدیک قابل استدلال ہے۔

۱۳ مجمع الزوائد بحوالہ مسند حماد، باب فی الاجماع، ص ۱۷۷ ج اول، طبع بیروت ۱۹۶۷ء،
والتفسیر و التجرید بحوالہ مسند و الطبرانی، ص ۸۵ ج ۳، ابن امیر الحاج ”التقریر“ میں نقل فرماتے
ہیں کہ: ابوبصرہ کی اس روایت کے تمام راوی ”رجال صحیح“ ہیں، سوائے ایک تابعی کے جو مبہم ہے،
لیکن اس روایت کا ایک شاہد حدیث مرسل ہے، جس کے سب رجال صحیح ہیں، اُسے طبریؒ نے سورۃ
انعام کی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔

۱۴ مستدرک حاکم، ص ۵۰ ج ۲، حاکم حضرت قدامہ کی اس روایت کے متعلق فرماتے ہیں کہ:
”ہذا الحدیث لم نکتب بہذا الاسناد الا حدیثاً واحداً“ حافظ ذہبیؒ نے یہاں بھی سکوت فرمایا ہے۔

(۶) حضرت ابوہریرہؓ (۷) حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہم اجمعین۔
ان آٹھ صحابہ کرام کے علاوہ اس حدیث کو مشہور تابعی حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے
کسی صحابی کا حوالہ دیتے بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔

۵۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ حاضرین کے سامنے خطبہ دیا، اور فرمایا کہ
آج میں تمھارے سامنے اس طرح خطبہ دینے کے لئے کھڑا ہوں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
ہمارے سامنے کھڑے ہوتے تھے، اور آپ نے ہمیں خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ :-

او صیکم بأصحابی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم، ثم یفشو الذنب حتی یعلف الرجل ولا یستحلف ولینہد ولا یتشهد،	تیں تم کو اپنے صحابہ (کی پیروی) کی وصیت کرتا ہوں، پھر ان لوگوں (کی پیروی) کی جو ان کے بعد ہوں گے، (یعنی تابعین) پھر ان لوگوں (کی پیروی) کی جو ان (تابعین) کے
---	---

۱۔ کتاب الفقیہ والمتفقہ للخطیب البغدادی، ص ۶۲ جزو خامس، مطبوعہ ریاض، خطیب نے
ابوہریرہؓ کی یہ روایت اپنی سند سے بیان کی ہے، اور سند پر کوئی کلام نہیں کیا۔

۲۔ مستدرک حاکم، ص ۵۰ ج ۲ و فتح الباری، ص ۳۱ ج ۱۳ مطبوعہ بیروت سنہ ۱۳۸۴ م، حافظ
ابن حجرؒ اور حاکم نے ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کی یہ روایت موقوفاً بیان کی ہے، حافظ ابن حجرؒ
نے سکوت فرمایا ہے جو ان کی توفیق کی علامت ہے، اور حاکم نے اسے ”صحیح علی شرط مسلم“ قرار دیا ہے،
اور ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ ”یہ حدیث ہم نے مسنداً (غالباً مرفوعاً) مراد ہیں، رفیع، بھی اپنے پاس
لکھی ہے، مگر اس کی سند شرط مسلم کے معیار پر نہیں (اس لئے مستدرک میں اسے ذکر نہیں کیا)
حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے حاکم کی اس پوری تحقیق پر یہاں بھی سکوت فرمایا ہے۔

۳۔ دیکھئے التقریر والتجیر، ص ۸۵ ج ۳، وتفسیر ابن جریر طبری، سورۃ آلعام، ص ۱۳ ج ۴،
علامہ ابن امیر الحاج نے حضرت حسن بصریؒ کی اس مرسل روایت کے بارے میں کہا ہے کہ ”اس کے تمام
راوی صحیح کے رجال ہیں“

۴۔ جامع الترمذی، ص ۸۴۹ ج ۲ مطبوعہ قرآن محل کراچی، و مستدرک حاکم، ص ۱۱۲ ج ۱،
امام ترمذی نے اس حدیث کو ”حسن صحیح غریب من ہذا الوجه“ کہا ہے، اور حاکم اور حافظ ذہبی دونوں نے اسے
”صحیح علی شرط الشیخین“ قرار دیا ہے۔

فمن اراد متکم بـُجُوحَةِ الْجَنَّةِ
فليلزم الجماعة فان الشيطان
مع الواحد وهو من الاثنين
ابعد، (رواه الترمذی فی
الجامع والحاکم فی المستدرک
واللفظ له قال الحاكم هذا
حدیث صحیح علی شرط الشيخین
ولم یخرجاه واقرة الذہبی)

بعد ہوں گے (یعنی تبع تابعین) پھر جھوٹ
پھیل جائے گا حتیٰ کہ آدمی قسم کھائے گا، حالانکہ
اس سے کسی نے قسم کا مطالبہ نہ کیا ہوگا
اور گواہی دے گا حالانکہ اس سے کسی نے
گواہی طلب نہ کی ہوگی، پس تم میں سے
جو شخص جنت کے بچوں پر رہنا چاہتا ہو
وہ ”الجماعۃ“ (مخصوص جماعت) کو لازم پکڑے
(یعنی اپنے اعتقاد اور افعال میں اس جماعت

کا اتباع کرے) کیونکہ شیطان ایک کے ساتھ ہوتا ہے اور دوسے زیادہ دور رہتا ہے۔
اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبع تابعین کے بعد دنیا میں جھوٹ پھیل
جانے کی خبر دی ہے، مگر ساتھ ہی ”الجماعۃ“ (مخصوص جماعت) کے ساتھ رہنے اور اس کی
پیروی کرنے کا حکم دیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ دینی اعتبار سے پکڑے ہوئے زمانے میں بھی امت
میں ایک خاص ”جماعت“ ایسی موجود رہے گی جو حق پر ہوگی، اور اس کا اتباع واجب ہوگا،
جس کا لازمی نتیجہ وہی ہے جو چھپے کئی آیات و احادیث سے معلوم ہو چکا ہے، کہ امت کا پورا مجموعہ
کبھی گمراہی پر متفق نہیں ہوگا، رہی یہ بات کہ ”الجماعۃ“ سے مسلمانوں کی کیسی جماعت مراد ہے؟
اس کی وضاحت آگے آئے گی۔

”الجماعۃ“ کے ساتھ رہنے اور اس کے اتباع کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو
حکم حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس حدیث میں نقل فرمایا ہے اسے چار اور صحابہ کرام (۱) حضرت
سعد بن ابی وقاص (۲) حضرت عبداللہ بن عمر (۳) حضرت حذیفہ اور (۴) حضرت معاذ بن جبل
لہ ”الجماعۃ“ عربی زبان میں مخصوص جماعت کو کہتے ہیں، جس کی تشریح آگے آئے گی۔

۱۵ مستدرک حاکم، ص ۱۱۴ و ۱۱۵، ج اول، حاکم اور ذہبی دونوں نے ان کی روایت کو بھی سنداً
”صحیح“ قرار دیا ہے، ۱۶ مستدرک حاکم، ص ۱۱۴، ج اول۔

۱۷ صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب کیف الامر اذا لم یکن جماعۃ، ص ۱۰۲۹ ج ۲ و صحیح مسلم کتاب الامارۃ
باب وجوب ملازمة جماعۃ المسلمین عند ظهور الفتن، ص ۱۲۷ ج ۲۔

۱۸ مشکوٰۃ شریف، ص ۳۱ ج ۱ کتاب العلم باب الاعتصام بالکتاب السنۃ بحوالہ مسند احمد۔

رضی اللہ عنہم نے بھی روایت کیا ہے۔

۶۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ کی مسجد خیف میں خطبہ حجۃ الوداع میں ارشاد فرمایا کہ :

ثلاث لا یغل علیہن قلب مسلم	تین خصلتیں ایسی ہیں کہ ان کی موجودگی میں
اخلاص العمل لله، والنصيحة	کسی مسلمان کا دل خیانت نہیں کرتا، عمل میں
للمسلمين ولزوم جماعتهم فان	اللہ کے لئے اخلاص، مسلمانوں کی خیر خواہی
دعوتهم تعیط من ورائهم۔	اور جماعتِ مسلمین کا اتباع، کیونکہ ان کی دعا،

پچھے سے ان کا احاطہ کئے ہوئے ہے (جو ان کو گمراہی اور نفس و شیطان کی حیلہ سازیوں سے بچاتی ہے)۔

معلوم ہوا کہ جو شخص اپنے اعتقاد اور عمل میں جماعتِ مسلمین کا اتباع کرے گا، خیانت اور گمراہی سے محفوظ رہے گا، اس حدیث کا حاصل بھی وہی ہے کہ جماعتِ مسلمین کا متفقہ عقیدہ یا عمل کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔

اس حدیث کو درشل صحابہ کرام نے روایت کیا ہے جن کے اسماء گرامی یہ ہیں :-
(۱) حضرت ابن مسعود (۲) حضرت انس (۳) حضرت جبیر بن مطعم (۴) حضرت زید بن ثابت،

۱۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب العلم، الفصل الثانی، ص ۳۵ ج اول، (اصح المطالعیہ کراچی) (بحوالہ امام شافعی دہلی)
نیز دیکھئے "الرسالۃ" للامام الشافعی الجزء الثالث، ص ۲۰۱ تا ص ۲۰۳ (مطبعة مصطفیٰ البابی الحلبي، مصر
الطبعة الاولى سنة ۱۳۸۵ھ) امام شافعی نے اس حدیث سے بھی اجماع کی حجت پر استدلال کیا ہے۔
۲۔ مسند احمد، ص ۲۲۵ ج ۳، مطبوعہ بیروت

۳۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسک، باب الخطبہ یوم النحر، ص ۲۱۹، (اصح المطالعیہ کراچی)، ابن ماجہ کی روایت معلوم
ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد خطبہ حجۃ الوداع میں منیٰ کی مسجد خیف میں فرمایا تھا، اور
مجمع الزوائد میں تو اس کی پوری صراحت ہے، دیکھئے مجمع الزوائد، ص ۳۹ تا ۴۰ ج ۱، و مسند احمد، ص ۸۰ و ۸۲ ج ۲
و مستدرک حاکم، کتاب العلم باب "ثلاث لا یغل علیہن الخ"، ص ۸۸ تا ۸۸ ج اول، حاکم اور ذہبی دونوں نے انکی
روایت کو "صحیح علی شرط الشیخین" کہا ہے۔

۴۔ مسند احمد، ص ۱۸۳ ج ۵۔

(۵) حضرت نعمان بن بشیر (۶) حضرت ابوسعید خدری (۷) حضرت ابوالدرداء (۸) حضرت معاذ بن جبل (۹) حضرت جابر (۱۰) حضرت ابوترصافہ، رضی اللہ عنہم اجمعین۔

۷۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:-

يَذُّ اللّٰهُ عَلَى الْجَمَاعَةِ، وَمَنْ
شَذَّ شَذَّ اِلَى النَّارِ۔
”اللہ کا ہاتھ جماعت (مسلمین) پر ہے،
اور جو شخص (ان سے) الگ راستہ اختیار
کرے گا جہنم کی طرف جاتے گا۔“

معلوم ہوا کہ ”الجماعۃ“ (مسلمانوں کی ایک مخصوص جماعت) کو اللہ تعالیٰ کی خاص تائید و رہنمائی حاصل ہے، جو اس کو ہر خطار سے بچاتی ہے، اُن کے متفقہ عقیدہ یا عمل کے خلاف جو بات ہوگی غلط اور باطل ہوگی، اسی لئے پچھلی احادیث میں ”الجماعۃ“ کے اتباع کا حکم بڑی تاکید سے دیا گیا ہے، اور یہاں ”الجماعۃ“ سے الگ راستہ اختیار کرنے والوں کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اُن کا راستہ جہنم کا راستہ ہے۔

یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے، اور اس کا پہلا جملہ ”ید اللہ علی الجماعۃ“ مزید دو صحابہ کرام (۱) حضرت عبداللہ بن عباس اور (۲) حضرت عسکر فخر

۱۔ مستدرک کتاب العلم، باب ”ثلاث لا یغل علیہن الخ“ ص ۸۸ ج اول، حاکم اور ذہبی دونوں نے ان کی روایت کو ”صحیح علی شرط مسلم“ قرار دیا ہے۔

۲۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے حضرت ابوترصافہؓ تک پانچ صحابہ کرام کی روایتیں علامہ ہیثمیؒ نے مجمع الزوائد میں قدرے ضعیف یا غیر موثق سندوں سے ذکر کی ہیں، ص ۱۳۷ تا ص ۱۳۹ ج ۱۔

۳۔ ابوترصافہ، ان کی کنیت اور نام ”جندرة بن خيشنة“ ہے، علامہ ابن الاثير جزیریؒ نے اُسد الغابہ میں کہا ہے کہ یہ صحابی ہیں، فلسطین جا کر آباد ہو گئے تھے، شام کے محدثین نے ان سے حدیثیں روایت کی ہیں، اُسد الغابہ میں ان کے والد کا نام ایک جگہ ”خيشنة“ اور دوسری جگہ ”خيشنة“ لکھا ہے، یہ ظاہر پہلا ہی نام صحیح ہے، کیونکہ اس کے

حروف کو علامہ جزیریؒ نے ضبط کیا ہے، دوسرے کو ضبط نہیں کیا بلکہ اُسد الغابہ ص ۳۰ ج ۳ و ص ۳۷ ج ۵، مجمع الزوائد میں ان صحابی کا نام ”حیدرہ بن خيشنة“ لکھا ہے، جو ظاہر کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے، دیکھئے مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۳۷۔

۴۔ جامع ترمذی، ابواب الفتن، باب لزوم الجماعة، ص ۲۹ ج ۲، مستدرک کتاب العلم، ص ۱۱۵ ج ۱، اس حدیث کی سند کا مفصل حال حدیث نمبر ۴ کے متعلقہ حاشیہ میں پیچھے بیان ہو چکا ہے، کیونکہ یہ حدیث درحقیقت حدیث نمبر ۴ ہی کا آخری حصہ ہے۔ ۵۔ جامع ترمذی حوالہ بالا، و مستدرک حوالہ بالا، ص ۱۱۶ ج ۱۔

۶۔ سنن نسائی، ص ۱۵۸ ج ۲، و کتاب الفقیہ والمتفقہ، ص ۱۶۲ جزو خامس۔

رضی اللہ عنہما نے بھی روایت کیا ہے۔

۸۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

جس شخص نے جماعت (مسلمین) سے علیحدگی
اختیار کی اور اسی حالت میں مر گیا، تو وہ
جاہلیت کی موت مرا

مَنْ قَارَعَ الْجَمَاعَةَ يَشْبُرًا
فَمَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً، رَوَاهُ
البخاری ومسلم والخطیب وغیرہ

عن ابن عباس وغیرہ

”جاہلیت“ قرآن و سنت کی اصطلاح میں اس دور کو کہا گیا ہے جب عرب میں کفر کا
گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا، اور اسلام کا سورج طلوع نہ ہوا تھا، اس حدیث سے اندازہ
کیا جاسکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ”الجماعۃ“ سے علیحدگی اختیار کرنے یعنی اُن کے
متفقہ فیصلے، عقیدے یا عمل کی مخالفت کو کتنا سنگین جرم قرار دیا ہے، آپ نے اس کی ممانعت
میں اتنی تاکید سے کام لیا کہ معترکتہ حدیث میں صرف اسی مضمون کی اٹھارہ حدیثیں اقم الحروف
کو ملی ہیں جو سولہ صحابہ کرام نے روایت کی ہیں، ان میں ”الجماعۃ“ سے علیحدگی کی نہ صرف شدید
نذمت کی گئی، بلکہ اس پر دنیا و آخرت کی سخت سزائیں مختلف انداز اور مختلف الفاظ میں بیان
فرمائی ہیں، کئی حدیثوں میں ارشاد ہے کہ جس نے ”الجماعۃ“ سے بالشت بھر علیحدگی اختیار کی اور مر گیا تو
وہ جاہلیت کی موت مرا، کچھ حدیثوں میں ارشاد ہے کہ:-

”اُس نے اسلام کا پھندا اپنی گردن
سے نکال دیا“

فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْإِسْلَامِ مِنْ
عُنُقِهِ۔

کہیں ارشاد ہے کہ:-

”وہ آگ میں داخل ہو گا“

دَخَلَ النَّارَ۔

کہیں ارشاد ہے کہ:-

”اُس کے پاس کوئی دلیل نہ رہی جس کی بناء
پر اسے معذور قرار دیا جاسکے اور وہ عذاب سے بچ سکے“

فَلَا حُجَّةَ لَهُ۔

پر اسے معذور قرار دیا جاسکے اور وہ عذاب سے بچ سکے“

کہیں ارشاد ہے:-

”ایسے لوگوں کا کچھ حال نہ پوچھو کہ اُن پر آخرت
میں کیا عذاب ہونے والا ہے“

فَلَا تَسْأَلْ عَنْهُمْ۔

کہیں سرمان ہے کہ :-

فَاَقْتُلُوْهُ۔

”اُسے قتل کر ڈالو“

کہیں حکم ہے کہ :-

فَاَصْبِرْ بُوْا عُنُقَهُ كَاِذَا مَنَّ كَان۔

”اُس کی گردن مار دو خواہ وہ کوئی بھی ہو“

کہیں سرمایا کہ :-

فَاِنَّ الشَّيْطَانَ مَعَ مَنْ فَارَقَ

”جو شخص ”الجماعۃ“ سے علیحدگی اختیار کرے

الْجَمَاعَةِ يَرْكُضُ۔

اس کے ساتھ شیطان ہوتا ہے جوڑے گناہ

کی طرف (ایڑ لگاتا) دوڑاتا رہتا ہے“

کہیں سرمایا :-

اُقْتُلُوا الْفَزَّ مَنْ كَانَتْ مِنَ النَّاسِ۔

”علحدگی اختیار کرنے (الجماعۃ کی مخالفت

کرنے والے کو قتل کر دو، وہ کوئی بھی آدمی ہو“

کہیں ارشاد ہے کہ :-

وَاَمَّا تَرْكُ السُّنَّةِ فَالْخُرُوجُ

”ترک سنت یہ ہے کہ ”الجماعۃ“ سے خارج

مِنَ الْجَمَاعَةِ۔

ہو جائے“

ایک حدیث صحیح میں یہ قانون بتایا گیا ہے کہ کسی کلمہ گو مسلمان کا خون ضررین صورتوں میں

حلال ہوتا ہے، جن میں سے ایک صورت یہ ہے کہ وہ :-

اَلشَّارِكُ لِدِيْنِهِ اَلْمُفْتَارِقُ

”اپنے دین کو چھوڑنے والا (یعنی) ”الجماعۃ“

لِلْجَمَاعَةِ۔

سے علیحدگی اختیار کرنے والا ہو“

جن صحابہ کرام نے یہ حدیثیں روایت کی ہیں اُن کے اسماء گرامی یہ ہیں :-

(۱) حضرت ابن عباس (۲) حضرت عثمان غنی

۱۔ صحیح بخاری، اول کتاب الفتن، باب ما جاء في قول الله ”وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبُنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا“ ص ۱۰۳۵

۲۔ صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب ما جاء في لزومۃ المسلمین، ص ۱۲۸ ج ثانی، و کتاب الفقیہ والمتفقۃ ص ۱۶۳

۳۔ ان کی روایت التارک لدینہ المفارق للجماعۃ کے لئے دیکھئے جامع ترمذی باب ما جاء لا یکل

دم امر المسلم الی باعدی ثلاث ابواب الدیات، ص ۲۰۳، ج اول۔

(۳) حضرت عرفجہ (۴) حضرت اسامہ بن شریک (۵) حضرت عائشہ (۶) حضرت ابو ہریرہ،
(۷) حضرت ابوذر غفاری (۸) حضرت حارث اشعری (۹) حضرت معاویہ (۱۰) حضرت ابن عمر

لہ ان کی روایت "فاخرہ بالسيف" کے لئے دیکھئے صحیح مسلم کتاب الامارۃ، باب حکم من فرق امر المسلمین ۱۲
ج ثانی، سنن نسائی، کتاب المحارۃ "قتل من فارق الجماعة" ص ۵۸ ج ثانی سنن ابوداؤد، کتاب السنۃ
باب قتل الخوارج، ص ۶۵۵ ج ثانی۔

لہ ان کی روایت "فاخرہ بالعنقہ" کے لئے دیکھئے سنن نسائی، حوالہ بالا۔

لہ ان کی روایت "التارک لدینہ المفارق للجماعۃ" دیکھئے صحیح مسلم، کتاب القسامۃ والقصاص باب ما یباح
بدم المسلم، ص ۵۹ ج ثانی، وترمذی ابواب الدیات باب ما جاز لا یحل دم امرئ مسلم الخ ص ۲۰۳ ج اول۔
لہ ان کی روایت "ما تریثہ جالیئہ" کے لئے دیکھئے سنن نسائی کتاب المحابۃ "التغلیظ فممن قاتل تحت
راۃ عتیۃ" ص ۶۸ ج ثانی و مستدرک کتاب العلم "من فارق الجماعة الخ" ص ۱۱۸ ج اول حاکم اور ذہبی نے
ابو ہریرہ کی اس روایت کی سند کے متعلق کہا ہے کہ "قد اتفق علی اخراج ابی ہریرۃ فی مثل ہذا"

نیز ابو ہریرہ ہی کی روایت "واما ترک السنۃ فاعز وج من الجماعة" کے لئے دیکھئے مستدرک کتاب العلم،
ص ۱۲۰ ج اول، اس روایت کو حاکم اور ذہبی نے "صحیح علی شرط مسلم" قرار دیا ہے،

لہ ان کی روایت "فقد خلع ربقة الاسلام من عنقہ" کے لئے دیکھئے سنن ابوداؤد، کتاب السنۃ باب قتل
الخوارج، ص ۶۵۵ ج ثانی، ابوداؤد نے ان کی روایت کی سند پر کوئی کلام نہیں کیا، نیز دیکھئے مستدرک
ص ۱۱۷ ج اول، قال الذہبی فی سندہ "خالد لم یضعف"۔

لہ ان کی روایت میں بھی وہی الفاظ ہیں جو ابوذرؓ کی روایت میں ہیں، دیکھئے جامع ترمذی ابواب
الامثال باب ما جاء فی مثل الصلوۃ والصیام الخ، ص ۱۲۹ ج ۲، امام ترمذی نے ان کی روایت کو "حدیث
حسن صحیح غریب" کہا ہے، اور اسی حدیث کا ایک اور طریق بھی بیان کیا ہے، نیز دیکھئے مستدرک کتاب العلم
ص ۱۱۷ و ۱۱۸ ج اول۔

لہ مستدرک، ص ۱۱۸ ج اول، حاکم اور ذہبی نے ان کی روایت "من فارق الجماعة مشراً وحلاً
النار" کی سند پر سکوت کیا ہے۔

لہ ان کی روایت "فلا حجة لہ" کی سند کے متعلق حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ "قد اتفق علی اخراج ابی ہریرۃ فی مثل ہذا"
دیکھئے مستدرک مع تلخیص ص ۱۱۸ و ۱۱۹ ج اول، نیز ابن عمرؓ کی ایک اور روایت "اخرج من عنقہ ربقہ

الاسلام" کے لئے دیکھئے کتاب الفقیۃ والمتفقۃ، ص ۱۶۲، جزو خامس۔

(۱۱) حضرت حذیفہؓ (۱۲) حضرت عامر بن ربیعہ (۱۳) حضرت فضالہ بن عبید (۱۴) حضرت ابن مسعودؓ (۱۵) حضرت ابومالک اشجری (۱۶) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہم اجمعین۔

۹۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ:-

ان امتی لا تجتمع علی ضلالة	تیری امت کسی گمراہی پر متفق نہیں ہوگی
فاذا رأیتم اخلاقاً فعلیکم بالسواد الاعظم۔	پس جب تم (لوگوں میں) اختلاف دیکھو تو
	تسواد اعظم کو لازم پکڑو (یعنی اس کا اتباع کرو)۔

اس حدیث کا پہلا جملہ تو سچے بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے آچکا ہے، یہاں اس کا دوسرا جملہ ”پس جب تم اختلاف دیکھو تو سواد اعظم کو لازم پکڑو“ بیان کرنا مقصود ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دوسرا جملہ حضرت انسؓ کے علاوہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے بھی ایک اور روایت میں اس طرح نقل کیا ہے کہ:-

۱۰۔ مستدرک ص ۱۱۹ ج اول، حافظ ذہبی نے ان کی روایت کردہ حدیث کو ”صحیح“ کہا ہے۔

۱۱۔ ان کی روایت ”مات مینتہ جاہلیۃ“ کے لئے دیکھئے کتاب الفقیہ والمتفقہ، ص ۱۶۳، جزو خامس۔

۱۲۔ مستدرک ص ۱۱۹ ج اول، حاکم اور ذہبی نے ان کی روایت ”فلا تسأل عنہم“ کو ”صحیح علی شرط الشیخین“ کہا ہے۔

۱۳۔ ان کی روایت ”فاقتلوا“ کے لئے دیکھئے کتاب الفقیہ والمتفقہ، ص ۱۶۴، جزو خامس، نیز ان کی ایک اور روایت ”الناک لدینہ المغارق للجماعۃ“ کے لئے دیکھئے کتاب القسامۃ والقصاص باب ما یباح بہ دم المسلم ص ۲۵۹ و ترمذی ابواب التیات باب ما جاء لایحل دم امرأ مسلم، ص ۲۰۳ ج اول۔ ۱۴۔ حوالہ ایضاً

۱۵۔ یہ اسم گرامی سب سے پہلے لکھنا چاہئے تھا، مگر ان کی روایت ”اقتلوا الفذ“ الخ جس سند سے منقول ہے، اس میں ایک راوی ”صالح بن میثم“ ہیں جن کے متعلق حافظ ہیثمیؒ نے کہا ہے کہ ”میں ان کو نہیں جانتا اس سند کے باقی سب راوی ثقہ ہیں“، دیکھئے مجمع الزوائد، ص ۲۳۳ ج سادس،

۱۶۔ سنن ابن ماجہ، ابواب الفتن، باب السواد الاعظم، ص ۲۸۳

۱۷۔ مستدرک کتاب العلم ص ۱۱۵ ج اول، حاکم نے ابن عمرؓ کی یہ روایت دو طریق سے نقل کی ہے اور دونوں کے باہر میں محبت سند کا رجحان ظاہر کیا ہے، مگر صحت کا فیصلہ نہیں کیا، حافظ ذہبیؒ نے سکوت کیا ہے۔

فَاتَّبِعُوا السَّوَادَ الْأَعْظَمَ فَإِنَّهُ
مَنْ شَدَّ شَدَّ فِي النَّارِ۔

پس تم سواد اعظم کا اتباع کرو، کیونکہ جو شخص
اگل راستہ اختیار کرے جہنم میں جائے گا،

معلوم ہوا کہ امت کا سواد اعظم ہمیشہ حق پر رہے گا، یعنی کبھی غلط بات پر متفق نہ ہوگا، ورنہ
اس کے اتباع کا حکم نہ دیا جاتا۔

”الجماعۃ“ اور ”سواد اعظم“ | ”السواد الاعظم“ عربی زبان میں ”عظیم ترین جماعت“ کو کہا جاتا ہے، یہاں
سے کیا مراد ہے؟ مسلمانوں کا وہ فرقہ مراد ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے

صحابہ کے طریقہ پر ہو، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابہ کرام کے طریقہ کو حق اور
واجب الاتباع سمجھتا اور اس کی مخالفت کو باطل قرار دیتا ہو، چنانچہ چار صحابہ کرام، حضرت
ابوالدرداء، حضرت ابوامامہ، حضرت واثلہ بن الاسقع اور حضرت انس رضی اللہ عنہم کی روایت
ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ”سواد اعظم کیا ہے؟ تو آپ نے
فرمایا کہ ”وہ لوگ جو اُس طریقہ پر ہوں جو میرا اور میرے صحابہ کا ہے“ یہی مضمون اگلی حدیث میں بھی وصفاً
سے آ رہا ہے:-

۱۰۔ حضرت عبد اللہ بن عمر بن العاص رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا کہ:-

أَنَّ بَنِي إِسْرَائِيلَ تَفَرَّقَتْ عَلَى
ثَلَاثِينَ وَسَبْعِينَ مِلَّةً، وَ

بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے تھے،
اور میری امت بہتر فرقوں میں بٹ جائے گی،

۱۱۔ مجمع الزوائد، کتاب العلم، باب ما جاء في المراء، ص ۱۵۶، ج ۱، کتاب الفتن، باب افراق الامم ص ۲۵۹
ج ۱، صالح بحوالہ بطرانی، الکبیر، حافظ ہیثمیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں ایک راوی ”کثر بن مردان“ ہیں جو بہت
ضعیف ہیں، لیکن راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ جو مضمون اس روایت میں بیان کیا گیا ہے وہی مضمون اگلی حدیث
نمبر ۱۱ میں قوی سند کے ساتھ آ رہا ہے، لہذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس مضمون کے ثابت ہونے میں
کوئی اشکال نہیں، (رفیع)

۱۲۔ جامع ترمذی، ابواب الایمان، باب افراق ہذہ الامۃ، ص ۱۰۴، ج ۱، ثانی، امام ترمذیؒ نے یہ حدیث قوی
سند سے روایت کی ہے، اور اسے ”حسن“ قرار دیا ہے، فرماتے ہیں کہ: ”ہذا حدیث حسن غریب مفسر لا نعرفہ
مثل ہذا الا من ہذا الوجه“

یہ سب آگ میں جائیں گے سوائے ایک فرقہ کے، صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہؐ وہ کونسا فرقہ ہے؟ فرمایا جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔

وَتَفْتَرِقُ أُمَّتِي عَلَى ثَلَاثٍ وَسَبْعِينَ
مِلَّةً كُلُّهُمْ فِي النَّارِ إِلَّا مِلَّةً وَاحِدَةً
قَالُوا مَنْ هِيَ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ
مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَسْحَابِي۔

• آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کے علاوہ مزید پانچ صحابہ کرام نے تھوڑے تھوڑے لفظی فرق کے ساتھ روایت کیا ہے، جن کے اسماء گرامی یہ ہیں:-
(۱) حضرت معاذ بن (۲) حضرت عوث بن مالک (۳) حضرت انس (۴) حضرت عمار بن عموث (۵) حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

ان سب حضرات کی روایتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرنے میں متفق ہیں کہ میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی، جن میں سے ایک فرقہ نجات پاتے گا باقی سب فرقے آگ میں جائیں گے، رہا یہ سوال کہ وہ نجات یافتہ فرقہ کونسا ہے؟ تو اس کا جواب ان روایتوں میں مختلف الفاظ سے دیا گیا ہے، ایک جواب حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی روایت میں ادبر آیا ہے کہ ”وہ فرقہ وہ ہے جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں“ یہ وہی بات ہے جو پچھلی حدیث (نمبر ۹) میں ”السواد الاعظم“ کے متعلق فرمائی گئی ہے۔

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس فرقہ کو ”السواد الاعظم“ کے نام سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

۱۔ سنن ابوداؤد اول کتاب السنۃ، ص ۶۳۱ ج ثانی، مشکوٰۃ، ص ۳۰ ج اول بحوالہ ترمذی۔

۲۔ سنن ابن ماجہ، ابواب الفتن، باب افتراق الامم، ص ۲۸۷۔

۳۔ مجمع الزوائد، کتاب قتال اہل البغی، باب ماجاء فی الخوارج، ص ۲۲۶ ج سادس، و باب افتراق الامم ص ۲۵۸ ج سابع، و کتاب الفقیہ والمنفقہ (للخطیب) ص ۱۶۵ جزو خامس۔

۴۔ مجمع الزوائد، کتاب الفتن، باب افتراق الامم، ص ۲۶۰ ج ۷۔

۵۔ حوالہ بالا، ص ۲۵۸، ج ۷، بحوالہ ”طبرانی فی الاوسط والکبیر“ علامہ سیوطی نے اس کی سند کی توثیق کی ہے۔

۶۔ سوائے حضرت انسؓ کے کہ انھوں نے کل بہتر کا عدد روایت کیا ہے، باقی مضمون انھوں نے بھی وہی نقل فرمایا ہے جو در سکر صحابہ کرام کی روایتوں میں ہے۔

حضرت عمر بن عوفؓ کی روایت میں ہے کہ وہ فرقہ ”الاسلام و جماعتہم“ ہے، یعنی ”اسلام اور مسلمانوں کی جماعت“ باقی تینوں صحابہ کرام کی روایتوں میں ہے کہ وہ فرقہ ”الجماعۃ“ ہے۔ روایات کی اس تفصیل سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آئیں:-

۱۔ وہ نجات یافتہ فرقہ ان لوگوں کا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابہ کرام کی سنت کے پیرو ہوں گے۔

۲۔ یہاں جو صفت اس نجات یافتہ فرقہ کی بیان فرمائی گئی وہی صفت پیچھے حدیث (نمبر ۹) میں ”السواد الاعظم“ کی بیان کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فرقہ کا نام ”السواد الاعظم“ ہے۔ ۳۔ اس نجات یافتہ فرقہ کا نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض روایات میں ”السواد الاعظم“ اور بعض روایات میں ”الجماعۃ“ بتایا ہے۔

ان تینوں باتوں کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ ”السواد الاعظم“ اور ”الجماعۃ“ درحقیقت اس نجات پانے والے ایک فرقہ کے دو نام ہیں، اور یہ فرقہ ایسے لوگوں کا مجموعہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے طریقہ پر قائم ہوں، صرف انہی لوگوں کا راستہ راہ ہدایت و نجات ہے، اس کے خلاف سب راستے گمراہی اور جہنم کی طرف جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ پیچھے حدیث (نمبر ۹) میں ”الجماعۃ“ اور ”سواد اعظم“ کے اتباع کا حکم نہایت تاکید سے دیا گیا ہے، جن کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ ”اُن پر اللہ کا ہاتھ ہے“ اُن کے اتباع کی تاثیر یہ بتائی گئی کہ وہ نفس و شیطان کی حیلہ سازیوں سے بچاتا ہے، اور اس کی مخالفت کی سزا دنیا میں سزائے موت اور آخرت میں جہنم کی آگ مقرر فرمائی گئی ہے، (نعوذ باللہ منہما)۔

بہر حال زیر بحث حدیث (نمبر ۱۰) سے بھی وہ بات معلوم ہوئی جو پچھلی تمام احادیث سے ثابت ہوتی آرہی ہے، کہ امت میں فساد اور بگاڑ پھیل جانے کے باوجود مسلمانوں کا ایک فرقہ حق پر قائم رہے گا، پوری امت کا مجموعہ کبھی گمراہی پر متفق نہ ہوگا، جس کا لازمی نتیجہ وہی ہے جو ”حجیت اجماع“ کا حاصل ہے کہ ”امت کا متفقہ عقیدہ، عمل یا فیصلہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا، اس کا اتباع فرض اور مخالفت سخت حرام ہے۔“

یہاں تک حجیت اجماع پر ہم نے قرآن مجید کی پانچ آیات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دس حدیثیں بیان کی ہیں جو بیا لیس صحابہ کرام نے روایت کی ہیں، ظاہر ہے کہ ان صحابہ کرام سے یہ حدیثیں سن کر روایت کرنے والے تابعین کی تعداد اور ان کے بعد سے اب تک

۱۔ حدیثوں کو بعد کے لوگوں تک پہنچانے والے راویوں کی تعداد ہر زمانہ میں کم ہونے کی بجائے مسلسل بڑھتی ہی چلی گئی ہے، ان میں سے ہر حدیث الگ الگ اگرچہ متواتر نہ ہو مگر ان سب احادیث کا مشترک مضمون جو اجماع کی حجت کو ثابت کرتا ہے متواتر ہے، لہذا تواتر سے اجماع کا حجت ہونا اور فقہ کے لئے عظیم ماخذ ہونا قرآن و سنت کی روشنی میں رد و روشن کی طرح واضح ہے۔ یہ سب وہ آیات و احادیث ہیں جن سے اجماع کے حجت ہونے پر فقہاء اور محدثین و مفسرین نے عام طور پر استدلال کیا ہے، بعض علماء محققین نے اور بھی کئی آیات و احادیث استدلال کیا ہیں، مگر ہم نے اختصار کے پیش نظر صرف وہ آیات و احادیث یہاں ذکر کی ہیں جو اجماع کی حجت میں زیادہ واضح تھیں، مطالعہ کے دوران اس سلسلہ میں صحابہ کرام کے اقوال و آثار بھی سامنے آئے مثال کے طور پر چند یہ ہیں :-

حجت اجماع پر چند آثار صحابہؓ (۱) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ :-

۱۔ تواتر کی اس قسم کو "تواتر فی القدر المشترك" کہا جاتا ہے، اور یہ بھی تواتر کی باقی قسموں کی طرح علم قطعی یقینی کا فائدہ دیتی ہے۔ (رفع)

۲۔ مثلاً سورہ نساء کی آیت "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ" (نساء: ۵۹) اور سورہ اعراف کی آیت "وَمَنْ خَلَفْنَا مِمَّنْ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ" (اعراف: ۱۸۰) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد "يوشك ان تعرفوا اهل الجنة من اهل النار" اوقال "خياركم من شراركم" قيل يا رسول الله بما اذا ؟ قال بالشئ الحسن والشئ البئس انتم شهداء لبعضكم على بعض" (مسند رک، کتاب العلم، ص ۲۰، ج اول) قال الحاكم هذا حديث صحيح الاسناد وقال الذهبي صحيح"۔

۳۔ مؤطا امام محمد، کتاب الصلوٰۃ، باب قیام شہر رمضان، ص ۱۲۰ و مجمع الزوائد، ص ۸، ج اول، بحوالہ احمد و البراز و الطبرانی فی الکبیر، وقال رجالہ، موثقون، امام محمد نے مؤطا میں اُسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد قرار دیا ہے، مگر سند ذکر نہیں فرمائی، ان تک یہ ارشاد ضرور قابل اعتماد سند سے پہنچا ہو گا، اور ظاہر بھی یہی ہے کہ یہ حضرت ابن مسعودؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے سنا ہو گا، کیونکہ اتنا بڑا قاعدہ کلیہ جو اللہ تعالیٰ کی پسند اور ناپسندیدگی کی خبر دے رہا ہو محض قیاس سے دریافت نہیں کیا جاسکتا، یہ بات صرف وحی سے ہی معلوم ہو سکتی ہے، اور صاحبِ وحی ہی بتلا سکتا ہے، مگر ہم نے اس ارشاد کو احادیث نبویہ کے بجائے آثار صحابہ میں اس لئے شمار کیا ہے کہ جن قابل اعتماد سندوں سے یہ ہم تک پہنچا ہے (باقی صفحہ آئندہ)

مَا رَأَى الْمُسْلِمُونَ حَسَنًا فَهُوَ
عِنْدَ اللَّهِ حَسَنٌ وَمَسَاءَ أَمْرُ
الْمُسْلِمُونَ قَبِيحًا فَهُوَ عِنْدَ اللَّهِ
قَبِيحٌ۔

جس چیز کو تمام مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ
کے نزدیک اچھی اور جس کو تمام مسلمان بُرا
سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بُری ہے۔

۲۔ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے مشہور قاضی "شرح" کو عدالتی
فیصلوں کے لئے جو بنیادی اصول لکھ کر بھیجے ان میں تیسرا اصول یہ تھا کہ جس مسئلہ کا حکم
قرآن و سنت میں (صریح طور پر) نہ ملے، اس میں امت کے اجماعی فیصلہ پر عمل کریں۔
حضرت عمرؓ کا یہ سرکاری فرمان امام شعبیؒ نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ :-

كتب عمر الى شريح ان اقبض بما
في كتاب الله فان اتاك امر
ليس في كتاب الله فاقض بما
سن رسول الله صلى الله عليه
وسلم فان اتاك امر ليس في
كتاب الله ولم يسنه رسول الله
صلى الله عليه وسلم فانظر له
الذي اجتمع عليه الناس فان
جاءك امر لم يتكلم فيه احد
فای الامرین شئت فخذ به
ان شئت فقدم وان شئت
فتأخر ولا اری التأخر الا خيرا
لك۔

حضرت عمرؓ نے شرح کو لکھ کر بھیجا کہ تم
فیصلے قرآن حکیم کے مطابق کرو، اور اگر
تھا ہے پاس کوئی ایسا مقدمہ آئے جس کا
(صریح) حکم قرآن شریف میں نہ ہو تو۔۔۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے
مطابق فیصلہ کرو، اور اگر کوئی ایسا مقدمہ
آئے جس کا حکم (صریح طور پر) نہ قرآن حکیم
میں ہو نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
سنت میں تو تم اس کے لئے وہ فیصلہ
تلاش کرو جس پر سب لوگ متفق ہو چکے
ہوں، اور اگر کوئی ایسا مقدمہ آجائے
جس کے متعلق کسی کا فیصلہ موجود نہ ہو
(نہ قرآن میں نہ سنت میں نہ اجماع میں)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) وہ سب ابن مسعود رضی اللہ عنہ پر جا کر ختم ہو جاتی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
یک نہیں پہنچتیں، بعض سندوں میں یہ ضرور ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے ارشاد نبویؐ بتا کر روایت
کیا ہے، مگر وہ سندیں قابل اعتماد نہیں، تفصیل کے لئے دیکھئے "التعلیق المجمل علی موطا الامام محمدؒ" ص ۱۲۱ و ۱۲۲۔
۳۔ دیکھئے خطیب بغدادی کی مشہور تصنیف "کتاب الفقیہ والمتفقہ" ص ۱۶۶ جزو خامس۔

تو اب دو صورتوں میں سے جس کو چاہو اختیار کرو، یعنی چاہو تو آگے بڑھ کر اپنے اجتہاد سے فیصلہ کر دو، اور چاہو تو پیچھے ہٹ جاؤ (یعنی اپنے اجتہاد سے فیصلہ کرنے کے بجائے اہل علم سے پوچھ کر عمل کرو) اور میں تمھارے لئے ایسے موقع پر بھی ہٹ جانا ہی بہتر سمجھتا ہوں۔“

۳۔ حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ :-

اتقوا الله وعليكم بالجماعة	اللہ سے ڈرو اور الجماعت کے ساتھ رہو
فان الله لم يكن ليجمع امة	کہو، کیونکہ اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت
محمد صلی اللہ علیہ وسلم علی	کو کبھی بھی کسی گمراہی پر متفق نہیں کرے گا۔
ضلالة۔	

اجماع کا فائدہ اور سند اجماع [یہاں ایک یہ بات قابل ذکر ہے کہ اجماع کے حجت ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اجماع کرنے والوں کو شرعی احکام میں نعوذ باللہ خدائی اختیار مل گئے ہیں، کہ وہ قرآن و سنت سے آداب ہو کر جس چیز کو چاہیں حرام اور جس کو چاہیں حلال کر دیں، خوب سمجھ لینا چاہئے کہ فقہ کا کوئی مسئلہ قرآن یا سنت کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتا، اجماع کا بھی ہر فیصلہ قرآن و سنت کا محتاج ہے، چنانچہ فقہ کے جس مسئلہ پر بھی اجماع منعقد ہوتا ہے وہ مسئلہ یا تو قرآن حکیم کی کسی آیت سے ماخوذ ہوتا ہے، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے، یا ایسے قیاس سے جس کی اصل قرآن یا سنت میں موجود ہو، غرض ہر اجماعی فیصلہ کسی نہ کسی دلیل شرعی پر مبنی ہوتا ہے، جس کو سند اجماع کہا جاتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ جب ہر اجماعی فیصلہ قرآن یا سنت یا قیاس پر مبنی ہوتا ہے تو اجماع سے کیا فائدہ ہوا؟ اور اسے فقہ کے دلائل میں کیوں شمار کیا جاتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اجماع کے دو فائدے ہیں، ایک یہ کہ قرآن یا سنت یا قیاس سے ثابت ہونے والا حکم اگر ظنی ہو تو اجماع

لے کتاب الفقہ والتفقہ، ص ۱۶، جزو خامس۔ ۱۷ جو حکم دلیل ظنی سے ثابت ہو وہ ظنی ہوتا ہے، اور جو دلیل قطعی سے ثابت ہو وہ قطعی ہوتا ہے، دلیل ظنی اور دلیل قطعی کا کچھ بیان پیچھے کی بحث میں ہو چکا ہے، یہاں انتخابات اور سمجھ لی جائے کہ قرآن حکیم کی جن آیات کا مطلب معین طور پر خوب واضح اور یقینی نہ ہو بلکہ اس میں ایک سے زیادہ مطالب کا احتمال ہو تو وہ آیت معنی کے اعتبار سے ظنی ہوتی ہے (اگرچہ غفلوں کے اعتبار سے ہر آیت قطعی ہے، بلکہ قرآن کریم کا ہر لفظ قطعی طور پر ثابت ہے، لیکن بعض کے معنی بھی قطعی ہوتے ہیں اور بعض کے ظنی) اور اس سے ثابت ہونے والا حکم بھی ظنی ہوتا ہے، نیز قیاس بھی دلیل ظنی ہے۔

اور اس سے ثابت ہونے والا حکم بھی ظنی، اجماع ان تمام ظنی احکام کو قطعی بنا دیتا ہے۔

اسے ”قطعی“ بنا دیتا ہے، جس کے بعد کسی فقیہ مجتہد کو بھی اس سے اختلاف کی گنجائش باقی نہیں رہتی، اور اگر وہ حکم پہلے ہی قطعی تھا تو اجماع اس کی قطعیت میں مزید قوت اور تاکید پیدا کر دیتا ہے۔ اور دوسرا فائدہ اجماع کا یہ ہے کہ وہ جس دلیل شرعی پر مبنی ہو بعد کے لوگوں کو اس دلیل کو پرکھنے اور اس میں غور و فکر کی ضرورت باقی نہیں رہتی، ان کو اس مسئلہ پر اعتماد کرنے کے لئے بس اتنی دلیل کافی ہوتی ہے کہ فلاں زمانہ کے تمام فقہاء کا اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے، انھوں نے کس دلیل شرعی کی بنیاد پر یہ اجماعی فیصلہ کیا تھا؟ یہ جاننے کی ضرورت بعد کے لوگوں کو نہیں رہتی، سند اجماع کی چند مثالوں سے یہ بات کچھ اور واضح ہو جائیگی۔

چند مثالیں | (۱) مثلاً فقہ کا مشہور اجماعی مسئلہ ہے کہ دادی، نانی، اور نواسی سے نکاح حرام ہے، اجماع کرنے والوں نے یہ مسئلہ قرآن حکیم کی آیت:-

مَحْرَمَاتٌ عَلَيْكُمْ اُمَّهَاتُكُمْ
وَبَنَاتُكُمْ، (نساء: ۲۳)

حرام کی گئی ہیں تم پر تمھاری مائیں اور
تمھاری بیٹیاں

سے لیا ہے، لہذا یہ آیت اس مسئلہ کے لئے ”سند اجماع“ ہے، مذکورہ بالا فقہی حکم اگرچہ اس آیت سے ثابت ہو چکا تھا، کیونکہ ”اُمَّهَاتُ“ (مائیں) کا لفظ دادی اور نانی کو بھی شامل ہے، اور ”بَنَاتُ“ (بیٹیاں) کا لفظ نواسی کو شامل ہے، لیکن یہ حکم یقینی اور قطعی نہ تھا، کیونکہ یہ احتمال یہاں موجود تھا کہ اُمَّهَاتُ (مائیں) سے یہاں صرف حقیقی مائیں مراد ہوں، دادی اور نانی مراد نہ ہوں، اس طرح بنات (بیٹیاں) کے لفظ میں احتمال تھا کہ اس سے یہاں صرف حقیقی بیٹیاں مراد ہوں اور بیٹیوں کی بیٹیاں مراد نہ ہوں، چنانچہ اس احتمال کی بنیاد پر کوئی مجتہد یہ کہہ سکتا تھا کہ دادی، نانی اور نواسی سے نکاح حرام نہیں، مگر جب ان کے حرام ہونے پر اجماع منعقد ہو گیا تو یہ حکم قطعی اور یقینی ہو گیا، اور مذکورہ بالا احتمال معتبر نہ رہا، اور کسی مجتہد کو اس سے اختلاف کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

(۲) یہ تو اس اجماعی فیصلہ کی مثال تھی جو قرآن حکیم سے مأخوذ ہے، اور سنت سے مأخوذ

۱۔ تہبیل الوصول، ص ۱۴۲۔

۲۔ تفسیر روح المعانی، ص ۲۴۹ ج ۲۔

۳۔ حوالہ بالا۔

ہونے کی مثال فقہ کا یہ اجماعی مسئلہ ہو کہ کھانے کی کوئی چیز خرید کر قبضہ کرنے سے پہلے فروخت کر دینا جائز نہیں (جیسا کہ آجکل سٹہ میں ہوتا ہے کہ محض زبانی طور پر کسی چیز کی خریداری کا معاملہ کر کے قبضہ کئے بغیر اُسے دوسرے کے ہاتھ اور دوسرا تیسرے کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے، جو قطعاً حرام ہے) اس مسئلہ میں سند اجماع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ :-

من ابتاع طعاماً فلا یبعہ حتی یشوفیہ۔
جس نے کوئی کھانے کی چیز خریدی وہ اس پر جب تک قبضہ نہ کر لے اُسے فروخت نہ کرے۔

یہ حکم جیسا کہ صاف ظاہر ہے اس حدیث سے معلوم ہو چکا تھا، مگر یہ حدیث "غیر متواتر" تھی، اور سچے عرض کیا جا چکا ہے کہ "حدیث غیر متواتر" ظنی ہوتی ہے، لہذا یہ حکم بھی ظنی تھا قطعی نہ تھا جب اُس پر اجماع منعقد ہو گیا تو یہی حکم قطعی بن گیا۔

(۳) اور قیاس سے ماخوذ ہونے کی مثال فقہ کا یہ اجماعی مسئلہ ہے کہ رہا (سود) چاول میں بھی جاری ہوتا ہے، یعنی جب چاول کو چاول کے عوض میں فروخت کیا جائے تو ادھار بھی حرام ہے، اور کسی طرف مقدار میں کمی بیشی بھی حرام، لیکن دین ہاتھوں ہاتھ ہونا ضروری ہے، اور دونوں چاول خواہ مختلف قسموں کے ہوں مگر مقدار ان کی برابر ہونی ضروری ہے، ادھار کریں گے یا مقداً میں کسی ایک طرف کمی بیشی کریں گے تو رہا ہو جائے گا، جو حرام ہے۔

یہ اجماعی فیصلہ قیاس کی بنیاد پر کیا گیا ہے، یعنی اس مسئلہ میں "سند اجماع" قیاس ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ چیزوں — سونا، چاندی، گندم، جو، کھجور، نمک — کے بارے میں فرمایا تھا کہ ان میں سے کسی چیز کو جب تم اُسی کی جنس کے بدلے میں فروخت کرو تو اس میں ادھار یا کمی بیشی رہا ہے، جو حرام ہے، حدیث سے ان کچھ چیزوں کا حکم تو صاف طور پر معلوم ہو گیا تھا، مگر چاول کے متعلق یہ حدیث خاموش تھی، اجماع کرنے والوں نے چاول کا حکم ان کچھ چیزوں پر قیاس کر کے معلوم کیا اور بتایا کہ جو حکم

۱۵ نور الانوار، ص ۲۲۲، بحث الاجماع۔ ۱۶ مشکوٰۃ شریف عن ابن عمر، ص ۲۴۷ ج ۲ کتاب البیوع،

باب المہنی عنہما من البیوع، بحوالہ بخاری و مسلم۔ ۱۷ نور الانوار، ص ۲۲۲، بحث الاجماع۔

۱۸ صحیح مسلم شریف، ص ۲۵۲ و ۲۵۳ ج ۲، باب الربا، کتاب البیوع۔

۱۹ قیاس ایک نہایت دقیق اور چھپہ فکری عمل ہے، جس کی بہت سی شرائط ہیں، قیاس کی حقیقت انشاء اللہ آگے اپنے مقام پر بیان ہوگی۔

ان اچھے چیزوں کا ہے وہی چاول کا بھی ہے۔

اگر اس قیاس پر سب مجتہدین کا اجماع نہ ہوا ہوتا تو یہ حکم ظنی ہوتا، کیونکہ قیاس دلیل ظنی ہے، اور دلیل ظنی سے حکم قطعی ثابت نہیں ہو سکتا، مگر جب اس قیاس پر ایک زمانے کے تمام فقہاء نے اجماع کر لیا تو یہ حکم قطعی ہو گیا، اجماع سے پہلے کسی فقیہ کو اس سے مختلف قیاس کرنے کی گنجائش تھی، اجماع کے بعد یہ گنجائش ختم ہو گئی۔

(۴) بسا اوقات جس مسئلہ پر اجماع منعقد ہوا ہو وہ پہلے ہی سے قطعی ہوتا ہے، ایسی صورت میں اجماع سے صرف یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کی قطعیت میں مزید تاکید اور قوت پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً پانچوں فرض نمازوں میں رکعتوں کی تعداد سنت متواترہ سے ثابت ہے، اور اس کی پابندی تمام مسلمانوں پر قطعی طور پر فرض ہے، پھر پوری امت کا اجماع بھی اس پر چلا آ رہا ہے جس کے لئے ”سند اجماع“ یہی سنت متواترہ ہے، اس مثال میں ایک ایسے حکم شرعی پر اجماع منعقد ہوا ہے جو پہلے ہی سے قطعی تھی، لہذا اجماع سے اس کی قطعیت میں مزید قوت اور تاکید پیدا ہو گئی ہے، اب اگر کسی زمانہ میں لوگوں کو خدا نخواستہ یہ معلوم نہ رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچوں نمازوں میں اس تعداد کی خود بھی پابندی فرمائی تھی اور سب کو اس کی پابندی کا حکم دیا تھا تب بھی لوگوں کو اس کی پابندی اس لئے لازم ہوگی کہ پوری امت کا اجماع اس پر چلا آ رہا ہے، یہی حال اوپر کی باقی مثالوں کا ہے، کہ اجماع کرنے والوں نے جس سند اجماع کی بنیاد پر وہ فیصلے کئے تھے اگر بعد کے لوگوں کو وہ سند اجماع معلوم نہ ہو یا یاد نہ رہے، تب بھی وہ اجماعی فیصلے قطعی اور واجب العمل رہیں گے، کیونکہ سند اجماع کی ضرورت اجماع کرنے والوں کو ہوتی ہے، بعد کے لوگوں کو (خواہ وہ فقہاء اور مجتہد ہوں) سند اجماع کی ضرورت نہیں، ان کے لئے صرف اجماع ہی کافی دلیل ہے۔

اجماع کن لوگوں کا معتبر ہے؟ اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ اجماع صرف عاقل، بالغ، مسلمانوں کا معتبر ہے، کسی مجنون، بچہ یا کافر کی موافقت

و مخالفت کا اعتبار نہیں، نیز اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ اجماع منعقد ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ عہد صحابہ سے لے کر قیامت تک کے تمام مسلمان کسی مسئلہ پر متفق ہوں، اس لئے کہ اگر اسے اجماع کے لئے شرط قرار دیا جائے تو قیامت سے پہلے کسی بھی مسئلے پر اجماع منعقد نہ ہو سکے گا، لہذا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اجماع کے لئے کسی ایک زمانہ کے مسلمانوں کا

متفق ہو جانا کافی ہے۔

ربایہ سوال کہ ایک زمانہ کے تمام مسلمانوں کا اتفاق ضروری ہے یا مخصوص قسم کے افراد کا متفق ہو جانا کافی ہے؟ اس میں علماء کے اقوال مختلف ہیں ہم یہاں چند اقوال ذکر کرتے ہیں۔
(۱) امام مالکؒ کے نزدیک صرف اہل مدینہ کا اجماع معتبر ہے، کسی اور کی موافقت یا مخالفت کا اعتبار نہیں۔

(۲) فرقہ زیدیہ اور امامیہؑ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کو اجماع کا اہل کہتا ہے دوسرے لوگوں کا اجماع ان کے نزدیک معتبر نہیں۔

(۳) بعض حضرات کے نزدیک صرف صحابہ کرام کا اجماع حجت ہے، ان حضرات کے نزدیک اجماع کا دروازہ عہد صحابہؓ کے بعد ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا ہے۔

(۴) بعض حضرات کہتے ہیں کہ ایک زمانہ کے تمام مسلمانوں کا اتفاق اجماع کے لئے شرط ہے، عوام ہوں یا خواص، عالم ہوں یا جاہل، جب تک سب متفق نہ ہوں اجماع منعقد نہ ہوگا۔
(۵)۔ پانچواں قول جمہور کا ہے جو نہایت معتدل ہے، وہ یہ کہ اجماع صحابہ کے ساتھ خاص

۱۔ الاحکام للاندی ص ۱۱۵ جلد اول۔
۲۔ مشہور یہی ہے مگر بہت سے علماء نے امام مالکؒ کی طرف اس مذہب کی نسبت کا انکار کیا ہے، تفصیل کے لئے دیکھئے "التقریر والتجیر" ص ۱۰۰ ج ۳۔

۳۔ التقریر والتجیر شرح التقریر، ص ۹۸ ج ۳۔

۴۔ مثلاً راؤد اصغہانی (تہذیب الوصول ص ۱۰۰) ابن حبان کے کلام سے بھی اسی طرف رجحان معلوم ہوتا ہے، امام احمدؒ کے دو قول ہیں، ایک یہ کہ اجماع صحابہ کے ساتھ خاص ہے، اور دوسرا یہ کہ خاص نہیں دوسرے قول کو علماء حنابلہ نے صحیح اور راجح قرار دیا ہے، (التقریر، ص ۹۷ ج ۳)۔

۵۔ قاضی ابوبکر باقلانی اور علامہ آمدی کا رجحان اسی طرف ہے، مگر دونوں کی رائے میں یہ منقہ ہے کہ قاضی ابوبکر تو فرماتے ہیں کہ جس اجماع میں کسی عام مسلمان کا اختلاف ہو وہ اجماع شرعاً حجت تو ہے مگر اس اجماع کو "اجماع امت" نہیں کہا جائے گا، کیونکہ عام مسلمان بھی امت کا فرد ہے، اور علامہ آمدی ایسے اجماع کو حجت بھی نہیں مانتے، دیکھئے التقریر شرح التقریر ص ۸۰ ج ۳۔

۶۔ التقریر شرح التقریر، ص ۸۱ و ۹۵ و ۹۷ ج ۳۔

نہیں کسی بھی زمانہ کے تمام متبع سنت فقہاء (مجتہدین) کا کسی حکم شرعی پر متفق ہو جانا اجماع کے لئے کافی ہے، عوام اور اہل بدعت یا فاسق کی موافقت و مخالفت کا اعتبار نہیں۔ قرآن و سنت کے جن دلائل سے اجماع کا حجت ہونا ثابت ہوا ہے، ان سے بھی اسی مسلک کی تائید ہوتی ہے، اس لئے کہ آیات و احادیث میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ کہیں بھی اجماع کو کسی خاص زمانہ یا خاص مقام یا نسل کے ساتھ مخصوص نہیں کیا گیا، بلکہ مطلقاً "المؤمنین" الامۃ "الجماعۃ" یا سواد اعظم کے اتفاق کو حجت قرار دیا گیا ہے، اور یہ چاروں الفاظ صحابہ کرام، آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل مدینہ کی طرح دوسرے مسلمانوں پر بھی صادق آتے ہیں، لہذا اجماع کو صرف صحابہ کرام یا اہل بیت یا اہل مدینہ کے ساتھ خاص کرنے کی کوئی واضح دلیل قرآن و سنت میں نہیں ملتی۔

اجماع کو صرف صحابہ کرام کے ساتھ خاص کرنے والے حضرات جن احادیث سے استدلال کرتے ہیں ان سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کا اجماع حجت ہے، مگر یہ کسی آیت یا حدیث سے ثابت نہیں ہوتا کہ بعد کے فقہاء کا اجماع حجت نہیں۔

جاہل، فاسق اور اہل بدعت کے اختلاف اجماع باطل نہیں ہوتا

رہا یہ سوال کہ جب مؤمنین، امت، الجماعۃ اور سواد اعظم کے اجماع کو قرآن و سنت میں حجت قرار دیا گیا ہے، تو اس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ عام مسلمانوں بلکہ اہل بدعت اور فاسق و فاجر مسلمانوں کی موافقت بھی اجماع

کیلئے شرط ہو اور ان کے اختلاف کی صورت میں جماع منعقد نہ ہو کیونکہ مؤمنین اور امت میں یہ لوگ بھی داخل ہیں۔ جواب یہ ہے کہ جن دلائل سے اجماع کی حجت ثابت ہوتی ہے ان میں اور دیگر آیات و احادیث میں اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اجماع صرف متبع سنت فقہاء کرام ہی کا معتبر ہے، باقی لوگوں کی موافقت یا مخالفت سے اجماع پر اثر نہیں پڑتا، ان دلائل کی کچھ تفصیل یہ ہے:-

۱۔ قرآن حکیم میں دو جگہ صریح ارشاد ہے کہ:-

"اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے دریافت کرو"

فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ

(نحل، ۴۳ و انبیاء، ۷)

۲۔ یہ اہل الذکر ہی کا ترجمہ ہے، لفظ الذکر کسی معنی میں استعمال ہوتا ہے (باقی بڑ صفحہ آئندہ)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں کو احکام شریعت معلوم نہ ہوں ان پر واجب ہو کہ علماء سے دریافت کر کے اس کے مطابق عمل کریں، توجب عوام کو خود علماء کے فتویٰ کا پابند کیا گیا ہے تو دنیا کے تمام علماء فقہاء کے متفقہ فیصلہ کی مخالفت عوام کو کیسے جائز ہو سکتی ہے، اور ان کے موافقت نہ کرنے سے فقہاء کا اجماع کیسے باطل ہو سکتا ہے!

(۲) قرآن حکیم نے فاسق کی دی ہوئی خبر کے متعلق یہ قانون ارشاد فرمایا ہے کہ :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ	”اے ایمان والو! اگر تمھارے پاس کوئی فاسق
فَاسِقٌ يَنْبَأُ قَتِيلًا أَوْ أَنْ تُصِيبُوا	خبر لے کر آئے تو (اس خبر کی) خوب تحقیق کر لیا
قَوْمًا يَجْهَلُونَ فَتُصِيبُوا عَلَىٰ مَا	کرد، کبھی کسی قوم کی نادانی سے کوئی ضرر
فَعَلْتُمْ تَادِ مِثْنَ ۝ (الحجرات، ۶)	نہ پہچان دو، پھر اپنے کئے پر پھپھانا پڑے۔“

اس لئے جمہور علماء کے نزدیک فاسق کی خبر یا شہادت مقبول نہیں، توجب عارضی نوعیت کے واقعات میں فاسق کی خبر اور شہادت کا یہ حال ہے تو دینی مسائل جو قیامت تک کے مسلمانوں کے لئے حجت اور واجب الاتباع بننے والے ہوں، ان میں اس کی شخصی رائے کیسے معتبر ہو سکتی ہے؟ اور جو بدعت فسق کی حد تک پہنچی ہوئی ہو اس کا مرتکب بھی فاسق ہے، لہذا ایسے اہل بدعت کی رائے بھی اجماع میں معتبر نہیں، اسی لئے جمہور علماء اہل سنت والجماعت نے شیعہ، خوارج اور معتزلہ وغیرہ کے اختلاف کا اجماع میں اعتبار نہیں کیا۔

پہلی آیت سے معلوم ہوا تھا کہ اجماع میں عوام کی موافقت و مخالفت معتبر نہیں، اور اس دوسری آیت سے ثابت ہوا کہ فاسق اور اہل بدعت کی موافقت و مخالفت کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ان میں سے ایک معنی علم کے بھی ہیں، اسی مناسبت سے قرآن کریم میں تورات کو بھی ”الذکر“ فرمایا ہے، ارشاد ہی ”وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ“ اور خود قرآن کریم نے بھی اپنا ایک نام ”الذکر“ بتایا ہے جیسا کہ سورہ نحل کی آیت (۲۴) ”وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ“ میں ”الذکر“ سے مراد قرآن کریم ہے، اس لئے ”اہل الذکر“ کے لفظی معنی اہل علم کے ہوتے، (تفسیر معارف القرآن، ص ۳۳۲، ج ۵)۔

۱۵ تفسیر قرطبی، ص ۲۷۲ ج ۱۱ و تفسیر معارف القرآن، ص ۵۹ ج ۶ و ص ۳۳۳ ج ۵۔

اعتبار نہیں، اس لئے حاصل ان درون آیتوں کا وہی ہے جو جمہور علماء نے اختیار کیا کہ اجماع صرف متبع سنت فقہاء کا معتبر ہے۔ اور یہی بات ان احادیث سے ثابت ہوتی ہے جن سے اجماع کے حجت ہونے پر استدلال کیا گیا ہے، ہم وہ احادیث خاصی تفصیل سے پیچھے بیان کر چکے ہیں، یہاں ہمیں ان کے الفاظ کا مختصر جائزہ لینا ہوگا، جس سے جمہور کا مسلک بخوبی واضح ہو سکے گا۔

(۱) سب سے پہلی حدیث جو ہم نے اجماع کی حجت پر پیش کی ہے، اس میں بیان ہوا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر کوئی ایسا معاملہ پیش آئے جس کا صریح حکم قرآن و سنت میں نہ ملے تو اس میں آپ کا کیا حکم ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ:-
شَاوِرُوا فِيهِ الْفُقَهَاءَ وَالْعَابِدِينَ۔

”تم اس معاملہ میں فقہاء اور عابدین سے

مشورہ کرو۔“

اس حدیث میں صراحت ہے کہ جو لوگ فقہاء بھی ہوں اور عابدین بھی صرف انہی کا مشورہ واجب الاتباع ہوگا۔

(۲) دوسری حدیث جو گیارہ صحابہ کرام نے روایت کی ہے اس میں پوری اُمت کا لفظ نہیں بلکہ طَائِفَةٌ مِّنْ أُمَّتِي کا لفظ ہے جس کا حاصل یہ کہ ”میری اُمت میں ایک جماعت حق پر قائم اور اس کے لئے برسرِ پیکار رہے گی“ اس میں پوری اُمت کے ہر فرد کے حق پر قائم رہنے کی خبر نہیں دیتی بلکہ بتایا گیا ہے کہ اُمت میں ایک جماعت حق پر قائم رہے گی، جو مخالفین سے حق کے لئے برسرِ پیکار رہے گی، اب خود اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اتباعِ حق پر قائم رہنے والی جماعت کا لازم ہوگا، یا اس کے مخالفین کا؟

(۳) تیسری حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو یہ ارشاد ہے کہ:-

لن يزال أمر هذه الأمة مستقيماً | ”اس اُمت کی حالت قیامت تک سیدھی
حتی تقوم الساعة۔“ | رہے گی۔“

ظاہر ہے اس کا یہ مطلب تو ہو نہیں سکتا کہ اس اُمت کا ہر فرد نیکو کار اور ہدایت یافتہ رہے گا کوئی بھی شخص غلطی نہیں کرے گا، کیونکہ مشاہدہ بھی اس کے خلاف ہے، اور اوپر کی اور بعد میں آنے والی حدیثیں بھی، لہذا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس اُمت کا پورا مجموعہ باطل اور غلط بات پر متفق نہیں ہوگا، کچھ لوگ حق پر ضرور قائم رہیں گے، باقی جو لوگ

ان کی مخالفت کریں گے کیا کریں! یہ حق پر ڈٹے رہیں گے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اُمت بحیثیت مجموعی گمراہی سے محفوظ رہے گی، اور یہ وہی بات ہے جو اوپر کی حدیث میں آچکی ہے، اب خود فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ جو لوگ حق پر ڈٹے رہیں گے اتباع ان کا واجب ہوگا یا ان کے مخالفین کا؟
(۴) چوتھی حدیث جو آٹھ صحابہ کرامؓ نے روایت کی ہے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ ہے کہ:-

<p>”اللہ میری اُمت کو کسی گمراہی پر متفق نہیں کرے گا اور اللہ کا ہاتھ ”الجماعۃ“ پر ہے، اور جو الگ راستہ اختیار کرے گا جہنم کی طرف جائے گا۔“</p>	<p>ان الله لا يجمع اُمتی (اد قال اُمة معتدی) علی ضلالۃ وید اللہ علی الجماعۃ ومن شذّ شذّ الی الناس۔</p>
---	--

اس حدیث میں پوری صراحت کے ساتھ وہ بات آگئی ہے جو ہم اوپر تیسری حدیث کے ضمن میں کہہ چکے ہیں کہ ”امت کی حالت ہمیشہ سیدھی رہنے“ اور کسی گمراہی پر متفق نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی شخص بھی مجروری یا گمراہی کا شکار نہ ہوگا، ہر فاسق و فاجر اور بدعتی مسلمان جو مشورہ بھی دینی امور میں پیش کرے گا صحیح اور درست ہوگا، بلکہ اس حدیث کے آخری دو جملوں ”اللہ کا ہاتھ الجماعۃ پر ہے“ اور ”جو الگ راستہ اختیار کرے گا جہنم کی طرف جائے گا“ نے بتا دیا کہ اُمت کی حالت سیدھی رہنے اور گمراہی پر متفق نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اُمت میں ایک جماعت ہمیشہ ایسی موجود رہے گی جو راہ ہدایت پر قائم رہے گی، جس کے نتیجہ میں اُمت بحیثیت مجموعی گمراہ ہو جانے سے محفوظ رہے گی، اس جماعت کو اللہ کی طرف سے خاص ہدایت و نصرت ملتی رہے گی، لوگوں پر لازم ہوگا کہ اس جماعت کی پیروی کریں، اور جو ان سے الگ راستہ اختیار کرے گا جہنم کی طرف جائے گا۔

معلوم ہوا کہ اجماع صرف اسی جماعت کا حجت ہوگا، دوسروں کی موافقت پر موقوف اور دوسروں کی مخالفت سے باطل نہ ہوگا۔

(۵ تا ۱۰) حدیث نمبر (۵) سے نمبر (۸) تک ۴ حدیثیں جو مجموعی طور پر ۳۴ صحابہ کرامؓ نے روایت کی ہیں ان میں ”الجماعۃ“ کی پیروی کا حکم نہایت تاکید سے دیا گیا ہے، اور اس کی مخالفت پر ہولناک سزائیں بیان ہوئی ہیں۔

نویں حدیث میں ”سواد اعظم“ کی پیروی کا حکم ہے، اور وہیں ہم نے دوسری حدیثوں کی روشنی میں تفصیل سے بیان کیا ہے کہ ”الجماعۃ“ اور ”سواد اعظم“ درحقیقت ایک ہی جماعت

کے دو نام ہیں، اور یہ دونوں نام ان مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابہ کرامؓ کے پیرو ہوں، اسی بناء پر ان کو اہل السنۃ والجماعہ بھی کہا جاتا ہے۔

اور دسویں حدیث میں تو صراحت ہو کہ اس اُمت میں تہتر فرقے ہوں گے، جن میں سے نجات یافتہ فرقہ صرف اُن لوگوں کا ہے جو متبع سنت ہوں، باقی سب فرقے گمراہ ہیں۔

پس حدیث نمبر (۵) سے نمبر (۱۰) تک سب حدیثوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ پیروی صرف ان لوگوں کی لازم ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی سنت کے پیرو ہوں، اور ان کے مخالفین گمراہ اور سخت عذاب کے مستحق ہیں، اب یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں کہ اجماع صرف متبع سنت مسلمانوں کا کافی ہو گا یا فاسق اور اہل بدعت کی مخالفت کی وجہ سے اُسے باطل کر دیا جائے گا؟

حاصل کلام یہ کہ جمہور فقہاء نے جو مسلک اختیار کیا ہو کہ اجماع میں عوام، اہل بدعت اور فاسق مسلمانوں کا اختلاف یا اتفاق معتبر نہیں، بلکہ صرف متبع سنت فقہاء کا اجماع ہی محبت ہے، قرآن و سنت کی تصریحات سے اسی مسلک کی تائید ہوتی ہے، اور حنفیہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

اجماع کی قسمیں | بنیادی طور پر اجماع کی تین قسمیں ہیں: (۱) اجماع قولی (۲) اجماع عملی، (۳) اجماع فسکوئی، ان تینوں کی کچھ تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ اجماع قولی یہ ہے کہ اجماع کی اہلیت رکھنے والے تمام حضرات زبانی طور پر کسی دینی مسئلہ پر اپنا اتفاق ظاہر کریں، جیسے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر تمام صحابہؓ نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی، اور زبان سے اس کا اقرار کیا۔

۲۔ اجماع عملی یہ ہے کہ اجماع کی اہلیت رکھنے والے تمام حضرات کسی زمانہ میں کوئی عمل کریں، جب کوئی عمل تمام اہل اجماع (جائز یا مستحب یا منون سمجھ کر) کرنے لگیں اس عمل کو بالاجماع جائز سمجھا جائے گا، اجماع کی اس قسم سے اُس فعل کا صرف مباح یا مستحب یا منون ہونا ثابت ہوگا، واجب ہونا اس قسم سے ثابت نہیں ہو سکتا، الا یہ کہ وہاں کوئی قرینہ ایسا پایا جائے جس سے وجوب ثابت ہوتا ہو۔

ظہر سے پہلے کی چار رکعتیں جو سنت مؤکدہ ہیں اُن کا سنت مؤکدہ ہونا صحابہ کرامؓ کے اجماع

عقل سے ثابت ہوا ہے۔

۳۔ اجماع سکوتی یہ ہے کہ اجماع کی اہلیت رکھنے والوں میں سے کچھ حضرات کوئی متفقہ فیصلہ زبانی یا عملی طور پر کریں جس کی اس زمانہ میں خوب شہرت ہو جائے یہاں تک کہ باقی سب مجتہدین کو بھی اس فیصلہ کی خبر ہو جائے، مگر وہ غور و فکر اور اظہار رائے کا موقع ملنے کے باوجود سکوت اختیار کریں ان میں سے کوئی بھی اس فیصلہ سے اختلاف نہ کرے۔

اجماع کی ان تینوں قسموں میں سے پہلی دونوں قسمیں تو سب فقہاء کے نزدیک حجت ہیں، البتہ تیسری قسم یعنی "اجماع سکوتی" کے حجت ہونے میں فقہاء کا اختلاف ہے، امام احمد، اکثر حنفیہ اور بعض شوافع کے نزدیک یہ حجت قطعہ ہے، اور امام شافعی، اکثر شوافع اور اکثر مالکیہ کے نزدیک حجت ہی نہیں، اور بعض فقہاء نے اسے "حجت ظنیہ" قرار دیا ہے۔ یہ اجماع کی قسموں کا اجمالی بیان ہے، تفصیل کے لئے اصول فقہ کی کتابوں کی مراجعت فرمائی جائے۔

اجماع کے مراتب | اجماع کرنے والوں کے اعتبار سے اجماع کے حسب ذیل تین درجات ہیں:-

۱۔ سب سے قوی درجہ کا اجماع وہ ہے جو تمام صحابہ کرام نے عقل یا زبانی طور پر صراحتہ کیا ہو، اس لئے کہ اس کے حجت قطعہ ہونے پر پوری امت کا اتفاق ہے۔

۲۔ دوسرا درجہ صحابہ کرام کے اجماع سکوتی کا ہے، یہ بھی اگرچہ حنفیہ سمیت بہت سے فقہاء کے نزدیک حجت قطعہ ہے، مگر اس کا منکر کافر نہیں، کیونکہ اس کے حجت ہونے میں امام شافعی اور بعض دیگر فقہاء کا اختلاف ہے، جیسا کہ پیچھے بیان ہو چکا۔

۳۔ تیسرے درجہ پر وہ اجماع ہے جو صحابہ کرام کے بعد کسی زمانہ کے تمام فقہاء نے کیا ہو، یہ بھی جمہور کے نزدیک حجت تو ہے، مگر "حجت قطعہ" نہیں، کیونکہ جو حضرات غیر صحابہ کے اجماع

۱۵ یہاں تک ان تین قسموں کا بیان تسہیل الوصول، ص ۱۶۸ و ص ۱۷۳ سے ماخوذ ہے۔

۱۶ التقرير، ص (۱۰۱ و ۱۰۲ ج ۳)۔

۱۷ جو حضرات صرف اہل مدینہ یا صرف اہل بیت کے اتفاق کو اجماع کے لئے کافی سمجھتے ہیں تمام صحابہ کرام کے اجماع ان کے نزدیک بھی حجت قطعہ ہے، کیونکہ صحابہ میں اس زمانہ کے اہل مدینہ اور اہل بیت بھی داخل ہیں۔

(تسہیل الوصول، ص ۱۷۳)۔

کو حجت نہیں مانتے، اُن کے اختلاف کی وجہ سے اس اجماع میں قطعیت باقی نہیں رہی، یہ درجہ میں ”سنت مشہورہ“ کے مانند ہے، اس کا منکر بھی کافر نہیں۔

ان سب درجات کی تفصیل کے لئے اصول فقہ کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔

نقل جماع | اجماعی فیصلوں کے درجات کی جو ترتیب اوپر بیان ہوئی وہ اصل کے اعتبار سے ہی، لیکن جب اجماعی فیصلے کی خبر ہم تک پہنچے گی تو اس خبر کی روایت جتنی قوی

ہوگی ہمارے حق میں اس اجماعی فیصلے کی تاثیر بھی اتنی ہی قوی ہوگی، اور روایت میں جس قدر ضعف ہوگا اس اجماعی فیصلے کی تاثیر بھی ہمارے حق میں اتنی ہی ضعیف ہو جائے گی، چنانچہ تمام صحابہ کرام کا اجماع قوی یا غلی جو درجہ اول کا اجماع ہے اور اپنی ذات میں حجت قطعیت ہے، اگر اس کی خبر ہم تک ”تواتر“ سے پہنچے تب تو وہ ہمارے لئے بھی حجت قطعیت باقی رہے گا، اور اس کا منکر کافر ہوگا، لیکن اس کی خبر ہم تک اگر قابل اعتماد سند سے تواتر کے بغیر پہنچے تو اس کی قطعیت ہمارے حق میں ختم ہو جائے گی، اور اس کا حکم وہی ہوگا جو غیر متواتر حدیث کا ہوتا ہے، کہ وہ دلیل قوی ہوتی ہے، شرعی احکام اس سے ثابت ہو سکتے ہیں مگر اس کا منکر کافر نہیں ہوتا۔

اور اگر اس کی خبر سند کے اعتبار سے بھی ضعیف ہو تو اس کا حکم وہ ہوگا جو حدیث ضعیف کا ہوتا ہے، کہ وہ حجت ہی نہیں، اور اس سے کوئی حکم شرعی ثابت نہیں ہو سکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ فقہ کا مآخذ ہونے کے اعتبار سے درجہ اول کے اجماع کی حیثیت ہمارے لئے وہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی ہے، کہ اگر وہ ہم تک تواتر سے پہنچے تو دلیل قطعیت ہے، اور سند ضعیف سے پہنچے تو وہ ہمارے لئے کسی حکم شرعی کی دلیل نہیں بن سکتا۔

اعتذار

جیسا کہ طبع اول و دوم کے دیباچوں میں عرض کیا گیا کہ حضرت والد ماجد مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش تھی کہ مقدمہ میں علم فقہ کے متعلق ضروری معلومات درج کی جائیں، چنانچہ احقر نے اپنی کم مانگی کے باوجود یہ مقدمہ اسی سعادت کے حصول کیلئے لکھنا شروع کیا تھا،

۱۔ مثلاً تہذیب الوصول، ص ۳، ۴، ۵، اور تقریر العجیز، ص ۸۰ تا ۹۲۔ ۲۔ تہذیب الوصول، ص ۱۴۳۔

لیکن اختصار کی پوری کوشش کے باوجود اسکی ضخامت بڑھتی چلی گئی، پھر بھی یہ چاہتا تھا کہ فقہ کے چوتھے مأخذ "قیاس" کا تعارف تو اسمیں ضرور آہی جائے۔
 _____ لیکن طرح طرح کے عوارض کا سلسلہ حائل ہوتا چلا گیا۔ اسلئے مجبوراً اب "قیاس" کے تعارف کے بغیر ہی اسے شائع کیا جا رہا ہے، اللہ تعالیٰ کی توفیق شامل حال رہی تو انشاء اللہ اگلی اشاعت تک اسے اور فقہ سے متعلق باقی معلومات جو حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرمانا چاہتے تھے انہیں بھی اپنی بساط کی حد تک لکھنے کی کوشش کروں گا۔ _____ فی الحال آگے صرف کتاب "امداد الاحکام" کا تعارف و خصوصیات اور اس کے مؤلفین کرام کے مختصر حالات زندگی بیان کئے جائیں گے۔

خالقہ تھانہ بھون جاری ہونے والے فتاویٰ

حکیم الامت مجدد ملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے جو فتاویٰ خود تحریر فرمائے اُن کا عظیم الشان مجموعہ "امداد الفتاویٰ" تو ساہا سال سے کچھ جلدوں میں شائع ہو رہا ہے، جو مشہور مجددانہ کارنامہ ہے، کسی تعارف کا محتاج نہیں۔

لیکن سوالات کی کثرت کے باعث حکیم الامت نے خالقہ تھانہ بھون کے بعض دوسرے علماء محققین کو بھی فتاویٰ لکھنے پر مامور فرمایا ہوا تھا، جو آپ ہی کی رہنمائی میں فتاویٰ لکھ کر آپ کی خدمت میں پیش کرتے، اور آپ کی نظر و اصلاح کے بعد وہ فتاویٰ روانہ کر دیئے جلتے تھے، اشاعت کی غرض ہر عام کے لکھے ہوئے فتاویٰ الگ الگ جسطروں میں نقل کر کے محفوظ کر لیا جاتے تھے، اس طرح آپ کی رہنمائی میں جو فتاویٰ لکھے گئے اُن کے مندرجہ ذیل تین مجموعے تیار ہو گئے، جن کے نام بھی حضرت ہی نے تجویز فرمائے تھے۔
 ۱۔ امداد الاحکام :- یہ زیادہ ضخیم مجموعہ ہے، جس کی جلد اول اس وقت آپ کے سامنے ہی، اس کتاب کو متعدد وجود سے حضرت حکیم الامت ہی کی تالیف کا درجہ حاصل ہے، جیسا کہ آگے اس کے مفصل تعارف سے معلوم ہوگا۔

۲۔ امداد المسائل :- یہ فتاویٰ حضرت حکیم الامت نے مولانا احمد حسن صاحب سلمیٰ سے لکھوائے تھے، صفر ۱۳۳۲ھ سے ۱۳۳۹ھ تک کے یہ فتاویٰ چھوٹے چھوٹے چار جسطروں

میں دارالعلوم کراچی کے شعبہ ”مجلس خیر“ میں محفوظ ہیں، طبع نہیں ہوئے، مگر ان کی تمہید میں حضرت حکیم الامتؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ ان میں صرف پہلے ہینہ کے فتاویٰ مجھے دکھائے گئے ہیں، باقی میں اس کا التزام نہیں کیا گیا۔

۳۔ جمیل الفتاویٰ :- یہ تھوڑے سے فتاویٰ ہیں جو حضرت حکیم الامتؒ نے مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی مدظلہم سے سنا تھا وہ میں لکھوانے شروع کئے تھے، اُن کی بھی طلبت نہیں ہو سکی، مفتی صاحب موصوف کے پاس محفوظ ہیں، غرض یہ تین مجموعے تیار ہوئے تھے، جن میں سے ”امداد الاحکام“ پہلی بار دارالعلوم کراچی سے شائع ہو رہا ہے، اور یہاں اسی کا تعارف مقصود ہے۔

امداد الاحکام

یہ اُن فتاویٰ کا نادبر روزگار مجموعہ ہے جو حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصی رہنمائی میں اکثر تو آپ کے جلیل القدر بھانجے اور شاگرد رشید حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ نے تحریر فرمائے، اور کچھ مولانا مفتی عبدالکریم صاحب گتھلویؒ کے تحریر فرمودہ ہیں، اور بعض فتاویٰ اس میں خود حضرت حکیم الامتؒ نے بھی تحریر فرمائے ہیں،

یہ مجموعہ تقریباً انیس سال (محرم ۱۳۴۸ھ سے شوال ۱۳۵۸ھ تک) کے فتاویٰ پر مشتمل ہے جس کی سبکدوشی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بہت سے فتاویٰ پر حضرت حکیم الامتؒ کے تصدیقی دستخط ہیں، اور جن پر تصدیقی دستخط نہیں وہ بھی اکثر آپ کے زبانی مشورے سے لکھے گئے ہیں اور جن فتاویٰ میں مشورے کی ضرورت نہیں تھی اُن کی صحت پر بھی آپ کو تقریباً ایسا ہی اعتناء تھا جیسے اپنے لکھے ہوئے فتاویٰ پر، یہ سب تفصیل حکیم الامت حضرت تھانویؒ ہی نے امداد الاحکام کی تمہید میں بیان فرمائی ہے، جو کتاب کے آغاز میں آئے گی۔

اُس تمہید کے یہ آخری جملے خاص طور سے قابل لحاظ ہیں کہ،

”بزرگوار سید (مولانا ظفر احمد صاحب) کے فتاویٰ پر مجھے تقریباً ایسا ہی اطمینان ہو جیسا خود اپنے لکھے ہوئے فتاویٰ پر، اسی لئے اس کا نام ”امداد الاحکام“ ضمیمہ امداد الفتاویٰ“ تجویز کرتا ہوں“

امداد الاحکام میں جو فتاویٰ مولانا مفتی عبدالکریم صاحب کے لکھے ہوئے ہیں، اُن پر بھی تصدیقی

دستخط کہیں حضرت حکیم الامتؒ نے اور کہیں مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ نے کئے ہیں، اور جن فتاویٰ پر ان دونوں بزرگوں میں سے کسی کے تصدیقی دستخط نہیں وہ بھی اکثر حضرت حکیم الامتؒ کے مشورے سے لکھے گئے ہیں، البتہ جن مسائل میں حضرتؒ کی تحقیق معلوم تھی، یا جن کا جواب بالکل ظاہر تھا ان میں حضرتؒ سے مشورے کا التزام نہیں کیا گیا،

لہذا امداد الاحکام کو درحقیقت ”امداد الفتاویٰ“ ہی کا ایک حصہ سمجھنا چاہئے، اور اس پر ایسا ہی اعتماد کیا جاسکتا ہے جیسا خود حضرت حکیم الامتؒ کے لکھے ہوئے فتاویٰ پر کیا جاتا ہے، ”امداد الاحکام“ کا مکمل مسودہ آٹھ رجسٹروں میں تیار ہوا تھا، جس پر حضرت حکیم الامتؒ نے نظر ثانی بھی انہی دونوں بزرگوں سے کرا کے تمہید تحریر فرمائی، کاتب کے لئے جگہ جگہ ہدایات لکھوائیں، اور ان کی قسط دار اشاعت کا سلسلہ دہلی کے ماہنامے ”الہادی“ میں شروع فرمادیا تھا مگر یہ سلسلہ جمادی الاول ۱۳۵۳ھ سے ربیع الاول ۱۳۵۴ھ تک جاری رہ کر بند ہو گیا، بہت کم فتاویٰ اس میں شائع ہو سکے، یہاں تک کہ رجب ۱۳۶۲ھ میں آپ کی وفات ہو گئی۔

حضرت حکیم الامتؒ کی وفات کے بعد فقہ و فتویٰ کا یہ گرانقدر سرمایہ ناظم خانقاہ حضرت مولانا شبیر علی صاحبؒ کے پاس محفوظ رہا، جب ناظم صاحب موصوفیؒ پاکستان ہجرت فرمائی تو ایک بڑا کارنامہ یہ انجام دیا کہ حضرت حکیم الامتؒ کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصانیف کے جو مسودات ان کے پاس محفوظ تھے پاکستان منتقل فرما کر دارالعلوم کراچی میں محفوظ کرادیئے، انہی مسودات میں ”امداد الاحکام“ کا یہ نادر روزگار مکمل مجموعہ بھی شامل تھا،

رجسٹروں میں یہ فتاویٰ تاریخ وار ترتیب سے درج تھے، فقہی ابواب پر مبنی نہ تھے، والد ماجد مفتی عظیم پاکستان حضرت مولانا مفتی

تبویب اشاعت

محمد شفیع صاحبؒ نے تبویب کا کام اپنی نگرانی و رہنمائی میں مختلف حضرات اہل علم سے کرایا، جن میں آپ کے ہونہار پوتے مولانا محمود اشرف عثمانی سلمہ، استاد جامعہ اشرفیہ لاہور (جو اُس وقت دارالعلوم کراچی کے درجہ تخصص فی الافتاء میں زیر تربیت تھے) اور مولانا رفیع اللہ صاحب سابق نائب مفتی دارالعلوم کراچی بہ طور خاص قابل ذکر ہیں، ناچیز راقم الحروف کو بھی ترتیب د

۱۵ یہ سب تفصیل مولانا مفتی عبدالکریم صاحبؒ ہی نے اپنے فتاویٰ کے رجسٹروں میں مختلف مقامات پر تحریر فرمائی ہے، (مثلاً رجسٹر ۷ ص ۱۰۹ و ۱۹۰ پر)۔

تبویب کے اس کام میں حقیر صاحبہ لینے کی سعادت نصیب ہوئی، تقریباً ڈیڑھ سال میں یہ مرحلہ شوال ۱۳۹۲ھ میں مکمل ہوا۔

ترتیب و تبویب کے مراحل کے بعد جب حضرت والد صاحب نے کتابت شروع کرائی تو اس کے مؤلف حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی تھے، دونوں بزرگوں کو اس کی اشاعت کا بے حد اشتیاق تھا۔

مگر آج جبکہ اس عظیم فقہی سرمایہ کی جلد اول مکتبہ دارالعلوم کراچی کے زیر اہتمام شائع ہو کر سامنے آرہی ہے، جہاں مسرت و امتنان کے جذبات موجزن ہیں وہیں یہ حسرت بھی دل کو پارہ پارہ کر رہی ہے کہ یہ دونوں بزرگ جو اس کی اشاعت پر سب سے زیادہ مسرور ہوتے، اور اس کام میں کوشش کرنے والوں کو دُعاؤں سے مالا مال فرمادیتے، دونوں ہی اس دافانی سے رخصت ہو چکے ہیں، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ، اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کے فیوض پہلے سے زیادہ وسعت کے ساتھ جاری رکھے، اور دارالعلوم کراچی کو ان کی تحقیقات زیادہ سے زیادہ منظر عام پر لانے کی توفیق عطا فرمائے، (رحمہما اللہ رحمۃً واسعۃً)

تالیف اور تبویب و اشاعت کی اس مختصر و مداد کے بعد اس کتاب کے متعلق کچھ تفصیلاً قارئین کی بصیرت و سہولت کے لئے درج کی جاتی ہیں:-

اس کتاب کے متعلق چند مفید تفصیلات

- ۱۔ یہ کتاب کل ۲۱،۷۱ فتاویٰ پر مشتمل ہے، جن میں ۵۰۱ فتاویٰ حضرت مولانا مفتی عبدالکریم صاحب گتھلویؒ نے اور باقی حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ نے تحریر فرمائے ہیں، سوائے بعض فتاویٰ کے کہ وہ حضرت حکیم الامتؒ کے تحریر فرمودہ ہیں۔
- ۲۔ اس کتاب میں فتاویٰ کی تعداد ”امداد الفتاویٰ“ سے ۱۲،۷۸ کم ہے، لیکن گمان ہوتا ہے کہ ضخامت امداد الفتاویٰ کے قریب قریب ہو چکا گی، کیونکہ اس میں دلائل کی تفصیل زیادہ ہے، خصوصاً حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ کے فتاویٰ میں احادیث کے دلائل نہایت شرح و بسط سے محدثانہ اصول پر بیان کئے گئے ہیں، بعض فتاویٰ تو مستقل رسالوں کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔

۳۔ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب کے فتاویٰ ۸ محرم ۱۳۷۲ھ سے ۱۲ شوال ۱۳۵۸ھ تک

اور مولانا مفتی عبدالکریم صاحب کے فتاویٰ ۱۲ ارشوال ۱۳۲۳ھ سے ۱۶ صفر ۱۳۵۵ھ تک کی مدت میں لکھے گئے ہیں۔

۴۔ دونوں بزرگوں کے فتاویٰ "امداد الاحکام" ہی کے رجسٹروں میں نقل کئے گئے تھے، رجسٹر کے ابتدائی حصے میں حضرت مولانا ظفر احمد صاحب کے فتاویٰ ہوتے تھے، اور آخری حصہ میں دوسری طرف سے مولانا مفتی عبدالکریم صاحب کے فتاویٰ نقل کیے جاتے تھے، ۵۔ مولانا مفتی عبدالکریم صاحب کے فتاویٰ بالکل شروع میں رجسٹر کی جلد پر غالباً حضرت حکیم الامتؒ ہی کے قلم سے "تمتہ امداد الاحکام از مولوی عبدالکریم" تحریر ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صاحب موصوفؒ کے ان فتاویٰ کا نام حضرت حکیم الامتؒ نے "تمتہ امداد الاحکام" تجویز فرمایا تھا۔ مگر قارئین کی سہولت کے لئے حضرت والد صاحبؒ نے دونوں بزرگوں کے فتاویٰ کو ایک ہی کتاب کی حیثیت سے یکجا مہیوب کرایا ہے، الگ الگ ترتیب قائم نہیں کی، فتویٰ کے آخر میں لکھنے والے کے نام سے دونوں بزرگوں کے فتاویٰ میں باسانی امتیاز کیا جاسکتا ہے، حاصل یہ کہ یہ کتاب اصل اور تمثیل دونوں پر مشتمل ہے اور دونوں کے مجموعہ کا نام "امداد الاحکام" ہی رکھا گیا ہے۔

۶۔ چونکہ اکثر فتاویٰ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ کے تحریر فرمودہ ہیں، لہذا غیر ضروری ضخامت سے بچنے کے لئے مولانا کا نام ہر فتوے کے آخر میں نقل کرنے کے بجائے طباعت میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ:

(الف) مولانا موصوفؒ کے لکھے ہوئے جن فتاویٰ پر حضرت حکیم الامتؒ یا کسی اور بزرگ کے تصدیقی دستخط نہیں، اُن کے آخر میں مولانا کا نام نہیں لکھا گیا،

(ب) اور جو فتاویٰ حضرت حکیم الامتؒ یا مولانا مفتی عبدالکریم صاحبؒ نے تحریر فرمائے ہیں اُن کے آخر میں لکھنے والے کا نام درج کیا گیا ہے۔

(ج) اور جن فتاویٰ پر کسی کے تصدیقی دستخط بھی ہیں اُن کے آخر میں اُن کے لکھنے والے اور تصدیقی دستخط والے دونوں بزرگوں کے نام درج کئے گئے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ جس فتوے کے آخر میں اُس کے لکھنے والے کا نام درج نہ ہو سمجھ لیا جائے کہ وہ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ کا تحریر فرمودہ ہے۔

۷۔ ہر فتوے کے آخر میں اُس کے لکھنے کی تاریخ پڑی ہوئی ہے، رمضان ۱۳۵۵ھ تک کے

مفتی عبدالکریم صاحب کے تمام فتاویٰ حضرت حکیم الامتؒ نے التزاماً ملاحظہ فرمائے ہیں خواہ تصدیقی دستخط فرمائے ہوں یا نہ فرمائے ہوں، اس تاریخ کے بعد جن فتاویٰ کو ملاحظہ فرمایا ان پر تصدیقی دستخط فرمادیے، اور باقی فتاویٰ مولانا ظفر احمد صاحب التزاماً ملاحظہ فرماتے رہے، اگرچہ تصدیقی دستخط نہ فرمائے ہوں۔۔۔۔۔ پھر، ربیع الثانی ۱۳۵۵ھ کے بعد مفتی صاحب موصوف نے جو فتاویٰ حضرت حکیم الامتؒ سے مشورہ کر کے لکھے، ان کے مقابل ”م“ لکھ دیا، اور جو فتاویٰ ظاہر تھے، یا جنہیں حضرت حکیم الامتؒ کی تحقیق معلوم تھی مشورہ کی ضرورت نہ سمجھی گئی، ان کے مقابل ”ظ“ لکھ دیا تھا۔۔۔۔۔ افسوس کہ جلد اول کی کتابت و طباعت میں یہ ”م“ اور ”ظ“ کی علامتیں نقل نہیں کی جاسکیں، انشاء اللہ آئندہ جلدوں میں بلکہ جلد اول کی بھی اگلی اشاعتوں میں ان کا التزام کیا جائے گا۔

- ۸۔ مولانا مفتی عبدالکریم صاحب نے بعض فتاویٰ کے متعلق کچھ ضروری نوٹ رجسٹر کی جلد پر تحریر فرمائے تھے، انہیں احقر نے متعلقہ فتوے کے حاشیہ پر نقل کر دیا ہے۔
- ۹۔ والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ کے ایسا پر کتاب کی ترتیب تبویب ”فتاویٰ دارالعلوم دیوبند“ کے انداز پر رکھی گئی ہے۔
- ۱۰۔ تبویب میں فہرست کو زیادہ سے زیادہ مفصل اور واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، کتب، ابواب اور فصلیں قائم کر کے ان سے متعلق تمام فتاویٰ یکجا کر دیئے گئے ہیں، قدیم طرز کے فقہی ابواب کے علاوہ جدید مسائل کے لئے نئے ابواب مقرر کئے گئے ہیں، بحمد اللہ ترتیب و تبویب پوری کتاب کی مکمل ہو چکی ہے، جلد اول آپ کے سامنے ہے، جلد دوم زیر کتابت ہے، حالات سازگار ہوئے تو باقی جلدیں بھی انشاء اللہ جلد شائع ہو کر سامنے آئیں گی، واللہ المستعان۔

اللہ تعالیٰ اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ نافع اور مقبول بنائے، اور جن بزرگوں کی تحقیق و کاوش کا یہ ثمرہ ہو ان کے درجات میں روز افزوں ترقیات عطا فرمائے، آمین۔

۱۱۔ یہ سب تفصیل مولانا مفتی عبدالکریم صاحب ہی نے فتاویٰ کے رجسٹروں میں متعدد مقامات پر تحریر فرمائی ہے، مثلاً رجسٹر ۷ کے ص ۱۰۹ و ص ۱۹۰ کے حاشیہ پر۔

مؤلفین کتاب کے مختصر حالات زندگی

یہ کتاب بنیادی طور پر جن دو بزرگوں کے فتاویٰ پر مشتمل ہے، مناسب معلوم ہوا کہ ان کے مختصر حالات زندگی بھی یہاں تحریر کر دیتے جائیں، — حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ کے حالات زندگی ”تذکرۃ لظفر“ سے لئے گئے ہیں،

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ۱۳ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ کو دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔پی) میں ہوئی، عمر تین سال تھی کہ والدہ صاحبہ کا انتقال ہو گیا، اس لیے آپ کی پرورش دادی صاحبہ نے فرمائی، نسبی تعلق دیوبند کے مشہور عثمانی خاندان سے ہے، طلب علم مولانا نے سات سال کی عمر میں فتران شریف ناظرہ دیوبند کے مشہور حفاظ کے پاس پڑھنا شروع کیا، جن میں حافظ نامدار صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند اور حافظ غلام رسول صاحب بہ طور خاص قابل ذکر ہیں، آپ نے فتران شریف بچپن میں حفظ نہ کیا تھا ۳۴ سال کی عمر میں مولانا حافظ عبداللطیف صاحب سے صرف چھ مہینے کی مدت میں حفظ قرآن کی سعادت بھی نصیب ہوئی،

نوسال کی عمر میں دارالعلوم دیوبند کے درجہ فارسی و ریاضی میں داخل ہوئے، جہاں فارسی کی تمام کتابیں اور میزان لہرے ناچیز راقم الحروف کے دادا حضرت مولانا محمد حسین صاحب سے اور ریاضی کی تعلیم منشی منظور احمد صاحب سے حاصل کی،

آپ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے حقیقی بھانجے تھے، بارہ سال عمر ہوئی، تو درس نظامی کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے تھانہ بھون منتقل ہو گئے، جہاں آپ کے ماموں حکیم الامت مجدد ملت حضرت مولانا اشرف صاحب تھانوی قدس سرہ کی مشہور خانقاہ اُس وقت مرجع خلاق تھی، اسی خانقاہ کے مدرسہ امداد العلوم میں آپ نے فارسی ادب کی انتہائی کستابیں

۱۵ یہ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب کی مفصل سوانح ہے، جو مولانا مفتی عبدالکریم صاحب کے لائق و سرزند جناب مولانا عبدالشکور صاحب ترمذی نے تالیف فرمائی ہے،

منشی شوکت علی صاحب سے، اور عربی ادب و نحو و صرف و غیرہ کی کتابیں مولانا محمد عبداللہ صاحب گنگوہی سے پڑھیں، علم تجوید کی بعض کتابیں، مثنوی کے کچھ حصے اور "التلخیصات لعشر" کے کچھ حصے حضرت حکیم الامت سے پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی، اور التلخیصات کے کچھ حصے اپنے برادر بزرگوار حضرت مولانا سعید احمد صاحب سے پڑھے۔

۱۳۲۳ھ میں جب حضرت حکیم الامت نے اپنی مشہور تفسیر "بیان لہترآن" کی تصنیف شروع فرمائی، اور اس میں زیادہ مشغولیت رہنے لگی تو ہونہار بھانجے کو کانپور لے جا کر وہاں اپنے قائم کئے ہوئے مدرسہ جامع العلوم میں داخل فرمادیا، اور مولانا کی تعلیم و تربیت اپنے شاگرد رشید مولانا محمد اسحق صاحب بردوانی اور مولانا محمد رشید صاحب کانپوری کے سپرد فرمادی، اس مدرسہ میں خداداد صلاحیتوں اور علی ذوق و محنت کی بدولت آپ تمام ساتھیوں میں ممتاز رہے، اور یہیں ۱۳۲۶ھ میں دورہ حدیث سے فارغ ہوئے۔

علوم عقلیہ منطق، فلسفہ، ریاضی اور ہیئت کی کچھ انتہائی کتابیں باقی تھیں، اُن کی تکمیل کے لئے حضرت حکیم الامت کے مشورہ سے آپ اسی سال مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں داخل ہو گئے، جہاں مشہور محدث و فقیہ عارف باللہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ کا فیض علم جاری تھا، اُن کے درس بخاری اور خدمت و صحبت میں رہنے کا بھی خوب موقع ملا، اور بعد میں ان کے دست مبارک پر بیعت ہونے کی سعادت نصیب ہوئی، ۱۳۲۸ھ میں جب مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور سے سند فراغ ملی تو آپ کی عمر صرف ۱۸ سال تھی۔

تدریسی خدمات غیر معمولی استعداد کو دیکھتے ہوئے آپ کو ۱۳۲۹ھ سے مدرسہ مظاہر العلوم ہی میں تدریس کے فرائض سپرد کر دیئے گئے، یہاں آپ کی باقاعدہ تدریس کا سلسلہ سات سال جاری رہا، اور مشکوٰۃ شریف تک کی کتابیں پڑھانے کا موقع ملا، اس کے بعد دو سال تھانہ بھون کے قریب مدرسہ ارشاد العلوم گڑھی پختہ میں دوسری کتابوں کے علاوہ بخاری و مسلم شریف کا درس بھی دیا۔

۱۳۳۹ھ میں دوسرے حج سے واپسی کے بعد مولانا کا مستقل قیام تھانہ بھون کی خانقاہ و مدرسہ امداد العلوم میں ہو گیا، یہاں حضرت حکیم الامت نے تدریس اور تصنیف و تالیف کے علاوہ فتویٰ نویسی کا شعبہ بھی آپ کے سپرد فرمادیا، مولانا ان تمام شعبوں میں حضرت حکیم الامت کی نگرانی و رہنمائی میں علمی خدمات انجام دیتے رہے، یہاں آپ نے بیضاوی شریف اور دورہ حدیث کی

کتابوں کا درس دیا، اور تمام علوم و فنون کی کتابیں پڑھائیں۔

تقریباً اڑھائی سال مدرسہ راہنہ رینگون (برما) میں علی، تبلیغی اور انتظامی خدمات انجام دیں، ۱۳۵۸ھ میں آپ کو ڈھاکہ یونیورسٹی میں پروفیسر دینیات مقرر کیا گیا، اور آپ کے سپرد بخاری شریف مسلم شریف، کتاب التوحید اور ہدایہ وغیرہ کے اسباق کئے گئے، لیکن مولانا کے علی ذوق کی تسکین کے لئے یہ اسباق کافی نہ ہوئے۔

چنانچہ مولانا نے یونیورسٹی کے مذکورہ اسباق کے علاوہ مدرسہ اشرف العلوم ڈھاکہ میں بھی اسباق کا سلسلہ بلامعاوضہ شروع فرمادیا، یہاں بخاری شریف، مؤطا امام مالک، بیضاوی شریف اور مشنوی مولانا روم کے اسباق پڑھائے۔

چوتھے سفر حج کے بعد لال باغ ڈھاکہ میں جامعہ ہتر آنیہ کے نام سے ایک عظیم دینی مدرسہ آپ کی سرپرستی میں قائم ہوا، اس میں بھی تقریباً پندرہ سال آپ نے بخاری شریف کا درس دیا، اور تاحیات اس مدرسہ کی سرپرستی فرماتے رہے۔

۱۹۴۸ء میں جبکہ پاکستان بن چکا تھا آپ کو مدرسہ عالیہ ڈھاکہ کی صدر مدرس کی مناصب پیش کیا گیا، جسے آپ نے قبول فرمایا، اور یونیورسٹی سے وہاں منتقل ہو گئے، یہاں مدرسہ کی تعلیمی نگرانی کے علاوہ بخاری شریف، الاشباہ والنظائر اور اصول بزدوی کے اسباق بھی آپ کے سپرد رہے۔

تقسیم ہند سے قبل ڈھاکہ یونیورسٹی سے تعلق کے زمانہ میں تعطیلات گراماں آپ نے جامعہ اسلامیہ ڈھاکہ میں بھی مسلم شریف اور ترمذی شریف کے اسباق پڑھائے ہیں، پانچویں حج سے واپسی کے بعد ۱۹۵۲ء میں آپ مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان منتقل ہو گئے، اور تاحیات دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈوالہار (ضلع حیدرآباد سندھ) میں بہ حیثیت شیخ الحدیث، قرآن و سنت اور فقہ و فتویٰ کی خدمت فرماتے رہے۔

تمام دینی علوم و فنون میں آپ کی بلند پایہ تصانیف اتنی زیادہ ہیں کہ ان سب کا مختصر مختصر تعارف بھی کرایا جائے تو اس کے لئے ایک مستقل رسالہ کی ضرورت ہوگی، لیکن آپ کی تین تصانیف اس صدی کے عظیم علمی کارناموں میں ممتاز مقام رکھتی ہیں۔

مولانا کا سب سے بڑا علمی شاہکار جو اس صدی ہی کا نہیں بلکہ علم حدیث کے چودہ سو سال

دور کا بہت بڑا کارنامہ ہے، کتاب ”اعلاء السنن“ کی تصنیف ہے جو کہ بنیں ضخیم جلدوں میں بڑے سائے کے چھ ہزار صفحات پر مشتمل ہے، یہ کتاب آپ نے حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی فرمائش پر اور انہی کی رہنمائی میں قیام تھانہ بھٹون کے دوران تصنیف فرمائی، اس کتاب میں مولانا نے تقریباً بیس سال کی عرق ریزی اور محنت شاقہ کے بعد ان احادیث کو فقہی ابواب کی ترتیب کے جمع فرمایا ہے، جن سے فقہ حنفی مأخوذ ہے، اور تمام فقہی ابواب سے متعلق احادیث نبویہ کی ایسی بے نظیر محدثانہ تشریح و تفصیل بیان فرمائی کہ علمی دنیا دیکھ کر ششدر رہ گئی، کہ اس زمانہ میں بھی ایسے محققانہ کارنامے انجام دینے والے پائے جاتے ہیں، مصر کے جلیل القدر عالم زبانی اور فن حدیث کے مشہور محقق شیخ زاہد الکوثریؒ اپنی کتاب ”مقالات الکوثری“ میں فرماتے ہیں کہ:

”حق بات یہ ہے کہ میں فن حدیث میں اس انتہاء درجہ کی تحقیق اور جامع کتاب کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔“

چند سطر بعد فرماتے ہیں کہ:

”مجھے اس کے مؤلف پر حد درجہ رشک آتا ہے“

حضرت مولانا محمد یوسف حنا بنوریؒ فرماتے ہیں کہ ”اس شہید علم کی یہ ایک کتاب ہی ان کی آئینہ کمالات ہے، اگر اور تصنیف نہ ہوتی تو صرف یہ ایک کتاب ہی کافی دشانی تھی“ یہ کتاب عربی زبان میں ہے، اور شائع ہو چکی ہے، مگر افسوس کہ کتابت و طباعت اس عظیم کتاب کے شایان شان نہیں، اب تقریباً چار سال سے برادر عزیز مولانا محمد تقی صاحب عثمانی اس کتاب پر تحقیق و تعلیق کا کام کر رہے ہیں جلد اول ان کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ ٹائپ کی دیدہ زیب طباعت سے آراستہ ہو چکی ہے، باقی جلدوں پر کام جاری ہے، سعودی عرب میں شام کے مشہور عالم فضیلہ الشیخ عبدالفتاح ابو غدہ اس کتاب کے مقدمہ پر تحقیق و تعلیق فرما رہے ہیں، جس کا ایک حصہ ”قواعد فی علوم الحدیث“ کے نام سے نہایت آب و تاب سے شائع ہو چکا ہے، اور دوسرے حصہ پر کام جاری ہے۔

مولانا کا دوسرا بڑا علمی شاہکار ”احکام الہدیان“ ہے، یہ بھی عربی زبان میں ہے، فقہ حنفی قرآن کریم کی کن کن آیات سے مأخوذ ہے، اور حنفی فقہ نے کون کون سی آیات سے کن کن فقہی مسائل کا استنباط کیا؟

۱۔ تقریباً شیخ عبدالفتاح ابو غدہ، براعلاء السنن ج اول طبع جدید، ص ۷۷، بحوالہ مقالات الکوثری، ص ۵۷۔

”احکام اُستِ ران“ میں ان سب کو نہایت تحقیق و ہستیاط کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے، حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ نے اس تصنیف کا کام چار علماء محققین کے سپرد فرما دیا تھا، جن میں سے حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی، حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی اور احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب (رحمہم اللہ) نے اپنے اپنے حصوں کا کام مکمل فرمایا، اور وہ طبع بھی ہوئے ایک حصہ ہنوز تشنہ تکمیل ہی، حضرت مولانا ظفر احمد صاحب کے سپرد سورہ فاتحہ سے سورہ نساء تک کا کام تھا، جو آپ نے نہایت حسن و خوبی سے انجام دیا، علم تفسیر و علم فقہ میں مولانا کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔

مولانا کا تیسرا بڑا کارنامہ ”امداد الاحکام“ ہے، جس کی جلد اول اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس کا مفصل تعارف پچھلے اوراق میں آچکا ہے، مولانا کی باقی بلند پایہ تصانیف کا مفصل تعارف کتاب ”تذکرۃ النظر“ میں ملاحظہ فرمایا جائے۔

تبلیغی خدمات | حضرت مولانا مرحوم نے تدریس و فتویٰ اور تصنیف و تالیف کے علاوہ تبلیغی خدمات میں بھی بھرپور حصہ لیا، اور وعظ و تذکیر اور زبانی مناظروں کے ذریعہ دین کی تبلیغ اور باطل کی سرکوبی کا سلسلہ ان تمام علمی و تحقیقی خدمات کے ساتھ تاحیات جاری رہا، برما میں رنگون کے قریب ایک بستی ”ویڈنو“ کے سارے مسلمان بھاگتی مذہب قبول کر کے مرتد ہو گئے تھے، حضرت مولانا کی تبلیغی کوششوں سے بحال شدہ ایک ہی سال میں وہ سب دوبارہ مسلمان ہو گئے، صرف سترہ آدمی اس مذہب میں ایسے باقی رہ گئے جنہیں مرکز بہائیت امریکہ سے بڑی بڑی تنخواہیں ملتی تھیں۔

عیسائی پادریوں، قادیانیوں اور متعدد فرقوں کے مبلغین سے آپ کے بڑے کامیاب مناظرے ہوئے، جن کی بصیرت افروز تفصیلات ”تذکرۃ النظر“ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ آپ نے حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایسا پر قیام پاکستان کی تحریک میں بھی تحریر و تقریر کے ذریعہ سرگرمی سے حصہ لیا، قیام پاکستان کی منزل قریب آئی تو صوبہ سرحد اور سلہٹ میں زلیف نڈم ہونا طے ہو گیا، جس میں شدید خطرہ تھا کہ یہ دونوں علاقے پاکستان میں شامل ہونے سے رہ جائیں، اس وقت قائد اعظم محمد علی جناح کی خواہش پر صوبہ سرحد کا دورہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، اور احقر کے والد ماجد نے فرمایا، اور سلہٹ کا محاذ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے سنبھالا، بحمد اللہ دونوں محاذوں پر ان بزرگوں کو مکمل کامیابی حاصل ہوئی،

اور وہاں کے مسلمانوں نے بہت بھاری اکثریت سے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو جب پاکستان کا پرچم یہاں کی آزاد فضاء میں پہلی مرتبہ لہرانے کی تقریب ہوئی تو قائد عظم کی خواہش پر کراچی میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے اور ڈھاکہ میں حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ نے پرچم کشائی فرمائی۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان میں قومی اسمبلی کے انتخابات ہونے والے تھے، اچانک سوشلزم کا فتنہ پورے پاکستان میں اٹھ کھڑا ہوا، اور سوشلزم کو اسلام کے عین مطابق کہا جانے لگا، یہ حضرت مولانا ظفر احمد صاحبؒ کی پیرائے سالی اور ہجوم امراض کا زمانہ تھا، مگر آپ نے اسی معذوری کی حالت میں پاکستان کے بڑے بڑے شہروں کے دورے فرمائے، اور اپنی تحریر و تقریر سے اسلام اور سوشلزم کا فرق واضح کیا۔

زندگی کے آخری بیس سال دارالعلوم اسلامیہ ٹنڈو اشدریار میں بسر ہوئے، امراض کا ہجوم ہو چکا تھا، اور جسمانی توانائیاں ختم ہو رہی تھیں، مگر صحیح بخاری کا درس اور فتاویٰ کا سلسلہ آخر حیات تک جاری رہا، نماز باجماعت اور اذکار و نوافل کی پابندی میں فرق نہ آیا، جب معذوری زیادہ ہو گئی تو ہاتھ کی گاڑی میں مسجد تک تشریف لے جاتے تھے، زبان پر اکثر اوقات ذکر جاری رہتا تھا ۱۹۴۷ء کے رمضان میں معالجین نے مسلسل امراض کے باعث روزہ سے منع کیا تھا، مگر آپ نہ ملنے اور فرمایا کہ:

”حضرت عباسؓ نے نوے سال کی عمر میں بھی روزہ ترک نہ فرمایا، اور سخت مشقت کے باوجود فدیہ دے کر روزہ چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے تو میں اس پر کیسے راضی ہو جاؤں؟“

بالآخر اسی سال ۱۹۴۷ء کے ماہ ذیقعدہ میں اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے جوار رحمت میں بلالیا، کراچی میں وفات ہوئی، اور یہیں پاپوشنگر کے قبرستان میں آپ کا مزار ہے، آپ کے صاحبزادے نے تالیف وفات یہ نکالی:-

”اِنَّهُ لَفِي رَوْحٍ وَرَيْحَانٍ وَجَنَّةٍ نَعِيمٍ“

۹۴ ————— ۱۳

مولانا مفتی عبدالکریم صاحب گمٹھلوی

”اداد الاحکام“ کے دوسرے مؤلف حضرت مولانا مفتی عبدالکریم صاحب گمٹھلوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، افسوس کہ مفتی صاحب مرحوم کی کوئی مستقل سوانح ابھی تک شائع نہیں ہوئی، البتہ اشرف سوانح جلد سوم میں آپ کی متعدد تبلیغی خدمات کا تذکرہ آگیا ہے، اور پروفیسر حمید سعید صاحب کی کتاب ”بزم اشرف کے چراغ“ میں بھی حضرت مفتی صاحب کے مختصر حالات زندگی بیان کئے گئے ہیں، یہاں انہی دو کتابوں کا خلاصہ ذکر کیا جاتا ہے۔

حضرت مفتی صاحب کا وطن ضلع کرنال کی تحصیل کا مشہور قصبہ ”گمٹھل گڑھو“ تھا، ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء میں آپ کی ولادت ہوئی، پانچ سال کی عمر میں والدہ صاحبہ کا انتقال ہو گیا تھا، آپ کے والد جناب حکیم محمد غوث صاحب دہلی کے مشہور حکیم ہوئے ہیں، فارسی ادب کا خاص ذوق رکھتے تھے، اور دہلی کے مشہور نقشبندی خاندان سے بیعت و ارادت کا تعلق تھا۔

تحصیلِ علوم | قرآن شریف اور نوشت و خواندگی تعلیم اپنے قصبہ میں پیر جی محمد اسحق صاحب وغیرہ سے حاصل کی، پھر سہارنپور کے شہرہ آفاق مدرسہ ”مظاہر العلوم“ میں داخل ہو کر شیخ المحدثین حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ کی سرپرستی میں درس نظامی کی باقاعدہ تحصیل شروع فرمادی۔

اسی اثناء میں درس نظامی کا کچھ حصہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کے زیر سایہ خانقاہ تھانہ بھون میں مولانا انوار الحق صاحب امرہ ہوی اور سید احمد حسن صاحب سنبھلی سے پڑھنے کا موقع ملا، گاہ بہ گاہ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ سے بھی علمی استفادہ فرماتے رہے، مدرسہ عبدالرب دہلی میں حضرت مولانا عبدعلی صاحب سے حدیث کی دو مشہور کتابیں مسلم شریف اور ترمذی شریف دوبارہ پڑھیں، مولانا عبدعلی صاحب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے شاگردوں میں مستیازی شان رکھتے تھے، اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے اساتذہ میں سے تھے۔

حضرت مفتی صاحب کو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ سے حدیث کی مشہور

جلد ۱ ص ۲۲۹ تا ص ۲۴۸، یہ حضرت حکیم الامت کی سوانح ہی جو خواجہ عزیز الحسن صاحب مجددیؒ کی تالیف ہے۔

کتابوں ”صحاح ستہ“ اور ”مؤطبیین“ کی اور علوم نقلیہ و عقلیہ کی قلمی سند بھی حاصل ہے۔

تدریسی خدمات | تحصیل علوم سے فراغت کے بعد حضرت سہارنپوریؒ کے ایما پر موضع اجرا و ضلع میرٹھ کے ایک مدرسہ میں تدریس پر مامور ہوئے، اس کے

بعد مختلف مدرسوں میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔

بعد ازاں تھانہ بھون میں اپنے پیر و مرشد حکیم الامت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کی رہنمائی میں تدریس و تالیف اور تبلیغ و فتویٰ کی خدمات میں مشغول ہو گئے، اور تقریباً پچیس سال اس خانقاہ سے تعلق رہا، حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی طرف سے آپ مجازِ صحبت ہیں۔

اسی پچیس سالہ دور میں تقریباً ایک سال اپنے حیدرآباد سندھ میں بھی تدریسی اور تبلیغی امور انجام دیئے، کچھ چھپنے ریواڑی کے عربی مدرسہ میں بحیثیت مدرس قیام فرمایا۔

سفر حج اور مدینہ منورہ میں خدمت تدریس | آپ نے پہلا حج غالباً ۱۳۲۵ھ میں کیا تھا، دوسرا سفر حج بال بچوں کے ساتھ ہوا اور

سال بھر حجاز مقدس میں قیام کے بعد تیسرا حج کر کے واپسی ہوئی، اس مرتبہ مسلسل آٹھ ماہ مدینہ طیبہ میں قیام کا شرف حاصل ہوا، اور مدینہ طیبہ کے ”درسہ علوم شرعیہ“ میں حدیث و فقہ کی بڑی کتابوں مسلم شریف، مؤطا، امام مالک، اور ہدایہ وغیرہ کا درس دینے کی سعادت نصیب ہوئی، آپ کے درس حدیث میں مسجد نبویؐ کے بعض اساتذہ بھی شریک ہو کر تھے، جو فقہ مالکی سے تعلق رکھتے تھے، حضرت مفتی صاحبؒ نے ایک استاذ سے دریافت کیا کہ مؤطا امام مالکؒ تو آپ کے امام کی کتاب ہے، اسے تو آپ حنفیوں سے زیادہ سمجھتے ہوں گے، پھر آپ یہاں اس کے سبق میں کیوں شریک ہوتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا کہ ”احادیث میں آپ جو تطبیق دیتے ہیں میں اُس کو سننے کے لئے آتا ہوں، پھر جا کر حرم نبویؐ میں طلبہ کو سناتا ہوں، یہ فن تطبیق جیسا کہ آپ حضرات کو آتا ہے ہمیں نہیں آتا“

تبلیغی خدمات | حضرت حکیم الامتؒ کو مفتی صاحبؒ پر حد درجہ اعتماد تھا، بڑے بڑے اہم کاموں کی انجام دہی پر آپ کو مامور فرماتے اور اپنے علمی تحقیقی اور تبلیغی کاموں میں شریک رکھتے تھے۔

۱۳۳۱ھ میں آگرہ کی طرف سے فتنہ امداد کی خبر پہنچی کہ وہاں آریہ مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کر رہے ہیں، حضرت حکیم الامتؒ نے اس فتنہ کے سد باب کے لئے مفتی صاحبؒ کو

اور مولانا عبد المجید صاحب بچھراؤی کو روانہ کیا، یہ دونوں حضرات وہاں دو سال تک تبلیغی جہد فرماتے رہے، قرآن شریف کی تعلیم کے لئے وہاں تفسیراً ایک سو مکاتب قائم کئے، جن کی مالی امداد میں حضرت تھانویؒ نے کافی حصہ لیا، بحمد اللہ! یہ کوششیں کامیاب ہوئیں، اس جدوجہد میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحب قدس سرہ کی معیت بھی حاصل رہی، جس پر حضرت حکیم الامتؒ نے اپنے والا نامہ میں بڑی مسرت کا اظہار فرمایا۔

صوبہ پنجاب میں وراثت کا قانون شریعت کے خلاف نافذ تھا، مثلاً بہن اور بیٹی کو حصہ نہیں دیا جاتا تھا، مسئلہ نہ جاننے کی وجہ سے اچھے خاصے دیندار مسلمان بھی حصہ نہ دیتے تھے، حضرت حکیم الامتؒ کو اطلاع ملی تو مفتی صاحبؒ کو دو مرتبہ پنجاب کے دورے پر بھیجا، کہ وہاں شرعی قانون کی نشر و اشاعت کریں، اور اس غیر شرعی قانون کو تبدیل کرانے کے لئے وہاں کے بااثر لوگوں کو آمادہ کریں، حضرت مفتی صاحبؒ نے اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے ایک رسالہ ”غصب المیراث“ بھی تالیف فرمایا، جو ایک سفر میں ریل میں بیٹھے بیٹھے چند گھنٹوں میں تحریر فرمایا، حضرت حکیم الامتؒ نے یہ رسالہ دو مرتبہ چھپوا کر بذریعہ ڈاک تقسیم فرمایا، ان مساعی کا اثر یہ ہوا کہ سفر پنجاب ختم ہونے سے پہلے ہی لوگوں نے قانون بدلنے کے لئے سعی شروع کر دی، جس کے کچھ اثرات پاکستان بن جانے کے بعد ۱۹۴۹ء میں ظاہر ہوئے، کہ قانون میں کسی قدر اصلاحات شرعی ضابطوں کے مطابق کر دی گئیں۔

غالباً ۱۳۲۶ھ یا ۱۳۲۷ھ میں ریاست اُور میں دینی تعلیم کے تمام چھوٹے بڑے مدارس حکومت نے یک قلم بند کر دیئے تھے، دہلی میں بھی جبریہ تعلیم کی وجہ سے قرآنی مکاتب کو حکماً توڑنے کا سلسلہ شروع ہو گیا، وہاں گیارہ مکتب ٹوٹ چکے تھے، حضرت حکیم الامتؒ نے اس حکم کو منسوخ کرنے اور متعلقہ قانونی چارہ جوئی کے لئے دہلی بھیجا، مفتی صاحبؒ کی لگاتار جدوجہد سے بحمد اللہ کامیابی ہوئی، اور اس کے بعد کوئی مکتب بند نہ کیا جاسکا، دوسرے مقامات پر بھی دہلی کی کوششوں کے بڑے مفید نتائج برآمد ہوئے۔

آپ تحریک قیام پاکستان کے پُر زور حامی تھے، اس زمانہ میں حضرت حکیم الامتؒ نے جو نو ذائدِ عظم کے پاس بغرض تبلیغ و مشورہ بھیجے، اُن میں آپ کو بھی شریک کیا گیا تھا، مفتی صاحبؒ کو مناظرے کا ملکہ بھی خوب حاصل تھا، حیدر آباد سندھ اور

مناظرے

انبالہ (پنجاب) میں مرزائیوں سے آپ کے دو مناظروں کی دُند و بزمِ شرف کے چراغ

میں نقل کی گئی ہے، جن میں مسلمانوں کو فتحِ مبین حاصل ہوئی۔

تحقیقی تصنیفی خدمات کئی بلند پایہ تصانیف آپ کا صدقہ جاریہ ہیں جو بیشتر حکیم الامتؒ کی رہنمائی اور سرِ مالش پر لکھی گئی ہیں، اور سب کا تعلق فقہ و فتویٰ سے ہے، چند تصانیف یہ ہیں:-

۱۔ حیلہ ناجزہ :- ہندوستان میں شرعی قاضی مقرر نہ ہونے کی وجہ سے شادی شدہ عورتوں کو بعض حالات میں سخت مصائب کا سامنا ہوا تھا، حضرت حکیم الامتؒ نے ان مسائل میں شدید ضرورت کی بناء پر مالکی مسلک اختیار فرمایا، اور ان مشکلات کے حل کی بہت آسان صورتیں تجویز فرمائیں، جو کتاب ”حیلہ ناجزہ“ میں بیان کی گئیں، یہ ایک لحاظ سے اجتہادی نوعیت کا کارنامہ تھا، کئی سال تک فقہ حنفی اور فقہ مالکی کی پوری تفصیلات نہایت احتیاط اور دقت نظر سے جمع کر کے نکلے گئے، اس پورے کام میں حکیم الامتؒ نے احقر کے والد ماجد کو اور حضرت مولانا مفتی عبدالکریم صاحب کو اوّل سے آخر تک شریک رکھا، درحقیقت یہ کتاب ان تینوں بزرگوں کا مشترک کارنامہ ہی، احقر نے اپنے والد ماجد سے سنا کہ اس کتاب کی تالیف کے دوران حضرت حکیم الامتؒ نے ایک مرتبہ اظہارِ خوشنودی اور حوصلہ افزائی کے لئے ہم دونوں (یعنی حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور حضرت مولانا مفتی عبدالکریم صاحب) سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ”تم دونوں میرے لئے بمنزلہ عَیْنِیْن ہو، ایک کے اول میں عین ہے (یعنی عبدالکریم) اور ایک کے آخر میں عین ہے“ (یعنی محمد شفیع)۔ اس کتاب کی تحقیق و تصنیف کے دوران حضرت مولانا مفتی عبدالکریم صاحب کئی کئی ہفتے دیوبند میں والد صاحب کے پاس قیام فرماتے، وہ میرے بچپن کا زمانہ تھا، مجھے یاد ہے کہ دونوں بزرگ شبِ روزان بچپن کے مسائل میں غور و فکر اور تبادلہ خیالات فرماتے رہتے تھے، بحمد اللہ یہ کتاب طبع ہو کر اتنی مقبول ہوئی کہ عورتوں کی مذکورہ مشکلات میں اب ہر حنفی دارالافتاء سے فتویٰ اسی کتاب کی روشنی میں لکھا جاتا ہے۔

۲۔ تتمہ امداد الاحکام :- یہ انہی ۵۰۱ فتاویٰ کا مجموعہ ہے جو ”امداد الاحکام“ کا جزو بنکر اب پہلی مرتبہ دارالعلوم کراچی سے شائع ہو رہے ہیں، ان کا مفصل تعارف پیچھے آچکا ہے۔

۳۔ عربی زبان میں ”عَیْنِیْن“ دو آنکھوں کو کہتے ہیں۔

۳۔ المختارات :- اس میں خیابلوغ وغیرہ کے مفصل احکام موجودہ ضرورتوں کے مطابق لکھے گئے ہیں، یہ رسالہ ”حیلہ ناجزہ“ کا جُز بن کر شائع ہوا ہے۔

۴۔ وفاق المجتہدین عن وفاق المجتہدین :- اس میں ”حیلہ ناجزہ“ پر ہونے والے بعض علمی اشکالات کو رفع کیا گیا ہے۔

۵۔ تجدد اللعنة فی تعدد الجمعة :- اس میں دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ بڑے شہر میں نماز جمعہ کے اجتماعات ایک سے زیادہ ہو سکتے ہیں۔

۶۔ القول الرفیع فی الذب عن الشفیع :- والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے رسالہ ”غایات النسب“ پر بعض لوگوں نے اعتراضات کئے اور فتنہ برپا کر دیا، تو حضرت مولانا مفتی عبدالکریم صاحب نے یہ رسالہ تصنیف فرمایا جس میں ان اعتراضات کا علمی جواب دیا گیا۔

۷۔ ترجمہ نصوص خطبات الاحکام :- حضرت حکیم الامت کی مشہور تالیف ”خطبات الاحکام“ جو بکثرت آیات و احادیث پر مشتمل ہے مفتی صاحب مرحوم نے اس رسالہ میں ان آیات و احادیث کا ترجمہ ضروری افادات کے ساتھ فرمایا ہے، اور بعض احادیث کا اضافہ بھی فرمایا ہے، یہ رسالہ اصل کتاب کے آخر میں عرصہ سے شائع ہو رہا ہے۔

۸۔ غصب المیراث :- اس رسالہ کا ذکر بھی تبلیغی خدمات میں آچکا ہے۔

۱۹۲۸ء میں اپنے اعزہ اور اہل وطن کے ہمراہ ہجرت کر کے پاکستان تشریف لے آئے، قصبہ ساہیوال ضلع سرگودھا میں قیام فرمایا، تقریباً سو سال

ہجرت پاکستان اور وفات

بعد یہیں بخار اور اسہال کے عارضہ میں ۹ رجب ۱۳۶۵ھ مطابق ۱۹۴۷ء میں وفات پائی، کل عمر ۵۳ سال چھ ماہ ۴ دن ہوئی، اسی قصبہ کے قبرستان میں آپ کا مزار ہے، رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً شاملاً۔

حضرت مفتی صاحب مرحوم کے صدقات جاریہ میں سے ایک بڑا صدقہ جاریہ آپ کے صاحبزادہ مولانا عبدالشکور صاحب ترمذی مدظلہ ہیں جو اپنے والد ماجد کے نقش قدم پر تدریس تصنیف اور تحقیق و تبلیغ کی مخلصانہ خدمات میں مشغول ہیں اب تک کئی وقیع تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں اور اسی قصبہ ساہیوال ضلع سرگودھا میں دارالعلوم حقانیہ نہایت جانفشانی اور سادگی سے چلا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب بزرگوں کے علوم و فیوض کو تاقیامت جاری رکھے اور درجات عالیہ سے سرفراز فرمائے، آمین۔

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

خادم دارالعلوم، کراچی

۲۰ صفر ۱۴۰۸ھ

۹ جنوری ۱۹۸۸ء

تمہید امداد الاحکام

ضمیمہ

امداد الفتاویٰ

بعد الحمد والصلوة عرض ہے کہ سن ۱۳۴۲ھ میں جب بر خوردار مولوی ظفر احمد سلمہ بقصد قیام مستقل تھانہ بھون آئے تو مغلہ اور کاموں کے میں نے فتاویٰ کا کام بھی ان کے سپرد کر دیا، کیونکہ کثرت مشاغل کی وجہ سے مجھے کتابوں کی تلاش و تفتیش کی فرست نہ ہوتی تھی، بر خوردار سلمہ ہر اس فتویٰ کو جس میں کچھ بھی کسی حیثیت سے اہمیت ہوتی تھی اول اول بالالتزام مجھے دکھالیتے تھے، اور معمولی فتاویٰ خود لکھ دیتے تھے، خدا کے فضل سے فتاویٰ کے کام کو انھوں نے باحسن وجہ انجام دیا، اور بعد چندے جب دیکھا گیا کہ اشار اللہ فتاویٰ نہایت تحقیق سے لکھے جاتے ہیں، اور بھدا اللہ ہر پہلو پر نظر کافی ہو جاتی ہے، تو پھر سب فتاویٰ کے دکھلانے کی ضرورت نہ سمجھی گئی، ہاں پھر بھی اکثر فتاویٰ میں مجھ سے مشورہ کر لیتے تھے، اور بعض فتاویٰ کو دکھلا بھی لیتے تھے، چنانچہ یہ مجموعہ جو جناب کے سامنے ہے اُن ہی فتاویٰ کا مجموعہ ہے، اس میں اگرچہ سب میرے دیکھے ہوئے نہیں ہیں، مگر بر خوردار سلمہ کے فتاویٰ پر مجھے تقریباً ایسا ہی اطمینان ہے جیسا خود اپنے لکھے ہوئے فتاویٰ پر اسی لئے اس کا نام ”امداد الاحکام ضمیمہ امداد الفتاویٰ“ تجویز کرتا ہوں، وباللہ التوفیق،

(اشرف علی)

امداد الاحکام جلد اول

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

کتاب الایمان والعقائد

فصل فی متفرقات

سوال (۱) بہشتی زیور میں تحریر ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف پر جہاد کیا تو اس وقت سلیمہ سعدیہؓ مع شوہر اور لڑکے کے حضور کی خدمت میں آئیں، آپ نے اپنی چادر اُن کی عزت کے واسطے بچھادی، اور مسلمان کیا، تو کیا سلیمہ سعدیہؓ اُس وقت مسلمان نہیں ہوتی تھیں جبکہ آپ کو دودھ پلاتی تھیں؟

الجواب: سلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا حضور کے ایام رضاع میں مسلمان تو یقیناً نہ تھیں اگر موجد ہوں تو اس کا ثبوت میری نظر سے نہیں گذرا، وہ غالباً غزوہ حنین کے بعد اسلام لائی ہیں،

سوال (۲) جو شخص کہ تارک الصلوٰۃ ہو بغیر عذر شرعی، اس کا کیا حکم ہے، آیا اس کو کافر کہیں گے یا نہیں، اور اگر کافر ہے تو کیا اس سے بھی مشرکین جیسا تعلقات میں حکم ہے یعنی جو حکم مشرکین سے ہے،

الجواب: قال فی الدرہی فرض عین علی کل مکلف الی ان قال ویکفر جاحداً بالشہوہا بدلیل قطعی وتارکاً عملاً مجانۃً ائیکما سلافاً یجب حتی یشعل لانی یجب لحق العبد فحق الحق احق وقیل یضرب حتی یشعل منہ الدم وعند الشافعی یقتل بصلوٰۃ واحدة حدّ وقیل کفرّاً قال فی الشامیۃ قولہ وقیل یضرب قالہ الامام المجوبی عن المنخ وظاہر الحلیۃ انہ المذہب

مع استیعاب میں غزوہ حنین کے موقع پر حجاز میں سلیمہؓ کا حضور کی خدمت میں آنا بیان کیا ہے، ایسا ہی اصابہ میں بھی ہے، اور اصابہ میں شمار بہت سلیمہؓ کا اسلام غزوہ ہوازن کے بعد بیان کیا ہے، غالباً اسی وقت سلیمہؓ بھی اسلام لائی ہوں گی، غزوہ ہوازن و غزوہ حنین ایک ہی ہے ۱۲ منہ

فانه قال وقال اصحابنا في جماعة منهم الزهري لا يقتل بل يعزر ويحبس حتى يموت او يتوب قوله د
عند الشافعي يقتل وكذلك عند مالك واحمد وفي رواية عن احمد وهي المختارة عند جمهور اصحابنا
انه يقتل كفا وبسط ذلك في الحلية ام (ص ۳۶۲ ج ۱)

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ تارکِ صلوٰۃ عمداً بشرطیکہ وہ نماز سے استہزاء نہ کرتا ہو حقیقہ
کے نزدیک کافر نہیں بلکہ فاسق ہے، جس کی سزا یہ ہے کہ اس کو اتنا مارا جائے کہ بدن سے خون
پہنے لگے پھر قید کر دیا جائے حتیٰ کہ مر جائے یا توبہ کرے، اور امام شافعی و مالک و احمد کے نزدیک
اس کی سزا قتل ہے، اور حنابلہ کے نزدیک مختار یہ ہے کہ تارکِ صلوٰۃ عمداً کافر ہے، مگر یہ ضرور
ہے کہ ان سزاؤں کا اختیار عام لوگوں کو نہیں بلکہ امام کے سپرد یہ سب کام ہیں، البتہ نابالغ اولاد
کو یا غلام کو باپ اور سید بھی سزا دے سکتے ہیں، مگر قتل کا اختیار ان کو بھی نہیں، عام مسلمانوں
کو تارکِ صلوٰۃ کے ساتھ دوستانہ تعلقات نہ کرنے چاہئیں، اس کے یہاں کھانا وغیرہ بھی نہ کھائیں
تاکہ زحمت حاصل ہو، چنانچہ فقہاء نے منکوحہ تارکِ صلوٰۃ کو طلاق دیدینا مستحب لکھا ہے، حالانکہ طلاق
ابغض المباحات ہے، قال فی الدرر لیحب لو مؤذیۃ او تارکۃ صلوٰۃ ام و فی الشامیۃ قوله او
تارکۃ صلوٰۃ الظاہران ترک الفرائض غیر الصلوٰۃ کالصلوٰۃ وعن ابن مسعود لان العی اللہ تعالیٰ
وصداقہما بذمتی خیر من اعاشرا مرآۃ لا تصلی ام (ص ۶۸۳ ج ۲)

میت کو بپارنے کا حکم | سوال (۳) اگر کوئی شخص خواہ عالم ہو یا جاہل کسی کے مزار پر جا کر
خواہ وہ مزار عالم کا ہو یا کسی ولی کا ہڈیہ کہے کہ اے فلاں شخص ہمارے واسطے یہ دعا کر کہ اس
کام میں کامیاب ہو جائیں یا یہ کہو کہ اے فلاں نکل قبر میں سے اسلام کی حمایت و مدد کر یا او
اسی قسم کے الفاظ استعمال کرے تو اس کے ایمان میں کچھ خلل تو نہیں آئے گا؟

الجواب؛ میت کو اس طرح پکارنا مکروہ ہے، اور اگر عقیدہ بھی خراب ہو کہ میت کو
کارخانہ خداوندی میں دخیل سمجھا ہو تو حرام ہے، قال فی الشامیۃ ویکرہ النوم عند القبر الی ان
قال وکل ما لم یعہد من السنۃ والمعہود منہا لیس الا زیارۃ تہا والدعاء عنہ قائما ام (۹۴۵ ج ۱)
واللہ اعلم، ۲، ربیع الثانی سنۃ ۱۳۴۵ھ

تابع سے قیامت میں حسبِ لائق جانے کا حکم | سوال (۴) اگر کوئی شخص اپنے سائے معاصی اور

۱۳ لیکن نابالغ کو ہاتھ سے مارا جائے لکڑی سے نہیں، صرح بہ فی الدرر ۱۲ ظفر

سینات سے توبہ کر کے مرگیا اور وہ اس حدیث کے بموجب کہ التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ کا مصداق ہو گیا، تو پھر اس سے قیامت کے دن باز پرس اس کے اعمال کی ہوگی یا نہیں؟ اور اگر ہوگی تو پھر عفو کے کیا معنی ہیں، کیونکہ باز پرس بھی تو ایک گونہ باعثِ کلفت ہے، اور اگر نہیں تو اس کے کیا معنی کہ اللہ تعالیٰ ذرہ ذرہ کا حساب لے گا،

الجواب: جو شخص توبہ کر کے مرتب ہے اور اس کی توبہ قبول بھی ہو جائے اس سے جو کچھ حساب ہوگا وہ بطور پیشی کے ہوگا، مناقشہ کے ساتھ حساب نہ ہوگا، فان من نقش ملک الحدیث، کیونکہ جس سے مناقشہ ہوگا وہ تو تباہ ہو جاوے گا اور توبہ کر کے مرنے والا ہلاکت سے محفوظ ہے فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَسَوْفَ يُجَابِبُ حَسَابًا سِيرًا وَيُنْقَلِبُ اِلَىٰ اَهْلِهِ مُسْرُورًا، وَآَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتَابَهُ بِشِمَالِهِ فَسَوْفَ يَدْعُو ثُبُورًا وَيَصْلٰى سَعِيرًا

اس آیت سے معلوم ہوا کہ حساب سب سے ہوگا مگر نیک لوگوں سے آسان حساب ہوگا، اور بدوں سے سخت، رہا یہ شبہ کہ باز پرس بھی تو ایک گونہ باعثِ کلفت ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ محبت کے ساتھ باز پرس باعثِ کلفت نہیں ہوا کرتی، کیا عاشق و معشوق میں باہم گلہ اور..... شکایات نہیں ہوا کرتے، پھر کیا عشاق کو اس سے کلفت ہوتی ہے یا اس میں لذت آتی ہے، فافہم،

سوال (۵) درین زمان یک رسالہ در سجدہ تعظیم مرشد از مولوی خواجہ حسن نظامی دہلوی شائع شدہ اگر در رد آں رسالہ دیگر از تالیف آن جناب یا دیگر عالم ربانی تصنیف یافتہ باشد از نام و نشان موجودگی آں رسالہ خورسند فرمایند عنایت باشد

الجواب: سجدہ تعظیم مرشد حرام ہے، اس بارہ میں رسالہ حفظ الایمان مؤلفہ حکیم الامت قابلِ ملاحظہ ہے، واللہ اعلم، ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۸ھ

مسئلہ تقدیر پر ایک اشکال کا جواب | سوال (۶)..... قرآن پاک میں ہو کہ اللہ

تعالیٰ جس کو چاہے گمراہ کرے اور جس کو چاہے ہدایت کرے، اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ جب ہدایت اور گمراہی کا دار و مدار مشیت الہی پر ہے تو بندہ مجبور ہے، ہدایت و گمراہی کا معاملہ بند کے اختیار اور ارادے سے باہر ہو گیا، خدا کی مشیت اگر اوجہل کی ہدایت کے ساتھ متعلق ہوتی تو وہ ضرور ہدایت پر ہوتا مگر اس کی گمراہی اور ضلالت کے ساتھ مشیت الہی متعلق

ہوتی ہندو گمراہ ہو گیا، یعنی خدا سی نے چاہا کہ ابو جہل گمراہ ہو، گویا ابو جہل ایمان لانے ... اور صراطِ مستقیم کی طرف آنے میں مجبور تھا، کیونکہ خدا کی مشیت اور ارادے کے خلاف کسی امر کا وقوع میں آنا غیر ممکن ہے، اس میں دو باتیں ہیں ایک تو یہ کہ بندہ اپنے کسی فعل بد یا نیک پر خدا کی مشیت کے سامنے مجبور ہو کر قادر ہی نہیں ٹھہرتا، دوسرے یہ کہ خدا کا کام ہدایت ہے نہ کہ گمراہ کرنا، اور اسکی مشیت کا تعلق بندے کی ہدایت کے ساتھ ہونا چاہئے نہ کہ گمراہی کے ساتھ، اور یا تو بندے ہی کے اختیار و ارادہ پر چھوڑ دینا چاہئے، کہ اگر وہ اپنے اختیار و ارادے سے ہدایت اختیار کرے تو خدا خلقِ ہدایت کر دے، اور اگر ضلالت و گمراہی اختیار کرے تو خدا گمراہی اور ضلالت کا خلق کر دے، خلاصہً شبہ کا یہ ہے کہ خدا کی مشیت کا یہ قانون بندے کو مجبور کرتا ہے یا خدا پر گمراہ کرنے کا دھبہ اور الزام لگاتا ہے، یہ اعتراض اکثر اربوں کا اس آیت پر ہوتا رہتا ہے، اور اسی چھیڑ چھاڑ میں ہمارے ذہن ناقص میں بھی ایسا ہی شبہ بیٹھ گیا ہے، کئی مولویوں سے پوچھا، کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا، ایک دن خود بخود یہ خیال ہوا کہ اس درد کی دو اجنبی حکیم الامت مدظلہم کے ہی آستانہ پر ملتی نظر آتی ہے، لہذا ہم کو قوی امید ہے کہ حضرت صاحب اس کے متعلق مجملًا یا مفصلًا کچھ تحریر فرمائیں گے، تو انشاء اللہ ہم کو ضرور تشفی ہو جائے گی، ہم کئی آدمی کئی روز سے اس مسئلہ میں غلطان و پچاں ہیں، مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا، زیادہ کیا عرض کریں،

۴۴ سوال نمبر ۴۴

الجواب: آپ کے دو اشکال ہیں (۱) ایک یہ کہ خدا کا کام ہدایت ہونا چاہئے نہ کہ گمراہ کرنا، (۲) دوسرے یہ کہ جب بندہ کا ارادہ و اختیار خدا کی مشیت کے تابع ہے تو انسان مجبور ٹھہرتا ہے، نیک و بد افعال میں قادر نہیں ٹھہرتا، جواب غور سے سنتے :-

پہلے اشکال کا جواب یہ ہے کہ آپ کو گمراہ کرنے کے معانی میں خلط ہو گیا ہے، اس لئے یہ شبہ ہوا، گمراہ کرنے کے دو معنی ہیں، ایک گمراہی کی طرف داعی ہونا، بُرے کاموں کی دعوت دینا، بُرے کاموں کو اچھا کہنا، دوسرے گمراہی کا پیدا کرنا، گمراہ کرنا بمعنی اول عیب ہے، کیونکہ یہ ایسا ہے جیسا پیشاب یا پاخانہ کھانے کا امر کرنا، اُسے گلاب و عطر کہنا، اور حق تعالیٰ اس سے پاک ہے، اِنَّ اللہَ لَا یَاْمُرُ بِالْعِظَمٰی وَالْفَحْشَآءِ، اور گمراہی کا پیدا کرنا کوئی عیب نہیں جیسا کہ پیشاب و پاخانہ کا پیدا کرنا عیب نہیں، کیونکہ ہدایت اور ضلالت کی مثال ظلمت

اور نور جیسی ہے، اگر خدا تعالیٰ کارات اور دن اور حسین و بد شکل اور سردی و گرمی اور راحت و غم وغیرہ کو پیدا کرنا عیب نہیں اور یقیناً عیب نہیں، کیونکہ اس سے اس کی قدرت کاملہ کا ظہور ہوتا ہے کہ اس کو ضدین کے پیدا کرنے پر پوری پوری قدرت حاصل ہے اور واقعی اضداد پر قادر ہونا غایت کمال ہے، تو اس کا ہدایت و گمراہی کو پیدا کرنا بھی عیب نہیں، کیونکہ اس سے بھی اس کی قدرت علی الضدین کا ظہور ہوتا ہے، پس جن آیات میں یہ آیا ہے کہ خدا تعالیٰ جسے چاہے ہدایت کرتا ہے اور جسے چاہے گمراہ کرتا ہے، اُن میں خلقِ ہدایت و خلقِ ضلال مراد ہے، اور یہ کلام بعینہ ایسا ہے کہ یوں کہا جاوے کہ حق تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں حسین پیدا کرتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں بد صورت پیدا کرتے ہیں، اور اس میں کچھ بھی اشکال نہیں،

دوسرے اشکال کا جواب یہ ہے کہ انسان کا ارادہ و مشیت اس کی ایک صفت ہے اور یقیناً تمام صفات وجود کی فرع ہیں، انسان اول موجود ہے پھر با ارادہ و با اختیار ہے، اگر موجود نہ ہو تو ارادہ و اختیار بھی حاصل نہ ہو، اب سمجھو کہ اسلام کی یہ تعلیم کہ انسان کا ارادہ و مشیت خدا تعالیٰ کے ارادہ و مشیت کے تابع ہے ویسی ہی ہے جیسے یہ تعلیم ہے کہ انسان کا وجود خدا کے وجود کے تابع ہے جس طرح انسان کا وجود بدون وجودِ الہی کے نہیں ہو سکتا اسی طرح اس کا ارادہ بدون ارادہ خداوندی کے نہیں ہو سکتا، اب اگر انسان کے ارادہ کو ارادہ خداوندی کا تابع ماننے سے اس کا مجبور ہونا لازم آوے تو چاہئے کہ انسان کے وجود کو خدا کے وجود کا تابع ماننے سے اس کا معدوم ہونا لازم آوے، کیونکہ جبر و اضطرار اسی طرح ارادہ و اختیار کی ضد ہے جس طرح عدم وجود کی ضد ہے، حالانکہ انسان کے وجود کا وجودِ الہی کے تابع ہونا ہر عاقل کو مسلم ہے، اور باوجود تابع ماننے کے سب اس کو موجود سمجھتے ہیں اور واقع میں بھی اسکو معدومات سے امتیاز حاصل ہے، تو اس کی کیا وجہ کہ انسان کے ارادہ و اختیار کو خدا کے ارادہ و اختیار کا تابع ماننے سے اس کا مجبور و مضطر ہونا لازم آوے،

الغرض انسان کی کسی صفت کا خدا کی صفت کے تابع ہونا اس کی نفی کو ہرگز مستلزم نہیں، اگر تم انسان کو موجود سمجھتے ہو باوجودیکہ وہ اپنے وجود میں خدا کے وجود کا تابع ہے تو یقیناً اس کو با ارادہ و با اختیار بھی ماننا پڑے گا گو اس کا ارادہ و اختیار خدا کے ارادہ و اختیار کے تابع ہے، فافہم واللہ تعالیٰ اعلم، اگر اس مختصر جواب سے تشفی نہ ہوئی ہو تو مفصل جواب بھی موجود ہے ^{نقطہ}

سوال (۷)، مسلمان شراب خور شراب کے نشہ کی حالت میں مرجائے تو اس کا ایمان قائم رہے گا اور کیا اس کی نماز جنازہ جائز ہے؟

جو شخص نشہ کی حالت میں مرجائے اس کے ایمان اور اس پر نماز جنازہ حکم

الجواب؛ شراب کے نشہ میں مرنے سے ایمان زائل نہیں ہوتا، ایمان کھنرے زائل ہوتا ہے، اور یہ فعل کفر نہیں بلکہ محصیت کبیرہ ہے، پس یہ شخص مسلمان ہے اور اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے، البتہ زجر و توبیخ کے لئے عالم مقتدا اور امام جامع مسجد اس کی نماز نہ پڑھے، عام مسلمان نماز پڑھ کر دفن کر دیں، اور اگر بدون نماز کے دفن کیا گیا تو سب گنہگار ہوں گے،

سوال (۸)، مسلمان ڈاکہ زن وقت ڈاکہ زنی کے مارا جائے تو کیا اس کا ایمان قائم رہے گا؟ اور اس کی نماز جنازہ جائز ہے؟

جو مسلمان ڈاکہ زنی یا زنا کاری کی حالت میں مرجائے اس کے ایمان حکم

الجواب؛ ڈاکہ زنی سے بھی ایمان زائل نہیں ہوتا، اس لئے یہ شخص بھی مسلمان ہے گو گنہگار ہے، اگر قاطع طریق بحالت ڈاکہ زنی قتل کیا جائے تو اس پر نماز نہ پڑھی جائے اور اگر گرفتار ہو کر قتل کیا جائے تو اس پر نماز پڑھی جائے، قال فی نور الایضاح مع مرقا الفلاح لا علی قاطع طریق اذا قتل کل منہم حالۃ المحاربة ولا یغسل لان علیاً رضی اللہ عنہ لم یغسل البغاة واما قتلوا بعد ثبوت دینہم (الامام علیہم السلام فانیہم یغسلون ویصلی علیہم) (ص ۳۵)

جو مسلمان بحالت زنا مرجائے اس کا وہی حکم ہے، جو اوپر شراب خور کا حکم مذکور ہوا، واللہ اعلم،

۲۲ ذی الحجہ ۱۴۲۲ھ

سوال (۹) دو شخص مسمیان بشیر الدین و رحیم الدین، شرعیات و معرفت کے بارے میں مولوی اسماعیل صاحب سے شیخ الدین و صفدر علی کے روبرو تقریر و گفتگو کر رہے تھے، کیا علماء کو گالیاں دینے والا کافر ہے؟ اور ایسے شخص سے مواکلت و مشارکت حکم

اس میں وہ دونوں بشیر الدین و رحیم الدین علماء کو سخت سخت گالیاں دیں اور ان کی شان میں فحش باتیں کیں، چنانچہ بولے کہ علماء سب چور اور گدھے ہیں، اور یہ لوگ معرفت کے بھید کیا جانتے ہیں، فقیر کے پاس معرفت ہے، مادہ گاؤ جیسا کہ نرگاؤ یعنی سانڈ کے

پاس جا کر تخم حمل لاتا ہے، ایسے ہی جاہل لوگ علماء کے پاس جا کر تخم حمل لاتے ہیں، ایسی ایسی فحش باتیں علماء کی شان میں لکھتے ہیں، اور طعن کرتے ہیں، اب ایسی صورت میں شرعاً بشیر الدین و رحیم الدین کافر ہوئے یا نہیں، اور ان کا نکاح ختم ہو یا نہیں، اور توبہ اور تجدید نکاح ان پر لازم ہے یا نہیں؟ اور اکل و شرب و مجالست ان کے ساتھ جائز ہے کہ نہیں، بینوا و توجروا

الجواب؛ کسی خاص عالم کو گالیاں دینے سے کفر نہیں ہوتا، اور ظاہر یہ کہ منظرہ اور گفتگو میں عام علماء کو بھی جو کچھ کہا گیا اس سے مخاطب ہی مراد ہے، لہذا کفر کا حکم نہیں کیا جاسکتا، البتہ ایسے لوگ جو علماء کو گالیاں دیں اس قابل نہیں ہیں مسلمان ان سے ملیں، پس ان سے اکل و شرب اور مواصلت و مشاربت ترک کرنا مسلمانوں کے ذمہ ہے، جب تک وہ اس گناہ سے توبہ نہ کر لیں اور علماء سے معافی نہ چاہیں،

اس شخص کا حکم جو فال کے فدیہ | سوال (۱۰) ایک شخص نے فال کتاب سے دیکھنا پیشہ کیا غیب کی باتیں بیان کرتا ہو ہے، عوام الناس کو جو اس کے معتقد ہیں مقدم و مؤخر کی بات کیا آئندہ ہوگی یا ہوگئی ہے بتاتا ہے، غرض کاہنی اور نجومیوں کا پیشہ ہندوؤں کے پنڈت کی اختیار کیا ہے، عددوں کا حساب لگا کر بہت غیب کی باتوں کی خبر دیتا ہے، آیت و عنیدہ مفاتیح الغیب الخ کے بالکل خلاف عامل ہے، واعظم شرک اشراک فی العلم کے علاوہ اور بھی کرتا ہے، آیا از روئے شرع شریف اس شخص کے واسطے کیا حکم ہے، اس طرح شرک سے آدمی کافر ہوتا ہے یا نہیں، مختصر جواب عنایت ہو،

الجواب؛ یہ شخص فاسق تو یقیناً ہے، اور جب تک وہ صراحتاً علم غیب کا دعویٰ نہ کرے اس وقت تک تکفیر نہ کرنا چاہئے، واللہ اعلم،

۱۱ صفر ۱۲۵۰ھ خانقاہ امدادیہ از تھانہ بھول

رسالہ نہایت الادراک

رسالہ نہایت الادراک | سوال (۱۱) وہ شرک جس کے بارے میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ (ان اللہ لا یغفران لیشراک بالہن) فی اقسام الاشراک،

اس شرک کی کیا حقیقت ہے، اور آیا اس شرک کا کوئی مرتبہ ایسا بھی ہے کہ بعض غیر اللہ کو اس درجہ میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کرنا منافی نجات ہو، اور بعض کو شریک کرنا منافی نجات نہ ہو، مثلاً ایک تو بزرگوں کی قبروں یا تعزیہ وغیرہ کو خاص نیت و اعتقاد کے ساتھ سجدہ کرنا، حاجت مانگنا ہے، یا ان پر حلوہ مالیدہ شیرینی وغیرہ چڑھانا ہے، دوسرے بتوں یا پیل کے درخت کو اسی نیت و اعتقاد کے ساتھ سجدہ کرنا، حاجت مانگنا یا ان پر حلوا وغیرہ چڑھانا ہے تو کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ان بزرگوں کی مقبولیت عند اللہ ہونے کی وجہ سجدہ وغیرہ کرنا منافی نجات نہ ہو اور بتوں و پیل کے ساتھ وہی برتاؤ منافی نجات ہو،

اور اگر یہ نہیں ہو سکتا بلکہ شرک کا ہر درجہ اور ہر مرتبہ منافی نجات ہے تو کیا وجہ ہے کہ بزرگوں کی قبروں یا تعزیہ وغیرہ کو سجدہ کرنے اور ان سے مرادیں مانگنے حلوہ مالیدہ چڑھانے کو شرک منافی نجات نہ کہا جائے، اور پیل کے درخت، بتوں وغیرہ کے ساتھ وہی برتاؤ شرک منافی نجات سمجھا جاوے، حالانکہ مشرکین مکہ بھی بنوں کو اللہ تعالیٰ کے ماتحت بلکہ وسیلہ قرب الی اللہ کا سمجھتے تھے، چنانچہ ارشاد ہے مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ، اور جس طرح تعزیر کی نسبت حضرات شہداء کربلا کی طرف کی جاتی ہے، ایسے ہی بتوں کو بھی حضرات انبیاء علیہم السلام کی طرف منسوب کیا جاتا تھا، چنانچہ کوئی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ نامزد تھا، اور کوئی حضرت ادریس علیہ السلام کے ساتھ، پس شرک کی حقیقت کیا ہے، جو اول میں پائی جاتی ہے اور دوسرے میں نہیں، بینوا تو جروا، انوار الحق امروہی

الجواب، وہ شرک جس پر عدم نجات و خلودِ نار مرتب ہے اس کی تعریف یہ ہے جو شبہ خیالی میں شرح مقاصد نسل کی گئی ہے اَنَّ الْكَافِرَ اِنْ اَظْهَرَ الْاِيْمَانَ فَهُوَ الْمُنَافِقُ وَاِنْ طَرَأَ كُفْرًا بَعْدَ الْاِيْمَانِ فَهُوَ الْمُرْتَدُّ وَاِنْ قَالَ بِالْشَّرِكِ فِي الْاُلُوْهِیَةِ فَهُوَ الْمُشْرِكُ
اھ (ص ۱۲۳)

عہ والكفر ضد الايمان اسی انکار ما جاز بہ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کما ان الايمان هو التصديق به ۱۲ منہ
عہ وتامد ان تدین بدین من الاديان والكتب المنسوخة فهو الکتابي وان ذهب الى قدم الدرر واسناد الحوادث
اليه فهو الدهري وان كان لا يثبت الباري فهو المعطل وان كان مع اعترافه بنبوة النبي يبطن عقائد هي كفر بالانفا
ق هو الزندق ۱۴ فاحفظه فانه تفصيل حسن ۱۲ منہ

پس اب سمجھنا چاہئے کہ مشرکین عرب جو اصنام کی عبادت کرتے تھے اور قبر پرست مسلمان جو قبروں اور تعزیوں کو سجدہ کرتے ہیں دونوں میں فرق ہے، مشرکین عرب ان کو شریک فی اللہ کہتے تھے اور زبان سے بھی ان کو شریک خدائی کہتے تھے، وَلَٰ عَلَيْهِ قَوْلُهُ تَعَالَىٰ وَجَعَلُوا لِلَّهِ مِمَّا ذَرَأَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْأَنْعَامِ نَصِيبًا فَقَالُوا هَذَا لِلَّهِ بِزَعْمِهِمْ وَهَذَا لِشُرَكَائِنَا وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ الْجِنَّ وَغَالٍ تَعَالَىٰ وَيَجْعَلُونَ لَهُ أَسْدَادًا وَيُغِيرُوا لَيْلَهُ مِنَ الْآيَاتِ اور گودہ لوگ اس میں تاویلیں کرتے تھے مگر اسی کے ساتھ کلمہ توحید سے متوحش بھی ہوتے تھے، اور کہتے تھے أَجْعَلُ إِلَّا إِلَهَةً إِلَهًا وَاحِدًا إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ اور طواف میں کہتے تھے لَبَّيْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ إِلَّا شَرِيكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهُ وَمَا لَكَ اور قبر پرست یا تعزیہ پرست ایسے نہیں ہیں نہ وہ کلمہ توحید کے منکر ہیں نہ اس سے متوحش ہیں بلکہ بلا استثناء خدا تعالیٰ کو معبود واحد کہتے اور اپنے کو مسلمان کہتے ہیں، اور ہنود اپنے دیوتاؤں کو شریک الوہیت مانتے ہیں اور کلمہ توحید سے منکر و متوحش ہیں جیسا کہ مشرکین عرب کی حالت اوپر معلوم ہوتی ہے، پس دونوں میں فرق یہ ہے کہ قبر پرستوں اور تعزیہ پرستوں کا شرک عملی ہے جب تک کہ وہ اپنے کو مسلم و موحد کہتے رہیں اور ہنود کا شرک اعتقادی و عملی دونوں سے مرکب ہے، یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ سجدہ غیر اللہ کو کرنا مطلقاً شرک نہیں بلکہ بعض صورتوں میں امارت شرک ہے، باقی حقیقت شرک وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی، اِی الْقَوْلُ بِالشِّرْكِ فِي الْاِلَٰهِيَّةِ قَلْبًا وَلِسَانًا۔ قَالَ فِي شَرْحِ الْعُقَاذِلِ وَلَا نَزَاعَ فِي اَنْ مِنَ الْمَعَاصِي مَا جَعَلَهُ الشَّارِعُ اِمَارَةً لِلتَّكْذِيبِ وَعِلْمٌ لَّوْنُهُ كَذَلِكَ بِالْاَدْلَةِ الشَّرْكِيَّةِ كَسُجُودِ الصُّنُودِ وَالْقَاءِ الْمَصْحُفِ فِي الْقَاذِرَاتِ وَ التَّلَفُظِ بِالْفَاظِ الْكُفْرِ اه (ص ۱۲۸)

باقی قبروں اور تعزیوں کو سجدہ کرنا یہ علامت تکذیب شرع نہیں، کیونکہ کفار میں ان کی عبادت رائج نہیں، ہاں جس چیز کی عبادت کفار میں رائج ہے اس کو سجدہ کرنا قضاء حکم کفر کو مستلزم ہوگا (مکما صرح بہ فی حاشیہ شرح العقائد، ص مذکور) اور دیانۃً اگر تصدیق و ایمان قلبی میں خلل نہ ہو (عند اللہ مؤمن ہوگا، علامہ ابن تیمیہ کی کتاب ... صراط مستقیم (ص ۱۵۰ سے ۱۶۵ تک) ملاحظہ ہو، علامہ نے اس میں تعظیم قبور اور سجدہ قبور کے متعلق سخت تہدید کی کلام فرمایا ہے، مگر ان لوگوں کو کافر و مشرک نہیں کہا جو اس میں

بتلا ہیں، ہاں مشابہ مشرکین ضرور کہا، نیز حدیث میں ہے لعن اللہ اقواما اتخذوا قبور
انبياءهم مساجد اللہم لا تجعل قبوری وثنا یعبد الخ مگر اس سے فقہاء نے سجدہ قبر
کی حرمت ہی مستنبط کی ہے، کسی نے ساجدہ قبر کو محض سجدہ کی وجہ سے کافر نہیں کہا، اللہم
الا ان یقرانہ علی طریق العبادۃ وان صاحب القبر معبود اسی شریک فی الالوہیۃ فافہم
واللہ تعالیٰ اعلم،

وفی الفتاوی الکاملیۃ اقول ولا یخفی ما حصل لکثیر من العوام بسبب تعظیم
قبور الاولیاء وارضاء الستور علیہا من الضرر العظیم فی اعتقادہم فانہم
یعتقدون فی الاولیاء التاثیر مع اللہ تعالیٰ حتی انہم ترکوا النذر باللہ تعالیٰ
وہو مشروع واكثر وامن النذر للاولیاء والتقرب الیہم وترکوا الحلف باللہ تعالیٰ
حتى صار عندہم کالعدم ولا یتجاسرون علی الحلف بھم لا اعتقادہم ان من حلف
بولی حانثا یضرہ فی بدنہ ومالہ واولادہ وھذا من الشرک والعیاذ باللہ
تعالی الا تری ما رواہ صاحب الحجۃ اللہ البالغۃ من قولہ صلی اللہ علیہ وسلم
من حلف بغير اللہ فقد اشرك قال وحملہ بعضہم علی الزجر والتغلیظ لیس
کذلک فانہ علی ظاہرہ حیث یحلفون معتقدین فیہم انہم یضر ونہم
فی ابدانہم واموالہم حتی سمعت من بعض قضاة الروم الموصوفین بالعلم
والصلاح انہ قال لو مکت من ہدم قبب الاولیاء لہدم متہا باجمعیہا کما فعل
عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بالشجرۃ القی وقعت تحتہا البیعة لما بلغہ
ان قوما یأتونها ویصلون عندھا فانہ قلعہا باصولہا مخافة ضرر العامة بہا
وفی الصحیح عن ابن عمر ان الشجرۃ اخفیست قالوا والحکمۃ ان لا یحصل
الافتنان بہا لما وقع تحتہا من الخیر فلو یقیت لما امن تعظیم الجہال لہا حتی
ربما اعتقدوا ان لہا قوۃ نفع اوضر کما نشاہد الان فیما ہود ونہا وذلک
اشار ابن عمر بقولہ کان خفاء ہا رحمۃ من اللہ تعالیٰ وروی ابن سعد باسناد

عہ قلت والجمع بینہ و بین ما تقدم عن عمر انہ قلعہا ان الشجرۃ الاصلیۃ اخفیست واتخذت العامة مکا ہنا شجرۃ
اخری قریبۃ مینہا وظنوا ہی نقلہا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، واللہ اعلم ۱۲ ط

صحیح عن نافع ان عمر بلغه ان قومًا یاتون الشجرة ویصلون عندها فنوعدهم ثم امر بقطعها فقطعت الخ من الجبل علی الجلالین ومساویم من بعض العامة من اعتقاد التاثر فی الاولیاء کتب فی حق عموم اهل السنة والجماعة الفرقة الوهابیة رسائل عدیده فی اشراکهم حتی انهم یعبرون غامعاً اهل السنة بالمشرکین واذا تسکنا بواحد منا قالوا اقتلوا المشرک والمصیبة العظيمة فی فقهاء القرى فانهم یامرون العوام عند توجه الحلف علیهم بالحلف بالولی ویقولون ان فیه الظهار الحق فانظر کیف یتوسلون الی اظهار الحق الدیوی بضیاع الدین من اصله ولا حول ولا قوة الا بالله تعالیٰ ام (ص ۲۶۳ و ۲۶۵)

قلت دلت العبارات المخطوطة علیها علی ان تعظیم غیر الله تعالیٰ بالنذر له والحلف باسمه والسجدة بین یدیه ان کان مقروناً باعتقاد تاثره مع الله تعالیٰ فهو من الشرک وساحبه شرک عملاً واعتقاداً قال العلامة الشافعی ابن قیم فی شرح منازل السائرین والعبادة تجمع اصیان غاية الحب بغایة الذل والخضوع ام وقال محشیہ العبادة تتضمن غاية الحب والخضوع كما قال ولكن لیس هن اكل معناها فان العاشق قد یجمع هذین المعنیین ولا یكون عابداً معشوقاً وانما العبادة عبارة عن الاعتقاد والشعور بان للمعبود سلطة غیبیة فوق الاسباب یقدر بها علی النفع والضر فکل دعاء او ثناء او تعظیم لصاحبه هذا الاعتقاد والشعور فهو عبادة ام (ص ۱۳۰ و ۱۳۱)

ان عبارات کا مقتضایہ ہے کہ قبر پرستوں اور تعزیہ پرستوں میں جو لوگ اہل فسور یا تعزیہ کی نسبت تاثر غیبی کے معتقد ہیں وہ شرک ہیں اور جو محض ظاہری تعظیم کے طور پر ان کو سجدہ وغیرہ کرتے ہیں اور ان کی تاثر کے معتقد نہیں وہ شرک عملی کی وجہ سے فاسق ہیں کافر نہیں، اور حضرت شیخ نے اعتقاد تاثر و عدم اعتقاد تاثر کے معیار کا یہ فرق بیان فرمایا ہے کہ بعض کا تو یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی خاص مخلوق کو جو اس کی مقرب ہے کچھ قدرت مستقلہ نفع و ضرر کی اس طرح سے عطا فرمادی ہے کہ اس کا اپنے معتقد و مخالف کو نفع یا ضرر پہنچانا مشیت جزئیہ حق پر موقوف نہیں، گو اگر روکنا چاہے تو پھر قدرت حق ہی غالب ہے، جیسے سلاطین اپنے نائبین حکام کو خاص اختیارات اس طرح دیدیتے ہیں

کہ ان کا اجراء اس وقت سلطان اعظم کی منظوری پر موقوف نہیں ہوتا، گور و کنا چاہے تو سلطان ہی کا حکم غالب رہے گا، سو یہ عقیدہ تو اعتقادِ تاثیر ہے، اور مشرکین عرب کا اپنے آہلہ باطلہ کے ساتھ یہی اعتقاد تھا، اور بعض کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ ایسی قدرت مستقلہ تو کسی مخلوق میں نہیں، مگر بعض مخلوق کو قرب و قبول کا ایسا درجہ عطا ہوتا ہے کہ یہ اپنے متوسلین کے لئے سفارش کرتے ہیں پھر اس سفارش کے بعد بھی ان کو نفع و ضرر کا اختیار نہیں دیا جاتا، بلکہ حق تعالیٰ ہی نفع و ضرر پہنچاتے ہیں، لیکن اس سفارش کے قبول میں تخلف کبھی نہیں ہوتا اور اس سفارش کی تحصیل کے لئے اس کے ساتھ بلا واسطہ یا بلا واسطہ معاملہ مشابہ عبادت کرتے ہیں، یہ عقیدہ اعتقادِ تاثیر نہیں ہے، لیکن بلا دلیل شرعی بلکہ خلاف دلیل شرعی ایسا عقیدہ رکھنا معصیت اعتقادِ یہ ہے اور مشابہ عبادت معاملہ کرنا معصیتِ عملیہ ہی، اور اسی مشابہت کے سبب اطلاقات شرعیہ میں اس کو مشرک کہہ دیا جاتا ہے

قال الشيخ اشرف على هذا ما سنح لي والله اعلم، ومن ههنا لم يكفر مشائخنا واکابرنا عابدی القیوس والساجدین لها وامثالهم لحملهم حالتهم على الصوة الثانية دون الاولى وقرینته دعویٰ هو لاء الاسلام والتوحید والتبوی من الشرائع بخلاف مشرکی العرب والهند فانهم يتوحدون من التبوی ومن نفی القدوة المستقلة عن الهتهم وقالوا اجعل الالهة الها واحداً، والله اعلم

۱۳ صفر ۱۲۸۵ھ

تیمتہ الرسالہ

المستأنة

بہنایۃ الادراک فی اقسام الاشرک

من سیدی حکیم الامتہ محمد الملتہ دام مجرہ علاہ

تقریر مذکور فارق بین الشرکین جو کہ ماخوذ ہر کلیات شرعیہ سے اپنے دونوں دعویٰ کے اعتبار سے ایک یہ کہ مشرکین اس تصرف غیر مقتدر بالاذن کے قائل تھے، دوسرے یہ کہ تصرف بالاذن کا قائل ہونا شرک اکبر نہیں ہے، زیادت اقناع میں محتاج تھی ادلہ جزئیہ کی، جن سے ایک مدت تک باوجود فکر و بحث کے ذہن خالی رہا، الحمد للہ پرسوں اور کل

علی التعاقب تین دلیلیں ذہن اور نظر میں گزریں جن کا مجموعہ دونوں دعوؤں میں تردد کے لئے بالکل نافی ہے،

دلیل اول عقلی بر اصول میزانیین؛ جو اپنی جزئیت کے سبب کلیات سے زیادہ کافی ہے، وہ یہ ہے کہ مسئلہ توحید الہ واجب عقلی ہے، خواہ بدیہی ہو یا نظری، یہ دوسری بحث ہے، اور کسی حکم کا وجوب عقلی مستلزم ہوتا ہے اس کی نقیض کے امتناع عقلی کو پس نقیض توحید کا حکم ممتنع ہوگا، اور اس نقیض کی دو قسمیں ہیں، ایک نفی الہ کہ کفر ہے دوسری شریک الہ آخر معہ کہ شرک ہے، اور مقسم کا امتناع مستلزم ہوتا ہے اس کے سب اقسام کے امتناع کو، پس شرک کے لئے لازم ہوا کہ وہ کسی امر ممتنع کا اعتقاد ہوگا اور اس امتناع واستحالة کی طرف نصوص بھی مشیر ہیں، بقولہ تعالیٰ قُلْ تَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّهُ يَحْكُمُ الْأُمُورَ ۚ وَإِذَا يَأْتِي السَّاعَةَ لَا يَكُنْ مِنْ الْغَاثِ وَالْغَابِثِ ۚ وَإِذَا يَأْتِي السَّاعَةَ لَا يَكُنْ مِنْ الْغَاثِ وَالْغَابِثِ ۚ وَإِذَا يَأْتِي السَّاعَةَ لَا يَكُنْ مِنْ الْغَاثِ وَالْغَابِثِ ۚ وَإِذَا يَأْتِي السَّاعَةَ لَا يَكُنْ مِنْ الْغَاثِ وَالْغَابِثِ ۚ

اور تصرف مقید بالاذن عقلاً ممتنع نہیں پس وہ شرک نہ ہوگا، گو کسی تصرف منفی بالنص کا اعتقاد بوجہ مخالفت نص کے معصیت یا کفر یا بدعت ہو، علی اختلاف مراتب، النص و مراتب المخالفة، مگر شرک کسی حال میں نہ ہوگا، اور جاہلان عرب کا مشرک ہونا نص سے ثابت ہے، پس لا محالہ وہ تصرف غیر مقید بالاذن کے قائل تھے، اس سے بحمد اللہ دونوں دعوئے ثابت ہو گئے،

دلیل ثانی نفلی من الاقوال المنقولة عن العلماء الربانیین؛ جو بوجہ صراحت موقت اکابر کے دلیل عقلی سے زیادہ شافی ہے، وہی ہذہ،

قال العلامة الفاضل محمد اعلی التہانوی فی کتابہ کشف اصطلاحات الفنون المؤلف سنة الف ومائة وثمانية وخمسين من الهجرة فی معنى الشرك بالکسر

عہ فقد فترها بحيث تكون الآية مشيرة الى بيان الاستحالة والامتناع المذكورين ۱۲۴

انبا زشدن واعتقاد انبا زبدي اى بى انبا زكنا فى المنتخب قال العلماء المشرك على
اربعه انواع الشرك فى الالهية والشرك فى وجوب الوجود والشرك فى التدبير
والشرك فى العبادة وليس احدا ثبت الله تعالى شريكا ساويه فى الالهية والوجود
والقدرة والحكمة الا الشنوية فانهم يشبثون الهين احدها حكيم يفعل الخير
والثانى سفيه يفعل الشر ويسمى الاول باسم يزدان والثانى باسم اهرمن
وهو الشيطان بزعمهم، واما الشريك فى العبادة والتدبير ففى الذاهبين اليه
كثيرة فمنهم عبدة الكواكب وهم فریقان منهم من يقول ان الله سبحانه
خلق هذه الكواكب وفوض تدبير العالم السفلى اليها فهذه الكواكب هى المدبرة
لهذا العالم قالوا فيجب علينا ان نعبد هذه الكواكب تعبد الله ونطيعه و
وهؤلاء هم الفلاسفة ومنهم قوم فلاة ينكرون الصانع ويقولون هذه
الافلاك والكواكب اجسام واجبة الوجود لذواتها ويمتنع عليها العدم فهذه المدبرة
لاحوال العالم السفلى وهؤلاء هم الدهرية الخالصة،

ومن يعبد غير الله النصارى الذين يعبدون المسيح ومنهم ايضا
عبدة الاوثان ولا بد من بيان سبب عبادة الاوثان از عبادة الاحجار من
جسم غفير عقلا ظاهر البطلان وقد ذكرنا لها وجوها، الوجه الاول ان الناس
لما رأوا تغيرات هذا العالم منوطة ومربوطة بتغيرات احوال الكواكب فان
بحسب قرب الشمس بعد ها عن سمت، الرأس تحدث الفصول الاربعة لثقل
بسببها تحدث الاحوال المختلفة فى هذا العالم، ثم ان الناس رصدوا احوال
سائر الكواكب فاعتقدوا انبساط السعادات والنحوسات بكيفية وقوعها
فى طوائف الناس على احوال مختلفة فلما اعتقدوا ذلك غلبت على ظنهم ان
مبدأ الحوادث هو الاتصالات الكوكبية فبالفراغ فى تعظيمها فمنهم من
اعتقدوا واجبة الوجود لذواتها وهى خلقت هذا العالم ومنهم من اعتقد
حدوثها كونها مخلوقة للاله الاكبر الا انها هى المدبرة لحوال هذا العالم
وهؤلاء هم الذين اثبتوا الوسائط بين الاله الاكبر وبين احوال هذا العالم،
ثم انهم لما رأوا ان هذه الكواكب قد تغيب عن الابصار فى اكثر الاوقات

اتخذوا لكل كوكب صنما من الجوهر المنسوب اليه كما اتخذهم صنم الشمس من الذهب والياقوت والاماس ثم اشتغلوا بعبادة تلك الاصنام وعرضهم منها عبادة تلك الكواكب والتقرب اليها واما الانبياء فلمهم مقامان احدهما اقامة الدليل على ان هذه الكواكب لا تاثير لها البتة في احوال هذا العالم لما قال الله تعالى الاله الخلق والامر بعد ان بين انها مستخرات واثايرها ان بتقدير تاثيرها دلائل الحدوث حاصله فيها فوجب كونها مخلوقة والاشتغال بعبادة الخالق اولى من الاشتغال بعبادة المخلوق وفي الكشف في تفسير قوله تعالى فَلَا تَجْعَلُوا إِلَهَ إِنْ شَاءَ أَنْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ، التذات المماثل في الذات والمخالف في الصفات فان قلت كانوا يسمون اصنامهم باسمه ويعظمونها بما يعظم به من القرب وما كانوا يزعمون انها تخالف الله وتناويه، قلت لما تهيؤوا اليها وعظموها وسموها الهة اشبهت حالهم حال من يعتقد انها الهة مثله قادرة على مخالفته ومضادته فقليل لهم ذلك على سبيل التفكك لهم،

والوجه الثاني ما ذكره ابو معشر ان كثيرا من اهل الصين والهند كانوا يشبّون الالهة والملئكة الا انهم يعتقدون انه تعالى جسم ذو صورة حسنة وكذا الملكة لكنهم احتجوا عتبا بالسموات فاتخذوا صوراً وتماثيل فيتخذون صورة في غاية الحسن ويقولون انها هيكل الاله وصورة اخرى دونها في الحسن يجعلونها صورة الملكة ثم يواظبون على عبادتها قاصدين بتلك العبادة الزلفى من الله وملئكته فالسبب على عبادة الاوثان على هذا اعتقاد ان الله تعالى جسم وفي مكان سبحانه،

الوجه الثالث ان القوم يعتقدون ان الله فوض تدبير كل من الاقاليمة الى ملك معين وفوض تدبير كل قسم من اقسام العالم الى روح سماوي بعينه فيقولون مدبر الجبال ملك مدبر الحيال ملك اخر هكذا فاتخذوا لكل واحد من الملكة المدبرة صنما مخصوصا ويطلبون من كل صنم ما يليق بذلك الروح الكلى ام (ص ۱، ۲، ۳) قلت وذكر مثل ذلك المفسر العلامة نظام الدين النيسابوري القتي في تفسيره غرائب القرآن فقال واعلم انه ليس في العالم احد يشبّ

لله شریکاً یسأریه فی الرجوب والعلم والقدرة والحكمة ولكن الشنوية یثبتون
 الهمین حکیم یفعل الخیر وسفیہ یفعل الشر اما اتخاذ مجرور سوی الله فنفی
 الذاهبین الیه کثیرة الفرق الاول عبدة الکواکب وهم الصائبة فانهم
 یقولون ان الله تعالى خلق هذه الکواکب وهی المدبرات فی هذا العالم فیجب
 علینا ان نعبد الله والکواکب تعبد الله، والفریق الثانی عبد المسيح علیه
 السلام والفریق الثالث عبدة الاوثان فنقول لادین اقدم من دین عبدة
 الاوثان والعلمیان هذا العجر المنحوت فی هذه الساعة لیس هو الذی خلقنا
 وخلق السماء والارض علم ضرری فیمتنع المطابق الجمیع العظیم علیه فوجب
 ان یكون لهم غرض اخر سوی ذلك والعلماء ذکرُوا فیہ وجوهاً الاول ما ذکره
 ابو معشر رفذ کرم مثل ما مر الفا وکذا الوجه الثانی قد مر ذکره وهو رؤية
 الناس احوال العالم مربوطة بتغیرات احوال الکواکب الخ

وثالثها ان اصحاب الاحکام^{ای الامراء} كانوا یرتقبون اوقاتاً فی السنین المتطاوله و
 یرزعون ان من اتخذ طلسماً فی ذلك الوقت علی وجه خاص فانه ینتفع به
 فی احوال مخصوصة نحو السعادة والخصب ودفع الافات، وكانوا اذا اتخذوا
 ذلك الطلسم عظمیة الاعتقاد هم انهم ینتفعون به فلما بالغوا فی ذلك لتعظیم
 صار ذلك كالعبادة فلما نسوا مبدأ الامر بتطاول المدة اشتغلوا بعبادتها،
 ورابعها انه متى مات منهم رجل کبیر یعتقدون فیہ انه مستجاب
 الدعوة ومقبول الشفاعة عند الله تعالى اتخذوا صنماً علی صورته وعبدوها
 علی اعتقاد ان ذلك الانسان یكون شفیعاً لهم یوم القيامة عند الله تعالى
 ویقولون هو علاء شفعا عند الله،
 وخامسها لعلمهم اتخذوها قبلة لصلواتهم وطاعاتهم ویسجدون

عنه قلت تلخص لنا من هذا التفصیل ان اسباب الشرک متعددة الاول اعتقاد كون
 الشئ شریکاً لله تعالى فی الالهیة والوجوب ولا قائل به سوی الوثنية، والثانی اعتقاد
 كون الشئ مدبراً فی العالم واسطة بینہ وبين الله تعالى مؤثراً فی العالم بالذات

اليها لالهها كما اتنا سجد الى القبلة لا للقبلة ولما استمرت هذه الحالة ظن الجاهل

ربقيه حاشيه صفحه گذشتہ) اى بارادة من غير احتياج الى ارادة الله ذلك تفويض
الله ذلك اليه كما هو اعتقاد عبدة الكواكب وبعض من عبدة الاوثان، واما اعتقاد كونه
مدبر او مؤثر محتاجا في تدبيره وتأثيره الى مشيئة الله وارادته فليس ذلك بشرك
لقرنه تعالى والمدبر آثر، وكذا اعتقاد كونه واسطة بينه وبين الله تعالى كذلك
ليس بشرك لكون الملكة والرسول وسائط بين العباد والخالق في المعرفة والاحكام و
كون بعض الملكة وسائط في الامور التكوينية كما لا يخفى على من طالع النصوص الاحاديث
والثالث السجود لشيء مع تسميته الها من غير اعتقاد كونه مؤثر او مدبر بالذات كما هو
شان بعض من عبدة الاوثان والرابع اعتقاد كون الله تعالى جسيما وفي مكان ودخل فيه
اعتقاد الولد والقاحبة له لكون من خواص الجسم، والخامس اعتقاد كون الشيء سوى
الله تعالى نافعا وضارا بالذات اى من غير احتياجه الى اذن الله في ذلك كما هو
اعتقاد اصحاب الطلاسم والسادس اعتقاد حلول الرب في شيء والسابع اعتقاد كون
الشيء شفيعا له عند الله تعالى وفيه تفصيل سيأتى فالعبادة هي اظهار غاية الذل و
الخشوع لشيء مع اعتقاد من تلك الاعتقادات فيه ومرجعه الى ما ذكرناه قبل ان العبادة
غاية الحب بغاية الذل والخضوع مع الشعور بان للمعبود سلطة غيبية فوق الاسباب
يقدر بها على النفع والضرر،

وليس السجود لشيء عبادة مطلقا لكون الملكة سجد والادم ولكون اخوة يوسف
وابويه خروا له سجدا، والظاهر الاصح ان هذا السجود كان بوضع الجبهة على الارض
كما هو المتبادر فيه لغة ولكنه لم يكن مقترنا بالاعتقاد من الاعتقادات المذكورة بل
كان لمحض التعية والاکرام وكان ذلك جائزا قبل ثمر نسخ في شرعنا ولذا قال العلماء
ان سجود التعية حرام وسجود العبادة كفر وبعد ذلك فلنستأمل احوال ساجدين للقبول
انهم باقى فریق من المشركين يشتبهون بالظاهر من احوالهم كونهم مشايخين للذين
اذا مات منهم رجل صالح يعتقدون فيه انه مستجاب الدعوة ومقبول الشفاعة
عند الله تعالى اتخذوا له صنما على صورته وعبدوها على اعتقاد (باقى برصفه آئندہ)

انه يجب عبادتها، وسادسها لعلمهم كانوا من المجسمة فاعتقدوا جواز حلول الرب
فيما فعبدوها على هذا التأويل (ص ۱۸۱ ج ۱ مع الطبري)

وقال العلامة ابن القيم في اغاثة اللمهان بما حاصلة تعلقا قال ايم اتخذوا
من دون الله شفعا قل اولو كانوا لا يملكون شيئا ولا يعقلون قل لله الشفاعة
جميعا له ملك السموات والارض، فاخبر ان الشفاعة لمن له ملك السموات وهو
الله وحده فهو الذي يشفع بنفسه الى نفسه ليرحم عبده فيأذن هو لمن يشاء
ان يشفع فيه فصارت الشفاعة في الحقيقة انما هي له والذي يشفع عنده انما
يشفع باذنه له وامر بعد شفاعة سبحانه وتعالى وهي ارادته من نفسه ان
يرحم عبده، وهذا عند الشفاعة الشريكية التي اشتهها هؤلاء المشركون
ومن وافقهم وهي التي اطلها سبحانه تعالى في كتابه بقوله واتقوا يوما
لا تجزي نفس عن نفس شيئا ولا يقبل منها عدل ولا تنفعها شفاعة وقوله
من قبل ان ياتي يوم لا بيع فيه ولا حيلة ولا شفاعة، وقوله ليس لهم من
دونه ولي ولا شفيع وقوله ما لكم من دونه من ولي ولا شفيع، فاخبر سبحانه
ليس للعباد شفيع من دونه بل اذا اراد الله سبحانه رحمة عبده اذن هو
لمن شفع فيه كما قال تعالى ما من شفيع الا من بعد اذنه وقال من ذا الذي

رقيه حاشية صفحہ گذشتہ) ان ذلك الانسان يكون شفيعا لهم يوم القيامة عند الله تعالى
ويقولون هؤلاء شفعا عند الله، غير ان ساجدي القبور لا يتخذون له صنما على صورته
بخلاف المشركين نعم كلاهما يشتركان في السجود لهذا الرجل ظاهر اذ في اعتقاد كونه
شفيعا باطنا وقد مر انهما ان السجود لشيء ليس بشرك مطلقا ولو كان من اكبر الكبائر، و
لنبعث الآن عن اعتقاد الشفاعة في احد هل هو شرك مطلقا ام فيه تفصيل فلا يحق
على من طالع النصوص وما روي الاحاديث ان اعتقاد الشفاعة في احد ليس بشرك مطلقا
لشبهت الشفاعة للانبياء ولعملة القرآن والادلياء يوم القيامة بعد اذنه تعالى لهم
في ذلك، فلا بد ان المشركين القائلين في اصنامهم هؤلاء شفعا عند الله كان
مفهوم الشفاعة عندهم معنى فوق ذلك كما سيأتي من ابن القيم ۱۲ تفسر احمد

يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ فَالشَّفَاعَةُ بِإِذْنِهِ لَيْسَتْ بِشَفَاعَةٍ مِنْ دُونِهِ وَلَا الشَّافِعُ شَفِيعٌ مِنْ دُونِهِ بَلْ شَفِيعٌ بِإِذْنِهِ وَالْفَرْقُ بَيْنَ الشَّفِيعِينَ كَالْفَرْقِ بَيْنَ الشَّرِيكِ وَالْعَبْدِ الْمَمُورِ فَالشَّفَاعَةُ الَّتِي أَبْطَلَهَا شَفَاعَةُ الشَّرِيكِ فَاتَّهَ لَا شَرِيكَ لَهُ وَالَّتِي اثْبَتَهَا شَفَاعَةُ الْعَبْدِ الْمَمُورِ الَّذِي لَا يَشْفَعُ وَلَا يَتَقَدَّمُ بَيْنَ يَدَيِ مَالِكِهِ حَتَّى يَأْذِنَ لَهُ (إِلَى أَنْ قَالَ) وَالْفَرْقُ بَيْنَهُمَا هُوَ الْفَرْقُ بَيْنَ الْمَخْلُوقِ وَالْخَالِقِ وَالرَّبِّ وَالْعَبْدِ وَالْمَالِكِ وَالْمَمْلُوكِ وَالْغَنَى وَالْفَقِيرَ وَالَّذِي لَا حَاجَةَ بِهِ إِلَى أَحَدٍ قَطُّ وَالْمَحْتَاجُ مِنْ كُلِّ وَجْهٍ إِلَى غَيْرِهِ ، فَالشَّفَاعَةُ عِنْدَ الْمَخْلُوقِينَ هُمْ شَرِكَا تُهْمٍ فَإِنْ قِيَامَ مَصَالِحُهُمْ بِهِمْ وَهُمْ عَوَا تُهْمٍ وَأَنْصَارُهُمُ الَّذِينَ قِيَامَ الْمُلُوكُ وَالْكَبَرَاءُ بِهِمْ وَلَوْلَاهُمْ لَمَا انْبَسَطَتْ أَيْدِيهِمْ وَاسْتَنْتَهَمُ فِي النَّاسِ فَلِحَاجَتِهِمْ إِلَيْهِمْ يَحْتَاجُونَ إِلَى قَبُولِ شَفَاعَتِهِمْ وَإِنْ لَمْ يَأْذِنُوا فِيهَا وَلَمْ يَرْضَوْا عَنْ الشَّافِعِ لَا تَهْمُ يَخَافُونَ أَنْ يَرُدُّوا شَفَاعَتَهُمْ فَتَنْقُصَ طَاعَتُهُمْ بِهِمْ لَهُ وَيَذْهَبُونَ إِلَى غَيْرِهِ فَلَا يَجِدُونَ بَدَلَ مَنْ قَبُولِ شَفَاعَتِهِمْ عَلَى الْكُرْهِ وَالرِّضَا فَمَا الْغَنَى الَّذِي غَنَاهُ مِنْ لَوَازِمِ ذَاتِهِ وَكُلِّ مَا سِوَاهُ فَقِيرَ إِلَيْهِ بِذَاتِهِ وَكُلِّ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ عَبِيدُ لَهُ مَقْبُورُونَ بِقَهْرِهِ قَالَ سُبْحَانَهُ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ وَقَالَ قُلْ لِلَّهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا فَاخْبِرْ أِنْ حَالُ مَلِكِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ يُوجِبُ أَنْ تَكُونَ الشَّفَاعَةُ كُلُّهَا لَهُ وَحْدَهُ وَإِنْ أَحَدًا لَا يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ فَإِنَّهُ لَيْسَ شَرِيكَ بَلْ مَمْلُوكٌ مُحَضَّرٌ بِخِلَافِ شَفَاعَةِ أَهْلِ الدُّنْيَا بَعْضُهُمْ عِنْدَ بَعْضٍ (إِلَى أَنْ قَالَ) وَبَيْنَ الشَّفَاعَتَيْنِ أَنَّ الشَّفَاعَةَ الْمَخْلُوقَ لِلْمَخْلُوقِ سُؤْلُهُ لِلْمَشْفُوعِ عِنْدَهُ لَا يَفْتَقِرُ فِيهَا إِلَى الْمَشْفُوعِ عِنْدَهُ لَا خَلْقًا وَلَا أَمْرًا وَلَا إِذَا تَابَلَ هُوَ سَبَبٌ مُعْتَرِكٌ مِنْ خَارِجٍ كَسَائِرِ الْأَسْبَابِ الَّتِي تَحْتَكَ الْأَسْبَابُ وَهَذَا السَّبَبُ الْمُعْتَرِكُ قَدْ يَكُونُ عِنْدَ الْمُتَحَرِّكِ لِأَجَلِهِ مَا يُوَافِقُهُ كَمَنْ يَشْفَعُ عِنْدَهُ فِي أَمْرٍ يَجِبُ وَرِضَاهُ وَقَدْ يَكُونُ عِنْدَهُ مَا يَخَالِفُهُ كَمَنْ يَشْفَعُ إِلَيْهِ فِي أَمْرٍ يَكْرَهُهُ ثُمَّ قَدْ يَكُونُ سُؤْلُهُ وَشَفَاعَتُهُ أَقْوَى مِنَ الْمَعَارِضِ فَيَقْبَلُهُ شَفَاعَةُ الشَّافِعِ وَقَدْ يَكُونُ الْمَعَارِضُ الَّذِي عِنْدَهُ أَقْوَى مِنَ شَفَاعَةِ الشَّافِعِ فَيَرُدُّهَا وَقَدْ يَتَعَارَضُ عِنْدَهُ الْأَمْرَانِ فَيَبْقَى مَتْرُودًا فَيَتَوَقَّفُ إِلَى أَنْ يَتَرَجَّحَ عِنْدَهُ أَحَدُ الْأَمْرَيْنِ بِمَرَجِّ شَفَاعَةِ الْإِنْسَانِ عِنْدَ مَخْلُوقٍ مِثْلِهِ سَعَى فِي مَسَبِّبٍ مُنْفَصِلٍ عَنِ الْمَشْفُوعِ إِلَيْهِ يَحْرُكُهُ بِهِ وَلَوْ

على كرامته فمنزلة الشفاعة عنده منزلة من يأمر غيره أو يكرهه على الفعل أما بقوة وسلطان وأما بما يرغبه فلا بد أن يحصل للمشفوع إليه من الشافع أما رغبة ينتفع بها وأما رهبة تندفع منه بشفاعته وهذا بخلاف الشفاعة عند الرب سبحانه فإنه ما لم يخلق شفاعته الشافع ويأذن له فيها ويحبها منه و يرضى عن الشافع لم يكن أن توجد والشافع لا يشفع عنده لحاجة الرب إليه ولا لرهبته منه ولا لرغبته فيما لديه وإنما يشفع عنده بمجرد الامتثال أمره وطاعة له فهو ما مورى بالشفاعة مطيع بامتثال الأمر فان أحدًا من الأنبياء والملوك وجميع المخلوقات لا يتحرك لشفاعة ولا غيرها إلا بمشيئة الله تعالى وخلقه فالرب تعالى هو الذي يحرك الشافع حتى يشفع والشفيع عند المخلوق هو الذي يحرك المشفوع إليه حتى يقبل، والشافع عند المخلوق مستغن عنه في أكثر الأمور وهو في الحقيقة شريك ولو كان مملوكه وعبدًا فالمشفوع عنده محتاج إليه فيما يناله منه من النفع بالنصر والمعاونة وغير ذلك كما أن الشافع محتاج إليه فيما يناله منه من رزق أو نصل وغيره فكل منهما محتاج إلى الآخر ومن وفقه الله

بهم قلت وبعد ذلك فلا يجوز الحكم على ساجدي القبول بالكفر والشرك الأكبر بمجرد اعتقادهم في أصحاب القبور أنهم شفعاؤهم عند الله ما لم يستفسر عن كيفية اعتقادهم ذلك وأما قبل الاستفسار فيلزم العمل بما قاله العلماء أن قول القائل أنبت الربيع البقل محمول على الاستحسان الحقيقي إن كان دهرًا أو على الإسناد العقلي المجازي إن كان مؤخرًا فكذا القول بأن هؤلاء شفعاؤنا عند الله يحمل على الشفاعة الشريكية إن كان القائل غير مسلم وعلى الشفاعة الشرعية إن كان مسلمًا وكذا القول بأن فلان يضر وينفع يحمل على الضر والنفع بالذات إن كان كافرًا جهارًا وعلى الضر والنفع باذن الله وكرامته التي أعطاه أياها إن كان مؤمنًا مؤخرًا مقربًا بالاسلام هكذا ينبغي أن يفهم المقام والحمد لله الملك المنعم وأهلك عرفت بالتفصيل الذي ذكره العلامة ابن القيم إن مرجعه إلى ما قال الشيخ في بيان الفرق في اعتقاد التاثير وعدمه فالمشرك يعتقد شفاعته معجزة مؤثرة لما له من القدرة المستقلة في زعمه والموحد المعظم للقبور لا يعتقد مؤثرته ولا الشافع ضارًا ولا نافعًا وإنما يعتقد عدم التخلف في شفاعته للكرامة التي له عند الله وهذا ليس بشرك وإن كان معصية فافهم انظر احد

لفهم هذا الموضع وعرفته تبيين له حقيقة التوحيد والشرك والفرق بين ما
اثبت الله تعالى من الشفاعة وبين مانعها والطله ومن لم يجعل الله نورا فماله
من نوراه ملخصا من ص ۱۱۵ الى ص ۱۱۸

ان نقول سے دعویٰ اولیٰ منطوقاً اور دعویٰ ثانیہ مفہوماً ثابت ہے،
دلیل ثالث نقلی من آیات رب العالمین، جو عالم السرائر والضمائر کی شہادت ہونے
کے سبب حجیت میں سب سے زیادہ وافی ہے، وہ ہوا کہ تعالیٰ قُلْ اَدْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِنْ
دُونِهِ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا۔ و قوله تعالیٰ وَلَا يَمْلِكُ
الَّذِیْنَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ و امثالہما من الایات
التي تفوت الحصر،

وجہ دلالت دعویٰ اولیٰ پر یہ ہے کہ ان نصوص میں ہر ایک تصرفات کی نفی کی گئی ہے، اور
ہر ایک من حیث الملک کا مقتضار بلکہ حقیقت تصرف غیر مقید بالاذن ہے، اور سیاق سے
مقصود مزعومات مشرکین کا ابطال ہے، اس سے معلوم ہوا کہ وہ ایسے ہی اختیارات و تصرفات
کے قائل تھے جو کہ مقید بالاذن نہ ہوں، پس دعویٰ اولیٰ ثابت ہو گیا، اور محل ذم کی قیود میں
مفہوم مخالف معتبر ہوتا ہے، اس سے دعویٰ ثانیہ پر بھی دلالت ہو گئی، والحمد لله علی
اتمام النعم والهام الحکم، سلم جمادی الثانیۃ ۱۳۲۵ھ

سوال (۱۲) کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مثل بشر کہنے
اپنا جیسا بشر سمجھنے کا حکم، میں آدمی کافر ہو جائے، جبکہ قرآن مجید میں خود انا بشر، یتثلکم
کاللفظ موجود ہے؟ یتنوا تو حبروا،

الجواب، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نفس بشریت میں اپنا جیسا بشر سمجھنا اور کامل
بشر سمجھنا لازم ہے، اور کمالات میں تمام مخلوق سے افضل سمجھنا لازم ہے، واللہ اعلم،
۱۳ رجب ۱۳۲۵ھ

سوال (۱۳) گورنمنٹ کے ہاں قاعدہ مقرر ہے کہ اگر اس کا کوئی
اقارب مر جاوے یا افسر مر جاوے تو ملازمین یا تین ہاتھ میں سیاہ سوت باندھے، اگر کوئی مسلمان
نہ ہو کر ایسا کرے اور کوئی عالم صاحب کلمہ کہ صاحبویہ سوت باندھنا بدعت ہے، اور ہم مسلمانوں کو نہ
چاہیے، تب اس نے بولا کہ ہاں ہوا چھوڑنا بھی بدعت ہے، اب ایسا استہزاء کرنے والا

گنہگار ہو یا نہیں، اور اگر ہوا تو کس قسم کا ہوا؟ بینوا

الجواب: احکام شرعیہ سے استہزاء کرنا کفر ہے، پس اگر اس شخص نے عالم کے فتویٰ کو صحیح سمجھ کر استہزاء کیا تو مرتد ہو گیا دوبارہ ایمان لاوے اور تجدید نکاح کرے، اور اگر عالم کے فتویٰ پر اعتماد نہیں تو کفر و ارتداد نہیں ہوا، لیکن تحقیر علم و اہل علم کا گناہ ہوا، واللہ اعلم
۱۵۔ ارشمان ۱۳۲۲ھ

سوال (۱۴): من ترک الصلوۃ متعمداً فقد کفر، حدیث ہذا صحیح ہے، یا حضورؐ نے ارشاد تنبیہا ہی فرمایا ہے، والسلام علی من اتبع الهدی،

الجواب: اگر ترک صلوٰۃ اعتقاداً یعنی اس کی فرضیت کا انکار ہے تو کفر ہے، اور اگر کوئی شخص باوجود فرض جانتے کے بوجہ غفلت و سستی نہیں پڑتا تو وہ فاسق ہے، اور اس کی تکفیر صحابہؓ سے جو مروی ہے وہ اس بناء پر ہے کہ اس زمانہ میں صلوٰۃ شعار اسلام تھی، واللہ اعلم، کتبہ الاحقر عبد الکریم عفا اللہ عنہ، ۲۱ رذی الحجہ ۱۳۲۳ھ

سوال (۱۵): بوسیلہ نبی یادی دعا، طلب اللہ پاک سے کرنا کیسا ہے؟
توسل بالاشخاص کے لئے مانع نہیں ہے، اور صحابہ کرام کا حضورؐ سے بعد وفات وسیلہ نہ لینا اور بجائے حضورؐ

کے حضرت عباسؓ سے وسیلہ لینا باتفاق مسلم ہے، اور فتاویٰ سراجیہ میں اس کو منع کیا ہے،

الجواب: حضرات صحابہ کا بعد صال نبویؐ علیہ الصلوٰۃ والسلام الی یوم القیام کے حضرت عباسؓ سے استسقاء میں توسل کرنا ہرگز اس امر پر دال نہیں کہ بعد وصال کے حضورؐ سے توسل فی العاقل ممنوع ہو گیا تھا، اگر کسی کو دعویٰ ہے تو دلالت النص و عبارتہ النص یا اشارۃ النص و اقتضائہ النص کے طریق سے کسی طریق سے ثابت کرے کہ یہ حدیث اس امر پر کیونکر دال ہے، بلکہ اگر غور کیا جائے تو خود اس واقعہ میں بھی توسل بسید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم تھا، کیونکہ حضرت عمرؓ کے الفاظ یہ ہیں اللہم انا نتوسل الیک بعتم نبیک وصنوا بیہ، یہاں بھی درحقیقت حضورؐ ہی سے توسل تھا، حضرت عباسؓ کو اس توسل بالنبیؐ کی تقویت کے لئے آگے کیا تھا،

دوسرے، حدیث توسل آدم علیہ السلام بسیدنا النبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم صحیح سند سے ثابت ہو جو مرفوع ہے، قال القسطلانی فی المواہب اللدنیۃ وقد صح ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لما اقترف آدم الخطیئۃ قال یارب اسئلك بحق محمد لما عرفت لی الخ (ص ۵۱۵ ج ۲) اور بیہقی نے بھی دلائل النبوة میں بسند صحیح اس کو رد کیا

کیا ہے، صرح بہ السید احمد دحلان فی الدرر السنیۃ (ص ۷۷) وقال الشیخ تقی الدین اسبکی بعد روائۃ ہذا الحدیث أخرجه الحاكم وقال هذا حدیث حسن صحیح الاسناد ولم یخرجاه کذا فی العجالة الجميلة تبعض مصنفی العصر (ص ۳۳) والمستدرک موجودنا فلعلنا نظفر فیہ بعد التتبع، پس انبیاء واولیاء کے ساتھ تو تسل جائز ہے، ہاں استعانة جائز نہیں، اور جن لوگوں نے تو تسل بالانبیاء والاولیاء کو ممنوع کہا ہے، انہوں نے تو تسل واستعانة میں فرق نہیں سمجھا، واللہ اعلم، ۲۳ رجب ۱۳۲۵ھ

سوال (۱۶) مٹا، زید یہ کہتا ہے توحید کے معنی اور موقد کی تعریف کہ شریعت میں موقد اس شخص کو کہتے ہیں کہ صرف خدا کے واحد ہونے کا معتقد ہو، اگرچہ اس کا یہ عقیدہ ہو کہ قرآن مجید خدا تعالیٰ کا کلام نہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول نہیں، اسی طرح دیگر انبیاء علیہم السلام اس کے نبی نہیں، اور اپنے اس عقیدہ کے مطابق فرقہ قادیانی فرقہ ناجیہ میں سے ہے سزا بھگت کر ایک یا ایک روز جنت میں ضرور جائے گا، عمرو یہ کہتا ہے کہ موقد شرعی اس کو کہتے ہیں کہ خدا کے واحد ہونے کا اعتقاد رکھے، اور باوجود اس کے دیگر امور اعتقاد کے ساتھ بھی موقد شرعی ہونے کے لئے اعتقاد رکھنا لازم اور ضروری ہے، مثلاً، کلام اللہ کے ساتھ اعتقاد یہ رکھے کہ خدا کا کلام ہے، اور قیامت ضرور آئے گی اور مرنے کے بعد زندہ کئے جائیں گے، اور کافرین جہنم میں داخل ہوں گے، دریافت طلب یہ امر ہے کہ زید کا قول صحیح ہے یا عمرو کا، اور اگر دونوں کا قول غلط ہے تو پھر یہ بتلایا جاوے کہ موقد شرعی کس کو کہتے ہیں؟

مٹا اگر زید کا قول غلط ہے تو یہ بتلایا جاوے کہ زید اپنے اس اعتقاد سے شرعی حیثیت سے مومن رہا یا نہیں، اگر نہ رہا تو کیا اس کی زوجہ مسلمہ اس کے نکاح میں رہی یا نہیں؟ الجواب، مٹا توحید کے معنی ہیں خدا کو ذات و صفات میں واحد و کامل و یکتا و بنیظیر سمجھنا، شریعت میں توحید سے محض وحدت عددیہ عرف اہل حساب مراد نہیں، بلکہ وحدت عرفیہ مراد ہے، اور عرف میں وحدت کا مفہوم یہی ہے کہ کوئی ذات و صفات میں کامل و یکتا و بنیظیر ہو، اور جو شخص قرآن کو کلام الہی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول اللہ نہیں سمجھتا وہ نعوذ باللہ خدا کو کاذب سمجھتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو اپنا کلام اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور جملہ انبیاء مذکورین فی القرآن کو اپنا نبی اور رسول فرمایا ہے اور یہ شخص اس کا انکار کر کے

خدا کی تکذیب کرتا ہے، اور جو شخص خدا کو ایک مانے مگر اس کے ساتھ اس کو کاذب بھی کہے وہ ہرگز جہنم نہیں ہو سکتا پس زید کا قول غلط ہے اور عمر کا قول صحیح ہے،

۲۔ زید کا یہ اعتقاد نصوص قطعیہ متواترہ اور اجماع امت کے خلاف ہے، اس لئے وہ اس اعتقاد کے ساتھ شرعاً مؤمن نہیں رہ سکتا، مرتد ہو گیا اور اس کی زوجہ اس کے نکاح سے خارج ہو گئی، تجدید ایمان و توبہ و تجدید نکاح لازم ہے،

سوال (۱۷) کیا جس شخص کا یہ اعتقاد ہو کہ کافرین ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہیں گے بلکہ سزا دیئے جانے کے بعد جنت میں ضرور جائیں گے اور کبھی وہاں سے نکل کر جنت میں نہ جائیں گے اس کی زوجہ شرعی حیثیت سے رہی؟ بیوا تو جوا
الجواب؛ یہ شخص دینی ضروریات و قطعیات کا اسلام کا منکر ہے، اس لئے کافر و مرتد ہے، اس کی زوجہ کا نکاح باطل ہو گیا، تجدید ایمان و توبہ و تجدید نکاح لازم ہے واللہ اعلم
۲۷ رجب ۱۳۵۴ھ

ثبوت شفاعت اولیاء اللہ | سوال (۱۸) زید کہتا ہے کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا... اولیاء اللہ بھی بروز قیامت اپنے اپنے مقدور کے موافق شفاعت کر سکتے ہیں آیا یہ قول صحیح ہے یا غلط، اگر اولیاء اللہ شفاعت کر سکتے ہیں تو اس کا کیا ثبوت ہے، جواب سے سرفراز فرمادیں؟

الجواب؛ یہ قول صحیح ہے، فقہ رومی الترمذی وابن ماجہ عن علی بن ابی طالب
قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من قرأ القرآن فاستظله وأحل حلاله وحرم حرامه أدخله الله به الجنة وشفعه في عشرة من أهل بيته كلهم قد حبت لهم النار كذا في الترغيب (ص ۲۵۳) جب حافظ قرآن ہونے کی اتنی فضیلت ہے کہ وہ اپنے خاندان کے دس چہنبروں کی شفاعت کرے گا اور اس کی شفاعت قبول ہوگی، تو جو لوگ حافظ قرآن ہونے کے علاوہ اور بھی اسباب ولایت رکھتے ہیں، مثلاً صحبت رسول یا امت واجتہاد و احیاء دین و اصلاح امت وغیرہ تو اس سے زیادہ درجہ رکھتے ہیں واللہ اعلم،
وقال في العقائد النسفية والشفاعة ثابتة للراسل والاعيار في حق اهل الكباثر بالمستفيض من الاخبار اه قال المعنى قوله والاخبار هم الصلحاء

والا تقیاء والانبیاء والشهداء والاصحاب والعلماء ام (ص ۷۵)

۱۲ رمضان ۱۲۵۵ھ

سوال (۱۹)

تحقیق عرض اعمال علی

النبی صلی اللہ علیہ وسلم

..... جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں بعد وفات ہر جمعہ اور پیر کے روز امت کے اعمال پیش ہوتے ہیں، آپ نیکی ملاحظہ فرما کر خوش ہوتے ہیں اور گناہ دیکھ کر استغفار کرتے ہیں اس کے متعلق کوئی صحیح حدیث وارد ہے یا خلفا راشدین کا قول ہے یا فقہ کے چاروں اماموں کا قول ہے؟ بحوالہ کتب معتبرہ بینا و جروا،
الجواب؛ اخرج العارث فی مسنده وابن سعد والقاضي اسمعيل عن بكر بن عبد الله المزني قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يا خيركم من تعرض عن اعمالكم فمن كان من حسن حمدت الله عليه وما كان من سوء استغفرت الله لكم واخرج البزار بسند صحيح من حديث ابن مسعود مثله ام خصائص كبرى للسيوطي (ص ۲۸۱ ج ۲) واخرج الحكيم الترمذي في نوادره من حديث...
عبد الغفور بن عبد العزيز عن ابيه عن جده قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم تعرض الاعمال يوم الاثنين والخميس على الله وتعرض على الانبياء والائمة يوم الجمعة فيغفر حون بحسناتهم وتزداد وجوههم بياضا واشراقا فاتقوا الله ولا تؤذوا موتاكم ام من شرح الصدر للسيوطي (ص ۱۰۲)

وعبد الغفور هذا قال ابن عدي ضعيف منكر الحديث وقال البخاري تركوه وقال ابن معين ليس حديثه بشيء واتهمه ابن حبان بالوضع ام من السارمجي واخرج الترمذي عن ابی هريرة مرفوعا وحسنه وغريبه قال تعرض الاعمال يوم الاثنين والخميس فاحب ان يعرض على اناصائهم واخرجه مسلم عن ابی هريرة مرفوعا بلفظ تعرض الاعمال في كل اثنين وخميس فيغفر الله في ذلك اليوم لكل امرئ لا يشرك بالله شيئا الا امرأ كانت بينه وبين اخيه شحنة فيقول اتركوا هذين حتى يصطلحا وفي رواية له تفتح ابواب الجنة يوم الاثنين والخميس فيغفر لكل عبد لا يشرك بالله شيئا الا رجلا كانت بينه وبين اخيه شحنة الحديث ورواه الطبراني بلفظ تنسخ دواوين اهل الارض في دواوين

أهل السماء في كل اثنين وخميس فيغفر لكل مسلم لا يشرك بالله شيئاً إلا رجلاً بينه وبين أخيه شحناء وأخرج أبو داود والنسائي عن أسامة بن زيد مرفوعاً في صوم يوم الاثنين والخميس قال ذلك يومان تعرض فيهما الأعمال على رب العالمين فأحب أن يعرض علي وأنا صائم وأخرج ابن خزيمة في صحيحه أيضاً مثله مختصراً
 (من الترغيب للندري (ص ۸۰ و ۸۱)

اس کے بعد جواب معروض ہے کہ یہ مضمون حدیث صحیح میں وارد ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بعد وفات کے اُمت کے اعمال پیش ہوتے ہیں، نیک اعمال کو دیکھ کر آپ خوش ہوتے ہیں اور گناہوں کو دیکھ کر استغفار فرماتے ہیں، لیکن اس روایت میں کوئی خاص دن مذکور نہیں بلکہ ایک ضعیف روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور والدین کے سامنے جمع کے دن اُمت کے اور اولاد کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں، اور ترمذی و مسلم و ابوداؤد و نسائی و طبرانی کی روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیر اور جمعرات کے دن اعمال کی پیشی رب العالمین کے حضور میں ہوتی ہے رگو اللہ تعالیٰ کو اس کی ضرورت نہیں، مگر بعض حکم و مصالح کی وجہ سے یہ قاعدہ مقرر فرمایا ہے، عرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اعمال اُمت کے پیش ہونا اور حضور کا خوش ہونا اور استغفار فرماتا ثابت ہے مگر اس میں پیر اور جمعرات کے دن کی قید حدیث میں میری نظر سے نہیں گذری بلکہ پیر اور جمعرات کے دن کی قید اس حدیث میں ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اعمال کا پیش ہونا مذکور ہے واللہ تعالیٰ اعلم وعلہ اتم و احکم،

یوم النخیس المبارک ۲۱ رجب ذی الفضل المبارک

۱۳۴۹ھ از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ اشرفیہ،

سبا بخیل کی بخشش نہیں ہوگی | سوال (۲۰) ایک شخص کہتا ہے کہ بخیل کی بخشش نہ ہوگی، خواہ وہ کتنا ہی عابد ہو، دوسرا شخص کہتا ہے کہ بخیل اپنے بخل کی سزا پا کر پھر جنت میں داخل کیا جائے گا؟

الجواب؛ عن ابی ہریرۃ مرفوعاً لا یجتمع شتم وایمان فی قلب ابداً، رواہ النسائی وابن حبان فی صحیحہ والحاکم واللفظ للعلی بن شیطون، وروی عن ابن عمر مرفوعاً الشحیح لا یدخل الجنة رواہ الطبرانی فی الاوسط وروی

عن ابی بکر الصدیقؓ مرفوعاً لا یدخل الجنة عب ولا منان ولا بخیل، وعن ابن عباسؓ خلق الله الجنة عدن بین کلاودی فیہا شمارھا و شق فیہا شمارھا فقال لہا تکلمی فقالت قد افلم المؤمنون فقال وعزتی وجلالی لا یجاوینی فیک یخیل رواہ الطبرانی فی الکبیر باسنادین احسن ہاجیل ام (ترغیب ص ۲۴۳ ج ۳)

ان بعض احادیث کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بخیل جنت میں داخل نہ ہوگا، مگر اس سے مراد وہ بخیل ہے جس کو شریعت بخیل کہے نہ وہ جس کو عام لوگ بخیل کہیں، اور شرعی بخیل وہ ہے جو حقوق واجبہ میں کوتاہی کرتا ہو، اور ایسا بخیل بھی سزا و عذاب بھگت کر بخیل کی صفت سے طہارت پا کر جنت میں چلا جاوے گا، اور ممکن ہے خدا تعالیٰ کسی کو بدون عذاب ہی کے اس مرض سے پاک کر کے جنت میں بھیج دے، باقی اس مرض کے ساتھ جنت

میں بخیل نہیں جاسکتا، روزِ محشر صاحبِ حق کے معاف کرنے سے سزا ہوگی یا نہیں؟ سوال (۲۱) ایک شخص کہتا ہے کہ کوئی شخص کسی کا قرضدار ہو، یا جبراً کسی کا حق دیا لیا ہو، مرنے کے بعد روزِ محشر اگر وہ حقدار معاف کر دے گا تو اس کو سزا نہ ملے گی، دوسرا شخص کہتا ہے کہ حقدار کو اس کے حق کے عوض میں اس کی نیکی دلائی جائے گی، اور حق غصب کرنے کے گناہ کی بھی سزا دی جائے گی آپ برائے کرم اس مسئلہ کو صاف لفظوں میں کھول کر اور ہم کم علم کو اچھی طرح سمجھا کر مشکور فرمائیں گے،

الجواب؛ حقوق کی صفائی اور معافی کا اصل محل تو دنیا ہی ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا ہی میں حقوق سے معافی چاہ لینے یا ادا کرنے کا حکم فرمایا ہے، پس اصل قانون کا مقتضی تو یہی ہے کہ بعد مرنے کے آخرت میں معافی حقوق العباد کی نہ ہو سکے، مگر خلا قاعده بطور فضل کے اللہ تعالیٰ بعض اہل حقوق کو دوسروں کے حقوق معاف فرمانے کی ترغیب دیں گے، جیسا کہ تخریج احیاء میں ص ۲۲۶ ج ۴ میں ایسی روایت مذکور ہے، واللہ تعالیٰ اعلم

۳۶
۴ رمضان ۱۴۱۰ھ

سوال (۲۲) کیا خاص خاص جگہوں میں بھی نحوست کا اعتقاد رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ درست ہے، اور متحقق ہے یا نہ؟ جس گاؤں میں خاکسار رہتا ہو کئی صدیوں سے معمور کیا گیا ہے، مگر ابتداء سے اب تک بالشت بھر بھی نہیں بڑھا، اور اب چند سالوں سے تنزل میں ہے حتیٰ کہ نصف گھر رہ گئے ہیں، کیا تبدیل جگہ کی رائے درست ہو

یا آپ خاص مہربانی فرما کر اس کی ترقی کے لئے دعا بہ خیر فرما کر مہربانی احسان فرما سکتے ہیں؟
الجواب:، نخوست کا اعتقاد تو جائز نہیں، ہاں یہ اعتقاد جائز ہے کہ اس جگہ کی آب ہو اچھی نہیں، اس لئے دوسری جگہ جہاں امراض کم اور سلسلہ ولادت زیادہ ہو منتقل ہو جاتا جائز ہے، واللہ تعالیٰ اعلم،
 ۱۲ رمضان ۱۳۲۲ھ

سوال (۲۲۳)..... قیامت کے دن حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے والد کے لئے استغفار کرنے کا عقیدہ رکھنا نصِ صریح کے خلاف ہے، یہ عقیدہ زید کا باوجودیکہ فلما ثبتین لہ، من جہۃ الوحی ہے، پھر بھی ایسا عقیدہ رکھتا ہے، کیا جرم ہے، بینوا تو حبروا،

الجواب:، زید کا یہ عقیدہ بالکل غلط ہے، اور نصِ صریح کے خلاف ہے، اس کو اس سے توبہ کرنا لازم ہے، اگر اس پر اصرار کرے گا تو گناہ کا اندیشہ ہے، حدیث میں صرف اتنا وارد ہے کہ قیامت کے دن حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ کو بد حالی میں دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے کہ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ مجھے قیامت میں رسوا نہ کریں گے اور میرے باپ کی بد حالی سے بڑھ کر کیا رسوائی ہو سکتی ہے، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے جنت تو کافروں پر حرام ہے، مگر تم اپنے پیروں کی طرف تو دیکھو، حضرت ابراہیمؑ اپنے پیروں کی طرف نظر کریں گے تو اپنے باپ کو بچو کی شکل میں دیکھیں گے، پھر اس کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا، تو اس واقعہ میں باپ کی شفاعت نہ ہوگی، بلکہ اپنی رسوائی کے دفع کی درخواست ہوگی، جو اس کی مسخ کی صورت سے پوری کی جائے گی، کہ اب کوئی اس کو پہچانے گا نہیں **حجۃ**

فصل فی کلمات الکفر

سوال (۱)، بندہ ایک بہت بڑے غیر شرع کام میں گرفتار ہو گیا ہے، گذارش یہ ہے کہ بندہ ایک روز رات کو اپنی بیوی سے شہر کے جواب میں عورت کا نماز پڑھنے سے انکار کرنا؟؟

یعنی عورت سے باتیں کر رہا تھا، اور وہ بات کرتے کرتے چار پائی سے نیچے اتر گئی اور رُومکبزمین پر لیٹ گئی، زمین کے اوپر پڑ گئی، اور میں نے کئی دفعہ اس سے کہا بھی کہ اٹھ کھڑی ہو جا، مگر وہ نہیں اٹھی، پھر میں نے اس سے کہا کہ تو بڑی بے وقوف ہے کہ زمین پر لوٹتی ہے، پھر میں نے کہا کہ تم انہی کپڑوں میں نماز پڑھ لو گی، تو اس نے کہا کہ میں تو نہیں پڑھتی، غصہ سے کہا نہیں پڑھتی اور کئی دفعہ کہا اسی طرح کہا، نماز سے انکار کرنے سے کفر آجہ ہے اور کفر آنے سے نکاح ٹوٹ گیا کہ نہیں، اور فجر کی نماز تو اس نے انہی کپڑوں میں پڑھی، اور ظہر کے وقت دوسرے کپڑے بدل کر نماز پڑھی، اب اس کے واسطے کیا کیا جاوے اور بندہ کیا کرے، بہت بچہ دغم ہوا ہے اور وہ نکاح پھر سے پڑھواتی نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ جاہل ہے اور اس بات کو سمجھتی نہیں کہ نکاح ٹوٹ گیا ہے یا نہیں، وہ اس بات کو معمولی سمجھتی ہے، اب میں کیا کروں اور اس سے صحبت کرنا کیسا ہے، جواب مفصل دو اور جلدی جواب دو کیا کروں؟

الجواب؛ اس صورت میں نکاح باطل نہیں ہوا، نہ وہ عورت کافر ہے، کیونکہ بظاہر اس کی نیت نماز کی تحقیر نہیں ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ شوہر کی بات کو رد کرنا چاہتی ہے کہ تیرا مقصود اس طرح بھی پورا نہ کروں گی، لہذا صحبت جائز ہے، واللہ اعلم،

قال فی العالمگیریۃ وقول الرجل لا اصلی یحتل اربعة اوجه احدها لا اصلی لا فی صلیت، والثانی لا اصلی باموال فقد امرنی بہا من ہونخیر منک والثالث لا اصلی فسقا مجانۃ فہذہ الثلاثۃ لیست بکفر، والرابع لا اصلی اذ لیس یجب علی الصلوۃ ولم امر بہا یکفر ولو اطلق وقال لا اصلی لا یکفر لاحتمال ہذہ الوجوۃ الخ (ص ۱۶۲ ج ۳) ۲۲۰ معتموم سنکٹام

عورت کا بطور مادہ کے نماز کو سوال (۲) زید کی بی بی حل سے تھی اور ایام قریب تھے، اور روگ اور جھاڑو مار کہنے کا حکم، گرانی و بوجھ کی وجہ سے اٹھنے بیٹھنے میں تکلیف ہوتی تھی، اس وجہ سے نماز اس کی چند روز سے چھوٹ گئی تھی، زید کو جب اس کی نماز قضا ہو جانے کا حال معلوم ہوا تو بی بی سے کہا کہ کیا... نماز قضا کرتی ہے، انھوں نے اس پر کہا اس لفظ سے کہ مار بڑھنی اٹھ بیٹھ جاتا نہیں پار لگتا نہیں، مار بڑھنی کا ترجمہ یہ ہے کہ جھاڑو مار، ہندی میں جھاڑو کو بڑھنی کہتے ہیں، عورتوں کا اکثر یہ دستور ہے کہ بعض بعض باتوں پر لفظ جھاڑو مار کہہ دیتی ہیں مطلب عورت کے کہنے کا یہ ہے کہ اس وقت تکلیف کی وجہ سے پڑھا نہیں جاتا، مگر اپنے محاورہ

کی وجہ سے جھاڑو مار کا لفظ کہہ دیا، اور ایک مرتبہ کام کے ترڈ میں سخی تو یہ لفظ بھی عورت نے ترڈ کی وجہ سے کہا کہ ابھی نماز پڑھنا ایک روگ ہے، روگ بیماری کو کہتے ہیں، یہ بھی عورتوں کی عادت ہے کہ ہر ہر باتوں میں اکثر روگ کہا کرتی ہیں، تو اس لفظ کے کہنے کا مطلب عورت کا یہ ہے کہ ابھی نماز پڑھنا بھی ایک بکھیرا اور بوجھ باقی ہے، تو کیا ان باتوں کے کہنے سے ایمان میں نقصان آیا اور نکاح ٹوٹ تو نہیں گیا،

الجواب، قال فی الخلاصة الجاهل اذا تكلم بكلمة الكفر ولم يدركها كافر قال بعضهم لا يكون كفرا ولا يعذر بالجهل وقال بعضهم يصير كافرا ومنها انه من اتى بلفظة الكفر وهو لم يعلم انها كفر الا انها اتى بها عن اختيار يكفر عند ما العلماء خلافا للبعض ولا يعذر بالجهل اما اذا اراد ان يتكلم فجري على لسانه كلمة الكفر والعياذ بالله من غير قصد لا يكفر اه من ۳۸۳ ج ۳ وفي الدرر واعلم انه لا يفيق بكفر مسلم امكن حمل كلامه على محمل حسن او كان في كفره خلاف ولو رواية ضعيفة اه قال الشامي وهذا لا ينافي معاملة بظاهر كلامه فيما هو حق العبد وهو طلاق الزوجة وملکها لنفسها بدليل ما صرحوا به من انه اذا اراد ان يتكلم بكلمة مباحة فجري على لسانه كلمة الكفر خطأ بلا قصد لا يصدق له القاضي و ان كان لا يكفر بينه وبين ربه الى ان قال نعم سيد كرا الشارح ان ما يكون كفر اتفاقا يبطل العمل والنكاح وما فيه خلاف يؤمر بالاستغفار والتوبة وتجعل النكاح اه وظاهره انه امر احتياط، من ۴۲۶ ج ۳،

صورت مسئلہ میں عورت کا ایمان زائل نہیں ہوا، نہ نکاح باطل ہوا، کیونکہ عورتیں ایسے الفاظ اپنے محاورہ اور عادت کے طور پر استعمال کرتی ہیں، کفر کی نیت سے نہیں استعمال کرتیں، نیز بعض دفعہ جھاڑو مار کے لفظ سے اپنے آپ کو کوسنا مقصود ہوتا ہے، اسی طرح نماز کو روگ اور بوجھ کہنے سے اپنے اوپر بوجھ کا ہونا مقصود ہوتا ہے، اس لئے اس سے کفر لازم نہیں آیا، فی العالمگیریہ ولو قال عند معجی شہر رمضان آمد آں ماہ گراں ان قال ذلک تھا ولبا الشہر الفضلۃ یکفر وان اراد به القبح لنفسه لا یکفر اه، من ۱۶۳ ج ۳، مگر عورتوں کو آئندہ کے لئے سخت تنبیہ کر دی جاوے، احکام شرعیہ کی بابت ایسے الفاظ نہ بولا کریں اور احتیاطاً توبہ و تجدید نکاح کر لیں تو بہتر ہے، واللہ اعلم

۱۲ رجب ۱۴۲۱ھ

سوال (۳)

لا الہ پر بدون الا اللہ کہو دم نکل جا
تو کافر رہے گا یا مسلم

..... کہ اگر میت قریب المرگ ہو دے اور اس کے پاس بیٹھنے والا کلمہ پڑھے یا آواز بلند تاکہ میت بھی کلمہ ادا کر سکے، یعنی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھے، مگر خیال ہے کہ میت بھی کلمہ شروع کرے اور نصف کلمہ پر اس کا دم اخیر ہو، یعنی وہ کہے لا الہ اور اس پر اس کی روح نکل جائے تو میت ثابت الایمان رہا یا نہیں، ایسے موقع پر لا الہ سے کلمہ شروع کرنا مناسب ہے یا لا الہ سے کلمہ شروع کرے؟

الجواب: میت کے سامنے کلمہ اتنی بلند آواز سے پڑھیں کہ وہ سنتا رہی، زیادہ آواز نہ بڑھائیں جو موجب تشویش ہو، اور نہ اس سے کہیں کہ تو بھی کہہ، بلکہ خود پڑھتے رہیں، اور جب وہ ایک بار کلمہ پڑھ لے خاموش ہو جائیں، ہاں اگر کلمہ کے بعد کچھ اور باتیں دنیا کی کرے تو پھر کلمہ پڑھنے لگیں جب ایک بار وہ کہہ لے خاموش ہو جائیں، و علیٰ ہذا، اور کلمہ لا الہ الا اللہ پورا کہیں فقط الا اللہ نہ کہیں، اور کبھی کبھی محمد رسول اللہ بھی ملا لیا کریں، اور لا الہ پر دم نکلنے سے میت کافر نہ ہوگا، کافر وہ ہے جو لا الہ پر وقف کرتے ہوئے الا اللہ کا منکر ہو، اور لا اللہ کا منکر نہ ہو تو لا الہ پر عداوت کرتے ہوئے بھی کفر لازم نہ ہوگا، ہاں عداوت ایسا کرنا جائز نہیں کہ موہم خلاف ہے، اور جو عداوت نہ کرے بلکہ بلا عداوت اضطراراً وقف ہو جائے مثلاً لیس ٹوٹ گیا یا دم نکل گیا تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں،

سوال (۴)

..... زید کا نکاح ہندہ کے ساتھ ہونے کے دوسرے ہی روز سے ہندہ اور اس کے والدین اور سب خاندان کے لوگوں کو کالی دینا شروع کر دیا اور کئی مرتبہ ہندہ کو زانیہ ہونے کا الزام لگایا گیا، اور کہا گیا کہ جب میں تجھ کو مار ڈالوں گا تب مجھ کو اطمینان ہوگا، کیونکہ ۳۶ برس کا بدلہ جو تیرے باپ دادا اور میرے باپ دادا سے لڑائی ہوئی تھی مجھ کو تم سے لینا ہے تیرے والدین غاصب و ظالم اور بے ایمان ہیں، ہندہ صبر کر کے خاموش رہتی اس پر بھی مظالم اور جفاکاری زید کی بڑھتے بڑھتے زد و کوب تک فوبت پہنچتی ہے، ہر وقت بات بات پر ہاتھ مروڑنا اور چٹکی کاٹنا زید کا شعار ہو گیا ہے، زیادہ برس یہ کہ زید نے ہندہ کو فرض نماز سے ہار ہارو کا، چنانچہ بہت سی نمازیں ہندہ کی قضا ہو گئیں، اور اس کے روکنے

میں ہمیشہ زید کہتا ہے کہ نماز کوئی چیز نہیں ہے، محض نعوذ باللہ فضول ہے اس کے پڑھنے سے نہ ثواب ہو اور نہ پڑھنے سے کوئی گناہ نہیں ہے، جب تک میں رہوں ہرگز نماز نہ پڑھوں کیونکہ یہ کوئی چیز نہیں ہے، ڈھکوسلہ شرعی ہے، لغو ہے، دور دراز سی نماز پر ہندہ کی مشکیں زید نے بانڈھیں جس کی وجہ سے ہندہ کو بچارا گیا، اور شانوں میں درد آج تک موجود ہے، اس پر بھی برہنہ رہنے کی اس کو فرمائش رہا کرتی، اور کیوں نہ ہوتی کہ الحیار من الایمان کی خلافت ورزی کرنا ضروری رہتا، اور دو مرتبہ حیض کی حالت میں وَلَا تَقْرُبُوا مَنِّ حَتَّىٰ يَنْطَرُونَ، حکم خداوندی کے خلافت ورزی کی اور یہی واضح رہے کہ ہندہ کا باپ یہ وصیت کر کے مر گیا کہ جو کوئی ہندہ کو زید سے ملانے کی کوشش کرے گا میں قیامت کے دن اس کا دامنگیر ہوں گا، اس صورت میں بمصداق عبارت شرح عقائد نسفی واستحلال المعصیۃ صغیرۃ کانت او کبیرۃ کفر، اذا ثبت کونها معصیۃ بدلیل قطعی وقد علم ذلك مما سبق والاستهانة بها کفر والاستهانة علی الشریعة کفر، لان ذلك من امارات التکذیب زید کا فر ہو گیا یا نہیں، اور در صورت کافر ہو جانے زید کا نکاح ٹوٹ گیا، ہندہ زید سے جدا ہو گئی یا نہیں فقط بینوا بالسنۃ والکتاب توجروا من اللہ والوہاب،

الجواب: بے شک صورت مسئلہ میں زید نے نماز کے متعلق جو الفاظ کہے ہیں ان کی وجہ سے کافر ہو گیا، اور اس کی زوجہ ہندہ اس کے نکاح سے خارج ہو گئی، بعد عدت کے وہ جس سے چاہے نکاح کر سکتی ہے، اور عدت اس وقت سے شمار ہوگی جب سے نماز کے متعلق وہ الفاظ زید نے کہے ہیں بشرطیکہ ہندہ ان الفاظ کے بعد زید سے الگ ہو گئی ہو اور اگر ان الفاظ کے بعد زید نے ہندہ سے وطی کی ہو تو عدت آخر وطی سے شمار ہوگی، پس ہندہ آخر وطی کے بعد آئندہ ہرگز زید کو اپنے اوپر قابو نہ دے اور اس سے الگ ہو جائے اور عدت تمام کر کے جس سے چاہے نکاح کر لے، اور عدت تین حیض ہیں، پس اگر ہندہ زید کے اقوال کفریہ کے بعد اس سے الگ ہو گئی ہو اور اس وقت سے اب تک تین حیض آچکے ہوں تو وہ... ابھی اپنا دوسرا نکاح کر سکتی ہے، اور اگر فوراً الگ نہیں ہوئی بلکہ وہ اس سے اقوال کفریہ کے بعد بھی وطی کرتا رہا تو ہندہ آخر وطی سے تین حیض شمار کر کے عدت سے نکل جائے گی، اور ہندہ ہر کامل کی مستحی ہے، اگر مہر مسمیٰ ہو اور خاندانی مہر کی مستحی ہے... اگر مسمیٰ نہیں جس کو دعویٰ کر کے اس سے لے سکتی ہے، قال فی الدرر ارتداد احدہما فسخ عاجل بلا قضاء فللموطوءۃ ولو حکما

کل مهر لکڑ کد به و غیرها نصفه لوسمی او المنة وارتنه... وعلیه نفقة العدة ام
 (ص ۶۲۳ ج ۲) و فیہ ایضا اذا وطئت المعتدة لشبهة ولو من المطلق وجبت عدة
 اخرى لتعبد بالسبب تدخلا والمرئی معها وتتم العدة الثانية ان تمت الاولى ام
 قال الشامی قوله اذا وطئت المعتدة ای من طلاق او غیره وقوله بشبهة متعلق
 بقوله وطئت وذلك كما لو طوئته للزوج فی العدة بعد الثلاث بكاح وكذا بدونه
 اذا قال طئنت انما فعل لی ومفاده انه لو وطئها فی العدة بلا نکاح عالما بحرمتها
 لا تجب عدة اخرى لانه زنا ام (ص ۱۰۳ ج ۲) قلت والظاهر ان المتكلم بالكلية
 المذكورة الكفرية جاهل بالشرع واحكامه فان كان وطئها بعد هاتنا وطئها
 لظنه قیام الزوجية بينهما فكان وطئا بشبهة فتجب علی المرأة عدة اخرى
 للوطئ وتند اخل العدة حتى تخرج من الجیم اذا حاضت ثلاث حیض بعد اخر
 الوطئ والله اعلم

۲۸ رجب ۱۲۵۵ھ

سوال (۵) ذیوی معاملات میں عالم سے لڑائی
 اور اس کو سب و شتم کرنا موجب قہر ہے
 ایک عالم نے مسجد کے اندر ایک عامی
 کو امور خانگی میں سب و شتم کرنا شروع کیا، عامی نے بھی منہ در
 عالم کو جواب دیا، اور کہا کہ آپ مسجد سے باہر ہو جائیے، اور وہ عامی اس مسجد کا متولی بھی ہے، لہذا
 دریافت طلب یہ امر ہے کہ آیا وہ شخص عامی کفر کے حکم کا مستحق ہوگا اور اس کی بی بی مطلقہ ہوگی
 اور اس مسجد میں نماز پڑھنا درست نہ ہوگا جو حکم ہو۔ بحوالہ کتب جواب ارشاد فرمایا جائے،
 الجواب؛ عالم کی سب و شتم سے کفر لازم نہیں آتا، کیونکہ فقہاء نے تصریح کی ہے
 کہ حضرات صحابہ اور شیخین کی سب و شتم سے کفر لازم نہیں آتا (شامی ج ۳ باب الرودة) اور
 فقہاء کے بعض فتاویٰ سے جو سب عالم کا کفر ہونا معلوم ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جب
 کہ عالم کو اس طرح سب و شتم کرے جس سے علم شریعت کی توہین ہو جائے اور ذیوی معاملات
 میں عالم سے لڑائی کرنا موجب توہین علم و شریعت نہیں ہے، ظفر احمد عفا عنہ اور اس کے
 الجواب صحیح لما فی العالمگیریة ویغاف علیہ الکفر اذا شتم عالما او فقیہا من
 غیر سبب یکن بقوله لعالم ذکر الحمار فی است ملک یرید علما لدین کذا فی البعوالین
 اور من غیر سبب کی قید سے معلوم ہو گیا کہ کسی وجہ سے ہو تو مکفر نہ کی جاوے گی، اور جب بلا سبب

کے ہوگی تو ظاہر یہ ہے کہ اس میں توہین ہے علم دین کی، لہذا اس پر کفر عائد ہوگا فقط واللہ اعلم
احقر عبد الکریم عفی عنہ ۶ ربیع الاول ۱۳۲۵ھ

یہ الفاظ کہ اگر کوئی اس کی خدمت کرتا تو بے خدمتی سے مرقی، خدمت کی بچ جاتی موجب کفر و ارتداد نہیں ہیں

سوال (۶)

چاند میاں کی ایک بیٹی بیمار تھی زوجہ اولیٰ سے لڑکی
حالت جاں کنی میں مبتلا تھی، باپ اس کی کنار پر بیٹھ کر
روتا تھا اور یہ بات کہتا تھا کہ اس کی ماں اگر اس وقت ہوتی یا اور کوئی اس کی تلابی کرتا تو
وہ بے تلابی نہیں مرقی، تلابی کرنے سے وہ بچ جاتی، زوجہ ثانی نے کہا جو مرنے والی ہے وہ
تلابی کرنے سے اور نہ کرنے سے مرے گی، اپنی مشکوٰۃ سے اس بات پر بہت تکرار کیا، تب زوجہ
ثانی کی ماں نے سنکر کہا کہ تم اگر بیٹا ہو تو تم کسی اور سے کروا کے بچاؤ اور میری بیٹی کو چھوڑ آؤ
اسی حال کے درمیان دس پندرہ منٹ کم و بیش میں وہ لڑکی مر گئی، بعد اس کے چاند میاں
نے اپنی مشکوٰۃ بیوی کو تین طلاق باتن دیں، اب عندالشرع زوج کے قول کے موافق حکم
ارتداد ہو گیا یا نہیں، اور تجدید نکاح کی ضرورت ہے یا نہیں، بینوا تو حبروا،

الجواب: صورت مسئلہ میں وہ شخص مرتد یا کافر کچھ نہیں ہوا، کیونکہ اس کا یہ کہنا کہ اگر کوئی
اس کی خدمت کرتا تو بے خدمتی سے نہ مرقی، خدمت کرنے سے بچ جاتی الخ ایسا ہی ہے جیسا
کوئی یوں کہے کہ فلاں شخص کو اگر قتل نہ کیا جاتا تو وہ بچ جاتا فلاں شخص نے اس کو قتل کر دیا اور
کسی نے بچایا نہیں، اس واسطے مرگیا، اور بیمار کی خدمت نہ کرنا بھی اس کو جان سے مارنا ہے، تو
جیسے پہلا قول کفر نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ قتل سبب موت ہو گیا، گو علت حقیقیہ مشیت حق
ہے ایسے ہی یہ قول بھی کفر نہیں، مطلب یہ ہے کہ ظاہر میں اس لڑکی کی موت کا سبب اس
کی بے خدمتی ہے، گو حقیقی علت یہ نہیں، واللہ اعلم،

نوٹ:۔ بظاہر جو لوگ چاند میاں کی تکفیر کرنا چاہتے ہیں ان کا مقصود یہ ہے کہ اس کی
آئندہ طلاق باطل ہو جاوے، تو یہ کتنا بڑا غضب ہے کہ ایمان کی قدر ایک عورت کے نکاح سے
بھی کم ہے، اگر یہی سبب اس سوال کا ہے تو سوال کرنے والے اپنے ایمان کی خیر منائیں کہ ان کے
سلب ایمان کا اندیشہ ہی، فقط
الرمضان ۱۳۲۵ھ

۵ زبان بنگلہ میں تدبیر و خدمت مرہض کو کہتے ہیں ۱۲ ظفر احمد

اس جملہ کا موجب ارتداد ہونا کہ سوال (۷) زید کا عقد مسماء ہندہ کے ساتھ ہوا اور عقد کے

میں اپنا مذہب تبدیل کر لوں گی

بعد ہندہ عرصہ چودہ سال تک زید کے مکان میں رہی اور اس کے ماہین ہندہ سے دوا لڑنے کے پید ہوئے
بعد چودہ سال کے زید اور ہندہ کے تعلقات کشیدہ ہو گئے اور ہندہ اپنے باپ کے مکان میں
چلی آئی، ہندہ کے باپ کے مکان پر ایک تقریب میں اہل برادری جمع ہوئے، اور ہندہ نے
ایک درخواست پچوں میں پیش کی، الزام یہ تھا کہ ہندہ کی ساس ہندہ کو زہر دہی کا الزام
لگاتی تھی کہ ہندہ زید کو زہر دینا چاہتی ہے، لہذا پچوں نے زید سے دریافت کیا، زید نے
کہا کہ ہندہ سے اور مجھ سے کوئی واسطہ غرض نہیں ہے، اس پر پچوں نے دریافت کیا کہ ہندہ
سے اور تم سے کب سے واسطہ غرض نہیں ہے، اس پر زید بولا کہ مجھ سے اور ہندہ سے جب سے
نکاح ہوا آج تک مجھ سے کوئی واسطہ غرض نہیں ہے، پچوں نے دریافت کیا کہ آخر کچھ کس
سے واسطہ ہے، زید نے کہا کہ میرے بھائی سے تعلق ہے، اور اسی سے واسطہ ہے، اس پر پچوں
نے زید سے دریافت کیا کہ جو لڑکے ہندہ سے ہوئے وہ کس کے ہیں، اس بات پر زید خاموش
رہا، ہندہ قریب آٹھ برس سے والدین کے مکان میں بسر اوقات کرتی ہے اور زید بھی ہندہ
کو رخصت کرانے کی غرض سے اس مدت میں اکثر آتا مگر ہندہ یہی جواب دیتی رہی کہ مجھ کو الزام
لگایا گیا ہے، اب میں منہ دکھانے کے قابل نہیں ہوں اور اب میں نہیں جاسکتی، اگر میرے
والدین یا اہل برادری میری رخصتی کے بارے میں زیادہ زور ڈالیں گے تو میں اپنا مذہب تبدیل
کر لوں گی یا خودکشی کر لوں گی، لہذا از روئے شرع اس مسئلہ میں کیا حکم ہے؟

الجواب؛ خدا کی پناہ! دنیا کی چند روزہ تکلیف وغیرہ بچنا تو ضروری سمجھا اور غذا
ابدی میں مستلما ہونے پر راضی ہوئی، جو تبدیل مذہب کے باعث لاحق ہوگا، یہ کم بخت
اس کہنے ہی سے کہ تبدیل مذہب کر لوں گی، مرتد ہو چکی ہے، تمام اعمال باطل ہو گئے اور
ہر حکم ارتداد کا اس پر عائد ہو گیا اب اس کو توبہ کر کے اسلام میں داخل ہونا چاہئے اور
اب چونکہ نکاح اس کا ٹوٹ گیا ہے اس واسطے بعض فقہاء کے نزدیک عدت کے بعد نکاح دوسری
جگہ ہو سکتا ہے، اور اگر قاضی شرعی ہوتا تو اس پہلے خاوند ہی سے نکاح پر مجبور کرتا دوسرے
شخص سے نکاح کی اجازت ہرگز نہ دیتا، لیکن جب حاکم شریعت موجود نہیں تو کیا کیا جاوے
فی العالمگیریۃ، ص ۱۶۱ ج ۳ ولو قالت لزوجها ان جفوتنی بعد هذا الوقت ان لم تستر لی

کذا الکفرات کفرت فی الحال کذا فی الفصول العبادية فقط

احقر عبد الکریم عفی عنہ ۲ ربیع الاول ۱۳۲۸ھ

قلت وحکم جبر المرتدۃ علی النکاح بالاول لعلہ مخصوص بالامام والقاضی
تكون ولاية الجبر الیہما ولا يكون فی دار الحرب ولاية الجبر لاحد علی أحد الا
للولى فی النکاح الصغیرین ونحوہ واللہ تعالی اعلم، فالجواب صحیح

۱۳۲۸ھ

ظفر احمد عفا عنہ ۲ ربیع الاول

اس شخص کا حکم جو یہ کہے کہ میں سوال (۸) ذیل کا سوال مع دو جواب بغرض تصحیح ہمارے پاس
فتویٰ پریشاب کرتا ہوں، آیا، لہذا اول سوال پھر وہ دونوں جواب لکھے جائیں گے، پھر
خانقاہ کا جواب لکھا جائے گا، سوال یہ ہے:-

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی آدمی کہے کہ میں فتوے پریشاب
کرتا ہوں، اس کا کیا حکم ہے؟

جواب اول؛ اگر فتویٰ صحیح اور مطابق شرع ہے، اور فتوے کو حق اور حکم شرع سمجھتے
ہوئے توہین اور استخفاف کی نیت سے ایسا کہا تب تو قائل کے کفر میں شبہ نہیں کہ اس لفظ
سے توہین ظاہر ہے، اور فتویٰ پیش کرنے والے سے خصومت یا عداوت یا فتوے کے مطابق
شرع نہ ہونے کی وجہ سے ایسا کہا تب قائل پر حکم کفر نہیں، فی البرازیلہ یکفر ان قصد
الاستخفاف بالدين وان لم ير به الاستخفاف بالدين لا يكفر اه وايضا فيه
القي الفتوى على الارض او قال... چه نامه آوردی عند روية الفتوى او قال
اين چه حكم شرع است يكفر لانه رد حكم الشرع اه وفي الهندية رجل عرض
عليه خصمه فتوى الاثمة فردها وقال چه يا زمامه فتوى اورد وقيل يكفر
لانه رد حكم الشرع وكذا لو لم يقل شيئا لكن القى الفتوى على الارض وقال آئين
شرع است يكفر اه كتبه العبد الواجب برحمة رب الشايتين محمد نور الحسين
كان الله له صدرا مدرسا مدرسه اسلاميه اندكوت ميرٹھ،

الجواب صحیح محمد عبدالرؤف غفرلہ صحیح ابو نصر حبیب اللہ غفرلہ

الجواب صحیح والمجيب نجیح جواب صحیح ہے

بنو سید طاہر حبیب غفرلہ مدرسہ امداد الاسلام میرٹھ، بشیر احمد غفرلہ مدرسہ العلوم میرٹھ

الجواب صحیح

هذا هو الحق والحق احق ان يتبع

عبد الرحمن مدرس امداد الاسلام صدر ميرٹھ خادم الطلبة محمد مبارک حسین محمودی صدر مدرس مدرسا العلوم میرٹھ

الجواب صحیح والمجيب مصيب

الجواب صواب والمجيب مثاب

بنو محمد ابرار مدرس امداد الاسلام ۱ لعبد محمد ہدایت اللہ عفی عنہ

الجواب صواب المجيب مصاب لا ريب فيه ولا امر تيا في العلم عند الله الوهاب،

العبد ابو النصر محمد عبد شاہ المجذبی لمرافقہ المحمدی المدرس النعمانیہ الواقعة فی بلدة دہلی

الجواب صحیح

قد صح الجواب

محمد عبد اللطیف غفرلہ مدرس النعمانیہ دہلی

اکبر حسن عفی عنہ مدرس مدرسا العلوم امپور

هكذا الجواب الله اعلم بالصواب

قد اصاب من اجاب

سید محمد شاہ عفی عنہ مدرسہ عالیہ امپور

محمد علی عفی عنہ مدرسہ اول مدرسا العلوم

الجواب صواب

الجواب صحیح

محمد فیاض الدین مدرس مدرسا العلوم ریار امپور

سید محمد نقوی مدرس مدرسا عزیزہ

جواب دوم؛ اس میں یہ تفصیل ضروری ہے کہ ان کلمات کے کہنے والے کی نیت کیا تھی، اگر نیت استحقاق دین نہ تھی تو اس صورت میں بلاشبہ کافر نہ ہوگا، اور اگر نیت استحقاق تو دین تھی یا کچھ نیت نہ تھی تو ان دونوں صورتوں میں دیکھنا یہ ہے کہ اس قائل کو اس بات کا علم تھا کہ یہ الفاظ کفر کے ہیں یا نہیں، اگر تھا تو اس کے کفر میں بھی شبہ نہیں ہے، کمافی کتب الفقه اور اگر اس کو اس بات کا علم نہ تھا کہ جو کوئی الفاظ میں کہہ رہا ہوں ان الفاظ آدمی کافر ہو جاتا ہے، تو اس کے کفر میں اختلاف ہی، اور فتویٰ اس پر ہے کہ کافر نہ ہوگا، اور مناسب یہ ہو کہ وہ توبہ کرے، اور احتیاطاً تجدید نکاح کرے، فتاویٰ قاضی خاں ص ۸۸ میں ہے؛ اما الجہل اذا تکلم بکفر ولم يد رانه کفر اختلفوا فيه قال بعضهم لا يكون کفر ولا يعذر بالجہل، وقال بعضهم يصير کافرا ولا يعذر بالجہل وكن اقال العلامة ابن نجيم بحر، ص ۱۲۵ ج ۵ وزاد بعده قوله والذي تحررانه لا يفتي بكفر مسلم امكن كلامه على محمل حسن او كان في كفره اختلاف ولورواية ضعيفة فعل هذا فاكثرا لفاظ التكفير المذكورة في الفتاوى لا يفتي به ولقد التزمت نفسي ان لا افتي بشيء منها ام

وقال فی الدل المختار وغیره والفاظ التکفیر تعرف فی الفتاوی مع انه لا یفتی بالکفر بشیء
منها الا فیما اتفق المشایخ علیه وفی الشامی ص ۳۹۹ ج ۳ وما فیہ خلاف یومر بالاستغفار
وتجدید النکاح وظاہرہ امر احتیاطیہ وفی الدر عن شرح الوهبانیة وما فیہ خلاف
یومر بالاستغفار وتجدید النکاح اه قال ابن عابد بن فی شامی ص ۴۱۲ ج ۳ قوله
وتجدید النکاح ای احتیاطا کما فی الفصول العبادیة انتهى، پس ان عبارتوں سے
معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص بہ نیت استخفاف بھی یہ الفاظ کہے گا اور وہ یہ نہیں سمجھتا کہ جن الفاظ
کو میں کہہ رہا ہوں وہ کفر کے الفاظ ہیں تو چونکہ ایسے شخص کے کفر میں اختلاف اور اختلاف مشایخ کا اس
کے کفر پر فتویٰ نہیں ہو اس لئے یہ شخص کافر نہ ہوگا، اور تجدید نکاح اور توبہ اور استغفار کا
اس کو احتیاطاً حکم کیا جائے گا، واللہ اعلم بالصواب،

مشیت اللہ عفا اللہ عنہ، مدرسہ عالیہ میرٹھ

جواب نر خانقاہ امدادیہ؛ دونوں فتوے اول سے آخر تک بنظر غائر دیکھے،
ہمارے خیال میں جہل ان مسائل میں عذر ہو سکتا ہے جو عوام سے مخفی ہوں، اور احکام شرعیہ
کی تعلیم کا لزوم اور توہین کی حرمت ایسی چیز نہیں جو کسی شخص سے مخفی رہ سکے، لہذا اس باب
میں جہل عذر نہ ہوگا، کما نقلہ الشامی عن المسایرة ونصہ ہذا یمایوجب التکذیب
جحد کل ما ثبت عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ادعاء ضررۃ وامام المریبلغ حد
الضررۃ کا استحقاق بنت الابن السدس مع البنت باجماع المسلمین فظاہر
کلام الحنفیۃ الا کفار مجحدہ فافہم لم یشرطوا سوی القطع فی الثبوت وحب
حملہ علی ما اذا علم المنکر ثبوته قطعاً لان مناط التکفیر وہو التکذیب الاستغفار
عند ذلك یكون اما اذا لم یعلم فلا الا ان یدکرہ اهل العلم ذلك فیلج ص ۴۳۹ ج ۳
واضافیہ قبیل العبارة المذكورة عن المسایرة ایضاً وبالجملة فقد ضم الی التصدیق
بالقلب او بالقلب واللسان فی تحقیق الایمان والاخلال بہما اخلال بالایمان اتفاقاً کثرت
السجود للصنم وقتل نبی والاستخفاف بہ وبالمصحف وبالكعبة وكذا مخالفة اد
انکار ما اجمع علیہ بعد العلم بہ الخ وقال العلامة الشامی بعدہ قلت ویظهر من
هذ ان ما کان دلیل الاستخفاف یکفر بہ وان لم یقصد الاستخفاف لانه لو
توقف علی قصد لما احتاج الی زیادة عدم الاخلال بہما لان قصد الاستخفاف

مناف للتصديق اه وايضا في الله المختار عن الفتح من هنال بلفظ كفر ارتد وان لم
يعتق للاستخفاف فهو ككفر العناد، ان عبارات سے بالکل واضح ہو گیا کہ استخفاف دین کفر
ہے، اور اس میں نہ استخفاف کرنے والے کا علم شرط ہے نہ قصد، پس فتویٰ نمبر ۲ میں علم کی
قید اور فتویٰ نمبر ۱ میں قصد کی قید جو لگائی گئی ہے وہ صحیح نہیں، البتہ یہ قید صحیح ہے کہ اس
بیہودہ قول کی وجہ اگر فتویٰ پیش کرنے والے کی عداوت وغیرہ ہے تو کفر سے بچ جاوے گا
کیونکہ اس وقت فی الواقع حکم شرع کی توہین نہیں ہوتی، اور جب فی الواقع توہین پائی جاوے
خواہ وہ بالائق ارادہ کرے یا نہ کرے ہر حال میں کافر ہو جائے گا، واللہ اعلم وعلمہ اتم

۵۲
کتبہ الاحقر عبد الکرم عفی عنہ، خانقاہ امدادیہ ۲۱ محرم

[illegible]

ہے جو ہمیشہ ننگا رہتا تھا، اس نے ہاشم کو کیا کیا باتیں تعلیم کیں معلوم نہیں لیکن وہ ہر قول فعل کی اس ننگے کی طرف نسبت کرتا ہے، اور کہتا ہے اگر ننگے کی رحمت ہو تو فلاں کام کروں گا، ہمارا ننگا جو کرتا ہے وہ ہوتا ہے، جو کرے گا وہ ہوگا، ہم کو کھلاتا یا لیتا ہے ہمارا ننگا،

نمبر ۲؛ اور ہر وقت تنگے کا دھیان کرتا رہتا ہے، اور احکام شریعت سے بالکل دستبردار ہو گیا ہے، یعنی صوم و صلوٰۃ وغیرہ ادا نہیں کرتا ہے، اس کی چند اولاد اور بیوی ہیں، یہ لوگ اس کے پیرو نہیں، شریعت کے پابند ہیں، یعنی نماز روزہ وغیرہ احکام شریعت بجالاتے ہیں لیکن بود و بخش کھانا پینا سب کچھ ایک ہی ساتھ کرتے ہیں،

نمبر ۳؛ اس کی جتنی آمدنی ہے سب کسپِ حلال سے ہے، اب اُن کے یہاں ضیافتِ قریب وغیرہ میں کھانا پینا کیسا ہے۔

نمبر ۳؛ اور اس کی اولاد سے شادی بیاہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

نمبر ۵: اور خاص ایسے شخص کی نسبت شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب؛ نمبر ۱۔ یہ الفاظ موجب زندقہ ہیں، اس لئے اس شخص کو ان الفاظ سے احتراز کرنا اور آئندہ کے لئے تجدیدِ ایمان و توبہ لازم ہے،

نمبر ۲؛ جب تک یہ شخص اپنے افعالِ کفر و زندقہ سے توبہ نہ کرے اس سے ترکِ موالیات و قطعِ تعلقات لازم ہے،

نمبر ۳؛ اس شخص کے یہاں ضیافت نہ کھائی جائے بلکہ اس سے ترک موالات کی جائے،
 نمبر ۴؛ اس کی اولاد سے شادی بیاہ جائز ہے، بشرطیکہ یہ شخص توبہ کرے، اور اگر وہ
 توبہ نہ کرے تو اس کی اولاد اس سے علیحدہ ہو جائے، تو ان سے شادی بیاہ جائز ہو ورنہ نہیں
 نمبر ۵؛ اس شخص کا ظاہر حال زندیقانہ ہے، واللہ اعلم بسرّ عبادہ فقط
 ۱۰ محرم ۱۳۴۹ھ

فصل فی الفرق الباطلۃ

قادیانی کی توبہ اور اس کی سوال (۱) ع
 دراشت حکم نرید مرزا غلام احمد قادیانی کو مجسّد و مثیل و یح سجھنا تھا

بعدہ بعض علماء کی ہمکلامی سے اس کے خیالات میں تبدیلی ہو کر وہ اس عقیدہ سے رجوع کر لیا،
 زید مفسر ہے کہ وہ اہل سنت حنفی الملتہ ہے، زید کا رجوع اور اقرار شرعاً درست ہی یا نہیں؟
 نمبر ۲، زید کے خدمات موروثی جو حسب قوانین سلطنت تو ریشاً اجراء ہوتے ہیں زید کے
 وارث خالد پر جو کہ اہل سنت حنفی المشرب ہی بحال ہو سکتے ہیں یا نہیں، اور زید کی جائداد کا
 غالد (فرزند زید) وارث ہو سکتا ہے یا نہیں، بینوا تو جروا؟

الجواب؛ نمبر ۱، جب زید نے اپنے عقیدہ سابقہ سے رجوع کر لیا اور وہ اقرار
 کرتا ہے کہ میں اہل سنت حنفی المذہب ہوں تو شرعاً اس کا رجوع اور اقرار بہتر ہے، اس کو
 مسلمان سنی المذہب سجھنا چاہئے،

نمبر ۲، جب زید شرعاً مسلمان ہے تو اس کی خدمات موروثی خالد کو جو اس کا وارث ہے
 دیدینا جائز ہے، اور خالد زید کی جائداد کا بھی وارث ہوگا، واللہ اعلم، ۶ رجب الاولیٰ ۱۳۴۰ھ

إِذَا تَلَّاهَا عَجِمَ النَّبِيُّ وَالْبَسَالَةُ مَعْنَى لَوْحٍ وَاللَّهُمَّ

فرقہ قادیانیہ کے اقوال کی تردید میں | سوال (۲) ذوالمجد والکرم حضرت اقدس مولانا صاحب
 مدظلکم العالی؛ بعد سلام مسنون آنکہ یہاں ایک مسجد پر قادیانیوں اور اہل اسلام میں آج کل
 مقدمہ چل رہا ہے، قادیانی مدعی اور اہل اسلام مدعا علیہم ہیں، عدالت میں تمام امور مختلف
 فیہا زیر بحث آگئے ہیں، چند سوالات بغرض تحقیق و مزید اطمینان خدمت والا میں ارسال

کئے جاتے ہیں، امید ہے کہ جوابات سے سرفراز فرمائیں گے، مفصل جوابات تحریر کرنے کے لئے تو بہت وقت اور دفتر چاہئے، آنجناب بقدر ضرورت اختصار کو مد نظر رکھ کر جوابات تحریر فرمائیں، تاکہ ہم لوگوں کے لئے مشعلِ راہ ہو سکیں، ضرورتاً قلتِ وقت کی وجہ سے ایک مکتوب میں کئی سوال درج کر دیئے گئے، امید کہ معاف فرمائیں گے،

سوالاٹ

نمبر ۱: نبی اور رسول کی جامع مانع تعریف کیا ہے، ان دونوں میں فرق ہے یا نہیں؟
نمبر ۲: فضوہ الحکم، فتوحاتِ مکبہ، ایواقیت والحواحیر وغیرہ میں صوفیائے کرام نے نبی تشریعی اور غیر تشریعی کی تقسیم کی ہے یا نہیں؟ اگر کی ہے تو ان حضرات کی اس سے کیا مراد ہے؟
نمبر ۳: کیا مولانا سے روم اور دوسرے بزرگوں نے کسی دلی کو نبی اور ان کے الہام کو وحی کہہ دیا ہے، اور اگر کہلے تو ان کی اس سے کیا مراد ہے؟
نمبر ۴: الہام، وحی غیر نبوت، وحی نبوت کی جامع مانع تعریف کیا ہے، ان میں جو کچھ فرق ہو بیان فرما دیا جائے؟

نمبر ۵: حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ دنیا میں بحیثیت نبی ہونے کے نازل ہوں گے یا بحیثیت امتی محض اپنے فرائض نبوت انجام دیں گے یا نہیں، اُن پر جو وحی نازل ہوگی وہ وحی نبوت بواسطہ جبرئیل ہوگی یا کیا؟

نمبر ۶: حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے مرثیہ میں حضرت اقدس مولانا گنگوہی قدس سرہ کی تعریف میں جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت مسیح علیہم السلام کا اسم گرامی آیا ہے ان مواقع کو ملاحظہ فرما کر یہ بیان فرما دیا جائے کہ اس سے مخالف نبی کریم اور حضرت مسیح علیہما السلام کی اہانت پر تو نہیں استدلال کر سکتا وغیرہ وغیرہ،

الجواب

نمبر ۱: نبی کی تعریف شریعت میں یہ ہے: وَأَمَّا فِي الشَّرْعِ فَقَالَ أَهْلُ الْحَقِّ مِنَ الْأَشْخَاءِ هُوَ مَنْ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى لَهُ هُوَ أَصْطَفَاهُ مِنْ عِبَادِهِ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ إِلَى قَوْمٍ كَذَّابُوا إِلَى النَّاسِ جَمِيعًا أَوْ يَلْفُظُهُمْ عَنِّي وَنَحْوَهُ مِنَ الْأَلْفَاظِ الدَّالَّةِ عَلَى هَذَا الْمَعْنَى كَبَعَثْنَاكَ وَنَبَّيْنَاهُمْ، قِيلَ النُّبُوَّةُ عِبَارَةٌ عَنْ هَذَا الْقَوْلِ مِمَّا كَوْنُهُ مُتَعَلِّقًا بِالْمُخَاطَبِ أَمْ مِنْ

کشاف اصطلاحات الفنون (ص ۱۳۵۹)

اور رسول کی تعریف یہ ہے؛ والرسول انسان بعثہ اللہ تعالیٰ الی الخلق لتبلیغ الاحکام
 شرح عقائد نسفیہ ص ۳۱) اور یہ تعریف خاص اصطلاح شرعی ہے ورنہ لغت رسول ہر قاصد
 کو عام ہے، جیسے رسول الملک و رسول الخلیفہ، اور اسی لغوی معنی کے اعتبار سے بعض نصوص میں
 ملائکہ کو بھی رسل کہا گیا ہے، مگر جس طرح شریعت نے زکوٰۃ و صلوٰۃ و حج و صوم کو معنی لغوی عام
 سے منتقل کر کے خاص معانی و افعال کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے، یونہی لفظ نبی اور رسول میں
 بھی تصرف کیا ہے، اب اس میں اختلاف ہے کہ نبی و رسول شرعاً متحد ہیں یا ان میں کچھ فرق
 ہے، بعض اہل علم اتحاد کے قائل ہیں، اور جمہور اہل سنت و جماعت کے نزدیک نبی عام ہے اور
 رسول خاص ہے، فکل رسول نبی و لا عکس، پھر اس میں اختلاف ہے کہ رسول کی وہ خصوصیت
 کیا ہے جس کے ساتھ وہ نبی سے ممتاز ہے، بعض نے یہ کہا ہے کہ رسول کے لئے صاحب کتاب ہونا
 ضروری ہے، اور نبی کے لئے نہیں، قال التفتازانی فی شرح العقائد النسفیة وحسب
 یشرط فیہ الكتاب بخلاف النبی فانہ اعم ام (ص ۳۱) اور بعض نے شریعت متجددہ
 کی قید لگائی ہے، کما فی حاشیۃ العصام علی شرح العقائد (ص مذکور) مگر ان میں سے ہر ایک قید
 پر اشکال ہے، کما صرح بہ الخیالی فی حاشیۃ شرح العقائد (ص ۴۰) وقال بعضهم الرسول
 من بعث الی قوم کافرین مشرکین لدعوتهم الی التوحید والرسالة والنبی اعم
 منه ومن بعث الی قوم موحدین متبعین لرسول متقدم لتقریر شرعہ
 یوحی من اللہ منزل علیہ ویؤیدہ ما فی البخاری فی حدیث الشفاعة فیانور
 نوحاً فیقولون انت اول الرسل فی الارض فاشفع لنا الی ربنا الخ فقیل نوح اول
 الرسل مع تقدم الانبیاء علیہ مثل ادم وشیث وادریس لانهم لم یکنوا رسلًا
 فکوفهم بعثوا الی قوم موحدین مؤمنین ونوح ارسل بعد ما ابتلی الناس بالشرک
 باللہ وتركوا سبیل من تقدم من الانبیاء، ولا یرد علی ذلك ما یرد علی التفتیز
 بالکتاب والشرع المتجدد من زیادة عدد الرسل علی عدد الکتاب ومن یؤمن بمعیل
 علیہ السلام رسولاً مع اتحاد شرعہ بشریۃ ابراهیم علیہ السلام فان

عہ لا احفظ اسم القائل ولكن هذا التعریف مترجم فی ذہنی مازمان ۱۲ منہ

اسمعیل کان مبعوثاً الی قوم جرهم وكانوا مشرکین فكان رسولاً وعلی هذا.....
 فالنبي انسان بعثه الله تعالى الى الخلق لتبليغ الاحكام وهو معنى قول اهل الحق
 من الاشاعرة هو من قال الله له ممن اصطفاه من عباده انا ارسلتك الى قوم كذا
 او الى الناس جميعاً ونحو ذلك كبعثتك اوتبئهم اه والرسول انسان بعثه الله
 تعالى الى قوم مشرکین کافرين لتبليغ التوحيد والرسالة والاحکام.

اور حق یہ ہے کہ جمہور کا یہ قول تو صحیح ہے کہ رسول خاص اور نبی عام ہے، کیونکہ دلائل و شرآئیر و
 حدیثیہ اس پر شاہد ہیں، اما کتاب فقوله تعالى وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا
 تَمَنَّى الْفَلْيُ الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ الْآيَة وَاَمَّا الحديث فما اخرج به ابن حبان في صحيحه
 وصححه المافظ ابن حجر في الفتح واخرجه ايضا اسحق بن راهويه وابن ابی شيبة
 ومحمد بن ابی عمرو وابو يعلى عن ابی ذر عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال
 كان الانبياء مائة الف واربعه وعشرين الفا وكان الرسل خمسة عشر وثلاثمائة
 رجل منهم اولهم ادم الى قوله واخرهم محمد صلى الله عليه وسلم اه

من هدية المهديين في آية..... خاتم النبیین لبعض المعاصرين ص ۲۰

باقی یہ کہ رسول کی خصوصیت کیا ہے اور نبی و رسول میں ماہ الفرق کیلئے اس سے نصوص
 ساکت ہیں، اس لئے اس میں سکوت ہی اسلم ہے، اپنی راتے سے بدون تصریح کے وجہ فرق
 متعین نہ کرنا چاہئے، کیونکہ مقامات انبیاء میں نبی کے سوا کوئی تکلم نہیں کر سکتا، واللہ اعلم،
 جواب سوال دوم؛ حدیث بخاری و مسلم میں ہے؛ لَوْعَاشَ ابْنِ اِبْرَاهِيمَ لَكَانَ نَبِيًّا
 وَلَكِنْ لَانْتَبَى بَعْدِي، اس کی شرح میں بعض مفتیین نے تبرعاً یہ بات لکھی ہے کہ اگر بالفرض
 ابراہیم صاحبزادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ رہتے اور نبی ہوتے تو وہ کیسے نبی ہوتے؟
 پھر اس سوال کا جواب دیا ہے کہ نبی غیر شرعی ہوتے جیسا کہ بنی اسرائیل میں موسیٰ علیہ السلام
 کے بعد انبیاء غیر شرعی ہوئے ہیں کہ وہ صاحب شریعت محمد وہ صاحب کتاب نہ تھے ام
 لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت غیر شرعیہ کسی
 کو حاصل ہو سکتی ہے، کیونکہ اس کی نفی تو خود اسی حدیث میں لکن لانتبی بعدی سے ہو چکی
 ہے، کہ چونکہ میرے بعد کسی کو نبوت نہیں مل سکتی اس لئے ابراہیم زندہ نہیں رہ سکے، اگر

عہ کامل علی القاری فی الموضوعات لہ ۱۲ منہ

نبوت غیر تشریعی حضور کے بعد باقی ہوتی تو ابراہیم بن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زندہ نہ رہنے کی علت میں وَلَٰكِنْ لَا نَبِيَّ بَعْدِي کیونکر صحیح ہوگا؟ بہر حال یہ تو صحیح ہے کہ نبوت کی دو قسمیں ہیں، نبوت تشریح جس میں نبی صاحب شرع مستقل ہو، دوسرے نبوت غیر تشریح جس میں نبی صاحب شرع مستقل نہ ہو، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی قسم کی نبوت باقی نہ رہی، اگر باقی ہوتی تو آپ کے صاحبزادہ ابراہیم ضرور زندہ رہتے اور نبی ہوتے، حیرت ہے کہ ابراہیم بن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تو اس لئے دنیا سے اٹھا لیا جاوے کہ خاتم النبیین کے بعد کوئی نبی نہیں اور ایک مغل بچہ قادیانی کو نبوت مل جائے اور اس کی نبوت خاتم النبیین اور لَا نَبِيَّ بَعْدِي کے منافی نہ ہو، اسی طرح بعض علماء نے نزول عیسیٰ علیہ السلام اور حدیث لَا نَبِيَّ بَعْدِي پر سے ایک اشکال کو رفع کیا ہے وہ یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام بوقت نزول نبی ہونگے یا امتی محض ہونگے اور عہد نبوت سے معزول ہو کر آئیں گے، جواب کا حاصل یہ ہے کہ وہ اس وقت نبوت سے معزول نہ ہوں گے بلکہ نبی ہوں گے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے تو وہ نبی تشریحی تھے اور حضور کے بعد جو نازل ہوں گے وہ نبی غیر تشریحی ہو کر آئیں گے کیونکہ اس وقت وہ شریعت محمدیہ کا اتباع کریں گے، پس مقصود اس قائل کا صرف عیسیٰ علیہ السلام کی شان نزول کو بتلانا ہے کہ وہ اس وقت نبوت سے معزول نہ ہوں گے یہ مطلب نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت غیر تشریحی کا انقطاع نہیں ہوا، اور یہ نبوت کسی کو آپ کے بعد مل سکتی ہے حاشا وکلاً، رہا یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کو تو حضور کے بعد نبوت غیر تشریحی ملی اس کا جواب بالکل ظاہر ہے کہ ان کو کسی قسم کی نبوت بھی حضور کے بعد نہیں ملی، بلکہ ان کو تو حضور سے پہلے نبوت مل چکی ہے، اور خاتم النبیین وَلَا نَبِيَّ بَعْدِي کا مطلب یہ ہے کہ حضور خاتم النبیین ہیں وَلَا يُنْبَأُ أَحَدٌ بَعْدَهُ کہ آپ کے بعد کسی کو نبی نہیں بنایا جائے گا ہاں یہ ممکن ہے کہ انبیاء سابقین میں سے کوئی نبی آپ کے بعد تک زندہ رہے، جیسا کہ حیات خضر کے بہت لوگ قائل ہیں، اور ان کو نبی بھی مانتے ہیں اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کو سمجھو کہ ان کی نبوت حضور سے پہلے ظہور میں آچکی اور حضور کے بعد تک وہ زندہ رہیں گے، سو یہ امر لَا نَبِيَّ بَعْدِي کے خلاف نہیں، اور اس حالت میں

نبی کا غزل نبوت سابقہ سے لازم آیا، بلفظ دیگر یوں کہتے کہ خاتم النبیین وَلَا نَبِيَّ بَعْدِي سے حدوٹ عطاء نبوت بعدہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نفی ہوتی ہے بقا نبوت حاصلہ قبلہ کی نفی نہیں ہوتی، کما سنو ضحیٰ بعدہ، اور مرزا کا دعویٰ نبوت یقیناً ان نصوص کے خلاف ہے، کیونکہ وہ مردود حضورؐ کے بعد پیدا ہوا ہے، اور اپنے لئے نبوت کا مدعی ہے، اس سے حضورؐ کے بعد کسی کو نبوت دیا جانا لازم آتا ہے جس کو ملا علی قاری اور شیخ ابن عربی وغیرہ کسی نے بھی جائز نہیں رکھا بلکہ مقصود ان کا صرف یہ ہے کہ جس نبی کو آپؐ سے پہلے نبوت مل چکی ہو اس کا حضورؐ کے بعد زندہ رہنا اور نبوت تشریعیہ سے نبوت غیر تشریعیہ کی طرف منتقل ہو کر نازل ہونا اور آپؐ کا تبع بن کر دنیا میں آنا لَا نَبِيَّ بَعْدِي اور خاتم النبیین کے خلاف نہیں، قَالَ الزَّمَخْشَرِيُّ أَمَّا اللُّغَةُ وَالْعَرَبِيَّةُ فِي تَفْسِيرِهِ خَاتَمُ يَفْتَحُ التَّاءُ بِمَعْنَى الطَّالِعِ وَيَكْسِرُهَا بِمَعْنَى الطَّالِعِ وَفَاعِلُ الْخَتْمِ وَتَقْوِيَةُ قِرَاءَةِ بَنِ مَسْعُودٍ وَلَكِنْ نَبِيًّا خَتَمَ النَّبِيِّينَ فَإِنْ قُلْتَ كَيْفَ كَانَ آخِرُ الْأَنْبِيَاءِ وَعِيسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ يَنْزِلُ فِي الْآخِرِ الزَّمَانِ قُلْتَ مَعْنَى كَوْنِهِ آخِرَ الْأَنْبِيَاءِ أَنَّهُ لَا يَنْتَبَأُ أَحَدٌ بَعْدَهُ وَعِيسَى مِمَّنْ يُبَيَّنُّ قَبْلَهُ (ص ۲۱۵ ج ۲) وَقَالَ الْعَلَامَةُ النَّسْفِيُّ فِي تَفْسِيرِهِ مَدَارِكُ التَّنْزِيلِ خَاتَمُ النَّبِيِّينَ يَفْتَحُ التَّاءُ عَاصِماً بِمَعْنَى الطَّالِعِ أَيْ الْآخِرِ هُمْ يَعْنِي لَا يَنْبَأُ أَحَدٌ بَعْدَهُ وَعِيسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ مِمَّنْ نَبِيٌّ قَبْلَهُ (ص ۳۰ ج ۳ مع الخازن) وَقَالَ أَفْضَلُ مَتَاخَرِي الْمَفْسَرِينَ صَاحِبُ رُوحِ الْمَعَانِي وَالْمُرَادُ بِكَوْنِهِ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ خَاتَمَهُمْ انْقِطَاعُ حَدِثِ وَصْفِ النَّبُوَّةِ فِي أَحَدِي الثَّقَلَيْنِ بَعْدَ تَحْلِيَّتِهِ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ بِهَا فِي هَذِهِ النِّشْأَةِ وَلَا يَقْدَرُ فِي ذَلِكَ مَا أَجْمَعَتْ عَلَيْهِ الْأُمَّةُ وَاشْتَهَرَتْ فِيهِ الْأَخْبَاءُ وَبَلَّغَتْ مَبْلَغَ التَّوَاتُرِ الْمَعْنَوِيِّ نَطْقُ بَيْدِ الْكِتَابِ عَلَى قَوْلِ وَجِبِ الْإِيمَانِ بِمَا كَفَرُ مَنكَرًا كَالْفَلَّاسِقَةِ مَنْ نَزَلَ عَلَى عِيسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي آخِرِ الزَّمَانِ لِأَنَّهُ كَانَ نَبِيًّا قَبْلَ تَحْلِي نَبِينَا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالنَّبُوَّةِ فِي هَذِهِ النِّشْأَةِ زُرُّوحُ الْمَعَانِي، ص ۶۰ ج ۴) وَقَالَ الزَّرْقَانِيُّ فِي شَرْحِ الْمَوَاهِبِ (ص ۲۶ ج ۵) وَمِنْهَا رَأَى مِنْ خَصَائِصِهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَنَّهُ خَاتَمُ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ كَمَا قَالَ تَعَالَى وَلَكِنْ رَسُولُ اللَّهِ وَخَاتَمُ النَّبِيِّينَ هِ أَيْ الْآخِرِ هُمْ الَّذِي خَتَمَهُمْ أَوْ خَتَمُوا بِهِ عَلَى قِرَاءَةِ عَاصِماً بِمَعْنَى لَفْتِهِ وَرَوَى أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَالْحَكَمُ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ عَنْ النَّسَمِ مَرْفُوعًا أَنَّ الرِّسَالَةَ وَالنَّبُوَّةَ قَدْ انْقَطَعَتْ فَلَا رَسُولَ بَعْدِي

ولا نبی ولا یقدر نزول عیسیٰ علیہ السلام بعدہ لانه یكون علی دینہ مع ان المراد انه اخر من نبی ام،

وقال الشيخ محی الدین ابن العربی فی الباب الرابع عشر من الفتوحات ثم اعلم ان حقيقة النبی الذی لیس برسول هو شخص یوحی الله بامریتضمن ذلك شریعة یتعهد بها فی نفسه فان بعث به بها الی غیرہ کان رسولاً ایضاً واطال فی ذلك ثم قال واعلم ان الملك یأتی النبی بالوحی علی حالین یتنزل بالوحی علی قلبه وتارة یأتیه فی صورة جسدیة من خارج وهذا باب اغلق بعد موت محمد صلی الله علیه وسلم فلا یفتح لاحد الی یوم القيمة ولكن بقی للاولیاء الالهام الذی لا تشریع فیہ انما هو یفسد حکم قال بعض الناس بصحة ذلله ونحو ذلك فیعمل به فی نفسه فقط ام من الیواقیت رص، ۳ ج ۲، وفیه ایضاً اعلم ان الاجماع قد انعقد علی انه صلی الله علیه وسلم خاتم المرسلین كما انه خاتم النبیین ام وفیه ایضاً وقال الشيخ فی الباب العادی والعشرین من الفتوحات من قال ان الله تعالی امره بشیء فلیس ذلك بصحیح انما ذلك تلبیس لان الامر من قسم الکلام وصفته وذلك باب مسدود ودون الناس فانه ما بقی فی الحضرة الالهیة امر تکلیفی الا وهو مشروع فما بقی للاولیاء وغیرهم الاسماء امرها ولكن لهم المناجاة الالهیة وذلك لا امر فیہ وانما هو حدیث وسمر وکل من قال من الاولیاء انه ما مورب امر الهی فی حرکاته وسکناته مخالف لا مرشعی محمدي تکلیفی او موافق له فقد التبس علیه الامر وان کان صادراً فیما قال انه سمعه فلیس ذلك عن الله وانما هو عن ابلیس فظن انه عن الله لان ابلیس قد اعطاه الله تعالی ان یصور عرشاً وکرسیاً وسماء ویخاطب الناس منه ام رص ۳۸ ج ۲

یہ شیخ کی تصریحات ہیں جو اجماع امت کے موافق ہیں، اور اسی پر تمام امت صوفیہ اور علماء کا اجماع ہے کہ رسالت و نبوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی، اب کسی کیلئے باب نبوت مفتوح نہیں ہو سکتا، اور شیخ کی طرف جو یہ قول منسوب کیا گیا ہے اعلم ان النبوة لم ترتفع مطلقاً بعد محمد محمد صلی اللہ علیہ وسلم وانما ارتفع نبوة

التشریع فقط اہم اس کا مطلب یا تو وہی ہے جو ہم نے شروع میں بیان کیا ہے کہ شیخ کا مقصود عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے اشکال کو دفع کرنا ہے، کہ آیت خاتم النبیین و حدیث لَا نَبِيَّ بَعْدِي سے عیسیٰ علیہ السلام کا نبوت سے معزول ہو کر نازل ہونا لازم نہیں آتا، یا اس کا مطلب وہ ہے جو شرح قصیدہ فارضیہ میں مذکور ہے: «و اما الولاية فهي التصرف في الخلق بالحق وليست في الحقيقة الا باطن النبوة لان النبوة ظاهرة والانباء وباطنها التصرف في النفوس باجراء الاحكام عليهما والنبوة مخومة من حيث الانباء اي الاخبار اذ لا نبى بعد محمد صلى الله عليه وسلم واثمة من حيث الولاية والتصرف لان نفوس الانبياء من امة محمد صلى الله عليه وسلم حاملة تصرف ولايته يتصرف بهم في الخلق بالحق الى قيام الساعة فباب الولاية مفتوح وباب النبوة مسدود وعلامة صحة الولي متابعة النبي في الظاهر اھ من كشاف اصطلاحات الفنون (ص ۱۵۲۹)»

جس کا حاصل یہ ہے کہ صوفیہ اپنی اصطلاح میں ولایت کو باطن نبوت کہتے ہیں اور اس کا مطلب یہ نہیں کہ ولایت نبوت کی فرد یا قسم ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ نبوت کے کمالات اور اجزاء میں سے ہے، اور ظاہر ہے کہ حبز پر گل کا اطلاق صحیح نہیں، جیسے نمک کو پلاؤ نہیں کہہ سکتے، آخر حدیث میں مبشرات کو نبوت کا چھیا لیسواں جزء کہا گیا ہے کیا اس سے یہ لازم آئے گا کہ مبشرات پر نبوت کا اور صاحب مبشرات پر نبی کا اطلاق جائز ہے؟ ہرگز نہیں، اسی طرح ولایت بھی نبوت کا جز ہے، مگر اس پر اطلاق نبوت جائز نہیں، اللهم الا ان يكون مجازا لقيام القران على عدم ارادة الحقيقة جس کی دلیل خود شرح قصیدہ فارضیہ کا یہ قول ہے فباب الولاية مفتوح وباب النبوة مسدود اھ اگر ولایت نبوت کی فرد یا قسم ہوتی تو باب النبوة کو مسدود کیوں کہتے، اور اس سے معلوم ہوا کہ ولایت پر نبوت کا اطلاق صحیح نہیں ہے، پس شیخ کے کلام میں نبوت غیر شرعیہ سے ولایت مراد ہے، چنانچہ فصوص الحکم میں نص عویری میں لکھتے ہیں: «واعلم ان الولاية هي الفلك المحيط بالعالم ولهذا لم تنقطع ولها الانباء العام واما نبوة التشريع والرسالة فمنقطعة وفي محمد صلى الله عليه وسلم فقد انقطعت الى ان قال فابقي لهم النبوة العامة التي لا تشريع فيها اھ من الحل الاقوم (ص ۱۵۲۹)»

اس میں تصریح ہے کہ نبوت عامہ سے شیخ کی مراد ولایت عامہ ہی جس کو اوپر انبار عام کہا ہے، اور اس کو نبوت غیر شرعیہ اسی وجہ سے کہا گیا کہ وہ نبوت کے کمالات اور اجزاء میں سے ہے، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ نعوذ باللہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی شخص نبی یا صاحب نبوت ہو سکتا ہے، بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ اولیاء اللہ بطریق وراثت کے اس کمال نبوت سے جس کا نام ولایت ہے متصف ہوتے ہیں، اور اس معنی کا مراد لینا اس لئے ضروری ہے کہ شیخ کی دوسری تصریحات انقطاع نبوت پر صراحتہً دال ہیں چنانچہ شیخ نے فتوحات مکیہ (ص ۵۱۰ ج ۳) میں فرمایا ہے:-

فما بقی للاولیاء بعد القطاع النبوة الا التعریفات وانسدت ابواب الاموالہیۃ والنواہی فمن ادعاها بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم فہو مدعی شریعة اوحی بھا الیہ سوء واقف بھا شرعاً او خالف ام کذا نقل بعض المعاصرين الثقات فی رسالۃ لہ، وقال الشعرانی فی الیواقیت بعد ذکر معناه فان کان مکلفاً ضرر بناعقده والا ضرر بناعنه صفحاً ۱۸ (ج ۲ ص ۳) وفی العیقات للشاہ محمد اسمعیل الذہلوی الشہید فالاتصاف بکمالات النبوة لا یتلزم الاتصاف بالنبوة ام من نقل هذا البعض ایضاً، اور اس سے زیادہ واضح علامہ شعرانی رحمہ کا قول ہے، جو کہ شیخ ابن عربی کے کلام کو بہت زیادہ سمجھنے والے ہیں، وہ فرماتے ہیں:-

ان الولاية وان جلت مرتبتها وعظمت فهي اخذة عن النبوة فلا تلحق نہایۃ الولاية بدایۃ النبوة ابداً ولوان ولیا تقدم الی العین التي یاخذ منها الانبیاء لا حرق فغایۃ امر الاولیاء انہم یتعبدون بشریۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قبل الفتح علیہم وبعدہ فلا یمکنہم ان یتقلوا بالاخذ عن اللہ ابداً ام (ص ۱۷ ج ۲)

پھر علامہ نے شیخ ابن عربی رحمہ کے چند اقوال اس مضمون کے تحت نقل فرمائے ہیں جو ان کی مراد کو اچھی طرح واضح کرتے ہیں، فقال قال الشيخ فی الباب الرابع عشر

لہ المولوی شبیر احمد عثمانی الدیوبندی ونقل سیدی حکیم الامتہ ہذہ العبارة عن سالتہ اخذ من سیدی حکیم الامتہ ۱۲

من انفتوحات اعلم ان الحق تعالى قصم ظهور الاولياء بانقطاع النبوة والرسالة بعد موت محمد صلى الله عليه وسلم وذلك لفقد هم الوحي الرباني الذي هو قوت ارواحهم الى ان قال وانما غاية لطف الله بالاولياء... انه البقي عليهم المبشرات في المنام ليستأنسوا براحة الوحي ام من اليواقيت (ص ۴۲)

اس میں نبوت اور رسالت کے انقطاع کا صاف اقرار ہے اور یہ کہ اولیاء کی مکرور اس انقطاع نے توڑ دیا، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ شیخ کے دو سر قول کا یہ مطلب نکالاجائے کہ وہ حضور کے بعد بقاء نبوت کے قائل ہیں، نعوذ باللہ منہ، بلکہ ان کا مطلب صرف یہ ہے کہ نبوت تو منقطع ہو چکی لیکن اس کے بعض اجزاء و کمالات و روح باقی ہیں جن کو ولایت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور کبھی مقام ارث سے، چنانچہ چند اقوال اور ملاحظہ ہوں وقال ايضا في الكلام على التشهد من الفتوحات اعلم ان الله تعالى قد سد باب الرسالة عن كل مخلوق بعد محمد صلى الله عليه وسلم الى يوم القيمة وانه لا مناسبة بيننا وبينه صلى الله عليه وسلم تكونه في مرتبة لا ينبغي ان تكون لنا ام وقال في شرحه لترجمان الاشواق اعلم ان مقام النبي ممنوع لنا دخوله وغاية معرفتنا به من طريق الارث النظر اليه كما ينظر من هوى اسفل الجنة الى من هوى اعلیٰ عليين وكما ينظر اهل الارض الى كواكب لسماء وقد بلغنا عن الشيخ ابی یزید انه فتح له من مقام النبوة قد رخم ابرة تجليا لدخول فكاد ان يحترق ام وقال في الباب الثاني والستين واربعائه من الفتوحات اعلم انه لا ذوق لنا في مقام النبوة لتكلم عليه وانما نتكلم على ذلك بقدر ما اعطينا من مقام الارث فقط لانه لا يصح لاحد منا دخول مقام النبوة وانما نراه كالنجوم على الماء ام من اليواقيت (ص ۴۲ ج ۲)

پس جو لوگ شیخ کے اس قول سے واعلم ان النبوة لم تنقطع مطلقا بموت محمد صلى الله عليه وسلم بل انقطع نبوة التشريع فقط یہ مطلب نکالتے ہیں کہ معاذ اللہ رسول اللہ صلى الله عليه وسلم کے بعد نبوت من کل الوجوه منقطع نہیں ہوئی بلکہ من وجہ منقطع ہوئی اور من وجہ باقی ہے، اور حضور کے بعد کسی دوسری قسم کا نبی ہونا ممکن ہے وہ شیخ کے ہاں اس دو سر قول سے اس مطلب کو منطبق کریں جن میں صاف تصریح ہے

کہ باب نبوت ورسالت مسدود ہو چکا، اور یہ کہ اب مقام نبوت میں کسی کے لئے دخول ممکن نہیں بلکہ دخول تو کیا مقام نبوت کی تجلی بھی کسی پر نہیں ہوتی، اور شیخ ابو یزید پر بقدر سوئی کے ناکہ کے مقام نبوت کی صرف تجلی ہی ہوتی تھی، بغیر دخول کے تو وہ جلنے کے قریب ہو گئے اہل پس لامحالہ یہی کہنا پڑے گا کہ شیخ کا مطلب عبارت مذکورہ سے وہ ہرگز نہیں جو بعض نادانوں نے سمجھا ہے بلکہ اس سے یا تو نزول عیسیٰ علیہ السلام پر سے اشکال کو رفع کرنا منظور ہو جس کو کبھی اس عنوان سے تعبیر کرتے ہیں جو نادانوں کو چکر میں ڈال رہا ہے، اور کبھی اس عنوان سے تعبیر کرتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام وقت نزول من السماء کے جماعت اولیاء میں داخل ہو کر نازل ہوں گے نہ کہ جماعت رسل میں، و عبارت شیخ فی الباب الثالث والتبعین من الفوتحات اعلم انہ لیس فی امة محمد صلی اللہ علیہ وسلم من ہوا فضل من ابی بکر غیر عیسیٰ علیہ السلام وذلك انه اذا نزل بین یدی الساعة لا یحکم الا بشرع محمد صلی اللہ علیہ وسلم فیکون له یوم القیامة حشر ان حشر فی غمرة الرسل بلواء الرسالة وحشر فی غمرة الاولیاء بلواء الولاية اه من الیواقیت (ص ۴۳، ۲۷)

یہ مطلب ہے کہ نبوت کے منقطع ہونے سے یہ مت سمجھو کہ اس کی برکات اور رواج اور کمالات بھی منقطع ہو گئے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت تشریع یعنی وحی منقطع ہو چکی ہے اور نبوت کا باطنی جزو یعنی وہ نسبت باطنیہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب میں تھی جس کو ولایت کہتے ہیں منقطع نہیں ہوئی، بلکہ اولیاء کو اس نسبت باطنیہ سے حصہ ملتا ہے، پھر اولیاء اس نسبت باطنیہ کے حامل ہو کر مقام نبوت کے قریب بھی نہیں ہوتے، بلکہ صرف دُور سے اس کو اس طرح دیکھ سکتے ہیں جس طرح زمین والے آسمان کے تارے دیکھتے ہیں، بتلایئے اس توضیح و تفصیل کے بعد شیخ کے کلام سے یہ کیونکہ مفہوم ہو سکتا ہے کہ وہ حضورؐ کے بعد بقاء نبوت کے قائل ہیں، حاشا و کلاً، اور اگر اس پر بھی کوئی ہٹ دھرمی کرے تو اس کے لئے دوسرا جواب یہ ہے کہ:-

ختم نبوت و انقطاع رسالت کا مسئلہ قرآن و احادیث میں نصوص قطعیہ سے ثابت ہے اور اس پر تمام امت کا اجماع ہے، اب تم اس کے خلاف اس دعوے پر کہ حضورؐ کے بعد کسی شخص کو کسی قسم کی نبوت مل سکتی ہے کوئی نص قطعی پیش کرو، کیونکہ قطعی کی تخصیص قطعی ہی سے ہو سکتی ہے، اور شیخ ابن عربی یا کسی اور بزرگ کا قول نص قطعی نہیں، بلکہ کسی درجہ میں

بھی حجت نہیں کیونکہ شیخ ابن عربی کے اقوال میں بعض یہودیوں کا خلاف شرع اقوال ٹھونسنا درجہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے، جیسا کہ علامہ شحرانی نے یواخت و بحر مورد و عہود محمدیہ میں اس کی تصریح کی ہے، تیز صوفیہ نے اس کی بھی تصریح کی ہے کہ ہم بہت سی باتیں رموز میں کہا کرتے ہیں جن کو دیکھنا اور بیان کرنا ہر شخص کو جائز نہیں، انہی وجہ سے بہت سے مسائل میں صوفیہ پر زندہ و کفر کا فتویٰ لگایا گیا ہے، کیونکہ یہودیوں کے دس دخلط کی وجہ سے بعض اقوال خلاف شرع ان کی طرف منسوب کئے گئے تھے، یا رموز کے نہ سمجھنے سے غلط مطلب ان کی طرف منسوب کیا گیا، پس ایسی حالت میں ان حضرات کی کتابوں سے کوئی قول نکال کر نصوص قطعیہ و مسئلہ اجماعیہ کے معارضہ میں پیش کرنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے، بلکہ ہم کو یہ کہنے کا حق ہے کہ جو قول نصوص قطعیہ و اجماع کے خلاف ہو وہ کسی کا الحاق ہے، جس کی دلیل خود ان حضرات کے وہ اقوال ہیں جو نصوص و اجماع کے موافق اور اس قول موہم کے خلاف ہیں، پھر خصوصاً مرزا قادیانی کو شیخ کا یہ قول تو کسی طرح بھی مفید نہیں ہو سکتا ہے، کیونکہ وہ تو اپنے لئے نبوت تشریعیہ و رسالت کا مدعی ہے، اس کے اقوال ملاحظہ ہوں، لعنہ اللہ و لعن اتباعہ و اخراہم و شرہم و بددہم اجمعین،

نمبر ۱۔ "ما سوا اس کے یہ بھی تو سمجھو کہ شریعت کیا ہے، جس نے اپنی وحی کے ذریعہ چند امر اور نہی بیان کئے، اور اپنی امت کے لئے ایک قانون مقرر کیا ہے، وہی صاحب الشریعہ ہو گیا، پس اس تعریف کی رو سے بھی ہمارے مخالف ملزم ہیں، کیونکہ میری وحی میں امر بھی ہے اور نہی بھی، مثلاً یہ الہام قل لیسوا منین یعصوا من ابصارہم و یحفظوا کربہم ذلک آذی لہم، یہ براہین احمدیہ میں درج ہے، اور اس میں امر بھی ہے اور نہی بھی، اور ایسا ہی اب تک میری وحی میں امر بھی ہوتے ہیں اور نہی بھی الخ رو بکھوار بعین مصنف مرزا علیہ ما علیہ، ص ۶ نمبر ۴)

نمبر ۲۔ رسالہ نزول مسیح مصنف مرزا، صفحہ ۹۹ میں ہے ۵
 آنچہ من بشنوم زوجی حنرا ۵ بخدا پاک داغش ز خطا
 ہچو تر آں منزہش دانم ۵ از خطا ہا ہمین ست ایمانم
 اور اسی کتاب کے صفحہ مذکورہ میں ہے ۵
 انبیاء گر چہ بودہ اندلبے ۵ من بعرفان نہ مکترم ز کسے

کم نیم زان ہمہ بروئے یعتیں ۴ ہر کہ گوید دروغ ہست لعین
ان تصریحات کے بعد کوئی کہہ سکتا ہے کہ مرزا نبوت تشریحیہ کا مدعی نہ تھا، اسی رسالہ نزول المسیح کے
صفحہ مذکورہ میں ہوتا ہے ۵

آنچہ دادست ہرنہی راجام ۶ داد آں حہام را مراہتمام
کیا اس میں تصریح نہیں ہے کہ مرزا اپنے کو تمام انبیاء سے افضل کہتا ہے کہ جو تمام کمالات
سائے انبیاء علیہم السلام میں تقسیم ہوئے تھے وہ سب تہنا اس کو دے گئے، نعوذ باللہ من
ہذہ الکفریات والہذیانات،

اور اوپر ہم شیخ ابن عربی کا قول نقل کر چکے ہیں کہ جو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد
اپنے لئے حق تعالیٰ کی طرف سے امداد دعویٰ کرے وہ تلبیس ابلیس میں مبتلا ہے، پس مرزا
کے متبعین اگر مرزا کو شیخ رح کے کسی قول سے نبی بنانے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ شیخ رح کے اس
قول سے اس کی تشریح بھی کر دیں کہ وہ نبی تو ہے مگر خدا کی طرف سے نہیں بلکہ ابلیس کی طرف
اور وہ وحی کو تو سنتا ہے مگر خدا کی وحی کو نہیں بلکہ شیطانی وحی کو (فاعتبروا یا اولی الابصار)
اخبار البدر مورخہ ۵، ماہ ۱۲ سنہ ۱۲۹۷ء میں ہے جو قادیان سے شائع ہوتا تھا:-

”ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم رسول ہیں اور نبی ہیں“

نمبر ۳۔ دافع البلاء، ص ۱۱ میں ہے:

”سچا خدا وہ ہے جس نے قادیان میں رسول بھیجا“

(نقلنا اقوال هذا اللعين باسرها مع الحواله من رساله ختم النبوة لبعض

افاضل دیوبند)

جواب سوال سوم

مولانا رومیؒ یا اور کسی بزرگ نے کسی ولی کو نبی نہیں کہا، اور نہ الہام کو وحی کہا، ہاں
مولانا رومیؒ کا ایک مصرعہ مرزائیوں کی زبان زد ہے اور کہتے ہیں کہ یہ مثنوی میں ہے ۵
آنہی وقت باشد اے مرید

جس میں مرشد کو نبی وقت کہا ہے، مگر ان ناقلین سے تصحیح نقل کا مطالبہ کرنا چاہئے، اگر یہ مصرعہ
مثنوی میں نکل آیا تو اسی مقام پر سیاق و سباق میں اس کا مطلب بھی مل جاوے گا کہ مراد

نائب نبی ہے جس کو مجازاً نبی کہہ دیا گیا اور مجازاً تو بعض دفعہ اس سے زیادہ کہہ دیا جاتا ہے، خود قرآن میں ہے **أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ** کیا تم نے اس کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو الہ بنایا ہے، تو کیا اس مجاز سے کوئی شخص دعویٰ مصاحبت الوہیت کو جائز کرے گا کہ میں بھی صاحب ہوی ہوں اور ہوی کو قرآن میں الہ کہا گیا ہے تو میں بھی صاحب الہ ہوں، یا اگر کسی کلکٹر کو مجازاً بادشاہ کہہ دیا جائے کہ وہ بھی اپنے ضلع میں بادشاہ کی مثل ہے، کیونکہ اس کا نائب ہے، تو کیا اس سے کلکٹر کو دعویٰ سلطنت جائز ہوگا؟ ہرگز نہیں، اسی طرح بزرگوں نے الہام کو وحی ہرگز نہیں کہا، ہاں بعض کے کلام میں ”وحی الہام“ کا لفظ وارد ہے جس میں تعیند موجود ہے، اور قید کے ساتھ وحی کا اطلاق غیروحی حقیقی پر جائز ہے، جیسے ”وحی الشیطان“ وغیرہ، اور اگر کسی کے کلام میں بغیر قید کے بھی غیروحی کو وحی کہا گیا ہو تو وہاں معنی لغوی مراد ہوں گے، نہ کہ اصطلاحی معنی، جس کا قرینہ یہ ہوگا کہ اس شخص نے دعویٰ نبوت نہیں کیا تھا، اور جو شخص اپنے الہام کو وحی کہہ کر دعویٰ نبوت کرے گا اس کے کلام میں یہ تاویل نہیں ہو سکتی،

جواب سوال چہارم | الہام اور وحی کی تعریف حسب ذیل ہے :-

الوحی بالفتح والسکون فی الاصل الاعلام فی خفاء
وقبل الاعلام فی سرعة وكل ما دللت به من کلام او کتابہ او اشارۃ او رسالۃ
فہو وحی (ای لغت) و فی اصطلاح الشریعۃ ہو کلام اللہ تعالیٰ المنزل علی نبی
من انبیائہ کذا فی الکومانی والعلینی وقال صدر الشریعۃ فی التوضیح فی

لہ اگر اس پر کوئی یہ کہے کہ مرزا کا دیانی نے بھی اپنے کو مجازاً نبی کہا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ارادہ مجاز کا دعویٰ بدون قرائن کے قبول نہیں ہو سکتا اور مرزا کے اقوال میں ارادہ مجاز کا کوئی قرینہ نہیں بلکہ وہ تو صاف اپنے کو نبی بلکہ رسول اور نبی تشریفی کہتا ہے، اور جو اس کی نبوت کو نہ مانے اسے کافر کہتا ہے اور اپنے لئے جملہ انبیاء سے زیادہ معجزات کا دعویٰ کرتا ہے، ملاحظہ ہو رسالہ ہدیۃ المہدیین مطبوعہ قاسمی دیوبند، دوسرے ارادہ مجاز کے معنی تو یہ ہیں کہ متکلم عدم ارادہ حقیقت کا مقرر ہو یا اگر کوئی حقیقت کی نفی کرے تو اس پر تکیر نہ کرے، جیسے: **زید اسد** کہا جائے تو متکلم زید لیس اسد کا بھی اقرار کرے گا اور اس کی نفی نہ کرے گا، پس اگر مرزا نے اپنے کو مجازاً نبی کہا، بمعنی وارث نبی یا نائب نبی تو اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ اپنے سے نبوت کی نفی نہیں کرتا، اور نفی کرنے والوں کی تکفیر کرتا ہے، اور جب اس کی نبوت سے آیت خاتم النبیین و حدیث **لَا نَبِيَّ بَعْدِي** کا معارضہ ہو تو قرآن و حدیث میں تحریف کرنے لگا، اور نبوت کی قسمیں اور انواع نکالنے لگا، صاف یونہی کیوں نہ کہہ دیا کہ میں نبی نہیں ہوں دوسری

مجازاً میری زبان سے نبی کا لفظ نکل گیا تھا، فقط ۱۲ منہ

رکن السنہ الوحی ظاہر و باطن الی ان قال وکل ذلك حجة مطلقا بخلاف الالهام
فانه لا يكون حجة على غيره ام من كثرة اصطلاحات الفنون للعلامة التهانوي
ر ص ۱۵۲۳ اور وحی انبیاء کے ساتھ مخصوص ہے اسی لئے کسی کا یہ دعویٰ کرنا کہ مجھ پر وحی
نازل ہوتی ہے، موجب کفر و ردت ہے، شفاء قاضی عیاض میں ہے، ومن ادعی النبوة
لنفسه او جوزا کتسابها والبلوغ بصفاء القلب الی مرتبہا کالفلاسفة وغلاة
المتصوفة وكذلك من ادعی منهم انه یوحی الیه وان لم یدع النبوة وهؤلاء
کلهم کفار مکذبون للنبی صلی اللہ علیہ وسلم لانه اخبر انه خاتم النبیین
وانه لا ینبی بعده واخبر عن الله وانه ارسل كافة للناس واجمعت الامة
على ان هذا الکلام على ظاهرة وان مفهومه المراد منه دون تاویل وتخصیص
فلا شک فی کفر هؤلاء الطوائف کلها قطعاً و اجماعاً و سماعاً ملخصاً من شرح
الشفاء للخفاجی ج ۳، ص ۵۲۲ و ۵۲۴، ملاحظہ ہو رسالہ اکفار الملحین، جس میں دیگر
ائمہ سے اسی کی مثل تصریح مذکور ہے،

والالهام بالهاء لغة الاعلام مطلقاً و شرعاً، القاء معنی فی القلب بطریق
الفیض ای بلا اکتساب و فکر ولا استفادة بل هو وارد غیبی و رد من الغیب
کذا فی الکشاف المذکور ر ص ۱۳۰۸ قال وهو ای الالهام لیس سبباً یحصل
به العلم لعامة الخلق و یصلح للالزام على الغير لکن یحصل به العلم فی
نفسه هکذا استفاد من شرح العقائد النسفیة و حواشیہ ام ر ص مذکور
مگر اس تعریف میں ایک قید مذکور نہیں یعنی ”قلب غیر النبی“ اور بدون اس قید کے تعریف
الہام نبی کے الہام کو بھی شامل ہے، اور نبی کا الہام اگر تعریف میں داخل ہوا تو آگے یہ قول
مطلقاً صحیح نہ ہوگا، و لیس سبباً یحصل به العلم لعامة الخلق کیونکہ نبی کا الہام وحی
ہے اور وہ حجت ہر جیسا کہ اوپر گذرا، پس تعریف جامع مانع یوں ہے، هو القاء معنی فی قلب
غیر النبی بطریق الفیض،

اور صوفیہ نے یہ فرق کیا ہے کہ وحی وہ ہے جو بواسطہ جبرئیل کے ہو اور الہام وہ ہے جو بواسطہ
ملک الہام کے ہو جو دوسرا فرشتہ ہی، مگر یہ تعریف جامع مانع نہیں، کیونکہ نبی کا مقام اور راسے
اس تعریف وحی سے خارج ہوتے جاتے ہیں، حالانکہ وہ بھی وحی میں داخل ہیں، اور وحی غیر نبوت

شرعاً کوئی چیز نہیں، بعض صوفیہ الہام ہی کو وحی الہام سے تعبیر کر دیتے ہیں، جس میں وحی سے مراد معنی لغوی ہیں نہ کہ معنی شرعی جس کا قرینہ خود ہی قید ہے، اگر مرزا کا دیا بی بھی اس کا دعویٰ کرے کہ میں نے بھی الہام کو مجازاً یا لغتہ وحی کہا ہے تو اس کا جواب یہ ہو کہ تیرے صریح اقوال اس تاویل کو رد کر رہے ہیں، اول تو ان کے غلط اور کذب ہونے کا اقرار کرو، وقد ذکرنا ہا قبل پھر تو اپنے اقرار سے نبی نہ ہوگا، بلکہ مدعی ولایت ہوگا، اور مدعی ولایت کاذب ہو ا کرتا ہے، کیونکہ دعویٰ کرنا نبی کے لئے مخصوص ہے ولی دعویٰ نہیں کیا کرتا، قال فی کشف اصطلاحات الفنون نقلًا عن النفعات والرسالة القشيرية ونیز از شروط ولی آنست کہ اخفاء حال خود کند چنانکہ از شروط نبی آنست کہ اظہار حال خود کند وعن خلاصة السلوك الوحي على ما قال البعض هو الذي يكون مستورا الحال ابداً والكون كله ناطقا على لسانه والمدعى الذي ناطق بالولاية والكون كله ينكر عليه اه

جواب سوال پنجم حضرت عیسیٰ علیہ السلام بوقت نزول متبع شریعت محمدیہ بن کر تشریف لائیں گے، لیکن یہ اتباع ان کی شان نبوت کا منقص

نہیں، بلکہ مکمل ہے، پس عیسیٰ علیہ السلام اس وقت نبی بھی ہوں گے اور امتی بھی، مگر نبی صاحب شرع نہ ہوں گے بلکہ نبی متبع ہوں گے، جیسے موسیٰ علیہ السلام کے بعد بیت سے انبیاء متبع تورات ہوئے ہیں، اور گو اس وقت عیسیٰ علیہ السلام پر وحی بواسطہ جبریل علیہ السلام توضیح مراد قرآن و حدیث نبوی کے لئے نازل ہونے میں بھی کوئی اشکال نہیں، مگر شیخ ابن عربی کے بعض اقوال سے جو کشف پر مبنی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے پاس اس وقت جبریل علیہ السلام کے واسطہ سے وحی نہ آئے گی، کما یفہم من الیواقیت (ص ۳۸ ج ۲) اور صورت اولیٰ کے موجب اشکال نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ آیت خاتم النبیین کا مطلب یہ ہے کہ حضور آخر النبیین ہیں، جیسے کہا جاتا ہے فلاں خاتم الراکبیین و آخر الراحلیین، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فلاں شخص صفت رکوب و ارتحال سے بعد موصوف ہوا اس کے لئے یہ لازم نہیں کہ اس سے پہلے راکبین و راہلین اس کے رکوب و ارتحال کے وقت فنا و معدوم ہو چکے ہوں بلکہ ان کے بقا کے ساتھ بھی یہ خاتم الراکبیین و آخر الراحلیین ہوگا، پس عیسیٰ علیہ السلام کا حضور سے پہلے نبوت سے متعلق ہو کر حضور کے بعد تک رہنا خاتم النبیین اور لائیٰ بعدی کے منافی نہیں، اور یہی معنی انقطاع وحی کے ہو سکتے ہیں، کہ حضور کے بعد

ابتداءً کسی پر وحی نہ آئے گی، اور جس پر آپ سے پہلے آچکی ہو اس پر وحی کا آثار ہنا اس کے خلاف نہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ حضور کے بعد جو نبی سابق یا وحی سابق باقی رہے وہ حضور کی نبوت وحی کے تابع ہوگی، ورنہ اس کا نسخ لازم آئے گا، حالانکہ یہ دین اسلام اجماعاً نسخ الادیان کہلما ہی اور اس کو کوئی نبی یا وحی منسوخ نہ کر سکے گی، اور آیات قرآنیہ واحادیث نبویہ بکثرت اس پر..... شاہد ہیں، اگر تفصیل مطلوب ہو تو رسالہ ختم النبوة فی القرآن وختم النبوة فی الحدیث وختم النبوة فی الآثار، وهدیۃ المہدیین فی آیۃ خاتم النبیین واکفار الملحدین فی شی من ضروریات الدین، مطبع قاسمی دیوبند سے طلب کر کے ملاحظہ ہوں،

جواب سوال ششم میں نے مرثیہ تمام دیکھا مجھے تو کوئی لفظ توہین کا موہم بھی نہیں ملا اگر آپ کے نزدیک کچھ ایہام ہو تو اس کی تشریح فرما کر سوال کریں،

ارج ۲۵ شمس ۱۳۵۷ھ از تھانہ بھون، خانقاہ امدادیہ

مرزا غلام احمد قادیانی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزہ احیاء موتی کا کیوں منکر تھا؟ سوال (۳) مرزا غلام احمد قادیانی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزہ احیاء موتی کا اس بناء پر منکر

ہے کہ قرآن میں رد میراث و رد نکاح کے (اگر اس کی بیوہ نے کسی اور سے نکاح کر لیا ہو) احکام بیان نہیں کئے، میرا جواب یہ ہے کہ اگر رد میراث و رد نکاح کی ضرورت ہوتی تو قرآن میں اس کے احکام ہوتے، چونکہ اس کے مرنے کے بعد اس کا مال اور اس کی ملک متعہ زائل ہو گئی، وہ محض احیاء سے واپس نہیں ہو سکتی، تا وقتیکہ اس کے مشروط اسباب و قیود نہ ہیا ہوں، یعنی وہ پھر مال کمائے یا وارث کسی کا بنے اور از سر نو نکاح کرے وغیرہ، فاجوابکم فی ہذا مسئلہ؟

الجواب؛ قال فی الشامیۃ فی باب المفقود تحت قول الدرفان طهر قبلہ اسی قبل موت اقرانہ حیًا الم مانصہ لکن لوعاد حیًا بعد الحكم بموت اقرانہ قال الظاہر انہ کالمیت اذا حی و المرتد اذا اسلم فالباقی فی ید ورثہ لہ ولا یطأ بما ذهب قال ثم بعد رقمہ رایت المرحوم ابالسعود نقلہ عن الشیخ شامی

۱۴ ص ۵۱۲ - ۳۱۳

وفی البحر فی الاحکام المرتدین وان عاد مسلما بعد الحكم بلحاظہ فما عین قائم فی یدہ فلیس لہ اخذ بدلہ منہ لان الوارث انما یخلفہ فیہ لاستغنائہ واذا عاد مسلما یحتاج الیہ فیقدم علیہ وعلیٰ ہذا الواحیاء اللہ میتا حقیقۃ

وإعادة إلى دار الدنيا كان له أخذ ما في يد ورثته وأطلق في قوله وألا لا تشمل ما إذا كان هالكا أو اتا له الوارث عن ملكه وهو قائم سواء كان بسبب يقبل الفسخ كبيع وهبة أو لا يقبله كعتق وتدبير واستيلاد فانه يمضي ولا عود له فيه وشمل ما لم يدخل في يد وارثه أصلا كمد يريه وامهات اولاده المحكوم عليهم بعقوبتهم بسبب الحكم بلحاظه فانهم لا يعودون في الرق لان القضاء بعقوبتهم قد صح بدليل مصحح له والعتق بعد نفاذه لا يقبل البطلان اه ص ۱۳۲ ج ۵ قلت وكذا اذا تزوجت زوجة الميت بعد عدة الوفاة رجلا فتكاحه صحيح ولا يبطل بعود الميت حيا فان الحكم بصحته قد تم بدليل مصحح له والله اعلم واما لو تزوجت في العدة فلا شك في بطلان النكاح الثاني وهل تعود الى الزوج الاول الذي اعيد حيا في عدتها بدون تجديد نكاح بينهما او بالتجديد فالظاهر الاول لقول الفقهاء المرأة تغسل زوجها الميت لان اباحة الغسل مستفاد بالنكاح والنكاح بعد الموت باق الى ان تنقضي العدة اه شامى ص ۸۹ ج ۳ ۱۳ شوال ۱۲۸۸ م ازتهانه بھون

فصل في الفرق الإسلامية

جماعت اہل حدیث کا حکم | سوال (۱۱)

..... اہل حدیث جن کو عرف عام میں وہابی کہا جاتا ہے کافر ہیں یا نہیں، اور آیا ان کو اسلام علیکم سے مخاطب کرنا جائز ہے یا نہیں، اور ان کے پیچھے نماز کا پڑھنا درست ہے یا نہیں، اور ان کے کتوں وغیرہ سے پانی بھرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جماعت اہل حدیث کافر نہیں ہیں، ان میں جو لوگ مذاہب اربعہ کی تقلید کو شرک اور مقلدین کو مشرک یا ائمہ کو ہر اکہتے ہیں وہ فاسق ہیں، اور جو ایسے نہیں ہیں صرف تارک تقلید ہیں اور محدثین کے مذہب پر ظاہر حدیث کے اتباع کو افضل سمجھتے ہیں، اور اس میں اتباع ہوئی سے کام نہیں لیتے وہ فاسق بھی نہیں ہیں بلکہ اہل سنت والجماعت میں داخل ہیں، غیر مقلدین کو اسلام علیکم کرنا تو عموماً جائز ہے، لیکن نماز میں پہلے فرقہ کی اقتداء نہ کی جائے جو فاسق ہے، کیونکہ فاسق کی اقتداء مکروہ ہے، نیز وہ لوگ مقامات اختلاف میں

دوسرے کے مذہب کی رعایت بھی نہیں کرتے اور دوسرے فرقہ کی اقتدار جائز ہے، مگر قسم ثانی اہل حدیث کی ہندوستان میں بہت کم پائی جاتی ہے اور ان کے کنوؤں سے پانی بھرنا عموماً جائز ہے، کیونکہ سب مسلمان ہیں،

۲۰۔ صفر ۱۳۵۷ھ درتھانہ بھون

اہل سنت والجماعت کی تعریف | سوال (۲) اہل سنت والجماعت کی جامع مانع تعریف کیا ہے بحوالہ کتب تحریر فرمائیں؟

الجواب: اہل سنت وجماعت وہ مسلمان ہیں جو عقائد و احکام میں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے مسلک پر ہوں اور قرآن کے ساتھ سنت نبویہ کو بھی حجت مانتے اور اس پر عمل کرتے ہوں قال فی شرح العقائد النسفیة فہمت الجبائی و ترک الاشعری مذہبہ فاشتغل هو ومن تبعہ بالبطال رای المعتزلة واثبات ماورد بہ السنة ومضى علیہ الجماعة (ص ۱۲) یہ تو اس لقب کے معنی ہیں اور اس کا مصداق وہ لوگ ہیں جو عقائد میں امام ابو الحسن اشعری یا ابو منصور ماتریدی کے متبع ہوں، کما فی حاشیۃ النخیالی علی شرح العقائد (ص ۱۹) اور فروع میں ائمہ اربعہ مشہور میں سے کسی ایک امام کے مقلد ہوں۔

۶ رجب ۱۳۵۷ھ ازتھانہ بھون، خانقاہ امدادیہ

غیر مقلدین کی مذمت کا حکم | سوال (۳) ایک شخص نے اپنے وعظ میں بیان کیا کہ اہل حدیثوں کی حدیث شریف میں بہت مذمت آتی ہے، اس نے اردو زبان میں ایک حدیث شریف کا ترجمہ بیان کیا اور کہا کہ اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فرقہ کا نام اہل حدیث ہی بتلادیا ہے، اور اس نے کہا کہ ان اہل حدیثوں سے تمام معاملات ترک کر دو، اور اہل حدیثوں کی عبادات پر بھی مذاق کیلئے، اور یہ بھی کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مثل بشر کہنے سے کافر ہو جاتا ہے، اور اس کی بیوی پر طلاق ہو گئی، اب سوال یہ ہے کیا اہل حدیثوں کی مذمت میں کوئی حدیث آئی ہے جس میں اس فرقہ کا نام بتلایا گیا ہے؟

الجواب: اہل حدیث کا نام لے کر کسی حدیث میں مذمت نہیں آئی، یہ اس واعظ نے غلط کہا، البتہ حدیث میں ان لوگوں کی مذمت آئی ہے جو سلف کو برا کہیں، اور ہندوستان کے اہل حدیث بھی اکثر ایسے ہی ہیں جو سلف کو برا کہتے ہیں، ۱۳ رجب ۱۳۵۷ھ

حکم دراشت میان شیعہ و اہل سنت | سوال (۴) شیعہ چو نمک

قرآن شریف کی اصلیت اور کمال سترہ ہزار آیات کا اقرار کرتے ہیں، چنانچہ اصول کافی میں موجود ہے اور موجودہ قرآن کو ناقص مانتے ہیں اور اپنی پیروی کے ساتھ لواطت کو بھی جائز کہتے ہیں، اور تمام اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین کو کافر اور مرتد کہتے ہیں اور مانتے ہیں اور اسی قسم کی اکثر باتوں میں یہ لوگ اہل سنت کے مخالف ہیں تو ان میں اور اہل سنت میں میراث جاری ہو گیا یا نہیں، کیونکہ موجودہ قرآن کی ۶۶۶۶ آیتوں کا اسی قدر اس کو جاتا اور یہی مقدار مانتا اور اس سے کم و بیش کا تسلیم نہ کرنا یہ بھی ضروریات دین سے ہے یا نہیں؟ اور علامہ خیر الدین رملی نے مخ الغفار شرح تنویر الابصار کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ معتزلہ اور آفضی کے تمام فرقے گروہ اہل کتاب میں سے ہیں یعنی ان میں داخل رکھ لیے، اور جبکہ اہل کتاب کی مثل مان لئے جائیں گے تو شریفیہ شرح سراجی کی اس عبارت کے خلاف ہوگا بخلاف اہل الاہوار فانہم معترفون بالانبیاء والکتاب وخیلفون فی تاویل الکتاب والسنة وذلک لایوجب اختلاف الملة، مگر شیعہ معترف قرآن موجود کی کمی میں نفس و قرآن کے اگر معترف ہیں تو اس کی مقدار بہت زیادہ بتلا کر حیثیت قرآن میں فرق کرنا بھی تو جائز نہ ہوگا، مقدار ۶۶۶۶ بھی ضروریات سے ہے یا نہیں، پس عرض یہ ہے اس اختلاف کے ہوتے ہوئے میراث کو سنی و شیعہ میں جائز سمجھا کر دینا جائز سمجھوں، بینوا تو جبروا؟

الجواب: اہل بدعت کے لئے یہ قاعدہ لکھا ہے کہ اس عقیدہ مخترعہ میں اگر ایسی چیز کا انکار ہو جو ضروریات دین سے ہے تب تو وہ کافر ہے ورنہ فاسق، اور ظاہر ہے کہ قرآن شریف کا اسی طرح محفوظ ہونا جس طرح کہ نازل ہوا ہے اصول دین سے ہے بلکہ اصل الاصول ہے، جو شخص (نعوذ باللہ) تحریف قرآن شریف کا قائل ہو وہ یقیناً کافر ہے،

فی الدر المختار (باب الامامة) کل من کان من قبلتنا لا یکفر بہا والی ان قال، وان انکر بعض ما علم من الدین ضرورة کفر بہا وقال العلامة الشامی رحمہ اللہ رتحت قوله لا یکفر بہا، ای بالبدعة المذكورة المینة علی شہتہ اذ لا خلاف فی کفر المخالف فی ضروریات الدین من حدو العالم وحشر الاجساد ونفی العالم بالجزئیات وانکان من اهل القبلة المواظب

۱۵ باب موانع ارث میں ۱۲ منہ

طول عمرہ علی الطاعات کما فی شرح التخریر فی البحر (ص ۳۵۰ ج ۱).....

.... فالجمل ان المذهب عدم تکفیر احد من المخالفین فیما لیس من الاصول
 المعلومة من الدین ضرورة رالی ان قال، اما من خرج بیدعته من اهل القبلة
 کمکری حدوث العالم والبعث وحشر الاجساد والعلم بالجزئیات فلا تنزه
 فی کفرهم لانکارهم بعض ما علم مجع الرسول به ضرورتاً و قال العلامة
 الشامی فی حاشیة البحر صفحہ مذکورة بالا.....

... قال الحلبي وعلى هذا يجب ان يحصل لعدم تكفير اهل القبلة المنقول
 رعن الامام والامام الشافعي رحمهما الله تعالى، على ما عدا.... غلاة الروافض
 ومن ضاهاهم فان امثالهم لا يحصل منهم بذل وسع في الاجتهاد فان من قال
 بان عليا هو الاله و بان جبرئيل عليه السلام غلط ونحو ذلك من السخف
 انما هو مبتدع بمحض الهوى وهو اسوأ حالا ممن قال بان عبد هم الا
 ربونا الى الله زلفى فلا يتأتى من مثل الامامين العظمين ان لا يحكمياهم
 من اكفر الكفرة الخ، والصا قال الشامی ج في باب المرتد (ص ۲۵۳ ج ۲) نعم
 شك في تكفير من قذف السيدة عائشة رضي الله تعالى عنها او انكر صحبه
 الصديق او اعتقد الالهية في علي او ان جبرئيل غلط في الوحي او نحو ذلك من
 الكفر الصريح المخالف للقرآن ام وقال العلامة الكمال بن همام في خاتمة
 كتاب المسايير (ص ۱۵) وقد اختلف في تكفير المخالف بعد الاتفاق على ان ما كان
 من اصول الدين وضرورياته يكفر المخالف فيه الخ،

اس سے معلوم ہو گیا کہ تحریف قرآن کا قائل بالاتفاق کافر ہے، اور دوسرے سوال
 کا جواب یہ ہے کہ شامی نے قول درمختار ویجوز مستحبا کے تحت میں لکھا ہے قدم الشارح
 فی باب الحيض الخلاف فی کفر مستحل وطئ العائض وطئ الدبر ثم وفق
 بما فی التاتارخانیة عن السراجیة اللوطة بسلوکة او مسلوکة او امرأته
 حرام الا انه لو استعمله لا یکفر قاله حسام الدین ام ای فیحصل القول بکفره
 علی ما اذا استعمل اللوطة باجنبي بخلاف غیره، لکن فی الشریئلا لیتة ان هذا
 یعلم ولا یعلم ای لئلا یتجرى الفسقه علیه بظنهم حله (ص ۲۴۱ ج ۳) باب

الوطی الذی یوجب لحد والذی لا یوجبہ) و فی باب المرقن من الدر المختار ص ۴۳۹ ج ۳) لا یفتی بالكفر بشی منها الا فیما اتفق المشائخ علیہ، پس استحلال ایقان زوجتہ فی الدبر کی وجہ سے کفر کا فتویٰ نہ دیا جاوے گا،

اور نمبر سویم کے متعلق یہ عرض ہے فی الدر المختار بعد تعریف الخوارج یا نفسم یکفر ون اصحاب نبینا صلی اللہ علیہ وسلم وحکمہم حکم البغاة باجماع الفقہاء کما حققہ فی الفتح وانما لم نکفرہم لکونہ عن تاویل وان کان باطلا بخلاف المستحل بلا تاویل کما مر فی باب الامامة ام رباب البغاة ص ۴۴۰ شامی، اور مخ الغفار کی عبارت میں وہی لوگ مراد ہوں گے جو ضروریات دین کے منکر نہیں اور عبارت اگر باب نکاح میں ہے جیسا کہ شامی میں ہے، علی انہم لیسوا بادی حال امن اهل الكتاب بل ہم مفسرون با شرف الكتب ام، تب تو اس سے ان کا مسلم ہونا لازم نہیں آتا نہ وارث ہونا، کیونکہ ان کی بیٹیوں سے نکاح حلال ہونا اور چیز ہے اور اسلام جدا چیز ہے، کما لا یخفی، اور اگر کسی اور جگہ کی عبارت ہے تو دوبارہ تحریر فرمائیے، اور شریفیہ کی عبارت میں لا ینکرون شیئا من اصول الدین المعلومة ضرورة کی قید لگانا لازم ہے،

عہ کتبہ اتباعا للسلف وهو الواجب علینا ولكن یختلج فی قلبی ان تکفیر الصعابة مخالف لصریح القرآن فینبغی ان یکون کفر اکمالا قذ الف صدیقة وانکارا صعبة الصدیق کفر بلا ریب کما نقلتہ عن العلامة الشامی انفا والینا تکفیر الصعابة شامل لتکفیر الصدیق الا کبر رضى الله تعالى وهو مردف لانکار صعبته فکیف التطبيق فی تکفیر منکر صعبته وعدم تکفیر مکفر الصعابة وفی حفظی انی رأیت فی کتاب من المعتبرات ان تفسیق الصعابة فسق وتکفیرہم کفر وهو الاوجه عندی لان من یفسقہم له نوع شبهة وان کان باطلا وتکفیرہم لیس بشبهة بل هو مجرد هوی کما لا یخفی ولكن لما جده الآن ولعل الله یحدث بعد ذلك امر او یؤید قولی ما فی الشرح الفقه الاکبر للملا علی القاری فلو فرض انه یسب الشیخین لا ینخرج عن الایمان نعم لو استحل المسبب القتل فهو کافر لا محالة ام مجموعة الفتاوی ص ۴ ج ۱۱ ص ۱۲ عفی عنہ ثم رأیت فی الملل والنحل ص ۱۸۳ ج ۴ ومن قولہم ان جمیع الصعابة کفر بعد موت النبی (الی ان قال) وكل هذا کفر صریح لا خفاء به ۱۲ منه

خلاصہ جواب کا یہ ہوا کہ مختلف عقائد کا مختلف حکم ہے، سب روافض کا ایک حکم نہیں بلکہ جو خریف قرآن وغیرہ کا قائل ہو وہ کافر ہے، اور جو شخص عقائد کفریہ نہ رکھتا ہو وہ کافر نہیں، بلکہ مبتدع، فاسق اور گمراہ ہے، اس لئے جس شخص پر اسلام یا کفر کا حکم لگانا چاہیں تو اس کے عقائد معلوم کرنے کی ضرورت ہے، محض ان کی کتابوں میں عقائد کفریہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر ہر رافضی یہ عقائد رکھتا ہے، بلکہ بعض عوام کو پتہ تک بھی نہیں، ہذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب، کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ از مدرّس امداد العلوم تھانہ بھون، مورخہ ۲ جمادی الثانی ۱۳۵۸ھ

کتاب التقلید والاجتہاد

مسئلہ مفقود کی طرح کسی مسئلہ میں بضرورت سوال (۱)
 دو سکرام کی تقلید جائز ہے یا نہیں؟ ... اگر کوئی شخص حنفی المذہب بضرورت کسی مسئلہ میں دو سکرام کے موافق عمل کرے تو جائز ہے یا نہیں جیسے مفقود لاپتہ کی زوجہ سخت پریشان ہو، اور گزر مشکل ہو یا کوئی شخص بھول کر اپنے بیٹے کی زوجہ کو شہوت سے ہاتھ لگا دے اور وہ صرف ظاہر جسم کو ہاتھ لگا دے زنا کی نوبت نہ آدے، اور بیٹا پریشان ہو کہ بیوی بچوں کو چھوڑنا ناگوار دوستوار گزرے، تو وہ عورت مفقود کی اور وہ بیٹا دو سکرام کے قول پر عمل کر کے دو سکرام سے نکاح کرے اور زوجہ کو حلال سمجھے تو یہ جائز ہے یا نہیں، اور شامی کی عبارت بھی اس کو کسی نے بتلا دی ہے،

متن؛ ان الرجوع عن التقليد بعد العمل باطل اتفاقاً،
 شرح؛ علی ان فی دعوی الاتفاق نظر فقد حکي الخلاف فيجوز عند القائل بالجواز كذا افادة العلامة الشربلالي في العقد الفرید ثم قال بعد ذكر فروع من اهل المذهب صریحاً بالجواز وكلام طويل فتحصل مما ذكرنا انه ليس على الانسان التزام مذهب معين وانه يجوز العمل بما يخالف ما عمل به على مذهب مقلداً فيه غير امامه مراعىا شروطه وعمل بما يرين متضادين في حادثتين لا تعلق لواحدة منهما بالآخرى وليس له ابطال عين

ما فعلہ بتقلید امام آخر لان امضاء الفعل كما مضاء القاسنی لا ينقص وقال ايضا ان له التقليد بعد العمل كما اذا صلى ظاهراً وصحتهما على من هبته تم تبين بطلانها في من هبته وصحتها على من هب غيره فله تقليده ويجتزئ بتلك الصلوة على ما قال انه روى عن ابی یوسف انه صلى الجمعة مفقلاً من الحمام ثم اخبر بفارة ميتة في بئر الحمام فقال ناخذ بقول اخواننا من اهل المدينة اذا بلغ الماء قلتين لم نجمل خبثا انتهى الشامي جلد اول مصری ص ۵۶،

اب عرض یہ ہے کہ سوال مذکورہ بالا کی ہر دو صورت میں عمل دوسرے امام کے مذاہب پر بصورت خاصہ جائز ہے یا نہیں، فقط،

الجواب؛ زوجہ مفقود میں امام مالک کے مذہب پر عمل کرنے کا فتویٰ حنفیہ نے بھی دیا ہے، مگر شرط یہ ہے کہ امام مالک کے مذہب کی تمام قیود و شرائط کا لحاظ کیا جائے اور وہ تمام شرائط کتب حنفیہ میں مذکور نہیں، بلکہ مالکیہ سے معلوم کرنا چاہئے، چنانچہ اس کے متعلق حرین سے علماء مالکیہ کا فتویٰ مفصل مولانا حسین احمد صاحب نے حاصل کیا ہے، ان سے تمام قیود و شرائط معلوم کر کے اس کے موافق عمل کر سکتے ہیں ۱۲ اور حرمت مصاہرہ کے متعلق مذہب غیر پر عمل کرنے کی حنفیہ نے اجازت نہیں دی، بلکہ فتویٰ امام ابو حنیفہ ہی کے قول پر ہے، اور وہی صحیح ہے، رہا تقلید مذہب غیر کا معاملہ سو عامی کو اس کی اجازت نہیں کیونکہ عوام کو اس کی اجازت دینے میں تلاعب بالدين ہے وہ دین کو کھیل بنالیں گے کہ آج اس کے مذہب میں سہولت دیکھی اس پر عمل کر لیا، کل دوسرے کے مذہب پر،

اور وہ تقلید مذہب غیر جس کا منشاء تلخیص رخص ہو، اتفاقاً حرام ہے، بلکہ یہ منصب علماء کا ہے کہ وہ مائل کی حالت دیکھ کر اور تقلید مذہب غیر کی ضرورت دیکھیں تو اس کو اس کی اجازت دیدیں جس کی صورت یہ نہیں کہ خود مذہب غیر پر فتویٰ دیں بلکہ اس کو دوسرے مذہب کے علماء سے رجوع کرنے کا طریقہ بتلا دیں، فات الحنفی لا یفتی الا بمنہ ر وان سئل عن من هب لغیر فیتول مذہب ابی حنیفہ فیہ کذا صرح بہ فی الدر فی رسم المفتی وجہہ عندی والله اعلم ان الحنفی مثلاً لا یعرف من هب لغیر حق المعرفۃ کما ان الشافعی لا یعرف من هب لحنفیۃ کذا فلا ینبغی لہ الافتاء بمذہب الغیر بل علیہ ان یرشد السائل الی الاستفتاء عنہم فافہم،

جو شخص وجہ ترجیح سمجھنے کی لیاقت رکھتا ہو اس کیلئے کسی ایسے بریئہ میں ایک قول پر از خود عمل کرنا جس میں دونوں بڑا اور ان کے ترجیح میں فقہاء و علماء عصر کا اختلاف ہو۔

سوال (۲) جزئی خاص میں مقامی علماء اختلاف کرتے ہیں، کتب معتبرہ میں احسان مثلاً ہدایہ، شامی وغیرہ میں بھی اختلاف واقع ہے، مثلاً مثلاً صاحب ہدایہ کے مسلک پر پچاس سال تک عمل کرتا رہا ہے اور اس دیا رخاس میں وہی مسلک صدیوں سے جاری و ساری

ہے، وہ شخص خاص گو مسائل کے وجہ ترجیح پر نہ خود گفتگو کر سکتا ہے، اور نہ ایسے مباحث علمیہ کے کماحقہ سمجھنے کی لیاقت رکھتا ہے، کیا اگر چاہے تو جزئی مذکور میں ہدایہ سے رجوع کرتا ہو شامی پر عمل کر سکتا ہے گویا ایسی ترجیح بلامرجح کی بناء پر تشویش عوام کا بھی اندیشہ ہو،

الجواب؛ روایات کی قوت و ضعف پر جس کی نظر نہیں ایسے شخص نے مختلف فیہ مسئلہ کی جانب خاص پر اگر عمل کر لیا ہے جس کی تصریح کتب متداولہ مستدلہ اکابر احناف میں ہو چکی ہے، خصوصاً وہ جانب اگر ایسی ہے کہ عوام میں اس کا اجراء بھی خوب کافی ہو گیا ہے تو اب ایسے شخص کو ایسی جانب کے ترک کرنے اور جو جانب باقی پر عمل کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، حکیم الامتہ حضرت مولانا تھانوی صاحب مدظلہ نے الاقتصاد (ص ۲۸) میں اس مضمون پر بایں الفاظ روشنی ڈالی ہے، ”آخر ترک کرنے کی تو کوئی وجہ متعین ہونا چاہئے، جس شخص کو قوت اجتہاد یہ نہ ہو اور اسی کے باب میں کلام ہو رہا ہے وہ ترجیح کے وجہ تو سمجھ نہیں سکتا تو پھر یہ فعل محض ترجیح بلامرجح ہوگا، اور اگر کوئی حقوڑا بہت سمجھ سکتا ہو تو اس کے ارتکاب میں دوسرے عوام الناس کے لئے جو متبع ہیں خواہش نفسانی کے ترک تقلید شخصی کا باب مفتوح ہوتا ہے اور اذ پر حدیث سے بیان ہو چکا ہے کہ جو امر عوام کے لئے باعث فساد ہو اس سے خواص کو بھی روکا جاتا ہے“

رئیس الطائفہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے عقیدہ الجید (ص ۷۸) میں ابن ام کالمیہ کی شرح مہناج البیضاوی سے یہ قول نقل فرمایا ہے فاذا وقعت لہامی حادثۃ فاستفتی فیہا مجتہداً او عمل فیہا بفتویٰ ذلک المجتہد فلیس لہ الرجوع عنہ الی فتویٰ غیرہ فی تلك الحادثۃ لعینہما، اور بشرط فہم اسی طرف مشیر ہے، درمختار کی یہ عبارت کہ وان الرجوع عن التقلید بعد العمل باطل اتفاقاً و ہواختاراً فی المذہب (شامی، ص ۶۹) الاقتصاد (ص ۴۲) میں دوسری جگہ حضرت مولانا مدظلہ نے اس مسئلہ کو اور واضح کر دیا ہے، الفاظ

یہ ہیں:۔ بحسب مسئلہ میں کسی عالم وسیع النظر ذکی الفہم منصف مزاج کو اپنی تحقیق سے یا کسی عامی کو ایسے عالم سے بشرطیکہ متقی بھی ہو بشہادت قلب معلوم ہو جائے کہ اس مسئلہ میں رائج دوسری جانب ہو تو دیکھنا چاہئے کہ اس مرجوح جانب میں بھی دلیل شرعی سے عمل کرنے کی گنجائش ہو یا نہیں، اگر گنجائش ہو تو ایسے موقع پر جہاں احتمالِ فتنہ و تشویش عوام کا ہو مسلمانوں کو تفریق کلمہ سے بچانے کے لئے اولیٰ یہی ہے کہ اس مرجوح جانب پر عمل کرے،

ہذا مختصر الکلام و بالتفصیل یستدعی بسطاً بسیطاً فی المرام و خیر الکلام ما قلّ و دلّ، واللہ اعلم
کتبہ عبیدہ المذنب عبد الرحیم مہمین سنی غفرلہ و لوا الدیہ و لمحییح
المسلمین، مورخہ ۳ ۱۱/ ۴

تنقیح من جامع امداد الاحکام،

سوال محل ہے اور جواب... قاعدہ کلیہ سے ہے، جو عوام کے لئے کافی نہیں، اس لئے بہتر یہ ہے کہ ہدایہ اور شامی کے اُس جزئیہ مختلف فیہا کی تعیین کر کے سوال کیا جائے فقط
ظفر احمد عفا اللہ عنہ از تھانہ بھون خانقاہ امداد
۹ ذیقعد ۱۳۲۸ھ

سوال،..... اگر کتب معتبرہ احناف میں کسی خاص جزئی کے متعلق دو حکم مختلف باس طور پائے جائیں کہ مثلاً صاحب ہدایہ نے ایک کو ترجیح دی ہو اور شامی نے دوسرے کو، اور نیز مقامی علماء بھی جزئی مذکور میں بعض ہدایہ کے مؤید ہوں اور بعض شامی کے، تو ایسی صورت میں ایسے شخص کے لئے کہ نہ خود روایات کے وجہ ترجیح پر کلام کر سکتا ہو اور نہ ایسے علمی مباحث کو کما حقہ سمجھ سکتا ہو، ان دونوں مذکورہ بالا کتب میں سے کسی ایک پر عمل کرنا بلا کراہت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب؛ ایسے شخص کے لئے مختلف فیہ مسائل میں ہدایہ، شامی یا اس پایہ کی دوسری کتابوں پر جو علمائے احناف کے نزدیک مستند اور مستدل ٹھہر چکی ہیں اعتماد کرنا اور ان میں سے کسی ایک پر عمل کرنا بلا کراہت جائز ہے، نہر الفائق فی کتاب القضاء میں اس کا بیان یوں آیا ہے، طریق نقل المفتی المقلد عن المجتہد احد امرین اما ان یكون له سند او یاخذ من کتاب معروف تد اولتہ الا ید نحو کتب محمد بن الحسن ونحوها من التصانیف المشہورۃ للمجتہدین لانه بمنزلۃ المتواتر

او المشہور، اور بعینہ یہی قول شامی میں علامہ ابن عابدینؒ سے اور عقد الجید میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ سے منقول ہے، ہنر الفائق میں آگے ارشاد ہے کہ نوادر کے مسائل بھی اگر ہدایہ یا مبسوط میں منقول ملیں تو معتبر سمجھے جائیں گے، الفاظ یہ ہیں:۔ واذا وجد النقل عن النوادر مثلاً فی کتاب مشہور معروف كالهدایة والمبسوط كان لك تعویلاً علی ذلك الكتاب۔ اگر مسئلہ واحدہ میں اقوال مختلفہ صحیحہ علماء پائے جائیں تو ان میں کسی ایک کو معمول بہ قرار دینا جائز رکھا گیا ہے، بحر الرائق کی کتاب الوقف میں یوں مذکور ہے:۔ متی كان فی المسئلة قولان مصححان جاز القضاء والاقتاء باحدهما، اور اس مسئلہ کے کل پہلوؤں پر نظر کرتے ہوئے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے عقد الجید، ص ۹۰..... میں عجیب فیصلہ کن بات لکھی ہے ملاحظہ ہو:۔ فلو كان حافظاً للاقوال المختلفة للمجتهدین ولا يعرف الحجة ولا قدرته علی الاجتهاد للترجیح لا یقطع بقول منها ولا یفتی به بل یحکمها للمستفتی فیختار المستفتی ما یقع فی قلبه انه الاصول ذکره فی بعض الجوامع وعندی انه لا یجب علیه حکایة کلها بل یشافی ان یحکی قولاً منها..... نعم لو حکى الكل فالأخذ بما یقع فی قلبه انه اصول اولی والعامی لا عبقری بما یقع فی قلبه من صواب الحكم وخطائه وعلى هذا استفتی فقیہین اعنی مجتہدین فاختلفا علیه الاولی ان یأخذ بقول من یمیل الیه قلبه منهما وعندی انه لو أخذ بقول الذی لا یمیل الیه جاز لان مثله وعدمه سواء، هکذا وجدت فی الکتاب اللہ اعلم بالصواب کتبہ عبد المذنب عبد الرحیم الیمینکی غفر له ولوالدیه لجمع المسلمین

مورخہ ۳ ۱۱/۴ م

تنقیح من جامع امداد الاحکام:۔

تنبیہ: دوسرے سوال و جواب پر جو تنقیح کی گئی یہاں بھی اسی کا اعادہ کرتا ہوں فقط، ظفر احمد عفا اللہ عنہ از تھانہ بھون خالقہ امدادیہ، ۹ ذیقعدہ ۱۴۲۸ م والعجب من المجیب انه کیف سوغ للعامی العمل بکتب لفقہة براءة والعبارة التي ذكرها تنادی بان لا عبقری لراعی العامی ولا لما یقع فی قلبه وانما علیه الأخذ بقول من یعتمد علیه ویعتقده، واللہ اعلم،

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

کتاب السنۃ والبدعۃ

سنن اور نوافل کے بعد امام اور مقتدیوں کا بالالتزام دُعا مانگنا کرنا بدعت ہی

سوال (۱) سورتی جامع مسجد رنگون میں تقریباً آج سے آٹھ دس برس پہلے فرض نمازوں کے سلام پھیرنے کے بعد متصل ہی امام اولاً دُعا میں اللہم اَنْتَ السَّلَام پڑھتا تھا اور جب لوگ سنن و نوافل سے فارغ ہو جاتے تھے تو پھر دوسری مرتبہ الفا تحہ کہہ کر بلند آواز سے دُعا مانگتا تھا اور سب مقتدی آمین آمین کہتے تھے، اس دوسری الفا تحہ والی دُعا کی پابندی ضروری سمجھتے تھے حتیٰ کہ کسی وقت امام کو سنن و نوافل پڑھنے میں دیر لگ جاتی تو منتظرین دُعا کا اعتراض امام پر ہوتا تھا کہ ہم تو دُعا کے انتظار میں ہیں اور امام صاحب تاخیر کرتے ہیں، انہی ایام میں مسجد کی امامت پر ایک دیندار عالم صاحب کا تقرر ہوا جب انھوں نے دیکھا کہ ثانی الفا تحہ کی نہایت پابندی کی جاتی ہے اور امام کو اس پر مجبور کیا جاتا ہے، نیز امام کو سنن و نوافل کے پڑھنے میں ذرا تاخیر ہو جاتی ہے تو اعتراض کیا جاتا ہے، تو لوگوں سے کہا کہ اس التزام کے ساتھ الفا تحہ پڑھنے کا حدیث و فقہ میں کسی جگہ ثبوت نہیں ملتا، اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنے سنن و نوافل پڑھ لینے کے بعد ہر شخص اپنے طور پر دُعا مانگ لیا کریں، ان عالم صاحب کے اس کہنے کا لوگوں پر اثر ہوا اور علماء کے فتوے لے کر اس التزام کے ساتھ الفا تحہ پڑھنا موقوف کر کے ہر شخص نے بعد سنن و نوافل منفرداً دُعا مانگنا شروع کیا، تقریباً آٹھ دس برس سے حسب ذیل طریقہ دُعا مانگنے کا جامع مسجد سورتی میں مسترر ہو گیا ہے، کہ جن فرضوں کے بعد سنتیں ہیں ان میں سلام پھیرنے کے بعد امام اللہم اَنْتَ السَّلَام یا اسی مقدار کی دُعا مانگتا ہے، دُعا میں سب لوگ شامل ہوتے ہیں اور جن فرضوں کے بعد سنتیں نہیں ہیں مثلاً فجر و عصر، اس میں سلام پھیرنے کے بعد دائیں باتیں جانب یا مصلیوں کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتا ہے، اور تھوڑی دیر اور دو وظائف میں مشغول ہوتا ہے، اس کے بعد جماعت کے ساتھ دُعا مانگتا ہے، اس آٹھ دس برس کے عرصہ میں بہت سے عالموں کا یہاں آنا جانا ہوا اور کچھ یہاں مقیم بھی ہیں، انھوں نے ہمیشہ اس طریقہ کو سنت کے موافق سمجھا، اور کبھی کبھی اعتراض نہیں کیا، نیز بہت سے مصلی بھی اس طریقہ کو

سنت کے موافق سمجھتے ہیں اور کچھ اعتراض نہیں کرتے ہیں، لیکن بعض ناواقف لوگ جو رسم کے پابند ہیں اور رسم کے کرنے میں ثواب سمجھتے ہیں، وہ متولیان مسجد کو ابھارتے ہیں کہ فاتحہ ثانی کا دوبارہ اجراء کیا جائے اور امام صاحب کو مجبور کیا جائے کہ وہ فاتحہ ثانی اسی التزام کے ساتھ پڑھیں جس طرح پہلے پڑھا جاتا تھا، اب سوال یہ ہے کہ اس وقت جو بعد نماز فرض متصل ہی ایک وقت دعاء مانگی جاتی ہے وہ سنت طریقہ کے موافق ہے یا نہیں؟

سنن و نوافل کے بعد خاص التزام مذکور کے ساتھ دعاء مانگنے کا ثبوت حدیث و فقہ سے ہے یا نہیں، سنن و نوافل کے بعد خاص التزام مذکور کے ساتھ فاتحہ شروع کرنے کے لئے متولیان مسجد امام مسجد کو مجبور کر سکتے ہیں یا نہیں، اگر وہ مجبور کریں تو ان کا یہ جبر شریعت کے موافق ہے یا نہیں؟

الجواب؛ قال العلامة المحدث ولی اللہ فی حجة اللہ البالغة بعد ما سرز الاحادیث الواردة فی الدعاء بعد المكتوبة مانصه والاولی ان یأتی بهذه الاذکار قبل الرواتب فانه جاء فی بعض الآثار ما یدل علی ذلك نصاً کقول من قال قبل ان ینصرف ویثقی رجلیه من صلوۃ المغرب والصبح لا الہ الا اللہ وحده لا شریک له الخ وکقول الراوی کان اذا سلم من صلوۃ یقول بصوته لا الہ الا اللہ الخ وفي بعضها ما یدل ظاهراً کقوله دبر کل صلوۃ الخ کذا فی النقاش المرغوبۃ ص ۵۲ وفيه ایضاً ص ۱۱ قال فی شرعة الاسلام ولینتم ای المصلی الدعاء بعد المكتوبة ام وفي مفاتیح الجنان قوله بعد المكتوبة ای قبل السنۃ ام،

طریقہ مسنونہ حسب تصریح فقہاء حنفیہ یہی ہے کہ جن نمازوں کے بعد سنتیں ہیں ان میں فرض کا سلام پھیرتے ہی مختصر دعاء کر کے سنن رواتب میں مشغول ہو جائیں، اور سنتیں پڑھنے کے بعد ہر شخص اپنے اپنے کام میں لگے، اور جن فرضوں کے بعد سنتیں نہیں ہیں، ان میں سلام پھیر کر امام داتیں یا باتیں جانب کو منحرف ہو کر اذکار ماثورہ پڑھے، پھر سب نمازی دعاء کریں اور جو صورت فاتحہ ثانیہ کی سوال میں مذکور ہے یہ بدعت ہی، اس کی کچھ اصل نہیں، بالخصوص التزام اور اصرار کی وجہ سے یہ بدعت سیئہ میں داخل ہے، قال فی السعاۃ فیہ ان من اصر علی امر مندوب وجعلہ عزماً ولم یعمل بالرخصة فقد اصاب منه الشیطان

من الاضلال فکیف بمن اصتر علی بدعة او منکر، کذا فی النقائس المرغوبۃ، ص ۳،
واللہ اعلم، پس متولیان مسجد کو اس طریقہ بدعت پر ہرگز مجبور کرنا جائز نہیں، اور یہ جبر بالکل
خلاف شریعت و اشاعت بدعت ہے، جس کا فاعل شرعاً بوجہ ابتداء کے مستحق گناہ عظیم
ہے، ۲۱ رذی الحجہ ۱۴۲۸ھ

از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ

تعمیر بنانے اور اس کو مسجد میں رکھنے کا حکم سوال (۲).....

صورت حال یہاں کی یہ ہے کہ ایک مسجد یہاں اہل سنت والجماعت کی ہے، جس کے متعلق تخمیناً ایک سو گھریو پاروں کے ہیں، جو سب اہل سنت ہیں، اور وہی لوگ اس مسجد کے متولی ہیں، عرصہ دراز سے ایک فقیر جو مسجد کا خدمتی سمجھا جاتا تھا وہ مذہباً شیعہ تھا، اور لوگ جو یہاں زوردار اور زمیندار سمجھے جاتے ہیں وہ بھی شیعہ ہیں، وہ اس فقیر کے حمایتی رہتے تھے، اس بنیاد پر وہ فقیر مذکورہ بالا مسجد میں ایک تعزیر بنا کر رکھتا تھا، جو اہل سنت کے مذہب کے قطعاً خلاف اور ناجائز ہے، چنانچہ دو تین سال ہوئے کہ وہ فقیر مر گیا، اور اس کا یا اس کے ورثاء کا کوئی تعلق مسجد سے نہ رہا اور دوسرا سنت جماعت مؤذن رکھ لیا، مگر اس کے ورثاء بوجہ حمایت اہل تشیع کے کہ جن کے ہاں اس قصبہ میں بڑے زور شور سے تعزیر داری ہوتی ہے اس کی حمایت پر کھڑے ہو گئے، اور زبردستی تعزیر رکھوانا چاہا اور رکھوا دیا، اہل سنن کو عدالت دیوانی میں اس فقیر کا استحقاق باطل ہو جانے کا دعویٰ کرنا پڑا، وکلار نے یہ مشورہ دیا کہ اگر تعزیر تمھارے مذہب کے خلاف ہو اور تم اپنی مسجد میں رکھا جانا نہیں چاہتے تو دعویٰ کے ساتھ اپنی مستند علماء کے وہ فتوے بھی شامل کرو جن کی وجہ سے تم مسجد میں تعزیر رکھنے کے مانع ہو، لہذا خدمت عالی میں گزارش ہے کہ ایک فتویٰ جو عرصہ طویل کے ساتھ ہے اس میں تعزیر اور تعزیر داری کی بُرائی، اور اس پر شرعاً جو وعیدیں ثابت ہوں وہ سب مدلل اور مفصل مع حوالہ کتب اور نیز یہ بھی کہ جس مسجد میں تعزیر رکھا ہوا ہو اس مسجد کی نماز میں کیا قصور عائد ہوتا ہے ارقام فرما کر بھیج دیجئے، چونکہ ہمارا یہ فعل کسی مسلم گروہ میں تفریق اور نزاع پیدا ہونے کی غرض سے نہیں ہے، بلکہ ایک نہایت ضال اور مبتدع گروہ کے شر اور بدعت سے اپنے کو محفوظ رکھنا مقصود ہے، اور بفضلہ اہل سنت کے یہاں جو تخمیناً ایک ہزار ہوں گے

سب متفق ہیں اور ان میں کوئی اختلاف نہیں، لہذا فتویٰ نہایت صاف و مسترح اور زوردار الفاظ میں ہونا چاہئے، تاکہ عدالت میں کارآمد ہو سکے، اور آپ اور یہ سب لوگ عند اللہ مجاہد و عند الناس مشکور ہوں، جناب مفتی صاحب کے دستخط ثبت ہونے کے بعد دیگر موجودہ علماء مدرسہ کے دستخط..... باہر میں بھی کرا دیں، تاکہ عدالت میں کارآمد ہو اور مستند مانا جاوے چونکہ یہ کام خالصاً وجہ اللہ ہے، لہذا قوی امید ہے کہ آنجناب اس میں پوری کوشش اور سعی بلیغ فرما کر جلد جواب بھیج دیں گے، جواب کے واسطے ایک آنہ کا ٹکٹ مرسل ہے

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ حنفی العقیدہ اہل سنت والجماعت کے مذہب میں تعزیہ بنانا یا اپنے مکان میں رکھنا، اور اس پر منّت اور چڑھاوا چڑھانا کیسا ہے، اور کس درجہ کا گناہ ہے؟ اور جس مسجد میں تعزیہ رکھا جاتا ہے اس میں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اور جو لوگ باوجود جاننے کے اس کے معاون اور مددگار ہوں ان سے کس قسم کا برتاؤ کیا جاوے؟ بینوا تو جروا،

الجواب؛ تعزیہ بنانا اور اس کو اپنے مکان میں رکھنا بدعت ضلالہ اور بہت بڑا گناہ ہے، اور اس کی تعظیم و تکریم کرنا شرک ہے، اسی طرح اس پر منّت اور چڑھاوا چڑھانا حرام اور شرک ہے، اور مسجد میں تعزیہ کا رکھنا ہرگز جائز نہیں، اور جس مسجد میں تعزیہ رکھا ہو اس میں تعزیہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا مکروہ ہے، اور اہل مسجد کے ذمہ تعزیہ کا نکال دینا واجب ہے، اور جو لوگ تعزیہ کو مسجد میں رکھنا چاہتے ہوں اور جو ان کے معاون ہیں وہ عند اللہ سخت گنہگار ہیں، ان سے ملنا جلنا، سلام و کلام کرنا ترک کر دینا چاہئے، جب تک وہ اس گناہ سے توبہ خالص نہ کریں، روی الطبرانی عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من احدث حدثاً او اوری محدثاً علیہ لعنة اللہ والملیكة والناس اجمعین لا یقبل اللہ منہ صراً ولا عدلاً، اس حدیث کے موافق جو لوگ تعزیہ اپنے گھر میں یا مسجد میں رکھتے ہیں یا جو اس کے معاون ہیں ان پر خدا کی اور فرشتوں کی اور سب مسلمانوں کی لعنت برستی ہے، اور ان کی نماز اور روزہ اور تمام اعمال صالحہ خدا کے یہاں مردود ہیں، کچھ قبول نہیں ہوتے، بحر الرائق میں ہے النذر للمخلوق لا یجوز لانه عبادة والعبادة لا تكون للمخلوق ام،

اس سے معلوم ہوا کہ تعزیہ کیلئے منّت ماننا اور چڑھاوے چڑھانا حرام قریب شرک ہے

مولانا عبدالحی لکھنویؒ اپنے فتاویٰ (ص ۱۰۹ ج ۲) صورت و شبیہ روضہ مقدسہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بنانے کو اور اس کی تعظیم و تکریم غیر مشروع کو بدعت و حرام لکھتے ہیں، پھر تعزیہ بنانا کیونکر جائز ہوگا، قال لنبی صلی اللہ علیہ وسلم لا تتخذن و اقبری عین امہ و قال لنبی صلی اللہ علیہ وسلم لعن اللہ الیہود والنصارى اتخذن و اقبری انبیاءہم مساجد اخرجہ البخاری،

مولانا عبدالحیؒ رسالہ اسلمی سے نقل فرماتے ہیں، من الاولہام فقرہ حکم شئی بشبیہ و هذا الوہم قد اضل عبدة الاصنام من طریق الصواب و اوقعہم فی ہاویۃ الجہالۃ ام (ص ۱۱۰ ج ۲) شامی میں ہے قال فی الدرر و لیس ثوب فیہ تماثل ذی روح ام فی رد المحتار قول و الظاہر انہ یلحق بہ الصلیب وان لم یکن تماثل ذی روح لانہ فیہ تشبہا بالنصارى و یکرہ التشبیہ بہم فی المذموم وان لم یقصدہ کما مر ام (ص ۶۷۷ ج ۱) اور ظاہر ہے کہ تعزیہ بھی صلیب کے نہیں، اس لئے اس کے سامنے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، اور مسجد میں اس کا رکھنا حرام ہے، لان المسجد لم ینزلوا انما ہو لعبادة اللہ و وحدہ، واللہ اعلم، حررہ الاحقر ظفر احمد تھانوی ۲۰ صفر ۱۳۸۵ھ معین خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون

الجواب صحیح، اشرف علی،

سوال (۳) چہ می فرمایند..... حیلۃ اسقاط کا حکم اور اس کی دوسری صحیح صورت در فدیہ صوم و صلوٰۃ و کیفیت حیلۃ اسقاط آن چوں شخصے بمیرد و نماز با فریضہ و واجب در روزہ ہائے شہر رمضان و کفارۃ یمن و سجدۃ تلاوت یا واجب دیگر بر ذمہ او باشد پس ایام نابالغیت را کہ سیزدہ سال است مثلاً طرح دادہ سالہا ما بقیۃ نماز ہر شبانہ روز را با و ترا اعتبار کنند و در کفارت ہر نماز پنجوقتہ و ہر روزہ و یک ترو و دو آثار گندم مقرر سازند پس ہر ایک روز و دو از دہ آثار گندم میشود و آثار ہر پنجوقتہ و دو آثار ہر نماز و ترو و دو ہین خنبر ایک و سیدے ل و سبت و تے زہ یک ماہ رمضان یک و نیم من گندم می شود پس مجموع یک صد و نہ و نیم من گردید، بعد ازاں باندا حساب مذکور یکسالہ ہر قدر کہ سنین عمرش کنند بہاں حساب این قدر گندم معین نمایند، پس درین صورت در ادائے فدیہ حیلہ نمایند بدین نمط کہ ہر قدر گندم مقرر کردہ باشند در عوض آن

قرآن مجید بحضور مسلمانان پر دست گرفتہ بمسکینے بفروشد چنانچہ گویند کہ اس مصحف مجید را در عوض این قدر گندم بدست تومی فروشم و آن مسکین آن را قبول کند و دو کس گواہ باشند پس آن قرآن مجید از آن مسکین شد و ادائے گندم مقررہ براد لازم آمد بعد ازاں بالغ قرآن بمشتری یعنی آن فقیر گوید کہ بر ذمہ فلاں ابن فلاں نماز ہائے پنجگانہ واجبات چندین مدت و روز ہائے شہر رمضان از بعضے حقوق خدا تعالیٰ کہ واجب الاداء بود بابت فدیہ فوت آہنا کہ حالا از ادائے آن عاجزست من ترا از مقدار گندم خود را کہ عوض آن مصحف بر تو قرض است در حقوق فدیہ آن فلاں متوفی بتو و ادم قبول کردی آن مسکین گوید قبول کردم، پس از علما ذوی العقول دریافت کردہ می شود کہ این اسقاط بحکم شرع شریف چہ حکم دارد و از ادائے فدیہ بری الذمہ خواہند شد یا نہ و میت را ازین نفع حاصل شود یا نہ، بحوالہ کتب معتبرہ و باسناید روایت مشہورہ مبادلہ عقلیہ و نقلیہ بینوا توجروا،

الجواب؛ فدیہ صوم و صلوٰۃ و کفارت وغیرہ میں تملیک عین شرط ہے، اور صورت مذکورہ میں تملیک عین نہیں ہوتی، بلکہ ابراہم دین ہے، اور ابراہم دین سے زکوٰۃ و کفارت ادا نہیں ہوتے، لہذا یہ صورت محض لغو ہے، قال فی عالمگیریہ رجل له علی فقیر مال و اراد ان يتصدق بماله علی غریبہ و یحتسب بہ عن زکوٰۃ ماله فقد عرف من اصحابنا انه لا یتادی بالدين زکوٰۃ العین ولا زکوٰۃ دین اخراہ ص ۲۶۰ و فیہ الضا و اداء العین عن العین وعن الدین جائز و اداء الدین عن العین وعن دین یقبض لا یجوز و اداء الدین عن دین لا یقبض یجوز کذا فی محیط الشرح ام، ص ۱۱۰ ج ۱ قلت و الکفارات کما و کذا الفدیۃ یشرط فیہا الاطعام و التصدق و مقتضاه التملیک فهو دین یقبض فلا یجوز اداء الدین عنہ،

بلکہ صلوٰۃ و صوم عن المیت کے ادا کرنے کا حیلہ بطریق صحیح یہ ہے جو عالمگیریہ میں لکھا ہے اذا اراد ان یؤدی الفدیۃ عن صوم ابیہ او عن صلوٰۃ و هو فقیر فانه یعطى منون من الحنطۃ فقیرا ثم یستوہبہ ثم یعطیه ہکذا الی ان یتم کذا فی الفتاویٰ الحنفیہ ام ص ۲۶۰ ج ۲، یعنی اس کا حیلہ یہ ہے کہ جتنی نمازیں اور روزے میت کے ذمہ ہیں انکی مقدار کے موافق فدیہ کے غلہ کا حساب کیا جائے، مثلاً میت کے اوپر فدیہ میں سو من غلہ واجب ہے جس کی قیمت ۵۰۰ روپیہ ہے پھر جتنی رقم میت کے ثلث مال سے بکل سکتی ہو وہ فقیر کو فدیہ کہہ کر

دی جائے پھر اس سے کہا جائے کہ یہ رقم تو ہم کو مہبہ کر دے جب وہ مہبہ کر دے تو پھر اسی کو فدیہ کہہ کر دیدی جاوے، پھر اس سے بطور مہبہ کے مانگ لی جائے اسی طرح کرتے رہیں، یہاں تک کہ مقدار مذکور پوری ہو جائے، اور ثلث مال کی قدر دینا اس وقت واجب ہے جب کہ میت فدیہ صلوٰۃ و صوم کی وصیت کر گیا ہو، اور اگر اس نے وصیت نہ کی ہو تو پھر جتنی رقم ورثہ خوشی کے ساتھ اس کے فدیہ میں دینا گوارہ کریں اس میں بھی عمل کیا جائے، مگر نابالغوں کے حصہ میں سے کچھ نہ لیا جائے، واللہ اعلم، ۲ رجادی الثانیہ ۱۴۲۸ھ

نعم الجواب المرشد الی الصواب، اشرف علی ۵ رجادی الثانیہ ۱۴۲۸ھ
غیر نبی پر درود کا حکم | سوال (۴) یہاں چند آدمی اپنے پیر کے اور دادا پیر کے اوپر بالائے استقلال درود شریف پڑھتے ہیں، اس قسم کے لوگوں کا شریعت کی رو سے کیا حکم ہے، وہ لوگ کافر ہیں یا نہیں؟ بادل دلیل و حوالہ کتب جواب فرماویں؟
الجواب: سخت مبتدع ہیں، اگر وہ استرار کریں کہ ہم پیر یا دادا پیر کو نبی سمجھتے ہیں تو پھر یہ لوگ کافر ہیں،

قبر اور جنازے پر تخفیف مذاب | سوال (۵) قبروں اور جنازوں پر پھول کی چادر ڈالنا از رو کے لئے پھول ڈالنے کا حکم، شرع جائز ہے یا نہیں، پھولوں کی تسبیح سے میت کو ثواب ملنے کا عقیدہ رکھنا صحیح ہو یا نہیں، رسول اللہ صلعم سے قبر پر کھجور کی ڈالی رکھنا جو ثابت ہے اس پر قبر اور جنازہ پر پھول ڈالنا کو قیاس کرتے ہوئے اس کو مستحب و سنت قرار دینا اور تمام فقہاء قبر اور جنازہ پر پھول ڈالنے کے مستحب و مستحسن ہیں کہنا اور اس پر فتویٰ دینا صحیح ہے یا نہیں، اور جس شہر میں اس کی عادت نہ ہو وہاں اس کو جاری کرانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جنازہ پر پھولوں کی چادر ڈالنا قرونِ ثلثہ میں کہیں ثابت نہیں، یہ صریح بدعت ہے، اور تشبہ بالہنود کی وجہ سے بھی حرام ہے، اور قبر پر پھول ڈالنا بھی صحابہ و تابعین کے زمانہ میں ثابت نہیں، ہاں حدیث سے صرف اتنا ثابت ہے کہ حضورؐ نے دو شخصوں کی قبروں پر کھجور کی ایک شاخ کو دو حصہ کر لے ایک اس پر ایک اُس پر لگا دی تھی اور یہ فرمایا کہ امید ہے کہ جب تک یہ شاخیں نہ سوکھیں اس وقت تک ان دونوں سے عذاب خفیف ہو جائے، اب اس میں علمائے امت کا اختلاف ہے کہ یہ امر حضورؐ کے ساتھ مخصوص

تھا اور یہ حضور کے دست مبارک کی برکت تھی یا اب بھی حضور کے اس فعل پر قیاس کر کے شاخ
تر لگائی جائے تو عذاب میں تخفیف ہوگی، بعض مالکیہ قول اول کی طرف گئے ہیں، اور ایک جماعت
شافعیہ قول ثانی کی طرف گئی ہے، (شامی ۴/۱۱۶ ج ۱) وفی المرقاة قال النووی اما وضعہما
على القبر فقل انه عليه الصلوة والسلام سأل الشفاعة لهما فاجيب بالتخفيف
ما لم یسیسا وقد ذکر مسلم فی انحرالکتاب فی حدیث جابر ان صاحبی القبرین
اجیبت شفاعتی فیہما وقیل انه کان یدعولہما فی ہذہ المدة وقیل لانہما یستحیان
ماداما رطبین قال کثیر من المفسرین فی قوله تعالى وان من شیء الا یسبح بحمدہ
معناه ان من شیء حی ثم قال وحیاء کل شیء بحسبہ فحیاء الغشب ما لم یسبح
والحجر ما لم یقطع الی ان قال وقد ذکر البخاری ان بریدۃ بن الحصیب الصحابی
اوصی ان یجعل فی قبرہ جریڈ تان فکانہ تبرک بفعل مثل رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم وقد انکر الخطابی ما یفعلہ الناس علی القبور من وضع الاخواص قال
لا اصل له الی ان قال واما انکار الخطابی وقوله لا اصل له ففيه بحث واضح
اذہذا الحدیث یصلح ان یکون اصلا له ثم رأیت ابن حجر صرح بہ وقال
قوله لا اصل له ممنوع بل ہذا الحدیث اصل اصیل له ومن ثم افتی بعض
الائمة من متاخری اصحابنا ان ما اعتید من وضع الریحان والجریڈ سنتہ
لہذا الحدیث ام ولعل وجہ کلام الخطابی ان ہذا واقعۃ حال خاص لا
یفید العموم ولہذا اوجہ لہ التوجیہات السابقہ فتدبر فانہ محل نظراہ
(ص ۲۸۶ ج ۱)

ان عبارات سے امور ذیل مستفاد ہوتے:

(۱) قبر پر پھول ڈالنے کا استحباب واستحسان متفق علیہ نہیں، بلکہ بعض اکابر علماء نے
اس سے منع فرمایا ہے (۲) قبر پر پھول یا شاخ لگانے سے یقیناً تخفیف عذاب کا اعتقاد
درست نہیں بلکہ محض امید کا درجہ ہے (۳) علماء حنفیہ کے اقوال اس مسئلہ میں متردد ہیں
کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل آپ کے ساتھ مخصوص تھا یا دوسرے کے فعل سے بھی تخفیف
عذاب کی امید ہے، پس جو شخص قبر پر پھول ڈالنے کو بالاتفاق مستحب و مستحسن کہے وہ کاذب ہے
رہا یہ کہ ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں تو چونکہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ قبر پر شاخ یا پھول ڈالنے

سے تخفیف عذاب کا اعتقاد بالجرم کرنا جائز نہیں تو جہاں اس فعل میں عوام کا یہ اعتقاد جازم ہو گا وہاں اس سے منع کیا جائے گا اور سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ موقعہ سوال میں عوام کی حالت یہی ہے اس لئے ان کے لئے یہ فعل جائز نہیں واللہ اعلم،

صفحہ ۲۵

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ تھانہ بھون ۱۸ صفر

اس کے علاوہ یہ علت تو مشترک ہے، پھول اور شاخ اور برگ سب میں بلکہ تر لکڑی زیادہ دیر تک تر رہے گی، بمقابلہ پھول کے اس سے معلوم ہوا کہ تسبیح کا محض بہانہ ہے، اصل مقصود تزیین اور اعتقاد تقرب الی المیت ہے، جو یقیناً بدعت و معصیت ہے، نیز اگر اس حکمت کی نیت ہوتی تو جن بزرگوں میں عوام کو عذاب کا احتمال بھی نہیں، ان کے قبور پر پھول چڑھانے کا اہتمام عصاة و فساق کی قبور سے زیادہ نہ ہوتا، اس سے بھی پتہ چلتا ہے، اسی نیت تزیین و اعتقاد تقرب کا، اور جن کتب فقہیہ میں ورد و ریحان کے ڈالنے کی اجازت دی ہے وہ مشروط ہے خلوعن المفاسد کے ساتھ اور اوپر اس خلو کا انتفاع محقق ہو چکا، اشرف علی

تغزیہ سازی اور اس پر نذر سوال (۶).....

وہمت ماننے کا حکم، بچے نصب کرنا اور اس سے نذر و نیاز کرنا دست بستہ سامنے کھڑے ہو کر فاتحہ دلانا اور اس کو تبرک سمجھ کر کھانا اور پنچوں پر عرضیاں چڑھانا، اور پنچوں کے سامنے از دیا و عمر کے لئے بچہ کو ڈالنا اور منت مراد ماننا اور مراد برآنے پر کچھ نذر دینا اور لبوں کا نام علم نصب کر کے نذر و نیاز کرنا اور وہاں جشن کرنا یہ تمام افعال از روئے شرع حرام ہیں یا شرک؟

الجواب؛ یہ جملہ افعال شرکیہ ہیں ان سے احتراز لازم اور توبہ کرنا واجب ہے لیکن اگر یہ لوگ موثر حق تعالیٰ کو مانتے ہیں اور ان اشیاء کو یا جن سے یہ اشیاء نامزد ہیں موثر نہیں مانتے، محض برکت کی چیزیں مانتے ہیں تو گو یہ اعتقاد بھی گناہ عظیم ہے، مگر اس صورت میں یہ لوگ ایمان سے خارج نہیں ہوتے، اور اگر یہ لوگ ان اشیاء کو یا اصحاب اشیاء کو ایسا تو مانتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے ان کے ہاتھ میں اختیارات دیدیتے ہیں تو اس صورت میں یہ لوگ ایمان سے بھی باہر ہو جائیں گے، تجدید ایمان و نکاح لازم ہوگا،

از تھانہ بھون خالقاہ امدادیہ ۱۸ صفر ۲۵

سوال (۷) مولود شریف کے واسطے مسجد میں (قبرستان کی مسجد ہی) مجلس مولود مسجد میں منعقد کرنا، بیٹھ کر گیس کی بتی جلانا اسپرٹ کی مدد سے اور مسجد کے اندر اور باہر کاغذ

کی رنگ برنگ کی جھنڈی لگانا اور وہ جھنڈی اب تک مسجد میں اور باہر لگی ہوئی ہیں، اور مسجد بنی بہوالی (نام موضع) سے ایک میل کے فاصلہ پر ہے، قبرستان میں نماز جمعہ کی ہوتی ہے، اس کے لئے کیا حکم ہے، تکلیف گوارا فرما کر خاکسار کو جواب سے سرفراز فرمائیں، زیادہ حدادب، الجواب؛ اول تو مولود شریف کے لئے خاص مجلس منعقد کرنا ہی بدعت ہے، پھر مسجد میں گیس کی روشنی کرنا اور جھنڈیاں لگانا یہ دوسرا گناہ ہے، کیونکہ گیس میں بدبو سخت ہوتی ہے، جس سے مسجد کا پاک رکھنا لازم ہے، اور جھنڈیاں لگانا ہول و لعب میں داخل ہے، اس سے بھی مسجد کو بچانا لازم ہے، اور قبرستان اگر قباہ مصر میں داخل ہو گاؤں کے متعلق نہ ہو تو اس کی مسجد میں نماز جمعہ درست ہے، اور اگر نمازیوں کے سامنے قبریں ہوں تو کراہت ہوگی، فقط از تھانہ بھون، خالقاہ اشرفیہ، ۶، ربيع الثاني ۱۴۲۵ھ

سوال (۸) ہمارے گاؤں کے ساتھ ہی قبرستان ہے، قریباً پچیس قبروں کے گرد چار دیواری بنانا کیسا ہے؟

تیس ہزار قبریں ہوں گی، اور دریا قریباً ایک میل ہے، دو تین سال سے گرمی کے دنوں میں جب پانی چڑھتا ہے تو قبرستان میں آجاتا ہے، گزشتہ سال دریا کا پانی اتنا آیا کہ آدھا قبرستان تو بالکل صاف ہو گیا ہے، یعنی نشان تک نہیں رہا جیسے قبرستان تھا ہی نہیں، ہمارے عزیزوں کی قبریں قبرستان کے بچوں میں تھیں، دو تین قبریں منہدم ہو گئی تھیں، مگر پانی اترنے کے بعد پھر از سر نو بنوائی گئیں، اب خیال ہوا ہے کہ اپنے عزیزوں کی قبروں کی چار دیواری بنائی جائے تاکہ پانی وغیرہ سے محفوظ رہیں اور منہدم نہ ہو جائیں، اگر شرعاً ممانعت نہ ہو تو کام شروع کر دیا جائے،

الجواب؛ اخراج ابوداؤد فی سننہ ومسلم وغیرہ مرفوعاً عنہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن تجصیل القبور وعن البناء علیہا وان یکتب علیہا قال الطحاوی فی حاشیئہ علی المراقی عن المعیط ان احتیج الی لکتابۃ حق لا ینذهب الا ثر ولا یمتھن بہ جائز فاما الکتابۃ من غیر عذر فلا الخ، وفی المراقی اذا خربت القبور فلا بأس بتطیینہ وعن انس مرفوعاً الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم انه قال خفق الرياح وقطر الا مطار علی قبر المؤمن کفارة لذنوبہ

الح (ص ۳۵) صورت مسئلہ میں چار دیواری بنا دینا جائز ہے، لان الحائط حول الارض ليس من البناء علی القبر کما لا یجفی، لیکن بہتر یہ ہے کہ قبروں کو اسی حال میں رہنے دیا جائے، قبر تو مٹنے ہی کے واسطے ہے، آخر ان کا نشان کب تک باقی رکھا جائے گا، فقط واللہ اعلم،

از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون ۱۹ ج ۲ ص ۲۵

سوال (۹) اکثر لوگ عید کی نماز کے بعد مصافحہ کرنے پر مصر ہوتے ہیں مسافحہ بدعت ہی
یہی لوگ اگر یوم عید کے پہلے یا عید روز مصافحہ کر لینے کو بعد چٹی کہ عید کی نماز کے پہلے اگر ملتے

ہیں تو مصافحہ کے لئے رجوع بھی نہیں ہوتے اور عید کے مصافحہ کرنے کو بہت ضروری سمجھتے ہیں تارکین کو برا بھلا کہتے ہیں، ایسے لوگوں سے اگر عید کے روز اول ملاقات ہو اور وہ اپنے اسی عقیدے سے مصافحہ کرنا چاہیں تو احقر ان سے مصافحہ کر لے یا نرمی سے یوں کہہ دے کہ بھائی آج کے روز ہم مصافحہ نہیں کرتے،

الجواب: عیدین کی نماز کے بعد مصافحہ کا جو رواج ہے یہ بدعت ہی، دوسکرا دقات کی طرح اگر کسی شخص سے اس وقت نئی ملاقات ہو تو مصافحہ کر لے ورنہ نہیں، فی رد المحتار ونقل فی تبیین المحارم عن الملتقط انه تکرہ المصافحة بعد اداء الصلوة بكل حال لان الصحابة ما صافحوا بعد اداء الصلوة ولا نهما من سنن الروافض،

احقر عبد الکریم گتھلوی عفی عنہ مجموعۃ الفتاویٰ، ص ۱۸۱ ج ۱

الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ ۵ ذی الحجہ ۱۳۳۳ھ

سوال (۱۰) حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مبارک دونوں ہاتھوں
انگوٹھے چومنا بدعت ہی
کے انگوٹھے کے ساتھ منہ سے بوسہ لے کر دونوں آنکھوں پر لگانے

ہیں یہ جائز ہے یا نہیں، اگر ناجائز ہے تو کیسا گناہ ہے، اور کس کتاب میں ہے؟

الجواب: آنحضرت کا نام مبارک سکر انگوٹھے چومنا بدعت ہے، کیونکر اکثر لوگ اس کو ثواب سمجھتے ہیں، اور وہ موقوف ہے روایت پر، اور روایت اس بارے میں کوئی ثابت نہیں کما قال البخاری فی المقاصد الحسنۃ ولا یصح فی المرفوع من کل ہذا شی اور فضائل اعمال میں ضعیف حدیث قبول ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اس میں ثواب سمجھے بغیر عمل کر لے، بشرطیکہ ضعف شدید نہ ہو اور وہ عمل کسی اصل شرعی کے تحت میں داخل ہو، کما صرح بہ فی الدر المختار (شامی ص ۱۳۲ ج ۱) فائدہ، شرط العمل بالحديث الضعیف عدم مشدّد ضعفه

وان یدخل تحت اصل عام وان لا یعتقد سنیۃ ذلك الحدیث وقال الشامی ای سنیۃ العمل به اور آجکل لوگ ثواب سمجھنے کے علاوہ تارک پر ملامت کرتے ہیں، اس لئے اس فعل سے روکا جاوے گا، واللہ اعلم بالصواب، وما یرائی فی بعض کتب الفقہۃ من التحریض علی فعلہ فمبني علی ظنہم ان ضعفہ یسر وما ذکر عن بعض المشائخ فعلی طریق الرقیۃ من رد العین فقط کتبه الاحقر عبدالکریم عفی عنہ،

الجواب صحیح ظفر احمد عفا اللہ عنہ، ۲۸ جمادی الاول ۱۳۲۲ھ

سوال (۱۱) جس گھر کا آدمی خواہ مرد ہو خواہ عورت فوت ہو جائے تک نہیں کھانا چلہتے، تو اس گھر کی روٹی پانی کتنے عرصہ تک نہ کھانا چاہئے، اور کس قدر

مانعت ہے؟

جواب؛ کچھ مانعت نہیں ہے، جب کہ کوئی رسم نہ کی جاوے اور ترکہ تقسیم کرنے کے بعد بالغ وارث فقراء کو کھلاوے، اور اگر ترکہ مشترک سے کہ جس میں کوئی نابالغ یا غائب شریک ہے کیا جائے تو ناجائز ہے، اسی طرح اگر شرکار موجود اور بالغ تو ہیں لیکن ان میں سے بعض نے اجازت دی نہیں یا رواجاً اجازت دیدی ہے تب بھی جائز نہیں، ایسا ہی فقراء کے علاوہ برادری کی دعوت ہر حال میں کرنا مکروہ ہی، اور بدعت سیئہ ہے، نیز ختم کے لئے اجتماع کرنا اور دعوت کرنا بھی جائز نہیں، پس آجکل جو طریقہ ایصال ثواب کا مروج ہے وہ جائز نہیں، قال الشامی، ص ۹۴۱ ج ۱ وقال (ای فی الفتح) ایضا ویکرہ اتخاذ الضیاء من الطعام من اهل البیت لانه مشروع فی الشرک لا فی الشرور وہی بدعة مستقبحة روى الامام احمد وابن ماجه بسند صحيح عن جریر بن عبد اللہ قال کتافد الاجتماع الی اهل البیت وصنعهم الطعام من النیاحۃ ام و فی البرازیۃ ویکرہ اتخاذ الطعام فی الیوم الاول والثالث وبعد الاسبوع ونقل الطعام الی القبر فی المواسم واتخاذ الدعوة لقراءة القرآن وجمع الصلحاء والقراء للختم او لقراءة سورة الانعام وسورة الاخلاص والحاصل ان اتخاذ الطعام عند قراءة القرآن لاجل الاکل یکرہ وفیہا من کتاب الاستحسان ان اتخذ طعاماً للفقراء کان حسناً واطال فی ذلك فی المعراج وقال وهنہ الافعال کلها للسمعة والریاء فیحترز عنها لانہم لا یریدون بذلک لوجه الله

تعالیٰ اہم وبحث ہنایں شرح المنیۃ بمعارضۃ حدیث جریر الماری بحديث اخر
 فیہ ائہ علیہ الصلوۃ والسلام دعتہ امراۃ رجل میت لما رجع من دفنہ فجاء
 وجع بالطعام اقول وفيہ نظر فانہ واقعة حال لا عموم لہا مع احتمال سبب خاص
 بخلاف ما فی حدیث جریر علی ائہ بحث فی المنقول فی مذہبنا ومذہب غیرنا
 کالشافعیۃ والحنابلۃ استدلالاً بحدیث جریر المذكور علی الکراہۃ لاسیما اذا
 کان فی الورثۃ صغاراً وغائب مع قطع النظر عما یحصل عند ذلک غالباً من المنکر
 الکثیرۃ کالقیاد الشموع والقنادیل التي لا توجد فی الافراح وکدق الطبول القنا
 بالاصوات الحسان واجتماع النساء والمردان واخذ الاجرة علی الذکر وخرارة
 القرآن وغیر ذلک مما هو مشاہد فی ہذہ الامان وما کان کذلک فلا شک فی
 حرمتہ ولطلان الوصیۃ بہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم،

عبدالکریم عفی عنہ خانقاہ امدادیہ سحانہ بھون، ۲۹، جمادی الثانی ۱۲۸۴ھ

طعام میت کے متعلق سوال (۱۲) ہمارے دیار میں

ایک سوال کا جواب لوگ مرنے کے بعد بعض جگہ تعین تاریخ کے ساتھ اور بعض جگہ بلا تعین

ایک ضیافت کر کے عام لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں، ہر طرح کے آدمی اس میں حاضر رہتے ہیں

کیا یہ شرعاً جائز اور باعث ثواب ہے یا مکروہ؟ بر تقدیر ثانی درجہ کراہت کیلئے، کتب فقہ

اور حدیث مع حوالہ صفحہ تحریر فرمادیں، کوئی عالم فرماتے ہیں کہ اگر عام طور پر لوگوں کو کھانا کھلا کر

ہو تو حنفی مذہب کی معتبر کتابوں میں اگر وہ مسئلہ مع ماہا وعلیہا موجود ہو تو ہم ضرور تسلیم کریں گے

ردالمحتار کی عبارت نقلاً عن الشيخ وبکیرۃ اتخاذ الضیافۃ من الطعام من اهل المیت لائہ

شرح فی السرور لا فی الشرور وہی بدعتہ مستقبحة روى الامام احمد وابن ماجہ

باسناد صحیح عن جریر بن عبد اللہ قال کنا نعد الاجتماع الی اهل المیت وصنعهم

الطعام من النیاحۃ وفی البزازیۃ وبکیرۃ اتخاذ الطعام فی الیوم الاول والثالث و

بعد الاسبوع، جس کو امداد الفتاویٰ (ص ۵۵ ج ۲) میں نقل کیلئے وفی ردالمحتار

(ص ۵۳۹) ومنها الوصیۃ من المیت باتخاذ الطعام والضیافۃ یوم موتہ او بعدہ

او باعطاء دراهم لمن یتلوا القرآن لروحہ او یصل کلہا بدم منکر باطلۃ

والماخوذ منها حرام للاکل وهو عاص بالتلاوة والذکر لاجل الدنیا،

عہ دعادت نمود کہ برائے میت در غیر نماز جائزہ صح شون وقرآن خوانند و ختمات خوانند بر سر گوردنہ غیر آن دایں مجوز

۱۲۰۰ ہجری ۱۲۰۰ ہجری ۱۲۰۰ ہجری ۱۲۰۰ ہجری ۱۲۰۰ ہجری ۱۲۰۰ ہجری ۱۲۰۰ ہجری ۱۲۰۰ ہجری ۱۲۰۰ ہجری ۱۲۰۰ ہجری

مسئلہ ہذا کے اثبات کے لئے کافی دانی ہے یا نہیں، بر تقدیر اول چند اہل شرعیہ اور اضافہ کر کے مع حوالہ صورت مسئلہ کو بالوضاحت تحریر فرما دیں، اور حدیث جریر کے متعلق سبط کے ساتھ تحریر فرما دیں کہ اس کا محل صحیح اور مفہوم واقعی کیا ہے، تاکہ رفع اشتباہ ہو جائے، نیز بتلایئے کہ کیا طعام المیت میت القلب حدیث صحیح ہے؟ جبکہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مدظلہم العالی کی ”براہین قاطعہ“ سے جس کو حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ملاحظہ فرمایا ہے معلوم ہوتا ہے، اگر یہی بات ہو تو حکیم الامت حضرت مولانا دامت برکاتہم نے ”امداد الفتاویٰ“ میں جو طعام المیت میت القلب کے متعلق تحریر فرمائے ہیں خدا جلے کہ کس کا قول صحیح ہے، اس کے معنی کیا ہوں گے، دونوں قولوں میں تطبیق بیان کر کے ممنون فرما دیں، نیز تحریر فرما دیں کہ علماء و فضلاء کو ایسی ضیافت میں شریک ہو کر کھانا کیسلا ہے، اور ان کی شرکت میں کیا خرابی ہے، اگر حنفی مذہب کی چند معتبر کتابوں کے حوالہ سے یہ مسئلہ حل ہو جائے تو بہت اچھا ہے، بہت لوگ ہدایت یاب ہوں گے،

الجواب اللہ الموفق للصواب

قال في غنية المستملی ص ۵۶۵ ويكره اتخاذ الضيافة من اهل الميت
لانه شرع في السرور والافراح والفرح والسرور في الحزن قالوا وهي بدعة مستقبحة لما روى الامام
احمد وابن ماجه باسناد صحيح عن جرير بن عبد الله قالوا كنا نعد الاجتماع
الى اهل الميت وصنعهم الطعام من النياحة ويستحب لجيران الميت واقرباءه
الا باعد تهيئة طعام لهم لقوله عليه السلام اصنعوا الال جعفر طعاما فقد جاءهم
ما يشغلهم حنه الترمذي وصححه الحاكم ولانه بر معروف وليستحب ان يلح
عليهم في الاكل لان الحزن يمنعهم من ذلك فيضعفون ذكره كله ابن الميمون
وفي فتاوى البزازية ويكره اتخاذ الطعام في اليوم الاول والثالث وبعد الاسبوع
ونقل الطعام الى القبر في المواسم واتخاذ الدعوة بقراءة القرآن جمع الصلحاء للتمتع
اول لقراءة سورة الانعام او الاخلاص، والحاصل ان اتخاذ الطعام عند قراءة القرآن
للاكل يكره، وفيها في كتاب الاستحسان وان اتخذ طعاما للفقراء عكس حشاً انفق
ولا يخلو عن نظر لانه لا دليل على الكراهة الا حديث جرير بن عبد الله المتقدم

وانما يدل على كراهة وذلك عند الموت فقط على انه قد عارضه ما رواه الحاكم
واحمد بسند صحيح وابوداؤد عن عاصم بن كليب عن ابيه عن رجل من الانصاف
قال خرجنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم في جنازة فرأيت رسول الله صلى
الله عليه وسلم يوصي الحافر يقول اوسع من قبل راسه اوسع من رجله فلما
رجع استقبله داعي امرأته فجاء وجيء بالطعام فوضع بين يديه ووضع ربين
يدي القوم فاكلوا ورسول الله صلى الله عليه وسلم يلوك لقمة في فيه ثم
قال اني اجد لحم شاة اخذت بغير اذن اهلها فارسلت المرأة تقول يا رسول الله
اني ارسلت الى البقيع اشتري شاة فلم اجد فارسلت الى جارلي قد اشتري شاة
ان يرسل الي بثمانها فلم يوجد فارسلت الى امرأته فارسلت بها الي فقال عليه
السلام اطعميه الاسارى ام قال الشامي وبحث هنا شارح المنية فذكر مخلصا
الى ان قال اقول فيه نظر فانه واقعة خال لا عموم لها مع احتمال سبب خاص
بخلاف ما في حديث جرير على انه بحث في المنقول في من هبنا ومن هب غيرنا
كالشافعية والحنابلة استدلالا ببحث جرير المنكور على الكراهة ولا سيما اذا
كان في الورثة صفار او غائب مع قطع النظر عما يحصل عند ذلك غالبا من المنكرات
الكثيرة كايقاد الشموع والقناديل التي لا توجد ... في الافراح وكذا الطبول و
الغناء بالاصوات العسسان واجتماع النساء والمردان واخذ الاجرة على الذكر و
قراءة القرآن وغير ذلك مما هو مشاهد في هذه الاماكن وما كان كذلك فلا شك
في حرمة ولبطلان الوصية به والاحول ولا قوة الا بالله العلي العظيم ^{۹۳۱ و ۹۳۲} ص ۱۱۳
ان عبارات سے امور ذیل مستفاد ہوئے :-

۱۔ مذہب حنفیہ میں کسی کے مرنے کے بعد اولیاء میت کا یوم موت یا سوئم اور ہفتہ و
عشرہ وغیرہ میں کھانا پکانا اور عام لوگوں کو کھلانا مکروہ ہے (اور اطلاق کی وجہ سے کراہت
تحریمیہ مراد ہے، نیز علت کا مقتضی بھی یہی ہے، لان علت حدیث جریر و عدہ ذلک فیہ من
السیاحۃ وہی حرام ۱۱۲)

۲۔ شامی کے قول سے معلوم ہوا کہ مذہب شافعیہ و حنابلہ میں بھی اس کی کراہت مصرح ہی

۳۔ دلیل کراہت حدیث جریر بن عبد اللہ ہے جس میں اس ضیافت کو نیاحت میں داخل کیا

ہی اور وہ حدیث صحیح ہے،

۴۔ شارح منیہ نے جو اس دلیل کو بہت کو یوم الموت کے ساتھ خاص کیا ہے، اور دوسری حدیث سے اس کا معارضہ کیا ہے یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ وہ حدیث قوی نہیں ہے بلکہ فعلی ہو جو واقعہ خاص ہونے کی وجہ سے وجہ مختلفہ کو محتمل ہے، اور حدیث جریر قوی ہے جو حکماً مرفوع ہے پس وہ مقدم ہے، اور حدیث جریر سے مذہب حنفیہ شافعیہ، حنابلہ میں استدلال کر کے اس ضیافت کو مکروہ کہا گیا ہے، پس ان اجلہ ائمہ کے سامنے شارح منیہ کی بحث قبول نہیں ہو سکتی طعام المیت میت القلب کا حدیث ہونا ہمیں ثابت نہیں ہوا، اور برائین قاطعہ میں بھی اس کی بحث نہیں ملی، صفحہ و بحث کا حوالہ لکھیں تو دیکھا جاوے، میرے نزدیک اس وقت تک حضرت حکیم الامت کا قول رائج ہے ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امر اللہ اعلم

۲۴ رجب ۱۲۵۵ھ از تھانہ بھون

فاتحہ خوانی کا مسنون طریقہ | سوال (۱۳) ۱۔ فاتحہ جو قبر پر پڑھی جاتی ہے اس کا مسنون طریقہ کیسا ہے؟ (۲) نیز فاتحہ قبر پر جا کر ضروری ہے، گھر پر اگر پڑھ دی جائے تو ثواب پہنچ جاوے گا یا نہیں؟

الجواب: فاتحہ جو قبر پر پڑھی جاتی ہے اس کا قاعدہ مسنونہ یہ ہے کہ قبرستان میں جا کر اول تو التَّسْلَامُ عَلَیْکُمْ یَا أَهْلَ الدِّیَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَ الْمُسْلِمَاتِ اُنْمِمْ لَنَا سَلَفٌ وَ نَحْنُ بِالْآثِرِ یَغْفِرُ اللّٰهُ لَنَا وَ لَکُمْ اَجْمَعِیْنَ کہے، یہ تو سب مردوں کو سلام اور دعا ہوئی، اس کے بعد سورہ تکوین ایک بار، سورہ قل ہو اللہ احد گیارہ بار اور بہت زیادہ ہو تو سورہ یسین بھی ایک بار پڑھ لے، پھر حق تعالیٰ سے دعا کرے کہ اس تلاوت کا ثواب فلاں فلاں کو اور جتنے یہاں مسلمان مدفون ہیں سب کو پہنچا دیا جائے، ۲۔ قرآن گھر پر بھی پڑھ کر بخش دیں تو ثواب پہنچ جائے گا، اگر صرف ثواب پہنچانے کا ارادہ ہو تو اس کے لئے قبر پر جانے کی ضرورت نہیں، ہاں اگر ثواب پہنچانے کے ساتھ میت کی تائیس و دلداری بھی مقصود ہو تو قبر پر جانے اور وہاں جا کر قرآن پڑھنے سے میت کو انس و مسرت زیادہ ہوتی ہے،

طرد نوم کے لئے درود شریف | سوال (۱۴) دیار بنگالہ کے اکثر علماء واعظین میں یہ دستور پڑھنا پڑھوانا بدعت ہے | یہ کہ بروقت شروع وعظ آیت کریمہ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰئِکَتَهُ یُحْسِنُوْنَ عَلَی النَّبِیِّ الْخَ تٰکِیْدًا ہر وعظ میں تلاوت کرتے ہیں، پھر سامعین باواز بلند بیک صورت یہ درود شریف صلی اللہ علی سیدنا الخ یا نبی سلام علیک یا رسول سلام علیک الخ پڑھتے ہیں اور بعد صلوٰۃ جمعہ اور تراویح بھی سب لوگ باواز بلند بیک صورت درود پڑھنے کا دستور ہے یہ کیسا ہے؟ پھر دس پندرہ منٹ تک وعظ بیان ہوتا ہے، پھر واعظ صاحب درود شریف کے دو ایک الفاظ شروع کرتا ہے، سامعین بطریق مذکور تین چار منٹ تک درود شریف بزور پڑھنے لگتے ہیں، پھر اس ہیئت کذانیہ پر وعظ ختم ہوتا ہے، اور اس ہیئت کذانیہ درود دبا بھر کا سبب چونکہ اکثر وعظرات کو ہوتا ہے، طرد النوم و گرمی ہنگامہ بتاتے ہیں، اور کوئی تو شہادت کل ماسمع کے حدیث من صلی صلوٰۃ و جہر بہا شہدہ کل حجر و مدر و رطب و یا پس اور کتاب مورد اذکار نووی کے دلائل پیش کرتے ہیں، آیا یہ طریقہ صحابہ و تابعین و سلف صالحین و ائمہ مجتہدین سے ثابت ہی یا نہیں، بر تقدیر ثانی واعظ کا یہ طرز جدید جائز یا بدعت سیئہ قابل ترک اور حدیث بالا وحوالہ مذکورہ و اغراض مسطورہ کے استدلال کیسا ہے؟

الجواب؛ یہ صورت بدعت سیئہ ہے، کیونکہ درود شریف کو ایک غرض دنیوی کا آلہ بنایا گیا ہے اور ذکر اللہ کو غرض دنیوی کا آلہ بنانا جائز نہیں، کما قالت الفقہار لایجوز للمحارس النداء بلا الہ الا اللہ و نحوہ، اور نمازوں کے بعد بھی فقہاء نے جہر بالذکر کو بدعت فرمایا ہے الا ماوردیہ الجہر کتکبیر التشریق و سبحان الملک القدوس۔ بعد اوتر

۶ سوال ۱۳۲۶ از تھانہ بھون

سوال (۱۵) نماز جنازہ پڑھنے کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا مکروہ دعا بدعت ہے | ہے یا نہیں؟

الجواب؛ قال فی حاشیۃ مالآبدمنہ و بعد سلام برائے دعا را استاد ہم نشانی بلکہ در محل جنازہ مشغول شوند کذا فی الدر المختار و زاد اللیب ام (ص ۸۲) قلت لم اجد فی الدر و الشامیۃ فلعلہ فی زاد اللیب و الاصل فیہ ان الصلوٰۃ علی الجنازۃ وضعت للدعاء فلا معنی للدعاء بعد الدعاء فلا یصح القیاس علی الصلوٰۃ

المکتوبۃ وایضا فذلک لم یقل عن السلف، پس نماز جنازہ سے فارغ ہو کر دعا کرنا بھی بدعت ہے اور رفع یدین دعا کے ساتھ ہی ہے تو وہ بھی قابل ترک ہے، واللہ اعلم
۱۵، ۱۶ شوال ۱۳۸۵ھ

دلیل کراہیت مصافحہ عقیب الصلوٰۃ | سوال (۱۶) محرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مولانا کراہتہ المصافحہ عقیب الصلوٰۃ کا حوالہ شامی سے دیا ہے، مگر موقع کا ذکر نہیں فرمایا ہے، اس لئے گزارش ہے کہ آپ شامی کا باب مع قید صفحہ ایسا لکھ دیجئے کہ ہر طبع کی کتاب میں مل سکے؟

الجواب؛ قال الشامی فی الحظر والاباحۃ فی باب الاستبراء وغیرہ من المجلد الخامس بعد ذکر اقوال من جواز المصافحۃ عقیب الصلوٰۃ ما نصہ ونقل فی تبیین المحارم عن الملقط انه تکرہ المصافحۃ بعد اداء الصلوٰۃ بكل حال لان الصحابة رضی اللہ عنہم ما صافحوا بعد اداء الصلوٰۃ ولا نہا من سنن لروای فضل ثم نقل عن ابن حجر من الشافعیۃ انها بدعة مکروہۃ لا اصل لها فی الشرع وانه ینتہ فاعلمها اولاً وبعز ثانیاً ثم قال وقال ابن العیاض من المالکیۃ فی المدخل انہما من البدع وموضع المصافحۃ فی الشرع انما هو عند لقاء المسلم لاخیه لا فی اذیبار الصلوٰۃ فحیث وضعها الشرع یضعها فینہی عن ذلک وینز فاعلم لما اتی بہ من خلاف السنۃ ام ر ص ۳۷۶ ج ۵ واللہ اعلم

یکم ذی الحجۃ ۱۳۸۵ھ

تہنیز و تکفین سے قبل گٹھلیوں پر | سوال (۱۷) بعض جگہ بغرض ایصالِ ثواب میت کی تہنیز و کلمہ طیبہ پڑھوانا اور ختم قرآن پاک تکفین سے قبل گٹھلیوں پر ایک لاکھ مرتبہ کلمہ طیبہ پڑھوانے کا اہتمام کر دانا کیسا ہے؟ | ہیں، اور اس کی تکمیل کے واسطے دوسرے شخصوں کے واسطے بلائے بھی جاتے ہیں، ان میں بعض لوگ خود بھی میت یا اس کے احباب کے تعلق سے آجاتے ہیں اور کلمہ پڑھتے ہیں، نیز ختم کلام مجید کا بھی بغرض ثواب اسی طریقہ سے اہتمام کیا جاتا ہے شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ فقط

الجواب؛ حضرات صحابہ و تابعین کے زمانہ میں یہ دستور نہ تھا، لیکن فی نفسہ یہ دستور جائز ہے، لکن المقصود ایصال الثواب الی المیت ولہ اصل فی الشرع، لیکن چونکہ اس

رواج کا یہ اثر ہو گیا ہے کہ جو شخص تعزیت کے لئے آئے وہ اسی وقت آ سکتا ہے جب کہ اس کو کلمہ خوانی اور قرآن خوانی کی بھی فرصت ہو، اور جس کو اس کی فرصت نہیں ہوتی وہ تعزیت واتباع جنازہ کو بھی نہیں آتا، حالانکہ تعزیت واتباع جنازہ سنت ہے، کافی الحدیث الصیح عن البراء امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باتباع الجنائز قال ابن قدامۃ زادناہ الصلوۃ علی المیت والیضاروی ابن ماجہ عن عبد اللہ بن ابی بکر بن عمرو بن حزم عن ابیہ عن جدہ مرفوعاً من مؤمن یعزی اخاً بمعصیۃ اللہ عزوجل من حلل الکرامۃ یوم القیامۃ اھ ولم یزل القعۃ متداولۃ بین الامة من خیر القرون الی وقتنا هذا،

پس جو امر مندوب یا مباح ترک سنت کی طرف مفصی ہو وہ خود قابل ترک ہی، علاوہ ازیں جو لوگ کلمہ خوانی و قرآن خوانی میں شریک ہوتے ہیں سب دلچسپی سے شریک نہیں ہوتے، بلکہ بعض گرائی کے ساتھ شریک ہوتے ہیں، اور یہ بھی امر منکر ہے، پھر جو شریک نہ ہو اس پر طعن ہوتا ہے، اور ترک مباح و مندوب پر طعن حرام ہے، ان وجوہ سے یہ دستور قابل ترک ہے، البتہ جہاں ان مفسد کا ارتقاع مظنون اور لوگوں کا اشتیاق محسوس ہو وہاں مضائقہ نہیں، بشرطیکہ اس کو رواج نہ دیا جاوے، بلکہ گاہے کر دیا اور گاہے ترک کر دیا۔
ظفر احمد عفا عنہ از تھانہ بھون ۵ رجب ۱۴۲۸ھ
تمام بدعات اسی طرح جاری ہو گئی ہیں، لہذا یہ رسم واجب ترک ہے، جس کو پڑھنا ہو بطور خود پڑھے، حج ہو کر پڑھنا یقیناً ذریعہ مفسد ہے، واللہ اعلم
اشرف علی ۵ رجب ۱۴۲۸ھ

سوال (۱۸) مؤمنے مبارک نبوی کی زیارت کا مشروع طریقہ کیا ہے؟
اس طرف اکثر ملکوں میں زیارت مؤمنے انور رسول اطہر صلی اللہ علیہ وسلم بایں طور کی جاتی ہے جو نقشہ اول سے ظاہر ہے، اور بعض ملکوں میں یوں کی جاتی ہے جیسے نقشہ ثانی میں ہے، اور زید کو جو نقشہ اولی کے مشروع جاننے والوں میں سے ہے،... خالد جو نقشہ ثانیہ کے مرتکبین سے ہے، کہتا ہے کہ یہ کام وہابیوں کا ہے، اور بے ادبی ہے اور عدم عشق رسول کی دلیل ہے، جس پر زید کہتا ہے کہ مشکوٰۃ وغیرہ میں فرمان نبوی موجود ہے اللہم لا تجعل قبری وثناً یعبد، اور امت کو تہدید فرمائی

ہے کہ لَا تَجْعَلُوا قَبْرِی عِیدًا، اور کتب فقہ میں ہے کہ غیر خدا کو مطلقاً سجدہ کرنے سے کافر ہو جاتا ہے بطور تہیۃ کے ہو یا بطور تعظیم و عبادت کے (ظہیر یہ قہستانی) سلام کرنے میں رکوع کے قریب تک ہونا بھی سجدہ کرنے طرح ہے (زاہدی) تو خالد لکھتا ہے کہ خود مشکوٰۃ میں کتاب الروایا میں ابن حزمیمہ بن ثابت سے روایت ہے کہ انھوں نے خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی پر اپنے آپ کو سجدہ کرتے دیکھا تھا، جب انھوں نے خواب حضور سے عرض کیا تو آپ نے فرمایا کہ تیرا یہ خواب سچا ہے اور آپ فوراً لیٹ گئے، اور ابن حزمیمہ کو اپنی پیشانی پر سجدہ کرنے کی اجازت دی اور انھوں نے سجدہ کر لیا، اور یہی مدارج النبوة اور روضۃ الاحباب میں لکھا ہے ہجرت کے آٹھویں سال عکرمہ بن ابی جہل جب اسلام لائے تو آپ کو سجدہ کیا اور آپ نے منع نہ فرمایا، ملاحظہ ہو:- "عکرمہ در مقابل آنحضرت صلعم بایستاد و بگفت یا محمد! این زن میگوید کہ تو مرا امان دادہ فرمودنم امان دادہ ام، عکرمہ گفت اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِیکَ لَهُ وَ اَنْتَ رَسُوْلُهُ۔ اَلْاَ گاہ از شرمندگی سر در پیش افگند" (آپ کو سجدہ کر دیا، آپ نے سجدہ کی اجازت دی) اور بہت سندیں رسالہ المسٹی بہ "مرشد کو سجدہ تعظیم" مرتبہ خواجہ حسن نظامی دہلوی صفحہ ۳۰ تا ۳۲ درویش پریس دہلی کے مسطور ہیں، اور تحفۃ الناظرین مصنف مولوی سید غلام مصطفیٰ ساکن موضع بھیگیوال ضلع ہوشیار پور مطبوعہ مصطفائی لاہور کے صفحہ ۴ پر یہ عبارت بتلاتا ہے کہ فتاویٰ منیہ میں ہے:- "سجدۃ بوجہ تکریم پانچ جگہ جائز ہے: الْقَوْمُ لِلنَّبِیِّ وَالْمُرِیدِ لِلشَّیْخِ وَالرَّعِیَّةُ لِلْمَلِکِ وَالْوَلَدُ لِلْوَالِدِ وَالْعَبْدُ لِلْمَوْلٰی"، اور فتاویٰ سراجی خانی میں ہے: "اِذَا سَجَدَ الْاِنْسَانُ سَجْدَةَ الْحَقِیْقَةِ لَا یُکْفَرُ"، اور فتاویٰ کافی میں ہے، کہا صدر شہید نے:-

مَنْ سَجَدَ لِغَیْرِ اللّٰهِ وَیَرِیدُ بِهٖ الْحَقِیْقَةَ دُوْنَ الصَّلٰوۃِ لَا یُکْفَرُ،

پس جناب سے امید ہے کہ ہر دو طریق و امور میں کوئی صورت مشروع و درست ہو ظاہر ہو، اور احادیث و مسائل مسطور کے بائے میں تصریح مذکور ہو، اور پھر فیصلہ کہ طریق زیارت مومنین مبارک زماۃ صحابہ و تابعین و تبع تابعین سلف صالحین رضوان اللہ علیہم اجمعین میں کس طور ہوتی تھی، مشرور و عاشرف اطلاق فرمائی سے افتخار مرحمت ہو، نقض یہ ہیں:-

(نقشہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

نقشہ اولیٰ	نقشہ ثانیہ
<p style="text-align: center;">نقشہ اولیٰ</p> <p style="text-align: center;">یہ چینی کا کٹورا ہو جس میں توبہ مبارک اور کنارہ لکھا دیکر رکھ دیا گیا ہو</p> <p style="text-align: center;">میز</p>	<p style="text-align: center;">نقشہ ثانیہ</p> <p style="text-align: center;">یہ کاسج کی شیشی ہو جس پر مود مبارک ڈیسا دیا گیا ہو یہ میز ہے جس پر غلاف کعبہ مکرمہ بچھا ہوا ہو</p> <p style="text-align: center;">میز</p>
<p>یہ سب زائرین ہیں، پہلا زائر منبر پر جو زائرین یا سادہ غلاف ڈھکا ہوا ہے اس کے نزدیک جا کر آنکھوں سے دیکھ کر درود شریف پڑھتا ہوا واپس ہوتا ہے، اور دو دو چار چار بھی مل کر دیکھ سکتے ہیں،</p>	<p>یہ سب زائرین ہیں، پہلا زائر سر غلاف پر ٹیک کر آنکھوں کو مل رہا ہے، دست بستہ کمر بستہ حال میں ہے، بعد میں سر اٹھا کر دیکھتا ہوا پچھلے پاؤں ہٹ کر آجاتا ہے، اور یہ یکے بعد دیگرے کیا جاتا ہے، یہ سب مل کر نہیں دیکھ سکتے کیونکہ مزدور مانع ہوتا ہے، اور درود ازا دل تا آخر جاری رہتا ہے،</p>

پس ان ہر دو صورتوں میں جائز و درست بتلادیا جاوے، ہر دو بروقت زیارت عورتوں سے زیارت و نذرانہ مال مبلغ وغیرہ لیتے ہیں، یہ نذرانہ لینا اور دینا درست ہے یا نہیں؟ اور کفار بھی جیسا کہ اکثر مساجد میں صبح و مغرب میں بیماروں وغیرہ کو لا کر دعا پڑھواتے ہیں، اسی حُسن عقیدت سے، اس میں بھی شیری اور فاتحہ کو مبلغ دیتے ہیں، یہ شیرینی اور مبلغ جائز ہے یا نہیں؟

زید جب کہتا ہے کہ غلاف کعبہ الگ آویزاں کر کے اس کو بوسہ وغیرہ دینا بہتر ہے، نہ کہ آگ پر سر رکھنا اور پرستش کا نمونہ بنانا ہے، تو خالد برا فرودختہ ہو کر حج کے مناسک اور رکن یمانی وغیرہ کے بوسہ اور منہ رگڑنے کا حوالہ دیتا ہے، ہر دو میں کون حق پر ہے تحریر فرمادیں؟

الجواب؛ مودے مبارک نبوی کی زیارت کا طریقہ مشروع وہی ہے جو نقشہ اولیٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنکھوں سے دیکھ کر زیارت کر لی، دوسرا طریقہ جو نقشہ ثانیہ میں ہے غیر مشروع ہے کہ ایہام عبادت کو مستلزم ہے، رہا یہ کہ خانہ کعبہ کی زیارت کے وقت غلاف

کو چومتے اور حجر اسود کو بوسہ دیتے ہیں اور اس سے منہ رگڑتے ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ کعبہ یا حجر اسود سے منہ رگڑنا اسی کے ساتھ مخصوص ہے، دوسری چیزوں کو اس پر قیاس کرنا غلط ہے، اور غلاف کعبہ کو آنکھوں اور منہ سے لگانا جائز ہے، جبکہ اس کے لئے جھکنا نہ پڑے، اور کسی شے کی عبادت کا ایہام نہ ہو،

سجدۂ تہیۃ سے کفر لازم نہ آتا جواز کو مقتضی نہیں، بلکہ سجدۂ تہیۃ کا اسلام میں ممنوع و حرام ہونا متفق علیہ ہے، بعض صحابہ نے حضور کو سجدہ کرنے کا ارادہ کیا تھا، کیونکہ اہل عجم اپنی سلاطین کو سجدہ کیا کرتے تھے، جب انھوں نے یہ ارادہ حضور سے عرض کیا تو آپ نے اس سے منع فرمایا و قال ارایت لو مررت بقبری اکت تسجد لہ فقلت لا فقال فلا تفعلوا لو کنت اُمراحد ان یسجد لاحد لا مرت النساء ان یسجدن لانزل جہنم لما جعل اللہ لہم علیہن من حق رواہ ابو داؤد رعن قیس بن سعد، واحمد عن معاذ بن جبل مشکوٰۃ (ص ۳۳۸) اور یقیناً یہ سجدہ سجدۂ تہیۃ تھا، سجدۂ عبادت کے جواز کا صحابی کو نہ وہم ہو سکتا تھا نہ وہ اس کے متعلق حضور سے سوال کر سکتے تھے، اور سوال کرتے تو حضور اس کو کفر و شرک قرار دیتے، اور غیظ و غضب کا اظہار فرماتے، کما غضب علی قولہم اجعل لنا انواطاً کما ہم انواط، اور ابو خزیمہ کو جو حضور نے اپنی پیشانی پر سجدہ کی اجازت دی تو اس سے سجدۂ تہیۃ کا جواز کسی طرح ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ یہ طریقہ تعظیم بجالانے کا ہرگز نہیں، کہ مرشد کو لٹا کر اس کی پیشانی پر سجدہ کیا جاوے، بلکہ یہ تو حضور نے محض ابو خزیمہ کا دل خوش کرنے کے لئے ان کی خواب کو سچا کر دیا، نہ ابو خزیمہ کی نیت آپ کو سجدہ کرنے کی تھی نہ آپ کی نیت معاذ اللہ مسجود بننے کی تھی، کیونکہ آپ اس صورت میں مسجود نہ تھے بلکہ مسجد تھے کما قال الفقہاء یجوز السجدۃ علی ظہر المصلی عند الزحام، اور تحفۃ الناظرین میں جو سجدۂ تعظیم پانچ جگہ جائز کہا ہے غلط ہے وہ کتاب معتبر نہیں،

زیارت مومنین مبارک کے وقت جو نذرانہ زائرین سے لیا جاتا ہے وہ اس شرط سے جائز ہے کہ دینے والے بطور منت و نذر کے نہ دیتے ہوں، بلکہ خدام مومنین مبارک کا دل خوش کرنے کو ہدیہ دیتے ہوں اور کفار سے لینا بھی اسی طرح درست ہے، واللہ اعلم

، ربيع الثاني ۱۴۲۸ھ

ایک عمل مشتمل بر بدعات سوال (۱۹) زید

وافعال شرکیہ، مولف کتاب نے لکھا ہے کہ میری یہ تصنیف جس کے چند نسخے ارسال ہیں فلاں بزرگ کے مزار پر لے جاؤ اور دعا کرو، تو عمر نے اس کی تعمیل یوں کی کہ اس صاحب مزار کے سجادہ نشین اور دوسرا اسی خاندان کے لوگوں کو جمع کیا، (یہ لوگ عرس وغیرہ مروجہ سالانہ پوری شان سے کرتے ہیں)، ان کو مزار میں لے گئے، نسخے ہاتھ میں تھے، نسخوں کو مزار کے پاس رکھا، اپنی اور مولف کی طرف سے فاتحہ پڑھی، اور عرض کیا کہ حضرت یہ آپ کے نواسہ نے لکھی ہے وہ اور میں دعا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مولف کو زیورِ علم سے مزین فرمادے، اور قابل بنائے، اس کے بعد وہ نسخے ان حضرات کو تقسیم کر دیئے، یہ عمل اس کا کیسا ہے؟ اور زید کا اس کے لئے عمل کرنا کیسا ہے؟ اور یہ نسخے (گو یا چڑھاوے کا مال) لینے کیسے ہیں، جو حکم شریعت غراہو اس سے مطلع فرمادیں، بینوا توحسروا؟

الجواب: یہ عمل تمام تر بدعات پر مشتمل ہے، میت کو جا کر خطاب کرنا اور اس سے دعا کی درخواست کرنا استعانت بالاموات پر مشتمل ہے جو شائبہ شرک سے خالی نہیں، اور عوام میں جو مشہور ہے اذا تخرجتم فی الامور فاستعينوا باهل القبور، یہ حدیث موضوع ہے صرح بہ ابن تیمیہ فی الصراط المستقیم (ص ۱۶۲) واللہ تعالیٰ اعلم،

باقی نسخوں کے لینے میں کچھ حرج نہیں، کیونکہ انہیں فعل کا کچھ اثر نہیں ہوا، ان نسخوں میں اور چڑھاوے کی مٹھائی و چادر وغیرہ میں فرق ہے، اس لئے ان کو اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا وہ فرق یہ ہے کہ ان نسخوں کا استعمال صرف نظر سے ہوگا، اور چڑھاوے کی چیز کا دیکھنا حرام نہیں، البتہ ان نسخوں کو بیع کیا جاوے اور قیمت اپنے صرف میں لائی جاوے تو شبہ ہو سکتا ہے مگر وجہ ثانی سے اس کی یعنی اس شبہ کی بھی گنجائش نہیں، دوسرے یہ کہ چڑھاوا حقیقت میں وہ ہے جو بطریق نذر و تعظیم میت کے چڑھایا جاوے، پس مٹھائی اور چادر وغیرہ میں تو تعظیم متعارف ہے، اور نسخوں کا چڑھانا تعظیم میت کے لئے متعارف نہیں، بلکہ اس میں صرف یہ نیت ہے کہ ان کو مزار پر رکھنے سے اُن میں کچھ برکت آجائے گی، تعظیم میت کا اس میں قصد متعارف نہیں، اور جب تعظیم کا قصد نہیں تو اس کو چڑھاوا نہیں کہہ سکتے، بلکہ یہ ایسا ہے جیسے بعض لوگ اپنے دامن یا ٹوپی کو مزارِ صلحاء کی مٹی سے مل لیتے ہیں، تاکہ برکت آجائے، پس ہر چند یہ فعل بھی محدث ہے، مگر اس سے ٹوپی یا دامن کو چڑھاوا کہنا صحیح نہیں، لکن منشاء ہ

التبرک دون قصد التعظیم بهذا الفعل فافهم والله تعالیٰ اعلم، فقط
۲۲ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ

سوال (۲۰) قبروں پر چڑھاوا چڑھانا اور اس کے لینے کا حکم،
..... جناب حاجی سید وارث علی شاہ صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ کے والد ماجد کے مزار شریف پر جو چڑھاوا چڑھاتے ہیں اس پر شاہ صاحب قبضہ اور تصرف کتے ہوئے ہیں اور خود جناب حاجی سید شاہ صاحب قدس سرہ کے مزار شریف پر جو صندوق وراثتے حاجی صاحب کے نام سے جو ایڈیشنل کمشنر نے رکھوا دیا ہے، اور اپنی تجویز میں یہ حکم لکھا ہے کہ اس بجس کے چڑھاوے کو جو حاجی صاحب کا جائز وارث ہو اس کو دیا جاوے، اس چڑھاوے کو بھی شاہ صاحب مدعی ہیں، ٹرسٹ کمیٹی نے جو جناب حاجی صاحب کے مزار شریف کے انتظام کے واسطے مقرر ہے شاہ صاحب کو بجس کے چڑھاوے کو دینے سے انکار کیا، اور یہ کہا کہ چڑھاوا حسب تجویز ایڈیشنل کمشنر ہم اسی کو دے سکتے ہیں جو جناب حاجی صاحب کا جائز وارث ثابت ہوگا، کیونکہ جناب حاجی صاحب کے بنی اعمام موجود ہیں، یہی دونوں چڑھاوے مابہ النزاع ہیں شاہ صاحب حاجی صاحب کی بہن کے نواسے کے نواسے ہوتے ہیں، سید صاحب جو جناب حاجی صاحب کے رشتہ میں بھائی ہوتے ہیں، اور سید صاحب جو جناب حاجی صاحب کے رشتہ میں پوتے ہوتے ہیں، یہ لوگ اپنی عصبيت کے لحاظ سے شاہ صاحب کے مقابلہ میں مدعی ہیں اسی صورت میں جناب حاجی صاحب کے عصبہ میں کون کون ہیں، اول یہ کہ سید صاحب اور سید صاحب، حاجی صاحب کے ورثہ بمقابلہ شاہ صاحب کے ہو سکتے ہیں اور صاحب کے مقابلہ میں کا حق مرجع ہی یا نہیں، بینوا تو جووا نوٹ :- اس کے بعد سائل نے تمام ورثہ کا شجرہ لکھا ہے جو بوجہ عدم ضرورت نقل نہیں کیا گیا ۱۲

الجواب: قبروں پر چڑھاوا چڑھانا حرام ہے، اور اس کا لینا بھی حرام ہے، لہذا اس کے

۱۳ اور اگر چڑھاوا نہ چڑھایا جاوے بلکہ ورثہ بخدادین مزار کی امداد مقصود ہو تو دینے والوں کے الفاظ کو لکھ کر دوبارہ سوال کیا جاوے ۱۴

مستحق نہ شاہ ہیں نہ حاجی شاہ صاحب کے درخشاں اس میں حق میراث ملا نہیں، کیونکہ یہ چڑھاوا ترکہ کی قسم سے نہیں ہے، اس چڑھاوے کا مالک وہی شخص ہے جس نے اس کو چڑھایا ہے، اگر وہ معلوم ہو تو اس کو واپس کیا جائے، اگر معلوم نہ ہو تو اُن فقرار پر تصدق کر دیا جائے جو مضطر اور فاقہ زدہ ہیں، جیسے یتامی اور بیوگان و مساکین وغیرہ، واللہ اعلم
از تھانہ بھون،،، شعبان ۱۳۸۸ھ

سوال (۲۱) دو لہا کا نکاح کے بعد اور مولود خواں کا مناجات سے فارغ ہونے کے بعد حاضرین مجلس کو سلام کرنا بدعت ہی، ہمارے اطراف میں رواج ہے کہ دو لہا کے سر پر جب عمامہ رکھتے ہیں یا مولوی صاحب جس وقت عقد نکاح خوانی سے فارغ ہوتے ہیں تو دو لہا کھڑا ہو کر حاضرین مجلس کو سلام کرتا ہے اور جس وقت مولوی صاحب مولود خوانی کی مناجات سے فارغ ہوتے ہیں تمام مجلس ان کو سلام کرتی ہو بعدہ شیرینی وغیرہ تقسیم ہوتی ہے بعدہ رخصت ہوتے ہیں، اس سلام کا کیا حکم ہے؟ اور جو شخص فتویٰ سلام مروجہ کے جواز کا دیوے اس شخص کے پیچھے نماز مکروہ ہے یا نہیں؟ جوابات بحوالہ کتب مرحمت فرمادیں، بینو ابالبرہان، توحید عند الرحمن،

الجواب من بعض علماء البنجال

اقول وبالله التوفیق کہ سلام مروجہ بدعت ہے کیونکہ حدیث شریف میں جیسا کہ ترمذی و ابوداؤد میں ہے سلام مسنونہ ان اوقات ثلاثہ میں عند الملاقات اور عند الرخصت اور وقت استیذان ثابت ہے، پس جو سلام ان کے علاوہ ہو گا وہ بدعت ہے، اگر اس کے لئے کوئی مصلحت شرعی داعی ہو تو بدعت حسنہ ہوگا، اور ظاہر ہے کہ سلام مروجہ کے لئے سوائے رواج و رسم کوئی مصلحت شرعی داعی نہیں ہے اس لئے وہ بدعت قبیحہ ہے مسلمانوں کو اس سے بچنا ضروری ہے، واللہ اعلم،

اور صورت مذکورہ میں جس نے جواز کا فتویٰ دیا ہو فاسق، یجب علیہ التوبۃ و یکرہ الصلوۃ خلفہ ان کان اماماً لما جاء فی الحدیث عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من افتی بغير علم کان اثمه علی من افتاه ومن اشار الی اخیه بامر یعلم ان الرشہ فی غیرہ فقد خانہ رواہ ابوداؤد هکذا حکم الکتاب واللہ اعلم بالصدق والثواب، حرره الراجی عفو ربہ القوی

احقر ابوالمبارک محمد عبدالحق غفرلہ رب الفلق مدرس مدرسہ کرامتیہ دیوبند پور ضلع لوالکھالی،

الجواب من جامع امل الاحکام

بیشک یہ سلام اگر ثواب کا کام سمجھ کر کیا جاتا ہے تو بدعت ہے، کیونکہ اس موقع پر سلام مشروع نہیں، مگر اس کے مجوز کو فاسق کہنا بھی درست نہیں، کیونکہ ممکن ہے کہ مجوز کے نزدیک عوام کے اس فعل کا منشاء دین کا کام سمجھنا نہ ہو بلکہ محض تہذیب اور ادب ہو واللہ اعلم، ظفر احمد عفا عنہ، یکم رمضان ۱۴۲۸ھ

سوال (۲۲) پیر کا بہشتی زیور میں غلاف کعبہ اور پیر کا رومال قبر میں رکھنے کو جائز لکھا ہے، اس کی کیا دلیل ہے، صفحہ ۷ پر لکھا ہے کہ کعبہ کا غلاف یا اپنے پیر کا رومال قبر میں دینا جائز ہے، اس کی کیا دلیل ہے؟

الجواب؛ بہشتی زیور کے مسئلہ کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن ابی کو اپنا قمیص پہنایا اور لعاب مبارک اس کے منہ میں ڈالا، اور اپنی صاحبزادی کے کفن میں اپنی ننگی عطا فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا اشعر نہا ایاہ وکلاہما حدیثان صحیحان أخرجهما أصحاب الصحاح منهم البخاری وغیرہ واللہ اعلم ظفر احمد عفا عنہ ۲۴ رمضان ۱۴۲۸ھ

فی حاشیۃ مشکوٰۃ (ص ۱۱۸) علی قولہ اشعر نہا وھذا الحدیث اصل فی التبرک باثار الصالحین ولباسہم کما یفعلہ بعض مریدین المشائخ من لبس اقمصہم فی القبر، واللہ اعلم ۱۲ لمعات احقر عبد الکریم عفی عنہ ۲۴ رمضان ۱۴۲۸ھ

سوال (۲۳) حکم چہلم بطریق خاص

..... ملک باگڑ میں جب کوئی شخص مرجاتا ہے تو عام مسلمان اس میت کا ۲۰ یا ۳۰ یا ۳۵ دن کے بعد چہلم کرتے ہیں، اور چہلم کی تیاری برادری کے بچوں کو جمع کر کے پہلے سے مقرر کر دیتی ہیں اور اپنے رشتہ داروں اور خلیفہ و اقرباء کو جو دور دور جگہوں میں رہتے ہیں شریک چہلم ہونے کے لئے طلب کرتے ہیں، اور جب کھانا پچنے کا وقت ہوتا ہے اس وقت برادری کے بچوں کو بلا کر ان سے اذن لیتے ہیں، اور برادری کے بچے کھانے کا وزن بتلا کر کہہ دیتے ہیں کہ یہ بچوں کا مال ہے، پچ جس طرح چاہیں گے اس کو برتیں گے، اور اکثر جگہ برادری کے لوگ

فی آدمی کھانا تول کر اپنے اپنے گھروں میں لے جاتے ہیں، کیا ایسے کھانے کا مردے کو کچھ ثواب پہنچتا ہے، اور کیا ایسا کھانا کھلانے والوں اور کھانے والوں کو کچھ ثواب ملتا ہے؟ یا بقول بعض علماء دین چہلم کا کھانا کھانے والے اور کھلانے والے دونوں فریق گنہگار ہوتے ہیں، اور میت کو کچھ فائدہ نہیں پہنچتا مع حوالہ النص جواب باصواب سے مطلع فرمائیے، بینوا توجروا۔
الجواب؛ رسوم مندرجہ سوال بدعت ہیں، جو لوگ ایسی رسمیں کرتے ہیں وہ گنہگار ہوتے ہیں، اور کھانے والا اگر مقتدر ہے، یعنی ایسا ہے کہ اس کی شرکت سے ان رسوم کی تائید ہوتی ہے تو اس کو کھانا جائز نہیں، اور جو شخص ایسا نہیں اور حاجتمند ہے اس کو کھانے کی گنجائش ہے، باقی جو شخص محتاج اور فقیر نہ ہو اس کو کھانا مکروہ ہے، اور خیرات کا ثواب ملنے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر وہ مال حرام ہے تب تو بالکل ثواب نہیں بلکہ گناہ ہے اور اگر مال حلال ہو لیکن محض فخر و ریاد وغیرہ کی وجہ سے کھلایا گیا ہے تب بھی ثواب ملے گا،
 فی الدر من صلی او تصدق یرائی بہ الناس لما یعقب بتلك الصلوة ولا یشاب بہا قبل هذا فی الفرائض وعسمہ الزاہدی للنوافل لقولہم الریاء لا یدخل الفرائض وقال الشامی وتخصیص الزاہدی للنوافل معناه فیما یظہرات الریاء یجب طوائفہا اصلًا فانہ لم یصلہا فاذا صلی سنة الظهر مثلاً ریاءً لاجل الناس ولولاہم لم یصلہا لا یقال انہ ائی بہا فیکون فی حکم تارکہا بخلاف الفرض فانہ لیس فی حکم تارکہ حتی لا یعاقب عقاب تارکہ والفرق ان المقصود من النوافل الثواب لتکسیر الفرائض وسد خللہا ہذا اما ظہر لفہی القاصر والله تعالیٰ اعلم (شامی ص ۴۲۱)

اور اگر مال بھی حلال ہو اور نیت بھی خالص ہو لیکن کھلایا جائے ایام مقررہ میں تو قواعد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھلانے کا ثواب ملے گا، اور اس بدعت یعنی دن مقرر کرنے کا گناہ ہوگا، جیسا کہ ارض مغصوبہ میں نماز، مگر اس کے متعلق جزئیہ نہیں ملا اور یہ اخیر شق یعنی رسوم میں خلوص گو محتمل ہے، اور اسی بنا پر جواب لکھ دیا ہے، لیکن اس کا وجود ہے مشکل، اور جس رقم یا جس جنس سے کھانا کھلایا جاتا ہے اگر وہ ترکہ مشترکہ سے ہے تب تو کسی حال میں اس کا کھانا درست نہیں، جب تک کہ ہر وارث سے اجازت نہ لی جاوے اور اس میں بھی یہ شرط ہے کہ کوئی وارث نابالغ نہ ہو اور ایک شرط یہ ہے کہ شرم و لحاظ

سے اجازت نہ دے، جیسا کہ سوال آئندہ کے جواب میں ہے،

ایضاً ایضاً [سوال ۲۴] ایک شخص مر گیا، اس کے وارث ایصالِ ثواب میت کیلئے خالصاً لئلا اس نیت سے کہ میت کو اس کا ثواب پہنچے اہل برادری و غرباء و مساکین و مالدار سب ہی لوگوں کو کھانا کھلانا چاہتے ہیں، اور میت کے وارثان کے دل میں کوئی فخر و تکبر نہیں ہو محض ان کی نیت ثواب کے لئے کھانا کھلانے کی ہے، مگر رشتہ دار و اہل برادری بغیر مشورۃ برادری و شرائط برادری منظوری کئے ایصالِ ثواب میت کے کھانے میں شریک نہیں ہوتے ہیں، مجبوراً وارثان میت کو برادری کو شریک کھانا کرنے کی غرض سے اور ان کو کھانا کھلانے کی نیت سے برادری کی قیود و شرائط منظور کرنی پڑتی ہیں، لہذا مطابق شرائط برادری کے جیسا کہ سوال نمبر میں درج ہے، وارثان میت کو ایصالِ ثواب میت کے لئے کھانا کھلانا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس سے میت کو کچھ ثواب پہنچتا ہے یا نہیں؟ مع حوالہ نص جواب با صواب سے مطلع فرمائیے، بینوا و توجروا؟

الجواب؛ جب برادری کی رسم خلافت شریعت ہے تو ان کی موافقت نہ کی جاوے بلکہ بدون کسی دن وغیرہ کی قیود و تہذیب خود ہی فقراء کو کھلا دیا جاوے، یا نقد وغیرہ دیدیا جاوے برادری کے توسط کی ضرورت ہی کیا ہے، باقی رہا برادری کو کھانا کھلانا تو برادری کی دعوت اس موقع پر مکروہ ہے فقط فقراء کو کھلانا چاہئے، البتہ برادری میں جو غریب ہیں وہ بھی مانند دوسرے فقراء کے شامل کئے جاویں، یہ شادی تھوڑا ہی ہے، کہ برادری کی حیثیت سے دعوت کی جاوے و فی الشامی عن الفتح انه قال ویکرہ اتخاذ الضیافۃ من الطعام من اهل المیت لانه شرع فی السرور لا فی الشر وروہی بدعۃ مستقبحة روی الامام احمد وابن ماجہ باسناد صحیح عن جریر بن عبد اللہ قال کنا نعد الاجتماع الی اهل المیت وصنعهم الطعام لهم من النیاحۃ الخ وقال بعد اسطر و فیہا (ای البزازیۃ) من کتاب الاستحسان وان اتخذ طعاماً للفقراء کان حسناً واطال فی ذلك فی المعراج وقال وھذه الافعال کلھا للسمعة والریاء فیحتوز عنھا لا نھم لا یریدون بہا وجہ اللہ تعالیٰ اھ (صفحہ ۹۴)

اور جب خالص نیت سے بدون کسی رسم کے حلال مال میں سے ایصالِ ثواب کے واسطے خیرات کرے تو ثواب پہنچتا ہے، اور منجملہ دیگر شرائط حلت کے ترکہ میں سے خیرات کرنے

کے لئے اس کا لحاظ بھی ضروری ہے کہ اس ترکہ میں کوئی تاباں وارث شریک نہ ہو، اگر نابالغ وارث شریک ہو تو پہلے اس کا حصہ الگ کر دے بعد میں بالغ ورثہ اپنے حصہ میں سے خرچ کریں، اسی طرح بالغ وارث کی رضامندی بھی ضروری ہے، اگر ایک وارث خیرات کرنا چاہے اور دوسرا وارث محض رسم کی وجہ سے خاموش ہو رہا یا ظاہری اجازت دیدی تو وہ اجازت معتبر نہیں، بلکہ دلی رضامندی شرط ہے جو قرآن سے معلوم ہو سکتی ہے بلکہ احوط تو یہ ہے کہ بالغ ورثہ بھی ترکہ تقسیم کر کے اپنے حصہ میں سے حسب منشاء خیرات وغیرہ کریں، فقط

طریق ایصالِ ثواب | سوال (۲۵) ایصالِ ثواب میت کے لئے مردہ کے کتنے دن مرنے کے بعد اور کس طریقہ سے کن کن شخصوں کو کھانا کھلانا چاہئے، جس سے میت کو ثواب پہنچے، اور ایصالِ ثواب میت کا کھانا اہل برادری دیا یا آشنا و خویش و اقرباء و مالدار شخصوں کو کھانا جائز ہے یا نہیں، مع حوالہ نص تحریر فرمائیے، بیواؤ تو جروا

الجواب؛ کوئی دن یا بیچ وغیرہ مستر نہیں، جب دل چاہے کھانا یا کپڑا نقد وغیرہ جو دل چاہے خیرات کر دے نہ کوئی خاص طریقہ ہے، نہ کوئی خاص چیز ہے بلکہ جو طریقہ ہمیشہ کی خیرات کا ہے وہی ایصالِ ثواب کے واسطے ہے، اور مالدار کو کھلانا صدقہ میں داخل نہیں ہے اور غنی کے علاوہ شادی وغیرہ کے موقع پر مالدار کو کھلانا جائز ہے، مگر ایصالِ ثواب کے کھانے میں غنی کو شریک نہ کیا جائے، کہ مکروہ ہے، جیسا کہ سوال ۱۷ میں گذر چکا،

احقر عبدالکریم عفی عنہ از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون

مورخہ ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۲۵ھ

نوٹ؛ سب سوالوں میں نص کا حوالہ طلب کیا ہے، اس مطالبہ کو جب پورا کیا جاتا ہے جبکہ نص کے معنی لکھے جاویں اور دلیل سے یہ ثابت کیا جاوے کہ ہر مسئلہ کے لئے نص کی ضرورت ہے،

سوال (۲۶) ایک شخص گھر سے فاتحہ یعنی کلام مجید گھر پر اور قبرستان میں جا کر قرآن مجید پڑھ کر ایصالِ ثواب میں کوئی فرق ہو یا نہیں؟ اور درود شریف وغیرہ پڑھ کر ایصالِ ثواب کرتا ہے،

دوسرا شخص قبرستان جا کر قبروں پر بیٹھ کر قرآن شریف وغیرہ پڑھ کر ایصالِ ثواب کرتا ہے، ان دونوں میں کوئی

الجواب؛ ثواب تو دونوں کی طرف سے برابر پہنچے گا، فرق کی کوئی دلیل نہیں، البتہ قبرستان میں اگر کسی عقیدہ فاسد کے باعث جاتا ہے تو گناہ ہوگا، اور اگر بد مذہب

وقت ہے یا برابر ہے؟ بیواؤ کتاب تو جروا احساب

عقیدہ جاوے تو زیارت قبور کا ثواب بھی ملے گا اور موتی کو بھی زیادہ مستر ہوگی، فقط
احقر عبدالکریم از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون ۱۱ ج ۲ ۱۳۵۵ھ
الجواب صحیح ظفر احمد عفا اللہ عنہ

سوال (۲۷) بعد تجہیز
دفن میت کے بعد قبرستان میں اقارب میت کا لوگوں کو دعوت دینا
تکفین میت کے اقارب و ورثاء جو لوگ بغرض دفن آتے ہیں
اُن لوگوں کو قبرستان میں دعوت دیتے ہیں کہ آپ لوگ فلاں روز ہمارے یہاں تشریف لا کر
طعام تناول فرماویں، کیا یہ دعوت کرنا اور قبول کرنا اور ایسا رواج کرنا جائز ہے یا نہیں، بینوا
تو جسروا الی یوم الحساب،

الجواب؛ یہ دعوت اور اس کا قبول کرنا دونوں ممنوع ہیں، ہرگز جائز نہیں، اس
رسم قبیح کا ترک کرنا لازم ہے، اس دعوت کے ناجائز ہونے کو علامی شامی نے فتح القدر
فتاویٰ بزازیہ اور معراج الدرایۃ سے نقل کیا ہے، و نیز خود بھی اس زمانہ کی مروجہ دعوت کے
متعلق لَا تُلَاقَ فِي حُرْمَتِهِ لَكَاہِی، اور علاوہ حنفیہ کے دیگر مذاہب یعنی شافعیہ وغیرہ کا بھی اس
کے عدم جواز پر اتفاق بیان کیا ہے، و نیز مسند امام احمد اور ابن ماجہ سے بسند صحیح روایت ورجح
کی ہے کہ جریر بن عبداللہ نے فرمایا ہے کہ ہم میت کے گھر جمع ہونے کو اور اہل میت کے کھانا
تیار کرنے کو نباحث میں شمار کرتے تھے، یعنی جس طرح نوحہ حرام ہے اسی طرح اس کو نوحہ کا
فرد سمجھ کر حرام جانتے تھے، پس اس کے بعد کس مسلمان کو جرأت ہو سکتی ہے کہ اس قسم کی رسوم
قبیحہ کو بدعت حسنہ کہہ کر قابل ثواب قرار دے، خدا تعالیٰ ہم سب کو سیدھا راستہ دکھاوے،
اور اس پر چلنے کی توفیق عطا فرماوے، آمین ثم آمین،

کتبہ احقر عبدالکریم عفی عنہ

از تھانہ بھون مورخہ ۲۹ ج ۱ ۱۳۵۵ھ

سوال (۲۸)
تلقین میت کے متعلق ایک سوال
جناب مولانا مولوی حکیم ابوالعلاء امجد علی صاحب صدر المدرسین
دارالعلوم معینیہ عثمانیہ اجمہ شریف اپنی تصنیف ”بہار شریعت“ حصہ چہارم میں لکھتے ہیں :-
(مسئلہ) دفن کے بعد مردے کو تلقین کرنا اہل سنت کے نزدیک مشروع ہے (جوہرہ)
یہ جو اکثر کتابوں میں ہے کہ تلقین نہ کی جائے، یہ معتزلہ کا مذہب ہے، انھوں نے ہماری

کتابوں میں یہ اضافہ کر دیا ہے (رد المحتار) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جب تمھارا کوئی مسلمان بھائی مرے اور اس کی مٹی دے چکو تو تم میں سے ایک شخص قبر کے سر ہالے کھڑا ہو کر کہے یا فلاں بن فلاں، وہ سنے گا اور جواب نہ دے گا، پھر کہے یا فلاں بن فلاں، وہ سیدھا کھڑا ہو کر بیٹھ جائے گا، پھر کہے یا فلاں بن فلاں، وہ کہے گا کہ ہمیں ارشاد کر اللہ تجھ پر رحم فرمائے، مگر تمہیں اس کے کہنے کی خبر نہیں ہوتی، پھر کہے اذکرو ما خرجت علیہ من الدنیا شہادۃ ان لا الہ الا اللہ وان محمد عبداً ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم وانت رضیت باللہ رباً وبالاسلام دیناً وبعحمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نبیاً وبالقرآن اماماً نیکرین ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر کہیں گے، چلو ہم اس کے پاس کیا بیٹھیں، جسے لوگ اس کی حجت سکھا چکے، اس پر کسی نے حضور سے عرض کیا کہ اگر اس کی مان کا نام معلوم نہ ہو تو فرمایا حوا کی نسبت کرے، رواہ الطبرانی فی الکبیر الضیاء فی الاحکام وغیرہما، بعض اجلۃ ائمہ تابعین فرماتے ہیں جب قبر مٹی برابر کر چکے اور لوگ واپس جائیں تو مستحب سمجھا جاتا ہے کہ میت سے اس کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر یہ کہا جائے یا فلاں بن فلاں قل لا الہ الا اللہ تین بار، پھر کہا جائے قل ربی اللہ دینی الاسلام ونبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم، لہذا عرض ہے کہ یہ مضمون بالاصح حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟

الجواب: حدیث تلقین اموات کی معتبر و صحیح ہے، جس کو رد المحتار میں بھی نقل کیا ہے، کیونکہ اہل سنت والجماعت لقنوا موتاکم سے حقیقی معنی ارادہ کرتے ہیں، اور شیخ کمال الدین بن الہمام بھی اپنی کتاب فتح القدر میں تائید بتفصیل کرتے ہیں کہ موتاکم سے مراد حقیقی معنی ہیں درمختار میں ہے و فی الجوہرۃ انه مشروع عند اہل السنۃ الخ اور رد المحتار میں ہے اما عند اہل السنۃ فالحدیث ای لقنوا موتاکم لا الہ الا اللہ محمول علی الحقیقۃ لان اللہ یحییہ علی ما جاءت بہ الآثار وقد روی عنہ علیہ السلام انه امر بالتلقین

عہ کنز العمال میں اس روایت کو ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے درج کیا ہے، اور طبرانی، کبیر ابن عساکر و طبری کی طرف منسوب کیلئے، اور قاعدۃ مذکورہ فی الخطبہ کی بناء پر دلیلی و ابن عساکر کی روایت ضعیف ہے، اور طبرانی کی اگر وہی سند ہے تو ضعیف ہے اور غالب گمان یہی ہے، واللہ اعلم ۱۲ عبد الکریم عفی عنہ عہ سخت حیرت ہے کہ بلا حوالہ اور سند کے صحیح لکھ دیا، کیا شامی میں نقل کرنے سے اس کا صحیح ہوتا لازم آتا ہے؟ ۱۲ عبد الکریم عفی عنہ

بعد الدفن یا فلان بن فلان اذکر دینک الذی کنت علیہ من شہادۃ ان لا اله الا الله وان محمد رسول الله وان الجنة حق والنار حق وان البعث حق وان الساعة آتیة لا ریب فیہا وان الله یبعث من فی القبور وانک رضیت بالله رباً وبالاسلام دیناً وبمحمد صلی الله علیہ وسلم نبیاً وبالقرآن اماماً وبالکعبۃ قبلۃً وبالؤمنین اخواناً ام وقد اطال فی الفتح فی تأیید حمل موتاکم فی الحدیث علی الحقیقۃ مع التوفیق بین الأدلۃ علی ان المیت یسمع اولاً یمسم کما سیأتی فی باب الیسین الخ اگرچہ تلقین بعد تدفین غیر مروج ہے لیکن اہل سنت والجماعت کے نزدیک مشروع بلکہ مستحب ہے، فقط واللہ اعلم،

اجاہ وکتبہ حبیب المسلمین عفی عنہ نائب مفتی مدرسہ امینیہ دہلی

اقول وبالله التوفیق جب ظاہر روایت میں ممانعت موجود ہے تو پھر بعض فقہاء کے قول کی بناء پر اس کو مستحب اور مشروع قرار دینا ہرگز صحیح نہیں ہے، اور ممانعت تلقین کی بناء استحالة حیات بعد الموت قرار دے کر اس کو معتزلہ کا مذہب اور تلقین کو اہل سنت کا مذہب کہنا بھی تعجب انگیز ہے، کیا علاوہ اس کے اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، ایک وجہ تو خود نسخ القدر نے کافی سے نقل کی ہے، وہ یہ کہ اگر وہ ایمان کے ساتھ مرا ہے تو اس کی حیات نہیں اور اگر (نعوذ باللہ) کفر پر خاتمہ ہوا تو تلقین مفید نہیں اور کفایہ شرح ہدایہ میں بھی یہی وجہ لکھی ہے، چنانچہ کفایہ کی عبارت یہ ہے وقد روی انه علیہ السلام امر بتلقین المیت بعد دفنه وزعموا انه مذهب اهل السنة والاول مذهب المعتزلة الا انا نقول لا فائدة فی التلقین بعد الموت لانه ان مات مؤمناً فلا حاجة الیه وان مات کافراً فلا یفید التلقین ام

باقی رہی یہ بات کہ یقنوا موتاً کم میں معنی حقیقی مراد کیوں نہیں لے، سو اس کی وجہ احقر کی فہم ناقص میں یہ آتی ہے کہ لفظ موتی سے جس طرح حقیقی معنی مفہوم ہوتے ہیں اسی طرح مجازی بھی مفہوم ہوتے ہیں، اور مجازی معنی لینے سے نفع زیادہ ہے، کیونکہ اس وقت جو حجب تکلیف کے محض کو از خود التفات ہونا دشوار ہے، اور تلقین سے اس کو توجہ ہو جاتی ہے، اور کلمہ شہادت پڑھ کر من گان آخر کلامہ لا اله الا الله واخل الجنة کا مصداق بن جاتا ہے، بخلاف تلقین بعد الدفن کے کہ اس میں بعض نے تو کوئی نفع تسلیم ہی نہیں کیا، جیسا کہ

کافی اور کفایہ سے نقل کر چکا ہوں، اور اگر وہ نفع بھی تسلیم کیا جاوے، جو صاحب فتح القدر نے بیان کیا ہے، یعنی استیناس بالذکر تب بھی وہ نفع یقیناً بہت کم ہے، اس نفع سے جو محضر کو ہوتا ہے، کیونکہ حالت احتضار میں تلقین کرنا عمل کی ترغیب دلانا ہے، اور عمل جس درجہ مفید ہو ظاہر ہے، اور محض استیناس عمل کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے،

خلاصہ جواب اشکال کا یہ ہوا کہ موتی کے مجازی معنی لینا راجح ہیں، لہذا حقیقی معنی مراد نہیں لئے، بلکہ تامل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ حقیقت مجبور ہو اور مجاز متعارف اور حقیقت مجبورہ سے مجاز متعارف مقدم ہوتا ہے، کما علم من الاصول، اور حقیقت کا مجبور اور مجاز کا متعارف ہونا ظاہر ہے، کیونکہ تلقین محضر پر امت کا تعامل ہے، حالانکہ اس کی دلیل سوئے لقنوا موتکم کے اور کوئی نہیں ہے، اگر مجاز متعارف نہ مانا جاوے تو تلقین محضر کی کوئی دلیل ہی نہ رہے، حالانکہ شامی نے درایہ سے نقل کیا ہے انة مستحب بالاجماع، اہم اور اگر کوئی حقیقت کا مجبور ہونا تسلیم نہ کرے بلکہ یوں کہے کہ مجاز تو متعارف ہے لیکن ساتھ ہی حقیقت بھی مستعمل ہے اور اس بنا پر حقیقت کو راجح کہے، اس کا جواب یہ ہے کہ جب حقیقت مستعمل ہو اور مجاز متعارف تب بھی صاحبین کے نزدیک تو مجاز ہی مقدم ہوتا ہے، البتہ امام صاحب کے نزدیک اس وقت حقیقت اولیٰ ہے، سوان کی طرف سے وہی جواب ہو سکتا ہے کہ تلقین محضر مفید ہے، اور تلقین میت مفید نہیں، اور محض استیناس کا فائدہ عمل کے مقابلہ میں معتبر نہیں جیسا کہ پیشہ گزر چکا ہے، نیز استیناس تلقین پر موقوف نہیں ہے، بلکہ تلاوت قرآن اور ذکر اللہ سے بدون تلقین بھی استیناس ہوتا، بلکہ مع شی زائد ای وصول الثواب فلاحاً تہی الی التلقین الذی ہو ادون من ایصال الثواب،

علاوہ ازیں یہاں گو حقیقت مستعمل ہے مگر متعذر ہے، اور جب متعذر ہو تو بہر حال مجاز مراد ہوتا ہے اتفاقاً بین الامام وصاحبیہ، اور جواب اہل علم سماع موتی کا انکار کرتے ہیں انکے نزدیک تو تعذر ظاہر ہے، اور جواب اہل علم سماع موتی کے قائل ہیں بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقیقت کو تلقین موتی میں متعذر نہ مانیں گے، مگر غور کرنے سے پتہ لگتا ہے کہ ان کے نزدیک

۷۵ چنانچہ حضرت عمرو بن العاصؓ سے مسلم نے روایت کی ہے: ۱۔ ثم اقبوا حول قبری قدر ما یختر جزر و یقیم

لمباحی استئناس بکم، الحدیث وہو الموقوف فی حکم المرفوع ۱۲ منہ

بھی متعذر ہو کیونکہ وہ مطلق سماع کے قائل ہیں، سماع مفید کا کوئی قائل نہیں ہے، اور مقصود سماع مفید ہوتی ہے، پس جب سماع مفید کا کوئی بھی قائل نہیں تو تلقین موتی میں حقیقی میت مراد لینا بالاتفاق متعذر ہے، فافہم۔

اور اگر اس روایت کو بطور اشکال لایا جاوے جس میں بعد الدفن کی تصریح ہے تو وہ اگر صحیح ہو تو اس میں یہ احتمال ہے کہ روایت بالمعنی ہو اور یہ سب تفصیل صرف درجہ توجہ میں ہے ورنہ اصل مدار اس پر ہے کہ جب ظاہر روایت میں تلقین بعد الدفن کی نفی ہے جس کا مقتضا غیر مشروع یا کم از کم غیر مسنون ہونا معلوم ہوتا ہے، اس کے بعد ہم مقلدین کو اس سے اختلاف کی گنجائش نہیں، خصوصاً جبکہ اس کے خلاف کوئی روایت نہیں، اور جس کو خلاف سمجھا گیا اس کا جواب موجود ہے،

حاصل یہ کہ ہمارے اکابر کے نزدیک تلقین بعد الموت مشروع نہیں ہے، ان کا ظاہر روایت پر عمل ہے اور وہی قوی ہے، اور اگر یہ کہا جاوے کہ تطبیق کے لئے دونوں وقتوں میں تلقین کو جائز کہا جاوے تو بہتر ہے، تاکہ مزید نفع ہو تو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ مجاز و حقیقت کا جمع کرنا جائز نہیں، کما تقر فی الاصول اور عموم مجاز کی یہاں کوئی صورت نہیں ہے، چنانچہ خود علامہ ابن الہمام خود تحریر فرماتے ہیں ولیس ینظر معنی لیم الحقیقی والمجازی الخ۔

اب ایک امر قابل غور اور رہا وہ یہ کہ اگر ظاہر اگر روایت کا محل یہ قرار دیا جاوے کہ تلقین بعد الموت مسنون نہیں، اور طبرانی وغیرہ نے جو حدیث روایت کی ہے اس کو اباحت پر محمول کیا جاوے اور عجب نہیں کہ زلیعی سے شامی نے جو تین قول نقل کئے ہیں ان میں سے قول ثالث یعنی لا یومر بہ ولا ینہی عنہ کا یہی منشاء ہو، سو بظاہر اس سے کوئی مانع نہیں، لیکن اس زمانہ میں تلقین بعد الدفن نہ صرف فض کا شعار ہے، اس واسطے اس کی اجازت نہ دی جاوے گی، اور اس کی نظیر فقہ میں موجود ہے، کہ باوجود وارد فی الشرع ہونے کے منع کی علت شعار فرق ضالہ قرار دی ہے، چنانچہ در مختار کتاب الخطر والاباحتہ میں ہے: ویجعلہ (ایہ الخاتم) لبطن کفہ فی یدہ الیسری وقیل الیمنی الا انہ شعار الروافض فیجب التعرّض عنہ قہراً وغیرہ فقط والله اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب،

کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ از تھانہ بھون

مورخہ ۵ رجب ۱۳۵۵ھ

سوال (۲۹) اس اطراف کے مولویان و منشیان صاحبان ماہ
رمضان المبارک میں دوسرے ملکوں میں روپیہ کمانے کی غرض سے
بھٹکتے ہیں، اور دعوت میں مولود خوانی و وعظ گوئی و ختم خوانی کرتے ہیں، اور اس میں روپیہ
پیسہ لیتے ہیں، اور قطرہ بھی لیتے ہیں، پس اس طرح سے روپیہ کمانا جائز ہے یا ناجائز، اور روڈ
پیسہ ان کے لئے حرام ہے یا حلال،

الجواب: حرام ہے، واللہ اعلم،

۱۷ شوال ۱۴۲۸ھ

سوال (۳۰) بعض اشخاص نے از نام ”موسے مبارک“ یا ”قدم شریف“
..... وغیرہ زیارت گاہیں قائم کر رکھی ہیں، جن کی زیارت کے لئے دن،
ہمینہ، وقت معتبر ہیں، اور اوقات مقررہ پر علاوہ مردوں کے
عورتوں کا خاص ہجوم اہتمام و انتظام کے ساتھ ہوتا ہے، اور بخور و شیرینی وغیرہ نقدی ملبوسات
لوگ (زائرین و زائرت) ان زیارت گاہوں میں بطور نذر و ہدیہ پیش کرتے ہیں، اور منتیں مانی
جاتی ہیں، قطع نظر اس کے کہ موسے مبارک وغیرہ کسی صحیح سند کے ساتھ ہو یا نہ ہو سوال یہ ہو کہ
از روئے شرع شریف ایسی زیارت گاہیں قائم کرنا یا اس کے ذریعہ سے منفعت حاصل کرنا، یا
قیمت تبرکات کا اس کام کو ذریعہ معاش بنانا جائز ہے، اور عورتوں کے اس ہجوم کو فتنہ کہا جاسکتا ہے
یا نہیں، اور زائرین اور زائرات کا نذر و منت و ہدیہ پیش کرنا شریعت اسلام میں عمل جائز
ہے یا ناجائز، اور لوگوں کو ایسی زیارت گاہوں میں جانا اور شرکت کرنا کہاں تک درست اور
رواہ ہے،

الجواب: موسے مبارک کی زیارت کیلئے زیارت گاہیں قائم کرنا اور زیارت کیلئے خاص ایام میں مردوں
عورتوں کا جمع ہونا اور اس کے واسطے منت و نذر مانتا جائز نہیں، یہ سب امور بدعت ہیں
اور اگر زیارت کے بعد ہدیہ دیا جائے تو یہ جائز ہے، مگر زیارت خاص ایام ہجوم میں نہ کرنا چاہئے
بلکہ ان ایام کے علاوہ کسی اور دن کی جائے تاکہ تاہید بدعت نہ ہو، واللہ اعلم

۲۵ شوال ۱۴۲۸ھ

سوال (۳۱) اگر اتفاقاً محفل میلاد میں حاضر ہو جاؤں کہ بے خبری سے محفل میلاد میں جانے کے بعد اگر وہاں سے بلا شرکت چلے جانے میں فساد کا خوف ہو تو اس صورت میں شریک ہونا چاہئے یا کیا کرے؟

جواب: اگر بے خبری میں شریک ہو جائے تو شرکت کر لی جائے، اور قیام بھی کر لیا جائے کہ فتنہ و فساد سے بچنا اہم ہے، ومن ابتلی ببلیتین فلیختر اھونھما واللہ تعالیٰ اعلم،

۱۲ ذی الحجہ ۱۴۲۸ھ

کتاب العلم

فصل فی المتفرقات

سوال (۱) ندرسون میں اکثر درجہ بندی ہوتی ہے تو آیا کسی لڑکے کو استاد پڑھا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: اس میں کثرت کا لحاظ ہوگا، اگر اکثر لڑکوں نے یاد کر لیا ہو تو سبق آگے پڑھا سکتا ہے، اور اگر اکثر نے یاد نہ کیا ہو تو آگے نہ پڑھانا چاہئے،

سوال (۲) جبکہ عام و خاص ایک ناجائز فعل جو کہ قیاس سے علماء نے نکالا ہے اگر کرنے لگیں تو کیا جائز ہو جاوے گا، کپڑے کی سلائی میں علی العموم عام و خاص ہر طبقہ کے لوگ کا پور میں ہی کرتے ہیں، اور اب عرف بھی ہو گیا تو ایسی حالت میں جائز ہو یا نہیں؟

جواب: عموم بلوہ کی وجہ سے کہ خاص و عام ایک ناجائز کام میں مبتلا ہوں، ہر ناجائز کام جائز نہیں ہو جاتا، بلکہ جس میں بوجہ اختلاف ائمہ کے کسی درجہ میں جواز کی گنجائش ہو وہاں عموم بلوہ کی وجہ سے کسی دوسرے کام کے قول کو اختیار کر لیا جاتا ہے، واللہ اعلم،

۸ رجب ۱۴۲۸ھ

کشف الغطاء عن کتابة النساء

متعلق تعلیم کتابت نسوان | سوال (۳) احقر ایک شبہ کے ازالہ کے لئے بذریعہ علیحدہ ہذا دست بستہ عرض کناں ہے، امیدوار ہوں کہ تسلی فرمادیں گے، بہشتی زیور اس وقت میرے سامنے نہیں لیکن مجھے یاد پڑتا ہے کہ آنجناب نے کسی حصہ میں تصریح فرمائی ہے کہ لڑکیوں کو بقدر ضرورت لکھنا، حساب، گرو وغیرہ کی تعلیم دی جائے، جس سے کہ خانگی حساب کتاب درست رکھیں، اور غیر کی احتیاج نہ رہے،

لیکن مختار بن احمد مؤید پاشا عظمیٰ نے اپنے ایک سالہ موسومہ فیصل الخطاب مطبوعہ بیروت میں اس کے خلاف تصریح کر کے تائید میں ایک حدیث نقل کی ہے، جس کو ترمذی میں نوادر الاصول میں نکالا ہے، اس کو بعض نے موضوع کہا ہے، لیکن صاحب رسالہ کہتے ہیں کہ والمعتمد صحیحہ اور وہ حدیث یہ ہے ر لا تسکنوا نساءکم الغرف ولا تعلمھن الکتابۃ وعلموھن المغزل وسورة النور، گو عاجز کی اپنی قلبی تشفی کے لئے آنجناب کا بہشتی زیور میں محض لکھ دینا ہی کافی ہے، بندہ نے یہی سمجھا ہے کہ عورت کا غیر محرم کے پاس خط لکھوانے کے لئے جانا اور ہم کلام ہونا زیادہ خطرناک ہے، اور لکھنا آجکل خانہ داری کا جزو ہے لہذا اجازت دی گئی، لیکن چونکہ اس مسئلہ کو کبھی معرض تحریر و تقریر میں لانا پڑتا ہے تو اس لئے رفع تعارض اور حدیث کا محل مطلوب ہو، مدلل ہو گو مختصر ہو،

الجواب المجمل

اس حدیث کو حاکم نے مستدرک میں داخل کیا ہے اور اس کی تصحیح کی ہے، مگر تلخیص مستدرک میں ذہبی نے کہا ہے قلت بل موضوع وافتہ عبد الوہاب قال ابو حاتم کذاب ام (ص ۳۹۶ ج ۲) اور سیبقتی نے شعب الایمان میں دوسرے طریق سے بھی اس کو روایت کیا ہے، جس میں محمد بن ابراہیم شامی ہے جس کے بارے میں ابن جوزی نے کہا ہے کان یضع الحدیث وقال الحافظ ورماء ابن حبان بالوضع اور اس حدیث کو ابن حبان نے تیسرے طریق سے روایت کیا ہے، ابن عباس سے، جس میں جعفر بن نصر ہے، جس کے متعلق ابن جوزی وابن عدی نے کہا ہے حدث عن الثقات بالبواطیل ام من الآلی المصنوعة (ج ۲ ص ۹۲ و ۹۳) اور ذہبی نے جعفر بن نصر کو مستہم بالوضع کیا ہے

اور اس کے ترجمہ میں حدیث مذکور اور چند احادیث ذکر کر کے کہا ہے کہ وہ نہ اباطیل
کذا فی لسان المیزان (ص ۱۳ ج ۲) اور اس کے معارض ابوداؤد کی حدیث ہے، عن الشفاء
بنت عبد اللہ قالت دخل علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وانا عند حفصة
فقال لی الا تعلمین ہذا رقیۃ النملۃ کما علمتہا الکتابۃ ام ورجال اسناد
رجال الصحیح الامتیح ابی داؤد ووثقہ واخرجه احمد فی مسندہ (ص ۱۲
ج ۴ مع العون) والحاکم وصححه هو والذہبی علی شرط الشیخین (ص ۵۵)
پس صاحب رسالہ فصل الخطاب کا حدیث لا تعلمون الکتابۃ کے متعلق واپس
صحیح کہنا صحیح نہیں، جبکہ قدما محققین حفاظ اس کو وہی اور موضوع کہہ چکے ہیں، اور
حدیث شفاء سے ابن تیمیہ وخطابی وابن القیم نے جواز کتابت للنساء پر استدلال کیا ہے
(معون صفحہ مذکور) واللہ اعلم،

تتمتہ؛ ہاں اگر کسی جگہ عورتوں کو خط و کتابت سکھانے سے مفاسد کا خطرہ
ہو تو وہاں دوسرے دلائل فقہیہ کی وجہ سے منع کیا جائے گا، کیونکہ مباح مفضی الی اثر
ہو جائے تو ممنوع ہو جائے گا، اور اگر یہ حدیث صحیح ہوتی تو اس کا محل یہی ہوتا،

۵، ج ۲ ص ۱۳۵

لڑکیوں کی تعلیم کے | سوال (۴) لڑکیوں کو اسکول میں پڑھنا جائز ہے یا نہیں، اگرچہ
متعلق ایک سنتوں نے | پڑھانے والی عورت ہی ہو، یہ مسئلہ ناجائز کر کے کسی کتاب میں بھیج
ملا تھا، مگر اس وقت وہ جگہ میں بھول گیا ہوں، لہذا کتاب کا نام و صفحہ بھی لکھ دیجئے،
الجواب؛ لڑکیوں کو اسکول میں پڑھانا چند وجوہ سے ناجائز ہے؛ (۱) عموماً
اسکولوں میں دینیات کی تعلیم نہیں ہوتی، بلکہ بعض کتابیں ایسی پڑھائی جاتی ہیں جن سے
لڑکیوں میں دین سے آزادی پیدا ہو جاتی ہے، (۲) پڑھانے والی عورت دیندار نہیں
ہوتی، اور استاد کا اثر شاگرد پر ضرور ہوتا ہے، اس لئے صحبت بد سے لڑکیاں خراب
ہو جاتی ہیں، اور شریعت میں صحبت بد سے بچنے کی سخت تاکید ہے، (۳) اس صورت میں
پردہ کی احتیاط نہیں ہو سکتی، جیسا کہ مشاہدہ ہے، اور اس بے احتیاطی سے بعض دفعہ
ناگوار صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں،

۲، ربیع الثانی ۱۳۴۲ھ

جاہل کو وعظ کہنا جائز نہیں | سوال (۵) مولانا: یہاں پر ایک حافظِ قرآن ہے جو سوائے قرآن شریف کے کچھ بھی علم نہیں رکھتا ہے، جا بجا وعظ کہتا ہے اور اکثر مسائل غلط بیان کرتا ہے، اگر اس سے کہا جاتا ہے کہ کسی عالم مستند کی کتاب لے کر بیان کیا کرو، کیونکہ مولانا صاحب مدظلہ کا فرمان ہے کہ جب تک صاحبِ علم نہ ہو ان کو بیان کرنا جائز نہیں، اور اس سے گرا ہی پھیلنے کا اندیشہ ہی، تو اس پر نہایت بُرا مانتا ہے، یہاں پر ایک جلسہ میں وعظ ہوا، جس میں بیرونیجات کے اکثر دیہاتی جمع تھے، اور اثنائے وعظ میں (فَا تَوَّأَحْرَ فَمَكْمُ) کے تحت میں حافظ نے کہا کہ عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں خواہ پیچھے سے آدیا آگے سے، دونوں طرف سے جو تنا جائز ہے، حالانکہ اسی جلسہ وعظ میں ایک عالم صاحب بھی تھے، جو محض شرکی وجہ سے اس نے سکوت کیا، لیکن جب ایک عالم صاحب مطلع ہوئے تو انھوں نے کہا کہ (دعای فی الدبر) اجماع قطعی سے حرام ہے اور اس کا حلال جاننے والا اسلام سے خارج اور بیوی مطلقہ ہوئی، الغرض جب تک تجدیدِ ایمان و نکاح نہ کرے تب تک صحبت حرام اور اولاد حرامی، اور اگر لاعلمی سے کہا ہو..... تو اسی طرح جلسہ کر کے اُن لوگوں کو پھر بلوادیں، اور سب کے سامنے توبہ کریں، اور جب تک توبہ نہ کریں اس کے پیچھے نماز ناجائز ہے، اور جنھوں نے لاعلمی سے اُن کے پیچھے نماز پڑھی اطلاع پانے پر اپنی نمازوں کو لوٹا دیں، اور اس مولانا نے جو جلسہ میں موجود تھے اظہارِ حق سے جو سکوت کیا تھا اس پر بھی فتویٰ دیا، کہ ان کے حقِ حدیث میں انہیں کا حکم ہے مولانا بھی توبہ فرمادیں، اور جب حافظ مذکور کو خبر ہوئی تو اس نے مولانا صاحب فتویٰ دینے کے حق میں بہت سے مغالطات گالیاں بچیں لیکن مولانا صاحب نے کچھ نہ فرمایا، بلکہ اس پر صبر و تحمل فرمایا،

اب آنجناب والا کی خدمت میں عرض ہے کہ جو مولانا صاحب نے فتویٰ دیا وہ قابلِ عمل ہے یا نہ اور حافظ مذکور کی توبہ کرنے کی کیا صورت ہے، اور آیا ہم لوگ اپنی نمازوں کو دہرا دیں، ہم سب چونکہ حضور کے خادم ہیں، حضور کرم فرما کر چند سطور تحریر فرمادیں، ہم لوگ نہایت شش و پنج میں مبتلا ہیں اور جواب کے منتظر ہیں، زیادہ والسلام

الجواب، اس جاہل کو وعظ کہنا جائز نہیں، نہ مسلمانوں کو اس کا وعظ سننا جائز ہے، مگر جو مضمون اس جاہل نے بیان کیا ہے اس کا جس قدر حصہ سوال میں مذکور ہے اس سے اس وعظ جاہل پر کفر عائد نہیں ہوا، نہ اس کی بیوی مطلقہ ہوئی، نہ نکاح فسخ

از کتاب بھون، ج ۱، ص ۲۷۴

حدیث طلب العلم فریضه

سوال

کے متعلق چند سوالات

۱۔ فرمانِ نبوی صلعم طلبُ العلمِ فریضۃٌ علی کلِّ مسلمٍ و مسلمۃٍ میں لفظ فرض سے کیا مطلب ہے، فرض کفایہ ہے یا فرض غیر کفایہ؟ اور کیا فرض ہونے کی صورت میں لازم ہے ہر شخص کو کہ وہ دورۂ حدیث تک پڑھے، یا بقدر حاجتِ دینی جس سے کچھ مسئلہ مسائل معلوم ہوں؟

۲۔ اور یہ کہ حدیث شریف کے عموم میں ہر شخص خواہ اس کو قابلیت علم پڑھنے کی ہو یا نہ ہو داخل ہے، اور کیا جس شخص میں قابلیت نہ ہو اس کا پڑھنا کیسا ہے، آیا جائز ہے، یا ناجائز؟ قابلیت کا یہاں یہ معیار ہے کہ یا تو حد درجہ بیوقوف ہو جو فقہ و حدیث سمجھ نہیں سکتا، یا اس قدر تیز واقع ہوا ہے کہ اصولِ موضوعہ کے ذریعہ غلط قیاس کر کے لوگوں کو بہکا نا کر

۳۔ اور کیا ہر وہ شخص جو صرف و نحو ابتدائی تعلیم سے بے بہرہ ہو یا اس کو اصولِ فقہ و فقہ سے بالکل ناواقفیت ہو، یا تھوڑی سی ادنیٰ درجہ میں واقفیت ہو اس کو فقہ و حدیث کی انتہائی کتاب پڑھنا کیسا ہے؟

۴۔ اور کیا علم مضرت رساں بھی کسی صورت میں کسی کو ہو سکتا ہے ؟ بینوا تو جردا

جنزاکم اللہ تعالیٰ،

جوابات؛ طلبِ علمِ دین کے دو درجے ہیں، ایک فرضِ عین، ایک فرضِ کفایہ
فرضِ عین کا درجہ یہ ہے کہ پاکی ناپاکی، وضو، نماز، روزہ کے احکام معلوم کر لے، عقائد
ضروریہ و فرائضِ اسلام کا علم حاصل کر لے، خواہ اردو میں یا عربی میں، یا صحبتِ اہل علم
کے ذریعہ سے، پھر اگر یہ شخص مفلس ہے صاحبِ نصاب نہیں تو اس کے ذمہ زکوٰۃ کے
احکام تفصیلیہ کا جانتا ضروری نہیں، اگر صاحبِ نصاب ہو تو زکوٰۃ کے احکام کا نا بھی

۱۲۔ لفظ مسلمہ حدیث میں نہیں ہے ۱۲ ظ

ضروری ہے، اگر زیادہ مالدار ہو تو حج کے احکام تفصیلیہ جانتا بھی ضروری ہے، بواحد من الطرق المذكورة، پھر اگر اس شخص کو بیع و شراء کی ضرورت بھی واقع ہوتی ہے تو احکام بیع و تجارت کا جانتا بھی ضروری ہے، اور اگر یہ شخص نکاح کرنا چاہے تو احکام نکاح بھی جانتا ضروری ہے، و علیٰ ہذا جس کام میں مشغول ہو اس کے احکام جانتا لازم ہے، بواحد من الطرق المذكورة،

اور فرض کفایہ یہ ہے کہ علم دین میں تجرہ حاصل کیا جاوے ایسا کہ لوگوں کو احکام دین بتلا سکے، اور ضعفاء کے شکوک و ادہام کا ازالہ کر سکے، اور مخالفین اسلام کے اعتراضات کا جواب دے سکے، یہ فرض کفایہ ہے، ہر شہر میں ایسی عالم کا ہونا ضروری ہے، اگر کسی شہر میں ایک عالم بھی ایسا نہ ہو تو وہاں کے سب مسلمان گنہگار ہوں گے، ورنہ نہیں،

۲۔ علم دین کا جو درجہ فرض کفایہ ہے یعنی تجرہ فی العلم اس کا محل ہر شخص نہیں بلکہ صرف وہی ہے جس میں علم کی قابلیت اور تجرہ کی لیاقت ہو، جس کی طبیعت میں سلامتی ہو، اور جس کی طبیعت میں سلامتی نہ ہو یا عقل نہ ہو اس کو تجرہ لازم نہیں، بلکہ اس کو متجرب بنانا جائز بھی نہیں، اور جو درجہ فرض عین ہے اس سے کوئی مستثنیٰ نہیں، نہ عاقل نہ کم عقل، کیونکہ وہ درجہ سہل الحصول ہے،

۳۔ بدون علم مبادی کے انتہائی کتب پڑھنا اور پڑھانا جائز نہیں، الا ان یکن سلیم الطبع ثاقب الذہن لایخشی علیہ خلط الحق بالمبطل و مثل ذلک نادر جدا،

۴۔ فرض عین کا درجہ کسی حال میں مضر نہیں، اور تجرہ کا درجہ بعض احوال میں مضر ہے، اور وہ وہی احوال ہیں جن میں اوپر تجرہ سے بعض کو منع کیا گیا ہے، اور یہ جو مشہور ہے کہ علم بلا عمل مضر ہے صحیح نہیں، بلکہ اس حالت میں بھی علم نافع ہے، کیونکہ اس سے توبہ و استغفار کی ہدایت ہوتی ہے، اور یہ بھی عمل کا ایک درجہ ہے، واللہ اعلم،

۳۰ رج ۱۸۸

سوال (۲)، بعض ممبران کونسل کو شش کر رہے ہیں کہ صوبہ یوپی میں لڑکیوں کی واسطے بھی جبریہ تعلیم کا قانون بنادیا جائے، کیا ایسا قانون مذہب اسلام کی رو سے جائز ہے؟ اگر جائز نہیں ہے تو مسلمان ممبروں کو نیز دیگر اہل اسلام کو اس کی مخالفت کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ بینوا تو جسروا،

لڑکیوں کیلئے جبریہ تعلیم کا قانون بنانا مذہب اسلام کی رو سے جائز ہے یا نہیں، اور کیا مسلمانوں کی اس کی مخالفت کرنی چاہیے؟

الجواب: یہ تجویز مذہب اسلام کے سراسر خلاف ہے، اور اس کا خلاف اسلام ہونا بالکل ظاہر ہے، مگر افسوس کہ اس زمانہ میں ظاہر سے ظاہرات پر بھی دلیل قائم کرنا پڑتی ہے، اس لئے مختصر طور پر عرض ہے کہ لڑکیوں کی جبریہ تعلیم میں وہ خرابی بدرجہ اولیٰ ہے جو لڑکوں کی جبریہ تعلیم میں مشاہد ہو چکی، یعنی اس قانون کو جاری کرنے والے تعلیم قرآن و دینیات کی حتی الوسع بیخ کنی کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑتے، گو قول خداوندی یُرِیْدُ دَنْ لِّطُفُوْا قَوْلَ اللّٰهِ یَا قَوْمِ اٰھِیْمُمْ وَاَللّٰھُ مُتِمُّ نُوْرٍہِ وَ لَوْ کَرِهَ الْکٰفِرُوْنَ کے مطابق وہ لوگ اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہوتے، گویا قرآن شریف ان نام ہناد مسلمانوں کی اس بیہودہ سعی کو دیکھ کر یہ کہتا ہے ۵

قتلِ این خستہ بشمشیر تو تقدیر نبود ۶ ورنہ هیچ از دل بے رحم تو تقصیر نبود
اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے روز ایسے ہی لوگوں کے بارے میں دربار خداوندی میں یہ شکایت پیش کریں گے: یَا رَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ہٰذَا الْقُرْآنَ مَجْوَزَۃً،

مسلمانوں کو لازم تھا کہ لڑکوں کی تعلیم کو حدود شرعیہ میں رکھتے، اور اس جبریہ تعلیم کے قانون سے تعلیم قرآن شریف پر کوئی اثر نہ آنے دیتے، جیسا کہ ان کو مسئلہ ۱۱۴م میں ایک مدلل اور مفصل فتویٰ شائع کر کے آگاہ کیا گیا تھا، جس پر تھانہ بھون، بہارنپور، دیوبند اور دہلی وغیرہ علمائے کرام نے متفقہ تصدیقات تحریر فرمائی تھیں،

مگر افسوس کہ اصلاح کی بجائے اور ایک قدم بربادی اور تباہی کی طرف اٹھانے لگے کہ لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں میں بھی اس زہریلے اثر کو پھیلانے کے متمنی اور ساعی ہیں، ابھی وقت ہے کہ بہت سہولت کے ساتھ مسلمان اس اخلاق اور دین کو تباہ کر نیوالے قانون سے محفوظ رہ سکتے ہیں، پس ان کو لازم ہے کہ اس وقت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں، اور جان توڑ کوشش کر کے اس تجویز کو مسترد کر دیں

اول تو تعلیم قرآن میں حاج ہونے ہی سے واضح ہے کہ یہ قانون خلاف شرع ہے، مذہب اسلام ہرگز اس کی اجازت نہیں دے سکتا، دوسرے اس میں اس خرابی کے

۵ یہ فتویٰ مولانا الیاس صاحب مقیم نظام الدین دہلی سرپرست انجمن خادم القرآن بازار بلیمارانجھلی نے چھپوایا تھا، اور مدرسہ امداد العلوم تھانہ بھون میں بھی موجود ہے ۱۲

علاوہ جو لڑکوں کے متعلق بیان کی گئی اور بھی بہت خرابیاں موجود ہیں جن میں سے ہر ایک اس کی مستقل دلیل ہے کہ یہ قانون شرع اسلام کے خلاف ہے، بطور مشتمل نمونہ از خروار کے کچھ بیان کی جاتی ہیں۔

(۱) اسلام میں پردہ کی بے حد تاکید وارد ہے کہ بلا ضرورت گھر سے باہر قدم نکالنے ہی کی اجازت نہیں، لقولہ تعالیٰ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى، اور حکم ہے وَلَا يَضُرُّنَّ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ زِينَتِهِنَّ، اس سے اندازہ ہوتا ہو سکتا ہے کہ جب زیور تک کی آواز کا پردہ ضروری ہے تو پھر عورت کی آواز کا پردہ کس قدر ضروری ہوگا، اور خود عورت کو کس قدر گہرا پردہ کرنا لازم ہوگا،

الغرض پردہ کرنا اسلام کا ایک تاکید می حکم ہے، اور آج کل بے علم اور کم فہم لوگوں نے اس پر جو شبہات کئے ہیں رسائل ذیل کے دیکھنے سے ان کا قلع قمع ہو جاتا ہے، لطائف رشیدیہ، مؤلفہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ،

القول الصواب فی مسئلہ الحجاب، ثبات الستور لذوات الخدور، القاء السکینہ فی تحقیق ابدار الزینۃ ہر سہ از حضرت مولانا تھانوی دامت برکاتہم، قول الصواب جو ایک صاحب نے نو تعلیم یافتہ لوگوں کے مذاق کی رعایت کر کے لکھا ہے، اور ظاہر ہے کہ اس تعلیم میں پردہ ہونا محال ہے، گو وہ لوگ جو دھوکہ دینا چاہتے ہیں یا خود دھوکہ میں پھنسے ہوئے ہیں اس کے مدعی ہیں کہ ان زمانہ اسکولوں میں پردہ کا کافی سے زیادہ انتظام ہے، مگر ذرا غور کیا جاوے تو واضح ہو جاوے گا کہ اول تو یہ ضرورت ہی شریعت کے نزدیک اس درجہ کی نہیں جس کے لئے گھر سے نکلنے کی اجازت دی جائے، اور اگر بالفرض اس کو ضرورت بھی تسلیم کر لیں تو جس درجہ میں شرعاً پردہ ضروری ہے اس کا انتظام اسکول میں ہرگز نہیں ہو سکتا، کیونکہ اکثر لڑکیاں بے خبری کی وجہ سے پورے پردہ کا خود اہتمام نہیں کر سکتیں، بلکہ ان کے سرپرست ان کو ہر موقع پر مناسب ہدایت کرتے رہتے ہیں، اسکول میں ان کو کون ہدایت کرے گا، خاص کر جب کہ خود استانی صاحبہ بے پردگی اور آزادی کی حامی ہو، پردہ کا اہتمام تو درکنار بہت جگہ بیہودہ استانی کی بدولت عفت سوز واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں، اسی طرح راستے میں آتے جاتے میں پوری حفاظت کا انتظام برائے گفتق ہی ہوتا ہے، اور جس اسکول میں استانی غیر مسلم ہو یا غیر مسلم لڑکیاں بھی تعلیم پاتی ہوں وہاں غیر مسلم عورت سے تو پردے کا محال

ہونا ظاہر ہے، حالانکہ شریعت مقدسہ میں غیر مسلم عورت سے بھی ہتھیلی اور چہرے کے سوا تمام بدن کا چھپانا فرض ہے، کما صرح بہ الفقہاء والمفسرون واستدلوا بقولہ تعالیٰ اونسائہن، اگر کوئی صاحب شبہ کریں کہ جبریہ تعلیم بالغ عورتوں کے واسطے نہیں ہے جبے پردگی کا اعتراض وارد ہو سکے، اس کا جواب یہ ہے کہ نابالغ پردہ کا حکم عائد نہ سمجھنا غلط ہے، شریعت مقدسہ کی رو سے مراہقہ کا حکم بالغہ کے مثل ہے، اور مراہقہ نو سال کی عمر میں شمار کی جاتی ہے، کما صرح بہ الفقہاء قاطبہ، بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ سات آٹھ سال کی عمر میں کسی قدر پردہ شروع کیا جاوے تاکہ زمانہ مراہقہ تک عادت ہو جاوے جیسا کہ دیندار خاندانوں میں دستور ہے، اور آجکل زمانہ کی نازک حالت کو دیکھتے ہوئے یہ ضرورت زیادہ شدید ہو جاتی ہے، پس جب سات سالہ بچی کو پردہ میں رکھنے کی ضرورت ہے اور نو سال کی عمر میں بالغہ کے مثل حکم دیا گیا ہے، تو پھر کم سنی کا وہ زمانہ کہاں بچا جس میں پردہ کی ضرورت نہ ہو اولہ تعلیم کے قابل ہو، اور یہ بات مخفی نہیں کہ جبریہ تعلیم کا قانون بارہ سال کی عمر تک جاری ہوتا ہے، جس کی زد میں یقیناً وہ لڑکیاں آتی ہیں جن پر پردہ فرض ہے، بلکہ بہت سی ان میں حقیقۃً بالغ ہوتی ہیں،

امید کہ اس مختصر تحریر میں غور کر کے حکم خداوندی کو بسر و چشم منظور کریں گے، اور ہرگز اس بے حیائی کو گوارا نہ کریں گے، جس طرف ان کو یہ پرفتن زمانہ بلارہا ہے، ورنہ دین اولہ دنیا و دنوں کا نقصان اٹھانا پڑے گا،

۲۔ صحیح حدیث شریف میں ہے لا تنزلوہن الغرف ولا تعلموہن الکتابۃ وعلومہن المغزل وسورۃ النور رکن اعمال بحوالہ کھب عن عائشۃ وسکت عنہ السیوطی فہو صحیح عندہ ایضاً اس ارشاد مبارک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کی تربیت میں سخت احتیاط کی ہدایت فرمائی ہے، اور ان کو کتابت سکھلانے سے منع فرمایا ہے، گو بعض خاص مواقع اس ممانعت سے مستثنیٰ ہو سکتے ہیں، مگر عام طور پر عورتوں کو کتابت سکھلانے کی ممانعت ہی ہے، کیونکہ ان کے لئے اس علم میں نفع کم ہے اور ضرر کا اندیشہ زیادہ، اور اسی پر قیاس کر کے دیگر علوم غیر ضروریہ مثل جغرافیہ وغیرہ کا حال بھی معلوم ہو گیا، اور یہ مضامین جبریہ تعلیم کے نصاب میں لازمی ہیں، اس سے بھی صاف واضح ہو گیا کہ یہ قانون مذہب اسلام کے خلاف ہے،

۳۔ مختلف عقائد و خیالات کی استانیوں اور لڑکیاں جمع ہوتی ہیں، جس کے باعث لڑکیوں پر کم عقلی کی وجہ سے بہت بُرا اثر پڑتا ہے، جس کا مشاہدہ ہزاروں جگہ ہو چکا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ اگر مسلمان اپنے ہاتھوں اپنی معصوم بچیوں کو بے دین اور بے حیا بنانا چاہتے ہیں تب تو خیر، ورنہ ان کے مذہب کی حفاظت اسی میں ہے کہ اس جبریہ تعلیم کے قانون کی سخت مخالفت کریں، وما علینا الا البلاغ

کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون

مورخہ ۹ ربیع الثانی ۱۳۵۲ھ

جواب عین صواب ہی، بلکہ بعضے.... مدعیان اسلام فرقے بھی اپنے خاص عقائد کے سبب فتوے کی رو سے مسلمان نہیں ہیں، اگر معلم اس فرقہ کی ہوئی تو مسلمان لڑکیاں اس سے بھی شرعاً ویسا ہی بدن چھپائیں جیسا کہ فرعون سے، اور اس کی دشواری اوپر معلوم ہو چکی ہے، کتبہ اشرف علی، ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۵۲ھ

فصل فی تعظیم العلم والعلماء و آداب الفتاویٰ

علوم دینیہ کی تعلیم و تحصیل کی ضرورت اور طالبان علم دین پر اہل دنیا کے اعتراف کا جواب

سوال (۱) دو برادر زید اور عمرو میں اختلاف ہے؛ زید فرماتے ہیں کہ تحصیل علوم مذہبی سے اکثر علماء و طلباء بدکار و طماع و مفلس و سائل ہو جاتے ہیں، اور سوال حرام ہے، اور قوم کے لئے باعث ننگ ہے، اور تحصیل علوم دنیادی مثل انگریزی وغیرہ کے قوم کے لئے باعث فخر و عزت و مالداری ہے، اور اس مال سے آئندہ ہم دین کی مدد کر سکتے ہیں، ہماری غرض اس کی تحصیل سے یہی ہے، رہا جوانوں کا فسق و فجور میں مبتلا ہو جانا تو تجربہ سے ہم کو یقین ہے کہ وہ آخر عمر میں گناہوں سے تائب اور اصلاح پذیر ہو جائیں گے، اور تعلیم موجودہ سے عقائد میں خرابی پیدا نہیں ہوتی، اور دینیات میں سے صرف قرآن شریف بغیر ترجمہ کے پڑھ لینا اور چند مسائل ضروریہ سے واقف ہو جانا کافی ہے،

چنانچہ زید نے اس خیال سے اپنے فرزند قریب تحصیل کو اسلامی مدرسہ سے اٹھالیا اور تفسیر و حدیث اور صحبت نیک سے علیحدہ کر کے آزادوں کی صحبت اور علوم دنیادی میں ڈال دیا اور تاکید فرائض نماز روزہ اور وضع اسلامی ترک کر دیا،

عمر فرماتے ہیں کہ گذر معاش کے واسطے کسب سہر بھی کیا کرے اور رفع ضرورت کو انگریزی بھی پڑھے، اور تحصیل علوم دینی جن کی فی زمانہ اشد ضرورت ہے اور منجملہ فرائض کے ہیں ان کا شغل بھی رکھیں، تاکہ آئندہ اس کے عقائد پر بد اثر نہ پڑے، اس وقت دونوں صاحبوں نے آپ کے فیصلہ پر رضامندی ظاہر کی ہے، جواب مدلل بدلیل، قرآن و حدیث تحریر فرمادیں کہ دونوں صاحبوں سے کون حق پر ہے؟

الجواب: زید کا یہ کہنا کہ تحصیل علوم مذہبی سے اکثر علماء طلباء بدکار و طماع و مفلس وسائل ہو جاتے ہیں، اگر اس کا یہ مطلب ہو کہ علوم مذہبی کا یہ اثر ہے تو بالکل غلط ہے، علم دین کافی نفسہ خاصہ یہ ہے کہ اس سے تقویٰ و طہارت و استغناء کی شان پیدا ہوتی ہے، لیکن جو لوگ علم دین پڑھنے کے بعد بھی بدکار رہتے ہیں وہ علوم دنیا پڑھ کر اس سے زیادہ بدکار ہوتے ہیں، پس بدکاری کا سبب زیادہ تر بچپن کی تربیت کا خراب ہونا ہے، اگر بچپن میں والدین بچوں کو گناہوں سے ڈراتے دھمکاتے رہیں، اور بد معاش لڑکوں کی صحبت سے بچاتے رہیں تو علم دین پڑھ کر یہ اوصاف درجہ کمال کو پہنچ جاتے ہیں، اور اگر بچپن میں تربیت خراب رہی تو علم دین سے اس کی کسی قدر اصلاح ہو جاتی ہے، مگر پوری اصلاح نہیں ہوتی، اور اگر ایسے لڑکے کو انگریزی پڑھائی گئی تو اس کی بد معاشی اور زیادہ بڑھ جائے گی، کیوں کہ اس میں گناہوں پر وعید و عذاب کا سبق ہی نہیں ہوتا،

رہا بعض علماء کا طماع و وسائل ہونا تو یہ بھی علم دین کا اثر نہیں، بلکہ یہ اس کا اثر ہے کہ عام طور پر عربی پڑھنے والے غریب اور مزدوری پیشہ اور حسب و نسب میں ادنیٰ طبقہ کے ہوتے ہیں، جن میں یہ خصلتیں پہلے سے راسخ ہوتی ہیں، پھر یہ لوگ ابتداء ہی سے مدرسہ کی روٹی اور کپڑے کے سہارے تعلیم حاصل کرتے ہیں، جس سے حرص و طمع کا مادہ بڑھ جاتا ہے، لیکن اہل مدارس کا اس میں قصور نہیں، اگر وہ غریب اور روٹی اور کپڑے کی امداد نہ کریں تو علم دین حاصل کرنے والا ایک بھی نہ رہے، اس میں سراسر مسلمانوں کا قصور ہے کہ جو لوگ حسب و نسب اور شرافت و تمول میں اعلیٰ طبقہ کے ہیں وہ علم دین سے متنفر ہیں، اگر یہ لوگ اپنی اولاد کو اسی فراخ دلی کے ساتھ تعلیم دینی میں مشغول کریں جیسا کہ انگریزی تعلیم میں وہ اُن پر ہزاروں روپیہ خرچ کرتے ہیں، کہ ہر مہینے میں تیس چالیس روپے اُن پر خرچ کر دیتے ہیں، اور علم دین سے فایز کر کے ایک سال کے لئے ان کو کسی محقق طبیب روحانی کے سپرد کر دیں تو ان میں

ہرگز یہ خصلتیں نہ پیدا ہوں گی، یہ ضرور ہے کہ اس صورت میں یہ عالم ہزاروں روپے کمانے والا نہ ہوگا، مگر استغنا رکاوہ جو ہر اس میں ہوگا جس کے سامنے وہ ہفت تسلیم کی سلطنت کو بیچ سمجھے گا، مگر آجکل متمول اور شریف لوگ اول تو اپنی اولاد کو دینی تعلیم سے بچاتے ہیں، اور اگر کسی نے دین میں مشغول بھی کیا تو اس پر روپیہ خرچ کرنے سے ہاتھ روک لیتے ہیں، پھر ایسے لوگوں میں طمع و حرص نہ پیدا ہو تو اور کیا ہو،

الغرض حسن خلق و عادات کی درستی زیادہ تر شرافت اور حسب و نسب اور بچپن کی عمدہ تربیت سے ہوتی ہے، اس کے بعد علم دین کا اثر اس پر پوری طرح ظاہر ہوتا ہے، اور اگر کسی طالب علم کو یہ باتیں میسر نہ آئیں تو والدین کو چاہئے کہ اس کو علم دین کے بعد کسی شیخ کامل کے سپرد کریں اس کے بعد ہرگز علماء و طلباء میں یہ امر اصرار نہیں رہ سکتے، **إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ**، لیکن میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ علم دین ہر حالت میں خواہ اس کے بعد وہ عالم کیسا ہی ہو دنیاوی علوم سے مقدم اور نافع ہے، جو شخص علم دین پڑھنے کے بعد بھی طماع و سائل رہے وہ دنیاوی علوم پڑھ کر رشوت خوری وغیرہ میں مبتلا ہوگا، اور رشوت لینے میں اور بھیک مانگنے میں کیا فرق ہے، ہاں ایک فرق ہے کہ سوال کر کے لینا خوشامد سے ہوتا ہے، اور رشوت ستانی گلا دبا کر، نیز یہ بھی فرق ہے کہ طماع و سائل اگر کسی سے کچھ مانگتا ہے تو چاہے اس کو سوال کا گناہ ہو مگر دینے والے کو تو ثواب مل جاتا ہے، اور رشوت ستانی میں دینے والے کو کچھ بھی ثواب نہیں ملتا، بلکہ اکثر مواقع میں اس کو بھی گناہ ہوتا ہے، اور لینے والے کو تو گناہ ہوتا ہی ہے، زید کا یہ کہنا کہ تعلیم موزودہ سے عقائد پر اثر نہیں پڑتا، تجربہ اور مشاہدہ کے بالکل خلاف ہے، اس کو جا کر کسی کالج میں چند دن قیام کر کے دیکھنا چاہئے، کہ مسلمان لڑکے احکام مذہبی کے ساتھ کس تمسخر سے پیش آتے ہیں، اور ان کو مذہب میں کیسے شکوک و اوہام پیدا ہوتے ہیں، علم دین سے عقائد پوری طرح محفوظ رہتے ہیں، اور عادات و خصائل کی بہت کچھ اصلاح ہو جاتی ہے، بشرطیکہ بچپن کی تربیت عمدہ ہو، اور بڑی صحبت سے اس کو بچایا گیا ہو، اور اساتذہ نے بھی اس کو علم پر عمل کرنے کی تاکید پوری طرح کی ہو، اور اساتذہ خود بھی عالم باعمل ہوں،

رہا افلاس کا مسئلہ تو اس کی بابت یہ عرض ہے کہ علم دین کو دنیا کمانے کے واسطے حاصل کرنا خود ممنوع ہے، علم دین اس کے لئے موضوع نہیں، پس جس شخص کو اپنی اولاد سے دنیا

کا اکتساب مقصود ہو اس کو چاہئے کہ علم دین کو اس کا ذریعہ نہ بناوے، بلکہ علم کے بعد اس کو کوئی صنعت و حرفت سکھائے جس سے وہ دنیا حاصل کر سکے،

پس خلاصہ یہ ہے کہ جس کو دنیا کا مقصود ہو تو بقدر ضرورت عقائد و احکام سیکھ کر خواہ اردو میں خواہ عربی میں کسی دنیوی کام میں لگے، اور جس کو محض دین کی خدمت مقصود ہو اور اپنی آخرت کا درست کرنا ہو وہ علم عربی علماء باعمل سے حاصل کرے، اور بعد فراغ کے کسی شیخ کا اہل کی صحبت میں رہے۔ اس شخص کو دنیا چاہے کم ملے مگر راحت و اطمینان اہل دنیا سے زیادہ نصیب ہوگا،

اب آگے اپنا ان تمام دعاوی پر دلائل تحریر کرنا ہوں اسکے بعد یہ عمر کے اقوال میں مفصلہ کر دیں گے، واللہ الموفق
عن عبد الله بن عمرو قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم رجل حامل فقه غير فقيه ومن لم ينعه علمه ضربه جملته أقرأ القرآن ما نكح الفان لم ينهك فلت تقرعه رواه الطبرانی في الكبير وفيه شهر بن حوشب ترغيب ص ۳۳، قلت وثقه بعضهم، وعن أبي هريرة رضي قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الناس معادن كعادن الذهب والفضة خيارهم في الجاهلية خيارهم في الإسلام إذا فقهوا، رواه مسلم، ومشكوة ص ۲۱، قال في العاشية عن المرقاة فالمعنى خيارهم بمكارم الاخلاق في الجاهلية خيارهم في الإسلام ايضا بها اذا فقهوا.... اذا صاروا لافقيها اي اذا استروا في الفقه والا فالشرف لا فقه منه ۱۲ عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم فقيه واحد اشد على الشيطان من الف عابد رواه الترمذي وابن ماجة (مشكوة ص ۲۲، ۱۱)

عن أبي هريرة رضي قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من تعلم علما مما يبتغى به وجه الله لا يتعلمه الا ليصيب به عرضا من الدنيا لم يجد عرف الجنة يوم القيامة يعني ربحها، رواه احمد وابوداؤد وابن ماجة (مشكوة)
عن عبد الله بن مسعود لو ان اهل العلم صافوا العلم ووضعوه عند اهل السواد وابه اهل زمانهم ولكنهم بذلوا على الدنيا لينا لوابه من دنياهم فها نوا عليهم سمعت نبيكم صلى الله عليه وسلم يقول من جعل اليوم هشا واحدا هم آخرته كفاه الله هم دنياه ومن تشعبت به اليوم احوال الدنيا

لم یبال الله فی اتی اودیتهما هلك رواه ابن ماجه ورواه البیهقی فی شعب الایمان
عن ابن عمر من قوله من جعل الموم الى اخره (ص ۲۵ مشکوٰۃ ج ۱۷)

عن ابی ذرؓ قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم یا ابا ذر لان تغدو فتعلم
ایة من کتاب الله تعالیٰ خیر لك من ان تصلی مائة رکعة ولان تغدو فتعلم بابا
من العلم عمل به اولم یعمل به خیر لك من ان تصلی الف رکعة رواه ابن ماجه
باسناد حسن (ترغیب ص ۲۵)

عن ابی هریرةؓ قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول الدنیا
ملعونۃ وملعون ما فیها الا ذکر الله وما والاه وعلما ومتعلما رواه الترمذی
وغیره وقال الترمذی حدیث حسن (ترغیب ص ۲۵)

وفی العقد الفرید قال عدی بن ارمطاة لایاس بن معاویة ولنی علی قوم من
القراء اولهم فقال له القراء ضابط یعملون للآخرۃ لا یعملون لك وضرب
یعملون للدنیا فما ظنك بهم اذا امکنتمهم منها ولكن علیک باهل البیوتات
الذین یتستحبون لاحسابهم فولیهم الله

ان دلائل سے واضح ہے کہ عمر و کا قول حق ہے اور زید کا دعویٰ بالکل باطل ہے، زید نے اپنی
اولاد کو جو قریب التحصیل تھے، حدیث و تفسیر و صحبت نیک سے الگ کرنے اور آزاد لوگوں کی
صحبت میں ڈال دینے اور فرائض نماز روزہ و بیع اسلامی کی تاکید ترک کرنے میں بڑا عظیم
کار تکاب کیا، اس حالت میں یہ اولاد آخرت میں اس کے کام نہ آئے گی، بلکہ دہال جان ہوگی
اور عالم ہو کر اس کے لئے ذریعہ نجات بننے کی امید غالب نھی، اور زید کو جو اعراض علم دینی
تعلیم پر ہیں اس کے جوابات اوپر گزر گئے، واللہ اعلم،

۲۸ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۰ھ

علماء کے اختلاف کی صورت | سوال (۲) بہت سے علماء کسی مسئلہ میں متفق ہیں اور بعض علماء
میں عوام کو کیا کرنا چاہئے | اس مسئلہ کے خلاف ہیں، اور عوام سب کو عالم سمجھتے ہیں، ان کو
اتنا معلوم نہیں کہ کون حق پر ہے اور کون ناحق پر، اب اس معنی کر کے عوام الناس کس کی
اتباع کریں کہ جس میں فلاح دارین ہو، اور لا تجتمع امتی علی الضلالة کے کیا معنی ہیں؟
الجواب: جب علماء میں کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو عوام کو یہ دیکھنا چاہئے کہ

کون عالم دنیا سے بے رغبت اور آخرت کی طرف زیادہ راغب ہو اور اتباع شریعت اور خوف خدا کی سفت کس میں بڑھی ہوئی ہے، پس جس عالم میں ان کے اعتقاد میں یہ اوصاف دوسروں سے زیادہ ہوں اس کا اعتبار کریں، آخر جب کسی مریض کے علاج و تشخیص میں چند طبیبوں کا اختلاف ہوتا ہے وہاں عوام کیا کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ جس کے ساتھ زیادہ اعتقاد ہوتا، اور جس کے ہاتھ میں دوسروں سے زیادہ شفاء معلوم ہوتی ہے، اسی کی رائے پر عمل کرتے ہیں، پس اسی طرح یہاں کرنا چاہئے، لا تجمیع امتی علی الضلالة کے معنی یہ ہیں کہ کسی وقت میں ساری امت غلط راستہ پر نہ ہوگی، کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ صحیح راستہ پر ضرور ہوگا، چنانچہ دوسری حدیث میں صاف تصریح ہے لا یزال طائفة من امتی ظاہرین علی الحق لا یضیئہم من غنا، لہم میری امت میں ایک جماعت حق پر ضرور رہے گی ان کو اس سے کچھ ضرر نہ ہوگا، کہ کوئی ان کا ساتھ چھوڑ دیں، اس حدیث میں لفظ طائفة موجود ہے جس کا اطلاق نونا آتا ہے، مطلب ظاہر ہے کہ ہر زمانہ میں ایک جماعت خواہ وہ شمار میں قلیل ہی ہو حق پر ضرور رہے گی، اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ کسی طرف کثرت کا ہونا اس کے حق پر ہونے کے لئے دلیل نہیں، کیونکہ ایسا ممکن ہے کہ قلیل جماعت حق پر ہو، اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ ایک عالم کا اختلاف بھی اجماع کے لئے قاذح ہے، اگر کسی مسئلہ میں ساری امت ایک طرف ہو اور صرف ایک عالم ان کے خلاف ہو تو اجماع نہیں کہتا جیسا کہ کیونکہ ممکن ہو کہ وہی ایک عالم حق پر ہو فافہم،

عالم پیر اور استاد کے | سوال (۳) آجکل عوام الناس کہ پیر یا استاد کو تفصیل الید والرجل ہاتھ پر چڑھنے کا حکم کرتے ہیں اور اختار یعنی سر جھکانے ہیں، جیسے سیدھے رکوع میں معلوم ہوتے ہیں، اور ارادۂ عزت عالم ہو..... اور مطلب اس کا سجدہ نہیں، اس کا کیا حکم ہے؟ حلت یا حرمت، بینوا توجروا؟

الجواب؛ عالم و والدین کی تفصیل ید ورجل جائز ہے مگر اخنا، مثل رکوع حرام ہے، واللہ اعلم، ۲۱ شعبان ۱۴۲۵ھ

اس شبہ کا جواب کہ مفتیان حنفیہ جواب استفتاء میں کتب فقہ کی عبارت کا حوالہ دیتی ہیں مگر قرآن و حدیث کا حوالہ نہیں دیتی، سوال (۴) احناف علماء جب کسی مسئلہ میں فتویٰ دیں گے تو

ہمیشہ ایسا درجہ دیکھا گیا، درمختار، ردالمحتار، شامی، عالمگیری وغیرہ دیکھو، یہ کہیں نہیں لکھتے
قال اللہ تعالیٰ یا قال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم، ایسا عمل کیوں ہے، حالانکہ قرآن و حدیث کا
حوالہ مؤمن کے واسطے زیادہ تسلی بخش ہے، اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

الجواب، آپ نے علماء احناف کی کتابیں دیکھی ہی نہیں، ہدایہ دیکھئے کہ جابجا آبا
واحادیث کا حوالہ دیتے ہیں، بدائع اور متوسط میں بھی ایسا ہی کیا ہے، خود درمختار اور ردالمحتار
میں بھی ایسا ہی کیا ہے، رہا یہ کہ آجکل کے مفتی قال اللہ وقال الرسول کا حوالہ کیوں نہیں دیتے،
اس کی وجہ یہ ہے کہ آجکل کے علماء احناف، بلکہ تمام علماء مقلد ہیں، یعنی وہ خود بلا واسطہ قرآن و
حدیث سے احکام استنباط کرنے کی قابلیت نہیں رکھتے، اس لئے جواب میں ان کتابوں کا حوالہ
دیدیتے ہیں جن میں قرآن و حدیث سے استنباط کر کے علماء مجتہدین نے احکام مقرر کئے ہیں
اور اگر وہ ایسا نہ کریں بلکہ از خود قرآن و حدیث سے استنباط کر کے جواب دینے لگیں تو مستفتی کو
ہرگز ان کی بات پر اطمینان نہ ہو وہ صاف کہہ دے گا کہ مجھ کو تمھارے فہم پر اعتماد نہیں نہ تمھارے
فہم کو میں حجت سمجھتا ہوں بلکہ یہ بتلاؤ کہ اس مسئلہ میں مجتہدین سلف نے قرآن و حدیث سے استنباط
کر کے کیا جواب دیا ہے، نیز خود ایسا مفتی بھی ہزاروں غلطیاں کرے گا، کیونکہ جب اس کو اجتہاد
کا درجہ حاصل نہیں تو قرآن و حدیث سے وہ کیا استنباط کرے گا، سوائے اس کے کہ ظاہری
ترجمہ کو پڑھ کر مخلوق کو دھوکہ دے، جیسا کہ اس مرض میں وہ جماعت مبتلا ہے جو آجکل اپنی
کو مجتہد کہتی ہیں، ان کے اجتہادات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ کس قدر غلطیاں کرتے
ہیں، چنانچہ آجکل کے ایک نام نہاد مجتہد کا ایک فتویٰ تو یہ ہے کہ قادیانی فرقہ کافر ہے، یہ تو صحیح
مگر اسی کے ساتھ یہ بھی فتویٰ ہے کہ قادیانیوں کے پیچھے مسلمانوں کی نماز صحیح ہے، بھلا کوئی اس سے
پوچھے کہ کافر کے پیچھے کیونکر نماز صحیح ہو سکتی، اور اگر صحیح ہے تو پھر اس میں قادیانیوں ہی کی کیا
تخصیص ہے، سب ہی کافروں کے پیچھے صحیح ہونا چاہئے، بس پھر ہندوؤں کو بھی امام بنا لیا کہ
اور عیسائیوں کو بھی درہیڑیوں کو بھی اور جب نماز میں یہ لوگ امام بن سکتے ہیں تو پھر ان کے ساتھ مناکحت
بھی ہونا چاہئے، نعوذ باللہ منہ، یہ حالت ہے آجکل کے اجتہاد کی، اسی لئے علماء احناف
تقلید سلف کو واجب کہتے ہیں، اور اسی لئے وہ فتاویٰ میں ان کتابوں کا حوالہ دیتے ہیں،
جن میں قرآن و حدیث سے مسائل استنباط کر کے سلف نے احکام جمع کر دیے ہیں،

اور فیعدہ سلمہ

فصل فی تعلیم القرآن و تلاوتہ و متعلقاتہ

قرآن مجید کا منظوم | سوال (۱) قرآن شریف کا ترجمہ اردو میں نظم کرنا کیسا ہے ؟
 ترجمہ کرنا کیسا ہے | الجواب : بالکل ناجائز ہے ، بلکہ عالمگیریہ میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص قرآن کو فارسی میں نظم کر دے تو اس کو قتل کر دیا جاوے ، کیونکہ وہ کافر ہے ،
 وفي التخییر رجل نظم القرآن بالفارسیة یقتل لانه کافر کذا فی التارخات
 ۱۴ (ص ۱۶۲) اور ظاہر ہے کہ فارسی میں نظم کرنا اور اردو میں نظم کرنا برابر ہے ، اور
 بظاہر کفر کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ نظم کرنے میں قرآن کی توہین ہے ، پس اگر کسی کی نیت
 اہانت کی نہ ہو تو اس کو کافر نہ کہا جاوے گا ، مگر نظم کرنے سے اس کو روک دیا جائے گا ،
 اگر روکنے کے بعد بھی باز نہ آوے تو فاسق ہے ، اور ایسی نظم کا خریدنا اور اس کو شائع
 کرنا بھی حرام ہے ، واللہ اعلم ، ۲۲ محرم منہج

قرآن مجید کی آیات | سوال (۲) ایک کنویں کے وسط دیوار میں ایک کتبہ نام بانی تاریخ بنار بمحمد ﷺ
 کنویں پر لکھا کر دے | و کلمہ شریف لگا ہوا ہے ، جس میں خوف بے ادبی ہے ، کیا اس کا رہنے
 دینا جائز ہے یا نہ ، اور اگر نہیں تو کیا حروف محو کے جاویں یا صحیح سالم کتبہ کو نکال کر کسی اپنی
 جگہ مسجد وغیرہ میں رکھ دیا جاوے ؟

الجواب : قال فی العالمگیریة و لیس بمستحسن كتابة القرآن علی
 المعاریب و الجدران لما یخاف من سقوط الكتابة و ان توطأ الی ان قال
 فالواجب ان یوضع فی اعلی موضع لا یوضع فوقه شیء و کذا یکره كتابة الرقاع
 و الصاقها بالابواب لما فیہ من الالهانة کذا فی الکفایة ۱۴ (ص ۷۰) ۱۱
 پس اگر کنویں کے متولی یا محلہ والے راضی ہوں تو اس کتبہ کو نکال کر کسی اپنی جگہ پر
 ادب سے رکھ دیا جاوے ، مسجد میں بھی چسپاں نہ کیا جاوے ،

بوسیدہ قرآن مجید اور دینی کتب کو | سوال (۳) پر آگندہ اوراق یا بوسیدہ قرآن مجید کو
 دفن کرنا چاہیے ، جلانا صحیح نہیں | دفن یا دریا برد کیا جاوے یا کس طرح ، نیرد و غیر اوراق
 اردو انگریزی اخبارات وغیرہ کو جن میں بعض مواقع پر آیات اور انگریزی کتب یا اخبار
 وغیرہ میں تصاویر بھی ہوتی ہیں ، کس طرح تلف کیا جاوے ؟

الجواب؛ قال فی العالمگیرية المصحف اذا صار خلقا لا یقرأ منه ویحرق
ان یضیع یجعل فی خرقه طاهرة یدفن ودفنه اولی من وضعه موضعا
یخاف ان یقع علیه النجاسة ام (ص ۲۱۶ ج ۶) وفيه (ص ۲۱۷) المصحف
اذا صار خرقا وتعذر القراءة منه لا یحرق بالنار اشار الشیبا فی الی هذا وبه
نأخذ ام، اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کو تو دفن کر دینا چاہئے، جلانا نہ چاہئے، باقی اور
جن میں قرآن کی آیت یا خدا و رسول کا نام ہو اس میں سے آیت اور خدا و رسول کے نام
کو نکال لینا چاہئے، ان کو دفن کر دیا جاوے، اور باقی کو جلادینا جائز ہے، مگر قرآن اور
خدا کے نام کو اس طرح بغلی قبر میں مڑے کر رکھا جاتا ہے، تاکہ اس پر مٹی نہ پڑے،
و یعدله لانه لوشق ودفن یحتاج الی اھالة التراب علیہ و فی ذلک
نوع تحقیر الا اذا جعل فوقہ سقفت بجث لا یصل... التراب علیہ
فہو حسن ایضا کذا فی الغرائب ام عالمگیرية،

قرآن مجید کو لیٹ کر پڑھنا | سوال (۴) قرآن شریف کو عام کتابوں کی طرح بیٹھ کر
یا لیٹ کر پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب؛ قرآن شریف کو بیٹھ کر اور لیٹ کر پڑھنا جائز ہے، مگر لیٹ کر حفظ سے
پڑھے، قرآن ہاتھ میں لے کر نہ لیٹے کہ اس میں سورہ ادب کا احتمال ہے، قال فی العالمگیرية
لا بأس بقراءة القرآن اذا وضع جنبه علی الارض ولیکن ینبغي ان یضم
رجلیہ عند القراءة کذا فی المحيط لا بأس بالقراءة مضطجعا اذا اخرج
رأسه من اللحاف والا فلا کذا فی القنیة ام (ص ۲۱۲ ج ۶) ان عبارت معلوم
ہوا کہ لیٹ کر قرآن پڑھنا چاہئے تو سر کو لحاف میں سے نکال کر پڑھنا چاہئے، اور پیسر
سمیٹ لینے چاہئیں، واللہ اعلم،

سوال (۵) قرآن مجید کو غلط پڑھنے، اوقات نہ کرنے
اور نماز اور خاج نماز میں قراءت شاذہ
پڑھنے کا حکم

..... جو قرآن شریف مرتبہ فی زمانہ ہے کہ قرون
ثلاثہ میں سے کسی تین میں مرتب ہو کر نقل ایک جا

کیا گیا ہے یا بعد میں، اور جو اس میں آیات و اوقات لوازم جائز و مطلق وغیرہ ہیں، یہ قراء
سبعہ کے متفق علیہ ہیں یا نہیں، فی زمانہ اگر کوئی حافظ قراءت قرآن میں قراء سبعہ میں سے

سے کسی کا اتباع نہ کرے اور اپنے اجتہاد سے جہاں چاہے قرار سب سے خلاف بلا تنگی نفس کے وقف کرے، اور آیات و اوقات کا کچھ لحاظ نہ رکھے، اور جہاں تشدید نہ ہو وہاں اپنی طرف سے تشدید لگا دے اور جہاں تشدید ہو اس کو چھوڑ دے، تو ایسا عمل نماز میں یا غیر نماز کی قراءت میں جائز ہے یا نہیں، اور قرار سب سے کا متفق علیہ فتویٰ یہ ہے لایحوز العمل فی القرآن علی القواعد العربیۃ بدون النقل المتواتر، بینوا توحسروا،

الجواب: قرآن موجودہ کی ترتیب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہوئی تھی، اور اس کے بعد سے اسی پر عمل چلا آ رہا ہے، اور قراءت میں تو اس میں بہت سی ہیں، مگر متواتر دس علی صحیح قراءتیں ہیں، اور اس زمانہ میں جو قرآن مرویہ اکثر بلاد ہے وہ جنس کی قراءت کے موافق ہے، اور اس کے علاوہ بھی چونکہ قراءت متواترہ ہیں، اس لئے صرف اسی قرآن مرویہ کی ترتیب وغیرہ پر تواتر کا حکم لگانا دوسری قراءت کو چھوڑ کر صحیح نہیں، جو قراءت دس قراءت میں سے پڑھے جائز ہو گا خواہ خارج صلوٰۃ یا داخل صلوٰۃ، البتہ قراءت شاذہ میں اختلاف ہے، اور تطبیق اس میں یہ دی گئی ہے کہ اگر مثلاً کسی شخص نے ساری قراءت قوانین شاذہ سے کی تو اس کی دو صورتیں ہیں کہ یا تو اس قراءت میں ذکر ہو گا اور یا بیان قصہ، دوسری صورت میں مطلقاً نماز صحیح نہیں ہوگی، اور پہلی صورت میں اگر قراءت متواترہ سے ... بھی کچھ قرآن پڑھ لیا، یعنی بقدر ما تجوز بہ الصلوٰۃ تب تو نماز صحیح ہو گئی، اور اگر سارا قراءت شاذہ ہی میں پڑھا تو نماز فاسد ہو جاوے گی، خارج صلوٰۃ البتہ مع الکراہۃ جائز ہے، مگر اولیٰ قراءت متواترہ سے پڑھنا ہے، تاکہ کسی قسم کا شبہ ان الفاظ کے قرآن ہونے میں نہ ہو، کما فی الشامی، ج ۱، ص ۳۶ القرآن الذی تجوز بہ الصلوٰۃ بالاتفاق هو المضبوط فی المصاحف الاثنتہ الثی بعثنا عثمان رضی اللہ عنہ الی الانصار و هو الذی اجمع علیہ الاثنتہ العشرۃ وهذا هو المتواتر جملة وتفصیلا فما فوق السبعة الی العشرۃ غیر شاذ وانما الشاذ ما وراء العشرۃ وهو الصحيح الخ انتہی، و فی موضع قبلہ وکان قصۃ ولم یثبت قرآنیتہ لم یکن قراءۃ ولا ذکر فیفسد بخلاف ما اذا کان ذکرًا فانه وان ثبت قرآنیتہ لم یکن کلامًا لکونه ذکرًا لکن ان وقف علیہ تفسد وان قرأ بعد من المتواتر ما تجوز بہ الصلوٰۃ فلا فہذا ما وفق بہ فی البحر انتہی

اور تخفیف مشدد اور تشدید مخفف میں اگر تغیر معنی ہو جائے تب تو نماز فاسد ہو جائے گی ورنہ نہیں، کافی الشامی ج ۱، ص ۴۲۳، اونی تخفیف المشد الى لا تفسدان ثم یغیر المعنی وان غیراختلفوا والعامة انه یفسد انتہی، اور وقت و وصل میں نماز ہو جاتی ہے، ہر صورت میں کافی الشامی ناقل قول شارح المنیۃ والصحیح عدم الفساد فی ذلک کلمہ، باقی و تران شریف میں کسی قسم کا تصرف عمداً جائز نہیں نہ خارج صلوٰۃ نہ داخل صلوٰۃ، واللہ اعلم، راقم خاکسار ضیاء الدین عفی عنہ

۵۔ جمادی الثانی ۱۴۳۵ھ

قرآن پاک میں محض اپنے قیاس یا قواعد کلیہ سے پڑھنا بدون روایت و بدون سماع درست نہیں، مصاحف عثمانیہ کا اتباع ضروری ہے، نماز کی صحت و فساد مفتی صاحب نے شرح لکھدی ہے فقط عبداللطیف عفا اللہ عنہ مدرس مدرسہ مظاہر علوم بہار پور

الجواب صواب

جواب صحیح ہے

بندہ احمد نور غفرلہ

فلشد راجب فقہانی تحقیق عجیب

بندہ عبدالرحمن عفی عنہ
نظر احمد عفا اللہ عنہ مقیم الخانقاہ الامدادیہ
بہتانہ بھون، ۱۲ رجب ۱۴۳۵ھ

سوال (۶)

قرآن مجید کی کتابت میں خط عثمانی کا واجب ہونا اور ترجمہ و تران کو علاحدہ چھاپنے کا حکم،

..... یہاں محسن الملک نواب حاجی حافظ محمد عبید اللہ خان صاحب بہادر کو دیکھنے پر فرزند ارجمند سرکار عالیہ دام اقبالہ کلام مجید سے بچہ شوق ہے، جس وقت موٹر میں سوار ہو کر کسی جگہ تشریف لے جاتے ہیں تو منزل مقصود تک کلام پاک پڑھنے کے سوائے کسی سے بات نہیں کرتے جناب مجدد روح کے پاس تین کلام مجید قلمی نایاب ہیں، (۱) دو قرآن شریف یا قوت مستعصی کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں جو سنہ ۱۳۳۵ھ میں لکھے گئے تھے، (۲) تیسرا کلام مجید یا قوت رقم خاں کا لکھا ہوا ہے، جو سنہ ۱۳۳۵ھ میں لکھا گیا تھا، اس تیسرے کلام مجید یا قوت رقم خاں کا چربہ ایک خوشنویس سے لکھا کر حضور مجدد روح نے پانچواں جلد طبع کرانی شروع کی تین ہزار جلد بلا ترجمہ اور دو ہزار جلد مع ترجمہ ہدیہ کی جانی تجویز

فرمائی، ہر ایک ورق متن جس کے ہر صفحہ پر نمبر شمار آیات لکھے گئے ہیں، ایک ورق ترجمہ شاہ ولی اللہ صاحب اور ایک ورق ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب شامل کیا جائے گا، پارہ وَاَعْلَمُوْا تک کلام مجید طبع ہو چکا ہے،

اس کلام مجید کے طبع میں علماء بھوپال معترض ہیں چونکہ اس کلام پاک میں رَبِّ الْعَالَمِیْنَ صالحین، صابریں، صاعزین، کافرین، شاکرین، جناب آیات ملائکہ و امثالہا الفاظ بالالہت خلاف رسم الخط عثمانی کے بتلاتے ہیں، اس لئے اس کا طبع کرانا، ہدیہ کرنا، اس میں ہدیہ کرنا ناجائز و حرام بلکہ حد کفر تک پہنچتا ہے، نواب صاحب ممدوح نے اس قرآن شریف کی کتابت کی مطابقت کے لئے دو قرآن مجید یا قوت المستعصی کے اور ایک قرآن مطبوعہ استنبول بعد سلطان عبدالحمید خان جس پر وہاں کے علماء مصححین اور علماء مجلس کی مواہیر ثبت ہیں، اور ایک صفحہ کلام مجید کا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا فوٹو جو خط کوفی میں ہر پیش کئے، لیکن علمائے بھوپال نے ان کی کتابت کو بھی تسلیم نہیں کیا اور یہی فرمایا کہ جب تک رسم الخط عثمانی میں طبع نہ ہونا جائز ہے، اب اس میں جناب کیا حکم فرماتے ہیں، آیا رسم الخط عثمانی واجب ہے یا مسنون یا مستحب اور اس کے خلاف کے واسطہ کا کیا حکم ہے شرح و بالتفصیل جواب سے اطلاع فرماویں، عربی میں جو استفقا، مکہ معظمہ و مصر و استنبول و دیوبند گیا ہے ایک کاپی اس کی بھی اس عریضہ کے شامل ہے،

نقل استفقا عربی

من ابی المحاسن محمود علی باشکاتب لحضرة نواب جنرل محسن الملک
المحافظ الحاج محمد عبید اللہ خان بہادر، سی، ایس، الی دَامَ اقبالہ بھوپال
(الہند الوسطی)،

قد رأینا فی کثیر من المصاحف المطبوعة فی الأستانة العلیة و غیرہا
والمکتوبة بقلم اشہر الخطاطین مثل الیا قوت المستعصی و غیرہ ان کلمات
العالمین، کافرین، شاکرین، صاعزین، جنات، ملائکہ، آیات و امثالہا
مکتوبة بالالہت و فی بعض المصاحف التي یدعی کاتبوها انهم کتبوها علی الرسم
العثمانی کتبت بغير الالہت هكذا العالمین، کافرین، صاعزین، جنات، ملائکہ،

آیت، فریق یقول ان کتابہ ہذہ الکلمات و امثالہا بالالف لا يجوز لانه مخالفت
للرسم القرآنی المأثور من المصاحف التي كتبت بامر سيدنا عثمان وقد بينه
علماء فن القراءة وكذلك كلمات، رحمت، بنت، امرات يجب ان تكتب في
المواضع المتحصصة بالتاء لا بالتاء التي تصيرها عند الوقف،

وفریق یقول ان کتابہ العالمین وشاکرین وامثالہما، بالالف و کتابہ رحمۃ
بالہاء يجوز وليس ذلك من رسم الخط العثماني في شيء وانما الرسم العثماني في
الواجب الاتباع انما هو في الالفاظ التي كتبت على غير قياس مثل مال هذا الرسول
مال هؤلاء القوم لا اذ بعنه لا الى الله تحشرون وامثالها بفضلكم اخبرونا
ما هو الرسم القرآنی وهل هو توفيقی واجب الاتباع عند السادة الحنفية
وهل يستفاد وجوبه من كتاب الله او سنة رسوله صلى الله عليه وسلم او
القياس او الاجماع المعتبر عند الاصوليين لعنفين واذا كان واجب الاتباع
فهل يدخل فيه لزوم كتابة امثال العالمين، صغرين، شكرين بغير الف ام ليس
ذلك من الرسم القرآنی في شيء ويجوز كتابتهما بالالف ايضا، بينوا توجروا،

الجواب في الله الموفق للصواب

الحمد لله سبحانه ما حمده الحامدون والصلوة والسلام على نبيه
سيدنا محمد كلما ذكره الذاكرون وعلى اله واصحابه واتباعه الذين
ظهر بهم تصديق قوله تعالى انا نحن نزلنا الذكر وانا له لحافظون،
اما بعد فقد قال الامام الحافظ السيوطي في كتابه الاتقان مانصه، القاعد
العربية ان اللفظ يكتب بحروف هجائية مع مراعاة الابتداء به والوقف
عليه وقد مهد النحاة له اصولا وقواعد وقد خالفها في بعض الحروف ^{خط} المصحف
الامام وقال اشهب سئل مالك هل يكتب... المصحف على ما احدثه الناس من
العجاء فقال لا الا على الكتابة الاولى رواه الداني في المقنع ثم قال ولا مخالف
له من علماء الامة وقال في موضع اخر سئل مالك عن الحروف في القرآن مثل
الواو والالف اتري ان يغير من المصحف اذا وجد فيه كذلك قال لا قال ابو عمرو

یعنی الواو والالف المزید تین فی الرسم المعد ومتین فی اللفظ نحو اُولُوا، وقال الامام احمد یحرم مخالفة مصحف عثمان فی واو ویا و الف او غیر ذلك وقال البیهقی فی شعب الایمان من یکتب مصحفا ینبغی ان یحافظ علی الہجاء الذی کتبوا بہ تلك المصاحف ولا یخالفہم فیہ ولا یغیر ما کتبوا شیئا فانہم کانوا اکثر علما وصدق قلبا ولسانا واعظم امانة منافلا ینبغی ان نطن بانفسنا استدراک علیہم اھ (ص ۲۳۱، ۲۳۲)

وفی النہایۃ القول المفید فی بیان الحث علی اتباع رسم المصاحف العثمانیۃ ناقل عن البرہان مانتہ، فیجب علی کل مسلم ان یقتدی بہم (ای بالصحاۃ) و یفعلہم فما کتبوا بواو فواجب ان یکتب لواو وما کتبوا بغير واو فواجب ان یکتب بغير واو وما کتبوا بالفت فواجب ان یکتب بالفت وما کتبوا بغير الف فواجب ان یکتب بغير الف وما کتبوا بیاء فواجب ان یکتب بیاء وما کتبوا بغير یاء فواجب ان یکتب بغير یاء وما کتبوا متصلا فواجب ان یکتب متصلا وما کتبوا منفصلا فواجب ان یکتب منفصلا وما کتبوا من ہاءات التانیث بالتاء المجرورۃ فواجب ان یکتب بالتاء المجرورۃ وما کتبوا منها بالہاء فواجب ان یکتب بالہاء اھ برہان۔ قال الامام احمد رحمہ اللہ تعمر مخالفة خط العثماني فی واو و الف او یاء او غیر ذلك وفی شرح ابن غازی وقد نقل الجعبری وغیرہ اجماع الائمة الاربعۃ علی وجوب اتباع مرسوم المصحف العثماني اھ (ص ۱۷۳) قلت ونبہ علی وجوبہ من علمائنا الحنفیۃ العلامة الملا علی القاری فی المنہج الفکریۃ (ص ۸۵)

ان تصریحات سے چند امور معلوم ہوئے :-

۱۔ اتباع رسم مصاحف عثمانیہ کتابت قرآن میں باجماع ائمہ اربعہ واجب ہے جس کی مخالفت گناہ ہے، مگر کفر نہیں، البتہ رسم خط عثمانی میں طعن کرنا اور اس کی تحقیر کرنا اندیشہ ناک ہے، جس سے کفر کا اندیشہ ہے

۲، واو (اور) یا (اور) الف کا حذف کرنا ان مواقع میں واجب ہے جہاں مصحف عثمانیہ میں ان حروف کو حذف کیا گیا ہے، اور جہاں زیادہ کئے گئے ہیں وہاں

زیادہ کرنا واجب ہے،

اسی طرح جہاں تار کو بصورت تار مربوطہ لکھا گیا ہے وہاں اسی طرح لکھنا واجب ہے، اور جہاں بصورت تار مجرورہ طویلہ لکھا گیا ہے وہاں جر و طویل کے ساتھ لکھنا واجب ہے، قال، الشيخ المحقق المقرئ محبت، دین الافغانی ناقلًا عن کتب الاثمة القدما المشهورین فی رسالة زبدة ترتیل القرآن مانصه وماکتبه بخیر الف فواجب ان یکتب بغیر الف وان قرى نحو الله والرحمن العلمین وما لک وذلك ورزقنهم وهذا وایت ویقوم وسحر وقل وصدقین وکذ بین وکفرین وخسرین والسموات والقیمة وامثالها وعلامتها الفتحة الخنجرة بطول الصفحة لا یسر منها (ص ۹۳) وفيه ایضاً (ص ۹۴) وماکتبه بتاء طویلة فواجب ان یکتب بتاء طویلة وماکتبه بتاء مد ورة فواجب ان یکتب بتاء مد ورة ام،

پس جن الفاظ کو سوال میں بطور مثال کے لکھا گیا ہے ان میں بھی بطور اتباع رسم عثمانی واجب ہے، اور وہ بھی داخل رسم عثمانی ہیں ان کو الف سے لکھنا مصحف میں جائز نہیں، اور جن دلائل سے سوال میں اس کے جواز پر استیناس کیا گیا ہے ان کا جواب حسب ذیل ہے، ۱۔ ایک صفحہ کلام مجید حضرت عثمان غنیؓ کا فوٹو جس کا ذکر سوال اردو میں ہے وہ حجت نہیں، کیونکہ ملا علی القاری، المخ الفکر یہ میں فرماتے ہیں :-

اذ هو رای عثمان بن امریق بن ثابت کاتب الوحی وغیره بان یکتبوا المصاحف المتعددة وارسلها الی مواضع مختلفة واختار واحد منها لنفسه ولاهل المدينة وما بقى منها شیء (ص ۸۵)

اس سے معلوم ہوا کہ مصاحف عثمانیہ میں سے کوئی مصحف بھی ملا علی قاری کے زمانے میں موجود نہ تھا، پھر معلوم نہیں کہ فوٹو لینے والوں کو یہ مصحف کہاں سے دستیاب ہوا، اور اس کی سند کیسے ہے، ممکن ہے کہ وہ نقل ہو اصل نہ ہو اور نقل میں اصل سے کچھ تغاوت ہو گیا ہو، رسم خط متعین عثمانی کو متقدمین علماء قرأت نے مستفل رسائل میں مفصلاً و مجملًا ضبط کر دیا ہے، ان کے مقابلہ میں یہ فوٹو حجت نہیں ہو سکتا،

۲۔ یا فوٹو شعیبی و یا قوت رقم خاں کے مصاحف کا ذکر بھی سوال میں کیا گیا ہے

یہ بھی تصریح علماء ثقات کے مقابلہ میں حجت نہیں ہو سکتی، کیونکہ ان حضرات کی امانت و وثاق و تفویض و احتیاط کا حال معلوم نہیں اور یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کو وجوب اتباع رسم خط عثمانی کا مسئلہ معلوم تھا اور قصداً اس کی مخالفت کی یا ان کو اس مسئلہ کا علم ہی نہ تھا،

۳۔ مصاحف مطبوعہ آستانہ استنبول جن پر وہاں کے علماء مصححین علماء مجلس موہبہ ثبت ہیں، ہرگز کسی درجہ میں مخالفت رسم خط عثمانی کے جائز ہونے میں حجت نہیں ہو سکتی، کیونکہ ان مصنفین میں سے بعض ان مواضع میں بھی رسم خط عثمانی کی مخالفت کی گئی ہے جہاں رسم خط عثمانی میں متعدد قرأت کو جمع کیا گیا ہے، اور قیاساً ایسے مواقع میں مخالفت کو کوئی جائز نہیں کہہ سکتا، مثلاً سورہ فاتحہ میں نالیک یوم الدین مصاحف عثمانیہ میں بحذف الف لکھا گیا ہے، تاکہ فقہ طویل سے اس کو نالک پڑھا جاسکے، اور فقہ عریضہ سے نالک، مگر مصاحف مطبوعہ استنبول میں اس کو الف سے لکھا گیا ہے، مصاحف عثمانیہ میں اَنْعَيْتُمْ اَكْمَدُ وَنَعَيْتُمْ اَكْمَدُ وِبَايَاتِي کو بحذف الف اس طرح مکتوب ہیں اَنْجَيْتُمْ اَكْمَدُ وَنَجَيْتُمْ اَكْمَدُ وِبَايَاتِي، تاکہ ان قراءات کو بھی محتمل رہے جن میں اَنْجَيْتُمْ اَكْمَدُ وَنَجَيْتُمْ اَكْمَدُ وِبَايَاتِي بصیغہ مفرد وارد ہو مگر مصاحف استنبول میں ہر سہ الفاظ الف کے ساتھ مکتوب ہیں، علیٰ ہذا سورہ نور میں اربع شہادات رسم خط عثمانی میں بدون الف کے ہے تاکہ قراءات اربع شہادۃ بصیغہ مفرد کو بھی محتمل رہے، اور مصاحف استنبول میں الف زائد کر دیا ہے، سورہ المؤمنین کے آخر میں قال کہ لبشتم وقال ان لبشتم رسم خط عثمانی میں بحذف الف مکتوب ہیں، تاکہ قراءات قیل وقل بصیغہ ماضی مجہول و امر حاضر کو محتمل رہے، مگر مصاحف استنبول میں الف زائد کر دیا ہے، علیٰ ہذا سورہ ہود میں الا ان شئوا کفر وادوا والنجم میں و شئوا فمما البقی حسب رسم عثمانی بزیادت الف بعد دال شئو ہے تاکہ اس قراءت کو بھی مشتمل رہے، جن میں لفظ شئو منصرف ہے، مگر مصاحف استنبول میں یہ الف ندارد ہے، سورہ دہر میں سلسلاً و اغللاً میں لفظ سلسلاً کو ایک حرف کی صورت میں لکھا، اور بعد لام ثانی کے الف کو زائد کرنا رسم خط عثمانی ہے، مگر مستثنیٰ استنبول میں اس کو دو حرف کی صورت میں لکھا ہے، اور اخیر میں سے الف کو حذف کر دیا، جن کی صورت یہ ہے (سلاسل)، حالانکہ اس سے علاوہ ازیں کہ قرأت منصرف پر اشارہ نہیں ہوتا وقف میں بڑی خرابی آتی ہے جس صورت سے مصاحف استنبول میں لکھا ہے، اس کا مقتضایہ ہے کہ وقف میں سلاسل کے لام اخیر کو ساکن کیا جاوے، حالانکہ بحالت وقف سب کے

نزدیک الف پڑھا جاتا ہے، گو بصورت وصل بعض کے نزدیک الف نہیں پڑھا جاتا، علیٰ ہذا سورہ دھر میں قواریثانی کے بعد بھی الف کا ہونا رسم خط عثمانی ہے، مگر مصنف استنبول میں اس کو بھی حذف کر دیا، جس میں وہی خرابی ہے جو ابی مذکور ہوئی، الغرض یہ مصنف استنبول تو مخالفت رسم خط عثمانی میں اس درجہ کو پہنچے ہوئے ہیں جس کو کوئی بھی جائز نہیں کہہ سکتا، کیونکہ اس طرز سے بقیہ قراءات پر دلالت نہیں ہو سکتی، حالانکہ صحت قراءات کا بڑا مدار اس پر ہے کہ رسم خط مصحف اس کو تحمل ہو۔ رسم، پس رسم خط عثمانی کی مخالفت جس طرح مصنف استنبول میں کی گئی ہے، اس سے بقیہ قراءات کا ابطال لازم آتا ہے اور اس کا عدم جواز ظاہر و بدہی ہے، لہذا ان سے تمسک ہرگز نہیں کیا جاسکتا،

یہ تو اصل سوال کا جواب ہو گیا، اب یہاں اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ دس پارے جو رسم خط عثمانی کے خلاف طبع ہو چکے ہیں ان کی بابت کیا حکم ہے، آیا ان کو ضائع کر دیا جائے یا ان کی اشاعت جائز ہے، سو ہمارے نزدیک اس کا وہی حکم ہے جو کتابت میں زبردستی کی غلطی یا اور کسی قسم کی غلطی کا حکم ہے، ظاہر ہے کہ مصاحف ایسے بہت کم ہوتے ہیں جن میں کتابت کی غلطیاں کم و بیش نہ رہ جاتی ہوں، اگر مطلق غلطی کی وجہ سے اشاعت قرآن کو ناجائز کیا جائے گا تو بجز ایہ، دو مصحف کے باقی سب کی اشاعت بند کر دینی پڑے گی، مگر اس کا مفہنی الی الحرجہ ہونا ظاہر ہے، بلکہ اغلاط کتابت کا سہل حکم یہ ہے کہ جتنی غلطیاں مصحف میں رہ گئی ہوں ان کی فہرست اول میں لگادی جائے، اور لکھ دیا جائے کہ ناظرین اس کے مطابق مصحف کو صحیح کر لیں، پس یہی صورت یہاں کی جائے کہ جتنے پارے طبع ہو چکے ہیں ان میں جن الفاظ میں مخالفت رسم عثمانی ہو گئی ہے ان کی فہرست اول میں لگادی جائے کہ ان الفاظ میں بوجہ اتباع مصحف یا قوت خان رسم خط عثمانی کی مخالفت ہو گئی ہے، اور نقل کے وقت ہم کو مطابقت رسم خط عثمانی کا واجب ہونا معلوم نہ تھا، اس لئے ناظرین ان مواقع کو اس طرح لکھ کر موافق رسم خط عثمانی صحیح کر لیں،

یہ تدبیر تو ان پاروں کے اصلاح کی ہے جو طبع ہو چکے ہیں، اور جو پارے ابھی طبع نہیں ہوئے ان میں لحاظ مطابقت رسم واجب ہے، ہرگز خلاف رسم خط عثمانی نہ لکھوایا جائے، اردو میں جو سوال کیا گیا ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس مصحف کے ساتھ ترجمہ بھی شائع ہوگا جس کی صورت یہ تجویز کی گئی ہے کہ کہ ایک ورق ہر ورق مصحف کے سامنے لگایا جائے گا اور

اس دوسرے ورق میں محض ترجمہ ہی ترجمہ ہوگا، سو مستفی صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ ترجمہ کی یہ صورت شرعاً جائز نہیں، کیونکہ اس صورت میں ترجمہ کا انسفال قرآن سے ممکن ہے، اگر کوئی شخص اس کو قرآن سے بالکل علیحدہ رکھنا چاہے تو رکھ سکتا ہے، حالانکہ ترجمہ قرآن اس طرح پر لکھنا جائز نہیں کہ وہ قرآن سے منفصل و علیحدہ ہو سکے بلکہ ترجمہ کو متن قرآن کے ساتھ ایسا ملحق ہونا چاہئے کہ اس سے جدا نہ کیا جاسکے، ورنہ بعض خریدار متن عربی کو الگ اور ترجمہ کو الگ رکھنا چاہیں، مگر جس سے وہ ترجمہ مثل انجیل و تورات کے غیر حاصل المتن ہوگا اور اس سے اندیشہ ہو کہ کچھ دنوں میں کتب سابقہ کی طرح لوگوں کے ہاتھ میں قرآن کا ترجمہ ہی رہ جاوے، اور متن گم ہو جاوے یا اس سے توجہ کم ہو جاوے،

هذا فساد عظیم یفضی الی ضرر و خیم قال المحقق ابن المہمام فی فتح الفتا
 (ص ۲۳۸ ج ۱) ناقلاً عن الکافی وان اعتاد القراءة بالانباریۃ او اراد ان یکتب
 مصحفاً ما یح و ان فی فی الایۃ او الایۃ تین الذان کتبہ الثانی و افسد کل
 حرون و ترجمتہ جازام فی الکافیۃ و اما لو اعتاد قراءة القرآن او کتابه
 المصحف بالانباریۃ ینسخ منه اشد المنع ام ،

ثم ذکر فیہ ان واحد من اهل الاهواء فی زیان الشیخ الجلیل
 ابی بکر محمد بن الفضل اراد ذلک فافق الشیخ بقتله قتلہ واحد من
 خدامہ وقال ان الشیخ امرنی بذلک فاعادہ الا یرفد ہب الیہ فقص
 علیہ الفتۃ وقال ان هذا کان یرید ان یبطل کتاب اللہ فی فخلع لہ
 الذمیر و جازاہ بالخیر ام بمعناہ مختصراً (ص ۲۳۹ مع فتح الفتا ج ۱)
 قلت ولا یخفی ان ما یظهر من السؤال فی صورة کتاب الترجمة یفضی الی
 ذلک فیمنع عنہ ایضاً،

ہمارے نزدیک ترجمہ کی بہتر صورت یہ ہے کہ ہر صفحہ کے حاشیہ پر آیات کا نمبر ڈال کر ترجمہ طبع کرایا جائے، اس صورت میں ترجمہ متن قرآن سے علیحدہ نہ ہو سکے گا، ہذا اقدار دت
 ان اولف رسالۃ مختصلاً فی بیان رسم خط المصحف الامام اصولاً و فروعاً و عارفی
 اللہ لاتامہا عاجلاً و رزقہا اقبول عاجلاً و ابلاً و هو الموفق والمعین،
 حررہ الاحقر نفل حمد عفا اللہ عنہ، بمقیم خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون، ۱ ربیع الثانی ۱۲۲۲ھ

الصواب لا يتجاوز عن الجواب ، كتيبه اشوت علی عاش وبيع الاخرى السلام
خط ناگری میں قرآن مجید لکھنے | سوال (۲) انجن نے جو طرز ترجمہ اور تفسیر کا اختیار کیا ہے وہ حسب
کا حکم ذیل ہے، پہلے اصل قرآن کو بخط عربی لکھا گیا ہے، پھر اسی کے

بالمقابل اصل قرآن کو بخط ناگری لکھا گیا ہے، بعدہ ان دونوں کے نیچے قرآن مجید کا ترجمہ
بزبان وخط ناگری لکھا گیا ہے، پھر اس کی تفسیر بخط ناگری ترجمہ کے نیچے کی گئی ہے، آیاتہ صورت
جائز ہے یا نہیں، فقط،

الجواب: (۱) ناگری ہو یا انگریزی ہر وہ خط جس میں رسم خط مصحف عثمانی کی رعایت
نہ ہو سکے اس میں قرآن لکھنا کسی طرح جائز نہیں کیونکہ کتابت مصحف میں رعایت رسم خط
عثمانی واجب ہے۔

(۲) ہر وہ خط جن میں رعایت رسم خط مذکور ہو جتنی ہے جیسے فارسی یا اردو نستعلیق
و امثالہ ان میں قرآن کا لکھنا محتاج فیہ بین القولین ہے، مگر اگر یہ اور رائج یہ ہو کہ ایسے
خطوط میں بھی پورا مصحف لکھنا جائز ہے، ایک، و آیات اتفاقہ لکھنے کا مضائقہ نہیں،
الغرض الفاظ قرآنی کو صرف عربی خط ہی میں لکھنا چاہئے، ترجمہ و تفسیر کی دوسری
زبان میں اور دوسرے خط میں لکھنے کا مضائقہ نہیں،

قال في الايمان وقال اشهب سحابا اذا هل يكتب المصحف علم ما
اسد ثمة الناس من ارجاء فقال لا الا على اربعة الاول في رواه الداني في المقدم
ثم قال ولا مناهات له من علماء الامة وقال في حرم الخویش مالک عن
السرور في اتفاق اربعة او الالف ان ان غير من السبعة اذا وجد
فيه كذا قال لا قال ابو عمرو واخذوا بالاداء المزيدين في الاسم
المعدوسين في اللفظ نحووا فدا قال الامام احمد يحرم مخالفة خط مصحف
العثماني في رواية او الف او غير ذلك ام ر ص ۲۷۱

قلت ولا يمكن رعاية ذلك في خط السبعة ولا في الخط الانجليزي نقابة
ما يمكن فيها ان يكتب الحروف المتفاوتة بما فقط ولا يمكن رعاية الزوائد
اصلا وايضا في غير ما يتلفظ به من الحروف في العربي لا توجد في هذه
الساكنين اصلا مثل الصاد والافاق ونحوهما في غير عنها بحروف مشتركة بينهما

۱۳ رجب ۱۲۲۲ م

والله اعلم،
خروج ربيع الثاني ١٣٢٥

حکم تلاوت قرآن بہیت اجتماع سوال (۹) اگر ایک ہی جگہ بہت سے لوگ باواز بلند قرآن مجید کی تلاوت کریں تو وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ کے لحاظ

سے کیا اس کو اس فعل سے منع کیا جاسکتا ہے اور یہ فعل جائز ہے یا نہیں؟

الجواب؛ حنفیہ نے تعلیم و تعلم میں تو اس طرح اجتماع کے ساتھ قرأت کی اجازت دی ہے مگر تلاوت میں مشہور قول یہ ہے کہ یہ صورت اجتماع جائز نہیں، لیکن بعض فقہاء نے اجازت بھی دی ہے والیہ میلان سیدی حکیم الامت قال فی المندیۃ ویکوہ للقوم ان یقرؤا القرآن جملة لتسمنہا ترک الاستماع والانصات للماور بھما کذا فی القنیۃ ام وفيہ ایضا ولا باس باجتماعہم علی قراءة الاخلاص جمل عند ختم القرآن ولو قرأ واحد واستمع الباقون فهو اولى کذا فی القنیۃ ام صبی یقرء فی البیت واهله مشغولون بالعمل یعذرون بترك الاستماع ان افتتحو العمل قبل القراءة والآ فلا وکذا قراءة الفقه عند قراءة القرآن ام (ص ۲۱۳ ج ۶) قلت فلو افتتحو العمل او قراءة الفقه مع قراءة الصبی فالظاهر الجواز وبناء المسئلة علی دفع الحرج فان لم یکن للجماعة بد من الاجتماع بان لم یکن لهم محل اخر ینبغي جواز اجتماعهم علیها متقدما ومتاخرا هذا وقد نظر الشيخ فی دلیل المسئلة من اصله فی بیان القرآن له (ص ۶۵ ج ۲) وقال عمومہ بحیث یتجاوز عن مراد المتکلم لا یصح والمراد العموم للتبلیغ او للصلوة لا غیر ثم نقل عن السراج المنیر للخطیب الشربینی عن البیضاوی وظاهر اللفظ یقتضی وجوبہما حیث یقرء القرآن مطلقاً وعامة العلماء علی استعبابہما خارج الصلوة الخ قال والظاهر ان الحنفیۃ داخلون ایضاً فی عامة العلماء واللفظ یشعر بالاجماع والله اعلم

۲۲ ج ۱ صفحہ ۱۳۵

جو شخص غلط قرآن پڑھتا ہو سوال (۱۰) کوئی شخص قرآن مجید کچھ غلط اور کچھ صحیح پڑھتا ہے، اس کی تلاوت اولیٰ ہو یا ترک

روزمرہ یا بوقت فرصت تلاوت کرنا اچھا ہے یا ترک کرنا چاہئے؟

الجواب؛ یہ شخص کسی عالم کو اپنا قرآن سنائے وہ سن کر یہ دیکھے گا کہ اس کی غلطی

کس حد تک ہی، اگر غلطی حد تحریف تک ہو تو اس کو ترک تلاوت لازم ہے جس کی تفصیل ابھی مذکور ہوتی ہے، اور تلاوت کرنا چاہے تو تصحیح حروف بقدر ضرورت لازم ہے، ہاں تصحیح حروف کی سعی میں جو تلاوت غلط ابتداءً ترین میں صادر ہوگی وہ عفو ہے لان القرآن ہو العلم دون التلاوة واللہ اعلم، ودلیلہ تجویز الفقہاء للعاثۃ اذا كانت معلۃ قراءۃ القرآن بالتہجی ولا یخفی ان التہجی تحریف ولكن اجازۃ للتعلیم و ضرورۃ فکذا التعلیم مثله فافہم،

الدلیل فی النوازل روی عن ابی القاسم یعنی الصفار انہ قال الہندی الذی لا یفصح بالقراءۃ فسکوۃ احب من قراءتہ فی الصلوۃ وقیل ولہذا القاری اجر لو قرأ فی غیر الصلوۃ قال ان کان عند تبديل الحروف یصیر کلاماً اخر من کلام الناس فلا ینبغی ان یقرأ فان قرو فی الصلوۃ تفسد صلوۃتہ وهو بقراءۃ ذلك یعنی فی غیر الصلوۃ غیر ما جورو فی الولو الجیۃ بمعناہ وهذا بناء علی مختار المتقدمین وهو المختار فینبغی ان ینظر الی تغییر المعنی بسبب ذلك الحرف فان کان فاحشا تفسد وان صح معناه ولم یجد کثیراً من معنی المراد لا تفسد اھ کبیر (ص ۲۵۳) واللہ اعلم،

۲۱ رجب سنہ ۱۳۴۵ھ

قرآن وحدیث واسم الہی سوال (۱۱) اگر قرآن مجید یا حدیث شریف یا اسم الہی بعینہ انگریزی ہوں تو وہ بھی واجب لتعظیم یا فارسی یا اردو میں لکھا ہوا ہو تو اس کی تعظیم و حرمت ضروری ہے یا نہیں؟

اے اگر قرآن مجید یا حدیث شریف یا اسماء الہی کا ترجمہ انگریزی، فارسی، اردو میں ہو تو کیا حکم ہے؟

الجواب: (۱) ہر زبان میں لکھا ہوا قرآن یا حدیث شریف یا اسم الہی واجب لتعظیم ہے، گو پورے قرآن کا اور زبانوں میں لکھنا جائز نہیں، مگر اس کی بے ادبی بھی جائز نہیں بلکہ اگر کسی نے پورا قرآن فارسی یا انگریزی میں لکھا ہو تو اس کو احتیاط سے ایک طرف جہاں پاؤں نہ پڑیں دفن کر دیا جائے اور اوپر تختہ رکھ کر مٹی سے چھپا دیا جائے، اور ایک

۱۲ منہ وہ تفصیل یہی ہے

دو آیت کا اردو یا فارسی و انگریزی رسم الخط میں لکھنا جائز ہے اور اس کا ادب واجب ہے،
 بلا ترجمہ گواصل کے برابر تو نہیں مگر بے حرمتی اس کی بھی جائز نہیں چاہے کسی زبان
 میں ہو، ۱۲ رجب ۱۳۳۳ھ

تعلیم کے وقت معلم اور بچے جگہ سوال (۱۲) ما تقولون ان المعلم جالس في المكان الاعلى
 اور متعلمین بھی جگہ بیٹھے ہوں تو والمتعلمون القراءان في الاسفل وهذا جائز ام لا؟
 اس میں شرعاً قباحت ہی یا نہیں الجواب: منع الاشارة الفقهاء عن مد الرجلين الى
 المصحف لما فيه من ايهام الاهانة (عالمگیریہ ص ۲۱۱ ج ۱) ولا يخفى
 ان الرجل لا يقدر ان يجلس فوق احد من عظمائه في مجلس واحد ويعد ذلك
 امساءة اللرب في حقه فالقراءان اعظم من كل عظيم في الدنيا فيكرة الجلوس في
 المكان الاعلى اذا كان القراءان اسفل منه في مجلس واحد واذا اختلف المجلس
 تبدل فلا بأس به لانعدام العلة،

ایصال ثواب کیلئے تلاوت قرآن سوال (۱۳) صفات مروجہ لا یشال ثواب جائز ہی یا نہیں
 پراجرت لبنا حرام ہے، بر تقدیر ثانی مجوزین عالمگیری کی سند پیش کرتے ہیں کہ کتاب
 الاسبارہ میں جواز لکھا ہے، گو مولانا عبدالحی صاحب اپنے فتویٰ میں عدم جواز کا فتویٰ دیتے ہیں
 لیکن عمدۃ الرعایہ میں حاشیہ متعلقہ باب الہرم میں نقل کرتے ہیں: اشبه ذلك ما لو
 استاجر شخص لقراءة القرآن ونحوه فاتی به على قصد كونه للمستاجر وقد صرحا
 فيه بان ثوابه للمستاجر، برائے عنایت میرے تردد کو رفع فرمائیے، نیز صورتہ مسئلہ
 وَلَا تَشْتَرُوا الْآيَةَ كَمَا تَحْتَ وَاحِلٍ هِيَ يَابَنِي؟

الجواب: قرأة قرآن عند القبر اور اس پراجرت کو عالمگیریہ وجوہہ میں اگرچہ
 جائز لکھا ہے، جبکہ مدت متعین کر کے معاملہ کیا گیا جاوے، لیکن عالمگیریہ وغیرہ کے اس
 فتویٰ کی علامہ شامی تردید و تغلیط کی ہے، اس لئے صحیح یہ ہے کہ قرأت قرآن پراجرت لبنا
 حرام ہے لکونہ استجاراً للطاعة وهو لا يجوز واستثناء التعليم والاذان الامامة
 للضرورة ولا ضرر ورفہ فیہ ص ۳۰۰ ج ۱ فی رد المحتار (ص ۵۲ و ۵۳)

اجتماعی طور پر ایک مجلس میں سوال (۱۴) در ملک مادر مسجد ان کلام اللہ یعنی قرآن مجید میخوانند
 باواز بلند تلاوت کا حکم ہمہ خلق جمع می شوند و ہم جہرمی کنند و سامع موجود نباشد

آیا اس جائز یا نہ، در بعضی کتب نوشتہ کہ سمح قرآن فرض کفایہ یعنی واجب کفائی است و دریں صورت سامع موجود نباشد،

الجواب: اجتماع کے ساتھ قرأت بالجہر کرنے میں اختلاف ہی، حنفیہ کا مشہور قول یہی ہے کہ جائز نہیں، کیونکہ اس صورت میں ترک اجتماع ہے، اور بعض جواز کی طرف بھی گئے ہیں، اس لئے گنجائش ہے، تفصیلی دلائل کی ضرورت ہو تو مفصل فتویٰ بعد ادا سے اجرت ناقل نقل کر اگر منگاسکتے ہیں، فقط،

سوال (۱۵) احمدی لوگوں کا اعتقاد ہے کہ کوئی قرآنی آیت برکات
قرآن مجید کے شفاء جسمانی ہونے پر شبہ کا جواب

شفاء جسمانی نہیں اُتری ہے، یہ تعویذ جو کہ مولوی لوگ لکھ کر برکات
شفائے جسمانی دیتے ہیں یہ شرک ہے، جو آیت کہ اس میں شفاء کا لفظ و نزل من الخ ہی
اس شفاء سے مراد شفاء روحانی ہے نہ کہ جسمانی، ایک دو حدیث بھی حوالہ میں زبانی پیش
کرتے ہیں کہ اس کی رو سے جسمانی شفاء منع ہے، وہ حدیثیں یاد نہیں ہیں، روحانی اور جسمانی
کے دلائل تحریر فرمائی جاویں، ؟

الجواب: قرآن میں لفظ شفاء عام ہے، اس کو خاص کرنے کے لئے کوئی دلیل
چاہئے، بدون دلیل کے دعویٰ تحفیص رد ہے،

صحیحین میں صحابہؓ کا سورہ فاتحہ سے سانپ کے ڈسے ہوئے کو جھاڑنا پھونکنا ثابت
ہے، ابن ماجہ میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تخیر
الدواء القرآن، ذکر العافظ ابن القیم فی زاد المعاد وسکت عنه واحتج بہ
فہو حسن اوصحیح عندہ۔

نیز صحیحین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معوذتین کو پڑھ کر اپنے اوپر دم کرنا مذکور
ہے اور معوذتین کا نزول ہی اس واقعہ میں ہوا ہے، جبکہ حضور پر ایک یہودی نے اور اس
کی بیٹیوں نے سحر کیا تھا، پھر آپؐ نے ان کو پڑھا تو سحر دفع ہو گیا، زاد المعاد میں اس کا بھی
ذکر ہے، وفی البخاری عن عائشة ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا
اشتكى يقرأ اعلى نفسه بالمعوذات وينفث الخ ص ۵۰، ۲۳،

۱۔ ردی العجہ مشکوٰۃ

انیس الواعظین کی ایک روایت | سوال (۱۶) ایک شخص کا یہ معمول ہے کہ ماہ رمضان کی تیسویں متعلق فضائل سورۃ عنکبوت کو بعد نماز تراویح سورۃ عنکبوت اور سورۃ روم کو پڑھ کر پانی

پر دم کر کے خود بھی پیتا ہے، اور سب کو پلاتا بھی ہے، اور اس کا مستدل ایک حدیث ہے جس کو انیس الواعظین میں بایں طور بیان فرمایا ہے، رسول گفت علیہ السلام من قرء سورۃ العنکبوت وسورۃ الروم فی لیلۃ الثلاثۃ والعشرین من رمضان فهو من اهل الجنة، شیخ المشائخ رکن الدین والحق ابوالفتح فیض اللہ قدس سرہ ملک بہرام سراج الدین فرمود اگر خواہی در بہشت بیشک در آئی دو سورۃ مذکور در شب بست سوم ماہ رمضان بخوان، پس ارشاد ہو کہ آیا شخص مذکورہ کا یہ فعل صحیح اور جائز و درست ہے یا نہیں؟

الجواب؛ فضائل سورۃ قرآن میں جس قدر احادیث ہیں بجز چند احادیث کے سب موضوع ہیں، احادیث صحیحہ میں سورۃ فاتحہ، سورۃ ملک، سورۃ کہف، سورۃ اخلاص، سورۃ کافرون والمعوذتین وسورۃ الم سجدہ، وسورۃ دخان وسورۃ الفتح وسورۃ یس کی فضیلت تو آئی ہے مگر وہ بھی محض تلاوت کی فضیلت ہے، کوئی جہنم یا دن یا تاریخ کی قید نہیں، اور سورۃ الروم اور سورۃ العنکبوت کی جو فضیلت قیود مذکورہ کے ساتھ انیس الواعظین سے نقل کی گئی ہے احادیث صحیحہ میں نظر سے نہیں گذری، اغلب یہ ہے کہ موضوع ہے،

پس جب تک حدیث کا صحیح ہونا معلوم نہ ہو جائے اس وقت تک اس فضیلت کا اعتقاد جائز نہیں، نہ اُس پر عمل کرنا جائز، اور انیس الواعظین کی روایات معتبر نہیں، واللہ تعالیٰ اعلم وقد صرح ائمتہ الحدیث بان الحدیث الذی فیہ فضائل السور موضوع، ذکرہ السيوطی فی اللالی المصنوعۃ فقط،

، اشعبان ۱۲۷۵ھ

قرآن مجید اور درود شریف دل میں | سوال (۱۷) درود شریف بغیر زبان ہلائے دل میں پڑھنے سے بھی ثواب ہوتا ہے؟

جواب؛ ہو گا یا نہیں، جواب سے ارشاد فرمادیں، تاکہ تشفی خاطر ہو بندہ اکثر چلتے پھرتے درود شریف دل میں خیالی پڑھتا ہے، اس لئے کہ النور کے مطالعہ گھبراہٹ پیدا ہوئی، یا اللہ خیالی پڑھنا میرا کیا اکارت گیا؟

الجواب؛ درود شریف و قرآن شریف وغیرہ اگر فقط دل میں پڑھا جاوے اور زبان سے بالکل نہ ہلائی جاوے تب بھی ثواب ہوتا ہے، لیکن زبان سے بھی پڑھیں تو زیادہ

ثواب ہی، اور سجدہ تلاوت واجب نہ ہونے سے یہ کیسے معلوم ہوا کہ ثواب نہیں ملتا، فی حاشیۃ الحصن الحصین علی قولہ کل ذکر مشروع واجباً کان او مستحباً لا یعتد بشیء منہ حتی یتلفظ بہ وھذا کلمہ فیما امر الشارع بان یدکر باللسان ولس معناه ان من یدکر بقلبہ لا یكون معتدا بہ لان مد اومة الذکر لا یتصور بدون اعتبارہ بل ہوا فضل ادراغہ فقد اخرج ابو یعلی عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تفضل الذکر الخفی الذی لا یسمعه الحفظة سبعون ضعفا الحدیث ملخصاً، کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ ۸، صفر ۱۳۵۵ھ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفاعنہ ۹، صفر ۱۳۵۵ھ

چارپائی کے نیچے بکس میں قرآن مجید | سوال (۱۸) بکس میں قرآن مجید بند ہی، چارپائی کے نیچے بند ہو تو چارپائی پر لیٹنا جائز ہے یا نہیں؟ ہے، اس پر لیٹنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب؛ فی العالمگیرۃ ص ۲۱۶ ج ۲ واذا حمل المصحف اوشیء من کتب الشریعة علی دابة فی جوالق و رکب صاحب الجوالق علی الجوالق لا یکرہ کذا فی المحیط اس سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت چارپائی کے نیچے بکس میں مصحف وغیرہ رکھنے کی گنجائش ہے، کما جوز الکرکوب للضرورة، اور بدون ضرورت کے ایسا کرنا بے ادبی ہے، واللہ اعلم رسائل کو وجہ ضرورت ظاہر کر کے سوال کرنا چاہتے، اپنی رائے پر عمل نہ کرے، ظفر احمد کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ | الجواب صحیح ظفر احمد عفاعنہ ۱۰، صفر ۱۳۵۵ھ

حائل شریف جیب میں رکھ کر | سوال (۱۹) اگر جیب میں چھوٹی حائل شریف ہو تو اس حالت پیشاب وغیرہ کرنا، میں پیشاب کرنے کی اجازت ہے یا نہیں؟

الجواب؛ جیب میں حائل شریف رکھ کر بیت الخلا میں جانا یا کسی اور جگہ پیشاب کرنا جائز تو ہے مگر خلافت اولیٰ ہے، اور یہ حکم جب ہے کہ حائل شریف جیب وغیرہ میں چھپ جاوے، اور اگر جیب میں ہوتے ہوئے نظر آتی ہے، تو ایسی حالت میں جیب سے نکال دینا ضروری ہے، فی الطحطاوی علی مرقی الفلاح ص ۳۲ ثم محل الکراہۃ ان لم یکن مستورا فان کان فی جیبہ فانه لا یاس بہ و فی القہستانی عن المنیۃ الافضل ان لا یدخل الخلاء و فی مکہ الا اذا اضطر و نرجوان لا یأثم بلا اضطرار ام واقرة الحموی و فی الحلبي الخاتم المکتوب فیہ شی من ذلک اذا جعل فصدہ الی باطن

کفہ قیل لایکونہ والتحرز اونی ۱۵
 احقر عبد الکریم عفی عنہ ۲۴ صفر ۱۳۵۵ھ
 از خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون ،
 الجواب صحیح ، ظفر احمد ۲۵ صفر ۱۳۵۵ھ

چند اموات کے ایصالِ ثواب کے لئے
 تلاوت میں ہر ایک کو پوری تلاوت
 کا ثواب ملے گا یا تقسیم ہو کر ؟

سوال (۲۰) میں روزانہ ایک سیپارہ قرآن شریف پڑھتا
 ہوں ، اب تک میں قرآن شریف پڑھ کر اس کا ثواب پیغمبر
 صاحب کو اور آپ کی امت کو اور اپنے اعزاء کو پہنچا تھا
 اور یہ سمجھتا تھا کہ پیغمبر صاحب کو اور آپ کے ہر امتی کو اور میرے ہر ایک عزیز کو فرداً فرداً
 ایک سیپارہ پڑھنے کا ثواب ہوگا ، اب میں نے سنا ہے کہ ہر ایک کو ایک سیپارہ پڑھنے کا
 ثواب ہوگا ، بلکہ اس ایک سیپارہ کے پڑھنے کا ثواب تقسیم ہوگا ، اور اس کا ایک ایک حصہ
 ہر ایک کو ملے گا ،

ان دونوں صورتوں میں صحیح کیا سمجھوں؟ ہر ایک کو ایک سیپارہ کا ثواب ہوگا، یا تقسیم ہو جائے گا، اور اس کا ایک ایک حصہ ہر ایک کو ملے گا؟

الجواب؛ چونکہ اس کی تصریح نہیں آئی ہے کہ جو پڑھ کر چند اموات کو بخشا ہو ہر ایک کو پوری پوری تلاوت کا ثواب ملے گا یا سب کو تقسیم ہو کر پہنچے گا، اس لئے کوئی خاص عقیدہ رکھنا ضروری نہیں، دونوں صورتیں محتمل ہیں، قواعد سے تو یہی رائج معلوم ہوتا ہے کہ تقسیم ہو کر ملے گا، جیسا کہ حضرت گنگوہی قدس سرہ نے ارشاد فرمایا ہے ولیکن فضل خداوندی سے یہ بھی بعید نہیں کہ وہ سب کو پورا پورا دیدے،

کتبہ احقر عبد الکریم عفی عنہ از خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون، ۱۲ شعبان ۱۳۵۴
میں کہتا ہوں کہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کا ثواب کم نہ ہوگا
اس کو سب کے برابر ثواب ملے گا، اخراج عبد العزیز صاحب الخلال بسندہ عن
النسائی مر فوعاً من دخل المقابر فقراء سورة یٰسین تحف الله عنهم وكان له
بعد من فیہا حسنات ام من شرح الصدور للسیوطی (ص ۱۲۲ و ۱۲۳) واخرج
مسلم عن ابی الدرداء مر فوعاً ما من عبد مسلم یدعولاً خیه بنظر الغیب
الاقال الملك المؤکل ولك بمثل ام عزیز زی (ص ۲۶۷ ج ۳)

قلت حديث مسلم صحيح وهو عام يشتمل الدعاء بإيصال ثواب القرأة
إلى الألباقيات لما عرفت سندها ولكنها عذرة طرق تكفي لإثبات المسئلة

قلت اخرج البیهقی فی الشعب عن ابن عمر مر فوعا قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من حج عن والديه بعد وفاتهما كتب الله له عتقا من النار وکان للمحبوب عنهما اجر حجة تامة من غیر ان ینقص من اجورهما شیء و اخرج ابو علی السمرقندی عن علی مرفوعا من مر علی المقابر وقرأ قل هو الله احد احدی عشرة مرة ثم وهب اجره للاموات اعطی من الاجر بعد الاموات و اخرج ابو القاسم الزنجانی فی فوائده عن ابی ہریرة مرفوعا من دخل المقابر ثم قرأ فاتحة الكتاب وقل هو الله احد والھکما التکاسر ثم قال اللهم انی جعلت ثواب ما قرأت من کلامک لاهل المقابر کأنوا شفعا له الی الله تعالی، والله تعالی اعلم،

ظفر احمد، عفاعنه ۲۰ شعبان ۱۲۵۸ھ

بوسیدہ قرآن مجید کو دفن کرنا سوال (۲۱) چاہئے، جلالنا صحیح نہیں..... چوں قرآن شریف

دریدہ و بوسیدہ گرد و دربارہ آن در سر آجیہ نوشتہ دفن فی مکان طہیر اور بحرق او نسل الخ و در شامی و عالمگیریہ نوشتہ کہ لا یحرق بالنار، والیہا اشار محمد فی السیر الخ و در قاضی خاں وغیرہ صورت تدفین مذکور است فقط و فعل عثمان و نہ کہ در بخاری شریف در باب جمع القرآن مذکور است تحریر راجع می دہد، این کمترین معتقدان دریں باب نہایت متردد است برائے تشفی خاطر و محض برائے دریافت حقیقت الحال بجناب علی عرض پرداز است کہ ازیں ہر دو قول کدام صحیح و قابل ترجیح است،

الجواب؛ روایت احراق بر جواز مع الکراہت محمول است و روایت تدفین بر استحباب کما علم من الشامی والدر المختار و نصہ والدفن احسن از فعل حضرت عثمان و احراق مزج نشود زیرا کہ مقصود از احراق مامون کردن از خلط قرآن بود و دریں زمانہ مقصود دیگر است کما لا ینفی، و تاویل دیگر در روایت عثمان و در روایت سراجیہ آن است کہ احراق بعد غسل مراد است، واللہ اعلم، احقر عبدالکریم عفی عنہ ۲۸ رجب ۱۲۵۸ھ

الجواب صحیح، اور قاضی عیاض نے جزم کے ساتھ کہا کہ حضرت عثمان نے مصاحف کو جو کہ جلایا تھا، صرح بہ الحافظ فی الفتح ص ۲۸، ظفر احمد عفاعنه، از خانقاہ ابدیہ تھانجو، ۲۸ رجب ۱۲۵۸ھ

گراموفون باجہ میں سوال (۲۲) گراموفون باجہ میں قرآن شریف سننا کیسا ہے، ایک قرآن مجید سننا، صاحب خلیفہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت مولانا گنگوہیؒ کے سامنے ایک مرتبہ اس کا ذکر آیا تو حضرت نے فرمایا کہ جس چیز کا سننا ویسے درست ہے اس کا باجہ میں سننا بھی درست ہے،

الجواب، ہرگز جائز نہیں ہے، ان صاحب کو یقیناً کچھ خلط ہوا ہوگا، قرآن کے ساتھ تلہی جائز نہیں اور اس کا داخل تلہی ہونا ظاہر ہے، ۵ ار رمضان ۱۳۵۸ھ

دستانے پہن کر بلا وضو سوال (۲۳) بسم اللہ الرحمن الرحیم، قرآن پاک چھونا، بغرض حفظ قرآن کو

بار بار چھونا پڑتا ہے تو دستانہ پہن کر جو خاص قرآن شریف چھونے کے لئے مخصوص ہو بلا وضو ہاتھ لگا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب، قال فی العالمگیریۃ ولا یجوز لہم مس المصحف بالثیاب الی ہم لایسواھا، ص ۲۲، چونکہ دستانہ بھی بلبوس ہے اس لئے اس سے مس مصحف جائز نہیں بلکہ رومال وغیرہ سے مس جائز ہے، جو بدن سے منفصل ہو، واللہ اعلم بالصواب، ۳۰ ج ۲ ۱۳۵۸ھ

فصل فی التجوید

سورة برآة کے شروع میں بسم اللہ پڑھنے کا حکم الملقب بالتسمیة علی لقلة من سورة برآة

سوال (۱)

جناب نے جو مسئلہ اپنی کتاب مسمیٰ باغلاط العوام صفحہ ۲۱ مسئلہ ۱۲ میں درج فرمایا ہے تو وہ خبر احاد سے ثابت ہے، اور جو قرأت شاطیہ اور نشر اور اتخاف میں ہے وہ تواتر سے ثابت ہے، طرق مذکورہ میں ترک بسم اللہ ہر حال میں ہے، خواہ برأت کو ماقبل سے وصل کیا جاوے یا ابتداء برأت سے ہو، ایسی صورت میں احاد کو متواتر ترجیح دینا لازم آتا ہے، کتب مذکورہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جمہور کا یہی مذہب ہے کہ ابتداء من البرأت کی صورت میں بسم اللہ نہ پڑھنی چاہئے، امید ہے

کہ احقر کو جناب تشفی بخش امر سے مطلع فرمادیں گے ؟

الجواب؛ الملقب بالتمیۃ علی القراءة من سورة براءة،

قال فی العالمگیریۃ وعن محمد بن مقاتل فیمن اراد قراءة سورة فعليه ان يستعين بالله ويتبع ذلك بسم الله الرحمن الرحيم فان استعاذ بسورة الانفال وسمى ومر فی قراءته الى سورة التوبة وقرأها كافاً ما تقدم من الاستعاذة والتمیۃ ولا ينبغي له ان يخالف الذين اتفقوا وكتبوا المصاحف التي فی ایدی الناس وان اقتصر علی ختم سورة الانفال فقطح القراءة ثم اراد ان یستدعی سورة التوبة كان کارادته ابتداء قراءته من الانفال فیستعین ویسمی وکذلک سائر السور کذا فی المحيط ص ۲۱۲ ج ۶

اس جزئیہ سے فقہی طور پر یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ فقہاء حنفیہ کے نزدیک سورۃ براءة پر ترک تسمیہ صرف اس صورت میں ہے جبکہ قاری اوپر سے سورۃ انفال پڑھتا ہوا آ رہا ہو، اور اگر ابتداء قرأت کی سورۃ توبہ ہی سے کی جائے تو اس صورت میں تسمیہ و تعوذ دونوں جائز بلکہ مستحب ہیں، جیسا کہ ہر سورۃ کا یہی حکم ہے، غرض فقہاء کے نزدیک ابتداء قرأت کی صورت میں سورۃ توبہ پر بسم اللہ کا پڑھنا جائز و مستحب ہے، اس سے اغلاط العوام کے مسئلہ کی تائید ظاہر ہے، اور چونکہ وہ رسالہ فقہی طریقہ پر لکھا گیا ہے اس لئے اس کے مسئلہ کی صحت کے لئے اتنا کافی ہے کہ فقہ حنفی کی کسی معتبر کتاب سے اس کی تائید ہو جاوے، اور علامہ کا معتبر ہونا ظاہر ہے جس میں محیط سے مسئلہ منقول ہے، جو فقہ حنفی میں داخل اصول ہے اور محمد بن مقاتل کا فتویٰ ہے جو امام محمد بن الحسن کے شاگردوں میں سے اعلیٰ طبقہ میں ہیں (جواب مضیۃ ۳۳ ج ۲)

اس کے بعد یہ بات بھی جاننا ضروری ہے کہ فتراء کا منصب الگ ہے فقہاء کا منصب جدا ہے، اس میں خلط کرنا خطا اور موجب غلط ہے، یعنی ائمہ قرأت کا منصب یہ ہے کہ وہ الفاظ و کلمات قرآن کی اداء اور ہیئت کو محفوظ کریں اور نقل کریں، کہ یہ لفظ کس طرح ادا ہوتا ہے اور اس کی ہیئت و تلفظ و کتابت و رسم خط کیا ہے، اور کس نے کس کس طرح اس کو پڑھا ہے، اور کس جگہ آیت ہے اور کہاں وقف ہے، وغیرہ وغیرہ، رہا یہ کہ اس مقام پر وقت یا آیت واجب ہے یا نہیں، یا کہ یہاں اس لفظ کے بجائے دوسرا لفظ پڑھا جانا جائز ہے

یا نہیں یہ منصب فقہاء کا ہے، الغرض حلت و حرمت جواز و عدم جواز و جوب اباحت کا بیان کرنا فقہاء کا منصب ہے، اور اس بارہ میں تمام امت فقہاء ہی کا اتباع کرتی ہے نہ کہ فتراء کا چنانچہ امت احکام میں ائمہ اربعہ امام ابو حنیفہ و مالک و شافعی و احمد بن حنبل کی تقلید کر رہی ہے، ائمہ سبعہ قرار میں سے کسی کی تقلید نہیں کرتی،

اب غور کرنا یہ ہے کہ انفال و برآت کے درمیان بسم اللہ پڑھنا یہ مسئلہ فقہ کا ہے یا قرآت کا، تو سنئے اس مسئلہ کے دو پہلو ہیں، ایک یہ کہ بسم اللہ اس مقام پر صرف عثمانیہ میں لکھی ہوئی تھی یا نہیں، اور ائمہ قرآت نے اس جگہ بسم اللہ پڑھی یا نہیں، اس پہلو کا تعلق فن قرآت سے ہے، دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہاں بسم اللہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں، اگر پڑھے گا تو گناہ ہوگا یا ثواب، اس کا تعلق فن فقہ سے ہے نہ کہ قرآت سے، اب اگر شیعہ اول میں فقہاء و فتراء کا اختلاف ہو تو اس میں قرار کے قول کو ترجیح ہوگی، کیونکہ نقل قرآن کے بارہ میں وہ امام ہیں، اور دوسری شیعہ میں اختلاف ہو تو فقہاء کے قول کو ترجیح ہوگی کیونکہ بیان احکام میں وہ امام ہیں،

اس تمہید کے بعد اپنے استفتاء کا جواب سنئے، آپ نے لکھا ہے کہ جو مسئلہ اغلاط العوام میں ہے وہ خبر احاد سے ثابت ہے اور جو شاطبیہ اور شرواحات میں ہے وہ تواتر سے ثابت ہے، اور طرق مذکورہ میں ترک بسم اللہ ہر حال میں ہے، امر، اس کے متعلق یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ شاطبیہ وغیرہ سے جو وصل و ابتداء دونوں حالتوں میں ترک بسم اللہ ثابت ہے تو اس سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ فتراء سبعہ اس سورۃ کے شروع میں مطلقاً بسم اللہ و تسمیہ نہ کرتے تھے، لیکن اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس جگہ ترک بسم اللہ کا حکم بھی مطلقاً متواتر ہے، کیونکہ یہ بات ضرور نہیں کہ فتراء سبعہ جس مسئلہ پر بھی اتفاق کر لیں وہ متواتر ہوا کرے، ہاں یہ ضرور ہے کہ آیات و کلمات قرآن کے متعلق وہ جو قرآت نقل کریں وہ قرآت متواتر ہوگی، لیکن جس مسئلہ میں گفتگو ہو وہ ہر پہلو سے قرآت کا مسئلہ نہیں، بلکہ اس میں ایک پہلو کا تعلق فقہ سے بھی ہے جیسا کہ اوپر گذرا، پس جس پہلو کا تعلق قرآت سے ہے اس میں اتفاق فتراء کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بسم اللہ کا جزو برآت نہ ہونا متواتر ہے کیونکہ یہاں ترک بسم اللہ ہر سب کا اتفاق ہے، اگر یہاں بھی دوسری سورتوں کی طرح بسم اللہ میں جزو سورۃ برآت ہونے کا احتمال ہوتا تو ضرور کسی قاری سے بسم اللہ پڑھنا ثابت ہوتا جیسا کہ

اور سورتوں میں اختلاف منقول ہے اس سے یہ استنباط کرنا کہ حکم ترک بسم اللہ بھی متواتر ہو صحیح نہیں کیونکہ اول تو جواز و عدم جواز وجوب و حرمت کا بیان کرنا منصب قراء سے الگ ہے تو ظاہر یہ ہے کہ وہ جو مسئلہ بھی بیان کریں گے اس کا تعلق صرف اس پہلو سے ہوگا جو نقل و اداء کے متعلق ہے نہ اس پہلو سے جو جواز و عدم جواز، وجوب و حرمت سے تعلق رکھتا ہے، دوسرے اگر وہ کسی جگہ جواز و عدم جواز وغیرہ میں بھی تواتر کا دعویٰ کریں تو چونکہ اس شق کا تعلق فقہ سے ہے اس لئے اس بارہ میں قراء کا قول فقہاء کے مقابلہ میں مقبول نہ ہوگا، عیسے اگر اس مسئلہ میں ترک بسم اللہ کا وجوب یا استحباب متواتر ہوتا تو فقہاء کو بھی اس تواتر کا علم ہوتا، کیونکہ متواتر کا علم سب کو ہوا کرتا ہے، اور جس کا علم بعض کو ہو بعض کو نہ ہو وہ متواتر ہی نہیں، اور امام محمد بن مقاتل رازی نے جو امام محمد بن حسن شیبانی کے شاگرد ہیں بحالت ابتداء استحباب تسمیہ کی تصریح کی ہے، اسی طرح امام طحاویؒ نے بھی مشکل الآثار میں برات کے ابتداء میں بہر حال تسمیہ کو ترجیح دی ہے، ملاحظہ ہو المختصر من المخصر (ص ۴۰۳) تو اگر اول برات میں ترک تسمیہ وجوباً یا استحباباً مطلقاً متواتر ہوتا تو ان دونوں حضرات کو ضرور اس کا علم ہوتا جن کا زمانہ امام شاطبی اور امام ابو عمرو دانی کے زمانہ سے بہت مقدم ہے یہ بعید کہ کہ تواتر کا علم شاطبی اور دانی کو تو ہو جائے، اور محمد بن مقاتل و طحاوی کو نہ ہو، اور یہ بھی بعید ہے کہ امام طحاوی اور محمد بن مقاتل تواتر یا اجماع کے خلاف کریں،

چوتھے شاطبیہ کے شعر میں ترک بسم اللہ کی علت تواتر مذکور نہیں، بلکہ صرف یہ مذکور ہے کہ وہ حکم سبقت کے ساتھ نازل ہوئی ہے، اور یہ علت نہیں بلکہ محض حکمت ہے ورنہ سورۃ محمد کے شروع میں بھی بسم اللہ نہ چاہئے تھی، جس کا دوسرا نام سورۃ القتال ہے، اور اگر یہ کہا جاتا کہ اس میں عذاب کا ذکر ہے، اور کفار سے اس کا تعلق ہے تو چاہئے کہ سورۃ ذیل تکلی تمزہ اور سورۃ تہمت میں بھی بسم اللہ نہ ہو، کیونکہ ان میں بھی عذاب کا ذکر ہے، اور کفار سے ان کا تعلق ہے، پس معلوم ہوا کہ یہ علت نہیں محض حکمت ہے، اور یہاں تسمیہ نہ ہونے کی اصل علت وہ ہے جس کو خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباسؓ کے جواب میں بیان فرمایا ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر سورت کے شروع پر بسم اللہ پڑھتے تھے جس سے ہم کو معلوم معلوم ہو جاتا تھا کہ یہاں سے سورۃ شروع ہوتی ہے، اور برات کے شروع میں آپؐ نے بسم اللہ نہیں پڑھی اور نہ یہ بتلادیا کہ الفال و برات یہ دو سورتیں ہیں یا ایک اور مضمون

دونوں کا متشابہ تھا، اس لئے میں نے دونوں کو پاس پاس کر کے بیچ میں فصل بھی کر دیا اور بسم اللہ نہیں لکھی، اس حدیث کو احمد و ابو داؤد و نسائی و ترمذی و ابن ماجہ اور ابن حبان و حاکم نے روایت کیا ہے، اور ابن حبان و حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے، فتح الباری ج ۳، اور اس علت کا مقتضاء وہی ہے جو عالمگیری میں محمد بن مقاتل سے منقول ہے کہ وصل کی حالت میں تو بسم اللہ نہ پڑھی جاوے، اور ابتداء کی صورت میں پڑھ لی جائے، کیونکہ اس حدیث سے ترک بسم اللہ کی علت یہ معلوم ہوئی کہ اس میں انفال کے جزو ہونے کا احتمال ہے، اور ظاہر ہے کہ سورۃ انفال کے کسی حقیقی جزو سے قرأت شروع کی جائے تو اس وقت بسم اللہ کا استحباب و جواز متفق علیہ ہے تو جزو محتمل کے ساتھ ابتداء قرأت کرنے میں جس میں استقلال کا احتمال بھی ہے بسم اللہ کے جواز میں کیا شبہ ہو سکتا ہے، بلکہ ظاہر یہ ہے کہ مستحب ہی، اور اگر لتزیلہا بالسيف کو علت ہی مانا جاوے تو یقیناً یہ علت تو متواتر نہیں، کیونکہ امام طحاوی نے اس علت کو مردود کہا ہے، ملاحظہ ہو، المعتصر من المختصر صفحہ مذکور، اور علت متواترہ کو کوئی ادنیٰ عالم بھی رد کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا، نہ کہ امام طحاوی جیسا محدث، فقیہ، مجتہد دوسرے یہ بات حضرت علیؑ سے منقول ہے جس کو حاکم نے مستدرک (ص ۲۳۰ ج ۲) میں روایت کیا ہے، اور حاکم اور علامہ ذہبیؒ دونوں نے اس سے سکوت کیا ہے، صحت کی تصریح نہیں کی، پس امام طحاوی کا اس کے مضمون پر کلام کرنا اس کی دلیل ہے کہ ان کے نزدیک یہ قول حضرت علیؑ سے صحت سند کے ساتھ منقول نہیں اور حضرت عثمانؓ سے جو حدیث منقول ہے اس کو حاکم و ابن حبان و ذہبی نے صحیح کہا ہے کما مر فی کلام الحافظ و صحیح الذہبی فی تلخیصہ للمستدرک (ص ۲۳۰ ج ۲) پس شاطبیہ کے اس شعرہ و مہما تصلھا و بدأت براءۃ و لتزلیھا بالسيف لست بمسملہ کا مطلب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ سورۃ برأت پر براءۃ وصل و ابتداء بسم اللہ نہ کہنا چاہئے کیونکہ وہ سیف کے ساتھ نازل ہوئی ہے، یعنی ائمہ قرأت نے اس حکمت کی وجہ سے جو حضرت علیؑ سے منقول ہے، ہر حالت میں اس سورۃ پر ترک بسم اللہ کو اختیار کیا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ ائمہ قرأت کے نزدیک ہر حالت میں ترک بسم اللہ واجب ہے، جس کا خلاف جائز ہے اور عدم وجوب کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ امام سخاوی نے لکھا ہے کہ ہم تبرکاً بسم اللہ براءۃ پر پڑھ لیتے ہیں، کما نقلہ القاری سلطان محمد خان مدرس المدرستہ تجوید الفرقان بلکنو فی مکتوبہ، اگر قراء ترک بسم اللہ کو واجب کہتے ہیں تو کیا امام سخاوی ناجائز کا ارتکاب کرتے تھے، حاشا و کلاً، پس یا تو یہ مان لیا جائے جو ہم کہتے ہیں کہ ائمہ قرأت وجوب

کے قائل نہیں یا یہ ماننا چاہئے کہ یہ مسئلہ متواتر نہیں بلکہ اجتہادی ہے، والحق ترشح قول الفقہاء فی الاجتہادات ۱۲ ظفر

نہ ہو، بلکہ ان کے نزدیک مستحق ہو کہ ہر حالت میں ترک کیا جائے جس کی بناء وہی حکمت ہے، نہ اس میں ترک بسم اللہ کا دعویٰ ہے نہ وجوب کا، وقال السیوطی فی الاتقان والابتداء بالاتی وسط براءة قل من تعرض له وقد صرح بالبسملة فیہ ابو الحسن السخاوی ورد علیہ الجعبری ام (ص ۱۱۱) قلت والابتداء بوسطها واولها سواء فی النظر وبہ علم ان ترک البسملة فی براءة عند الابتداء بہا لیس بمتواتر والام مختلف فیہ القراء فافہم،

پھر چونکہ اس استحسان کا بنی دلیل ہو تو فقہاء کو حق ہے کہ اس دلیل میں غور کر کے دوسری دلیل کو اس پر ترجیح دیں، چنانچہ سند اور روایت و درایت سیدنا عثمانؓ کی حدیث کی ترجیح اس پر ظاہر ہے کہ اس میں اصل علت کا ذکر ہے، اور قول سیدنا علیؓ میں صرف حکمت مذکور ہے، اور احکام کی تفریع علل پر ہوتی ہے، نہ کہ حکم پر، ہذا واللہ یہدی من یشاء الی صراط مستقیم فقط از تھانہ بھون خانقاہ اشرفیہ، مورخہ ۳، جمادی الاولیٰ ۱۳۵۴ھ

سوال (۲) مَالَا طَاقَةَ كُنَابِهِ كَوَلَا طَاقَةَ

کُنَابِیْہِ پڑھنے کا حکم، قرآن مجید و فرقان حمید کے اندر سورۃ بقرہ کے آخر میں

مَالَا طَاقَةَ كُنَابِیْہِ یہاں پر وقت جائز ہے، یہاں بِنِہِ پڑھنا چاہئے یا بِیْہِ اگر پڑھا جاوے اور ہا کے درمیان یا قائم کرنے سے کیا کفر عائد ہوگا، ہمارے یہاں پر ایک عرب صاحب تشریف لائے، وہ فرماتے تھے کہ اگر اس جگہ درمیان ہا اور ہا کے یا قائم کرنے سے اور بِنِہِ پڑھنے سے کفر عائد ہوگا تو اور بہت جگہ قرآن مجید کے اندر لفظ بِیْہِ پڑھتا ہے، یہاں پر بِنِہِ پڑھنے سے نماز کے اندر کچھ فرق آتا ہے یا نہیں جیسے عَجَبًا یَقْدِرُ عَلَی الرَّشْدِ قَامَنَابِہِ ط اور سَأَلْتَهُ ط و بال امرہ ط عبادہ ط وغیرہ، یہ لفظ بھی اسی قسم کے ہیں، ان کے اندر بھی تی کی زیادتی ہوتی ہے، تی کی زیادتی کرنے سے پڑھنا جائز ہے یا نہیں، اور نماز میں کچھ فرق آتا ہے یا نہیں، بروئے شرع شریف جواب سے مطلع فرمائیں، اللہ تعالیٰ آپ کو اجر عظیم عطا فرماوے،

الجواب؛ لَا طَاقَةَ كُنَابِیْہِ ط پر وقت جائز ہے، اور وقت کے وقت ہا اور ہا کے درمیان یا قائم کرنا جائز نہیں ہے، کہ فعل مہمل ہے، اور لفظ قرآن کو بگاڑنا ہے، اور یہ جب ہو کہ عمدًا یا زیادہ کیا جائے، اور بلا قصد کے زیادہ ہو جائے تو عمدًا پڑھانے کے

برابر تو گناہ نہ ہوگا، لیکن تلاوت میں سستی کرنے کا گناہ ہوگا، اور کفر کسی حالت میں عائد نہیں ہوتا، ہونا کوئی شخص قرآن کی تحریف کے قصد سے یا استہزاء لفظ کو بگاڑتا ہے تو اس کو سوال میں واضح کر کے سوال دوبارہ کیا جائے، اور جس کا قصد تحریف و استہزاء کا نہیں بلکہ تجوید جاننے کی وجہ سے وہ یہ کو بیٹھ پڑتا ہے تو اس پر کفر عائد نہیں ہوتا، اگر اس صورت میں عرب صاحب نے کفر کا فتویٰ دیا ہو تو ان کا فتویٰ صحیح نہیں ہے، واللہ اعلم

۱۲ شعبان ۱۴۲۸ھ، خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون

اجزاء قواعد صرف و در تحفیف و اسقاط ہمزہ | سوال (۳) قاعدہ صرفی یہ ہے کہ اگر ہمزہ منفردہ متحرکہ در قرآن خلاف قرأت حفص است یا نہ نقل کر کے ماقبل کو دیدیں گے اور ہمزہ کو تحفیف کے لئے ساقط کر دیں گے، مثلاً یومنون میں یومنون جوازاً یا مثلاً قد اقلع میں قد اقلع بھی پڑھ سکتے ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ امام حفص جن کی قرأت ہم لوگ پڑھتے ہیں ان کا عمل کیا ہے، اور آیا قرآن مجید میں اس قاعدہ صرفی کے جواز کی بناء پر کہیں ہمزہ کا سقوط اور کہیں اس کی بقاء درست ہوگی یا نہ ہوگی، اور ایسا کرنا امام حفص کی قرأت کے خلاف تو نہ ہوگا؟

الجواب؛ اس قاعدہ صرفی پر عمل کرنا قرأت حفص کے خلاف ہے، کیونکہ ان کی قرأت تغیم و تحقیق پر مبنی ہے و ہوا الاصل، البتہ چونکہ دوسرے ائمہ قرأت سے ایسا حذف و تحفیف ثابت ہے، اس لئے تلاوت میں قاعدہ صرف کا اجزاء جائز ہے، مگر یہ ضرور ہے کہ پہلے یہ معلوم کر لیا جائے کہ ائمہ قرأت میں سے اس موقع پر کسی نے ایسا کیا ہے یا نہیں؟ فان مبنی القرآن علی النقل دون القیاس والعقل، نیز بحالت امامت ایسا نہ کیا جائے، کہ عوام کو تو خوش ہوگا،

۲۲ شعبان ۱۴۲۸ھ

نقد جہاں کم میں ادغام واجب ہے یا نہیں | سوال (۴) اسی طرح ادغام جائز میں یعنی جو صرفاً اور اس میں حفص کا کیا قول ہے؟ | جائز ہے، اس میں بھی وجود یا عدم کی کوئی شق اختیاً کرنا خلاف صرف نہیں، مگر یہ نہیں معلوم کہ قرأت حفص اس میں صرف کے اعتبار سے دونوں طرح پڑھتے ہیں یا ایک طرح، نیز مثلاً نقد جہاں کم میں بقاعدہ صرف ادغام واجب ہے، مگر ہمارے یہاں کے قرآنوں میں بغیر ادغام چھپا ہوا ہے، اس کے متعلق حفص کا کیا قول ہے، صرف میں قاعدہ بیان کیا گیا ہے کہ جہاں حرکت حرف دوم واجب ہو،

وہاں ادغام واجب ہے، اور جہاں جائز ہو وہاں جائز ہے، اور جہاں ممتنع ہو وہاں ممتنع ہو نیز اور تمام شرائط ادغام بھی پائے جلتے ہیں، کہ دو حرف ہم مخرج ہیں کلمۃ التباس سے بھی بے خوف ہے اور ملحق برباعی بھی نہیں ہے، اور حرف دوم متحرک بھی ہے، اور یہ حرکت دوم واجب بھی ہے،

الجواب، قرأت حفص میں صرف مثیلین و متجانسین کا ادغام ہے، متقاربین کا ادغام نہیں ہے، اور ادغام واجب بھی صرف یہی ہے کہ مثیلین و متجانسین کا پہلا حرف ساکن ہو تو ادغام لازم ہے، لَقَدْ جَاءَكُمْ متقاربین کے جنس سے ہے، اس واسطے اس میں ادغام واجب نہیں، ہاں جائز ہے، لثبوتہ عن ائمة القسرة غیر حفص لکن بشرط التلاوة منفردا دون الامامة لما قد مناه، دوسرے دال قَدْ کا ادغام تَرَار میں ایک مستقل مسئلہ ہے، کہ دالِ قد کے محال ادغام حروف ثمانیہ ہیں، سین، ذال، ضاد، ظار، زار، جیم، صاد، شین عاصم و قالون و ابن کثیر سب میں اظہار کرتے ہیں، ورش ضاد و ظار میں ادغام باقی میں اظہار ابن ذکوان ضاد و ذال و زار و ظار میں ادغام بقیہ میں اظہار، ہشام طبریکشا اظہار بقیہ موانع میں ادغام کرتے ہیں، اور ابو عمر و حمزہ و کسائی حروف ثمانیہ بجمیعہ میں ادغام کرتے ہیں، کذا فی ابن القاصح، پس لَقَدْ جَاءَكُمْ کا ادغام حفص کی قرأت میں نہیں ہے، ہاں اگر کوئی کرے تو جائز ہے،

۲۲ شعبان ۱۲۶۳ھ

مکرر سوال متعلق سوال مذکور | سوال (۵)، استاذی المکرم مولانا ظفر احمد صاحب فیوضکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ والانا مہ میرے عزیز نے جواب میں ملا، جس میں ادغام کے بارے میں مذہب قرار سب سے معلوم ہو گیا، مگر ساتھ ہی اس کے اہل صرف پراعتراض باقی رہا جو مثل لَقَدْ جَاءَكُمْ میں ادغام کو واجب کہتے ہیں،

الجواب، مکرری السلام علیکم ورحمۃ اللہ، بجواب گرامی نامہ آنکہ، شاید آپ کو بیچ گنج وغیرہ کی عبارت سے شبہ ہو گیا ہے کہ اہل صرف قراء کے خلاف ہیں مگر واقعہ یہ نہیں اہل صرف قراء کے موافق ہیں، بلکہ اہل صرف و نحو وہی ہیں جو اہل قرأت ہیں قال ابن العاجب فی الشافیۃ والطاء والدال والذال والطاء والناء والشاء یدغم بعضها فی بعض وفی الصاد والزاء وال سین ام وقال الرضی فی شرحہ واعلم انه اذا کان اول المتقاربین ساکنا والثانی ضمیر مرفوع متصل فکانهما فی الکلمۃ

الواحدة التي لا يلبس فيها وذلك لشدة الاتصال ثم انه ان اشتد تقارب الحرفين
لزم الادغام كما في عدت وزدت بخلاف الكلمتين المستقلتين فانه يجوز ترك
الادغام اذن والادغام احسن وبخلاف ما لم يشد فيه التقارب فنوعدت
واعلم ان الاحرف الستة المذكورة يدغم في الضاد والشين المعجمتين
ايضا لكن ادغامها فيهما اقل من ادغام بعضها في بعض الخ ص ۳۹۹ مطبوعه
لاهور، اس عبارت میں غور کرنے سے امور ذیل معلوم ہوں گے،

(۱) متقاربین میں ادغام جب واجب ہے کہ اول ساکن دوم متحرک ہو، اور کلمہ واحدہ میں
اجتماع ہو، کلمتین مستقلین میں واجب نہیں، (اور لغد جبارک کو کلمہ واحدہ شمار کرنا درست
نہیں)

(۲) کلمہ واحدہ میں ادغام جب واجب ہے کہ تقارب شدید ہو، ورنہ غدت میں واجب
نہیں، (اور لغد جبارک میں دال و جیم میں تقارب شدید نہیں پس وجوب نہ ہوا)
(۳) ابن حاجب اور رضی نے دال کا ادغام جیم میں بیان ہی نہیں کیا، پھر اہل صرف
کے نزدیک لغد جبارک میں ادغام کس طرح واجب ہوا، بات یہ ہو کہ دال و جیم میں براۓ
نام تقارب ہی جس کی وجہ سے ابو عمرو جو اہم الادغام ہیں ان میں ادغام کو جائز کرتے ہیں
ورنہ وجوب کا تو کوئی احتمال نہیں نہ صرفانہ قرآنہ،

۳، رمضان ۱۲۶۰ھ

تَشْنِيفُ السَّمْعِ بِمَعْنَى الْأَحْرَفِ السَّبْعِ

تَكْمِيلُ لَوْقُوفٍ فِي تَفْصِيلِ سَبْعَةِ حُرُوفٍ

تشنیف السمع بمعنی الاحرف سبع | سوالات (۶) ۱۔ صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت ابی بن کعبؓ
و تکمیل الوقوف فی تفصیل سبعة حروف سے جو قرآن مجید کے قاری تھے روایت ہے کہ آنحضرتؐ
کو حسب دعاء آنحضرتؐ سات قراءتوں میں قرآن مجید پڑھنے کی اجازت دی گئی اور آسان
کیا گیا، چنانچہ ابی بن کعب مذکور سے روایت ہے کہ ان کے پاس ایک شخص نے قرآن کو

۵۰ ہذا للقب من سیدی حکیم الامت قال ہو مخصوص بالجواب عن سبعة استئلة ۱۲

دوسری قرأت میں پڑھا، جو مذکور کو اس کا علم نہ تھا، وہ اس کو آنحضورؐ کے حضور میں لے گئے تو آنحضورؐ نے اس قرأت کو بھی درست فرمایا، اس سے صحابی مذکور کو ایسا وسوسہ گذرا کہ حالت کفر میں بھی ویسا شک نہ گذرا تھا، آنحضورؐ سمجھ گئے، اور آنحضورؐ نے اُن کے سینہ پر ہاتھ مارا، جس سے مذکور کا شک جاتا رہا، اب اس سے حسب ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں،

(۱) جبکہ ایک صحابی کو شک ہوا تو عام مسلمانوں کا کیا حال، اب حضورؐ کے ہاتھ کے بجاتے تو علماء کا جواب ہی ہو سکتا ہے،

(۲) قرأت منزل من اللہ نازل ہو چکی تھی وہ تو ایک ہی قرأت ہوگی پھر حضرت کی دعا سے سات قراءتوں میں اجازت ہوئی آسانی ہو جائیگی وجہ، جو حدیث میں ہے کہ سات حروف میں قرآن نازل ہوا اس سے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ایک حرف یا لفظ قرآن شریف سات حروف میں پڑھنا جائز ہے، یا وہ خاص خاص حروف یا الفاظ ہیں، اگر خاص ہیں تو وہ الفاظ کہاں کہاں قرآن شریف میں وارد ہیں، اور وہ تبادلہ قرأت قرآن شریف سے ثابت ہے یا حدیث ہے

(۳) قرأت منزل من اللہ میں کیا تکلیف تھی جو حضورؐ نے آسانی چاہی، باقی چھ قرأت خود حضورؐ نے تجویز فرمائیں، تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام کے برابر مخلوق کا کلام نہیں ہو سکتا پھر کلام الہی میں حضورؐ نے دخل کیوں دیا، خواہ قرأت منزل من اللہ میں تکلیف ہی ہوتی، پھر اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اَلْوَسْعًا،

(۴) موجودہ قرآنوں میں قرأت قرآن شریف ایک ہی ہے بعض پُرانے نسخوں پر حاشیہ پر ایک دو قراءتوں درج ہیں سات کہیں نہیں،

(۵) پھر ہر جگہ موجودہ قراءتوں میں وہ سات قراءتیں نقل کیوں نہیں جس سے واضح ہونا چاہتے تھا کہ منزل من اللہ یہ قرأت ہے، پھر حضرت کی دعا سے یہ قرأت بھی پڑھنی جائز ہے،

(۶) جبکہ مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ قرآن شریف ویسا ہی منزل من اللہ محفوظ ہے جیسا اتارا گیا ہے، زیرِ برکات بھی فرق نہیں، تو اس کے کیا معنی ہوتے کہ سات قرأت دعا حضورؐ سے جائز ہوتیں،

(۷) مثلاً الحمد شریف میں مَلِک کے بجائے مَلِک پڑھنا جائز ہے، حالانکہ بہ لحاظ لغت مَلِک اور مَلِک کے معنوں میں فرق ہے، کسی چیز کے مالک اور بادشاہ میں بہت فرق ہے،

تمہید جواب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، آپ کے سوالات مولانا مرتضیٰ حسن صاحب نے احقر کو دینے کے جبکہ میں اس ہفتہ کے شروع میں دیوبند حاضر ہوا تھا، اور یہ فرمایا کہ سائل کا اطمینان نہیں ہوا، اس لئے سہل عنوان سے جواب دینے کی ضرورت ہے، میں نے ان کے ارشاد کی تعمیل ضروری سمجھی، اس لئے آپ کے سوالات اپنے ساتھ تھانہ بھون لایا، مگر آپ کا خط دیکھ کر دل بچھ گیا اور جواب دینے سے طبیعت رکنے لگی، کیونکہ آپ نے مولانا حبیب الرحمن صاحب کے جواب پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے چند اعتراضات کئے ہیں جو ایک طالب حق بلکہ مسلمان کی شان سے نہایت مستبعد ہے،

کیا آپ کو معلوم نہیں کہ علامہ کے ذمہ صرف تبلیغ ہے، سائل کا اطمینان کر دینا ان کے ذمہ نہیں، اور نہ یہ کسی کے اختیار میں ہے، اگر سائل طالب حق ہو اور خدا نے اس کو فہم سلیم بھی عطا فرمائی ہو تو محقق کے جواب سے اس کا اطمینان ہو جاتا ہے، اور اگر ان شرائط میں سے کسی میں خلل ہو تو اطمینان نہیں ہوتا، اور علماء اس کے مکلف نہیں، آپ کے سوالات کا جواب ایک بار دیا جا چکا تھا جس سے ضرورت کا درجہ ادا ہو گیا تھا، اب اگر دوسری ضروریات کو آپ کے مکرر سوالات پر مقدم کیا گیا تو اس میں اعتراض کی کونسی بات ہے بالخصوص جبکہ سوالات ایسے ہیں جن کو عمل میں کوئی دخل نہیں، بلکہ صرف علمی تحقیقات پر مشتمل ہیں، جن کا عامی کو کوئی حق نہیں، عامی کو صرف احکام دریافت کرنے کا حق ہے، تحقیقات علمیہ کا حق علماء و طلباء کو ہے، جیسا کہ رعایا کو صرف احکام و قوانین سلطنت معلوم کرنا ضروری ہے اور قانون کی علل و دقائق کی تحقیق کا حق نہیں، بلکہ یہ حق دکلاء و اہل قانون کو ہے، پس آپ کے اعتراض کو دیکھ کر جواب دینے سے دل رُک گیا تھا، مگر صرف مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کے ارشاد کی وجہ سے جواب کی ہمت کرتا ہوں، لَاقَ رِضَا اللہ فی رِضَا الْاَیْمَانِ

الجواب

(۱) عن ابن عباس مرفوعاً قال اقرأنی جبریل علی حرف فرجعتہ فلم ازل استزیئ ویزیدنی حتی انتھی الی سبعة احرف، اخرجه البخاری،

وفي رواية مسلم عن ابي بلفظ ان النبي صلى الله عليه وسلم كان عند اصناف
 بنى غفار فاته جبريل فقال ان الله يأمرك ان تقر في امك القرآن على حرف فرد
 اليه ان هو ان على امتي وفي رواية له ان امتي لا تطيق ذلك،
 وللمزمذى من وجه اخر انه صلى الله عليه وسلم قال يا جبريل اني بعثت
 الى امته اميين منهم العجوز والشيخ الكبير والغلام والجارية والرجل
 الذي لم يقرأ كتاباً قط الحديث،
 وخرج البخاري عن عمر في قصة طويلة فقال رسول الله صلى الله عليه
 وسلم ان هذا القرآن انزل على سبعة احرف فاقروا ما تيسر منه ام وقال
 الله تعالى وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه ليبين لهم الآية،
 وخرج البخاري عن عثمان انه قال للرهط القرشيين الثلاثة اذا اختلفتم
 وزيد بن ثابت في شيء من القرآن فاكتبوه بلسان قريش فانما ننزل بلسانهم ففعلوا
 الخ - وخرج ابوداود من طريق كعب الانصاري ان عمر كتب الى ابن مسعود ان
 القرآن نزل بلسان قريش فاقرئ الناس بلغة قريش لا بلغة هذيل ام وعن عمر
 ايضا انه قال اذا اختلفتم في اللغة فاكتبوها بلسان مضر ام اخرج العافط في
 الفتح وعنه الى ابن داود في المصاحف وزيادته في الفتح صحاح اوحسان،
 وخرج البخاري عن حذيفة انه افترعه اختلا فهم في القراءة فقال
 حذيفة لعثمان يا امير المؤمنين ادرك هذه الامة قبل ان يختلفوا في الكتاب
 اختلاف اليهود والنصارى الخ قال العافط وفي رواية يونس فتذاكروا
 القرآن فاختلوا فيه حتى كاد يكون بينهم فتنة وفي رواية عمار بن غزوة
 ان حذيفة قدم من غزوة فلم يدخل بيته حتى اتى عثمان فقال يا امير المؤمنين
 ادرك الناس قال وما ذاك قال غزوت فرج ارمينية فاذا اهل الشام يقرءون
 بقراءة ابي بن كعب فيأتون بمالهم يسمعون اهل العراق واذا اهل العراق يقرءون
 بقراءة عبد الله بن مسعود فيأتون بمالهم يسمعون اهل الشام فيكفر بعضهم
 بعضها وخرج ابن ابي داود في المصاحف من طريق ابي قلابة قال لما كان في
 خلافة عثمان جعل المعلم يعلم قراءة الرجل والمعلم يعلم قراءة الرجل

فجعل العلماء يتلقون فيختلفون حتى ارتفع ذلك الى المعلمين حتى كفر بعضهم بعضاً فبلغ ذلك عثمان فخطب فقال انتم عندى تختلفون فمن نأى منى من الامصار اشد اختلافًا،

واخرج ابن ابى داود باسناد صحيح من طريق سويد بن غفلة قال قال على لا تقولوا فى عثمان الا خيراً فوالله ما فعل الذى فعل فى المصاحف الا عن ملأ من اهل مكة ما يقولون فى هذه القراءة فقد بلغنى ان بعضهم يقول ان قراءتى خير من قراءتك وهذا يكاد ان يكون كفر اقلنا فما ترى قال ارى ان نجسم الناس على مصحف واحد فلا تكون فوقة ولا اختلاف قلنا نعم ما رأيت ام رضى الله عنه، فتح الباري

قال الحافظ وذهب ابو عبيد واخرون الى ان المراد بالاحرف السبعة اختلاف اللغات وهو اختيار ابن عطية وتعقب بان لغات العرب اكثر من سبعة واجيب بان المراد افصحها فجاء عن ابى صالح عن ابن عباس قال نزل القرآن على سبع لغات منها خمس بلغة العجم من هوازن قال والعجم سعد بن بكر وجشم بن بكر ونصر بن معاوية وثقيف وهؤلاء كلهم من هوازن ويقال لهم عليا هوازن ولهذا قال ابو عمرو بن العلاء افصح العرب عليا هوازن وسفلى تميم يعنى بنى دارم واخرج ابو عبيد من وجه اخر عن ابن عباس قال نزل القرآن بلغة الكعبين كعب قریش وكعب خزاعة قيل وكيف ذاك قال لان الدار واحدة يعنى ان خزاعة كانوا جيران قریش فسهلت عليهم لغتهم وقال ابو حاتم السجستاني نزل بلغة قریش..... وهذا يدل وتيمم الرباب والاندلس وربيعة وهوازن وسعد بن بكر ام ونقل ابو شامة عن بعض الشيوخ انه قال انزل القرآن اولاً بلسان قریش ومن جاورهم من العرب الفصحاء ثم ابيح للعرب ان يقرؤا بلغة اهلهم التى جرت عادتهم باستعمالها على اختلافهم فى الالفاظ والاعراب ولم يكلف احد منهم الانتقال من لغتهم الى لغة اخرى للمشقة ولما كان فيهم من الحمية ولطلب تسهيل تفهيم المراد ام قال الحافظ وتسمه ذلك ان يقال ان الاباحة المذكورة

لم تفع بالتشهي اي ان كل احد يغير الكلمة بمراد فيها في لغة بل الموعى في ذلك
 السماع من النبي صلى الله عليه وسلم (ص ۲۲ ۹۷)
 وفيه ايضا اما من اراد قراءته من غير العرب فلا اختيار له ان يقرأه
 بلسان قريش لانه الاولى وعليه - يحمل ما كتب به عمري ابن مسعود لان
 جميع اللغات بالنسبة لغير العربي مستوية في التعبير فاذا لبد من واحدة
 فلتكن بلغة النبي صلى الله عليه وسلم واما العربي المجبول على لغته فلو
 كلف قراءته بلغة قريش لعسر عليه التحول مع اباحة الله له ان يقرأه
 بلغته ويشير الى هذا قوله في حديث أبي كما تقدم هون على امتي وقوله
 ان امتي لا تطيق ذلك،

قال الخطيب في تاريخه (ابوشامة) انه انزل اولاً بلسان قريش ثم سهل على الامتان يقرأه بغير لسان قريش
 وذلك بعد ان كثرت دخول العرب في الاسلام فقد ثبت ان ورد التخفيف بذلك
 كان بعد الهجرة كما تقدم في حديث ابي بن كعب ان جبريل لقي النبي صلى الله
 عليه وسلم عند اضافة بني غفار الحديث وهو موضع بالمدنية النبوية
 (صفحة ۲۵ ۹۷)

دلائل مذکورہ بالا سے امور ذیل مستفاد ہوئے :-
 (الف) جبریل علیہ السلام نے اولاً ایک ہی طریقہ پر حضور کو قرآن پڑھایا، (ملاحظہ
 ہو نمبر ۱)۔

(ب) پھر حضور کو حکم ہوا کہ امت کو بھی اسی طریقہ پر قرآن پڑھائیں، حضور صلی
 اللہ علیہ وسلم نے درخواست کی کہ میری امت پر آسانی کی جائے، میری امت اس سے
 عاجز ہے تو شات طریقوں سے پڑھنے کی اجازت دی گئی، اور یہ درخواست حضور صلی اللہ
 علیہ وسلم نے مدینہ منورہ پہنچ کر ہجرت کے بعد کی ہے، جبکہ اہل عرب اسلام میں کثرت داخل
 ہونے لگے (ملاحظہ ہو، نمبر ۲ و نمبر ۱۱) اس سے معلوم ہوا کہ ہجرت سے پہلے صرف ایک ہی
 طریقہ پر قرأت تھی،

(ج) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس درخواست کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ میں امتی
 قوم کی طرف مبہوت ہوا ہوں، جن میں بعضے لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے لکھا پڑھا نہیں

اور ان میں بوڑھی عورتیں بھی ہیں، اور بوڑھے مرد بھی اور لڑکے اور لڑکیاں بھی (جو اپنی زبان کو جلدی نہیں بدل سکتے)۔

(د) اب یہ گفتگو باقی رہی کہ سب سے احرف یعنی اُن ثبات طریقوں سے کیا مراد ہے، جن کی ہجرت کے بعد اجازت دی گئی، اور وہ طریقہ کونسا تھا جس پر اولاً قرآن نازل ہوا، سو محققین امت کا قول یہ ہے کہ قرآن اولاً قریش کے لغت پر نازل ہوا، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کی زبان تھی، چنانچہ قرآن میں بھی ارشاد ہے وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (کہ ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا مگر اس کی قوم ہی کی زبان میں تاکہ اُن کو سمجھا سکے) اور حضور کی قوم قریش تھی، پس ضرور ہے کہ قرآن قریش کی زبان میں نازل ہوا اور حدیث میں بھی حضرت عمر و حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کا قول موجود ہے، کہ قرآن لغت قریش میں نازل ہوا ہے (ملاحظہ ہو نمبر ۶ و ۷) پس اولاً لغت قریش میں قرآن کا نزول ہوا، اور ہجرت سے پہلے چونکہ اسلام لانے والے زیادہ تر اہل مکہ تھے، جو سب قریش تھے یا قریش کی زبان میں تکلم کرنے والے، اس لئے عرب کے دوسرے لغات میں پڑھنے کی مسلمانوں کی ضرورت نہ تھی، پھر ہجرت کے بعد چونکہ دوسرے قبائل عرب بھی اسلام میں داخل ہونے لگے اور گو تمام قبائل عرب کی مشترک زبان عربی تھی، مگر تلفظ و اعراب وغیرہ میں بہت کچھ اختلاف تھا، مثلاً قریش حَتَّى حِينَ كَوْحًا سے پڑھتے تھے اور حذیل اس کو عَتَّى حِينَ عَيْن سے پڑھتے تھے، قریش اِنَّا اَعْطَيْنَاكَ الْكُوْثُرَ پڑھتے، اور بعض قبائل اَعْطَيْنَا كَوَا لَطِيْنًا پڑھتے، یعنی بجائے عَيْن کے نَوْن ادا کرتے تھے، لغت قریش میں حروف مضارع کو فتح یا ضمہ ہوتا ہے، بعض قبائل ان کو کسرہ سے پڑھتے تھے، مثلاً تَعْلَمُوْنَ کو تَعْلَمُوْنَ کہتے، لغت قریش میں ہمزہ بھی ایک حرف ہے، اور بعض قبائل ہمزہ بالکل ادا کرتے تھے (اور اس اختلاف کی نظیر ہر زبان میں موجود ہے، مثلاً دہلی اور لکھنؤ کی اردو زبان میں اختلاف ہے، ایک کھار پانی کہتا ہے، ایک کھاری پانی بولتا ہے، کوئی میٹھا دہی کہتا ہے کوئی میٹھی دہی، اسی طرح کسی جگہ چھا چھ بولتے ہیں کہیں مٹھا، کسی جگہ چھالیہ بولتے ہیں کہیں ڈلی یا سپاری کہتے ہیں، دہلی والے عموماً ہا کو یا بولتے ہیں، مثلاً میں جا رہا تھا، میں یہ کہہ رہا تھا، اور لکھنؤ والے اس طرح نہیں بولتے اور قاعدہ ہے کہ مادری زبان کا دفعۃً بدل جانا دشوار ہے، دگوپوری کو شش اور اہتمام سے کام لیا جائے تو ممکن ہے مگر قدرے دشوار ضرور ہے) خصوصاً ایسی قوم کو جس میں لکھنے پڑھنے

کارواج بالکل نہ ہو، بلکہ محض سننے سنانے پر مدار ہو، اور قرآن کا مدار ان کے یہاں محض اسی پر تھا، لکھنے پڑھنے والے بہت کم تھے، بس جتنا قرآن جس کے پاس تھا وہ حفظ ہی میں تھا، اور اس حالت میں دوسرے قبائل اپنے تلفظ ہی کے موافق قرآن کو پڑھتے تھے، دفعۃً لغت قریش اور تلفظ قریش کو ادا نہ کر سکتے تھے (جیسا کہ لکھنؤ والا دفعۃً دلی کے محاورات میں گفتگو نہیں کر سکتا، اگر وہ اردو کا کوئی مضمون لکھ کر دیکھ کر نہ پڑھے بلکہ یادداشت سے پڑھے تو ضرور اپنے لکھنوی تلفظ اور محاورات سے اس کو ادا کرے گا، ہاں کوشش کے ساتھ یاد کرنے سے بہت جگہ دہلی کے محاورات کو ملحوظ رکھنا ممکن ہے، لیکن کہیں کہیں اس کی مادی زبان کا تلفظ بھی ضرور ادا ہوگا ۱۲) اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی درخواست کی کہ چونکہ اہل عرب زیادہ ترامی ہیں اور ان کے تلفظ و اعاب مختلف ہیں تو دفعۃً سب کو لغت قریش کا مکلف کرنے میں اندیشہ ہے کہ ان سے اس میں کوتاہی ہوگی اور اس کوتاہی کی وجہ سے گناہ میں مبتلا ہوں گے، اس لئے اس میں توسیع فرمائی جائے، چنانچہ درخواست منظور ہوئی، اور سات طریقوں سے قرآن پڑھنے کی اجازت دی گئی، اور ان سات طریقوں سے مراد قبائل عرب کے سات لغات ہیں جن کے نام بھی روایات میں مذکور ہوئے ہیں (ملاحظہ ہو)۔ یعنی اس کی اجازت دی گئی کہ جو شخص لغت قریش میں قرآن کا تلفظ نہ کر سکے وہ ان قبائل میں سے کسی قبیلہ کے تلفظ میں قرآن کے الفاظ کو ادا کر لیا کرے، اور غالباً سات لغات میں انحصار اس لئے کیا گیا کہ ان کے سوا دوسرے قبائل کا تلفظ فصیح نہ تھا، یا یہ کہ ان قبائل کے تلفظ کے تابع دوسرے قبائل تھے، اس لئے زیادہ توسیع کی ضرورت نہ تھی، اور اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ لغت قریش کے علاوہ جو کچھ لغات تھیں ان میں حقیقۃً قرآن کا نزول نہیں ہوا، بلکہ حقیقی نزول لغت قریش میں تھا، مگر چونکہ سہولت کے لئے دوسرے کچھ قبائل کے تلفظ میں بھی قرآن پڑھنے کی اجازت دیدی گئی تھی اس لئے حکماء وہ بھی منزل من اللہ ہو گئے، رفعل ما ورنہ ان القرآن انزل علی سبعة احرف، اوقال لرجلین قرأتہما مختلفۃ ہکذا نزول محمول علی التوسیع فی الکلام بطریق الجوز ای ان کلہما منزلة حکما ۱۲)

نیز یہ بھی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سات لغات میں پڑھنا ہر شخص کی رائے پر نہ تھا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر پڑھنے کی اجازت تھی، حضور نے خود دوسرے لغات میں پڑھ کر بتلادیا تھا، کہ لغت قریش کے سوا ان لغات میں اس طرح بھی پڑھنا جائز ہے

(ملاحظہ ہو نمبر ۱)

(۸) بخاری کی حدیث میں فَاَقْرَأْ مَا تَسْرِبْنَهُ سے مفہوم ہوتا ہے کہ لغت قریش کے علاوہ دوسرے لغات میں پڑھنا واجب نہ تھا صرف جائز تھا، اور اس کا منشاء وہی ہے کہ دوسرے لغات کی اجازت سہولت اور تیسیر کے لئے دی گئی تھی،

(۹) حضرات صحابہ کو معلوم تھا کہ قرآن کا نزول اولاً لغت قریش میں ہوا ہے، اور ہجرت سے پہلے زمانہ قیام مکہ میں تیرہ سال تک ایک ہی قرأت اور ایک ہی لغت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھایا گیا، اور حضور نے بھی ایک ہی لغت میں مسلمانوں کو قرآن سکھلایا، پھر مدینہ میں ہجرت کے بعد حضور نے اس میں توسیع کی درخواست کی جو منظور ہوئی، ان سب امور سے صحابہ جانتے تھے کہ قرآن کی اصلی لغت قریش کی لغت ہے، اور دوسرے لغات کی اجازت عارضی لغت تیسیر ہے، اور جو حکم عارضی کسی خاص غرض کے لئے ہوتا ہے... وہ حصول غرض تک محدود ہوتا ہے، پس جب غرض حاصل ہو گئی اور اہل عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج ہو گیا، ادھر دوسرے قبائل کا اختلاط بھی قریش سے زیادہ ہو گیا، اور اب سب کو لغت قریش میں قرآن کا پڑھنا آسان ہو گیا ہے، ادھر یہ دیکھا گیا کہ جن لغات میں قرآن پڑھنے کی اجازت سہولت و تیسیر کے لئے دی گئی تھی اب ان کا باقی رکھنا موجب اختلاف اور سبب فتنہ بن رہا ہے کہ دوسرے قبائل کے آدمی اپنے ہی طریقہ کو صحیح اور دوسرے طریقوں کو غلط کہتے ہیں، اور ایک دوسرے کی تکفیر کرتے ہیں تو صحابہ نے اجماع کے ساتھ اس پر اتفاق کر لیا کہ اب دوسری قراتوں کا باقی رکھنا مناسب نہیں، بلکہ قرآن کو صرف لغت قریش پر جمع کرنا چاہئے، (ملاحظہ ہو نمبر ۸ و ۹) چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں تمام اجلہ صحابہ کے اتفاق سے صرف ایک قرات اور ایک ہی لغت پر قرآن جمع کیا گیا، کہ یہی قرآن کی اصلی زبان تھی اور بقیہ زبان میں قرآن کا پڑھنا بند کر دیا گیا کہ وہ عارضی زبان تھی جو خاص غرض کے لئے جائز کی گئی تھی، اور اب وہ غرض حاصل ہو گئی،

(۱۰) اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ احرف سبعہ سے مراد وہ قرات سبعہ نہیں ہیں جو اس وقت تک قرآن میں رائج اور شاطبیہ وغیرہ میں مدون ہیں، کیونکہ یہ قرات سبعہ سب کے سب لغت قریش کے موافق ہیں، دوسرے لغات عرب ان میں موجود نہیں ہیں رہا یہ سوال کہ لغت قریش میں قراءات سبعہ کیوں ہیں ایک ہی قراءت کیوں نہ ہوئی

سوالہ تعالیٰ کے اسرار کو پوری طرح تو کون سمجھ سکتا ہے، لیکن محققین کی برکت سے جو حکمت معلوم ہوتی ہے اس کو عرض کرتا ہوں، اس میں ایک حکمت تو یہ ہے کہ تھوڑے لفظوں میں بہت سے احکام بیان ہو جاتے ہیں، اگر اختلافِ قرأت نہ ہوتا تو اس حکم کے لئے جو قرأت کے اختلاف سے ظاہر کیا گیا ہے مستقل آیت نازل ہوتی، اور اس طرح قرآن بھی انجیل و توریت کی طرح ضخیم کتاب ہو جاتی، حالانکہ قرآن کا حفظ واجب کیا گیا ہے، تو حفظ میں دشواری ہوتی اس لئے اللہ تعالیٰ نے بہت سے احکام کو ایک ہی آیت میں چند قرأتیں نازل کرنے بیان فرمادیا، دوسری حکمت یہ ہے کہ قرآن کو معجزہ قرار دیا گیا تھا اور بلغا، و فصحا، عرب سے اس کی نظیر کا مطالبہ کیا گیا تھا، اور عام طور پر انسان کے کلام بلیغ و فصیح کا حال یہ ہے کہ اگر اس میں کچھ تغیر کیا گیا تو اس کی فصاحت و بلاغت میں فرق آ جاتا ہے، اور یہ تو ضرور ہے کہ تغیر کے بعد دونوں میں ایک درجہ کی بلاغت نہیں رہتی، بلکہ ایک میں فصاحت زیادہ دوسرے میں کم ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی بہت پست کرنے کے لئے قرآن میں بعض الفاظ کو کئی کئی طرح استعمال فرمایا اور دکھلادیا کہ کسی کی بلاغت و فصاحت میں ذرہ برابر فرق نہیں اور جس طرح بھی پڑھا جائے ہر حالت میں یہ کلام معجز ہے، اور یقیناً یہ امر مشکل کی اعلیٰ درجہ کی قدرتِ کلامی کی دلیل ہے، کہ وہ فصاحت و بلاغت پیدا کرنے میں ایک ہی طرز کا محتاج نہیں بلکہ وہ کئی کئی طرح تکلم کر کے بھی کلام کو ایک ہی درجہ پر فصیح و بلیغ رکھ سکتا ہے، اب میں سائل کے سوالات کی طرف توجہ کرتا ہوں، سائل کو حضرت ابی کعب کے واقعہ پر شبہ ہے کہ جب ایک جید صحابی کو شک ہوا تو عام مسلمانوں کا کیا حال الخ اس کا جواب یہ ہے کہ صحابی کو شک نہ ہوا تھا صرف وسوسہ پیدا ہوا تھا اور وسوسہ اور شک میں فرق ہے وسوسہ غیر اختیاری ہے، جس پر کچھ مواخذہ نہیں، شک اختیاری ہے جو کفر ہو جاتا ہے، سائل کا اس کو شک سمجھنا غلط ہے، کیونکہ ابی بن کعب کی اسی حدیث کے الفاظ طبری میں یہ ہیں؛

فوجدت فی نفسی وسوسة الشیطان حتی احمر وجهی فضرب فی صدري و قال اللهم احسأ عنه الشیطان، کذا فی فتح الباری (ص ۲۱ ج ۹) اور وسوسہ کا علاج کبھی تصرف سے ہوتا ہے، جیسا کہ حضور نے اس موقع پر کیا، کبھی دوسرے طریقوں سے ہوتا ہے جیسا کہ علماء نے بیان فرمایا ہے، اور وسوسہ بڑے سے بڑے ولی کو بھی ہو سکتا ہے، حتیٰ کہ کفر کا وسوسہ بھی ہو سکتا ہے، اور یہ کسی درجہ میں بھی مضر نہیں

جبکہ دوسوسہ کے درجہ سے آگے نہ بڑھے، ابو داؤد میں روایت ہے کہ صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم کو بعض دفعہ ایسے وساوس آتے ہیں کہ ہم اس وقت جل کر کوئلہ ہو جانا پسند کرتے ہیں، حضور نے جواب میں فرمایا، ذاک صریح الایمان الحمد للہ الذی رد کیدہ الی الوسوسۃ، (کہ یہ تو خالص ایمان ہے، خدا کا شکر کرو کہ اب شیطان کی تہمت تدریس دوسوسہ تک ہی رہ گئی) مشکوٰۃ، ص ۹،

رہا یہ کہ جس امر سے اتنے بڑے صحابی کو دوسوسہ پیدا ہوا اس سے عام مسلمانوں کو بھی دوسوسہ پیدا ہو سکتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ صحابی کو اس وقت تک یہ معلوم نہ تھا کہ قرآن کو مختلف لغات میں پڑھنے کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت ہے، وہ یہ سمجھے تھے کہ قرآن کا ایک ہی لغت میں پڑھنا واجب ہے، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلادیا کہ اس کو سات لغتوں میں پڑھنے کی بھی اجازت ہے، پھر کسی کو دوسوسہ پیدا نہیں ہوا، پس اب بھی کسی مسلمان کو اس حقیقت کے معلوم کرنے کے بعد دوسوسہ نہ ہونا چاہئے، مگر صحابہ کرام نے بعد والوں کے حال پر رحم کھا کر ان سات لغات کو اسی لئے باقی نہ رکھا کہ اس سے بعد والوں کو فتنے پھیلے گئے، بلکہ قرآن کو صرف ایک ہی لغت میں لکھا گیا جو قرآن کی اصل زبان تھی، کیونکہ ہم نے مکرر بیان کیا ہے کہ دو سکر لغات کی اجازت محض قبائل عرب پر تیسر و تہمیل کے لئے دی گئی تھی، اور وہ قرآن کی اصلی لغت نہ تھی،

رہا یہ سوال کہ جس طرح عرب کے لئے سہولت و آسانی کی رعایت کی گئی کہ سات لغات کی اجازت ہو گئی اسی طرح اہل عجم کے لئے بھی سہولت و آسانی ہونا چاہئے تھی، اس کا جواب یہ ہے کہ اہل عجم کے لئے بھی سہولت و آسانی شریعت میں موجود ہے، مگر اس کی وہ صورت نہیں جو اہل عرب کے لئے تھی، بلکہ دوسری صورت ہے وہ یہ کہ اہل عجم کو لغت قریش ہی کا سیکھنا واجب ہے، کیونکہ ان کے لئے تمام قبائل عرب کے لغات مساوی درجہ رکھتے ہیں، بلکہ لغت قریش زیادہ آسان ہے، اور اس میں یہ سہولت کر دی گئی کہ جب تک حروف و مخارج صحیح نہ ہوں اس وقت تک غلط حروف و مخارج ہی میں قرآن پڑھنے کی اجازت دیدی گئی اور یہ کہدیا گیا کہ تصحیح حروف و مخارج میں لگے رہو، کوشش کرتے رہو، اور جب تک صحیح نہ ہوں اس وقت تک تمہارا غلط قرآن بھی خدا کے یہاں مقبول ہے، اور اس بارہ میں فقہانے جس قدر سہولتیں بیان کی ہیں کہ خطا، لغوی خطا، اعرابی، لحن خفی، لحن جلی کی تفصیل کر کے

بہت سی صورتوں میں باوجود غلطی کے اہل عجم کی نماز کو صحیح مانا ہے، وہ قابل دید ہے، پس خیال غلط ہے کہ اہل عجم کے لئے قرأت قرآن میں تیسیر و تسہیل نہیں،

(۲) اس کے بعد سائل سوال کرتا ہے کہ کیا ایک لفظ یا ایک حرف قرآن شریف کا سنا حروف میں پڑھنا جائز ہے الخ، جواب یہ ہے کہ سائل نے سب سے احرف کا مطلب نہیں سمجھا، ہم اوپر بتلا چکے ہیں کہ سب سے احرف سے مراد قبائل عرب کے سات لغات (یعنی سات زبانیں) ہیں، جو باوجود عربی ہونے کے تلفظ و اعراب میں باہم مختلف تھیں، جیسا کہ ہندوستان میں مختلف صوبوں کے اندر اردو زبان کا تلفظ مختلف ہے، اور ظاہر ہے کہ ایک زبان میں جو اختلاف تلفظ ہوتا ہے وہ ہر لفظ میں نہیں ہوتا، بلکہ بعض خاص الفاظ میں اختلاف ہوتا ہے، پس اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر لفظ کو سات لفظ میں پڑھنا جائز ہو، ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی خاص لفظ کو سات طرح بھی پڑھا جاتا ہو، جیسا کہ عَبْدُ الطَّاعُوْتُ میں علماء نے کہا ہے (فتح الباری)

رہا یہ کہ وہ خاص خاص الفاظ کہاں کہاں قرآن میں وارد ہیں، تو اس کے معلوم کرنے کی ضرورت اب نہیں رہی، کیونکہ حضرت عثمانؓ ہی کے زمانہ میں تمام اہل عرب قرآن کو لغت قریش میں پڑھنے پر قادر ہو گئے تھے، اور یہ حالت دیکھ کر صحابہ نے قرآن کو لغت قریش ہی پر جمع کیا، اور بقیہ لغات کو جمع نہیں کیا، بلکہ ان میں قرآن کے پڑھنے سے لوگوں کو رکھڑا گیا، کیونکہ اس کی اجازت عارضی تھی، اور اب ضرورت باقی نہیں رہی، جیسا کہ اوپر تفصیل کے ساتھ اس کے دلائل مذکور ہو چکے،

(۳) قرأت منزل من اللہ صرف ایک تھی، یعنی لغت قریش، اور حضورؐ کی درخواست سے جو دوسرے لغات عرب میں قرأت کی اجازت مل گئی، ان کو اللہ تعالیٰ کی اجازت سے حضورؐ نے بیان فرمادیا اس لئے وہ بھی حکماً منزل تھیں، حقیقتہً ان کا نزول نہیں ہوا، اور نہ ان کے نزول کی ضرورت تھی، کیونکہ اہل عرب خود جانتے تھے کہ اس لفظ کو قریش کس طرح بولتے ہیں، اور دوسرے قبائل کس طرح، نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی تمام لغات عرب سے واقف تھے کہ وہ کہاں کہاں قریش کے تلفظ سے اختلاف رکھتے ہیں، اور اس پر یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ کے کلام کے برابر مخلوق کا کلام نہیں ہو سکتا، پھر کلام الہی میں حضورؐ نے کیوں دخل دیا، کیونکہ حضورؐ کا یہ دخل خدا تعالیٰ کی اجازت سے تھا، اور اس دخل کا حاصل یہ نہیں تھا

کہ کلام الہی میں زیادت یا کمی کی گئی بلکہ کلام الہی کے الفاظ میں دوسرے قبائل کو اجازت دی گئی کہ وہ ان کو اپنے تلفظ کے موافق ادا کر لیں جیسا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو اجازت ہو کہ جب تک ان کا تلفظ صحیح ہو اس وقت تک الحمد کو الہم اور النعمت کو انامت اور غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کو غیر المغضوب علیہم ولا الدوالین پڑھ لیں، اور ہر شخص جانتا ہے کہ ہندوستانی مسلمان اپنے غلط تلفظ میں بھی کلام الہی کو ہی پڑھتے ہیں کچھ اور کتاب نہیں پڑھتے، یہی حال اس تلفظ کا تھا جس کی اجازت حضورؐ کی دعا سے ہوئی کہ سات لغات میں قرآن کو پڑھ لو، اتنا فرق ہے کہ اہل عرب کے تلفظ میں کہیں لفظ بدلتا تھا کہیں اعراب بھی بدلتے تھے، رہا یہ سوال کہ قرأت منزل من اللہ میں کیا تکلیف تھی الخ تو اس سوال کا جواب ہماری ذمہ نہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تکلیف کا احساس فرمایا، اور اس کو تکلیف سمجھا، ہم کو اگر اس کا احساس نہ ہو تو ہم کو اس کے سمجھنے کی بھی ضرورت نہیں لیکن پھر بھی میں نے تبرعاً اس کی اوپر مثال لکھ دی، کہ جیسا دہلی والوں کو لکھنؤ والوں کا تلفظ اختیار کر لینا دفعۃً سہل نہیں، یہی حال قبائل عرب کا تھا، رہا یہ کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے لا یكلف اللہ نفساً الا وسعہا تو حق تعالیٰ نے اس تکلیف کا لحاظ کیوں نہیں فرمایا کہ حضورؐ کی دعا کی ضرورت ہوئی، اس کا جواب یہ ہے کہ ایک لغت میں سب قبائل کا قرآن پڑھنا گودشوار تھا مگر قدرت اختیار باہر نہ تھا، اگر قدرت اختیار باہر ہوتا تو جیسے بگو لغت قریش کیونکر آسان ہو گیا، اور یقیناً جو کام ایک مہینہ کے بعد انسان کر سکتا ہے وہ پہلے دن بھی اس کے اختیار باہر نہیں، گو پہلے دن میں اس کا بجا لانا زیادہ دشوار ہو، پس حق تعالیٰ کا حکم لا یكلف اللہ نفساً الا وسعہا کے خلاف ہرگز نہ تھا، البتہ حضورؐ نے اس میں زیادہ سہولت کی درخواست کی اور اگر فرض کر لیا جائے کہ لغت قریش کا دفعۃً سیکھ لینا دیگر قبائل کی قدرت سے خارج تھا، جب بھی اللہ تعالیٰ کا حکم لا یكلف اللہ نفساً الا وسعہا کے خلاف نہ تھا، کیونکہ اس صورت میں ایک قرأت کے واجب ہونے کا حاصل یہ ہوتا کہ جب تک یہ قرأت صحیح طور پر حاصل نہ ہو اس وقت تک کی نمازیں درست نہ ہوں گی، بعد میں ان نمازوں کی قضا واجب ہو گئی، اور یہ قدرت سے باہر نہ تھا ہاں امت پر گرائی ہوئی، حضورؐ نے اسی کو رفع کرنا چاہا، یا اس کا حاصل یہ ہوتا کہ جو قبائل قرآن کو قریش کے تلفظ میں ادا نہیں کر سکتے، وہ جب تک تلفظ قریش کو نہ سیکھ لیں، اس وقت تک خود قرآن نہ پڑھیں، نہ ایسا شخص امام بنے

بلکہ ان قبائل کو چاہئے کہ کسی قریشی مسلمان کو اپنے یہاں لے جا کر رکھیں اور اس سے قرآن سنا کریں، اسی کو امام بنایا کریں، اور یہ بھی قدرت سے باہر نہ تھا، مگر گراں ضرور تھا، حضورؐ نے اس گرائی کے رفع کی درخواست کی جیسا کہ پچاس نمازوں سے پانچ تک تخفیف کی درخواست کی تھی، لایکلف اللہ نفساً الا وسعاً کے خلاف وہ حکم بھی نہ تھا، کیونکہ پچاس نمازیں قدرت سے باہر نہیں، ہاں گرائی ضرور ہوتی، اسی طرح اس کو سمجھو،

(۴) سائل نے پُرانے فترانوں میں مختلف قراءتیں دیکھ کر یہ سمجھا ہے کہ یہ اُن قراتوں میں سے کوئی فترت ہے جن کے لئے حضورؐ نے دُعاء کی تھی، حالانکہ یہ خیال غلط ہے، کیونکہ ہم بتلا چکے ہیں کہ سبعة احرف سے مراد قبائل عرب کے سات لغات ہیں، اور حضرت عثمانؓ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہی بقیہ چھ لغات کی ضرورت نہ رہنے کی وجہ سے قرآن کو صرف ایک لغت یعنی لغت قریش میں جمع کیا گیا، اور یہ فترتیں جو آجکل قراتوں میں لکھی گئی ہیں یہ احرف سبعة میں سے نہیں ہیں، بلکہ یہ سب ایک حرف ایک لغت یعنی لغت قریش ہی ہے، اور اس لغت میں اختلاف قراءت کی حکمت میں اور پر عرض کر چکا ہوں مکرر ملاحظہ کیا جا، اور اس اختلاف کو سات قراءت یا قراءات سبعة کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ ہر حرف اور ہر لفظ میں سات قراءتیں ہیں بلکہ ان قراءات کو قراءات سبعة محض قاریوں کے سات ہونے کی وجہ سے کہا گیا ہے، اور اس کا بھی یہ مطلب نہیں کہ ہر قراءت کا راوی ایک ہی ہے بلکہ ہر قراءت متواتر ہے جس کے راوی ہر زمانہ میں بے شمار تھے، لیکن تابعین و تبع تابعین کے زمانہ میں جن کا درجہ قراءت میں بڑھا ہوا تھا ان کو قراءت کا امام قرار دے کر ایک ایک قراءت کا ایک ایک شخص کو امام بنالیا گیا اور ان سب کی قراتوں میں بعض جگہ ہی اختلاف ہوتا ہے، ہر جگہ نہیں، اور یہ اختلاف بقول بعض کہیں تو کیفیت تلفظ کا ہے، جیسے مد و ادغام و آملہ وغیرہ اور کہیں نفس لفظ میں اختلاف ہے، اور یہ بالاتفاق ہے، کیونکہ قریش کے بعض قبائل مد و ادغام و آملہ زیادہ کرتے تھے، اور بعض کم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر طرح پڑھ کر سنا دیا جس کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت تھی، اور جہاں نفس لفظ میں اختلاف ہے اس میں یا یہ حکمت ہے کہ ایک ہی آیت میں چند احکام بیان کرنا منظور ہے تاکہ قرآن منہم نہ ہو جائے، یا اہل بلاغت کی ہمتیں پست کرنا مقصود ہے کہ دیکھو ہم کس طرح ایک کلام میں بدل بدل کر مکمل کرتے ہیں، اور پھر بھی فصاحت و بلاغت اپنے درجہ پر ہے، اگر کسی کو ہمت ہو تو اس کا مقابلہ کرے،

(۵) اس نمبر کا جواب نمبر ۳ سے واضح ہو چکا۔

(۶) سات لغات میں قرآن پڑھنے کی اجازت دینے سے قرآن کے محفوظ ہونے میں کیا فرق ہوا، کیا اگر اہل عرب الحمد کو آراء سے اور ہندوستان کے جاہل الہمد کو آراء سے پڑھے تو اس قرآن میں کچھ فرق آگیا یا یہ کہا جائے گا کہ ہندوستانی صحیح تلفظ پر قادر نہیں، اس لئے دو شخصوں کی قرأت میں فرق ہو گیا ورنہ لفظ ایک ہی ہے، بس اسی کی نظر ان سات لغات کے تلفظ کو سمجھنا چاہئے جن کی حضورؐ نے اجازت حاصل کی تھی محض اس لئے کہ قبائل عرب قرآن کی اصلی تلفظ کو صحیح طور پر ادا کرنے پر پوری طرح دفعہ قادر نہ تھے،

(۷) مالک یوم الدین میں جو دو قرار تیں ہیں ان کا اختلاف ان سات لغات یا احرف سبعہ میں سے نہیں جن کی اجازت حضورؐ نے دعاء سے حاصل کی تھی، بلکہ یہ دو قرأتیں ایک ہی لغت میں ہیں، یعنی لغت قریش میں اور اس میں وہی حکمت ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نہ صرف مالک ہیں کہ بادشاہ نہ ہوں اور نہ صرف بادشاہ ہیں کہ مالک نہ ہوں، اور کمال کا مقتضایہ ہے کہ دونوں صفتیں مجتمع ہوں، اس لئے یہاں دو قرأت مقرر کر کے دونوں صفتوں کا اللہ تعالیٰ میں مجتمع ہونا بتلادیا گیا، بتلایے اس میں کیا اشکال ہے، بلکہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو اشکال باقی رہتا ہے، اگر قرأت ایک ہوتی تو مالک سے عدم سلطنت کا شبہ رہتا، اور خلک سے عدم مالکیت کا،

الوقف علی آیت آیت، یعنی الجوارب المتعلق بالوقف علی آیت یہ؛ (۷) قال الفاری فی شرح ہر آیت پر وقف کرنا، الشماثل فی حدیث ام سلمہؓ کان یقلّم قراتہ یقول الحمد

لله رب العالمین ثم یقف ثم یقول الرحمن الرحیم ثم یقف ثم یقول والحمد لله انہ کان یقف علی رؤس الآسی تعلیم اللّٰمة ولوفیه قطع الصفتہ عن الموصوف ومن ثم قال البیہقی والعلیمی وغیرہما یسنّ ان یقف علی رؤس الآسی وان تعلقت بما بعدہا لا یتباع فقدح بعضهم فی الحدیث بان محل الوقف یوم الدین غفلة عن القواعد المقررة فی کتب القراءۃ اذا جمعا علی ان الوقف علی الفواصل وقف حسن و ان تعلقت بما بعدہا وانما الخلاف فی الافضل هل الوصل او الوقف فالجہور کالسجادی وغیرہ علی الاول والجزری علی الثانی وکذا صاحب القاموس حیث قال صح انہ صلی اللہ علیہ وسلم وقف علی راس کل آیت وان کان

متعلقاً بہا بعدہ و قول بعض القراء الوقف علی ما یفصل فیہ الکلام اولی، غفلة
عن السنۃ وان اتباعہ صلی اللہ علیہ وسلم اولی، والاعدل عدم العدول عما
ورث فی خصوص الوقف متابعۃ ام من ۱۱۲،

اس سے معلوم ہوا کہ ہر آیت پر وقف کرنا اتفاقاً جائز ہے، خواہ آیت پر لا ہو یا نہ ہو، لیکن
لازم نہیں، بلکہ جمہور فتر کا مذہب یہ ہے کہ وقف کلام تام پر اولیٰ ہے، اور رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم نے ہر ہر آیت پر جو وقف فرمایا ہے، اس سے امت کو فواصل و مقاطع آیات کی
تعلیم مقصود تھی، جب یہ مقصود حاصل ہو گیا تو اب ہر آیت پر وقف کی ضرورت نہیں، کلام
تام پر وقف کیا جائے، جمہور کا قول یہی ہے کہ بعض فتر نے ظاہر حدیث پر عمل اختیار کیا،
اور ہر آیت پر وقف کو مستحسن کہا ہے، مگر ضروری اور لازم کسی نے نہیں کہا،
ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ زیادہ معتدل بات یہ ہے کہ جن مواقع میں رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم سے صراحۃً وقف ثابت ہے (جیسے سورۃ فاتحہ کی ہر آیت پر وقف صراحۃً منقول
ہے، اسی طرح اور بھی مواقع ہیں جن میں راویان حدیث نے حضورؐ کا وقف بیان کیا ہے)
وہاں وقف کو وصل پر ترجیح دی جائے کہ اتباع اسی میں ہے، یعنی ان کے علاوہ دوسرے
مقامات میں جمہور کے قول پر عمل کیا جائے کہ جہاں کلام تام ہو گیا ہو وقف کیا جائے جہاں تام
نہ ہو وصل کیا جائے، اور جو شخص اس امر پر غور کرے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
احادیث کثیرہ میں تحسین صوت بالقرآن و تزین قرآن بالاصوات کا امر فرمایا ہے اور یقیناً
بعض مقامات میں ہر ہر آیت پر وقف کرنا تحسین صوت و تزین قرآن کے خلاف ہوتا ہے
اس سے قرأت کی سلاست و روانی برباد ہو جاتی اور سامع پر قرأت ثقیل ہو جاتی ہے،
جس کو شارع علیہ السلام کسی طرح گوارا نہیں فرما سکتے، تو وہ خود یہ کہنے پر مجبور ہو گا کہ ہر آیت
پر وقف ضروری نہیں، بلکہ بعض جگہ اولیٰ بھی نہیں، مثلاً سورۃ العادیات میں کوئی شخص
ہر آیت پر وقف کرنے لگے اور یوں پڑھے: والحدیث ضجاً۔ فالمریت قدحاً۔ فالمنغیرات
ضجاً۔ فاشرن بہ نقعاً۔ فوسطن بہ جمعاً۔ اسی طرح سورۃ النازعات، والمرسلات کی اوائل
آیات میں ہر آیت پر وقف کرنا موجب سلاست نہیں ہوتا، بلکہ باعث تشقیل علی السامع
ہو جاتا ہے، پس شارع علیہ السلام کا مقصود ہر آیت پر وقف کرنے سے جو کچھ تھا اس کو
جمہور علماء نے خوب سمجھا ہے، اور بعض علماء نے تو حدیث اُم سلمہؓ کو صرف سورۃ فاتحہ

کے ساتھ مخصوص کیا ہے کہ حضور سورہ فاتحہ میں ہر آیت پر وقت فرماتے تھے، سائے قرآن کا اس میں ذکر نہیں، ملاحظہ ہو اعلیٰ السنن، ص ۱۵۱ ج ۴، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب
از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ، ۳ رمضان ۱۳۸۵ھ

کتاب التفسیر

تحقیق معنی آیت، فابعثوا حکماً من
اہلہ وحکماً من اہلہا، الآیہ والملقب
بہدایۃ الامم فی ولایۃ الحکم

سوال (۱).....

ایک مسلمان اپنی منکوحہ عورت پر بلاوجہ محض شرارتِ نفس کے باعث شب و روز ظلم و تعدی کرے جسے وہ نیک خاتون صبر و سکون سے برداشت کرتی رہے، اور اُن تک نہ کرے، پھر بھی ظالم اس پر پس نہ کرتے ہوئے اس کو اپنے گھر سے نکال باہر کرے، اور اس کو تمام حقوقِ زوجیت سے محروم کر دے، نہ اس کے نان و نفقہ کی خبر گیری کرے، نہ کبھی آمد و رفت رکھے، خویش و اقارب اس کو سمجھا کر صلح و آشتی پر مائل کرنا چاہیں وہ نہ مانے اور نہ طلاق دینے پر رضا مند ہو، ایسی حالت میں اس مظلومہ عورت کی اس ظالم کے پیچھے ظلم سے رہائی کی آیا شرعاً کوئی جائز صورت ہی یا نہیں؟ اگر نہیں جیسا کہ بعض علماء نے فتویٰ دیا کہ احناف کے نزدیک تفریق کا حق کسی کو نہیں تو پھر ان تمام تصریحات کا کیا مطلب ہے جو کتب تفاسیر و احادیث و فقہ میں موجود ہیں، قول باری تعالیٰ فابعثوا حکماً من اہلہ و حکماً من اہلہا کے تحت میں ائمہ اربعہ میں سے امام مالکؒ اور شافعیؒ غالباً امام احمد بن حنبل بھی اس کے قائل ہیں کہ حکم بمنزلہ قاضی اور حاکم کے ہے، اس کو صلح و تفریق دونوں حق حاصل ہیں، جیسا موقع دیکھے عمل کرے،

امام اعظمؒ کا یہ قول ہے کہ حکم بمنزلہ شاہد کے ہے نہ قاضی کے، پس اس لئے اُسے صرف صلح کا اختیار ہے، جس کے لئے وہ آیت میں مامور ہے، اس کو بذاتہ تفریق کا حق حاصل نہیں، ہاں اگر قاضی یا حاکم اس کو اس کا (تفریق) کا اختیار دیدے تو وہ تفریق کر سکتا ہے، علاوہ ازیں احادیث میں موجود ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض زوجین میں تفریق کرائی، پس کیا یہ نظائر و اقوال قابل عمل نہ رہے،

توقع ہے کہ علماء کرام و مفتیان عظام کامل غور و خوض کے بعد اس اہم مسئلہ کا شافی و

تسلیم بخش جواب کتاب وسنت وفقہ حنفی کے مطابق مدلل بدلائل بتینہ ارقام فرما کر عند اللہ ماجور ہوں گے۔

نیز یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اس فتنہ و فساد اور فسق و فجور کے وقت جبکہ ایک غیر مسلم طاقت ملک پر مسلط ہے مسلمانوں کے مذہبی حقوق کے تحفظ کا بھی اطمینان نہیں، چہ جائیکہ احکام شرع کا اجراء و نفاذ حکماً ہو سکے اسی کا نتیجہ ہے کہ مذکورہ بالا حوادث کے ضمن میں بعض عورتیں مظالم سے تنگ آ کر مرتد ہونے پر مجبور ہوئیں، اگر درحقیقت مسئلہ مستولہ میں کوئی صورت جواز کی نہیں نکل سکتی تو یہ شریعت غرپر ایک بہت بدنامدار غ ہوگا، جو شریعت کہ قیامت تک کی رہبری اور ہدایت کے لئے مکمل قانون کی شکل میں بھیجی گئی العیاذ باللہ یہ کہا جائے گا کہ اس میں ایک ایسی مظلومہ اور ستم رسیدہ کی نجات کی کوئی شکل ہی نہیں، اس کے ظالم خاوند کو سب حقوق حاصل ہیں، اور وہ اپنے واجبی حقوق سے بھی محروم، بنا۔ بریں یہ چند صورتیں درج ذیل کی جاتی ہیں، جن کا تفصیلی جواب مرحمت فرمایا جائے :-

(۱) مذکورہ بالا زوجین اگر کسی ایسی قوم سے ہوں کہ ان کا جماعتی نظام مرتب ہو اور ان کے پٹیل یا پنچ جماعتی امور کے فیصلے کے مجاز ہوں تو کیا ان کی جماعت پٹیلوں یا پنچوں کو حکم بنا کر ان کو صلح و تفریق کا اختیار تفویض کیا جاسکتا ہے؟ تنہا یا قاضی شہر کے ساتھ (جو نکاح و طلاق کے معاملات پر حکومت کی طرف سے مقرر ہوتا ہے) یا صرف قاضی شہر کو حق تفریق حاصل ہو سکتا ہے؟ اگر تفریق کے جواز کا فتویٰ ہو جائے تو میں پر عمل کرتے ہوئے مجسٹریٹ یا کلکٹر (مسلم یا غیر مسلم) حکماً تفریق کر سکتے ہیں؟

(۲) اگر تفریق جائز ہو سکتی ہے تو اس کے شرعی موجبات کیا ہیں، جن کی موجودگی پر تفریق کرائی جاسکے؟

الجواب الملقب بہدایۃ الامم فی ولایۃ الحکم

سائل نے فابعدوا احکامنا من اہلکم و حکمائنا من اہلنا کے تحت میں جو کتب تفاسیر و احادیث وفقہ کے حوالہ سے یہ لکھا ہے کہ ائمہ اربعہ میں سے امام مالک اور شافعی، غالباً امام احمد بن حنبل بھی اس کے قائل ہیں کہ حکم بمنزلہ قاضی اور حاکم کے ہیں اس کو صلح و تفریق دونوں حق حاصل ہیں، جیسا موقع دیکھے الخ اس میں اس نے سخت مغالطہ سے کام لیا ہے، نقل مذاہب میں بالکل احتیاط

کام نہیں لیا اور یہ سخت سنگین جرم ہے، جس سے دنیا و آخرت دونوں میں رسوائی ہوتی ہے، اصل یہ ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں امام ابو حنیفہ اور اور حنبلہ فقہائے کوفہ اور امام شافعی اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ کا مذہب یہ ہے کہ حکمین کو تفریق و خلع کا حق حاصل نہیں، مگر یہ کہ زوجین کی طرف سے حکمین کو کالہ یہ حق دیا جائے، اور امام مالک کے نزدیک حکمین کو تفریق کا بھی اختیار ہے، مگر شرط یہ ہے کہ حکمین والی یا سلطان یا نائب والی یا سلطان کی طرف سے بھیجے ہوئے ہوں، اور اگر حکمین کو حاکم نے نہ بھیجا ہو بلکہ زوجین کی برادری نے بھیجا ہو تو اس حالت میں امام مالک کے نزدیک بھی حکمین کو تفریق کا اختیار نہیں، الا اذا وکلتھما الزوجان بہ ملاحظہ ہو فتح الباری (ص ۳۵۳ ج ۱) قال ابن بطال اجمع العلماء علی ان المختار بقولہ وان خفتم شقاق بینھما الحکام ان المراد بقولہ ان یریدن اصلاحا الحکمان وان الحکمین یکون احدهما من جهة الرجل والاخر من جهة المرأة الا ان لا یوجد من اھلھما من یصلح فیجوز ان یکون من الاجانب من یصلح لذلك وانھما اذا اختلفا لیم یفقد قولھما وان اتفقا نفذ فی الجمع بینھما من غیر توکیل واختلفوا فیما اذا اتفقا علی الفرقة فقال مالک والاوزاعی واسحق ینفذ بغیر توکیل ولا اذن من الزوجین وقال الکوفیون والشافعی واحد یمتدحان الی الاذن فاما مالک ومن تابعه فالحقوة بالعین والمولی فان الحاکم یطلق علیھما فکذلک هذا، وايضا فلما کان المخاطب بذلک الحکام وان الارسال الیھم دل علی ان لبلوغ الغایة من الجمع والتفریق الیھم وجری الباقون والاصل وهو ان الطلاق بید الزوج فان اذن فی ذلک والاطلاق علیھ الحاکم اس میں صاف تصریح ہے کہ امام مالک حکمین کو تفریق کا اختیار محض اس وجہ سے دیتے ہیں کہ وہ حکام کے بھیجے ہوئے ہیں، اور ان کے قائم مقام ہیں، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اس شرط کے ساتھ امام مالک کے نزدیک یہ بھی شرط ہے کہ حکمین دونوں اتفاق کے ساتھ فیصلہ کریں اگر دونوں میں اختلاف ہوگا تو ان کا حکم نافذ ہوگا، مدونہ میں جو مذہب امام مالک کی معتبر و معتمد کتاب ہے، ان دونوں شرطوں کی تصریح ہے، مالک الا الذی یکون فیہ الحکمان انما ذلک اذا فتح ما بین الرجل وامرأته حتی لا یتبہ

بینہما بیئۃ ولا استطاع ان یتخلص الی امرہما فاذا بلغا ذلک بعث الی رجل
من اہلہما وجلا من اہلہ عدلین فنظر فی امرہما واجتہد ا فان استطاع الصلح
اصلحا والافرقا بینہما شتم یجوز فراقتہما دون الامام وان رأیا ان یاخذ من
مالہما حتی یکون خلعا فعلا ھ (ص ۲۵۳ ج ۲) اور (ص ۲۵۴ ج ۲) مذکور میں ہے ؛ قلت
فلو اختلفا فطلق احدہما ولم یطلق الاخر قال اذا لا یکون هناك فراق لان الی
کل واحد منہما ما الی صاحبہ باجتماعہما علیہ ھ
مقررات ابن رشد میں بھی بعث حکام کی قید مذکور ہے (ص ۲۵۳ ج ۲) اور تفسیر القرآن
للعلامة الحسن النیسابوری میں ہے ثم المبعوثان وکیلان من جهة الزوجین
مولیان من جهة الحکام المخاطبین بقولہ فابعثوا فیہ للشافعی قولان اصحہما
وبہ قال ابو حنیفۃ واحمد انہما وکیلان لان البضع حق الزوج والمال حق
الزوجة وھما رشیدان والخطاب فی قولہ فَاِنْ خِفْتُمْ وَفِی قَابَعُتُھُا لصالحی
الامة وثانیہما وبہ قال مالک انہما مولیان لانه تعالیٰ سماھما الحکمین ھ
(ص ۲۵۴ ج ۲ مع الطبری) وقال معی السنۃ الفراء البغوی الشافعی بسندہ الی
الامام الشافعی قال اخبرنا الثقفی عن ایوب عن ابن سیرین عن عبیدۃ انه
قال فی هذه الایۃ وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِھِمَا فَاَبْعَثُوا حُكَمًا مِّنْ اَھْلِہِ وَحُكَمًا
مِّنْ اَھْلِھَا قال جاء رجل وامرأة الی علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ومع
کل واحد قوۃ عن الناس فامرہم علی فبعثوا حکمًا من اہلہ وحکمًا من اہلہا
قال للحکمین تدربان ما علیكما ان رأیتما ان تجعلا جمعتهما وان آیاتما تفرقا ففرقتما
قالت المرأة رضیت بکتاب اللہ بما علی فیہ ولی فقال الرجل اما الفرقة فلا نقول
علی رضی اللہ تعالیٰ کنا واللہ حتی تقر ببطل الذی اقرت بہ واختلف القول فی جواز
بعث الحکمین من غیر رضا الزوجین واصح القولین انه لا یجوز الا برضاہما
ولیس لحکم الزوج ان یطلق الا باذنه ولا لحکم المرأة ان یختلع علی مالہا الا باذنها
وهو قول اصحاب الراعی لان علیاً رضی اللہ عنہ حین قال الرجل اما الفرقة فلا

عہ دنی الطبری تمام وہو الصحیح ۱۲ منہ

قال کذب حتی تقر بمثل الذی اقرت به فثبت ان تنفیذ الامر موقوف علی اقراره و رضاه (۱۷ ص ۲۳۵) اس سے معلوم ہوا کہ امام شافعی کا قول اصح امام ابو حنیفہ و احمد بن حنبل کے موافق ہے، اور صرف امام مالک نے حکمین کو تفریق و خلع کا اختیار دیا، وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ حکمین حکام کی طرف سے متولی صلح بنائے گئے ہوں، کما مر۔ پس ہندوستان میں جو حالت ہے کہ سلطنت غیر مسلم متسلط ہے، جیسا کہ سائل نے اقرار کیا ہے، اس حال میں امام مالک نے کا قول ہی اس کو کیا نافع ہو سکتا ہے، کیونکہ یہاں دینی مسلم و قاضی مسلم کہاں، جن کے بھیجے ہوئے حکمین کو امام مالک کے نزدیک حق تفریق حاصل ہے، اور غیر مسلم حکم یا حاکم کو اجماعاً تفریق بین الزوجین المسلمین کا حق نہیں، پس سائل کا آیت فابعدوا حکما من اہلہ و حکما من اہلہا سے مطلق حکم کے فیصلہ تفریق کے جواز پر امام مالک وغیرہ کے اقوال کا حوالہ دینا اس کی قلت احتیاط پر دال ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ امام مالک کے قول پر بھی وہ حکمین جو دینی و سلطان مسلم کی طرف سے حکم نہ بنائے گئے ہوں، تفریق نہیں کر سکتے نہ ان کی تفریق صحیح ہوگی، اس کے بعد سائل کا یہ کہنا کہ علاوہ ازیں احادیث میں موجود ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض زوجین میں تفریق کرائی، پس کیا اب یہ نظائر و اقوال قابل عمل نہ رہے الہ یہ بھی سنگین مغالطہ ہے، کیا سائل کو معلوم نہیں کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبی و رسول ہونے کے ساتھ امام و سلطان بھی تھے، پس حضور کی تفریق سے یہ ثابت ہوا کہ بعض صورتوں میں امام و سلطان (یا ان کا نائب قاضی) تفریق بین الزوجین کر سکتا ہے، یہ کس طرح معلوم ہوا کہ ہر شخص تفریق کر سکتا ہے،

اس کے بعد سائل نے ہندوستان کی صورت حاضرہ کو ظاہر کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ بعض عورتیں اپنے ازواج کے مظالم سے مجبور ہو کر مرتد ہو گئی ہیں، ایسی صورت میں اگر حکمین زوجین میں تفریق نہ کرا سکیں تو اور کوئی صورت ایسی مظلومہ کی رہائی کی بتلائی جاوے، اور اگر اس کی کوئی صورت نہیں نکل سکتی تو یہ شریعت غرا پر بہت بد نما داغ ہوگا، الی آخر ما قال و اطال۔ اس کا جواب یہ ہے کہ غیر مسلم حکومت میں جہاں قانون اسلام پر پوری طرح عمل ہی ہو سکے اگر مسلمانوں کو کسی مسئلہ میں تنگی پیش آئے تو اس سے شریعت غرا پر ہرگز کوئی داغ نہیں لگ سکتا، کیونکہ قانون کے مکمل اور سہل ہونے کے معنی یہ ہوا کرتے ہیں کہ اگر اس قانون کو پوری طرح جاری کیا جاوے تو یہ تمام مصالح کا متکفل ہے، اب اگر قانون کو جاری ہی نہ کیا جاوے

یا جاری نہ کر سکیں اور اس وجہ سے کسی کو دشواری پیش آئے تو یہ قانون کا نقص نہیں بلکہ اس میں ان لوگوں کا قصور ہے جو اس مکمل قانون کے اجراء سے مانع ہیں، یا ان کا قصور ہے جو ایسی جگہ بہتے ہیں جہاں یہ قانون جاری نہیں، یہ تو اس سوال کا کئی جواب تھا، اور جزئی جواب یہ ہر کہ ہندوستان میں حکومت غیر مسلم کے تحت میں ہی اس مشکل صورت کے اشکال کو چند وجہ سے حل کیا جاسکتا ہے؛

(۱) سب مسلمان حکومت سے درخواست کریں کہ ایسی مظلوم عورتوں کی رہائی کے لئے جو بدون حاکم مسلم کے فیصلہ کے نہیں ہو سکتی ہندوستان میں قضاۃ کا منصب قائم کر دے جو محض نکاح خواں قاضی نہ ہوں، بلکہ باحکومت قاضی ہوں، یا کم از کم ایسے مقدمات کے فیصلہ کا اختیار صرف مسلم حکام کو دے، جیسے مسلمان ڈپٹی اور منصف وغیرہ، غیر مسلم حکام کے یہاں ایسے مقدمات نہ بھیجے جاویں جن میں شرعاً حاکم مسلم ہی کا فیصلہ لازمی ہے، اور ان مسلم حکام کو ہدایت کرے کہ ان مقدمات میں علماء سے فتویٰ لے کر مطابق فتویٰ کے فیصلہ کیا کریں، جیسا کہ مقدمات فرائض و میراث میں اب بھی ایسا ہوتا ہے، اور اگر سب مسلمان گورنمنٹ سے یہ درخواست کریں گے، اور اپنی مذہبی مشکلات کو پیش کریں گے تو وہ ضرور اس پر توجہ کرے گی، کیونکہ گورنمنٹ رعایا کو مذہبی تنگی نہیں دینا چاہتی،

(۲) جب تک صورت اولیٰ کا تحقق ہو اس وقت تک کے لئے یہ انتظام کیا جاتے کہ جو ظالم شوہر اپنی بیوی پر ظلم کرتا ہو، اور سمجھانے سے بھی اس کے حقوق ادا نہ کرتا ہو اس کے جبراً طلاق لے لی جاوے، برادری کے پنج وغیرہ اس کو طلاق پر مجبور کریں، اور وہ ایسا کر سکتے ہیں، اور طلاق مکرہ مذہب ابو حنیفہ میں واقع ہو جاتی ہے، بددن ان دو صورتوں کے محض پنج کی تفریق کا عدم ہے، اور مجسٹریٹ کی تفریق اس وقت معتبر ہے جب کہ وہ مسلمان ہو، اور حکومت کی طرف سے اس کو تفریق کا اختیار دیا گیا ہو، پھر بعض صورتوں میں تو خود حنفی حاکم مسلم کی تفریق بھی معتبر ہے، اور بعض صورتوں میں اُسے کسی شافعی کو اپنا نائب بنانا پڑے گا، والبسط فی الشامیہ، ص ۵۸، ۵۹ (۲) اور جس شخص کو صرف مسلمان ہی خود قاضی بنالیں وہ قاضی شرعی نہ ہوگا، کیونکہ وہ با اختیار صاحب حکومت نہ ہوگا، اور قاضی کے لئے حاکم ہونا شرط ہے، اس کی تفصیل رسالہ القول الماضی فی نصب القاضی، مطبوعہ سالہ النور، تھانہ بھون، بمحرم الحرام ۱۳۵۸ھ میں ملاحظہ ہو، واللہ اعلم، ۲ رجب المرجب ۱۳۵۸ھ

تحقیق معنی الی بمعنی مع سوال (۲) ایک بات یہ دریافت کرتا ہوں کہ منہ دھونے کے بعد ہاتھ دھونے میں پانی انگلیوں سے مرفق کی طرف لے جائے یا برعکس، مرفق پر الی ہے جس سے میں سمجھتا تھا کہ غایت انتہا بتلا رہا ہے، لہذا ابتداء میں انگلیوں سے ہونی چاہئے، فقہاء نے الی کو بمعنی مع کر کے لکھا ہے، اس کو یہ سمجھتا ہوں کہ چونکہ الی بمعنی مع میری نظر سے نہیں گذرا، لہذا مع سے اشارہ اس طرف ہو کہ غایت داخل غسل ہے نہ کہ خارج، اگر الی بمعنی مع آیا ہو تو ارشاد ہو، دیوبند کا ایک فتویٰ میری نظر سے گذرا جس سے معلوم ہوا کہ احادیث سے یہی ثابت ہے، کہ ہاتھ دھونے میں پانی کہنیوں پر ڈالے، کہ انگلیوں کی طرف جائے، کیا آپ کی تحقیق میں بھی یہ صحیح ہے، دونوں امر کے جواب باصواب سے مفصل اطلاع دیجئے۔

الجواب، قال فی نور الایضاح ولین البداءة بالغسل من رؤس الاصابع فی الیدین والرجلین لان الله تعالى جعل المرافق والكعبین غاية الغسل فتكون منتھی لفعل کما فعله النبی صلی الله علیه وسلم (ص ۲۲ مع الطحاوی) قلت ودلیل فعله صلی الله علیه وسلم کذا ما رواه مسلم عن نعيم بن عبد الله المجهري قال رايت ابا هريرة يتوضأ فاسبغ الوضوء ثم غسل يده اليمنى حتى اشرع في العضد ثم يده اليسرى حتى اشرع في العضد ثم مسح برأسه ثم غسل رجله اليمنى حتى اشرع في الساق ثم غسل رجله اليسرى حتى اشرع في الساق ثم قال هكذا رايت رسول الله صلی الله علیه وسلم يتوضأ (ص ۱۲۶) ومعنى قول اشرع في العضد والساق اى ادخل الغسل فيهما وقد ورد فيه لفظ حتى وهى نص فى معنى الغاية هناك لانها لا تستعمل بمعنى مع اذا دخلت على الفعل وكون الی بمعنی مع فى آية الوضوء رده فى البحر (ص ۱۲ ج ۱) بابلغ رد نعم انها قد تكون بمعنى مع كما مثل لك فى شرح الجامى بقوله تعالى وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَهُمْ إِلَىٰ أَمْوَالِكُمْ اى معها لما قال فى الكافية والى للانتهاؤ بمعنى مع قلباً اه والله تعالى اعلم

از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون ۱۲ ج ۱۲

آیت و لتکون آية من خلفک کی سوال (۳) سورۃ یونس میں فرعون کی لاش کو پھلے آنے والوں کے لئے موجب عبرت و نشان قدرت الہی قرار دیا گیا ہے، خیر القرون اور سلف نے اس کی تفسیر شکر سے پیچھے آنے والوں سے کی ہے، حالانکہ چودھویں صدی میں اس کی صحیح تفسیر یہ ثابت ہوئی کہ فرعون کی لاش دریائے نیل کے کنارے سے کسی صورت سے صندوق میں سے نکل آئی جو بالکل محفوظ تھی، اور قیامت تک محفوظ رہے گی، جو مصر کے عجائب خانہ میں ہی، جو آنے والی انسانی نسل کے لئے نشانی قدرت ثابت ہوگی، جس کا ذکر سفرنامہ حضرت حسن نظامی دہلوی میں ہے، حالانکہ سب سے معتبر تفسیر خیر القرون ہے، اور آنحضرت سے موجودہ حالت کی تفسیر ثابت نہیں، سلف کی تفسیر میں یا حدیث سے زمانہ موجودہ کے مطابق اس کی تفسیر بیان نہیں ہوئی، اس کی کیا وجہ؟

الجواب؛ حسن نظامی صاحب کے سفرنامہ میں فرعون کی لاش کے متعلق جو واقعہ مذکور ہے اس کو قرآن کی تفسیر بنانا چند وجہ سے غلط ہے،

(ا) اس لئے کہ مصر کے اندر فرعون کی لاش کے سوا دیگر سلاطین کی لاشیں بھی محفوظ برآمد ہوئی ہیں، جیسا کہ اخبارات سے معلوم ہوا، تو فرعون کی اس بارے میں کوئی خصوصیت نہ رہی، اگر اس کو نشانی قدرت بھی تسلیم کر لیا جائے تو یہ نشانی ایسی ہے جو مصر والوں کے لئے کوئی عجیب بات نہ تھی، کیونکہ وہ تو اپنے سلاطین کی لاش کو کسی خاص مصالحہ سے ہمیشہ ہی محفوظ رکھتے تھے،

(ب) لاش کا محفوظ رکھنا خاص ادویہ کے ذریعہ سے ہر زمانہ میں ممکن ہے، چنانچہ لندن میں وکٹوریہ کی لاش سیطر محفوظ ہے، تو یہ کوئی ایسی نشانی نہیں جس کو خدائی نشان کہا جائے، (ج) فرعون کسی ایک شخص کا نام نہیں، بلکہ مصر کے ہر بادشاہ کا لقب فرعون ہوتا تھا جیسا کہ سری و قیصر ہر بادشاہ فارس و بادشاہ روم کا لقب ہوتا تھا اور جس فرعون کا قصہ قرآن میں ہے، اس کا نام قرآن میں یا حدیث میں نہیں بتلایا گیا، ہاں مفسرین نے تورات کے واسطے سے اس کا نام ذکر کیا ہے، اور اس میں بھی اختلاف ہے،

تو ایسی صورت میں صرف تابوت پر فرعون لکھا ہوا ہونے سے یہ کیونکر یقین کیا جاسکے کہ یہ وہی فرعون ہے جس کا قصہ قرآن میں ہے، اور اگر کوئی ایسا دعویٰ کرے تو یہ اس کی غلطی ہے ہاں احتمال کے درجہ میں اس کو تسلیم کیا جاسکتا ہے، اور احتمالی بات کو قرآن کی تفسیر بنانا غلط ہے

اور اگر یقین بھی کر لیا جائے تو (۱) و رب کی وجہ سے اس واقعہ کو قرآن کی تفسیر بنانا صحیح نہیں بلکہ اس کی تفسیر وہی ہے جو مفسرین نے بیان کی ہے کہ قَالِیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لَمَّا كُنَ لَمْسًا خَلْفَكَ آیہ کا مطلب یہ ہے کہ آج ہم تیری لاش کو رہائی میں تہہ نشین ہونے سے نجات دیں گے تاکہ ان کے لئے عبرت ہو، جو تیرے بعد (موجود) ہیں کیونکہ فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا اگر اس کی لاش تہہ نشین ہو جاتی تو شاید اس زمانہ کے بعض لوگوں کو اس کی غایت عظمت اور ہیبت کی وجہ سے اس کے غرق ہونے میں شبہ ہوتا، اس لئے اس کی لاش کو پانی کے اوپر ترا کر سب کو یقین دلادیا گیا، اور جن لوگوں نے اس کو خدائی کا دعویٰ کرتے ہوئے دیکھا تھا ان کو اس کی بد حالی اور تباہی دیکھ کر پوری عبرت ہوئی، اور ظاہر ہے کہ یہ نشانی اور عبرت انہی لوگوں کے لئے زیادہ تر مؤثر تھی جنہوں نے فرعون کو اس سے پہلے خدائی کا دعویٰ کرتے ہوئے بہت بڑی شان و شوکت میں دیکھا تھا، دوسرے زمانہ کے لوگوں کے لئے جنہوں نے صرف تابوت کے چند لفظوں سے اس فرعون کا مدعی خدائی ہونا احتمال کے درجہ میں معلوم کیا ہے زیادہ عبرت نہیں ہو سکتی،

(۵) علاوہ ازیں اس کا کیا بھروسہ ہے کہ مصر کے عجائب خانہ میں یہ لاش قیامت تک محفوظ رہے گی، اب اگر ہم نے قرآن کی تفسیر بدل دی اور یہ مطلب بیان کیا کہ تیری لاش تیرے پیچھے آنے والوں کے لئے قیامت تک عبرت و نشانی ہوگی، اور اس کے بعد کسی عیسائی بادشاہ نے فرعون کی لاش کو جلادیا، یا کسی دقت میں وہ مصالحوں پر لگا ہوا ہی بیکار ہو گیا، اور لاش خاک خوردہ ہو گئی، تو اس تفسیر کو پھر بدلنا پڑے گا، اس لئے ہم اے سلف اکابر نے ایسی بات نہیں کہی جو بھروسہ کی نہیں، ہاں اگر قرآن و حدیث میں صراحۃً ایسا دعویٰ ہوتا تو پھر یہ تفسیر بھروسہ کی ہو جاتی، اور اس دقت یقیناً یہ لاش قیامت تک محفوظ رہتی، مگر جب خدا و رسولؐ نے ایسا نہیں کیا تو کس کے بھروسہ پر ہم ایسی تفسیر کر کے اسلام پر دھبہ لگانے کا الزام اپنے سر لیں، علاوہ ازیں یہ کہ مفسرین نے لمن خلفک کی تفسیر ایسے عام الفاظ سے کی ہے جس میں زمانہ مابعد کے لوگ بھی داخل ہو سکتے ہیں، کیونکہ مفسرین سلف کی تفسیر سے اس کی نفی نہیں ہوتی، گو صراحۃً عموم کا دعویٰ بھی نہیں کیا گیا، جس کے لئے وجہ مذکورہ علت میں کافی ہیں،

الذی یقعدہ سلمہ

کتاب يتعلق بالحديث والسنة

سوال (۱) | نشر الطیب میں جو مضمون مفتی الہی بخش صاحب
حضور صلی اللہ علیہ وسلم ثابت یا نہیں؟
کی کتاب سے لیا ہے اس کے باب ماکولات میں ایک روایت
حضرت عائشہ صدیقہ رضی عنہا سے مروی ہے کہ حضور سرور کائنات م کو روغن زیتون، شہد، کدو
مرغوب تھا، اور حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سرخاب، گائے کا گوشت تناول فرمایا
ہے، یہ روایت کس کتاب اور کس باب کی ہے، یا شفاء قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ یا شامل ترمذی
اگر حضور والا کو آسانی سے مل جائے تو تحریر فرمایا جاوے؟

الجواب: قال فی زاد المعاد اکل رطلہ اللہ علیہ وسلم الحلوی و
العسل وکان یحبہما واکل لحم الجزور والضان والد جاج ولحم الحباری
ولحم حداد الوحش والارنب وطعام البحر، معلوم ہوا کہ حضور نے سرخاب کا گوشت
کھایا اور گائے کے گوشت کے بارے میں مسلم کی روایت سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے
اس کی طرف رغبت ظاہر فرمائی، اور طلب فرمایا، جس سے بظاہر تناول مفہوم ہوتا ہے، صراحتاً
نہیں، روى مسلم فی آخر کتاب الزکوۃ عن عائشۃ قالت اتی النبی صلی اللہ علیہ
وسلم بلحم بقی فقیل ہذا ما تصدق بہ علی بریرۃ فقال ہولہا صدقۃ ولنا
ہدیۃ، واللہ اعلم، ۲۶ محرم سنہ ۱۴۲۸ھ

سوال (۲) | میں ایک گھنگار مسلمان ہوں، عربی کی تعلیم
نقد یہ لینے کا احادیث سے ثبوت
تھوڑی سی حاصل کی ہے، طالب علم ہوں، ضلع بستی میرا وطن ہے، ادبی نسب ہے، نام
خلیل احمد ہے، اور استعداد علمی بہت قلیل ہے، وعظ کہنے کا بحد شوق ہے، اور ہر جمعہ کو
بستی کی جامع مسجد میں وعظ کہتا ہوں، اور جب کبھی تشریف مل جاتا ہے تو باہر اسی کو کرایہ ریل
میں خرچ کرتے ہوئے ہر گاؤں و قصبہ و شہر کے مسلمانوں کو احکام اسلامی حسب تقسیم آپ کی
کتاب تعلیم الدین کے عقائد و عبادات و معاملات و اخلاق و طریق معاشرت کے اجزاء
نمہ کو بیان کرتا ہوں، مطلب آیات کا بحوالہ تفسیر بیضاوی و جلالین و روح البیان
مع ابواب تفسیر لجام الترمذی اور آپ کی سبق الغایات وغیرہ کے کہتا ہوں، اور جو کوئی

کچھ دیتا ہے تو یہ کہہ کر واپس کر دیتا ہوں کہ گولینا اس رقم کا بموجب حدیث موطا امام مالک جائز ہے، مگر چونکہ فعلاً و عملاً نقدری لینا ہدیہ میں سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ثابت یا میری نظر سے نہیں گذرا اس لئے معذور ہوں، رخصت و فتویٰ پر میرا عمل نہیں ہے، بلکہ اکثر اعمال میں اب تک عزیمت و تقویٰ پر ہے، لیکن چونکہ تکلیف بہت ہے، اور فی الحال کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے، اس وجہ سے کپڑوں تک سے مجبور ہوں،

لہذا آپ سے عرض ہے کہ اگر کوئی حدیث نقدری ہدیہ لینے کے متعلق مسیدی و محبوبی وسیلۂ یومی و غدی صلی اللہ علیہ وسلم کا عملاً اپنی ذات کے متعلق آپ کی نظر سے گذری ہو تو براہ شفقت علی الخلق و اتحادی نبی اس سے مطلع فرمائیں، ابن ماجہ میں صدقہ زیور ایک صحابہ کا منقول ہے جو حضور نے لیا، مگر صدقہ اپنی ذات پر خرچ نہ فرماتے تھے، بلکہ اصحاب صفہ کو دیدیا کرتے تھے، کذا فی جامع الترمذی، البتہ موزہ چرمی بخاشی پادشاہ ملبوسات میں، اور اطعمہ متنوعہ ماکولات میں سنن ابی داؤد و جامع ترمذی و موطا۔ امام مالک میں منقول ہے اور جہ رومی کی حدیث سنداً ضعیف ہے، اور ہدیہ شریکین متعلق عباد و غیرہ مختلف فیہ ہے، ان احادیث کی حالت تحریر فرمادیجئے، اور ہدیہ نقود بشرط تعادل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بطریق فعل ارشاد فرمائی جائے، میں احادیث فعل کو قوی پر اپنی ذات کے لئے ترجیح دے چکا ہوں عامہ مسلمین کو تو احادیث قوی بہ لحاظ ان کی ضعف ہمت کے بتاتا ہوں، امید ہے کہ اس کا جواب ذرا مدلل بحوالہ کتب حدیث مرحمت فرمایا جائے،

میں آپ کا غائبانہ شاگرد ہوں اور بوجہ اتحاد نبی آپ کے ایک قسم کی محبت خاصہ ہے، میرا نسب نامہ موجود ہے، جو کہ ابراہیم ادہم سے تین واسطہ سے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تک پہنچتی ہے، یہی وجہ ہے کہ خدمت اسلام کے لئے جس قدر شرح صدر اللہ تعالیٰ نے مجھ کو دیا ہے کم اہل علم کو حاصل ہے، الحمد للہ علی ذلک حمد اکثر۔ میں باوجود قلت علم اکثر سند یافتہ مولویوں کو تبلیغ احکام ضروریہ شرعیہ کو مسلمانوں میں اور اشاعت اسلام کو کافروں میں کرنے کو راغب کرتا رہتا ہوں، مولوی عبد..... جو فرنگی محلی ہیں ایک مدلل مضمون وجوب تبلیغ پر لکھنؤ میں لکھ کر دیا، مگر وہ اس پر عمل کرنے سے اپنے کو باوجود اقرار صحت مضمون قاصر بتلاتے رہے، خیر یہ درمیان میں جملہ معترضہ ہو گیا، عرض کرنا یہ ہے کہ میری نگرانی اور اصلاح آپ اگر تحریر فرماتے رہیں تو احسان آپ کا مجھ پر عظیم اور اللہ سے اجر جزیل ہوگا، بالفعل ہدیہ نقود کی حدیث

مح ہدیہ ملبوسات اور نیز ارشادات لائقہ سے ممنون فرمائیں۔

الجواب؛ اگرچہ جواز ہدیہ کے عام دلائل کے ہوتے ہوئے اس کی ضرورت کچھ بھی نہیں ہے کہ خاص نقد ہدیہ لینے دینے کا ثبوت پیش کیا جائے، مگر سائل کی محض تسلی کے لئے اس کا ثبوت پیش کیا جاتا ہے؛ عن معوذ بن عفراء قال اثبت النبی صلی اللہ علیہ وسلم بقتاع من رطب یرید طبقا واجرز غب یرید قثاء فاعطانی ملا کفہ حلیا وذهب ارشفاء قاضی عیاض، ص ۲۵۲ ج ۱، قلت رواہ الترمذی فی شمائلہ بسند جید عن الربیع بنت معوذ بن عفراء وقال فیہ فاعطانی ملا کفہ حلیا وذهب الخ،

اس حدیث سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نقد ہدیہ دینا فعلاً اور صحابی کا اسے قبول کرنا بتقریر نبوی ثابت ہے، اور یہ دہم نہیں ہو سکتا کہ ممکن ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سونا وغیرہ بطور صدقہ کے دیا ہو، کیونکہ سیاق حدیث اس کو مقتضی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیا تھا وہ صحابی کے ہدیہ کی مکافات تھی، پس ظاہر یہی ہے کہ آپ نے ہدیہ دیا تھا، پس نقد ہدیہ دینے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کا اتباع اور قبول کرنے میں تقریر کا اتباع ہے، اور اگر مزید تفتیش سے کام لیا جائے تو اس کا ثبوت بھی صراحتاً مل جائے گا کہ آپ نے نقد ہدیہ قبول فرمایا ہے، مگر قلت فرصت کی وجہ سے اسی روایت پر اکتفا کیا گیا، کہ یہی دونوں کے ثبوت کو کافی ہے، واللہ اعلم، ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۱۷۰ھ

قلت وقد ثبت قبولہ صلی اللہ علیہ وسلم ہدیۃ النفود صراحة ایضا قال الحافظ فی الفتح فی قصۃ ہرقل وقد وقعت لہرقل قصص اخری بعد ذلک الی ان قال ومکاتبة النبی صلی اللہ علیہ وسلم لہ ثانیاً وارسالہ الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بن ذہب فقسمہ بین اصحابہ کما فی روایۃ ابن حبان التي اشرنا الیہا قبل اہر ص ۱۱۷۰ ج ۱

من تشبہ بقوم فہو منہم کی تشریح	سوال (۳) من تشبہ بقوم فہو منہم، کا خلاصہ مضمون بیان
اور تشبہ بالکفار کی مختلف	فرمائیے، کہ مشابہت کسے کہتے ہیں، اور کسی عارض کی وجہ سے
صورتیں اور ان کا حکم،	کبھی مرتفع بھی ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب؛ تشبہ بالکفار کی چند صورتیں ہیں :-

(۱) فطری امور میں مشابہت، مثلاً کھانا پینا، چلنا پھرنا، سونا لیٹنا، صفائی رکھنا وغیرہ، یہ مشابہت حرام نہیں قال فی الدرفان التشبه بهم لا يکوه فی کل شی بل فی المذموم وفيما يقصد به التشبه كما فی البجرام قال الشامي تحت قوله لا يکوه فی کل شی فانانا کل ونشرب كما يفعلون ام (ص ۶۵۲ ج ۱)

(۲) عادات میں مشابہت مثلاً جس ہیئت سے وہ کھانا کھاتے ہیں اسی ہیئت سے کھانا یا لباس ان کی وضع پر پہننا، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر ہماری کوئی خاص وضع پہلے ہی ہو اور کفار نے بھی اس کو اختیار کر لیا ہو، خواہ ہمارا اتباع کر کے یا ویسے ہی اس صورت میں یہ مشابہت اتفاقیہ ہے، اور اگر ہماری وضع پہلے سے جدا ہو اور اس کو چھوڑ کر ہم کفار کی وضع اختیار کریں، یہ ناجائز ہے، اگر ان کی مشابہت کا قصد بھی ہے تب تو کراہت تحریمی ہے، اور اگر مشابہت کا قصد نہیں ہے بلکہ اس لباس و وضع کو کسی اور مصلحت سے اختیار کیا گیا ہے تو اس صورت میں تشبہ کا گناہ نہ ہوگا، مگر چونکہ تشبہ کی صورت ہے، اس لئے کراہت تنزیہی سے خالی نہیں قال هشام رأيت علی ابی یوسف نعلین مخ سرفین بمسامیر فقلت اتري بهذا الحدیث باسا قال لا قلت فسفیان وثورین یزید کرها ذلك لان فيه تشبهما بالرهبان فقال ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يلبس النعال التي لها شعر وانها من لباس الرهبان فقد اشار الى ان صورة المشابهة فيما تعلق به صلاح العباد لا يضر فان الارض مما لا يمكن قطع المسافة البعيدة فيها الا بهذا النوع ام قلت وفعله عليه السلام محمول علی بیان الجواز اذا كان بدون القصد،

مگر چونکہ آجکل عوام جواز کے لئے بہانے ڈھونڈتے ہیں، ان کا قصد تشبہ ہی کا ہوتا ہے اس لئے اکثر احتیاط کے لئے عادات میں بھی تشبہ سے منع کیا جاتا ہے، خواہ تشبہ کا قصد ہو یا نہ ہو،

(۳) ان امور میں تشبہ جو کفار کا مذہبی شعار یا دینی رسم اور قومی رواج ہے، جیسے زنا وغیرہ پہننا، یا مجوس کی خاص ٹوپی جو ان کے مذہب کا شعار ہے اس میں تشبہ حرام بلکہ بعض صورتوں میں کفر ہے، عالمگیر یہ وغیرہ میں اس کی تصریح ہے،

سوال (۴) گائے بکری کے اجزائے سبعہ کو فہتائے کرام مکروہ تحریمی قرطنے
 حیوان کے اجزاء سبعہ کی حرمت کا حدیث صحیح ثبوت ہیں، دلیل حرمت میری نظر سے نہیں گذری، ازراہ غایت ارشاد فرمائی جا،
 اہل حدیث بکرے کے خفستان بے تکلف رغبت سے کھاتے ہیں، اور احناف سے دلیل حرمت طلب
 کرتے ہیں، تو دلیل ایسی ارشاد فرمائی جاتے کہ ان کے مقابلہ میں حجت ہو،

الجواب: اخرج محمد فی الآثار اخبارنا عبد الرحمن بن عمرو والاوزاعی
 عن واصل بن ابی جبیل عن عباد قال قال کون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 من الشاة سبعاً المراتة والمثانة والغدة والصيا والذکر والاثنتین والدم
 وكان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یجب من الشاة مقدما اھ رص ۳۰۲،
 مترجم، قلت الاوزاعی امام مشہور متفق علیہ جلالتہ وواصل بن جبیل قال
 ابن ابی مریم عن ابن معین مستقیم الحدیث وذكرہ ابن حبان فی الثقة کذا
 فی التہذیب رص ۱۰۲ و ۱۰۳ ج ۱۱) وفی التہذیب رص ۱۲۱ مقبول اھ وصباحہ لا یسل
 عنه فهو مرسل حسن والذیل حجة عندنا وقال ابن المدینی کان عطاء عیاض
 عن کل ضرب من مراسلات مباحہ احب الی من مراسلاتہ بکثیر اھ رص ۶۹
 الراوی ص ۶۹) وهذا یشر بقبول مراسلاتہ عنه المحدثین ایضاً، واخریہ
 الطبرانی فی الاوسط عن ابن عمرو بن عدی والبیہقی عن عائشة وعن
 ابن عباس کذا فی کنز العمال رص ۲۱ ج ۲) قلت والمرسل اذا اعتضد لہو ضعیفاً
 فهو حجة عند الكل قال فی تدریب الراوی الثانیہ صور الرازی وغیرہ من
 اهل الاصول المسند العاصد بان لا یكون منہ من الاسناد لیکون الاحتجاء
 بالمجموع والا فالاحتجاج حیث یسند بالمسند فقط اھ رص ۶۸) پس یہ مرسل
 حنفیہ کے نزدیک تو حجت ہے ہی، شافعیہ کے نزدیک بھی حجت ہے، واللہ اعلم،
 ۳ شعبان ۱۴۲۲ھ

سوال (۵) بعد سلام مسنون کے عرض یہ ہے کہ آنجناب جس وقت
 میت کے سر ہانے قل ہو اللہ الخ پڑھ کر ڈھیلے رکھنے کے سلسلے
 میں ایک حدیث کی تحقیق خادمان آنجناب کی ملاقات کے لئے آئے تھے، اور جس وقت آپ
 ڈا بھیل جا رہے تھے اس وقت آپ سے یہ سوال کیا تھا کہ میت کے سر ہانے قل کے ڈھیلے رکھتے

ہیں سورۃ اخلاص تین بار یا سات بار پڑھ کر ڈھیلے پردم کرتے ہیں، اور میت کی سیدھی بازو پر رکھتے ہیں یہ جائز ہے یا نہیں تو آنجناب نے فرمایا تھا کہ اصل کی کچھ اصل نہیں ہے، جناب آپ کے قول کو میں برابر قبول کرتا ہوں، کوئی بھی تحریر آپ کے نام کی ہوتی ہے اس کو بصدرِ دل مقبول کرتا ہوں، مگر جناب میں نے کتاب تصریح الاثنی عشر ترجمہ شرح برزخ، ص ۷۷، میں یہ حدیث لکھی ہوئی دیکھی ہے تو آیا یہ حدیث قابل اعتبار ہے یا نہیں، کیونکہ حدیث کا پہچانا آپ کا ہی کام ہے۔
 اخراج الحاكم عن انس بن مالك انه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم
 من اخذ سبعة حصاة او مدر ريقا اعلی كل واحد قل هو الله احد ثلاثا ثم يضعها
 جانب رأس الميت ينجيه الله تعالى من عذاب القبر الخ،

تو جناب آپ نے مستدرک حاکم کی یہ حدیث دیکھی ہے یا نہیں، ہمارے مرشد مولانا حاجی مولوی محمد الدین صاحب مجتہد دی بھر دچی کے پاس یہ کتاب ہے، مگر تھوڑی بدت کیلئے حیدرآباد دکن سے آئی ہے مگر جلد ۱ نہیں آئی، اس واسطے اس میں دیکھنے کا موقع نہیں،
 مولانا

صاحب آنجناب کی ملاقات کے واسطے آنے کا قصد کرتے تھے، مگر بیماری اس وقت مکان میں زیادہ تھی، جناب یہ خلاصہ اچھی طرح کوشش کر کے کر دیں،

الجواب؛ مستدرک حاکم جلد اول ہمارے پاس ہے، اس میں کتاب الجنائز و کتاب فضائل القرآن موجود ہے، یہ حدیث اس میں کہیں نہیں ملی، کنز العمال میں بھی مختلف مقامات میں تلاش کیا، مگر کہیں یہ حدیث نظر سے نہیں گذری، ہاں طحاوی حاشیہ مراقی الفلاح میں یہ لکھا ہے، دنی کتاب النورین من اخذ من تراب القبر بیدہ و قرأ علیہ سورۃ القدر سبعا و ترکہ فی القبر لم یعذب صاحب القبر، ذکرہ السید احمد (۳۵۶ ج ۱) اور اوائل سورۃ البقرہ و اخرها کالقبر میں مردہ کے سرھانے کی طرف اور پیروں کی طرف پڑھنا عبد اللہ بن عمر رضی عنہ سے منقول ہے، ذکرہ فی شرح الصدور و اللہ اعلم،

۱۱ شعبان ۱۳۲۲ھ

سوال (۶) غیر مقلدوں کے ایک مسئلہ نے یہاں سب کو پریشان کر رکھا ہے، ایک یہاں غیر مقلد ہے، اب وہ یہ حدیث لوگوں کے سامنے پڑھتا ہے، اور کہتا ہے کہ اس پر عمل کرو یا نہ کرو

حدیث الزاق المنکب بالمنکب
 والزاق المنکب بالکعب کے معنی کی تحقیق
 اور اس حدیث سے اشکال کا جواب

ان کے علاوہ سے مانگو، محض لوگوں کی تسلی کے لئے حضور سے دریافت کرتا ہوں، اب تک میں ملتا بھی رہا مگر جب مجبور ہو گیا تو عرض کی نوبت آئی، کوئی جواب لوگوں کے تسلی بخش عطا فرمایا جائے، میرے لئے صرف حضرت کا فعل ہی کافی ہے، وہ حدیث یہ ہے:-

صحیح بخاری کتاب المذاق المنکب بالمنکب والقدم بالقدم فی الصف و قال النعمان بن بشیر رايت الرجل منا يلزق كعبه بكعب صاحبه، ربيع بخاری مطبوعہ احمدی ص ۱۰۰، ترجمہ یہ کرتے ہیں ”صف نماز میں کندھے سے کندھا اور ٹخنے سے ملانے کے باب میں نعمان بن بشیر صحابی کہتے ہیں کہ میں دیکھتا ہوں، یعنی مجھے وہ وقت خوب یاد ہے کہ ہم میں سے ہر شخص سب نماز میں اپنے ساتھی یعنی پاس والے سے ٹخنے سے ٹخنا چپکا رہا ہے، اور یہ فعل صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقامت میں صرف حکم فرمانے پر کیا تھا، جس کی تفصیل سنن ابی داؤد اور صحیح ابن خزمیہ میں اپنی نعمان بن بشیر صحابیؓ سے روایت ہے، اقبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی الناس بوجہہ فقال اقيموا صفوفکم ثلاثا واللہ ليقمن صفوفکم اولیخالفن اللہ بین قلوبکم قال فسرأیت الرجل منا يلزق منکبه بمنکب صاحبه وکعبه بکعبه انتھی فتح الباری النصارى ۴۰۰، ترجمہ یہ کرتے ہیں:- ”قرایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر تین مرتبہ فرمایا لوگو! صفیں سیدھی کرو، واللہ صفیں سیدھی کرو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں میں خلافت ڈال دے گا“ نعمان صحابیؓ کہتے ہیں کہ پس اب اس حکم کے بعد میں نے ہر شخص کو دیکھا کہ وہ اپنے ساتھی یعنی پاس والے نمازی کے کندھے سے کندھا اور ٹخنے سے ٹخنہ چپکا رہا ہے، ابوداؤد میں گھٹنے سے گھٹنے چپکانے کا بھی ذکر ہے، وکعبه بکعب صاحبه کا لفظ ہے، (ابوداؤد، مطبوعہ مطبع النصارى دہلی ص ۵۰)

الجواب؛ حضرت نعمان بن بشیر کو جو روایت ابوداؤد اور صحیح ابن خزمیہ کے حوالہ سے فتح الباری سے نقل کی گئی ہے وہ صاف طور پر یہ بتلا رہی ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز شروع کرنے سے پہلے لوگوں کو صف سیدھی کرنے کا حکم فرمایا، اس وقت ہر شخص اپنے کندھے کو دوسرے کے کندھے سے اور ٹخنے کو دوسرے کے ٹخنے سے ملاتا تھا، اس سے یہ کہا ثابت ہوا کہ نماز شروع ہوجانے کے بعد نماز کے اندر بھی ٹخنوں کو ٹخنوں سے چپکانا چاہئے کیونکہ حدیث میں یہ نہیں ہے، فرأیت الرجل منا يلزق منکبه بمنکب صاحبه وکعبه بکعبه فی الصلوۃ اگر فی الصلوۃ کا لفظ حدیث میں ہوتا، تو اس وقت غیر مقلدین کا استدلال تام ہو سکتا تھا،

اور اس کے بغیر استدلال تام نہیں، مطلب یہ ہے کہ جب حضورؐ نے تسویۃ صفت کا امر فرمایا اس وقت محاذات اور برابری حاصل کرنے کے لئے کندھے کو کندھے اور ٹخنے کو ٹخنے سے ملا کر دیکھ لیا کرتے تھے، کہ محاذات ہو گئی یا نہیں، باقی اس کا نماز میں باقی رکھنا کسی دلیل سے ثابت نہیں،

دوسرے ہمارے نزدیک الزاق سے مجازاً محاذات مراد ہے، امام شوکانی نے نہل الاوطار میں حدیث تسویۃ الصفت کا یہی مطلب بیان کیا ہے، امی اجعلوا بعضہا حذاء بعض بیٹ یحون متکب کل واحد من المصلین مواز یا لمنکب الآخر ومسا مثاله فتکون المناکب والاعناق والاقدام علی سمت واحد ام (ص ۶۵ ج ۳) امام شوکانی کے اس قول سے ظاہر ہے کہ صفت برابر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ گردن اور قدم اور کندھا ہر نمازی کا دوسرے کے محاذی اور مقابل ایک سمت میں ہو ٹخنوں کا چپکنا اس کے لئے ضروری نہیں، اس لئے حافظ ابن حجر نے بخاری رحمہ اللہ کے قول الزاق المنکب بالمنکب والقدم بالقدم کو مبالغہ پر محمول فرمایا ہے، قال الحافظ المراد بذلك المبالغة فی تعریل الصفت (تسویۃ) وسدخلہ ام (ص ۶۱ ج ۲) جس سے صاف ظاہر ہے کہ اصل مقصود صفت کا برابر کرنا اور درمیانی فرجات کو بند کرنا ہے جس کو مبالغہ الزاق القدم بالقدم سے تعبیر کر دیا گیا،

علاوہ بریں اگر مان لیا جاوے کہ الزاق قدم بالقدم شرعاً مطلوب ہے تو سوال یہ ہے کہ یہ نماز کی ابتداء سے انتہاء تک ہر رکن میں مطلوب ہے یا بعض ارکان میں، صورت اولیٰ میں بتلایا جاوے کہ بحالت قعود الزاق کی کیا صورت ہوگی، اور صورت ثانیہ میں بعض ارکان کی تخصیص کس دلیل کی جائے گی، اگر یہ کہا جائے کہ بحالت قعود الزاق متعذر ہے، اس لئے یہ حالت مستثنیٰ ہے، تو ہم کہیں گے کہ بحالت قیام بھی یہ الزاق آسان نہیں، اس سے نمازیوں کو قیام میں بہت دشواری ہوتی ہے، چنانچہ تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے، پس اس الزاق کو ابتداء صلوٰۃ کے ساتھ خاص کرنا چاہئے۔ نیز فتح الباری میں حضرت انس صحابی رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے وزاد معمرنی روایتہ ولو فعلت ذلک باحدہم الیوم لنفرکانہ بغل فموس ام (ص ۶۱ ج ۲)، (ترجمہ) معمر نے اپنی روایت میں (تسا اور زیادہ کیا ہے کہ اگر میں آج کل کسی کے ساتھ ایسا کر دوں (یعنی ٹخنے سے ٹخنہ ملا دوں)، تو وہ ایسا بھاگے گا جیسا سرکش خچر اس سے صاف معلوم ہوا کہ حضرت انس بعد وصال نبویؐ کے الزاق کعب بالکعب نہ کرتے تھے، اور یہ اس کی دلیل ہے کہ الزاق سنت مقصودہ نہیں ہے، ورنہ صحابہ کسی کی نفرت کی وجہ سے اس کو ہرگز ترک نہ کر سکتے تھے، اور نیز نفرت اس فعل سے ہوا کرتی ہے جو عام طور پر نماز میں نہ کیا جاتا ہو، اور جو فعل عام طور پر سب کرتے ہوں اس سے نفرت

نہیں ہوا کرتی، پس اگر یہ الزاق سنت مقصودہ ہوتا تو سب صحابہ عام طور سے اس پر عمل کرتے، اور تابعین ان کے عمل دائم و عام کو دیکھ کر سمجھ جاتے کہ یہ سنت صلوات ہے، پھر کسی کو کسی کے الزاق کعب سے نفرت ہونے کی کیا وجہ تھی، پس حضرت انس رضی اللہ عنہ کے اس قول سے جیسا یہ معلوم ہوا کہ وہ لوگوں کی نفرت کے خیال سے الزاق نہ کرتے تھے، ایسے ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ فعل صحابہ و تابعین میں عموماً متروک تھا، اور یہ دلیل ہے اس فعل کے سنت مقصودہ نہ ہونے کی، یہی وجہ ہے کہ احادیث قولیہ میں الزاق کعب کا امر کہیں وارد نہیں، (کما اذی الیہ نظری) بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال میں حاذوا بالمناکب و سدوا للخلل و تراصوا و امثالہ وارد ہیں، حضور نے محاذات و فرجات بند کرنے اور مل کر کھڑے ہونے کا امر فرمایا ہے، الزاق کعب وغیرہ یہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم سے فعلاً منقول ہے، جس کا جہل یہ ہوا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور کے ارشادات پر مبالغہ کے ساتھ عمل کرنے کے لئے بعض دفعہ الزاق کیا، اور وہ بھی نماز شروع کرنے سے پہلے، جیسا کہ ہم نے شروع میں ذکر کیا ہے،

واللہ اعلم،

۱۲ اشوال ۱۳۲۲ھ

سوال (۷) جو لوگوں کے زبان میں حدیث یا آئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان ہے، کیسی ہے، یعنی صحیح ہے یا نہیں، اور بر تقدیر اول کس کتاب میں عرس پر استدلال کا جواب

حدیث کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یزور الشہداء باحد کل حول الحدیث

الجواب: قال العافظ السیوطی فی شرح الصدور الخرج النبیہقی عن الواقدی قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یزور الشہداء باحد کل حول واذا باخ الشعب یرفع صوته فیقول سلام علیکم بما صدقتم الآیۃ (ص ۸۳) اس حدیث کی سندیں دافدی ہے، جس کی اکثر محدثین نے تضعیف کی ہے، اور احادیث احکام میں اس سے احتجاج نہیں کرتے، دوسرا اس میں یہ کہاں ہے کہ حضور اسی تاریخ میں تشریف لاتے تھے جس میں یہ حضرات شہید ہوتے تھے، بلکہ اس میں صرف یہ ہے کہ ہر سال تشریف لے جایا کرتے خواہ کسی تاریخ میں ہو، میرے اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ تہما صرف زیارت و دعا کے لئے تشریف لے جاتے تھے، پس اہل عرس نے اس سے تاریخ کی تعیین اور اہتمام و تداعی کے ساتھ لوگوں کو جمع کرنا اور عرس کے لئے چندہ کرنا، سفر کرنا اور قوالی و سماع وغیرہ منکرات کا ارتکاب کرنا کہاں سے نکال لیا، اگر کوئی شخص کیفیت ما اتفاق بدوین تعیین ایام و بدوین

تداعی واجتماع و اہتمام کے منکرات سے احتراز کر کے ہر سال صلحا کی قبور کی زیارت کر لے تو اس کو کون منع کرتا ہے، مانعین عرس اس کو تو منع نہیں کرتے، بہر حال جتنا مضمون اس حدیث ضعیف سے ثابت ہے اہل حق اس کے جواز کے قائل ہیں، اور جس سے وہ روکنے میں اس کا ثبوت حدیث سے نہیں نکلتا،
 (الصفحة ۵۵)

از تھانہ بھون خالقہ امدادیہ اشرفیہ،

رفع یدین سے متعلق ابوداؤد | سوال (۸) سنن ابی داؤد مؤلفہ سلیمان بن اشعث میں حدیث کی ایک حدیث کی تحقیق، عدم رفع یدین بایں سند وارد ہے، حدیثنا حسین بن عبد

الرحمن حدیثنا وکیع عن محمد بن عبد الرحمن عن حکم بن عتیبة عن عبد الرحمن بن ابی لیلی عن براء بن عازب ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلی فلم یرفع یدیه الا اول مرة،

اس میں دریافت طلب یہ امر ہے کہ حسین بن عبد الرحمن کا حال مفصل بایں طور کہ یہ شیخ ابی داؤد ہیں، اور وکیع بن جراح سے حدیث روایت کرتے ہیں، اور یہ ثقہ ہیں یا نہیں، مناسب ہے کہ کتب معتبر اسماء الرجال و مطبع تحریر فرمائیں،

دوم یہ کہ قدوی نے اس راوی کے متعلق خلاصہ تہذیب الکمال مؤلفہ حافظ صفی الدین احمد بن عبد اللہ خزرجی میں اتنا پایا ہے کہ حسین بن عبد الرحمن روی عن وکیع وابن نمیر وغیرہ وعنہ ابوداؤد والنسائی وغیرہ، مگر اس میں ان کی ثقاہت یا تضعیف منقول نہیں، اور یہ خلاصہ تہذیب الکمال مطبوعہ مصر ہے، اگر آپ کے پاس بھی یہی خلاصہ ہو تو تحریر فرمائیں، کہ یہ عبارت اس میں موجود ہے یا نہیں؟

الجواب؛ خلاصہ تہذیب الکمال میں وہ عبارت موجود ہے جو آپ نے نقل کی ہے، جس سے وکیع سے ان کا راوی ہونا معلوم ہو گیا، (ص ۱۷) اور حاشیہ میں تہذیب سے اتنا اور نقل کیا ہے ”ذکرہ ابن حبان فی الثقات اھ“ اور تہذیب التہذیب مطبوعہ حیدرآباد..... دائرة المعارف (ص ۳۲۲ ج ۲) میں ہے، -الحسین بن عبد الرحمن ابوعلی الجرجانی روی عن الولید بن مسلم وطلق غنام وابن نمیر وخطب بن تیم وغیرہم وعنہ ابوداؤد والنسائی وابن ماجہ واحمد بن علی الدبار وغیرہم و ذکرہ ابن حبان فی الثقات وقال حدیثنا عنہ اھل واسط وقال ابو حاتم مجھول

فكانه ما خبر امره ام، اس میں اس راوی کی توثیق بھی مذکور ہے، اور شیخ ابی داؤد ہونا بھی اور ابو حاتم کی تجہیل کا بھی جواب ہی کہ اس کا منشاء عدم خبرت ہے، اور نہ جس سے ابو داؤد ولسائی جیسے ثقافت روایت کریں وہ مجہول کیسے ہو سکتا ہے، خصوصاً جبکہ اس کے علاوہ تین اصحاب صحاح کے متعدد اور ثقافت بھی راوی ہوں، اور روایت الاثنین ترافع جہالت العین، اور حسین بن عبدالرحمن کی اس حدیث پر جو ابو داؤد نے فرمایا ہے "لیسن بصیح" اس کا جواب بذل الجہود شائع کردہ مدرسہ مظاہر علوم بہار نپور کی جلد دوم (ص ۱۷) میں تفصیل سے مذکور ہے، فقط والسلام

۳۰ ربيع الاول ۱۲۵۵ھ

توثیق ابوبکرہ شیخ طحاوی | سوال (۹) حاوی المعقول والمنقول جامع الفروع والوصول
مکرمی معظی مولوی اشرف علی صاحب و محبتی مولوی ظفر احمد صاحب ادام اللہ ظلمکما العالی
از جانب خاکسار بے وقار عبدالحی، بعد سنت الاسلام واضح رائے عالی ہو کہ جواب مسئلہ
آپ کا دربارہ راوی حدیث حسین بن عبدالرحمان شیخ ابو داؤد صاحب سنن وارد ہو کر مؤید
تسکین دل غمگین ہوا، اللہ تعالیٰ خاطر عاظر آں مکرمان کو بھی دارین میں مسرور رکھے، آمین،
ایک اور تصدیق دیا جاتا ہے، امید ہے کہ بندہ کو بقول مشہور صاحب الغرض مجنون
معذور رکھیں گے، اول یہ کہ خلاصہ تہذیب الکمال سے تمام عبارت دربارہ راوی مذکور حسین
بن عبدالرحمن نقل کر کے روانہ فرمادیں، مع حوالہ مطبع و شہر،

دوم امام طحاوی معانی الآثار میں حدیث عدم رفع یدین سوائے تکبیر تحریمہ لائے ہیں
بایں سند حد ثنا ابویوسف قال ثنا مؤمل قال ثنا سفیان عن المغيرة قال قلت لابو اھیم حدایت
واعل انه رأى النبي صلى الله عليه وسلم يرفع يديه اذا افتتح الصلاة واذا ركع واذا رفع رأسه
من الركوع فقال ان كان وائلا رآه مرة يفعل ذلك فقد رآه عبد الله خمسين مرة لا يفعل
ذلك، اس میں یہ امر قابل دریافت ہے کہ ابوبکرہ شیخ طحاوی کون شخص ہیں ان کی تعیین
اس طرح پر کتب اسماء الرجال سے کہ یہ شیخ طحاوی ہیں اور مؤمل بن اسمعیل سے حدیث لیتے
ہیں اور ان کے بارہ میں قول محدثین علماء کے کہ یہ ثقہ ہیں یا ضعیف تحریر فرماویں؟

سوم اینکه سند سنن ابی داؤد میں حسین بن عبدالرحمن غیر معروف بالفت لام ہے،
اور خلاصہ تہذیب الکمال میں معروف بالفت لام ہے، تو یہ الفت لام اس پر کیسا ہی نفس کا

یا زائد، اور حسین بن عبد الرحمن ترکیب میں کہا ہے؛

الجواب، قال السيوطي في حسن المعاصرة الفاضل بقاربن قتيبة بن اسد الثقفي ابوبكرة الفقيه قاضي الديار المصرية سمع ابا داود الطيالسي واقترانه روى عنه ابو عوانه في صحيحه وابن خزيمة ام رص، ۱۹ ج ۱، وجواهر المفيدة في طبقات الحنفية بقاربن قتيبة ابن اسد الثقفي البكر اوى البصري ابوبكرة قاضي مصر سمع ابا داود الطيالسي ويزيد بن هارون واحيا علم البصر بين ابهم فحدث عن عبد الصمد بن عبد الوارث وصفوان بن عيسى الزهري ومؤمل بن سميعيل روى عنه الطحاوي فاكثروا روى عنه ايضا ابو هوانه في صحيحه وابوبكر بن خزيمة امام الائمة ام رص ۱۹ ج ۱، واخرج الحاكم حديثه في المستدرک وقال ان ابابكرة ثقة مأمون ام رص ۱۰ ج ۱، واقرة الذهي على توثيقه في تلخيصه للمستدرک (ص مذكور) اور سنن ابوداؤد میں حسین بن عبد الرحمن کا معرک باللام نہ ہونا اور خلاصہ تہذیب الکمال میں معرک باللام ہونا مضر نہیں، کیونکہ لفظ حسن اور حسن پر لام تعریف کا داخل کرنا اور داخل نہ کرنا دونوں جائز ہیں، جاما الحسین بن علی وجاہ حسین بن علی دونوں طرح کہہ سکتے ہیں، ترکیب بہر حال توصیفی ہے، حسین موصوف ابن صفت ہے، فقط

۲۰ ج ۱، ج ۱، ۲۵

تحقیق حدیث کنت کزاً مخفياً | سوال (۱) عرض یہ ہے کہ یہ حدیث شریف کنت کزاً مخفياً کتب اولیاء کرام میں بکثرت پائی جاتی ہے، اور نیز ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے مرقات میں بیان فرمایا ہے، اور نیز اس کی تصحیح اور تنقید مولانا عبد الحق صاحب نے مدارج میں بیان فرمایا ہے، اور نیز دیگر کتب فضلاء میں موجود ہے، مگر راوی کا ذکر نہیں کیا ہے، لہذا حضور کو تکلیف دی جاتی ہے، کہ بندہ کو اس کے راوی سے اطلاع دیجئے، اور نیز کتاب وصفہ سے بتلا کر ممنون فرمایا جاوے،

الجواب؛ في المقاصد الحسنة رص ۱۵۳، کنت کزاً الخ قال ابن يمية انه ليس من كلام النبي ولا يعرف له سند صحيح ولا ضعيف وتبعه الزركشي وشيخنا ام وفي الدر المنشرة للسيوطي لا اصل له (فتاوى حدیثیہ ص ۱۸۷) اور مدارج کا جو حوالہ دیا گیا ہے اگر مدارج کی عبارت لکھی جاوے تو اس کو

دیکھا جاوے اور صفحہ مدارج کا ضرور لکھنا چاہئے، فقط احقر عبدالکریم عفی عنہ

الجواب صحیح، ظفر محمد عفا عنہ ۳۷ شعبان ۱۴۲۸ھ

سوال (۱۱) ۱۔ الجمعة علی من سمح النذر اور الجمعة علی من آواه
والجمعة علی من آواه اللیل کی تحقیق اللیل کیسی حدیث ہے، قابل عمل ہے یا نہیں، اور اس کا کیا

مطلب ہے؟

۱۔ یہاں جمعہ جائز نہیں ہے، اور گاؤں کے تمام لوگ پڑھنے ہی پر بس نہیں کرتے بلکہ تارک جمعہ پر لعن طعن بھی کرتے ہیں تو کیا اس صورت میں بندہ نفل کی نیت سے شریک جمعہ ہو جایا کرے یا نہیں؟

۲۔ جب سب لوگ یہاں جمعہ ادا کر لیں تو اسی مسجد میں جمعہ کے بعد جماعت کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھنا مکروہ ہے یا نہیں؟

الجواب؛ دونوں حدیثیں ضعیف ہیں، اما الاول فقد اخرجہ ابوداؤد حد ثنا محمد بن یحیی بن قادم ر الذہلی، ناقبصة بن عقبہ صدوق) ^{سفیان} (الثوری) عن محمد بن سعید یعنی الطائفی ر قال المنذری فیہ مقال وثقہ ابن ابی وارة والبیہقی) عن ابی سلمة بن نبیہ (مجہول) عن عبد اللہ ہارون رحجازی مجہول کذا فی التقریب) عن عبد اللہ بن عمرو بن عاص عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الجمعة علی کل من سمع النداء قال ابوداؤد روی ہذا الحدیث جماعة عن سفیان مقصوراً علی عبد اللہ بن عمرو ولم یرفعوا وانما اسندہ قبیصة ام واخرجہ البیہقی والدارقطنی بطریق الولید عن زہیر بن محمّد عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدّہ مرفوعاً وفیہ زہیر بن محمّد روی عن اهل الشام من اکیر والولید مدلس وقد عنعنہ فلا یصح واخرجہ الدارقطنی عن رواية محمد بن الفضل عن حجاج بن ارطاة عن عمرو بن شعیب کذا لك مرفوعاً وفی سندہ محمد بن الفضل نسبوا الی الکذا وقال العراقی ضعیف جداً فعلى هذا جميع طرق الحديث مشکوفاً فیہ کذا فی بذل المجہود (ص ۱۶۵ ج ۱۰) نقلًا عن الشوکانی والعراقی، واما الثاني فقد رواه الترمذی والبیہقی من حدیث ابی ہریرة ر

مرفوعاً الجمعة على من اواه الليل وضيقاه ونقل عن احمد انه لم يره شيئاً
كذا في بذي المجهود نقلًا عن العيني (ص ۱۶۲ ج ۲) ويجابر ضهما ما رواه
البخاري ومسلم وابوداؤد وغيرهم عن عائشة زوج النبي صلى الله عليه
وسلم انها قالت كان الناس يتناوبون الجمعة من منازلهم ومن العوالي
قال الحافظ في الفتح ولو كان واجبا على اهل العوالي ما تناوبوا وكانوا يحضرون
جميعا كذا في بذي المجهود ولا يخفى ان اهل قباء يأوون الى منازلهم
قبل الليل بعد الجمعة ومع ذلك لم تجب عليهم الجمعة بل كانوا يتناوبون
لها (ص من كور)

اور ان دون حدیثوں کا محل ہمارے نزدیک یہ ہے کہ جمعہ اہل مصر و اہل قناریہ مصر پر واجب
ہے، اور ان کے ماسوا پر واجب تو نہیں، لیکن جو بدوین مشقت کے آسکیں ان کو فضیلت جمعہ
حاصل کرنے کے لئے حاضر ہونا چاہئے، ہما محمولان علی الذب، اور یہ تاویل تبرعا کر دی جاتی ہے
در نہ سند کے اعتبار سے جب یہ احادیث صحیح نہیں تو تاویل کی حاجت نہیں، مگر ادب یہ ہے
کہ حدیث ضعیف کو بھی ترک نہ کیا جاوے، بلکہ اس کا محل صحیح بیان کر دیا جاوے،
۱۔ اگر مصرت شدیدہ و ایندائے جسمانی کا خوف نہ ہو تو محض لعن طعن کی پردہ ہرگز نہ کی
جاوے، اور جمعہ میں کسی نیت سے بھی شرکت نہ کی جاوے لہذا فیہ من تکتیر سواد الجہال والیقاع
الواردين والصادرين في الضلال،

۲۔ جماعت نظر مکر وہ نہیں، کیونکہ وہ جماعت ثانیہ نہیں بلکہ بوجہ فساد جماعت اولیٰ
ہی جماعت اولیٰ حقیقہ ہے، واللہ تعالیٰ اعلم،

۲۵
شعبان

تحقیق معنی حدیث الاسلام | سوال (۱۲) الاسلام یہدم ماکان قبلہ میں کیا حقوق العباد
یہدم ماکان قبلہ، بھی داخل ہیں، اگر نہ داخل ہوں تو وہ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ
علیہم اجمعین جنہوں نے قبل اسلام مسلمانوں کے ساتھ تعدی کی اور قتال کیا، اور اس
قتال میں بہت سے مسلمان جاں بحق ہوئے ان کے حق سے وہ کیونکر بری ہوں گے؟
الجواب، حقوق العباد الواجبة اس میں داخل نہیں، مثلاً کسی کی امانت قبل از اسلام
اس کے پاس ہو تو رد واجب ہے، کسی کا دین ہو تو ادا واجب ہے، کسی سے بطور غدر و سرقت

کے مال حاصل کیا ہو تو واپس کرنا واجب ہے، فقد ورد فی قسۃ حدیبیہ ان المغیرۃ بن شعبہ کان قد سحب قومانی الجاہلیۃ فقتلہم واخذ اموالہم ثم جاء فاسلم فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اما الاسلام فاقبل واما المال فلت منه فی شئ قال ابن القیم ونبہ دلیل علی ان مال المشرک المعاهد معصوم وانه لا یملک بل یرد علیہ فان المغیرۃ کان قد صحبہم علی الامان ثم قدر بہم واخذ اموالہم ام (رزاد المعاد، ص ۳۸۶ ج ۱) و فی نور الانوار والکفار مخاطبون بالامر بالایمان و بالمشرک من العقوبات والمعاملات والصحیح انہم لایخاطبون باذار ما یحتمل السقوط من العبادات ام (ص ۹۰)

اور صحابہ میں سے قبل از اسلام جس نے مسلمانوں کے ساتھ تعدی کی تھی، چونکہ وہ اہل حرب تھے، اور حربی استیلا علی مال المسلم سے اس کا مالک ہو جاتا ہے، اور قتل مسلم سے اس پر قصاص واجب نہیں ہوتا نہ ایذا مسلم سے اس پر قانوناً کوئی جرم عائد ہوتا ہے، اس لئے وہ حقوق العباد سے بری تھے، صرف حقوق اللہ یعنی ایذا اولیاء اللہ و ایذا رسول اللہ کے مجرم تھے وہ اسلام سے عفو ہو گیا، واللہ اعلم

۲۲ شعبان ۱۲۶ھ

حدیث من فسر القرآن برأیه | سوال (۱۳) من فسر القرآن برأیه، اس روایت کے تمام الفاظ کیا ہیں، اور یہ کس کی روایت ہے، اگر آسانی سے تحقیق ہو جائے تو ممنون ہوں گا، مشکوٰۃ شریف میں باب الاعتصام بالکتاب والسنة اور باب العلم میں مجھے نہیں ملی، مرزائیوں کے جواب میں پیش کرنا ہے،

الجواب: حدیث کے الفاظ یوں ہیں (۱) عن ابن عباس مرفوعاً من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوأ مقعدہ من النار اخرجہ الترمذی و بیجانیہ علاء الصنعة، (۲) وعن جندب مرفوعاً من قال فی القرآن برأیه فاصاب فقد اخطأ بیجانیہ علامۃ الحسن کذا فی شرح الجامع الصغیر للحنبل (ص ۳۵۱ ج ۱)

۳ رمضان ۱۲۶ھ

عوارف المعارف کی ایک | سوال (۱۴) در ترجمہ عوارف المعارف حدیث فیاتین علی حدیث کے متعلق ہستفتاء۔ الناس زمان لا یسلم لذی دین دینہ الامن فمن قریۃ الی قریۃ ومن شاہق الی شاہق ومن حجر الی حجر کالتغلب الذی یردع قالوا متی ذلک یا رسول اللہ

قال اذا لم تصل الميمنة الابمخاصي الله الخ صحيح است يانه ؟

الجواب، اس کا اجمالی مضمون تو صحیح ہے، اس تفصیل کے ساتھ نظر سے سند کے ساتھ نہیں گذرا، ۶ رمضان ۱۴۲۸ھ

آیت قتل فی آدم من ربہ کلمات قتاب علیہ سوال (۱۵)
سے متعلق ایک روایت کی تحقیق زید حضرت عباس سے یوں روایت

تحریر کرتا ہے کہ حضرت عباسؓ سے ... روایت ہے کہ میں نے حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اُن کلمات کی بابت سوال کیا جن کی تعلیم آیت ہذا میں ہوئی، حضور ص نے فرمایا کہ آدم علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و علی رضی اللہ عنہ و فاطمہ رضی اللہ عنہا و حسن رضی اللہ عنہ کو وسیلہ کر کے گناہ کی معافی چاہی، خدا تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی، اور ان کے گناہ معاف کر دیے حدیث یہ ہے: اخبرنا ابن النجار عن ابن عباس قال سألت رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الكلمات التي تلقها آدم من ربه فتاب عليه قال سألت آدم بحق محمد وعلي وفاطمة والحسن ان تبت علي فتاب عليه (در منشور سیوطی) زید کے مقابلہ میں اپنا خیال یہ ہے کہ بحق محمدؐ تک عبارت صحیح ہے اور پھر آگے زائد ہے نہیں معلوم کس نے زیادہ کیا، فقط، جواب صحیح حدیث سے عنایت ہو دے،

الجواب؛ زید نے جو روایت بیان کی ہے وہ محض بے اصل ہے، در منشور نے اس کو ابن النجار سے نقل کیا ہے، اس کے علاوہ دارقطنی نے بھی اس روایت کو لیا ہے، لیکن دونوں کتابوں میں سے ایک ہی سند سے روایت موجود ہے، یعنی ابن النجار اور دارقطنی ہر دو کی سند میں حسین ابن الحسن الاشقر عن عمرو بن ثابت ابی المقدم عن ابیہ موجود ہے، اور یہ حسین رافضی غالی تھا، اور اکثر لوگوں نے اس پر جرح کی ہے، حتیٰ کہ بعض نے کذاب کہا ہے، اور عمرو بن ابی المقدم بھی غالی شیعہ تھا اور اس کے ضعیف ہونے پر سب محدثین کا اتفاق ہی اور بڑے سخت الفاظ میں اس پر جرح کی ہے، چنانچہ ابوداؤد نے رافضی خبیث کہا ہے پس یہ روایت موضوع ہے ہرگز قابل اعتماد نہیں، مہناج السنۃ میں صاف لکھا ہے، کذب موضوع۔ باتفاق اہل العلم (ص ۳۶ ج ۴) اور جب معلوم ہو گیا کہ یہ حدیث نہیں بلکہ حسین یا عمرو کا گھڑا ہوا مضمون ہے تو اس کا دوسرا جواب دینے کی ضرورت نہیں، اگر پھر بھی کسی کو خواہش ہو تو مہناج السنۃ دیکھ لے، کہ اس میں دیگر سات جواب موجود ہیں، اور جب معلوم ہو گیا

کہ یہ محل روایت ہی سرے سے گھڑی ہوئی ہے تو پھر بحق محمد تک کا صحیح ماننا بھی بلا دلیل ہے، اور کلمات کی صحیح اور معتبر تفسیر یہ ہے کہ رہنا ظلمنا النفس الخ مراد ہے، اس کو چند صحابہ نے بیان فرمایا ہے، اور خود حضرت ابن عباسؓ نے بھی یہی فرمایا ہے، جیسا کہ ثعلبی اور ابن المنذر نے ان سے روایت کی ہے جو درمنثور ہی میں موجود ہے، واللہ اعلم، کتبہ الاحقر عبد الکریم
از مکتبہ بھون ضلع مظفر نگر مورخہ ۲۲ رجب ۱۳۵۸ھ

کتاب التصوف والسلوک

الحب فی اللہ کی حقیقت سوال (۱) اس کی علامت اور اس کے حقوق کیا ہیں؟
..... اللہ کے لئے دوستی رکھنا دل سے ہے یا فقط زبان سے؟

۱۔ دینی دوستی رکھنے والوں کی صفت کیا ہے، اور کس طرح سے دوستی رکھنا ہے؟
۲۔ دینی دوستی رکھنے والوں کے ساتھ جو خلاف ورزی کرتے ہیں ان کے ساتھ کس طرح سلوک کرنا چاہیے؟ اس کی تفصیل بیان فرما کر عند اللہ ماجور ہوں، بینوا تو جروا،
الجواب؛ ۱۔ حب فی اللہ قلب سے ہوتی ہے، اور زبان سے ظاہر کرنا بھی مستحب ہے، باقی فقط زبان سے حب فی اللہ نہیں ہوتی، وہ مدارات میں داخل ہے، اگر شرعی مصلحت سے ہو،

۲۔ حب فی اللہ کی صفت یہ ہے کہ اس کا منشأ محض سلام اور اتباع شریعت ہو، کوئی نفسانی غرض اس کا منشأ نہ ہو، جس کی علامت یہ ہے کہ جب تک محبوب شریعت پر قائم رہے اس وقت تک اس سے محبت رہے، گو اس سے کوئی نفع اپنے کو نہ حاصل ہوتا ہو اور جب شریعت کے خلاف باصرار کرنے لگے تو محبت زائل ہو جاوے،

۳۔ حب فی اللہ کے چند حقوق یہ ہیں؛ ۱۔ (۱) گاہے گاہے اس سے ملتے رہنا (۲) اس کی راحت سے خوش ہونا، کلفت سے رنجیدہ ہونا (۳) بقدر وسعت ہدیہ دینا (۴) خط و کتابت رکھنا (۵) اس کے لئے دعا کرتے رہنا (۶) اس کے ساتھ ہمیشہ خیر خواہی کرنا، (۷) اس کے مخالفوں کی باتیں نہ سننا اور جو شے تو ان کو رد کر دینا وغیرہ وغیرہ،

سوال سوم کا مطلب نہیں سمجھ میں آیا، واللہ اعلم

۲۵ شعبان ۱۴۲۲ھ

فاسق پر طریقت نہیں ہو سکتا | سوال (۲)

..... ایک پیر عوام الناس ہے جس کو پیری وراثت سے ملی ہے، اس کا والد مجاز تھا، اس نے اپنی اولاد موجودہ کو اجازت خلافت دیدی ہے، اس کی اولاد معمولی خواندہ ہی آثارِ رشد اس میں نہیں، بلکہ خلافتِ شرع بھی کر رہے ہیں، عوام معتقد ہیں ایک عالم نے ایک وقت رد و قدح کیا تو اس پر کفر کا فتویٰ دیا، کہ مرتدِ طریقت ہی، اور مرتدِ طریقت بہت بُرا ہوتا ہے مرتدِ شریعت سے، اس جملہ کا بھی مطلب دریافت ہے، کہ یہ کس کا مقولہ ہے اور مطلب اس سے کیا ہے؟

۱۔ اب اس وقت منکوحہ نابالغ کی تھی، جو کہ صرف سرکاری کاغذات میں پندرہ سال کا ہے، خود بلوغ کا منکر، اور گواہ بھی نہیں، منکوحہ کو ایک شخص گھر لے گیا ہے، علماء دقت نے واپسی کا فتویٰ دیا ہے، اور لڑکے کو نابالغ قرار دیا ہے، خطِ سرکاری کا اعتبار نہیں کیا، موجود پیر صاحب نے بلا کر یہ کارروائی کی، لڑکے سے طلاق دلوائی، دریافت کیا کہ جماع کیا ہے؟ لڑکے نے انکار کیا، اس پر حلف بھی دیا، فوراً نکاح باندھ لیا ہے، خلوت کا کچھ بھی تذکرہ نہیں تحریر بھی دی ہے کہ سرکاری خط معتبر ہے شرع میں، اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تولد زمانہ کفر میں ہوا تھا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا اعتبار کر کے اپنی عمر بتلائی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں سے اپنے وقت تولد کا پوچھ کر کے بتلایا ہوگا، اور چونکہ لڑکے نے حلف لیا جماع کا، چونکہ خلوت ضعیف ہے جماع سے، اس لئے خلوت کا اعتبار نہیں، اس لئے میں نے نکاح جائز رکھا، انتہی،

اب دریافت یہ ہے کہ خطِ سرکاری معتبر ہے یا نہیں، یہ نکاح علی المنکوحہ یا علی المعتدہ موجودہ واقعہ میں خلوت صحیحہ موجود ہے جس کا مفتی نے دریافت تک نہیں کیا، بلکہ جماع کی نفی سے اس کی بھی نفی کی، اور ایسے پیر مفتی کا کیا حکم ہے؟

الجواب: یہ کسی کا بھی مقولہ نہیں، جہلاً بصوفیہ کی اختراع ہے، اور جب پیر کی اولاد میں رشد کے آثار نہیں وہ شرعاً فاسق ہے، اور فاسق شرعی پر طریقت کیونکر ہو سکتا ہے؟ پس ان سے ہرگز بیعت نہ کی جاوے، اور ان کے فتوے سے کوئی عالم مرتدِ طریقت نہیں ہو سکتا،

۱۔ یہ پیرضال مفضل و فاسق و فاجر ہے، اگر لڑکا واقع میں شرعی بالغ نہیں، اور بلوغ سے منکر ہے تو یہ نکاح منکوحہ ہے، جو باطل و باطل ہے، اور جس نے نکاح کیا ہے وہ زانی ہے، اور اگر لڑکا بلوغ کا مدعی ہے تو اس کی عمر لکھ کر دوبارہ سوال کیا جائے،

۲۱، شعبان ۱۳۵۵ھ

مسئلہ سلوک | سوال (۳)..... عشاء کی نماز کے بعد اپنے دونوں

ہاتھوں کو انکے ہاتھ کے درمیان میں گویا حضرت صلعم کے ہاتھ پر ان کا ہاتھ رکھا، جیسا کہ لکھتے ہیں بیعت رسول اللہ صلعم علی خمس شہادۃ ان لا الہ الا اللہ وان رسول اللہ و اقام الصلوٰۃ و ایتاء الزکوٰۃ و صوم رمضان الخ ایسے ہی حضرت صلعم کا ہاتھ پکڑ کے بیعت کرنے کو خیال کرنا درست ہے یا نہیں، للہ جواب فرمائیے، ایک عالم مریدوں کو تعلیم دیتا ہے،

الجواب؛ شیخ صادق کو نائب رسولؐ تو سمجھنا چاہیے، مگر یہ خیال کرنا ہرگز جائز نہیں کہ شیخ کے ہاتھ رسولؐ کے دست مبارک ہیں، اس میں تو گویا شیخ کو رسولؐ سمجھ لیا ہو، نعوذ باللہ من ہذہ الکفریات، کیا کوئی مسلمان ایسا تصور کر سکتا ہے کہ جس میں شیخ کو رسولؐ مانا پڑے، اور شیخ صادق تو کبھی یہ بھی نہ کہے گا کہ مجھ کو نائب رسولؐ سمجھو چہ جائے کہ اپنے ہاتھ کو دست رسولؐ تصور کرنے کا امر کرے، غرض یہ فعل بہت ہی منکر ہے، جو شخص اس کی تعلیم کرتا ہو اس سے احتساب لازم ہے، کہیں وہ کل کو دعویٰ نبوت کا نہ کر بیٹھے، جو اپنے ہاتھ کو نبی کا ہاتھ بتلاتا ہے وہ اپنے آپ کو نبی کہنے لگے تو کیا بعید ہے، اللہ تعالیٰ جملہ فتنے سے مسلمانوں کو محفوظ رکھو،

آمین ثم آمین، فقط احقر عبدالکریم عفی عنہ ۲۵ ج ۲ ۱۳۵۵ھ

الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ ۲۸ ج ۲ ۱۳۵۵ھ

سوال (۴) زید ایام بیض کے روزے مابانہ اور وظیفہ درود و جو رشد متبع شریعت تعلیم کری

دلائل الخیرات شریف روزانہ کرتا ہے، مگر رشد اس کو ان دنوں چیزوں سے منع کر کے درود شریف و استغفار وغیرہا کے وظائف بتلاتے ہیں، رشد کے حکم کے موافق وظائف درود شریف وغیرہ پڑھ کر روزہ ایام بیض وغیرہ رکھنا مناسب ہے یا نہیں؟

الجواب؛ وظائف وہی زیادہ مناسب اور مفید ہوتے ہیں جو کہ رشد متبع شریعت تعلیم کرے، اور ایام بیض کے روزے مستحب ہیں، اگر کسی وجہ سے رشد کامل کسی

امرید کو اس کی حالت خاصہ کے اعتبار سے منع کرنے تو مرشد کی تجویز کو اپنی رائے پر مقدم کرے، بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ بعض فعل مستحب کسی خاص شخص کے لئے کسی وجہ سے مضر ہو جاتا ہے، الاحقر عبد الکریم عفی عنہ از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون،

مورخہ ۲ شعبان ۱۲۵۷ھ

سوال (۵) بسم اللہ الرحمن الرحیم،
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی کو خرقہ دینا ثابت ہے؟ نیز اصطلاح خرقہ میں اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟

قال الملا علی القاری (من مفتریات الصوفیة علی النبی علیہ السلام) لبس الخرقۃ الصوفیة وكون الحسن البصری لبسها من علی قال ابن دجیة وابن الصلاح انه باطل وكذا قال العسقلانی انه لبس فی شی من طرقها ما یثبت ولم یرد فی خبر صحیح ولا حسن ولا ضعیف ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لبس الخرقۃ علی الصوة المتعارفة بین الصوفیة.... لاحد من الصحابة ولا امر احداً من اصحابه بفعل ذلك، وكل ما یرى من ذلك صریحاً فباطل قال ثم ان من الكذب لمفتری قول من قال ان علیاً لبس الخرقۃ لحسن البصری فان ائمة الحدیث لم یثبتوا للحسن من علی سماعاً فضلاً عن ان یلبسه الخرقۃ قال السخاوی ولم ینقر بذلك شیخنا بل سبقه الیه جماعة حتی من لبسها ولبسها کالد میاطی والذہبی وابن حبان والعلائی و العراقی وابن الملقن والبرہان الحلبي وغيرهم یعنی تشبہا بالقوم وتبرکاً بطریقہم اذ ورد لبسہم لہا مع السجۃ المتصلة الی کمیل ابن زیاد وهو صاحب علیاً کرم اللہ وجہہ اتفاقاً وفي بعض الطرق ایضاً اتصالها بأولس القرنی وهو قال اجتمع بعمر وعلی رضی اللہ عنہما قلت وكذا نسبة التلقین المتعارف بین الصوفیة لا اصل لہ وكذا نسبة المصافحة المتصلة الی النبی علیہ الصلوۃ والسلام لیس لہ اصل عند العلماء الاعلام وكذا نسبة الخرقۃ الی اولس وانه علیہ السلام اوصی بخرقۃ لا اولس وان عمرو علیاً سلماھا الیہ وانھا وصلت الیہم منہ وھل حراً فقیر ثابت ولا ذکرة بعض المشائخ فالمدار علی طریق الصحبة ومتابعۃ الكتاب والسنة ومجانبة الهوى ومقاربة

الهدی والعاقبة للتقوی (موضوعات لملا علی القاری رحمۃ اللہ علیہ ص ۶۲ و ۶۳)
مطبوعہ استنبول

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین صورت مسئلہ میں کون سا قول محقق ہے کہ خرقہ علی رضی اللہ عنہ نے حسن بصریؒ کو عطا فرمایا، اور بعد ازاں سلسلہ وار یہ طریق مروج آج تک چلا آ رہا ہے، یا کمال ابن زیادہؒ کو دیا گیا، یا یہ کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت اویسؒ کے پاس تشریف لے گئے، اور موافق وصیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کو خرقہ عطا فرمایا، بعد ازاں یہ رسم فقرا میں وہیں سے رواج سلسلہ بہ سلسلہ پاتی گئی کیا ان روایات میں سے کوئی روایت قابل اعتماد ہے؟ اور کیا سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی کو خرقہ دینا ثابت ہے، و نیز خرقہ کی ہیئت کیا ہے، اور کیا اس زمانہ میں اس کا پہننا مناسب ہے یا ترک، اور اصطلاح صوفیہ میں اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟

الجواب؛ سلسلہ صوفیہ کی صحت کے لئے خرقہ کا ثبوت ضروری نہیں بلکہ لغا طول اور صحت کافی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی کو خرقہ پہننا ثابت نہیں، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا بھی کسی کو خرقہ پہننا ثابت نہیں، ہاں یہ ثابت ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہے، اسی طرح یہ بھی ثابت ہے کہ امام حسن بصریؒ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی صحبت میں رہے، ففي الخلاصة عن تہذیب التکمال وقال یونس بن عبید سالت الحسن قلت یا ابا سعید انک تقول قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وانک لمرتد لکہ قال یا ابن اخی لقد سألتنی عن شیء ماسألنی احد قبلك ولولا منزلتک منی ما اخبرتک انی فی زمان کما تری روکان فی عمل الحجاج کل شیء سمعتنی اقول قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فهو علی ابن ابی طالب غیر انی فی زمان لا استطیع ان اذکر علیاً رکذا فی حاشیة التہذیب ص ۲۶۶ ج ۲) قال الشیخ مولانا فخر الدین النظامی فی کتابہ فخر الحسن هذا دلیل جلیل علی سماع الحسن من علی المرتضیٰ واکثارة عنه رکثرة ما رواه الحسن من المراسیل والروایة لیس فیہم کلام للثقات ام وقال السیوطی فی اتحاف الفرقہ یوصل الخرقہ بعد ما اخرج عن ابی یعلی فی مسندہ حدیث الحسن قال سمعت علیاً یقول قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مثل امتی مثل لمطر الحدیث

قال محمد بن الحسن الصيرفي شيخ شيوخنا هذا نص صريح في سماع الحسن من علي رضي الله عنه ورجاله ثقات ام من التعليق الحسن،

اور اگر علی کرم اللہ وجہہ حسن بصریؒ اور کلیل بن زیادؒ کو خرقہ پہناتے تو اپنے صاحبزادوں امام حسن و امام حسین علیہما السلام کو ضرور پہناتے، جن کا قطعی طور پر صاحب کمال اور حقا نسبت و احسان ہونا بشارت نبوی ثابت ہے، واقعہ یہ ہے کہ اجازت اور خلافت باطنہ کے لئے صرف لقاء و صحبت اور زبانی اجازت کی ضرورت ہے، سو وہ تمام مشائخ سلسلہ میں موجود ہے، بعض بزرگوں نے اپنے کسی مجاز کا دل خوش کرنے کے لئے اجازت لسانی کے ساتھ خرقہ بھی عطا فرمایا ہوگا، اس وقت سے خرقہ کا دستور جاری ہو گیا، باقی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یا حضرات صحابہؓ سے نہ اس کا ثبوت نہ ثبوت کی ضرورت،

از تھانہ بھون ۳۵۵ھ

نسبت تلقین کی حقیقت | سوال (۶) نیز باصطلاح صوفیہ نسبت تلقین کیا ہے، اور اس کا حکم کیا ہے، یہ بھی متحقق امور شرعیہ میں سے ہے یا نہیں؟

الجواب: نسبت تلقین کی حقیقت معروضہ یہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اللہ تک پہنچنے کا نزدیک تر راستہ بتلا دیجئے جو بندوں پر بھی آسان ہو اور اللہ کے نزدیک بھی افضل ہو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے افضل لا الہ الا اللہ ہے، اس پر حضرت علیؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں یہ ذکر کیونکر کروں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آنکھیں بند کرو، اور تین دفعہ مجھ سے اس کو سنو، پھر تین دفعہ تم بھی ذکر کرو اور میں سنوں، اس کے بعد حضور نے اپنی مبارک آنکھیں بند کر کے بلند آواز سے تین دفعہ لا الہ الا اللہ کہا اور حضرت علیؓ سنتے رہے پھر حضرت علیؓ نے آنکھیں بند کر کے بلند آواز سے تین دفعہ لا الہ الا اللہ کہا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سنتے رہے، ام

حضرت شیخ امام سید احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ نے البرہان المؤید میں فرمایا ہے کہ تلقین کا یہ طریقہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بسند صحیح ثابت ہے، اور اسی کے موافق صوفیہ میں سلسلہ سلسلہ چلا آ رہا ہے، مگر محدثین کے طریق پر اس کا ثبوت نہیں ہے، اور غالباً شیخ امام سید احمد کبیر رفاعی نے اس کی سند کو صوفیہ کے طریقہ پر صحیح فرمایا ہی، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب،

نسبت مصالحة کی حقیقت **سوال (۲)** نسبت مصالحة متصلہ باسلاح صوفیہ کسے کہتے ہیں؟ اور اس کا ثبوت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے یا نہیں، ان امور کے متعلق ملا علی قاریؒ نے اپنی کتاب موضوعات میں کلام کیا ہے، اور زوردار الفاظ میں انکار کیا ہے، لیکن اسی کتاب میں اور اسی مقام پر علامہ سخاویؒ اور دیگر علماء کبار ذہبیؒ و دیلمیؒ و ابن ملقمؒ و غیرہم کے متعلق نقل فرماتے ہیں کہ یہ حضرات خرقہ تشبیہاً بالقوم و تبرکاً بطریقہم پہنتے تھے، بدیہی وجہ آنجناب..... کی طرف رجوع کیا ہے، ان دونوں اقوال میں کس پر اعتماد و وثوق کیا جاوے، ازراہ شفقت بزرگمانہ تفہیم سے سفینہ فرمایا جاوے۔ بینوا توجروا؟

الجواب: نسبت مصالحة کی حقیقت کسی مقام پر کتب معتبرہ میں نظر سے نہیں گزری اصطلاح قدیم ہے، ولعل الله يحدث بعد ذلك امراً، نعم قال فی کشف اصطلاح الفنون الصلح عند الصوفیة عبارة عن قبول الاعمال والعبادات (ص ۸۳ ج ۱۰) فلعل الصلح والمصالحة عبارة عن الاتصال والمواصله والحصول وهوان لا یجد العبد غیر خالفه ولا يتصل بسره خاطر لغير صانعه (عوارف، ص ۲۶۹ ج ۲) فهناك يصلح العبد ويرزق والصلاح والقبول والوصل والاتصال في الاصل عبارة عن النسبة الباطنية التي قد امتاز بها القوم اهل الطريق وهي قصوى مرادهم وغاية قصدهم ومنتهى سعيهم، والله تعالى اعلم، ولا شك في اتصال هذه النسبة بالحضرة النبوية فانها مشكوة الانوار ومنبع الاسرار ومنتهى كل کمال وجمال ولا بد لحصول هذه النسبة من صحبة شيخ کامل اتصلت سلسلته الروحانية بمشكوة النبوة ومعدن الرسالة ولا یجدى فیها مجرد تحصیل العلم وکثرة العمل بدون صحبة الشيخ كما هو مشاهد الا نادراً والنادر کالمعدوم وقد كان بعض الاجلة من الصوفیة قد اختار لاقاء هذه النسبة فی قلوب المريدین طریقاً خاصاً بصراً الهمة اليها وهي معرفته بین القوم وهذه الطريق لم یثبت من النبی صلی الله علیه وسلم بهذه الهيئة وهي التي قال فیها القاری لا اصل لها، والله تعالى اعلم

کتاب الذکر والدعاء والتعوذات

کھڑے ہو کر ذکر کرنا | سوال (۱) خاچہ صلوٰۃ کھڑے ہو کر ذکر کرنا افضل ہے یا بیٹھ کر؟ مسئلہ
افضل ہے یا بیٹھ کر | کسی کتاب میں نہیں دیکھا، ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ بیٹھ کے پڑھنا
افضل ہے اور اکثر احادیث میں ذکر کرجوس وقوعہی کے ساتھ مذکور ہے۔

الجواب: دعا اور ذکر میں افضل جلوس ہی ہے۔ قال العلامة ابن الجزری
فی العنسن، ادا ب الدعاء منها.... ما یبذل ان یکون رکنا وان یکون شریطا وان
یکون غیر ذلک من مامورات ومنہیات وغیرہا الی ان قال والجثو علی الرکب
عواہ قال المحشی العلامة من حدیث عامر بن خارج بن سعد عن سعد بن سعد
بن ابی وقاص ام رص ۲۲ وقال صاحب العنسن ایضاً فی بیان ادا ب الذکر
مانصہ، وان کان جالساً فی موضع استقبال القبلة ام قال المحشی العلامة فی الفاری
قوله جالساً وتفید الجلوس لانه افضل احواله اما علی رکبتيه او بصفته
التربیع بحسب اختلاف المشائخ ام رص ۲۶ ہاں جس جگہ قیام کرے اگر کوئی رائے
شرعی ہو وہاں قیام افضل ہے، جیسا کہ زیارت نبوی کریم علیہ افضل الصلوٰۃ والسلام کے
لئے مواجہہ شریفیہ میں کھڑے ہو کر صلوٰۃ و سلام پڑھنا مشروع ہے۔ قال العلامة فی الفاری
فی مناسک ثم توجه ای بقلب والقلب مع رعاية غایۃ الادب فقام تجاه الوجه
الشریف ام رص ۲۸۶ وما احسن قول بعضهم لو بئتکم قاصداً اسی علی
بصری: لم اقض حقوا ای الحق ادبت، رزقنا اللہ تعالیٰ زیارۃ وجہ الکریم
ورویۃ جمالہ الوسیم، وجمعنا بہ فی جنات النعیم، امین امین،
لیکن اس پر قیام مولد کو قیام کرنا صحیح نہیں، کیونکہ یہ قیام اسی موضع شریف و امثالہ
کے ساتھ مختص ہے، فافہم واللہ اعلم۔

۵ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۵ھ

وترکی نماز کے بعد سبحان الملک | سوال (۲) وتر کی نماز کے بعد سبحان الملک تقدس کتنی مرتبہ
التقدس کتنی مرتبہ کہنا چاہیے، | کہنا چاہیے، غالباً مشکوٰۃ میں تین دفعہ کہنا آیا ہے، اور اخیر

بسم تیسری آواز کے لئے رفع سونہ کا لفظ آیا ہے، بعضے کہتے ہیں کہ ہر سہ بار بجز خفیف کرنے تو پھر تیسری دفعہ رفع سونہ کے کیا معنی :

الجواب : قال فی الحسن واذا سلم منه قال سبحان الملك القدوس ثلاث مرات یمد صوتہ فی الثالثہ ویرفع راسہ من فطہ اس سے معلوم ہوا کہ تین بار کہے اور تیسری بار میں آواز بلند کرے اور دراز کرے، اور سیاق کا مقتضایہ ہے کہ پہلی دربار میں بھی جہر ہے، مگر خفیف ورنہ راوی کو تعبیر عدد ثلاث کا علم بصورت اخفا، اولین متعذر تھا، واللہ اعلم،

۲۲ ریح الثانی سنہ ۴۴

فرض نمازوں کے بعد باواز بلند تکبیر | سوال (۳) آجکل
کہنے کا حکم اور اس کی سختی، بعض واعظین مسلمانوں کو یہ تعلیم دیتے پھرتے ہیں کہ پانچوں

نمازوں کے بعد سب نمازیوں کو باواز بلند تین مرتبہ اللہ اکبر کا امر لگانا چاہئے، اور جب اللہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ بدعت ہے تو وہ اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ خدا کا نام لینا اور تکبیر کہنا بھی بدعت بدعت ہو سکتا ہے، اور استدلال میں تکبیرات تشریف اور تکبیر جہاد کو پیش کرتے ہیں، امید ہے کہ اس سوال کا جواب مع حوالہ سنت و کتاب دیا جائے گا، بنو ابی الامر الصواب وکم عند اللہ جزیل الثواب،

الجواب واللہ الموفق للصواب : اس قسم کا سوال حضرت علامہ مولانا ابوالحسن عبدالحی لکھنوی نور اللہ مرقدہ کی خدمت میں بھی پیش ہوا تھا، جس کا مفصل جواب مولانا مرحوم کے فتاویٰ میں منقول ہے، مختصراً کچھ یہاں بھی ذکر کیا جاتا ہے، نیز درمحل بمقام دیگر نوشتہ ہے :
ولیحذر راجعاً من الجہر بالذکر والدعاء عند الفراغ من السلوۃ ان کان فی جماعۃ فانہ ذلک من البدع، انتہی وعلامہ بدرالدین العینی الحنفی دربنایہ شرح ہدایہ می نویسند، قال ابوبکر الرازی قال مشائرننا التکبیر جہراً فی

سہ نماز سے فارغ ہونے کے وقت ذکر اور دعا میں جہر کرنے سے اگر جماعت کیساتھ ہو سب کو بچنا چاہئے کیونکہ یہ بدعتوں میں سے ایک بدعت ہے ۱۲

عہ ابوبکر رازی نے کہا ہے کہ ہمارے مشائخ نے فرمایا ہے کہ ایام تشریق و عید الاضحیٰ کے سوا تکبیر میں کسی وقت جہر کرنا مسنون نہیں، مگر دشمن اور چوروں کے مقابلہ کے وقت اور بعض نے کہا ہے کہ آگ لگنے اور خطرناک مواقع میں بھی ام۔

غير ايام التشريق والاضحى لايسن الا بازاء العدو واللسوس وقيل وكذا في الحريق
والمخاوف كلها انتهى، وفي نصاب الاحتساب اذا كبروا على اثار الصلوة جهرا
يكره وانه بدعة يعني سوى الايام النحر والتشريق انتهى، واین قسم عبارت جنبه
بسیار اندک ازان تراست ذکر جہری بجز چند مواضع مستثناة ثابت می شود تفصیل آن در رساله
ام سباحه الفکر فی الجہر بالذکر موجود است، الحاصل ذکر جہری بعد نماز سوائے مرایام تشریق
و غیرہ اگر احیاناً باشد مضائقہ نیست بشرطیکہ جہر مفرط نباشد، و همچنین اگر مقصود از جہر تعلیم
باشد و بدون این اغراض التزام و اہتمام آن کردن چنانکہ در سوال مذکور است خلاف طریق نبوی
و طریق سلف صالح است و اللہ اعلم اھ (ص ۲۳۳ ج ۲ مع الخلاصہ)

بعض لوگوں نے نماز کے بعد بلند آواز سے ذکر کرنے پر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ
کی روایت سے استدلال کیا ہے جسکو بخاری نے ان الفاظ سے روایت کیا ہے، ان رفع
الصوت بالذکر حين ينصرف الناس من المكتوبة كان على عهد رسول الله صلى
الله عليه وسلم وقال ابن عباس كنت اعلم اذا انصرفوا بذلك اذا سمعته اھ
(ص ۲۶۹ ج ۲ فتح الباری) نماز فرض سے فراغت کے بعد بلند آواز سے ذکر کرنا رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا، ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب میں ذکر کی آواز سنتا تھا اس
وقت نماز کا ختم ہونا مجھے معلوم ہو جاتا تھا، فتح الباری میں اس کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے،
وقال النووي حمل الشافعي هذا الحديث على انهم جهروا به وفتايسير الاجل
تعليم صفة الذكر لانهم داوموا على الجهر به والمختاران الامام والمأموم
يخفيان الذكر الا ان احتيج الى التعليم اھ (ص ۲۶۹ ج ۲) یعنی امام شافعی رحمہ اللہ نے
اس حدیث کو اس پر محمول کیا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک دوسرے کو ذکر کے الفاظ اور
طریقہ سکھانے کے واسطے کچھ دنوں جہر کیا ہے، ہمیشہ انھوں نے جہر نہیں کیا، اور مختاری بھی
کہ امام اور مفتدی آہستہ ذکر کریں، البتہ اگر تعلیم کی ضرورت ہو تو مضائقہ نہیں اھ
علامہ عینی عمدة القاری میں اس کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں وقال ابن بطلال وقول
ابن عباس كان على عهد النبي صلى الله عليه وسلم فيه دلالة على انه لم يكن

عہ جب نماز کے بعد ایام تشریق و نحر کے سوا جہر کے ساتھ تکبیر کہیں تو مکروہ اور بدعت ہے،

علامہ عینی نے اس حدیث کی شرح میں ابن بطلان کا یہ قول بھی نقل کیا ہے؛ وقال ابن بطلان اصحاب المذاہب المتبعة وغيرهم متفقون على عدم استحباب رفع الصوت والتكبير والذكر حاشا ابن حزم اه، ابن بطلان کہتے ہیں کہ وہ ائمہ جن کے مذاہب کا اتباع کیا جاتا ہے اور ان کے سوا دوسرے بھی اس پر متفق ہیں کہ تکبیر و ذکر کے ساتھ آواز کا بلند کرنا (نمازوں کے بعد) مستحب نہیں ہے، بجز ابن حزم کے کہ اھ، فتح الباری میں یہ بھی مذکور ہے قال الطبري فيه الابانة عن صحة ما كان يفعل بعض الامراء من التكبير عقب الصلوة وتعقبه ابن بطلان بانه لم يقف على ذلك عن احد من السلف الا ما حكاه ابن حبيب في الواضحة اھم كانوا يستحبون التكبير في العشاء عقب الصبح والعشاء تكبيرا عاليا ثلاثا قال وهو قدیم من شان الناس قال ابن بطلان وفي العتبية عن مالك ان ذلك محدث اھ (ص ۲۶۹ ج ۲) وفي العمدة للعيني وعن عبدة انه بدعة اھ (ص ۱۹۲ ج ۳)۔

طبرانی نے کہا ہے کہ حدیث ابن عباسؓ سے بعض امرائے اس فعل کی صحت معلوم ہوئی ہے کہ وہ نماز کے بعد تکبیر بلند آواز سے کہاکرنے لگتے، ابن بطال نے اس پر اعتراض کیا ہے، کہ سلف میں سے کسی سے ہم کو یہ ثابت نہیں ہوا، بجز اس کے کہ ابن حبیب نے واضحہ میں نقل کیا ہے کہ لوگ لشکروں میں صبح اور عشاء کی نماز کے بعد بین مرنہ بلند آواز سے تکبیر کہنے کو پسند کرتے تھے، ابن بطال کہتے ہیں کہ عتبہ میں مالک کا قول اس کی نسبت نقل کیا ہے کہ یہ طریقہ محدث ہے (نواب جاد ہے) اور بخانی میں عبیدہ سے منقول ہے کہ یہ طریقہ بدعت ہے اور

الغرض اس حدیث سے استدلال کرنا موجودہ تکبیر پر صحیح نہیں، کیونکہ تمام علماء برندانہ نے اس حدیث میں خود تادیل کی ہے، اور جن لوگوں نے لشکروں میں نماز صبح و عشاء کے بعد تین بار تکبیر کہنے کا رواج جاری کیا تھا، امام مالکؒ وغیرہ نے اس کے بدعت ہونے کی تصریح کی ہے، قال فی المرقاة وحمل الشافعی جمہرہ ہذا علی انہ کان لاجل تعلم المامونین لقولہ تعالیٰ وَلَا تَجْهَرُوا بِصَلَاتِكُمْ وَلَا تَخَافُتُمْ بِهَا الْآیۃَ نَزَلَتْ فِی الدَّعَاءِ کَمَا فِی الصَّحِیحِیْنِ وَاسْتَدِلَّ الْبِیْهَقِیْ وَغَیْرَہُ لَطَلَبِ الْاِسْلَامِ بِخَبَرِ الصَّحِیحِیْنِ اِنَّہُ عَلِیْہِ السَّلَامُ اَمْرَہُمْ بِتَرْکِ مَا کَانَ اَعْلَیْہِ مِنْ رَفْعِ الصَّوْتِ بِالْتَهْلِیْلِ وَالتَّکْبِیْرِ وَفَا لَ اَنْتُمْ لَا تَدْعُوْنَ اَصْمَ وَلَا غَائِبًا اِنَّہُ مَعَكُمْ اِنَّہُ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ اھ (ص ۱۸ ج ۲)

یعنی امام شافعیؒ نے اس جہر بالذکر کو اس پر محمول کیا ہے، کہ وہ اس لئے تھا کہ مقتدی سمجھ لیں کہونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ صلوٰۃ میں نہ جہر کرو، نہ بہت آہستگی کرو، اور یہ آیت دعا (و ذکر) ہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جیسا کہ صحیحین میں ثابت ہے، بیہقی وغیرہ نے دعا و ذکر میں اخفاء کے مطلوب ہونے پر صحیحین کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے، جس میں اس کی تصریح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو اس طریقہ سے منع فرمایا تھا، جو انھوں نے تہلیل و تکبیر بلند آواز سے کرنے میں خستیا کر رکھا تھا اور آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں پکارتے ہو (جس کو تم پکارتے ہو) وہ تمہارے ساتھ ہے وہ سننے والا اور بہت نزدیک ہوا

استدلال کا حاصل یہ ہوا کہ ابن عباسؓ کی حدیث نص سرائی کے خلاف وارد ہوئی ہے، اس لئے اس میں تادیل کرنا ضروری ہے، (کیونکہ نص میں دعا و ذکر بلند آواز سے کرنے کی ممانعت صریح ہے) علاوہ ازیں خود صحیحین میں دوسری حدیث ابن عباسؓ کی حدیث کے لئے ناسخ موجود ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ ذکر اور تکبیر میں آواز بلند کرتے تھے، اور حضورؐ نے ان کو اس سے

منع فرمایا، پس صورت موجودہ پر حدیث ابن عباسؓ سے استدلال ہرگز صحیح نہیں، ارباقائل کا یہ کہنا کہ تکبیر اور خدا کا ذکر بدعت نہیں ہو سکتا، اس کا جواب یہ ہے کہ علماء مذہب کی عبارت دیکھ لو وہ اس صورت سے ذکر کو بدعت ہی فرما رہے ہیں، تو کیا تم کو ان پر بھی اعتراض ہے، دوسرے شخص سمجھ سکتا ہے کہ جو لوگ اس کو بدعت کہتے ہیں وہ ذکر اور تکبیر کو بدعت نہیں کہتے بلکہ اس بہرہ اور اجتماع اور التزام و اہتمام کو بدعت کہتے ہیں، اگر بطور خود کسی وقت میں اتفاتیہ کوئی شخص زور سے تکبیر کہہ دے اس کو کون حرام کہتا ہے، لیکن نمازوں کے بعد خاص طور پر جہر کے ساتھ نمازیوں کا مل کر تکبیر کے نعرے لگانا یہ صورت ضرور بدعت ہے،

رہا تکبیر بر وقت جہاد پر اس کو قیاس کرنا سو یہ بھی غلط قیاس ہے، کیونکہ جہاد میں دشمن کے مقابلہ میں تکبیر بلند آواز سے کہنا ثابت ہے، نمازوں کے بعد ثابت نہیں، قال تعالیٰ اِذَا لَقِیْتُمْ دَرُفَةً فَاتَّبِعُوا اَوَّازَ کُرِّ وَاللَّهِ کَثِیْرًا اَلَا یَہْدِیْکُمْ لَیْسَ بِہِذَا اَمْرًا اِنْ کُنْتُمْ مُّسْلِمِیْنَ (اے مسلمانو! جب تم دشمن کی جماعت سے ملو اس وقت جھے رہو اور خدا کو یاد کرو) سو مقابلہ کے وقت ارہاب عدد کے لئے تکبیر بالجہر کا کسی کو انکار نہیں اور اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ زمانہ سابق میں لشکر والے عشاء و صبح کے بعد تین بار زور سے تکبیر کہتے تھے، اس کو امام مالکؒ اور عبیدہؒ نے بدعت کہا ہے، اور صورت موجودہ بھی اگر تاویل بعید کر کے اس کو جہاد کی صورتیں کوئی داخل کرنا چاہے تکبیر عسا کر سے زیادہ نہیں ہو سکتی، جب وہ بدعت ہے تو یہ بدرجہ اولیٰ بدعت ہے،

رہا تکبیرات تشریق پر قیاس کرنا وہ اس لئے غلط ہے کہ تکبیرات تشریق خلاف قیاس نص سے ثابت ہیں، اور خلاف قیاس پر قیاس صحیح نہیں، امام صاحبؒ اور صاحبینؒ کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ عید الفطر کے دن عید گاہ جاتے ہوئے تکبیر جہر کے

عہ آجکل جاہلوں نے یہ عنوان خوب یاد کر لیا ہے، چنانچہ جب اہل مولود و اہل فاتحہ سے کہا جاتا ہے کہ اس طرح مولود و فاتحہ بدعت ہے تو وہ بھی یہی کہہ دیتے ہیں کہ بھلا ذکر رسولؐ اور سورہ فاتحہ کا پڑھنا بھی بدعت ہو سکتا ہے اس کا جواب بھی یہی ہے کہ نفس ذکر رسولؐ اور نفس قرأت فاتحہ کو کوئی بدعت نہیں کہتا، بلکہ اس طریقہ سے کرنے کو بدعت کہا جاتا ہے، جیسا کہ کوئی شخص طلوع و غروب کے وقت نماز پڑھنے لگے، یا قبلہ کی طرف پشت کر کے پڑھے تو ایسی نماز سے ہر کوئی منع کرتا ہے، تو وہ نماز کو نہیں منع کرتا بلکہ اس وقت اور اس ہیئت سے منع کرتا ہے، فافہم ۱۲

عہ البتہ اگر دشمن کی فوج کے ساتھ ادا کی جا تو اسکے بعض کے نزدیک تکبیر بالجہر جائز ہے ۱۲ منہ

سانحہ کہنی پاسبنے یا آتے نہ، صاحبین نے عید الاضحیٰ پر قیاس کر کے جہر کو ترجیح دیا، اور عبد اللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ ان کے اس قیاس کی تاخیر بھی ہوئی ہے، مگر بائیں ہمہ صاحب ہدایہ اور ابن ہمام نے امام صاحبؒ کی طرف سے جو جواب دیئے ہیں وہ قابل ملاحظہ ہے، فی الہدایۃ ولا یکبر عند ابی حنیفۃ رحمہ اللہ فی طریق المصلیٰ رای یوم الفطر ۱۱۲ وعندہما یکبر اعتباراً بالاضحیٰ ولہ ان الاصل فی الثناء الاخفاء والشرع ورد بہ فی الاضحیٰ لانہ یوم تکبیر ولا کذلک یوم الفطر اہ قال المصنف فی الفتح قولہ ولا یکبر الخلف فی الجہر بالتکبیر فی الفطر لانی اصلہ لانہ داخل فی عموم ذکر اللہ تعالیٰ فعندہما بجہر بہ کلاضحیٰ وعندہ لا یجہر بہ، وفي الخلاصة ما یفید ان الخلاف فی اصل التکبیر ولیس بشیء اذ لا یمنع من ذکر اللہ بسائر الالفاظ فی شیء من الاوقات بل من ایقاعہ علی وجہ البدعۃ فقال ابو حنیفۃ رفع الصوت بالذکر بدعۃ یخالف الامر من قوله تعالیٰ وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً وَدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ الْاِیْقَاعُ تَصِرُ فِیْہِ عَلٰی مَوَدِّ الشَّرْعِ وَقَدْ وَرَدَ بِہِ فِی الْاَضْحٰی وَهُوَ قَوْلُهُ تَعَالٰی وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِیْ اَیَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ، جاء فی التفسیر ان المراد التکبیر فی ہذہ الایام والاولیٰ الاکتفاء فیہ بالاجماع علیہ فان قیل فقد قال اللہ تعالیٰ وَلِتَّكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتَّكْبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰیْکُمْ وروی الدارقطنی عن سالم ان عبد اللہ بن عمرؓ اخبرہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یکبر فی الفطر من حین ینخرج من بیتہ حتی یاتی المصلیٰ فالجواب (عن الایۃ ۱۱۲) ان صلوة العید فیہا التکبیر والمذکور فی الایۃ بتقدیر کونہ امر علی ما تقدم فیہ اعم منہ وما فی الطریق فلا دلالة علی التکبیر المتنازع فیہ لجواز کونہ ما فی الصلوة والحديث المذکور ضعیف بسوسی بن محسن بن عطاء ابی الطاهر المقدسی، ثم لیس فیہ انہ کان یجہر وهو محل النزاع وکذا روی الحاکم من فروع السمعین کرا الجہر نعم روی الدارقطنی عن نافع موقوفاً علی ابن عمرؓ انہ کان اذا غدا یوم الفطر ویوم الاضحیٰ یجہر بالتکبیر حتی یاتی المصلیٰ ثم یکبر حتی یأتی الامام قال البیہقی الصحیح وقفہ علی ابن عمرؓ ونول صحابی لا یعارض بہ عموم الایۃ القطعیۃ الدلالة

اعنی قوله تعالى وَاذْكُرْ رَبَّكَ اِلَىٰ قَوْلِهِ وِدْوَانَ الْعِصْرِ وَقَالَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
 خیر الذکر الخفی ام ملخصاً ص (۲۰۲) (ترجمہ) ”عید الفطر کے دن تکبیر بالجہر کہنے میں
 اختلاص ہے۔ نفس تکبیر میں اختلاص نہیں۔ کیونکہ وہ تو عموم ذکر اللہ میں داخل ہے، پس صاحبین کے
 نزدیک عید الاضحیٰ کی طرح یوم الفطر میں بھی جہر کرے، اور امام صاحب کے نزدیک جہر نہ کرے
 اور خلوات کے بعض الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ نفس تکبیر ہی میں اختلاص ہے، اور یہ صحیح نہیں
 کیونکہ ذکر اللہ کسی وقت پر کسی لفظ سے منع نہیں کیا جاسکتا، بلکہ بطریق برکت ذکر اللہ
 سے منع کیا جاتا ہے، پس امام صاحب فرماتے ہیں کہ ذکر میں آواز بلند کرنا بدعت ہے، کیونکہ
 امر الہی کے خلاف ہے، حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ الخ (ترجمہ) ”اور اپنے رب
 کو اپنے دل میں یاد کر دعا جزی اور خوف کے ساتھ بلند آواز سے ... کم آواز کے ساتھ الخ“
 پس جہر میں اسی موقع پر اختصار کیا جائے گا، جہاں شریعت میں جہر وارد ہوا ہے، اور عید الاضحیٰ
 میں جہر وارد ہوا ہے، چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاذْكُرْ وَاللَّهُ فِيْ اَيَّامٍ مُّتَعَدَّةٍ اٰیۃ
 ”خدا کو چند دنوں یاد کرو“ تفسیر میں آیا ہے کہ اس سے مراد ان ایام (تشریق) میں تکبیر کہنا
 ہے، اور اولیٰ یہ ہے کہ اس میں اجماع پر اکتفاء کیا جائے کہ ایام تشریق میں تکبیر بالجہر پر
 اجماع ہو چکا ہے (۱۲) اگر کوئی یہ کہے کہ عید الفطر کے بارے میں بھی، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے
 وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ الخ تاکہ تم شمار کو پورا کرو اور خدا تعالیٰ کی تکبیر کو اس نعمت
 پر کہ اس نے تم کو ہدایت کی “ (اس سے عید الفطر میں بھی تکبیر کا حکم ہے) اور دارقطنی نے
 سالم سے روایت کی ہے کہ عبد اللہ بن عمرؓ نے اُن کو خبر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 یوم الفطر میں اپنے گھر سے نکلنے کے بعد عید گاہ تک تکبیر کہا کرتے تھے، پس (آیت کا) جواب
 تو یہ ہے کہ عید الفطر کی نماز میں تکبیر کہی جاتی ہے، اور آیت میں اگر امر کے معنی مان بھی لئے
 جاتیں تو اس میں مطلق تکبیر کا ذکر ہے جو تکبیر صلوٰۃ و تکبیر طریق دونوں کو عام ہے، پس اس
 میں تکبیر متنازع فیہ (یعنی تکبیر طریق) پر دلالت نہیں، کیونکہ ممکن ہے کہ اس میں نماز کی تکبیر
 مراد ہو،

اور حدیث کا جواب یہ ہے کہ وہ ضعیف ہے، کیونکہ اس کے راوی موسیٰ بن محمد

اس عبارت میں قائل کے اس قول کا جواب ہو گیا کہ خدا کا نام لے کر اور تکبیر کہنا بھی کہیں بدعت ہو سکتا ہے، جواب
 یہ کہ نفس تکبیر سے منع نہیں کیا جاتا، نہ وہ فی نفسہ بدعت ہے بلکہ جہر اور اجتماع و التزام سے منع کیا جاتا ہے، کیونکہ یہ بدعت ہے، ۱۳ منہ

بن عطاء ابو ظاہر مرقسی ثقفی نہیں ہیں، نیز حدیث میں اس کا کچھ ذکر نہیں کہ آپؐ جہر کرتے تھے حالانکہ اسی میں ہے، اسی طرح حاکم نے بھی (اس کو) مرفوعاً روایت کیا ہے، اس میں بھی جہر کا نہیں، ہاں دارقطنی نے نافع سے روایت کی ہے جو ابن عمرؓ پر موقوف ہے، کہ وہ جب یوم الفطر و یوم الاضحیٰ میں گھر سے جاتے تھے تو جہر کے ساتھ تکبیر کہتے تھے، عید گاہ پہنچنے تک، پھر تکبیر کہتے تھے امام کے آنے تک، یہی نے کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ ابن عمرؓ پر موقوف ہے، اور صحابی کا قول آیت قطیۃ الدلالة یعنی ارشاد خداوندی وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً وَدُؤُنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ کے... عموم کا معارض نہیں ہو سکتا، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بہترین ذکر ذکر خفی ہے، اہم اس سے ہر نصف سمجھ سکتا ہے کہ باوجودیکہ یوم الفطر میں راستہ میں تکبیر یا جہر کے لئے صحابی کا قول دلیل ہو سکتا ہے، اور حدیث مرفوعہ ضعیف سے بھی کچھ سہارا مل سکتا ہے، اور اس کو عید الاضحیٰ کے ساتھ مشابہت بھی بہت کچھ حاصل ہے، مگر پھر بھی امام صاحب یوم الفطر میں جہر بالتکبیر کے قائل نہیں ہوئے، اور یہ فرمایا کہ آیت قطعی کے عموم سے ہر ذکر اور ثناء میں اخفاء کا امر معلوم ہوتا ہے، پس جب تک کسی قوی دلیل سے کسی موقع پر جہر ثابت نہ ہو گا وہاں جہر نہ کیا جائے گا، اور دلائل مذکورہ اس کے لئے ضعیف ہیں، پھر پانچوں نمازوں کے بعد تین بار نعرۃ تکبیر اللہ اکبر کی جس شخص نے تعلیم دی ہے کیا اس کے پاس اس کی سند میں کوئی حدیث ضعیف مرفوعہ ہے، یا کسی صحابی کا فعل ہے؟ یا وہ عید الاضحیٰ کے ساتھ مشابہت کسی طرح ثابت کر سکتا ہے ہرگز نہیں، پھر اس کو تکبیر استثنائین پر قیاس کرتے ہوئے اور ایک بدعت کو دین میں رائج کرتے ہوئے خوف خدا کرنا چاہتے، شاید کسی کو فتح القدر کی اس عبارت سے دھوکہ ہو دے کہ ابو جعفر لا یبغی ان تمنع العامة عن ذلک یعنی الجہر بالتکبیر فی یوم الفطر (۱۲) لقلة رغبتهم فی الخیرات، سو سمجھ لینا چاہئے کہ ابو جعفر کا یہ قول اس بناء پر ہے کہ تکبیر یوم الفطر میں صاحبین کا قول موجود ہے تو مسئلہ مختلف فیہا ہو گیا، باقی صورت مسئلہ میں تو کسی امام کا بھی قول نہیں بلکہ سب اس کو بدعت کہتے ہیں، اس سے ضرور منع کیا جاوے گا، واللہ اعلم،

۳۰ رجادی الاولیٰ سنہ ۱۲۸۵ھ

فرض نمازوں کے بعد سوال (۲)
 اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ الْخَيْرُ مِنْهَا بحساب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

سے ہر نماز کے بعد یعنی جن نمازوں کے بعد سنن و نوافل نہ ہوں مثلاً فجر اور عصر کے اور جن نماز مفروضہ کے بعد سنن و نوافل ہوں مثل ظہر اور مغرب اور عشاء کے بعد اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ و منک السلام الخ فرماتا ثابت ہے یا نہیں، بیٹنوا تو جروا؟

الجواب؛ عن عائشة ر قالت کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا سلم لم یقعد الا مقدرا ما یقول اللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ و منک السلام تبارکت اذ الجلال والاکرام، و فی روایۃ ابن نمیر یاذا الجلال والاکرام، اخرجہ مسلم ص ۲۱۱ عن ثوبان قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا انصرف من صلاته استغفر ثلاثا و قال اللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ و منک السلام تبارکت اذ الجلال والاکرام، قال الولید فقلت للاوزاعی کیف الاستغفار قال استغفر اللّٰهُ استغفر اللّٰهُ، رواہ مسلم ص ۲۱۸ ج ۲

ان احادیث کے عموم سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا ہر نماز کے بعد پڑھا کرتے تھے، لیکن جس قدر الفاظ حدیث میں وارد ہیں یہی پڑھنا سنت ہے، بعض لوگوں نے اس پر اور الفاظ زیادہ کر لیے ہیں، وہ سنت میں داخل نہیں، واللہ اعلم
 ۲۲ رمضان سنہ ۱۲۸۸ھ

فرض نمازوں کے بعد سوال (۵) درمیان فرض و سنت دعا برفع یدین بفصل قلیل
 ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا در دیار از زمانہ قدیم مروج است، پس حالا بعضے اس دعا کو مکروہ و ممنوع شمر دے دی فرمایند کہ ثبوت اس دعا برفع یدین از بیچ کتاب یافتہ نشرہ محض الفاظ اللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ الخ بفاصلہ اندک بلا رفع یدین خواندہ بادا سے سنت قیام نمایند در بارہ نیز ثبوت رفع یدین یا عدم آن بسند کتب بر نگارند، کہ نزاع رفع شود،

الجواب؛ قال فی الحصن فی آداب الدعا منها الصلوۃ عن حب مس و بسط الیدین ت مس و رفعہما مع ۱۵ ص ۲۳، اس سے معلوم ہوا کہ نماز کے بعد دعا مستحب ہے، اور بسط و رفع یدین مطلقاً آداب دعا سے ہے، واللہ اعلم،
 ۲ جمادی الثانیہ ۱۲۸۸ھ

صلوٰۃ خمسہ کے بعد ذکر بالجہر | سوال ۱۰ | بچکانہ فرض نماز کی مناجات میں اے اے بھرا اللہ انت کا التزام درست ہی یا نہیں؟ السلام و منک السلام یا ذا الجلال والاكرام تک کہتے ہیں اور مقتدی لوگ سمعنا و اطعنا، الیک المصیر بالجہر کہہ کر مناجات ختم کر دیتی ہیں، کچھ قباحت ہے؟ اس سربز پر مداومت میں کچھ حرج ہے؟

الجواب؛ بدعت ہے، بلکہ سب اہستہ کہیں، اور اس پر مداومت بالجہر کرنا بھی بدعت ہے،

دلیلہ ما نقلہ اسلامۃ عبدالحی فی فتاویٰ عن المدخل و لیسن را جمیعاً من الجہر بالذکر والدعاء عند الفراغ من الصلوٰۃ ان ثان فی جماعۃ فان ذلك من البدع ام وعن نصاب الاحتساب اذا کبر و اعلى اثر الصلوٰۃ جہر ایکرہ و انه بدعة یعنی سوی ایام النحر و التشریق ام، و این قسم عبارت حقیقہ بسیار است، التوصل ذکر جہری بعد نماز سوائے ایام تشریق اگر احیاناً باشد مضائقہ نیست بشرطیکہ جہر مفطر نباشد و بچپنیں اگر مقصود از جہر تعلیم باشد و بدون اس غرض التزام و اہتمام آن کردن چنانکہ در سوال مذکور است خلاف طریقہ نبویہ و طریق سلف صالح است، واللہ اعلم، انتہی کلامہ ملخصاً رص ۲۲۳ ج ۲ مع الخلاصۃ

۱۰ صفر ۱۳۵۴ھ از خانقاہ اشرفیہ، تھانہ بھون

جس درود میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم | سوال (۴) | یہ دو درود شریف مندرجہ ذیل میں ایک کو نذر ہوا اور آپ کو نور ذاتی کہا گیا ہو پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ مولانا صاحب اپنے مریدوں کو تعلیم دیتے ہیں اور

ہمیں شبہ ہے کہ اس مضمون کے درود شریف پڑھنا اور پڑھانا جس میں استمداد اور اسد راک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوں اور جس میں نور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نور ذاتی قرار دیتے ہوں (اور ہم نور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نور مخلوق جانتے ہیں) جائز ہے یا نہیں؟ آپ از روئے شرع شریف، دلیل روشن سے لکھ جواب فرما کر حق سے آگاہ کریں، اور میں اس کو چھپوا کر شائع کر دوں، تاکہ سب مسلمان بھائی اس غلطی سے محفوظ رہیں، بنوا تو جبروا،

درود اول الصلوٰۃ والسلام علیک یا سید منی یا رسول اللہ خنی پیدی منی قلت
حیلتی ادرکنی،

درود ثانی: اللھم صل علی سیدنا محمد بن النور الذی اتی والسر الساری
فی سائر الالسناء والصفات،

الجواب: درود اول میں حضور کو ندا ہے، اگر اعفاد ہے کہ حضور ندا کو
سنتے ہیں، با قصد پڑھنے والے کا ندا ہی ہے، تو یہ درود پڑھنا بدعت ہے اور حرام ہے،
اور اگر یہ قصد نہیں اور یہ اعتقاد نہیں، تو ان سے پوچھا جائے کہ اس ندا سے ان کا کیا قصد
ہے، اور مریدوں کو کس قصد کی تعلیم کرتے ہیں، اس کے بعد جواب دیا جائے گا،
اور دوسرا درود جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نور ذاتی کہا گیا ہے اس میں اگر یہ
مراد ہے کہ حضور کا نور حق تعالیٰ نور کذات کا بڑا ہے تب تو یہ بھی حرام بلکہ موجب کفر ہے،
اور اگر نور ذاتی سے مراد یہ ہے کہ حضور دیگر مخلوق کے اعتبار سے نور میں اسل ہیں، اور سب
لوگ آپ سے نور کا استفادہ کرتے ہیں، جیسے شمس کے نور کو باعتبار قمر و نجوم کے نور ذاتی کہہ دیا کرتے
ہیں، اور فی نفسہ آپ کے نور کو مطلقاً نور ذاتی نہیں اعتقاد کرتے، بلکہ حق تعالیٰ کا مخلوق جانتے
ہیں تو اس صورت میں کفر تو نہ ہوگا، مگر ایہام کی وجہ سے ناجائز جب بھی ہوگا، ودلائل
ذلک فی المطولات مذکورہ وفی کتب اہل الحق مسطورہ وعند العلماء مشہورہ،

۱۲ ربيع الاول ۱۲۵۵ھ

بلا وضو فاتحہ خوانی اور قبروں پر (سوال) (۸)
ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کا حکم، بزرگان دین کی قبروں پر فاتحہ پڑھنا بلا وضو جائز

ہے یا نہیں، اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا چاہئے یا نہیں؟
علا بعد نماز سنت و نفل بھی دعا ہاتھ اٹھا کر مانگنا چاہئے یا صرف بعد فرض ہی دعا،
ضروری ہے،

علا نظر کی پہلی سنت اگر چھوٹ جاتے تو اس کا پڑھنا ضروری ہے یا نہیں اور ادا کا وقت
کب تک ہے؟

الجواب: فاتحہ سے مراد غالباً سورتیں پڑھ کر ثواب پہونچانا ہے تو بلا وضو قرآن کا
پڑھنا جائز ہے، جبکہ جنابت نہ ہو، اور قبروں کے سامنے ہاتھ اٹھا کر دعا نہ کی جائے،

ہاں قبر کی طرف پشت کر کے یا رانیں بائیں الگ ہو کر قبلہ کی طرف منہ کر کے ہاتھ اٹھا کر دعا کر سکتے ہیں، جبکہ سامنے اور کوئی قبر نہ ہو، قال ابن تیمیہ فی اقتضاء الصراط المستقیم واتفق الائمۃ علی انه اذا دعا بسجد النبی صلی اللہ علیہ وسلم لایستقبل قبرہ وتنازعوا عند السلام علیہ فقال مالک وأحمد وغيرهما یستقبل قبرہ ویسلم علیہ وهو الذی ذکرہ اصحاب المشافعی والحنہ منصور عنہ وقال ابو حنیفہ بل یتقبل القبلة ویسلم علیہ کذا فی کذب اصحابہ الی ان قال فانہ انما یرخص فیما اذا سلم علیہ ثم اراد الدعاء ان یدعو مستقبل القبلة اما مستدبر القبور او منحرفا عنہ ولایدعو مستقبل القبور (ص ۱۸۸ ج ۱) قلت واذا کان هذا حال الدعاء عند افضل القبور فما بال رفع الیدین عند غیرہ مستقبلا لہ ؟ فرض نمازوں کے بعد دعا مانگنا آکر ہے، کیوں؟ حدیثوں میں اس کی ترغیب زیادہ ہے، باقی سنن و نوافل کے بعد دعا مانگنا ضروری نہیں اگر مانگ لیا کرے تو اچھا ہے،

۳۔ ظہر کی سنت قبلہ چھوٹ جائیں تو بعد فرض کے وقت ظہر کے اندر اندر اس کو پڑھ لینا چاہئے، وقت کے بعد نہیں، فقط

۲، ج ۱، ص ۲۵

بعض ایقاظ نامتین بآواز بلند | سوال (۹) اس ملک میں وعظ کی مجلسیں اکثر رات کو ہوا درود پڑھوانے کا حکم، کرتی ہیں، دن میں بہت کم اور سامعین سب کے سب محض عوام ہی ہوتے ہیں، بغرض تنبیہ و ایقاظ حاضرین واعظ لوگ زور شور سے درود شریف پڑھتے ہیں، اور پڑھواتے ہیں، ورنہ عوام لوگ بیٹھے بیٹھے اوتکھا کرتے ہیں۔ اس بات کو بعض علما شدت سے منع کرتے ہیں، اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے منع کرنا بطریق استدلال کرنے ہیں، باوجودیکہ ردالمحتار میں اس کی تاویل بھی موجود ہے، یعنی حضرت عمرؓ کا منع فرمانا کوئی مصلحت سے ہو سکتا ہے، مثلاً وہ ذکر باجمہر مسجد میں ہو جہاں مختلف اشخاص ذکر میں مشغول رہتے ہیں تو ذکر باجمہر سے اور لوگوں کو نقصان پہونچے گا، کیا یہ تاویل صحیح ہے، یا ویسا درود باجمہر پڑھنا ممنوعات شرعیہ میں سے ہے؟

الجواب: ان واعظوں کا زور شور سے درود پڑھنا دو وجہ سے ممنوع ہے، ایک

یہ کہ انھوں نے درود شریف کو ایفاظ نامہ بن کر ذکر کیا اور ذکر کو ذریعہ ایفاظ بنانا مشہور
مکروہ ہے، اسی لئے فقہاء نے حارس کے ذکر کو لا الہ الا اللہ کو سختی سے منع کیا ہے، کہ وہ بھی ذکر اللہ
کو ایفاظ کا ذریعہ بناتا ہے، دوسری بوجہ صیاح فی المسجد کے کہ یہ لوگ مسجد میں بہت زور کے
ساتھ چیخے ہیں، اور ذکر جو مسجد میں جائز ہے وہ وہ ہے کہ حد صیاح میں داخل نہ ہو، اس لئے
اذان داخل مسجد مکروہ ہے، کہ اس میں صیاح ہے، اور اذان جمعہ ثانی جائز ہے کہ اس میں صیاح
نہیں ہوتا بلکہ مثل اقامت کے خفض صوت سے ہوتی ہے، واللہ اعلم، قال فی العالمگیریۃ
وان سبح الفقاعی اوصلی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن فتم فقاعہ علی
فسد ترویجہ وتحیینہ اذ الفصا ص اذ افسد بھما کوئی ہتکابہ اثم ام (ص ۲۶۱)
ملفوظ تعویذ کو پاخانہ وغیرہ میں سوال (۱۱) تعویذ آیات قرآنی کے یا اسمائے حسنی کے اگر موم جامہ
سٹا لہا نادرست ہے یا نہیں؟ اور کپڑے وغیرہ میں پیٹ کر پاخانہ پیشاب یا جنب وغیرہ کی حالت
میں علیحدہ نہ کئے جاویں تو کچھ حرج ہے یا نہیں؟ ایسا سُننا ہے کہ موم جامہ کیا ہوا تعویذ پاخانہ
وغیرہ میں لے جانے سے کچھ حرج نہیں ہے، کیا یہ صحیح ہے؟

ع۔ اگر پاخانہ میں علیحدہ کر دیا جائے تو کیا پیشاب کرتے وقت بھی علیحدہ کر دینا

چاہیے، یا ہٹانے کی حاجت کے وقت، کیا کیا جاوے؟

الجواب ع۔ موم جامہ ہو یا کوئی کپڑا ہو جب تعویذات کو کپڑے میں پیٹ لیا گیا
تو اب اس کو بیت الخلاء میں یا بحالت بول و جنابت ساتھ رکھ سکتے ہیں قال فی نور الایمان
ویکر الدخول للخلاء ومعہ شیء مکتوب فیہ اسم اللہ او قرآن ام، قال
الطحطاوی علی حاشیتہ ثم محل الکراہۃ ان لم یکن مستورا فان کان فی جیبہ
فم لا بأس بہ وفی القہستانی عن النیۃ الا نسل ان لا یدخل وفی کہ مصحف
الا اذا انطروا نرجوان لا یأثم بلا اضلار اراہ واقعہ السوری وفی الحلبي الخاتم
المکتوب فیہ شیء من ذلك اذا جعل فص خاتمہ الی باطن کفہ قیل لا یکرہ
والتحرز اولی ام (ص ۳۳)

ع۔ اور پر حکم عام لکھ دیا گیا،

کافر کو تعویذ دینا کیسا ہے سوال (۱۱) ہندو و مشرک کافر کو تعویذات آیات قرآنی وغیرہ کے
دے سکتے ہیں یا نہیں؟

البتوا ب، اگر یہ ایسا ہی ہو، اور تعویذ کے مانع پر ایک دوسرا کاغذ سادہ زائد لپیٹ دیا جائے تاکہ قرآن کی آیت کے کاغذ کو مشرک کا ہاتھ نہ لگے، تو جائز ہے، اور بہتر یہ ہے کہ کفار کو آیات قرآنیہ کا تعویذ بالکل نہ دیا جائے،

تحقیق ذکر الجہر [ص ۱۱۱، ۱۱۲] ہر ایک طرف میں ایک کڑوا ایک پیرہہ مرید ہوا، پیر اور مرید سب کے سب ایسے طریقہ پر ذکر کرتے ہیں کہ کرتے کرتے ناچنا شروع کر دیتے ہیں، اور سر گھلنے گھمانے بیہوش ہو جاتے ہیں، اور سب لوگ کہتے ہیں کہ یہ ذکر جمل ہے،

اب عرض کرتا ہوں کہ اس صورت پر ذکر کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں، اور ذکر جمل کی حد کیا ہے، کونسی صورت پر کرنے سے جائز ہوگا اور کونسی صورت پر ناجائز ہوگا ہے؟ اس مسئلہ کا مع دلیل جواب کا خواستگار ہوں۔

البتوا ب، فی الاقوال ج ۱ ص ۱۱۲ قال النبی ان الاخفاء افسس حیث خاف، الریاء او قاذی المسلمین او ینام بجہر، والجہر افسس فی فیو ذلک لان العمل فیہ اکثر ولان قاضیہ تنعسی الی الساعین ولانہ یوقظ قلب القاری ویجسم ھمہ الی الفکر ویصرف سمعہ الیہ ویطرد النواذیر فی النشاط ویدل علی ھذا الجمیع حدیث ابی داؤد۔ یسند صحیح عن ابی سعید اعتکف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی المسجد فسمعہم یجھرون بالقراءة فکشف، الستور قال ان کلکم مناج ربہ فلا یؤذین بعضکم بعضا ولا یرفع بعضہم علی بعض فی القراءة وقال بعضهم یتحب الجہر ببعض القراءة والاسرار یجھرون فی فیان بالبد، والیامر قد یکل فیترج باناس اراھ و فی السحیحین عن عائشہ رضی اللہ عنہا یصلوا بایات ولا تنبت بها الا یہ فی الدعاء وقد صح عنہ صلی اللہ علیہ وسلم اربعوا علی انفسکم عند یث اخرجہ الخمسة الا الناس،

پس ذکر جہر اس حد تک جائز ہے کہ اس سے سونے والوں اور نمازیوں کو تکلیف نہ ہو اور نہ خود اپنے آپ کو تعب ہو اور نہ ریا کا خوف ہو، اور اگر قسیر ریا نہ ہو محض دوسرے ریا کا آنا ہو، تو وہ ریا نہیں ہے، اس کی پرواہ نہ چاہئے، خلاصہ یہ کہ ذکر جہر کے لئے حد یہ ہے کہ جس سے نہ اپنے کو ایذا ہو نہ دوسروں کو ایذا ہو، اور اگر کسی نے ذکر جہر تو شروع کیا

حد کے اندر پھر بے اختیار بالقصد کسی کیفیت یا حالت کے غلبہ سے تجاوز عن الحد ہو گیا تو اس شخص پر ملامت نہیں، فان الامور الغير الاختيارية خارجة عن التكليف كما لا يخفى،

احقر عبد الکرم عفی عنہ

الترجمہ استقام کے ساتھ نماز کے سوال (۱۳) تذکرۃ الغوثیہ مع تذکرۃ البخاری ص ۲۲۲ اور بعد ذکر جہر بدعت ہے۔ ارشاد الطالبین صفحہ ۲۲۶ مطبوعہ لاہور میں لکھا ہے کہ:

قال النبی سلم من یجهر بکلمة الطیبة بعد اداء الصلوة المكتوبة متصلاً ثلاثاً الخ قال ابو حنیفة کلمة الطیبة بعد اداء الصلوة المكتوبة فسننه و قد کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم مع اصحابه یجهر بکلمة الطیبة الخ کذا ذکر فی نوادر البرہانی، ان حدیثوں کے مطابق بعد نماز فریضہ کے اور قبل سنت مؤکدہ کے غلبہ جہر کر کے پڑھنا درست ہے یا نہیں، اور یہ حدیث مندرجہ بالا صحیح ہے یا نہیں اور اس کا کیا فتویٰ ہوگا؟

الجواب: فی المدخل ولیحذر واجمعاً من الجهر بالذکر والدعاء عند الفراغ من الصلاة ان کان فی جماعة فان ذلك من البدع (فتاویٰ عبد الحی مع الخلاصة، ص ۲۳۳ ج ۲) وفي فتح الباری تحت رواية ابن عباس ان رفع الصوت بالذکر حين ينصرف الناس کان علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الحدیث قال الطبرانی فیہ الابانة عن صحة ما کان یفعل بعض الامراء من التكبير عقب الصلوة وتعقبه ابن بطلان بانه لم یفعل علی ذلك عن احد من السلف الا ما حکاه ابن جیب فی الراضعة انهم كانوا يستجرون التكبير فی العشاء عقب الصبح والعشاء تکبیراً عالياً ثلاثاً قال وهو قدیم من شان الناس قال ابن بطلان وفي العتبية عن مالک ان ذلك محدث ام رص ۶۹ وفي العدة للعینی ص ۱۹۲ وعن عبیدة انه بدعة وفي العدة ایسا وقال ابن بطلان اصحاب المذاهب المتبعة وغيرهم متفقون علی عدم استحباب رفع الصوت بالتکبير والذکر حاشا ابن حزم (صفحہ بالا) وقال النوری حمل الشافعی هذا الحدیث (ای حدیث ابن عباس المذكور) علی انهم جہروا به وقتاً سیراً

لاجل التعليم صفته الذکر انہم داوموا علی الجہر بہ والمختاران الامام والمأموم
بغفیان الذکر الا ان احتیج الی التعليم رفعت الباری ص ۲۶۹ جلد ۲،

ان عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ التزام و اہتمام کے ساتھ نماز کے بعد ذکر چہرہ بدعت
ہے، اور روایت مندرجہ سوال کی تحقیق نہیں کہ کیسی ہے، بر تقدیر ثبوت صورت تعلیم وغیرہ
پر محمول کی جاوے گی، مانند روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما،

جو شخص جماعت سے نماز پڑھ کر سوال (۱۲) ایک شخص نماز باجماعت پڑھ کر بلا دعاء مانگے
بلا دعاء مانگے پہلے چلا جاتے امام سے پہلے چلا جاتا ہے اس کے واسطے کیا حکم ہے، جبکہ
تو اس کے لئے کیا حکم ہے وہ اپنی علیحدہ دعاء مانگتا ہے،

الجواب؛ اگر کسی شخص کو سخت ضرورت ہو تو وہ امام سے پہلے دعاء مانگ کر
جا سکتا ہے، اگر ضرورت نہ ہو تو بلا وجہ امام سے پہلے دعاء مانگ کر چلا جانا مکروہ ہے کہ اس میں
صورت مخالفت جماعت ہے، جس سے ضغینہ و حسد پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، فقد اخرج
ابوداؤد عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم حثہم علی الصلوٰۃ ونہاہم
ان ینصرفوا قبل ان یرافہ من الصلوٰۃ بسند جید (ص ۲۱۹ ج ۱ جواہر نفی)
قلت وحملہ بعضهم علی النفی عن الانصراف من المسجد کما فی بذل المجہود
عن المرقاۃ (ص ۳۲۹ ج ۱) ان اگر امام بہت لمبی دعائیں کرتا ہو جیسا کہ جاہل الامور کی
عادت ہے تو بہت مقتدیوں کو سب کو یا ایک کو اس سے پہلے دعاء ختم کر کے چلا جانا جائز
ہے، اس صورت میں تطویل کی ملامت امام پر ہے، قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من کان منکم
امامًا فلیخفف الصلوٰۃ ومن صلی لنفسہ فلیطول ما شاء متفق علیہ والدعاء اولیٰ بذلک الحکم
فانہ من تواج الصلوٰۃ، واللہ اعلم،

۱۲ صفر ۱۲۲۲ھ

اسم ذات کی قرأت کی تحقیق اگر ذکر میں لفظ اللہ کی ہا بالکل حذف ہو گئی تب بھی

وہ ذکر اسم ذات شمار ہوگا، خصوصاً جب کہ تکلف سے حضور قلب میں فرق آتا ہو، البتہ
قصداً حذف بھی نہ کیا جاوے کہ حذف اس کا خطا ہے، فی الدرر والقسم باللہ تعالیٰ
ولو یرفع الہاء او نصبھا او حذفتھا کما یستعملہ الاثرک وقال الشامی تحت رقلہ
او حذفتھا قال فی المجتبى ولو قال واندہ بغیرھا کعادة الشطار فیمین قلت فعلی

هذا ما يستعمله الاتراك بالله بغير هاء يمين العتاهم وهكذا نقله عنه في البحرو
 عل احد الواضعين بغير هاء وبالواو لا بالهمزة اى بغير الف التى هى الحرف الهاء
 تأمل ثم رايته كذلك فى الوهبانية وقال ابن الشحنة فى شرحها المراد بالهاء
 الالف بين الهاء واللام فاذا حذفها العالف او الذابح او الداخل فى الصلوة قيل
 لا يضر لانه سمع حذفها فى لغة العرب وقيل يضر (ص ۶، ج ۳) وفى الطحاوى
 على مرقى الفلام ص ۱۳۰ قوله الثالث عشر ان لا يحذف الهاء من الجلالة
 قال فى الشرح المذكور وعن ترك هاء والمراد بالهاء الالف الناشئ بالمد الذى
 فى اللام الثانية من الجلالة فاذا حذفه العالف او الذابح او المكبر للصلوة
 او حذف الهاء من الجلالة اختلف فى انعقاد يمينه وحل ذبيحته وصحته
 تحريره فلا يترك ذلك احتياطاً وفيه ايضا ص ۱۶۳ وان كان فى وسطه حتى
 صار اكبار فقل تفسد صلواته لانه جمع كبير وهو طبل ذو وجه واحد واسم
 من اسماء اولاد الشيطان وفى القنية لا تفسد لانه اشياء وهولغة قوم متبعين
 الزيلعى بانه لا يجوز الا فى شعر ولو فعله المؤذن لا تجب الاعادة لان
 امر الاذان اوسع كذا فى السراج وان تعدى يكفى اى مع قصد المعنى والا لا
 ويستغفر ويتوب مضمرات ام قلت فظاهر ان امر الذکر اوسع من امر الاذان
 والله اعلم ، كتبه الاحقر عبد الكريم عفى عنه ، ۸ محرم سنة ۱۳۲۲ هـ

میری رائے اس تحریر کے موافق ہے ، صحیح ، الجواب صحیح

لطف رسول عفى عنه ظفر احمد عفا عنه رضی اللہ عنہ

۹ محرم سنہ ۱۳۲۲ م ۹ محرم سنہ ۱۳۲۲ م ۹ محرم سنہ ۱۳۲۲ م

اضافہ ؛ قال الشامي تحت قوله والمستحب ان يقول بسم الله باظهار الهاء
 فان لم يظهرها وقصد ذكر الله يحل وان لم يقصد وقصد ترك الهاء لا يحل
 اتقلى عن الخلاصة (ص ۲۹۲ ج ۵) احقر عبد الكريم عفى عنه
 ۲۹ ج ۲ سنہ ۱۳۲۵ م

سوال (۱۶) ہمارے قصبہ میں علماء کے اندر مسئلہ ذیل لے کر ایک
 اذان خطبہ جمعہ کے بعد بڑا جلسہ ہو گیا، بس کچھ طے نہ ہو سکا، لہذا سب اہل جلسہ مل کر آپ کے
 دعار مکروہ ہے ؟؟؟

تحریر پر اکتفاء کیا، یعنی جو کچھ حضور تحریر فرماویں، اسی پر فیصلہ ہوگا، لہذا امید قوی ہے کہ کتاب کا حوالہ دے کر مسئلہ ذیل کا جواب فرما کر ہمارے شور و غل کا فیصلہ فرما دیں، یعنی جمعہ کے روز خطبہ سے پہلے جو اذان ثانی ہوتی ہو اُس اذان کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا جائز ہی یا نہیں یعنی بعد اذان ثانی کے رفع یدین جائز ہے یا ناجائز؟ فقط والسلام

الجواب؛ قال فی المہدایۃ اذا خرج الامام یوم الجمعة ترک الناس الصلوة والكلام حتی یفرغ من خطبۃ وقال لا یاس بالکلام اذا خرج الامام قبل ان یخطب واذا نزل قبل ان یکبر اھ قولہما قبل ان یخطب بدن علی کراہۃ الكل عند ہم جمیعاً بعد الشرع فی الخطبۃ، خطبہ کے وقت جو اذان ہوتی ہے اس کے بعد امام معاً خطبہ شروع کر دیتا ہے، اور اس کو سنت کے موافق ایسا ہی کرنا چاہیے، اس لئے اذان کے بعد دعا کرنا اور رفع یدین کرنا دونوں مکروہ ہیں، اس سے احتراز کرنا چاہیے، واللہ اعلم،

۲۵ رجب ۱۴۲۶ھ

دفع طاعون کے لئے "لی خمسۃ اطلق ہا الخ" سوال (۱۴)..... طاعون کی دعا، لی خمسۃ بڑھنا یا بطور تعویذ لکھنا جائز ہے یا نہیں؟
اُطْفِئْ بِہَا حَسْرَ الْوَبَاِ الْخَاطِمَ وَالْمُصْطَفِیَّ وَالْمُرْتَضٰی وَابْنَ اَبْنٰی وَالْفَاطِمَہُ، کارواج مختلف طرق سے ہے، بعض لکھ کر دروازہ پر سپاں کر دینے ہیں، اور بعض جگہ روا ہے کہ محلے کے چاروں طرف بانس کھڑے کر دیتے ہیں، اور یہ دعا لکھ کر کپڑے وغیرہ پر بانس میں باندھ دیتے ہیں، تاکہ طاعون نہ آوے، آیا یہ دعا بڑھنی جائز ہے یا نہیں، اور لکھ کر اس طرز خاص پر شرعاً جائز ہے یا ناجائز، اور بعض لوگ اللہم بڑھا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب شرعاً جائز ہے، اور بغیر اللہم کے ناجائز، ان کا قول صحیح ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا،

الجواب؛ یہ دعا نہیں ہے بلکہ تعویذ ہے عملیات کی قسم ہے، پس اگر اس کو دعا و ثواب سمجھ کر بڑھا جاوے یا لکھا جاوے تو بدعت ہے اور محض تعویذ سمجھ کر لکھیں تو جائز ہے، خواہ بازو پر باندھیں یا بانس یا گھر پر، اور اللہم بڑھانا اور نہ بڑھانا..... دونوں برابر ہیں، اگر تعویذ کے طور پر استعمال کریں تو دونوں طرح جائز ہے ورنہ جائز نہیں، کیونکہ اللہم بڑھانے سے اس میں معنی دینا کے پیدا نہیں ہوتے، ۵ اشوال ۱۴۲۶ھ

سوال (۱۸) تراویح میں عادت یہ ہے کہ تمام تراویح پڑھ کر آخر میں نماز تراویح کے آخر میں اور ہر ترویجہ میں دعا مانگنا کیسا؟ دعا مانگتے ہیں، اور بعض جگہ ہر ترویجہ پر دعا مانگتے ہیں، اور دوسویں رکعت پر بھی دعا مانگتے ہیں، اس میں مسنون طریقہ کیا ہے، آیا آخر میں دعا کرنی چاہئے یا ہر ترویجہ پر، ہر ترویجہ پر دعا مانگنا مکروہ تو نہیں؟ بحوالہ کتب معلوم فرمادیں،

الجواب: تراویح کے بعد دعا کرنا احادیث سے صراحتاً تو ثابت نہیں، ہاں عام طور پر نماز کے بعد دعا کا مستحب ہونا احادیث سے مفہوم ہوتا ہے، اس عموم میں تراویح بھی داخل ہے، لیکن ہر ترویجہ پر دعا مانگنا سامعین و مقتدین پر ثقل کا موجب ہے، اور فقہاء نے تراویح میں سہولت علی القوم کا لحاظ فرمایا ہے، اسی لئے نماز میں امام کو اجازت دی ہے کہ اگر ثناء وادعیہ دور و در سے قوم پر ثقل ہو تو اس میں اختصار کر دے، پھر جو امر خارج صلوٰۃ موجب ثقل ہو اس کا حذف کرنا بدرجہ اولیٰ مناسب ہے، اس لئے ہر ترویجہ پر دعا نہ کی جائے، بلکہ حتم تراویح پر قبل از وتر دعا کرے، یہی ہمارے اکابر کا معمول ہے، اور قبل از وتر غالباً اس لئے اختیار کیا گیا کہ وتر کی افضلیت اول اللیل و آخر اللیل حنفیہ میں مختلف فیہ ہے، تو شاید کوئی مقتدی آخر رات میں وتر پڑھے، اور اس لئے آخر وتر پر حاضر نہ رہے تو قبل از وتر میں تمام جماعت کی رعایت ہے، واللہ اعلم، ۵۱ سوال ۱۸

سوال (۱۸) احمدی لوگوں کا اعتقاد ہے کہ کوئی قرآنی آیت بڑا شفاء ہوئے پر شبہ کا جواب، جسمانی نہیں اتری ہے، یہ تعویذ جو کہ مولوی لوگ لکھ کر برائے شفاء

جسمانی دیتے ہیں یہ شرک ہی جو آیت کہ اس میں شفاء کا لفظ و تنزل من الخ ہے، اس شفاء سے مراد شفاء روحانی ہے نہ کہ جسمانی، ایک دو حدیث بھی حوالہ میں پیش کر رہے ہیں کہ اس کی رو سے جسمانی شفاء منح ہے، وہ حدیثیں یاد نہیں ہیں، روحانی اور جسمانی کی دلائل تحریر فرمائیں، الجواب: قرآن میں لفظ شفاء عام ہے، اس کو خاص کرنے کے لئے کوئی دلیل چاہئے بدون دلیل کے دعویٰ تخصیص رد ہے،

صحیحین میں صحابہ کا سورۃ فاتحہ سے سانپ کے ڈسے ہوئے کو بھاڑنا پھونکنا ثابت ہے، ابن ماجہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خیر الدوا القرآن، ذکرہ الحافظ ابن القیم فی زاد المعاد و سکت عنہ واجتہ بہ فو حسن او صحیح عنہ، نیز صحیحین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معوذتین کو پڑھ کر اپنے اوپر دم کرنا مذکور ہے،

اور معوذتین کا نزول ہی اس واقعہ میں ہوا ہے جبکہ حضور پر ایک یہودی نے اور اس کی بیٹیوں نے سحر کیا تھا، پھر آپ نے ان کو پڑھا، تو سحر دفع ہو گیا، زاد المعاد میں اس کا بھی ذکر ہے و فی البخاری عن عائشة رضی اللہ عنہا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا اشتکی یقرأ علی نفسه بالمعوذات وینفث الخ ص ۵۰، ج ۲

۶ ذیحہ ۱۳۸۶ھ

سوال (۲۰) دریں دیار برائے حصار و بائے خو خوار بڑے بچندہ برائے دفع و باء وغیرہ می خرنند بطریقے از طرق مخصوصہ مذمومہ عیاذ باللہ کہ در رسالہ حکمت افلاطون مصنفہ مولوی محمد حمید الرحمن بنگالی چانگامی سائیکالوسی نوشتہ ذبح سازند و گوشتہا بحسب چندہ تقسیم نمایند و ہر یکے بخانہ خود بختہ خورند حتی کہ مرین را کہ در بعض مرض گرفتار است خوراند و اعتقاد بریں دارند کہ خورندگانش از بلائے و با محفوظ ماند و این عمل را اصطلاحاً گاؤ قربانی و گاؤ بندگویند و بعض گویند این ترکیب در تفسیر احمدی تحت قصہ ذبح بقرہ موجود است، بینوا تو جبروا،

الجواب، حصار مذکور از بدعات سینہ و حرام است، مسلمانان را ازین احتراز و زید واجب است کما فی الحدیث من احدث فی امرنا هذا مالیس منه فہو ردولان جہلۃ زماننا یعقدون المحصار المذکور مؤثراتاً فی دفع الباء والبلیات و یترمونہ التزام المفروضات والرسالة المہودۃ غیر معتبرۃ فالحد کل الحذر من الامور المحدثۃ المحترقۃ و لیس فی تفسیر من التکذیب هذا التریب فایاکم والافتراء والبهتان والتکذیب،

الجواب صحیح

الجواب صحیح

اشرف علی

ظفر احمد عفاعنہ مقیم خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون

۲ صفر ۱۳۸۶ھ

۲ صفر ۱۳۸۶ھ

سوال (۲۱) ہل الاستغفار بعد الصلوۃ المفروضۃ ممنوع و حرام؟

الجواب، لابل جائز و مستحب اما الاول فبعد فرض الظہر والمغرب والعشاء ان کان دعاء الاستغفار بقدر اللہم انت السلام الخ لان المصلی قد خیر بین الفرض والسنة بالفصل المذكور فید عوفیہ بای دعاء شأ اتفاقاً و فی طول الفصل اختلاف المشائخ فقال الحلوانی لا بأس بالفصل بالادراہ واختارہ الکمال والاكثر علی انه مکروہ ای تنزیہاً بکذا فی فایۃ الاوطار،

واما الثاني فبعد الفجر والعصر لما في الدار المختار ويستحب ان يستغفر ثلاثا
وليقر الآية الكرسي الخ والقول بان الاستغفار بعد الفرض حرام لانها من
الاعمال الحسنة والاستغفار يكون بعد الافعال السيئة من افواه العوام لما
ذكر من جواز الاستغفار بعد الصلوات كلها فرضا كانت او سنة مع انها من
الاعمال الصالحة ولا استعجابه في عين الصلوة كما في العالم الكبير فاذا
فرغ من الصلوة على النبي صلى الله عليه وسلم يستغفر لنفسه ولابويه الخ
ولتعليمه صلعم ابا بكر دعاء الاستغفار ليقر أه في الصلوة اللهم اني ظلمت
نفسى ظلما كثيرا ولا يغفر الذنوب الا انت فاغفر لي مغفرة من عندك
وارحمني انك انت الغفور الرحيم (مشكوة) ولان النبي صلى الله عليه وسلم
كان يستغفر كل يوم مائة مرة مع انه معصوم ولان الاستغفار بعد الصلوة
ليس بتخييل انها من الافعال المذمومة بل بتفكير ان الادعية بعد الصلوة
مقبولة وان القصور وقعت في اركان الصلوة وسننها وادابها فلا دليل على
منع الاستغفار بعد الفرض مطلقا ولا على منع تقديمه على غيره من الدعوات بعد
الصلوة كما ذهب اليه من جعل نفسه من العلماء الثقات،

الجواب صحيح، فوافر عفا عنه ازخافاه امداديه، تخانه بهون ۲۹ رذی ۱۲۸۶

تمتة الجواب، قلت وما حكاة بعض المعترضين على الجواب المذكور عن
رفع اشكال بر جواب تذكور مجالس الابرار ان فيه عن علي رضاه رأى فتوما
يستغفرون بعد المكتوبة فانكر عليهم وقال هل اذنبت ذنبا فتستغفرون
منه الخ فمجالس الابرار ليس عندنا حتى نقف على كلامه وصحيح مراده
وانه هل ذكر له سند ام ذكره بلا سند وبالجملته فان كان ذلك في الكتاب
المذكور باللفظ الذي ذكره المعترضون فهو معارض لما في الصحيح لمسلم عن
ثوبان رضي الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا انصرف من
صلوته استغفر ثلاثا الحديث (ص ۲۱۸ ج ۱) وما في مصنف ابن ابي شيبة بسند
صحيح عن زاذان قال قال حدثني رجل من الانصار قال سمعت رسول الله صلى
الله عليه وسلم يقول في دبر الصلوة اللهم اغفر وتب علي انك انت التواب

الغفور مائة مرة کذا فی کتالعمال (ص ۲۶۶ ج ۱) والحديث الذي لاسنده لا يصلح لمعارضة الصحيح اصلا كيف وقد اجمع العلماء على استحباب الاستغفار بعد الصلوات لم نرفيه خلافا لاحد وان سلمنا صحة الاثر عن علي ورونه خوط القتاد فهو محمول على ما اذا كان بطريق اللزوم والالتزام حتى يجعل كواجب والفرض ويلام على تاركه وج لا شك في وجوب الانكار عليه والله تعالى اعلم حرره الاحقر ظفر احمد عفانه ازرقانه بكون خاتمه امد اديه

۲۰ صفر سنه ۱۳۸۵

اصل الجواب كذا الجواب عن الاعتراض عليه صحيح، نعم لو التزم الجهر او الاجتماع له فهو بدعة ويمكن ان يكون محملا لما في المجالس ان ثبت، اشرف على، ۲۰ صفر سنه ۱۳۸۵

سوال (۲۲) اس وقت باعث تصديقه امر ہے کہ ہماری طویل دعاء مانگنی چاہتے؟ مسجد کے پیش امام حافظ عبدالعزیز صاحب حضرت والا جا کے فرید ہیں، وہ جمعہ کی فرض نماز کے بعد دعاء بہت مختصر کرتے ہیں، اللہم انت السلام الخ پڑھ کر ختم کر دیتے ہیں، بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جمعہ کے فرضوں کے بعد دعاء کسی قدر طویل ہونی چاہئے، حافظ صاحب نے کہا کہ اولاً حضرت مولانا مدظلہم سے استفسار کر لیا جائے اس لئے استدعاء ہے کہ ازراہ لطف و کرم ضرور ایسا فرمائیں کہ دعاء کسی قدر طویل کی جاسکتی ہو یا نہیں، اگر طویل کی جائے تو کس قدر طویل ہو؟

علا نماز ظہر، مغرب، عشاء کے بعد دعاء میں اللہم انت السلام الخ کے درود شریف مثلاً صلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب؛ غالباً حافظ صاحب موصوف کا یہ عمل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ... کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یقعد الا بمقدار ما یقول اللہم انت السلام الخ کی وجہ سے ہے، مگر حضرات فقہاء نے دوسری حدیث کی وجہ سے اس کو تحذیر پر محمول نہیں کیا، بلکہ تقریب پر محمول کیا ہے، ملاحظہ ہو طحاوی حاشیہ مراقی الفلاح (ص ۱۸۱) کیونکہ صحیحین میں مغیرہ بن شعبہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر فرض نماز کے بعد لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملك وله الحمد وهو على كل شيء

قدیر، اللهم لا مانع لما اعطيت ولا معطي لما منعت ولا ينفع ذا الجد منك الجد،
 بھی پڑھا کرتے تھے، اور مسلم میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز
 سے فارغ ہو کر لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملك ولہ الحمد و هو علی
 کل شیء قدیر و لا حول و لا قوۃ الا باللہ العلی العظیم، ولا نعبد الا ایاہ و لا نعقل
 ولہ الشناء الحسن لا الہ الا اللہ مخلصین لہ الدین ولو کذب الکافرون پڑھتے
 تھے، اور یہ سب روایات صحیح ہیں، اس لئے دعاء میں بقدر التلم انت السلام الخ اختصار کرنا
 ضروری نہیں، بلکہ دعاء طویل بھی سنت کے موافق ہوگی، اور ہمارے اکابر جمعہ وعیدین میں نماز
 طور سے دعاء طویل کرتے ہیں، اور طول کی حد یہ ہے کہ مقتدیوں پر گرانی نہ ہو،
 ہر دعاء کے بعد ورد شریف مستحب ہے، قال عمر کل دعاء معلق حتی تصلی علی نبیک
 او كما قال ذکرہ فی الحصن فقط، واللہ اعلم،

۱۴ ربيع الثاني ۱۳۸۴ھ

فرض نمازوں کے بعد مقدم راس پر ہاتھ | سوال (۲۳)
 رکھ کر پڑھی جانے والی دعاء کونسی ہے؟ ... بعد نماز فرض کے جو مقدم راس پر ہاتھ رکھ کر دعاء پڑھتی
 ہیں، وہ کون سی دعاء ہے، اور اس کا پڑھنا کیسا ہے، اور مقدم راس پر ہاتھ رکھ کر کے دعاء
 پڑھنے کا کسی حدیث میں وارد ہے یا نہیں؟ جواب اس کا بحوالہ کتب صحیح عبارت کے ارشاد
 فرمادیں، بینوا تو جروا،

الجواب؛ وہ دعاء یہ ہے بسم اللہ الذی لا الہ الا هو الرحمن الرحیم
 اذهب عني الهم والحزن، اس کو بزار و طبرانی و ابن سنی نے روایت کیا، و لفظ ابن السنی
 اشهد ان لا الہ الا هو الرحمن الرحیم اذهب عني الهم والحزن، قال میرزا و اسنادہ
 ضعیف کذا فی الحصن الحصین وحاشیہ (ص ۱۰)، واللہ تعالیٰ اعلم،
 ۲۰ شعبان ۱۳۸۴ھ

آیات قرآنی اور ادعیہ ماثورہ سے | سوال (۲۴)
 تعویذات اور گنڈے کرنے کا حکم، عرف عام میں جس کو گنڈا کہتے ہیں، یعنی سورہ
 الرحمن چھپک کے لئے جیسا کہ معمولات خاندان عزیز یہ میں مذکور و مشہور ہے، یا اسی طرح
 کسی دیگر آیات قرآنی یا دعاء ماثورہ کو پڑھ کر تاگے پر دم کرتے جانا اور گرہ دیتے جانا، پھر

گنڈہ اس کا نام رکھ کر کسی مریض حبشی و آسیبی کے دفعیہ کے لئے ڈلوانا، یا کسی آیت شریانی اور دعا، ماثورہ کو لکھ کر تعویذ بنا کر گلے میں بندھوانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ کہا جاتا ہے کہ بعض احادیث میں بالخصوص گنڈہ کی ممانعت آئی ہے، کیا یہ صحیح ہے یا قابل تاویل؟ اگر گنڈہ بنانا بطریق مذکور جائز ہے تو اس کا ترک اولیٰ ہے، یا عملدرآمد؟ بینوا تو حبروا،
الجواب: حدیث میں تمام جاہلیت کی ممانعت ہے جو شرک سے خالی نہ تھے، اور رقیہ بالقرآن کی اجازت ہے، کما فی قصۃ اللدیخ الذی رقاہ الصحابة واخذوا علیہ اجرًا من الغنم، پس چیچک کا گنڈا اور اسی طرح دیگر تعویذات و گنڈے بھی جو آیات و ادعیہ ماثورہ سے کئے جائیں فی نفسہ جائز ہیں، اگر اس میں کراہت یا حرمت آئے گی تو کسی عاصی کی وجہ سے آئے گی، مثلاً عوام کا عقیدہ خراب ہو جاوے کہ وہ تعویذ و گنڈے کو مؤثر بالذات سمجھ لگیں تو اس سے منع کیا جائے گا، اور ترک بہر حال اولیٰ ہے، مسنون صرف یہ ہے کہ ادعیہ و آیات کو پڑھ کر دم کیا جائے، واللہ تعالیٰ اعلم

۱۶، محرم ۱۴۲۸ھ

نوٹ: مندرجہ ذیل سوال و جواب بنگال سے بغرض اصلاح و تصویب آیا اولیٰ وہ سوال و جواب بعینہ نقل کیا جاتا ہے پھر یہاں کا جواب نقل ہو گا۔

رقیہ بالقرآن اور اس پر اجرت | سوال (۲۵)
 کی ایک صورت کا حکم، بنگال کے اکثر اطراف میں رواج ہے کہ دفع مصائب و بلیات دنیویہ کے لئے اہل محلہ چندہ جمع کر کے مولوی و میا بجی صاحبان کو دعوت دے کر مسجد میں ختم شفاء پڑھا کر دعا کراتے ہیں، اور اس چندہ سے ان صاحبان کو کھلاتے ہیں پلاتے ہیں اور روپے پیسے دیتے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ کھانا پینا لینا دینا جائز ہے یا نہیں، اور مسجد میں ختم و دعا جائز ہے یا نہیں، بینوا تو حبروا؛

الجواب من بعض علماء بنگال:

عن ابن عباسؓ ان نضرًا من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم مروا بماء فیه لدیخ او سلیم فعرض لہم رجل من اهل الماء فقال هل فیکم من ان ان فی الماء رجلاً لدیخا او سلیمًا فانطلق رجل منهم فقرا بفاتحة الكتاب علی شاة فبرأ فجاء بالشاة الی اصحابہ فکروہ ذلک وقالوا اخذت علی

کتاب اللہ اجر اُحیٰ قد موالمدینہ فقالوا یا رسول اللہ اخذ علی کتاب اللہ اجرا
 فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان احق ما اخذتم علیہ اجرا کتاب اللہ
 رواہ البخاری وفي رواية اصبتم اقسوا واجعلوا لی معکم سهما وعن خارقة
 بن الصلت عن عتہ قال اقبلنا من عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 فاتینا علی حی من العرب فقالوا انا انبنا انکم قد جئتم من عند هذا
 الرجل بخیر فهل عندکم من دواء اور قیة فان عندنا معترها فی القیود
 فقرأت علیہ بفاتحة الكتاب ثلثة ايام غدوة وعشية اجمع بزاقی ثم اتقل
 قال فكانما انشط عن عقال فاعطونی مجعلا فقلت لا حتی اسئل النبی صلی اللہ
 علیہ وسلم لم فقال کل فلعمری لمن اکل برقیة باطل فقد اکت برقیہ
 حق رواہ احمد وابوداؤد وفي حاشية المشکوۃ معنی یا الی اللغات قوله
 اضربوا لی معکم سهما ای اجعلوا لی سهما والمقصود تطیب قلوبکم و بیان
 انه حلال طیب وفيه دلیل علی ان الرقیة بالقرآن واخذ الاجرة علیها جائز
 بلا شبهة، فی رد المحتار (ص ۵۳۳) وجوز الرقیة بالاجرة ولو بالقرآن
 كما ذكره الطحاوی لانه لیست عبادة معصنه بل مثل التدوی،

ان سب عبارات سے کاشمیں فی نصف النهار صاف واضح ہوتا ہے کہ یہ کھانا پینا لینا ترنا
 جائز ہے، لیکن یہ ختم و دعا مسجد میں جائز نہیں، خارج مسجد ہونا چاہیے، کیونکہ یہ ختم و دعا
 نفع دنیوی کے لئے ہے، اور مسجد میں امور دنیویہ کا ارتکاب جائز نہیں، کما روی عن ابی ہریرۃ
 قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واذا رأیتم من یبیم او یستام فی
 المسجد فقولوا لا یریح اللہ فی تجارتکم واذا رأیتم من ینشد فیہ ضالة
 فقولوا لا یرد اللہ علیک رواہ الترمذی،

وفي العالمگیرية (ص ۱۲۱ ج ۲) رجل یبیم التعویذ فی المسجد الجامع و
 یکتب فی التعویذ التوراة والانجیل والفرقان ویأخذ علیہم المال ویقول
 ادفع الی الهدایة لا یجل له ذلك کذا فی الکبیری ویکرہ کل عمل الدنیا
 فی المسجد ولو جلس المعلم فی المسجد والوراق یکتب فان کان المعلم یکتب
 للحسبة والوراق یکتب لنفسه فلا بأس به لانه قریة وان کان بالاجرة

ویکون الا ان یقع لهما الضرورة کذا فی محیط السرخسی راقول ولا ضرر ولا فساد لهما فیہ
 واهل المعلة کفیلهم ویجب تنزیہ المسابد عن امور الدنیا علی کافة المسلمین
 من الخاص والعام،

مخفی نہ رہی کہ ختم خوانان جو اکثر مسجد میں فضول بات چیت کرتے ہیں پان کھاتے پیتے ہیں
 یہ باتیں بھی غیر معتکف کے لئے جائز نہیں، اور چونکہ یہ ختم مسجد میں ان برائیتوں کا واسطہ بنتا
 ہے، اس لئے بھی یہ ختم مسجد میں ناجائز ہوگا، کیونکہ جو امر معصیت کا ذریعہ بنے گو وہ امر فی
 مشروع ہونا جائز ہوتا ہے، کالبیع یوم الجمعة بعد الاذان الاول لوقوع الخلل فی سعی الجمعة
 تطاثرہ کثیرہ فی کتب الفقہ، ”حق است اس سخن حق را شاید نہفت“

اگر کوئی کہے یہ کھانا پینا، پیسے لینا اجرت نہیں اور اس پر اصرار کرے تو اس کا جواب
 یہی ہے کہ ختم اللہ علی قلوبہم وعلی سمعہم وعلی ابصارہم غشاوة، اور من یجعل اللہ لوراء
 فمالہ من نور، دوسرا جواب یہ ہے کہ اجرت کے لئے شرط لفظی ضروری نہیں بلکہ بقاعدہ
 المعروفہ کاملہ شروط رواج اور تعارف کافی ہے، فی الدر المختار ومن لم یکن عالما باہل زمانہ
 فهو جاہل، محمد اشرف عفاعنہ

الجواب من جامع امداد الاحکام

رقیہ بالقرآن جائز ہے، اور رقیہ پر اجرت لینا بھی جائز ہے، مگر سوال میں جو صورت
 بھی ہے کہ چندہ جمع کر کے ایسا کیا جاتا ہے یہ صورت ناجائز ہے، کیونکہ تجربہ یہ ہے کہ اہل محلہ
 سب خوش دلی سے چندہ میں شریک نہیں ہوتے، بلکہ بعض تو سرداران محلہ کے دباؤ سے چندہ
 دیتے ہیں، بعض محض شرم کی وجہ سے چندہ دیتے ہیں، اور جبر سے مسلمان کا مال لینا جائز نہیں
 ومن لم یکن عالما باہل زمانہ فهو جاہل کما قال المجیب الاول وقد قال
 النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا یحل مال امرأ مسلم الا بطیب نفس منه، واللہ
 تعالیٰ اعلم، حررہ الاحقر نطفہ احمد عفاعنہ از تھانہ بھون،

۲۲ صفحہ المنظر مشکوٰۃ

سوال (۲۶) اعمال قرآنی میں ایک موقع پر لکھا گیا	بذریعہ عمل محبوب کو سرگرداں و مطیع بنانا
ہی، ایک عمل کی تعریف و خاصیت میں کہ اس عمل سے	اور کسی عورت کو شادی پر راضی کرنا ایسا کہ
محبوب محب پر سرگرداں ہو جاتے گا، اعمال قرآنی حصہ سوم	اور جو عمل نبوی غرض کیلئے کیا جائے اس پر ثواب نہیں ملتا

اسی طرح میں نے اور بھی بعض حضرات اور محتاط بزرگوں کا یہ عمل دیکھا کہ کوئی عورت شادی کو راضی نہیں ہے، یا کسی کا محبوب بے رخی کرتا ہے تو وہ حضرات کوئی عمل مثلاً آیات قرآنی یا اسماء باری تعالیٰ پڑھنے کو متلاوت دیتے ہیں، کیا کسی محبوب کو بذریعہ عمل سرگرداں کرنا یا کسی عورت کو عمل سے شادی پر راضی کرنا شرعاً جائز ہے، اگرچہ محب کی نیت یہی ہو کہ میں محبوب کو اپنا سرگرداں اور شیدا بنا کر یہ محبت بالکل حدود شرعیہ ہی میں صرف کروں گا، اور آپس میں ایک دوسرے کی اصلاح کریں گے، ہر وقت نیک باتوں ہی میں مشغول رہیں گے، لیکن سوال یہ ہے کہ کسی کے قلب میں شدید محبت کی کوشش کرنا یا سرگرداں بنانا بھی جائز ہے، اس کی کوئی دلیل ہے؟

(۲) اگرچہ کیسی ہی پاک محبت کی طلب ہو، لیکن کسی کو اپنا مطیع بنانے کے لئے آیات قرآنی یا اسماء ربانی کا ورد شرعاً جائز ہے؟ اگر جائز ہے تو کیا ادب اور احترام کے بھی خلاف نہیں؟ کسی دنیوی غرض کے لئے آیات قرآنی کا استعمال باعث ادبار نہیں ہے؟

(۳) جو شخص کسی غرض کے لئے آیات قرآنی یا ورد شریف پڑھے، کیا اس کو بھی قرآن شریف کے ہر حرف پر نیکیاں یا ورد شریف پر ثواب یا تقرب رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام حاصل ہو سکتا ہے جو اس کے مطلع فرمایا جاوے،

(الجواب) اس مقام پر اولاً چند مقدمات مہتمد کرنا ضروری ہے:-

(۱) رقیہ بالقرآن جائز ہے کہ اس بات دنیویہ ہی میں ہو، دلیل مافی الحدیث الصحیح من فعل الصحابة انهم رقوا کافر لدیغا بغاخۃ الکتاب فقرأوا فاعذرا علیہ اجرا واخبروا بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاقربہم علیہ،

(۲) بعض ایسے علوم کی تعلیم و تعلم جائز ہے جو دوزخ میں ہیں کہ ان کا استعمال محل مباح ہے، بھی ہو سکتا ہے، اور محل حرام میں بھی مثلاً فنون سپہ گری و فمشیر زنی و علم نجوم و فلسفہ اور اس کی تعلیم اس کو مقتضی نہیں کہ محل حرام میں بھی استعمال جائز ہے بلکہ محل استعمال کی بابت وقت استعمال کے فتویٰ حاصل کرنا چاہئے،

(۳) کتب عملیات میں صرف عزائم کے فن کی تعلیم مقصود ہوتی ہے، استعمال مطلق کی اجازت مراد نہیں، کیونکہ یہ مسئلہ علم فقہ سے متعلق ہے،

(۴) انما الاعمال بالنیات،

اس کے بعد جواب ظاہر ہے کہ اعمال قرآنی میں صرف عملیات کا فن بتلانا مقصود ہے

کہ فلاں کام کے لئے فلاں عمل ہو، رہا یہ کہ اس کا استعمال کس مقام پر جائز ہے، سو ظاہر ہے کہ صرف زوجہ نامہ سرمان پر جائز ہے، یا ایسی بیوہ عورت پر جو بوجہ رسم درواج کے نکاح سے انکاری ہو اور اگر اس کو اس شخص خاص سے نفرت ہو تو جائز نہیں، اور اجنبیات و امارد پر استعمال مطلقاً حرام ہے، اور جو عملیات دنیوی غرض کے لئے پڑھے جاویں، ان میں ثواب نہیں ہے فقط،

۱۰ ربيع الثاني ۱۲۸۵ھ

ضمن نمازوں کے بعد سوال (۲۶) زید کہتا ہے کہ بعد صلوات مکتوبات کے ہاتھ اٹھا کر دعا، ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا مانگنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں، لہذا بدعتِ سیئہ ہے زید کا قول کیسا ہے، دعا کا ثبوت ہے تو حدیث تحریر فرمادیں؟

الجواب: ہاں صحاحِ مستتہ کی روایات میں اس کا صراحۃً ذکر نہیں، مگر ابن ابی شیبہ کے مصنف میں ایک روایت موجود ہے، جس میں نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا مذکور ہے، علاء السنن جلد سوم میں یہ حدیث مذکور ہے،

۲۰ ربيع ۲ ۱۲۸۵ھ

حکم بعض عملیات سوال (۲۸) اس زمانہ میں بہت سے نئے نئے عملیات رائج ہوئے ہیں مغلہ ان کے ایک طریقہ یہ ہے کہ وہ ارواح سے مکالمہ کرتے ہیں، اور ان سے حالات آئندہ دریافت کر کے لوگوں کو بتاتے ہیں، اور ایک طریقہ نجوم کا حسابی ہے کہ فلاں فلاں سپاہ کی رفتار فلاں فلاں وقت اور فلاں فلاں سمت میں رہنے لگے، اور اس سے یہ امور پیدا ہوتے ہیں اس کے جواز و عدم جواز کے متعلق شرعی حدود کیا ہیں، حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کلمہ ہینین کو شیاطین استراقِ سمع کر کے بتاتے ہیں، اور یہ لوگ اس میں کذب کی آمیزش کر کے اوروں کو بتاتے ہیں، اگر کوئی عمل شیطان کی مدد سے بری ہو اور بتانے والا کذب بھی نہ ملتا ہو تو کیا جائز ہوگا، اور اس سے استفادہ درست ہوگا یا نہیں؟

الجواب: یہ سب کلمہ ہینین ہی کے مثل ہیں اور ان سے استفادہ جائز نہیں، کیونکہ حدیث میں جس طرح کلمہ ہینین سے استفادہ و تصدیق پر وعید ہے، اسی طرح عوات سے استفادہ و تصدیق پر بھی وعید ہے، والعراف بشدة الراء هو الذی یستدل علی الامور باسباب و مقدمات یدعی معرفتها بہا و قال المناوی ہومن یخبر بالامور الما صنیۃ او بخفی ام

وقد اخرج مسلم والحاكم عن بعض امهات المؤمنين وعن ابي هريرة
من اني عرّفا او كانا فصدقه بما يقول لم تقبل له صلاة اربعين ليلة ولفظ
الحاكم فقد كفى بما اتى على محمد واسناده صحيح كذا في الجامع الصغير
للسيوطي مع العزيزي، ص ۲۹۳ ج ۳،

قال الشارح الحفيتي اما اذا اخبره من غير ان يسأله فلا بأس عليه وان
صدقه لانه قيد الوعيد بالسؤال والتصدقين معا فلا يحصل باحدهما
اه قلت وفيه تامل والظاهر ان التصديق منهي عنه مطلقا والسؤال ان
كان للتصديق فحرام ايضا والا فيكون، والله اعلم

اور علت ممانعت کی یہ ہے کہ یہ سب مقدمات اور حسابات فی نفسہ ظنی ہیں، قطعی
کوئی نہیں، سب میں یا تو خیال کو بڑا دخل ہے، یا قواعد پوری طرح کلیاً صحیح نہیں اور
ایسے عوام کو بتلانے والے کے متعلق علم غیب کا اعتقاد ہو جاتا ہے اور توکل ضعیف
ہو جاتا ہے، اس لئے سب صورتیں اشتراک علت کی وجہ سے ممانعت میں مساوی ہیں،
واللہ اعلم، ۲۰ شعبان ۱۳۸۵ھ

ذکر اسم ذات میں اگر (۴) رہ جائے | سوال (۲۹) ذکر اسم ذات میں اگر (۴) رہ جاوے
تو کوئی حرج ہے یا نہیں، تو کوئی حرج تو نہیں؟ شرح جامی دیکھنے سے تو یہ معلوم
ہوتا ہے کہ یہ بھی صحیح ہے، کیونکہ ترخیم منادی کے جو شرائط بیان کئے ہیں وہ سب اس کلمہ میں بھی
پائی جاتی ہیں، نیز ترخیم کے بعد حذف حرف ندا کا قاعدہ بیان کیا ہے، اور اس میں یہ قید نہیں لگائی
کہ حذف حرف ندا کے لئے منادی مرخم نہ ہونا چاہئے، اور نہ یہی لکھا کہ مرخم ہونا چاہئے، اس لئے
اس اطلاق سے مرخم و غیر مرخم دونوں میں حذف کا جواز معلوم ہوتا ہے؟

الجواب: کوئی حرج نہیں، مگر منشاء عدم حرج کا رفع حرج عن الذاکرین اللہ کبیرا
ہے، کیونکہ تجربہ و مشاہدہ ہے کہ کثرت ذکر اس رعایت کے ساتھ دشوار ہو کہ آہ ادارہ ہوتی ہے
یا نہیں، اور خصوصاً توجہ الی المذکور تو بہت دشوار ہے، خصوصاً مبتدی کو، پس ذکر کو ابتداء
ذکر کے وقت ارادہ یہی کرنا چاہئے کہ میں سب حروف کو ادا کروں گا، پھر اس کی طرف التفات
کی زیادہ ضرورت نہیں، اگر ہمارا ادانہ ہوئی تو بوجہ قصد اداء کے کالا دا ہوگی، بانی ترخیم و
حذف حرف ندا وغیرہ سے اسم جلالت مستثنیٰ ہے وہاں یہ صورتیں نجات کے نزدیک

جائز نہیں، ملاحظہ ہو شرح جامی صفحہ ۱۲۰ والفیہ صفحہ ۶، و شرح جامی صفحہ ۱۲۵ و شرح رضی ۳۲۳،

سوال (۳۰) نماز ظہر و مغرب اور عشاء کے فرض کے بعد
کے بعد کس قدر دعا مانگنی چاہئے، مناجات کو درازی کرنا کیا حرج ہے، اگر حرج ہے تو مقدار

کتنی ہے؟

الجواب: جن نمازوں کے بعد سنن ہیں ان میں اولیٰ یہ ہے کہ دعا طویل نہ مانگیں،
اور ادسنن کے بعد پڑھے، اور دعا قصیر کی مقدار اللہم انت السلام الخ ہے، یا اسی کے قریب
قریب اور دعا پڑھی جاوے، و ہذا کلمہ فی الدر المختار و رد المحتار، صفحہ ۵۵۲ ج ۱، واللہ اعلم

کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ

سوال (۳۱) عبادت بدنی مثلاً نماز روزہ کا ثواب کسی میت کو یا زندہ
ثواب بخش سکتے ہیں، کو بخش سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: مردہ اور زندہ سب کو ثواب پہنچ سکتا ہے، عبادت بدنیہ کا بھی اور میت
کا بھی، واللہ اعلم، احقر عبد الکریم ۱۵ رمضان ۱۴۲۸ھ

الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ

سوال (۳۲) جاہل اہل اسلام کو تبلیغی کام کرنا یعنی ادا مرو
یا وظائف کا شغل رکھنا، نو اہی کی تعلیم دینے و دلانے کی کوشش کرنا بہتر ہے یا وظائف

داور او کا شغل رکھنا اولیٰ ہے،

الجواب: اس میں ہر شخص کا ایک حکم نہیں ہے، بلکہ جو جاہل اہل علم کی صحبت سے
حدود و آداب تبلیغ اور مسائل ضروریہ سے واقف ہو گیا، وہ اس کو تبلیغ کرنا جائز ہے اور بابت
ثواب ہے، ورنہ تبلیغ کا کام جاہل کو ممنوع ہے، فقط کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ
از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون مورخہ ۲ شعبان ۱۴۲۸ھ

سوال (۳۳) رقبہ القرآن اور اس پر

اجرت لینے کا حکم دریں امکانہ از قدیم الایام عادت ختم بر مرہن جاریست کہ علماء و طلباء
را بر سر بیار جمع کردہ ختم قرآن شریف میخوانند و بعد قرات بر قدسے آب دم کردہ بر مرہن بنوشند
شکرانہ ختم مبلغ عین بقاریان میدہند، عالم مسی زیدی فرماید کہ اس ختم کہ باجرت مروج
است ناجائزست بدلائل ذیل حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اقرأ القرآن ولا تأکلو

بہ الخ ودر رسالہ شفاء العلیل مؤلفہ علامہ شامی بسیار بحث تحریر است، خلاصہ اش اینست
 وقد صرح ائمتنا وغیرہم بان القاری للدنیا لا ثواب له والاخذ والمعطى آثان، وقد قال العلماء
 ان القاری اذا قرأ لاجل المال فلا ثواب له فای شیء یہدیہ الی المیت، دیگر عالم مسمی بکر حکم داده
 کہ این ختم مذکور علی المریض جائز است کہ از قسم رقبہ است، چرا کہ درینجا علت استشفاء است
 و بر میت علت حصول ثواب است، وجوز والرقیۃ بالاحبرۃ ولو بالقرآن کما ذکر الطحاوی لایہنا
 لیست عبادۃ محضۃ بل من التداوی انتہی، عالم نمبر اول می گوید کہ در رقیہ قاری مختار می باشد
 ہر چہ می خواند و در صورت ختم با مور بقرات تمام قرآن می باشد پس قیاس مع الفارق است،
 عالم نمبر دوم در جواب می فرماید کہ جوز والرقیۃ بالقرآن صریح است پس در جواز یک آیت و
 تمام قرآن حکم یکسان، پس آن قبلہ دریں بحث از روی شرع شریف کدام قول ترجیح می دہند
 کہ بدان عمل نہائیم،

الجواب؛ جواب بکر صحیح است و قیاس ختم مریض بر ختم میت درست نیست،
 و مختار بودن راتی بہ رقیہ لازم نیست بلکہ جائز است کہ مستاجر از خود تعیین رقیہ کند و این اولی
 بالجواز است، لان الاصل فی الاجارة کون العمل معلوماً عند المتعاقدين و ہینا کذلک و اذا کان
 الراتی مختاراً لم یکن العمل معلوماً للمستاجر و انما جوزہ بالنص علی خلاف القیاس،

کتاب السیر والمناقب

حضرت لانا شاہ اسمعیل شہید کا حال | سوال (۱) شاہ اسمعیل صاحب شہید کس قسم کے
 شخص تھے، ان کو جو شخص برا سمجھے وہ کس قدر راستی پر ہے، اور آیا وہ مقلد تھی یا غیر مقلد؟
 الجواب؛ مولانا محمد اسمعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ عالم با عمل صوفی بنے بل
 یگانہ روزگار، مصلح وقت، صاحب تلقین و ارشاد، جامع ظاہر و باطن و قاطع بدعت و
 حامی سنت، مجاہد، غازی فی سبیل اللہ، صاحب سنان و لسان تھے، اور مذہباً حنفی
 مقلد تھے، غیر مقلد نہ تھے، حق تعالیٰ نے مخلوق کثیر کو ان کے انفاس قدسیہ سے ہدایت فرمائی ہے،
 رضی اللہ تعالیٰ عنہ و عناد حشرنا فی زمرة نبینا صلی اللہ علیہ وسلم برکتہ آمین، جو ان کو بر الہی
 وہ بدعتی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اہل بدعت کو ان سے خارج ہے، ۲۰ صفر ۱۲۵۵ھ از تہذیب
 کیا یہ درست ہے کہ رسول اللہ | سوال (۲) جناب والا سلام علیکم، دو چار باتیں حسب ذیل
 صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہ تھا؟ دریافت طلب ہیں، لہذا جواب عنایت فرمایا جاوے، تکلیف

کی معافی چاہتا ہوں فقط،

- (۱) مشہور ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہ تھا، کیا درست ہے؟
 (۲) مشہور ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی مکر مبارک سے صاف نکل آتا تھا، یعنی بیچ میں نکل آتا تھا، کیا درست ہے؟

الجواب: حافظ سیوطیؒ نے خصائص کبریٰ میں ایک روایت ضعیف حکیم ترمذی سے اس مضمون کی نقل کی ہے، جس میں عبدالرحمن بن قیس زعفرانی بہت ضعیف راوی ہے جس کی توثیق کسی نے نہیں کی، بلکہ بعض نے کذب و وضع کی طرف بھی منسوب کیا ہے (تہذیب التہذیب ص ۲۵۸ ج ۶) الفاظ حدیث کے یہ ہیں: - عن ذکوان ان رسول الله صلى الله عليه وسلم لم يكن يري له ظل في شمس لا قمر (خصائص ج ۱ ص ۱۷)

(۲) دوسرا مضمون بے اصل معلوم ہوتا ہے، اس کی اصل ضعیف یا قوی کچھ نہیں ملی واللہ اعلم،، رجادی الثانی ۳۳۸ م

تحقیق قصہ حضرت علیؑ کے نزدیک از یہود | سوال (۳) دیوان سنی و قصص الانبیاء اردو میں واقع اجرت سقی ماربعوض تورات کرد، ہے کہ ایک دفعہ سردار دو جہاں بعد چار دن کی بھوک کے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دولت خانہ پر تشریف لائے، اور طعام کا حال پوچھا، جواب ملا کہ آٹھ روز سے فاقہ ہے، پھر جا کر ایک یہودی کی نوکری کی، ایک ڈول کنویں سے نکالنے پر ایک کجور، پانچویں ڈول پر رستی ٹوٹ کر ڈول گر گیا، یہودی نے ایک چائٹا اس زور سے فخر الموجودات کو مارا کہ کلمہ سرخ ہو گیا، لمباقصہ ہے، اس قصہ کے متعلق رائے عالی سے مطلع فرمادیں کہ صحت یا ضعیف یا منکر و موضوع، کس درجہ میں ہے، بہر صورت واعظین اس کا بیان کرنا کیسا ہے؟

الجواب: یہ قصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں ہے، حضورؐ نے نبوت سے پہلے تو کسی سے مואجرت کا معاملہ کیا ہے، بعد نبوت کے ہرگز ثابت نہیں کہ آپؐ نے کسی سے معاملہ مואجرت کا کیا ہو و فی الصحیح انہ رعی الغنم لاهل مکة علی قراریطاھ و اجر نفسه من خدیجة فی سفرہا بما لھا الی الشام ذکرہ اصحاب السیر کافی زاد المعاد ہاں ایسا قصہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ہے کہ اسخوں نے ایک یہودی سے چھوڑا پر اجرت کا معاملہ کیا تھا، مگر اس میں بھی طمانچہ مارنے کا قصہ نہیں فقداخرج المنذری

فی ترغیبه عن فاطمة رضي الله عنهما اتاه رسول الله صلى الله عليه وسلم يوما فقال
 ابن ابنائی یعنی حسنا وحسینا قالت اصبحنا وليس فی بیتنا شیء یدوقه ذائق فقال
 علی اذهب بهما فانی اتخوف ان یبکیا علیک وليس عندک شیء فذهب الی فلان
 الیهودی فتوجه الیه النبی صلی الله علیه وسلم فوجد هما یلعبان فی شربة
 بین ایدیهما فضل من تمر فقال یا علی الا تقلب ابنی قبل ان یشتد الحر قال اصبحنا
 وليس فی بیتنا شیء فلو جلست یرسل الله حتی اجمع لفاطمة فضل تمرات
 فجلس رسول الله صلی الله علیه وسلم حتی اجمع لفاطمة فضل تمر فجعله
 فی خرقة ثم اقبل فحمل النبی صلی الله علیه وسلم احدهما وعلی الآخر حتی
 اقبلهما رول الطبرانی باسناد حسن (ص ۵۱) وقد وقع مثله للکعب بن عجرة
 قال اتیت النبی صلی الله علیه وسلم فرأیته متغیرا فقلت بابی انت مالی اراه
 متغیرا قال ما دخل جو فی ما یدخل جوف ذات کبد منذ ثلاث قال فذهبت
 فاذا یهودی یسقی ابله فسقیت له علی کل دلو بقرعة فجمعت تمرات فأتیت به
 النبی صلی الله علیه وسلم فقال من این لك فاخبرته الحدیث واسناده
 جید کذا فی الترغیب (ص ۵۰) پس دیوان سنی وقصص الانبیاء کا قصہ مذکورہ میری
 خیال میں صحیح نہیں، اور واعظین کو اس کا بیان جائز نہیں، واخاف ان یكون موضوعا
 والله اعلم، ۲۱ ربیع الاول ۱۳۸۴ھ،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم | سوال (۴) -----

کے سایہ نہ ہونے کی تحقیق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ تھا یا نہیں تھا،
 اور اگر تھا تو کیا کبھی بطریق اعجاز و خرق عادت باوجود دھوپ یا چاندنی یا روشنی ہونے کے
 سایہ نہیں بھی پڑا ہے، یا کبھی بھی ایسا ہونا ثابت نہیں ہو اور یہ جو حضرت علام مولانا
 عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ القوی نے التعلیق العجیب محل حاشیة الجلال لمنطق التہذیب میں
 بالکل سایہ نہ ہونا تحریر فرمایا ہے کہاں تک صحیح ہے، اور اس کا ماخذ کیا ہے، چنانچہ التعلیق
 العجیب شرح قول تہذیب "و نور بہ الاقتدار یلین میں ہے:-

الاحتمال الثالث ان یكون اشارة الى اسمه الشريف فانه من اسمائه النور
 كما قوله تعالى قد جاءكم من الله نور و کتاب مبین، ومما یؤید ان النبی

صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا مشی فی الشمس القمر لا یقع ظلہ علی الارض لان الظل انما یكون لما فیہ كثافة واما ذاته فكانت نورا من الرأس الى القدم انتهى فقط بنو التوکل الجواب؛ قال السيوطی فی الخصائص وقد عقد بابا للآیة فی انه صلی اللہ علیہ وسلم لم یمکن یرى له ظل ما نصه اخرج الحکیم الترمذی عن ذکوان ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یمکن له ظل فی الشمس لا قمر قال ابن سبع من خصائصه ان ظلہ کان لا یقع علی الارض وانه کان نورا فكان اذا مشی فی الشمس او القمر لا ینظر له ظل قال بعضهم ویشهد له حدیث قوله صلی اللہ علیہ وسلم فی دعائه اللهم اجعلنی نورا ام (ص ۶۸ ج ۱) قلت وهذا مرسل ضعیف فان فی سنده عبد الرحمن بن قیس الزعفرانی کما یظهر من (ص ۱، ج ۱) من الخصائص ایضا وقد اتهم بالضعف والکذب الوضع وترجمته مستوفاة فی تمذیب التہذیب ومیزان الاعتدال،

اس مسئلہ میں ایک حدیث مرسل ضعیف ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ دھوپ یا چاندنی میں نظر نہ آتا تھا، پس یوں نہ کہنا چاہئے کہ آپ کا سایہ نہ تھا، بلکہ وہی کہا جاوے جو اس حدیث ضعیف میں وارد ہے، اور گویہ حدیث ضعیف ہے مگر یہ بات عوام و علماء میں مشہور چلی آرہی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اصل اس کی ضرور ہے، دو سکر مناقب و فضائل میں تشرید زیادہ نہیں، تیسرے یہ کہ زمین پر سایہ کا واقع ہونا درحقیقت انسان کے لئے اس کی بڑی کمزوری اور عاجزی کو ظاہر کرتا ہے، کہ تیرا سایہ جو تیری صورت کے مثل ہے زمین پر اس طرح پڑا ہوا ہے کہ جو کوئی چاہے اس پر تیرے کھڑے ہو جائے اس پر تھوک دے، اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے بچا لیا ہو تو کچھ تعجب نہیں، کہ آپ کے سایہ کو زمین پر واقع نہ کیا ہوتا کہ اس پر کسی کا قدم نہ پڑے، و نحو ذلک، بہر حال اس امر کے اعتقاد کی بھی گنجائش ہے، کیونکہ کسی درجہ میں دلیل موجود ہے، اور جو اس کا معتقد نہ ہو اس کو بھی گنجائش ہے، کیونکہ دلیل الیسی نہیں جس کا تسلیم کرنا واجب ہے، واللہ تعالیٰ اعلم، ۳۳ ربیع الاول ۱۲۸۴ھ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کا سوال (۵) زید اور بکر کا باہم تنازع اس بعد وفات کے زندہ ہو کر مسلمان ہونے کی تحقیق

مسئلہ پر ہو رہا ہے، زید کہتا ہے کہ نعوذ باللہ والدین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحالت کفر فوت ہوئے ہیں، اُن کے لئے احادیث سے مغفرت ثابت نہیں ہے، اور بکر کہتا ہے کہ نہیں، ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ زندہ کیا تھا، اور اُن کے واسطے دعائے مغفرت کی جو کہ قبول ہوئی،

زید اس فتویٰ دینے پر اسلام سے خارج ہو سکتا ہے یا نہیں، اگر اسلام سے خارج ہوا تو اس کے ساتھ سلوک کافروں کا رکھنا چاہئے یا چکنو نہ؟ اگر اسلام سے خارج نہیں ہوا تو کس فرقہ میں داخل ہوا، خدا نخواستہ زید سچا ہے تو کس حدیث کی رو سے؟ مجتہدوں کا اور موجودہ علماء کا اس مسئلہ میں کیا خیال ہے، براہ نوازش اس مسئلہ کا مفصل جواب بحوالہ کتب و حدیث اور فقہ تحریر فرما کر مشکور فرماویں.....

الجواب، زید پر کفر کا فتویٰ تو نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ ایمان ابوین شریفین میں روایات مختلف ہیں، ایک صحیح روایت میں وہ مضمون بھی ہے جو بکر کہتا ہے، اور چھو علماء اسی طرف ہیں، اور بعض صحیح روایات سے اس کے خلاف بھی ثابت ہوتا ہے، اس لئے اسلام مسئلہ میں سکوت و توقف ہے، مگر اس میں شک نہیں کہ زید کے اس قول سے سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (روحی فداہ و قلبی فداہ) کو اذیت ہوتی ہے، وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ رَسُولَ اللَّهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ، پس زید اپنی زبان کو روکے ورنہ اُس پر ابتلاء بکفر کا اندیشہ ہوگا واللہ تعالیٰ اعلم، ۸، جمادی الاولیٰ ۱۳۸۸ھ، تھانہ بھون،

ایضاً ایضاً | سوال (۶) فقہ اکبر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے متعلق نائماً علی الکفر درج ہے، پس اگر کوئی شخص باوجود حنفی ہونے کے ابوین شریفین کے دوبارہ زندہ ہو کر ایمان لانے کا عقیدہ رکھے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ اور وہ شخص حقیقت سے نکل جاوے گا، یا نہیں؟

الجواب، فقہ اکبر کی نسبت امام صاحب کی طرف تو اترا سند صحیح سے ثابت نہیں اس لئے اس کی یہ عبارت حجت نہیں، اور اس مسئلہ میں حنفیہ محققین کا قول یہ ہے کہ سکوت اسلام ہے، واللہ اعلم،

مسئلہ حیات انبیاء علیہم السلام | انبیاء علیہم السلام کی حیات بعد الموت یہی حیات دنیویہ ہی یا دوسری

حیات ہے، جس کو حیات برزخیہ کہا جاتا ہے، یعنی انبیاء علیہم السلام کی موت سے ان کی حیات دنیویہ منقطع ہو کر بعد اس کے ان کو دوسری حیات ملی ہے، یا یہی حیات دنیویہ مان کی مسلسل چلی گئی ہے، اور موت اُن کی قاطع حیات دنیویہ کی نہیں بنی، نیز جو شخص موتِ انبیاء کو خصوصاً خاتم الانبیاء کی موت دنیوی کو نہ مانے اور آیات و احادیثِ موت کی تاویل کرے اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب؛ انبیاء علیہم السلام کی حیات بعد الموت حیات برزخیہ ہی جو دوسری اموات کی حیات برزخیہ سے اقویٰ و اشددہی، اور جو شخص حضور کی یا سب انبیاء کی موت دنیوی کا انکار کرے وہ گمراہ ہے، قال اللہ تعالیٰ انک میت و انکم میتون، فسوی بینہم و بینہ فی الموت فعلم ان موت الكل سواء واللہ تعالیٰ اعلم۔
۲۳ رجمادی الثانیہ ۱۳۸۸ھ، تھانہ بھون

ایک صحابی کے ہر نبوت چھونے سوال (۸) یہ عوام و عظیم میں جو ایک طول طویل قصہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص مدعی ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ہاتھ پر چابک مارا ہے، لہذا میں بھی حضور صلعم سے مستدعی ہوں کہ آپ پر امن مبارک اتاریں، لہذا حضور نے اتارا اس نے ہر نبوت کو بوسہ دیا، اور کہا بس یہی آرزو تھی جناب والا کیا بھلا کسی کی مجال تھی جو حضور سے بدلہ لے، اس قصہ کی بھی کچھ اصل ہے؟
الجواب؛ یہ قصہ تو واقع ہوا، مگر واعظین جو اس کو وفاتِ نبوی کے واقعہ میں بیان کرتے ہیں کہ حضور نے سب لوگوں کو جمع کر کے اُن سے معافی چاہی، اس وقت ایک صحابی نے عرض کیا، یہ صحیح نہیں، بلکہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ میں یا نماز میں مسلمانوں کی صف سیدھی کر رہے تھے اس وقت ایک صحابی کا سینہ آگے کو ابھرا ہوا تھا، آپ نے لکڑی سے ان کو برابر کیا، تو وہ کہنے لگے کہ مجھے تکلیف ہوئی، حضور نے فرمایا اچھا بدلہ لے لو، واللہ اعلم،

کتاب الطہارۃ

فصل فی فرائض الوضوء

سوال (۱) عہد چہرہ کہاں سے کہاں تک ہے، حد چہرہ کس کو
ڈاڑھی کے غسل کا حکم کہتے ہیں ۲ ٹھوڑی کے نیچے اور حلق کے درمیان میں جو عضو ہے

وہ حد چہرہ ہے یا غایب ہے، (۳) وضو میں گھنی داڑھی کے جڑوں کا کس قدر خشک رہنا
معاف ہے (۴) گھنی داڑھی سے جڑوں کا اور بالوں کا دھونا فرض ہے یا واجب یا
سنت ہے کیا ہے (۵) گھنی داڑھی سے چند بال خشک رہ گئے تو وضو درست ہو گیا نہیں
بالوں کا کس قدر خشک رہنا معاف ہے، (۶) داڑھی بھگونے کے لئے چلو میں پانی کے کر
خوب بھگووے، یا صرف جس پانی سے منہ دھو یا جاوے وہی پانی کافی ہے؟

الجواب: چہرہ کی حد عرض میں ایک کان سے دوسرے کان تک ہے، اور لمبائی
میں سکر بالوں سے لیکر ٹھوڑی تک نیچے حلق تک ہے (۲) گھنی داڑھی کے بالوں
کی جڑوں کا ترک کرنا فرض نہیں ہے، بلکہ اوپر اوپر کے بالوں کا دھونا فرض ہے (۳)
ٹھوڑی کے نیچے اور حلق کے درمیان جو عضو ہے وہ بھی چہرہ میں داخل ہے، (۴) جو
پانی چہرہ پر ڈالا جاتا ہے اگر اس سے ڈاڑھی کے اوپر کے بال خوب تر ہو جاویں تو علحدہ
چلو لینے کی ضرورت نہیں، (۵) گھنی داڑھی کے بیچ میں بال خشک رہیں تو حرج
نہیں، اوپر کے بال تر ہو جانا چاہیے، واللہ اعلم، ۸ رجب ۱۴۲۸ھ

سوال (۲) وضو میں حد چہرہ کس کو کہتے ہیں، عہد چہرہ کہاں
کہاں کہاں تک ہے سے کہاں تک ہے ۳ ٹھوڑی کے نیچے اور حلق کے درمیان میں جو عضو

ہے وہ چہرہ میں ہے، یا غایب ہے؟

الجواب: (۱) قال فی مرقی الفلاح وحده ای جملة الوجه طولا
من مبدأ منقطع الجبهة سوا کان به شعر ام لا والجبهة ما اکتنفه جبین
الی اسفل الذقن وهي مجموع لحيته واللی منبت اللحية فوق عظم الاسنان
لمن لیست له لحيته کشفه وفي حقه الی ما لا فی البشرة من الوجه

وحدہ عرضا مابین شحمتی الاذنین ویدخل فی الغایتین جزءاً منهما
لاتصالہ بالفرض والبیاض الذی بین العذار والاذن علی الصحیح ام
ملخصاً، ص ۳۴، چہرہ کی حد طول میں سر کے بالوں کی جڑ سے لے کر ٹھوڑی کے نیچے تک
ہے، اور عرضاً ایک کان کی نو سے لے کر دوسرے کان کی نو تک ہے،
(۳) ٹھوڑی کے نیچے حلق کے درمیان میں جو عضو ہے وہ بھی چہرہ میں داخل ہے
اس کا دھونا بھی فرض ہے،

گھنی ڈاڑھی کے سوال (۳) گھنی ڈاڑھی کی جڑوں کا اور بالوں کا دھونا فرض ہے،
دھونے کا حکم یا واجب ہے یا سنت ہے کیا ہے، گھنی ڈاڑھی کے بالوں کی جڑوں
کا کس قدر خشک رکھنا معاف ہے، گھنی ڈاڑھی کے چند بال خشک رہ گئے تو یہ وضو
درست ہو یا نہیں، بالوں کا کس قدر خشک رہنا معاف ہے، ڈاڑھی کے بھگونے کے
لئے چلو میں پانی لے لے کر ڈاڑھی خوب اچھی طرح بھگوے یا کہ صرف جس پانی سے منہ دھویا
جاوے وہی پانی کافی ہے،

الجواب، قال فی نورالایضاح وفی حقہ زہی من لہ لحيۃ کثیفۃ، الی
مالاقی البشرۃ من الوجہ ام قال الطحاوی ای الذی لاتری منہ فلا یجب
علیہ ایصال الماء الی المنابت السفلی ام ص ۳۴ وفی نورالایضاح ایضا یجب
یعنی یفترض غسل ظاہر اللحيۃ الکثیفۃ وہی التي لاتری بشرتہا فی اصم
ما یفتی بہ من التصاحیح فی حکمہا لقیامہا مقام البشرۃ لتحول الفرض الیہا
الی ان قال ولا یجب ایصال الماء الی المسترسل من الشعر عن دائرۃ لہ لیس
منہ اصالة ولا بد لاعنہ قال الطحاوی وانما زاد المصنف لفظ ظاہر لشارة
الی انہ لا یفترض غسل ماتحت الطبقة العليا من منابت الشعر ام ص ۳
گھنی ڈاڑھی کا حکم یہ ہے جو جڑیں رخساروں سے متصل ہیں ان کا دھونا نیز جو بال چہرہ
کے دائرہ کو محیط ہیں، ان کا اوپر سے دھونا فرض ہے، اور جو جڑیں رخساروں سے متصل
نہیں اسی طرح وہ بال جو دائرہ چہرہ کو محیط نہیں بلکہ نیچے کو دراز ہو گئے ہیں، نیز وہ جڑیں
اور بال جو ٹھوڑی کے نیچے ہیں اور ان کا تر کرنا اور دھونا فرض نہیں، ہاں سنت یہ ہے
کہ ایک دو چلو میں پانی لے کر ٹھوڑی کے نیچے کے بالوں کو جڑوں سمیت تر کر لیا جاوے

اس جواب سے اس کے متعلق تمام سوالات کا جواب ہو گیا، خلاصہ یہ ہے کہ گھسنی داڑھی کی جو جڑیں رخسار سے ملی ہوئی ہیں سب سے اوپر ان کا تر کرنا فرض ہے، اور جو بال رخساروں کے اوپر ہیں اور جو ٹھوڑی کے اوپر ہیں (جن سے دائرۃ وجہ کا احاطہ ہو رہا ہے) ان کا دھونا فرض ہے، اس کے مابقی جڑوں اور بالوں کا دھونا یا تر کرنا فرض نہیں صرف سنت ہی، اگر یہ باقی جڑیں اور بال خشک رہیں تو معاف ہی، اور جتنی مقدار جڑوں یا بالوں کا دھونا فرض ہے ان کے لئے الگ چلو میں پانی کا لینا ضروری نہیں، وہی پانی کافی ہے جو چہرہ کے اوپر بہہ کر رہا ہے،

سوال (۴) اگر ایک شخص کے بدن پر ایسا زخم
دو اگر اس طرح چمٹ جائے کہ چھڑانا
مشکل ہو تو عضو کس طرح دھویا جائے
لگ گیا جس سے خون بند نہیں ہوتا ہے، اگر چونا
لگا دیا گیا اور اس کے اثر سے خون بند ہو گیا، اور وہ جگہ ایسی ہے جس کا دھونا وضو میں
ضروری ہے تو چونا چھڑا کر وہ جگہ دھونا چاہئے یا نہیں، اگر چونا ایسا خشک ہو گیا ہے کہ
چھونے کے چھڑانے سے پھر خون نکلنے کا اندیشہ ہو تو کیا کرے ؟

اسی طرح اگر غسل کی ضرورت ہے اور ٹانگ میں کئی دن ہوئے ایک چوٹ لگ
گئی تھی اور اس پر چونا لگا دیا گیا تھا اور خون اس سے بند ہو گیا تھا، اب وہ چونا ایسا
خشک ہو گیا ہے کہ پانی کی تری سے کسی طرح نہیں چھوٹتا ہے، اگر چاقو وغیرہ سے چھڑایا جا
تو خون نکلتا ضروری ہے ایسی صورت میں کیا کرے، صرف اوپر اوپر سے پانی اس جگہ
بہا لینا درست ہے یا یہ تکلف چونا چھڑا کر صاف کر کے خواہ خون ہی کیوں نہ نکلے پانی بہانا چاہئے
اور اگر خون نکلنے لگے اور پھر بھی پورے طور پر چونا اس زخم سے نہ چھوٹے تو کیا کرے ؟

الجواب: چونا چھڑانا واجب ہے، بشرطیکہ چھڑانا ضرر نہ دے، اور اگر ضرر دے
تو اسی پر پانی بہا لیا جائے، چاقو سے چھڑانے کی ضرورت نہیں، بلکہ تیل اور پانی وغیرہ
سے سہولت جتنا چھوٹ سکے اس کا چھڑانا واجب ہے، اور جو اس سے بھی نہ چھوٹے
اس کا مضائقہ نہیں، قال فی نور الایضاح ولو ضرت غسل شقوق رجله جازاً مرار
الماء علی الدواعی الذی وضعہ فیہا قال الطحطاوی ثم محل جوازاً مراراً الماء
علی الدواعی اذا لم یزد علی رأس الشقاق فان زاد تعین غسل ماتحت الزائد
کما فی ابن امیر حاج ومثله فی الدر لکن ینبغی ان یقید بعدم الضرر کما

لا یخفی افادہ بعض الافاضل ۱۵ (ص ۳۷) یہی حکم غسل کا بھی ہے، واللہ اعلم ۲۳ شعبان ۱۴۲۲ھ
 ناپاک دوا کا استعمال اور سوال (۵) کوئی ایسی دوا جس میں پیسہ، خاک یا اور اس قسم کی اشیاء ہوں استعمال کرنے کے دوران میں نماز پڑھنے کے واسطے تیمم بعد وضو کر لیا جاوے، یا اور کوئی صورت اعتیاد اس پر مسح کا حکم، کی جاوے پانی سے دھونا دوا کے نفع کو باطل کر دے گا،

الجواب: جس دوا میں سور کی چربی وغیرہ ہو اس کا استعمال اس وقت تک جائز نہیں جب تک کہ حکیم حاذق مسلم یہ نہ کہہ دے کہ مریض کے لئے شفاء ایسی دوا میں ہے، اور کوئی دوا نافع نہ ہوگی، اور اس صورت میں اگر دھونا مضر ہو تو عضو بخن کو کھول کر اس پر مسح کرے، اور کھولنا بھی مضر ہو تو پٹی پر مسح کرے یعنی بھیگا ہاتھ اس پر پھیر لے اور یہ مسح اس وقت تک کافی ہے جب تک عضو صحتیاب ہو، البتہ اگر پٹی کو بدلتے ہوئے ہر دفعہ نیا مسح کر لیا کرے تو احوط ہے، اور اگر یہ عضو اعضاء وضو میں سے ہو تو ہر وضو کے وقت مسح لازم ہوگا، اور تیمم بعد وضو سے کچھ نہ ہوگا، اس کی کچھ ضرورت نہیں، بلکہ لغو ہوگا، اور اگر شفاء اس دوا میں منحصر نہ ہو تو اس کا استعمال جائز نہیں، کوئی ایسی دوا استعمال کرے جس کے اجزاء طاہر ہوں، واللہ اعلم، ۲۵ رجب ۱۴۲۵ھ

فصل فی سنن الوضوء وآدابہ مکروہاتہ

وضو میں بات چیت اور کسی شخص سوال (۱) حضرت مدظلہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ، کی بات کا جواب دینا کیسا ہے؟ از طالب الخیر والدعاء گزارش ہے کہ میں وضو کر رہا تھا اور ادعیتہ ما ثورہ بھی پڑھ رہا تھا کہ ایک شخص نے مجھے مخاطب کر کے مجھ سے کچھ کہنا چاہا میں نے اس خیال سے کہ وضو میں بات چیت کرنا خلاف سنت ہے، اُن کی طرف کچھ توجہ نہ کی، وہ بول کر بھی شرمندہ ہوئے، اور پھر کہنے لگے کہ تم سے اخلاقی جرم کا ارتکاب ہوا ہے، وضو میں از خود کسی سے فضول بات کی ابتداء کرنا مکروہ ہے، اور اگر کوئی دوسرا بات کرے تو قبل اس کے کہ اس بات کی اچھائی برائی کے متعلق کوئی رائے قائم ہو اس کی بات پر کان نہ دھرنا اور متکلم کو جواب نہ دے کر شرمندہ کرنا اور وہ بھی صرف ترک مندوب کی وجہ سے یقیناً غلو فی الدین ہے، حضور سے پوچھتا ہوں کہ یہ ان کی تعریض کس حد تک صحیح ہے؟

کیا دعاء کو چھوڑ کر جواب میں مشغول ہو جاتا تو اچھا تھا، یا کیا؟
الجواب؛ بیشک وضو میں بالکل نہ بولنا اور دوسرا شخص بات کرے تو اس کو بالکل
 جواب نہ دینا بوجہ کسر قلبِ مسلم کے مذموم ہے، ادعیۃ ماثورہ کی رعایت اتنی ضروری نہیں
 جتنی قلبِ مسلم کی رعایت ضروری ہے، اس حالت میں وضو کرنے والا کم از کم اتنا ہی
 جواب دیدے کہ میں وضو سے فارغ ہو کر آپ کی بات سنوں گا، تو اس سے ادعیۃ ماثورہ
 میں خلل بھی نہ ہوتا، اور نہ ایسی بات وضو میں مکروہ ہے، فقہاء نے جو کلام فی الوضو کو مکروہ
 کہلے اُس کا مطلب یہ ہے کہ بلا ضرورت مکروہ ہے، اور اس صورت میں جبکہ دوسرا
 شخص آکر بات کرے اس کی تطیبِ قلب کی رعایت سے مختصراً جواب دینا بلا ضرورت
 نہیں بلکہ ایک حد تک ضروری ہے، قال فی نور الایضاح والمراقی ویکروہ التکلم بکلام
 الناس لانه يشغله عن الادعية ام قال الطحطاوی ما لم یکن لِحاجة تفوته
 بترکہ قالہ ابن امیر حاج ام وقولہ لانه لا يشغله عن الادعية ولا حیل
 تخلص الموضوع من شوائب الدنيا ام (۲۸) قلت والكلام فی جواب سائل هو
 لِحاجة تفوته بترکہ وهو تطیب قلب المؤمن وهو عبادة فقد روى ابو هريرة
 رضي الله عنهما قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من قرأ سورة الفاتحة في صلاة
 لم يمت حتى يولد له خير من ثمانين الف درهم، وعن ابی ذر مرفوعاً
 بتمسك في وجه اخيك لك صدقة رواه الترمذی وحسنه وصححه ابن
 حبان کذا فی التوخيذ (ص ۲۶۸ و ۲۶۹) ۳ ربيع الاول ۳۵۵ھ

وضو میں ایک ہاتھ سے منہ دھونا | سوال (۲) وضو میں ایک ہاتھ سے منہ دھونا اور سر کا مسح
 اور مسح کرنا جائز ہے یا مکروہ، کرنا مکروہ ہے یا کہ نہیں، اگر مکروہ ہے تو کس کتاب میں
 لکھا ہے، ارشاد فرمادیں؟

الجواب؛ چہرہ ایک ہاتھ سے دھونا اور سر کا مسح ایک ہاتھ سے کرنا خلاف
 سنت ہے، قال فی الدرر ولین ثلث الغسل المستوعب وفي البحر السنة
 تکرار الغسلات المستوعبات لا الغرفات ام قال الطحطاوی فی حاشیة
 مراقی الفلاح ولوا اقتصر علی مرة ففيه اقوال ثالثها ان اعتاده اشم والا لا اختار
 صاحب الخلاصة ام (ص ۴۲) وفي نور الایضاح ولین البداءة بالمیامن فی
 الیدین والرجلین قال الطحطاوی وهما عضوان مغسولان فخرج العضو

الواحد كالوجه فلا يطيب فيه التيامن والعضوان المسوحيان كالاذنين و
التخفين فالسنة (غسله) ومسحهما معا لكونه اسهل الا اذا كان اقطع فانه
يبدأ بالايمن منها يعنى من الخدين والاذنين والتخفين اه (ص ۴۴) وليس
استيعاب الرأس بالمسح اه، اور ايک ہاتھ سے غسل وجہ و مسح راس میں استيعاب
نہیں ہو سکتا، جیسا مشاہد ہے، اور خلاف سنت بھی ہو جائے تو مضائقہ نہیں، مگر اس کا
عادی ہونا مکروہ ہے، جیسا کہ لمطادوی کی عبارت سے معلوم ہوا، واللہ تعالیٰ اعلم، ۳۳ سوال

فصل فی نواقض الوضوء

سوال (۱) ایسی دوا بوا سیر جواز قسم تیل ہو اور مستہ
بوا سیر کے متوں پر تیل لگاتے ہوئے۔
ترا نگلی کا اندر داخل کر لینا ناقض وضو ہے۔
بہتر ہو۔۔۔۔۔ وہ دوا انگلی میں لگا کر بہتر پہنچانا چاہیے
اور انگلی۔۔۔ دوا پہنچانے وقت ایک گرہ سے کم بہتر جاتی ہے، پھر انگلی نکال لی گئی، تو با وضو
ہونے کی حالت میں وضو قائم رہا یا نہیں، اور جو تیل پاخانہ کے مقام پر اس عمل سے لگا رہا نجس
ہے یا نہیں، اور پا جامہ کی رومالی میں وہ تیل لگ جانے سے رومالی نجس ہوئی یا نہیں، اور وقتاً
فوقتاً دین بار ایسا عمل کرنے سے کیا حکم ہے؟

الجواب؛ قال فی الدر وکذا الوادخل اصبعه فی دُبُرہ ولم یغیبها فان
غیبها او ادخلها عند الاستنجاء بطل وضوءه وصومه اه وفي الشامية قوله و
لم یغیبها لکن الصحیح انه تعتبر البلة او الراشعة ذکرة فی المنتقی اه وفيه ایضا
وکذا لو خرج الدن من الذبر بعد ما احقن به ینقض بلا خلاف اه (ص ۵۴) و
۵۵ ج ۱) وفيه ایضا قلت ولكن لو ادخلها عند الاستنجاء ینتقض وضوءه
ایضا لانها لا تغلوعن البلة اذا خرجت کما فی شرح الشیخ اسمعیل عن الواقعات
وکذا فی التاتارخانية لکن نقل فیها ایضا عن الذخيرة عدم النقض والذي
یظهر هو النقض لخروج البلة اه،

خلاصہ یہ کہ جب انگلی کو تر کر کے دُبر میں داخل کیا جاوے گا تو وضو ہر حال میں ٹوٹ
جائے گا، خواہ فاسب ہو یا نہ ہو، اسی طرح جو تیل دُبر میں لگایا گیا ہے جب وہ باہر نکل آوے گا
تو وضو ٹوٹ جائے گا، کیونکہ وہ تیل نجس ہے، پس رومالی میں جو تیل لگا ہوا ہے اگر وہ اندر سے

آنے والا ہے تب تو ردی ناپاک ہے، اور اگر وہ تیل ہے جو اندر سے نہیں آتا بلکہ باہر ہی سے لگتا ہے تو ناپاک نہیں، ہر حال میں حسیا ط ضروری ہے، مریض کو چاہئے کہ جب وہ تیل لگا چکے تو فوراً کسی دوسرے کپڑے سے دُبر اور اس کے حوالی کو اچھی طرح تیل سے صاف کر دیا کرے، اس کے بعد بھی اگر تیل کا اثر باہر ظاہر ہو تو وہ اندر سے آنے والا ہے جس سے یقیناً کپڑا ناپاک ہو جائیگا۔

..... (۲) سوال
 استنجے کے بعد قطرہ کا شبہ ہونا

..... ایک شخص قریب چار سال سے قطرہ کے مرض میں مبتلا ہے، چند دنوں سے اس کی حالت یہ ہوئی کہ بعد وضو یا درمیان نماز خفیف سی حرکت معلوم ہوتی ہے جس سے وہم ہوتا ہے کہ قطرہ آگیا، اور جب دیکھا جاتا ہے تو اکثر اوقات کچھ نہیں ہوتا، شاذ و نادر پندرہ بیس دفعہ کے بعد ایک آدھ دفعہ قطرہ دکھائی دیتا ہے، ورنہ اکثر وہم ہی وہم رہتا ہے اب سوال یہ ہے کہ اس صورت میں کہ شاذ و نادر خروج ثابت ہوتا ہے اور اکثر نہیں، آیا دیکھنا واجب ہے یا نہیں، بینوا تو حسروا،

الجواب؛ قال فی الخلاصة ومن توضأ ثم رأى الببل سائلا من ذكره اعاد الوضوء فان كان الشيطان يريه كثيرا او لا يعلم انه بول او ماء مضي على صلوة وينبغي ان ينضح فرجه وازارته بالماء اذا توضأ قطعاً للوسوسة لكن هذه الحيلة انما تنفع اذا كان قريبا لعهد من الوضوء اما اذا كان بعيدا وجف عضوه لا ينفعه هذا وهذا اذا لم يستيقن انه بول فان تيقن لا ينفعه الحيلة اهـ ص ۱۸ ج ۱، وفي العالم كبرى شك انه كبر لا افتتاح او لا او هل احدث او لا او هل اصاب النجاسة ثوبه او لا او مسح رأسه او لا استقبال ان كان اول مرة والا مضي في صلوته ۱۲ ولا يلزم الوضوء ولا غسل ثوبه كذا في فتح القدیر اهـ ص ۸۲ ج ۱، وفي الخلاصة ايضا وعلى هذا (لا يجب عليه الاعادة ۱۲) اذا ظهرت السند او على رأس الاحليل بعد الفراغ من الصلوة ولم يعلم انها ظهرت في الصلوة وهذا اذا لم يشك في الصلوة اما اذا شك في الصلوة وتيقن بالسند ولا بعد الفراغ من الصلوة يجب عليه اعادة الصلوة اهـ ص ۱۷ ج ۱،

صورت مسئلہ میں جب وہم کا غلبہ ہو تو وہم سے وضو فاسد نہیں ہوتا، نہ نماز میں نقصان لازم آتا ہے، اور اس کا مقتضایہ ہے کہ دیکھنا بھی واجب نہیں، البتہ اگر غالب ظن یہ ہو جائے

کہ قطرہ آگیا تو دیکھنا واجب ہے، نماز میں ہاتھ لگا کر دیکھ لے اور خارج صلوٰۃ جس صورت سے آسانی ہو دیکھ لے، اور اگر نماز میں قطرہ کا شک ہو گیا ہو غالب ظن نہ ہو تو بعد فراغ از نماز فوراً دیکھ لینا چاہئے، اگر تری کا تیقن ہو جائے تو اعادۃ صلوٰۃ واجب ہے، اور ایسے مبتلی کو بعد وضو کے اپنے عضو اور انگلی کو بھگو لینا چاہئے، پھر جب تک پیشاب کے قطرہ کا تیقن نہ ہو ہریم کو اسی پر محمول کرے کہ پانی کی تری ہوگی، جب تک کہ عضو اور کپڑا خشک نہ ہو جاوے، واللہ اعلم، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات سوال (۳) بعد ہدیہ منیہ و تحفہ بہیہ مرضیہ آنکہ کی طہارت اور آپ کے حق میں ان کے اوعظہ و اشرار و عظ غفۃ کہ فضلات یعنی بول و براز و ریم و ناقض وضو ہونے کی تحقیق، خون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طیب و طاهر بودند و شفاء و درو بودند، در حق شان ناقض وضو و غسل ہم نبودند، آنچہ وضو و غسل آزاں حضرت منقول است آن تعلیماً للامۃ فرمودہ بودند، این مسئلہ گرفتہ ما بین چہاں بلکہ بعض خواص بسیار قیل و قال می شود، رائے اکثر بلکہ کل بر این ست کہ آنچہ حضرت فیض درجت تحریر فرمایند عمل و اعتقاد کردہ شود، لہذا حضور موفور السرور و تصدیقہ دادہ می شود کہ این مسئلہ را از کتب صحاح و تفسیر وفقہ حنفیہ مفصل و مدلل ارقام فرمودہ تسل فرمایند و نیز تفصیل فرمایند کہ طہارت شان لذاتہ و لغیرہ عام بود یا خاص و باز طہارت شان موقوف بوقت خاص شدہ یا علی الاطلاق، والا جبر علی اللہ الاکبر،

الجواب: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات تو طاهر ہیں، جمہور علماء اس طرف گئے ہیں لیکن یہ کہ ان کا خروج آپ کے حق میں ناقض وضو تھا یا موجب غسل نہ تھا غلط ہے حدیث صحیح میں جسکو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے وارد ہے کہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم خرج وقد اقيمت الصلوة وعدت الصفوف حتى اذا قام في مصلاه انتظرونا ان يكبر انصرف وفي رواية ابى داود ودخل في صلوٰۃ الفجر فكبر، قال علي مكانكم فمكثنا على هيئتنا حتى خرج الينا ينطفئ رأسه ماء وقد اغتسل اھ زاد الدارقطني فقال اني كنت جنباً فنسيت ان اغتسل (فتح الباری ص ۱۰۲ ج ۲) اگر آپ نے نماز شروع کر دی تھی اور پھر غسل کے لئے قطع کی تو ظاہر ہے کہ جنابت آپ کے لئے موجب غسل تھی جب ہی تو نماز کو قطع کرنا جائز ہوا، ورنہ ایک

امر مندوب کے لئے نماز قطع نہیں ہو سکتی، اور اگر نماز شروع بھی نہ کی ہو تب بھی مقتدیوں کو اتنی دیر تک انتظار میں کھڑا رکھنا بدون کسی ضرورت شدیدہ کے نہیں ہو سکتا، معلوم ہوا کہ جناب سے آپ کے ذمہ بھی غسل واجب ہوتا تھا، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً القرآن علی کل حال مآلہ یکن جنبا صتہ ابن عباس والترمذی کذا فی بلوغ المرام (ص ۱۸ ج ۱) اس سے بھی معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی ان احکام کے پابند تھے، ایک دفعہ حضور پیشاب فرما رہے تھے، ایک شخص نے سلام کیا تو آپ نے فوراً جواب نہیں دیا بلکہ استبراء کے بعد دیوار پر ہاتھ مار کر تیمم کے بعد جواب دیا، اور فرمایا کرہت ان اذکر اللہ الاعلیٰ طہارۃ، رواہ ابوداؤد (ص ۱ ج ۱) اس سے معلوم ہوا کہ پیشاب کر کے آپ کا وضو اور طہارت بھی زائل ہو جاتا تھا، اور علماء نے احکام کے متعلق قاعدہ مقرر فرمایا ہے، لا یثبت الخصوصية الا بدلیل، اس لئے احکام نواقض وضو ووجبات غسل وغیرہ میں جملہ ائمہ اربعہ نے حضور کے افعال سے استدلال کیا ہے اور کسی کو حق نہیں ہے کہ محض فضیلت کے طاہر ہونے سے ان امور کو آپ کے حق میں غیر تابع وضو یا غیر موجب غسل کہے، ہذا واللہ اعلم، ۵ ربيع الثاني ۱۳۲۳ھ

شفار الاستقام فی احکام الزکام

زکام میں رطوبات سائلہ من الالنف | سوال (۳) ایک مسئلہ کے متعلق متعدد کتب کو دیکھا
کی طہارۃ و نواقض وضو نہ ہونے کی تحقیق | مگر اطمینان نہیں ہوا، جناب کی خدمت میں عرض کرتا ہوں
جناب کی نظر وسیع میں اگر اس کے متعلق کہیں تصریح ہو تو تحریر فرما کر ممنون فرماؤں، نیز
اپنی رائے عالی سے بھی مطلع فرماؤں، حضرت اقدس سلمہ سے بھی اگر دریافت فرمایا جائے تو
فوراً علی نور، وہ یہ کہ ہے کہ حالت زکام میں ناک سے جو دماغی رطوبات بصورت سیلان نکلتے
ہیں آیا نواقض وضو ہیں یا نہیں اور نجس ہیں یا نہیں، فقہاء کی عبارت سے بظاہر معلوم ہوتا
ہے کہ یہ نواقض وضو ہے، ثم الجرح والنقطة وماء الشدی والسترۃ والاذن إذا
کان لعلہ سوا علی الاصح ام فتح القدیر، ص ۳۴ ج ۱، بحر الرائق ص ۳۲ ج ۱

عہ سہ ماہ بہ سیدی حکیم الامتہ دام مجدہ وعلاہ ۱۲ ظفر احمد

فتاویٰ ہندیہ ص ۱۰ ج ۱۔ ولا فرق بین الرمد وغيره من الالوجاع ولا بین ما من العین او غیرہا بل کل ما ینخرج من علتہ من ائی موضع کان كالاذن والشدی والسرۃ ونحوہا فانہ ناقض علی الاصح لانہ صدید اکبیری ص ۱۳۱، وفي التبین والفتح الخارج من الاذن او الصدید ان کان بدون الوجع لا ینقض ومع الوجع ینقض لانہ دلیل الجرح روى ذلك عن الحلواني اه وفيہ نظریں الظاہر اذا کان الخارج قیخاً او صدیداً ینقص سواء کان مع وجع او بدونہ لانہما لا ینخرجان الا من علتہ نعم ہذا التفصیل حسن فیما اذا کان الخارج ماء لیس غیرہ بحول الرائق ص ۱۳۲،

صاحب بحر کی اس نظر سے بھی بظاہر ناقض ہی معلوم ہوتا ہے، علامہ شامی فتح القدر اور بحر الرائق کی عبارت ختم الجرح والنقطۃ الخ کے نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں وفيہ اشارۃ الی ان الوجع غیر قید بل وجود العلة کاف، رد المحتار، ص ۱۰۴ ج ۱، لغویین اور اطباء کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ زکام کی حالت میں دماغ میں کوئی جرح یا قرحہ نہیں ہوتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پانی صدید و قیح تو نہیں، الزکام بالضم والذکمة تجلب فضول رطبة من بطنی الدماغ المقدمین الی المنخرین، قاموس، اس کے قریب قریب اطباء نے بھی یہی تعریف زکام کی کی ہے، جس سے بصراحت معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف رطوبہ فاضلہ ہیں، صدید و قیح نہیں،

فتاویٰ رشیدیہ حصہ دوم ص ۳، میں ہے ”الجواب“ آنکھ دیکھنے میں جو پانی نکلتا ہے پاک ہے، اگرچہ بعض علماء نے ناپاک کہہ دیا ہے، لیکن تحقیق کے خلاف ہے فقط، واللہ تعالیٰ اعلم، اس کلام و جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ زکام کا پانی بھی ناپاک نہیں ہے ورنہ ما بہ الفرق کیا ہے، نیز یہ جواب بعض فقہاء کی عبارات کے خلاف ہے، وعلى هذا قالوا من رمدت عينه رسال الماء منها وجب عليه الوضوء اه فتح القدير، ج ۱، ان عبارات کو ملاحظہ فرما کر قول فیصل تحریر فرماویں،

الجواب؛ قال فی الدر ولا ینقصہ قیخ من بلغم علی المعتمد اصلہم ”قال الشامی“ ای سواء کان صاعداً من الجوف او نازلاً من الرأس، خلافاً لابن یوسف فی الصاعد من الجوف والیہ اشار بقوله علی المعتمد ام (ص ۱۴۳)

قلت اطلق في النازل من الرأس فشمّل المزموم وغيره وفي مراقى الفلاح و
ينقصه قعي طعام وماء وان لم يتغير او يخلق او مرة اذا ملا الفم لتنجسه بما في
قعر المعدة اه قال الطحاوي قوله وان لم يتغير اشاربه الى انه لا فرق بين
انواع القيح سواء قاء من ساعته ام لا وقال الحسن اذا تناول طعاما او ماء ثم
قاء من ساعته لا ينقض وضوئه وقال الزاهدي ومحل الاختلاف اذا وصل
الى معدته ولم يستقر اما الوقاء قبل الوصول وهو في المرنى فانه لا ينقض اتفاقا
اه (ص ۵۲) قلت وظاهر ان ماء الالف انما ينزل من الرأس ولا يصعد من
المعدة فلا ينقض اتفاقا وفيه ايضا (ص ۵۵) وهو راي البلغم طاهر اه
قال الطحاوي اي عندهما مطلقا لانه بزاق حقيقة والبزاق طاهر لان
الرطوبة ترقى اعلى الحلق فتصير بزاقا وفي اسفله تغلظ فتصير بلغم فلم يخرج
من المعدة اه قلت ولما كان ذلك حقيقة البلغم فله حكم البزاق سواء سال
من الالف او من الفم وفي الخلاصة وان قاء بلغما ان نزل من الرأس فهو
كالبزاق وان صعد من الجوف فكذلك عندهما وقال ابو يوسف ينقض ان
كان ملا الفم اه (ص ۱۵ ج ۱)

وفي مراقى الفلاح مع الطحاوي ايضا عن الجوهرية الماء الصافي اذا
خرج من النقطة لا ينقض وفي التبیین ولو كان بعينه رمد او عيش يسيل
منها الدموع قالوا يؤمر بالوضوء لوقت كل صلوة لاحتمال ان يكون صديدا او
قيحا قال العلامة الشلبی فی حاشیة علیه قال الشيخ كمال الدين في فصل
المستحاضة اقول هذا التعليق يقتضي انه امر استحباب فان الشك والاحتمال
في كونه ناقضا لا يوجب الحكم بالنقض اذا اليقين لا يزول بالشك الى ان قال
وهما يشهد لهذا (اي لكونه امر استحباب) ما في الشرح الزاهدي عقيب هذه
المسئلة وعن هشام في جامعه ان كان قيحا فكا المستحاضة والا فكا الصحيحة
واما قولهم ماء الجرح والنقطة وماء السرة والثدي والعين والاذن ان كان
لعله سوا " ينبغي ان يحمل على ما اذا كان الخارج من العين متغيرا بسبب
ذلك اه (ص ۵۴) قلت وما ينزل من الماء في الزكام ليس لعله جرح او قرحة

کمالا یخفی ومع ذلك فهو ماء صاف ليس بتغير فكان كماء العين الصافي
فلا ينقض ولا يكون نجسًا وقال البدر العيني في شرح البخاري له تحت حديث
وما تنخم النبي صلى الله عليه وسلم النخامة الا وقعت في كف رجل
منهم فذلك بها وجهه وجلة ما نصه بيان استنباط الاحكام منها الاستدلال
على طهارة البصاق والمخاط، قال ابن بطال وهو امر مجمع عليه لا نعلم فيه خلافاً
الاماروي عن سلمان انه جله غير طاهر وان الحسن بن حي كرهه في الثوب و
عن الاوزاعي انه كره ان يدخل سواكه في وضوئه وقال بعض الشراح ما
ثبت عن الشارع من خلافهم فهو المتبع والحجة البالغة فلا معنى لقول من
خالف ام (ص ۹۲۵ ج ۱) وقال قبل ذلك بصفحة والمخاط بضم الميم ما يسيل
من الانف ام قلت اطلقوا في طهارته ولم يقيده بغير المزكوم فهو طاهر مطلقاً،
وذكر في البحر والحقوا بالقى ماء فم النائم اذا صعد من الجوف (راى البطن)
بان كان اصفر او منتناً وهو مختار ابي نصر وصح في الخلاصة طهارته وعند ابي
يوسف نجس ولو نزل من الرأس فطاهر اتفاقاً ام (ص ۳۵) وصرح قبل ذلك
بطهارة المخاط النازل من الرأس ولو كان كثيراً فاحتشاور على الخلاصة حيث
ذكر فيه خلاف ابي يوسف وانما خلافة في الصاعد من الجوف فليراجع، و
قال قاضي خان الماء اذا اختلط بالمخاط او بالبزاق جاز به الوضوء ويكره ام
(ص ۱۰ ج ۱) اطلق في المخاط ولم يقيده بغير المزكوم فلو كان مخاط المزكوم نجسا
حد ثا لزم التقييد به والكراهة التي ذكرها للاستقذار عن مثل ذلك
الماء طبعاً، بهر حال فقهاء كل ان اطلاقات او تصريحات سے معلوم ہوتا ہے کہ رطوبات سائلہ
من الانف مطلقاً طاہر ہیں، الا ان يكون دماً، والله اعلم،

تتمۃ الكلام

ثم رأيت الشامي قد بحث عن المسئلة صلحة فقال تحت قول الدور
صاحب عذر من به سلس البول او استطلاق بطن الى ان قال وكذا كل ما
يخرج بوجع ولو من اذن وقدى وسرة ام ما نصه ظاهراً يعنى الانف اذا زك

لكن صر حوايان ماء فم النائم طاهر ولو متنا فتامل ام رص ۳۱۲ ج ۱ باب
 المعذورين) وفي التحرير المختار قوله لكن صر حوايان فم النائم الخ اي فمقتضى
 ما صر حوايه ان لا يكون الزكام ناقضا بالاولى لانبعائه من الرأس الذي ليس
 محل النجاسة وانبعاث الاول من الجوف الذي هو محلها لكن يفرق بينهما
 بان الزكام خارج بعله بخلاف ماء فم النائم ولو متنا ام رص ۳۹ ج ۱
 قلت ان اراد بالعلة مطلق المرض فوجوده في الزكام مسلم ونفيه عن ماء
 فم النائم ممنوع لان الماء لا يسيل عن فم النائم الا لعلة في جوفه كعدو
 الديدان فيه ونحوه وان اراد بها الجرح والقرح فنفيه عن ماء فم النائم
 مسلم ولا تسلم وجوده في الزكام فان حقيقته تجلب الفضول الرطبة من
 بطنى الدماغ المقدمين الى المنخرين تجلب الفضول من بطنى الدماغ المقدمين
 الى الحلق وسمى نزلة كذا في الكشاف للتهانوى رص ۲۱۹ ج ۲ وسببه
 حرارة الدماغ او برودته طبيعتين كانتا او عارضتين كما في شرح الاسبا
 ولم يقل احد ان سببه جراحة في الدماغ او قرحة فيه والظاهر ان
 المراد بالعلة في كلام الفقهاء الجرح لا مطلق المرض والا لزم كون الدم
 ناقضا ايضا لا سيما من ضعيف القلب فانه لا يبكي الا لعلة في قلبه وكذا
 ريق من كان مبتلى بكثرة سيلاته كما يشاهد في كثير من الناس وفيه
 مخالفة للنصوص الدالة على طهارته مطلقا وعليه الاجماع كما مر ايضا
 فيه من الجرح مالا يخفى وهو مدفوع بالنص ما جعل عليكم في الدين من
 حرج فالصحيح ان ماء فم النائم والزكام سواء بل عدم النقص في الثاني
 اولى كما ذكره في التحرير اولا وايضا فاطلاق المتقدمين بطهارة النازل
 من الرأس وعدم تعرضهم لبيان الخلاف فيه وذكرهم ذلك فيما يصعد من
 الجوف من البلغم يرد هذا البحث ويستأصله فلو كان في الزكام وسوستهما
 لما سكتوا عنه وقد ورد في الحديث عن سلمة بن الاكوع انه سمع النبي
 صلى الله عليه وسلم وعطس رجل عنده فقال له يرحمك الله ثم عطس
 اخرى فقال الرجل مزكوم رواه مسلم وفي رواية للترمذي انه قال في الثالثة

انہ مذکور اہم ولم یا مرہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالاحتراز عما یرج من
انفہ وعن ابی ہریرۃ قال شمت اخاک ثلاثا فان زاد فهو زکام رواہ ابوداؤد و
قال لا علمہ الا انہ رفع الحدیث الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم کذا فی
المشکوۃ (۳۴۶) ولم یرد فی نص ما انہ امرہ بالاجتناب عن ماء زکامہ
فالظاهر ما قلنا انہ طاهر ولس بنجس ولا ناقض وروی الشیخان عن ابی ہریرۃ
ہر فوعا ان اللہ یحب العطاس ویکرمہ التثاؤب کما فیہ ایضاً (ص مذکور)
ولا یخفی کثرۃ العطاس فی الزکام فلو کان ناقضاً ونجساً لم یکن محبوباً مطلقاً بل
ذکرہ الشارح حدا معلوماً واذ لیس فالقول بنجاسة ماء الزکام وبکونه ناقضاً
للموضوع خلاف النصوص واللہ تعالیٰ اعلم، حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از تھانہ بھون ۲۴ رجب ۱۳۸۵ھ، نعم التحقیق وبالقبول حقیق، اشرف علی عفی ۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۵ھ

درمیان نماز قطرہ آجائے | سوال (۵) نماز پڑھنے کی نقل و حرکت میں جبکہ قطرہ آجاتا ہے
تو وضو ٹوٹ جائے گا، تو وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں، اور اب پھر وضو کر کے اپنی بقیہ نماز

ادا کی جاوے، یا نماز کی ضرورت نہیں ہے اور کپڑے کو بدل دے یا اسی سے نماز ادا کرے،
جب کبھی ایسا موقع ہوا ہے تا بعد ارنے نہ وضو دوبارہ کیا ہے، نہ یا تجامہ بدلا ہے، یہ شبہ
ابھی تک قائم ہے، اور خیال ہوتا ہے کہ نماز ہوتی ہے یا نہیں؟ لہذا امیدوار ہوں کہ مفصل
جواب سے مطلع کیا جاؤں،

الجواب؛ وضو ٹوٹ جاتا ہے، اس لئے دوبارہ کیا جاوے، پھر خواہ برعایت
شرائط بنا کی جاوے یا نماز دوبارہ پڑھ لی جاوے اور ردپیہ کے پھیلاؤ میں کپڑا نجس ہو گیا کہ
تو اس کو بھی بدلنا ضروری ہے، اس میں نماز نہ ہوگی، اور اگر ردپیہ کے برابر نجاست نہ لگی ہو تو
اسی کپڑے میں نماز ہو جاوے گی، مگر عمداً اتنی ناپاکی کا بھی کپڑے میں رکھنا مکروہ تحریمی ہے،
مگر جبکہ کثرت عذر سے کپڑے بدلنے میں حرج ہو تو مضائقہ نہیں، کما ہوا الظاہر،

الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ ۸ ربیع الثانی ۱۳۸۵ھ، احقر عبدالکریم گتھلوی عفی عنہ ۸ ربیع الثانی ۱۳۸۵ھ
گالی اور فحش گوئی سے | سوال (۶) وضو کے بعد زبان گالی یا اور کوئی فحش کلمہ نکالنے سے
وضو نہیں ٹوٹتا، وضو میں کیا نقص آتا ہے، کیا وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

الجواب؛ وضو کے بعد گالی دینے سے وضو تو نہیں ٹوٹتا، لیکن اس کا نور کم ہو جاتا ہے

اس لئے دوبارہ کر لینا بہتر ہے، قال فی نور الایضاح وشرحہ وندب الوضوء الی ان قال وبعد کلام غیبة وکذب ونميمة وبعد کل خطیئة رمنها الشتمة وهي السب فی الوجه ۲۲ (ظ) وانشاد شعر قبیح لان الوضوء یکفر الذنوب الصغائر وقہقہمة خارج الصلوة لانہا حدث صورة ام (ص ۲۹) قلت والتعلیل یفید الذنب ولو کان الرجل علی وضوء لاجل تکفیر هذه الذنوب وايضا فذکر ذنبہ بعد القہقہمة یفید ندبہ ولو کان علی وضوء حتماً فکذا قرأ ثلثها، واللہ اعلم

۲۵ رجب ۱۲۵۰ھ

سوال (۷) ایک عورت نے نماز کے واسطے وضو کی، پھر نماز بچے کو دودھ پلانے سے وضو نہیں ٹوٹتا، نماز میں دودھ پیا تو نماز فاسد ہو جائے گی؟ وضو ٹوٹ گئی یا رہ گئی؟

الجواب: اگر پستان سے دودھ نکلا بھی ہو تو عورت کی نماز تو فاسد ہو جائے گی وضو میں نقصان نہیں آیا، (شامی ص ۲۲ ج ۲) ۲۳ رمضان المبارک ۱۲۵۰ھ

سوال (۸) آجکل ہندوستان اور غیر ہندوستان میں نصاریٰ کا عورت پر نظر پڑ جانے سے وضو نہیں ٹوٹتا بہت زور ہے، اور انہی کی اکثر جگہ حکومت ہے، اور نصاریٰ کے علاوہ

ہندوؤں میں بھی رواج ہے کہ ان کی عورتیں خوب عمدہ لباس پہن کر نکلتی ہیں، اور ان کے علاوہ اور قومیں بھی جو بازاروں میں اور راستوں میں برابر آتی جاتی ہیں، اور خصوصاً نصرانی عورتیں جن کا لباس اس قسم کا ہے کہ اُن کے ہاتھ کندھوں تک اور پاؤں گھٹنوں تک برہنہ ہوتے ہیں، آگے گلا وغیرہ کھلا رکھتے ہیں، اور اُن کے لباس اس قسم کے ہوتے ہیں جس میں بدن وغیرہ نظر آتا ہے، اب اس کے بعد یہ عرض ہے کہ مسلمان آجکل جتنے ہیں وہ اپنے نفس پر قادر نہیں ہیں، اور نہ اُن کی ایسی حالتیں ہیں جو غیر محرم پر نظر ڈالیں تو وہ بہ نظر شہوت نہ ہو، اور بہت کم ایسے... مسلمان بزرگ ہیں جو ایسے مجامع کو دیکھ کر اپنے نفس پر قادر رہتے ہیں، ان تمام موجودہ حالات کو دیکھ کر عرض ہے کہ اگر کوئی شخص با وضو ہو تو اس کا وضو ہو گا یا جاوے گا، حالانکہ فقہاء کرام کا مطلب یہی ہے کہ وضو نہیں جاوے گا مگر یہ کیا اجازت دیتا ہے، کہ نظر شہوت پڑنے کے بعد وضو ہوتا ہے یا نہیں، اور ایک یہ ہے کہ لوگوں کی حالت ان حسین عورتوں کو دیکھ کر متغیر ہو جاتی ہے، اور نظر تو یقیناً شہوت

کے ساتھ ہوتی ہے تو پھر اس صورت میں کیا حکم ہے، اور سائل خود بھی یہ جانتا ہے کہ وضو احسان کے مسلک پر نہیں جاتا ہے، مگر زید لوگوں کو اس زمانہ کے حالات کو دیکھتے ہوئے وضو کرنا اچھا بتلاتا ہے، اور یہ کہتا ہے کہ اگر ایسا زمانہ نازک جیسا کہ موجود ہے اگر فقہاء کرام کے سامنے ہوتا تو ضرور دوبارہ وضو کرنے کی اجازت دیتے اور بہت سارے اشخاص ایسے ہیں کہ جب حسین عورت پر نظر پڑتی ہے تو وہ شہوت کے ساتھ ہوتی ہے، آجکل بہت کم ایسے لوگ ہیں جو اس سے محفوظ ہوں، تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب؛ نگاہ کا اٹھانا اور کسی کو دیکھنا امر مستحبابی ہے، آنکھیں اور نگاہیں خود بخود کسی پر نہیں پڑ جاتیں لہذا ایسے وقت میں مردوں کو نگاہ نیچی رکھنی چاہئیں لیکن اگر شہوت سے کسی عورت پر نظر پڑ جائے تو اس سے وضو نہ ٹوٹے گا، نہ حنفیہ کے مسلک پر نہ کسی اور کے مسلک پر ہاں اگر عمدتاً عورت کو دیکھا ہو تو یہ گناہ ہے، اور ہر گناہ کے بعد وضو کر کے توبہ کرنا مستحب ہے، اور مطلق توبہ تو واجب ہے، قال فی المراقی الفلاح وبعد کل خطیئۃ وانشاء شعر الخ، ص ۴۴، ۱۰ شعبان ۱۳۴۸ھ

فصل فی وجوب الغسل فرایضہ و سننہ و آدابہ؛

سوال (۱) حضور میرے منہ کے اندر ایک دانت کیڑا کپڑا پانی پہونچانا فرض ہے یا نہیں؟ اور کھایا، اب فوق کی طرف دانت کیچوں بیچ ایک سوراخ ہو گیا ہے، کچھ کھانے پینے کی چیز اس کے اندر گھس رہی ہے وہ نکلنے میں مشکل، یعنی آدہ درکا ہوتا ہے، نکلنے کے بعد پھر کوئی چیز کھانے یا پینے سے دانت میں درد معلوم ہوتا ہے، ٹھنڈا پانی پہونچنے سے تکلیف ہوتی ہے، اب فرض غسل وضو کرنے کے وقت وہ سوراخ مذکور میں پہونچی ہوئی چیز نکالنی پڑے گی یا بغیر نکالنے کے وضو اور فرض ادا ہوگا، اس سوراخ میں پانی پہونچانا فرض ہے یا نہیں؟

الجواب؛ قال فی مرقی الفلاح فی بیان فرایض الغسل وغسل الفم والالاف ام قال الطحطاوی ای بدون مبالغۃ فیہما فانہما سنۃ فیہ علی المعتمد ولو کان سنۃ مجتہداً فبقی فیہ طعام او بین اسنانہ او کان فی انفہ درن رطب اجزاء ام (ص ۵۹) غسل کی حالت میں دانت کے سوراخ میں پانی

پہونچانا فرض نہیں، اور پہونچائے تو اچھا ہے،

عورت کا فرج میں دوا رکھنا | سوال (۲) قابلہ جو دوا رکھتی ہے اس دوا کے رکھنے سے
موجب غسل ہے یا نہیں، غسل تو واجب نہیں ہی یا ہے؟

الجواب؛ قول مختار میں تو مطلقاً غسل نہیں اور صاحب منیہ نے بحثاً کہا ہے کہ احتیاط
وجوب غسل میں ہے، بشرطیکہ مقصود استمتاع یا استلذاز ہو، اور جو مقصود محض تداوی ہو
جیسا سوال میں مذکور ہے تو ان کے نزدیک بھی غسل نہیں، قال فی الدرر والاعتدال
اصبع ونحوہ فی الدبر والقبل علی المختار اہم ونقل الشامی من کلام نوح افندی
علی التجنیس ان المختار وجوب لغسل فی القبل اذ قصد الاستمتاع لان
الشهوة فیہن غالبۃ فبقام السبب مقام المسبب قال وقولہ لان المختار
وجوب الغسل الخ بحث منه سبقہ الیہ شارح المنیۃ حیث قال والاولی
ان یجب فی القبل الخ وقد نبتہ فی الامداد ایضاً علی انہ بحث من شاح
المنیۃ فافہم، واللہ اعلم، ۸/ ذی الحجہ ۱۴۲۸ھ

عورت کے اندام نہانی میں شہوت | سوال (۳) آدمی کا عورت کی جائے مخصوص میں انگلی
یا بغیر شہوت انگلی داخل کرنے سے داخل کرنے سے شہوت یا غیر شہوت صرت فاعل یا
صرت فاعل یا دونوں پر غسل واجب؟ دونوں پر غسل فرض ہوگا یا نہیں؟ والسلام

الجواب؛ اگر انگلی داخل کرنے کے وقت عورت کی شہوت براہیگختہ ہو جائے
تو ایک قول میں عورت پر غسل واجب ہو جائے گا، اور ایک قول میں واجب نہیں جب تک
انزال نہ ہو، اور احتیاطاً غسل ہی میں ہے، اور اگر عورت کی شہوت براہیگختہ نہ ہو تو غسل
کسی قول میں واجب نہیں، اور فاعل ادخال اصبع پر بھی غسل نہیں والمسئلۃ مذکورۃ
فی شرح المنیۃ (ص ۲۴) وفی الدرر (ص ۱۷۱) وجعل فی الدرر عدم وجوب
الغسل هو المختار وفی الشامیۃ حکى عن نوح افندی وشرح المنیۃ ان وجوب
الغسل هو المختار واللہ اعلم، ۲۶/ شعبان ۱۴۲۸ھ

غسل جمعہ کے بجائے معذور یا غیر معذور | سوال (۴) کئی روز سے ایک
تیمم کر لے تو مؤدی بالسنۃ ہوگا یا نہیں؟

جنزئی کی تلاش میں ہوں، ملی نہیں، اس لئے حضرت کی خدمت میں درخواست ہے کہ اگر نظر

گذری ہو یا استاذی مولانا ظفر احمد صاحب کوئل سے تو حضرت ممنون فرمادیں، غسل جمعہ کی بجائے اگر معذور یا غیر معذور تیمم کر لے تو مؤدی بالسنة ہو گا یا نہیں، مالکیہ و شافعیہ میں یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، مالکیہ کے نزدیک یہ غسل معطل بالراحۃ الکمرہ میں ہے، اس لئے تیمم اس کے قائم مقام نہیں اور شافعیہ کے نزدیک معطل باکمل الطہارتین ہے، اس لئے تیمم کافی ہے، حنفیہ کی عبارات سے دونوں کا علت ہونا معلوم ہوتا ہے، بعض فقہاء پہلی علت کی بناء پر شب جمعہ کے غسل کو بھی کافی لکھتے ہیں اور بعض اس کی علت علی اکمل الطہارتین فرماتے ہیں، اس لئے کلیہ سے بھی حکم نہیں نکلتا، ذکر کیا کاندھلوی سہارنپور ۱۵۰۵ رمضان ۱۳۸۵ھ

الجواب؛ اس وقت تک اس مسئلہ میں کوئی جزئیہ صریحہ نہیں ملا، مگر احادیث و اقوال فقہیہ سے راجح یہ ہے کہ امر غسل جمعہ میں اصل علت تنظیف ہے، اور گو تنظیف دو سکرایام میں بھی ہو سکتی ہے، مگر جمعہ کی تخصیص بوجہ اس کے یوم الاجتماع ہونے کے ہے، و ہو علت تخصیصہ یوم العید ایضا و ہوا لظاہر من قول صاحب الہدایہ و بہ ورد لتصریح فی حدیث عائشہ و ابن عباس فی بدر الغسل، اور جب راجح یہ علت ہے تو تیمم اس کا قائم مقام نہیں ہو سکتا، نہ معذور کے لئے نہ غیر معذور کے لئے، ہذا ناظر لی واللہ تعالیٰ اعلم، ۹ رمضان ۱۳۸۵ھ

سوال (۵) زید کو غسل کی حاجت ہوئی اور قبل نماز مخبر غسل کیلئے نیت شرط نہیں ہے

اس نے غسل کیا، اور غسل کے وقت نیت یہ کی کہ ناپاکی دور ہونے اور نمازیں پڑھنے کے واسطے غسل کرنا ہے، ایسی حالت میں کیا بعد غسل ناپاکی نماز کے لئے اس کو دوبارہ غسل کرنا ہو گا؟

الجواب؛ غسل کے لئے نیت شرط نہیں ہے، اگر بدون نیت بھی غسل کیا جائے تو اس کے بعد نماز پڑھ سکتا ہے، گو نیت کرنا بہتر ہے، اور جب بطریق مذکورہ سوال غسل ہو چکا تو پھر اس کو دوبارہ غسل کی حاجت کیا رہی، باقی رہا یہ کہ ایک ناپاکی کا غسل ہو اور ایک نماز کا غسل ہو، یہ بالکل نئی گھڑت اور محض بڑھل ہے، کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ، ۲۲/۲/۱۳۸۵ھ

سوال (۶) خواب میں احتلام ہوا، محتلم کو قرائن خارجہ سے اس کا یقین ہو کہ منی بغیر شہوت دفع کے خارج ہوئی ہے، تو آیا اس صورت میں غسل فرض ہے یا نہیں؟

جواب میں احتلام ہوا، محتلم کو قرائن خارجہ سے اس کا یقین ہو کہ منی بغیر شہوت دفع کے خارج ہوئی ہے، تو اس صورت میں غسل فرض ہے یا نہیں؟

قرائن خارجیہ مثلاً ایک شخص بوجہ کبرسنی کے عدیم الشہوت ہے، اب اس کو احتلام ہوتا ہی نہیں، تو اس کو عدیم الشہوت ہونے کی وجہ سے یقین ہو کہ یہ احتلام غیر دفت و شہوت کی حالت میں ہوا ہے، یا مثلاً ایک شخص مریض ہے جو سیلانِ منی و کثرتِ احتلام کے مرض میں مبتلا ہے اور علامات و اسباب کو دیکھ کر اس کو یقین ہے کہ یہ منی جو سوتے میں خارج ہوئی ہے بغیر شہوت و دفت کے ہوئی ہے، اور کتبِ طبیہ مثلاً شرح اسباب وغیرہ میں مصرح ہے کہ جس کثرتِ احتلام کا سبب برودت و رطوبت اور استرخاءِ اوعیہ منی ہوتا ہے اسکی علامت بلا دفت و انعاظ و شہوت خروجِ منی ہوتا ہے، غرض ایسے قرائن سے اس کو یقین ہو گیا کہ بغیر شہوت کے منی نکلی ہے، مرقاة مصری جلد اول ص ۳۲ میں مندرج ہے :-

و اکثر العلماء علی انه لا یجب الغسل حتی یعلم انه بلل الماء الدافق واستحبوا الغسل احتیاطاً، جس کا ترجمہ نواب قطب الدین صاحب بھی ترجمہ مشکوٰۃ یعنی مظاہر حق میں لکھتے ہیں ”اور اکثر علماء نے کہا ہے کہ غسل واجب نہیں آتا یعنی سونے کی حالت میں تری دیکھنے سے یہاں تک کہ جانے کہ یہ کود کر نکلی ہے، یعنی اگر جانتا ہے کہ کود کر نکلی ہے تو غسل واجب ہوگا، ورنہ مستحب واسطے احتیاط کے، غرض جناب اس میں ارشاد فرماتیں کہ کوئی مبتلا بہ اس قول پر عمل کرے تو کیسا ہے، بینوا تو جسروا،

الجواب: ہمارے نزدیک اس قول پر عمل اسکو جائز ہو جسکو بیداری میں بھی بدون شہوت کے انزالِ منی ہو جاتا ہو، اور جسکو بیداری میں بدون شہوت کے انزالِ منی نہ ہوتا ہو اس کو نیند سے بیدار ہونے کے بعد جو تری لباس پر نظر آئی، اور یقین ہے کہ منی ہی یا منیٰ الذمذی ہونے میں شک ہو اس پر غسل واجب ہے، اور یہ خیال صحیح نہیں کہ نیند میں منی بدون شہوت کے نکلی ہے، کیونکہ نیند کی حالت کا اس کو کیا علم، بلکہ احتلام میں مدارِ رؤیتِ بلل پر ہے، واللہ اعلم، قال فی مراقی الفلاح ومنہا ای من اسباب وجوب الغسل وجود ماء رقیق بعد الانتباہ عن النوم ولم یثذکر احتلاماً عند ہما ولم یما روی انه صلی اللہ علیہ وسلم سئل عن الرجل یجد البلیل ولم یثذکر احتلاماً قال یغتسل خلافاً لابن یوسف ویقولہ اخذ خلف بن ایوب وابواللیث لانه مذی وهو اقل من الم ر ص ۵) قلت وقد اخذنا بقولہ فیمن کان مبتلی بالانزال بلا شہوة فی البقطة ایضاً والافاقول ما قالہ واللہ اعلم، ۲۱ محرم ۱۳۹۰ھ

فصل فی الحيض والنفس الاستحاضة

حالت حیض میں جماع کرنا حرام ہے | سوال (۱) کیا ایام حیض میں عورت سے صحبت کرنا گناہ کبیرہ ہے اور اس کی نسبت سخت وعید آتی ہے ؟

الجواب : ایام حیض میں جماع کرنا نصِ شرعی سے حرام ہو چکا ہے گناہ کبیرہ ہے اگر غلطی سے کبھی ایسا ہو جائے تو اگر شروع حیض میں صحبت کی ہو تو ایک دینار اور آخر میں کی ہو تو نصف دینار خیرات کر دینا افضل ہے اور توبہ و استغفار واجب، ۱۲ رج سلمہ

دم حیض اگر دس روز بڑھ جائے | سوال (۲) عورت کا خون حیض دس دن سے بڑھ گیا اور اگلے حیض کی مدت یاد نہیں مگر یہ یاد ہے کہ پہلے زمانہ میں اول ماہ یا وسط یا آخر میں حیض آتا تھا، تبدلہ یا کچھ تفکر کرنے سے، اور عورت پہلے حیض کی مدت خوب سوچنے سے انداز کر سکتی ہے یا نہیں کر سکتی ہے تو ان صورتوں میں کیا حکم ہے ؟

الجواب : عورت اگر پہلے حیض کی مدت یا وقت بھول جائے تو غلبہ ظن اور تحرّی سے جس بات کو ترجیح ہو اس پر عمل کر سکتی ہے، اور اگر غلبہ ظن بھی کسی طرف نہ ہو تو صورتِ مسئلہ میں حکم یہ ہے کہ اس کا حیض تین دن مانا جائے گا، باقی جتنے دن اس کو خون آیا اُن دنوں کی نماز اس کے ذمہ واجب ہے، لیکن سات دن کی نمازیں اس مدتِ دم کی اس طرح ادا کی جائیں کہ ہر نماز کے وقت غسل کیا جاوے، سات دن کے بعد اور ایام کی نماز میں صرف وضو جدید کرے، واللہ اعلم، اور اگر دس دن گذر جانے کے بعد قضا کرے تو ہر نماز کے لئے غسل لازم نہ ہوگا، صرف اول نماز کے لئے غسل کرے باقی کے لئے وضو، ۲ رج سلمہ

دم نفاس اگر چالیس روز بڑھ جائے | سوال (۳) ایک عورت کی عادت نفاس کبھی ایک ماہ کبھی اس سے کچھ کم ہے، مگر اس مرتبہ خون چالیس روز سے زیادہ بڑھ گیا اور رنگ اس کا اس خون حیض کے مشابہ ہے جو ہر ماہ اس کو پانچ روز آتا ہے اور تاریخیں بھی اُس وقت خون حیض ہی کی ہیں جس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ بعد انقطاع دم نفاس دم حیض جاری ہو گیا ہے اس صورت میں کیا کرنا چاہئے ؟

الجواب : قال فی منہل الوردین من بحار الفیض فی ذوالتأہلین فی مثل لعینہ اکثر ای النفاس اربعون یوماً وقد علما جمالا مما مر من بیان اکثر العیض

والنفاس وان الزائغ عليهما لا يكون حيضاً ولا نفاساً ان الدم الصحيح لا يعقبه دم صحيح و
حينئذ فالحيضان لا يتواليان بل الثاني منهما استحاضة وكذا في الاخيرين في قوله و
كذا النفاسان والنفاس الحيض بل لا بد من طهر تام فاصل بينهما اي بين كل
اثنين من الحيضين والنفاسين والحيض والنفاس اهر ص،،، و ٨٠، وفي
رد المحتار في حكم المتحيرة المبتدأة ونفاسها اربعون ثم عشرين طهرها اذا لا يتوالى
نفاس وحيض اهر ص ٢٩٣ ج ١ پس صورت مذکورہ میں اس کا نفاس عادت سابقہ
کے موافق شمار ہو کر باقی دم استحاضہ ہے حیض نہیں، کیونکہ نفاس کے بعد جب تک پندرہ
دن پورے نہ گزر جائیں اُس وقت تک حیض نہیں ہو سکتا، ہاں اگر نفاس کے پندرہ دن کے
بعد بھی خون آتا رہا اور وہ تاریخی حیض کی ہوں تو اس کو حیض کہا جائے گا،

عبرم جواز مس بین السرة والركبة | سوال (۴) دران حالیکہ ایام حیض میں عورت سے مس
بدون عائل در حالت حیض، وغیرہ جائز ہے تو کیا بغیر دخول او پر او پر جسم کے زیر نواف جماع

جائز ہو گا یا نہیں؟

الجواب، امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ناف کے نیچے اور گھٹنے کے اوپر کا بدن حالت
حیض میں مس کرنا بدون عائل کے جائز نہیں، اور امام محمدؒ کے نزدیک بجز جماع در فرج کے
اور بظہر مباشرت درست ہے، پس اُن کے نزدیک یہ صورت جائز ہے جو سائل نے دریافت
کی ہے، اور احتیاط امام صاحبؒ کے قول میں ہے اور اسی پر فتویٰ ہے، اور ضرورت کے وقت
امام محمدؒ کے قول پر بھی عمل جائز ہے، قال فی الدر وقربان ماتعت الاناء یعنی ما بین
سرة وركبة ولو بلا شهوة وحل ما عداه مطلقاً وقال الشامي فيجوز الاستمتاع
بالسرة وما فوقها والركبة وما تحتها ولو بلا عائل وكذا ابنا بينهما باعائل بغیر
الوطاء الى ان قال وقال محمدٌ يحتنب شعار الدم یعنی الجماع فقط اهر ص ٣٠١ ج ١
وفي الطحاوی (ص ٨٣) علی مرآة الفلام وخص محمدٌ التحريم بشعار الدم وهو
موضع خروجه كما في الجوهرية وفي شرح التاويلات ويقول محمدٌ نقول وجهه
صاحب الغاية وقد علمت ما به الفتوى اهر وهو قول الشيخين،

ایام حیض کے گزر جانے کے بعد غسل کرنے | سوال (۵) اگر عاتضہ عورت بعد بند ہونے حیض کے
سے پہلے بیوی سے مباشرت کا حکم، اور انقضائے ایام موعودہ کے دو ایک روز اور غسل

نہ کرے تو قبل غسل اس سے جماع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جب عورت کے ایام حیض گزر جائیں اور دس دن سے پہلے خون بند ہو جائے اور بندش کے بعد ایک نماز کامل کا وقت کامل گزر جائے تو اس عورت سے جماع جائز ہے غسل کرے یا نہ کرے، اور دس دن کے بعد نماز گزرنے کی بھی ضرورت نہیں، واللہ اعلم ۲۰ محرم ۱۴۲۵ھ

سوال (۶) میرے گھر میں ولادت سے دس بارہ گھنٹے پیشتر ولادت کے قبل خروج ماہ حکم پانی جاری ہے جو ولادت کے وقت سے کچھ پہلے بند ہوا، پانچ بجے بالکل تر ہو جاتے تھے، اور متعدد بار پانچ بجے تبدیل کرنے پڑے، اس حالت میں نماز پڑھنا چاہئے تھی یا نہیں؟ اگر نماز پڑھی جاتی تو بھی وہ پانی برابر جاری رہتا،

الجواب: یہ پانی نفاس یا حیض نہیں بلکہ رطوبت نجسہ ہے، اس کا نکلنا مانع صلوٰۃ نہیں، بلکہ اس کے باوجود بھی نماز پڑھنا ضروری ہے، اور اگر نماز کے پورے وقت میں کوئی زمانہ ایسا نہ مل سکے جو اس رطوبت سے خالی ہو تو اس صورت میں معذور ہوں گی، اور اس رطوبت کے خروج کے ساتھ نماز صحیح ہوگی، مگر یہ ضروری ہے کہ اگر گدھی رکھنے سے تکلیف نہ ہو، اور گدھی رکھنے سے فرج خارج میں رطوبت نہ آئے تو اس حالت میں گدھی کا نماز اور وضو سے پہلے رکھنا واجب ہوگا، ۸ ارزی الحجہ ۱۴۲۲ھ

سوال (۷) نفاس کا خون بند ہو گیا ہے، لیکن دوا رکھنے سے اکثر مدت نفاس گزرنے کے بعد فرج سے پانی نکلے تو یہ نفاس شمار ہو گیا یا نہیں؟ ۹۹

الجواب: یہ پانی صاف شفاف ہے یا اس میں کچھ زردی وغیرہ بھی ہے، اگر بالکل صاف ہے تو یہ نفاس نہیں اور بطریق مذکورہ بالا نماز پڑھنا ضروری ہے، اور اگر صاف نہیں بلکہ میلا اور زردی مائل ہے تو چالیس دن کے اندر اندر یہ نفاس ہی شمار ہے جس سے نماز ساقط ہے، والکل ظاہرین نظر فی لفقہ، ۸ ارزی الحجہ ۱۴۲۲ھ

مسئلہ نفاس **سوال (۸)** عورت کو پہلے وقت نفاس ۱۴ دن آکر بند ہو گیا اور اس نے غسل کر کے نماز شروع کی،

دو دن کے بعد پھر خون معلوم ہوا اور بیس دن کے بعد ختم ہوا پھر دوسرے وقت بیس دن کو بند ہوا، مگر اس نے غسل نہ کیا اور کہنے پر یہ کہا کہ ایک دو دن راہ دیکھ لوں، اس کے بعد ایک دن ... پھر ذرا خون کا دھبہ معلوم ہوا مگر وہ ایک ہی وقت پھر نہ معلوم ہوا تو ایسی عورت کی مدت نفاس کتنی ہے، اور اس کو ایک دو روز راہ دیکھنا اور نماز نہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں، اور قضا پڑھے یا نہیں؟، دم ۱۴، ط ۲، دم ۲۰، مکمل ۳۶ دن، تنقیح :- یہ سمجھ میں نہیں آیا دوسرے وقت سے کیا مراد ہے؟

جواب تنقیح :- دوسرے وقت سے دوسرا نفاس مراد ہو جو بعد وضع حمل ثانی کے ہے،

الجواب :- اول مرتبہ مکمل ۳۶ یوم نفاس تھا اور دوسری مرتبہ عادت سے قبل پاک ہونے قضا واجب نہیں، ہاں ۳۶ یوم سے قبل جماع مکروہ ہے، فی العالمگیریۃ صفحہ ۲۴۱ ج ۱ وانقطع دمہا دون عادتها یکرہ قربانہا وان اغتسلت حتی تمضی عادتها وعلیہا ان تصلی و تصوم للاحتیاط ہکذا فی التبیین وقال بعد سطر ومتی طهرت المبتدأۃ دون العشرۃ اور معتادۃ دون العادۃ اخرت الموضوع والاغتسال الی اخر الوقت بحيث لا تدخل الصلوۃ فی الوقت المکرۃ کذا فی الزاہدی،

مسئلہ نفاس کی ایک صورت کے متعلق استفتاء کا جواب، سوال (۹) زچگی کے زمانہ میں جب تک خون برابر آتا رہے نماز نہیں پڑھی جاتی، لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دو دن کے واسطے خون بند ہو گیا اور ایک دو روز پھر آ گیا، پھر بند ہو گیا پھر آنے لگا، تو ایسی صورت میں نماز پڑھتی رہے یا قضا کرے، زچگی کے زمانے میں بار بار غسل نہیں کر سکتی تو اس زمانے میں اگر نماز پڑھی جائے تو کیا تیمم جائز ہوگا، تیمم غسل اور وضو دونوں کے لئے کیا جاسکتا ہے یا غسل کے لئے تیمم کرے اور پانی سے وضو کرے، بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ خون تو نہیں آتا لیکن پانی آتا رہتا ہے، بعض دفعہ خود اور بعض اوقات اس وجہ سے کہ ایک مہینہ تک دو آئیں استعمال ہوتی رہتی ہیں، اس وجہ سے اس صورت میں نماز پڑھنی جائز ہے یا نہیں، زیادہ حلا،

الجواب :- قال ابن عابدین فی رسالتہ منہل الواردین ثم ان المرأة کلما رأت الدم تترك الصلوۃ مبتدأۃ کانت او معتادۃ کما سیأتی فی الفصل السادس بشرط کون الرؤیۃ فی خلال المدة لا بعدھا، وکلما انقطع دمہا فی الحيض قبل ثلثۃ ایام تصلی لکن تستظر اخر الوقت ای المستحب وجوباً فان لم یعد فی الوقت توضع

بند بھی نماز پڑھنی چاہیو حتی البتہ اس حالت میں نماز چاہیو کہ وقت تمحویک اخیر تک انتظار کرو لیکن جب میں خون دیکھو تو ظاہر ہو گیا کہ وہ دن نفاس

وتصلی وتصوم ان انقطع لیلاً وتشبہ بالصائم ان انقطع نهاراً وان عاد فی الوقت او بعد فی العشرة كما یأتی بطل الحکم بطهارتها تقعد عن الصلوة والصوم و بعد الثلاثة ان انقطع قبل العادة فکذلک الحکم لکن هنا تصلی بالغسل علماً انقطع لا بالوضوء لانه تحقق كونها حائضاً بروية الدم ثلاثة فاکثر اربع العادة فالحکم ایضاً کذلک لکن هنا تاخیر الغسل لاجل الصلوة مستحب لا واجب وان عاد الدم فی العشرة ولم يتجاوزها بطل الحکم بطهارتها فلو تجاوزها فالعشرة حیض لو مبتدأه والا یام عادتها، ولو اعتادت فی الحيض يوماً ما ویوماً طهرت هکذا الی العشرة فاذا رأت الدم فی الیوم الاول تترك الصلوة والصوم واذا ظهرت فی الثاني وضأت صلت ولا غسل لعدم كونها حائضاً بعد فی الثالث تترك الصلوة والصوم وفي الرابع تغسل وتصلی هکذا الی العشرة کذا فی التارخانیة ونحوه فی صدر الشریعة والنقاس کالحيض فی الاحکام المذكورة غیر انه یجب الغسل فيه كلما انقطع علی کل حال سواء کان قبل ثلاثة اربعها لانه لا اقل له ففی کل انقطاع یحتمل خروجها من النفاس فیجب الغسل بخلاف ما قبل الثلاث فی الحيض (م ص ۹۳)

خلاصہ یہ ہے کہ نفاس کی مدت میں (جو کہ چالیس دن ہے) عورت جب خون دیکھے تو نماز روزہ چھوڑ دے، اور جب تک خون جاری رہے چھوڑے رکھے، اور اگر کسی وقت خون بند ہو جائے تو اُس وقت جس نماز کا وقت ہو اس کے وقت مستحب کے اخیر کا انتظار کرے اگر اخیر وقت میں خون جاری ہو جاوے تو نماز چھوڑے رکھے اور اگر اخیر وقت تک بند رہی تو غسل کر کے نماز پڑھے، اور رات کو بند ہو اور صبح کے قریب تک بند رہے تو روزہ بھی رکھنا واجب ہے، اور دن میں بند ہو تو روزہ داروں کی طرح رہنا واجب ہے، بشرطیکہ دن بھر بند رہے، ورنہ خون آجلنے پر روزہ داروں کی طرح رہنا واجب نہ رہے گا، اور خون بند ہونے کے وقت یہ دیکھنا چاہئے کہ عادت سابقہ سے پہلے بند ہوا ہے یا عادت کے بعد اگر پہلے بند ہوا ہے تو غسل کر کے نماز پڑھنا واجب ہے، مگر غسل و نماز میں وقت مستحب کے اخیر کا انتظار کرنا واجب ہی، اور اگر عادت کے بعد بند ہوا ہے تو نماز پڑھنا اب بھی واجب ہی، مگر اس صورت میں غسل و نماز کے لئے اخیر وقت کا انتظار مستحب ہی، واجب نہیں، چالیس دن کے اندر خون آنے اور بند ہونے کا تو یہی حکم ہے، اور اگر چالیس دن سے زائد خون آیا

تو عادت کے ایام کو تو نفاس سمجھا جائے گا، اور باقی کو بیماری، تو ایام عادت کے بعد جتنے دنوں کی نماز خون آنے کے سبب نہیں پڑھی گئی، اُن کی قضا کرنا واجب ہوگی،

یہ تو نفاس کا حکم تھا جس سے سوال کیا گیا ہے، اس کے بعد ہم حیض کا حکم بھی متمم فائدہ کے لئے بیان کئے دیتے ہیں، حیض کا حکم یہ ہے کہ تین دن گزرنے سے پہلے تو خون دیکھ کر نماز روزہ چھوڑ دے اور جب تک خون جاری رہے چھوڑے رکھے، اور اگر کسی وقت خون بند ہو جائے تو وقت مستحب کے اخیر کا انتظار کرے، اگر اس وقت خون جاری ہو جاوے تو نماز روزہ چھوڑے رکھے، اور اس وقت تک بند رہے تو وضو کر کے نماز پڑھے غسل واجب نہیں، اور رات کو بند ہو اور صبح کے قریب تک بند رہے تو روزہ کی نیت رمضان میں کرنا واجب ہے، اور دن میں بند ہو اور کسی نماز کے اخیر وقت تک بند رہے تو روزہ داروں کی طرح رہنا واجب ہے، اور حیض شروع ہونے سے تین دن گزرنے کے بعد حکم یہ ہے کہ خون دیکھنے سے تو نماز وغیرہ چھوڑ دے، اور جب تک جاری رہے چھوڑے رکھے اور جب بند ہو نماز شروع کر دے جیسا اوپر حکم تھا، البتہ یہ دیکھنا چاہئے کہ عادت سابقہ سے پہلے بند ہوا ہے یا عادت کے بعد، اگر پہلے بند ہوا ہے تو غسل و نماز میں آخر وقت مستحب کا انتظار واجب ہے، اور بعد عادت کے بند ہوا ہے تو اخیر وقت کا انتظار مستحب ہے، واجب نہیں، دس روز تک تو یہی حکم ہے، اور اگر دس دن سے زائد خون آیا تو ایام عادت سابقہ کے بعد جتنے دن کی نماز بوجہ خون آنے کے نہیں پڑھی، اُن کی قضا واجب ہے حیض کے دن وہی سمجھے جائیں گے جو عادت کے ایام ہیں، یہ حکم تو نماز روزہ کا ہے، اور شوہر سے مقاربت کا یہ حکم ہے کہ نفاس کے چار دن سے کم میں اور حیض کے دس دن سے کم میں اگر عادت کے موافق بند ہوا ہو یا عادت کے بعد جب تو عورت کے غسل کر لینے یا بحالت عذر تیمم کر لینے یا ایک نماز کے وقت گزر جانے کے بعد مقاربت جائز ہے، اور عادت سے پہلے بند ہوا ہے تو جب تک ایام عادت پورے نہ ہوں مقاربت جائز نہیں، گو عورت غسل کر کے نماز پڑھنے لگی ہو، کیونکہ نماز روزہ کا حکم الگ ہے، اور مقاربت کا حکم الگ ہے، اور حیض و نفاس دونوں میں پانی کے آنے کا حکم یہ ہے کہ گدلا پانی تو حیض و نفاس ہی ہے، جب کہ دس دن اور چالیس دن کے اندر اندر ہو، اور صاف پانی حیض و نفاس نہیں، بلکہ اس کو خون کا بند ہونا سمجھا جائے گا، اور جس عورت پر نماز کے لئے غسل واجب ہو مگر وہ بوجہ مرض و ضعف کے غسل پر قادر نہ ہو تو اس کو غسل کی طرف

تیم کرنا جائز ہے، لیکن اگر وضو کرنا مضرت ہو تو وضو کرنا واجب ہوگا، واللہ تعالیٰ اعلم،
۴ شعبان سنہ ۱۳۸۵ھ

تمتہ؛ (۱) پانی کا رنگ وہ معتبر ہے جو تازہ آمد کے وقت ہو، پس اگر تازہ آمد کے وقت پانی صاف تھا، بعد میں کپڑے پر لگ کر رنگ میں گدلا پن آگیا تو یہ عورت حیض و نفاس سے پاک ہوگی، بعد کے تغیر کا اعتبار نہیں، صرح بہ فی منہل الواردین فی المقدمة

(۲) اگر حیض دس دن پورے ہونے اور نفاس چالیس دن پورے ہونے پر بند ہو تو بدو دن انتظار غسل وغیرہ کے مقاربت جائز ہے، صرح بہ الفقہاء فی کتبہم،

(۳) اگر حیض دس دن پر اور نفاس چالیس دن پر بند ہو گیا، اور بندش کے بعد ایک دو دن کے وقفہ سے پھر جاری ہو گیا تو یہ وقفہ بھی بحکم جریان دم کے ہے، پس یوں سمجھا جائیگا کہ حیض دن سے زیادہ آیا اور نفاس چالیس دن سے زیادہ آیا، اور اس کا حکم یہ ہے کہ اگر اس عورت کی عادت حیض و نفاس میں پہلے سے معلوم ہے تو ایام عادت حیض و نفاس میں اور عادت سے زیادہ جتنے ایام ہیں وہ سب استحاضہ ہیں، پس عادت سے زائد ایام میں اگر کسی دن میں بوجہ خون آنے کے نماز نہ پڑھی ہو تو اس کی قضاء واجب ہے، البتہ اگر دس دن حیض کے اور چالیس دن نفاس کے بعد پندرہ دن خون بند رہے تو اب اس وقفہ کو بحکم جریان دم شمار نہ کیا جائے گا بلکہ یہ دوسرا خون شمار ہوگا، پس اگر وہ حیض بن سکے مثلاً تین دن کمال خون آیا تو اس کو دوسرا حیض شمار کیا جائے گا، واللہ تعالیٰ اعلم،

ففي الرسالة المذكورة لو عاد الدم بطل الحكم بطهارتها كانها لم تطهر قال في التتارخانية وهذا اذا عاد في العشرة ولم يتجاوزها وطهرت بعد ذلك خمسة عشر يوماً فلو تجاوزها انقص الطهر عن ذلك فالعشرة حيض لو مبتدأه والا فایام عادتها (ص ۹۳) ۴ شعبان سنہ ۱۳۸۵ھ

سوال (۱۰) جس عورت کو ایام حیض کی عدد اور تاریخ
جس عورت کو ایام حیض کی عدد اور تاریخ
دونوں یا تاریخ یا دن ہو اس کیلئے کیا حکم ہے؟
تاریخ یعنی محل حیض یا دن ہو پھر اس کو استحاضہ
مستمر ہو جائے اس کا کیا حکم ہے، اور جس کو شمار ایام یا دن ہو مگر محل دم یا دن ہو اس کا کیا
حکم ہے، بینوا تو حبروا،

الجواب، قال ابن عابدین فی رسالته منہل الواردین من بحار الفیض

في احكام المصنعة اعلم انه يجب على كل امرأة حفظ عاداتها في الحيض والتفاسح الطهر
عدد او مكانا كونه خمسة مثلاً من اول شهر او اخره مثلاً والحق المكمل الزمان فوجدنا ان جنت اعني
عليها وتساهلت في حفظ ذلك ولم تهتم لدنيا فسقا فنيست عاداتها فاستمر الدم
فعلينا بعد ما افاقت او ندمت ان تتحرى بغلبة الظن كما في اشتباه القبلة
واعدا الركعات فان استقر ظنها على موضع حيضها وعدة عملت به والا
فعلينا الاخذ بالاحوط في الاحكام فما غلب على ظنها انه حيضها او طهرها عملت
به وان ترددت تعلى وتصوم احتياطاً على ما يأتي تفصيله ولا تدخل المسجد
ولا تطوف الا للزيارة لانه ركن الحج فلا يترك لاحتمال الحيض بخلاف
القدوم فانه سنة ثم تعيد طواف الزيارة بعد عشرة ايام ليقع احدهما
في طهر بيقين والا للصدر فلا تتركه لوجوبه على غير المكي ولا تعيد ولا
تس المصحف ولا يجوز وطئها ابد الا ان التحرى في الفروج لا يجوز نص عليه
محمد محيط ولا تقرأ القرآن في غير الصلوة وتصلى الفرض والواجب و
السنن المشهورة اى المكية بحركتها تبعاً للمقرض وتقرأ في كل ركعة
الفاحة وسورة قصيرة على الصحيح وقيل تقتصر على المقرض بحرسى
ما عد الاولين من الفرض فلا تقرأ في شئ من ذلك السورة بل تقرأ الفاتحة فقط
لوجوبها في رواية عن ابى حنيفة رحمه محيط وقيل لا تقرأ اصلاً والصحيح
الاول تتارخانية وتقرأ القنوت وسائر الدعوات والاذكار
وكما ترددت بين الطهر ودخول الحيض صلت بالوضوء لوقت كل
صلوة وان ترددت بين الطهر والخروج من الحيض فتصلى بالغسل كذلك
اى لوقت كل صلوة ثم تعيد في وقت الثانية بعد الغسل قبل الوقتية و
هكذا تصنع في وقت كل صلوة انتهى، مثاله امرأة تذكر ان حيضها في
كل شهر مرة وانقطاعه في النصف الاخير ولا تذكر غير هذين فانها في النصف
الاول تتردد بين الدخول والطهر وفي النصف الاخير بين الطهر والخروج
واما اذا لم تذكر شيئاً اصلاً فهي مترددة في كل زمان بين الطهر والدخول
فحكمه حكم التردد بين الطهر والخروج بلا فرق وان سمعت سحبة

فوجدتها للحال سقطت عنها والا اعادتها بعد عشرة ايام وان كانت عليها فائتة
فقضتها فعليها اعادتها بعد عشرة ايام من يوم القضاء قبل ان تزيد المدة
على خمسة عشر وهو الصحيح واما حكم الصوم فانها لا تفطر في رمضان اصلاً
لاحتمالها طهارتها كل يوم ثم لها حالات (ذكرها مفصلة فليراجع) وهذا حكم الاضلال
العام اى اضلال العدد والمكان بحيث تكون في كل يوم متروكة بين الحيض والطمهر
وما يقرب به اى ما يقرب من العام كان علمت عدد ايامها لكن اضلت مكانها
في جميع الشهر واما الخاص وهو الاضلال في المكان فقط كان علمت عدد ايامها
واضلت مكانها في بعض الشهر كالعشر الاول منه مثلاً والاضلال في العدد فقط
مع العلم بالمكان فموقوف على مقدمه رفقها مع الامثلة فليراجع ثم
ذكر بعد الاضلال في النفاس ايضا فليطالع، ص ۹۹ و ۱۰۶

قلت وهذا هو مذهب الحنفية في المضلة والعلم به والعمل عسير جداً
للساء زماننا فرائنا الاقتاء بقول احمد فيها اولى ويسير وهو ما ذكره ابن قدامة
في المغني بسأله فان كانت لها ايام نسيتهما فانها تقعد ستاً وسبعاً في كل شهر
وقوله ستاً وسبعاً الظاهر انه ردها الى اجتماعها ورأيها فيسبغ على ظننا
انه اقرب الى عادتها او عادة نسائها او ما يكون اشبه بكونه حيضاً ذكره القاضي في
بعض المواضع وهل تجلس ايام حيضها من اول كل شهر او بالتعري والاجتهاد فيه فليراجع
كل شهر اذا كان يحتمل لان النبي صلى الله عليه وسلم قال لحمة فتحيض ستة ايام او سبعة ايام في علم الله
ثم اغتسل وصلى اربعاً وعشرين ليلة او ثلاثاً وعشرين ليلة وايامها فقدم حيضها
على الطهر ثم امرها بالصلوة والصوم في بقيته ولان المبتدأة تجلس من اول الشهر
مع انه لا عادة لها فكذلك النامية،

القسم الثالث النامية لوقتها دون عددها وهذه تتنوع نوعين احدهما
ان لا تعلم لها وقتاً.... اصلاً وتعلم ان حيضها خمسة ايام فانها تجلس خمسة
من كل شهر اما من اوله او بالتعري على اختلاف الوجهين الخ (ص ۳۳۰ و ۳۳۳)
وقول الشافعي موافق لقول الحنفية في الباب كما ذكره في المغني ص ۳۲۱ والله تعالى
اعلم وعلمه اتم واحكم ۳۱۳ رذيقه لا سئل ۳۱۴

سوال (۱۱) کسی عورت کو عموماً پانچ روز حیض رہتا ہے جس عورت کو ایام حیض پانچ دن ہوں اگر اس کے بعد کبھی خون آنے لگے تو یہ پھر وہ پاک ہو کر غسل جنابت کر لیتی ہے، مگر بعض مرتبہ خللاً خون حیض ہے یا استحاضہ، عادت اس پانچ روز کے بعد پھر خون حیض آنے لگتا ہے، اور ایک دو روز میں بند ہو جاتا ہے تو یہ خون حیض ہے یا استحاضہ، اور اس میں وطی بعد غسل کے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب؛ پاکی کے بعد صورت مسئلہ میں پانچ روز کے بعد یعنی ابتداء حیض سے دس روز کے بعد جو خون آوے وہ استحاضہ ہے، استحاضہ میں نماز معاف نہیں، اسی حالت میں پڑھتی رہی اور سہمیستری بھی جائز ہے، احقر عبدالکریم عفی عنہ ۱۲ صفر ۱۳۵۸ھ
الجواب صحیح، ظواہر احمد عفا عنہ ۱۲ صفر ۱۳۵۸ھ

فصل فی احکام المعذور

سوال (۱۲) زید کو بوجہ ضعف مثانہ قطرہ آنے کا مرض ہے، وہ پیشاب گاہ میں کرسی رکھتا ہے، اور کرسی اس قدر اندر رہتا ہے کہ نظر بالکل نہیں آتا اور حشفہ سے بھی پرے رہتا ہے، ایسی صورت میں وقت کے گزرنے پر وضو جدید کرے یا اس وقت وضو کرے کہ جب قطرہ عضو سے نفوذ کر کے سپاری میں آ جاوے، اور چونکہ کرسی اندر رہتا ہے اس کا ترہونا معلوم نہیں ہو سکتا کہ کس وقت ترہوا ہے،

الجواب؛ قال فی مرقی الفلاح ومن بہ عذر کسلس بول او استطلاق بطن وانفلات ریح ورعات دأثم وجرح لا یرقأ ولا یمن جسہ بحشون غیر مشقة یتوضون لوقت کل صلوۃ ام قال الطحطاوی فیتعین علیہ ردۃ متی قد علیہ بعلاج من غیر مشقة وفي المضمرات عن التصاب بہ سلس بول فجعل القطنۃ فی ذکرہ ومنعہ من الخروج وهو یعلم انہ لو لم یحش ظہر البول فاخرج القطنۃ وعلیہا بلتۃ فهو محدث ساعة اخراج القطنۃ فقط وعلیہ الفتوی ام ص ۸۵، اس سے معلوم ہوا کہ کرسی احلیل میں رکھنے سے اگر قطرہ کا اثر ظاہر کرسی پر ظاہر نہ ہو تو یہ شخص معذور نہیں ہے، اس کو ہر وقت وضو جدید کرنا لازم نہیں، لیکن اس کو چاہئے کہ کرسی اتنا مبارکھے کہ اس کا ایک سر اسوراخ ذکر کے متصل ہو جب ترہو اس

سہرے میں پہنچ جائے گی اس وقت وضو ٹوٹ جائے گا، ۴ رزی الحجہ ۱۳۲۷ھ

معذور کی نماز کا حکم اور کپڑوں

سوال (۲)

کے پاک کرنے کا طریقہ،

..... اگر کوئی شخص اس قدر معذور ہو جائے کہ چار رکعت کی تعداد تک بھی خالی از عذر نہیں رہتا، اب دو وجہ ہیں، ایک یہ کہ تسلسل البول کے عارضہ میں مبتلا ہے، اب اگر وہ شخص دو تہبند بھی رکھے تو بھی لاچار ہے، اگر اب ہر چار رکعت کے لئے تہبند علیحدہ بنائے تو بھی حرج عظیم ہے، اور جس قدر مقدار چار رکعت میں کپڑا ناپاک ہو رہا ہے وہ ہر دفعہ دھونا پڑے گا یا نہ، اسی طرح ریح والا ہر چار رکعت میں مقدار میں جو مبتلا ہو جاتا ہے وہ ہر چار رکعت کے بعد وضو کی تجدید کرے یا نہ کرے؟

الجواب؛ ایسا معذور جو چار رکعت بھی بدون عذر کے نہ پڑھ سکے اس کو ہر وقت تازہ وضو کرنا چاہئے، وقت کے اندر اندر اس وضو سے بہت سی نمازیں پڑھ سکتا ہے، گو وہ عذر جاری ہو پس ریح والا جو اتنا وقت بھی ریح سے خالی نہیں پاتا جس میں وضو کر کے فرض نماز پڑھ سکے معذور شرعی ہے، اس کو ہر چار رکعت کے بعد تجدید وضو کی ضرورت نہیں، ایسے ہی تسلسل البول والا اور اگر وضو اور فرض نماز کی مقدار اس عذر سے خالی وقت ملتا ہو تو وہ معذور شرعی نہیں، رہا کپڑا پاک کرنے کا حکم تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر کپڑے کا دھونا مفید ہوتا ہو کہ اگر کپڑا دھو کر نماز پڑھے تو نماز کے درمیان میں وہ دوبارہ ناپاک نہ ہوتا ہو تب تو اس کے ذمہ دھونا واجب ہے، اور اگر مفید نہ ہو یعنی یہ حالت ہو کہ کپڑا دھو کر نماز پڑھنے سے درمیان نماز کے وہ پھر ناپاک ہو جاتا ہو تو وہ دھونا واجب نہیں، قال فی حاشیۃ مراقی الفلاح فی النوازل ان کان لو غسلہ تنجس ثانیاً قبل الفراغ من الصلوۃ جازان لا یغسلہ والا فلا قال هو المختار (ص ۸۶) مگر جب نجاست بہت زیادہ جمع ہو جایا کر تو دن میں ایک بار دوبار دھولیا جائے، ۲۳ شعبان ۱۳۲۷ھ

معذور کی وضو کی ایک سوال (۳) مجھ کو پیشاب کے بعد دیر تک قطرہ یا نمی آجانے کا

صورت کا حکم، شک رہا کرتا ہے، مثلاً پیشاب کے آدھ گھنٹہ پیچھے وضو کرنے بیٹھا

پس دوران وضو میں خیال ہوا کہ پیشاب کے مقام پر نمی آگئی، یا آیا چاہتی ہے، اس کا امتحان کرنے کے لئے کہ آیا درحقیقت نمی آگئی یا نہیں، ڈھیلے سے دیکھا، پس بعض اوقات ڈھیلے

میں نمی یعنی بھیگاپن معلوم ہوا اور بعض اوقات نہیں، اس نمی آجانے کے اندیشہ سے تقریباً نماز سے ڈیڑھ یا دو گھنٹے پہلے خواہ پیشاب لگے یا نہ لگے، پیشاب کر لیا کرتا ہوں تاکہ نماز اطمینان کے ساتھ ہو، اور اگر کسی وقت ڈیڑھ یا دو گھنٹے پہلے پیشاب کرنے کا اتفاق نہ ہوا تو پھر پیشاب لگنے پر بھی نماز سے فارغ ہونے تک روکنا پڑتا ہے،

خلاصہ یہ ہے کہ اس قطرہ کی وجہ سے طبیعت میں الجھن سی رہتی ہے، پس ارشاد فرمائی کہ آیا یہ ضرور ہے کہ قطرہ کا گمان ہونے کی حالت میں ہمیشہ وضو کر کر لینا چاہئے، یا گمان ہونے پر ہر وقت دیکھ..... لینا چاہئے، یا قطرہ آجانے کی جانب بالکل دھیان ہی نہ کرنا چاہئے، غرض جو حکم شرعی ہو یا شرعاً کوئی آسان شکل ہو اس سے خاکسار کو آگاہ فرمائیں اور یہ امر بھی قابل گزارش ہے کہ بندہ کو دو گھنٹہ یا سوا دو گھنٹہ پیچھے پیشاب کی حاجت ہوا کرتی ہے، پس اگر کسی وقت بھول گیا اور جماعت میں گھنٹہ یا پون گھنٹہ باقی ہوا تو بڑی مشکل و تکلیف پیش آتی ہے، فقط والسلام

الجواب؛ قال فی مراقی الفلاح یلزم الرجل الاستبراء والمراد طلب براءة المخرج عن اثر الرشم حتى يزول اثر البول بزوال البول الذي يظهر على العجز بوضعه على المخرج وحينئذ يطمئن قلبه على حسب عادته اما بالمشي اوالتنحيم او الاضطجاع على شقه الايسر او غيره بنقل اقدام وركض وعصر ذكره برفق لاختلاف عادات الناس فلا يقيد بشيء احم وفي حاشيته للطحاوي عن المضمرات ومتى وقع في قلبه انه صار طاهراً اجاز له ان يستنجي (ويوضئ) لان كل احد اعلم بحاله (ص ۲۶) وقال في الدرر يستحب للمرجل ان رابيه الشيطان ان يحتشي ويجب ان كان لا ينقطع الابه قد رما يصلي احم (ص ۱۵۵ ج ۱) وقال الشامي في باب الاستنجاء وجدناه نافعاً جداً لقطع التقاطير،

صورت مسئلہ میں حکم یہ ہے کہ وضو کرنے سے پہلے اگر استنجاء کیا ہو تو دفع تقاطیر کی جو تدبیر تحریر میں نافع ہوتی ہو خواہ چلنا پھرنا یا لیٹنا وغیرہ ان تدابیر سے دفع تقاطیر کا اطمینان کیا جائے، اور جب اطمینان ہو جائے کہ اب قطرہ آنا بند ہو گیا، اس کے بعد وضو کیا جائے اس کے بعد اگر پھر شبہ قطرہ آنے کا ہو تو ہاتھ ڈال کر دیکھ لیا جائے، اگر انگلی پر نمی معلوم ہو تو وضو دوبارہ کر لیا جائے ورنہ نہیں، اگر کسی وقت نماز کے قریب استنجاء کی ضرورت

ہو، اور پیشاب کے روکنے میں ضرورتی کا اندیشہ ہو تو پیشاب کو روکنا نہ چاہئے، بلکہ پیشاب کر کے رفع قطرہ کی تدبیر کی جاوے، اور کچھ دیر ٹہلنے چلنے پھرنے کے بعد وضو کر لیا جائے پھر نماز شروع کر دیں، اس کے بعد اگر قطرہ کا شبہ ہو تو ہاتھ سے دیکھ لیا جائے، اگر معلوم ہو کہ نمی آئی ہے تو وضو دوبارہ کیا جائے ورنہ نماز پڑھتا رہے، جس کو قطرہ کا دسوسہ زیادہ آتا ہو اس کے لئے یہ تدبیر مفید ہے کہ عضو خاص کے اندر کسی قدر روئی رکھ لیا کرے، اس سے قطرہ بند ہو جاتا ہے، اور روئی کو سوراخ سے ملا ہوا نہ رکھے، بلکہ ذرا سوراخ سے نیچے کو یعنی اندر کو رکھے، اس صورت میں روئی کے تر ہونے سے وضو باطل نہ ہوگا، جب تک سوراخ کے منہ پر تری نہ آجائے، اور اگر روئی سوراخ کے متصل ہوگی تو باہر کا حصہ تر ہو جانے سے وضو ٹوٹ جائے گا، کما ذکرہ فی الدرر (۵۴ ج ۱) ۱۸، صفر ۱۳۸۴ھ

حکم نماز برائے مریض کہ معذور | سوال (۴) میں ایک ہفتہ سے بخار اور کھانسی، نزلہ زکام میں مبتلا باشد از تطہیر لباس و بدن، ہوں، میرا چھوٹا بچہ صرف پانچ مہینہ کا ہے جو ہر روز رات کے وقت پیشاب سے میرا جسم ناپاک کر دیتا ہے، باوجود حفاظت کے بھی اس کی نجاست بچنا غیر ممکن ہے، بیماری سے قبل میں ہر روز جسم کے ناپاک حصہ کو گرم پانی سے پاک کر لیا کرتی تھی، اور کپڑے بدل کر نماز پڑھ لیا کرتی تھی، لیکن جس دن سے میں بیمار ہوئی ہوں بدن کو پاک کرنے سے مجبور ہوں، ایک دور و ز ایسی حالت میں بھی پاک کیا تو بیماری نے طول پکڑ لیا، چھوٹا بچہ بھی بیمار ہو گیا، اب میں جناب کی خدمت میں عرض کرتی ہوں کہ ایسی حالت میں تیمم جائز ہے یا نہیں، اھ اگر تیمم کیا جائے تو کس طرح، آیا مٹی پر ہاتھ مار کر جسم کے ناپاک حصہ کو مل لینا کافی ہے یا صرف غسل وضو کا تیمم کر دینا، اس شش و پنج میں میری کئی روز سے نمازیں قضا ہو رہی ہیں، جس سے میری طبیعت سخت پریشان ہے، ایک ایک وقت کی نماز چھوٹنے سے دل بے قرار ہے، باقی کیا عرض کروں؟

الجواب: ایسی حالت میں نماز ہرگز قضا نہ کریں، بلکہ ناپاکی سے بچنے کی پوری تدبیر کریں، بچہ کے رات کو لنگر باندھ دیا کریں، اس سے ناپاکی ماں کے اوپر نہ آئے گی، اور اس کے بعد بھی تھوڑی بہت ناپاکی لگے تو اگر گرم پانی سے پاک کرنا مضر نہ ہو تو گرم پانی سے دھوئیں، اور یہ بھی مضر ہو تو اسی طرح نماز پڑھ لیں نماز درست ہو جائے گی، اور کپڑوں کا یہ انتظام کیا جائے کہ نماز کے واسطے ایک پاک جوڑا الگ رکھ لیں جو صرف نماز کے وقت

پہن لیا، پھرتا دیا، اور یہ ممکن نہ ہو تو کپڑوں کی ناپاکی کے ساتھ بھی نماز پڑھ لیا کرے، جب کہ دھونا اور بھیگا کپڑا بدن پر رہنا مضر ہو، قال فی شرح المنیۃ ان الرجل روفی حکمہ المرأة اذا کان علی جسدہ نجاسة وهو مسافر قید بہ باعتبار الغالب والا فلا فرق بین المسافر وغيرہ و لیس معہ ماء او مائع مزیل او کان معہ وهو یخاف العطش روفی حکمہ از دیاد المرض حالاً او مالاً علی نفسه او علی من تلزمہ مؤنتہ فانہ لا یلزمہ ازالۃ ملک النجاسة ویجوز لہ ان یصلی بہا (۱۹۵) واللہ اعلم ، ۳ شعبان ۱۲۵۵ھ

سوال (۵) حکم استنجاء و وضوء برینِ ریشہ جو وضو اور استنجاء پر قادر نہ ہو، میرے بدن میں ریشہ ہے، جس کی وجہ سے چھوٹا بڑا استنجاء بھی پوری طرح نہیں ہو سکتا ہے، اور وضو بھی باوجود کوشش کے پوری طرح نہیں ہو سکتی، کہیں سے خشک بھی رہ جاتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ ایسی حالت میں نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب: صورت مسئلہ میں اس شخص کو چاہئے کہ ڈھیلے سے استنجاء کر لیا کرے ریشہ پانی کا لوٹا اٹھانے سے تو مانع ہوگا، مگر ڈھیلے کے اٹھانے سے مانع نہ ہوگا، پس ڈھیلوں سے استنجاء کر لیا کرے، اور وضو اور غسل کی جگہ تیمم کر لیا کرے بشرطیکہ سائل صاحب اولاد و صاحب زوجہ نہ ہو، اور خدمت کے لئے نوکر رکھنے پر بھی قادر نہ ہو، یا صاحب اولاد و زوجہ ہو اور وہ اس کو وضو اور استنجاء کرانے پر راضی نہ ہو اور اگر بیوی اس پر راضی ہو کہ وضو اور استنجاء کرے تو پھر اس کو تیمم جائز نہیں، اور بعض صورتوں میں صرف ڈھیلے سے استنجاء بھی جائز نہیں یعنی جبکہ نجاست اپنے مخرج سے تجاوز کر جائے اور بیوی استنجاء کرنے پر راضی ہو، قال فی الدریاب التیمم اولمرض یستد او یشتد بغلبة ظن او قول حاذق مسلم ولو یتحرق اولم یجد من یؤمنہ فان وجد ولو باجر مثل ولہ ذلک فی ظاہر المذہب لای تیمم کافی البحر اہ قال الشامی حاصل ما فیہ انہ لو وجد خادما ای من تلزمہ طاعته (فی مثل ذلک) کعبدة وولدة واجیرہ لای تیمم اتفاقا وان وجد غیرہ ممن لو استعان بہ اعانہ ولو زوجتہ فظاہر المذہب انہ لای تیمم ایضا بلا خلاف وقیل علی قوله

تیسم علی قولہا لا کالخلاف فی مریض لا یقدر علی الاستقبال او التحول
من الفراش النجس ووجد من یوجہہ او یحوّلہ الخ (ص ۲۴۰ ج ۱)
تنبیہ : استنجائیں بیوی کے سوا کسی اور کو لینا جائز نہیں، ہاں وضو و غسل میں
اولاد اور نوکر سب سے مدد لینا جائز بلکہ ایسے معذور پر واجب ہے، لیکن غسل میں پردہ کا اہتمام
نگلی وغیرہ سے لازم و ضروری ہے، واللہ اعلم، ۲۵ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ

فصل فی احکام المیاء

کنویں میں مینگنی گرجانے کا حکم | سوال (۱) مسجد کے کنویں کی حفاظت ممکن ہے، بکری کی اس
میں سے ایک مینگنی قدرے شگاف ہوئی نکلی ہے، مینگنی کے گرنے کی خبر نہیں معلوم ہے،
مولانا صاحب اس کنویں کا پانی پاک ہے یا نجس ہے، شرعاً کیا حکم ہے؟
الجواب : ظاہر روایت کے موافق اگر مینگنی ٹوٹی ہوئی کنویں سے نکلے یا گرجائے تو
کنواں ناپاک ہو جاتا ہے، سارا پانی نکالنا چاہئے، مگر صحیح مذہب یہ ہے کہ تھوڑی سی مینگنی
گرنے سے کنواں ناپاک نہیں ہوتا خواہ سالم ہوں یا شکستہ، البتہ زیادہ ہوں تو کنواں ناپاک
ہے، اور زیادہ کی حد یہ ہے کہ اکثر ڈولوں میں ایک یا دو مینگنی ضرور آتی ہوں، اور یہ حکم
سب کنوؤں کے لئے عام ہے، خواہ بستی کے ہوں یا جنگل کے، حفاظت ممکن ہو یا نہ ہو، قال
فی مراقی الفلاح ولا تنجس البیر بالبعر والروث والخشی ولا فرق بین آبار الامصار
والغلات فی الصحیح ولا فرق بین الرطب والیابس والصحیح والمنکسر فی ظاہر
الروایۃ لشمول الضرورة فلا تنجس الا ان یكون کثیرا وهو ما یشککثرہ الناظر
والقلیل ما یشککہ وعلیہ الاعتماد وان لا یخلو روعن بعرة ونحوہا کما صححہ
فی المیسواہ قال الطحطاوی قولہ فی ظاہر الروایۃ الاولی ان یقول فی الصحیح
فان ظاہر الروایۃ کما ذکرہ السرخسی ان الروث والمتفتت من البعر مفسد
مطلقاً ص ۲۳، اس جواب سے آپ کے تمام سوالات کا جواب ہو گیا، جو اس کے متعلق
تھے، اور بہشتی زیور میں استیعاب مسائل کا قصہ نہیں کیا گیا، ضروری باتیں لکھ دی ہیں،
ایک بڑے حوض سے ایک چھوٹا حوض نکالا جائے | سوال (۲)
تو کیا چھوٹے حوض سے وضو کرنا جائز ہے؟ قصبہ گوردھرے میں

گنج شہداء کی مسجد میں حوض کبیر سے ایک حوض صغیر بطور شاخ نکالا ہے، صغیر کا پانی کبیر سے متصل ہے، تو اس صغیر میں کوئی شخص وضو کرے تو اس کا وضو درست ہوگا، مینا تو جردا،
الجواب فیہ الصواب؛ صورت مسئلہ میں اس صغیر حوض میں وضو جائز نہیں ہے
 صغیر حوض میں جو شخص وضو کرے نماز پڑھے گا نادرست ہوگی، کما فی فتاویٰ خوازمۃ الروایا
 لمولانا القاضی حکیم مولانا الی الخانیۃ ورق، اغیر مطبع حوض کبیر یشعب منہ حوض
 صغیر فتوٰی المسان فی الحوض الصغیر لا یجوز وان کان ماء الحوض الصغیر متصلاً
 ماء الحوض الکبیر وھکذا فی مجموع الفتاویٰ للشیخ الاجل طاہر ابن عبد الرشید
 البخاری صفحہ ۵ النہر الذی ہو متصل بالحوض فکان ابتداء الحوض یدخل
 ماء النہر فوضاً انسان فیہ ان کان النہر قد ردّ راعین ونصف لا یجوز ولا یجعل
 تبعاً للحوض ان کان اقل یجوز یجعل تبعاً للحوض قبل لا یجوز ولا یجعل تبعاً للحوض ان کان قد دلع،
 کلام اس میں ہے کہ شاخ منقسمہ میں وضو جائز ہے یا نہیں، عنایت فرما کر اگر ممکن ہو
 تو کوئی عبارت تائید عبارت میں بڑھادیں، تاکہ کامل تائید ہو جائے گی،

الجواب من جامع امداد الاحکام؛ فاضل مجیب نے جو عبارت نقل فرمائی ہیں
 ان کا مطلب یہ ہے کہ دو حوض علیحدہ علیحدہ ہوں، اور حوض کبیر سے بواسطہ کسی منفذ یا نالی
 کے حوض صغیر میں پانی بھرا گیا ہو تو اس صورت میں حوض صغیر سے وضو جائز نہیں اور قرینہ
 اس مراد کا لفظ ”یشعب“ عبارت اولیٰ میں اور لفظ ”النہر الذی ہو متصل بالحوض“ عبارت
 ثانیہ میں ہے کہ اس جگہ نہر سے مراد وہ نالی ہے جس سے حوض کو بھرا جاتا ہے، اور صورت مسئلہ
 میں انشعب حوض صغیر من الکبیر نہیں ہے بلکہ حقیقت میں وہ ایک ہی حوض ہے، جس کا ایک
 حصہ عرضاً و طولاً عشر فی عشر ہے، اور ایک حصہ عرض میں کم اور طول میں حصہ عرض کے ساتھ
 مل کر عشر فی عشر ہے، پس صورت مسئلہ میں اس حوض کے ہر جانب میں وضو درست ہے،
 اور وقوع نجاست سے کوئی حصہ ناپاک نہ ہوگا، قال فی الدرر ولولہ طول لا عرض
 ولکنہ یبلغ عشر فی عشر کان یکون طولہ خمسین ذراعاً وعرضہ ذراعین ^{مثلاً}
 شامی، جاز تیسیراً قال فی رد المحتار ای جاز الوضو منہ بناء علی نجاسة الماء
 المستعمل او المراد جاز وان وقعت فیہ نجاسة وھذا احد قولین وھو
 المختار کما فی الدرر عن عیون المذہب والظہیریۃ وصححہ فی المعیط والاختیار

واللہ اعلم بالصواب

وغيرها واختار في الفتح القول الآخر وصححه تلميذه الشيخ قاسم لان مدار
الكثرة على عدم خلوص النجاسة الى جانب الآخر ولا شك في غلبه الخلو
من جهة العرض ومثله لو كان له عمق بلا سعة اى بلا عرض ولا طول لان
الاستعمال من السطح لا من العمق واجاب في البحر بان هذا وان كان الاوجه
الا انهم وسعوا الامر على الناس وقالوا بالضم كما اشار اليه في التنجيس بقوله
تيسيرا على المسلمين اه وعليه بعضهم بان اعتبار الطول لا ينعوا اعتبار العرض
ينجسه فيبقى طاهرا على الاصل للشك في تنجيسه اه ص ١٩٩ ج ١ والله اعلم،

١٦ شوال ١٢٨٥

گوبر لگا ہوا کپڑا اگر کنویں میں سوال (۳) اگر محجب یعنی اینڈ وا جو کہ عورت کے سر کے
 گر جائے تو کیا حکم ہے، اوپر رکھ کر گوبر وغیرہ کا ٹوکرا وغیرہ اٹھاتی ہیں اور اس پر گند
 وغیرہ لگا ہوتا ہے وہ کنویں میں گر جاوے تو کس قدر پانی نکالنا چاہئے؟

الجواب؛ قال في الخلاصة والسرقيين اذا وقع في البير تنجس الماء كله قليلاً كان او كثيراً وعن ابى يوسف لا ابالى بالتبنة والتبنتين بلطخة بالسرقي اذا وقع في البير ارضاً قلت والوجه لما يتعذر الاحتراز عن وقوع التين واما الثوب المتلطخ به فما الاحتراز عنه غير متعذر ووقوعه نادر فالظاهر نجاسة البير بوقوعه، جس کپڑے میں گوبر لگا ہوا ہو اس کے گرنے سے کنواں ناپاک ہو جائے گا، سارا پانی نکالنا چاہئے، واللہ اعلم، ۱۸ ارشوال سلمہ

سوال (۴) ایک کنویں میں کبوتر گر کر مر گیا اور سڑ کر ریزہ ریزہ ہو کر نکلا اور کنواں پاک اس طرح سے کیا کہ نہر کا پانی کنویں کے اندر موری کر کے تین مرتبہ اس کنویں کو نہر کے پانی سے بھر دیا اور وہ نہر اور کنواں پانی بھر کر ایک کر دیا، اور جو کہ کنویں کے اندر موری کی تھی وہ کنویں کے اوپر کے سرے سے چار ہاتھ نیچے تھی، آیا اس طرح سے یہ کنواں پاک ہوایا نہیں؟

الجواب؛ کنواں اس طرح پاک نہیں ہوا، کیونکہ موری کے نیچے جو پانی باقی تھا وہ جاری نہیں ہوا اور ناپاک دراصل وہی تھا اسی کے نکلنے کی ضرورت تھی، لہذا پانی ڈول سے نکال کر پھر سارا پانی کنواں پاک کیا جاوے، ۱۹ رمضان ۱۳۳۵ھ،

کنوس میں مرغی کا بچہ گر کر زندہ سوال (۵) نکالا گیا تو کنواں پاک ہی یا ناپاک
 نکالا گیا، مرغیاں اکثر غلیظ اور گوہ کھاتی رہتی ہیں، گندمی نالیوں میں اکثر گھومتی
 رہتی ہیں جس سے ان کے پاؤں اور چونچ نجس رہا کرتے ہیں، لیکن مرغی کا بچہ جب کنوس
 میں گرا تو کسی شخص نے گرتے وقت یا نکلنے کے وقت مجر د اس بات کا خیال نہیں کیا
 کہ آیا اس کے جسم پر کوئی نجاست ظاہری تو نہیں ہے، الغرض کسی شخص کو نہ تو اس
 کے نجس ہونے کا علم ہے اور نہ پاک ہونے کا، اس صورت میں چند امور دریافت طلب
 ہیں، (۱) آیا کنوس کا پانی نجس ہوا یا نہیں (۲) آیا اس کنوس سے بلا صاف کئے ہوئے
 وضو اور غسل جائز ہے یا نہیں (۳) اگر کنواں نجس ہو گیا تو کتنا پانی نکالنا واجب ہے،
 (۴) اگر نجس نہیں ہوا تو استحباباً کچھ پانی نکالا جائے گا یا نہیں، اگر نکالا جائے گا تو
 کتنا؟ بیٹو! تو جسروا،

الجواب: کنواں اس صورت میں پاک ہی، وہم کرنے کی ضرورت نہیں جب
 اس کے جسم وغیرہ پر کوئی ظاہری نجاست ہونے کا یقین نہیں، نہ کسی نے دیکھا تو
 کنواں پاک ہی ہے، قال فی مرقی الفلاح ولا ینجس الماء بوقوع ادمی والبقوع
 مایو کل لحمہ کالابل والبقر والغنم اذا خرج حیوا ولم یکن علی بدنہ
 نجاسة متیقنة ولا ینظر الی ظاہر اشتمال افخا ذہا علی ابوالہا ام،
 قال الطحطاوی لاحتمال طہارتہا بوردہا ماء کثیرا قبل ذلک فہذا مع
 الاصل وهو الطہارۃ تطافرا علی عدم الترح کذا فی الفتح ام (ص ۲۲)
 قلت وبہذا ظہر حکم الاشیاء المصنوعۃ بایدی الکفار کالعلوی وغیرہا
 فلا یحکم بتنجاسہا بمجرد اشتمالہم علی النجاسات لاحتمال ورودہم
 علی ماء کثیر قبل ذلک ونحوہ فافہم، ۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۴ھ

ہل لا یوضو حرمتہ فی الشرع | سوال (۶) ما قولکم ایہا العلماء الکرام والفصحاء
 العظام فی الماء المستعمل بالوضوء والغسل الہ العزۃ والکرامۃ وأیجوز
 اجراء ذلک الماء علی المقامات النجسۃ والبول والغائط وغیرہا قصد
 لطہارۃ تلك المقامات وأیجوز ان یبول فی ذلک الماء، وما قولکم فمن

یہ تکب ذلک الفعل عند اویصر علیہ آلہ حکم الفاسق ام لا، بینوا بالسنن
توجروا بالخلد،

الجواب:، قال فی الدرر من منہیاتہ التوضی بفضل ماء المرأة فی موضع
نجس لان ماء الوضوء حرمۃ الخ (ص ۱۳۸ مع الشامی) اس سے معلوم ہوا کہ ماہ
مستعمل وضو کی حرمت شریعت میں ہے، اس لئے مقام نجس میں وضو کرنا مکروہ ہے، لیکن اس پر
کوئی دلیل نہیں ملی، کہ محل نجس میں کراہت توضی سے مراد کراہت تحریمیہ ہے، بظاہر کراہت
تثریہ ہے، اور وہ بھی حنفیہ کے قول ثالث پر کہ ماہ مستعمل طاہر غیر طہور ہے، اور یہی صحیح اور
مفتی بہ ہے، اور روایت نجاست مستعمل پر خواہ غلیظہ ہو یا خفیفہ ماہ مستعمل کی کچھ حرمت
نہ ہوگی، لان النجس لا حرمة له بل یحترق عنہ ویتوقی، پس اس مسئلہ میں نزاع اور غلو نہ کرنا چاہئے
کیونکہ حنفیہ کے اقوال طہارت و نجاست مستعمل میں مختلف ہیں، پس حرمت بھی اس کی مختلف
ہے، واللہ اعلم، یکم رجب ۱۳۵۷ھ

حکم آب تالاب [سوال (۷)] ایک تالاب ہمارے یہاں ایسا ہے کہ جب وہ خشک ہو جاتا ہے
تو لوگ اس میں پیشاب پاخانہ اور بھی دوسری نجاست ڈالتے ہیں اور بارش آتی ہے تو پہلے
محلوں سے سیلوں کا پیشاب و گوبر وغیرہ نجاست پانی کے ساتھ اس زمین میں جہاں پہلے بہت
نجاست پڑی تھی جمع ہوتا ہے، اور پھر زیادہ بارش ہونے کی وجہ سے کھیتوں کا پانی بہت
کثرت سے آتا ہے، اور تالاب میں جمع ہوتا ہے، اور تالاب میں قریب بیس ہیکٹہ زمین میں
پھیلتا ہے، اور کہیں ایک آدمی اور کہیں نصف آدمی کے قدر کے پانی ہوتا ہے تو وہ پانی پاک ہے
یا ناپاک، اور دھوبی اس سے کپڑے دھوتے ہیں تو اس کو پھر دھونا چاہئے، یا نہیں؟
تنقیح: اس کا پانی کہیں نکلتا بھی ہے یا نہیں اور جمع ہونے کے وقت کیا ہر طرف
نجس پانی آتا ہے یا کسی طرف سے طاہر بھی اور غالب کونسا ہوتا ہے؟

نحو اب تنقیح: متعلق مسئلہ تالاب پانی نکلنے کی دو صورتیں ہیں، تھوڑا پانی یعنی
نصف تالاب یا پونہ تالاب بھر جاتا ہے تو نکالنے سے نکلتا ہے، اور جب پورا بھر جاتا ہے تو
خود بخود نکل جاتا ہے، اور جمع ہوتے وقت ہر طرف سے نجس نہیں آتا بلکہ پاک بھی آتا ہے،
اور غالب پاک ہی ہوتا ہے، اور کثرت سے پاک ہی جمع ہوتا ہے،

الجواب: اگر وہ درودہ کی مقدار میں پاک پانی کسی جگہ جمع ہو کر اس تالاب میں آجائے

تو پاک ہو جاوے گا، اور اگر اتنا پانی پاک اس میں اس طرح نہیں آیا تو جس وقت اس کا پانی پورا بھر کر پہنے لگے گا تو پاک ہو جاوے گا، فی العالمگیریہ ص ۱۱ ج ۱، وفي الفتاویٰ غدیو کیویر لا یكون فيه الماء في الصيف، وتروث فيه الدواب والناس ثم يملأ في الشتاء ويرفع منه الجمد ان كان الماء الذي يدخله يدخل على مكان نجس فالماء والجمد نجس وان كثربعد ذلك وان كان في مكان طاهر واستقر فيه حتى صار عشر في عشر ثم انتهى الى النجاسة فالماء والجمد طاهر ان كذا في الفتاویٰ وفيه ايضا حوض صغير يتنجس مائة فدخل الماء الطاهر فيه من جانب سأل ماء الحوض من جانب اخر كان الفقيه ابو جعفر يقول كما سأل ماء الحوض من الجانب الاخر يحكم بطهارة الحوض وهو اختيار الصدوق والشهيد كذا في المحيط كتبه الاحقر عبد الكريم گتھلوی عفی عنہ، الجواب صحیح ظواہر عفا عنہ ۱۹ رذی الحجہ ۱۳۲۸ کنویں میں جب تک ناپاکی کا گڑنا متیقن نہ ہو اُسے پاک سمجھا جائے گا، سوال (۸) اکثر کنویں دیکھے جاتے ہیں کہ عام طور پر لوگ ان میں احتیاط نہیں کرتے گلیوں میں برہنہ پاؤں پھرتے ہیں بے نمازی ہوتے ہیں، بلکہ یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ مسلمان ہیں یا نہیں، گلیوں میں نجاست بھی ہوتی ہے، غالب ظن ہے کہ وہ پاؤں کے ساتھ نجاست لگنے سے پرہیز نہیں کرتے، ایسے لوگ کنوؤں پر آتے ہیں پانی نکالتے ہیں، پانی کنویں کے کنارہ پر گرتا ہے، پیران لوگوں کے اس پانی سے بھیگ جاتے ہیں، بلکہ بعض لوگ پاؤں کو دیں دھو بھی لیتے ہیں، بعض مواضع میں لوگ جوتوں کے ساتھ ہی کنویں پر چڑھ جاتے ہیں اور پانی جوتوں کے ساتھ لگتا ہے، اس پانی سے رسی بھی بھیگ جاتی ہے، اور ڈول یا بوکا بھی اس جگہ پڑتا ہے، وہ پانی کنویں میں گرتا ہے، رسی سے بھی ٹپک کر کنویں میں گرتا ہے، اور وہ ڈول یا بوکا جن کو پانی مذکور لگ گیا تھا وہ بھی کنویں میں ڈالے جاتے ہیں، عوام تو اس پانی کو بیدھڑک استعمال وضو وغیرہ کے واسطے کرتے ہیں، احقر کو ہمیشہ ایسے پانی کے استعمال میں کھٹکا رہتا ہے، مگر استعمال کر لیتا ہے، اس خوف سے کہ الذین یزکون انفسہم کایم مصداق نہ بن جاؤں، کیا ایسے پانی کو وضو وغیرہ کے لئے بے کھٹکے استعمال کر لیا جائے، یا کہ اور پانی کے ساتھ لایا جائے، بعض موقع پر ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ پانی سے پیشاب کی بو آتی ہے، یا مزہ پیشاب کا ہوتا ہے یا دونوں ہوتے ہیں، اور لوگ بے کھٹک اس پانی کو وضو وغیرہ کے لئے استعمال میں لاتے ہیں تو کیا ایسے موقع پر تیمم کرنا چاہئے

یا کہ اسی پانی سے وضو کر لیا جاوے، امام محمد صاحبؒ کے قول پر اگر تیمم کا حکم ہو تو امام نے اس پانی سے وضو کر لیا، لا پرواہی سے اس امام کے پیچھے نماز پڑھ لینا چاہئے یا تہنہ پڑھے، اور بندر کا جھوٹا نجس ہے یا مکروہ؟ بینوا توجروا عند ربکم،

الجواب؛ الیقین لایزول بالشک کے قاعدہ سے اس پانی کو پاک کہا جاوے گا، جب تک اس میں ناپاکی کا گرنا متیقن نہ ہو جاوے، اور رنگ وغیرہ میں تغیر بھی نجاست کی دلیل نہیں، طول مکث وغیرہ سے بھی تغیر ہو جاتا ہے، اور بندر کا جھوٹا نجس ہے، فقط
الحجۃ صحیحہ ظفر احمد عفا عنہ ۱۲ رمضان ۱۴۲۳ھ، حررہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ ۱۲ رمضان ۱۴۲۳ھ

سوال (۹) ایک مٹکا مسجد کا جو زمین میں دبا ہوا ہے، اس ناپاک کنویں کا پانی جس برتن اور جگہ پر گرے اس کا پاک کرنا ضروری ہے؟ میں کنویں کا ناپاک پانی ڈالا گیا، بعد ازاں کنواں پاک کیا گیا تو کیا مٹکے کا پاک کرنا اور کوزیوں کا اور بوریہ اور مسجد اور ستھر (جو ایک قسم کا گھاس کا ٹکڑا مسجد میں ایام سرما میں بچھایا جاتا ہے) کا پاک کرنا بھی ضروری ہے یا نہیں، کیونکہ اکثر قبل از علم وقوع نجاست جو وضو ناپاک پانی سے کیا گیا تو پاؤں کی ترسی بوریے اور ستھر مسجد کو لگ ہی جاتی ہے، تو اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ اس مٹکے کو کس طرح پاک کریں گے، اور تین دفعہ پانی سے اس کو کس طرح دھو سکیں گے، اور مٹکے کو اکھاڑنا مشکل ہے، کیونکہ وہ پختہ اینٹوں سے مضبوط پکا بنایا گیا ہے، اور نیچے اس کے ٹونٹی بھی نہیں ہے، جس سے پانی بہا دیا جاوے، فقط دستیوں سے پانی نکالا جاتا ہے، اسی طرح بوریہ اور ستھر اور کوزیوں کا حکم ارشاد فرمایا جاوے،

ایک کنواں چند دن سے صاف کیا گیا، بعدہ اغلباً ایک دو ماہ کے بعد اس سے اچانک بُو آنے لگی، کوئی جانور یا نجاست نظر نہیں آتی، چنانچہ پھر صاف کیا گیا، تو بھی کوئی شے ناپاک کنویں سے برآمد نہیں ہوئی، لیکن بعد صاف کرنے کے اب بُو کوئی نہیں ہے، تو دریافت طلب یہ امر ہے کہ اس طرح پھر اگر بُو آنے لگے تو کیا وہ پانی ناپاک تصور کر کے سب نکالنا پڑے گا یا نہیں، بینوا توجروا

الجواب؛ کنویں کی رسی اور ڈول اور گھٹری وغیرہ تو کنواں پاک ہونے سے تبعاً پاک ہو جاتا ہے، کافی نور الایضاح (ص ۲۳) وعللہ بكونہا نجسة تبعاً للبرکة لیکن فرش مسجد اور نوٹے وغیرہ بدون پاک کئے پاک نہ ہوں گے، پس اگر ناپاک پانی فرش مسجد اور لوٹوں کو

اور گھاس کو جو مسجد میں پڑا ہے لگا ہوتا ہے سب کو پاک کرنا ضروری ہے، اور گھاس کو اوپر پر سے کچھ اتار کر پھینک دیا جائے، یا اتار کر دھو کر سکھلا کر بچھایا جائے، اور جو مٹکا بچھتا گڑا ہوا ہے اس کے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس میں تین دفعہ پانی بہت مقدار میں ڈال کر سب جوانب سے دھو کر نکال دیا جائے، اور ہر دفعہ میں اچھی طرح پانی نکال دیا جائے، تیسری دفعہ میں مٹکا پاک ہو جائے گا، ۴/۲۵ رزی الحجہ ۲۵

کنویں میں چھوٹی یا بڑی چھپکلی گرنے کا حکم سوال (۱۰)..... چھپکلی اور یہ کہ گرگٹ اس کے علاوہ دوسری نوع ہے

نہیں، صام ابرص کے گر کر مرجانے سے فقہاء نے جو کنویں میں سے ہیں سے تیس ڈول تک نکالنے کے لئے لکھا ہے، اس سے کیا مراد ہے، لغت کی کتاب سراج وغیرہ میں تو صام ابرص کا ترجمہ چھپکلی دیکھی لکھا ہے کہ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ چھپکلی مذکور کے مرجانے سے کنواں ناپاک ہو جاتا ہے، اور کفایہ بشرح ہدایہ میں صام ابرص کے معنی گرگٹ کے ہیں اور چھپکلی کے نہیں ہیں، علاوہ اس کے فقہاء ج یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ جن جانوروں میں دم سائل نہیں ہے اُن کے مرجانے اور پھٹنے پھولنے سے کنواں ناپاک نہیں ہوتا، تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ چھپکلی مذکور میں دم سائل نہیں ہے، اب اس میں تطبیق کس طرح پر ہوگی اور چھپکلی مذکور کون سے حکم میں داخل ہوگی، ایک مولوی صاحب نے یہ جواب تحریر فرمایا ہے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے،

الجواب ھذا الموفق للصواب؛ صحیح یہ ہے کہ چھپکلی کے مرنے سے چاہ ناپاک نہیں ہوتا احتیاطاً بیس تیس ڈول نکال دیتے جاویں تو اچھا ہے، اصل یہ ہے کہ جس جانور میں خون نہیں ہے اس کے مرنے سے پانی ناپاک نہیں ہوتا، البتہ بڑا گرگٹ جس کو دوزخہ کبیرہ کہتے ہیں اور اس میں خون ہوتا ہے اس کے مرنے سے چاہ ناپاک ہوتا ہے، اس میں پھر وہ تفصیل ہو جو چاہے وغیرہ میں ہے۔ یعنی اگر گر کر مرجائے پھولے پھٹے نہیں تو بیس یا تیس ڈول، ورنہ نکل پانی نکالنا چاہئے (ہدایہ ص ۲۶ س ۱۴) مسئلہ تو یہ ہے اور اس کو یاد رکھنا چاہئے، باقی لغت وغیرہ کی کتابوں کو دیکھ کر شبہ نہ کرنا چاہئے، شرح منیہ میں ہے ولذا الوزعة اذا كانت کبيرة الخ، پس جس کتاب میں صام ابرص کے مرنے سے پانی کا ناپاک ہونا لکھا ہو اس سے مراد دوزخہ کبیرہ یعنی گرگٹ ہی لینا چاہئے،

دوسرے مولوی صاحب یہ فرماتے ہیں جو درج ذیل ہے:-

الجواب؛ صورت مسئلہ میں پیس سے تیس ڈول تک پانی نکالا جائے گا، اس لئے کہ وزغہ چھپکلی کو بھی کہتے ہیں، جیسا کہ مراقی الفلاح میں ہے (سواکن البیوت) (رمالہ دم سائل) کافارۃ والنجۃ والوزغۃ جب وزغہ کو سواکن البیوت میں لکھا ہی ظاہر ہے کہ سواکن البیوت میں چھپکلی ہے نہ کہ گرگٹ، جس پر لغت بھی شاہد ہے، اور عبارت مذکورہ سے چھپکلی میں دم سائل ہونا بھی مصرح ہے، اور حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحبؒ نے لکھانے اپنا مشاہدہ لکھا ہے کہ چھپکلی میں دم سائل ہوتا ہے، واللہ اعلم بالصواب،

چونکہ مولوی صاحبان نے ڈول کا گناہ قول تحریر فرماتے ہیں، بعدہ بہشتی زیور پہلا حصہ جدید مکمل، میں یہ مسئلہ نظر پڑا۔

مسئلہ؛ بڑی چھپکلی جس میں بہتا ہوا خون ہوتا ہو اس کا حکم بھی یہی ہے کہ اگر مر جاوے اور پھولے پھٹے نہیں تو بیس ڈول نکالنا چاہئے، اور تیس ڈول نکال دینا بہتر ہے، اور جس میں بہتا ہوا خون نہ ہوتا ہو اس کے مرنے سے پانی ناپاک نہیں ہوتا،

اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ بڑی چھپکلی سے کیا مراد ہے، آیا گرگٹ یا وہ چھپکلی جو جسامت میں بڑی ہو، اس مسئلہ کو واضح کر کے تحریر فرمائیے گا (مع حوالہ کتب) فقط

الجواب؛ قال فی حیوۃ الحيوان الوزغۃ دویۃ معروفة دھی نسام ابرص جنس نسام ابرص کبارہ واقفقا علی ان الوزغ من العشرات المؤذیات ام (ص ۳۳۸) اس سے معلوم ہوا کہ وزغہ اور نسام ابرص ایک ہی جنس ہے، بڑی قسم کو نسام ابرص کہتے ہیں اور چھوٹی کو وزغہ، اور گرگٹ ان دونوں کے علاوہ تیسری قسم ہے، جس کو حربا کہتے ہیں وہ سواکن بیوت سے نہیں بلکہ سواکن اشجار سے ہے، گو بعض نے اس کو بھی وزغہ کی نوع سے کہا ہے، مگر راجح یہ ہے کہ یہ نوع جدا ہے، کما فی حیوۃ الحيوان (ص ۲۱۰ و ۲۱۱ ج ۱) پس نسام ابرص سے مراد بڑی چھپکلی ہے جو جسامت میں بڑی ہوتی ہے، گھروں میں دو قسم کی چھپکلی نظر پڑتی ہے ایک مقدار میں بڑی ہوتی ہے اور ایک چھوٹی ہے، بڑی میں تو دم سائل کا تجربہ ہوا ہے، اس لئے وہ تو حکم فارہ میں ہے، اور چھوٹی میں دم سائل نہیں دیکھا گیا، اس لئے اس کے مرنے سے کنواں ناپاک نہ ہوگا، اور عبارت مراقی الفلاح میں وزغہ سے مراد وزغہ کبیرہ یعنی نسام ابرص ہی ہے، کیونکہ اوپر معلوم ہو چکا کہ یہ دونوں ایک ہی ہیں، صرف صغرو کبر کا فرق ہے قال فی شرح المنیۃ کذا الوزغۃ اذا کانت کبیوۃ ای حیث یکون لہا دم فانہا

تفسد الماء ۱۴ (ص ۱۶۲) کبیرہ کی قید سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی وزغہ صغیرہ میں دم نہیں ہوتا، اور وزغہ کبیرہ وسام ابرص واحد ہیں، مجیب اول کا وزغہ کبیرہ کا ترجمہ گرگٹ سے کرنا صحیح نہیں، اور مجیب ثانی کا عبارت مراقی الفلاح میں وزغہ کو صغیرہ و کبیرہ دونوں کو عام کرنا صحیح نہیں، والحق التفصیل واللہ اعلم، حکم محرم الحرام ۲۶

سوال (۱۱) اگر کسی شخص نے کتے کے گردن میں رسی باندھ کر کتے کو رستی سے باندھ کر کنویں میں لٹکادیا، اور اس کا منہ پانی سے علیحدہ رہا، اور اس کے جسم پر بظاہر کسی قسم کی نجاست بھی نہ تھی اور پھر اس نے اسے زندہ نکال لیا تو وہ کنواں پاک ہے یا ناپاک، نیز یہ کہ زندہ کتے تو کنواں ناپاک نہیں ہوگا،

کے بال پاک ہیں یا ناپاک، اور تراور خشک میں فرق ہے یا نہیں؟
الجواب: کتے کا جسم بجز منہ کے سب پاک ہے، جب تک ناپاکی نظر نہ آوے پس صورت مسئلہ میں کنواں پاک ہے، بشرطیکہ سوال واقع کے مطابق ہو،

اصلہ ان الکلب لیس بنجس العین عندنا خلافاً للروافض و

انما ینجس فمہ ولعابه عندنا، ۸ ارجادی الثانی ۲۴

سوال (۱۲) کنویں میں پیشاب پاخانہ گر جانے کا حکم
کنویں میں پیشاب پاخانہ وغیرہ گر جانے کے علاوہ اس کی کہگل بھی نکالی جائے یا صرف پانی نکالنا کافی ہوگا؟

الجواب: پیشاب میں تو صرف گل پانی کا نکال دینا کافی ہے، کہگل وغیرہ نکالنے کی ضرورت نہیں، اور پاخانہ اگر رقیق ہو جس کی نسبت یہ گمان غالب ہو کہ پانی کے اندر منتشر ہو گیا ہو گا تہہ نشین نہ ہوا ہو گا تو اس کا بھی وہی حکم ہے جو پیشاب کا ہے، اور اگر غلیظ ہو جس کے تہہ نشین ہونے کا گمان غالب ہو تو کہگل بھی نکالنا ضروری ہے، یا یہ کہ پانی نکال کر اتنی مدت تک کنویں کو چھوڑ دیا جائے کہ بطن غالب پاخانہ مٹی ہو جائے،
۸، محرم الحرام ۲۴

سوال (۱۳) بعض مولویوں سے سنا ہے کہ قلیل چھوٹے برتن میں پانی کے اندر ہاتھ یا انگلی ڈوب جا تو یہ پانی مستعمل کہلائیگا یا نہیں؟
پانی میں اگر بغیر وضو کے ہاتھ کا کوئی حصہ مثلاً انگلی یا ہتھیلی ڈوب جائے تو وہ پانی پاک تو رہتا ہے، مگر مستعمل ہو جاتا ہے، اور مستعمل پانی سے

وضو درست نہیں، کیا یہ مسئلہ صحیح ہے،

الجواب؛ برتن کا پانی مستعمل جب ہوتا ہے کہ برتن میں ہاتھ ڈالتے ہوئے وضو یا غسل کا ارادہ ہو مثلاً برتن میں ہاتھ ڈال کر برتن کے اندر ہی پانی ہاتھ کو ملے اور ملنے سے مقصود وضو یا غسل کرنا ہے، اور اگر پانی میں ہاتھ اس واسطے ڈالا ہے کہ پانی ہاتھ میں لے کر برتن سے الگ وضو یا غسل کے لئے دھویا جائے گا تو برتن کا پانی مستعمل نہ ہوگا، بلکہ جو پانی ہاتھ کو ملے ہوئے گرے گا وہ مستعمل ہوگا، واللہ اعلم، ۲۶/محرم ۱۴۲۹ھ

فصل فی التیمم

تیمم میں کم از کم کتنا بڑا ڈھیلہ ہونا چاہئے؟ سوال (۱) یہ دو مسئلے دریافت کرنے کی ضرورت ہے کہ اور کلوخ تیمم سے استنجا کا حکم (۱) کم سے کم کتنے چھوٹے ڈھیلے پر تیمم ہو سکتا ہے، یا چھوٹی چھوٹی دو ڈلی ہوں ان دونوں کو ایک جگہ کر کے بھی ہو جاتا ہے، بعض دفعہ کوئی آدمی پاس نہیں ہوتا، ایسا اتفاق مجبوری میں ہوا ہے،

دوسرا یہ مسئلہ ہے کہ جس ڈھیلے سے تیمم کیا ہو اس سے استنجا پاک کرنے میں کوئی حرج تو نہیں اس میں سے توڑ کر ڈھیلے سے استنجا کر لیں؟

الجواب؛ قال فی الدرہوقصص صعبین مطہرو استعمالہ حقیقۃً او حکماً لیعم التیمم بالحجر الاملس بصفة مخصوصة هذا لئلا یفید ان الضر ببتین رکن وهو الاصح الا حوط الی ان قال وکنہ الشیئان الضر بتان والاستیعاب شرطہ ستہ منها کونہ بثلاث اصابع ام قال الشامی تحت قوله وهو الاصح الا حوط هذا ما ذهب الیہ السید ابوشجاع وصححه الحلوانی و فی النصاب وهذا الاستحسان وبہ ناخذ وهو الاحوط وقیل لیس بمرکن والیہ ذهب لاسیبجانی وقاضی خا والیہ مال فی البحر والبرازیة والامداد وقال فی الفتح انه الذی یقتضیہ النظر لان المامور بہ فی الایۃ المسح لا یشمل قولہ علیہ السلام التیمم ضربتان اما علی ارادة الضربة اعم من کونها علی الارض او علی العنصر مسحاً وانه خرج مخرج الغالب ام واقرة فی العلیة ورجحه فی شرح الوہبانیۃ اھ و فیہ ایضاً لو کنس داسراً وھدم حائطاً فاصاب وجھہ وذراعیہ غبار لم یجزہ

ذلك عن التيمم حتى يتردى عليه واذا اقلت الريح الغبار على يديه ووجهه
فمسخ بنية التيمم اجزاءه على الثاني دون الاول رص، ۲۳ ج ۱

احوط یہ ہے کہ ڈھیلا اتنا بڑا ہو جس پر دونوں ہاتھ سے ایک دفعہ ضرب کر سکیں، یا کہ کم از کم اتنا بڑا کہ ایک ہاتھ پورا یعنی پتھیلی مع انگلیوں کے اُس پر آجائے اور یکے بعد دیگرے دونوں ہاتھوں کو اس پر مار سکیں، کیونکہ بعض علماء کے نزدیک ضرب تيمم کا رکن ہے اور استنجا میں تيمم کا ڈھیلا استعمال کرنا جائز تو ہے مگر اچھا نہیں، فقہاء نے ناپاک جگہ وضو کرنے کو خلاف ادب کہا ہے، اور وجہ یہی لکھی ہے کہ وضو کا پانی قابلِ حرمت ہے پس ایسے ہی تيمم کا ڈھیلا بھی ہے، ۱۰ ربيع الاول ۱۲۸۵ھ

حکم تيمم برائے محافظ گتہ درمیان | سوال (۲)

..... ۱، ایک شخص بیس یا کہ تیس بھینسوں کے گتہ کے پاس ہے، اور پانی بھی قریب ہے، مگر اندیشہ ہے کہ وہ بھینسیں کھیت میں نقصان کر دیں گی، کیونکہ کھیت دوسرے کا ہے، اس حالت میں تيمم سے نماز جائز ہے یا کہ نہیں،

..... ۲، ایک شخص اپنے اناج کے پاس ہے، اور وہ جنگل میں اکیلا ہے، اس کو اندیشہ ہے کہ اگر میں یہاں سے وضو کرنے گیا تو اناج چور اٹھالے جائیں گے، اگر پانی بھی آدھ کوں ہوئے تو تيمم جائز ہے کہ نہیں؟

الجواب؛ قال في الدر من عجز عن استعماله الماء لبعده ميلا او مرض او برد يهلك الجنب او يمرضه او خوف عدو كحيتة او نار على نفسه ولو من فاسق او حبس غريم او ماله ولو امانته (عد الامانة ماله باعتبار وضع اليد عليها ۱۲) او عطش او عدم الله طاهرة تيمم لهذا اعذار كلها ام رص ۲۳ ج ۱ اس سے معلوم ہوا کہ اپنے مال کے تلف ہونے کا خوف تو تيمم کو جائز کرتا ہے، اور دوسرے کے مال تلف ہونے کا خوف مبیح تيمم نہیں، پس اس صورت میں شخص مذکور کو تيمم جائز نہیں، بلکہ لازم ہے کہ وضو کرے اور جانوروں کو اپنے ساتھ پانی پر لیجائے، اور وضو کرتے ہوئے ان کو کھیت میں گھسنے سے روکتا رہے، دوسرے جیسا وضو کرنے میں یہ اندیشہ ہے کہ جانور کھیت میں گھس جائیں گے نماز پڑھنے میں بھی تو یہ اندیشہ ہے، تو کیا یہ شخص نماز کو بھی ترک کرنا چاہتا ہے، پس یہ عذر قابلِ قبول نہیں اور اس پر واجب ہے کہ اپنی طرف سے جانوروں کا پورا انتظام جتنا کر سکتا ہے کرے، اس کے

بعد وضو اور نماز میں مشغول ہو جائے،

(جواب ۷) اس صورت میں تیمم جائز ہے، بخوفہ علی مالہ و قدرہ بالدرہم کما فی الشامیۃ

صفحہ ۲۴۲ جلد ۱، ۲۴، شوال ۱۴۲۲ھ

فصل فی المسح علی الخفین

کرچ کے موزہ پر مسح درست ہے | سوال (۱).....

..... اگر کرچ کا موزہ ایسا ہو جس پر چمڑا بسلا ہوا ہو، مثلاً پنجہ اور برابروں پر اور ایڑی بھی چمڑے کی ہو اور تلہ بھی چمڑے کا ہو اور بعض جگہ کرچ ہو اور فیتہ باندھنے کی جگہ پر بھی چمڑا ہو اور کرچ ایک قسم کا ٹاٹ سن کا بنا ہوا ایسا گاڑھا ہوتا ہے کہ اس میں کپڑے کی طرح پانی نہیں پھوٹتا اور نہ وہ پانی لگنے سے ذرا نرم پڑ سکتا ہے، ان سب صورتوں میں اُن پر مسح جائز ہے یا نہیں، اور اگر جائز ہے تو اگر سوائے تلہ کے اور چمڑا نہ لگا ہو تب بھی جائز ہے یا نہیں، اور اگر اس میں بھی جائز ہے تو بدرون چمڑے کے یعنی محض کرچ کا موزہ ہو تب بھی جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: کرچ کی جو صورت بیان کی گئی ہے اس حالت میں تو اگر چمڑا اس پر لگا بھی نہ لگایا جائے جب بھی مسح درست ہے، قال فی المنیۃ وشرحہا ویجوز المسح علی الخفین المتخذۃ من اللبود التركیۃ لامکان قطع المسافۃ بہا حتی قالوا ولشہد ابو حنیفۃ صلابۃ ہما لا فتی بالجواز لشدة دلکھا وقد اخل اجزاء ہما بذلک حتی صارت کالجود الغلیظ واجمعوا علی جواز المسح علیہما بطریق الدلالة کما تقدم ام وفيہ ایضاً وحد الجوزین الثخنین ان یستمسک ویثبت علی الساق من غیر ان یشدہ بشئ اھ، والمراد استساکہ بصلابتہ وغلظتہ دون جدتہ وضحیہ، والحد بعدم جذب الماء کما فی الادیم علی ما فہم من کلام قاضی خاں اقرب وبما تضمنہ وجہ الدلیل و ما یسکن فیہ متابعتہ المشی اصوب ام (ص ۱۱۹) قلت وھذہ المشرائط کلمھا موجودۃ فی القرص فلا شک فی جواز المسح علیہ عندہم، مگر احتیاطیہ ہے کہ تلہ چمڑے کا لگایا جائے تو پھر بہت اچھا ہو جائے گا، تلے کے سوا اور کسی جگہ چمڑے کے لگانے کی ضرورت نہیں، واللہ اعلم ^{ج۲ ص ۲۴۲}

مسح علی الخفین | سوال (۲) یہاں ایک شخص ہے اس نے کپڑے کی جراب پر جو معمولی ڈھائی تین آنہ کی ہوگی چمڑے کا پائتا بہ سی لیا، بلکہ چند ٹانگے لگائے ہیں، پائتا بہ بالکل کپڑے

کاسا ہی نہ اونچی ایڑی ہے، نہ انگلیوں کی طرف سے کچھ زیادہ ہے، اب وہ خفین کی طرح اس پر مسح کرتے ہیں، کیا یہ مسح جائز ہے، اور منعل جو آتا ہے اس کی یہی صورت ہے، مجھے دراصل منعل کی صورت میں تردد ہے،

الجواب؛ منعل کی صورت تو یہی ہے، کیونکہ صرف اسفل پر چڑھ ہونے کی تصریح معتبرہ میں موجود ہے، مگر جواب کر باس کا منعل ہونا مسح کے لئے کافی نہیں ہے، اس واسطے جواب مذکور فی السؤال پر مسح بالکل جائز نہیں، جو کہ تفصیل ذیل سے ظاہر ہے، اور تفصیل یہ ہے کہ جو رب کی چار قسمیں ہیں، اول صفیق منعل، دوم صفیق غیر منعل، سوم رقیق منعل، چہارم رقیق غیر منعل، قسم اول پر بالاتفاق مسح جائز ہے اور دوم پر جواز مسح میں اختلاف ہے کہ امام صاحب کے نزدیک جائز نہیں اور صاحبینؒ جائز کہتے ہیں، اور فتویٰ صاحبین کے قول پر ہر جیسا کہ ہدایہ، شرح وقایہ وغیرہ کتب کثیرہ میں موجود ہے، اور امام صاحبؒ نے مرض وفات میں وفات سے تین روز یا سات روز قبل جو ربین ثخنین پر مسح کیا اور فرمایا فعلت ما کنت منعت عنه، اس کلام سے رجوع پر استدلال کیا جاتا ہے، اور ظاہر یہی ہے، گو احتمال یہ بھی ہے کہ بضرورت مذہب غیر پر عمل کر لیا ہو، مگر فتویٰ کے لئے رجوع کا ثابِت کرنا ضروری نہیں بلکہ اہل ترجیح قوت دلیل وغیرہ کی بناء پر بھی فتویٰ دے سکتے ہیں، اور قسم سوم کا حکم عنقریب آتا ہے، اور قسم چہارم پر کسی کے نزدیک مسح جائز نہیں، یہ تفصیل بعض کتب فقہ میں تو مصرح ہے اور بعض سے مفہوم ہوتی ہے، اس کے خلاف نہ کسی کتاب میں تصریح ہے نہ احتمال، چنانچہ فتاویٰ قاضی خاں میں ہے، وان مسح علی الجوربین فهو علی وجہ ان کا نارقیقین غیر منعلین لا یجوز المسح علیہما فی قولہم وان کا نا ثخنین منعلین جاز المسح علیہما فی قولہم وان کا نا ثخنین غیر منعلین لا یجوز المسح علیہما فی قول ابی حنیفۃؒ و فی قول صاحبہ یجوز وعن ابی حنیفۃ رحمہ اللہ انه رجع الی قولہما وھذا فی العنایۃ شرح الھدایۃ والبحر الرائق وخلاصۃ الفتاویٰ وغیرہ وایضاً هو المفہوم من مختصر القدری والکنز وغیرہا..... من المتون المعبرۃ،

اب قسم سوم یعنی رقیق منعل باقی رہی، اور سوال اسی کے متعلق ہے، سو اس کی تحقیق یہ ہے کہ قدوری وکنز وملتقى البحر و تنویر الابصار کی عبارت سے بظاہر جواز مسح معلوم ہوتا ہے کیونکہ اسفہوں نے اپنی عبارت روح علی الجرموق والجورب المجلد والمنعل والٹخنین ونحو

عہ اور مجلد کا ذکر مستطرد آجاتا ہے ورنہ وہ فی نفسہ حقیقی خفا ہو اس کا پڑا خواہ دبیز ہو یا نہ ہو اس کو جواز مسح میں کہہ کر، خا، شہد، کما لا تخف، ۱۲ منہ

ہذہ العبارة میں منعل اور تخین کو ایک دوسرے پر عطف کیا ہے، جس کا مقتضایہ ہے کہ منعل پر ہر حال میں مسح جائز ہو خواہ وہ تخین ہو یا نہ ہو، مگر وقایہ اور نور الایضاح سے اس کے خلاف ثابت ہوتا ہے، کیونکہ وقایہ کی عبارت یہ ہے ”ادجور بیہ التخنین منعلین او مجلدین“ اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام صاحب کے نزدیک تخین ہونے کے بعد منعل ہونا شرط ہے اور بدون تخانہ کے منعل ہونا کافی نہیں، جیسا کہ محشی چلپی نے نہایت بسط کے ساتھ اس کو بیان فرمایا ہے، اور اخیر میں لکھا ہے والذی تلخص عنہ بعد ہذہ المباحث ان الجورب (الرقیق) الذی لا یجوز علیہ المسح اجماعاً اذا جلد اسفله فقط او مع موضع اصابع الرجل بحيث یكون محل الفرض الذی هو ظہر القدم خالیاً بالکلیۃ لا یجوز علیہ المسح قطعاً لانہ لاریبۃ ان نشاء الاختلاف بینہ وبين صاحبیہ اکتفاءً بما یجوز النخانة والاستمساک علی الساق وعدم اکتفائه بہ قائلاً بانہ لا ینفی فی جواز المسح ما ذکر بل لا بد معہ من امر^{زائد} علیہ وهو المنعل او المجلد لیتمکن بہ علی المشی حتی یكون الجورب باجماع ہذہ الامور فیہ فی معنی الخف واذا اتفق شیء منہما خرج عن کونہ فی معنایہ لان الحاق الشیء بالشیء انما یتأتی اذا کان فی معنایہ من کل وجہ ولہ مؤیدات کثیرۃ لا یحتمل ہذا المختصر ایرادھا قائل ام

اور تحریر مختار میں ہے فی حاشیۃ عبد الحلیم ما ینفید اشتراط النخانة فی المنعلین لانی المجلدین الخ، اور نور الایضاح کی عبارت یہ ہے صح المسح علی الخفین فی الحدث الا صغر للرجال وللنساء لو کان من تخین غیر الجلد سواء کان لہما نعل من جلد اولاً ام، اس سے بھی صاف ظاہر ہے کہ تخین ہونا منعل کے لئے بھی شرط ہے، اور تنویر الابصار نے خف پر جواز مسح کے جو شروط ثلاثہ لکھے ہیں ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ رقیق منعل پر مسح کافی نہیں، کیونکہ شرط ثالث یعنی کونہ مما یمکن متابعتہ المشی فیہ، (ای من غیر لبس المداس فوقہ شامی) اور شرط اول یعنی کونہ سائر القدم مع الکعب اس میں موجود نہیں، یہ گفتگو تو متون متداولہ کے متعلق تھی، جس کا حاصل یہ ہوا کہ اس قسم کا حکم مصرح کسی متن میں نہیں ہے، مگر بعض سے بوجہ اطلاق کے جواز مفہوم ہوتا ہے، اور بعض

معہ معلوم ان القدم اذا ظہر بقدر ثلث اصابعھا جعل کالغالی بالکلیۃ، ۱۲ منہ معہ ای علی الدر المختار ۱۲ منہ

سے بوجہ تقييد کے عدم جواز، اس لئے شروع فتاویٰ کی طرف مراجعت لابدی ہے، سو شروع فتاویٰ سے یہی واضح ہوتا ہے کہ رقیق منعل پر مسح جائز نہیں ہے، کیونکہ خلاصۃ الفتاویٰ میں جورب منعل کی تفسیر میں شخونت کی قید لگائی ہے، ولہذا تفسیر لجورب المنعل ان یكون الجورب المنعل کجورب الصبيان الذين یمشون علیہما فی شخونۃ الجورب وغلظ الثعل یجوز المسح علیہ اھ علاوہ ازیں خلاصہ میں ہی تصریح ہے کہ جورب کر باس اگر منعل ہوں تب بھی اُن پر مسح جائز نہیں جس کی وجہ بجز رقیق ہونے کے اور کچھ نہیں کما قال واجمعوا انہ لوکان منعلاً او مبطناً یجوز المسح علیہ ولوکان من الکرباس لایجوز المسح علیہ اھ، اسی واسطے طحاوی نے شرح مراقی الفلاح میں لکھا ہے رتحت قوله او کر باس، وظاہر کلام الحلواني والخلاصۃ انہ لا یصح المسح علیہ الا اذا کان مجلداً فلیراجع اھ قلت یندفع الاشکال بما سنعرض علی قول الحلواني، اور علامہ ابن ہمام فتح القدر میں لکھتے ہیں: لا شک ان المسح علی الخف علی خلل القیاس فلا یصح الحاق غیرہ بہ الا اذا کان بطریق الدلالة وهو ان یكون فی معناه ومعناه الساتر لمحل الذي هو بصدد متابعۃ المشی فیہ فی السف، وغیرہ الخ (ص ۱۳۹ ج ۱) اس سے معلوم ہوا کہ رقیق منعل کافی نہیں، کیونکہ وہ ساتر محل فرض نہیں ونیز رد المحتار میں شرح منیہ سے نقل کیا ہے ان ما یعمل من بطوخ یجوز المسح علیہ لوکان تخیناً بحيث یمکن ان یمشی معہ فرسخاً من غیر التجلید والتنعیل وان کان رقیقاً فمع التجلید او التنعیل ولوکان کما ینزع بعض الناس انہ لایجوز المسح علیہ ما لم یتوَعَب الجلد حیث ما یستوالقدم الی الساق لماکان بینہ وبين الکرباس فرق، اس سے صراحتہ معلوم ہوتا ہے کہ جورب کر باس کے لئے استیعاب جلد یعنی مجلد ہونا ضروری ہے، اور شرح منیہ میں علامہ حلبی نے جورب کی تقسیم اس طرح بیان کی ہے: ذکرہ نجم الدین الزاہدی عن شمس الائمۃ الحلواني ان الجورب خمسة انواع من المرعزی والغزل والشعر والجلد الرقیق والکرباس قال وذکر التفاصیل فی الاربعة ومن الثخین والرقيق والمنعل وغیر المنعل والمبطن وغیر المبطن واما الخامس فلا یجوز المسح علیہ کیفما کان اھ ونحو فی التتارخلاء

عہ یجب حملہ علی ان رقیقہ لیس کر قۃ الکرباس ۱۲ منہ

عہ اس معلوم ہوتا ہے کہ کپڑے کے جورب اگر تخین ہوں تب بھی اُن پر مسح جائز نہیں، لیکن (باقی خانہ صفحہ پر)

(حاشیۃ البحر للعلامة الشامی ص ۸۲ ج ۱) ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ منعل کے لئے شخصین ہونا شرط ہے، رقیق منعل پر مسح جائز نہیں، اور ان تصریحات کے علاوہ خود ظاہر الروایہ کے الفاظ اس پر دال ہیں، قال شمس الائمة السرخسی فی مبسوطہ قال رواہا المسح علی الجور بن فان کان شخصین منعین یجوز المسح علیہما یہ متن ہے، اور الفاظ میں امام محمد رحمہ اللہ کے جس میں امام صاحب کا قول نقل کر رہے ہیں، اس میں منعین کے ساتھ شخصین کی بھی قید ہے، اور شمس الائمة اس کی شرح میں یوں تحریر فرماتے ہیں، لان مواظبة المشی سفرا بہما ممکن وان کانا رقیقین لا یجوز المسح علیہما لانہما بمنزلة اللفافة وان کانا شخصین غیر منعین لا یجوز المسح علیہما عند ابی حنیفۃ لان مواظبة المشی بہما سفرا غیر ممکن نکا بمنزلة الجورب الرقیق وعلی قول ابی یوسف ومحمد رحمہما اللہ یجوز المسح علیہما (ص ۱۰۲ ج ۱) اس عبارت میں بعد اشتراک قید منعین کے رقیقین کا مقابلہ شخصین سے ہے، پس معلوم ہوا کہ رقیقین منعین پر بالاتفاق مسح ناجائز ہے، اور مضمرات میں امام صاحب کا مذہب بدیں الفاظ نقل کیا ہے واما الامام فقال اولاً انه یشتط فی جواز المسح علی الجورب الشخصین ان یکون منعلاً او مجلداً، یعنی جورب مطلق کا منعل ہونا کافی نہیں، بلکہ شخصین کا منعل ہونا کافی ہے (مجموعۃ الفتاویٰ علی الخلاصۃ، ص ۳، ج ۱) اور امام طحاوی نے فرمایا ہے لا نزی بأساً بالمسح علی الجوربین اذا کانا صفتین قد قال ذلک ابو یوسف ومحمد واما ابو حنیفۃ فان کان لا یری ذلک حتی یکونا صفتین ویکونا مجلدین فیکونا کالخفین (ص ۵۸ ج ۱)

غرض یہ کہ امام صاحب اور صاحبین میں اختلاف یہ تھا کہ جورب کا شخصین ہونا کافی ہو یا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) علامہ شرنبلانی نے شخصین ہونے کی صورت میں جائز قرار دیا ہے، کما مر آنفاً، اور جواز کا حکم صحیح ہے، پس حلوانی کے قول میں تاویل کی جاوے گی اور تاویل یہ ہے کہ اس زمانہ میں دبیز کپڑا ایسا نہ ہوتا ہوگا جس پر شخصین کی تعریف (یعنی لایشفان) صادق آسکے، اور آجکل ڈبل زین وغیرہ ایسے کپڑے موجود ہیں، پس یہ اختلاف اصل مسئلہ نہیں ہے، بلکہ اصل اختلاف احوال کی وجہ سے ہے واللہ اعلم ۱۲ منہ
سہ ہذا علی روایت الحسن ہی ان المنعل ما جلد اسفلہ واعلاه بحیث یستر الکعبین فالجلد المنعل منہ لوقان واما فی ظاہر الروایت فالمنعل ما جلد اسفلہ فقط ۱۲ منہ

نہیں، صاحبین کافی سمجھتے تھے اور امام صاحب اس میں منحل ہونے کی شرط لگاتے تھے، اور فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے، خواہ رجوع امام کی وجہ سے ہو یا اور کسی وجہ سے، مگر اس رجوع یا فتویٰ سے یہ کسی طرح لازم نہیں آتا کہ منحل پر مطلقاً یعنی اس کے رقیق ہونے کی صورت میں بھی مسح جائز ہو جاوے، پس کنز وغیرہ کی عبارت تسامح سے خالی نہیں ہے، بلکہ وقایہ کی عبارت میں بھی ایک دوسری قسم کا تسامح ہے، یعنی اس سے رقیق مجلد پر بھی مسح کا عدم جواز مفہوم ہوتا ہے جو خلاف واقع ہے، اور متون میں سب سے اوضح عبارت نور الایضاح کی ہے، کمالا یحییٰ واللہ اعلم وعلما تم واحکم،

تنبیہ، استطراد اخصین کے متعلق ایک ایسا جزئیہ لکھا جاتا ہے جس سے اکثر ناواقف ہیں، وہ یہ کہ جس موزے پر مسح جائز ہے اگر وہ اتنا گھس جاوے کہ بدون جوتہ پہنے ہوئے چلنے سے پھٹ جانے کا اندیشہ ہو تو اس پر مسح جائز نہیں رہتا، کما حرره العلامة الشامی تحت قول الدرر، الثالث دكونه مما یكن المشی، المعتاد (فیہ) فرسخا کثیرا، کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ، ارشوال رشید

فصل فی النجاستہ و احکام التطہیر

سوال (۱) احتلام ہونے پر کیا جسم کے تمام کپڑے بستر جن کپڑے کے ایک حصہ پر نجاست لگی ہو تو اس کا بقیہ حصہ پاک ہے، وغیرہ ناپاک تصور ہوں گے؟ گو کسی طرح نجاست کا داغ ان پر نہ آیا ہو یا نہیں، یا صرف جس پر نجاست معلوم ہو وہی ناپاک تصور ہوگا؟

الجواب؛ احتلام ہونے پر تمام کپڑے ناپاک نہیں ہوتے، بلکہ جس کپڑے پر جتنی دُور تک منی کا اثر معلوم ہو وہ کپڑا اسی قدر ناپاک ہوتا ہے، باقی سب پاک ہیں، ۶/۲ ریح ۲۸۸

۱۔ مگر ایک کمی اس میں بھی ہر وہ یہ کہ امام صاحب کا اختلاف ذکر نہیں کیا، اور وقایہ میں صاحبین کے قول سے تعرض نہیں کیا گیا، اور کنز و تنویر وغیرہ میں تو بالکل ہی غلط کر دیا، اور قدوری و ملتقی نے ہر دو مذہب کو جدا گانہ بیان کیا، مگر متعلین کو مطلق رکھا حالانکہ کافی حاکم یعنی متن مبسوط میں ثنینین متعلین ہی، کما مر آنفا، الغرض متون مذکورہ میں کسی کی عبارت تسامح سے خالی نہیں، لہذا جامع مانع عبارت جس اختلاف بین الامام و صاحبیہ و قول مفتی بہ بھی معلوم ہو جائے تجویز کی جاتی ہے، صحیح علی الجوز، مجلد الثمین المتعل بالاتفاق و عندہما علی الثمین المجرد ایضاً و یفتی ۱۲۸

بھنگی کے چھونے کا حکم | سوال (۲) ایک شخص نے ایک حلال خور (بھنگی، مہتر) کو چھو لیا، جبکہ وہ کام سے فارغ ہو کر جا رہا تھا اور غسل نہیں کیا تھا کیا ایسی حالت میں اس شخص پر غسل واجب ہوگا؟
الجواب؛ حلال خور کو چھونے سے نہ غسل واجب ہے نہ وضو، ہاں اگر اس کے بدن پر ناپاکی تر لگی ہوئی ہو، اور چھونے سے وہ ہاتھ کو کپڑے کو لگ جائے، تو اس ناپاکی کو دھونا ضروری ہوگا، اور اگر خشک ناپاکی ہو تو کچھ ضروری نہیں، واللہ اعلم، ۲۶ ربیع الثانی سنہ ۱۴۲۵ھ

ناپاک ہمد باندھ کر غسل کرنے سے | سوال (۳) اگر کوئی شخص ہمد باندھ کر (جس کا ہمد تہمد و بدن پاک ہو جائیگا یا نہیں؟
پلید ہو اور یا بدن بھی کسی جگہ سے نجس ہو یا دونوں ناپاک ہوں) نل کے نیچے بیٹھ کر اچھی طرح ہنالیوے تو وہ اور تہمد پاک ہو جائیگا یا نہیں؟ مجھ کو دو اشکال ہیں، پہلا اشکال جائز کا کہ جنگ بد میں جو لوگ رات کو ناپاک ہو گئے تھے وہ صرف میخ کے ہی پانی سے پاک ہو گئے اور نل کی دھار تو اس سے کہیں زائد ہے، دوسرا ناپاکی کا بہشتی زیور میں دیکھ کر کہ کپڑا جو پلید ہو تیسری مرتبہ زور سے پھوڑا جاوے، ورنہ پاک نہ ہوگا اور پہنے پہنے پھوڑنا کافی ہو نہیں سکے گا،

الجواب؛ اگر بدن اور تہمد پر بہت سا پانی بہا دیا جاوے اور پہنے پہنے اس کو پھوڑ دیا جاوے تو وہ پاک ہو جائے گا، بشرطیکہ ظاہر آنجاست کا جرم محسوس نہ ہو، قال فی الدر اما لو غسل فی غدیر او صب علیہ ماء کثیر او جری علیہ الماء طهر مطلقا بلا مشط عصر و تجفیف و تکرار غمس هو المختار ام قال الشامی وقد صرح فی شرح المنیۃ عند قوله روی عن ابی یوسف ان الجنب اذا اتر فی الحمام و صب الماء علی جسده ثم علی الانوار حکم بطہارۃ الانوار وان لم یعصر و فی المنتقی شرح العصر علی قول ابی یوسف بما نصہ تقدّم ان هذا ظاهر الروایۃ علی قول الكلّی و ما قال فی الفتح ان المروی عن ابی یوسف فی الانوار لضرورة ستر العورة فلا يلحق به غیره ولا تترك الروایات الظاهرة فیہ ام فقد ردّه الشامی باحسن رد وقال ردّه فی البحر ایضا بما فی السراج واقرة فی النهر و غیره (ص ۳۲۲ ج ۱) واللہ اعلم،

۱۸ محرم ۱۴۲۵ھ

نشاستہ گندم میں کتانہ ڈال دے | سوال (۴) ایک واقعہ پیش آیا ہے اس کے متعلق تکلیف تو اس کی طہارت کا طریقہ، گو ارا فرما کر شرعی حکم سے مطلع فرمایا جائے، ہر چند بہشتی زیور

و دیگر مسائل فقہ میں دیکھا گیا، لیکن مخصوص جزئی نہیں ملی، واقعہ یہ ہے کہ ایک گھڑے میں نشاستہ گندم تیار کر کے رکھا تھا، اس کے اوپر پانی بھی تھا، انتظار تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد جب نشاستہ اچھی طرح بیٹھ جائے تو پانی نتھار دیا جائے کہ یکایک کتے نے اس پانی میں منہ ڈال دیا، اس وقت نشاستہ تہہ نشین تھا اور پانی اوپر آ گیا تھا، اب اس نشاستہ کے متعلق کیا حکم ہے، یہ پاک ہو سکتا ہے یا نہیں، اگر ہو سکتا ہے تو کس طرح؟

الجواب؛ کم از کم تین دفعہ پاک پانی نشاستہ میں ملایا جائے، اور جب وہ تہہ نشین ہو جائے سارا پانی پھینک دیا جائے، سات بار کیا جائے تو اور اچھا ہے، اس طرح نشاستہ پاک ہو جائے گا، قیاساً علی التمن والعسل واللہ اعلم، ۴۲ رجادی الثانی ۱۳۵۷ھ

سوال (۵) در غسل جامہ از نجاست غیر مرنی عصر جبہ چگونہ باشد، آیا در نجہ زور کردن باشد یا بہ بچپین در ہر دو دست مثل عرق عام،

الجواب؛ فی مراقی الفلاح و یطہر محل النجاسة من غیر المرئیة بغسلها ثلاثاً و حیوا العصر کل مرة اھ قال الطحطاوی و یبالغ فی المرة الثالثة حتی یقطع النقاط و المعتبرة قوة کل عاصر دون غیرہ کما فی الفتح و لو لم یصرف قوتہ لرقۃ الثوب قیل لا یطہر و هو اختیار قاضی خان و قیل یطہر للمصر و ردۃ و هو الاظہر کما فی البحر والنہر اھ (ص ۹۲)

قلت فالمعتبر قوة کل عاصر برعاية المعصور بظاہر بہر دو دست بچپین لازم است و چنان بيفشہ کہ تقاطر بند گرد و در فشردن صرف قوة عاصر برعایت حال جامہ ضروری است واللہ اعلم، ۴۳ رجادی الثانی ۱۳۵۷ھ

سوال (۶) خاکسار کو اس مسئلہ میں شبہ ہے جو کہ بہشتی زیور میں پاکی تقاطر شرط نہیں، ناپاکی کے مسائل میں ہے کہ کپڑے کے علاوہ جو چیز نچوڑنے سے نہ نچڑے

مثلاً جوتے یا لٹے کے تو تین دفعہ دھونے سے اس طرح کہ ہر مرتبہ میں تقاطر بند ہو جائے پاک ہوتی ہے ظاہراً بدن بھی اس میں داخل ہے، کیونکہ وہ نچوڑنے سے نہیں نچڑتا، اس بناء پر یہ شبہ کہ مثلاً کسی کے ہاتھ ناپاک ہوئے اس نے حمام کی ٹونٹی کھول کر تین دفعہ دھوئے، پے پے اسی طرح اور کوئی حصہ بدن کا جہاں نجاست غیر مرنی لگ گئی ہو، مثلاً چھوٹا اسجاء کے وقت پے پے پانی ڈالتا رہا، اور تین مرتبہ پیشاب گاہ کو مل کر کھڑا ہو گیا

توان صورتوں میں تقاطر بند نہ ہونے کے سبب ناپاک سمجھا جاتے یا پاک، ہم تو سب ہی لوگ اس میں مبتلا ہیں، خصوصاً جب آدمی زیادہ ہوں، غسل خانہ ایک ہی ہو تو ایسے وقت میں بوقت استنجا، اگر تقاطر کا ہر دفعہ میں لحاظ رکھا جائے جیسا کہ ہم سمجھتے ہیں، یعنی بالکل ایک ایک قطرہ بند ہو جائے تو بہت دیر لگنے کی وجہ سے حرج لازم آئے، اسی طرح اگر ٹونٹی کو تقاطر بند کرنے کے لئے بند کریں تو ناپاک ہو جائے، کیونکہ ابھی تین مرتبہ ہاتھ اس طرح سے نہیں دھوئے گئے کہ ہر دفعہ تقاطر بند ہوا ہو، لہذا آنحضور جامع شریعت و طریقت مشفق امت سے گزارش ہے کہ اس مسئلہ کو ہم پر واضح کر دیں، ہم نے اسی طرح آج تک یعنی بلا تقاطر کے بند ہونے کے نمازیں پڑھی ہیں، ہمارے لئے کیا حکم ہے جو حضور کا جواب آدے گا اگر کوئی بیوقوف باوجود بتا دینے کے پھر نہ مانے، اسی طرح بلا تقاطر کام کرے تو جن لوگوں کو اس کا ہاتھ لگے وہ نجس ہونگے یا نہ؟

الجواب: قل فی مراقی الفلاح والنفار الجدید یغسل ثلاثا بانقطاع تقاطر

فی کل منہما ویغسل القدیم ام قال الطحطاوی تحت قوله ویغسل القدیم ای یمیز

بالغسل ثلاثا جفت اول لان النجاسة علی ظاہر فقط فصار کالبدن ام (ص ۱۸)

اس سے معلوم ہوا کہ بدن کی طہارت کے لئے نجاست غیر مرئیہ میں بھی انقطاع تقاطر شرط

نہیں، بلکہ تین بار دھونے کے بعد پاک ہو جائے گا، خواہ تقاطر بند نہ ہو، واللہ اعلم، ۸ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ

سوال (۲): اکثر لوگ کہتے ہیں کہ نجاست کو مل کر اتارے، جب نجاست

چھوٹنے کا یقین ہو جاوے تب تین دفعہ پھر پاک کرے، بعض کہتے ہیں فقط ایک دفعہ بعد

نجاست چھوٹ جانے کے پخوڑنا کافی ہے، پاک ہو جاتا ہے، بعض کہتے ہیں کہ جب نجاست

چھوٹ جانے کا یقین ہو پاک ہوا، نہ پخوڑنا ہی ضروری ہے، چاہے ملنے سے اتر جاوے، نہ ایک

دفعہ اور تین دفعہ دفعہ کی خصوصیت ہے، اب عقل حیران ہے، خیال فرمادیں کہ رات دن

ہم نے کپڑے دھونے میں گزارا تھا، جب کپڑا پاک ہو جانے کا یقین ہو جایا کرتا تھا، مگر اب

تسل نہیں ہوتی، وجہ اس کی یہ ہے کہ ایک روز حضرت مولانا مولوی قاضی حکیم پیر درہنہ شیخ محمد صدیق احمد

صاحب کاندھلوی فرمانے لگے خادموں کو کہ بھائی کپڑے دھو دو، حسب فرمان ایک شخص نے

کپڑے دھو کر لا دیئے، آپ نے فرمایا کہ خوب پخوڑو، لہذا مناسب طریقہ سے پخوڑ دیئے، اور

آپ نے خود دست مبارک سے دوبارہ پخوڑے اور فرمایا کہ جب تک بڑے زور سے نہ پخوڑا جاوے

اور کپڑے میں سے پانی کا ایک ایک قطرہ ٹپکنا بند نہ ہو جاوے جب تک کہ کپڑا پاک نہیں

حالانکہ حضور نے اپنی کپڑوں سے عشاء کی نماز پڑھائی، اب صورت یہ ہے کہ اگر کمزور کپڑا ہوتا ہے تو بالکل پھٹ جاتا ہے، بڑے زور سے نچوڑنے میں، اور نماز کے لئے دھوتے میں نماز ہی کے وہ قابل نہیں رہتا، بوجہ پھٹنے کے، دوسرے جو کپڑا موٹا اور مضبوط ہوتا ہے اس کا کسی حالت میں پانی ٹپکنا بند نہیں ہوتا، کیونکہ اس کا نچوڑنا طاقت سے باہر ہوتا ہے، اور نچوڑتے ہوئے ہاتھ دکھ جلتے ہیں، اور جب ذرا زور لگاتا ہوں تو پانی ضرور ٹپکتا ہے، تمام کپڑا نچوڑتا نہیں، زور کے ساتھ لاچار ہو کر چھوڑ دیتا ہوں، اور بعض چیز زیادہ چھوٹی ہوتی ہے مثلاً ٹوپی یا سخت ہوتی ہے جیسا کہ ڈوری وہ نہ ہاتھ میں آتی ہے اور نہ چٹکی سے نچڑتی ہے، ان سب کا طریقہ پاک کی کتاب میں فرمادیں،

الجواب؛ زور سے نچوڑنا فقط تیسری مرتبہ میں ضروری ہے، اور جس کپڑے کے نچوڑنے میں زیادہ طاقت کی حاجت ہو اس کو اپنی طاقت کے مطابق نچوڑ دینا کافی ہے اگرچہ کسی دوسرے کے نچوڑنے سے پانی ٹپکتا ہے تب بھی پاک ہو گیا، اور اگر کمزور کپڑے کو زیادہ زور سے نہ نچوڑا ہو تب بھی پاک ہو جائے گا، جیسا کہ طحاوی علی مرقی الفلاح ص ۹۲ میں ہے (والعصر کل مرة) ویبالی فی الثالثة حتی ينقطع التقاط والمعتبر قوة كل عاصر دون غیرہ کما فی الفتح فلو كانت بحيث لو عصر غیرہ قطر طهر بالنسبة الیه دون ذلك الغیر کما فی الدرر وللم یصرف قوته لرقعة الثوب قبل لا یطهر وهو اختیار قاضی خلیل قبل یطهر للم ضرورۃ کما فی البحر والنہر اھ، کتبہ عبد الکریم عفی عنہ، ۲۶ رزی قعدہ ۱۳۳۳ھ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا اللہ عنہ،

سوال (۸) مٹی کا برتن جس میں پانی بھرا ہو اور اوپر چاروں طرف خوب تری ہو اگر ناپاک خشک یا تر زمین پر پانچ یا دس منٹ تک رکھا ہو تو وہ برتن یا اس کا پانی ناپاک ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب؛ برتن کے اندر جو پانی ہے وہ تو بہر حال پاک ہے، اور خود برتن کا یہ حکم ہے کہ اگر وہ ناپاک خشک زمین پر رکھا گیا ہے تو اس کی تلی میں زمین کی مٹی لگ گئی تو تلی ناپاک ہو گئی، اس کو دھونا چاہئے، اور اگر کچھ نہیں لگا تو پاک ہے، اور تر زمین ناپاک پر رکھا گیا ہے تو تلی ناپاک ہو گئی، اس کو دھولینا چاہئے، واللہ اعلم، احقر عبد الکریم عفی عنہ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفی عنہ، ۵ رزی الحجہ ۱۳۳۳ھ

گھوڑے کا پسینہ پاک ہے | سوال (۹) سنا ہے کہ گھوڑے کا پسینہ پاک ہے، جبکہ گھوڑا اپنے پیشاب اور لید میں ہمیشہ رات کو ٹوٹتا ہے، اور اکثر دفعہ گھوڑوں کے بدن پر رنگ لید کا بھی لگ جاتا ہے، تو فرمائیے گھوڑے کا پسینہ اس حالت میں کیسا ہے، پاک ہے یا ناپاک؟ دوسرے کوئی گھوڑے کو پاک کرنے کی غرض سے نہیں نہلاتا فقط وقت سفر کھریرا جس کو کھرا بھی کہتے ہیں، اس سے گھوڑے کے بدن کی میل مٹی اتاری اور اسباب کھینچا اور چل دیں، اب راستہ میں جو بارش آتی اور تمام گھوڑے کا بدن اور اسباب بھیگا اور چھینٹ گھوڑے کے بدن سے ترخ کر زید پر آئی وہ پاک ہے یا ناپاک؟ آجکل برسات میں بڑی تکلیف رہتی ہے، جواب مفصل فرمادیں،

(۲) کسی قسم کی چھینٹ گھوڑے کے کان میں اگر پڑ جائے ناپاک وہ کس طرح پاک ہوگی جبکہ گھوڑا ذرا چھینٹ پڑنے پر گردن ہلا کر اس کو نکالنے کی کوشش کرتا ہے، اور کیونکہ قصداً کان میں پانی ڈالنے سے مرنے کا اندیشہ ہے گھوڑے کے، اسی غرض سے پانی ڈالنا ممکن نہیں کافی طریقہ سے کہ گھوڑا برداشت کرے،

الجواب؛ کیری شرح منیہ ص ۱۸۰ میں ہے وقد سئل ابو نصر الدباس عن يغسل الدابة فيصيبه من ذلك الماء الذي يسيل منها شيء او يصيبه من عرقها شيء قال لا يضرك قيل له وان كانت اى ولو كانت قد تدرغت في بولها وروثها قال اذا جفت وتناثر وذهب عينه لا يضرك ايضا وهذا يناسب ما اختاره الفقيه ابوالليث ام، اس سے معلوم ہوا کہ گھوڑا وغیرہ جانور کا بدن اگر نجس ہو جاوے تو خشک ہو کر کھریرا یا بدون کھریرا ہی وہ لید وغیرہ اتر جانے پر پاک ہو جاتا ہے، پس اس کے بعد اس کو پسینہ آوے یا بارش وغیرہ میں بھیگ جاوے تو سوار کے کپڑے وغیرہ ناپاک نہ ہوں گے، اسی طرح کان میں جو نجاست لگ جاوے اس کو دھونے کی ضرورت نہیں، بلکہ خشک ہو کر اتر جاوے گی تو پاک ہو جاوے گا، فقط عبدالکریم گتھلوی، الجواب صحیح، ظفر احمد عفی عنہ ۹ اردوی الحجۃ ۱۳۲۷ھ

چمگاڈ کی بیٹ پاک ہے یا نجس | سوال (۱۰) چمگاڈ کی بیٹ جس کو اس کے منہ کا اگال بھی کہا جاتا ہے پاک ہے یا ناپاک، بعض مساجد میں بکثرت ہوتی ہیں، اس پر نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب؛ فی الدرر فی رقیق من مغلطہ کعذرة و بول غیر ماکول ولو من صغیر لم یطعم، الا بول الخفاش خرعة فطاهر وقال الشامی، ص ۳۲۸ ج ۱ و فی البدائع وغیرہ بول الخفافیش و خروها لیس بنجس لتعد رصیانتہ الثوب الا وانی عنہا الخ، پس ہیٹ چمکاؤڑ کی پاک ہو اور نماز اس پر جائز ہے، واللہ اعلم،

کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ ۶ ج ۲ مسئلہ ۷، الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ

سوال (۱۱) تکلمہ کی نئی صفوں کو دھو کر نماز پڑھنا چاہیے، یا ضروری ہے یا بغیر دھوئے اس پر نماز پڑھی جاسکتی ہے

ہندو کی بنائی ہوئی صفوں کا دھونا بغیر دھوئے، کیونکہ یہ صفیں اکثر ہندو کھارے یہاں پر بناتے ہیں اور پانی ناپاک لگاتے ہیں جس برتن میں کہ یہ لوگ تکلمہ جھگوتے ہیں اس میں اکثر کتے پانی پی لیتے ہیں، غرضیکہ احتیاط نہیں کر سکتے،

الجواب؛ اگر ناپاک ہونا یقین سے معلوم ہو جاوے تب تو دھونا ضروری ہے اور اگر شبہ ہو تو احتیاطاً دھولینا بہتر ہے، کما فی الدر المختار (فرع) ما یرج من دار الحرب

کسنباب ان علم د بغه بطاهر او بنجس فنجس وان شک فغسله فضل

وفی الشامی ونقل فی القنیۃ ان الجلود التي تدبغ فی بلدنا ولا یغسل مذبحها

ولا تنقی الغاسانی د بغمها ویلقونها علی الارض النجسة لا یغسلونها بعد تمام الدبغ ففی طاهرہ و یجوز اتخاذ الخفاف

والمکات و غلا لکتاب و المشط و القراب و الدلاء و طباق و یابساً اھ اقول ولا یخفی ان هذا

عند الشک وعدم العلم بنجاستھا (ص ۲۱۲ ج ۱) اور قنیہ کی عبارت سے یہ بھی واضح ہو گیا

کہ کسی جگہ عام دستور ہونے سے یقین نجاست کا نہیں ہوتا، بلکہ یقین کی صورت یہ ہے کہ کسی

خاص چٹائی میں ناپاک پانی لگنا معلوم ہو جائے واللہ اعلم، احقر عبد الکریم، ۲۱ ربیع ۲ ۱۳۵۷ھ

سوال (۱۲) سوال یہ ہے کہ غلہ گاہنے میں بیل پیشاب وغیرہ

کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟ وہیں کرتے ہیں، اس کا کیا حکم ہے؟ اور کہاں مذکور ہے؟

الجواب؛ قال فی رد المحتار فی بیان المطہرات وقسمۃ مثلی الخ ص ۳۳ ج ۳

اس سے معلوم ہوا کہ تقسیم بھی بعض صورتوں میں مہر ہے اور وہ یہی صورت ہے کہ بیل غلہ گاہنے

میں پیشاب کر دیتے ہیں تو بعد تقسیم کے سارا غلہ پاک ہو جاتا ہے، کیونکہ شبہ ہو گیا کہ پیشاب

اس میں ہے یا اس میں ہے، یقین نہ رہا کہ اسی میں ہے، اس لئے اب اس کا کھانا جائز ہے،

اور تقسیم کی صورت یہ ہے کہ یا تو غلہ میں چند شرکاء ہوں جو باہم اپنے حصص تقسیم کر لیں،

یا کوئی شریک نہیں مگر غلہ میں سے کچھ فروخت کیا گیا یا کسی کو ہبہ کیا گیا یا کمینوں کو دیا گیا تو اس سے بھی یہ بات یقینی نہ رہی کہ پیشاب کس حصہ میں ہے، زوال یقین نجاست کی وجہ سے طہارت کا حکم دیا گیا واما عند محمد قبول ما یؤکل لحم طاهر فلا حاجۃ الی القسمۃ واللہ اعلم، ۲۴ ذیقعدہ ۱۳۸۸

دودھ نکالتے وقت تین مینگنی | سوال (۱۳) مسئلہ ذیل میں حکم شرعی تحریر فرمایا جاوے، کہ اگر دودھ کے برابر چوڑا بھینس کے بدن پر سے بکری کی تین مینگنی کی مقدار میں دودھ میں گر جائے تو دودھ نجس | چوڑا جو مٹی اور بھینس کے پیشاب سے مرکب ہوتا ہے دودھ میں ہو جائے گا یا نہیں ؟ ؟ ؟

رہے، یہاں تک کہ اس چوڑے کا کچھ حصہ دودھ میں تحلیل ہو جائے اور بقیہ کو نکال کر پھینک دیا جاوے تو یہ دودھ نجس ہو یا نہیں، اور اگر ہوا تو انسانوں کے علاوہ جانوروں کو بھی پلا سکتے ہیں یا نہیں ؟ فقط

الجواب؛ اگر اس امر کا یقین ہے کہ یہ چوڑا پیشاب مرکب، تو دودھ نجس ہو گیا، مگر جانوروں کو پلانا جائز ہے للاختلاف فی نجاستہ، اور اگر یقین نہیں محض دہم اور گمان ہے، اور گمان غائب نہیں تو دودھ پاک ہے، انسان بھی اس کو کھا سکتا ہے، ولا یقاس علی ما لو وقعت بعرتا ابل او غنم فی محلب فانہ انما یحیی اذ ارمیتا فوراً قبل تفتت وتلون وعلۃ العفوان من عادتما ان تبعد ذلک الوقت والاحتراز عنہ عسیر ولا کذلک غیرہ کذا فی الشامیۃ ص ۲۲۸ ج ۱، واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۲۰ محرم ۱۳۸۹

بغیر ڈھیلوں کے صرف پانی | سوال (۱۴) بلا کلوخ محض استنجہ سے کامل طہارت ہوتی ہے یا سے استنجا کرنے کا حکم نہیں؟ بینوا تو جبروا،

الجواب؛ ہو جاتی ہے، بشرطیکہ قطرہ آنے کا مرض نہ ہو اور اگر یہ مرض ہو تو کلوخ لینا چاہئے یا کوئی اور تدبیر مثل تحریک وغیرہ کے ایسی کرنی چاہئے جس سے قطرہ آئینکا احتمال نہ رہے، واللہ اعلم، ۲۵ شعبان ۱۳۸۲ھ

کتاب الصلوة

فصل فی المواقیت

صبح صادق اور صبح کاذب کی علامت | سوال (۱)

علامات مشہورہ صبح کاذب و صادق کی یعنی بیاض مستطیل و مستطیر معلوم ہیں دریافت طلب یہ امر ہے کہ موسم موجودہ زمانہ سرماییں بیاض مستطیل صبح کاذب کی کس وقت ظاہر ہو کر غائب ہوتی ہے، اور ابتداء بیاض مستطیل صبح صادق کی کتنے بجے پر ظاہر ہوتی ہے، گھڑیال کے حساب اور انداز سے ارشاد فرماویں، زید و عمر و علامات مذکورہ کی شناخت سے عاجز ہیں بلکہ اکثر مسلمان اس جانب کے بے علمی کی وجہ سے صبح صادق میں سحری کیا کرتے ہیں، آپ ہی کے فیصلہ پر اتفاق چاہتے ہیں؟

الجواب؛ قال فی شرح الجعفی وقد عرف بالتجربة ان اول الصبح و اخر الشفق انما يكون اذا كان انحطاط الشمس ثمانية عشر جزءاً ام قال المحشي هذا هو المشهور و وقع فی بعض كتب ابی ریحان انه سبعة عشر جزءاً و قيل انه تسعة عشر جزءاً وهذا فی ابتداء الصبح الكاذب و اما فی ابتداء الصبح الصادق فقد قيل ان انحطاط الشمس حينئذ خمسة عشر جزءاً ام (ص ۱۲) و ذكر فی رد المحتار ان التفاوت بين الفجرين و كذا بين الشفقين الاحمر والابيض انما هو بثلاث درجات و فی احیاء العلوم باب النوافل و يعرف راسی الفجر الصادق، بالقمر لیلین من الشهر فان القمر یطلع مع الفجر لیلین ست و عشرین و یطلع الصبح مع غروب القمر لیلین اثنی عشر من الشهر هذا هو الغالب و یطرق علیه تفاوت فی بعض البروج ام، ان عبارات سے معلوم ہوا کہ صبح صادق طلوع آفتاب سے ۸ درجہ پہلے ہوتی ہے، جس کی مقدار گھنٹوں کے حساب سے ایک گھنٹہ ۵ منٹ ہوتی ہے، اور صبح کاذب و صادق میں تین درجہ کا تفاوت ہے، یعنی صبح کاذب صبح صادق سے ۱۲ منٹ پہلے ہوتی ہے، لیکن احتیاط یہ ہے کہ سحری طلوع آفتاب سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ترک کر دی جائے، اور صبح صادق کے پہچاننے کی ترکیب یہ ہے کہ ہرگز

میں دو رات چاند کے طلوع و غروب کو دیکھ لیا جائے، اور وہ دو راتیں بارہویں اور چھبیسویں راتیں ہیں، بارہویں شب میں چاند کے غروب ہوتے ہی صبح صادق ہو جاتی ہے، اور چھبیسویں شب میں صبح صادق کے ساتھ ساتھ چاند طلوع ہوتا ہے، ان دو راتوں کے تجربہ سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ طلوع فجر اور طلوع شمس میں کتنا فاصلہ ہوتا ہے، لیکن ہمارے عمل اس پر ہے کہ آفتاب کے طلوع ہونے سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے سحری ترک کر دیتے ہیں، واللہ اعلم،

یہاں آجکل ریلوے ٹائم سے ۵ بجکر ۵ منٹ پر صبح ہو جاتی ہے، لیکن ملک برار کے طلوع و غروب یہاں کے طلوع و غروب سے متفاوت ہے، اس لئے وہاں اس پر عمل نہیں ہو سکتا، عصر کے وقت کی ابتداء کی تحقیق | سوال (۲) امر ضروری یہ ہے کہ عصر کے وقت شروع ہونے کے متعلق علماء دین و شرع متین کیا فرماتے ہیں، آیا امام صاحب کے قول کی بناء پر وقت مثلیں سایہ کے بعد سے شروع ہوتا ہے، بر بناء قول صاحبین کے مثل سایہ پزان دونوں اقوال میں حنفیوں کا فتویٰ جس پر ہو تحریر فرمایا جائے، اگر احناف کا عمل امام صاحب کے قول مثلیں پر ہے تو حنفی جناب حضرت جبریل علیہ السلام کی مثل والی حدیث کا کیا جواب دیتے ہیں، کارڈ میں جگہ ہونے کی صورت میں اگر مسئلہ مذکور کی قدرے دلیل بھی ارقام فرمادیں تو نہایت ممنون احسان ہوں گا اور تابعدار کی تشریف خاطر کا باعث،

جناب مولانا سخاوت علی صاحب مہاجر مدنی جو پوری مرحوم مغفور اپنے رسالہ مسٹی بعرف الاوقات میں تحریر فرماتے ہیں کہ حنفیوں کا عمل در آمد صاحبین کے قول مثل سایہ پر ہونا چاہئے، اس لئے کہ امام صاحب آخر زمانہ میں اس قول کی طرف رجوع ہوئے ہیں، آخر یہ کہاں تک صحیح ہے، واقع میں یہ صحیح ہے کہ امام صاحب آخر وقت میں صاحبین کے قول کی طرف رجوع ہو گئے تھے یا نہیں؟ مولانا موصوف کی تحریر تابعدار کے لئے کافی طور پر تسلی بخش اس لئے نہیں ہوئی کہ مولانا کے عقائد اور میرے عقائد میں فرق ہے، یعنی بندہ تقلید کا قائل ہے اور مولانا اس کے خلاف تھے، محض خادم کو اس مسئلہ کے متعلق حنفیوں کے یہاں کی تحقیق مقصود ہے۔
الجواب؛ قال فی مرقاۃ الفلاح وقت الظہر من زوال الشمس الی وقت العصر وفیہ روایتان عن الامام فی روایۃ الی قبیل ان یصیر ظل کل شیء مثلیہ سوی فی الزوال لتعارض الآثار وهو الصحیح وعلیہ مجل المشائخ والمتون ام قال المعشی الطحطاوی قولہ لتعارض الآثار بیانہ ان قولہ صلی اللہ علیہ وسلم فی

الحديث المتفق عليه ابرءوا بالظهر فان شدة الحر من فيح جهنم يقتضى تاخير
الظهر عن المثل لان اشد الحر في ديارهم وقت المثل وحديث امامة جبريل
في اليوم الاول يقتضى انتهاء وقت الظهر بخروج المثل لانه صلى به صلى الله
عليه وسلم العصر في اول المثل الثاني فحصل التعارض بينهما فلا يخرج وقت
الظهر بالشك وتمايمه في المطولات ام ص ۱۱۹، قلت وفي حديث امامة
جبريل اضطراب ايضا كما بينته في الجزء الثاني من احياء السنن قال و
قوله وهو الصحيح صححه جمهور اهل المذهب وقول الطحاوى ولقولهما ناخذ
يدل على انه المذهب وفي البرهان قولهما هو الاظهر فقد اختلف الترجيح
قال في مراقى الفلاح والرواية الثانية اشد اليهما بقوله او مثله مرة واحدة
سوى قل الاستواء واختار الثاني الطحاوى وهو قول الصاحبين ابى يوسف و
محمد لامامة جبريل العصر فيه ولكن علمت ان اكثر المشائخ على اشتراط
بلوغ الظل مثليه والاخذ به احوط لبراءة الذمة بيقين اذ تقديم الصلوة
عن وقتها لا يصح وتصح اذا خرج وقتها فكيف والوقت باق اتفاقا،
ان عبارات سے چند امور مستفاد ہوئے (۱) امام صاحبؒ بھی ایک روایت مثل
واحد کے ہے، (۲) حنفیہ نے دونوں روایتوں کی تصحیح کی ہے، ترجیح میں اختلاف ہو رہا ہے،
لیکن احتیاطاً جمہور مشائخ حنفیہ کا عمل مثلیں کی روایت پر ہے، بلکہ علامہ شامی نے لکھا
ہے کہ اگر کسی مسجد میں عصر کی نماز مثل واحد پر ہوتی ہے، اور مثلیں کے انتظار سے فوت عجمت
لازم آتا ہو تو افضل بلکہ لازم یہ ہے کہ مثلیں کا انتظار کرے اور تنہا نماز پڑھے، وھذا نصہ،
قوله وعليه عمل الناس اليوم اى في كثير من البلاد والاحسن ما في المساجد عن
شيخ الاسلام ان الاحتياط ان لا يؤخر الظهر الى المثل وان لا يصلى العصر
حتى يبلغ المثليين ليكون مؤدياً للصَّلواتين في وقتها بالاجماع،
وانظر هل اذا لم من تاخير العصر الى المثليين قوت الجماعة يكون
الاولى التاخير ام لا والظاهر الاول بل يلزم لمن اعتقد رجحان قول الامام
تأمل، ثم رأيت في اخر شرح المنية ناقلاً عن بعض الفتاوى انه لو كان امام
محله يصلى العشاء قبل غياب الشفق الابيض فالافضل ان يصليهما

وحدہ بعد البیاض (۱۷ ص ۳۷۲) ان عبارات میں حدیث جبرئیل کا جواب بھی مذکور ہے، اور ہم کو امام صاحب کا آخر عمر میں صاحبین کے قول کی طرف رجوع کرنا ثابت نہیں ہوا، مولانا سخاوت علی صاحب نے کسی کتاب کا حوالہ لکھا ہو تو بتلایا جاوے، ورنہ محض ان کا لکھنا کافی نہیں شامی نے شفق احمر کے مسئلہ میں لکھا ہے کہ امام نے صاحبین کے قول کی طرف رجوع کر لیا تھا، پھر بعد میں اس کو بھی رد کر دیا ہے، ص ۳۷۳ ج ۱، مثلیں کے مسئلہ میں امام کا رجوع ثابت نہیں، ۳، سوال سلسلہ

سایہ اصلی اور مثلیں کا بیان | سوال (۳) عصر کے وقت اکثر کتابوں میں یہی دیکھا گیا ہے کہ سوائے سایہ اصلی کے دوسایہ ہو جاوے تب عصر کا وقت ہوتا ہے، تو ٹھیک اول وقت کا معلوم کرنے کے لئے آسان طریقہ کیا ہے؟ کیونکہ سایہ اصلی ہمیشہ کم زیادہ ہو ا کرتا ہے، اور نماز اصلی سایہ اور عصر کے وقت کا ناپنا بہت ہی دقت و پریشانی ہے، اس لئے دریافت طلب ہے کہ لکڑی سے سایہ ناپنا جاوے، اور ٹھیک اول وقت بھی معلوم ہو جاوے، جس طرح دوپہر کو آفتاب ڈھل گیا، ظہر کا وقت ہو آفتاب غروب ہوا، مغرب کا وقت ہوا، اسی طرح کوئی آسان طریقہ بتلا دیں، کیونکہ کئی مرتبہ تجربہ کیا گیا ہے تو اذان بے وقت ہوتی ہے، کبھی جماعت بھی ہوتی ہے، آزمائش سے ٹھیک وقت نہیں ہوتا، سوائے اصلی سایہ کے دوسایہ کا ہونا یہ قید کا ہونا بارہ ماہ کے لئے ہے یا صرف ایام دھوپ کے لئے ہے بدلیل تحریر فرماویں، اگر یہ قید بارہ ماہ کے لئے ہے تو ایام بارش میں کس طرح سے معلوم کیا جاوے، اور گھڑی کا شریعت میں اعتبار نہیں کیا گیا ہے، اگر کے دنوں میں سوائے اصلی سایہ کے دوسایہ کا ہونا اعتبار نہیں کیا گیا ہے، تو وہ دلیل کس کتاب میں ہے تحریر فرماویں، اگر عصر کی نماز دیر کر کے پڑھنے کا حکم ہے تو کیا حد ہے جو اس حد سے ہم دیر کر کے نماز پڑھیں، حد معلوم کرنے کی پہچان خوب خلاصہ تحریر فرماویں معہ دلیل کے،

الجواب: سایہ اصلی اور دوشل کی پہچان کا طریقہ کسی عالم کی زبانی سمجھ لیں تحریر سمجھ میں نہ آئے گا، آسان بات یہ ہے کہ جب دن بہت چھوٹا ہو اس وقت عصر کی نماز غروب آفتاب سے ایک گھنٹہ پہلے پڑھ لیا کریں اور جب دن بہت بڑا ہو تو غروب سے اچھڑ گھنٹہ پہلے عصر پڑھا کریں، اور درمیانی دنوں میں ایک گھنٹہ پہلے غروب پڑھا کریں، اس طریقہ پر عصر ہمیشہ دوشل کے بعد ہو ا کریں گے دوشل کے بعد عصر پڑھنے کا حکم ہر زمانہ میں ہر خواہ ابرہ ہو یا نہ ہو،

سایہ اصلی کے متعلق فتویٰ کس پر ہے؟ سوال (۴) سایہ اصلی کے متعلق فتویٰ کس پر ہے، جواب بدیل

تخریر فرماویں؟

الجواب: فتویٰ اس پر ہے کہ ہر کی نماز ایک مثل سے پہلے پڑھے اور عصر کی نماز دو مثل کے بعد پڑھے، حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ بامر سیدی حکیم الامت دام مجیدم، شعبان ۱۴۲۸ھ

سوال (۵) میں سیاح گو پہلے سے ہوں اور یہاں لوگ کی رات ہو دو باں نماز کس طرح ادا کی جائے؟ تعطیل میں عموماً ادھر ادھر سیر کرنے چلے جائیں، میں احتیاطاً

ایک مسئلہ دریافت کرتا ہوں، شاید کہیں وہاں بھی چلا جاؤں، وہ یہ ہو کہ انگلستان کے اوپر چند ایسی جگہ ہیں جہاں ۶ ماہ سورج رہتا ہے اور ۶ ماہ نہیں رہتا، مجھے خود بھی تحقیق نہیں، نہ معلوم کہ سورج ڈوبتا بھی ہے یا نہیں، اتنا ضرور معلوم ہے کہ موسم گرما میں لوگ کالے پردے لگا کر مکانات میں رات بناتے ہیں، ورنہ تو پوری موسم گرما اتنی روشنی رہتی ہے کہ سونا مشکل ہوتا ہے، موسم سرما میں اتنا اندھیرا رہتا ہے کہ ہمیشہ روشنی سے کام لیا جاتا ہے، وہاں نماز کی کیا صورت ہو، موسم سرما میں تو وہاں جانا مشکل ہے کیونکہ بے انتہا سردی رہتی ہے، یہاں تک کہ موسم گرما میں بھی برف جمی رہتی ہے، اگر کبھی گیا تو موسم گرما میں جانا ہوگا، جبکہ سورج غروب غروب نہیں ہوتا،

الجواب: قال فی الدرر فاقد وقتهما کبلغار مکلف بهما فبقدر لهما ولا ینوی القضاء لفقد وقت الاداء به افعی البرهان الکبیر واختاره الکمال وتبعه ابن الشحنة فی الغائره فصحه اه ملخصاً، قال الشامی فی بیان الدلیل علیہ وما روی انه صلی الله علیه وسلم ذکر الدجال قلنا ما البثه فی الارض قال اربعون یوما یوم کسنة ویوم کشر ویوم کجمعة وسائر ايامہ کایا مکمر قلنا یا رسول الله فذلک الیوم الذی کسنة اتکفینا فیہ صلوٰۃ یوم قال لا اقدر والہ رواہ مسلم ص ۳۷۶ ج ۱ وقال فی ص ۳۷۸ ج ۱ والحاصل انهما قولان مصححان یتأید القول بالوجوب بانہ قال به امام مجتہد وهو الامام الشافعی کما نقلہ فی الحلیۃ عن المتولی عنہ اھ جن مقامات میں ۶ ماہ دن اور ۶ ماہ رات ہوتی ہے وہاں وقت کا انداز کر کے ہر چوبیس گھنٹہ میں پانچ نمازیں الگ الگ فصل کے ساتھ ادا کرنا واجب ہے مختار قول یہی ہے، واللہ اعلم، ۱۰ شعبان ۱۴۲۸ھ

لندن میں نمازِ عشاء اور نمازِ سوال (۶) گرمیوں میں لندن میں سورج ۹ بجے غروب ہوتا ہے، تو گویا اس وقت مغرب کی نماز ادا کی عشاء کا وقت مغرب کے ایک سوال، کے ۱۱ بجے تک انتظار کرنا پڑتا ہے، اس سے پہلے سو نہیں سکتے، اس صورت میں کیا ہو، کیونکہ نماز پڑھنے کے بعد کہیں ۱۱ بجے سونے جاسکتے ہیں اور پھر ۱۲ بجے کے بعد نیند آتی ہے، ویسے تو عموماً اتنی دیر تک پڑھتا رہتا ہوں لیکن پھر صبح کا وقت ضائع ہو جاتا ہے، کیونکہ پھر جلد نہیں اٹھ سکتا، ان دنوں میں فجر کی نماز کا وقت قریب ۲ بجے ہوتا ہے، کیونکہ سورج ۳ بجے نکلتا ہے، میرا ہندوستان میں ۵ بجے اٹھنا دشوار تھا ۳ بجے کون اٹھائے گا، اگر میرا کالج الیج شروع ہوا کرتا تو میں ۲ بجے تک پڑھتا رہتا، اس صورت میں عشاء اور فجر دونوں مل جاتیں، اور پھر ۳ بجے سے ۱۰ بجے تک سوتا، لیکن یہ بھی مشکل ہے، غرض ان تمام باتوں سے ضرور مطلع کچھ کرے گا کہ میں کیا کروں؟

الجواب: اس صورت میں جبکہ غروب کے بعد گھنٹہ رات ہوتی ہے، لندن والوں پر مغرب و عشاء و فجر تینوں نمازیں اپنے اپنے وقت میں پڑھنی واجب ہیں، اس صورت پر سائل نے جو اشکال کیا ہے کہ عشاء پڑھ کر ۱۲ بجے سونا ملے گا تو ۲ بجے جاگنا دشوار ہوگا اس کے متعلق چند باتیں معروض ہیں، (۱) دن میں کوئی وقت فرصت کا نکال کر جس میں بہتر وقت دوپہر کا ہے خوب سویا کریں، (۲) الارم کی گھڑی کو صبح کے وقت پر لگا کر سویا کرنا آٹھ ضرور کھل جائے گی (۳) عشاء کی نماز غروب کے ایک گھنٹہ بعد معاً پڑھ لیا کریں، حسین کے مذہب پر شفقِ احمر کے غائب ہوجانے سے عشاء کا وقت ہو جاتا ہے، اور شفقِ احمر غروب کے بعد ایک گھنٹہ میں غائب ہو جاتی ہے، اور سہولت کے لئے فتویٰ قول صاحبین پر دیا گیا ہے، گو احتیاط بعد شفقِ بیاض کے پڑھنے میں ہی، مگر ضرورت کے وقت قول صاحبین پر عمل کر لینا بھی جائز ہے، پس غروب کے ایک گھنٹہ بعد نمازِ عشاء پڑھ کر فوراً سو رہا کریں، اس طرح سائل کو ۱۱ بجے سونا مل جائے گا، واللہ اعلم، ارشعبان ۱۴۲۸ھ

نصف شب کے بعد عشاء کی سوال (۷) مجموع الفتاویٰ میں لکھا ہے کہ نصف شب کے نماز ادا کرنے کا حکم،،، بعد اگر کوئی عشاء کی نماز پڑھے تو اس کا اعادہ صبح کو واجب ہے اور حضرت والا بہشتی زیور میں تحریر فرماتے ہیں کہ مغرب کے بعد مرنے کی مٹ جانے کے بعد

صبح صادق تک عشاء کا وقت باقی رہتا ہے، یہ سمجھ میں نہیں آتی، اگر اتفاقاً کبھی نصف شب کے بعد عشاء پڑھی جائے تو صبح کو پھر اعادہ کرنا ضرور ہوگا یا نہیں؟

الجواب: بعد نصف شب کے عشاء کی نماز درست تو ہے اور وہ ادا صحیح ہو جاتی ہے مگر بلا عذراتی تاخیر کرنا مکروہ ہے، باقی اعادہ کا واجب ہونا یہ غلط ہے، کیونکہ اعادہ اس جگہ واجب ہوتا ہے جہاں صلوٰۃ معادہ صلوٰۃ اولیٰ سے اکمل ہو سکتی ہو، اور یہاں صلوٰۃ معادہ بعد الفجر صلوٰۃ اولیٰ سے انقص ہوگی، کیونکہ اولیٰ ادا ہے اور ثانیہ قضاء و شتان بینہما، اس تاخیر سے استغفار کرنا چاہئے اگر بلا عذر ہو اور عذر سے ہو تو کچھ مضائقہ نہیں، واللہ اعلم،

سوال (۸) حضور اقدس نے امداد الفتاویٰ جلد اول میں وقت عشاء پر پڑھنے کا حکم، عشاء غروب آفتاب سے ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد تحریر فرمایا ہے

ہادی النظر میں شبہ سا ہوتا ہے، خوب سمجھ میں نہیں آتا، اس فرمان واجب الاذعان کے موافق اگر کوئی شخص غروب آفتاب سے گھنٹہ یا سو اگھنٹہ کے بعد مغرب پڑھے تو درست ہونا چاہئے، مگر مشاہدہ نہیں مانتا، براہ کرم ذرا مکرر تفصیل فرمادی جاوے، غروب آفتاب سے ڈیڑھ گھنٹہ کی مدت بہت زیادہ سی معلوم ہوتی ہے،

الجواب: اس کا مطلب یہ نہیں جو آپ نے سمجھا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ عشاء کی نماز غروب سے ڈیڑھ گھنٹہ گزرنے پر پڑھنا چاہئے، عشاء اس سے پہلے نہ پڑھے، یہ مطلب نہیں کہ مغرب کی نماز اتنی دیر تک درست ہے، چنانچہ عبارت سوال کو دیکھ کر کہ سائل نماز عشاء پڑھنے کے لئے وقت عشاء دریافت کر رہا ہے، ص ۶۲) یہ مطلب ظاہر ہے جو ہم نے بیان کیا، نماز عیدین کا مستحب وقت کونسا ہے؟ **سوال (۹)** نماز عیدین کا مستحب وقت بحساب گھنٹہ

ومنٹ کے طلوع سے کس قدر بعد شروع ہوتا ہے اور کتنی دیر رہتا ہے؟
۱۔ نماز عیدین میں وقت مستحب کی پابندی شرعاً اولیٰ ہے یا کثرت نمازیوں کی امید پر وقت مستحب سے تجاوز اور تاخیر اولیٰ ہے؟

۲۔ وقت مستحب پر اس طرح عامل ہونے میں کہ اس سے تجاوز ہی نہ ہو فرضیت کے مرتبہ میں قرار دینا ہے یا نہیں؟

۳۔ نماز عیدین کا وقت بحساب فی گھنٹہ ومنٹ کے کس وقت مکروہ ہوتا ہے؟
الجواب: طلوع آفتاب سے دس منٹ کے بعد وقت شروع ہو جاتا ہے اور نصف النہار

تک رہتا ہے، یعنی نصف النہار سے پہلے پہلے قال فی الدرر وقتها من الارتفاع قدر رحم
فلا تصح قبلہ الی الزوال باسقاط الغایۃ فلوزالت الشمس فی اثنائها فسدت اہ
قال الشامی قولہ قدر رحم هو اثناعشر شبراً والمراد بہ وقت حل النافلۃ اہ
رص ۸۰، ۸۱ قلت وحرینا ارتفاعها هذا القدر بل شیخنا زائد علیہ فی عشر
دقائق والله اعلم

۱۲۔ جماعات میں عموماً نمازیوں کی کثرت کا لحاظ آؤنی ہے، پس وقت مذکور کے اندر اندر
کوئی ایسا وقت نماز کا معین کیا جائے جس میں نمازیوں کی غالب تعداد شریک ہو جائے، مگر
اس کے ساتھ اس کا بھی لحاظ رکھا جائے کہ دیہات والوں کی رعایت سے نماز میں اتنی زیادہ
دیر نہ کی جائے جس سے شہر والوں کو تکلیف ہونے لگے، کیونکہ دیہات والوں پر جماعت عید
واجب نہیں، محض ثواب اور مستحب ہی، پس اہل استحباب کی رعایت سے اہل وجوب کو تنگی اور
پریشانی میں ڈالنا مکروہ ہے،

نیز بقر عید کی نماز عید الفطر کی نماز سے سویرے پڑھنا چاہئے، کیونکہ شہر والے بعد نماز
کے قربانی کرتے ہیں تو نماز کی تاخیر سے اُن کو قربانی میں تاخیر ہوگی، جس سے تکلیف ہوتی ہے،
قال فی رد المحتار بند بتعجیل الاضحیٰ لتعجیل الاضاحی وتاخیر الفطر لیودی
الفطرۃ کما فی البحر رص ۸۰، ۸۱

۱۳۔ سوال سوم سمجھ میں نہیں آیا، معلوم نہیں سائل وقت مستحب کس کو سمجھے ہوئے ہے
اور اس پر جو لوگ پابندی کرتے ہیں، اُن کے پاس اس پابندی کی کوئی وجہ ہے یا نہیں ممکن
ہے کہ کسی مصلحت کی وجہ سے پابندی ہو، اس لئے مبہم سوال کا جواب نہیں دیا جاسکتا،
۱۴۔ عیدین کے متعلق وقت کراہت بلندی آفتاب سے پہلے اور زوال آفتاب کا وقت ہر
کما تر، ۵ رذی الحجہ ۱۳۳۳ھ،

جمعہ کے دن ٹھیک دوپہر کو | سوال (۱۰) مسئلہ یہ ہے کہ میں بہارنپور گیا تھا وہاں جا کر دیکھا تو
نماز تیس بجے پڑھنے کا حکم | جمعہ مسجد میں جمعہ کے وقت ٹھیک دوپہر بارہ بجے صلوٰۃ التسبیح
پڑھنے لگے، میں نے کہا کہ زوال کے وقت سجدہ کرنا حرام ہے، انھوں نے کہا کہ جمعہ کو جائز ہے
تم دریافت کرو، آپ فرمادیں کہ یہ کہاں تک درست ہے؟

الجواب؛ امام ابو یوسف ؒ کے نزدیک جمعہ کے دن ٹھیک دوپہر کو نماز پڑھنا جائز

ہے، اور بعض علماء نے اُن کے قول پر فتویٰ بھی دیا ہے، لیکن ہمارا اور اکثر محقق فقہاء علماء کے نزدیک امام صاحب کے قول پر فتویٰ ہے، کہ جمعہ کے دن بھی مثل اور دنوں کے اس وقت نماز جائز نہیں جیسا کہ شامی اور بدائع میں مصرح ہے، وجہ طوالت کا رڈ میں عبارت نہیں لکھی گئی، نوٹ: ٹھیک دوپہر پلوے کے بارہ بجے نہیں ہوتا، بلکہ کچھ منٹ بعد ہوتا ہے، اور ہر موسم میں کچھ فرق ہوتا رہتا ہے، کتبہ احقر عبدالکریم عفی عنہ ۶ ربيع الثاني ۱۴۲۵ھ

آخر عصر میں اسی روز سوال (۱۱) کتاب علم الفقہ میں لکھا ہے کہ نماز اسی دن کی عصر کی مکروہ وقت کی عصر ادا کرنا، یعنی قریب غروب آفتاب پڑھنا گراہت تحریمیہ کے ساتھ ہے، جس کا

باطل کر کے اچھے وقت ادا کرنا واجب ہے، کیا یہ صحیح ہے، اور قابل عمل ہے، اکثر لوگ وجہ عدیم الفرستی اپنے پیشہ کے مکروہ وقت میں نماز ادا کرتے ہیں تو کیا انکو اعادہ کر لینا چاہئے؟

الجواب: یہ تو صحیح ہے کہ اُس وقت عصر کی نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، اور اس قدر

کرنا سخت گناہ ہے، لیکن اس عصر کو اس وقت توڑ دینا اور اس کو دوبارہ پڑھنا جو علم الفقہ میں

لکھا ہے صحیح نہیں، غالباً مؤلف سلمہ نے شامی سے لیا ہے، اُس میں اس موقع پر عبارت شبہ

میں ڈالنے والی ہے، مؤلف کا ذہن اس طرف گیا، لیکن شامی نے طحاوی کا حوالہ دیا ہے، اس

میں دیکھا تو صاف موجود ہے کہ عصر کو اسی وقت پڑھے، نہ قطع کرے اور نہ دوبارہ پڑھنا ورنہ

ہے، کیونکہ شامی میں ہے الاصلوة جنازة حضرت فیہا وسجدة تلیت ایتھا فیہا وعصر

یومہ والنفل والنذر المقید بہا وقضاء ما شرع بہ فیہا ثم افسدہ فتعقد هذه

الستة بلاکراہۃ اصلا فی الاولیٰ منها مع الکراہۃ التنزیہ فی الثانیۃ و

التحریمۃ فی الثالثۃ وکذا فی البواقی لکن مع وجوب القطع والقضاء فی وقت

غیر مکسودہ (ص ۳۸ ج ۱) اس میں مع وجوب الخ فقط بواقی کے ساتھ ہے، ثالثہ کے

ساتھ اس کا تعلق نہیں ہے جیسا کہ مؤلف علم الفقہ نے خیال کیا ہے، چنانچہ طحاوی میں ہے

فیجب القطع والقضاء فی غیر النوعین الا عصر یومہ فانه لا یجوز قطعه الخ کتبہ احقر عبدالکریم عفی

عنه الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ ۱۰ شعبان ۱۴۲۵ھ

وقت عشاء و فجر کے بارے میں سوال (۱۲) آیا جناب کے علم میں گھڑی کے حساب سے کچھ وقت

مقرر ہے کہ آجکل رمضان میں غروب شمس سے کتنی دیر کے بعد وقت عشاء کا شروع ہو جاتا ہے

اور مختلف فیہ کب سے اور متفق علیہ کب سے اور ایسے ہی صبح صادق سے طلوع شمس تک

کتنا وقت ہے؟

الجواب، ہر موسم میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ہوتا ہے، مابین غروب و وقتِ عشاء، اور مابین فجر و طلوع بھی، اور ہر زمانہ میں جو قدرے تفاوت ہوتا ہے وہ مظاہر حق سے یا اسلامی جنتری سے جو سہارنپور میں ملتی ہے معلوم کریں، کتبہ احقر عبدالکریم ۱۵ رمضان ۱۳۸۸ھ جمعہ کے دن زوال کے سوال (۱۳)..... زوال کے وقت نماز پڑھنے کا حکم وقت نماز پڑھنے کے متعلق جمعہ کے دن درمختار میں امام ابو یوسفؒ کے قول پر فتویٰ نقل کیا ہے، مگر علامہ شامیؒ نے اس کو مخدوش کر دیا ہے، لیکن خود کوئی فیصلہ نہیں کیا، اب قول فیصل کیا ہے؟

الجواب، علامہ شامی نے صاف طور پر ترجیح دی ہے۔ قول امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کو۔ اور فتح القدیر نے جو قول ابو یوسفؒ کو ظاہراً ترجیح دی ہے اس کے متعلق لکھا ہے لیکن لم یعول علیہ فی شرح المنیۃ والاملاذ علی ان هذا ليس من المواضع التي يحصل فيها المطلق على المقيّد كما يعلم من الاصول وايضا فان حديث النهي صحيح رواه مسلم وغيره فيقدم بصحته واتفاق الاثنية على العمل به وكونه حاضراً اور اخیر میں اپنی تائید کے لئے تحریر فرماتے ہیں، ورأيت في البدائع ايضاً ما نصه وما ورد من النهي الا بصفة شاذ لا يقبل في معارضة المشهور وكذا رواية استثناء يوم الجمعة غريب فلا يجوز تخصيص المشهور به اه، وللشاهد اس سے صاف واضح ہے کہ راجح قول امام صاحبؒ کا ہے، اور جمعہ کو بھی دیگر ایام کی طرح استوار کے وقت نماز پڑھنا ممنوع ہے، ۳ ربیع الثانی ۱۳۸۸ھ

صلوة خمسہ کے اوقات مستحبہ | سوال (۱۴) ۱۔ نماز فجر کا وقت مستحب طلوع آفتاب سے کس قدر قبل ہے؟ (۲) نماز ظہر کا وقت مستحب نصف النہار سے کس قدر بعد ہے؟ (۳) نماز عصر کا وقت مستحب غروب آفتاب سے کس قدر قبل ہے؟ (۴) نماز مغرب کے وقت غروب سے کس قدر بعد تک رہتا ہے؟ (۵) نماز عشاء کا وقت مستحب ثلث لیل ہے یا سُدس لیل، اور تعین لیل غروب آفتاب تا صبح صادق سے کیا جاوے گا یا غروب آفتاب تا طلوع آفتاب سے؟

الجواب، نماز فجر میں اسفار مستحب ہے، یعنی روشنی پھیلنے سے پہلے شروع نہ کی جاوے، وهو المختار كما في الدر المختار وهو ظاهر الرواية كما في البحر عن العناية خلافاً

للمطاعوی فانه قال ان کان من عزمه تطویل القراءة فالافضل ان یسبأ بالتغلیس ویشتم
بالاسفار وان لم یکن من عزمه تطویل القراءة فالاسفار رای الابتداء فی الاسفار
افضل من التغلیس، ووجه المختار ان فیه تکیث الجماعة کما قاله الشمس الاثمة
فی المبسوط، اور روشنی پھیلنے کا وقت اُحقرنے جو تجربہ کیا تو طلوع فجر و طلوع شمس کے نصف
پر ہے، اور طلوع عین میں کم از کم فاصلہ ایک گھنٹہ بیس منٹ ہوتا ہے، اور زائد سے زائد ایک گھنٹہ
۳۵ منٹ، پس اسفار کا وقت بعض ایام میں طلوع شمس سے ۴۰ منٹ پیشتر ہوگا، اور بعض
ایام میں تقریباً ۵۰ منٹ، جیسا کہ اسلامی جنتری سہارنپور سے واضح ہے، یہ تو نماز فجر کے وقت
مستحب کی ابتداء ہے، اور انتہاء کے متعلق شامی میں ہے وحد الاسفار ان یسکنہ اعادة
الطهارة ولو من حدث اکبر کما فی النہر والفہستانی واعادة الصلوة علی الحالة
الاولی قبل طلوع الشمس رای بجیت یرتل اربعین آیت الی ستین اور اس کا تخمینہ
آدھا گھنٹہ کیا گیا ہے، پس وقت مستحب کا انتہائی حصہ یہ ہے کہ جب نماز شروع کی جاوے
اس وقت کم از کم نصف گھنٹہ طلوع آفتاب میں باقی ہو،

اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ وقت مستحب کی فضیلت حاصل کرنے کے لئے کوئی ایسا وقت
معیّن نہیں ہے جس میں ذرا سی کمی بیشی سے یہ فضیلت فوت ہو جاوے، بلکہ بعض ایام میں
طلوع آفتاب سے ۴۰ منٹ پہلے شروع کرنا بھی وقت مستحب کی حد میں داخل ہے، اور بعض
میں ۵۰ منٹ قبل طلوع بھی، اور علاوہ ازیں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وقت فجر کا کوئی
حصہ مکروہ نہیں، پس اگر کوئی اسفار سے قبل نماز پڑھے یا زیادہ تاخیر کر دے تو اس پر ملامت نہیں،
(۲) نصف النہار استواء شمس کا وقت ہے، اس سے دو منٹ بعد زوال شروع ہوتا ہے
اور نصف النہار سے پانچ منٹ بعد لوگ شمس محسوس ہو جاتی، پس وقت ظہر کی ابتداء نصف النہار
سے ۵ منٹ بعد ہے، مگر نماز پڑھنے میں یہ تفصیل ہے کہ نماز ظہر سردی میں جلدی پڑھنا
مستحب ہے، اور گرمی میں دیر سے پڑھنا اور تعجیل و تاخیر کی حد یہ ہے کہ نصف اول میں پڑھنا

۱۵ شم رأیت فی البحر عن السراج الوہاج وحد الاسفار ان یصلی فی النصف الثانی والحمد للہ علی ذلک ۱۲ منہ

۱۵ سہارنپور دیوبند وغیرہ میں اسی پر عمل ہے، کہ نماز شروع کرنے کے وقت ۳۰ منٹ سے کم باقی نہیں ہوتے،

اور ۴۰ - ۴۵ سے زیادہ نہیں ہوتے، ۱۲ منہ

تعیل ہے اور نصف ثانی پڑھنا تاخیر ہے، کما نفلہ صاحب البحر عن الاسرار ص ۲۴۸ اور
ظہر کا وقت متفق علیہ ہے ایک مثل تک ہی پس سردی میں تو ایک مثل کے نصف اول میں پڑھنا
چاہئے، اور گرمی میں نصف ثانی میں، اور ہمارے دیار میں جو معمول ہے وہ بالکل اس کے مطابق ہے
چنانچہ سردی میں دھوپ گھڑی سے تقریباً تین بجے تک ایک مثل ہے، اور دھوپ گھڑی کے
حساب ڈیڑھ بجے سے پیشتر جماعت ہو جکتی ہے، جو یقیناً نصف اول ہے، اور گرمی میں پونے
چار تک ایک مثل ہے، اور نماز دو بجے کے بعد پڑھنے کا معمول ہے، جو یقیناً نصف ثانی ہے، اور
درمیان زمانہ میں تھوڑا تھوڑا تفاوت ہوتا رہتا ہے، کمالاً بخفی،

(۳) وقت عصر کی ابتداء اور وقت ظہر کی انتہاء میں اختلاف ہے، صاحبین کے نزدیک
ایک مثل پر ظہر کا وقت ختم ہو کر عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے، اور امام صاحب کے نزدیک
مشہور روایت کی بناء پر دو مثل پر وقت ظہر ختم ہوتا ہے، اور وقت عصر شروع ہوتا ہے،
اور ایک روایت امام صاحب سے یہ بھی ہے کہ وقت ظہر تو ایک مثل پر ختم ہو جاتا ہے، مگر
وقت عصر دو مثل پر شروع ہوتا ہے، اکثر مشائخ نے احتیاط کی وجہ سے اسی قول کو لیا ہے،
اور ہمارے اکابر کا عمل بھی اسی پر ہے، اور جب وقت عصر کی ابتداء میں اختلاف ہے تو
وقت مستحب کے شروع ہونے میں بھی اختلاف ہوگا، یعنی صاحبین کے نزدیک ایک مثل سے
غروب آفتاب تک جس قدر وقت ہے اس کے نصف اخیر میں نماز پڑھنا مستحب ہی، اور امام صاحب
کے قول پر دو مثل سے غروب تک جتنا وقت ہے اس کے نصف اخیر میں، اور ہمارے دیار میں
جس وقت نماز پڑھنے کا معمول ہے وہ صاحبین کے نزدیک وقت عصر کا نصف اخیر ہے، اور
امام صاحب کے نزدیک نصف اول یعنی قول امام کی رعایت اس معمول میں نہیں ہے، حالانکہ
ظہر میں اس کی رعایت کی گئی ہے، کما مر فی الحاشیۃ آلفا، سو اس کی وجہ سننے یا دیکھنے میں تو

۵۔ بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ اس معمول میں دونوں قول کی رعایت ہی، یعنی ایام تعیل میں ایسے وقت نماز
ہوتی ہی، جو مثلین کا بھی نصف اولیٰ ہی اور ایک مثل کا بھی، اور ایام تاخیر میں ایسے وقت نماز ہوتی ہے جو ایک
مثل کا بھی نصف ثانی ہی اور مثلین کا بھی نصف ثانی ہے، اور چونکہ ایک مثل کے بعد وقت مختلف فیہ ہی، اور جو
اس وقت کو ظہر کا وقت کہتے ہیں وہ بھی مکروہ کہتے ہیں، اس واسطے ایک مثل سے پہلے ظہر پڑھی جاتی ہے،

نہیں آئی، مگر غالب خیال یہ ہے کہ تاخیر ظہر میں تو ابراہیم مقصود ہے، اس کے واسطے قولِ امام کی رعایت ضروری ہے، اور تاخیر عصر کا جو مقصود ہے یعنی نوافل کے لئے گنجائش دینا وہ ایسے وقت پڑھنے سے بھی حاصل ہو جاتا ہے جو قول صاحبین کی بناء پر نصف اخیر ہو، اور امام صاحب کے قول پر اول وقت ہو، واللہ اعلم بالصواب،

اور وقتِ مستحب کی انتہاء اصفرارِ شمس تک ہی یعنی دھوپ زرد ہو جانے تک تاخیر کرنا مکروہ تحریمی ہے، اور اس کا تخمینہ کبھی احقر نے تو کیا نہیں مگر مولانا یحییٰ صاحب کاندھلوی نے حضرت گنگوہیؒ کا قول نقل کیا تھا، کہ غروب سے صرف دس منٹ پہلے دھوپ زرد ہوتی ہے، خود بھی اس کا تجربہ کر لیا جاوے،

(۴) غروب کے بعد معمولی دیر کا تو مضائقہ نہیں، لیکن یقین غروب کے بعد فوراً اذان کہنا چاہیے، اور اذان و اقامت میں تھوڑا سا وقفہ بھی مامور بہ ہے جس کی مقدار تین آیتوں کا پڑھنا ہے، اور اگر اس سے زیادہ دیر کی تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ اشتباکِ نجوم تک تاخیر کرنا تو مکروہ تحریمی ہے، اور اتنی دیر کرنا کہ ایک آدمہ ستارہ ظاہر ہو جاوے مکروہ تنزیہی ہے، اور اگر ستارہ تو کوئی ظاہر نہ ہوا ہو مگر اتنی دیر ہو گئی کہ اطمینان سے دو رکعتیں پڑھی جاسکتی ہیں، تو اکثر فقہاء اس قدر تاخیر کو مکروہ تنزیہی کہتے ہیں، کہ صاحب الدرر و فتح القدر وغیرہما، لیکن شرح منیہ اور حلیہ سے شامی نے نقل کیا ہے کہ مکروہ نہیں بلکہ مباح ہے، یعنی مستحب تو یہی ہے کہ دو رکعت کی مقدار دیر نہ کرے، لیکن اگر کسی نے دیر کی تو ظہورِ النجم تک کراہت نہیں مباح ہے، خلاصہ یہ کہ اس میں اختلاف ہے کہ وقتِ مکروہ تنزیہی کب سے شروع ہوتا ہے، بعض کے نزدیک دو رکعت مقدار وقت گزرنے پر اور بعض کے نزدیک ظہورِ النجم سے، والثانی اقرب و اوسع و ظاہر مافی رد المحتار يدل ان العلامة الشامی مال الیہ، اور یہ سب گفتگو جب ہے جبکہ کوئی عذر نہ ہو، اور اگر عذر ہو تو پھر تاخیر میں کراہت نہیں، ومن الاعذار السفر و کونه علی اکل مکافی الدرہ پس رمضان میں افطار کی وجہ سے دیر ہونا مضائقہ نہیں، اور وقتِ مغرب کی انتہاء مختلف فیہ ہے، امام صاحب کے نزدیک تو شفقِ ابیض غائب ہونے پر ختم ہوتا ہے، اور غروبِ آفتاب و شفقِ ابیض کے درمیان اتنا وقت ہوتا ہے جتنا کہ طلوعِ فجر صادق و طلوعِ آفتاب میں اور صاحبین کے نزدیک شفقِ احمر تک وقتِ مغرب ہے، اس کا صحیح حساب معلوم نہیں ہے، کہ شفقِ ابیض سے کتنی دیر پیشتر غائب ہوتی ہے، کسی ریاضی داں سے دریافت کر لیا جاوے،

(۵) شرفارات غروب آفتاب سے طلوع فجر صادق تک ہی، اور مستحب یہ ہے کہ غشاء میں ثلث لیل تک تاخیر کی جاوے، اور ثلث سے نصف تک مباح ہے، اور نصف کے بعد مکروہ تحریمی ہے، لیکن جب ثلث تک تاخیر کرنے میں تقلیل جماعت کا اندیشہ ہو جیسا کہ آجکل یہ اندیشہ سب جگہ ہی، تو پھر جلدی پڑھ لینا بہتر ہے، واللہ اعلم، ۸ ارشوال ۱۵۴

غروب آفتاب اور غروب شفق | سوال (۱۵) قابل گزارش یہ ہے کہ مولوی عبدالکریم کا جواب ملا، ابیض میں تفاوت کی تحقیق میں نے چاہا تھا کہ ان کے ارشاد کے مطابق بتا دوں، اور برکت

آں قبلہ دو جہاں بنا لوں گا، مشکل یہ پیش آئی کہ اہل ہندسہ نے ابیض و احمر کی تفریق نہیں کی، صرف ۸ درجہ انعکاس سورج رکھے ہیں، میں نے اس سے پہلے بھی چار سال ہوتے کوشش کی تھی، اور اب پھر کوشش کی، مجھے خیال یہ آیا کہ اہل ہندسہ نے مشاہدات کر کے اصول بنائے ہیں میں خود کیوں نہ تجربہ کروں و مشاہدہ کروں، اور ٹھیک پتہ لگاؤں، چنانچہ برکت آں قبلہ میں نے مولوی شمشیر علی، ممتاز علی، حافظ بشیر احمد صاحبان کو ساتھ لے کر روزانہ غروب سے ۸ بجے تک بیٹھنا اور مشاہدہ کرنا شروع کیا، اور نظر سے جو فرق پیدا ہو سکتا تھا اس کا حساب کیا،

جو جو شفق کی شکلیں آسمان پر پیدا ہوتی ہیں ان کے مسودے اور چلتے ہوئے سرسری نقشے بنا کر پیش کر رہا ہوں :-

صورت یہ پیدا ہوتی ہے کہ غروب کے ساتھ ہی ساتھ کوئی سرخی نہیں رہتی، اس کے بعد تقریباً منٹ کے بعد نہایت تیزی کے ساتھ چوتھائی افق پر سرخی چھا جاتی ہے، پھر یہ سرخی طول میں گھٹتی جاتی ہے، اور اونچائی میں زیادہ ہوتی جاتی ہے، اور اس کے اوپر خفیف سیاہ ڈورا آجاتا ہے، پھر یہ سرخی سمٹتی ہے، اور ایک جگہ آجاتی ہے، اور اس کے اوپر سفیدی پھیلنا شروع ہوتی ہے، اور سفیدی ہوتی ہے، اور نیچے سرخی کم کم، پھر یہ سرخی غائب ہو جاتی ہے، اس کے غائب ہوتے ہی دو ایک منٹ تک سناٹا ہو جاتا ہے، بعض دفعہ تو نہایت بھیانک نظر آتا ہے، اور ڈر سا لگتا ہے، اب سفیدی کا دور دورہ ہو جاتا ہے، اور مقام غروب سے سورج سے شمالاً و جنوباً سفیدی پھیل جاتی ہے جو دودھ کی طرح سفید ہوتی ہے، پھر یہ سفیدی طول میں گھٹتی ہے، مگر چوڑائی میں زیادہ اور صاف ہوتی ہے،

اسکے بعد طول اور گھٹتا ہے، مگر اب اوپر ایک چھوٹی طسی محراب پیدا ہو جاتی ہے، اور بعدہ سفیدی خوب روشن ہو جاتی ہے، چوڑان میں زیادہ ہوتی ہے، اور اس جگہ جہاں سورج ڈوبا تھا محراب پیدا ہوتی ہے، اور وہ سفیدی جو طول میں مقام غروب سے شمالاً و جنوباً پھیلی تھی دھیرے دھیرے غائب ہو جاتی ہے، اور صرف محراب جو ایک لمبی ستون کی طرح ہوتی ہے باقی رہ جاتی ہے، یہی وہ وقت ہے جس کو ہندسہ والے غروب شفق بتاتے ہیں، اور اس کے ختم پر کل حضرات نے اپنی اپنی جنتریوں میں غروب شفق ابیض بتایا ہے،

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ طولا از شمال تا جنوب شفق نہ ابیض رہا نہ احمر، مگر یہ محرابی ستون اس ابیض کے سمٹنے سے ہی تو پیدا ہوتا ہے، اس کو کیوں چھوڑ دیا جائے، یہ اگر شفق ابیض کا حصہ نہیں تو کیا ہے، یہ حصہ بہت دیر میں تقریباً ۳۵ منٹ میں موسم اعتدال میں غائب ہو جاتا ہے، خادم نے جو مشاہدہ کیا اور بار بار دیکھا ہے اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ ابیض کا حصہ ہے، مگر انھوں نے اس کو اس وجہ سے چھوڑ دیا ہے کہ اس کے نمودار تمام آسمان پر محیط صورت ختم ہو گئی، صرف مقام غروب آفتاب پر ایک ستون رہ گیا جس کا تمام افق پر کوئی اثر نہیں، جس طرح ریاضی میں اوسط میں کرتے ہیں یا کسرات کو چھوڑ جاتے ہیں، اگر اس ستون کو خارج کر دیا جاوے تب تو ہندسی اعداد ٹھیک ہیں، اور اگر اس کو شامل کیا جائے تو ۲۵ منٹ بعد غروب ابیض ہوگا،

اب بندگانِ عالی بتائیں کہ خادم اس کو اسی طرح ترک اور نظر انداز کر دے جس طرح جدید انگریزی ہندسہ نے نظر انداز کیا ہے، یا شامل کیا جائے گا تو ایک انقلابِ عظیم پیدا ہوگا، میری اوّل کی جہتِ ریاں سب قابلِ ترمیم ہیں،

الجواب: گذارش آنکہ آپ کی تحریر میں غور کیا، نیز حضرت والا سے اس باب میں مراجعت کی، بالآخر یہ طے ہوا کہ غروب آفتاب اور غروب شفق ابیض میں اتنا ہی تفاوت ہوتا ہے جتنا کہ صبح کاذب اور طلوع آفتاب میں ہوتا ہے، یعنی ۸ درجے، اور جتنا تفاوت صبح کاذب و صادق میں ہوتا ہے اتنا ہی تفاوت شفق احمر و ابیض کے غروب میں ہوتا ہے، یعنی ۳ درجے، کتابوں میں بھی یہی ملا، چنانچہ جزو اول شرح چغینی میں اور جزو دوم رد المحتار میں مصرح ہے، اور مقتضائے قیاس بھی یہی ہے، پس اصل سوال کا جواب تو ہو چکا، یعنی

بیاض مستطیر کے غروب پر شفق کا غروب مانا گیا ہے، اور وہ سفیدی جو بشکل ستون ۸ درجہ کے بعد آپ نے مشاہدہ کی ہے، نظر انداز کرنے کے قابل ہے جیسا کہ سب جنتریوں میں کی گئی ہے، باقی رہا یہ سوال کہ باوجود بعد شمس عن الافق اس بیاض مستطیر کے رہنے کی کیا وجہ ہے، سو یہ علم ہیئت کی بحث سے خارج ہے، ممکن ہے کہ علم طبعیات میں اس کی کوئی وجہ مل جاوے، تلاش کی ضرورت نہیں سمجھی، کہ اس پر کوئی حکم شرعی مرتب نہیں، فقط احقر عبدالکریم عفی عنہ مورخہ ۲، ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ،

چونکہ یہ جواب میری مشارکت اور مشاورت سے لکھا گیا ہے اس لئے میں اس میں متفق ہوں اور اس کی مزید تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ فجر سے قبل بیاض مستطیل بالیقین عشاء کا وقت ہے، اقرب الی القیاس یہ ہے کہ اسی طرح بیاض مستطیل بعد غروب بھی عشاء کا وقت ہو، واللہ اعلم، البتہ اگر کوئی نقل صحیح اس قیاس کے معارض ہوتی... تو یہ قیاس مؤثر نہ ہوتا، اور ایسی نقل مفقود ہے، اور گویہ دلیل قطعی نہ ہو لیکن مقتض ضرور ہو کمالا یحییٰ، اثر علی ۲، ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ

فصل فی الاذان والاقامۃ

اذان کے جواب میں اللہ اکبر | سوال (۱) اذان سننے کے وقت سامع کو اللہ اکبر کے ساتھ کے بجائے جل جلالہ کہنا | جواب دینا افضل اور بہتر اور مزجج ہے، یا جل جلالہ اور اگر جل جلالہ کہنا جائز ہے تو کوئی اس بارہ میں حدیث وارد ہوئی ہے یا نہیں؟

الجواب؛ قال فی الحصن واذا سمع المؤذن فلیقل کما یقول (ع) وبعد العیلة لا حول ولا قوۃ الا باللہ (ص ۸۰) اس سے معلوم ہوا کہ اذان میں اللہ اکبر کے جواب میں اللہ اکبر کہنا ہی افضل ہے، لورود الامر فیہ واقلہ السنۃ او الاستحباب، ہاں اللہ اکبر کے بعد جل جلالہ بڑھادے تو اچھا ہے، لکن زیادہ فی الشنار، باقی حدیث میں کہیں ہم کو ثابت نہیں ہوا، اور اگر اللہ اکبر نہ کہے بلکہ صرف جل جلالہ کہے تو جواز میں تو شک نہیں، لکن التکبیر فی الاذان اقل تاکدامنہ فی فتاح الصلوٰۃ فلما جاز فیہ عند الخفیۃ ان یقول اللہ اجل، او اعظم او الرحمن اکبر او مایودی معنی التعظیم ففی الاذان اولیٰ، لیکن خلافت سنت ضرور ہے، بچہ کے کان میں سرّاً اذان | سوال (۲) مولود کے کان میں جو اذان دی جاتی ہے اسکی کیفیت دینی چاہئے یا جہراً؟ | کیا ہے، نماز کی اذانوں کی طرح جیسا قبلہ رخ اور کان میں ہاتھ دینا

بلند آواز سے دینا اور مرد ہونا وغیرہ شرطیں یہاں بھی ملحوظ ہیں یا نہیں، زید کہتا ہے کچھ شرط نہیں بلکہ بچہ کو گود میں لیکر بچہ کو سنا دینے سے کافی ہے، نہ جہر کی ضرورت ہے اور نہ قبلہ رخ کی آیا یہ کہنا صحیح ہے یا غلط؟

الجواب: زید کا قول صحیح ہے، کیونکہ اس اذان سے اعلام مقصود نہیں صرف تبرک مقصود ہے لہذا نہ جہر مفطر چاہئے نہ استقبال قبلہ کی ضرورت ہے، اور استقبال کے افضل ہونے میں شک بھی نہیں، کیونکہ مطلق ذکر میں استقبال افضل ہے، فلذا ہذا اگر لزوم کی کوئی دلیل نہیں، واللہ اعلم، ۹ شعبان ۱۳۲۷ھ

سوال (۵) اذان و اقامت میں حی علی الصلوٰۃ وحی علی الصلوٰۃ ہر کلمہ پر وقف کا مسنون ہونا، اگر پہلے میں وصل کر کے حی علی الصلوٰۃ یعنی تاء کو ظاہر کیا اور ثانی

حی علی الصلوٰۃ پر وقف کیا تو کچھ حرج ہے یا نہیں؟

الجواب: اذان و اقامت میں جزم مسنون ہے، پس حی علی الصلوٰۃ وحی علی الصلوٰۃ کی تاء و حاء کو حرکت نہ دینا چاہئے بلکہ ہر کلمہ اذان پر وقف اور اقامت میں نیت وقف کرنا چاہئے کافی مراقی الفلاح ویسکن کلمات الاذان والاقامة فی الاذان حقيقة وینالوقف فی الاقامة لانه لم یقف حقيقة لان المطلوب فيه الحد ۱۲ طحاوی) لقوله عليه السلام الاذان جزم والاقامة جزم والتكبير جزم ای لا فتاح الصلوٰۃ ام (ص ۱۱)

مسجد کی چھت پر اذان کہنا سنت **سوال (۶)** در اختیار اردو میں تحریر ہے کہ اذان

ہے یا واجب، اور بلندی پر اذان کہنے سے بے پردگی ہو تو کیا حکم ہے؟

بلند جگہ پر کہنی چاہئے جو اس کے خلاف کرے گا وہ گناہگار ہوگا، یہاں اس پر عمل ہونے سے کوئی کہتا، یہ مکانات کی بے پردگی ہوتی ہے، بے پردگی کے انتظام کے لئے کہا جاتا ہے تو یہ جواب ملتا ہے کہ قدیم سے جہاں اذان ہوتی آئی ہے وہاں ہونی چاہئے کیا پہلے دنیا میں مولوی نہیں تھے، اب نئی نئی باتیں کہاں سے نکل آئیں، اکثر اس مسجد میں علماء وں کی آمد و رفت رہی ہے، کبھی کسی صاحب نے اعتراض نہیں کیا، ایسی صورت میں بموجب شرع شریف کیا کرنا چاہئے، آیا چھت مسجد یا غسلخانہ کی چھت پر یا سقاوہ کی چھت پر یا نالیوں پر جو کہ فرش مسجد سے کسی قدر اونچی ہیں، اذان کہی جاوے، امید کہ بیائش کی تعداد

حضور فرما کر اطلاع بخشیں، تاکہ شر رفع ہو،

الجواب؛ قال فی الدر وهو سنة للرجال فی مکان عال مؤكدة ام (ص ۳۹ ج ۱)
قال الشامی فی القنیة ولسن الاذان فی موضع عال والاقامة علی الارض وفي
اذان المغرب اختلاف المشائخ والظاهر انه لیس المكان العالی فی المغرب بل یضاً
كما سیأتی وفي السراج وینبغی ان یؤذن فی موضع یشعر السمع للجیران ویرفع
صوته ولا یجهد نفسه ام وفي الشامية ایضاً قال ابن سعد بالسند الی ام
زید بن ثابت کان بیتی اطول بیت حول المسجد فكان بلال یؤذن فوقه
من اول ما اذن الی ان نبی رسول الله صلی الله علیه وسلم مسجد فكان
یؤذن بعد علی ظهر المسجد وقد رفع له شیء فوق ظهره ام (ص ۴۰ ج ۱)
قلت هذا اشر حسن كما ذکرته فی الاعلاء معنی یا الی داود (ص ۱۱۰ ج ۲)
وفي الطحطاوی علی مراقی الفلاح ویکره ان یؤذن فی المسجد کما فی القهستانی
عن النظم فان لم یکن ثمة مکان مرتفع للاذان یؤذن فی فناء المسجد ام
(ص ۱۱۳) عربی در مختار میں ہے لکھا ہے کہ اذان بلند مکان میں کہنا سنت ہے، اس میں
یہ نہیں لکھا کہ جو اس کے خلاف کرے گا وہ گنہگار ہوگا، ہاں اس کے بعد مطلق اذان کے
متعلق کہا ہے کہ اذان سنت مؤکدہ ہے کما لو اجب فی الحق الاثم، لیکن اس کا یہ مطلب ہے کہ
اگر فرض نماز کے لئے اذان بالکل نہ دی جائے تو گناہ ہوگا، یہ مطلب نہیں کہ بلند جگہ میں اذان
نہ دی جائے گی تو گناہ ہوگا، خوب سمجھ لو، ہر حال اس میں شک نہیں کہ اذان کا بلند جگہ میں
ہونا مستنون ہے، مگر بلند جگہ میں ہونا سنت مؤکدہ نہیں، بلکہ سنن زوائد سے ہے، جس کا
کرنا موجب ثواب ہے، اور ترک سے گناہ نہیں، اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بلال
مؤذن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد کی چھت پر اذان دیا کرتے تھے، اور وہاں کوئی
بلند جگہ اذان کے لئے ان کے واسطے بنادی گئی تھی، لیکن ہر جگہ کے لئے یکساں بلندی نہیں
مقرر ہو سکتی، بلکہ اس کا معیار اہل محلہ کو آواز پہنچنے پر ہے، پس جتنی بلندی سے محلہ کے اکثر
گھروں میں آواز بہولت پہنچ جائے اتنی بلند جگہ پر اذان دی جائے بشرطیکہ اتنی بلندی سے
مسلمانوں کے گھروں کی بے پردگی نہ ہوتی ہو، اور بے پردگی ہوتی ہو تو ایسی بلند جگہ اختیار
کی جائے جہاں بے پردگی نہ ہوتی ہو اور اس کا انتظام نہ ہو سکے تو پھر اذان مسجد کے حصہ زیریں

میں حدِ مسجد سے باہر نالی وغیرہ پر دی جائے، اور سنت ارتقاع کی رعایت میں محرم کا ارتکاب نہ کیا جا، واللہ اعلم، ۱۸ صفر ۱۳۵۴ھ

جمعہ کے روز اذان ثانی کا سوال (۷) کوئی کہتا ہے کہ جمعہ کی اذان ثانی کی اجابت اور مناجات جواب دینا جائز ہی نہیں، مگر وہ تحریمی ہے، کوئی کہتا ہے مگر وہ تنزیہی ہے، کوئی کہتا ہے بدعت ہے، اور کوئی کہتا ہے کہ مستحب ہی، لہذا عرض پرداز ہوں کہ کونسی بات صحیح ہے، معہ اولہ تحریر فرما دیں گے،

الجواب؛ جمعہ کی اذان ثانی کا جواب دینا مختلف فیہ ہی، صاحبین کے نزدیک جائز ہے، اور امام صاحب کے قول میں مختلف روایات ہیں، ایک روایت سے کراہت معلوم ہوتی ہے اور ایک روایت سے جواز معلوم ہوتا ہے، اور طحاوی نے اس کا اصح ہونا نقل کیا ہے، اور امام صاحب سے جو یہ قول مشہور ہے کہ خروج امام قاطع صلوة وکلام ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ خروج امام قاطع کلام الناس ہے، اور قاطع سائر الکلام خطبہ کا شروع ہو جانا ہے، پس ابتداء خطبہ سے پہلے کلام دینی یعنی تسبیح و جواب اذان جائز ہے، وبہ وردت الاحادیث ناطقة کما ذکرته فی اعلاء السنن فعن ابی ہریرۃ مرفوعاً خروج الامام یوم الجمعة للصلوة یقطع الصلوة وکلامہ یقطع الکلام اخرجہ البیہقی وسندہ حسن وعن ثعلبة ابن مالک القاضی انه اخبرہ رای ابن شہاب انہم کانوا فی زمن عمر ابن الخطاب یصلون الجمعة حتی یمضی عمر فاذا خرج وجلس علی المنبر واذن المؤذنون قال ثعلبة جلسنا نتحدث فاذا سکت المؤذنون وقام عمر یخطب النعتنا فلم یشکر منا احد اخرجہ مالک فی الموطاء وسندہ صحیح و ثعلبة مختلف فی صحبته، قال صاحب التہذیب لہ صحبۃ ام وقال الطحاوی فی حاشیئہ علی مراقی الفلاح فی البحر عن العنایۃ والنهاية اختلف المشاعخ علی قول الامام فی الکلام قبل الخطبة فقیل انه یکرہ ما کان من جنس کلام الناس اما لتبیح ونحوہ فلا وقیل ذلک مکروہ (ایضاً) والاول اصح ومن ثمة قال فی البرہان و خروجہ قاطع للکلام ای کلام الناس عند الامام فعلم بحدثہ لانه لا خلاف بینہم فی جواز غیر الدنیوی علی الاصح ویحصل لفظة الکلام فی الاثر علی الدنیوی ویشهد لہ ما اخرجہ البخاری ان معاویۃ رضی اللہ عنہ اجاب المؤذن بین یدیه

فلما ان قضی التاذین قال یا ایہا الناس انی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
على هذا المجلس حين اذن المؤذن يقول ما سمعتم من مقالتي اھ ص ۳۰۱ والبسط
فی الاعلاء (ص ۵۹ و ۶۰ و ۶۱ ج ۲) ۷ رجب ۱۲۵۵ھ

مرض طاعون میں اذان دینا | سوال (۶) مرض طاعون میں جو اکثر آدمی مسجدوں
مشرع ہے یا نہیں؟ میں اذانیں دیتے ہیں، یہ شرع کے خلاف ہے یا موافق ہے، ایک

مولوی صاحب حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ کے بابت فرماتے ہیں کہ ان کا
توفیقی ہے اذانوں کا، کیا یہ بات صحیح ہے اور ان کا فتویٰ ہی؟ جواب فرمادیں،

الجواب: قال الشامي عن حاشية البحر للخير الرملي رأيت في كتب الشافعية
انه قد سبق الاذان لغير الصلوة كما في اذان المولد والمهوم والمصرع والغضب
ومن ساء خلقه من انسان او بهيمة وعند من رحم الجيش وعند الحرابي و
عند تغول الفيلان اى عند تمرد الجن لخبر صحيح فيه اقول ولا بعد فيه
عندنا اى لان ما صح فيه الخبر بلا معارض فهو من ذهب للمجتهد وان لم
ينص عليه اھ (ص ۳۹۹ ج ۱) بعض علماء نے تغول غیلان کی حدیث سے طاعون کے لئے
اذان کو مشروع کہا ہے، مگر ہم کو اس میں کلام ہے، ہمارے نزدیک تغول غیلان سے مراد یہ
ہے کہ کوئی ایسی صورت نمودار ہو جس میں جنات کا سامنے موجود ہونا اور غلبہ و تمرد کرنا محسوس
ہو، جیسا کہ رات کو سفر کرتے ہوئے بعض دفعہ جنگلوں میں جنات کی آوازیں یا ڈراونی شکلیں
نظر آ کر تھیں، اس وقت اذان دینا مشروع ہے، اور طاعون میں جنات کا وجود اور غلبہ
محسوس نہیں ہوتا، بلکہ محض سمعاً و نقلاً معلوم ہوا ہے، واللہ اعلم، قلت ویؤید قول الشیخ
فی القاموس ومجمع البحار من تفسیر القول بالتلون بصور شتی وايضا فان فی
الاذان فی هذه الحالة تشویشا وتغلیطا وايضا فیه تھویل للناس فانهم اذا
سموا الاذانات بکثرة یفرعون ویترھمون ان الرباء شدیدة فی البلد حتی
سقط حمل بعض الخول بذلک قالہ الشیخ لا یقال ان لم یعتقد سنیة هذا
الاذان مستدلا بالحديث المنکور لکونه محسورا علی ظهور الجن بل اذن سنیة
الرقیة ینبغی ان یجوز قلنا ان العوام تعتقدہ من الامور الشرعیة الدینیة كما
هو شاهد من احوالهم ومن لم یعرف حال اهل زمانہ فهو جاهل فانهم، حریر الاحقاص
ظفر احمد عفا عنہ ۲۱ شوال ۱۲۵۵ھ، نعم التحقیق بقول حقیق، کتبہ الخرف علی، ۲۳ شوال ۱۲۵۵ھ

مسجد میں تلاوت کرنے والے کو | سوال (۲۱)، تالی القرآن فی المسجد کو خواہ عامی ہو یا عالم جو آ
جواب اذان افضل ہو یا تلاوت؟ | الاذان افضل ہو یا مشغولی تلاوت؟

الجواب؛ جواب اذان افضل ہے، فی الدر المختار (ویجب) وجوباً وقال
الحلواني ندباً والواجب الاجابة بالقدم (من سمع الاذان) ولو جنباً لاحتضا
نفساء وسامع خطبته وفي صلاة جنازة وجماع ومستراح واكل وتعليم علم
وتعلمه بخلاف قرآن وقال الشامي تحت قوله بخلاف قرآن لانه لا يفوت
جوهره ولعله لان تكرار القرآن إنما هو للاجر فلا يفوت بالاجابة بخلاف
التعلم فعلى هذا الويقر تعليم او تعلم لا يقع سائغاً في (ص ۱۳۴) وقال الشافعي
ايضا ص ۱۳۲ ر ولو بسجد لا اى لا يجب قطعها بالمعنى الذى ذكرناه
انفا فلا ينافى ما قدمه من ان اجابة اللسان مندوبة عند الحلواني وفي الصفحة
المذكورة ايضا بعد نقل حديث عن الطحاوي فهذه قرينة صارفة للامر عن
الوجوب وبه تأيد ما صرح به جماعة من اصحابنا من عدم وجوب الاجابة
باللسان وانما مستحبة وهذا ظاهر في ترجيح قول الحلواني وعليه مشي في
الخانية والفيض الخ، ۲۱ ر ذى الحجة سنة ۱۲۸۵

تحقیق وقت قیام امام | سوال (۱۸)
وقوم برائے نماز،

..... زید و بکر دو عالم سنی المذہب آپس میں مختلف ہو گئے ہیں
دونوں کے دلائل لکھے جاتے ہیں جو حق و انصاف ہو اس کو تحریر فرمائیں، واحکم بینہما بالحق،
زید کا قول ہے کہ تکبیر ہوتے وقت امام و مقتدی کو بیٹھے رہنا اور حی علی الفلاح سن کر کھڑے
ہونا مستحب ہے اور شروع تکبیر سے کھڑے رہنا مکروہ ہے (عالمگیری وغیرہ کتب فقہیہ)
بکر کا قول ہے کہ یہ مسئلہ عام نہیں بلکہ خاص اس صورت میں ہے جبکہ امام و مقتدی محراب
کے قریب ہوں، اور اگر محراب سے دور ہوں تو جب امام محراب کی طرف چلے اور جس صف کے
پاس پہنچے اس صف کے لوگ کھڑے ہوتے جائیں، اور اگر آگے سے آیا تو امام پر نظر پڑتے ہی
سب کھڑے ہو جائیں، جیسا کہ البحر الرائق، در مختار، مجمع الزہر، مراقی الفلاح، عالمگیری

۵۵ حکذا فی الاصل والصیحیح ۱۲ منہ

دیگرہ وغیرہ میں کمال تشریح سے مذکور ہے، عبارت بحر الرائق و در مختار یہ ہے ان کان الامام بقرب المحراب والا فبقوم کل صف ينتهي اليه الامام على الاظهر وان دخل من قدام قوامين يقع بصهم عليه الخ اور بکریہ بھی کہتا ہے کہ شروع تکبیر سے کھڑے رہنا مکروہ بھی نہیں، علامہ طحاوی حنفی حاشیہ در مختار میں فرماتے ہیں الظاهر انه احتراز عن التأخير لا التقديم حتى لو قام اول الإقامة لباس، اور شروع سے کھڑے رہنا کیونکر مکروہ کہا جاسکتا ہے جبکہ عموماً صحابہ کرام شروع سے کھڑے رہا کرتے تھے، چنانچہ بخاری و مسلم کی متعدد حدیثوں سے ایک حدیث بخاری یہ ہے اقيمت الصلوة فسوى الناس صفوفهم فخرج رسول الله صلى الله عليه وسلم فقدم، فتح الباری میں بروایت ابن شہاب ہر ان الناس كانوا ساعة يقول المؤذن الله اكبر يقومون الى الصلوة فلا ياتي النبي صلى الله عليه وسلم مقامه حتى تعدل الصفوف، ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام اللہ اکبر... سننے کے ساتھ کھڑے ہو جاتے تھے، اور حضور تشریف لانے کے ساتھ ہی مصلے پر کھڑے ہو جاتے، چنانچہ لفظ بخاری فخرج اور فقدم سے ظاہر ہے، اور فقہائے کرام نے جو حی علی الفلاح پر کھڑے ہونے کو لکھا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص شروع سے نہ کھڑا ہوا ہو تو اب اس لفظ پر کھڑے ہو جانا اسے مستحب ہے، جیسا کہ علامہ طحاوی حنفی نے تصریح کر دی۔ الظاهر انه احتراز عن التأخير لا التقديم، غرض حی علی الفلاح تک بیٹھنا شرعاً مطلوب ہے مندوب نہیں ہے، اسی وجہ سے محققین فقہاء نے قیام عند حی الفلاح کو مندوب لکھا ہے کسی نے قعود الی حی علی الفلاح کو مندوب نہیں لکھا، اور حدیث وفقہ میں اسی صورت سے مطابقت ہو سکتی ہے

بکر کہتا ہے کہ اگر لاکھوں صحابہ کرام سے کسی صحابی نے کبھی حی علی الفلاح تک قعود کیا تو بے شک قعود کرنا بہتر ہوگا، ورنہ صرف جائز یا مباح کہا جائے گا، اور شروع سے کھڑے رہنے کو ہرگز مکروہ نہ کہا جائے گا، اگرچہ عالمگیری میں مکروہ لکھا ہے، مگر بے دلیل ہے، لہذا قابل تسلیم نہیں، دیکھو اسی عالمگیری میں صیام سستہ سوال کو بروایت حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ مکروہ لکھا ہے، حالانکہ بے دلیل ہے، دو سکر فقہاء نے اس مسئلہ عالمگیری کو تسلیم نہ فرمایا اور عام طور پر صیام سستہ کو مستحب و مندوب لکھا ہے، اور فقہ

میں بہت ایسے مسائل ہیں کہ کسی نے مکروہ لکھ دیا، مگر محققین فقہاء کے نزدیک اس کی کوئی دلیل نہ ملی، لہذا اس کی کراہت تسلیم نہ فرمائی، شامی و بحر وغیرہ میں کثرت سے اس قسم کی عبارت ملتی ہے لا یلزم منه الکراہۃ اذ لا بد لہا من دلیل، اگر تھوڑی دیر کیلئے ظاہر عبارات حضرات فقہاء کرام سے حی علی الفلاح تک بیٹھنے کو مستحب سمجھ لیا جائے جب بھی شروع سے کھڑے رہنا فقہاء کے طور پر مکروہ نہ ہوگا، کیونکہ ترک مستحب سے کراہت نہیں لازم آتی ہے، بحر الرائق جلد ۱ میں ہے لا یلزم من ترک المستحب ثبوت الکراہۃ اذ لا بد لہا من دلیل خاص، غرض اصول و ضوابط فقہیہ حنفیہ سے شروع سے کھڑے ہونے کی کراہت نہیں ثابت ہو سکتی،

بکرنے اس کے متعلق ایک رسالہ مدلل و مفصل لکھا ہے جس کا نام "الکلام المحکم فی قیام الامام والموتم" ہے، لہذا آپ دونوں میں غور فرما کر جو حق ہو اس کو تحریر فرمائیں، خلاصہ قول بکریہ کہ شروع سے نہ قیام مکروہ نہ قعود مستحب بلکہ اگر بیٹھا رہا تو حی علی الفلاح سن کر کھڑے ہونا مستحب ہی،

در مسئلہ مسئلہ؛ بکر کا معمول ہے کہ وضو اور سنتوں سے فارغ ہو کر مسجد میں اسے وقت آتا ہے کہ لوگ وضو اور سنتوں سے فارغ رہتے ہیں یا قریب فارغ ہونے کے رہتے ہیں، تو آنے کے ساتھ ہی مصلے پر کھڑا ہو جاتا ہے، اور اس کو سنت کریمہ جانتا ہی جیسا کہ بخاری میں ہے فخرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتقدم اور مسلم میں فاتی مقام مقامہ سے ثابت ہے، اور اس کے بعد تکبیر شروع ہوتی ہے تو بکر اپنے مقتدیوں کہتا ہے کہ اس صورت میں سب مقتدیوں کو کھڑے ہو جانا چاہئے، جیسا کہ عبارات فقہیہ مذکورہ سے ثابت ہے والا فیقوم کل صفت ینتہی الیہ الامام، و نیز حدیث صحیح لا تقوٰوا حتی یردنی، سے بھی مقتدیوں کا قیام کرنا سنت ہے، زید کہتا ہے کہ اس امام کو بھی اگر مصلے پر بیٹھ جانا چاہئے اور حی علی الفلاح پر کھڑے ہونا چاہئے، بکر کہتا ہے کہ اس وقت بیٹھنے کے لئے کسی فقیہ نے تصریح نہ کی، لہذا قابل تسلیم نہیں، بلکہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نے فتاویٰ رضویہ جلد دوم صفحہ ۵۰۸ میں ایسے امام کے لئے فرمایا "اسے بیٹھنے کی بھی حاجت نہیں مصلے پر جائے اور حی علی الفلاح یا ختم تکبیر پر تکبیر تحریمہ کہے" اور صفحہ ۳۷۲ میں فرماتے ہیں "پھر جب امام آئے اور تکبیر شروع ہو، اس وقت دو صورتیں ہیں، اگر امام صوفی

کی طرف سے داخل مسجد ہو تو جس صف سے گذرنا چاہے وہی صف کھڑی ہوئی جائے، اور اگر سامنے سے آئے تو اسے دیکھتے ہی سب کھڑے ہو جائیں۔

لہذا بکر کا یہ معمول فقہ حنفی اور فتاویٰ رضویہ کی تصریح کے موافق کیسا ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بکر جب مسجد میں آتا ہے اور دیکھتا ہے کہ مصلیٰ کم ہیں یا زیادہ تر لوگ وضو اور سنتوں میں مصروف ہیں تو قرب محراب میں بیٹھ جاتا ہے، اور لوگوں کے فارغ ہونے کا انتظار کرتا ہے اور اس انتظار کو بھی سنت نبویؐ جانتا ہے جب فارغ ہو جاتے ہیں تو تکبیر شروع کر دیتا ہے اور ظاہر الفاظ فقہیہ کے خیال اور مقامی علماء کے موافقت کے لحاظ سے تکبیر ہوتے وقت بیٹھا رہتا ہے، اور حتیٰ علی الفلاح سنکر کھڑا ہو جاتا ہے، اور اس بیٹھے رہنے کو دلائل مذکورہ کی رو سے صرف جائز و مباح جانتا ہے، پس بکر کا یہ عمل اور خیال کیسا ہے،

تیسرا مسئلہ: یہ ہے کہ زید بعد خطبہ جمعہ بھی جلوس کرتا ہے، اور حتیٰ علی الفلاح پر کھڑا ہوتا ہے، بکر کہتا ہے کہ اس وقت کے لئے کسی فقیہ نے جلوس کی تصریح نہ فرمائی، لہذا خطبہ کے بعد بیٹھنا چاہئے، بلکہ خطبہ سے فارغ ہو کر مصلیٰ پر کھڑا ہو جائے، چنانچہ حضرت فاضل بریلوی کے فتاویٰ رضویہ ج ۲ ص ۵۰۸ میں ہے: ”بعد خطبہ اسے اختیار ہے کہیں منقول نہیں کہ خطبہ فرما کر تکبیر ہونے تک جلوس فرماتے ہیں، یہ حکم قوم کے لئے ہے۔“

چوتھا مسئلہ: زید باوجود مستحب جلنے کے اس مسئلہ میں تشدد کرتا ہے، اور شروع سے کھڑے رہنے والے کو بار بار تاکید کر کے بٹھاتا ہے، بکر کہتا ہے کہ امر مستحب کے لئے یہ تشدد زیبا نہیں، اور نہ مستحب کی یہ شان ہے،

پانچواں مسئلہ: یہ ہے جس میں زید دیکر دونوں حیران ہیں کہ فقہ میں جہاں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ حتیٰ علی الفلاح پر کھڑے ہو جائیں وہاں امام و مقتدی دونوں کے واسطے لکھا ہے مگر حضرت فاضل بریلوی فتاویٰ رضویہ جلد دوم صفحہ ۵۰۹ میں لکھتے ہیں: ”یہ حکم قوم کے لئے ہے،“ پھر صفحہ ۵۱۱ میں ہے ”امام کے لئے اس میں خاص کوئی حکم نہیں مقتدیوں کو حکم ہے کہ تکبیر بیٹھ کر سنیں“ الخ پھر صفحہ ۵۱۳ میں ہے ”مقتدیوں کو حکم یہ ہے کہ تکبیر بیٹھ کر سنیں۔“

پس حضرت فاضل بریلوی کی یہ تخصیص قوم کی بظاہر عموماً کتب فقہیہ و نیز بہار شریعت کے تصریحات کے خلاف ہے، اور اس سے زیادہ حیرت یہ کہ بہار شریعت کے آخر میں حضرت فاضل بریلوی مدوح کی تصدیق موجود ہے، پس حضرات علماء کرام اسکی تحقیق

فرمائیں کہ کون صحیح ہے، بلا دلیل و حوالہ کتاب کوئی جواب نہ ہو، قال بکر ما كنت قاطعاً امرأ حتى افتوني في امری،

تفصیل الجواب | اقول وبالله التوفیق وهو الهادی وهو خیر رفیق،
قال العلامة البدر العینی فی شرحہ علی البخاری تحت حدیث
تحقیق الصواب | لا تقوموا حتى ترونی ما نصه قد اختلف السلف متى يقوم

الناس الى الصلوة فذهب مالك والجمهور الى انه ليس بقيامهم حد ولكن استعجب عامتهم القيام اذا اخذ المؤذن في الاقامة وكان انس رضى الله تعالى عنه يقوم اذا قال المؤذن "قد قامت الصلوة" وكبر الامام رواه ابن المنذر وغيره وكذا رواه سعيد بن منصور من طريق ابی اسحق عن اصحاب عبد الله قاله الحافظ في الفتح ص ۱۰۰ ج ۲ فهو حسن او صحيح على قاعدته (وحكاہ ابن ابی شیبہ عن سويد بن غفلة وقيس بن ابی حازم وحماد عن سعيد بن المسيب وعمر بن عبد العزيز اذا قال المؤذن الله اكبر وجب القيام واذا قال حي على الصلوة اعتدلت الصفوف واذا قال لا اله الا الله كبر الامام ذكره الحافظ في الفتح ايضا فهو حسن او صحيح على قاعدته) وذهبت عامة العلماء الى انه لا يكبر حتى يفرغ المؤذن من الاقامة وفي المصنف كبر هشام يعني ابن عروة ان يقوم حتى يقول المؤذن قد قامت الصلوة وعن يحيى بن وثاب اذا فرغ المؤذن كبر، وكان ابراهيم يقول اذا قامت الصلوة كبر ومن ذهب الشافعي وطائفة انه يستحب ان لا يقوم حتى يفرغ المؤذن من الاقامة وهو قول ابی يوسف وعن مالك رحمه الله السنة في الشروع في الصلوة بعد الاقامة وبداية استواء الصف وقال احمد اذا قال المؤذن قد قامت الصلوة يقوم وقال زفر اذا قال المؤذن قد قامت الصلوة مرة قاموا واذا قال ثانيا افتتحوا وقال ابو حنيفة ومحمد يقومون في الصف اذا قال حي على الصلوة فاذا قال قد قامت الصلوة كبر الامام لانه امين الشرع وقد اخبر بقيامها فيجب تصديقه واذا لم يكن الامام في المسجد فذهب الجمهور الى انهم لا يقومون حتى يروا امره ص ۱۰۱ ج ۲ قلت وقوله واذا لم يكن الامام في المسجد الخ اشارة الى ان الاختلاف المذكور سابقا في وقت القيام انما هو فيما اذا كان الامام في المسجد

وقال العافظ في الفتح اما حديث ابى هريرة (الذى اخرجها البخارى) بلفظ اقيمت
الصلوة فسرى الناس صفوفهم فخرج النبي صلى الله عليه وسلم ولفظه في مستخرج
ابى نعيم نصف الناس صفوفهم ثم خرج علينا ولفظه عند مسلم اقيمت الصلوة
فقمنا فعدلنا الصفوف قبل ان يخرج اليها النبي صلى الله عليه وسلم فيجمع
بينه وبين حديث ابى قتادة (لا تقوموا حتى ترونى) بان ذلك ربما وقع
لبيان الجواز وبان صنيعهم في حديث ابى هريرة ربما كان سبب النهى عن
ذلك في حديث ابى قتادة وانهم كانوا يقومون ساعة تقام الصلوة ولولم يخرج
النبي صلى الله عليه وسلم منهاهم عن ذلك لاحتمال ان يقع له شغل يبطئ
فيه عن الخروج فيشق عليهم انتظاره ام رص ۱۰۰ ج ۲ قلت وقد روى مسلم
عن جابر بن سمرة ان بلالا كان لا يقيم حتى يخرج النبي صلى الله عليه وسلم
فاذا خرج اقام الصلوة حين يراه ام رص ۲۲۱ ج ۱ ولعل فيه حكاية عن فعل
بلال بعد النهى المذكور في حديث ابى قتادة، وروى البزار عن عبد الله
ابن ابى اوفى مرفوعا قال كان بلال اذا قال قد قامت الصلوة نهض رسول الله
صلى الله عليه وسلم بالتكبير وفيه الحجاج بن فروخ ضعفه الهيثمى في
مجمع الزوائد (ص ۱۸۲ ج ۱) وذكره ابن حبان في الثقات كما في اللسان (ص ۱۴۹)
فهو حسن الحديث وقد تقدم عن انس انه كان يقوم اذا قال المؤذن قد قامت
الصلوة رواه ابن المنذر وغيره وسكت عنه العافظ في الفتح فهو حسن او صحيح
وهو محمول على ما اذا كان الامام في المسجد بقرب المحراب والمراد بالقيام القيام
بحقيقة الصلوة وهو بالتكبير للاحرام كما يشعر به لفظ البزار نهض بالتكبير
واما القيام من الجلوس فلا بد ان يتقدمه بشئ فثبت انه صلى الله عليه وسلم
كان يقوم في مصلاة عند قول المؤذن قد قامت الصلوة قبله بشئ وكذا فعله
انس فمارواه عبد الرزاق من ابن جريم عن ابن شهاب ان الناس كانوا
ساعة يقول المؤذن الله اكبر يقومون الى الصلوة فلا ياتي النبي صلى الله عليه
وسلم مقامه حتى تعتدل الصفوف كما في فتح الباري (ص ۱۰۰ ج ۶) يحصل
القيام فيه على القيام من مكان الجلوس لا القيام في الصف فكانوا يقومون

فی الصف عند قول المؤذن قد قامت الصلوة قبله بشئ کيلا تتضاد الآثار وان كان الظاهر منه القيام فی الصف کما لا يخفى، وبالجمله فحاصل الاحاديث ان الامام اذا كان فی المسجد بقرب المحراب فلا ينبغي للناس والامام ان يقوموا قبل الشروع فی الاقامة بل بعده اما ساعه يقول المؤذن الله اكبر او عند قوله قد قامت الصلوة قبله بشئ وان كان خارجا منه فلا يقوموا حتى يروه فاذا رآوه مقبلا الى المحراب قاموا ومقتضاه ان الامام اذا دخل المسجد وقد شرع المؤذن فی الاقامة لا يجلس فيه منتظرا قول المؤذن حتى على الصلوة او قد قامت الصلوة بل يستمر ذاهبا الى المصلی لانه بعد ان يؤمر الناس بالقيام لرؤية الامام ويؤمر هو بالجلوس كلا، واما ما قاله الفقهاء من كراهة السمود فمعناه انتظار الناس الامام قياما قبل رؤيتهم اياه مقبلا الى المحراب وهو معنى قول على بن ابي اركم سامدين يؤيده ما رواه ابو داود عن كهسب باسناد رجاله موثقون انه قال قمنا الى الصلوة بمئى والامام لم يخرج فبعد بعضنا فقال لى شيخ من اهل الكوفة ما يقعد لك قلت ابن بريفة قال هذا السمخوام (ص ۱۳۲۱۳) فالسمخوان ينتظروا الامام قياما قبل خروجه وقبل رؤيتهم اياه مقبلا عليهم وقال الحافظ المحجة ابن قدامة الحنبلى فى المغنى يستحب ان يقوم الى الصلوة عند قول المؤذن قد قامت الصلوة وبهذا قال مالك قال ابن المنذر على هذا اهل الحرمين وقال الشافعى يقوم اذا فرغ المؤذن من الاقامة وكان عمر بن عبد العزيز و محمد بن كعب وسالم وابوقلابه والزهرى وعطاء يقومون فى اول بدوة من الاقامة رقلت وعليه العمل اليوم فى الديار والامصار بلا انكار (۱۲) و قال ابو حنيفة يقوم اذا قال حتى على الصلوة فاذا قال قد قامت الصلوة كبرو كان اصحاب عبد الله يكبرون اذا قال المؤذن قد قامت الصلوة وبه قال سويد بن غفلة والنخعى ولا يستحب عندنا ان يكبروا بعد فراغه من الاقامة وهو قول الحسن ويحيى بن وثاب واستحق ولى يوسف والشافعى وعليه جل الائمة فى الامصار واذا ثبت هذا فانما يقوم المأمومون اذا كان الامام فى المسجد او قريبا منه وان لم يكن فى مقامه فان اقيمت والامام

فی غیر المسجد ولم یعلموا قربه لم یقوموا لما روى ابو قتادة قال قال رسول الله
 صلى الله عليه وسلم اذا اقيمت الصلوة فلا تقوموا حتى ترونى متفق عليه
 والبخارى قد خرجت وخروج على والناس ينظرونه قياما للصلوة فقال ما الى
 ازكم سامدين ام ملخصا رص، ۵۰، ۵۰، ۱۱۳، ۵۰، ۱۱۳، وقال فى الدر فى آداب الصلوة و
 القيام الامام وموتى حين قبل على الفلاح خلا قال زفر فعندة عند حى الصلوة
 ان كان الامام بقرب المحراب والاروان لم يكن بقرب المحراب بان كان فى موضع
 اخر من المسجد او خارجه ودخل من خلف ۱۲ شامى، فيقوم كل صف يستهوى اليه
 الامام على الاظهر وان دخل من قدام قاموا حين يقع بصرهم عليه ام رطب ۱۲۹۹
 وقال محمد فى الآثار اخبرنا ابو حنيفة عن طلحة بن مصرف عن ابراهيم انه
 قال اذا قال المؤذن حى على الفلاح فينبغي للقوم ان يقوموا للصلوة فاذا قال قد
 قامت الصلوة كبر الامام اخرجته محمد فى الآثار ثم قال وبه ناخذ وهو قول
 ابى حنيفة فان كف الامام حتى فرغ المؤذن من الاقامة ثم كبر فلا بأس ايضا
 كل ذلك حسن ام قلت وقول ابراهيم حجة عندنا لكونه لسان ابن مسعود
 واصحابه وقد تقدم فى قول الحافظ ابن قدامة ان اصحاب عبد الله كانوا
 يكبرون عند قول المؤذن قد قامت الصلوة والظاهر انهم اخذوا ذلك عن
 عبد الله رضى الله عنه وقد ظهر من قول محمد ان الشروع عند قوله قد
 قامت الصلوة ليس من الواجبات بل من الآداب فقط فلو شرع بعد الاقامة
 كان حسنا ايضا قلت وكذلك القيام عند قوله حى على الصلوة من الآداب ايضا
 كما يشعر به صنيع الفقهاء فانهم لم يذكروا فى السنن ولا فى الواجبات بل
 ذكروا فى الآداب فقط فلو قاموا عند بدو الاقامة فلا بأس به وكان ذلك
 حسنا ولذا قال الطحاوى فى حاشية الدر تحت قوله والقيام لامام وموتى

عنه قلت ليس لفظ قد خرجت عند البخارى بل هو عند مسلم وغيره قلعه من زلة القلم ۱۲ منه
 عنه وفى بعض الروايات عكس هذا فعند الثلاثة عند حى على الصلوة وعند زفر عند حى
 على الفلاح والصحيح عن زفر ان يقوم عند قد قامت الصلوة ۱۲ منه

حين قيل على الفلاح الخ مانصه الظاهر انه احتراز عن التأخير لا التقديم حتى
 لو قام اول الاقامة لابأس وحرراه (ص ۳۳۱ ج ۱) ولكنه قال في حاشيته على مرقى
 الفلاح تحت قول الماتن ومن الادب القيام (اي قيام القوم والامام ان كان حاضرا
 بقرب المحراب حين قيل اي وقت قول المقيم على الفلاح لانه امر به فيجاء
 وان لم يكن (الامام) حاضر يقوم كل صف ينتهي اليه الامام في الاظهرام مانصه
 واذا اخذ المؤذن في الاقامة ودخل رجل المسجد فانه يقعد ولا ينتظر قائما
 فانه مكروه كما في المضممرات قمتا في ويفهم منه كراهة القيام ابتداء الاقامة
 والناس عنه غافلون (ص ۱۶۱) ويمكن التطبيق بين قوليه ان قوله في حاشية
 الدرر محمول على ما اذا كان الامام حاضرا في بد والاقامة فلا بأس بالقيام من
 ابتداء الاقامة وقوله في حاشية المرقى محمول على ما اذا لم يكن الامام حاضرا وقت الاقامة لا ينبغي القيام الا ان يأتي
 الامام ويشعر بلفظ المفضل ولا ينتظر قائما ومعناه فانه اعلم ان لا ينتظر الامام قائما فافهم، واما
 حكم الاقامة لصلوة الجمعة فللمؤمنين ان يقوموا عند قوله على الفلاح
 او حتى على الصلوة ولو قاموا عند بد والاقامة فلا بأس به وذلك حسن ايضا كما مر
 وللامام ما ذكره في الدرر ويؤذن ثانيا بين يديه اي الخطيب اذا جلس على المنبر
 فاذا اتم اقيمت له قال الشامي اقيمت بحيث يتصل اول الاقامة بآخر الخطبة و
 تنتهي الاقامة بقيام الخطيب في مقام الصلوة (ص ۸۶۰ ج ۱) ومفاده ان
 الخطيب يستمر قائما عند الاقامة ولا يجلس منتظرا قول المؤذن حتى على الصلوة
 وهذا ظاهر وعليه العمل في ديار الاسلام والله اعلم

خلاصہ ان تمام روایات کا یہ ہے کہ اگر امام وقت اقامت کے مسجد میں قریب محراب
 کے بیٹھا ہوا ہو، تو فقہاء حنفیہ کے نزدیک مستحب یہ ہے کہ شروع تکبیر پر قیام نہ کریں نہ
 امام نہ قوم بلکہ حتیٰ علی الصلوة یا حتی علی الفلاح یا قد قامت الصلوة پر کھڑے ہوں (علی
 اختلاف الاقوال بین الائمة وزفر کما مر) اور اگر شروع اقامت ہی پر کھڑے ہو جائیں تو یہ بھی
 بہتر ہے اور مباح ہے، اور بہت سے تابعین کا اس پر عمل تھا، پس اس کو مکروہ نہیں کہا
 جاسکتا، کیونکہ کراہت پر کوئی دلیل نہیں، اور بعض عبارات فقہیہ میں جو اس کو مکروہ
 لکھا ہے، اس کا محمل یہ ہے کہ اگر شروع اقامت میں امام حاضر نہ ہو تو اس کے انتظار میں

قیام مکروہ ہے، اور اگر امام موجود ہو اور وہ شروع اقامت ہی پر کھڑا ہو گیا ہو تو مقتدیوں کو بھی کھڑا ہونا چاہئے، اور یہ مکروہ نہیں، نہ امام کے لئے نہ مقتدیوں کے لئے، گو ادلی یہ تھا کہ سب کے سب حی علی الصلوٰۃ پر کھڑے ہوتے،

اور اگر امام وقت اقامت کے مسجد میں اور قرب محراب میں موجود نہ ہو تو جب تک امام کو آتا ہوا نہ دیکھیں سب لوگ بیٹھیں رہیں، خواہ اقامت پوری ہی ہو جائے، غرض اس وقت امام کو بدون دیکھے کھڑا ہونا مکروہ ہے، وهو داخل فی السمود وهو الذی نفی عنہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی حدیث ابی قتادہ اذا اقامت الصلوٰۃ فلا تقوموا حتی ترونی، اور اگر امام اقامت سے پہلے مصلے پر پہنچ جائے تو اس صورت میں مقتدیوں کو اقامت شروع ہونے کے بعد حی علی الصلوٰۃ یا قد قامت الصلوٰۃ پر کھڑا ہونا چاہئے، اور شروع اقامت پر کھڑے ہو جائیں، تو یہ بھی اچھا ہے، لیکن اقامت سے پہلے کھڑے نہ ہوں،

اور بکر کا یہ فعل کہ وہ اقامت سے پہلے مصلے پر پہنچ جاتا ہے پھر تکبیر شروع ہوتی ہے سنت کے موافق نہیں، حضور کی عادت شریفہ یہ تھی کہ جب آپ حجرہ سے نکلتے بلا ل اُسی وقت تکبیر شروع کر دیتے تھے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ختم اقامت یا وسط اقامت میں مصلے پر پہنچتے تھے، غرض اقامت شروع ہونے سے پہلے امام اور قوم دونوں کو مصلے پر کھڑا نہ ہونا چاہئے کہ اس کا ثبوت فعل سلف اور آثار مرفوعہ وغیرہ سے نہیں ملتا،

اور جمعہ کی نماز میں مقتدیوں کو حی علی الصلوٰۃ یا شروع اقامت پر کھڑا ہونا چاہئے، اور امام مؤذن کو یہ تعلیم کرے کہ وہ اقامت خطبہ ختم ہونے کے قریب اس طرح شروع کر دیا کرے کہ امام خطبہ ختم کر کے جب مصلے پر پہنچے تو اقامت ختم ہو جائے، یہ مستحب ہے، اس سے معلوم ہوا کہ امام کو خطبہ ختم کر کے بیٹھنا مستحب نہیں، اور اگر مؤذن ختم خطبہ سے پہلے اقامت شروع نہ کرے جب بھی اس وقت امام کے لئے جلوس ثابت نہیں بلکہ وہ کھڑا ہی رہے، خواہ منبر پر، اور ختم اقامت کے قریب مصلے پر پہنچے، یا خطبہ ختم کر کے مصلے پر ہی کھڑا ہو جائے، یہاں تک سائل کے سوال اول و دوم و سوم کا جواب ہو گیا، چوتھے مسئلہ کا جواب یہ ہے کہ زید کا یہ فعل کہ وہ مقتدیوں کو شروع تکبیر پر کھڑے ہونے سے منع کرتا اور بیٹھلا تا ہے تشدد غیر مرضی اور غلو فی الدین ہے، کیونکہ حی علی الصلاح پر کھڑا ہونا محض ادب ہے، اور شروع اقامت پر کھڑا ہونا بھی سلف سے ثابت ہے، اس سے منع کرنے کی کوئی وجہ نہیں،

پانچویں مسئلہ کا جواب یہ ہے کہ فتاویٰ رضویہ میں قیام علیٰ حی علی الصلوٰۃ کو امام کے ساتھ خاص کرنا نصوص فقہیہ کے خلاف ہے، بلکہ یہ حکم سب کے لئے ہے، یہ اور بات ہے کہ حکم سنت ہے یا محض ادب، سو عبارات فقہاء میں اس کی تصریح ہے کہ محض ادب ہے، اور مشروع اقامت سے ہی سب کھڑے ہو جائیں تو جائز ہے اور یہ بھی حسن ہے، مگر خواہ مشروع اقامت پر کھڑے ہونے کا حکم ہو یا حی علی الصلوٰۃ پر دونوں حکم امام اور مقتدی سب کے لئے ہیں، پس فتاویٰ رضویہ کی یہ تقیید و تخصیص صحیح نہیں، اور اس کا قول بلا دلیل قابل تسلیم نہیں، واللہ اعلم، ۲۳، محرم ۱۴۲۸ھ

جمعہ کی اذان ثانی کا جواب دینا جائز | سوال (۹) جمعہ میں اذان ثانی کا جواب دینا اور اذان کی ہے مگر دعاء کرنا جائز نہیں، دعاء پڑھنا از روئے مذہب حنفیہ جائز ہے یا نہیں، حضرت

مولانا عبدالحی صاحب مرحوم لکھنوی نے سعایہ فی کشف شرح الوقایہ میں اس کے متعلق بہت بحث کی ہے، اور آخر میں اپنی رائے سے یہ لکھا ہے کہ جواب دینا جائز ہے، لہذا آپ کے امید کرتا ہوں کہ اس کے متعلق کافی بحث کریں گے، بندہ اب تک جواب نہیں دیتا اور نہ دعاء پڑھتا ہے، لیکن سعایہ کے دیکھنے سے اب شبہ پڑ گیا ہے،

الجواب؛ جمعہ کی اذان ثانی کا جواب دینا تو جائز ہے، کیونکہ وہ قبل از خطبہ ہے، مگر اذان کے بعد دعاء پڑھنا جائز نہیں، کیونکہ وہ خطبہ کا وقت ہے، وکلام الامام یقطع سائر انواع الکلام والبسط فی اعلاء السنن (ص ۶۰ ج ۲)، ۲، شعبان ۱۴۲۸ھ

استفتاء متعلق ادائیگی | سوال (۱۰) اذان اور اقامت میں اگر اللہ اکبر کی راہ کو اللہ سے ملا دیا کلمات اذان و اقامت جائے، اور اسی طرح اور کلمات کو ساکن نہ کرتے ہوئے اُن کے اعراب کو ظاہر کیا جائے تو جائز ہے یا نہیں، میرے ناقص خیال سے جائز ہونا چاہئے؟

الجواب؛ اذان اور اقامت کے کلمات میں سکون و دقت مطلوب ہے، حرکت کا اظہار نہیں چاہئے، و فی الامداد و حیزم الرار فی التکبیر ای یسکنا قال الزیلعی یعنی علی الوقف لکن فی الاذان حقیقۃ و فی الاقامۃ ینوی الوقف اعمای للحدیث شامی (ج ۲)، واللہ اعلم، ۲، شعبان ۱۴۲۸ھ

رفع طاعون کے لئے اذانیں | سوال (۱۱) طاعون کمرض کے وقت اکثر عوام میں اذانوں کا رواج دینا مشروع ہے یا نہیں؟ ہے، اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب؛ حدیث میں تغول غیلان کے وقت اذان کو مندوب فرمایا ہے، اور طاعون

میں و خزانہ انما من الحج ثابت ہے، اس لئے بعض نے کہلے کہ رفع طاعون کے لئے بکثرت اذانیں دینے کا مضائقہ نہیں، مگر صورت یہ ہونی چاہئے کہ اوقات اذان ہی میں اور ایام سے کچھ زیادہ آدمیوں نے اذان پڑھ دی، اور یہ صورت متعارف ہے کہ غیر اوقات اذان و صلوٰۃ میں بکثرت اذان دی جاتی ہے اس میں تشویش علی الناس ہے، اس لئے قابل ترک ہے اور بعض کے نزدیک اس و خزانہ کو تغول پر قیاس کرنا جائز نہیں، اس لئے کہ تغول میں ظہور ہوتا ہے جس کا کوئی وقت نہیں، اس لئے فوراً اذان کی ضرورت ہوتی ہے، اور و خزانہ میں کوئی خاص وقت ظہور کا نہیں، اس لئے وقتی اذانیں بھی برکت کے لئے کافی ہیں، مستقیلاً اذان کی کوئی دلیل نہیں، لہذا یہ بدعت ہوتی جس کا ترک واجب ہے، یہ دونوں قول ہیں، اور اقویٰ دلیل سے ثانی ہے، لہذا اسی پر عمل کرنا چاہئے، واللہ اعلم، ۲۴ شوال ۱۴۲۷ھ

اذان جمعہ کیلئے نقارہ بجانا اور سوال (۱۲)..... اس کے متعلق چند سوالات

..... آجکل دیہاتوں میں یہ قاعدہ ہے اختیار کیا ہے کہ ہر ایک مسجد میں ایک ایک نقارہ رکھا ہوا ہے، اس واسطے کہ جمعہ کے روز اس کو واسطے اعلان نماز جمعہ کے بجایا جاوے، کیونکہ اکثر لوگ دیہاتوں کے باہر کھیتوں میں دور دور ہوتے ہیں، اذان کی آواز وہاں تک نہیں پہنچ سکتی ہے، اس وجہ سے مسجدوں میں نقارے رکھے گئے ہیں، اس واسطے وہ نقارہ جمعہ کے روز اور روزہ افطاری کے وقت اور سحری کے وقت بجایا جاتا ہے، اور مسجد کے روپے سے وہ نقارہ بنایا گیا ہے، سو اس طرح یہ نقارہ بجانا اعلان کے واسطے اور مسجد کے روپے سے اس کو بنانا جائز ہے کہ نہیں اور اس کو جائز جاننا کیسا ہے؟

دوسرے بیماری طاعون کے واسطے اس نقارے پر ایک دعا لکھ کر اس کو بجایا جاتا ہے، اس واسطے کہ اس کی آواز جہاں تک جائے گی بیماری طاعون ہو جائے گی، اس طرح بجانا اور اس کو جائز جاننا کیسا ہے، اور نقارہ کو مسجد کے اندر رکھنا اور بجانا کیسا ہے، خلاصہ جواب باصواب مع حوالہ کتب احادیث کے مرحمت فرمادیں، بینوا و توجروا، فقط،

الجواب: افطار اور سحری کے لئے تو نقارہ بجانا جائز ہے، لیکن اذان جمعہ کی اطلاع کے لئے جائز نہیں، کیونکہ اس صورت میں نقارہ سے اذان کا کام لینا لازم آئے گا، اور یہ حد کے خلاف ہے، فانہ صلی اللہ علیہ وسلم اهتم اولاً بان یضرب الناقوس

او البوق فترکہ حذر عن التشبه بالكفار فلا يجوز لنا احداث ما تركه النبي صلى الله عليه وسلم لاعلام الصلوٰۃ، دوسرے دیہات والوں کے ذمہ جمعہ کی نماز فرض نہیں تو ان کو اطلاع کی ضرورت ہی کیا ہے جو شخص بدون اطلاع کے آسکے پڑھ لے ورنہ خیر،

اور مسجد کے روپیہ سے نقارہ بنانا اس کی دو صورتیں ہیں ایک کہ لوگوں نے مسجد میں ایسی غرض سے روپیہ دیا ہو کہ اس سے نقارہ بنایا جائے، یہ صورت تو جائز ہے، ایک یہ کہ جو روپیہ مصارف مسجد کے لئے جمع تھا اس سے نقارہ بنایا جائے، یہ جائز نہیں، فقد صرح فی الخلاصہ انہ لا يجوز لقيم المسجد ان يشتري جنازة او تختا لغسل الاموات من مال المسجد،

اور طاعون کے زمانہ میں نقارہ پر دعا، کھ کر بجانا بھی جائز نہیں، لفساد عقیدۃ العوام فیہ، اور نقارہ کو مسجد کے اندر یا مسجد کی چھت پر رکھ کر بجانا بھی جائز نہیں، بلکہ جن مواقع میں بجانا جائز ہے اس وقت مسجد سے باہر رکھ کر بجا یا جائے اور نقارہ مسجد کو مسجد میں رکھنا اس شرط سے جائز ہے کہ اس کے رکھنے سے نمازیوں کو تنگی نہ ہوتی ہو، ورنہ باہر رکھا جائے، واللہ تعالیٰ اعلم، و شوال

اذان میں تثویب کی کیا صورت؟ سوال (۱۳) اذان میں تثویب کی کیا صورت ہے، اور تثویب کے معنی، کیا معنی ہیں؟

الجواب: اذان میں تثویب مسنون تو یہ ہے کہ اذان فجر میں الصلوٰۃ خیر من النوم اضافہ کیا جائے، اور تثویب مبتدع ایک تو اذان میں ہے کہ حتیٰ علیٰ خیر العمل اضافہ کیا جائے جیسار و افض کرتے ہیں، اور ایک ما بین الاذان والاقامۃ ہے کہ مؤذن نھوڑی دیر میں ... الصلوٰۃ جامعۃ یا الصلوٰۃ الصلوٰۃ رحمکم اللہ پکارتا ہے، یہ دونوں بدعت و مکروہ ہیں، واللہ اشد ابتداء و کراہۃ

سوال (۱۴) مسجد کے اندر جواب اذان دینا واجب ہی یا نہیں، جو شخص مسجد میں ہو اس کو جواب اذان دینا واجب ہی یا نہیں؟ کیونکہ کتاب القول المتین میں لکھا ہے کہ جواب دینا ضروری نہیں ہے، اگر جواب دے تو صواب ہے،

الجواب: بیشک اس صورت میں جواب دینا ضروری نہیں، البتہ مستحب ہے، لہذا بلا وجہ ترک کرنا بہتر نہیں، واللہ اعلم، کتبہ الاحقر عبد الکریم عفاعنہ
الجواب صحیح، ظفر احمد عفاعنہ ۱۰ شعبان ۱۴۲۸ھ

ایک شخص کا دو مسجدوں میں اذان دینا | سوال (۱۵)

..... ایک مسجد محلہ ہنود میں ہے، نہ وہاں پر مسافر کا گزر ہوتا ہے نہ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مسجد ہے، اور ایک شخص دوسری مسجد کا امام نماز کے بعد اس لئے اذان پڑھ دیتا ہے کہ یہ مسجد ویران نہ ہو، اور ہنود اس میں بڑی حرکت نہ کرنے پائیں،

الجواب؛ دو مسجدوں میں اذان کہنا ہے تو مکروہ، مگر چونکہ کسی مسجد میں اذان کا ترک ہو جانا موجب اندیشہ ہے، اس واسطے اس میں قواعد سے گنجائش ہو سکتی ہے، مگر کوئی جزئیہ نہیں ملا واللہ اعلم، احقر عبدالکریم عفی عنہ ۱۷ شوال ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح، ظفر احمد عفی عنہ

اذان سے متعلق چند سوالوں پر | سوال (۱۶) مکھوم مباد کہ اذان نماز پنجگانہ در مسجد دادن و مشتمل ایک استفتاء،
شباں گا چسراغ روشن کردن اگر جماعت نباشد و چون گاہی گردد و گاہی نہ گردد، پس حکم وارد و اذان محض بر جماعت مسنون است یا برائے مسجد نیز شرط است و چون گاہی ترک گردد چہ لازم آید و بعض مؤذنان ایں اطراف گاہ بگاہ بدعوت رد و آنجا نماز یا جماعت خواند پیش از آنجا آمدہ اذان دادہ بکار خویش مشغول شود، پس اذان دریں صورت مسنون است یا نہ، جملہ صور مفصلاً تحریر فرمودہ ممنون سازند،

الجواب؛ اذان در ہر مسجد سنت مؤکدہ مثل واجب ہست خواہ جماعت باشد یا شخصے تنہا نماز گزارد ولیکن اگر از محلہ ثانیہ آواز رسیدہ باشد آن کفایت کند و اذان کہے و نہ کہ نماز دریں مسجد گزارد و اذان شخصیکہ نماز بمسجد دیگر خواندہ است کراہت دارد و همچنین بعد اذان بمسجد دیگر رفتن ممنوع است کما قال الشامی (ص ۳۵ ج ۱) تحت قول الدر للفرانجی (الخمس) دخلت الجمعة بحرو و شمل حالة السفر والحضر الا افراد والجماعة قال في مواهب الرحمن ونور الايضاح ولو منفردا اداء او قضاء سفر او حضر او فيه ايضا تحت قوله كالواجب قال في النهر ولما ربحكم البلدة الواحدة اذا اتسعت اطرافها كمصر والظاهر ان اهل كل محلة يسمعون الاذان ولو من محلة اخرى يسقط عنهم لان لم يسمعوا ام والاضافه (ص ۳ ج ۱) تحت قوله (ويكره له ان يؤذن في مسجدين) لان الاذان للمكتوبة وهو في

عنه قلت علم من التعليل ان التاذين مكره لمن قد صلى سوا اذان في مسجد آخر ولا فافهم ۱۲ منہ

المسجد الثاني يصلي النافلة فلا ينبغي ان يدعوا الناس الى المكتوبة وهو لا يساعدهم فيها اهل بدائمه وفيه ايضا رص ۶۶۸ وكرهه) تحريما للنهي (خروج من لم يصل من مسجد اذن فيه) وليكن چراغ روشن کردن پس حکم آن نیا فتم کہ سنت است یا مستحب آرے ایں قدر معلوم است کہ ایں فعل از زمانہ قدیم متواتر است و نیز آنکہ دریں امر نیز جماعت را دخل نیست بلکہ بہر حال روشن کردن مساوی ہست خواہ در آن مسجد جماعت باشد خواہ منفرد نماز خواندہ شود، البتہ مسجدیکہ آمدن کسے در آن احتمال ندارد، چنانکہ بعض مساجد در خرابہ ہا باشد دریں چنین مسجد چراغ روشن کردن ندانم چہ حکم دارد، واللہ اعلم، ۲، ج ۱، ششم سوال (۱۴).....

اذان کے بعد گھنٹہ وغیرہ بجا کر

لوگوں کو نماز کے لئے بلانا مکروہ

اور بدعت ہے

..... ہمارے اس دیہات میں بعض نے ایسے رواج کر لیا کہ ہر نماز یا بعض نماز جیسے فجر و عصر و جمعہ کی اذان کے آگے یا پیچھے گھنٹے بجاتے ہیں، یا ٹین پر مارتے ہیں، تاکہ لوگوں کو نماز کے وقت کا ہونا..... یا جماعت شروع ہونا معلوم ہو تاکہ جلد مسجد کی طرف روانہ ہوں نماز کے باجماعت ادا کے لئے، بعض نے مسجد کے ساتھ ہی گھنٹہ لٹکایا اور ٹین کو لٹکایا، ان سے جب اس کی علت پوچھی گئی تو جواب دیا کہ گھنٹے و ٹین کی آواز بہت بلند ہے لوگ بہت دور سے سنتے ہیں کہ جہاں اذان کی آواز نہیں پہنچ سکتی بعض کہتے ہیں کہ فجر میں نیند سے بیداری کے لئے ایسا کیا جاتا ہے، غرضیکہ کسی صورت سے یہ نامشروع فعل جائز ہو سکتا ہے یا نہیں، نادان کا یہ خیال ہے کہ ایسا فعل قطعاً حرام ہوگا، کیونکہ اس سے اذان مسنونہ بالکل بیکار ہو جاتی ہے، اس کی کوئی حاجت ہی نہیں رہتی، اس پر اعتماد کر کے لوگ بھی گھنٹے کی آواز کی طرف تاک لگاتے رہتے ہیں، حالانکہ اذان کو ایسے بیکار چھوڑنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے، اور اس سے تشابہ بالکفار بھی لازم آتا ہے،

الجواب، صورت مسئلہ سوال مکروہ ہے اور بدعت، اس لئے اس سے احتراز لازم ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اعلان نماز کے لئے طریق اعلان نماز کی فکر ہوئی تو حضور نے ان سب طریقوں کو ناپسند فرمایا اور الہام و وحی کے بعد اذان کو اختیار فرمایا، اب اذان کے ساتھ دوسرے طریقے اعلان کے لئے اختیار کرنا بدعت ہے، وایضاً

ففي الجرس للعبادة مثل الصلوة تشبهاً بالمنور، البتة اگر اذان سے پہلے گھنٹہ اس واسطے بجایا جائے، تاکہ بستی والوں کو وقت کی اطلاع ہو جائے اور مؤذن وقت کو معلوم کر کے اذان دے، تو اس میں گنجائش ہے، لکن الجرس لغير الصلوة من بيان الاوقات وفيه سعة والله اعلم،
۱۵ ذیقعدہ ۱۳۸۵ھ

فصل فی احکام المسجد و آدابہ

مسجد میں سونے کا حکم | سوال (۱) بعض لوگ کہتے ہیں کہ علی العموم مسجد میں سونا جائز ہے، چنانچہ اس سونے کے دلائل حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ہمیشہ مسجد میں سونا ثابت کرتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ مسجد میں سونے سے بے ادبی تو ضرور ہوتی ہے، اور بعض منکرات بھی سونے والے سے وقوع میں آتے ہیں، گو بوجہ سوجانے کے کیوں نہ ہو، غالباً اسی وجہ سے بعض مولوی مسافر باوجود ملنے مکان کے اپنا رہنا ہنا اور خور و نوش مسجد ہی میں اختیار کرتے ہیں، منع کرنے پر یہ کہتے ہیں کہ دروازے پر جانے سے زقزق بقیق میں پڑنا ہوگا، حالانکہ مسجد میں جہالت کی باتوں کی پوری داد دی جاتی ہے، بہر حال مسجد میں سونا حنفیہ کے نزدیک کیسا ہے؟

الجواب؛ مسجد میں سونا معتکف اور اس مسافر کے سوا جس کو مکان نہ ملتا ہو باقی لوگوں کے لئے مکروہ ہے، قال فی الدرر واکل و نوم الا لمعتکف و غریب، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا فعل ضرورت پر محمول ہے قال الحافظ فی الفتح وروى عن ابن عباس کراهیۃ الا لمن یرید الصلوة وعن ابن مسعود مطلقاً وعن مالک التفصیل بین من لا مسکن فیکما و بین من لا مسکن له فیباح ۱۵

مسجد میں درزش کرنے کا حکم | سوال (۲) مسجد میں درزش کرنی یعنی ڈنڈہ مونگدرا اور کوئی ایسی ہی چیز یعنی تلوار وغیرہ کا چلانا جو واقعی درزش ہے مسجد کے اندر جائز ہے یا نہیں؟ بعض لوگ زنگیوں کے کھیلنے کو مسجد میں ثابت کر رہے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا دکھلانا یہ بھی حدیث سے ثبوت کو پہنچ رہا ہے، تو کیا اب بھی اس معنی کر کے مسجد کے اندر ایسے فعل کرنا جائز ہے، اور اگر نہیں تو آداب مسجد کے کیا معنی ہیں؟

الجواب؛ مسجد میں ڈنڈا اور منگدر سے درزش کرنا مکروہ ہے، لما ورد فی صحیح مسلم من قوله صلی اللہ علیہ وسلم لا اعرابی الذی بال فی المسجد ان هذه المسجد لا تصلم

لشئ من هذا البول ولا القذر انما هي لذكر الله تعالى والصلوة وقراءة القرآن ام
 رفتح الباری ج ۱ ص ۲۷۸) وفيه ايضا وظاهر الحصر من سياق مسلم في حديث انس
 انه لا يجوز في المسجد شئ غير ما ذكر من الصلوة والقرآن والذكر لكن الاجماع
 على ان مفهوم الحصر منه غير معمول به ولا ريب ان فعل غير المذكورات مافی معنا
 خلاف الاولى، والله اعلم (ص ۲۸۰ ج ۱)

ربا حبشه والوں کا مسجد میں نیسروں سے کھیلنا تو اس سے اگر مسجد میں ڈنڈ مگر کوجائے
 کیا جائے تو رقص کا بھی مسجد میں جائز ہونا لازم آئے گا، کیونکہ اسی قصہ میں یہ بھی وارد ہے
 کہ ایک حبشی عورت اُچھل کود رہی تھی اور اس کے گرد بچے تماشہ دیکھ رہے تھے، ففی رواية
 النسائي من طريق يزيد بن رومان عنهما سمعت لغطا وصوت وصبیان فقام النسبي
 صلى الله عليه وسلم فاذا حبشية تنزف ای ترقص والصبیان حولها (فتح الباری
 ج ۳ ص ۳۷۰) پس اس حدیث سے استدلال نہیں ہو سکتا، کیونکہ مسجد میں رقص کو کسی نے جائز
 نہیں کہا، اور نہ یہ اعدواہم ما استطعتم کی فرد ہے، پس ظاہر یہ ہے کہ یہ رقص اور لعب مسجد
 سے باہر تھا، اور کچھ تماشہ دیکھنے والے مسجد میں کھڑے ہوں گے، اس لئے راوی نے مجازاً یہ کہہ دیا
 کہ مسجد میں نیزوں سے کھیل رہے تھے، یعنی مسجد کے قریب،

دوسری بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کھیلنے والوں کو
 دھمکایا تھا، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عمر ان کو چھوڑو، یہ بنو ارفدہ ہیں،
 یعنی یہ لوگ کھیل کے عادی ہیں، خصوصاً ایام عید میں (اور وہ دن عید ہی کا تھا)، ام،
 محب طبری نے اس پر لکھا ہے کہ اس ارشاد میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان لوگوں کے
 لئے بعضی وہ باتیں معاف ہیں جو دوسروں کے لئے معاف نہیں ہیں، اور چونکہ اصل یہی ہے کہ
 مسجد کو لہو و لعب سے بچایا جائے اس لئے مورد نص پر مقتصر رہے گا ام زاذنی رواية الزهري
 عن عروة بن زهرهم عن عمر قال النبي صلى الله عليه وسلم يا عمر و زاذ ابو عوانة فقام
 بنو ارفدة قال المحب الطبري فيه تنبيه على انه يغتفرهم ما لا يغتفر لغيرهم

سے بظاہر یہ کو دنیوی نا بالغ اور نا سمجھ لڑکی تھی جیسا کہ سیاق سے معلوم ہوتا ہے، اس لئے حضور نے بچوں کا کھیل
 سمجھ کر اس کو منع نہ کیا ہوگا، یا وہ ایسی ہی باولی ہوگی وہ کوئی باقاعدہ رقص نہ تھا ۱۲ منہ

لان الاصل فی المساجد تنزیہا عن الجب فیقتصر علی ما ورد فیہ النص انتھی رفیع البیرونی
 ص ۳۰۳، ۳۰۴) ملخصاً، علاوہ ازیں قاعدہ یہ ہے کہ جب قول اور فعل اور تقریر میں تعارض ہو تاہی
 قول کو ترجیح ہوتی ہے، کیونکہ فعل اور تقریر میں خصوصیات کا احتمال ہو سکتا ہے، اور یہ واقعہ
 حدیث قولی کے خلاف ہے جو پہلے بروایت مسلم گذر چکی ہے، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے
 فرمایا ہے کہ مسجدیں تو صرف قراءت قرآن اور صلوٰۃ اور ذکر کے واسطے بنائی گئی ہیں، دوسری
 حدیث ابن ماجہ میں ہے جنبا و مساجدکم صبیانکم و محانیکم و شرائکم و بیعکم
 و خصوماتکم و رفع اصواتکم و اقامۃ حد و حکم و سل سبوفکم الخ حضور صلی اللہ
 علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اپنی مسجدوں کو بچوں سے اور پاگلوں سے بچاؤ نیز بیع و شرا سے
 اور جھگڑے و خصومت سے اور آواز بلند کرنے سے اور حدود قائم کرنے سے اور تلوار
 سونٹنے سے الخ اور یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے مگر اس کے طرق متعدد ہیں، جیسا کہ محدث سخاویؒ
 نے معاصر حسنہ (ص ۸۴) میں بیان فرمایا ہے، اور حدیث ضعیف تعدد طرق سے قابل احتجاج
 ہو جاتی ہے، نیز مسلم کی حدیث مذکور بھی اس کے لئے شاید صحیح ہی، پس بوقت تعارض یہ حدیث
 قولی اس واقعہ فعلی سے مقدم ہوگی، (لکھا ہو مسترر فی الاصول) لہذا ڈیوٹو مگر غیر کی ورزش مسجد
 میں مکروہ ہے، ۲۴ جمادی الاولیٰ (سہ)

مسجد میں گھنٹہ لگانا جائز ہے | سوال (۳) آجکل اکثر مسجدوں میں بڑی گھڑی آویزاں کی جاتی
 ہے، نمازوں کے وقتوں کے پہچاننے کے لئے اس میں سے بجنے کے وقت جو آواز نکلتی ہے یہ
 ممنوع تو نہیں ہے؟ کیونکہ بعض لوگ اس قول رحمہما جسرس شیطان کی وجہ سے مسجد میں
 ایسی گھڑی کار رکھنا منع کرتے ہیں، تو کیا یہ باہر ہو سکتا ہے یا نہیں، اور مسجد میں اس معنی
 کر کے گھڑی رکھنا چاہئے یا نہیں، اور یہ قول صحابی ہی یا احادیث رسول؟

الجواب: مع کل جسرس شیطان، یہ حدیث نبویؐ ہے، ابو داؤد میں حضرت
 عمر رضی اللہ عنہ سے منقطعاً مروی ہے (کذا فی الترغیب ص ۵۰۵) قال فی مجمع البحار
 جسرس بفتح تین وهو ما یعلق بعنق الدابة او برجل البانی والصبيان وكذا العجلاء
 جسرس کی مانعت حدیث میں دو جگہ وارد ہے، ایک عورتوں کے زیوروں میں کیونکہ اس سے
 مردوں کو آواز پہنچتی ہے، اور ان کے قلوب مائل ہوتے ہیں، دوسرے سفر میں جانوروں کی
 گردنوں میں یا گاڑی وغیرہ میں جو گھنٹہ یا گھنٹی ہوتی ہے اس کو منع کیا گیا ہے، جس کی علت

غالباً کفار کا شبہ ہے کہ وہ اپنی شان و شوکت کے اظہار کے لئے ایسا کرتے تھے، مسلمانوں کو ایسا نہ چاہئے، پس گھڑی میں جو گھنٹہ بجاتا ہے وہ جس ممنوع میں داخل نہیں، فقہانے سحری وغیرہ میں لوگوں کے جگانے کے لئے نثارہ کو جائز لکھا ہے، کیونکہ مقصود وقت کا بتلانا ہے اور مقصود نہیں، یہی مصلحت اس گھنٹہ میں ہے، لہذا اس میں کراہت نہیں، ۲۴ رجائی لاوی

مسجد کی دوسری منزل میں نماز سوال (۴) اول ایک مسجد ایک منزلہ تھی، پھر اس کو دو منزلہ بنایا گیا پڑھنا بلا کراہت صحیح ہے،

اس طرح سے ایک سمت تو پہلی ہی بنیاد رہی اور تین سمت سے بنیاد پڑھائی گئی، اور پوری مسجد پر دوسری منزل بنادی گئی ہے جس میں نیچے صحن بالکل نہیں رہا، چونکہ ایسی حالت میں نیچے کے درجہ میں گرمی سخت ہوتی ہے، اس لئے بعض مواسم میں اوپر کی منزل میں نماز پڑھی جاتی ہے، بعض علماء سے معلوم ہوا کہ سقفت مسجد پر نماز پڑھنا مکروہ ہے، جب سے سخت تر درد کہ دوسری منزل میں اگر نماز پڑھی جاوے تو اس کراہت کا ارتکاب لازم آتا ہے، اور اگر نیچے کی منزل میں پڑھی جاوے تو بعض موسم میں سخت تکلیف ہوتی ہے، حتیٰ کہ ایک روز امام صاحب کو بوجہ شدت گرمی غش آگیا تھا، علاوہ اس کے ایسا کرنے میں غالب گمان یہ ہے کہ اس موسم میں اس میں کوئی نماز پڑھے گا، اور مسجد معطل ہو جاوے گی، تو ایسی حالت میں موسم گرما میں اوپر کی منزل میں نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں، بینوا توجروا؟

الجواب؛ قال فی الدرر وکیر تحریماً الوطأ فوقه والبول والمقوطلانہ من الی عنان السماء و فی الفتوی الشامیة قوله الوطأ فوقه ای الجماع خزائن اما الوطأ فوقه بالقدم فغیر مکروه الا فی الکعبۃ لغیر عن رلقولہم بکراہۃ الصلوة فوقها ثم رأیت الفہستانی نقل عن المفید کراہۃ الصعود علی سطح المسجد ام ویلزمہ کراہۃ الصلوة ایضا فوقه فلیتأمل قوله لانه مسجد علیہ لکراہۃ ما ذکر فوقه قال الزلیعی ولہذا یصح اقتداء من علی سطح المسجد بمن فیہ اذا لم یقدم علی الامام ولا یبطل الاعتکاف بالصعود الیہ ولا یحل للمجنب والحائض والنفساء الوقوف علیہ ام (ص ۶۸۶ ج ۱) و فی رد المحتار ج ۳ ص ۵۳، قوله او جعل فوقه بیتا الخ ظاہرہ انہ لا فرق بین ان یکون البیت للمسجد ولا الا انہ یؤخذ من التقلیل ان محل من کونہ مسجد فیما اذا لم یکن وقفا علی مصالح المسجد وبہ صرح

فی الاسعاف فقال واذا كان السرداب او العلو لمصالح المسجد او كانا وقفاً عليه صار
مسجداً ام شربلاً لیه، قال فی البحر وحاصله ان شرط کونه مسجد ان ینزل من سفلہ
وعلوہ مسجد ینقطع حق العبد عنه ام قال فی الدرر ص مذکور، فرع لو بنی
فوقہ بیتاً للامام لا یضر لانه من المصالح اما لو تمت المسجد یتیم ثم اساد البناء
منع ام قلت لعل هذا المنع مختص بما اذا بنی بیتاً فوقہ للسکنی کما هو ظاهر و
اما اذا بنی للصلوة وتوسیع المسجد فلا یمنع مطلقاً ۱۲ نطفی، قال فی رد المحتار و
فی جامع الفتاویٰ لہم تحویل المسجد الی مکان آخر ان ترکوا بحیث لا یصلی فیہ ام
ر ص ۵۴ ج ۳) قلت کان لہم تحویل المسجد الی مکان آخر قلان یحولوا للصلوة فی
بعض المواسم من تحتہ الی فوق اولی بالجواز واما کراهۃ الوطأ بالاقدام فوق
المسجد فانه مختص بما اذا کان لغير عذر واذ کان عذر فلا کراهۃ فی الصلوٰۃ
فوقہ ایضاً واللہ اعلم

عبارت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ صورت مذکورہ میں مسجد کی اوپر والی منزل میں نماز بلا کراہت
جائز ہے مسجد کی چھت پر نماز کا مکروہ ہونا اس صورت کے ساتھ مختص ہے، جبکہ چھت پر
اہل محلہ نماز کے لئے جگہ نہ بنا دیں اور اس کو چھت ہی قرار دیں اور جب اس پر نماز کے لئے
دوسری منزل بنا دی گئی، تو اب یہ سقف کے حکم میں نہیں، بلکہ دوسری منزل کی چھت کو
سقف قرار دیا جاوے گا، واللہ اعلم، ۱۷ ارشوال منکلمہ

مسجد کی دیوار پر تیمم کرنا مکروہ ہے | سوال (۵) مسجد کی دیوار پر تیمم کرنا جائز ہے یا نہیں۔
خواہ دیواروں پر چونہ پھیرا گیا ہو یا مٹی سے لپائی ہوئی ہو،

الجواب: مسجد کی دیوار پر تیمم کرنا مکروہ ہے، کیونکہ مال وقف کو غیر مصرف میں صرف
کرنا ہے، لیکن اگر تیمم کر لیا تو درست ہو جائے گا، بشرطیکہ جس چونہ یا مٹی سے مسجد کی لپائی
کی گئی ہے وہ چونہ اور مٹی پاک ہو، اس میں ناپاکی نہ ملی ہو، ۱۷ ارشوال منکلمہ

طوائف کی بنائی ہوئی مسجد میں نماز کا حکم | سوال (۶)

..... ایک مسجد زمانہ قدیم کی بنی ہوئی ہے، اور اس وقت کے مسلمان اس کی مرمت
کرتے ہیں اور اس میں نماز باجماعت ادا کرتے ہیں، مگر یہ مسجد کسی طائفہ (رتبہ) کی
بنوائی ہوئی ہے، تو بعض لوگ منع کرتے ہیں، اور بعض لوگ نماز پڑھتے ہیں، آیا ایسی مسجد

میں نماز درست ہو جو اور مسجد میں نماز پڑھنے کی فضیلت ہو اس مسجد میں ملے گی یا نہیں، واسطے تحقیق مسئلہ یہ ہستقار خدمت والا میں ارسال کر کے امیدوار ہوں کہ بحوالہ کتب معتبرہ بیا فرمائیے
الجواب: زانیہ کی بنائی ہوئی مسجد حکماً مسجد ہو گئی، حتیٰ کہ ورثہ کا حق اس سے منقطع ہو گیا اور اس میں کسی کا تصرف خلافت وقت ناجائز ہو گیا، نہ اس کو ڈھا سکتے ہیں نہ اُس کو بیع کر کے دوسری مسجد میں اس کی قیمت لگا سکتے ہیں، لیکن اس میں نماز پڑھنے سے ثواب کامل نہ ملیگا گو فرض ذمہ سے ساقط ہو جائے گا، قال فی الدر و شرطہ شرط سائر التبرعات کحرية و تکلیف و فی رد المحتار افاد ان الواقف لا بد ان یکون مالکاً له وقت الوقف ملکاً باتاً و لو سبب فاسد الی ان قال و هم وقت ما شراه فاسد البعد القبض اه
 ص ۵۵۵ ج ۳، و فی الحدیث ان الله طیب لا یقبل الا الطیب،

مولانا رفیع الدین دہلوی در بعضے تحریرات خود می نویسند معلوم است کہ در زمین مخصوصہ پیش حنفیہ نماز ساقط از ذمہ می شود، پس در مسجد فاحشہ نماز خواہد شد لیکن نقصان ثواب برائے مصلی و محرومی ثواب برائے زانیہ مقرر است، فی الحدیث لا یصل الی الله الا الطیب اه
 از فتاویٰ مولانا عبدالحی مع الخلاصۃ ص ۲۲۹ ج ۱، پس بہتر یہ ہے کہ ایسی مسجد کا دروازہ اینٹوں سے بند کر کے صورت مسجد پر چھوڑ دیا جائے اور اس میں نماز نہ پڑھی جائے، واللہ اعلم
 ۲۰ ردی الحجہ ۱۳۸۴ھ،

مسجد میں دنیا کی باتیں کرنا مکروہ ہے | سوال (۷) مسجد میں دنیاوی معاملات کے متعلق گفتگو کرنے کی شرع شریف نے اجازت دی ہے ؟

الجواب: قال فی الدر و ریکوہ، الکلام المباح و قیدہ فی الظہیریۃ بان یجلس لاجلہ لکن فی النہی الاطلاق اوجہ ۱۴ ص ۶۹۲ ج ۱، مسجد میں دنیاوی باتیں مکروہ ہیں، ۸ شعبان ۱۳۸۴ھ

حکم تعلیم مدرس در مسجد | سوال (۸) جس مدرس کو تنخواہ مدرسہ ملتی ہے اور بچوں سے مشاہرہ نہیں ملتا تو وہ تعلیم کا کام مسجد میں کر سکتا ہے یا ناجائز ہے ؟

الجواب: ایسے مدرس کو بھی تعلیم کا کام مسجد میں مکروہ ہے، البتہ اعتکاف کی نیت کر کے بیٹھا کرے تو درست ہے، اور اعتکاف تھوڑی دیر کا بھی ہو سکتا ہے، ۴ ردی الحجہ ۱۳۸۴ھ
 اس مسجد کا حکم جس کا قبلہ قدر منحرف ہو | سوال (۹)

..... واضح ہو کہ ہمارے گاؤں میں ایک مسجد شریف غریب لوگوں نے تیار کی ہے، مگر بنا کے وقت ستارہ قطب کا دھیان نہیں کیا گیا اور مسجد شریف اچھی طرح سے تیار رہی ہے، جس میں عرصہ دو ماہ سے سنت جماعت ہو رہی ہے، اب معلوم ہوا کہ مسجد شریف قطب ستارہ پر تمام پوری سیدھی نہیں، اس طرح کہ جب مسجد شریف کے جنوبی کونہ سے دیوار سے متصل ہو کر قطب ستارہ پر نظر کی جاتی ہے تو دیکھنے میں نہیں آتا ہے، اور جب مشرق کی طرف تین وال بڑھ جاتا ہے تو شمالی مشرقی کونہ میں پورا ٹھیک تمام نظر آتا ہے، اور بغیر ستارہ قطب کے جب بین المغربین کا حساب کیا جاتا ہے تو مسجد شریف پوری تمام نظر آتی ہے، لیکن اور مسجدوں سے مبتدل نظر آتی ہے، اب بتلا دیجئے کہ ملک سندھ و ہندوستان میں ستارہ قطب معتبر یا بین المغربین، اور اس مسجد شریف کے لئے کیا حکم ہے، اگر گرا دینے کا حکم ہے تو پھر تیار ہونا ممکن نہیں، کیونکہ اس مسجد شریف کے جماعتی بالکل مسکین لوگ ہیں، اور جماعت کی تعداد بالکل کم ہے؟

الجواب؛ اصل اعتبار تو محاریب قدیمہ کا ہے جن کا صحیح ہونا عام طور پر معلوم ہے، باقی ہندوستان میں نماز کی صحت کے لئے بین المغربین ہونا بھی کافی ہے، اور قطب ستارہ کا اعتبار بھی صحیح ہے، محاریب قدیمہ غالباً اسی پر بنائی گئی ہیں، پس اس مسجد کا قبلہ اگر بین المغربین ہو تو نماز درست ہو جائے گی، مگر بہتر یہ ہے کہ مساجد قدیمہ سے جس قدر انحراف اس کے قبلہ کا ہو امام اور مقتدی صفت بندی کے وقت اس قدر انحراف کر لیا کریں، مسجد کے گرانے کی کوئی ضرورت نہیں، قال فی رد المحتار ففی القہستانی ولا باس بالانحراف انحرافاً لا تزول بہ المقابلة بالکلیۃ بان یبقی شیء من سطح الوجه مسامتا للکعبۃ ام الی ان قال وشیائی فی المتن فی مفسدات الصلوة انها تفسد بتحول صدرہ عن القبلة بغیر عذر فعلم ان الانحراف الیسیر لا یضر وهو الذی یبقی مع الوجه اوشی من جوانبہ مسامتا لعین الکعبۃ او هو انہا بان یخرج الخط من الوجه او من بعض جوانبہ ویبر علی الکعبۃ او هو انہا مستقیما ولا یلزم ان یکون الخط الخارج علی استقامة خارجا من جبهة المصلی بل منها او من جوانبہا کما دل علیہ قول الدر من جبین المصلی فان الجبین طرف الجبهة وهما جبینان علی ما قررناه یحصل ما فی الفتح والبحر عن الفتاوی من ان

الانحراف المفسدان يجاوز المشارق الى المغرب ام قلت ولا يخفى ان المصلى اذا اقام بين المغربين يخرج الخط من بعض جوانب وجهه مارا على الكعبة اور هوائها وفي الدرو هو في القرى والامصار محاريب الصحابة والتابعين ام رقلت وفي حكمها محاريب من بعدهم من السلف التي اجمع المسلمون على استقامة قبلتها، وفي المغاوير البحار النجوم كالقطب ام قال الشامي هو اقوى الادلة وهو نجم صغير في نبات نعش الصغرى بين المشرقين والحدى الخ
(ص ۴۴۶ الى ۴۴۷ ج ۱) والله اعلم، ۲۴ شعبان ۱۴۲۵ھ

مسجد کے اندر نماز پڑھنا اور مسجد کے صحن یا چھت پر سوال (۱۰) مسجد اور صحن کی بزرگی نماز پڑھنا برابر ہے یا ثواب میں فرق آتا ہے؟

ایک درجہ میں مانی جاتی ہے یا علحدہ ۱۔ مسجد میں نماز پڑھنے سے ثواب کی زیادتی اور صحن میں امام کھڑے ہو کر نماز پڑھانے سے ثواب کی کمی، کیا ثواب میں یہ لحاظ مسجد و صحن کے دو درجے ہیں یا ایک ہی درجہ ہے، حرارت کے دنوں میں امام اور مقتدریان کا صحن میں نماز پڑھنا ہوتا ہے، بینوا تو جسروا؟

الجواب: جہاں تک زمین مسجد کے لئے یعنی نماز پڑھنے کے لئے وقف کی گئی ہو وہ سب فضیلت میں برابر ہے، اور جب مسجد میں صف بندی ہو جائے اور جگہ نہ رہے تو جو لوگ خارج مسجد کھڑے ہو کر نماز میں شامل ہوتے ہیں ان کو بھی مثل مسجد والوں کے ثواب ملتا ہو غرض اندرون مسجد و صحن مسجد میں کوئی فرق نہیں، ہاں سقف مسجد و داخل مسجد میں فقہانے فرق بیان کیا ہے، کہ سقف میں وہ ثواب نہیں جو داخل مسجد میں ہے، گو حکم اعتکاف میں ۲۵ شعبان ۱۴۲۵ھ

مسجد کے اندر جوتے رکھنے، اخبار پڑھنے سوال (۱۱) حامداً و مصلياً، ۱۔ مسجد کے احاطہ کے اندر اور دنیوی باتیں کرنے کا حکم جوتہ چھوڑنا ۲۔ خلافت کے رسالے اور اخبار اور اشتہار

جنگ کے پڑھتے ہیں، ۳۔ مسجد یا صحن میں بیٹھ کر دنیا کی اور تجارت کی باتیں کرنا، بیچنا کرنا یا جواز ہو گا یا نہ؟ اور مسجد میں باتیں کرنے والوں کے لئے کیا وعید آتی ہے، بینوا تو جسروا؟
الجواب: جوتہ میں اگر نجاست نہ لگی ہو تو مسجد کے اندر رکھ دینا جائز ہے، اور اگر چوری خوف نہ ہو تو مسجد سے باہر رکھنا اولیٰ ہے، اور اگر ناپاکی لگی ہو تو بدون اس کے دو کمرے

جو تہ کو مسجد میں رکھنا جائز نہیں، بلکہ یہ سب کام مسجد کے اندر مکروہ ہیں، یاہر ہوتی چاہیں البتہ اگر پچاپیت شریعت کے موافق ہو اور لڑائی جھگڑا نہ ہو تو اس کا مسجد میں کرنا مضائقہ نہیں، ورنہ ناجائز ہے، وعید کوئی خاص منقول نہیں، یہی بہت بڑی وعید ہے کہ یہ کام گناہ ہے، واللہ اعلم، ۲۵ شعبان ۱۳۲۳ھ

محلہ کی مسجد میں پنج وقتہ سوال (۱۲) کیا محلہ کی مسجد میں نماز کا ثواب جامع مسجد سے بھی نماز کی فضیلت، زیادہ ہے؟ اور یہ زیادتی کا حکم پنج وقتی نماز کے لئے ہے یا جمعہ اور عیدین بھی اس میں شامل ہیں؟

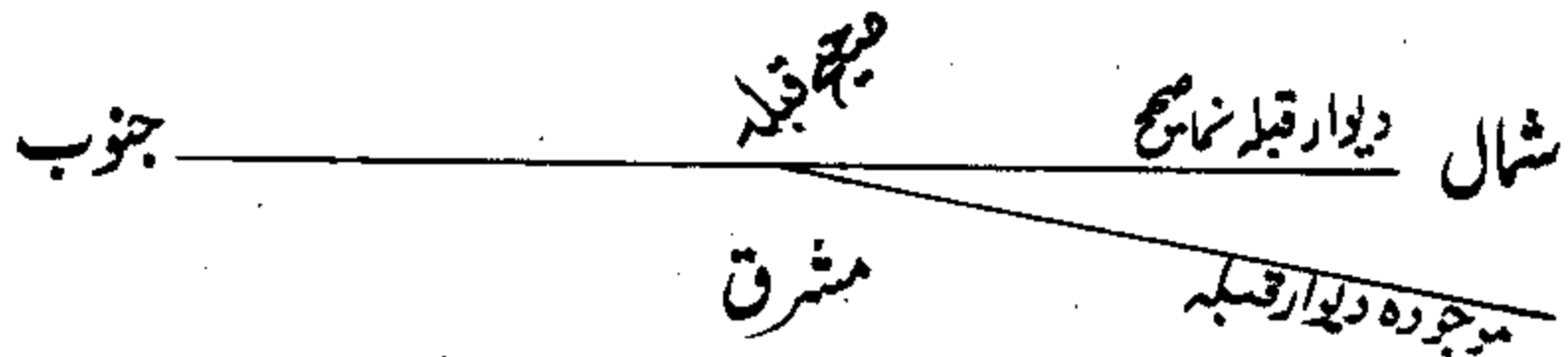
الجواب؛ پنج وقتہ نماز محلہ کی مسجد میں افضل ہے، اس کو چھوڑ کر قصد جامع مسجد میں نہ جائے، البتہ کسی کام سے جامع مسجد کی طرف گیا ہو اور وہاں نماز کا وقت آجائے تو اس حالت میں جامع مسجد ہی میں نماز پڑھ لے اور اس وقت اس کا ثواب مسجد محلہ سے زیادہ ہوگا، اور جمعہ کی نماز جامع مسجد ہی میں افضل ہے، اور عیدین کی جنگل میں افضل ہے، نمازی کے سامنے سے گزرنے میں سوال (۱۳) شامی وغیرہ کتابوں میں مسجد کبیر کی تعریف میں مسجد کبیر و صغیر کی تحستین، اربعین یا رستین ذراع ببارہ مروا امام المصلیٰ مذکور ہے، اب سوال یہ ہے کہ یہ پیمائش ببارہ مروا امام المصلیٰ طول کی ہے یا عرض کی، یاہر ایک کی یا چاروں طرف کی مجموعہ پیمائش مراد ہے؟ مدلل جواب عطا فرمائیے؟

الجواب؛ مراد طول میں رستین یا اربعین ذراع ہونا ہے، کیونکہ مدار اس پر ہے کہ مسجد اتنی بڑی ہو کہ جس میں اگر مصلیٰ کے سامنے دور سے گزرے تو بعد کافی ہو جائے، جس سے تشویش مصلیٰ کو لاحق نہ ہو، اور اس امر میں مقدار طول کو دخل ہے نہ کہ عرض کو، نیز شامی میں کہا ہے؛ فانہ رای المسجد الصغیر کبقعة واحدة منها یجعل جمیع ما بین یدی المصلیٰ الی حائط القبلة مکانا واحدا بخلاف المسجد الکبیر والصحران فانہ لو جعل كذلك لزم الحرج علی المارة فاقصر علی موضع السجود ام (ص ۶۶۳ ج ۱) ظاہر ہے کہ حرج علی المار میں مقدار طول ہی کو دخل ہے، نہ عرض کو، نیز جعل جمیع ما بین یدی المصلیٰ الی حائط القبلة بھی اس کو مفید ہے، پس یہ مقدار طول جانب قبلہ کی ہے، اور عرض اس کے منافی ہوگا، واللہ اعلم، ۸ ذیقعدہ ۱۳۲۳ھ

جس مسجد کا صحن قبلہ سے مائل و منحرف ہو اس میں نماز پڑھنا کیسا؟ سوال (۱۴)

..... ایک مسجد ایسی بنی ہوئی ہے کہ جس کا رخ مائل بجانب شمال قبلہ سے اس قدر ہٹا ہوا ہے، آیا اس قدر کجی سے نماز ہوتی ہے یا نہیں، حکم مشروع کیا ہے، در صورت نہ ہونے نماز کے اور باوجود مالی استطاعت کے مسجد مذکور کو از سر نو تعمیر کر سکتے ہیں یا نہیں، یا قبلہ ہی کی دیوار توڑ کر اس کو درست قبلہ رخ کر دیا جائے، اگر از سر نو تعمیر نہ کرائی جائے اور نہ دیوار توڑ کر اس کو قبلہ رخ کیا جائے، تو ایسی حالت میں اجنبی شخص کو دھوکہ کھانے اور خلاف قبلہ رخ پر نماز پڑھنے کا اندیشہ ہو، ایسے خطرے کی حالتیں اگر از سر نو مسجد مذکور کو تعمیر کرایا جائے تو درست ہے یا نہیں، اور سوا بارہ فٹ کجی ہے، یہ بھی تحقیق سے معلوم ہوا ہے، جواب کے مشرف فرمائے، صورت ہکذا۔

مغرب



الجواب؛ قال فی الشامیة قد علمت انه لو فرض شخص مستقبلاً من بلدة یعین الکعبة حقيقة بان یفرض الخط الخارج من جبینہ واقعاً علی الکعبة فہذا مسامت لہا تحقیقاً ولو انه انتقل الی جہت یمینہ او شمالہ بغير اسخ كثيرة وفرضنا خطاً ماراً علی الکعبة من المشرق الی المغرب وكان الخط الخارج من جبین المصلی یصل علی استقامتہ الی ہذا الخط المار علی الکعبة فانہ بہذا الانتقال لا تزول المقابلة بالکلیة لان وجہ الانسان مقوس فہما تاخر یمیناً او شمالاً عن عین الکعبة یبقی شیء من جوانب وجہہ مقابلاً لہا الی ان قال بل المفہوم مساقد مناہ عن المعراج والدر من التقیید بحصول زاویتیین قائمتین عند انتقال المستقبل یمیناً او یساراً انہ لا یصح لو كانت احدیہما حاوۃ والاخری منفرجة بہذہ الصورة

خط کعبہ

مصلی

ثم قال لکن وقع فی کلامہم ما یدل علی ان الانحراف لا یضرب فی القہستانی ولا بأس بالانحراف انحرافاً لا تزول بہ المقابلة بالکلیة بان یبقی شیء من سطح الوجہ مسامتاً للکعبة او وسیأتی فی المتن فی مفسدات الصلوة انہا تفسد بتحویل صدرک عن القبلة بلا عذر

فعلم ان الانحراف اليسير لا يضر وهو الذي يبقى معه الوجه او شئ من جوانبه
مسامتا لعين الكعبة اولها وانما بان يخرج الخط من الوجه او من بعض جوانبه
ويبر على الكعبة او هو انما مستقيما ولا يلزم ان يكون الخط الخارج على استقامة
خارجا من جهة المصلي بل منها او من جوانبها كما دل عليه قول الدر من جبين
المصلي فان الجبين طرف الجبهة وهما جبينان وعلى ما قررنا يحمل ما في الفتح
والبعر عن الفتاوى من ان الانحراف المفسد ان يجاوز المشرق الى المغرب اهر
ر ص ۴۴۶ ج ۱) عبارات مذکورہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر نمازی کی پیشانی سے یا جواب
چہرہ کے کسی جزو سے بھی ایسا خط نکلے جو خط کعبہ سے زاویہ قائمہ پر تقاطع کرے تو اتنے
انحراف سے نماز ہو جائے گی، اب اس کو خود دیکھ لیا جائے کہ صورت مذکورہ میں موجودہ دیوار
قبلہ کی طرف رخ کر کے کھڑے ہونے سے چہرے کی کسی جانب سے بھی ایسا خط نکل سکتا ہے
جو خط کعبہ سے زاویہ قائمہ پر تقاطع کرتا ہو، اگر ایسا خط نکل سکتا ہے، تو اس قدر انحراف
مفسد صلوٰۃ نہیں، اور نہیں نکلتا تو نماز نہ ہوگی، باقی ہر صورت بہتر یہ ہے کہ اگر ممکن ہو
تو ساری مسجد کو مہندم نہ کیا جائے بلکہ دیوار قبلہ کو توڑ کر صحیح طور پر قبلہ رخ کر دیا جائے اور
اگر ایسا ممکن نہ ہو تو قیچہ قبلہ کے لئے جبکہ رخ میں انحراف بین ہو پوری عمارت کا از سر نو کجی
بتا دینا جائز ہے، بشرطیکہ مسلمانوں کو اس کی استطاعت ہو، ورنہ سہل صورت یہ ہے
کہ فرش مسجد میں قبلہ کے صحیح رخ پر پچھتہ مسالے سے خط کھینچ دیا جائے، اور صفیں اسی خط
کے موافق بچھائی جائیں، اس سے آنے والوں کو بھی دھوکا نہ ہوگا، وہ خطوط کو دیکھ کر
قبلہ کا رخ معلوم کر لیں گے، واللہ اعلم، ارذلیقعدہ سلمہ ۴

مسجد کا چراغ حجرہ میں | سوال (۱۵) مسجد میں جو
بلانا درست نہیں، تیل چراغ روشن کرنے کو لوگ دے جاتے ہیں، اس تیل سے سحر میں
اور نماز فجر کے وقت چراغ روشن کرنا جائز ہے یا نہیں، اور لوگوں کی طرف سے اس کی صریح
اجازت ہونے نہ ہونے میں اور ان کو اس کا علم ہونے نہ ہونے کی حالت میں کچھ فرق ہے
یا نہیں، نیز مسجد کے حجرہ میں مسجد کا تیل جلانا جائز ہے یا نہیں، اور اگر کوئی تیل دیو والا
ان خود یا دریافت کرنے پر حجرہ اور مسجد دونوں میں جلانے کی اجازت دیدے تو کیا حکم ہے
اور بعض مرتبہ کسی بچہ وغیرہ کی معرفت تیل بھیج دیتے ہیں وہ اگر مسجد اور حجرہ دونوں جگہ

جگہ جلانے کی اجازت دے تو معتبر ہوگی یا نہیں؟ بینوا تو حیروا،

الجواب: قال فی العالمگیرية ولا یحمل الرجل سراج المسجد الی بیتہ ویحمل من بیتہ الی المسجد ولا یباس ان یتروک سراج المسجد فی المسجد الی ثلث اللیل ولا یتروک اکثر من ذلك الا اذا شرط الواقف ذلك او کان ذلك معتاداً فی ذلك الموضع کذا فی فتاویٰ قاضی خان امر ص ۱۰ ج ۱، اس سے معلوم ہوا کہ مسجد کا چراغ یا تیل جگرہ میں جلانا جائز نہیں، البتہ اگر تیل دینے والا صراحتاً اس کی اجازت دیدے تو اجازت دینے والے کے تیل میں سے مؤذن کو بقدر ضرورت جگرہ میں تیل جلانا جائز ہے، اور جو اجازت نہ دے اس کے تیل میں سے جلانا جائز نہیں، پس مؤذن کو اجازت والا تیل اور بے اجازت والا الگ الگ برتن میں رکھنا چاہئے اور نابالغ بچہ کی اجازت معتبر نہیں،

اور مسجد کا چراغ ہتائی رات سے زیادہ مسجد میں روشن نہ کرنا چاہئے، کہ یہ جائز نہیں البتہ اگر تیل والا اجازت دیدے تو اس کے تیل میں سے سحر کے وقت روشن کرنا جائز ہے یا کسی موضع میں دستور عام ہو کہ سحر میں چراغ روشن کیا جاتا ہو تو وہاں بدون اجازت لڑ بھی سحر میں روشن کرنا جائز ہوگا، اور نماز صبح کے وقت جاڑوں میں چراغ روشن کرنا عام دستور ہے، اس لئے صبح کے وقت جاڑوں میں تو مطلقاً اس کی اجازت ہے اور گرمیوں میں اجازت لینا چاہئے، یا عام عرف کو دیکھ کر عمل کرنا چاہئے، واللہ اعلم، غرہ صفر ۱۴۲۸ھ

مسجد میں نماز کی فضیلت داردہ | سوال (۱۶) - حدیث میں جو مسجد محلہ کا ثواب چھپیں اس وقت ہر جبکہ مسجد وقف ہو، رکعت کا وارد ہر اب وہ زمین وقف کا حکم ہے یا مطلق نماز کے لئے بنانے سے بھی یہ حکم ہوگا، اور کسی نے نماز کے واسطے مکان بنا دیا اور نماز پڑھنے لگے مگر زبانی وقف نہیں کیا، اب لوگوں کے نماز پڑھنے پر بھی وقف کا حکم دیا جاوے گا یا نہیں؟ (۲) نماز جماعت سے پڑھنے کا ستائیس درجہ تہنلے ملکہ ہے، یہ حکم گھر پر جماعت کا بھی ہے یا مسجد کا، اور جب مسجد کا حکم چھپیں کا ثواب ہے، اور جماعت کا ستائیس کا ہے، اب اس قاعدہ سے جب مسجد اور جماعت دونوں ہوں گے تو ۲۵ اور ۲ کے ضرب دینے کا ثواب ہونا چاہئے، یہ قاعدہ ٹھیک ہے یا نہیں، جیسے بعض لوگ کہتے ہیں،

الجواب: (۲) مسجد وہی ہے جو وقف ہو، جو وقف نہ ہو وہ مسجد نہیں ہے، اس

اقرب واللہ تعالیٰ اعلم! پس اس فعل کا عمداً آواز کے ساتھ کرنا شرعاً منکر ہے جو کراہت تحریمیہ کو مستلزم ہے، لکن ثبوت منکریتہ بالخیال الظنی اور مسجد میں کرنا تو اشد کراہت کو مستلزم ہے، واما اختلاف السلف فیہ فانما ہو فیما اذا عجز سراً لا فیما اذا عجز طبعاً بالتصویب عمداً، پس شخص اگر اس حرکت سے باز نہ آوے اور توبہ نہ کرے تو وہ امام بنانے کے قابل نہیں، اور عزل میں فتنہ نہ ہو تو اس کو امامت سے الگ کر دینا چاہیے،

(۳) صفت مذکورہ پر حدیث کرنے والا تو فاسق ہے اس لئے امام بنانے کے قابل نہیں اور مردوں کو غسل دینا اگر لوگ اس کی امامت سے کراہت کرتے ہوں اور اس کے پیچھے نماز پڑھنے سے راضی نہ ہوں تو اس کو بھی امام نہ بنایا جاوے، بشرطیکہ مقتدیوں میں اس کی برابر یا اس سے زیادہ احکام صلوٰۃ کا جاننے والا اور قرآن صحیح پڑھنے والا دوسرا موجود ہو، ورنہ غسل ہی کی امامت اولیٰ ہے، واللہ اعلم، ۲۲ رجب ۱۴۴۴ھ مسجد بنانا فرض ہے یا واجب | سوال (۱۸) مسجد کا بنوانا فرض ہے یا واجب ہے یا سنت ہے یا مستحب ہے، جواب مرحمت فرمائیں؟

الجواب: ہر شہر و قصبہ و گاؤں میں مسجد کیلئے بقدر ضرورت زمین وقف کرنا تو وہاں کے مسلمانوں پر واجب علی الکفایہ ہے، باقی عمارت بنوانا فرض نہیں بلکہ مستحب ہے قال فی الدار و من نذر نذر مطلقاً من جنسہ واجب و هو عبادة مقصودة و جب الشرط لنرم الناذر الوفاء به كصوم و صلوٰۃ و صدقة و وقف و اعتكاف و اعتناق رقة و حج و ما شياً فانها عبادات مقصودة و من جنسها واجب لوجوب الاعتق فی الكفاية الى ان قال و وقف مسجد للمسلمين واجب علی الامام من بیت المال رای فی کل بلدة علی الظاہر ط ۲ (شامی) و لا فعلی المسلمین رای و ان لم یفعل الامام فعلی المسلمین ۲ (شامی) ص ۱۰۲ و ۱۰۳ ج ۳) و فی حاشیئہ علی البحر بعد نقل کلام البدائع فی عدم صحة النذر ببناء المسجد لكونها قربة غیر مقصودة ماضیہ فہذا صریح فی ان الشرط کون المنذر بنفسه عبادة مقصودة لا ماکان من جنسہ و یدل علیہ انہم صححوا النذر بالوقت لان من جنسہ واجباً و وقف المسجد للمسلمین وقد علمت ان بناء المسجد غیر مقصود ام (ص ۱۰۶ ج ۲) قلت علی ان بناء المسجد ليس من جنسہ واجباً، واللہ اعلم،

ہندو مسجد کے قریب گانا یا سنگ

سوال (۱۹).....

..... اگر ہندو لوگ کوئی مسجد کے

قریب سے گانا بجانا کرتے ہوئے یا سنگ کرتے

ہوئے جاویں تو اس میں مسجد کی ہتک حرمت ہوگی یا نہیں

ہتک حرمت اور عبادت میں وہ مخل ہونے کی جہت

کرتن کرتے ہوئے گزریں تو اس سے

مسجد کی ہتک حرمت ہوگی یا نہیں

اور مسلمانوں کو شرعاً اس سے روکنے

کا حق ہے یا نہیں؟

مسلمانوں کو شرعاً حق ممانعت و منافی کی ہے یا نہیں؟ اور اس کو ہند کرنے کے لئے مسلمانوں کو بہ دل و جان کوشاں ہونا چاہیے یا نہیں؟

الجواب؛ قال تعالى وَمَا كَانَ صَلَاةُكُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مَكَاةً وَتَصَدَّقَ
فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ه وقد فسر لمكاء بالتصفيرو نفخ البوق
ونحوه والتصدية بالتصفيق كما في الدر المنثور وتفسير ابن جرير في تفسير
هذه الآية، قلت وفيه دلالة على بغض الله ومقتة امثال تلك الافعال
عند المساجد واشعار بان بها تنتهك حرمة المساجد ففرع عليه بقوله
فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ، وفسر بما حصل لهم من الخزي و
التكال ببدن، ولا يخفى ان كل ما يبغضه الله ويمقتة لا يقرب مؤمن ابداً
وان سكونه عنه وتقدير فاعله عليه معصية كبيرة فيجب عليه انكاره ما
امكن وادناه ان ينكر بقلبه ان لم يستطع تغييره بلسانه ولا بيده واعلاه
ان يغيره بيده ان كان يستطيع ذلك وشرط الاستطاعة ان لا يترتب عليه
فتنة اشد منه والكل ظاهر لمن نظر في قواعد الشرع، هذا وقد ذكر
الشيخ ابن تيمية في شروط عمر رضي الله عنه مع اهل الذمة ولا تظهر
الصليب على كنائسنا ولا تظهر صليباً ولا كتاباً في شيء من طرق المسلمين
ولا اسواقهم ولا تضرب بنوا قيسنا في كنائسنا الا ضرباً خفيفاً ولا ترفع
اصواتنا مع موتانا ولا تظهر النيران معهم في شيء من طرق المسلمين
ولا ترفع اصواتنا في الصلوة ولا القراءة فيما يحضره المسلمون اهـ،
(ص ۵۸) قال رواية حرب باسناد وجيد وهذه الشروط اشهر شيء في
كتب الفقه والعلم وهي مجمعة عليها في الجملة بين العلماء ام قلت

فظهر بذلك ان كل ذلك من علامات غلبة الكفر وذلة اهل الاسلام فلذا
شرط عليهم تركه كله فيما كان المسلمون يقدرون على استيفاء من هذا الشرط
تحت قوانين الحكومة يلزمهم استيفاءه منهم، والله اعلم

اس میں شک نہیں کہ کفار کا مساجدِ مسلمین کے سامنے گانا بجانا اور رسومِ کفر و
شرک بجالانا موجبِ ہتک و حرمتِ مسجد ہے، اور اسی وجہ سے اب تک مختلف مواقع میں
حکومتِ وقت نے ہندوؤں کو مسجد کے سامنے ان افعال سے منع کیا ہے، کیونکہ ان مسلمانوں
کو ایذا ہوتی ہے اور مساجد کی ہتک حرمت ہوتی ہے، اور مسلمانوں نے کبھی اس کو
آج تک گوارا نہیں کیا، اور جب یہ افعال مسجد کے سامنے ہتک حرمتِ مسجد کا سبب ہیں
تو مسلمانوں کو یہ بھی حق ہے کہ ہندوؤں کو مساجد کے سامنے ان افعال کے کرنے سے روکیں
مگر روکنے کی وہ صورت اختیار کرنا چاہتے ہیں اس سے بڑھ کر فتنہ کا اندیشہ نہ ہو،
اور جس صورت میں اس سے بھی زیادہ فتنہ کا خطرہ ہو وہ صورت اختیار نہ کی جائے، پس
مسلمانوں کو صرف یہ صورت اختیار کرنا چاہئے کہ حکومتِ وقت سے درخواست کریں،
کہ ہندوؤں کا مساجد کے سامنے گانا بجانا اور اپنے رسومِ کفر و شرک بجالانا ہماری مسجدوں
کی ہتک حرمت کا سبب ہے، اس لئے ان کو مسجدوں کے سامنے ایسے افعال کرنے سے
روک دیا جائے، گورنمنٹ سے ایسی درخواست کرنے میں پوری کوشش بدل و جان کرنا
چاہئے، اور اس میں جس قدر سعی کی جائے گی باعثِ ثوابِ عظیم ہوگی، (لما فیہ من اعلا کلمۃ اللہ)
اور جب حکومت کی طرف سے مسلمانوں کو یہ حق مل جائے جیسا کہ ابتداءً حکومت اس وقت
تک گورنمنٹ نے مسلمانوں کو یہ حق دے رکھا تھا تو اس کے بعد اگر کسی جگہ ہندوؤں کے
خلافت عمل کریں وہاں ان کے روکنے کی صرف یہ تدبیر کریں کہ حکومت ہی سے استغاثہ کریں
تاکہ حکومت اپنے قاعدہ کے موافق ہندوؤں کو اس ناجائز و ناشائستہ حرکت سے خود
روک دے، مسلمانوں کو بلا واسطہ ہندوؤں سے تعرض و مزاحمت نہ کرنا چاہئے، کیونکہ
اس میں مساجد کی زیادہ ہتک حرمت کا قوی اندیشہ ہے، کیونکہ جب ان سے بلا واسطہ
مزاحمت کی جائے گی تو وہ مقابلہ کریں گے، اور مقابلہ میں آکر مسجد کی زیادہ ہتک
حرمت کریں گے، مثلاً اس پر ڈھیلے پتھر پھینکنے لگیں یا مسجد ہی کو معاذ اللہ منہدم
کر دیں گے، چنانچہ بعض مواقع میں ایسا سنا بھی گیا ہے، پس یہ صورت جائز نہیں،

اور اگر کسی سگہ کے ناواقف مسلمانوں نے یہ ضرورت اختیار کی ہو اور اس میں اپنی جان فیدی ہو ان کا معاملہ خدا کے سپرد ہے، وہ ہر شخص کی نیت و عذر کو خود جانتے ہیں، باقی شرعاً مسلمانوں کے لئے اس وقت صرف پہلے طریقہ سے کوشش کرنا جائز ہے، کہ گورنمنٹ سے درخواست کریں، دوسرے طریقہ سے کوشش جائز نہیں، کہ خود مقابلہ کے لئے آمادہ ہو جائیں کہ اس میں زیادہ ہتک حرمت اور زیادہ مفسد و فتن کا خطرہ ہے، اور اگر خدا نخواستہ گورنمنٹ مسلمانوں کی اس درخواست کو قبول نہ کرے تو اس وقت مسلمانوں کو صبر کرنا چاہئے اور خدا تعالیٰ سے دعا کرنا چاہئے کہ وہ مساجد کی ہتک حرمت کو دور کرنے کی کوئی سبیل پیدا کر دیں، اس وقت مسلمانوں کو صرف دل سے ہندوؤں کو اس فعل پر نفرت و کراہت بکھڑکانا کافی ہے، مقابلہ کسی کا نہ کریں، نہ حکومت کا نہ رعایا کا، لیکن حکومت کے ایک بار اس درخواست کے رد کرنے پر کوشش کو ترک نہ کریں بلکہ موقع بموقع بار بار حکومت سے اس حق کے عطا کی درخواست کرتے رہیں، انشاء اللہ حکومت ضرور توجہ کرے گی، واللہ اعلم، ۱۸ ذیقعدہ ۱۴۲۷ھ

مسجد میں کھڑکیاں ٹھونسنے کا حکم | سوال (۲۰) مسجد کی مغربی دیوار پر کھڑکیاں بنانا جس میں ہوا کی آمد و رفت ہو از روئے شرع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جائز ہے مگر کینسہ و گرجا کے طرز پر نہ ہو بلکہ مسجدوں کے طرز پر ہوں، واللہ اعلم، ۱۵ محرم ۱۴۲۷ھ

مسجد میں نمازیوں کے | سوال (۲۱) مسجد کے اندر یا باہر فرش پر نمازیوں کے لئے پانی کا لئے پانی کا گھڑا رکھنا | گھڑا رکھنا ایسا ہے،

الجواب: اس میں فی نفسہ تو کوئی حرج نہیں، اگر وہاں کوئی خرابی ہو تو اس کو ظاہر کیا جائے، کتبہ احقر عبدالکریم عفی عنہ | الجواب صحیحہ ظفر احمد عفا اللہ عنہ

بضرورت مسجد میں دنیا کی | سوال (۲۲) مسجد میں گفتگو دنیوی کرنا کس درجہ کا گناہ ہے؟

الجواب: دنیوی کلام بضرورت ہو تو مسجد میں جائز ہے، بشرطیکہ مسجد میں اسکی غرض سے نہ آیا ہو، بلا ضرورت مکروہ ہے، اس پر حدیث شریف میں سخت وعید وارد ہے، ۲۵ رجب ۱۴۲۷ھ

محلہ کی مسجد چھوڑ کر دوسری مسجد میں نماز پڑھنے کا حکم | سوال (۲۳) واضح ہو کہ میرے محلہ میں

دور مسجد ہیں، قریب کی مسجد میں نماز مسنون طریقہ سے نہیں ہوتی، امام مختصر سی سورتیں پڑھتا ہے جس سے طبیعت سیر نہیں ہوتی، وہ ایک بوڑھے آدمی کا جو بالکل تندرست ہے خیال کرتا ہے اور زیادہ پڑھے تو وہ بوڑھا آدمی جنگ پر آمادہ ہو جاتا ہے، اس واسطے لمبی رکعت نہیں ہوتی، دور کی مسجد میں جو بہت دور نہیں ہر ایک نیک بخت آدمی آتا ہے اور وہاں نماز عمدہ اور مسنون طریقہ پر ہوتی ہے، پس درخواست ہے کہ ارشاد فرماویں کہ کیا نماز دور کی مسجد میں ہو جاتی ہے، اور پچیس نمازوں کا ثواب ملے گا یا نہیں؟

دیگر اس قریب والی مسجد میں لڑائی جھگڑے کا بھی اندیشہ رہتا ہے، ایک مولوی نے مجھ کو منع کیا تھا کہ دور نماز کے لئے نہ جایا کرو، اس واسطے آپ سے درخواست ہے کہ کیا دور کی مسجد میں نماز پڑھنے سے کوئی نقص تو واقع نہیں ہوتا؟ اور آپ دور والی مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت دیتے ہیں، یا نہیں، مفصل جواب سے مشرف فرماویں؟

الجواب: اصل یہ ہے کہ مسجد محلہ جو اپنے گھر سے اقرب ہو اس کا حق زیادہ ہے اس کو چھوڑ کر دور کی مسجد میں جانا بلا وجہ معتبرہ جائز نہیں، پس اگر مسجد قریب کا امام فاسق اور غلط خواہ نہیں ہے تو محض اس وجہ سے کہ وہ لمبی سورتیں نہیں پڑھتا مسجد قریب کا ترک جائز نہیں، اور اندیشہ فساد جو لکھا ہے تو سائل فساد کی بات میں شرکت نہ کرے، ہاں اگر بدون اس کی شرکت کے بھی کوئی خواہ مخواہ اس سے فساد کرتا ہو تو اس عذر کی وجہ سے مسجد بعید میں جانا جائز ہے، قال الشافعی تحت قول الدر ولو فاتته الجماعة، ندب طلبہا فی مسجد اخر الا المسجد الحرام اہ مانصہ واعترض الشرنبلالی بان هذا ینافی وجوب الجماعة واجاب بان الوجوب عند عدم العرج وفي تتبعها فی الاماکن القاصیة حرج لا ینفی مع ما فی مجاوزة مسجد حیة من مخالفة قوله صلی اللہ علیہ وسلم لا صلاة لجار المسجد الا فی المسجد اہ (ص ۶، ۵۱۷)

۵۔ رمضان المبارک شکرم،

سوال (۲۴) مسجد میں روزہ افطار کرنا اس خیال سے کہ مسجد میں افطار کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر گھر افطار کر کے مسجد میں گئے تو جماعت کا کچھ حصہ نہیں ملے گا، افطار سے مطلب یہ ہے کہ افطار میں کھانا وغیرہ اچھی طرح سے کھالیا جاوے، ورنہ یہ ممکن ہے کہ اگر ایک گھنٹہ پانی یا صرف چھوڑا وغیرہ کھا کر چلے تو اوّل رکعت میں بخوبی شامل ہو سکتا ہے اور مسجد اول سے

یہ دشوار ہے کہ وہ اذان و تکبیر میں اس قدر وقفہ کریں کہ گھر کے افطار کرنے والے جماعت کی اول رکعت میں شامل ہو جاویں، تو ایسی صورت میں مسجد میں افطار کا کیا حکم ہے؟

الجواب: ایسی حالت میں افطار مسجد میں کیا جاوے، مگر مسجد کی حد کے اندر نہ کھائیں بلکہ باہر کھائیں، اور باہر کوئی جگہ مناسب نہ ہو تو مسجد ہی میں کھالیں اور کھانے سے کچھ دیر پہلے اعتکاف کی نیت کر کے مسجد میں آجایا کریں، امام محمدؒ کے نزدیک اعتکاف قدر قلیل زمان کا بھی صحیح ہے، قال فی الدرر وکروہ اکل ونوم الا لمعتکف الخ قال الشافعی قوله اکل ونوم الخ اذا اراد ذلك ینبغی ان ینوی الاعتکاف فیدخل ویذکر الله تعالیٰ بقدر ما نوى او یصلی ثم یفعل ما شاء فتاویٰ ہندیۃ (جلد ۶۹) واللہ اعلم

غزہ رمضان المبارک ۱۴۲۵ھ

ایضاً ایضاً سوال (۲۵) رمضان شریف میں اہل محلہ کا خوف ترک جماعت نماز مغرب مسجد محلہ میں جمع ہو کر شربت وغیرہ قلیل انشیاء سے روزہ افطار کرنا بلا کراہت جائز ہو گا یا نہیں؟

الجواب: مسجد میں اکل و شرب مکروہ ہے، مگر ضرورت کے وقت بلا کراہت جائز ہے، کالمسافر یباح له النوم فیہ، اور ترک جماعت کا اندیشہ بھی عذر ہے، اس لئے اگر مسجد سے باہر کوئی جگہ ایسی نہ ہو جہاں افطار کر سکیں تو مسجد ہی میں افطار کر لینا جائز ہے بشرطیکہ مسجد کو ملوث نہ کیا جائے، قال علی الفاری فی وجہ تاخیر عمرو و عثمان الافطار عن الصلوٰۃ انہما کانافی المسجد وکانا غیر معتکفین ورأیا الاکل والشرب بغیر المعتکف مکروہین فی المسجد، لکن اطلاق احادیث التعجیل ظاہر فی استثنائ حال الافطار (ص ۵۱۳ ج ۲) کوئی کپڑا وغیرہ ایسا بچھا لیا جائے جس سے مسجد کی حفاظت رہے، اور بہتر یہ ہے کہ اس وقت افطار سے کچھ پہلے اعتکاف کی نیت کر کے مسجد میں داخل ہو، اور امام محمدؒ کے نزدیک اعتکاف ساعت بھی درست ہے، وہ بے یقینی، پھر یہ کراہت کلیۃً مرفوع ہو جاوے گی، واللہ اعلم، ۱۴ رمضان ۱۴۲۵ھ

سوال (۲۶) قربانی کے گوشت کی وجہ سے ہر اس کے لئے ایک استعمال کرنا درست نہیں، بوریانیا خرید کیا جانا ہے، اور اس کا استعمال اس طرح ہوتا ہے کہ محلہ کی مسجد کے پُرانے اور بوسیدہ بوریئے گوشت کے کام میں لاتے جلتے ہیں اور

نئے بوریئے مسجد میں ڈال دیتے جاتے ہیں، بعض لوگ اس عمل کو بھی ناجائز بتاتے ہیں، امید ہے کہ جناب والادونوں باتوں کے شرعی حکم سے مشرف فرمائیں گے؟

الجواب: قربانی کے لئے مسجد کا پُرانا بوری یا جس طرح عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے استعمال کرنا جائز نہیں، بلکہ اس کی صورت یہ ہونا چاہئے کہ پُرانے بوریئے کو متولی یا مہتمم مسجد سے نئے بوریئے کے عوض خرید لیا جاوے، خریدنے کے بعد وہ پُرانا بوریہ تمھاری ملک ہو جائے گا، اور ملک مسجد سے نکل جائے گا اور قبل اشتراء کے وہ ملک مسجد میں ہے، اور ملک مسجد کو اپنے ذاتی تصرفات میں لانا جائز نہیں، واللہ اعلم، ۲۲ ذی الحجہ ۱۳۵۲ھ

سوال (۲۷) زید میگوید کہ دریں ملک بنگال عید گاہ را مسقف ساختن بشرط جواز بر سر زیراکہ باران بکثرت می بارد و احیاناً بآباد صور اتصال می گردد، لہذا مراد اے نماز عید در عید گاہ صورتی نمی بندد و حصار عید گاہ از جائے مسقف دور می باشد و بدون محکم صرف بسقف در میدان عید گاہ حکم مکان ندارد، و بکر می گوید کہ عید گاہ را مسقف کردن جائز نباشد زیرا کہ برائے نماز عید خروج الی الجبانہ سنت است و عید گاہ بوجہ سقفت و حصار مکانی می گردد و خروج الی مکان خلاف سنت است فلا جرم جائے عید گاہ را مسقف ندیدہ ام و نشنیدہ ام و اگر باران وغیرہ گاہے مانع گردد تا برائے نماز عید مساجد موجود است،

الجواب: قول بکر کہ عید گاہ بوجہ سقفت و حصار مکان می گردد و خروج الی مکان خلاف سنت است، صحیح نیست، قال فی البحر من المغرب والخروج الی الجبانہ سنة لصلاة العيد وان كان يسعهم المسجد الجامع وفي المغرب الجبانة المصلى العام في الصحراء وفي مجمل البعل الجبان والجبانة الصحراء وتسمى بهما المقابر لانها تكون في الصحراء (ص ۲، ج ۱) قلت وكذا يسمى بهما مصلى العيد لانها تكون في الصحراء لان مصلى العيد هي الصحراء بعينها كما يشعر بما قلنا قول المغرب، پس دریں صورت خروج الی الجبانہ یعنی خروج الی المصلى العام في الصحراء متحقق است زیرا کہ خروج بسور مکانیکہ در صحراء ہست مستلزم خروج بسور صحراہم باشد قال فی البحر وفي الخلاصة ولا يخرج المنبر الی الجبانة يوم العيد واختلف المشايخ في بناء المنبر في الجبانة قال بعضهم بكرة وقال

بعضہم لا یکرہ فی نسخۃ الامام خواہی زادہ ہذا حسن فی زماننا وعن
ابی حنیفۃ انہ لا یأس بہ (ص ۱۵۹ ج ۲) قلت والمراد بناء المنبر مع ما یعلق
بہ من الحصار وغیرہا فان بناء المنبر وحده فی الصحراء لا یتصور عادة و
لم یکن ذلک متعارفا، پس بناء بر قول خواہر زادہ کہ بناء منبر را بزمانہ خود حسن گفتہ
تسقیف عید گاہ ہم درجاتے کہ بکثرت باران نماز عید بدون سقف متعذر باشد جائز خواہ
شد کہ در ترک تسقیف ترک سنت خروج الی الجبانہ دواماً لازم می آید، پس قول زید نزد ما
قوی است، واللہ اعلم، ۸، محرم ۱۳۸۵ھ

مسجد میں کھانا کھانا اور کھلانا مکروہ ہے | سوال (۲۸) دیار بنگالہ میں یہ دستور ہے
کہ بروز جمعہ شیرینی پکانے یا کبوتر یا مرغ وغیرہ ذبح کر کے بہات سالن تیار کر کے مسجد میں
لے جاتے ہیں، بعد نماز تمام مصلیٰ کو قطارِ صلوٰۃ میں مسجد کے اندر ہی اندر تقسیم کر دیتی ہیں
اور بوقت نذر اکثر یہ کہتے ہیں اگر یہ کام ہو جاوے تو مسجد میں کبوتر وغیرہ کو ذبح کر کے شیرینی
مع نیاز دوں گا، یا فقط شیرینی بھیج دوں گا، یا بلا تعلیق مثلاً کھیت و زراعت کا نیاز دے گا
و پھل مل جاوے مسجد کی نیت سے پکا کر بھیج دیتے ہیں، اگر کہا جاوے مصلیوں کو بلا کر گھر میں
کھلا دو تو ہرگز نہیں ملتے، پس ان صورتِ مذکورہ نیاز و نذر جو کہ تعلق مسجد کو ضروری جانتے
ہیں کیا حکم ہوگا، کیا واقعی نذر یا رسوم جاہلانہ ہے اور اطعمہ مذکورہ کا کھانا فقیر و غنی کو
کیسا ہوگا، اور بعض یہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کے نام پر مسجد میں دوں گا، تفصیلاً حوالہ کتب
سے تسکین بخشیں، اللہ تعالیٰ آپ کو اجر جزیل عطا فرمادیں، اکثر لوگ خاص و عام
... فتنہ و فساد میں مبتلا ہیں، حضور والا کے جواب باصواب پر امید ہدایت ہے، اگر طرز
سوال میں کوئی غلط ہو تو تصحیح فرمادیں عین عنایت ہے، تاکہ مجمع علماء میں پیش کیا جاوے،
الجواب، مسجد میں کھانا کھانا اور کھلانا مکروہ ہے، اور اگر اس کا التزام کر لیا جاوے
تو سختی کے ساتھ منع کرنا لازم ہے، واللہ اعلم، ۶، شوال ۱۳۸۵ھ

سوال (۲۹) ہمارے یہاں بڑی جامع مسجد ہے اس میں اکثر
سب مسجد کے اندر ہوں تو یہ صورت
بھی جنازہ کی مکروہ ہے یا نہیں؟
دیوار میں ایک بڑی کھڑکی ہے، وہ کھول کر اس کے سامنے جنازہ باہر مسجد سے رکھ کر امام

جمعہ مع جماعت مسجد میں نماز جنازہ پڑھا لینا ہے، پس سوال یہ ہے کہ ہر حنفی فقہاء نے اس صورت میں بھی مکروہ کو رائج لکھا ہے لیکن جمعہ وعید کے وقت ازدحام و کثرت جماعت کی حالت میں بھی جواز بے کراہت کی گنجائش ہو سکتی ہے یا کہ نہ، کیونکہ اس وقت میں اتنے آدمی نماز جنازہ کے لئے مسجد سے باہر کہاں سما سکتے ہیں؟

الجواب: بصورت مسئلہ میں درمختار میں تو کراہت ہی کو مختار کہا ہے، مگر شامی نے بعض جزئیات فقہیہ سے اس میں توسع لکھا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم، قال الشامی اما اذا عللنا بخوف تلویث المسجد فلا یکرہ اذا کان المیت خارج المسجد وحدث او مع بعض القوم اھ ح قال فی شرح المنیۃ والیہ مال فی المبسوط والمعیط وعلیہ العمل وهو المختار اھ قلت بل ذکر فی غایۃ البیان والعنایۃ انه لا کراہۃ فیہا بالاتفاق لکن ردہ فی البحر ثم اعلم ان التعلیل الاقل رای قوله ان المسجد انما بنی للمکتوبۃ وتوابعہا فیہ خفاء اذ لا شک ان الصلوة علی الجنائزۃ دعاء و ذکر وہما مہما بنی لہ المسجد والا لزم المنع عن الدعاء فیہ لنحو الاستسقاء والکسوف مع ان الوارد فی ذلك ما رواہ مسلم ان رجلا نشد فی المسجد ضالۃ فقال صلی اللہ علیہ وسلم لا وحدث انما بنیت المساجد لہما بنیت لہ فلیتأمل اھ ر ص ۹۲۳ قال الشیخ ولكن مراد الفقہاء ان الدعاء لمثل هذا لم ینقل عن السلف فی المسجد فكانت مہما لرتین لہ المساجد، ثم قال فاضل المذہب ما ذکرہ فی الدرر نعم لما اختلفت اقوال الفقہاء فیہ ففیہ وسعۃ فلا ینبغی التشدد فی الانکار والاصرار علی الاحتراز عنہ والضرر واللہ اعلم، ۵۱ سوال سلک

سوال (۳۰) جو لوگ کثرت جماعت کے سبب خارج مسجد امام کی اقتدار میں نماز پڑھتے ہیں اور اگر کسی انکو مسجد کا ثواب ملے گا یا نہیں؟ بعض کو مسجد کا ثواب ملے گا یا نہیں؟

الجواب: اتصال صفوف واتحاد مکان کی وجہ سے خارج مسجد حکم مسجد ہو جاتا ہے، اسی لئے اقتدار بد داخل مسجد صحیح ہے، ورنہ اقتدار ہی صحیح نہ ہوتی،

فان اختلاف المكان يمنع الاقتداء قال الشامي نقلاً عن البدائع لو كان على سطح بجانب المسجد متصل به ليس بينهما طريق فاقتدى به (ای بمن فی جوف المسجد) صح اقتداء عندئذ لانه اذا كان متصلاً به صار تبعاً لسطح المسجد وسطح المسجد له حکم المسجد فهو كما اقتداء في جوف المسجد اذا كان لا يشتبه عليه حال الامام (۱۵ ر ص ۱۱۲) خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک اقتداء بداخل المسجد صحیح ہے وہاں تک کی تمام زمین نماز جماعت کے وقت حکماً مسجد ہے اور سب کو ثواب مسجد کا ملے گا، یہ اور بات ہے کہ حقیقی مسجد اور حکمی کا مسجد کا فرق ہو جیسا کہ مسجد نبویؐ میں جہاں تک بھی مسجد بڑھ جائے، ثواب موعود حدیث ملے گا، گو افضل تحری مسجد قدیم ہے، اور قواعد شرع بھی اسی کو مقتضی ہیں، کیونکہ نمازی جس قدر بھی نماز کو آتے ہیں سب کی نیت مسجد ہی میں نماز پڑھنے کی ہوتی ہے، مجبوری ضیق ہی کی وجہ سے وہ باہر کھڑے ہوتے ہیں، پھر ان کو مسجد کا ثواب کیوں نہ ملے، وقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم انما الاعمال بالنیات اسی ثوابہا، واللہ تعالیٰ اعلم ، ۲۶، شوال ۱۳۸۵ھ

سوال (۳۱) قرب وجوار میں متعدد مسجدیں ہوں تو مسجد محلہ میں نماز افضل ہے یا سب کا حکم برابر ہے

زید کے مکان کے قریب تین مساجد بتفصیل ذیل ہیں :- (۱) مسجد فاطمہ مکان زید سے ۸۳ قدم کے فاصلہ پر ہے، راستہ میں پختہ سڑک نہیں ہے، ایک مقام پر راستہ میں کچھ بھی رہا کرتی ہے، مسجد میں پنج وقتہ نماز باجماعت وقت معینہ پر ہوتی ہے، لیکن امام کا تعین نہیں ہے، (۲) مسجد سبحان، مکان زید سے ۱۲۳ قدم کے فاصلہ پر ہے، راستہ میں پختہ سڑک نہیں ہے، ... گلی میں ایک مقام پر حوض بھی ہے، مسجد میں پنج وقتہ نماز بھی ہوتی ہے، لیکن امام کا تعین نہیں ہے، (۳) مسجد فیض، مکان زید سے ۱۲۳ قدم کے فاصلہ پر ہے، راستہ میں پختہ سڑک بھی ہے، سڑک پر لالٹین کی کافی روشنی رہتی ہے، مسجد میں پنج وقتہ نماز باجماعت وقت معینہ پر ہوتی ہے، امام کا تعین ہے، زید اپنی ہمراہ لالٹین رکھنے کی استطاعت رکھتا ہے، لیکن بہ لحاظ سہولت نماز عشاء و فجر اسی مسجد میں ادا کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ مسجد او ۲ کو شب میں جاتے ہوئے حشرات ارض کا خطرہ دل میں پیدا ہوتا ہے، استفتاء یہ ہے کہ زید کو ہر سہ مسجد متذکرہ بالا میں سے کس مسجد میں

بالالتزام نماز پجو قتمہ ادا کرنی چاہئے، بیوہ تو حبر درہ

الجواب، ان مسجدوں میں جو مسجد سائل کے محلہ کی مسجد ہو وہ افضل ہے، اس میں اس کو بالالتزام نماز پڑھنا چاہئے، اور اگر یہ سب اسی کے محلہ کی مسجدیں ہیں تو ان سب میں جو سب سے پہلے کی اور قدیم مسجد ہو وہ افضل ہے، اگر قدم میں بھی سب برابر ہوں یا اقدم معلوم نہ ہو تو جو سب سے زیادہ قریب ہے وہ افضل ہے، ہذا ما علمتہ من کلام الدردشامی (جلد ۱۰ ص ۶۹۰) واللہ تعالیٰ اعلم، ۲۰ جمادی الثانی ۱۳۸۷ھ

مذہب حنفی میں رائج اور صحیح یہ ہے کہ مسجد جماعت میں نماز جنازہ مطلقاً مکروہ ہے اسباب خورجہ میں منعقد ہوتی ہے، جس کے صدر حضرت مولانا

حسین احمد صاحب مدنی صاحب صدر مدرس مدرسہ عالیہ دیوبند قرار پاتے ہیں، حضرت مولانا جمعہ کے دن خورجہ تشریف لے آئے، جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ ایک جنازہ کی نماز جنازہ کو مسجد کے اندر رکھ کر اور مصلیٰ باہر مسجد مولانا نے نماز پڑھائی، جس وقت کہ جنازہ مسجد کے اندر رکھا گیا تو عبداللہ خان گنج والوں نے مولانا سے عرض کیا کہ مسجد کے اندر جنازہ رکھ کر نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، اس پر مولانا نے فرمایا کہ نہیں جائز ہے، آپ نماز پڑھ لیں، میں بعد نماز آپ کا اطمینان کر دوں گا، مگر عبداللہ خان بھائی نے نماز نہیں پڑھی، اور عرض کیا کہ تمام حضرات دیوبند سے کہ جو آج قبروں میں بھی آرام فرما رہے ہیں اور موجودہ بھی ہیں یہی سنتے رہے ہیں کہ مسجد کے اندر جنازہ کی نماز مکروہ ہے، چونکہ مجمع ہزار پانچ سو آدمیوں کا تھا بڑی قیل و قال ہوئی، بعد نماز ایک اور صاحب نے عرض کیا کہ مولانا اس مسئلہ کو حل فرماتے جائیے گا، کہ جنازہ مسجد کے اندر رکھ کر نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں در نہ احتمال ہے کہ خورجہ والوں کے سر چھوٹنے لگیں، اس پر مولانا نے فرمایا کہ شوافع کے یہاں بالکل درست ہے اور احناف کے یہاں جنازہ کو مسجد کے اندر رکھ کر نماز پڑھنے میں اختلاف ہے، ایک جواز کی طرف اور دوسرا عدم جواز کی طرف اور مکہ میں یہی ہوتا ہے اور مدینہ میں مسجد کے اندر جنازہ رکھ کر نماز پڑھی جاتی ہے، اس پر ایک صاحب نے عرض کیا کہ مولانا ہم رواج اور رسم دریا نہیں کرتے ہیں، حدیث شریف میں کیا حکم ہے، مولانا نے حدیث شریف پڑھ دی، اس کے بعد لوگوں نے مولوی صاحب اور قاری صاحب سے دریافت کیا، دونوں صاحبوں نے اس صورت کو متفق علیہ مکروہ تحریمی بتایا، اور اگر جنازہ مسجد سے باہر ہو اور مصلیان داخل فی المسجد

تو اس صورت کو احناف کے یہاں مختلف فیہ کہا، مگر رائج یہی ہے کہ اس صورت میں نماز درست ہے، بالآخر مولانا حسین صاحب کے سامنے ایک استفتاء پیش کیا گیا ہے، جس میں صورت کا حکم از روئے فقہ حنفی دریافت کیا ہے، مولانا نے فرمایا کہ اگر طحاوی یا مراقی الفلاح ہو تو میں ابھی دکھا دوں، اس پر عرض کیا گیا کہ یہاں یہ دونوں کتابیں نہیں ہیں، جب تنبیہ کو علم ہوا کہ مولانا مراقی الفلاح مانگتے ہیں تب میں نے مولوی صاحب سے عرض کیا کہ مراقی الفلاح میں نے جناب کو مکہ سے لا کر پیش کی ہے، آپ مکان سے اس کو لاویں، تو مولوی صاحب مکان گئے، مگر تساہل کی وجہ سے کتاب نہ لاسکے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولوی صاحب مولانا سے بالمشافہ گفتگو کرنے میں گریز کرتے تھے، بہر حال مولانا اس استفتاء کو دیوبند لے گئے ہیں، مگر ہفتہ ہوا کہ جواب نہیں آیا، دیکھئے کیا جواب حجت فرماتے ہیں، حصن والا صورت مسطورہ میں فقہ حنفی میں کچھ گنجائش جواز کی ہو یا نہیں؟

الجواب ہذا مسئلہ میں مولانا حسین احمد صاحب نے جو فرمایا ہے صحیح ہے، احناف کے علماء میں جنازہ کو مسجد کے اندر رکھ کر بشرطیکہ مقتدی و امام سب باہر ہوں نماز پڑھنے میں بھی اختلاف ہے، بعض نے اس کو جائز کہا ہے، شرح مراقی الفلاح میں ہے، فلو كان الميت موضوعاً في المسجد والناس خارجه لا تكبره وبالعكس تكبره كما في الوجهة قال الطحاوی (ص ۳۴) وفيه ان الميت يشغل المسجد بعد جنازته،

مگر علماء احناف کے اقوال مختلف ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مذہب میں بھی اختلاف ہو بلکہ جب کسی مسئلہ میں اقوال مختلف ہوتے ہیں تو مذہب اُن میں سے ایک ہوتا ہے، اور مذہب وہ ہے جس کو اہل متون نے اختیار کیا ہو، پس مذہب حنفی میں رائج اور صحیح یہ ہے کہ مسجد حیات میں نماز جنازہ بہر حال مکروہ ہے، خواہ جنازہ تہما مسجد کے اندر ہو اور مقتدی اور امام باہر مقتدی و امام مسجد کے اندر ہو اور جنازہ باہر یا امام اور جنازہ تہما یا مع بعض قوم کے باہر ہو اور باقی مقتدی اندر، جیسا کہ درمختار اور شامی ص ۹۲۴ ج ۱ سے ظاہر ہے، البتہ چونکہ اس مسئلہ میں شوافع اور خود علماء حنفیہ کے درمیان اختلاف ہے، اس لئے مولانا حسین احمد صاحب کے فعل پر شدت کے ساتھ انکار کرنا بے جا تھا، اور مولانا کو بھی مناسب تھا کہ چونکہ منکر کا انکار بالکل غلط نہ تھا بلکہ مذہب مختار و صحیح کے موافق تھا اس لئے اس کے انکار کو عملاً تسلیم کر لیتے اور بعد میں قولاً اس کی اصلاح فرمادیتے کہ مسئلہ مختلف فیہ ہوا اس میں صورت کی بھی

گنجائش ہو جس پر آپ نے انکار کیا تھا، اس لئے شدت کے ساتھ انکار مناسب نہ تھا،

واللہ اعلم، ۲۴ جمادی الثانی ۱۳۸۴ھ

بعض مسجد میں لالٹین جلانا کیسا ہے؟ سوال (۳۳).....

..... ہمارے گاؤں کی مسجد بستی سے باہر ہے، وہاں اور کوئی گھر نہیں ہے، اندیرے میں عشاء کی نماز پڑھ کر گھر آنا بغیر روشنی کے مشکل ہے، برسات میں راستہ میں سانپ پڑے رہتے ہیں، ایسی صورت میں مسجد کے اندر مٹی کے تیل کی لالٹین رکھنا جائز ہے یا نہیں، بارش کے دن میں تو مسجد کے اندر رکھنے کے سوا کوئی صورت نہیں ہے، ہاں اگر بارش نہ ہو تو مسجد کی دیوار سے باہر جو حصہ چھت کا ہے اس کی کڑی میں رکھنے کی صورت ہے، ایسی صورت میں جو حکم شرع ہو ارشاد فرمادیں،

الجواب:؛ عذر کی صورت میں جائز ہے، اور یہ صورت عذر کی ہے فقہ ورد فی الحدیث انہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من اكل من هذه الشجرة الخبيثة والبصل والثوم، فلا يقرب من مسجدنا فاخذ رجل بيد رسول الله صلى الله عليه وسلم ووضعها على صدره وفيه قرحة قد شد عليها البصل فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم انك معذورا كما قال ذكره الحافظ في الفتح وعزاه الى ابى داود كما هو في حفظی، ۱۵ رذی الحجہ ۱۳۸۴ھ

مسجد مزار کی تعریف | سوال (۳۴)..... مسجد مزار کی تعریف کیا ہے؟

اور اس کی بناء کیونکر ہوتی ہے؟

الجواب:؛ مسجد مزار جس کی قرآن میں مذمت ہو وہ جس کی بناء سے مسجدیت مقصود نہ ہو اور جس کی بناء سے مسجدیت مقصود ہو وہ مسجد ہے، گو فساد نیت کی وجہ سے ثواب کم ہو واللہ اعلم، ۲۲ رذی الحجہ ۱۳۸۴ھ

مسجد کا فرش اور ممبر عید گاہ | سوال (۳۵) مسجد کا منبر اور بچھونے عید گاہ میں لیجانا درست ہے یا نہیں؟، جیسا کہ ہمارے اطراف کے بعض لوگ لیجا یا کرتے ہیں، اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ عند الضرورة منبر عید گاہ میں لیجا سکتے ہیں، یہ بروئے کتاب درست ہے یا نہیں، جواب با صواب سے مطلع فرمادیں؟

الجواب:؛ مسجد کا فرش عید گاہ میں لیجانا جائز نہیں، ہاں ایک روایت میں منبر کا

یجائز ہے اور دوسری روایت میں مکروہ ہے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ منبر بھی نہ لیجائیں
 قال فی الدرر والاباس باخراج منبر الیہا ولكن فی الخلاصة لاباس بسنائه
 دون اخلایه ام قال الشامی ومثله فی المعانیة فدل کلامهما علی انه لا خلا
 فی کراهة اخلایه الیہا وانما الخلاف فی بناءه فیہا ویسکن حمل الکراهة
 علی التنزیہیة وهی مرجع خلاف الاولی المفاد من کلمة لاباس غالباً فلا
 مخالفة فافهم ام (ص ۸۶۸ ج ۱) واللہ تعالی اعلم واما حرمة اخراج حصر
 المسجد الی المصلی فلان اشياء المسجد وقف علیہ ولا یجوز استعمال الوقف
 فی غیر ما وقف له وهذا ظاهر، ۹ محرم شکستہ

مسجد میں تمباکو کھانا | سوال (۳۶) تمباکو کی نساو لینا اور تمباکو کھانا مسجد کے اندر
 اور نساو لینا کیسا ہے؟ کیسا ہے؟

الجواب؛ نساو سونگھنا اور تمباکو کھانا مسجد کے اندر خلاف اولیٰ ہے، جو کراہت
 تنزیہیہ سے خالی نہیں لما فیہ من الرائحة الکراهة التي امر بنظافة المساجد
 عنها ولما فی الثموم من الصیاح الحاصل عند العطاس وقد امرنا بخفض
 الصوت فی المسجد ونهینا عن رفعه فیہ واللہ تعالی اعلم ۱۲ صفر ۱۳۸۷
 مسجد میں اخراج ریح کا حکم | سوال (۳۷) مسجد میں حدیث کرنا جائز ہے یا نہیں؟
 اگر نہیں ہے تب کیا حرام ہے یا مکروہ، اگر مکروہ ہے تو تحریمی ہے یا تنزیہی؟

۱۲ اگر جائز نہیں ہے تو جو طلبہ مسجد میں رہتے ہیں اور کتاب کا تکرار کرتے ہیں
 اور نیند کر جاتے ہیں، ان لوگوں کو کیا کرنا چاہیے، اس حالت میں معاف ہے کیا؟
 الجواب؛ ۱۳ فی العالمگیرۃ (ص ۶۱۱) واختلف فی الذی یفسو فی
 المسجد فلم یر بعضہم بأساً وبعضہم قالوا لا یفسو ویخرج اذا احتاج الیہ
 وهو الاصح کذا فی القوتاشی، اس سے معلوم ہوا کہ مسجد میں اخراج ریح نہ چاہیے، اور ظاہر
 اس عبارت سے کراہت تحریمیہ ہے،

۱۴ فی العالمگیرۃ ایضاً (ص ۲۱۵ ج ۱) ولا بأس للغریب ولصاحب الدار
 ان ینام فی المسجد فی الصحیح من المذهب والاحسن ان یتورع فلا ینام کذا فی
 خزائن الفتاوی، پس مسجد میں سونا خلاف اولیٰ ہے گو جائز ہے، اور جب سونا جائز ہے

تو حالتِ نوم میں خروجِ یرح سے گناہ نہ ہوگا، اور نیز نوم تو رافع تکلیف ہے، اس لئے نفس نوم اگر ممنوع تسلیم کیا جاوے تب بھی نوم میں حدث کرنے سے گناہ نہ ہوگا،

جھوٹی اور بڑی مسجد میں نمازی کے | سوال (۳۸) بڑی مسجد جس میں چھ سات صفت یا زیا
سامنے کتنے فاصلہ پر گزرنا درست ہے | صفیں جماعت کی ہو جاویں، یا چھوٹی مسجد جس میں

ایک اندر اور دو باہر صفت ہوں یا جنگل میں نماز ادا کی جاوے تو نمازی کے آگے سے نکلنے والا کتنے فاصلہ میں ہر صورت میں گنہگار ہوگا؟

الجواب: بڑی مسجد اور جنگل میں تو نمازی سے اتنے فاصلہ پر گزرنا جائز ہے کہ جہاں تک سجدہ کی جگہ پر نظر رکھ کر نمازی کی نظر نہ پھوٹے، لیکن چھوٹی مسجد میں اتنے فاصلہ پر سے گزرنا بھی جائز نہیں ہے، اور سوال میں جسکو بڑی مسجد لکھا ہے، وہ بڑی مسجد نہیں ہے بڑی مسجد وہ ہے جس کا عرض کم از کم چائیکل ہا تھ ہو،

اس مسجد کا حکم جس کا رخ | سوال (۳۹) اسلامی ملکوں سے دور دراز ایک جزیرہ میں تاجر
بنیل درجے تک مخوف ہو | مسلمانوں کی ایک جماعت نے باہم چند سے ایک مسجد تعمیر کی،

تعمیر کے منتظم نے غلطی سے مسجد کا رخ قبلہ کی سمت سے تقریباً بینیل درجے پھرا ہوا رکھا (جیسا نقشہ سے معلوم ہوگا) تعمیر اسی شکل پر پوری ہو گئی، اس کے بعد جاننے والوں نے بتایا کہ مسجد میں قبلہ کا رخ غلط ہے، پس کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ:-

(۱) در صورتیکہ مسجد کا سرمایہ بھی اس قدر ہو کہ دوبارہ صحیح رخ پر مسجد کو بنایا جاسکتا ہو نیز وہاں کے مسلمان بھی اس کے لئے تیار ہوں کہ دوبارہ چندہ کر کے مسجد کو قبلہ کے ٹھیک رخ پر بنایا جائے (۲) کیا مسجد کو اسی حال پر رکھا جائے یا (ب) قبلہ کے رخ کو درست کر کے دوبارہ بنایا جائے؟

(۲) موجودہ تعمیر میں صرف صفوں کو صحیح رخ پر بچھا کر صحیح رخ پڑھی جائے، یا صحیح سمت قبلہ جانتے ہوئے بھی اسی غلط رخ پر نماز ادا کی جائے، جان بوجھ کر غلط رخ پر نماز پڑھنے والے کا کیا حکم ہے؟

(۳) اگر امام صحیح رخ جانتے ہوئے اسی غلط رخ پر نماز پڑھے اور جاننے والا مقتدی خود اپنا رخ صحیح کر لے تو اس مقتدی اور اس کا نماز کا شریعت میں کیا حکم ہے؟

(۴) تعمیر کا منتظم اپنی غلطی پر اصرار کرتے ہوئے اگر مسجد کو دوبارہ تعمیر کرنے سے

روکے اور صفوں کو صحیح رخ پر بچھا کر ٹھیک سمت پر نماز پڑھنے سے بھی منع کرے، تو ایسا شخص متولی و منتظم مسجد بنانے کے قابل ہے یا نہیں، اور اس کا حکم اس معاملہ میں مانا جائے یا نہیں؟

(۵) اگر امام مسجد میں اس متولی و منتظم کو خوش کرنے کے لئے جان بوجھ کر اسی غلط رخ پر نماز پڑھائے، اور بعض مقتدیوں کے منع کرنے بلکہ قطب نما و نقشہ آلات دکھا کر صحیح رخ سمجھانے کے باوجود باز نہ آئے تو ایسا شخص امام بنانے کے قابل ہے یا نہیں، اگر اس کا اقتدار درست ہی تو اس وقت مقتدی کو امام کے غلط رخ پر کھڑا ہونا چاہئے یا صحیح پر، اور نقشہ یہ ہے۔

الجواب؛ یہ سب سوالات اس واسطے

پیدا ہوئے ہیں کہ اس فرق کو صحت صلوٰۃ کا منافی سمجھا گیا، حالانکہ انما فرق ہوتے ہوئے نماز بالکل درست ہے، پس اختلافات کی ضرورت نہیں، اُسی رخ پر بلاشبہ نماز پڑھتے رہیں، اور اگر کبھی بالاتفاق درست کرنا چاہیں تب بھی مسجد کا سرمایہ اس میں نہ لگایا جاوے، لائنہ لیس بضرورت، البتہ اگر مستقل چندہ کر لیں تو چنداں مضائقہ نہیں مورخہ، از یقعدہ اشہم، کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ

فصل فی شروط الصلوٰۃ و ارکانہا و واجباتہا و سننہا و آدابہا

رفع سبابہ کے وقت نگاہ | سوال (۱) بندہ نماز میں قعدہ کے وقت نظر گود میں رکھتا ہے، کہاں ہونی چاہئے؟ | تو کیا رفع سبابہ کے وقت نظر سبابہ کی طرف رکھنی چاہئے؟ اور کیا سلام پھیرنے تک نظر سبابہ کی طرف رکھنی چاہئے؟

الجواب؛ قعدہ کے وقت نظر گود ہی کی طرف رکھنی چاہئے، سبابہ کی طرف نظر کرنا میری نظر سے نہیں گذرا قال فی مراقی الفلاح ص ۱۶۱ و منها نظر المصلی سوا کان رجلاً او مراعاة الی موضع سجود قائما الی ان قال، والی حجر جالساً بعد میں ایک حدیث نظر سے گذری جس کو نسائی نے روایت کیا ہے عن عبد اللہ بن عمر فی حدیث طویل وفيہ اشار باصبعہ الی تلی الایہام فی القبلة و رمی ببصرہ الیہا و تحوھا ثم قال هكذا رأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یصنع

امہ وسکت عنہ، اس سے اشارہ کے وقت سبابہ کی طرف نظر کرنا ثابت ہے، مگر قرار ثابت

نہیں، واللہ اعلم،

التحیات قبل بسم اللہ | سوال (۲) التحیات کے قبل بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر پڑھنے کا حکم، التحیات کو پڑھنا حدیث شریف سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، التحیات میں پوری بسم اللہ الرحمن الرحیم کسی حدیث میں ثابت نہیں البتہ بعض احادیث میں اس طرح وارد ہے بسم اللہ التحیات لله والصلوات لله والذاکیات لله الخ باقی حقیقہ کے نزدیک سب افضل تشہد ابن مسعودؓ جو کہ ان بلاد میں رائج ہے، اس پر زیادت کرنا خلاف اولیٰ ہے، باقی اگر بسم اللہ پڑھاوے تو نماز میں کچھ خلل نہ آوے گا، قال فی الدرر یقیناً تشہد ابن مسعود وجوباً کما بحثہ فی البحر وکن کلام غیر یفیدہ نہ وجزم شیخ الاسلام الجد بان الخلاف فی الافضلیۃ امہ ص ۵۳۲ واللہ اعلم، ۴ رجب ۱۳۸۵ھ

تکبیر تحریمہ کہنے کے وقت قیام فرض ہے | سوال (۳) ایک شخص مسجد میں ایسے وقت آیا کہ امام رکوع میں ہے اس نے تکبیر تحریمہ کہہ کر فوراً رکوع میں شرکت کر لی، یعنی تکبیر تحریمہ کہہ کر قیام کچھ نہیں کیا، فوراً جھک گیا تو نماز صحیح ہوئی یا نہیں؟

الجواب، اگر تکبیر تحریمہ بحالت قیام کہی ہے یا بحالت استناء کہی ہے، مگر وہ اقرب الی القیام تھا تو نماز درست ہے، اور اگر بحالت استناء کہی اور اقرب الی الركوع تھا تو نماز درست نہیں، غرض تکبیر تحریمہ کا بحالت قیام یا بحالت اقرب الی القیام ہونا فرض ہے، تکبیر تحریمہ کے بعد مزید قیام فرض نہیں، قال فی مرقاۃ الفلاح والثانی من شرط صحۃ التعریمۃ الایقان بالتعریۃ قائماً ومنعنیاً قلیلاً قبل وجود استناعہ بما ہو اقرب للركوع قال فی البرہان لو ادرك الامام رکعاً فحنی ظهرہ ثم کبر ان کان الی القیام اقرب ہم الشروع ولو اراد به تکبیر الركوع وتلفونیتہ لان مدرك الامام فی الركوع لا یحتاج الی تکبیر مرتین خلافاً لبعضہم وان کان الی الركوع اقرب لا یصح الشروع امہ ص ۱۲۷، ۳ شعبان

رضویں کوئی عضو خشک رہ گیا | سوال (۴) زید نے وضو کیا جتنے مقام کا دھونا وضو میں اور نماز پڑھ لی تو کیا حکم ہے؟ فرض ہے تو فرض کے مقام پر ایک انگل خشک رہ گیا اور

خشک کار ہنا زید کو معلوم نہیں ہے، ویسے ہی نماز پڑھ لی تو زید کی نماز ہو گئی یا نہیں، بکر نے دیکھ لیا کہ زید کا فلاں مقام پر فرض کی جگہ پر ایک انگل خشک ہے تو بکر نے زید کو دو سبب سے نہیں بتلایا، ایک سبب یہ ہے کہ زید کو کوئی بھولی چوک بتلاتا ہے تو زید کو بڑا معلوم ہوتا ہے، دوسرا سبب یہ ہے کہ بکر سے زید کی نا اتفاقی ہے، ایسی صورت میں بکر گنہگار ہوگا یا نہیں ہوگا، شرعاً حکم کیا ہے؟

الجواب؛ جب عضو مندرض خشک رہ گیا تو جس وقت زید کو معلوم ہوا اس وقت نماز کا اعادہ واجب ہے، اگر اعادہ نہ کیا گنہگار ہوگا اور اگر کبھی معلوم نہ ہوا تو اگر اس نے وضو احتیاط کے ساتھ اعضاء کو خوب مل کر کی تھی، اور اپنی طرف سے کچھ کوتاہی نہیں کی تو امید ہے کہ اس نماز کے فساد سے اس کو عذاب نہ ہوگا، اور اگر بے احتیاطی و لاپرواہی سے جلدی جلدی وضو کیا تھا تو اس نماز کے فساد کا اس کو گناہ ہوگا (۱) بکر نے اگر اس واسطے نہیں بتلایا کہ زید کو اس کی غلطی پر مطلع کرنے سے غصہ آتا اور وہ بُرا مانتا ہے تب تو صرف زید کو گناہ ہوا بکر کو نہیں ہوا، اور اگر زید اُس سے بُرا نہیں مانتا، لیکن بکر نے محض نا اتفاقی کی وجہ سے نہیں بتلایا تو بکر کو بھی گناہ ہوگا،

سوال (۵) عورت قیام کے وقت دونوں پاؤں کے درمیان کتنا فاصلہ رکھے؟
عورت قیام کے وقت دونوں پاؤں کے درمیان کتنا فاصلہ رکھے، اور کیا دونوں پاؤں کے ٹخنے بالکل ملادے؟

الجواب؛ قال فی رد المحتار وینبغی ان یکون بینہما مقدار اربع اصابع الید لانہ اقرب الی الخشوع ہکذا روی عن ابی نضل لدیوسی انہ کان یفعلہ کذا فی الکبریٰ وماروی انہم الصقوا لکعب بالکعب ارید بہ الجماعۃ ای قام کل احد بجانب الآخر (ص ۲۶۲ ج ۱) اس سے معلوم ہوا کہ بحالت قیام دونوں پیروں میں چار انگل کا فصل مناسب ہے، اور اسی حکم سے کسی جگہ عورتوں کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا، پس اُن کے لئے بھی یہی مناسب ہے، ہاں رکوع و سجود کی کیفیت مرد و عورت کی مختلف ہے، واللہ اعلم، ۸ ارشوال رحمہ

سوال (۶) درمیان خلق مشہور است کہ در اشارت تشہد میں رفع سبابہ کا اثبات اور روایات نفی کا جواب سبابہ روایات ہنی و اثبات ہرد و آمدہ لیکن چونکہ ہنی برابر اثبات

ترجیح باشد لہذا نہی اشارت را ترجیح شد و بعض خلق می گوید کہ چوں معارضہ حل و حرمت
بباید ترجیح حرمت باشد مثبتین اشارت را ازین چه جواب است ،
دیگر آنکہ مانعین اشارت می گوید کہ لفظ علیہ الفتویٰ کہ از آکد الفاظ ترجیح است ،
بر نفی اشارت لفظ و علیہ الفتویٰ بسیار در کتب مذکور است ، چنانکہ در مختار وغیرہ
و بر اثبات اشارت لفظ و علیہ الفتویٰ نیاورده لہذا نہی اشارت را ترجیح داده شود بر
اثبات اشارت ، عرض آنکہ در کتب در کدام کتاب معتمد علیہ بر اثبات اشارت لفظ
و علیہ الفتویٰ آورده یا نہ اگر آورده باشد عبارت کتاب نوشته شود و اگر نہ جواب
مانعین را نوشته شود ؟

الجواب ، امام محمد موطا میں بسند صحیح یہ حدیث نقل کر کے کان رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم اذ اجلس فی الصلوة وضع کفہ الیمنی علی فخذہ الیمنی
وقبض اصابعہ کلہا و اشار باصبعہ الی الایمہا و وضع کفہ الیسری علی
فخذہ الیسری ام فرماتے ہیں قال محمد و یضیع رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم ناخذ و هو قول ابی حنیفہ ام (ص ۱۰۶) ترجمہ :- کہا محمد نے اور ہم رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے فعل کو اختیار کرتے ہیں اور یہی قول ہے امام ابو حنیفہ کا ، ام
امام محمد کا یہ قول ہزار علیہ الفتویٰ سے آکد و مؤکد ہے ، لما فیہ من اسنادہ الاخذ الی
ضیح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ، اور مانعین اشارت کا یہ کہنا کہ اثبات اشارت
پر لفظ فتویٰ نہیں ہے غلط ہے ، در مختار میں ہے ، بل فی متن در را لبحار و شرحہ
غیر الا فکار المفتی بہ عندنا نہ یشیر باسماً اصابعہ کلہا و فی الشریعۃ
عن البرہان الصحیح انما یشیر ببسبغہ و حدھا و احتز بالصحیح عما
قل لا یشیر لانہ خلاف الدرایۃ والروایۃ ام وقال فی رد المحتار ناقلًا
عن غرر الافکار و الفتویٰ ان المفتی بہ عندنا خلافہ ای خلاف عدم الاشارة
و هو الاشارة علی کیفیۃ عقد ثلثۃ و خمسین کما قال بہ الشافعی و احمد
و فی المعیط انہا سنة یرفعہا عند النفی و یضعہا عند الاثبات و هو قول
ابی حنیفہ و محمد و کثرت بہ الآثار و الاخبار فالعمل بہ اولی ام
(ص ۵۳۰ ج ۱) اس سے معلوم ہوا کہ عدم اشارہ کے مقابل اثبات اشارہ کے لئے

لفظ معتد و صحیح و مفتی بہ و علیہ آفتویٰ والعلیٰ بہ اولیٰ بہت سے الفاظ کتب فقہ معتد علیہا میں موجود ہیں، اور محمدؐ کی کتابوں میں اسی کی تصریح ہے، پس یہی مذہب حنفیہ کا ہے، اور احادیث سے اسی کی تائید ہوتی ہے، اور کتب محمدؐ کے مقابلہ میں خلاصہ وغیرہ کی کوئی ہستی نہیں اور حرمت و حلت کا تعارض اور ترجیح حرمت کا قاعدہ وہاں ہے، جبکہ حرمت و حلت کا ورود کلام شارع میں ہو اور اس مسئلہ میں کسی حدیث سے مانعت اشارہ کی ثابت نہیں ہوئی، باقی مصنفین کے کلام میں اگر حرمت و حلت کا تعارض ہے تو وہاں مطلقاً حرمت کو ترجیح نہ ہوگی، بلکہ جو قول روایت و درایت کے زیادہ موافق ہوگا وہی راجح ہوگا، پس اشارہ موافق سنت ہے، یہی راجح ہے اور اہل سرحد و پنجاب جو اس سے روکتے اور انکار کرتے ہیں اُن پر خوف عذاب شدید ہے، واللہ اعلم، ۱۸ رمضان ۱۳۷۲ھ

سوال (۷) نماز میں بحالت سجدہ عورتیں اپنے دونوں پاؤں مردوں عورتیں سجدہ کے وقت پاؤں کیسے رکھیں، کی طرح کھڑے رکھیں یا بچھاویں، جیسا کہ قعدہ میں عورتوں کو داہنی طرف پاؤں نکال کر بچھانے کا حکم ہے، صرف قدم کے کھڑے رکھنے اور بچھلنے میں شبہ ہے، کہ اس امر میں قعدہ اور سجدہ کا عورتوں کیلئے یکساں طریقہ ہے یا کچھ فرق ہے؟ باقی سجدہ میں شک و فحزین و ذرا علین وغیرہ ملا کر پست ہو کر سجدہ کرنا عورتوں کو یہ تو معلوم ہے، کتابوں میں سجدہ کی حالت میں قدمین کو کھڑے رکھنے یا بچھانے کا حکم باوجود تجسس و تلاش کے معلوم نہیں ہوا، عورتوں کے لئے، مردوں اور عورتوں کے طریقہ نماز کا فرق جہاں کتابوں میں بتلایا ہے وہاں سجدہ کی حالت میں دو سکر فرق کو تو بتلایا ہے، مگر قدمین کو بچھا کر اور داہنی طرف کو نکال کر سجدہ کرنا عورتوں کے لئے نہیں بتلایا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں قدمین کو سجدہ میں مثل مردوں کے کھڑے رکھیں، اور آجکل عورتیں قدمین کو بچھا کر اور داہنی طرف نکال کر مثل قعدہ کے سجدہ کرتی ہیں، اگر کسی کتاب میں یہ طریقہ بتھرا مرقوم ہو تو کتاب کا حوالہ تحریر فرماویں

الجواب: از مولانا عبدالحی اللکھنوی سوال کردہ شد کہ بعض زنان ہند جو از قومہ سجدہ می روند اول بتورک نشسته پستر بہاں حالت تورک سجدہ می سازند و جمیع سجدات متورکانہ ادا می سازند ہر دو پارا بجانب راست کشیدہ، بعض علماء نفی آن می کنند و می گویند کہ نسوان عرب چنان نمی کنند بلکہ در سجدہ پارا مثل مردان قائم و انگشتان را متوجہ قبلہ می دارند و فعل نسوان ہند بلا دلیل است، فاجاب رحمہ اللہ فقہاء در کتب خود فروع

کثیرہ برائے نسواں ذکر کردہ اندکہ دران شرکت مردان نیست منجملہ ایں ہم است کہ در سجدہ
نصب قدین مثل مردان نسا زند در بحر الرائق می نویسند لا تنصب لقدمین کما ذکرہ فی المجتبى
در جامع الرموز است والمرآة تخفف اسی توقع الخفص لمہود فلا تنصب اصابع القدمین
ولا تبدی اصبعین الخ پس نہ قائم کردن زان ہند ہر دو پارا وقت سجدہ موافق اقوال فقہاء
است (ص ۷۷ ج ۱)

اس سے معلوم ہوا کہ عورت کو سجدہ میں قدین کو مرد کی طرح کھڑا نہ کرنا چاہئے، رہا یہ
کہ دائیں طرف نکال کر سجدہ کرے یا بدو ن اخراج کے سجدہ کرے تو ان دونوں میں جو صورت
زیادہ موجب ستر ہو وہ افضل ہوگی، اور بظاہر دائیں طرف پیر نکال کر سجدہ کرنے میں ضم
اللحم باللحم اور ستر زیادہ ہے فہو اولی وان لم ارہ صریحا و لکن ورد الامر بعنم اللحم ہن فی حدیث
مرسل و در مراعاة الاسترہن فی کلام الفقہاء و ہذا یؤید ما قلنا و اللہ اعلم، ۸، رجب ۱۳۸۷
اقامت کے وقت امام اور مقتدیوں کو سوال (۸) امام اور مقتدیوں کو اقامت شروع ہوتے ہی
کب کھڑا ہونا چاہئے؟ کھڑا ہونا چاہئے یا درمیان میں ہر صورت ثانی میں درمیان میں
کس لفظ پر کھڑا ہونا چاہئے، اسی طرح امام کو تکبیر تحریمہ درمیان اقامت میں کہنی چاہئے،
یا اقامت ختم ہونے کے بعد، بینوا توجسروا؟

الجواب؛ اگر امام شروع اقامت کے وقت محراب کے قریب یا مسجد میں موجود ہو تو
امام اور مقتدی دونوں کو حی علی الفلاح پر کھڑا ہونا مستحب ہے، اور بعض کے نزدیک حی علی
الصلوٰۃ پر کھڑا ہونا مستحب ہے، ابتداء اقامت ہی سے کھڑا ہونا جیسا کہ آجکل رائج ہے،
مکروہ ہے، لیکن اگر امام اقامت سے پہلے محراب پر پہنچ جاتے، تو مقتدیوں کو کھڑا ہونا
چاہئے، گو اس صورت میں امام نے خلافت اولیٰ کا ارتکاب کیا، مگر امام کے کھڑے ہو جانے
کے بعد مقتدیوں کو نہ بیٹھنا چاہئے، پس ابتداء اقامت سے مقتدیوں کا کھڑا ہونا اس وقت
مکروہ ہے جب کہ امام بوقت اقامت موجود نہ ہو، اور تکبیر تحریمہ شروع کرنا قد قامت الصلوٰۃ

۷۷ اس پر بعد میں اتنا شبہ ہوا کہ پہلے تورک کرنے میں ایک فعل زائد یعنی قعدہ کی زیادت لازم آتی ہے،
ویکن ان یقال ان التورک قبل السجدة انما ہو لیکون السجدة من ادبها بعنم اللحم باللحم بخلاف اذا سجدوا لا بد من التورک
فیکون العنم المذكور حاصل بعد لا من اول لکن لیکل علیہ زیادة الفعل لشد فلا یبغی لاجل رعایة الاستریة التی

پر مستحب ہی، اقامت کہنے والا اقامت پوری کر دے اور امام درمیان میں قدامت الصلوة پر تحریم باندھ لے، اور امام ابو یوسف کا قول یہ ہے کہ امام ختم اقامت ہونے کے بعد تحریم شروع کرے، اور بعض فقہاء نے اسی قول کو اعدل المذاہب اور اصح قرار دیا ہے، مگر حدیث سے امام صاحب کے قول کی تائید ہوتی ہے، واللہ اعلم،

قال فی نور الایضاح ومن الادب القیام ای قیام القوم والامام ان کان حاضر البقر بالمحراب حین قیل ای وقت قول المقیم حتی علی الفلاح (وقال الحسن وزفر عندی علی الصلوة کما فی سبک الانهر عن ابن الکمال اھ طحاوی) لانه امر به فیجاب وان لم یکن ظاہراً یقوم کل صفحین ینتھی الیہ الامام فی الاظهر فکلیما جا وز صفا قام ذلك الصف اھ وان دخل من قد امهم قاموا حین رأوا اھ طحاوی) ومن الادب شروع الامام الی احرامہ مذ قیل ای عند قول المقیم قد قامت الصلوة عندھا وقال ابو یوسف یش ۶ اذا فرغ من الاقامة رای بدون فصل وبه قالت الائمة الثلاثة وهو اعدل المذاہب شرح المجمع وهو الاصح قہستانی عن الخلاصة وهو الحق نھراھ طحاوی) قلت وفی مجمع الزوائد (ص ۱۸۲ ج ۱) عن عبد اللہ بن ابی اونی قال کان بلال اذا قال قد قامت الصلوة نھس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالتکبیر رواہ البزار وفیہ الحجاب بن فروخ وهو ضعیف اھ قلت ذکرہ ابن حبان فی الثقات کذا فی اللسان (ص ۱۷۹ ج ۱) وقوله نھس بالتکبیر معناه قام متلبسا به وقال الطحاوی واذا اخذ المؤذن فی الاقامة ودخل رجل المسجد فانه یقعد ولا ینتظر قائما فانه مکروه قہستانی وفیہم منه کراهة القیام ابتداء الاقامة والناس عنه غافلون اھ قلت وهو محمول علی ما اذا لم یقیم الامام عند ابتداء الاقامة والا فیقوم القوم عند قیام الامام لقوله صلی اللہ علیہ وسلم لا تقوموا حتی ترونی اھ علی قیامہم علی رویة الامام فعلى قیامہ بالاولی، واللہ اعلم، مرجعہ دی الثانیہ ۳۴۴

حی علی الفلاح کہنے کے وقت | سوال (۹) بعض پیش امام اقامت کہتے وقت مصلے سے اسام کا کھڑا ہونا | جدا کھڑے رہتے ہیں، جب حی علی الفلاح پڑھا جاتا ہے

اس وقت مصلے پر آکر کھڑے ہوتے اس کی بابت کیا مسئلہ ہے؟

الجواب؛ قال فی موافی الفلاح ومن الادب قیام القوم والامام ان کان حاضر البقرب المحراب حین قبل ای وقت قول المقیم حی علی الفلاح الخ، اس کے معلوم ہوا کہ ادب نماز کا یہ ہے کہ اگر امام اقامت کے وقت موجود ہو تو امام اور تمام مقتدی حی علی الفلاح پر کھڑے ہوں اس سے پہلے بیٹھے رہیں، باقی اس سے پہلے مصلے سے الگ کھڑے رہنا اس کی کوئی اصل نہیں، واللہ اعلم، ۳ رمضان سنہ ۱۲۸۷ھ

اقامت وقت امام اور سوال (۱۰) مقتدی کب کھڑے ہوں

..... ان امصار و بلاد میں یہ قاعدہ ہے کہ جب نماز کے واسطے اقامت شروع ہوتی ہے امام اپنے مصلے پر اور تمام مقتدی صفت میں اپنی جگہ پر کھڑے ہو جاتے ہیں، اور اس جگہ جامع مسجد سکندر آباد میں بھی ہمیشہ سے اسی طرح سے کھڑے ہوتے ہیں حالانکہ شرح وقایہ جلد اول مطبع مجتبائی صفحہ ۱۰ پر ہے، ویقوم الامام والقوم عند حی علی الصلوٰۃ اور اس کے حاشیہ پر ہے، وفيه اشارة الى انه رجل اذا دخل المسجد يكره له انتظار الصلوٰۃ قائما بل يجلس بموضع ثم يقوم عند حی علی الفلاح وبه صرح فی جامع المضمرات، جامع المضمرات کے حوالے سے شروع میں کھڑے ہونے کو مکروہ لکھا ہے، فتاویٰ عالمگیری صفحہ ۲۲۲ جلد اول مطبع نو لکشر میں ہے، ان کان المؤذن غیر الامام وکان القوم مع الامام فانه يقوم الامام والقوم اذا قال المؤذن حی علی الفلاح عند علمائنا الثلاثة وهو الصحيح (عالمگیری میں بالاتفاق اسی کو صحیح لکھا ہے) غایۃ الاوطار جلد اول مطبع نو لکشر، ص ۲۲۱ میں ہے والقیام للامام والمؤتم حین قبل حی علی الفلاح خلا فالزفر فعدہ حین حی علی الصلوٰۃ، ابن کمال شامی کا بھی حوالہ دیا ہے کہ اس میں بھی یہی طریقہ صحیح لکھا ہے، ان کتابوں میں یہ مسئلہ دیکھا کہ شروع میں کھڑا ہونے کو مکروہ لکھا ہے، اور عند حی علی الفلاح یا حی علی الصلوٰۃ کو مستحب و احسن لکھا ہے، طریقہ قدیم کو چھوڑ دیا اور مقتدیوں کو بتلادیا کہ اس طریقہ کو مستحب لکھا ہے واجب فرض نہیں، پنجوقتہ نماز میں قریب بیس پچیس آدمی سب اس کے عادی ہو گئے کہ پہلے سے ایک صف میں برابر کھڑے ہوتے ہیں اور وقت حی علی الصلوٰۃ کے کھڑے ہو جاتے ہیں، صف بھی سیدھی ہوتی ہے، جمعہ کے روز

زیادہ آدمی ہوتے ہیں، بیٹھنے میں ٹھیک انتظام نہیں ہوتا، اگر جمعہ کے روز اس مستحب طریقہ پر عمل کیا جائے تو جماعت سیدھی نہ ہوگی، اور جماعت کے سیدھی کرنے کا زیادہ اہتمام ہے، اور یہ فعل مستحب ہی، اس روز شروع سے کھڑے ہو کر جماعت سیدھی کر لیتے ہیں، عرصہ چار یا پانچ ماہ سے یہ عمل جاری ہے، اب کوئی باہر کے عالم آتے ہیں تو اس طریقہ کو بدعت و مکروہ بتلاتے ہیں، اب عرض یہ ہے کہ اگر یہ فعل متصل حتی علی الصلوٰۃ یا حتی علی الفلاح پر کھڑا ہونا بدعت یا مکروہ ہو تو اس کو چھوڑ کر اسی طریقہ پر عمل کریں یعنی شروع سے کھڑے ہو جایا کریں، مگر برائے ہر بانی بحوالہ کتب حنفی ارشاد ہو کہ شروع سے کھڑا ہونا مستحب ہی، حوالہ کتب ضرور ہو جو آجکل رسم و رواج ہے کہ شروع سے کھڑے ہو جاتے ہیں اس کو دخل نہ ہو، بلکہ بحوالہ کتب ہو، بینوا تو جروا!

الجواب: فی الحدیث عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا تقوموا حتی تردنی، اس سے یہ معلوم ہوا کہ امام کو مسجد میں آنا ہوا دیکھنے سے پہلے مقتدیوں کا کھڑا ہونا ممنوع ہے، اور یہی سمود ہے جس کو فقہار نے انتظار قانس سے بیان فرمایا ہے اور امام جب مسجد میں آجائے اور مصلے پر پہنچ جائے تو اس وقت مقتدیوں کو کھڑا ہو جانا جائز ہے، خواہ تکبیر نہ کہی ہو یا حتی علی الفلاح پر نہ پہنچا ہو حتی علی الفلاح پر کھڑا ہونا اس وقت مستحب ہی جبکہ امام بھی حتی علی الفلاح ہی پر کھڑا ہو، اور اگر وہ شروع تکبیر پر کھڑا ہو جائے تو مقتدیوں کو چاہئے کہ جس صفت کے سامنے سے امام گزرے وہ کھڑے ہو جائیں، اور جب مصلے پر پہنچ جائے تو سب کھڑے ہو جائیں، قال فی الدر فی ادب الصلوٰۃ والقیام لا امام ومؤتم حین قیل حتی علی الفلاح خلافا للزفر، فعندہ عندی علی الصلوٰۃ ان کان الامام بقرب المحراب والا رای وان لم یکن بقرب المحراب بان کان فی موضع اخر من المسجد او خارجہ ودخل من خلف ۱۲ شامی، فیقوم کل صفت ینتہی الیہ الامام علی الاظهر وان دخل من قدام قاموا حین یقع بصرہم علیہ ام (ص ۲۹۹ ج ۱)

اس سے معلوم ہوا کہ حتی علی الفلاح پر کھڑا ہونے کا استحباب ہر صورت میں نہیں بلکہ اس وقت ہے جب کہ امام مصلے پر کھڑا نہ ہو، بلکہ محراب کے قریب بیٹھا ہو، اور اگر وہ محراب کے قریب بیٹھا نہ ہو بلکہ مسجد کے کسی اور حصہ میں ہو یا مسجد سے باہر ہو

تو جس وقت وہ کھڑا ہو کر صفوف کے سامنے گزرے یہ صفوف والے اس کو دیکھ کر کھڑے ہو جائیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ امام و مقتدی کا حی علی الفلاح پر کھڑا ہونا آداب میں ہے واجبات و سنن میں سے نہیں، پس حی علی الفلاح پر کھڑا ہونا بدعت نہیں، اور اس کے پہلے بھی کھڑا ہونا بدعت نہیں، اگر امام کو مصلیٰ کیطرت آتا ہو اور دیکھ لیا جائے، البتہ اگر امام مصلیٰ کی طرف نہ آتا ہو بلکہ بیٹھا ہو یا مسجد باہر کسی کام میں ہو تو اس صورت میں مقتدیوں کو حی علی الفلاح سے پہلے کھڑا ہونا مکروہ ہے، لکن داخلہ فی السموت و ہوا لا انتظار قائمًا، واللہ اعلم، ۱۳ رجب ۱۲۵۷ھ

سوال (۱۱) زید مدعی ہے کہ مصلیٰ کو حی علی الصلوٰۃ پر اور امام کو اقامت کے وقت امام اور مقتدی کب کھڑے ہوں۔
قد قامت الصلوٰۃ پر... قیام کرنے کی کوئی دلیل نہیں، عاجز نے مظاہر حق دکھائی تو کہا اس کے علاوہ اور دلیل لائے، تو تسلیم کروں گا، دلیل مظاہر بلاحوالہ کتب ہر حدیث و فقہ و دلائل بیان فرمائیے،

الجواب: عن عبد اللہ بن ابی ادنیٰ قال کان بلال اذا قال قد قامت الصلوٰۃ خفض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالتکبیر رواہ البزار ضعفہ الہیثمی و ذکرہ ابن حبان فی الثقات رمجم الزوائد (ص ۱۸۲ ج ۱) و لسان (ص ۱۴۹ ج ۲) اس مرفوع حدیث سے معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قد قامت الصلوٰۃ پر تکبیر شروع فرما دیا کرتے تھے، اور مقتدیوں کو امام کی تکبیر سے پہلے صفت درست کرنے کے لئے اٹھنا چاہئے، تو حنفیہ کا قول ثابت ہو گیا، ۱۲ رمضان ۱۲۵۷ھ ایضاً ایضاً سوال (۱۲).....

..... امام و مقتدی نماز سے پہلے اپنی جگہ پر صفت میں بیٹھے رہیں اور تکبیر اقامت میں حی علی الصلوٰۃ کہے تب امام و مقتدی کھڑے ہو جائیں، اور نماز کی نیت کر لیں، یہ مسئلہ مفتاح البختہ اردو مصنفہ جناب مولوی کرامت علی صاحب جوہپوری مطبوعہ مطبع احمدی واقع شاہ باغ صفحہ ۳۸ و ۳۹ میں تحریر ہے، حالانکہ اس وقت تک محققین علماء کرام کا جو احناف میں سے ہیں اس پر عمل ہے، کہ شروع اقامت کے وقت امام و مقتدی کھڑے ہو کر صفوف کو ترتیب دیتے ہیں، اور کلمہ قد قامت الصلوٰۃ پر امام و مقتدی نماز کی نیت کرتے ہیں، ایک امام مسجد جو علم عربی سے بالکل ناواقف ہیں

اس مسئلہ کو کتاب مذکور میں دیکھ کر خود بھی اقامت شروع ہونے سے پیشتر اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ جاتے ہیں اور مقتدیوں کو بھی اپنی اپنی جگہ پر بیٹھنے کو مجبور کرتے ہیں، اس سے فتنہ و فساد پیدا ہونے کا اندیشہ ہی کیا کتب حنفیہ اور احادیث صحیحہ سے امام اور مقتدیوں کا اقامت کے وقت بیٹھا رہنا ثابت ہے؟ اور اگر کتب حنفیہ اور احادیث صحیحہ سے اس کا ثبوت ہے تو علماء احناف کا عمل اس کے خلاف کیوں ہے؟ اور ہمیں کس مسئلہ پر عمل کرنا چاہئے؟ جواب بدلائل مرجحت فرمایا جاوے،

الجواب؛ شروع اقامت سے کھڑے ہو جانے کا جو معمول ہے وہی بہتر ہے اس کو بدلنے کی ضرورت نہیں، اور یہ مسئلہ جو مفتاح الجنۃ میں ہے کتب فقہ میں بھی اس کی اصل مذکور ہے، لیکن اول تو اس میں فقہاء نے تفصیل لکھی ہے، نامعلوم مفتاح الجنۃ میں وہ تفصیل بھی لی ہے یا نہیں، تفصیل یہ ہے کہ اگر امام وقت جماعت سے پیشتر ہی مصلے کے قریب بیٹھا ہوا ہے تب تو حتیٰ علی الفلاح کہتے ہی سب کھڑے ہو جاویں، اور اگر امام جماعت کے وقت پر خارج مسجد سے آیا ہے تو جس صف سے امام گزرتا جاوے وہ صف کھڑی ہوئی جاوے، اور اگر امام صفوف کے سامنے سے داخل ہوا ہو تو سب صفوف امام کو دیکھتے ہی کھڑی ہو جاویں، یہ تین صورتیں تو درمختار عالمگیری وغیرہ میں مصرح ہیں، اور ایک چوتھی صورت یہ ہے کہ امام مسجد میں تو پہلے سے موجود ہی، لیکن محراب سے فاصلہ پر ہے، سو اس صورت کا حکم بھی تفصیل بالا سے معلوم ہو گیا، کہ جن صفوں سے امام آگے ہے وہ صفیں امام کے اٹھتے ہی سب کھڑی ہو جاویں، اور جو صفوف امام سے آگے بیٹھی ہیں ان میں جس صف سے امام بڑھتا جاوے وہ کھڑی ہوتی جاوے، اس چوتھی صورت کو علامہ شامی نے درمختار ہی کی عبارت سے مستنبط فرمایا ہے، درمختار کی عبارت یہ ہے (والقیام) لا امام وموتم (حین قبل حتیٰ علی الفلاح) ان کان الامام بقرب المحراب والا فبقوم کل صف یتنہی الیہ الامام علی الاظهر وان دخل من قدام قاموا حین یقع بصرهم علیہ، اور شامی نے والا فبقوم کے تحت میں لکھا ہے ای وان لم یکن الامام بقرب المحراب بان کان فی موضع آخر من المسجد وارجو دخلا من خلف (ص ۵۰۰ ج ۱) اس سے معلوم ہوا کہ یہ حکم

۱۔ بعض حتیٰ علی السلوة لکھتے ہیں، واللہ اعلم ۱۲ منہ

۲۔ مثلاً حجرہ میں دریچہ ہوا امام اس دریچہ سے آوے ۱۲ منہ

ہر حال میں نہیں ہے، بلکہ چار صورتوں میں سے صرف ایک صورت میں ہے، و نیز یہ کسی نے نہیں کہا کہ امام صاحب ضرور خواہ مخواہ جا کر بیٹھا کریں بلکہ اس مسئلہ کا منشاء صرف یہ ہے کہ اگر اتفاقاً پیشتر سے امام محراب کے قریب بیٹھا ہو تو یہ حکم ہے، پس ان امام صاحب نے اس کا اہتمام جو شرع کیا ہے یہ ان کی زیادتی ہے، ایسا اہتمام ہرگز نہ چاہئے، دوسرے یہ کہ یہ سب آداب میں سے ہیں اور ادب وہ ہے جو اکمال سنت کے واسطے مشروع ہو اور اس کے ترک پر ملامت و عتاب نہیں ہو سکتا، اگر کوئی کرے تو بہتر ہے ورنہ کچھ حرج نہیں ہے، مکما صرح بہ فی الدر المختار وغیرہ من کتب الفقہاء پس مقتدیوں کو مجبور کرنا بالکل بے جا ہے، تیسرے یہ بات غور طلب ہے کہ حتی علی الفلاح کے وقت کھڑے ہونے کا جو آداب میں شمار کیا ہے تو اس کا مقابل کیا ہے، عام طور پر لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس سے یہ ثابت ہوا کہ حتی علی الفلاح سے پہلے کھڑا ہونا خلافت اولیٰ ہے، حالانکہ یہ بھی تو کہا جاسکتا ہے کہ اس کے بعد بیٹھا رہنا خلافت اولیٰ ہے، کیونکہ اقامت کے بعد فوراً نماز شروع کر دینا مستحب ہے، اس واسطے اس کے ختم ہونے سے پیشتر کھڑا ہونا آداب میں رکھا گیا تاکہ اس سنت مستحبہ کی تکمیل ہو جاوے، پس اس بناء پر اگر اقامت کے شروع ہی سے کھڑے ہوں تو اس میں کوئی حرج نہ ہوگا، اور یہ جو احقر نے کہا ہے کہ قیام عند الحیعلہ کو اولیٰ کہنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس سے پیشتر قیام خلافت اولیٰ ہو بلکہ حیعلہ کے بعد جلوس کو خلافت اولیٰ کہنا چاہئے، اس کی طرف مرقی الفلاح کے قول میں اشارہ ہے، کیونکہ اس میں یہ دلیل لکھی ہے، لانه امر به فیجاب، اس سے معلوم ہوا کہ اصل مقصود امر کی طرف مبادرت ہے، مکما صرح بہ الطحاوی بقوله فیبادر الیہا بالقیام اور ظاہر ہے کہ مبادرت کا مقابلاً دیر لگانا ہے، بعد امر کے نہ کہ امر سے قبل مستعد ہونا، پس واضح ہو گیا کہ ہمارا معمول ہرگز خلافت اولیٰ نہیں ہے بلکہ ہم بدرجہ اولیٰ اس حکم مبادرت الی القیام پر عامل ہیں و نیز جتنا جلدی کھڑے ہوں گے اسی قدر اہتمام ہوگا تسویہ صفوف کا، پس اسکی کوئی وجہ نہیں کہ قیام قبل الحیعلہ کو خلافت اولیٰ کہا جاوے، اور اگر کسی کو شبہ ہو کہ شرح مرقی الفلاح میں تصریح ہے، واذا اخذ المؤمنون فی الاقامۃ ودخل رجل المسجد فانه یقعد ولا ینتظر قاسماً فانه مکروه کما فی المصنعات

عہ مؤلف مفتاح الجنۃ نے یہی سمجھ کر اپنی طرف سے بڑھا دیا کہ امام دمقذی سب اپنی جگہ پر بیٹھے رہیں، ورنہ کتب فقہ میں اس جملہ کا کہیں پتہ نہیں ۱۲ منہ

قہستانی و نفیم منہ کراہتہ القیام ابتداء الاقامة والناس عنه غافلون اھ، سو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ جسزنیہ اگر تسلیم کیا جاوے تو مخصوص ہوگا اس صورت کے ساتھ جبکہ امام اور قوم بیٹھی ہو کہ اس وقت آنے والے کو سب کی موافقت کرنی چاہئے خلافت کرنا کراہت سے خالی نہیں، پس نفیم منہ سے جو تفریح کی گئی ہے وہ مخدوش ہے، ہذا ما عندی واللہ اعلم وعلیہ اتم واحکم،

اور دوسرا جز جو سوال میں ضمناً مذکور ہے کہ کلمہ قد قامت الصلوة پر امام و مقتدی نماز کی نیت کرتے ہیں، ہمارے اکابر کا اس پر بھی عمل نہیں ہے بلکہ اقامت پوری ہونے کے بعد نماز شروع کرتے ہیں اور اسی کو بہتر سمجھتے ہیں، کیونکہ اس طرح مؤذن تکبیر تحریمہ میں شامل ہو جاتا ہے، اور اقامت کا جواب دینا جو مستحب ہے، اس کا بھی موقع امام اور مقتدی سب کو ملتا ہے، اور طحاوی نے اسی کو ترجیح دی ہے، لانه قال تحت قول الشربین لایہ (و) من الادب و مشروع الامام، الی احرامہ و مذقیل، ای عند قول المقیم (قد قامت الصلوة) عندهما وقال ابو یوسف یشرع اذا فرغ من الاقامة الخ ای بدون فصل و بہ قالت النعمہ الثلاثة وهو عدل للذاهب مشر المجہم وهو الاصح قہستانی عن الغلاصۃ وهو الحق نفس (ص ۱۶۲) فقط واللہ اعلم بالصواب، کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ ۲۸ جمادی الثانی ۱۳۸۸ھ

تکبیر تحریمہ اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ لٹکا کر سوال (۱۴)..... باندھ جائیں یا بغیر لٹکائے باندھ جائیں

..... نماز کی تکبیر تحریمہ اللہ اکبر کہہ کے ہاتھ لٹکا کر ناف کے نیچے باندھنا چاہئے یا ہاتھ بغیر لٹکائے باندھ لینا چاہئے، بعض عالم کہتے ہیں تکبیر تحریمہ کی اللہ اکبر کہہ کے ہاتھ لٹکا دینا پھر ناف کے نیچے باندھ لینا بہتر ہے، بعض کہتے ہیں کہ بغیر ہاتھ لٹکائے باندھنا بہتر ہے، بعض کہتے ہیں کہ تکبیر تحریمہ کی اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ چھوڑ کر پھر باندھنا مکروہ ہے، ہاتھ نہ لٹکانا چاہئے، فقط اللہ اکبر کہہ کے ہاتھ بدون چھوڑے ہوئے باندھنا چاہئے، بعض کہتے ہیں ہاتھ لٹکانا اور نہ لٹکانا دونوں قول صحیح ہیں، کسی حالت میں مکروہ نہیں چاہئے لٹکائے یا نہ لٹکائے، دونوں قولوں میں کوئی افضل نہیں، دونوں برابر ہیں، اب بندہ عرض کرتا ہے کہ امام ابو حنیفہ صاحب کا راجح قول کون سا ہے، بینوا تو جبروا؟

الجواب؛ قال فی الدرود وضع الرجل یمینہ علی ینارہ تحت سرتہ کما فرغ من التکبیر بلا ارسال فی الاصح ام قال الشافعی هو ظاهر الروایۃ وروی عن محمد بن النوار دہانہ یرسلہا حالۃ الشناء فاذا فرغ منه یضع بناء علی ان الوضع سنۃ القیام الذی لہ قرأ فی ظاہر المذہب سنۃ القراءۃ عند محمدؒ، حلیہ ص ۱۱۳ اس سے معلوم ہوا کہ ظاہر روایت اور امام ابو حنیفہؒ کا قول تو یہ ہے کہ تکبیر کہہ کے ہاتھوں کو بدون چھوڑے ہوئے باندھ لے، اور امام محمدؒ کا قول یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ میں ہاتھ اٹھا کر چھوڑ دے اور جب تک شمار پڑھتا رہے اُس وقت تک ہاتھ چھوڑے رکھے، جب قرأت یعنی الحمد شروع کرے اس وقت باندھ لے، اور اصح قول اوّل ہے، باقی یہ قول کسی کا نہیں کہ اللہ اکبر کہتے ہوئے ہاتھ اٹھائے پھر چھوڑ دے پھر فوراً ہی باندھ لے کہ اس صورت میں یہ ارسال محض لغو ہے، واللہ اعلم، ۲۶ رذی الحجہ ۱۲۲۳ھ

سوال (۱۵) نماز میں تکبیرات کہنا واجب؟
 واجب پڑ یا سنت؟ الجواب؛ تکبیر تحریمہ تو فرض ہے اور باقی رکوع و سجدہ کی تکبیریں سنت ہیں، کما فی العالمگیریۃ (ج ۱ ص ۲۲) فرائض الصلوة وہی ست منها التحریۃ وفيہ ایضاً ص ۲۵، سنہارفع الیدین للتحریۃ الی ان قال وتکبیر الركوع وتسبیحہ ثلاثاً واخذ رکبتيہ بید یہ وقف یح اصابعہ وتکبیر السجود والرفع، احقر عبد الکریم گہتلوی عفی عنہ
 الجواب؛ نعم، ظفر احمد عفا عنہ، ۵ رذی الحجہ ۱۲۲۳ھ

سوال (۱۶) باسمہ تعالیٰ؛ ایہا العلماء العاملون رکوع میں الصاقِ رجلین سنت ہے یا نہیں؟ والفضلاء کاملون ما تقولون فی الصاقِ رجل کعبیہ فی الركوع والسجود ایدھو من سنن الصلوة ام لا وبای حدیث صحیح ثابت ہو، ومن القائل بہ من الائمة المعترین وکثیر من علماء ہذا الزمان ینکرون سنیۃ ذلك ومنہم صاحب السغایۃ وغیرہ بینوا بالتحقیق وتوجروا علی الیقین ونحن نرید ان نطبع فتوکم،

الجواب؛ لم نجد حدیثاً صریحاً فی سنیۃ ہذا الصاق فی الركوع والسجود ولم یذکرہ من فقہائنا الا صاحب الدرر وشارح المنیۃ ومن

تبعها وهم قليل ولم يتعرض له القدوري ولا صاحب الكنز والوقاية وغيرهم من اصحاب المتن المعتمدة الناقلين لظاهر الرواية وفي ترجيح الراجح لشيخنا قال علاء الدين الكهنوي في السعاية ان قدوة الفائلين بسنية اللصاق من الحنفية هو الزاهد وهو ان كان اما ماجليا في الفقة لكنه مشهور بنقل الروايات الضعيفة صرح به ابن عابدين في تقيح الفتاوى الحامدية وفي الفوائد البهية انه كان معتزلي العقائد حنفى الفروع (النور ص ۶) متعلق شعبان سلمه) وكلام الطحاوى في معاني الآثار يفيد ان اللصاق ليس مشروعا في شئ من الاعضاء في الركوع ولا في السجود (للرجال) بل المشروع عكسه اى التجاني بينهما قال الطحاوى في بحث التطبيق ثم التمسنا لكم ذلك من طريق النظر كيف هو فرأينا التطبيق فيه التقاء اليدين ورأينا وضع اليدين على الركبتين فيه تفرقهما فارادنا ان ننظر في حكم اشكال ذلك في الصلوة كيف هو فرأينا السنة جاءت عن النبي صلى الله عليه وسلم بالتجاني في الركوع والسجود واجمع المسلمون على ذلك فكان ذلك من تفرق الاعضاء وكما قام في الصلوة امران يراوح بين مية قدوى ذلك عن ابن مسعود وهو الذى دوى للتطبيق فلما رأينا تفرق الاعضاء في هذا بعضها من بعض دوى من اللصاق بعضها بعضا فاختلوا في الصلوة وتفرقوا في الركوع كما نظر على ذلك ان يكونا مختلفا في ذلك معطو على ما اجمعوا عليه منه فيكون كما كان التفرق فيما ذكرنا افضل يكون في سائر الاعضاء كذلك ام (ص ۱۳۵) وبعد ذلك فلا حاجة الى اقامة الدليل على سنية هذا اللصاق اذا ثبت ضعف نقله في المذهب ونص الطحاوى على سنية التجاني بين الاعضاء في الركوع والسجود جميعا والله تعالى اعلم

مسئله رفع يدين | سوال (۱۴) حديث عدم

رفع يدين بروایت برابر بن عاذب ابوداؤد میں موجود ہے اس میں راوی یزید بن ابی زیاد میں علماء حدیث کو بہت کلام ہے، اور کہتے ہیں کہ ان کا حافظہ بوقت زیادتی لا یعود کے فاسد ہو گیا تھا، ابن حبان و بخاری و بیہقی و حاکم و دارقطنی و غیرہم نے ایسا ہی کہا ہے، اور حافظ عینی نے ہنا یہ عمدۃ القاری میں اس کا جواب دیا ہے اور کہا ہے کہ یعقوب بن سفیان و ابن شایہن و غیرہ نے ان کی توثیق کی ہے، لہذا عرض ہے کہ سوا حافظ عینی

کے اور بھی کوئی مصنف معتمد اپنی حفاظ کی توثیق یزید بن ابی زیاد کے بارے میں نقل کرتا ہے ہاں حافظ زلیعی نے تخریج ہدایہ میں ابوالحسہ سے نقل کی ہے مگر نہیں معلوم کہ یہ ابوالحسہ رجال جرح و تعدیل سے ہیں یا نہیں، امید کہ جواب باصواب تسلی فرما دیں گے،

الجواب؛ مسئلہ رفع یدین کے متعلق حضرت مولانا خلیل حسد مدنیوہم نے ”بذل الجہود فی حل ابی داؤد“ جلد دوم میں بہت مبسوط تحریر فرمائی ہے کہ اس قدر جامع اور مبسوط تحریر اور جگہ نہیں مل سکتی، اس کے صفحہ ۷ پر جو ہر نفی سے نقل کیا ہے ثم حکى البيهقي عن الدارمي انه قال ويحقق قول بن عينة ان الثوري وزهيرا وهشيم ما و غيرهم من اهل العلم لم يجيئوا بهاراي زيادة لم يعد، انما جاء بهما من سمع منه باخرة قلت يعارض هذا قول ابن عدي في الكامل رواه هشيم وشريك وجماعة معهما عن يزيد باسنادة وقالوا فيه ثم لم يعد الخ پھر تحریر فرمایا ہے قلت قولهم ان زيادة لقطة ثم لا يعود مدرج من قول يزيد ابن زياد لقن فتلقن بطله مارواه عيسى بن عبد الرحمن والحكم بن عتيبة عند البيهقي والطحاوي ابی داؤد كلاهما ثقتان بل عيسى بن عبد الرحمن ثقة ثبت واما قولهم بان حدیث عيسى والحكم رواه عنهما محمد بن عبد الرحمن بن ابی لیلی وهو ضعيف فالجواب عنه ان الساقط قال فی المہذب بعد نقل تضعيفه قال ابو حاتم عن احمد بن يونس ذكره زائدة فقال كان افقه اهل الدنيا وقال العجلي كان فقيها صاحب سنة صدوقا جامع الحديث وكان عالما بالقرآن وكان من احسن الناس كان جميلا نبیلا وقال يعقوب بن سفيان ثقة عدل في حديثه بعض المقال لئن الحديث عندهم الى ان قال فتأيد حديث يزيد بن زياد بعد يث عيسى والحكم وتأييد رواية محمد بن عبد الرحمن بعد يث رواه جماعة من المحدثين عن يزيد بن ابی زیاد ملخصا، کتبہ الاحقر عبد الكريم عفی عنہ، ارجو

رفع یدین در قنوت وتر | سوال (۱۸) |

..... ایک غیر مقلد صاحب نے مذہب احناف پر اعتراض کیا جس کی وجہ سے عوام میں فتنہ بپا ہے کہ وتر میں قبل دعاء قنوت جو رفع یدین و تکبیر مروج ہے یہ حدیث سے ثابت نہیں، لہذا بدعت سیئہ ہے، اور ہم نے ہر چند بموافقت استطاعت کتب حدیث و فقہ

میں تتبع و تلاش کی، لیکن دربارہٴ رفع یدین اثر ابن مسعود و ابراہیم نخعیؒ کچھ نہ ملا اور دربارہٴ تکبیر حدیث علیؓ جس کو صاحب بدائع نے مرفوعاً نکالا ہے لیکن اس کی تخریج معلوم نہیں، لہذا اگر کوئی حدیث صحیح دربارہٴ رفع یدین و تکبیر ہو تو عبارت مع حوالہ کتاب و صفحات تحریر فرمادیں، اور کوئی حدیث صحیح نہ ہو تو عوام کے سمجھانے کی کوئی بہتر صورت تحریر فرمادیں امید کہ جلد جواب تحریر فرما کر عند اللہ ماجور ہوں گے، بینوا توجروا،

الجواب: فی حاشیۃ آثار السنن (ص ۱۱) قلت وقد ثبت رفع الیدین فی مطلق القنوت عن عمر بن الخطابؓ اخرج البخاری فی جزء رفع الیدین باسناد صحیح عن ابی عثمان قال کنا وعمر یؤم الناس ثم یقنت بنا عند التکویع یرفع یدیه حتی یشد کفاه ویخرج ضبیعه وعنه قال کان عمر یرفع یدیه فی القنوت رواه البخاری فی جزء باسناد حسن وقال البیهقی فی المعرفة وروی فی رفع الیدین فی قنوت الوتر عن ابن مسعودؓ وابی ہریرۃؓ وامام وفیه ایضاً ص ۱۹) وعن طارق بن شہاب قال صلیت خلف عمرؓ صلوۃ الصبح فلما فرغ من القراءة فی الركعة الثانية کبر ثم قنت ثم کبر فکرم رواه الطحاوی واسناده صحیح،

پس حضرت عمرؓ سے مطلق قنوت میں رفع یدین صحیح سند سے ثابت ہوا، اور موقوف مالا بدرك بالرائی میں حکماً مرفوعاً ہوتا ہے اور نمازیں ہر رفع یدین میں تکبیر ہے، اس لئے تکبیر بھی ضمناً ثابت ہو گئی، اور دوسری روایت میں تکبیر کی تصریح ہے، باقی رہی یہ بات کہ وہ قنوت فجر کے بارہ میں ہی سو قنوت فجر وغیر فجر میں فرق ہونے کی دلیل کیا ہے، اور اثر ابن مسعود و نخعیؒ کی آثار السنن میں تصریح کی ہے، وقال ابن قدامة فی المغنی وروی عن عمر انه کان اذا فرغ من القراءة فی الوتر کبر ام وروی السیوطی فی معجمہ الکبیر حد شاعلی ابو نعیم شاعبد السلام بن حرب عن لیث عن عبد الرحمن بن الاسود عن ابيه ان عبد الله (ابن مسعود) کان یکبر حین یفرغ من القراءة ثم اذا فرغ من القنوت کبر وکرم ام قال النیموی رجال اسناده کلهم ثقات الا لیثا و هو ابن ابی سلیم ام ر من التعليق الحسن ص ۲۱) قلت لیث وثقة ابن معین واخرج له مسلم واستشهد به البخاری فالحدیث حسن و فی آثار السنن (ص مذكور) عن الاسود عن عبد الله انه کان یقرأ فی آخر رکعة

مع یتم قنوت الوتر وخیرہ ۱۲ منہ

من اوت قل هو الله ثم يرفع يديه فيقنت قبل الركعة رواه البخاري في جزء رفع اليدين واسناده صحيح ام

پس عبد اللہ بن مسعودؓ سے وتر کی قنوت میں رفع یدین اور تکبیر کا ثبوت سند صحیح حسن سے ہو گیا ہے، اور صحابی کا فعل و قول حجت ہے خصوصاً ابن مسعود و عمر رضی اللہ عنہما کا کہ ایک خلفائے راشدین میں سے ہے جن کے اقتدار کا ہم کو حکم ہے اور دوسرے صحابی کی بابت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے رضیت لامتی ما رضیہ ابن ام عبد و قال اقتدوا بالذین من بعدی ابی بکر و عمر اب جو اس تکبیر و رفع کو بدعت کہتا ہے وہ خود مبتدع ضال ہے اور حضرت علیؓ کی روایت کے متعلق تحقیق نہ ہو سکی، فقط عبد الکریم عفی عنہ الجواب صحیح، ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۳ شعبان المعظم ۱۴۲۲ھ

جماعت میں اگر مقتدی سے ٹوٹی فرض یا سوال (۱۹) درمیان نماز اگر مقتدی سے فرض یا واجب نہ ہو جائے تو اس کو کیا کرنا چاہئے؟ واجب کا سہو ہو جائے تو کیا کرے، پھر سے نماز پڑھے امام سے الگ ہو کر یا نیت توڑ کر الگ ہو جائے، یا وقت سلام وہ مقتدی سجدہ سہو کرے، جس طرح دفعیہ ہوتا ہو تو تحریر فرمائیے،

الجواب؛ اگر درمیان میں فرض فوت ہو جائے تب تو نیت توڑ کر اسی وقت از سر نو نیت باندھ کر امام کے ساتھ شامل جماعت ہو جائے، اور اگر واجب فوت ہو جائے تو کچھ نہ کرے، نہ نیت توڑے نہ سجدہ سہو کرے، مقتدی کو ترک واجب سہو معاف ہی اور عمدت ترک ہو تو بعد جماعت کے نماز کا اعادہ کرے،

سوال (۲۰) نماز میں دل سے نیت کرتے وقت نماز میں نیت کرتے وقت بجائے عصر کے مغرب کی نیت کر لی تو نماز ہو جائیگی یا نہیں؟ سہو اگر دل ہی میں بجائے وقت عصر کے وقت مغرب زمین میں آگیا، اور تکبیر تحریمہ کہہ کر نیت باندھ لی، پھر معاً خیال آیا کہ میں نے غلطی کی تو وہ نیت توڑ کر پھر سے نیت کرے، یا نماز پڑھ لے؟

الجواب؛ اس صورت میں نیت درست نہیں ہوئی، جب کہ نیت ہی میں غلطی ہو، پس دوبارہ صحیح نیت سے تکبیر تحریمہ کے ساتھ نماز شروع کرنا لازم ہے، واللہ تعالیٰ اعلم، رحمہ

سوال (۲۱) کوئی کان میں نماز پڑھنے سے متعلق ایک ہتھیار، جس جگہ ہم لوگ رہتے ہیں وہاں پر رکھا ہے، کوئلہ کی زمین کے اندر

سے کوئلہ نکالا جاتا ہے، لہذا جو لوگ مسلمان غریب اس میں کام کرتے ہیں کوئلہ کاٹتے ہیں اور گاڑیوں میں بھرتے ہیں، وہاں پر پانی بھی ملتا ہے، مگر اندھیرا سخت، قیامت کا نمونہ ہے، وہاں پر لوگ نماز پڑھتے ہیں، لیکن مسئلہ پوچھتے ہیں، کیونکہ جس جگہ وہ لوگ کام کرتے ہیں، جگہ بہت خراب ہے، اور حالت یہ ہے کہ کپڑا جسم میں صرف فرض یعنی ستر ڈھانکنے کے لائق ہوتا ہے، بعض تو لنگوٹ باندھ کر کام کرتے ہیں، بچے بھی پانی ہے، پانی کی جگہ سے کوئلہ ٹوکری میں بھر کے گاڑی میں لادتے ہیں، اس پر اوپر سے پانی مثال سوتوں کے ٹپکتا رہتا ہے، اور گرمی بھی بعض جگہ ایسی ہے کہ پسینہ کثیر ہر وقت جاری رہتا ہے، اسی حالت میں کوئلہ اٹھانا پڑتا ہے اور کان میں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے کہ جماعت ہو جاوے اگر کوشش کی جاوے تو مع امم کے چار یا پنج پڑھتے ہیں جماعت کے ساتھ، مگر اکثر جگہ گیل پانی جاتی ہے وہاں پر نماز چھوڑ دینا چاہیے یا کہ نہیں، اور عورت و مرد دونوں مل کر کام کرتے ہیں، اور دونوں مسلمان ہیں، کس صورت سے نماز پڑھیں، کیا حکم فرماتے ہیں، اور یہاں پر کام کرنے کا وقت ۸ بجے صبح سے ۸ بجے رات تک ہی، اور دوسرے وقت ۸ بجے رات سے ۸ بجے صبح تک کام ہوتا ہے، دو وقتہ کام ہوتا ہے، یعنی یہ کارخانہ چوبیس گھنٹہ چالو رہتا ہے، اتوار کی رخصت ملتی ہے، جو شخص اس ہفتہ دن میں کام پر جاوے گا وہ اگلے ہفتہ رات کو کام پر جاوے گا، اول تو وہاں رات اور دن دونوں کی ایک صورت ہے، گھڑی کے ذریعہ سے وقت معلوم ہوتا ہے، اور جس جگہ زمین کے اندر جاتے ہیں اس جگہ سے کام کرنے کی جگہ آدھ میل یا آدھ میل زیادہ درجا پڑتا ہے، بلکہ بعض ایک میل زائد درجا پڑتا ہے، اول وقت معلوم کرنے کی قلت ہے، دوسرے پانی کی سخت تکلیف ہے، اور وہاں پر پانی بہتا رہتا ہے، نالی سے نگر اس میں لوگ شبہ اور کراہت کرتے ہیں، کیونکہ وہیں پر لوگ پاخانہ بشتاب کرتے ہیں، اور جگہ جگہ نالی کے سرے پر اکثر غلیظ پایا جاتا ہے، بہت سخت تکلیف ہے، اگر اوپر اٹھ کر نماز پڑھی جاوے تو وقت بہت سا برباد ہو جاتا ہے، اور جو کام ہم لوگ کر کے آتے ہیں وہ کوئی دوسرا لے لے گا، یعنی کوئلہ گرایا ہے، ہم گئے نماز پڑھنے تو دوسرے شخص نے آکر لے لیا، ہماری محنت ضائع گئی، اور ہم نماز ہی کے لئے تین دفعہ گئے وقت ختم ہو گیا، دوسرے کا وقت آ گیا، یعنی ۸ بجے، اب ہم کو کل پھر صبح ۸ بجے گاڑی ملے گی، اور ہم کوئلہ کاٹ کر لائیں گے، ہم لوگ کیا کریں، سخت مجبور ہیں، اب حضور بتلا دیں کہ یہ لوگ نماز

پڑھتے نہیں، اگر کہتے ہیں تو سو سو اعتراض کرتے ہیں، اور حیلہ و حجت کرتے ہیں، اور جو لوگ نماز کے شوقین ہیں وہ پانی کے ناپاک ہونے کے خیال سے اوپر سوکھی مٹی لیجاتے ہیں، اور تیمم کر کے نماز پڑھتے ہیں، وہ وہ لوگ ہیں جو سرداروں میں سے ہیں، حضور کیا حکم دیتے ہیں کہ وہاں پر تیمم جائز ہوگا یا کہ نہیں یا کہ اس پانی سے وضو جائز ہوگا، اور جگہ گیلی ہوگی متعلق کیا حکم ہوتا ہے یا ایسی جگہ نماز چھوڑ دیتے کا حکم ہے یا اوپر آکر قضا پڑھنی چاہئے، اس لئے ہم نے تفصیل لکھا ہے، آدمی جب کھاد سے اوپر اٹھتا ہے تو ایک دم کالا بھوت ہو جاتا ہے، اور زمین کے نیچے ایک ہزار یا ڈیڑھ ہزار فٹ نیچے جا کر یہ سب کام ہوتا ہے، بعض جگہ کم ہے پانچ سو یا سات سو فٹ ہے جو حکم ہو وہی کیا ہوا ہے؟

الجواب: جگہ ناگلیلا ہونا نماز سے مانع نہیں، گیلی جگہ پر نماز درست ہو جاتی ہے، جب کہ زمین پر پیشانی جم جائے، اور جو پانی اس جگہ نالی سے بہتا ہے وہ پاک ہے، جب تک پانی میں غلیظہ و نجاست کی بو وغیرہ ظاہر نہ ہو، پس جو لوگ کونہ کی کان میں کام کرتے ہیں، ان کو ایسی جگہ جہاں وہ کام کرتے ہیں نماز پڑھنا چاہئے، اور وقت کو اور قبلہ کے رخ کو انداز سے معلوم کرنا چاہئے، اور نماز کے وقت ستر کو اچھی طرح ڈھانک لینا چاہئے، پھر اگر سہولت ہو تو جماعت سے نماز پڑھیں، اور اگر دشواری ہو تو الگ الگ ہی پڑھ لیں اور جب تک بہتے ہوئے پانی میں نجاست کا اثر ظاہر نہ ہو اس وقت تک اس کو ناپاک سمجھنا غلط ہے، اور تیمم جائز نہیں بلکہ وضو کرنا واجب ہے، ہذا واللہ اعلم، ۲۷ رمضان ۱۳۷۴ھ

سوال (۱۲۲) مقتدن اگر قعدہ اخیر میں الخیات درود و دعا ترک کر دے تو نماز واجب الاعادہ ہوگی یا نہیں؟

الجواب: اگر سہواً قشہر نہیں پڑھا، تو اعادہ لازم نہیں، اور اگر عمدتاً ترک کیا ہو تو نماز تو اس صورت میں بھی ہو گئی، مگر اعادہ لازم ہے، تاکہ ترک واجب عمدتاً سے جوخلل آگیا ہے وہ مرفع ہو جاوے، ۳۱ رمضان المبارک ۱۳۷۴ھ

سوال (۲۳) آجکل میز وغیرہ سب پر جو روغن میز وغیرہ پر ناپاک روغن اور پالش لگایا گیا ہو اس پر بغیر کٹر اڈالے نماز پڑھنا کیسا ہے؟

ہوتا ہے اس پالش میں شراب کی آمیزش مسموع ہے، دریں صورت بلا بسط ثوب اس پر نماز جائز ہے یا نہیں؟

الجواب؛ ایسی میز پر بلا سبطِ ثوب نماز پڑھنا خلافِ احتیاط ہے، ۱۲ رمضان ۱۴۲۸ھ
بِحالت نماز بارش ہونے لگے | **سوال (۲۱۲)** جماعت کے ساتھ صحن میں نماز ہو رہی ہو، ایسی
تو ایسی حالت میں کیا کرنا چاہئے؟ حالت میں پانی برسے لگے تو کیا کرنا چاہئے؟

الجواب؛ پانی برسنا نماز سے مزاح نہیں، نماز پڑھتا رہے، اور اطمینان سے
پڑھتا رہے، اس کے بعد خدائے کبڑے دیئے ہوں تو گیلے اتار کر سوکھے پہن لے، اور کپڑے
نہ ہوں تو انہی کو سکھا کر پڑھ لے، البتہ اگر کسی کو بارش میں نماز پڑھنے سے بیمار ہونے کا اندیشہ
ہو وہ جلدی جلدی نماز پوری کر لے، اور اگر زیادہ خطرہ ہو تو نماز توڑ کر اندر چلا جائے، واللہ
تعالیٰ اعلم، ۱۲ صفر ۱۴۲۸ھ

کیا یہ صحیح ہے کہ جسکو ترجمہ قرآن | **سوال (۲۵)** بکر کہتا ہے کہ جس شخص کو ترجمہ قرآن نہیں آتا اس کی
نہ آتا ہو اس کی نماز نہیں ہوتی، نماز ہرگز نہیں ہوتی اور نہ اس کو تلاوتِ فتران کا ثواب ملتا ہے،
نہ اس کو تلاوت کا ثواب ملتا ہے؟ اس پر بعض لوگوں نے نماز پڑھنا اور تلاوت کرنا چھوڑ دیا، اس کا
جواب مدلل دیا جائے؟

الجواب؛ دلیل کا بیان کرنا خود اس شخص کے ذمہ ہے، کیونکہ وہی مدعی ہے، اور
دعویٰ بلا دلیل مسموع نہیں، لہذا یہ قول غلط ہے، نیز ہم تبرعاً کہتے ہیں کہ اس شخص کا قول
فاقر اذ انما تيسر منه کے خلاف ہے، کیونکہ جو شخص فتران پڑھنے پر قادر ہے اور ترجمہ
سمجھنے پر قادر نہیں تو یہ آیت اس کو صرف قرأتِ قرآن کا مکلف بناتی ہے، اور اس سے اس کی
نماز صحیح ہو جائیگی لانیان المامور بہ، ترجمہ کی قید لگانا تبسیر کے خلاف ہے، دوسرے ہم پوچھتے
ہیں کہ قرآن نظم عربی کا نام ہے یا نظم عربی مع الترجمة کا، شوق ثانی باطل ہے، ورنہ لازم آئے گا
کہ صبیان و جہلاء تلاوتِ قرآن کے وقت قاری قرآن نہ ہوں، بلکہ وہ قرآن کے سوا کچھ اور
پڑھتے ہوں، اور یہ لغو ہے، پس شوقِ اول متعین ہے، تو اس کے تحقق سے قرأتِ فتران کا
تحقق ہو گیا، اور یہی شرطِ صلوٰۃ و ثواب ہے، اس سے زیادہ شرطِ صلوٰۃ و ثواب نہیں،
سجدہ میں باتے ہوئے پہلے | **سوال (۲۶)** سجدہ میں جب جاتے ہیں تو پہلے سر ٹیکے یا ناک
سر ٹیکے یا ناک.....؟ ٹیکے، اور جب اٹھتے تو پہلے سر اٹھا دے یا ناک اٹھا دے؟

الجواب؛ سجدے میں جلتے ہوئے پہلے سر رکھے پھر ناک اور اٹھتے ہوئے کوئی
ترتیب مذکور نہیں، اور ظاہر یہ ہے کہ دونوں ساتھ ہی اٹھائے جائیں، قال فی الدرشم

وجہہ مقدّمًا انفہ لما مَرَّای لقربہ من الارض لما قال الشامی لکن فی البداء
ومنها ای من السنن ان یضع جہتہ ثم انفہ وقال بعضهم انفہ ثم جہتہ و
مقتضاه اعتماد تقدیم الجہتہ وان العکس قول البعض ام قال فی الدرر و عکس
مفوضہ قال الشامی وهل یرفع الالف قبل الجہتہ ای علی القول بانہ
یضعہ قبلہا قال فی العلّیۃ لم اقف علی صریح فیہ ام (ص ۲۵) واللہ اعلم
۱۶ رجب سنہ ۱۳۴۴

بدون عذر فرض، وتر اور سنت فجر | سوال (۲۷) یہاں پر عورتوں کا دستور ہے کہ جب
بیٹھ کر پڑھنے سے نماز نہیں ہوتی، نماز پڑھتی ہیں تو پہلے کھڑی ہو کر ایک رکعت چاہے
فرض ہوں یا سنت پڑھتی ہیں، باقی نماز بیٹھ کر پڑھتی ہیں اور یوں کہتی ہیں کہ ہمارے
واسطے یوں ہی حکم ہے، آپ فرماویں کہ یہ نماز ہوتی ہے یا نہیں، اور حالانکہ تندرست
ہیں اور کوئی تکلیف نہیں،

الجواب؛ فرض اور وتر سنت فجر میں بدون عذر بیٹھنا جائز نہیں، نماز درست
نہ ہوگی، اور بقیہ سنن مؤکدہ میں بلا عذر قعود مکروہ ہے، شامی (ص ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱)
کھڑا ہو کر پڑھنا ضروری ہے، اور مرد و عورت کا ایک ہی حکم ہے اور نفل میں ایسا کرنا جائز
ہے کہ ایک رکعت کھڑی ہو کر پڑھی جائے باقی بیٹھ کر دوہو الاصح، اور اس میں بھی مرد
عورت برابر ہیں، مگر یہ صورت صاحبین کے نزدیک نوافل میں بھی جائز نہیں، ہاں یہ
جائز ہے کہ نوافل کو اول سے اخیر تک بیٹھ کر پڑھے (شامی ص ۲۹، ج ۱) نیز نوافل
میں یہ بھی اتفاقاً جائز ہے کہ دو رکعت قیاماً پڑھے اور دو رکعت جالساً، لان کل شفعة
منہا صلوٰۃ علیحدۃ، (شامی ص مذکور) اسی طرح شروع میں بیٹھ کر پڑھنا پھر کھڑا ہونا
احقر عبد الکریم عفی عنہ، ۱۷ ربیع الثانی سنہ ۱۳۴۴
بالاتفاق جائز ہے،

مسئلہ سمت قبلہ | سوال (۲۸) سوال یہ ہے کہ کلکتہ، پٹنہ، گیا اور الہ آباد سے مکہ معظمہ
پچھم دکن کی طرف ہے، اس لئے خیال ہوتا ہے کہ نماز پڑھتے ہیں قبلہ کی طرف رخ کرنے کی یہ
صورت ہوگی کہ ذرا سا دکن مڑتے ہوئے پچھم کے رخ کھڑے ہوں، مگر ایک عالم صاحب
ہیئت دان یہ فرماتے ہیں کہ ان شہروں میں پچھم سے ذرا اتر کر کی طرف مڑتے ہوئے کھڑے
ہونے سے مصلیٰ قبلہ رخ ہوگا، یہ فرمانا ان کا صحیح ہے یا نہیں، اور نماز میں ان مذکورہ

جگہوں میں کس طرف کھڑا ہونا چاہئے، یا ٹھیک کچھ کی طرف؟ بینوا تو حیرا،
الجواب؛ فی الدرودھ فی القرائی والامصار معاریب الصحابة والتابعین
 وقال الشامی تحتہ فلا يجوز التحری معها زیلعی بل علينا اتباعهم خانیة ولا
 يعتمد علی قول الفلکی العالم البصیر الثقة ان فیہا انحرافا خلافا للشافعیة
 فی جمیع ذلك كما بسطہ فی الفتاوی الخیریة الخ وقال الشامی ایضا بعدہ
 قلیلا والظاهر ان الخلاف فی عدم اعتبارہا رای النجوم، انما ہو عند
 وجود المحاریب القدیمۃ اذ لا يجوز التحری معها كما قد مناه لعل تلزم
 تخطئة السلف الصالح وجماہیر المسامین بخلاف ما اذا کان فی المفاہرۃ
 الخ، ص ۲۲۷ ج ۱)

اس سے معلوم ہوا کہ جمہور مسلمین نے جس سمت پر مساجد بنائی ہیں ان کو غلط نہ کہنا چاہئے
 پس تدقیقات مذکورہ فی السؤال سے احتراز لازم ہے، اور اگر کوئی شخص اپنے قواعد کو صحیح
 گمان کر کے تھوڑا بہت تفاوت مساجد عامہ میں ثابت بھی کر دے تو اس سے سمت کا غلط
 ہونا لازم نہیں آتا، جیسا کہ قول در (وغیرہ) اسی لغیر معاینہ (اصناف جہتہا) کے تحت میں
 شامی کے ملاحظہ کرنے سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے، اور در والوں کو سوائے جہت کے اور
 کیا معلوم ہو سکتا ہے، عین کعبہ کی طرف متوجہ ہونے کے واسطے ہمارے پاس کیا ذریعہ
 ہے، واللہ اعلم، کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ

الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ، ۷ رجب ۱۳۵۸ھ

نماز جنازہ کی وضو سے | سوال (۲۹) نماز جنازہ کی وضو سے نماز ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب؛ جس وضو سے نماز جنازہ پڑھی جاوے اس سے فرض
 وغیرہ پڑھنے میں کچھ مضائقہ نہیں، احقر عبد الکریم عفی عنہ، ۱۲ رجب ۱۳۵۸ھ، الجواب صحیح ظفر احمد عفی عنہ

چوتھی رکعت کو تیسری خیال کر کے کھڑے ہونے | سوال (۳۰) نماز میں درمیانی قعدہ سہواً
 کے بعد یاد آیا تو کیا کرنا چاہئے؟؟ رہ جاوے اور کھڑے ہو جانے کے بعد یا کھڑے

ہو جانے کے قریب یاد آوے تو بیٹھنا نہیں چاہئے، بلکہ سجدہ سہو کر لینا چاہئے، لیکن آخری قعدہ
 (چوتھی رکعت کو تیسری رکعت خیال کرنے کے وقت کھڑا ہو جاوے اور کھڑے ہونے کے
 بعد یا کھڑے ہو جانے کے قریب یاد آوے کہ یہ چوتھی رکعت تھی تو بیٹھ جانا چاہئے یا بیٹھنا

نہیں چاہئے، بلکہ ایک رکعت اور پڑھ کر سجدہ سہو کرنا چاہئے؛
الجواب: تعدہ اخیرہ کو بھول کر کھڑے ہو جانے کی صورت میں بیٹھنا ضروری ہے؛
 حتیٰ کہ اگر پانچویں رکعت کا رکوع بھی کر چکا ہو تب بھی بیٹھ جاوے اور بہر حال سجدہ سہو کر لے
 نماز ہو جاوے گی، البتہ اگر پانچویں رکعت کا سجدہ کر چکا ہو تو اب یہ نماز نفل ہو چکی فرض
 دوبارہ پڑھنا پڑیں گے، ۱۵ رمضان ۱۴۲۸ھ

سوال (۳۱) نماز میں شیطانی وساوس اور دنیاوی خیالات آنا، نہ ہو، اور دنیاوی خیالات نہ ہوں؟

الجواب: جہاں تک ہو سکے قرأت اور تسبیح وغیرہ کی طرف دھیان رکھیں، رفتہ
 رفتہ عادت پختہ ہو جاوے گی، اور باوجود اس کوشش کے پھر بھی خود بخود دھیان اور طرف جاد
 تو کچھ حرج نہیں فقط اتنا ضروری ہے کہ اپنا ارادہ دوسری طرف خیال نہ کری، احقر عبد الکریم عفی عنہ رشوال ۱۴۲۸ھ **الجواب صحیح**، ظواہر، رشوال
 نماز کے بعد جو سر پر ہاتھ رکھا جاتا ہے **سوال (۳۲)** بعد فرض نماز جو سر پر ہاتھ رکھتے ہیں کیا اس
 اس وقت کچھ پڑھنا بھی چاہئے یا نہیں؟ میں کچھ پڑھنا بھی چاہئے؟

الجواب: بسم اللہ الذی لا الہ الا هو الرحمن الرحیم اللہم اذهب
 عنی الہم والحزن پڑھتے ہیں، رشوال ۱۴۲۸ھ

سوال (۳۳) عورت سجدہ میں پاؤں کس طرح رکھے بہشتی زیور مدلل میں حصہ دوم کے صفحہ ۲۴
 پر یہ عبارت سجدہ کے بیان میں لکھی گئی ہے، ”ہاتھ پاؤں کی انگلیاں قبلہ کی طرف رکھے، مگر
 پاؤں کھڑے نہ کرے، بلکہ اپنی طرف نکال دے اور خوب سمٹ کر اپنے اور اس میں لفظ مگر نکال
 تک عبارت بڑھائی گئی ہے، اس عبارت کے بڑھ جانے سے احقر کے سمجھ میں یہ آیا ہے
 کہ سجدہ میں عورت اپنے دونوں پیروں کو مثل تورک کے دہنی طرف نکال دے اور اسی
 طور سے سجدہ کرے، مگر شامی میں ہے و ذکر فی البحر اہنا لا تنصب اصابع القدمین،
 اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیروں کو تو عورت کھڑے رکھے اور انگلیوں کو زمین پر بچھائے
 رکھے اور اسی صورت میں انگلیوں کا قبلہ رخ ہونا ممکن ہے ورنہ نہیں، اور عالمگیری
 میں ہے والمرآۃ لا تجانی فی رکوعہا وسجودہا وتقع علی رجليہا و فی السجۃ تفرش بطنہا
 علی فخذیہا کذا فی الخلاصۃ، اس سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورت سجدہ کرتے وقت
 مردوں کی طرح پاؤں پر بیٹھے تورک کے طور پر نہ بیٹھے، اور پست سجدہ کرنے میں یہ فرق

کافی ہو کہ بازوؤں کو کروٹوں میں ملا کر دبانے رکھے، اور پیٹ کو رانوں پر جالیوں اور کلائیوں کو زمین پر بچھانے رکھے، اور نیپٹلیوں کو بھی زمین پر بچھانے رکھے، بخلاف مردوں کے،

اور جامع الرموز میں لکھا ہے فلا تنصب اصابع القدامین، پس ان عبارتوں میں اور مرقوم بالا بہشتی زیور کی اس عبارت مزیدہ میں مخالفت معلوم ہوتی ہے، اور کسی طرح سمجھ نہیں سکا کہ دونوں پر شمال کی طرف داہنی جانب کو باہر بھی نکلے ہوئے ہوں اور ان کے اوپر بیٹھی ہوئی بھی، اور سجدہ کے وقت دونوں پاؤں داہنی طرف نکلے ہوئے بھی ہوں اور انگلیاں بھی ہوئی قبلہ رو بھی اور دونوں قدم بھی کھڑے ہوں، پس مکلف ملازمان قدس صفات ہوں کہ کونسی صورت اختیار کی جائے، اس سے پیشتر تو احقر شامی اور جامع الرموز اور عالمگیریہ کے موافق بتلاتا تھا اور اب بوجہ نہ سمجھنے کے حیرانی پیدا ہوئی، پس امید ہے کہ تصریح فرمائی جائے کہ کونسی عبارت کی اتباع کروں؟

الجواب: فقہاء نے عورت کو انتصاب مستثنیٰ کر کے توجیہ اصابع الی القبلة مستثنیٰ نہیں کیا، اور ترک انتصاب کے ساتھ توجیہ اصابع الی القبلة کی وہی صورت ہے جو بہشتی زیور میں ہے، اس کے سوا سجدہ میں توجیہ اصابع الی القبلة کی عورت کے لئے کوئی صورت نہیں، ظفر احمد عفا عنہ، ۱۷ شوال ۱۲۸۴ھ

الجواب الثانی: سوال میں جو تمام روایات کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے یہ تو ممکن نہیں ہے، کیونکہ تورک وعدم تورک میں تنافی ہے، پس لا تنصب اصابع القدامین اولاً و تقعد علی رجليہا، ان حضرات کی روایت ہے جو تورک کے قائل نہیں، اب فقط یہ سوال باقی رہا کہ توجیہ اصابع الی القبلة دونوں روایت میں سے کس کی بناء پر ہے، سوا حق کے نزدیک عدم تورک کی حالت میں لا تنصب الا اصابع کی تصریح ہوتے ہوئے توجیہ اصابع ناممکن ہے اور جو صورت بیان کی گئی جب اس میں توجیہ اصابع ممکن ہی نہیں تو اس کو مستثنیات میں بیان کرنے کی حاجت ہی کیلئے ہے، مکالم لا یخفی، اور تورک کی صورت میں بھی گو بدقت کسی قدر پاؤں کو موڑ کر قبلہ کی طرف انگلیاں ہو سکتی ہیں، اور اسی بناء پر بہشتی زیور میں توجیہ اصابع الی القبلة کو برقرار رکھا گیا ہے، لیکن احقر کے فہم ناقص میں اس صورت میں توجیہ اصابع مامور بہ نہیں ہے اور گو توجیہ اصابع سے عورت کو کہیں مستثنیٰ نہیں کیا، لیکن اس کے واسطے مستقل صورت سجدہ بیان کرنا اور اس صورت میں توجیہ اصابع کا محال یا متعذر ہونا

خود استنابہ، والٹر اعلم، مراقی الفلاح میں ہے (در بین (اختراش) الرجل رجلہ الیسری ونسب الیمنی) وتوجیہ اصابعہا نحو القبلة كما ورد عن ابن مسعود عن الله عنهما (روى ابن رتورک المروانی) بان تجلس على الیتماء وتضع الفخذ وتخرج رجلها من تحت وركبها الیمنی لانه استرلها وقال شارحہا (وتوجیہ اصابعہا) ای باطن اصابع الیمنی نحو القبلة بقدر الاستطاعة فان توجیہ الخنصر لا یخلو عن عسر قہستانی، فقط، اس سے معلوم ہوا کہ قدر استطاعت توجیہ مسنون ہے، اور ظاہر ہے کہ مرد و خنصر کی توجیہ میں اس قدر دقت نہیں جس قدر توڑک کی حالت میں دقت ہوتی ہے، خلاصہ یہ کہ بوجہ دشواری عورت اس حکم سے مستثنیٰ معلوم ہوتی ہے، لیکن فقہار نے مستثنیات میں شمار نہیں کیا، اس واسطے اگر سہولت سے ہو سکے کر لیا جاوے در نہ کاوش نہ کی جاوے، والٹر اعلم احقر عبد الکریم عفی عنہ ۱۰ ارشوال مشکہ

التنقیل علی الجواب الثانی؛ مشاہدہ میں کلام ہے، احقر کا مشاہدہ یہ ہے کہ توجیہ اصابع الی القبلة کی آسان صورت توڑک ہی ہے، اس کو محال یا متعذر کہنا عجیب ہے، منشاء اس دشواری یا استحالة کا یہ ہے کہ محجب ثانی کے ذہن میں توڑک مع ضم الرجلین کی صورت نہیں، وہ توڑک مع تفرج الرجلین میں توجیہ اصابع کو دشوار دیکھ کر مطلق توڑک میں اس کو دشوار سمجھ گئے ۱۲ ظفر احمد عفا عنہ

ضمیمہ سوال مذکور؛

..... خادم نے بہ سوال خدمت سامی میں پیش کیا تھا، جس کا جواب جناب مولانا و مکرنا مولوی ظفر احمد صاحب نے اور مولانا عبد الکریم صاحب نے تحریر فرمایا ہے جو بعینہ نیاز نامہ ہذا کے ساتھ ارسال خدمت گرامی ہے، ان صاحبوں نے جو جواب تحریر فرمایا ہے اس سے بجائے تردد و شبہ رفع ہونے کے اور بھی بڑھ گیا، اسی حیرانی میں لپھوٹے شفا رالعی سوال پھر مکلف ہوں، موجب تردد یہ ہے کہ جناب مولانا ظفر احمد صاحب جو تحریر فرماتے ہیں کہ فقہار نے عورت کو انتصاب الخ اس عبارت کا مطلب میں نے یہ سمجھا کہ عورت کے لئے سجدہ میں پاؤں کا کھڑا کرنا فقہار رحمہم اللہ نے مستثنیٰ فرمایا ہے، اور توجیہ اصابع للقدیم جائز بلکہ ضروری ہے اور اس کی یہ صورت ہے کہ قومہ سے جب سجدہ میں جا

توپاؤں کو داہنی طرف نکال کر سجدہ کرے، اور جب میں خاکسار شامی کی عبارت انہما لا تنصب اصابع القدرین کو مولانا ظفر احمد صاحب کی عبارت جواب سے ملتا ہوں تو شامی کی عبارت اس سے نہیں ملتی، کیونکہ شامی کی عبارت سے انتصاب القدرین کا استثناء ثابت نہیں ہوتا، بلکہ انتصاب اصابع القدرین کا استثناء معلوم ہوتا ہے، چنانچہ رسالہ مفتاح الصلوٰۃ کے صفحہ ۸ پر ہے، ”ہشتم انگشتانِ پائے استادہ نہ کند“ اور جامع الرموز کی عبارت فلا تنصب اصابع القدرین سے بھی فہم ناقص میں یہی سمجھا گیا ہے کہ عورت جب قومہ سے سجدہ میں جائے تو سیدھی سجدہ میں جائے پہلے زانو ٹیکے پھر ہاتھ ٹیکے، پھر پیشانی و ناک ٹیکے اور دونوں پاؤں کو علیٰ صدور القدرین کھڑے اور اصابع القدرین کو علیٰ بطونہا، مفروش رکھے، اس صورت میں توجیہ الی القبلة بھی ہوگئی، بوجہ اتم،

الجواب؛ قد میں کی یہ حالت مرد و عورت میں یکساں ہوگئی، کیونکہ مرد بھی قد میں کو سجدہ میں اسی طرح رکھتا ہے، حالانکہ فقہاء کی عبارت قد میں کو حالت کو مرد و عورت کے حق میں متفاوت بتلاتی ہے، اب اس کے بعد بتلایئے کہ اس کے مقابل مرد کے واسطے نصب اصابع قد میں کی کیا صورت ہوگی جس میں توجیہ الی القبلة بھی ہو سکے؟

سوال؛ اور فرق مرد و عورت کے سجدہ میں بھی ہو جاتا ہے، اور اس قدر شرق مع دیگر مستثنیات کے کافی ہے، کیونکہ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے والمرأة تنخفض کی شرح یہی کی ہے، کہ عورت بازوؤں کو کروٹ سے ملا یوسے، اور کلائیوں کو زمین پر بچھائے، اور پیٹ کو زانو پر بچھائے، اور پنڈلیوں سے زانوؤں کو ملائے، اور پاؤں کی انگلیوں کو زمین پر بچھائے، یہ صورت تو تمام کتب فقہ میں پائی جاتی ہے، مگر جس صورت کو مولانا ظفر احمد صاحب فرماتے ہیں کہ توجیہ اصابع القدرین کی مع انتصاب القدرین کے استثناء کے سوائے صورت مسطورہ بہشتی زیور کے اور کوئی صورت ہی نہیں، وہ یعنی بحالت سجدہ عورت دونوں پاؤں کو داہنی طرف نکال کر سجدہ کرے تو اس صورت میں توجیہ اصابع القدرین الی القبلة کہاں ہے، یہ تو عقلاً و نقلاً توجیہ اصابع الی الشمال ہے البتہ اسی صورت کو توجیہ اصابع الی القبلة فرض کر لیا جائے تو یہ اور بات ہے،

الجواب؛ یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے مشاہدہ سے، تحریر سے کیونکہ واضح کیا جائے، حاصل یہ ہے کہ رجلیں کو داہنی طرف نکال کر اگر پیروں کو خوب ملایا جائے جیسا.....

عورتوں کو ضم رجلیں کا حکم ہے تو توجیہ الی القبلة اصابع کی بہت آسان ہے، ہاں اگر ضم نہ کیا جائے بلکہ رجلیں میں تفرج ہو تو توجیہ الی الشمال ہوگی،

سوال: اور اس صورت میں جو احقر کی سمجھ میں ان عبارات مرقومہ سے آتی ہے، حدیث امرت ان اسجد علی سبعة اعظم علی الجہتہ والیڈین والربیتین واطراف القدمین، (متفق علیہ) سے بھی پوری پوری موافقت و مطابقت ہو جاتی ہے، اور اگر پاؤں کو داہنی طرف نکال کر سجدہ کیا تو سات اعضا کے عوض کل پانچ اعضا پر سجدہ ہوگا، تو اس لحاظ سے بھی وہ صورت اقرب الی الصواب معلوم ہوتی ہے، نہ یہ صورت جس میں پانچ اعضا پر سجدہ ہو،

الجواب: حدیث میں اطراف القدمین آیا ہے، جس سے وہ صورت بھی خارج نہیں جو بہشتی زیور میں مذکور ہے، کیونکہ ہر قدم کی کرٹ زمین سے ملی رہے گی، تو اطراف القدمین پر سجدہ ہو گیا، البتہ اطراف سے مراد اگر اصابع ہوں تو بے شک بہشتی زیور کے خلاف ہوگا، فیحرو ولسنا مل،

سوال: اور یہ صورت جو عمرہ سے چل کر عورت پہلے بیٹھ کر دونوں پاؤں کو داہنی طرف نکال کر بعد اس کے سجدہ کرے (اسی کی تمام عورتیں عادی ہیں جو غالباً تمام ہندوستان بھر کی عورتوں کا تعامل اسی طور پر) کسی فقہ نے اپنی تصنیف میں لکھا ہے، یا انتصاب القدمین کو کسی نے لکھا ہے یا فقط انتصاب اصابع القدمین سے انتصاب القدمین مراد لیا جاتا ہے، (عبارت زائدہ) احقر نے بہت دیکھا بھالا مگر اس فرق مرقومہ کے سوا اور فرق کسی نے نہیں لکھا ہے، عورت انتصاب اصابع الرجلیں میں مستثنیٰ ہو نہ انتصاب القدمین میں، پس امید ہے کہ جواب شافی سے احقر کے تردد و پریشانی کو رفع فرمادیں گے،

الجواب: عبارات فقہاء میں تو لا تنصب اصابع القدمین ہی وارد ہے، مگر ترک نصب اصابع سے ترک نصب قدمین دو درجہ سے مراد لیا گیا ہے، ایک یہ کہ اس میں ستر زیادہ ہے، اور عورتوں کو اختیار ستر کا امر ہے، دوسرا اس میں توجیہ اصابع الی القبلة بھی ہے، اگر عورت نصب قدمین کرے تو اس میں ستر کی تقلیل ہے، پھر اس کے ساتھ اگر نصب اصابع نہ کرے بلکہ بقول سائل کے اُن کو قبلم رُویط کرے تو فقہاء کا نصب اصابع رجلیں میں عورت و مرد کو متفاوت بتلانا لغو ہوگا، کیونکہ یہی صورت مرد بھی کرتے ہیں، اس کو لا تنصب اصابع

القدین کی تفسیر بنانا غلط ہے، بس صحیح تفسیر یہی سمجھ میں آئی کہ مراد یہ ہے کہ عورت پیروں کی انگلیوں کو زمین پر کھڑا نہ کرے، نہ قبلہ رو نہ ترک استقبال کے ساتھ بلکہ پیروں کو اس طرح بچھائے کہ اصابع قبلہ رو ہوں، واللہ اعلم،

سوال: اور جناب مولانا عبدالکریم صاحب زاد مجد نے زیب رقم فرمایا ہے کہ سوال میں جو تمام روایات کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے، الخ،

احقر نے جمع کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ صرف یہ استفسار ہر کسی نے فقہاء متقدمین یا متاخرین سے یہ سورت (جو اس مزید فرمودہ عبارت سے مفہوم ہے، اور تمام ہند کی عورتیں قریب قریب اسی طرح کرتی بھی ہیں) لکھی بھی یا نہیں لکھی، اگر لکھی ہے تو کس نے اور اگر نہیں لکھی تو یہ استثناء انتصاب القدین کی ان عبارات سوال کے مخالف ہے، کیونکہ ان عبارتوں میں وہ صورت معلوم ہوتی ہے نہ یہ کہ پاؤں کو دائیں طرف نکالا جائے، احقر نے یہ لکھا ہے کہ سجدہ میں تو رک کی صورت نہ بیٹھے، بلکہ خوب سمٹ کر سجدہ پست کرے مگر پاؤں کو کھڑا رکھے علی صدر القدین، اور انگلیوں کو مفردش علی بطونہا موجه الی القبلة رکھے، اور جلسہ میں عورت اپنے دونوں پاؤں کے اوپر بیٹھے، ان عبارتوں سے میں نے یہ سمجھ کر بہشتی زیور کی اس مزید عبارت کو ان عبارتوں کے خلاف سمجھ کر یہ سوال لکھا ہے تو رک تو قعدوں میں ہی کیا جاتا ہے، سجدوں اور جلسوں میں نہیں کیا جاتا، اگر جلسہ اور حالت سجدے میں کسی نے لکھا ہے تو لکھتے، والسلام،

جواب: یہ سوال حضرت علامہ مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی کیا گیا ہے، انھوں نے زنان ہند کے اس طریق سجدہ کو اقوال فقہاء کے موافق بتلایا ہے، اسی کے موافق بہشتی زیور میں مسطور ہے، اور فقہاء کی عبارت سے جس طرح یہ مضمون سمجھا گیا کہ اوپر لکھ دیا گیا، دو سر علماء سے بھی مراجعت کر لی جائے، فلعل اللہ یحدث بعد ذلک امراً، سوال: آنجناب نے جو

فقر کے جواب میں تحریر فرمایا ہے اس سے تسلی و تشفی پھر بھی نہیں ہوئی، کیونکہ آنجناب تحریر فرماتے ہیں، اول عبارات فقہاء تو لاتنصب اصابع القدین ہی وارد ہے، مگر نصب اصابع سے ترک نصب قدین دو وجہ سے مراد لیا گیا ہے الخ فقر کے نزدیک یہ بیان صحیح نہیں ہے، کیونکہ آنجناب فرماتے ہیں کہ اصابع سے قدم مراد ہے،

جواب؛ یعنی اس عبارت میں جو عورتوں کے متعلق ہے،

سوال؛ اور یہ خلاف ہے فقہاء کے، کیونکہ کبیری مطبوعہ فخر المطالع کے صفحہ ۲۰۸ پر ہے
”المراد من وضع القدم وضع اصابعها،

جواب؛ یہ عبارت مردوں کے متعلق ہے،

سوال؛ توجہ کہ وضع قدم سے وضع اصابع مراد مان لیں تو وہ تحریر سامی اس کے خلاف
ہوگی، پس اسی کے موافق و مؤید ہے عبارت عالمگیری، پس انگلیاں کھڑی کرنا مردوں کا اور
بچھانا عورتوں کا کافی ہے،

جواب؛ مردوں کا انگلیاں کھڑی کرنا آپ نے کہاں سے نکالا اور اس صورت میں
توجہ اصابع الی القبلة کیونکر کرے گا،

سوال؛ تفاوت مع دیگر امور متفاوته سجدہ کے یعنی کلائیوں زمین پر بھی ہونا اور
رائیں پنڈلیوں سے ملی ہوئی ہونا اور بازوؤں کا کروٹوں سے اور رانوں سے چسپاں رکھنا اور
پیٹ کو زانو پر بچھانا اور دونوں پیروں کے اوپر بیٹھنا جلسہ میں اور سجدہ میں زانوؤں سے
متصل کرنا، چنانچہ عالمگیری کی یہ عبارت جلسہ اور سجدہ کی ہیئت کو صاف بتلاتی ہے
والمرأة لا تجافي في ركوعها وسجودها وتقع على رجليها وفي السجدة تفرش بطنها على فخذيها
كذا في الخلاصة، اور اس کا ترجمہ مولوی امیر علی صاحب یوں کرتے ہیں، نوحہ، عالمگیری
جلد اول صفحہ ۱۰ عورت اپنے اعضا کو رکوع اور سجود میں ملا ہوا رکھے، جدا جدا نہ کرے، اور سجدہ
میں دونوں پاؤں پر بیٹھے، اور پیٹ کو زانو پر بچھاوے، الخ اس سے بھی صاف بیان ہو گیا کہ
یہ فرق جو بندہ نے عرض کیا ہے کافی ہے، اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ سجدہ کے وقت اور جلسہ میں
عورت متوترک نہ ہوے، بلکہ پاؤں کے اوپر بیٹھے، اور مذکورہ و مرقومہ عبارت سے اصابع الرجلین
کا نصب نہ کرنا لغو نہیں ہے، کیونکہ قدیمین سے مراد اصابع ہے، کما حققہ فی عبارة الکبیری

دوم اینکه قدیمین کی یہ حالت مرد و عورت میں الخ قدیمین کو مرد بھی کھڑے رکھے اور عورت
بھی کھڑے ہی رکھے، اور مرد انگلیوں کو کھڑی رکھے،

جواب؛ قبلہ رخ کیونکر ہوں گی، وفی الحدیث المتفق علیہ عن ابی حمیدانہ، صلی اللہ علیہ وسلم
کان یفتح اصابع رجلیه اذا سجد ای یشیہا ویعطفہا ویکسر بالتوجه الی القبلة، اور انگلیوں کا کھڑا
کرنا اس کے خلاف ہے،

سوال: اور عورت انگلیوں کو مفردش رکھے اور قد بن بقول آنجناب ملائے رکھے، یہ فرق سجدہ کا ہوا اور جب جلسہ میں بیٹھے تو دونوں پیروں پر بیٹھے، جلسہ میں توڑک کر نہ بیٹھے اور مرد ایک پاؤں کو بچھا کر اس پر بیٹھے، اور دوسرے کو کھڑا رکھے، باینطور کہ اس کی انگلیاں مفردش درو قبلہ ہوں، پس یہ تفاوت کافی ہے، اس کو عالمگیری کی عبارت مرد میں غور فرمانے پر خوب سمجھ سکتے ہیں، فہم ناقص میں جو آیا ہے عرض کر دیا ہے، مرد کے واسطے اصابع کو کھڑا رکھنا آیا ہے، اور اس کو یوں بتلایا ہے کبیری فخر المطابع المراد بوضع الاصابع تو یہاں نحو القبلة لیکن الاعتماد علیہا، اس سے یہی سمجھا جاتا ہے کہ انگلیوں کے سر زمین پر معتمد ہونا اس میں... توجیہ بھی ہو جاتی ہے،

جواب: اگر اصابع کا سر زمین پر معتمد ہوا تو قبلہ رو ہر گز نہ ہوں گی، اور اگر مرد نے انگلیوں کو دبا دیا اور دبا کر قبلہ رو کیا تو یہی صورت آپ عورتوں کے لئے تجویز کر رہے ہیں حالانکہ فقہاء کا یہ قول کہ والمرأة لا تنصب اصابع قدمیہا الخ بتلاتا ہے، کہ یہ حکم عورتوں کے لئے خاص ہے، مرد و عورت دونوں اس میں مشترک نہیں، پس نصب اصابع و ترک نصب اصابع کی ایسی صورت بتلائیے، جس میں مرد و عورت دونوں سجدہ میں پیروں کی انگلیوں کو قبلہ رو نہ بھی کریں بھر مرد نصب اصابع کریں اور عورتیں ترک نصب اصابع، آپ کی اس تطویل سے یہ اشکال حل نہیں ہوا،

سوال: کیونکہ کسی قدر دبانے سے ذرا سا انگلیوں کے سر درو قبلہ ہو جاتے ہیں، مگر اس میں تکلف ضرور ہے، سو ہم یہ بات مشاہدہ سے الخ یہ تحریر سے بھی سمجھ میں آتی ہے، چنانچہ ان عبارات منقولہ میں غور کرنے سے صاف واضح ہو جاتا ہے داہنی طرف پیروں کا نکالنا اور ان کو ملانا اس کی کیا ضرورت ہے، جبکہ کسی نے اس کو لکھا ہی نہیں ہے؟ جواب: اور آپ نے مردوں کے لئے جو صورت نصب اصابع کی لکھی ہے جس میں استقبال اصابع نہیں وہ کس نے لکھی ہے؟

سوال: اور وہ صورت جو لکھی ہوئی ہے وہ نہایت آستر ہے، تو پھر اسی کا عامل ہونا لازم ہے، نہ اس صورت کا، یہ صورت توڑک تو فعدہ کی ہے نہ سجدہ کی، جس کے لئے یہ تکلف گوارا کیا جائے، اور یہ آسان بھی نہیں ہے، اور آسان بھی وہی شکل ہے جس کو فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے بتلایا ہے، البتہ چونکہ اس صورت توڑک کی عورتیں عادی ہو چکی ہیں

ان کو آسان معلوم ہوئی ہوگی، مگر جبکہ اس صورت کو لکھا ہی نہیں تو پھر اس کو چھوڑ کر اسل صورت کو سخت یا کرنا کرنا چاہیے، اور نعامل موجودہ مرد بہ قابل اعتبار نہیں، بہت سی باتیں مذہب کے خلاف مردج ہیں جن کے سنوارنے میں علما، رحمہم اللہ کو دشواریاں پیش آتی ہیں، چنانچہ مردوں کو قبروں میں چت لٹانے میں، حالانکہ کر دھڑ پر لٹانا تمام کتب میں مسطور و مزبور ہے،

جواب: اس دغظ کی ضرورت نہیں، کلام اسی میں ہے کہ عورتوں کی یہ صورت سحرہ شرع کے موافق ہے یا نہیں؟

سوال: اسی طرح مسئلہ زیر بحث کا حال معلوم ہوتا ہے کہ خلاف قاعدہ مردج ہو گیا ہے، گو کتب مذہب میں مصرح ہے، چہارم حدیث من اطراف القدمین الخ اطراف القدمین سے مراد انگلیاں ہیں، نہ کہ قدیمین کہ کر وٹیں، کیونکہ شامی اور غنائیہ شرح ہدایہ والکبیری وغیرہ میں انگلیاں رکھنا ہی فرض بتلایا ہے، نہ کہ کر وٹیں، تو کر وٹیں مراد لینا اطراف القدمین سے کہاں تاں صحیح ہو سکتا ہے، چنانچہ تیسری کی عبارت یہ ہے ثم المراد من وضع القدم وضع اصابعها قال الزاہدی ودرج رؤس القدمین حالۃ السجود فرض ونی مختصر الکفرخی سجد ودرج اصابع رجليه عن الارض لا تجوز وکذا فی الخلاصۃ فی البرازلی وضع لقدام یوضع الاصابع وان وضع اصبعاً واحداً ودرج ظهر القدم بلا اصابع ان وضع مع ذلک احدی قدمیه صح والافلا وفہم من ہذا ان المراد بوضع الاصابع توجیہا نحو القبلة لیكون الاعتماد علیہا والافلو وضع ظهر القدم وقد جعلہ غیر معتبر و ہذا مما یجب التذیہ لہ فان اکثر النسا س عنہ غافلون،

جواب: یہ عبارت مردوں کے لئے متعلق ہے، ان کے واسطے اعتماد علی الاصابع میں کلام نہیں، مگر جب عورتوں اعتماد علی الاصابع سے منع کیا گیا ہے تو ان کو یہ عبارت عام نہیں، اور اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو صورت مردوں کے لئے نصب اصابع کی آپ نے اوپر لکھی ہے وہ غلط ہے، کیونکہ وضع اصابع و نصب اصابع سے مراد توجیہ الی القبلة ہی نہ مطلع وضع اور مطلق نصب،

سوال: اس میں میں نے غور کرنے سے یہی سمجھا کہ اطراف سے مراد انگلیاں ہیں، اور باقی مسئلہ کی صورت بھی اس سے نکل آتی ہے، اور فتاویٰ سراجیہ (جو فتاویٰ قاضی خاں کے حاشیہ

پر ہے) کے صفحہ ۵۲ پر ہے، المرأة فی سجودہا تنخفض ولا تنصب كانتصاب الرجل وتلزم بطنها علی فخذیہا وتجلس للتشهد علی الیثما اليسری وتخرج رجلیہا من الجانب الآخر، اس میں ظاہر طور سے معلوم ہی ہوتا ہے کہ انتصاب، القدمین عورت کو کرنا ہے مگر مرد کے مثل نہ کرے، بلکہ اس کے خلات کرے، اور وہ انگلیوں کے بسط سے حاصل ہو جاتا ہے، کیونکہ اس میں انتصاب کی نفی نہیں کی بلکہ مماثلت کی نفی ہے، پس ان تمام عبارتوں سے تو وہ عبارت زائدہ بہشتی زیور کی صحیح نہیں معلوم ہوتی، اور مولانا عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اگر کوئی عبارت کسی کتاب کی نقل فرمائی ہو تو فیہا، ورنہ بلا نقل کے ان کا اجتہاد ہوگا، جو ان عبارتوں کے شاید کہ خلاف بھی مانا جائے گا، اور فقیر کا اعتماد جو اپنے حضرت مرشد نامہ اللہ تعالیٰ ظلل فیضانہ الی یوم الدین پر ہے، وہ اور کسی پر نہیں ہے، واللہ علی ما اقول وکیل،

الجواب؛ مولانا عبدالحی صاحب نے فقہاء کے کلام سے سمجھ کر لکھا ہی اور وہ مسلم صاحب فتویٰ اور صاحب وسیع النظر ہیں، ان کا استنباط ہمارے آپ کے استنباط سے مقدم ہے، تفصیل کا شوق ہو تو ان کا فتویٰ ملاحظہ فرمایا جائے،

تمتہ؛ عبارات فقہاء سے قطع نظر کر کے اب میں حدیث کی طرف توجہ کرتا ہوں، حضرت علی رضی کی حدیث میں ہے واذا سجدت المرأة فلتحتمز ولتضم فخذیہا رواہ ابن ابی شیبہ (بسنن حسن) اور عبد اللہ بن عمر رضی کی مرفوع حدیث میں ہے اذا سجدت المرأة الصقت بطنها علی فخذیہا و فی روایہ بین فخذیہا کاستر مایکون، رواہ البیہقی، اور یزید بن ابی خبیث کی مرسل روایت میں ہے قال لمرأتین اذا سجدا فضا بعض اللحم الی الارض فان المرأة فی ذلک لیس کالرجل رواہ ابو داؤد فی مراسیلہ، والروایات کما فی اعلاء السنن،

اس سے ابورذیل معلوم ہوتے (۱) عورت سجدہ میں احتفاز کرے، والاحتفاز التضم فی السجود (۲) عورت سجدہ میں پورے ستر کے ساتھ جتنا ممکن ہو پیٹ کو رانوں سے چپکا کر اب ہمارا خیال یہ ہے کہ پورے ستر کے ساتھ الصاق بطن بالفخذین اور پورا التضم اعضاء اور زمین سے گوشت کو منضم کر دینا اسی صورت سے متحقق ہے جو بہشتی زیور میں ہے، اور جو صورت آپ نے تجویز کی ہے نہ اس میں پورا الصاق ہے نہ پورا ستر ہے، نہ زمین سے گوشت کا انضمام ہے، مجھے امید نہیں کہ اس تفصیل کے بعد بھی آپ میری بات مانیں گے، مگر اس کا اتنا اثر ہونا چاہئے کہ آپ عورتوں کے مردجہ سجود پر انکار نہ کریں، اور یہ سمجھ لیں کہ اس کی بھی گنجائش ہے

ہاں اپنی مستورات کو آپ جو صورت چاہیں تعلیم کریں اس کا اختیار ہے، ۱۲ زلیقہ ۱۳۸۵ھ
 سجدہ میں توجہ اصابع رجلین | سوال (۳۵) نماز میں حکم ہے کہ بحالت سجدہ اصابع رجلین متوجہ
 عورتوں کے لئے بھی مسنون ہے | الی القبلہ ہونی چاہئیں، کیا عورتوں کے لئے بھی یہی حکم ہے، اگر
 نہیں ہے تو نساء کا استثناء کہاں مذکور ہے ؟

الجواب: بحالت سجدہ توجہ اصابع الی القبلہ عورتوں کے لئے بھی مسنون ہے،
 اور وہ اس کو سہولت کے ساتھ ادا کر سکتی ہیں مگر مستی کرتی ہیں، ۲۲ زلیقہ ۱۳۸۵ھ

فصل فی الامامة والجماعة

جماعت ثانیہ کا حکم | سوال (۱) ہمارے اطراف میں اکثر جماعت کے ساتھ نماز پنج وقتی بعض
 جگہوں میں پڑھی جاتی ہے، اور بلا تنخواہ کے امام بھی امامت کے لئے نامزد رہتے ہیں، گو مؤذن
 کئی ایک ہوا کرتے ہیں، تو آیا جماعت اولیٰ کے بعد ایسی جگہوں میں جماعت ثانیہ حنفیہ کے نزدیک
 مکروہ ہے، تحریمی یا صرف مکروہ یا کچھ بھی نہیں ؟

الجواب: قال فی الشامیۃ یکرہ تکرار الجماعة فی مسجد محلۃ باذان و
 اقامة الا اذا صلی بمصافیه او لا غیر اہلہ او اہلہ لکن بمخافتۃ الاذان لو
 کراہلہ بن وشمس الزکوان مسجد طریق جاز اجتماعا کما فی مسجد لیس لہ امام
 ولا مؤذن ویصلی الناس فیہ فوجا فوجا فان الافضل ان یصلی کل فریق باذان
 واقامة علیحدۃ کما فی امالی قاضی خان ام رص ۵۷، ۱ ج ۱، وفیہ (ص ۵۷، ۸ ج ۱)
 وقد منافی باب الاذان عن اخر شرح المنیۃ عن ابی یوسف انه اذا لم تکن
 الجماعة علی المیدۃ الاولى لا تکرہ ولا تکرہ وهو الصحیح وبالعدول عن
 المحراب تختلف المیدۃ کذا فی البزازیۃ انتھی وفي التاتاریخانیۃ عن
 الولی الجیۃ وبہ ناخذ ۵،

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ بصورت مذکورہ مسجد محلہ میں جس میں امام و مؤذن مقرر
 ہیں جماعت ثانیہ مکروہ ہے، مگر بتغییر ہیئت امام ابو یوسف کے قول پر گنجائش ہے، لیکن ہمارے
 مشائخ نے انتظام عوام کے لئے اس پر فتویٰ نہیں دیا، بلکہ مسجد محلہ میں جہاں امام و مؤذن مقرر ہو
 مطلقاً کراہت کا فتویٰ دیا ہے، واللہ اعلم، ۲۲ ربیع الثانی ۱۳۸۵ھ

ظاہر ہے کہ جماعت ثانیہ کا ہونا جائز ہے، لیکن اگر امام و مؤذن مقرر نہ ہوں تو جائز نہیں ہے، لیکن ہمارے مشائخ نے انتظام عوام کے لئے اس پر فتویٰ نہیں دیا، بلکہ مسجد محلہ میں جہاں امام و مؤذن مقرر ہو مطلقاً کراہت کا فتویٰ دیا ہے، واللہ اعلم، ۲۲ ربیع الثانی ۱۳۸۵ھ

۵ صفحہ اوچال عن جہاں مسجد ثانیہ مؤذن فیہ وایقام ۱۲ ظ ۵۷ قلت وہو الذی یمیل الیہ القلب لقوة دلیلہ فان علیہ

سوال (۲) جس کی بیوی بدکار اور فاسق ہو اس کی امامت کا حکم،

ہندہ ایک عورت نامعلوم الاسم والنسب (جو تحقیق کرنے سے اس قدر پتہ چلتا ہے کہ ہندو مفورہ نامسلمان تھی) اول وہ ایک رافضی کے (بسیب خواہش نفسی) ساتھ قرار ہوئی اور کچھ عرصہ تک اس کے پاس رہی، پھر دوسرے رافضی کے پاس اس اول مرد کو زندہ چھوڑ کر ساتھ رہی، نکاح غالباً دونوں میں سے کسی سے ہوا ہو جس کا علم نہیں، بعد مرنے دوسرے شخص کے کچھ دنوں آزاد بد چلن رہی، اب ایک لڑکی ہے جس کو اپنے بطن سے بتلاتی ہے، اور لڑکی کا نکاح ایک رافضی مرد سے کر دیا ہے، بلکہ تحقیق سے معلوم ہوا کہ خود بھی اس رافضی داماد سے ناجائز تعلق رکھتی ہے، بلکہ اس رافضی داماد کی خوشی کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے جس خاندان اہل سنت میں ہندو نے نکاح کیا ہے اس کی عورت کو بھی اس سے ناجائز تعلق کرانا چاہتی ہے، جو واقعات سے ظاہر ہو چکا ہے، اور اگر اس کے داماد کی نگرانی کی جاتی ہے تو کہتی ہے کہ میں شوہر کے ساتھ نہیں داماد رافضی کے ساتھ... رہوں گی، اور اس کے لڑکے یعنی نواسہ کو پرورش کرتی ہے، اور متبنتی جانتی ہے، اب اہل سنت مرد سے نکاح کر لیا ہے، مگر شوہر اس کے رشتہ داروں سے رافضیوں کو ترجیح دیتی ہے، اب اس نکاح کی وجہ سے ہندو اپنے کو اہل سنت کہتی ہے، بلکہ اس تحقیق مذہب کے خیال سے اس نے ایک بزرگ اہل سنت سے بیعت کر کے دھوکہ میں ڈال دیا ہے، مگر چونکہ اس کے شوہر کی رشتہ داری رافضیوں میں پہلے سے ہوتی رہی ہے، اور بعض رشتہ دار اسکے شوہر کے مکانات اہل رافضی سے خوب واقف ہیں، جب اس سے تحقیق نام و مذہب و نسب چاہتے ہیں تو وہ کہتی ہے کہ اگر میں رافضی ہوں تو پیشاب پلاؤں گی، اور نام و نسب وغیرہ نہیں بتلاتی، بلکہ بعض وقت تحقیق حالات میں شوہر کے رشتہ داران اہل سنت کو کافر بھی کہتی ہے تو ایسی عورت کو جو نام و نشان وغیرہ اپنے سابقہ حالات کچھ نہ بتلاتی ہو اور حالاً بالاموجود ہوں اس کو اہل سنت سمجھیں یا کیا، اور اس سے مثل رافضیوں کے احتیاط کریں یا نہیں؟

الجواب: جب ہندو نے رافضی مردوں سے ناجائز تعلق رکھا، اور اپنی بیٹی کو بھی رافضی سے بیاہا، اور خود بھی داماد سے ناجائز تعلق رکھتی ہے اس صورت میں بظاہر

ہندہ پر رافضی ہونے کا شبہ ہی اور بدکار و فاسق ہونے میں تو شبہ بھی نہیں، اگر ہندہ کے شوہر کو یہ سب حالات معلوم ہیں اور وہ پھر بھی اس پر تنبیہ نہیں کرتا نہ اس کو علیحدہ کرتا ہے تو وہ بھی فاسق و دیوث ہے، اہل سنت کو ایسے شخص کے گھر میں اپنی مستورات کو نہ بھیجنا چاہئے، اور مستورات اہل سنت کو ہندہ سے پوری طرح احتراز کرنا چاہئے، اور ہندہ کے شوہر کے پیچھے اس حالت میں نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، ۲۴ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۷ھ

سوال (۳) ہندہ ایک عورت نامعلوم الاسم والنسب والمذہب کے پیچھے نماز کا حکم، ہے، اور جس نے اس خاندان میں نکاح کیا ہے، اس کے خاندان اور

مردوں کو بھی اپنے ساتھ اپنی خواہش سے زانی بنایا اور اس کے داماد سے بھی جو رافضی ہے زنا کراتی ہے، اور اس رافضی کی رضامندی کے واسطے اس خاندان کے دوسری عورتوں کو بھی خراب کرانا چاہتی ہے، جو واقعات سے ظاہر ہوتا ہے، بلکہ غیروں کے تعلق کو زیادہ پسند کرتی ہے، اور اگر اس کی نگرانی کی جاوے تو نگرانی کرنے والوں کو متہم کرتی ہے، اب ہندہ کے شوہر کا باپ چاہتا ہے کہ ایسی عورت جو خود بدچلن اور مخرب عزت خاندان ہو اس کے شوہر اور اس خاندان سے علیحدہ ہو جاوے، چونکہ ہندہ بہت چالاک اور جادو و تعویذ وغیرہ لغویات کرنے والے لوگوں سے واقف ہے اپنے شوہر کو ایسا مجبور کر دیا ہے کہ باوجود علم کے علیحدہ کرنا نہیں چاہتا، کیا ایسی عورت کو شرعاً علیحدہ کرنا جائز ہے؟ اور اگر ایسی عورت کو علیحدہ کرنا جائز ہے تو کیا تدبیر کی جاوے، کوئی دعا، یا اسم باری تعالیٰ یا جو کچھ مناسب ہو تعلیم فرمایا جاوے، اور اس کے شوہر کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، نماز جائز نہیں، اور اصلاح کی تدبیر یہ ہے کہ ساری برادری اس کا کھانا پینا اس کے یہاں آنا جائز نہ کر دیں، ۲۴ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۷ھ

سوال (۴) ایسے شخص کے پیچھے جسکی قرأت درست نہ ہو، جان غلط قرآن پڑھنے والے سے پیچھے نماز کا حکم، بوجھ کر نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں، اور بغیر جانے ہوئے نماز پڑھنے تو اس کی نماز درست ہوگی یا نہیں؟

الجواب، اگر اس شخص کی قرأت مایہ جوز بہا الصلوٰۃ ہے تب تو اقتدار کا مضائقہ نہیں، اور اگر ایسی غلط قرأت ہے کہ اس سے نماز صحیح نہیں ہوتی تو اقتدار صحیح نہیں، اور ہر حالت میں عمدہ قرآن پڑھنے والے کے پیچھے نماز پڑھنا اور ایسے ہی شخص کو امام مقرر

کرنا چاہئے، مکافی الحدیث، لیومکم اقرنکم، واللہ اعلم، ۱ رجمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۸۷ھ
 محلہ کی مسجد میں اگر جماعت | سوال (۵) اگر مسجد میں جماعت فوت ہوگئی ہو تو تنہا مسجد میں
 فوت ہو جائے تو کیا کرے؟ نماز ادا کرنا بہتر ہے یا مکان پر اور فضیلت مسجد میں نماز پڑھنے کی
 جو چھپس یا پانچ سو یا ہزار یا پچاس ہزار یا لاکھ کا مسجد محلہ سے لے کر کعبہ تک کے بارہ میں آیا ہے
 تو یہ باعتبار جماعت کے یا تنہا اور یہ سب واجبات سے ہے یا مندوبات سے، بینوا تو چروا،
 الجواب؛ قال فی الخلاصۃ (ص ۲۲۸ ج ۱) رجل فاتمہ الجماعۃ فی مسجدہ ان ذاب
 الی مسجد آخر یصلی فیہ بالجماعۃ فہو حسن وان صلی فی مسجد حیہ وحدہ فحسن وان دخل منزله
 فصلی بالہ فحسن اھ، اس عبارت سے معلوم ہوا کہ اپنی مسجد میں اگر جماعت فوت ہو جاوے
 تو دوسری مسجد میں جا کر جماعت سے نماز پڑھنا بہتر ہے، اور اگر تنہا اسی مسجد محلہ میں پڑھے
 یہ بھی اچھلے، اور اگر اپنے گھر پر آکر اہل و خیال کے ساتھ جماعت کر کے پڑھے یہ بھی بہتری
 اور بظاہر سب بہتر صورت اولیٰ ہے، اور آخر کی دونوں صورتیں فضیلت میں برابر ہیں،
 کیونکہ تنہا مسجد میں پڑھنے سے جماعت کا ثواب نہ ہوگا، مگر مسجد کی فضیلت حاصل ہو جائیگی
 اور گھر پر جماعت کرنے سے مسجد کی فضیلت فوت ہو جاوے گی مگر جماعت کا ثواب مل جائیگا
 مگر میرے خیال میں تیسری صورت دوسری سے افضل ہے، کیونکہ جماعت کی فضیلت مسجد کی
 فضیلت سے زیادہ ہے، البتہ اگر مسجد محلہ میں کوئی بھی نماز نہ پڑھتا ہو اس وقت مسجد میں
 تنہا نماز پڑھنا گھر پر جماعت کرنے سے افضل ہے، اور مسجد میں نماز پڑھنے پر جو ثواب احادیث
 میں وارد ہے وہ ہر حال میں خواہ تنہا پڑھے یا جماعت سے، اور جماعت کا ثواب اس کے علاوہ
 ہے (کذا دل علیہ اطلاق الحدیث) واللہ اعلم، جماعت حنفیہ کے نزدیک واجب عین ہے، اور مسجد
 میں جماعت کرنا سنت مؤکدہ ہے، واللہ اعلم، قال فی الخلاصۃ قال الصدوق الشہید انما
 الاساءۃ فیما اذا ترک اھل المسجد کلھم الجماعۃ فھم اساقوا و ترکوا السنۃ وان صلوا
 بالجماعۃ فی البیت اختلف المشائخ فیہ والصحیح ان للجماعۃ فضیلة وللجماعۃ
 فی المسجد فضیلة اخرى فھو قد اتی بالحدیثی الفضیلتین وترک الاخری وھکذا
 الجواب فی المکتوبات ام ص ۶۳ ج ۱، ۲۲ رجمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۸۷ھ
 امام کا کتنا درنچا کھڑا ہونا مکروہ ہے؟ | سوال (۶) امام کا
 درنچا جگہ کھڑا ہونا مکروہ ہے خواہ کتنی ہی درنچی ہو، اس کی دلیل بحر الرائق (ج ۲ ص ۲۶) میں

اور محراب میں بھی امام کا کھڑا ہونا مکروہ ہے، وقت فرصت جواب مرحمت ہو،
الجواب؛ میں نے یہ عرض کیا تھا کہ امام کا مطلقاً کسی قدر اونچا کھڑا ہونا مکروہ نہیں،
 مثلاً دو انگل یا چار انگل اونچا ہو یہ جائز ہے، بحر الرائق کی عبارت سے میرے اس قول کی تائید
 ہوتی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں قوله وانفراد الامام على الدكان وعكسه اما الاول فالحديث
 الحاكم مرفوعاً عن رسول الله صلى الله عليه وسلم ان يقوم الامام فوق ويبقى الناس
 خلفه وعلوه بائنه تشبه باهل الكتاب فانهم يتخذون الامام هم وكانوا اطلقه
 فشمّل ما اذا كان الدكان قد رقامة الرجل او دون ذلك وهو ظاهر للرواية
 وصححه في البدل ثم لاطلاق النهي وقيد الطحاوي بقدر القامة ونفى الكل
 في سادونه ام غالباً فشمّل ما اذا كان الدكان قد رقامة الرجل او دون ذلك
 سے آپ کو یہ شبہ ہوا ہے کہ ذرا سی بلندی بھی مکروہ ہے، حالانکہ صاحب بحر کا یہ مقصود نہیں ہے
 بلکہ ان کا مقصود طحاوی کے قول کو رد کرنا ہے، کہ انھوں نے قدر آدم بلندی کو مکروہ کہا ہے،
 اس سے کم کو مکروہ نہیں کہا، یہ تفسیر صحیح نہیں، کیونکہ اطلاق حدیث قدر آدم اور اس سے کم
 دونوں کی کراہت کو مقتضی ہے، رہا یہ کہ قدر آدم سے کم جس قدر بھی ہو سب مکروہ ہے،
 حتیٰ کہ ایک دو انگل بلندی بھی، یہ اس عبارت سے مفہوم نہیں ہوتا، بلکہ آگے چل کر خود
 بحر الرائق میں تصریح ہے کہ تھوڑی سی بلندی مکروہ نہیں ہے، وقال قاضي خان في شرح
 الجامع الصغير انه مقدار بين راع اعتباراً بالسترة وعليه الاعتماد وفي غاية البيان
 وهو الصحيح وفي فتح القدير وهو المختار، اس میں تصریح ہے کہ صحیح اور معتبر قول یہ ہے
 کہ ایک ذراع بلندی مکروہ ہے، اس پر اعتماد ہے، اس سے کم مکروہ نہیں، اس کے بعد کہتے
 ہیں ولكن قال راي صاحب الفتح ۱۲) الاوجه الاطلاق وهو ما يقع به الامتياز
 لان الموجب وهو شبه الارض راع يتحقق فيه غير مقتصر على قدر الذراع
 یعنی صاحب فتح نے کہا ہے کہ زیادہ مناسب یہ ہے کہ ذراع کی قید نہ لگائی جائے، بلکہ اطلاق
 پر رکھا جاوے کہ جتنی بلندی سے امتیاز حاصل ہو وہ مکروہ ہے، سواؤلاً یہ صاحب فتح کی
 رائے ہے روایت نہیں ہے، دو سکران کا بھی یہ مطلب نہیں کہ ذرا سی بلندی بھی مکروہ
 ہے، کیونکہ وہ اگر ذراع کی قید نہیں لگاتے تو یہ قید ضرور بڑھاتے ہیں کہ جتنی بلندی سے
 امام کو امتیاز ہو جائے، وہ مکروہ ہے، اس سے کم مکروہ نہیں، اور ظاہر ہے کہ ایک دو انگل

لما ضمن وان احسن كان له من الاجر مثل اجر من صلى خلفه من غير ان ينقص من اجرهم شيئا وما كان من نقص فهو عليه رواه الطبرانی في الاوسط من رواية معاذ بن عباد قلت وهو حسن على قاعدة المنذري كما لا يخفى وعن عبد الله بن عمر رضي الله عنهما ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال ثلثة على كتمان المسك اراه قال يرا الفقيه عبد ادى حق الله وحق موالیه ورجل أم قومًا وهم به راضون ورجل ينادي بالصلوات الخمس في كل يوم وليلة رواه احمد والترمذي وقال حديث حسن رواه الطبرانی في الصغير والاصط باسناد لا بأس به ولفظه قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ثلثة لا يهولهم الفزع الاكبر ولا ينالهم الحساب هم على كتيب من مسك حتى يفرغ من حساب الخلائق رجل قرأ القرآن ابتغاء وجه الله وأم به قومًا وهم به راضون الحديث كذا في الترغيب للمنذري، ص ۸، ج ۱،

ان احادیث سے امامت کی حسب ذیل فضیلتیں ثابت ہوتیں، بشرطیکہ امام شرائط صلوٰۃ کی پوری رعایت کرے، (۱) جتنے آدمی اس کے پیچھے ہوتے ہیں ان سب کی نمازوں کے برابر اس کو بھی ثواب ملتا ہے اور اس کی نماز کا ثواب علیحدہ ہے، (۲) قیامت کی گھبراہٹ سے مامون رہے گا (۳) حساب کتاب سے محفوظ رہے گا (۴) مشک کے ٹیلوں پر قیامت میں بے فکر بیٹھا رہے گا، یہاں تک کہ مخلوق حساب سے فارغ ہو، اور فقہاء نے لکھا ہے کہ امامت اذان سے افضل ہے، کیونکہ امام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت کا حق ادا کرتا ہے، سوال

..... سوال (۹) اگر نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہو

تو مجذوم کا گھر میں نماز پڑھنا ایک آدمی کو عارضہ جذام کا ہو گیا ہے، مگر جسم مجذوم بہتر ہو، اور اسے عجا کا ثواب ملے گا کا بالکل سلامت ہے، کسی عضو میں فرق نہیں ہے، اور کسی

ناکس سے ملتا رہتا ہے، اور ہر مقام پر آتا جاتا ہے، مثلاً مسجد و خانقاہ، مجلس و محفل وغیرہ اور وہ آدمی نماز جماعت کا شوقین اور پابند ہے، لیکن بعض آدمی اس سے نفرت کرتے ہیں، اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر وہ نماز جماعت میں شامل ہوگا تو میں نماز میں مسجد میں نہ پڑھوں گا مگر اکثر لوگ ملتے جلتے ہیں اور نماز باجماعت اس کے ساتھ ادا کرتے ہیں اور اس کی محبت و مخالفت رکھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ مرض خداوند تعالیٰ کے اختیار میں ہے جس کو چاہے

دید یوے، اور مجذوم کہتا ہے کہ قرآن و حدیث سے علماء منع فرمادیں تو میں اپنے مکان پر نماز جماعت ترک کر کے پڑھ لیا کروں، لہذا مسلمانوں کی رائے سے یہ استفتاء ارسال خدمت والا ہے، کہ بحوالہ کتب معتبرہ کے ارشاد فرمادیں تاکہ مسلمانان اس کے مطابق عمل کریں، یعنی اس بیچالے جذامی کو ساتھ لے کر نماز پڑھیں یا پرسینہ کریں؟

الجواب؛ جب مجذوم سے نمازیوں کو ایذا ہوتی ہے تو اس کو نماز اپنے گھر پر پڑھنا چاہئے، جماعت یا جمعہ وغیرہ میں شریک نہ ہونا چاہئے، اس کو گھر پر نماز پڑھنے میں بھی جماعت کا ثواب ملے گا، جبکہ وہ جماعت کا شوق دل میں رکھتا ہے، فی الفتاوی الشامیہ وکذلک الحق بعضهم بذلک من بقیہ بخر او بہ جرح له راحة وکذلک القصاب والسماک والمجنون والابرص اولى بالاحاق وقال سحنون لا اری الجمعة علیہما الی ان قال وقوله صلی اللہ علیہ وسلم ولیقعد فی بیتہ صریح فی ان اکل هذه الاشياء مثل الثوم والبصل اذا کان عن ضرورة (۱۲) عذر فی التخلف عن الجماعة وايضا هنا علتان اذی المسلمین واذی الملا عتمة نبا لنظر الی الاولی یعذر فی ترک الجماعة وحضور المسجدين ۶۹۲ ۱۰۳۰ رزی الحج مشکوٰۃ،

سوال (۱۰) ایک صاحب بعمر ۸ سال سے لڑکے اور لڑکیاں بیٹھ کر نماز پڑھانے والے امام کے پیچھے نماز کا حکم پڑھاتے رہے، اور مسجد میں پیش امام بھی رہے ہیں، اور اب انکی عمر ۸ سال ہے، یا زیادہ کی ہوگی، اور پھر یہ امر رہتی ہو کہ ۳۲ سال قحط جو ہوا بسبب تنگی گھاس درخت سے گر کر ضرب شدید ٹانگوں میں ہو گئی، اور ہڈی وغیرہ میں کچھ ضرب نہیں ہوئی، اور پھر وہ ہی اپنا کام بیٹھ کر کرتے رہے، اور نماز باقاعدہ پڑھا رہے ہیں، کیا فرماتے ہیں علماء دین متین اس مسئلہ میں کہ ان کے مقتدیوں کی نماز میں کچھ فرق تو نہیں پڑتا، بسبب ناطاقتی کے بیٹھ کر پڑھاتے ہیں،

الجواب؛ اگر یہ شخص بوجہ عذر کے بیٹھ کر نماز پڑھاتا ہے اور رکوع و سجدہ بجالاتا ہے، یعنی رکوع و سجدہ کے لئے محض اشارہ نہیں کرتا، بلکہ جس طرح تندرست آدمی بیٹھ کر نماز پڑھا کرتے ہیں کہ رکوع کے لئے گھٹنوں کے مقابل سر جھکاتے ہیں، اور سجدہ کے لئے زمین پر سر ٹیکتے ہیں اسی طرح وہ بھی کرتا ہے تو مقتدیوں کی نماز

صحیح ہے، مگر اس صورت میں بھی احتیاط یہی ہے کہ امام ایسا آدمی ہو جو کھڑا ہو کر قیام اور رکوع بجالا دے، اور اگر یہ شخص سجد کے لئے زمین پر سر نہیں ٹیک سکتا بلکہ اشارہ سے سجدہ کوتاہ ہے تو مقتدیوں کی نماز درست نہ ہوگی، قال فی نور الابصاح و صح اقتدار قائم بقاعدہ قال الطحاوی لے یرکع ویسجد و ہذا عندہما خلافاً للمحد و قولہ احوط کما فی البرہان وغیرہ ص ۱۷۲، واللہ اعلم ۱۷۲ ذی الحجہ سنہ ۱۳۸۷ھ

احق بالامامت کو مقدم کرنا سنت مؤکدہ ہے | سوال (۱۱) باب الامامۃ میں جو احق بالامامت یا مستحب اور غیر احق کو مقدم کرنے کا حکم، الا علم باحکام الصلوۃ مذکور ہے، تو باب اول کتب فقہ کی ترتیب کا ملحوظ رکھنا از قبیلہ مندرجات ہے یا سنت مؤکدہ ہے، بہشتی زیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سنت ہے، مسئلہ: اجارہ علی الطاعات متقدمین کے نزدیک ناجائز ہے، البتہ متاخرین بعض طاعات میں بضرورت اس کے جواز کے قائل ہیں، پس امامت کے لئے کسی کو اجورہ پر مقرر کرنا بے ضرورت، جائز ہے یا نہیں، یعنی فی زمانہ جو متولیان و منتظمین کی مساجد کی یہ عادت ہو گئی ہے کہ وہ کسی حافظ وغیرہ کو اجرت پر امام مقرر کرتے ہیں اور قوم میں بعضہم فوق بعض عالم، فاضل، قاری موجود ہوتے ہیں ان سے اس بارے میں کچھ مشورہ نہیں کیا جاتا، اور مقتدیوں میں سے جو پنجگانہ نماز میں حاضر رہتے ہیں اور بہت سے ان میں احق بالامامت ہوتے ہیں ان سے نہیں کہا جاتا کہ تم میں جو احق بالامامت ہو وہ کارامانہ اپنے ذمہ لے، بلکہ محض اپنی رائے سے جو مناسب اجورہ پر کوئی معمولی شخص دستیاب ہو گیا کہ نہ وہ ذی علم ہوتا ہے نہ صحت کے ساتھ مثل قاریوں کے قرآن شریف پڑھ سکتا ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ محض حافظ ہوتا ہے اور اس کو امام مقرر کر دیتے ہیں، پھر بسا اوقات ان لوگوں کو جو احق بالامامت ہوتے ہیں ان کو اس شخص کی اقتدار میں گوناگوں وجوہ سے ضیق واقع ہوتی ہے، اور وہ چاہتے ہیں کہ اگر نماز پڑھانا ہمارے متعلق ہو جاوے تو ہم اس کو بہ طیب خاطر گوارہ کر لیں اور ہمیں تنخواہ وغیرہ سے کچھ غرض نہیں، لیکن متولیان و منتظمین مساجد اس طرز توجہ نہیں کرتے، تو دریافت طلب یہ امر ہے کہ اگر قوم میں عالم فاضل و افضل لوگ موجود ہوں تو ان کی موجودگی میں متولیان مساجد کو بلا مرضی ان کی کسی غیر احق کو امام مقرر کرنا جائز ہے اور موافق سنت ہی یا نہیں اور متولیان مساجد کو اور قوم کو ایسا حق حاصل ہے یا نہیں؟ کہ وہ بموجودگی احق بالامامت کے

غیر کو بلا مرضی و استمراج احق بالامامۃ امام مقرر کر سکیں، اور اگر قوم یا متولیان مساجد نہ ہو، تو حق کو مقدم کریں تو احق اور افضل کو حق منع حاصل ہے یا نہیں، باب الجنازہ و در مختار میں مذکور ہے کہ ثم الولی بترتیب عصوبۃ الاتحاح الا الالب فیقدم علی الابن اتفاقاً، قال الشامی قولہ فیقدم علی الابن اتفاقاً الخ هو الاصح لاقلاۃ فضیلة علیہ و زیادۃ سن و الفضیلة و الزیادۃ تعتبر ترجیحاً فی استحقاق الامامۃ کما فی سائر الصلوٰۃ، بحر عن المبداء، بعد ازاں در مختار میں یہ مذکور ہے ولہ ای للولی و مثله کل من یقدم من باب اولی الاذن لغيرہ فیہا لانہ حقہ فیملک البطالہ الا انہ ان کان هناك من یساویہ فلہ ای لذلک المساوی ولو اصغر سناً المنع لمشارکتہ فی الحق، شامی لکھتے ہیں فلو کان شقیقین فالاسن اولی لکنہ لو قدم احد افلا اصغر منعه ولو قدم کل منہما واحداً فمن قدمہ الاسن اولی، بحر، پس جب کہ ان عبارات سے یہ معلوم ہو گیا کہ باب اولی کا حکم باب الامامۃ اور باب الجنازہ میں برابر ہے، از روئے استحقاق کے تو اس سے ظاہر تر یہی معلوم ہوتا ہے کہ متولیان مساجد اور قوم اگر کسی غیر اولی کو بموجودگی اولی امام بنا دیں تو اولی شخص کو حق منع حاصل ہے، اور کتب فقہ میں جو اجورہ علی الطاعات متاخرین کے نزدیک مجوز ہے وہ بشرط ضرورت ہے، چنانچہ یہ امر مصرح ہے کہ اہل ثواب کے لئے قراءۃ قرآن اجورہ پر ناجائز قرار دیا گیا ہے، بوجہ اس کے کہ اس کو ایک امر غیر ضروری مانا ہے، نیز کتاب الفرائض باب الرد میں یہ امر مصرح ہے کہ رد علی الزوجین بموجودگی دیگر وراثہ ناجائز ہے، البتہ اگر ماسوا زوجین کے کوئی اور وارث نہ ہو تو ان پر رد صحیح ہے، پس یہ صورتیں مقتضی اس امر کی ہیں کہ بے ضرورت اجورہ پر امام مقرر کرنا بھی ناجائز ہے، بالخصوص ایسی صورت میں کہ بموجودگی اولی و افضل غیر اولی کو ہمیشہ کے لئے امام مقرر کیا جاوے، بینوا تو جروا،

الجواب، قال فی الدر والاحق بالامامۃ تقدیماً بل نصباً مجسم الا نفر الاعلم باحکام الصلوٰۃ ام قال الشامی قولہ تقدیماً ای علی من حضر معہ قولہ بل نصباً ای للامام الراجح فی الدر ایضا ولو قد مواعیر الاولی اساء و ابلا اثم و فی رد المحتار قال فی التارخانیۃ و لو ان رجلین فی الفقہ و الصلاح سواء الا ان احدهما اقرأ فقدم القوم الاخر فقد اساء و اوترکوا السنۃ و لکن

لا یأثمون لانهم قد وارثوا صالحا وکذا حکم فی الامارة والحکومة اما الخلافة
وهی الامامة الکبریٰ فلا یجوز ان یتروکوا الا فضل وعلیه اجماع الامة اه فافهم
وفی الدر ايضا وعلی ان صاحب البيت ومثله امام المسجد الراتب ا ولی بالامامة
من غیر مطلقا قال الشافعی ان کان غیره من العاضرين هو اعلم واقرا منه الخ (ص ۵۸۳)
(ج ۱) وفی الدر ايضا وکذا تکرر خلف امره الی ان قال ومن ام باجرة، قال الشافعی
بان استوجر لیصلی اماما سنة او شهرا بکذا ولیس منه ما شرطه الواقف^{علیه}
فانه صدقة ومعونة له رحمتی ای یشبه الصدقة ویشبه الاجرة
کما سیأتی ان شاء الله تعالی فی الوقف علی ان المفقوبه مذهب المتأخرین من
جواز الاستعجار علی تعلیم القرآن والامامة والاذان للصلاة ام (ص ۵۸۷ ج ۱)
وفی الدر ايضا طالب التولية لا یولی الا المشرط له النظر لانه مولى فیريد
التنفید وفيه ایضا ثم اذامات المشرط له بعد موت الواقف ولم یوص
لاحد فولایة النصب للقاضی اذا لا ولایة المستحق الا بتولية ام (ج ۳،
ص ۶۳۵ و ۶۳۶) وفی رد المحتار وفی البیری عن حای الحصیری عن وقف
الانصارى فان لم یکن من یتولى من جيران الواقف وقرايته الا برزق و
یفعل واحد من غیرهم بلا رزق فذلک الی القاضی ینظر فیما هو الاصلح
لاهل الوقف ام وفيه ایضا من الاشباه اذا ولی السلطان مدرسا لیس
باهل لم تصح تولیة لان فعله مقید بالمصلحة خصوصا ان کان المقرر
عن مدرس اهل فان الاهل لم ینعزل وصرح البزارى فی الصلح بان
السلطان اذا اعطى غیر المستحق فقد ظلم مرتین بمنع المستحق واعطى غیر
المستحق ام (ص ۵۹۷ ج ۳)

ان عبارتوں سے امور ذیل مستفاد ہوئے (۱) سنت یہ ہے کہ احق بالامامة کو امام
مقرر کیا جاوے، (۲) اگر متولیان مسجد غیر احق کو مقرر کریں تو اس کی دو صورتیں ہیں
اگر وہ امامت کا اہل بھی نہیں، مثلاً مسائل صلوٰۃ سے جاہل ہے، یا قرآن قدر صلوٰۃ جواز
پڑھنے سے عاجز ہے یا فاسق ہے، تب تو متولیوں کے امام بنانے سے وہ امام ہی نہ ہوگا،
اور اگر متولی اس کو تنخواہ مسجد کی آمدنی سے دیں گے تو ظالم و گنہگار ہوں گے، اور اگر

اہل ہے گو احق نہ ہو تو اس کا امام مقرر کرنا خلاف سنت ہے مگر متولیان کو گناہ نہ ہوگا، (۳)
 جب کوئی شخص امام راتب مقرر ہو جائے بشرطیکہ وہ نااہل نہ ہو تو پھر وہی احق بالامامت ہے
 گو اس کے پیچھے اس سے افضل و اکل موجود ہوں، (۴) مستحق امامت کو قبل از تفریب وجہ اپنے
 علم و فضل وغیرہ کے کسی امام کو امامت سے روکنے کا حق نہیں (۵) جو شخص خود امام بننا چاہتا
 ہو وہ امامت کا مستحق نہیں، گو کیسا ہی افضل ہو، ہاں اگر اس کے سوا اور کوئی اہل نہ ہو تو
 وہی مستحق ہے، یا وہ بلا تنخواہ امامت پر راضی ہو اور دوسرے تنخواہ کے بغیر راضی نہیں تو متولیان
 کو وقف کی مصلحت پر نظر کرنا چاہئے، اور جو مناسب ہو اس کو امام مقرر کرنا چاہئے، اگر
 بلا تنخواہ امامت کرنے والا ویسے ہی پابندی کر سکے جتنی تنخواہ والا کرتا ہے، اور وہ احق بالامامت
 بھی ہو اور اکثر نمازی اس کو پسند بھی کرتے ہوں، تو تنخواہ دار کا ایسی حالت میں رکھنا وقف
 کی مصلحت کے خلاف ہے (۶) اگر وقف نے وقف مسجد میں امام کی تنخواہ مشروط کر دی ہو
 تو وہ اجرت نہیں بلکہ وہ انانت و امداد ہے، جو اتفاقاً جائز ہے، اور مشروط نہ کی ہو تو وہ
 اجرت ہے جو متاخرین کے نزدیک جائز ہے، واللہ اعلم، ۲۲ صفر ۱۳۸۱ھ

امامت کے لئے عمامہ باندھنا سوال (۱۳).....

..... آیا عمامہ باندھنا فعل رسول اللہ ہے، اور ہمیشہ یا گاہ بگاہ، کیا آپ ہمیشہ
 نماز عمامہ سے پڑھاتے تھے، یا کبھی بلا عمامہ بھی نماز پڑھا یا ہے، اگر کوئی پیش امام کبھی بلا عمامہ
 نماز پڑھا تو وہ تارک سنت کہا جائے گا، یا اس کا ثواب کم ہو جائے گا یا کیا بحوالہ کتب
 احادیث صحیحہ ارشاد فرماتے گا، اور شرح سفر السعادت بمقابلہ کتب احادیث صحیحہ کیا مزہ
 رکھتی ہے، بینوا تو جردا،

الجواب؛ عمامہ باندھنا نماز اور غیر حالت نماز دونوں میں سنت ہے، امام
 کے لئے بھی اور مقتدی کے لئے بھی، لیکن بدون عمامہ کے بھی نماز پڑھنا جائز ہے،
 اس سے نماز میں کچھ کراہت نہیں ہوتی، بلکہ جہاں عمامہ کو نماز کے لئے لوگ ضروری سمجھتے
 ہوں وہاں امام کو اصلاح عقیدہ عوام کے لئے گاہے گاہے عمامہ کا ترک کر دینا افضل
 ہوگا قال العلامة المحدث عبد الرؤوف المنادی فی شرح الشمائل للترمذی
 مانصہ والعامة سنة لاسيما للصلوة ولقصد التجميل لاخبار كثيرة فيها
 واشتد اذضعف كثير فيها يجبره كثرة طرقتها وزعم وضع اكثرها

تساہل وتحصل السنۃ بكونها على الرأس أو القلنسوة تحتها إلى أن قال ولا بأس
بليس القلنسوة اللاصقة بالرأس والمرتفعة المضربة وغيرها تحت العمامة
وبلاعمامة لأن ذلك كله جاء عن المصطفى صلى الله عليه وسلم وبذلك
أيد بعضهم ما اعتيد في بعض الأقطار من ترك العمامة من أصلها وتمييز
علمائهم بطيلسان على قلنسوة بيضاء ولكن الأفضل العمامة أم وقال
العلامة الفاری فی شرح الشماثل ایضا ولابی داود والمصنف فرق ما بیننا
وبین المشرکین العمامة علی القلانس قال المصنف غریب وليس اسناد
بالقائم أم ص ۱۶۵ و ۱۶۶ ج ۱، وفي زاد المعاد لابن القيم وكانت له صلى الله
عليه وسلم عمامة تسمى السحاب كساها عليها وكان يلبسها ويلبس تحتها
القلنسوة وكان يلبس القلنسوة بغير عمامة ويلبس العمامة بغير قلنسوة
وكان إذا اتم أرخى عمامته بين كتفيه أم ص ۳۲ ج ۱، قلت وهذا عام
للصلوة وغيرها، والله أعلم، ۱۹ جمادى الأولى ۱۳۴۲ھ

امام اعظمؒ کو برا بھلا کہنے والے | سوال (۱۳) بعد تھوڑے عرصہ کے جناب حافظ صاحب
کے پیچھے نماز کا حکم، مسجد میں نماز مغرب کے قبل تشریف لا کر مصلیوں سے
کہنے لگے کہ دیکھئے دیکھئے صاحبو اس کتاب نام لا معلوم میں لکھا ہے، کیا لکھا ہے مسئلہ درود
امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک زنا کی خرچی حلال عینی کی شرح میں موجود ہے، بس مصلیوں
میں سے ایک شخص بول اٹھا کہ جناب حافظ صاحب آپ شاید امام صاحب کے حالات سے
واقف نہیں، امام صاحب وہی ہیں کہ ایک وضو سے چالیس برس تک نماز فجر کی پڑھی، تو
حافظ صاحب نے جواب دیا کہ امام صاحب نے بدعت کیا، تو اسی مصلی نے کہا کہ او نماز پوچھو
اعتقاد حافظ صاحب کا معلوم ہو گیا اور ان کے پیچھے نماز ہرگز نہ ہوگی، کیونکہ اس روز بالابد
کو پڑی بنایا، اور آج امام صاحب کو زنا کی تہمت لگایا اور بدعتی بنایا، افسوس! جناب
حافظ صاحب آپ اگر جماعت مسلمان علم والوں میں ہوتے تو اس گفتگو پر جماعت سے
گوشمالی دے کر نکال دیئے جاتے اور امام بننے کے لائق نہ رہتے، اور دیکھو بھائیو میں اُن کے
پیچھے نماز نہ پڑھوں گا، اور اگر جماعت ہوتی رہے گی تو دار کواعیہ الراکعین کے خیال سے جماعت
میں شریک ہو کر نماز اپنی دُہراؤں گا، چونکہ حافظ صاحب اس محلہ کے امام ہیں، خلاصہ

یہ ہے کہ اظہار حق ہو اس شخص کا کلام ارقام سے باہر ہے، ایسے کو امام بنانا جائز ہے یا نہیں، اور ایسے اعتقاد والے کو کیا کہنا چاہئے، صاف صاف مدلل تحریر ہو؟

الجواب؛ جس نے امام اعظم کی شان میں ایسے الفاظ استعمال کئے وہ خود مردود ہے، اس کے پیچھے نماز درست نہیں، مسلمانوں کو کوئی اور امام صالح حنفی متقی تلاش کرنا چاہئے، واللہ اعلم ۱۲ رجب ۱۴۲۸ھ

سوال (۱۳) امام نے دوسری رکعت میں ایک سجدہ کر کے بیٹھ جائے الخ اگر ایک سجدہ کر کے بیٹھ گیا تو اب لقمہ کس طرح دیوے، کہ امام کو معلوم ہو جاوے کہ میں دوسرا سجدہ بھول گیا،

الجواب؛ جب امام ایک سجدہ کر کے بیٹھ جائے تو مقتدی سبحان اللہ کہیں اس سے امام کو یاد آ جاوے گا کہ مجھ سے کچھ رہ گیا ہے،

سوال (۱۵) مسجد کا پیش امام مسجد میں صفیں غیر رخ بچھاتا ہے سے ٹیڑھا بچھانا، اگر کوئی مقتدی صف کو درست کرتا ہے تو خفا ہوتا ہے، اور کہتا ہے کہ صفیں درست ہیں، مگر صفیں بالکل ٹیڑھی ہوتی ہیں، جس کا خاکہ یہ ہے قبلہ صحیح

اس حالت میں نماز میں کراہیت تو نہیں ہوگی،

الجواب؛ صورت مذکورہ میں نماز تو سب کی ہو جاتی ہے، مگر امام کا بلا وجہ صفیں ٹیڑھی بچھانا اور اس پر اصرار کرنا موجب نقصان صلوٰۃ ہے، اور باعث تشویش قوم

لہذا اس کو اس لغو حرکت سے احتراز کرنا چاہئے، قال فی الخلاصۃ فی القبلة المختار انہ ينظر الی غروب الشمس فی اقصر یوم فی الشتاء والی الغروب فی اطول یوم فی الصيف فیجعل ثلثی

ذلک عن یمنہ والثلث عن یسارہ ویصلی فیما بین ذلک، ص ۷۰، ج ۱، ۲۲ رمضان ۱۴۲۸ھ

سوال (۱۶) لنگڑا آدمی جو کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتا، بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے، وہ بیٹھ کر اپنی نماز پڑھتا ہے، اس کو جماعت میں صف اول میں بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب؛ جائز ہے، واللہ اعلم ۱۱ شعبان ۱۴۲۸ھ

سوال (۱۷) دو منزلہ مسجد میں امام کے سامنے اوپر کو کھلا ایک جماعت کرنے کا حکم، ہونا (جیسا کہ دیکھا جاتا ہے) ضروری ہے یا بغیر اس کے بھی بیک

جماعت دونوں منزلوں میں نماز جائز ہے ؟

الجواب؛ جب مسجد کی منزل اسفل نمازیوں سے بھر جاوے تو اوپر کی منزل میں کھڑے ہو کر مفتی جماعت میں شریک کر سکتے ہیں بشرطیکہ امام سے آگے نہ بڑھیں، اور امام کے افعال کی اطلاع ہوتی رہے، امام کے سامنے اوپر کا حصہ کھلا ہونا شرط نہیں، البتہ اس سے اطلاع احوال امام میں سہولت ہوتی ہے، واللہ اعلم، ۲۴ شعبان ۱۴۲۸ھ

طاق اور محراب میں امام کا کھڑا ہونا | سوال (۱۸)۔

مسجد کی کمانوں میں اور مسجد کے دونوں ستونوں کے درمیان میں امام کو کھڑا ہو کر نماز پڑھنا جائز ہے یا نہ، اگر امام کمان سے ذرا ہٹ کر پیچھے کھڑا ہو تو پیچھے کی صف والے کو سجدہ کی جگہ نہیں رہتی، لہذا امام عین کمان میں کھڑے ہو کر نماز پڑھاتے ہیں، فقط بنوا توجسروا،

الجواب، کمانوں اور ستونوں میں تمامہ امام کا کھڑا ہونا مکروہ ہے، لیکن اگر جگہ تنگ ہو تو کراہت باقی نہ رہے گی، قال فی مراقی الفلاح ویکرہ قیام الامام بجملۃ فی المحراب لاقیامہ خارجہ وسجودہ فیہ والکراہۃ لاشتباہ الحال علی القوم واذا ضاق المكان فلا کراہۃ ام (ص ۲۱۱) ۲۵ شعبان ۱۴۲۸ھ

بیٹھ کر امامت کرنے والے | سوال (۱۹)۔

اعرج کے پیچھے نماز کا حکم قصبہ مراد نگر میں ایک مسجد کے پیش ام پیشتر بھی اپنی ٹانگوں سے مجبوری کی حالت میں تھا، لیکن وقتی اور جمعہ کی نماز کھڑے ہو کر بدقت تمام ادا کرتا تھا، اب معذوری اس قدر بڑھ گئی ہے کہ کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہا، اور بیٹھ کر وقتی اور جمعہ کی نمازوں کی امامت ادا کرتا ہے، ایسی حالت میں نماز جمعہ خصوصاً اور وقتی نماز عموماً اس کے پیچھے جائز ہیں یا نہیں، جواب سے مشرح طور پر آگاہی بخشی جاوے ؟

الجواب؛ قال فی الدررکنذ انکرہ خلف امرؤ وسفیہ ومفلوج وابصر شاع برصہ ام قال الشامی وکن ذلک اعرج یقوم ببعض قدمہ فالاعتداء بغیرہ اولی والظاہر ان العلة النفسیة ولذا قید الابصر بالشیع لیکون ظاہر اولعدم امکان اکمال الطہارۃ ایضاً فی المفلوج وغیرہ ام (ص ۱۷۵) ۱۷۵ ملخصاً صورت مسئلہ میں اگر امام مذکور کے برابر یا اس سے زیادہ علم و قرارت والا کوئی دوسرا امام مل سکے تو اس کی اقتدار افضل ہے، اور اس صورت میں امام اعرج کی اقتدار

مکروہ ہوگی، اور اگر کوئی اس جیسے نہ مل سکے تو اسی امام کے پیچھے نماز بلا کراہت درست ہوگی واللہ اعلم۔ ۱۹ ذیقعدہ ۱۳۲۲ھ

امام کے بدعتی ہونے پر مسجد کی جماعت ترک کرنے اور گھر میں جماعت کرنے کا حکم، تمام بدعات مردوجہ فی زمانہ کو اعتصاماً بالکتاب والسنة دفعۃ چھوڑ دیا، اور اپنی اموات وغیرہ میں کتب فقہ کی ہدایت

کے مطابق عامل بن گئے۔ اور کسی کے بُرا بھلا کہنے کی مطلق پرواہ نہیں کرتے تھے، اور فقہ کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کو پسند کیا، تو مستدرع امام کا مسئلہ معلوم کرنے پر ان کو خیال ہوا کہ ہم اہل سنت بدعتیوں کے پیچھے کیوں پڑھیں، ہم اپنی جماعت الگ قائم کر سکتے ہیں، اور چونکہ ہماری جماعت کے آدمی بیس پچیس کی تعداد سے متجاوز ہیں، مگر باد جود ایں ہمہ مساجد کے اماموں کو بسبب مستدرعین کے غلبہ کے معزول و برطرف نہیں کر سکتے، اب یا تو تارک جماعت ہو کر فرادی فرادی نمازیں مسجدوں میں پڑھا کریں، یا کسی مکان مثل گھیرہ وغیرہ کے محلہ میں اپنی جماعت کے لوگوں کو جمع کر کے بجاعت اپنی نمازیں پڑھا کریں، پس اُن لوگوں نے اس صورت ثانی کو اختیار کر کے محلہ کی مسجد کے قریب ایک وسیع گھیر میں اپنی جماعت قائم کر لی ہے، تو کیا یہ جماعت قائم کر لینا ان کا جائز بلا کراہت کے ہو گا یا مکروہ ہے، کیونکہ مسجد میں نماز پڑھنے کی صورت یہ ہے کہ فرادی فرادی پڑھیں، اس میں تو ہمیشہ کے لئے تارک جماعت بنتے ہیں، اور مستدرع کے پیچھے مکروہ ہے، اور وہاں یعنی اس گھیر میں اپنی جماعت مستقل ہوتی ہے، چونکہ مسجد میں فتنہ و فساد کے عذر سے جماعت نہیں قائم کر سکتے، اور اس مکان میں کوئی مانع نہیں ہے، تو یہ مذکور لوگ تمام یا اکثر اپنی جماعت جو کرتے ہیں اس میں ان کا یہ عذر شرعی عذر ہی یا نہیں، اگر ہے تو کیا ان کی نماز بسبب اس عذر کے مسجد کے جماعت کے برابر فضیلت رکھے گی یا نہیں، جیسا کہ صحیح بخاری کے باب الجہاد میں یہ حدیث ہے کہ اذا مرض العبد او سافر كتب له مثل ما كان يعمل مقيماً صحيحاً، اس سے تو فضیلت مسجد کے برابر ہی سمجھی جاتی ہے، اور ہدایہ کی اس حدیث ر صلوٰۃ القاعد علی النصف من صلوٰۃ القائم کے تحت میں صاحب کفایہ لکھتے ہیں و صلوٰۃ المعذور لیست علی النصف بل ہو مثل صلوٰۃ القائم، اور اس سے عذر کو پورا دخل معلوم ہوتا ہے، اور اسی بناء پر وہ لوگ اپنی جماعت اُس گھیر میں قائم کرتے ہیں، پس جو امر مفتی یہ ہو اس سے مطلع فرمائیں،

البتراب؛ قال فی البعرو ذکر فی غایۃ البیان معنیاً الی الاجناس ان تارک الجماعة یتوجب اساءۃ ولا تقبل شہادتہ اذا ترکہا استخفافاً بذلک وجمانۃ اما اذا ترکہا سہوا او ترکہا بتاویل بان یکون الامام من اهل الاهواء او مخالف المذہب المقتدی لا یراعی من ہبہ فلا یتوجب الاساءۃ وتقبل شہادتہ ام (ص ۳۲۵ ج ۱) وفيہ ایضاً ذکر المشرح وغیرہ ان الفاسق اذا تعدی ومنعہ یصلی الجمعة خلفہ وفي غیرہا ینتقل الی مسجد اخر وعلل لہ فی المعراج بان فی غیر الجمعة یجوز اماما غیرہ فقال فی فتح القدیر وعلی هذا فیکرہ الاقتداء بہ فی الجمعة اذا تعدی اقامتہا فی المصر علی قول محمدؐ وهو المفق بہ لانه بسبیل من التحول حیث عنہ ام (ص ۳۲۹ ج ۱) وفي تعلیق البحر لابن عابدین عن القنیۃ اختلف العلماء فی اقامتہا فی البیت والاصح انہا کما قامتہا فی المسجد الا فی الفضیلۃ وهو ظاہر من مذہب الشافعی ام (ص ۳۲۵ ج ۱) عبارت اولی سے بدعت امام مسقط جماعت معلوم ہوتا ہے، اور عبارت ثانیہ سے وجوب تحول بجانب امام دیگر مفہوم ہوتا ہے اور عبارت ثالثہ سے جماعت خانہ کا حکم مثل جماعت مسجد معلوم ہوتا ہے، صرف فضیلت کا فرق ہے، پس اگر عذر بدعت امام کی وجہ سے گھر میں جماعت اہل سنت کے ساتھ نماز پڑھی جائے تو عبارات مذکورہ سے اس کا جواز ثابت ہوتا ہے، رہا یہ کہ اس صورت میں جماعت بیت سے مسجد کی فضیلت حاصل ہوگی یا نہیں اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا، البتہ مراقی الفلاح میں کہا ہے واذا انقطع عن الجماعة لعذر من اعذارہا المبیحۃ للمتخلف وكانت نیتہ حضورہا لولا العذر والحاصل یحصل لہ ثوابہا لقولہ صلی اللہ علیہ وسلم انما الاعمال بالنیات وانما لكل امری ما نوى ام (ص ۳۲۵ ج ۱) اور اگر بدعت امام کا عذر ہونا معلوم ہو چکا ہے، ان مقدمات سے مستنبط ہو سکتا ہے کہ اس صورت میں مسجد کی فضیلت بھی حاصل ہو جائے گی، واللہ اعلم، لیکن اس پر خدشہ یہ ہے کہ حضرات صحابہؓ نے حجاج وغیرہ کے پیچھے جماعت ترک نہیں کی، حالانکہ وہ بھی اپنے کسی گھر میں الگ جماعت کر سکتے تھے، اگر یہ افضل ہوتا تو صحابہ ضرور ایسا کرتے، ہاں یہ ممکن ہے کہ انھوں نے خوف کی وجہ سے متخلف جماعت نہ کیا ہو، فتبر، ۱۹، زیقہ سلسلہ

تجوید سے قرآن مجید پڑھنے والے کی | سوال (۲۱) اگر
غیر مجتہد کے پیچھے نماز کا حکم، کوئی بڑا عالم نماز میں حاکم کی جگہ ہار یا عین کی جگہ الف اور

ضاد کو دال پڑھے تو جو کوئی عالم نہیں لیکن تشرآن صحیح پڑھتا ہے اس کی اقتدار اس عالم
کے ساتھ کرنا جائز ہے یا نہیں، بر تقدیر اول پھر نماز کا اعادہ کرنا چاہئے یا نہیں؟

الجواب، اگر یہ عالم اپنی قدرت کے موافق تصحیح حروف میں سعی کر چکا پھر بھی
صحیح پڑھنے پر قادر نہیں ہوا یا اس کی زبان میں علت ہے جس کی وجہ سے وہ صحیح پڑھنے سے
معذور ہے، ان دو صورتوں میں صحیح پڑھنے والے کی نماز اس کے پیچھے درست ہو جائے گی،
اور اگر اس نے سعی نہیں کی، نہ اس کی زبان میں علت ہے تو اس کے پیچھے صحیح قرآن پڑھنے
والے کی نماز درست نہیں، اس صورت میں اس نماز کا اعادہ واجب ہے، جو اس کے پیچھے
پڑھی گئی ہو، واللہ اعلم، ۲۲ ذی الحجہ ۱۴۲۸ھ

صحیح خواں کی غلط خواں کے | سوال (۲۲) اگر محلہ کی مسجد کا امام قرأت میں ایسی غلطیاں کرتا ہو
امام کے پیچھے نماز کا حکم، کہ بجائے معروف صیغوں کے مجہول اور بجائے مجہول کے معروف اول

بجائے صاد کے سین پڑھتا ہو تو اس صورت میں وہ شخص جو تشرآن صحیح پڑھتا ہو محلہ
کی مسجد کے خیال سے اسی مسجد میں اسی امام کے پیچھے نماز پڑھیں یا دوسری جگہ؟

الجواب، غلط خواں امام کے پیچھے صحیح قرآن پڑھنے والے کی نماز بعض صورتوں میں
فاسد ہو جاتی ہے، اس لئے بہتر تو یہ ہے کہ اگر فساد نہ ہو تو غلط خواں امام کو امامت سے الگ
کر کے صحیح خواں امام مقرر کیا جائے، اگر اس میں فتنہ کا احتمال ہو تو صحیح قرآن پڑھنے والے غلط خواں
کی اقتدار نہ کریں، بلکہ مسجد محلہ کو چھوڑ کر کسی صحیح خواں امام کی اقتدار کریں، واللہ اعلم، ۲۲ ذی الحجہ ۱۴۲۸ھ

اعرج کی امامت مکروہ کا بیان | سوال (۲۳) زید کے عذر کی وجہ سے چلتے وقت بایاں قدم
اور اس کی تفصیل،

ذرا دبا کر چلتا ہے، اور نماز میں سجدہ اور قعدہ اولیٰ سے اٹھتے وقت دایاں قدم تقریباً ایک باشت
آگے بڑھ جاتا ہے، ایسے حالت میں شخص مذکور فقہائے حنفیہ کے نزدیک اعرج کے حکم میں داخل ہے
یا نہیں، اور در مختار کی عبارت (ولو لم یؤدبہم لہ کارہون ان الکراہۃ لفساد فیہ اولانہم احق
بالامانۃ منہ لہ ذلک تحریراً لحدیث ابی داؤد) کی روش سے کیا شخص مذکور کی امامت مکروہ تحریمی
ہوگی؟ جبکہ شخص مذکور بحالت قیام دونوں قدم پر کھڑا ہوتا ہو، اور بایں ہمہ خود بھی امامت

سے گریز کرتا ہو، معتبر اور صاحب فہم اصحاب ان کے علم اور اقرار ہونے کی وجہ سے جبراً امام بناتے ہیں، اور یہاں فساد خلقی اور خلقی دونوں مراد ہیں یا صرف فساد خلقی مثل فسق و فجور وغیرہ کے مراد ہے، اور اگر فساد عام مراد ہے تو صورت حاضر، اس میں داخل ہے یا نہیں، اور اگر داخل بھی ہو تو صورت دافعہ اس طرح ہونے پر کہ ازل کسی ذاتی کاوش کی وجہ سے ایک شخص شخص مذکور سے ناراض ہو کر اس کی امامت سے منہ موڑتا ہے، پانچ چھ روز کے بعد ایک شخص کو اپنا ہم خیال بنا کر مسجد اور جماعت سے علیحدہ کرتا ہے، پھر بعد ایک ماہ کے ایک تیسرے شخص کو مع اس کے اتباع کے مسجد اور جماعت معہود سے علیحدہ کر کے طرح طرح کے فساد برپا کرتا ہے اور اعرجیت کی صورت کو آڑ بنا کر اس سے اپنے فساد میں امداد لیتا ہے، ایسی حالت میں کیا ان علیحدہ شدہ بعض قوم کی نفرت شرعاً مقبول ہوگی یا نہیں، بحوالہ کتاب بیان فرما کر ثواب دارین حاصل کریں،

الجواب: قال فی الدرود کن التکرہ خلف امر دوسفیہ ومفلوج وابصر
شاع برصہ ام، قال الشامی وكذلك اعرج یقوم ببعض قدمہ فالقتداء
بغیرہ اولی الی ان قال والظاهر ان العلة النفرۃ ام فی الدر ایضا هذا ان وجہ
غیرہم ای من ہوا حق بالامامۃ منهم ۱۲ شامی، والافلاکراۃ بحر بشار قال
الشامی وقد علمت انه موافق للمنقول عن الاختیار وغیرہ ۱۲ ام (ص ۸، ۸۵)
چونکہ اعرج میں یقوم ببعض قدمہ کی قید لگائی گئی ہے، اور قیود فقہیہ احترازی ہوتی ہیں
اس لئے معلوم ہوا کہ جو شخص دونوں پیروں پر بخوبی کھڑا ہوتا ہے وہ اس اعرج میں داخل
نہیں جس کے پیچھے نماز مکروہ ہے، کیونکہ عرج قلیل موجب نفرت نہیں ہوتا، پھر جس اعرج
کے پیچھے نماز مکروہ بھی ہے تو کراہت اس وقت ہے جبکہ مقتدیوں میں اس سے افضل موجود
ہو اور اگر اس سے علم و قرأت میں افضل کوئی نہ ہو تو اعرج کامل کے پیچھے نماز میں کچھ کراہت
نہیں رہتی اور اس حالت میں لوگوں کی نفرت کا کچھ اعتبار نہیں کیا جائے گا، قال فی البحر
قید کراۃ امامۃ الاعشی فی المعیط وغیرہ بان لا یكون افضل القوم فان
کان افضل فہو اولی الی ان قال ولعل وجهہ ان تنفر الجماعۃ بتقدیمہ یزول
اذا کان افضل من غیرہ بل التنفیر یكون فی تقدیم غیرہ ام (ص ۸۵ ج ۱)
پس بصورت مذکورہ اس اعرج کے پیچھے نماز بلا کراہت درست ہے، اور نفرت قوم کا اعتبار

نہیں خصوصاً جبکہ اس نفرت کا منشاء ذاتی عداوت ہو جیسا کہ سوال سے معلوم ہو رہا ہے۔

ہذا واللہ اعلم بالصواب، ۲۳ رزی الحجہ ۱۲۸۶ھ

اس شخص کی امامت کا حکم | سوال (۲۴) بکر ایک امام مسجد ہے، اور ایک چھوٹے موضع کا رہنے والا ہے، اور اکثر بکر کی زوجہ اپنے عزیز واقارب کے بغرض کے لئے گھر سے باہر نکلتی ہو ملاقات ایک چادر اوڑھ کر چلی جاتی ہے، اور عام طور سے کسی جگہ نہیں آتی جاتی، جیسا کہ نام زمینداران کی مستورات کھیت وغیرہ میں کھلے منہ روٹی وغیرہ لے کر جاتی ہیں اور دن میں بہت کم ادھر ادھر آتی جاتی ہے، بلکہ اکثر رات کو چلی جاتی ہے بکر کی امامت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب؛ صورت مذکورہ میں بکر کی امامت درست ہے، لیکن یہ لازم ہے کہ بکر اپنی زوجہ کو تائید کرے کہ جب اعزہ واقارب کے ملنے جایا کرے تو چادر سے سارا بدن خوب چھپا کر جایا کرے، ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۶ھ

عورتوں کی تنہا جماعت کا حکم | سوال (۲۵)

پردہ نشین لکھی پڑھی عورت نماز عیدین اور نماز جمعہ اپنے گھر میں صرف عورتوں ہی عورتوں کی امام بن کر پڑھا سکتی ہے؟ اگر نماز جمعہ نہیں پڑھا سکتی تو کیا عیدین کی نماز پڑھانے کی اجازت ہے، اور کچھ کراہت تو نہیں؟ اگر باجماعت نہیں تو عیدین میں عورتیں ایک گھر میں جمع ہو کر علیحدہ علیحدہ اپنی دو رکعت پڑھ سکتی ہیں، اور کیا آیت ذیل سے جماعت نساء کی اباحت پر استدلال صحیح ہے؟ خاص کر عیدین کی جماعت نساء پر مفصل جواب تمام شبہات کو دفع فرماتے ہوئے دستخط خاص سے مزین فرمادیں، روایات یہ ہیں؛ سنن ابوداؤد میں حدیث طویل میں مردی ہے وکانت ایام وقته

قد قرأت القرآن فاستأذنت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان تتخذ فی دارھا مؤذنا فاذن لھا وامرھا ان تؤم اھل دارھا،

کتاب الآثار محمد بن الحسن میں ہے اخبرنا ابو حنیفۃ نا حماد عن ابراہیم عن عائشۃ انھا کانت تؤم النساء فی شھر رمضان فتقوم وسطھن،

تخریج رافعی میں ہے اخرج ابن ابی شیبۃ ثم الحاکم من طریق ابن ابی لیلی عن عطاء عن عائشۃ انھا کانت تؤم النساء فتقوم معھن فی الصف،

واخرج الشافعي وابن ابی شيبة وعبد الرزاق عن ام سلمة انها كانت اتت النساء فقامت وسطهن، اور مستدرک میں یہ ہر ان عائشہ كانت قعودن وتقيم وتقوم النساء فتقوم وسطهن، بعض میں مطلق امامت کا ذکر ہے، اور بعضوں میں ^{مقيمين} بر رمضان نیز کارہین جماعت ان روایات کا کیا جواب دیتے ہیں،

الجواب: اخرج العیثمی فی مجمع الزوائد عن عائشة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لا خير في جماعة النساء الا في المسجد او في جنازة قتيلا رواه احمد الطبراني في الاوسط الا انه قال لا خير في جماعة النساء الا في المسجد جماعة وفيه ابن هبة وفيه كلام امر ص ۵۵ ج ۱ قلت قد حسن له الترمذي واحتج به غير واحد كما فيه الايضار ص ۱۲۶ وص ۶۵ ولا يخفى ان جماعة النساء في مسجد لا تكون الا مع الرجال فمعنى الحديث لا خير في جماعة النساء الا مع الرجال فعلم ان جماعة النساء وحدهن مكروهة لنفيه صلى الله عليه وسلم الخيرية عنها، وقد اجمعت الامة على كراهة خروج النساء الى مسجد الجماعة الايضار لو خرجن فلم يجوز احد من الائمة ان يجمعن وحدهن بل لا بد لهن من الصلوة خلف الرجال فافهم وكل ما ورد عن عائشة وام سلمة في امامتها النساء فلا يخلو عن مثل ليث بن ابی سليم وابن ابی ليلى وغيرهما من فيه مقال فلم يكن راجحا على اثر ابن لهيعة هذا اور رواية ابراهيم عن عائشة منقطعة فلا ترجيح له الايضار ولا يخفى ترجيح المرفوع على الموقوف ولم يتبين مخالفته عمل الراوي لرواية هل كانت قبل الرواية او بعد ها فلا يعمل بفعل عائشة وانها المرفوع فافهم والبسط في الاعلاء ص ۱۱۲ و ۱۱۳ ج ۲

روایات، مذکورہ سوال کا جواب تو عبارت عربی میں دیدیا گیا کہ حضرت عائشہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً روایت کرتی ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ عورتوں کی جماعت میں خیر نہیں ہے، اسی پر حنفیہ کا عمل ہے، اور اسی سے اُن کے قول کی ترجیح معلوم ہوتی ہے پس عورتوں کو باہم جماعت کرنا مکروہ ہے، اور عید کی جماعت تو صرف عورتوں کے منعقد ہو ہی نہیں سکتی، کیونکہ وہ مثل جمعہ کے ہے، جس کے لئے رجال کا وجود شرط ہے، اور اس کے

سوا بھی ان کی جماعت مکروہ ہے، اور عید کے دن الگ الگ بھی نماز پڑھنا ایک گھر میں جمع ہو کر مکروہ ہے، کیونکہ اجتماع فسادِ فتنہ سے خالی نہیں ہاں ہر عورت اپنے گھر میں بہ نیت نفل جتنی چاہے نماز پڑھے، واللہ اعلم، ۱۹ رجب ۱۴۲۸ھ

امام رکوع میں ہوا مقتدی تکبیر تحریمہ کہہ کر فوراً رکوع میں شرکت کر لے تو نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟ سوال (۲۶)..... امام رکوع میں ہو تو تحریمہ کہہ کر فوراً رکوع میں شرکت کر لے تو نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟ کہہ کر فوراً مقتدی رکوع کر سکتا ہے یا نہیں؟ اس کی نماز ایسا کرنے سے ہوگی یا نہیں؟ ایک شخص مسجد میں ایسے وقت آیا کہ امام رکوع میں ہے، اس نے تکبیر تحریمہ کہہ کر فوراً رکوع میں شرکت کر لی، یعنی تکبیر تحریمہ کہہ کر قیام کچھ نہیں کیا، فوراً جھک گیا تو نماز صحیح ہوئی یا نہیں؟

الجواب: اگر تکبیر تحریمہ بحالت قیام کہی ہے یا بحالت انحناء کہی ہے، اگر وہ اقرب الی القیام تھا تو نماز درست ہے، اور اگر بحالت انحناء کہی اور اقرب الی الركوع تھا تو نماز درست نہیں ہوئی، غرض تکبیر تحریمہ کا بحالت قیام یا بحالت اقرب الی القیام ہونا فرض ہے، تکبیر تحریمہ کے بعد مزید قیام فرض نہیں قال فی مرقا الفلاح والثانی من شروط التعریبة الاتیان بالتعریبة قاشا ومنحنیا قليلا قبل وجود انحنائه بساھوا قرب للركوع قال فی البرھان لو ادرك الامام ركعاً فحنى ظهره ثم كبر ان كان الى القیام اقرب صم اشروع ولو اراد به تكبیر الركوع وتلغو نيته لان مدرك الامام في الركوع لا يحتاج الى تكبیر مرتین خلافا لبعضهم وان كان الى الركوع اقرب لا يصح الشروع ام ص ۱۲، ۱۳ شعبان ۱۴۲۸ھ

جماعت ثانیہ | سوال (۲۷)..... جس مسجد میں امام اور مؤذن معسر رہے اور اس گاؤں کے تمام آدمی اس مسجد میں اول جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں، اس کے بعد اگر دو ہی آدمی پھر جماعت کریں مکروہ تحریمی ہو گا یا نہیں؟ چند کتب معتبرہ کی عبارت نقل فرما کر جواب عنایت فرمادیں، بینوا توجسروا،

الجواب واللہ الموفق للصواب؛ ذکر فی رد المحتار عن المنبع ثم قال فی الاستدلال ولنا انه علیہ الصلوٰۃ والسلام كان خرج لیصلم بین

عہ قلت اخرجه الطبرانی فی الکبیر والاوسط عن ابی بکرۃ درجہ ثقات کذا فی مجمع الزوائد (۱/۱۷۱) ظ

قوم فعاد الى المسجد وقد صلى اهل المسجد فرجع الى منزله فجمع اهله و
صلى ولو جاز ذلك لما اختار الصلوة في بيته على الجماعة في المسجد ولان
في الاطلاق هكذا تقليل الجماعة معنى فانهم لا يجتمعون اذا علموا انها
لا تقوتهم ومقتضى هذا الاستدلال كراهة التكرار في مسجد المحلة
ولو بدون اذان ويؤيده ما في الظهيرية ولو دخل جماعة المسجد بعد ما
صلى فيه اهله يصلون وحدها وهو ظاهر الرواية ام وهذا مخالف
لحكاية الاجماع المارة وهو ما ذكره قبل عن المنبع والتقليل للمسجد
المختصة بالمحلة احتراز من الشارع وبالاذان الثاني احتراز عما اذا
صلى في المسجد المحلة جماعة بغير اذان حيث يباح اجماعا ام رص (ص ۵۵)
لبدائع في بيان ما يفعله بعد فوات الجماعة مانصه لاختلاف في انه
اذا فاتته الجماعة لا يجب عليه الطلب في مسجد اخر لكن كيف يصنع
ذكر في الاصل انه اذا فاتته الجماعة في مسجد حيه فان اتى مسجدا
اخر يرد اذراك الجماعة فيه فحسن صلى في مسجد حيه فحسن قال كانوا اذا
فاتتهم الجماعة فمنهم من يصلى في مسجد حيه ومنهم من يتبع الجماعة
اراد به الصحابة رضي الله عنهم ولان في كل جانب مراعاة حرمة وترك
اخرى ففي احد الجانبين مراعاة حرمة مسجد وترك الجماعة وفي
الجانب الاخر مراعاة فضيلة الجماعة وترك حق مسجد فاذا تعذر لجميع

عده اور وعليه بعض الناس نقلاً عن التحرير المختار بقوله ولا يتم الاستدلال به الا اذا وجد جماعة يصلى بهم
في المسجد ومع هذا اختار الصلوة في منزله باهله ام قلت عدم وجوبه مثل هذه الجماعة بعيد لانه صلى الله
عليه وسلم لم يكن يذهب للصلاة بين الاقوام وحده بل كان يذهب بجماعة من اصحابه كما هو المعروف من عاداته
ولو سلم تنزلا فكان يمكن ان يحج الصلوة باهله في المسجد فان النساء كن يشهدن الصلوة فيه مع النبي صلى الله
عليه وسلم كما عرف في موضعه فاستدلال به تام ولا يضره الاحتمالات البعيدة ۱۲ اظ، على انه قد ثبت عن
الصحابة انهم لم يجعوا في المسجد ثانيا مع قدرتهم على ذلك كما سيأتي،
عده سيأتي ما يدل له مؤيدة ۱۲ منه

بينهما مال الى ايها شاء وذكر القدرى انه اذا فاتته الجماعة جمع باهل في منزله وان صلى وحده جاز لما روى عن النبي صلى الله عليه وسلم انه خرج من المدينة الى صلح بلن حيين من احياء العرب فانصرف منه وقد فرغ الناس من الصلوة فمال الى بيته وجمع باهل في منزله وفي هذا الحديث دليل على سقوط الطلب اذ لو وجب لكان اولى الناس به رسول الله صلى الله عليه وسلم وذكر الامام الشافعي ان الا الى في زماننا انه اذا لم يخل مسجده ان يتبع الجماعة وان دخل مسجده صلى فيه ام رص ۱۵۶ ج ۱ قلت وهذا يدل على كراهة الجماعة الثانية مطلقا ولو بدون اذان لانه حصر منع فانت الجماعة في تتبعها في مسجد اخر ان كان يبرجوا ذرا كها فيه وفي صلواته في مسجد حيه منفردا وعلله بان في كل جانب مراعاة حرمة وترك اخرى فاذا تعذر الجمع بينهما مال الى ايها شاء فلو كانت الجماعة الثانية بدون الاذان غير مكروهة لانتفى ذلك التعذر بان يجمع ثانيا في مسجد سبه كما لا يخفى فالظاهر ان المذهب عندنا وظاهر الرواية هو الكراهة مطلقا ولو بدون اذان فان صاحب البدائع والقدرى والشمسي اعرف الناس بالمذهب من غيرهم وتقيدوها بالاذان لعلمها في النوار قال الشعلاني في رحمة الائمة ومن دخل مسجد افوجد امامه قد فرغ من الصلوة فان كان المسجد في غير مسر الناس كره له ان يستأنف فيه جماعة عند ابى حنيفة ومالك والشافعي وقال احمد لا يكره ام رص ۳۲ والدلائل ايضا تقتضي الكراهة مطلقا منها ما قد مر ذكره ومنها ما رواه سحنون عن ابن القاسم عن مالك عن عبد الرحمن بن الجبر قال دخلت مع سالم بن عبد الله مسجد الجعفة وقد فرغوا من الصلوة فقالوا لا تجمع الصلوة فقال سالم لا تجمع صلوة واحدة في مسجد واحد مرتين رجاله كلهم ثقات قال ابن وهب اخبرني رجال من اهل العلم عن ابن شهاب ويحيى بن سعيد وربيعه والليث مثله ام من المدونة الكبرى لما لك رص ۸۹ ج ۱ فهو لاء اكابر التابعين كرهوا الجماعة الثانية

فی مسجد واحد ولم یقیدها بالاذان وقال الشافعی وانا قد حفظنا ان قد فاتت
رجالاً معه صلی الله علیہ وسلم الصلوة فصلوا بعلمه منفردین وقد كانوا
قادریں علی ان یجمعوا وان قد فاتت الصلوة فی الجماعة قوماً فجاء المسجد
فصلی کل واحد منهم منفرداً وقد كانوا قادیں علی ان یجمعوا فی المسجد ام
من الام (ص ۱۳۷ ج ۱) قلت فلو كانت الجماعة الثانية غیر مکروهة بدون
الاذان لما ترکها السجدة وهم سباقون الی الغایات راغبون الی افضل
الطاعات قال الشافعی رحمه الله واما کراهت رאי تکرار الجماعة فی
المسجد (ص ۱۳۷ ج ۱) ذلك لهم لانهم ليس بما فعل السلف قبلنا بل قد عا
بعضهم ام من الام (ص ۱۳۷ ج ۱) قلت وكما لم یفعله السلف بالاذان
ثانیاً فی المسجد کذا لم یفعله فیہ بدون الاذان ایضاً ومن ادعی غیر
ذلك فلیأت بیدیان قال الشافعی رحمه الله واحب کراهیة من کراهیة
ذلك منهم انما کان لتفرق الكلمة وان یرغب رجل عن الصلوة خلف
امام جماعة فینخلف هو ومن اراد عن المسجد فی وقت الصلوة فاذا
قضیت دخلوا فجمعوا فیکون فی هذا اختلاف ونفرین كلمة وفیهما
المکروه وانما کراهة هذا فی کل مسجد له امام ومؤذن فاما مسجد بنی
علی ظہر الطريق او ناحية لا یؤذن فیہ مؤذن راتب ولا یكون له امام
معارف ویصلی فیہ المائتة ویستظلون فلا اکراهة فی ذلك لانه ليس فیہ معنی
الذی وصفت من تفرق الكلمة ثم قال واما کراهیة هو ان یجمعوا فی
مسجد مرتین ولا یاس بان یغیر الی موضع فیمجمعوا فیہ ام من الام
(ص ۱۳۷ و ۱۳۸ ج ۱) قلت وهذا له موافق لما ذکره اصحابنا غیر انهم عللوا
الکراهیة بنقاع القوم من الجماعة الاولى ولا یخفی ان العلة التي ذکرها
الشافعی اشد واحذر وألثر وقوعاً واستمالاً لاسیما فی زمان الفساد والنقطاع
الوداد ومقتضاها کراهیة التکرار ولو یدرن اذان هذا هو الحق الرابع
عندی والمراد بالکراهیة کراهیة التحريم،

بسم الله الرحمن الرحيم

سے ہذا یوید مذکرہ صاحب البدرائع عن الحسن والامام الشافعی رحمہ اللہ مجتہداً فی الفقه والحديث فتعلیقہ جزئاً

خلاصہ ان عبارات کا یہ ہے کہ مسجد محلہ میں جس میں امام اور مؤذن مقرر ہے دوسری جماعت کرنا مکروہ تحریمی ہے، خواہ بدون اذان ثانی۔ لے ہو یا مع اذان و اقامت۔ دلائل کا مقتضی یہی ہے، اور ظہیر یہ اور بدائع وغیرہ سے بھی اطلاق کراہت ہی مستفاد ہوتا ہے، گو بعض فتاویٰ میں بدون اذان ثانی کے جماعت ثانیہ کو مباح لکھا ہے، مگر دلائل پر نظر کر کے یہ قید ضعیف معلوم ہوتی ہے، اور اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو اباحت سے مراد کراہت تحریمیہ کی نفی ہوگی، کراہت تنزیہیہ کی نفی مراد نہیں، کذا قالہ بعض اکابرنا منہم قطب دفتہ مولانا شیخ رشید احمد قدس سرہ، در سکر جن روایات میں اطلاق ہے ان کا مقتضی یہ کہ بدون اذان کے بھی کراہت ہے، اور جن میں تفسید ہے، یعنی جن میں بدون اذان کے اجماعاً مباح کہا ہے، اگر امام صاحب سے یہ روایت بھی صحیح ہو تو ان کا مقتضی اباحت بدون اذان ہے، اور جب کراہت و اباحت میں تعارض ہو تو کراہت کو ترجیح ہوگی، ۱۲ رمضان ۱۲۸۷ھ حکم نماز امام بلا عمامہ | سوال (۲۸) امام اگر بلا عمامہ کے نماز پڑھاوے اور مقتدی عمامہ باندھے ہوئے ہوں اُن کی نماز ہو جائے گی یا نہیں؟ یہ مسئلہ ایک کتاب میں لکھا ہے کہ اگر پیش امام بلا عمامہ کے نماز پڑھاوے تو جو مقتدی عمامہ باندھے ہوئے ہوں ان کی نماز نہ ہوگی،

الجواب؛ اگر امام بلا عمامہ کے نماز پڑھاوے اور مقتدی عمامہ باندھے ہوئے ہوں تو سب کی نماز درست ہے، کسی کی نماز فاسد نہ ہوگی، البتہ امام مالک کے نزدیک امام مسجد کو بغیر چادرہ اوڑھے امامت کرنا مکروہ ہے، لیکن اس کے ترک سے کسی کی نماز فاسدان کے نزدیک بھی نہیں ہوتی، قال مالک واکسرا للامام ان یصلی بغیر رداء الا ان یکون امام قوم فی سفر اور جلا ام قوم فی موضع اجتمعوا فیہ اوفی دارہ فاما... مسجد جماعة او مساجد القبائل... فاکسرا له ذلك و احب الی ان لو جعل عمامة علی عاتقه اذا کان مسافراً او صلی فی دارہ او رصہ... (جامدینہ) قلت والخروج من الخلاف مستحب عندنا ایضا واللہ اعلم ۳ محرم ۱۲۸۷ھ ولد الزنا کی امامت | سوال (۲۹) ولد الزنا کی امامت مکروہ تحریمی ہوگی یا نہیں؟ مکروہ تنزیہی ہے | الجواب، ولد الزنا کی امامت مکروہ تنزیہی ہے، فی اندر ص ۵۸۴ (ریکھ) تنزیہار امامة عید) الی ان قال (وولد الزنا) هذا ان وجد

غيرهم والا فلا كراهة بحريجتا وقال الشامي تحت قول الدرر ونحوه الا عني،
 لكن ما بحثه في البحر صرح به في الاختيار حيث قال ولو عدت اى علة
 الكراهة بان كان الاعرابي افضل من الحضري والعبد من الحر وولد الزنا
 من ولد المرشدة والاعلى من البصير فالحكم بالصد ام ونحوه في شرح
 الملتقى للبهنسي وشرح درر البحار ولعل وجهه ان تنفير الجماعة بتقد يمه
 يزول اذا كان افضل من غيره بل التنفير يكون في تقديم غيره ام (ص ۵۸۵)

۲۶ ذيقعدة سنة ۳۳۴

ستونوں کے درمیان صفیں | سوال (۳) ما تقولون ان مسجد آلہ اعمدہ ہل يجوز
 بنانا مکروہ ہے، ان يجعل الصفوف بينهما ام لا؟

الجواب؛ يكره الصف بين السواري ما لم يضطر اليه لورود النهي عن
 ذلك ولعل فقهه انتقاء رص الصفوف وهو ما مروي في قوله صلى الله عليه
 وسلم تراثوا اخرج ابن ماجه وابن خزيمة والحاكم عن معاوية بن قرة
 عن ابيه قال كنا تنهى ان نصف بين السواري على عهد رسول الله صلى الله
 عليه وسلم ونطرد عنها طردا رجاله رجال الصحيح الا هارون بن مسلم
 وهو حسن الحديث وثقة ابن حبان وروى الترمذي عن عبد الحميد
 بن محمود قال صليا خلف امير من الامراء فاضطربنا الناس فصلينا بين
 الساريتين فلما صليا قال انس بن مالك كنا نتقى هذا على عهد رسول الله صلى
 الله عليه وسلم قال الترمذي حديث حسن صحيح (ص ۳۱ ج ۳) قال
 العلامة العيني في شرح البخاري اذا كان منفردا بالأس في الصلوة
 بين الساريتين اذا لم يكن في جماعة وقيد بغير جماعة لان ذلك لا يقطع
 الصفوف وتسوية الصفوف مطلوبة في الجماعة ام (ص ۲۷۸ ج ۲) وفي
 فتح الباري قال المحب الطبري كراهة قوم الصف بين السواري للنهي الوارد
 عن ذلك ومحلها الكراهة عند عدم الضيق والحكمة فيه اما لا ينقطع
 الصف اولانه موضع النعال ام (ص ۲۷۸ ج ۱) قلت وقواعدنا لا تباہ لا
 سيما والعيني من اثمتنا وقد منعه ايضا والله اعلم

مقتدی نابالغ ہوں تو سوال (۲۱)، اگر امام کے پیچھے مقتدی نابالغ ہوں تو جماعت ہو سکتی جماعت ہو سکتی ہو یا نہیں؟ ہے یا نہیں؟

الجواب: نابالغ مقتدی اگر سمجھدار ہے تو جماعت صحیح ہے، فی العالمگیریۃ (ص ۵۲ ج ۱) اذ اذاد علی الواحد فی غیر الجمعة فهو جماعة وارجو ان معہ سبب قتل کذا فی المسألة۔ بلا عذر جماعت چھوڑنا گناہ سوال (۲۲) جس مسجد میں پانچ وقت باقاعدہ جماعت ہوتی ہو اور اصرار فسق ہے، اسی مسجد میں ایک شخص اکثر پہلے نماز پڑھ لیتا ہے، اور بعض اوقات اذان مسجد میں سن کر نماز پڑھ کر چلا جاتا ہے، اس کی نماز جائز ہے یا کہ نہیں؟

الجواب: جماعت سے نماز پڑھنا سنت مؤکدہ فریب واجب ہے، لہذا بلا عذر اس کا چھوڑنا گناہ ہے اور ترک جماعت کا عادی ہو یا فسق ہو یا ایسا شخص شرعاً فاسق ہو یا حق عبد الکریم، ۴ صفر ۱۴۲۲ھ محراب اور در میں امام کا سوال (۲۳) امام کھڑا ہونا مکروہ ہے مسجد کے در میں کھڑا ہوا اور مقتدی، فرض کے اوپر کھڑے ہو کر، ایک شخص نے منع کیا کہ محراب میں امام نے کھڑے ہونے سے نماز نہ ہوگی، ایک دوسرے شخص نے کہا کہ محراب نہیں بہر طور ہے، محراب اس کو کہتے ہیں جو مسجد کے اندر دیوار میں گہرا ہوتا ہے، اس میں اگر امام کھڑا ہو اور مقتدی سے غائب ہو اس میں نماز پڑھنے سے نماز نہ ہوگی، اب حضور جو تحریر فرمادیں وہ عمل کیا جائے،

الجواب: فی الدر المنثور و قیام الامام فی المحراب لا سجود فیہ، و قد ماہ خارجہ لان المعتبرۃ للقدم مطلقاً وان اردیشتبہ خال الامام ان علل بالتشبیہ الخ وقال الشافعی تحت (قولہ ان علل بالتشبیہ) قید للکراۃ وحاصلہ انہ صرح مسد فی الجامع الصغیر بالکراۃ ولم یفسل باختلاف المشائخ فی سببہا فقیل کونہ یصیر ممتازاً عنہم فی المكان لان المحراب فی معنی بیت الخرو ذلک صنیع اهل کتاب واقتصر علیہ فی المہدایۃ وانتارہ الامام السرخسی (ص ۶۷۵)

اس سے معلوم ہوا ان مختار وجہ کراہت کی تشبیہ و امتیاز ہے، اور اس میں اندرونی محراب اور دروازے برابر ہیں، لہذا مسجد کے در میں کھڑا ہونا بھی مکروہ ہے واللہ اعلم احقر عبد الکریم عفی عنہ، جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ

امام نے سہوً بلا وضو نماز پڑھا دی | سوال (۳۲) اگر کوئی..... پیش امام بھول کر بلا وضو تو اس کو کیا کرنا چاہئے؟ نماز پڑھا دیوے جب نماز کا وقت نکل جاوے تب یاد آوے کہ بلا وضو نماز پڑھا دی ہے، اس حالت میں کیا کرنا چاہئے، ایسا ہو گیا ہے جس کی وجہ سے یہ کارٹ لکھا گیا ہے، اور سب مقتدی جواب کے انتظار میں ہیں کہ نماز ہوئی یا نہیں؟

الجواب: امام پر لازم ہے کہ جن اشخاص نے متعلق معلوم ہو کہ وہ اس نماز میں شریک تھے، ان سب کو جس طرح ممکن ہو اطلاع کر دے، اور امام عادل ہو تو ان پر اس کی اطلاع سے اعادہ کرنا ضروری ہے، اور اگر امام عادل نہ ہو تو اعادہ مستحب ہی، کافی الحدیث الشامی (ص ۶۱۸ ج ۱) و اذا ظهر حدث امامہ بطلت فیلزم اعادہ تمام کما یلزم الا امام الاخبار بالقدرة المسکن، بلسانہ او بکتاب اور رسولی علی الاصح، لمعینین والا لایلزمہ، بحر، قال الشامی و اذا ظهر ای بشهادة الشهود او باخباره عن نفسه وکان عدلاً والامدب کافی النہر عن السلج،

عبد الکریم عفی عنہ ج ۲ ص ۲۸۵، الجواب صحیح، نظر احمد

امرد کی امامت مکروہ ہے | سوال (۳۵) بے ریش بالغ کے چھپے نماز درست ہے یا جب ایک ڈاڑھی والا آدمی ایک ہی لیاقت کا موجود ہے،

الجواب: فی الشامی (وکن اتکره خلف امرء) الظاہر انما تنزیہیۃ ایضاً والظاہر ایضاً کما قال الحمصی ان المراد به الصبیح الوجه لانه محل الفتنۃ الخ، اس سے معلوم ہوا کہ حسین امرد کی امامت مکروہ تنزیہی ہے، واللہ اعلم،

احقر عبد الکریم عفی عنہ ۵ محرم ۱۳۵۵ھ الجواب صحیح نظر احمد عفا عنہ ۶ محرم ۱۳۵۵ھ

ایضاً ایضاً | سوال (۳۶)..... ایک حافظ

جس کی عمر ۱۸ سال کی ہے، اور وجود ظاہری بھی بالغ نظر آتا ہے، لیکن ڈاڑھی ابھی تک نہیں آئی، اور تین چار سال تک رمضان شریف میں قرآن شریف نفلوں میں سناتا رہا، برجہ نابالغی کے جب بالغ ہوا تب محراب سنائی، اب اس کو ایک مسجد میں لوگ امام مقرر کرتے ہیں اور اردو دو چار جماعت تک پڑھا ہوا ہے اور پڑھتا ہے، اور دینیات مفتاح الجنۃ وغیرہ بھی پڑھتا ہے، اس کے چھپے نماز درست ہے یا نہیں؟

الجواب: اس امرد بالغ کے چھپے تراویح پڑھنا تو بلا کراہت جائز ہے، جبکہ اور

حافظ غیر مرنہ ملے، لیکن فرائض کی نماز میں بہتر یہ ہے کہ اس کو امام نہ بنایا جاوے، اگر وہ خوب صورت ہو، اور اگر خوب صورت اور محلِ فتنہ نہ ہو تو فرائض میں بھی اس کی امامت بلا کراہت درست ہے، قال فی الدار وکذا ذکر خلف امرد و سفیه الخ قال الشاسی الظاہر انها تنزیہ ابصار الظاہر ایضا کما قال الحسینی ان المراد به السبیم الوجه لانه محل الفتنة امرص، ۵۸ ج ۱، قلت انما قلت بجواز امامته فی التراجع لاختلاف الفقهاء فی جواز امامة الصبی فیہا فجوزها مشایخ بلخ والاسح عدم الجواز کما فی الشامیة عن الہدایة رص ۶۰۴ ج ۱، فلما اختلفوا فی الصبی الغیر البالغ فینبغی ان یتفقوا علی جواز امامة الامرد البالغ اذا لم یوجد حافظ غیرہ ولان فیہ البقاء اسفند القرآن وامل مشایخ بلخ جوزہ امامة الصبی فیہا نظراً الى زلزاله، ولكن الصبی لیس باهل لها والامرد البالغ اهلها وانما البرائة لعارض فتنه فی بالسند و، والله اعلم، ۲۰ شعبان ۱۲۵۵ھ

ڈاڑھی کے سفید بال اکھڑوانے | سوال (۲) زید پیش امام ہے اور اپنی ڈاڑھی کے سفید والے کو اقتدار حاکم، اکھڑواتا ہے، آیا اس کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں اور ڈاڑھی کے سفید بال اکھڑوانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر یہ شخص قبل از وقت بوڑھا ہو گیا ہو تو تب تو نتف شیب بائز ہے بشرطیکہ محض زینت ہی نہ ہو، بلکہ ارضا زوجه مقصود ہو یا اور کوئی ضرورت ہو، اور اگر بوڑھا قبل از وقت نہیں بلکہ رقت پر ہوا ہے... تو نتف شیب مکروہ ہے اور کراہت تنزیہیہ ہے، قال فی التندیة ونتف الشیب مدونة للتنزیہین لا لتزہیب العد وکذا نقلتہ الامام کذا فی جواب السوال خلاصی (صفحہ ۲۳) قلت واستفظ عن موضع لا یحضر فی الاذن لقتل لا بأس به فی ذلک والسمع بینہما ما ذکر، قد ولعل جمع حسن، والله اعلم، ۲۱ شعبان ۱۲۵۵ھ

جو شخص تراویح میر ختم قرآن پر | سوال (۳۸) آج کل ایک فصلی حافظ صاحب تراویح پڑھتا اجرت لیتا ہو اس کی افتاء حکم | ہیں، اور میں بھی اس جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا ہوں، یہ یقینی بات ہے کہ بعد ختم کلام مجید حافظ صاحب کی خدمت کی جاوے گی، اور مجھ کو بھی

شامل ہونا پڑے گا، ایسی حالت میں میرے لئے تراویح کا پڑھنا ایسے امام کے پیچھے جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب: اگر یہ حافظِ قرآن ختمِ قرآن کی اجرت پہلے سے طے کر لیتا ہے اور یہ شخص اس مسجد میں جہاں تراویح پڑھاتا ہے امام بھی نہیں تو یہ ذاسق ہے، اس کے پیچھے نماز پڑھنا نہ چاہیے، بلکہ امام ترکیف سے چند آدمیوں کے ساتھ جدا جماعت کر لی جاوے۔ اور اگر بھی ممکن نہ ہو تو نہ پڑھ لی جائے، اور اگر یہ شخص پہلے سے اجرت طے نہیں کرتا بلکہ قرآن تراویح میں سنا دیتا ہے، اور بعد تراویح کے لوگ حسبِ ہمت خدمت کر دیتے ہیں، اور یہ کمی بیشی پر کچھ اعتراض و مطالبہ نہیں کرتا، تو گو اس صورت میں بھی یہ رقم تو اس کو لینا جائز نہیں لکھو نہ معاوضۃ الختم لان المعروف کا مندرجہ، مگر یہ شخص تکبیر کبیرہ نہیں، اس کے پیچھے نماز جائز ہے، واللہ اعلم، ۱۰ رمضان شریف ۱۴۲۸ھ

صحیح اقتدار کے لئے علم باقتالات | سوال (۳۹) میرے سابق محار کی مسجد جناب نے دیکھی ہے امام شرط پر رویت نہیں، اس کی سطح مستوی ہے، اور جمعہ کے دن کثرتِ مسلمان

کی وجہ سے وہاں کچھ نمازی کھڑے ہو جاتے ہیں، مگر مسجد کی چھت میں کوئی روشنی نہ ہے، جیسا کہ دو منزلہ مساجد میں اکثر معمول ہے نہیں ہے بکر کی آواز بلکہ خود امام کی قرأت و تکبیر کی بھی آواز جاتی ہے، مگر امام کے حرکات و سکنات کا مشاہدہ نہیں ہو سکتا، ایسی صورت میں اوپر کھڑے ہونے والے نمازیوں کی نماز ہو جاوے گی یا نہیں، اور دوسرے مکانات کی چھتوں پر بھی لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں، جو محض تکبیر پر رکوع و سجدہ میں جاتے ہیں، اس میں اور اس میں کیا فرق ہے، اور چونکہ یہ واقعہ ہے اس لئے اس کے جواب کے قبل از جمعہ..... ضرورت، ہر تاکہ نماز صحیح نہ ہو تو روک دیا جائے، روایات کی چنداں ضرورت نہیں، محققانہ قول فیصل مفتی بہ درکار ہے،

الجواب: صحیح اقتدار کے لئے علم باقتالات امام شرط ہے، رویت ضروری نہیں پس سقف مسجد پر نماز پڑھنے والوں کی نماز درست ہے، گو امام کو دیکھتے نہ ہوں قال فی الدار وعلیہ باقتالاتہ الخ قال الشامی ای بسمع اور رویۃ للامام اول بعض المقتدین رحمۃ وان لم یتمتع المكان طام (ص ۵۵، ج ۱) ۱۸ رمضان ۱۴۲۸ھ

تحقیق تسویہ صفوں والی صاق القدم بالقدم | سوال (۴۰) جماعت میں صفوں کو سیدھا کرنیکی

تاکید ہے کہ کدھ سے کدھا ملا دیں، اور حضرات اہل حدیث فرماتے ہیں کہ سداً لخلل
سے مراد پیر سے پیر بھی ملا کر صف میں نمازی کھڑے ہوں، اور الصاق سے مراد حقیقتاً ملا ہے
تو کیا ان کا کہنا حق ہے، اور احناف غلطی پر ہیں کہ جو پیروں کو نہیں ملا۔ نہ،

۲، کیا سداً لخلل کدھ سے کدھ ملا۔ نہ سے ہوتا ہے کہ نہیں، اگر ہوتا ہے تو کیا پیروں کو
فراخ کر کے ملا۔ نہ سے سداً لخلل نہیں ہوگا، ان کو واضح کر کے جواب لکھیں، اس میں
ہمارے یہاں کے احناف بھی مبتلا ہوتے ہیں،

الربوای، عن انس مرفوعاً قال رصوا صفوفكم وقاروا بينكم واحاذوا بالاعضاء
رواه ابوداؤد والنسائي وصححه ابن حبان بلوغ المرام (ص ۱۳۷، ۱۳۸) قال في الجمع
البحار تراصوا في الصفوف اي تلاصقوا حتى لا يكون بينكم ذرج من رصا لبناء
اذا التصق بعضها ببعض ام (ص ۲۳۱، ۲۳۲) وفي الباب، عن النعمان بن بشير
يقول اقبل علينا رسول الله صلى الله عليه وسلم بوجهه فقال اقيموا صفوفكم
ثلثا والله لتقيمن صفوفكم او ليخالفن الله بين قلوبكم قال فقد رأيت
الرجل من ايلزق منكبه بمنكب صاحبه وركبته بركبته وكعبه بكعبه اخرجه
ابوداؤد وصححه ابن حزيمة رفتح الباری، (ص ۲۳۱، ۲۳۲) وعن انس مرفوعاً
قال اقيموا صفوفكم فاني اريكم من وراء ظهري وكان احدنا يلزق منكبه بمنكب
صاحبه وقد مره بقدمه رواه البخاری قال الحافظ في الفتح (ص ۲۳۱، ۲۳۲) و
اخرجه الاسماعيل في مستخرجہ الصحيح) من رواية معمر عن حميد بلفظ
قال انس فلقد رأيت احداً الى اخره وزاد معمر في رواية ولو فعلت ذلك باحد
اليوم لنفركانه بغل شمس ام وذكرت في اعلاء السنن اخذت طائفة في زينة
بظاهري هذا الحديث فتراهم يلزقون اقدامهم باقدام من يليهم في
الصف ولا يزالون يتكلمون ذلك الى اخر الصلوة ولا يخفى ان في الزايق
الاقدام بالاقدام مع الزايق المناكب بالمناكب والركب بالركب مشقة
عظيمة لا سيما مع ابقائهم اذن ذلك الى اخر الصلوة كما هو مشاهد والخرج
مد فوع بالنص على ان الزايق تلك الاعضاء باجمعيها حقيقة غير ممكن اذا
كان المصلون مختلفي القامة فالمراد منه جعل بعضها في محاذات بعض قال

الحافظ فی الفتح تحت قول البخاری باب الزاق القدم بالقدم فی الصف المراد
بذلك المبالغة فی تعدیل الصف وسدخله (ص مذكور) وفی عون المعبود
قوله صلى الله عليه وسلم حاذوا بالمنكب ای اجعلوا بعضها حذاء بعض بحيث
يكون منكب كل واحد موازياً لمنكب الآخر ومسا مثاله فتكون المنكبات لا غنى
والاقدام علی سمت واحد (ص ۱۷۲/۵) وقال الشيخ ولو حصل الالزاق
على الحقيقة فالمراد منه احداثه وقت الاقامة لتسوية الصف فان احداث
الالزاق فی تلك الاعضاء طريق تحصيل هذه التسوية ولا دلالة فی الحديث
على البقاء فی الصلوة بعد الشروع فيها ومن ادعى ذلك فليأت بحجة عليه ام
قلت وقول انس كان احداً ناو قوله ولقد رأيت احداً نايفيد ان الفعل المذكور
كان فی زمن النبي صلى الله عليه وسلم ولم يبق بعده كما صرح به فی
رواية معمر بقوله ولو فعلت ذلك باحدهم لتفر كانه بغل شمس فلو كان
ذلك سنة مقصودة من سنن الصلوة لم يتركها الصحابة والتابعون
ولم يتفر منها احد فالصحيح ما قلنا ان ذلك كان للمبالغة فی تسوية
الصف حين الاقامة لا بعد ها فی داخل الصلوة ام (ص ۲۹۹/۲)

ان عبارات مذکورہ سے واضح ہو گیا کہ سد الخلل سے مراد یہ ہے کہ نمازی خوب مل کر
کھڑے ہوں کہ درمیان میں فرجہ نہ رہی، اور یہ بات کندھا ملانے سے حاصل ہوتی ہے، قدم
قدم ملانے سے فرجہ پیدا ہو جائے گا، اور قدم سے قدم ملانا نماز شروع کرنے سے پہلے اسی
غرض سے ہے تاکہ صف سیدھی ہو جائے نماز کے اندر قدم سے قدم ملانا سنت نہیں ہے،
اس لئے احناف غلطی پر نہیں ہیں،

۲، پیروں کو فراخ کر کے ملانے سے سد الخلل نہ ہوگا، بلکہ کندھے سے کندھا ملانے
سے سد الخلل ہوگا، کیونکہ ان اللہ یحب الذین یصفون کما تصف الملائکۃ کا ہم بنیان مرسوم
سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نمازیوں کو بنیان مرسوم کی طرح مل کر کھڑا ہونا چاہئے، اور یہ تراویح
الزاق مناکب ہی سے ہوتا ہے، واللہ اعلم، ۲۱ رذی الحجہ ۱۲۵۵ھ

اس شخص کی اقتدار کا حکم جو خارج مسجد بدن اتصال صفوت سوال (۲۱) مقتدی اگر مسجد سے باہر ہو
امام کی آواز یا مسجد اندر موجود مقتدیوں کی حرکت دیکھ کر نماز ادا کر یعنی جس جگہ وہ کھڑے ہیں وہ مسجد کی حد سے

باہر ہے، اور وہاں تک صوفیں بھی متصل نہیں ہے، تو اس صورت میں اگر مقتدی امام کی آواز سننے ہوں، یا مسجد کے اندر جو مقتدی ہیں ان کی حرکات کو دیکھتے ہیں تو باہر دانے مقتدیوں کی نماز درست ہے یا نہیں؟

البراء، صورت مسئلہ میں ایسے مقتدیوں کی نماز درست ہو جاوے گی، قال فی الدبر بشر وطعشر نية المؤتم الاقتداء واتحاد مكانهما وصلواتهما و صحة صلاة امامه وعدم معاذات امرأة وعدم تقدم عليه بعقبه وعلمه بانتقالاته وبجاليه من اقامة وسفر ومشاركة في الاركان وكونه مثله او دونه فيها،

قال الشافعي تحت قوله بشر وطعشر: هذه الشرط في الحقيقة شرط الاقتداء وقوله را اتحاد مكانهما، فلو اقتدى راجل براكب او بالعكس او راکب براكب دابة اخرى لم يصح لاختلاف المكان فلو كانا على دابة واحدة صح لاتحادهما في الامداد وسيأتي واما اذا كان بينهما حائل فسيأتي ان المعتمد اعتبار الاشتباه لا اتحاد المكان فيخرج بقوله وعلمه بانتقالاته وسياتي تحقيق هذه المسئلة بما لا مزيد عليه قال الشافعي تحت ر قوله وعلمه بانتقالاته، اى بسماع اور رواية الامام او بعض المقتدين رحمته وان لم يتحد المكان، اس جواب کی بنا، اس پر ہے کہ صحت اقتداء کے لئے اتحاد مکان امام و مقتدی شرط نہیں، اور یہ بنا صحیح نہیں کیونکہ شرط اتحاد مکان امام ابو حنیفہ کا مذہب مشہور ہے، تمام متون میں یہ شرط مذکور ہے، اور طحاوی نے جو دان لم يتحد المكان فرمایا ہے اس کا منشاء بعض فروع سے مغالطہ میں پڑنا ہے، جیسا کہ خود در مختار اور شامی میں صفحہ ۶۱۲ پر ان فروع کی تفصیل آتی ہے، ان فروع کو اور متون کے اشتراط مکان کو دیکھ کر قول فیصل یہ ہے کہ اتحاد مکان کا مشروط ہونا تو یقینی ہے، اور جس نے اس شرط کی نفی کی یہ اس کی غلطی ہے، کیونکہ جو شرط متون میں بالاتفاق مذکور ہے، اور امام کے مذہب میں اس شرط کا ہونا مشہور ہے اس سے قطع نظر نہیں کی جاسکتی، لیکن اتحاد مکان کا مدارعوت پر ہے، اگر عرفاً مکان مقتدی مکان امام سے متحد ہو تو اقتداء صحیح ہے اور عرفاً متحد نہ ہو تو اقتداء صحیح نہیں، اس لئے بعض فروع میں بعض مشائخ نے اقتداء

کو صحیح کہا، کیونکہ اُن کے نزدیک اتحاد عرفی موجود تھا، اور بعض نے صحیح نہیں کہا، اُن کے نزدیک اتحاد مکان عرفاً تھا، باقی اشراط اتحاد مکان پر سب متفق ہیں، لہذا منبغی ان یفہم المقام والعلم عند اللہ الملک اعلام، ۲۶ صفر ۱۲۶۱ھ

جو شخص قطرہ آنے کا مرید ہو [سوال (۴۳)] ایک شخص بڑا ذی علم اور خاندان انصاری کے اسکی اقتدار جائز ہے یا نہیں؟

ہے، اور شریعت کا بڑا پابند ہے، اور عابد بھی ہے، یعنی نماز تہجد و اشراق و پناشت وغیرہ کا بڑا پابند ہے، ہر وقت ہی یادِ الہی کرتا رہتا ہے، روزانہ قرآن شریف کی منزل سے بھی زیادہ تلاوت کرتا ہے، اب کچھ عرصہ سے قطرہ کی تکلیف ہو گئی ہے، یعنی پیشاب کے کچھ دیر بعد قطرہ آجاتا ہے، اور بعض دفعہ بالکل نہیں آتا، مگر اس شخص کے دل پر عشاء و تہجد کے وقت پر، کیونکہ ان دونوں وقتوں میں وضو سے پیشتر پیشاب کرنا پڑتا ہے، اسی کا خیال آتا ہے، اور پھر وہ دیکھ بھی لیتا ہے کہ اگر دوبارہ قطرہ آگیا ہو تو دوبارہ وضو کر لے، اگر کپڑے کو لگ گیا تو کپڑا پاک کر لے، ایسے شخص کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں اگر اس کے پیچھے نماز نہ پڑھے وہ کیسا ہے؟ بینوا تو حبروا؟

الجواب؛ اگر یہ شخص پورا محتاط ہے کہ وقت شروع نماز سے اتنی دیر پہلے پیشاب کرنے کا اہتمام رکھتا ہے جس میں آمد قطرہ سے اطمینان کلی ہو جائے تو اس کے پیچھے نماز پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں اور اتفاقاً کبھی قطرہ آجائے دیکھ لیتا ہے اور نماز کا اعادہ کر لیتا ہے اور مقتدیوں کو بھی اعادہ کا امر کرتا ہے اس سے اس کے پیچھے نماز پڑھنے میں رکاوٹ نہ ہونا چاہئے، اور اگر یہ پورا محتاط نہیں یا باوجود احتیاط کے بھی قطرہ کا مرید ہو، جس کی علامت یہ ہے کہ وہ روزانہ یا مہینہ میں اکثر اوقات اعادہ صلوٰۃ کرتا ہو تو اس کے پیچھے نماز نہ پڑھی جائے، بلکہ کوئی تندرست آدمی امام بنایا جائے، لان عدم الاهتمام بالاستبراء حرام و مرتکبہ فاسق لوجب الاستبراء بحیث یطمئن قلبہ قبل الشروع فی الصلوٰۃ صرح بہ فی مراتی الفلاح فی فصل الاستبراء وان کان مبتلی بظہور القطرة مع الاهتمام بالاستبراء ایضاً وکان ذلک منہ کثیراً فهو مرید، کامل معذور والصبح اولیٰ منہ، واللہ اعلم، ۱۱ رجب ۱۲۶۱ھ

لواطت سے تائب کی اقتدار کا حکم [سوال (۴۳)] ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا کہ جس سے فعل قوم لوط علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سرزد ہوا ہو مگر اس فعل شنیع سے توبہ کر لی ہو، اور

آئندہ اسی عہد پر قائم رہنے کا عزم رکھتا ہو کیسا ہے، اور اگر مقتدی ایسے شخص کو امام بنا دیں تو ان پر کچھ وبال ہو گا یا نہیں؟ اور اس فعل بد کا کفارہ کیا ہو سکتا ہے، بیوا بالتفصیل توجروا من اللہ الجلیل،

الجواب؛ التائب من الذنب کمن لا ذنب له، اس فعل کا کفارہ توبہ صادقہ ہی ہے جو شخص توبہ کر لے اور قرأت سے اس کی توبہ صحیح معلوم ہو کہ اب اس فعل سے اور اس کے مقدمات سے کلی حبتناہ کرتا ہو تو اس کے پیچھے نماز بلا کراہت جائز ہے، لیکن اگر یہ شخص بدنام ہو چکا ہو اور اس کے پیچھے نماز پڑھنے سے لوگ کنارہ کریں تو کسی ایسے شخص کو امام بنانا چاہئے جو بدنام نہ ہو، بفضیلة الاورع من غیرہ وکون تھلیل الجماعة مکروہا، واللہ اعلم، شعبان ۱۳۲۷ھ جس لڑکے کی عمر پندرہ سال ہو سوال (۴۴) ایک لڑکا جس کا عمر پندرہ برس کی ہے کیا اس کی اقتدار میں تراویح بلا کراہت لڑکا تراویح میں امام بن سکتا ہے، اور تراویح میں امام بنانے کی صورت میں کیا فرض نماز کی امامت کر سکتا ہے، اور فتاویٰ عالمگیریہ مطبوعہ نو لکھنؤ جلد سوم صفحہ ۹۰۶ میں یہ عبارت ہے، امام بنانا مناسب نہیں،

بلوغ الغلام بالاحتلام او الانزال والجارية بالاحتلام او الحيض او الحمل كذا في الدر المختار والسنن الذي يحكم ببلوغ الغلام الجارية اذا انتهيا اليه خمس عشرة سنة عند ابی يوسف ومحمد وهو رواية عن ابی حنيفة وعليه الفتوى وعن ابی حنيفة ثمان عشرة سنة للغلام وسبع عشرة سنة للجارية كذا في الكافي، کیا اس عبارت پر قیاس کر کے تراویح وغیرہ میں اس لڑکے کی امامت کا حکم دے سکتے ہیں؟

الجواب؛ جس لڑکے کی عمر پندرہ سال کی پوری ہو وہ قول مفتی بہ میں بالغ ہے اس کے پیچھے تراویح کی نماز بلا کراہت درست ہے، البتہ فرض میں امام نہ بنایا جاوے، لکراہة المكتوبة خلف الامرد الذي يشتهي ولم يعتبر بهذا الكراهة في التراويح لتوسيع الفقهاء في امر النافلة حتى ان بعضهم جوز صلوة البالغ خلف الصبي الذي لم يبلغ في التراويح وان كان ذلك ضعيفا ولكنه مشع بتوسيعهم في امر النافلة فافهم، ۲۷ شعبان ۱۳۲۷ھ

ستونوں کے درمیان صف بندی بلا عذر مکروہ ہے | سوال (۴۵)

..... مسجد کے دروازوں یا بیچ مسجد میں ستونوں کے درمیان مقتدی صف باندھ کر
اقتدار کر رہے مثلاً اس کے دروازوں میں سے ہر ایک دروازہ میں تین چار مقتدی سما سکتے
ہیں، پھر بیچ میں ستون آجائے تو آریہ ستون کا درمیان آجانا مانع اقتدار ہو یا مستلزم
کراہت کا ہے، اور یہ کراہت کا لزوم عام ہے یا خاص، باوجود گنجائش و عدم تنگی کے وقت
پر منحصر ہے؟ بینوا توجروا،

الجواب؛ قال العینی فی شرح البخاری اذا کان منفرداً لا یاس بالصلوٰۃ
بین الساریتین اذا لم یکن فی جماعۃ وقید بغیر جماعۃ لان ذلك یقطع الصفوف
وتسویۃ الصفوف فی الجماعۃ مطلوبۃ ام ر ص ۸، ۲ ج ۲، وفی الدر فی کراہۃ
قیام الامام فی المحراب وعلى مکان مرتفع مانسہ وهذا کله عند عدم العذر
کجمعة وعید فلو قاموا علی الرفوف والامام علی الارض او فی المحراب لضر
المکان لم یکره ام ر ص ۶، ۱ ج ۱، و ذکر الحافظ فی الفتح عن المعجب الطبری
کره قوم الصف بین السواری للنهی الوارد عن ذلك ومحل الکراہۃ عند عدم
الضیق ام ر ص ۴، ۲ ج ۲، قلت وکلام علمائنا یوافقه فی هذا التفتیش والشدائم
ستونوں کے درمیان صف باندھ کرنا بلا عذر مکروہ ہے، مگر مانع اقتدار نہیں ہے، اور یہ
کراہت عام ہے اس صورت کو بھی جبکہ صف ستونوں کے درمیان اس طرح باندھی جا
کہ فرجہ باقی نہ رہے، کیونکہ اس صورت میں بھی ستون قاطع صف ہے، البتہ اگر جمعہ وعید کے
موقع پر تنگی ہو تو ایسی حالت میں صف بین السواری بلا کراہت جائز ہے، واللہ اعلم، سوال ام
جماعت کے سنت مؤکدہ قریب من سوال (۱۲۶)..... یہ جو فقہاء نے لکھا ہے کہ جماعت

الواجب ہونے کا مطلب یہ کہ جماعت
کن لوگوں پر واجب ہے، اسکی مختلف
صوتوں کے متعلق استفتاء،

ہو جائے گا یا نہیں، ایسا ہی کوئی باہر جانے والا ہے اپنی مسجد محلہ میں قبل جماعت فقط تین چار
آدمیوں سے جماعت کر کے باہر چلا جائے تو بھی جماعت ساقط ہو جائے گی یا نہ؟
(۲) سوائے مسجد محلہ کے کوئی سفر میں ہو، یا اگر شرعی مسافر نہ ہو لیکن اپنے وطن کے
سوا اور کہیں ہو تو بھی اس پر حضور مسجد کی جماعت کا لازم ہے یا نہیں، دو سکر یہ ہے کہ جو

وعید تارک جماعت پر وارد ہوا ہے وہ مطلقاً جماعت کے تارک ہے یا مسجد محلہ کی جماعت کے تارک ہے؟ اکثر کتب میں اس کی تفصیل و تفریق نہیں لکھی ہے، اس لئے بعض اس کے قائل ہونے لگے ہیں کہ جماعت مؤکد عام ہے، اس کی تحقیق و تفصیل سے آگاہی بخشنے کا؟

الجواب: حنفیہ کے نزدیک صلوات مکتوبہ کی جماعت مسجد محلہ میں سنت مؤکدہ بلکہ واجب ہے، گھر میں جماعت کرنے سے جماعت کا ثواب مل جاوے گا، لیکن ترک سنت مؤکدہ اور ترک واجب کا گناہ ہوگا، قال فی التوسیر والجماعة سنة مؤكدة للرجل واقلها اثنان وقيل واجبة وعليه العامة ام قال في الدر عن البحر وهو اى الوجوب الراجح عند اهل المذاهب اھ (ص ۵۷۶ ج ۱) اس سے تو جماعت کا وجوب معلوم ہوا، رہی اس کی دلیل کہ مسجد میں جماعت کرنا واجب ہے، سو حنفیہ سب اس پر متفق ہیں کہ اجابت اذان واجب ہے، ہاں اس میں اختلاف ہے کہ اجابت باللسان واجب ہے یا بالقدم، بشر بن لالی نے نور الایضاح و مراقی الفلاح میں دونوں کو واجب کہا ہے (ص ۱۷۸) اور قاضی خاں و حلوانی وغیرہ نے صرف اجابت بالقدم کو واجب کہل ہے، اور اجابت باللسان کو مستحب کہا ہے، قال فی البصر قال قاضی خان اسباب المؤذن فضيلة وان تركها لا ياثم واما قوله عليه السلام من لم يجب الاذان فلا صلوة له فمعناه الاجابة بالقدم لا باللسان فقط اھ وقال الحلواني الاجابة بالقدم لا باللسان حتى لو اجاب باللسان ولم يمش الى المسجد لا يكون مجيباً ولو كان في المسجد حين سمع الاذان ليس عليه الاسباب اھ (ص ۲۵۹ ج ۱) اور ظاہر ہے کہ اجابت بالقدم سے مراد یہی ہے کہ مسجد جا کر جماعت سے نماز پڑھے و فی رد المستار فیما اذا افتتحت الجماعة في مسجد حية و ذكر القد وری یجمع باھلہ و یصلی بہم بعدہ و ینال ثواب الجماعة کذا فی الفتح و ذکر الشر بن لالی بان هذا ینافی وجوب الجماعة و اجاب بان الوجوب عند عدم الخروج و فی تتبعها فی الماکن القاصية حرج مع ما فی مجاوزة مسجد حية من مخالفة قوله صلى الله عليه وسلم لا صلوة لجار المسجد الا فی المسجد اھ (ص ۵۸۰ ج ۱)

اس سے صاف معلوم ہوا کہ گھر میں جماعت کرنا اس وقت جائز ہے جبکہ مسجد محلہ میں جماعت نہ مل سکی ہو، اور اگر مسجد محلہ میں جماعت ابھی نہیں ہوئی تو گھر میں جماعت

کرنا جائز نہیں، بحر میں ہے وسئل الحلواني عن يجمع باهله احيانا هل ينال ثواب الجماعة اولاً قال لا ويكون بدعة ومكروها اھ (ص ۳۲۶ ج ۱) اس میں میں صاف تصریح ہے کہ گھر میں جماعت کرنا بدعت و مکروہ ہے، یعنی جب کہ مسجد محلہ میں جماعت ملنے کی امید ہو، اور اگر وہاں جماعت ہو چکی تو پھر گھر میں جماعت کرنے سے جماعت کا ثواب مل جائے گا، لیکن ترک جماعت فی المسجد کا گناہ بھی ہوگا، اگر اس نے قصد اکسل وغیرہ کی وجہ سے دیر کی ہو، اور اگر عذر شرعی کی وجہ سے دیر ہو گئی تو گناہ نہ ہوگا، پس صاحب قنیۃ نے جو مطلقاً لکھا ہے اختلف العلماء فی اقامتها فی البیت والا صح انہا کاقامتها فی المسجد الا فی الفضیلة وهو ظاہر مذهب الشافعی کذا فی حاشیۃ البحر یہ صحیح نہیں، کیونکہ اصحاب مذہب کی تصریحات اس کے خلاف ہیں، اور صاحب قنیۃ کی نقل ضعیف ہے، اور یہ قول احادیث صحیحہ کے بھی خلاف ہے عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قال من سرہ ان یلقی اللہ غد امسلسا فلیحافظ علی ثلث الصلوات الخمس حیث ینادی بہن فان اللہ شرع لنبیہ صلی اللہ علیہ وسلم سنن الہدی فان من سنن الہدی وان لا احسب متکراً احد الالہ مسجد فی بیتہ یصلی فیہ فلو صلیتم فی بیوتکم وترکتہ مساجدکم لتركتم سنة نبیہ ولو ترکتم سنة نبیکم لسنلتم الحدیث اخرجہ النسائی ولفظہ وسلم وابوداؤد ولفظ مسند قال ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عملنا سنن الہدی وان من سنن الہدی الصلوۃ فی المسجد الذی یؤذن فیہ اھ، اس میں صاف مسجد میں حاضر ہو کر نماز ادا کرنے کو سنت مؤکدہ اور گھر میں نماز پڑھنے کو ضلالت کہا ہے،

وعن ابن عباس مرفوعاً من سمع الذی اءولم یجب فلا صلوۃ لہ الا من عذر حصہ الحاکم وابن حبان، وعن علی مرفوعاً لا صلوۃ لجار المسجد الا فی المسجد رواہ ابن حبان وسندہ حسن التفصیل فی اعلیٰ سنن اور جو شخص سفر شرعی سے کم مسافت کا مسافر ہے وہ حکم مقیم ہے، اس پر بھی جماعت مسجد کا اہتمام واجب ہے لا استثناء الفقہاء المسافر دون المقیم، البتہ اگر اس حالت میں جماعت سے کوئی دوسرا عذر مانع ہو تو تخلف عن الجماعۃ کی گنجائش ہے، والا عذر مذکور فی الفقہ بالبسط والشدۃ علم

بدعتی اور غیر مقلد کی اقتداء کا حکم | سوال (۲۷) ۱۔ ہم لوگ تھوڑی آدمی اہل سنت والجماعت اور انہیں کون اور کس کی اقتداء بہتر ہے؟ حنفی المذہب ہیں، ہم لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ہمارے امام عظم رحمہ اللہ نے کوئی اچھی بات نہیں چھوڑی، جو کچھ ان سے ثابت ہو اس پر عمل کرنا چاہئے اپنی طرف سے کوئی نیا کام ایجاد نہ کرنا چاہئے، اپنے امام کا پورا مقلد حقیقی طور پر ہونا چاہئے۔ ۲۔ دوسری جماعت جو اپنے کو حنفی اور مفتلہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی کہتے ہیں تقلید کو ضروری سمجھتے ہیں، مگر بہت کام جس کا امام صاحب سے ثبوت نہیں کرتے ہیں مثلاً مولود، وقت، ذکر پیدائش قیام، فاتحہ مرد و جہ، گیارہویں، رجبی شریف، عرس، اور زیارت مزار بزرگان کے واسطے پھول واری شریف، اجیر شریف، بہار شریف وغیرہ بھی جاتے ہیں، اذان میں اشہدان محمد رسول اللہ پر جب مؤذن پہنچتا ہے تو یہ انگلیٹھوں کے ناخن کو چومتے اور آنکھوں سے لگاتے ہیں، ان میں سے کوئی کام جائز ہو تو اس سے بھی مطلع فرمائیے گا، ۳۔ تیسری جماعت ہے جو تقلید شخصی کو ناجائز کہتے ہیں، ان کا دعویٰ ہے کہ قرآن و حدیث کے مطابق عمل چاہئے، البتہ قرآن و حدیث میں جو مسئلہ نہ ملے تو اماموں کا قول قابل عمل ہے، آمین آواز سے کہتے ہیں، رفع یدین کرتے ہیں، رکوع سے اٹھ کر اللہم ربنا لک الحمد پورا پڑھتے ہیں سجدہ سے اٹھ کر اللہم اغفر لی پورا پڑھتے ہیں، مولود، نیاز، گیارہویں، رجبی شریف عرس وغیرہ نہیں کرتے ہیں۔

اب قابل غور بات یہ ہے کہ دو مسجدیں یہاں ہیں، ایک مسجد میں جماعت نمبر ۲ حنفی انداز کے امام ہیں، جماعت بھی ان کی کثیر ہے، ہم لوگ جماعت ۱ ان کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں تو ہم لوگوں کے لڑکوں پر بڑا اثر..... پڑتا ہے، یعنی یہ لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم بھی حنفی یہ بھی حنفی، تو اتنی بڑی جماعت جو کام کرتی ہے وہ ضرور جائز ہی ہوگا، ورنہ ان کے علماء تو منع کرتے، علماء تو خود مولود، نیاز، عرس وغیرہ میں شریک ہوتے ہیں، اور اس کی تعریف کرتے ہیں، اور دوسری مسجد میں امام غیر مفتلہ ہیں، ان کی جماعت کثیر اس مسجد میں نماز پڑھتی ہے، یہاں ہم لوگ اگر نماز پڑھیں تو مقتدی بننا پڑتا ہے، ان کے ساتھ نماز پڑھنے میں ہم لوگوں کے لڑکوں پر بڑا اثر پڑنے کا خوف نہیں، کیونکہ یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ یہ لوگ غیر مقلد ہیں، ان کا مذہب ہی دوسرا ہے، مگر آمین، رفع یدین یہ لوگ کرتے ہیں، ایسی حالت میں ہم لوگوں کا جماعت ۱ کے ساتھ نماز پڑھنا بہتر ہے یا جماعت ۲ غیر مقلدوں کے

ساتھ نماز پڑھنا اچھا ہے،

جوابات: (۱) حنفی مقلدوں کو یہ اعتقاد رکھنا چاہئے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کتاب اللہ اور حدیث کو بہت اچھی طرح سمجھتے تھے، اس لئے جو کچھ انھوں نے مسائل شرعیہ بیان فرماتے ہیں وہ قرآن و حدیث کے خلاف ہرگز نہیں، اور خطا سے بجز انبیاء علیہ السلام کے کوئی معصوم نہیں، ممکن ہے کہ امام صاحب سے کسی جگہ خطا بھی ہوئی ہو، مگر یہ احتمال جیسا امام صاحب کے متعلق ہر تمام ائمہ اور محدثین کے متعلق بھی ہے، پس جو شخص کسی مسئلہ میں امام صاحب کو خطا پر تبتلا کر اگر وہ مجتہد ہو تو ممکن ہے کہ خود اسی کا قول خطا ہو، اور اگر مجتہد نہیں تو اس کو امام صاحب جیسے مجتہد اعظم کی شان میں ایسی بات کہنا چھوڑنا منہ بڑی بات ہے، جو سخت بے ادبی ہے، پس حنفی یوں سمجھیں کہ ہم قرآن و حدیث ہی کا اتباع کرتے ہیں، اس تفسیر کے موافق جو امام ابو حنیفہ نے بیان فرمائی ہیں، اور جو لوگ مجتہد نہ ہوں ان پر واجب ہے کہ قرآن و حدیث کے سمجھنے میں کسی مجتہد کا اتباع کریں، محض اپنی سمجھ سے مطلب نہ گھڑیں، کیونکہ ہر علم میں ماہرین کا اتباع لازم ہے، اور قرآن و حدیث کے ماہر مجتہدین ہی ہیں،

(۲) یہ لوگ بدعتی ہیں، ان سے احتراز کرنا چاہئے، یہ امام ابو حنیفہ کے پورے مقلد نہیں بلکہ بہت باتیں ان کے خلاف کرتے ہیں، چنانچہ جتنی باتوں کا اس نمبر میں ذکر ہے امام ابو حنیفہ نے ان کو جائز نہیں فرمایا، بلکہ ان کے مذہب کی رو سے یہ سب بدعات ہیں،

(۳) یہ لوگ غیر مقلد ہیں، اور اسلام میں جس قدر فتنے پیدا ہوتے ہیں ترک تقلید ہی سے پیدا ہوتے ہیں، پس حنفی مقلدوں کو نمبر ۲ و ۳ دونوں جماعتوں سے الگ رہنا چاہئے، اور کسی کے ساتھ بھی نماز نہ پڑھیں، بلکہ اپنی جماعت الگ کریں اور بدرجہ مجبوری جماعت نمبر ۲ کے ساتھ نماز پڑھ لیا کریں، کیونکہ وہ لوگ نماز وضو پاکی ناپاکی کے مسائل میں امام ابو حنیفہ کے مذہب پر عمل کرتے ہیں تو حنفیوں کی نماز اپنے مذہب کے موافق صحیح ہو جائے گی، اور جماعت ۲ وضو اور غسل اور پاکی ناپاکی کے مسائل میں امام ابو حنیفہ کے مذہب کی بہت امور میں مخالف ہیں، ان کے پیچھے حنفیوں کی نماز درست نہیں ہوگی، کیونکہ متنی ان کے یہاں پاک ہے، غسل جنابت میں مکلی کرنا، ناک میں پانی دینا ان کے یہاں ضروری نہیں، خون، پیپ، سقے وغیرہ سے ان کا وضو نہیں ٹوٹتا، کنویں میں چوہا وغیرہ مرنے سے کنواں ان کے نزدیک ناپاک نہیں ہوتا، ایسی حالت میں ان کے وضو اور پاکی کا کیا اعتبار، رہا اولاد کا بگڑنا سو اس کا اندیشہ غیر مقلدوں کے ساتھ

میل جول میں زیادہ ہی کیونکہ وہ خود نمازی کے اندر بہت باتیں ہمارے خلاف کرتے ہیں جس سے بچوں کو وحشت ہوگی کہ یہ نئی باتیں کیسی ہیں، پھر ممکن ہو کہ وہ بھی غیر مقلد ہو جائیں اور یہ سخت فتنہ ہے جس کے بعد ایمان کی خیر بہت کم ہے، واللہ اعلم، ۸۸ سوال مسئلہ ۴۷

اگلی صف پر ہونے کے بعد سوال (۴۸) اگر

اکسیلا آدمی کیا کرے؟ کوئی شخص جماعت کھڑی ہونے کے بعد آئے اور تنہا ہو تو صف میں سے کسی نمازی کو اپنے تختہ شامل کرنے کے واسطے پیچھے کو کھینچے تو نیت اول باندھے (یعنی تکبیر تحریمہ اول کہی) یا بدون نیت (و تکبیر تحریمہ) باندھے کھینچ لے، اور اس کو اپنے برابر کھڑا کر کے نیت باندھے، اگر بدون نیت باندھے کھینچے گا تو تعلیم خارج تو نہ ہوگی؟

الجواب: آجکل کسی کو نہ کھینچے، نہ بعد تکبیر تحریمہ نہ قبل تکبیر تحریمہ، بلکہ مسبوق صف کے پیچھے تنہا کھڑا ہو جائے، اور تفرّد خلف الصف میں جو کراہت ہو وہ جب ہو کہ صف میں فرج ہو، اور جب صف بھر گئی ہو پھر تفرّد میں کراہت نہیں، آجکل فتویٰ اسی پر ہے، اور اگر کوئی مسئلہ جذب ہی پر عمل کرنا چاہے تو جذب عالم بعد التکبیر اولیٰ ہے، اور قبل التکبیر بھی جائز ہے، فساد کسی صورت میں نہیں، اور جذب جاہل میں فساد کا خوف ہو قال فی رد المحتار عن الفقہائے عن الجلابی ان المقتدی یتأخر عن الیمین الی خلف اذا جاء اخراہ و فی الفتح ولو اقتدی واحد باخر فجاء ثالث یجذب المقتدی بعد التکبیر ولو جذب بہ قبل التکبیر لا یضر اہ قلت و مسئلۃ المتفرّد خلف الصف مثلہ واللہ تعالیٰ اعلم، ۹۱ ریح المسئلہ

حکم نزاع در امامت سوال (۴۹) جناب اکو ماجرائے ذیل میں

ثالث ہم لوگوں نے مانا ہے، جیسا سرمان ہو، عمل میں لا دیں گے، ایک محلہ کے قدیمی داعی امام قاری صاحب نے دوسرے ضلع میں بضرورت جانا چاہا، مصلیٰ لوگوں نے جواب دیا کہ منشی لطف الرحمن غیر ملکی کو جیسا کہ آگے اور ایک سال چند روز جمعہ (یعنی اٹکین) دیکر گئے تھے اب بھی دیکے جلیئے، امام قدیم نے موافق اجازت مصلیٰ نے خطیب سے جا کر کہہ کر دوسرے ضلع کو چلے گئے، نئے خطیب نے بعد دو جمعہ آکر مصلیوں سے کہا کہ میں کئی جمعہ کے لئے قبول نہیں کرتا اگر برابر برابر امامتی دو گے پڑھاؤں گا، مصلیوں نے مجبوراً کہا کہ آپ نے امام ٹھیک ہیں اور قدیمی امام کو آئندہ نہیں رکھیں گے، اور قسم بھی اس پر کھائی، اب قدیمی امام آکر دعویٰ دے رہے ہیں، اور فساد یہاں تک بڑھا کہ اب اب سب مصلیٰ اور قدیم و جدید دونوں امام جناب سے دست بستہ

عرض گزار ہیں کہ اس درمیانی قول و قرار و قسم کرنے سے نئے امام کا حق امامت کرنا ہے یا قدیم امام کا، موافق حکم و اجازت مصلیٰ جو کہ نئے امام کو کہہ کر اور امامت کا حکم دے کر دوسرے ضلع گیا تھا، ابھی اسی کا دعویٰ اور حق امامت بحال رہیگا، کس کا خطیبی بحال رہے گا، الحاصل مصلیٰ لوگ اور دونوں امام قدیم محلہ و امام و خطیب غیر محلہ سب مل کر دستخط کر کے جناب سے مسئلہ طلب کرتے ہیں، اور ثالث مانتے ہیں کہ کون دائمی خطیب موافق شرع محمدی کے ہے، موافق اس کے عمل کریں گے،

الجواب: صورت مسئلہ میں چونکہ امام قدیم رخصت لے کر گیا تھا مستعفی ہو کر نہیں گیا تھا، اور اہل محلہ یعنی مصلیوں نے امام جدید کو مقرر کرتے ہوئے امام قدیم کو اطلاع نہیں دی کہ تم کو معزول کر دیا گیا، اس لئے امام قدیم منصب امامت پر بدستور باقی ہے، فان الاجارة لا یصح فسحا الا بحضرة المتعاقدين حقيقة او حکما ولم یوجد، اور اس کا دعویٰ حق بجانب ہے، کیونکہ نہ اُس نے استعفیٰ دیا، نہ اس کو عزل کی اطلاع دی گئی، اور امام جدید کا دعویٰ بھی حق بجانب ہے، کیونکہ جس وقت اس نے امامت سے انکار کیا تو اہل محلہ نے اس کو ہمیشہ کے واسطے امام بنالیا، اور اس سے عہد بھی کر لیا تھا، پس امام قدیم اور امام جدید دونوں امامت کے عہدے پر قائم ہیں، اور ان ایام کی تنخواہ دونوں کو دینی پڑے گی، اور اب اہل محلہ کو اختیار ہے کہ اگر دونوں کو امام نہ رکھ سکیں تو ان میں سے ایک کو جواب دید کر الگ کر دیں، خواہ قدیم کو خواہ جدید کو، اور وسعت ہو تو دونوں کو امام بنالیں، یہ تو صورت مسئلہ کا جواب تھا، اب بطور نصیحت کے لکھا جاتا ہے کہ اہل محلہ نے اس معاملہ میں سخت کوتاہی کی کہ جس وقت امام جدید کو مستقل امام دائمی بنایا تھا اس وقت امام قدیم کو اطلاع کیوں نہیں دی، کہ تم کو آج سے معزول کر دیا گیا، اور امام جدید نے یہ سخت بے مروتی کی کہ امام قدیم کے منصب کی طمع کی، اور اس کی جگہ پر قبضہ جمانا چاہا، اور امام قدیم نے یہ غلطی کی کہ جب اس کی جگہ اہل محلہ نے دوسرے کو رکھ لیا تھا تو اس میں آکر جھگڑا اور منازعت کی، یہ امور علم و اسلام کی شان سے بہت بعید تھے، واللہ اعلم ۲۳ ربیع الثانی ۱۲۸۷ھ

سوال (۵۰) جماعت کی نماز میں صف اول سے صف اول میں امام کے پیچھے پھر داہنی اور پھر بائیں جانب کھڑے ہونے کی فضیلت بہتر جگہ اس شخص کی ہے جو امام کے پیچھے ہوتا ہے اور اس کے بعد جو داہنی طرف اور بعد ازاں وہ شخص جو بائیں طرف ہے، اس ترتیب مرا تے

بارے میں جو فقہاء کی عبارت ہو وہ بجنسہ تحریر فرمانے کا ارشاد فرماویں، یہ ترتیب غالباً بحر الرائق میں مذکور ہے، کتاب یہاں میسر نہیں آئی،

الجواب، قال الشامی روی فی الاخبار ان اللہ تعالیٰ اذا انزل الرحمۃ علی الجماعۃ یزلہا اولاً علی الامام ثم تتجاوز عنہ الی من یحذاثہ فی الصف الاول ثم الی المیا من ثم الی المیا سر ثم الی الصف الثانی انتامہ فی البحراہ ص ۵۹۳ ج ۱ قلت والحديث اخرجہ فی کنز العمال نحوه قریباً منہ والظاهر من جلالة السیوطی انه لا یسکت عن الموضوع فلا بأس فی الفصائل، واللہ تعالیٰ اعلم، ۲، رمضان سنہ ۱۳۵۴ھ

ظلم وفسق کا مرتکب لائق امامت نہیں ہے | سوال (۵۱)

..... ایک نابینا حافظ راجپوت مسلمان قاضی صاحب کی بہن کو قرآن شریف پڑھانے جایا کرتے تھے، حافظ صاحب کو لوگوں نے منع کیا، حافظ جی پڑھانے سے منع نہ ہوئے، حافظ جی صاحب نے قاضی کی بہن کا نکاح اس کے تایا زاد بھائی سے کر دیا، ایک دن گھر میں خوشدامن کے ساتھ لڑائی ہوئی، طعنہ و تشنیع ہونے لگی، غرض قاضی کی بہن کو نکال دیا، اور پھر طلاق نامہ لکھ کر اس کو دیدیا، پھر عدت طلاق ختم کے بعد حافظ صاحب نے اپنی شاگردن سے نکاح پڑھوایا، قاضی صاحب کی بہن کی اولاد حافظ صاحب کے تخم سے ہوئی، حافظ صاحب کا انتقال ہو گیا، اب حافظ صاحب کے لڑکے مدرسہ اسلامیہ قرآنہ میں پڑھنے کے واسطے گئے تو قاضی صاحب نے اپنے بھانجوں کو نکلوا دیا، اور یہ کہا یہاں پڑھنے مت آنا، جو پڑھنے آئے تو مار دیں گے، ایسے امام کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟

الجواب؛ اس قاضی امام کا ان بچوں کو یعنی بھانجوں کو مدرسہ نکالنا ظلم ہے، جو محض عصبیت اور جاہلیت پر مبنی ہے، اور ظلم و فسق ہے، لہذا جب تک یہ امام اپنے بھانجوں سے اس ظلم کو رفع نہ کرے اور ان کے ساتھ شفقت کا برتاؤ نہ کرے، امامت سے الگ کر دیا جائے، فقط واللہ اعلم،

صحت اقتدار کیلئے علم بحال و انتقالات امام | سوال (۵۲) دو منزلہ مسجد میں اگر اوپر کے درجہ شرطی، سماع صوت ضروری نہیں، پر امام مع معتقدین ہو اور نیچے بھی معتقدین ہوں یا بالعکس ہو تو علی الاطلاق سب کی نماز درست ہے، یا اس کے متعلق کچھ شرائط ہیں؟

مثلاً امام کی آواز سب کو پہنچنا ضروری ہے یا نہیں، اگر امام کی آواز نہ پہنچے تو مکیتر کی تکبیر کافی ہے یا نہیں؟

الجواب، علم بحال الامام و بانتقالہ شرط ہے، خواہ سماع صوت امام سے ہو یا سماع صوت مکیتر سے، اور ایک شرط یہ ہے کہ امام سے تقدم نہ ہو، اگر کوئی مقدم ہو گیا اس کی نماز درست نہ ہوگی،

مسجد محلہ میں جماعت ثانیہ مکروہ ہے | سوال (۵۳) جماعت ثانیہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب، محلہ کی مسجد میں جماعت ثانیہ مکروہ ہے، احقر عبدالکریم عفی عنہ
الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ ۱۰ صفر ۱۳۵۷ھ

پیش امام تیمم سے جماعت | سوال (۵۴) پیش امام تیمم سے جماعت کرا سکتا ہے یا نہیں؟
کرا سکتا ہے یا نہیں؟ | الجواب، اگر امام نے کسی عذر سے تیمم کیا ہے تو شیخین کے

نزدیک اس کی امامت صحیح ہے، اور امام محمد کے نزدیک صحیح نہیں، اس لئے بہتر ہے کہ کسی اور شخص متوضی کو امام بنایا جاوے، البتہ اگر اور کوئی شخص امامت کے قابل موجود نہ ہو تو خود ہی پڑھاوے، اور نماز جنازہ میں بالاتفاق امامت متیمم جائز ہے فی الدر المختار (صح اقتداء متوضی) لا ماء معه (بستیمم) وقال الشامي ای عندهما وقال محمد لا یصح فی غیر صلوة الجنائز (ص ۶۱۵ ج ۱) احقر عبدالکریم عفی عنہ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ ۲۹ ربیع الثانی ۱۳۵۷ھ

مواضع وقف کے علاوہ وقف کرنیوالے | سوال (۵۵) اگر قاری نے حالت نماز میں اضطراباً کی نماز اور اس کی اقتداء حکم ایسے موقع پر وقف کر کے اعادہ لفظ موقوف کا کیا جائے

اوقات معتبرہ میں سے کوئی وقف نہیں ہے، تو اس کی نماز کا کیا حکم ہے، زید کہتا ہے کہ فقہاء نے تکرار کو مکروہ لکھا ہے، اور اس نے لفظ موقوف کا تکرار کیا، لہذا نماز مکروہ ہوئی، نیز ایسے شخص کی امامت جائز نہیں، ثبوت میں فتاویٰ عالمگیری باب الامامة کی یہ عبارت پیش کرتا ہے، ومن یقف فی غیر مواضعه ولا یقف فی مواضعه لا ینبغی لہ ان یؤم
اب گزارش یہ ہے کہ تکرار کا اطلاق اعادہ لفظ موقوف پر بھی ہوتا ہے یا نہیں، اگر ہو تو ابتداء مابعد سے کرنی ہوگی، اور یہ صورت قراء کی تصریح کے بالکل خلاف ہے، کیونکہ وہ لوگ وقف قلیح پر اعادہ لازم کہتے ہیں، آیا یہ لزوم غیر نماز میں ہے یا نماز میں بھی، جواب بتفصیل ارشاد فرماؤں، بینوا توجروا

الجواب:؛ غالب اضطرار میں وقت اور تکرار کا مضائقہ نہیں اور ایک آدھ لفظ کے تکرار کو فقہاء نے مکروہ نہیں کہا، اور عالمگیری کی عبارت میں وہ شخص مراد ہے جو بلا ضرورت بکثرت ایسا کرتا ہو، واللہ اعلم، احقر عبد الکریم عفی عنہ، الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ ۱۲ رجب ۱۴۲۸ھ جب صفت میں جگہ نہ ہو تو بعد میں آئی والا سوال (۵۱).....

تہنا کھڑا ہو یا کیا کرے ؟ جماعت میں پوری صفت ہونے کے بعد اگر کوئی شخص آدھے اور داہنی باتیں صفت میں جگہ باقی نہ ہو تو بائیں جانب سے کسی مقتدی کو کھینچے یا داہنی جانب سے یا بچ سے اندیشہ فساد کی جگہ تو تہنا پیچھے کھڑا ہونا چاہئے، مگر جہاں اہل علم ہوں وہاں کس طرف سے کھینچے،

الجواب:؛ جب صفت میں جگہ نہ ہو تو تہنا صفت میں کھڑا ہونا مکروہ تو ہے نہیں جیسا عالمگیری میں محیط سے بروایت محمد بن شجاع و حسن بن زیاد عن ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہے، اور صفت سے کسی کو کھینچنے میں اندیشہ ہی اور کھینچنا ضروری ہے نہیں فقط اولیٰ ہے، اس واسطے فقہاء نے اب اس سے مطلقاً منع کر دیا ہے، اور تہنا کھڑا ہونے کو اولیٰ قرار دیا، فی السحار علی مراقی الفلاح الاصح انه ينتظر الى الركوع فان جاء رجل والاحد الىه رجلاً ودخل في الصف والقيام وحده اولیٰ فی زماننا الغلبة الجہل فلعله اذا جرح تفسد صلواته، اور اس میں یہ تفصیل کہ اگر عالم بالاحکام ہو تو اس کو کھینچ لے ورنہ نہیں قبل کہ ساتھ نفل کی ہے، اور ایسے موقع پر اندیشہ فساد کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ عین اس وقت اس شخص سے فساد صلوٰۃ متوہم ہو جس کو کھینچنا چاہتا ہے، بلکہ اس مسئلہ کو شائع کرنے سے اور اس پر عمل کرنے سے اندیشہ ہے کہ عوام اپنی نمازیں توڑ لیں گے، غلبہ جہل سے اس طرف اشارہ ہے کہ گو قلیل مقدار میں عالم ہیں، مگر کثرت کے اعتبار کر کے سب جگہ یکساں عمل کریں گے واللہ اعلم، باقی رہی یہ بات کہ اگر کوئی بناءً بر جواز کسی عالم بالاحکام کو کھینچنا چاہے تو کس جگہ سے کھینچے تو اس کا جسزنیہ تو ملا نہیں، لیکن قواعد سے معلوم ہوتا ہے کہ رکوع تک انتظار کرے کہ شاید کوئی نمازی آجاوے، اور اگر نہ آوے تو درمیان سے کھینچے، کیونکہ اس میں ایک ہی خرابی ہے، کہ صفت مقدم میں جگہ خالی رہے گی، اور کنارہ سے کھینچنے میں اس کے علاوہ یہ بھی

۵۴ اس کے ساتھ ہی ایک قید مراقی الفلاح میں یہ بھی ہے لایتا ذی بہ ۱۲ منہ

خرابی ہے کہ صفت آخر درمیان سے شروع نہ ہوگی، اور جب ہر کہ دونوں جگہ عالم بالاحکام موجود ہوں، ورنہ جہاں ہو وہیں سے گنجائش معلوم ہوتی ہے، اور اسلم یہی ہر کہ تنہا کھڑا ہو جائے، اور قواعد سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کہنے کے بعد اگر کوئی شخص آجاوے تو جدید آئیوآلے کو چاہئے کہ صفت مقدم میں جو جگہ خالی ہو اس کو پُر کرے، واللہ اعلم، احقر عبدالکریم
الجواب صحیح ظفر احمد عفاعنہ، ۱۸ رمضان ۱۴۲۸ھ

مسجد کی چھت پر بلا ضرورت سوال (۵۷) جماعت کرنا مکروہ ہے، بوجہ گرمی امام دالان مسجد اور صحن مسجد کو چھوڑ کر مسجد کی چھت پر جا کر جماعت کرے تو اس کا یہ طرز عمل از روئے شرع شریف صحیح ہوگا یا خلاف اور نماز ایسی صورت میں ہو جاوے گی، یا دوبارہ پڑھنی پڑے گی، اس کا جواب باصواب بالتشریح مع حوالہ جات تحریر فرمائیں، بینواتو حبروا؟

الجواب؛ نماز صحیح تو ہو جاوے گی، دوبارہ پڑھنے کی کوئی وجہ نہیں، مگر بلا ضرورت مسجد کی چھت پر جانا اور نماز پڑھنا مکروہ ہے، اس واسطے اس سے پرہیز کرنا چاہئے، کما قال العلامة الشامی رحمہ اللہ تعالیٰ تحت قول التنبیہ (والوطؤ فوقہ) ثم رأیت القمستانی نقل عن المفید کراہۃ الصعود علی المسجد ام ویلزمہ کراہۃ الصلوٰۃ ایضاً فوقہ فلیتأمل، اور گرمی کی شدت بھی ضرورت اور عذر میں داخل ہے یا نہیں اس کی تصریح نہیں ملی، مگر بظاہر عذر نہیں معلوم ہوتا، اس لئے احقر کے نزدیک چھت پر جماعت کرنا مکروہ ہو و الا حوط، واللہ اعلم و علمہ و حکمہ، کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ، ۲۱ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ

سوال (۵۸) ایک شخص امام مسجد مفت رہا اب اس امام کو کوئی ایسے شخص کی اقتداء حکم مرض لاحق ہو ہے، جس کی وجہ سے جلوس عورتوں کی طرح پیر ایک طرہ نکال کر کرتا ہے، نیز بیٹھک اوٹھک میں ہاتھ سے ٹیک لگاتا ہے، ایسے شخص کو امام مفت رہ کر رکھنا کیسا ہے، اور ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے، اگر کراہت ہو تو کیسی؟
الجواب؛ اس کی امامت درست ہے، کچھ کراہت نہیں، تورک و اعتماد غیر معذور کے لئے مکروہ ہے، معذور کے لئے مکروہ نہیں، فقد فعلہ النبی صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم
حین بدن لکبرہ، ۲۰ محرم ۱۴۲۹ھ

معہ چونکہ یہ جزئیہ کہیں مصرح نہیں اس لئے دوسری جگہ بھی تحقیق کر لیا جائے ۱۲ منہ

فصل فی المسبوق باللاحق

مسبوق کی نماز کا حکم جبکہ وہ سجدہ سہو میں امام کی سوال (۱) میں نے ایک مرتبہ جناب سے متابعت کرے اور امام پر سجدہ سہو واجب نہ ہو

سجدہ سہو کے متعلق دریافت کیا تھا، اگر بلا ضرورت سجدہ سہو کر لیا جاوے تو کیا نماز کا اعادہ واجب ہوتا ہے؟ چنانچہ جناب نے حسب ذیل فتویٰ صادر فرمایا:-

(نقل فتویٰ) اگر مصلیٰ سجدہ سہو کی ضرورت سمجھ کر سجدہ سہو کرے اور بعد میں معلوم ہو کہ سجدہ سہو کی ضرورت نہ تھی تو اس صورت میں نماز کا اعادہ واجب نہیں، الامداد کی عبارت میں دیکھوں تو اس کو حل کر سکتا ہوں، قال فی حاشیۃ نور الایضاح ولوقایح المسبوق امامہ فی سجود السہو فتبین انہ لا سہو علیہ فصلوۃ المسبوق جائزۃ عند المتأخرین وعلیہ الفتویٰ ام (ص ۱۹) قلت وهذا فرع لصحة صلوة الامام فان صلوة المسبوق تقسب بفساد صلوة امامہ كما لا يخفى، الامداد کی عبارت حسب ذیل غور فرمائیے، الامداد بابت ماہ رجب ۱۳۳۳ھ ص ۱۹

(سوال) اگر آخرین میں کسی نے ضم سورۃ سہو کیا اور اس نے سجدہ سہو اس کو موجب سہو سمجھ کر لیا تو نماز ہو جائے گی یا نہیں، آیا سجدہ بے ضرورت کو زیادت فی الرکن و ترار دیگر اعادۃ صلوة لازم قرار دیں گے یا نہیں؟

(جواب) فی الدر المختار واجبات الصلوة ولفظ السلام مرتین فالثانی واجب وفيه قبيل باب الاستخلاص ولو ظن الامام السهو فسد له فتا (رای المسبوق) فبان ان لا سهو فالاشبه الفساد لا قتل ائمة فی موضع الانفراد وفي رد المحتار وفي الفیض وقيل لا تقسب وبه یفتی وفي البحر عن الظهيرية قال الفقيه ابو الليث فی زماننا لا تقسب لان الجهل فی القراء غالب اھم، وفي الخلاصة اذا ظن الامام ان علیہ سهو فسد للسهو وتابعه المسبوق فی ذلك ثم علم ان الامام لم یکن علیہ سهو فیه روايتان اختلف المشايخ لاختلاف الروایتین واشهرهما ان صلوة المسبوق نفسه وقال الامام ابو حفص الكبير لا یفسد والصدور الشہید اخذ به فی واقعہ

ص ۱۶۳ ج ۱۶۲

ان روایات سے امور ذیل مستفاد ہوتے، نمبر ۱، نماز ہو جائے گی، نمبر ۲، اگر دونوں طرف سلام پھیرا ہے تو اعادہ واجب نہیں اور ایک طرف سلام پھیرا ہے تو چونکہ ایک واجب یعنی سلام ثانی ترک کر دیا اعادہ واجب ہوگا، نمبر ۳، اگر یہ شخص امام ہے تو اس کے ساتھ اگر کوئی مسبوق ہو اور اس نے بھی سجدہ سہوا اور اس کے بعد قعدہ میں اس کا اقتداء کیا، اس مسبوق کی نماز درمختار کے قول پر اور وہی مقتضی قواعد کا بھی ہے فاسد ہو گئی لیکن اگر اس مسبوق کو اس فضول سہو کا پتہ ہی نہ لگا، تو یہ معذور ہے، اور میرے نزدیک صاحب فیض اور ابواللیث کے حکم عدم فساد کا محل اسی کو قرار دیا جاوے تو بہتر ہے کہ جب مسبوق کو پتہ نہ لگے، پس دونوں قولوں میں تطبیق ہو جاوے گی،

الجواب: مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ، جناب کا والا نامہ موصول ہوا تھا، میں سفر میں تھا، اس لئے دیر ہوئی، پھر حضرت مولانا سے دریافت کا موقع نہ ملا، کہ آج آپ کا دوسرا خط موصول ہوا تو میں نے اس کی بابت حضرت مولانا سے عرض کیا، حضرت کے ارشاد کے بعد جو رائے میری قائم ہوئی وہ یہ ہے کہ الامداد میں قواعد کے موافق جواب دیا گیا ہے، اور احقر نے متاخرین کے قول مفتی بہ کے موافق جواب دیا ہے، رہا سلام کا مسئلہ تو الامداد میں ایک سلام کے بعد نماز کو ختم مانا ہے، اور دوسرا سلام گویا فوت ہوا اور میرا یہ خیال ہے کہ ایک سلام کے بعد جب سجدہ سہو کیا گیا پھر دونوں طرف سلام پھیرا گیا تو اس سلام سے سلام ثانی کی قضا ہو گئی، گویا کہ سلام ثانی فوت نہیں ہوا، بلکہ مؤخر ہوا، رہا یہ کہ اس تاخیر سے سجدہ سہو دوبارہ لازم ہونا چاہئے، اس کا جواب ظاہر ہے کہ ایک بار سجدہ سہو تمام سہوات کے لئے کافی ہے، یہ حال اس صورت میں اعادہ صلوٰۃ واجب نہیں، ہذا معلّمہ واللہ اعلم، دو سرے علماء سے بھی تحقیق کر لیں اور جو محقق ہو اس سے مجھے بھی اطلاع دیں فقط

۱۳ رمضان المبارک ۱۳۸۷ھ

مسبوق نے غلطی سے سلام پھیر دیا | سوال (۲) امام نے سلام پھیرا اور مسبوق نادانی یا سہو اور پھر کسی کے کہنے پر کھڑا ہو گیا | سے سلام پھیر دیا یا چپ بیٹھا رہا تب امام یاد دوسرے مقتدی کے (جواب خارج نماز میں ہی) بتلانے سے وہ خیال کیا کہ نماز باقی رہی باقی پڑھی یہ درست ہو یا نہ؟

الجواب: اس حالت میں سلام پھیرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی، اور مقتدی

خارج سلوۃ یا امام فارغ عن الصلوٰۃ کے بتلانے سے اگر مسبوق کو یاد آ گیا اور اپنی یاد پر کھڑا ہوا تو نماز فاسد نہیں ہوئی بشرطیکہ کوئی عمل منافی صلوٰۃ نہ کیا ہو، پس اگر امام کے سلام کے بعد فوراً بتلانے سے کھڑا ہوا تب تو سجدہ سہو بھی نہیں، اور تین سحان اللہ کی مقدار دیر ہوئی تو سجدہ سہو لازم ہے، ۲، جمادی الثانیہ ۱۲۸۴ھ

مسبوق اگر امام کے ساتھ سوال (۳) اگر مسبوق۔ نہ امام کے ساتھ سجدہ سہو میں یہ سمجھ کر سلام پھیرے تو کیا حکم ہے؟ سلام پھیرا کہ مجھ کو بھی دیگر مقتدیوں کی طرح سلام پھیرنا چاہی تو اس کا کیا حکم ہے، اور سہو اسلام پھیرا تو کیا حکم ہے؟

الجواب؛ قال فی الدرر ولسلم المسبوق، ساھیا ان بعد امامہ لزمہ السہو والا لا قال الشامی قوله ولسلم ساھیا قید بہ لانه لوسلم مع الامام علی ظن ان علیہ السلام معہ فہو سلام عمد ففسد کما فی البحر عن الظہیریۃ ۱۴۶۶ھ ص ۱۲۶ و فی الخلاصۃ المسبوق اذا سلم مع الامام علی ظن ان علیہ ان یسلم مع الامام فہو سلام عمد ایمنع البناء ۱۴۶۹ھ ص ۱، صورت اولیٰ میں جب کہ مسبوق نے سلام سہو میں امام کی متابعت عمداً کی ہے مسبوق کی نماز فاسد ہو گئی، اور صورت ثانیہ میں جبکہ سہو اسلام پھیر دیا تو حکم یہ ہے کہ اگر یہ سلام امام کے ساتھ پھیرا تب تو مسبوق پر کچھ نہیں، لکن مقتدیانی ہذہ الحالۃ و سہو مقتدی لایوجب شیئاً، اور اگر امام کے بعد سلام پھیرا تو مسبوق کے ذمہ سجدہ سہو لازم آئے گا، لکن منفردانی ہذہ الحالۃ و سہو المنفرد لوجب سجود السہو، میں کہتا ہوں کہ مقتضی قیاس کا یہ ہے کہ اس صورت میں بھی مسبوق پر سجدہ سہو لازم نہ آوے، کیونکہ اگر اس نے امام کے بعد بھی سلام پھیرا ہے جب بھی وہ شرکت سجود سہو کی وجہ سے حالت اقتداء کی طرف لوٹ آیا تو یہ سہو بھی سہو منفرد نہیں بلکہ سہو مقتدی ہے وھو لایوجب شیئاً قال الطحطاوی فی حاشیۃ مراقی الفلاح اما سلامہ بعد سلام الامام من سجود السہو فلا یلزم بہ سہو لانه لما سجد للسہو معہ عاد الی الاقتداء ولا سہو علی مقتدی قائل فیہ کلام (۲۶۹)، ۲ شعبان ۱۲۸۱ھ امام کے ساتھ ایک رکعت پانچواں مسبوق پر سوال (۴) در مختار کی اس عبارت فمدرک رکعتہ ایک رکعت ادا کر نیکی بعد قعدہ لازم ہے یا نہیں؟ من غیر فجر یاتی برکتین بفاصلۃ سورۃ و تہنئۃ بینہما سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ثلاثی اور رباعی نماز کی ایک رکعت پانے والے مسبوق ایک رکعت تسلیم

امام کے بعد پڑھ کر وجہاً تعدہ کرے اور تشهد پڑھے، اور اگر نہ کیا تو سجدہ سہو کرنا چاہئے، ورنہ کراہت تحریمی ہوگی اور تشهد بینہما کے تحت میں علامہ شامی نے جو یہ تحریر فرمایا ہے کہ قال فی شرح المنیۃ ولولم یقعد جازاً استحساناً لا قیاساً ولم یلزمہ سجود السہو لکون الركعة اولی من وجہ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعدہ اور تشهد مذکورہ واجب و ضروری نہیں، ورنہ سجدہ سہو یا اعادہ واجب ہوتا، اگر ترک کی صورت میں نماز مکروہ تحریمی اور واجب الاعادہ ہوتی ہے یا سجدہ سہو لازم ہوتا ہے، تو حضور تکلیف فرما کر اثبات مدعی کے لئے کوئی عبارت علاوہ ان عبارات کے تحریر فرما دیں تاکہ اطمینان ہو ورنہ متن و شرح کی عبارت کی توجیہ فرما دیں کہ بظاہر مختلف معلوم ہوتی ہیں،

الجواب؛ قال فی الدر فی احکام المسبوق ویقضى اول صلوة فی حق قراءة و آخرها فی حق تشهد ام فی رد المحتار هذا قول محمد کما فی مبسوط السرخسی وعلیه اقتصر فی الخلاصة وشرح الطحاوی والاسبیجانی والفتح والدر والبحر وغيرهم وذكر الخلاف كذلك فی السلاج لكن فی صلاة الجلابی ان هذا قولهما وتما مہ فی شرح الشيخ اسمعیل و فی الفیض عن المستصفی لو ادركه فی ركعة الرباعی یقضى ركعتین بفاتحة وسورة ثم یتشهد ثم یاتی بالثانیة بفاتحة خاصة عند ابی حنیفة ر و قال ركعة بفاتحة وسورة وتشهد ثم ركعتین اولاهما بفاتحة وسورة وثانیتهما بفاتحة خاصة وظاهر كلاهما اعتماد قول محمد ام ص ۲۲۳ و ۲۲۴ ج ۱، و فی کتاب الآثار لمحمد قال اخبرنا ابو حنیفة ر عن حماد عن ابراهیم ان مسروقاً وجندباً دخلوا فی صلاة الامام فی المغرب فادركا معه ركعة وسبقهما برکعتین فصلیامعه ركعة ثم قاما یقضیان فاما مسروق فجلس فی الركعة الاولى التي قضی واما جندب فقام فی الاولى وجلس فی الثانية فلما انصرفا قبل کل واحد علی صاحبه ثم انهما تساوتا الی عبد الله بن مسعود فقضا علیه القصة فقال كلا كما قد احسن وان اصلي كما صلي مسروق احب الی قال محمد و یقول ابن مسعود ناخذ یجلس فی الركعتین جميعاً اللتین فاتاه وهو قول ابی حنیفة ر ام ص ۲۷،

ان عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ درمختار میں جو قول نقل کیا ہے وہ افضل ہے، اور اگر ثلاثی درباعی نماز کی ایک رکعت پانے والا مسبوق تسلیم امام کے بعد ایک رکعت پڑھ کر قعدہ نہ کرے بلکہ دو رکعت کے بعد قعدہ کرے تو یہ بھی جائز ہے، اور سجدہ سہولاً لازم نہیں آئے گا واللہ اعلم، ۲۳ سوال ۱۳۴ھ

امام اگر چار رکعت کے بعد سہواً کھڑا ہو جائے | سوال (۵) چار رکعت والی نماز میں اگر امام قعدہ تو کیا مسبوق اس کی اقتدار کرے، | آخرہ کر کے سہواً کھڑا ہو جائے، اور دو رکعت اور منضم کر لے تو ان دو رکعت میں مسبوق اس امام کی اقتدار کر سکتا ہے یا نہیں؟ اور در صورت جوازیہ دو رکعت مسبوق کے حق میں کیا ہوگی؟

الجواب: قعدہ آخرہ کے بعد اگر امام سہواً کھڑا ہو جائے تو مسبوق کو اس زائد نماز میں اقتدار جائز نہیں، اگر اقتدار کرے گا تو مسبوق کی نماز فاسد ہو جائے گی، قال فی الدرر ولو قام امامہ لخامسة فتابعه ان بعد القعود تفسد والا لا اھ قال الشامی قوله تفسد ای صلوٰۃ المسبوق لانه اقتداء فی موضع الا افراد اھ (ص ۶۲۶ ج ۱)، واللہ اعلم، ۲۴ ردی الحجۃ ۱۳۴۲ھ

مسبوق کی نماز کا حکم جبکہ امام کے ساتھ | سوال (۶) فرض نماز میں اگر امام نے سجدہ سہو کیا، اور سجدہ سہو کرے، حالانکہ امام پر سجدہ واجب تھا | پھر معلوم ہوا کہ جس صورت میں سجدہ سہو کیا ہے، اس میں سجدہ سہو واجب نہیں تھا، یعنی کوئی واجب ترک نہیں ہوا تھا، تو اس صورت میں جو ایسے مقتدی ہیں جن کی کوئی رکعت جماعت سے جاتی رہی ہے، مثلاً ایک یا دو رکعت ہونے کے بعد شریک جماعت ہوئے ہیں، اور امام کے ساتھ انھوں نے بھی سجدہ سہو کیا ہے، تو ان کی نماز میں کچھ نقص تو نہ ہوگا؟

الجواب: اس میں دو روایتیں ہیں، ایک روایت میں مسبوق کی نماز فاسد ہے، اور دوسری میں فاسد نہیں، کمافی الخلاصۃ (ص ۱۶۳ ج ۱) اور عموم بلوٹی کی وجہ سے میں دوسری صورت میں فتویٰ دیتا ہوں، ۲ جمادی الثانیہ ۱۳۴۲ھ

نماز مغرب میں امام نے سہواً چوتھی رکعت ملا کر سلام پھیر دیا | سوال (۷) امام نے مغرب کی نماز اور دوبارہ نماز پڑھائی تو جو لوگ پہلی جماعت کی دوسری یا بعد قاعدہ کے موافق تین رکعت پوری کی رکعتوں میں شریک ہو کر دوسری جماعت میں شریک ہو سکے ہیں یا نہیں؟ کر کے چوتھی رکعت سہواً اور پڑھادی

بعد سلام کے مقتدیوں نے یاد دلایا کہ چار رکعت ہوئی ہیں، امام نے یہ سن کر دوبارہ پھر نماز پڑھا دی، سو یہ نماز یقیناً ادا ہو گئی ہوگی، اب اس میں دو بات اور قابل تحقیق ہیں، (۱) پہلی نماز میں جو لوگ دوسری یا تیسری یا چوتھی رکعت میں آکر شریک ہوئے تھے وہ بھی اس اعادہ میں شریک ہو سکتے ہیں یا نہیں (۲) جو لوگ اس اعادہ میں والی نماز میں از سر نو شریک ہوتے ہیں ان کی نماز بھی ہو جاوے گی یا نہیں؟

الجواب؛ اس کے متعلق جزئیہ تو نہیں ملا، لیکن قواعد سے اختلاف معلوم ہوتا ہے کیونکہ قاعدہ کلیہ ہے کہ امام کی نماز مقتدی کی نماز سے ادا ہونے کی صورت میں اقتدار صحیح نہیں، اور صورت مذکورہ فی السؤال میں اعادہ کیا جاوے تو اس میں یہ اختلاف ہے کہ دوسری نماز یا فرض واقع ہوگی یا نماز اول کے لئے جابر ہوتی ہے، اس لئے اعادہ مذکورہ کے وقت کسی نئے آدمی کی اقتدار میں اختلاف ہوگا، اور چونکہ مختار قول ثانی ہے، کما صرح فی الدر مع شرحہ ص ۴۷۶ ج ۱، اس لئے اقتدار نہ کرنا مختار ہوگا، اور جس شخص نے چوتھی رکعت میں اقتدار کی ہے چونکہ اس کی اقتدار صحیح نہیں ہوتی، رکما فی الشامی ص ۸۲ ج ۱، تتمہ، لواقندی بہ مفترض فی قیام الخامسة بعد القعود قدر التہدیم یصح ولوا عاد الی القعود اس لئے وہ اس شخص کے مانند ہو جو پہلی نماز میں بالکل شامل نہیں ہوا، اور دوسری تیسری رکعت میں شامل ہونے والوں نے اگر اپنی وہ رکعت جس میں یہ مسبوق ہیں ادا کر لی ہے تب تو جماعت ثانیہ میں شریک ہو جاویں، اور اگر دوسری جماعت کی تیاری سن کر انھوں نے نماز توڑ دی ہے تو وہ بھی نئے اشخاص کے حکم میں ہوں گے، کمالا یخفی، واللہ اعلم،

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا اللہ عنہ

کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ

سوال (۸) اگر مسبوق نمازی جماعت میں ایسے وقت آکے ملے کہ وہ امام بوقت سلام امام کے سلام پھیرنے سے پہلے صرف نیت ہی باندھنے پایا یا قعدہ میں ملنے کے لئے کچھ تھوڑی ہی جھکا تھا، مگر قعدہ نہ مل سکا، اور امام نے سلام پھیر دیا، تو یہ فرمائیے کہ وہ مسبوق نمازی جماعت میں شامل ہوا یا نہیں، اگر جماعت میں شامل ہوا نہیں تو نیت سے اپنی نماز فردا پوری کرے، یا پھر سے علیحدہ نماز کی نیت کرے؟

الجواب؛ قال فی الدر لو کبر قائما فرکع ولم یقف صح لان ما اتی بہ الی ان يبلغ الركوع یکفیه قذیہ ص ۶۳ ج ۱ و فی الشری بن لالیة والثانی من شرط

یعنی جب کوئی واجب ترک ہوا ہو، ۱۲

صحۃ التعریبۃ الاتیان بالتعریبۃ قائماً او منحنیاً قلیلاً قبل وجود اغنائہ
بساہوا قرب للركوع قال فی البرہان لو ادرك الامام راكعاً فحنى ظهره ثم كبر ان
كان الى القيام اقرب صح الشروع ولو اراد به تكبير الركوع وتلغويته لان
مدرك الامام في الركوع لا يحتاج الى تكبير مرتين خلافاً لبعضهم وان كان
الى الركوع اقرب لا يصح التعریبۃ اه ص ۱۲، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تکبیر
تحریمہ کے لئے بقدر اللہ اکبر قیام کافی ہے، زیادہ کی ضرورت اس وقت ہے جبکہ مصلے پر
تحریمہ کے بعد قیام بھی فرض ہو، صرف صحت تحریمہ کے لئے ادراک رکوع وغیرہ میں قیام
زائد علی قدر اللہ اکبر لازم نہیں، پس اگر سلام امام سے پہلے نیت صلوٰۃ کے بعد اللہ اکبر کہے
تو اقتداء صحیح ہوگئی، گو مجھکنے بھی نہ پایا ہو، بیٹھنے بھی نہ پایا ہو، اور اللہ اکبر کے بعد وقفہ
بھی نہ ہوا ہو، واللہ اعلم، ۲۲/ صفر ۱۲۶ھ

مسبوق امام کے قعدہ اخیرہ میں تشہد درود | سوال (۹) مسبوق قعدہ اخیرہ میں تشہد اور
دونوں پڑھے یا فقط تشہد پر اکتفاء کرے، درود شریف دونوں پڑھے یا فقط تشہد یا ساکت
رہے، اور دعاء ما توره پڑھے یا نہیں؟

الجواب؛ غالباً قعدہ اخیرہ سے مراد وہ قعدہ ہے جو امام کا قعدہ اخیرہ ہے، سو
اس میں مسبوق کو صرف تشہد پڑھنا چاہئے، خواہ تشہد کو آہستہ آہستہ کھڑا کر اس
طرح پڑھے کہ سلام امام تک ممتد ہو جائے یا تشہد کو مکرر پڑھتا رہے، اس پر درود و
دعاء کا اضافہ نہ کرے، ۱۲/ رجب ۱۲۶ھ

سوال (۱۰) مسبوق کا امام قعدہ اخیرہ میں تشہد
پڑھ کر سہو سے پانچویں رکعت کو کھڑا ہو گیا، مسبوق
بعد کھڑے ہو جانے کے امام کے اپنی بقیہ نماز امام
سے علیحدہ ہو کر پڑھنی شروع کر دے، اور امام نے
ابھی تک پانچویں رکعت کا سجدہ بھی نہ کیا تھا مگر
امام قعدہ اخیرہ کے بعد سہو پانچویں رکعت
کے لئے کھڑا ہو جائے اور مسبوق امام سے
علیحدہ اپنی نماز پوری کر دے تو سجدہ سہو میں
امام کیتھا شریک ہو یا نہیں، اور شریک
ہو جائے تو اس کی نماز ہو جائے گی یا فاسد ہوگی؟
امام پانچویں رکعت کا رکوع کر چکا تھا اور اس مسبوق نے اپنی بقیہ نماز کی امام سے علیحدہ ہو کر
مع رکوع سجدہ کے ایک رکعت پوری کر لی اور امام کو پانچویں رکعت کا رکوع کرنے کے بعد
پانچویں رکعت میں ہونا یا دایا اور امام سجدہ سہو کی طرف لوٹا تو یہ مسبوق ایک رکعت

علحدہ پڑھنے کے بعد سجدہ سہو میں امام کا شریک ہووے یا نہیں، اور اگر شریک ہو گیا ہو تو اس مسبوق کی نماز فاسد ہوگی یا نہیں، اور اگر شریک نہ ہو ا تو یہ مسبوق اپنی بقیہ نماز پوری کر کے تعدہ اخیرہ میں سجدہ سہو کرے یا نہیں، اور اگر شریک نہ ہو اور سجدہ سہو بھی نہ کیا تو مسبوق کی نماز فاسد ہو جاوے گی یا نہیں؟ مفصل تحریر فرمائیے گا،

الجواب؛ قال فی الخلاصة الامام اذا قام الى الخامسة وتابعه المسبون ان كان فعلا اماما على الرابعة تفسد صلوة المسبوق وان لم يكن فعلا تفسد حتى يقيد الخامسة بالسجدة فان قيد فسدت صلوة الكل ام، (ص ۱۶۲ ج ۱) وفي الدرر لو اقام امامه لخامسة فتابعه ان بعد القعود تفسد والا لا ام قال الشامي تفسد اي صلوة المسبوق لانه اقتداءه في موضع الانفراد ولان اقتداء المسبوق بغيره مفسد كما مر وقوله والا لا، لان ما قام اليه الامام على شرف الرفض ولعدم تمام الصلوة ام (ص ۱۶۶ ج ۱)

اس سے معلوم ہوا کہ امام اگر تعدہ اخیرہ میں تشہد پڑھ کر پانچویں رکعت کی طرف کھڑا ہو جائے تو اب مسبوق کو اس کا اتباع نہ کرنا چاہیے، بلکہ اس سے علحدہ ہو کر اپنی نماز پوری کر لینا چاہیے، اور اگر اس نے پانچویں رکعت میں امام کی موافقت کی تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی، اور عدم موافقت کی صورت میں مسبوق پر سجدہ سہو لازم نہ آئے گا، کیونکہ امام پر یہ سہو ایسی حالت میں لازم آیا ہے، جبکہ مسبوق منفرد ہو چکا ہے، اور اگر امام خامسہ کے سجدہ سے پہلے سجدہ سہو کی طرف لوٹ آئے جب بھی مسبوق اس کی موافقت نہ کرے بلکہ اگر موافقت کرے گا نماز فاسد ہو جائے گی، ۵ سوال مسئلہ

مسبوق کے شامل جماعت ہوتے ہی امام سلام پھیرے تو وہ تشہد پڑھے یا نہیں؟ سوال (۱۱) مسبوق کے اقتدار کر کے بیٹھتے ہی امام سلام پھیر دیا، اب وہ مسبوق تشہد پڑھے گا یا کیا کرے گا؟

الجواب؛ مسبوق کے شامل ہوتے ہی اگر امام سلام پھیرے تب بھی مسبوق کو تشہد پوری کر کے کھڑا ہونا چاہیے، کافی الدرر بخلاف سلامہ، اوقیامہ الی الثالثة (قبل اتمام التشهد) فانه لا يتابعه بل يتمه لوجوبه ولو لم يتم جازو قال الشامي ای ولو خاف ان تفوته الركعة الثالثة مع الامام كما

صح به فی الظہیریۃ و شمل باطلاقہ ما لو اقتدی بہ فی اثناء التہنید الاول
اولا خیر فحین قعد قام امامہ او سلم و مقتضایہ انہ یتہم التہنید ثم یقوم
ولم ارہ صریحا ثم رأیتہ فی الذخیرۃ ناقلا عن ابی الیث المختار عن ابی انہ
یتہم التہنید وان لم یفعل اجزأہ اہ و لله الحمد (وقولہ جاز) ای صح مع
کراہتہ التحریم کما افادہ ح و نازعہ ط والرحمتی الخ (ص، ۵۵) قلت و کذا
قوله اجزأہ یحصل علی الاجزاء مع الکملۃ کما لا یخفی، والله اعلم،
الجواب صحیح، نظر احمد عنہ ۲، ج ۱، ۵، ۲، کتبہ الاحقر عبد الکریم، ۲، ج ۱، ۵، ۲،

فصل فی الحدیث فی الصلوة

سوال (۱) ایک شخص نے وضو کیا، بعد میں
خون غیر سائل ناک سے نکلنے کے بعد اگر ہاتھ سے پونچھا
اور آخر نماز تک ہاتھ پر رہا تو نماز ہو جائے گی؟
اندر ناک کے اوپر سے خون نکلا اور جاری نہیں ہوا، اور اس نے نماز کے اندر ہاتھ سے پونچھا،
اور ہاتھ پھر اخیر تک رہنے دیا، پھر نماز ختم کی، تو آیا اس صورت میں نماز ہو گئی یا نہیں؟
اس کو مع کتاب کے حوالے کے جواب دیدیں،

الجواب: قال فی الدر المنثور و غیرہ ما لیس بحد فلیس بنجس، صورت مستولیہ میں نماز درست ہو گئی،
کیونکہ جب خون بہا نہیں تو اس سے وضو نہیں ٹوٹا، اور جس چیز کے نکلنے سے وضو نہ ٹوٹے وہ
پاک ہے، تو یہ خون پاک تھا، اس کے ہاتھ میں لگے رہنے سے نماز میں خرابی نہ آئے گی، ۲، ج ۱، ۵، ۲،

فصل فیما یفسد الصلوة وما یکرہ فیہا،

سوال (۱) نماز میں چیخے، چلانے اور
اچھلنے کودنے کا حکم،..... ضلع بریسال میں ایک فرقہ درویش چشتیہ طریقہ

کا ہے، ان لوگوں میں ایک عجیب حال یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ لوگ گاہ بگاہ چیخیں مارتے ہیں
اور یہ حال نماز میں زیادہ ہوتا ہے، کبھی ہا ہا کبھی ہو ہو کر کے چیخ مارتے ہیں، مطلب یہ کہ
رنگ برنگ کی چیخیں مارتے ہیں، اگر کوئی اجنبی آدمی ان لوگوں کے ساتھ نماز میں شریک ہو تو وہ
ڈر کے مارے نماز کی اقتدار بھی چھوڑ دیتا ہے، کیونکہ وہ عجیب آواز ہوتی ہے، لوگ اس سے خوفزدہ

ہو جاتے ہیں، اور کوئی کبھی نماز میں سامنے کی طرف بڑھ جاتا ہے، اور کبھی پیچھے کی طرف ہٹ جاتا ہے، اور کبھی کود کر اوپر کی طرف اٹھ جاتا ہے، جس میں دونوں پاؤں زمین سے علیحدہ ہو جاتے ہیں، اور کبھی نماز میں تالیاں بجاتا ہے، اور کبھی التحیات یا قرأت میں سے چند لفظوں کو بلند آواز سے اور باقی خفی، ان لوگوں سے اگر دریافت کیا جائے تو جواب دیتے ہیں کہ یہ افعال ہم سے بلا اختیار ہوتے ہیں، اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ افعال مذکورہ شریعت میں درست ہیں یا نہیں، اور ان لوگوں سے مرید ہونا اور ان لوگوں کے پیچھے نماز درست ہوگی یا نہیں، اور افعال مذکورہ میں سے کون کون مفسدِ صلوٰۃ ہیں، تحریر فرمادیں؟

الجواب: اگر واقعی ان لوگوں سے یہ حرکات بے اختیار بحالت اضطرار صادر ہوتی ہیں جسکو اصطلاح صوفیہ میں غلبہ حال کہتے ہیں تو اس کا حکم حسبِ قیل ہے:-

(۱) چیخنے اور چلانے اور قہقہہ مارنے سے نماز فاسد نہ ہوگی (۲) نماز میں آگے پیچھے ہٹنے سے بھی نماز فاسد نہ ہوگی، بشرطیکہ سینہ قبلہ ہی کی طرف رہے، قبلہ سے نہ پھرے اور بشرطیکہ ایک دفعہ میں مقدار صفت سے زیادہ مشی نہ ہوتی ہو، گو متفرقاً زیادہ ہو جاتی ہو، (۳) زیادہ کودنے سے نماز باطل ہو جائے گی، لائنہ کالاستدبار فی کونہ منافیاً (۴) تالیاں بجانے سے نماز فاسد نہ ہوگی، لائنہ کالتصیح وہو مشروع للنساء (۵) التحیات یا قرأت میں سے اگر کسی قدر حصہ کو چہرے سے پڑھ دیں تو نماز فاسد نہ ہوگی، لائنہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یحیر بالآیۃ احیاناً فی الظہر و فی الحدیث من السنۃ اخفاء التہجد قلت وھو لیس بواجب فاذا جہر بہ عمد لا تفسد فکیف اذا جہر بہ لعذر قال فی مرقا الفلاح ولا تفسد بحصولہا رای بحروف مسموعۃ من ذکر جنتہ او نار اتقا قال الدلائل علی الخشوع ام، قال فی العاشیۃ لو اعجبته قراءۃ الامام فبکی وقال نعم او بلی لا تفسد ولو وسوسہ الشیطان فحوقل ان لامور الاخرۃ لا تفسد وان لامور الدنیا فسدت ام رص ۱۹۰ قال ویفسدھا التذنج بلا عذر لما فیہ من الحروف وان کان لعذر کمنعہ البلغم من القراءۃ لا یفسد و فی العاشیۃ للطحطاوی و محل الفساد بہ عند حصول الحروف اذا امکنہ الامتناع عنہ اما اذا لم یکنہ الامتناع عنہ فلا تفسد بہ عند الكل کالمریض اذا لم یکنہ منع نفسه عن الانین والتاوی لانہ حیث یمنع

کا لعطاس والجشاء اذا حصل بهما حرور ام (ص ۱۸۹) ای ولم یمكنه دفعه
وفیه ایضا و ذکر المحقق ابن امیر حاج ما حاصلہ ان المشی لا یخلو اما ان
یکون بلا عذر او یکون بعذر فان کان بلا عذر فان کان کثیرا متوالیا یفسد
صلوٰتہ سواء استند بر القبلة مع ذلك او لا لانه حیث عن عمل کثیر لیس
من اعمال الصلوٰۃ ولم تقع الرخصة فیه وان کان کثیرا غیر متوال بل تفرق
فی رکعات او تغلله مهلات فان استند بر معه القبلة فسد لوجود المنافی
قطعا من غیر ضرورة وان لم يستند بر معه القبلة لم یفسد ولكن یکره لما
عرف ان ما افسد کثیرا کره قلیله عند عدم الضرورة وان کان بعذر کان
لاجل الموضوع من الصدق فی الصلوٰۃ اولاً لنصل فیه الی وجه العذر واورج
من صلوٰۃ الخوف لا یفسد ولا یکره مطلقا سواء کان قلیلا او کثیرا استند
القبلة اولم یستند بر ام (ص ۱۸۹) واللہ اعلم، اور یہ جواب اس وقت ہے جبکہ
یہ حرکات بالاضطرار صادر ہوتے ہوئے ان لوگوں کو ہوش باقی رہتا ہو، اور اگر ہوش بھی
نہیں رہتا اور اس درجہ بے خبری ہو جاتی ہے کہ اگر ریح صادر ہو جائے تب بھی اُن کو خبر
نہ ہو تو اس حالت میں نماز بھی فاسد ہو جائے گی اور وضو بھی، لانه کالغشی والنوم
الثقلین وبہما تفسد الصلوٰۃ لمنظنة خروج الناقض، لیکن جب ان لوگوں کی ان حرکات
نمازیوں کو تو حش اور خوف لاحق ہوتا ہے تو ایسے غلبہ حال کی حالت میں ان لوگوں کو عجت
سے نماز نہ پڑھنا چاہئے، اپنے گھر میں پڑھنا چاہئے، لما قد ورد فی الحدیث من اكل الثوم
فلا یقر بن مصلانا وعلی النہی ایذاہ المسلمین فیدخل تحتہ کل ما حصل بہ الایذاء،

رہا ان سے مرید ہونا تو اگر یہ لوگ متبع شریعت ہوں، اور کسی شیخ محقق نے ان میں
سے کسی کو مجاز و خلیفہ کر دیا ہو تو اس سے بیعت ہونا جائز ہے ورنہ نہیں، واللہ اعلم،

۵ ارذیقہ ۳۲۱ھ

سوال (۲) گنجی (بنیاء) جو آجکل نہایت کثرت سے لوگ پہنتے ہیں مثل
بغیر ضرورت کے صرف بنیان میں نماز پڑھنا مکروہ ہے، نیمہ کے کہنی کے اوپر ہوتا ہے اس کو پہن کر نماز بلا کراہت جائز

ہے یا نہیں؟

الجواب؛ جس شخص کے پاس گرتہ نہ ہو اس کی نماز گنجی (بنیان) پہن کر بلا کراہت

درست ہے، اور جس کے پاس آستین والا کرتہ ہو اس کی نماز گنجی پہن کر بکراہت درست ہو۔ کیونکہ نماز میں کہنیوں کا بلا غدر رکھنا مکروہ ہے، نیز عادتاً صرف بنیان پہن کر مجالس عامہ میں جانا معیوب سمجھا جاتا ہے تو صاحب استطاعت کو ایسے لباس میں نماز پڑھنا مکروہ ہے، جس کو پہن کر مجالس عامہ میں وہ نہ جاسکے، واللہ اعلم، ۲۲ رذی الحجہ ۱۴۲۳ھ

نابینا کو نماز میں قبلہ رخ | سوال (۳)
 کر دینا درست ہے یا نہیں؟ ایک نابینا آدمی نے نماز کی نیت باندھی اور اس کا رخ ٹھیک

قبلہ کی طرف نہیں ہے تو اس صورت میں دو سر آدمی کو زبان سے بتلانا یا ہاتھوں سے پکڑ کر اس کو قبلہ رو کر دینا جائز ہے یا نہیں، بینوا توجروا،

الجواب؛ جائز ہے بشرطیکہ نماز شروع کرنے کے وقت کوئی بتلانے والا میسر نہ ہو، اور اگر میسر تھا اور پھر بدون پوچھ اندھے نے نماز شروع کر دی، تو وہ نماز اول ہی سے باطل ہے، بعد کا بتلانا اور قبلہ رو کرنا مفید نہ ہوگا، قال فی العالمگیریۃ ولو اُشبهت

القبلة فی المفاضة فوق اجتماعہ الی اجماعہ فاجبرہ عدلان اذا کان من اهل ذلك الموضع لا يجوز له الا ان یاخذ بقولہما کذا فی الخلاصة (ص ۳۹ ج ۱) وفیہا

الاعمی اذا صلی رکعة الی غیر القبلة فجاء رجل وحوله الی القبلة واقتدی به ان لم یجد الاعمی (حین افتتح الصلوٰۃ) من یسئلہ جازت صلوٰۃ الامام

رای الاعمی) وفسدت صلوٰۃ المقتدی (ص ۴۰ ج ۱) مختصل قلت ولكن دل الجزئیتان علی جواز نفس الاخبار والتحویل، واللہ اعلم، ۱۲ رجب ۱۴۲۳ھ

منبر کی سیڑھی پر سجدہ کرنے کا حکم | سوال (۴) ایک مسجد میں امام کے خطبہ پڑھتے ہوئے منبر پر

اس کی ایک سیڑھی کچھ زیادہ آگے کو ہے، جس کی وجہ سے جو صف اول نمازیوں کی ہوتی ہے اس میں دو نمازیوں کو سجدہ اسی سیڑھی کے اوپر کرنا پڑتا ہے، اور یہ سیڑھی فرش مسجد سے

پانچ گز اونچی ہے، اگر مجبوری ہے تو صرف اسی قدر کہ ایسی صورت میں اندر کے دریں بجائے تین صف کے دو صف ہوتی ہیں، اور اگر منبر کے سامنے جو سیڑھی ہے اسی قدر

جگہ کو چھوڑ دی جائے تو صفتیں تو ضرور تین ہو جائیں گی، لیکن درمیان میں دو نمازیوں کی جگہ خالی رہتی ہے، اور سلسلہ صف شکستہ ہوتا ہے، اور یہ بات نہیں ہے کہ مسجد میں گنجائش نہیں ہے، بلکہ ضرورت سے زیادہ گنجائش ہے، لہذا اندر سے صورت اُن دو نمازیوں

کی نماز صحیح ہوتی ہے اور جائز ہے یا کیا صورت ہے ؟

الجواب : ایک بالشت اونچی سیڑھی پر سجدہ جائز ہے، اور وہ سیڑھی پانچ گروہ ہے، اس لئے نماز جائز نہیں ہوتی، فی العالمگیریۃ (ص ۴۴ ج ۱)، اذ اکان موضع السجود ارفع من موضع القدمین بقدر لبنة اولینتین منصوبتین جازوان زاد لم یجز کذا فی المزہدی واحد اللبنة ربع ذراع کذا فی السلج الوہاج، اور بلا ضرورت صفت میں جگہ چھوڑنا بھی مکروہ ہے، اس لئے اندر دو صف باندھی جائیں،

کتبہ الاحقر عبد الکریم عنی عنہ ۸ ربیع الثانی ۱۲۴۸ھ الجواب صحیح ظفر احمد عفا اللہ عنہ
سوال (۴) ایک شخص قعدۂ اخیرہ میں بیٹھا قعدہ آخری تشهد پڑھنے کے بعد امام سہوا کھڑا ہوا اور قعدہ اولیٰ کے بعد مقدمی کے قعدہ دینے پر بیٹھ گیا اور تشهد پڑھ کر سجدہ سہو کیا، اور پھر تشهد پڑھ کر سلام پھیرا، تو نماز ہو گئی یا نہیں ؟

بیٹھا اور پھر التحیات پڑھ کر سجدہ سہو کیا، اور سجدہ سہو کرنے کے بعد پھر تشهد وغیرہ پڑھ کر سلام پھیرا، ایسی حالت میں اس کی نماز کیسی ہوئی ؟

الجواب : قال فی الدر وان قعد فی الرابعة مثلاً قدر التشهد ثم قام عاد و سلم و لو سلم قائماً صح ام قال الشامی ای عاد للجلوس لما مر ان ملأ الركعة محل للرفض وفيه إشارة الى انه لا يعيد التشهد وبه صرح فی البحر قال فی الامداد والعود للتسليم جالساً سنة لان السنة التسليم جالساً والتسليم حال القيام غير مشروع فی الصلوة المطلقة بلا عذر فياتی به علی الوجه المشروع فلو سلم قائماً لم تفسد صلاته وكان تاركاً للسنة ام (ص ۸۲ ج ۱) قلت ومثال العذر ما اذا انتقض وضوؤه وهو قائم فيسلم قائماً ولا ينتظر القعود فان المضي فی الصلوة بعد انتقاض الوضوء لا يحوز والله اعلم وذكر في هذه المسئلة استطراد الحاجة اليها والله تعالى اعلم
 اس صورت میں دوبارہ تشهد پڑھنے کی ضرورت نہ تھی، بلکہ بیٹھتے ہی سلام پھیر کر سجدہ سہو کر لینا چاہئے تھا، لیکن اگر بیٹھنے کے بعد دوبارہ تشهد پڑھ لیا، پھر سلام پھیر کر سجدہ سہو کیا، جب بھی نماز صحیح ہو گئی، اور سجدہ سہو اس تاخیر کا بھی جائز ہو گیا،

واللہ تعالیٰ اعلم وعلما تم واحکم، یکم محرم الحرام ۱۳۸۶ھ

سوال (۵) زید دعویٰ می کند کہ در حالت عقص شعر نماز عورتوں کیلئے نماز میں عقص شعر مکروہ یا نہیں ؟؛ گذاردن مردان را مکروہ است نہ زنان را زیرا کہ بریں کراہت

مجدیثہ کہ صاحب ہدایہ وغیرہا استدلال کردہ اند، موردش مرد است نہ زن و نیز موتے ہر زن حکم عضوے میدارد و برین تقدیر اگر برائے سجدہ موتے زن موتے خود را بگذارد تا بوجہ برو شدن از پارچہ سر نمازش فاسد گردد، اما عمر می گوید کہ در کراہت آن عقص شعر حکم مرد و زن یکسان است چرا کہ اگرچہ مورد حدیث مذکور خاص است لیکن حکمش عام لہذا فقہاء درجاء کہ حکم آن کراہت بمردان تخصیص نہ کردہ اند،

الجواب؛ قال فی الدر فی باب المکروہات وعقص شعرہ ام قال الشافعی ای منفرہ وفتلہ والمراد بہ ان یجعلہ علی ہامتہ ویشدہ بصمغ او یلف ذوائبہ حول رأسہ کما یفعلہ النساء فی بعض الاوقات او یجمع الشعر کلہ من قبل القفا ویشدہ بخیط او خرقة وجميع ذلك مکروہ لما روی الطبرانی انه علیہ الصلوۃ والسلام نمی ان یصلی الرجل ورأسہ معقوص ام (ص ۱۱ ج ۱) و فی نیل الاوطار عن العرائی وهو مختص بالرجال دون النساء لان شعرهن عورة یجب ستورہ فی الصلوۃ فاذا نقضتہ ربما استرسل وتعد رستہ فتبطل صلاتہما ام (ص ۲۳۵ ج ۲) قلت وقول العرائی لا تأبأہ قواعدنا بل ہی تعید فان شعر النساء عورة عندنا ایضاً، پس درین مسئلہ ہم قول زید نزد ما صحیح است، نہ قول اللہ اعلم،

(تنبیہ) در یک بار زاید از سہ سوال را جواب دادن اینجا قاعدہ نیست پس از بقیہ سوالات دوبارہ استفسار کنند اگر خواہند، ۸ محرم ۱۳۸۶ھ

سوال (۶) در مطلب ایں عبارت بہشتی زیور کی ایک عبارت کی وضاحت کہ اگر جنت و دوزخ کو یاد کرنے سے دل بھر آیا، اور

زور سے آواز نکل پڑی تو نماز نہیں ٹوٹی، بحث شدہ است، کہے گوید کہ ایں آواز خاص است و کسی گوید عام، پس اگر خاص باشد حد اوچہ و آن آواز اختیاری است یا نہ و مراد از دُل بھر آنا، چیست؟ و امامت آن کس اگر متبع شریعت باشد درست است یا نہ،

للہ فرمودہ اجرش عند اللہ امانت دارند و بس،

الجواب؛ مراد از این عبارت گریہ بے خستیا ری است کہ بر ضبط آن قدرت نباشد الا بالخرج، پس این چنین گریہ اگر از ذکر جنّت و دوزخ یا از غلبہ محبت خداوندی در حالت نماز طاری شود نماز فاسد نگردد اگرچہ باواز بلند و صیاح مزید باشد قال المحقق فی الفتح تحت قول الهدایۃ فان ان فیها اوتاقہ او بکی فارتفع بکاء فان کان من ذکر الجنة او النار لم یقطعها لانه یدل علی زیادۃ الخشوع اه، مانقہ وان حصل به الحروف اه ص ۳۲۲ ج ۱ و فی موضع اخر والصیاح ملحق بالکلام الذی بساطہ ذلک الصیاح و سیاتی انه اذا ارتفع بکاء من ذکر الجنة والنار لا تفسد وان کان یقال ان المراد اذا حصل به الحروف ولو صرح به رای بالجنة والنار بسوا الیها والعیاذ منها، لا تفسد اه ملخصا (ص ۳۲۲ ج ۱) پس گریہ را کہ بذکر آخرت باشد حدیث نیست بجز آنکہ از قصد واختیار نباشد، واللہ اعلم، غرہ جمادی الثانی ۱۳۶۲ھ

مسجد کی چھت پر نماز | سوال (۴) مسجد کی چھت پر نماز پڑھنا کیسا ہے، مکروہ ہے یا نہیں؟
پڑھنا مکروہ ہے یا نہیں؟ اگر رمضان شریف میں ایک امام نیچے مسجد میں تراویح پڑھائے اور دوسرا امام مسجد کی چھت پر پڑھائے تو بلا کراہت جائز ہے یا نہیں، اگر مسجد میں دو بزرگ یعنی دو منزلیں ہوں تو دو سکر درجہ کا چھت میں شمار ہوگا یا نہیں، فتاویٰ قاضیخان مطبوعہ نوکشتور جلد اول صفحہ ۱۱ میں یہ عبارت ہے و کذا الوصلی علی السطح فی شدۃ الحر لقولہ تعالیٰ قل نار جہنم اشد حرا لوکانوا یفہقون، کیا اس عبارت سے چھت پر نماز پڑھنے کو مکروہ کہہ سکتے ہیں یا نہیں،

الجواب؛ قال فی الدرر وکرہ تحریما الوطأ فوقہ والبول والتغوط لانه مسجد الی عنان السماء اه قال الشامی وکذا یصح اقتداء من علی سطح المسجد بمن فیہ اذا لم یقدم علی الامام ولا یطل الاعتکاف بالصعود الیہ وارجح للجنب والحائض والنفساء الوقوف علیہ ولو حلفت لا یدخل هذه الدار فوقت علی سطحہ یحنت اه (ص ۶۸۶ ج ۱) وایضا فان الفقہاء لم ینکروا فی مکروہات الصلوٰۃ سوی ظہر بیت اللہ اه، مسجد کی چھت پر نماز پڑھنا مکروہ

ہے دل علیہ قولہ فارتفع بکاء لم یقل رفع بکاء والقواعد تدل ایضا،

نہیں کیونکہ وہ بھی مسجد ہی ہے، البتہ یہ جائز نہیں کہ جماعت، سقہ، ہی پر ہو نیچے کے درجہ میں نماز ہی نہ ہو، کیونکہ اصل مسجدیت میں داخل حصہ ہی ہے، سقہ کی مسجدیت تبعاً للتحۃ ہے پس داخل حصہ میں نماز نہ ہونا صرف سقہ پر ہونا مکروہ ہوگا، الا للحاجة الشدیدیۃ بان کان المسجد منزلین ویتعذر الصلوة فی الداخل للمحروخہ فهو عذر ولان المنزلة الثانية لیس فی حکم السقف بالکلیۃ بل لہ حکم المسجد والسقف ما کان فوق المنزلة الثانية، اور یہ صورت بلا کراہتہ جائز ہے کہ امام تحت میں داخل مسجد ہو اور کچھ جماعت اس کے ساتھ ہو، اور کثرت جماعت کے وقت کچھ آدمی اوپر چھت پر اقتدار کر لیں بشرط التخلف عن الامام وفی شرح المنیۃ للعلی و کذا لیکرہ) لوصلی علی سطح المسجد من شدة الحر لقوله تعالى قل نار جهنم اشد حرا لوکانوا یفقهون^۱ وفی القنیۃ امام یصلی التراويح علی سطح المسجد اختلف فی کراہتہ والاولی ان لا یصلی فیہ عند العذر فکیف بغیرہ اھ (ص ۳۹۲)

اس سے معلوم ہوا کہ تحت مسجد کو چھوڑ کر سقہ پر نماز پڑھنا مکروہ ہے، یہ تو سقہ کا حکم ہے، اور دو منزلہ کے بارے میں یہ کہنا کہ بالائی منزل سقہ کے حکم میں ہے، صحیح نہیں بلکہ سقہ وہ ہے جو بالائی منزل کے اوپر ہے، پس دو منزلہ میں یہ جائز ہے کہ کسی وقت تحتانی منزل میں نماز نہ پڑھی جائے، صرف بالائی میں پڑھی جائے وہ اس کی نظیر ہے کہ کسی وقت مسجد کے داخلی حصہ میں نماز نہ ہو، بلکہ صحن میں پڑھی جاوے کہ یہ بلا کراہت جائز ہے، رہی یہ صورت کہ دو منزلہ مسجد میں ایک امام تحتانی منزل میں ہو اور ایک امام بالائی منزل میں ہو، اور دونوں الگ الگ تراویح پڑھاویں، سو یہ صورت مکروہ ہے، کیونکہ فقہاء نے ایک مسجد میں تراویح کی دو جماعتوں سے منع کیا ہے، ولو صلوا التراويح ثم ارادوا ان یصلی ثانیاً یصلی فرادی کذا فی الخلاصۃ (ص ۶۲ ج ۱) وفی شرح المنیۃ (ص ۳۸۹) ولوام فی التراويح مرتین فی مسجد واحد کرہ وکذا لو صلا ہا مرتین ما مونا فی مسجد واحد وان صلی فی المسجدین اختلف المشائخ فیہ اھ نیز تکرار جماعت ایک مسجد میں ایک وقت میں سلف سے ثابت نہیں، والخیر کلہ فی اتباع السلف ولا یغتر احد بما یفعلہ اہل الحرم من تعدد الجماعات فی التراويح فان الحرم یجوز فیہ تکرار الجماعۃ فانه لا یمدق علیہ انہ مسجد محلی بل ہو کسی شارع وقد تقررانہ لا کراہتہ فی تکرار الجماعۃ فیہ اجماعاً (شامی ص ۵، ۸) وبالجملة فکل مسجد یجوز تکرار الجماعۃ فیہ لا بأس بتکرار التراويح فیہ اذا کان الامام والمؤمنون فی کل علیہم تہم والا فلا، ۲۴ شعبان ۱۲۶۶ھ

حکم نماز بلا عمامہ و بلا قلنسوة سوال (۸) لوگ آجکل مختلف ہیں.....

(۱) سر پر کلاہ اور کلاہ کے اوپر عمامہ باندھ کر نماز پڑھتے ہیں، (۲) صرف ٹوپی سے فریضہ ادا کرتے ہیں بمشکل ۱۵، فی صدی ہوں گے، (۳) سر پر صرف لنگی یا مٹل وغیرہ کی..... پگڑی باندھے ہوئے نماز پڑھتے ہیں، پگڑی وغیرہ کے نیچے ٹوپی نہیں ہوتی، ایسے ۴۰، ۵۰ فی صدی ہوں گے،

دیگریہ کہ ایسا بھی دیکھا کہ نمبر ۲ سے اگر ضرورتاً امام بھی بن جائیں تو وہ ٹوپی اتار کر صرف گز دو گز یا کم و بیش رد مال وغیرہ باندھ کر جماعت کرا دیتے ہیں، پورے طور پر تمام سر بھی نہیں ڈھکا جاتا، نمبر ۳ کے سر تو بالعموم درمیان سے کھلے رہتے ہیں، لہذا با آداب التماس ہو کہ ہر سہ اقسام مذکورہ کے درجات نماز، نیز از روئے شریعت دیگر حالات پر نظر ڈالتے ہوئے نماز امام اور دو سر اشخاص نمبر ۳ میں تو کوئی اعتراض نہیں ہے؟ اگر ہی تو آگاہ فرمادیجئے،

الجواب؛ قال فی شرح الشائل ولا یأس بلبس القلنسوة للاصتقاء بالرأس والمرتفعة المضربة وغیرہا تحت العمامة وبلا عمامة لان کل ذلك جاء عن المصطفی و بذلک اید بعضهم ما اعتید فی بعض الاقطار من ترک العمامة من اصلها لکن الافضل العمامة اه و لابی داؤد والترمذی فرق ما بیننا وبين المشرکین العمامة علی القلانس قال الترمذی غریب واسنادہ لیس بالقائم اه (ص ۱۶۶ ج ۱) وفيه (ص ۱۶۸) وقال ميرك وروی عن ابن عباس ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يلبس القلانس تحت العمامة ولبس العمامة بغير القلانس اه وقد ورد انه صلى الله عليه وسلم نهى عن الاعتجار في الصلوة وفسره الفقهاء كما في مراقي الفلاح بانه شد الرأس بالمنديل أو تكوير عمامته على راسه وترك وسطها مكشوقا اه (ص ۲۰۴)

اس سے معلوم ہوا کہ صورت نمبر ۱ و نمبر ۲ تینوں جائز ہیں، مگر افضل صورت نمبر ۱ ہے اور نمبر ۳ ایسی شرط سے جائز ہے کہ سر کا درمیانی حصہ بھی عمامہ سے مستور ہو مکشوف نہ ہو ورنہ نماز مکروہ ہوگی، واللہ اعلم،

۵ ربيع الثاني ۱۴۲۵ھ

مجنونہ کی محاذات مفسد نماز نہیں | سوال (۹) مجنونہ عورت کی محاذات باعث فساد نماز

ہوگی یا نہیں؟

الجواب: نہیں، کیونکہ فساد صلوٰۃ بالمحاذات کے لئے اشتراک فی الصلوٰۃ والتحریم شرط ہے اور مجنونہ کی نماز ہی صحیح نہیں، صرح فی کتب الفقہ کلمہا باشتراط اشتراکھا تحریمۃ واداء وهو فرع صحة الصلوٰۃ والمجنون لا تعب علیہ الفرائض ولا تصح منه وهذا ظاہر، واللہ اعلم وفي الشامیۃ عن الفہستانی قال وفيہ اشارۃ الی ان محاذات المجنونة لا تفسد لان صلاتہا لیست بصلوٰۃ فی الحقیقۃ اھ (ص ۵۹۹ ج ۱) ۱۸ رجبادی الثانیۃ سکنم

بلا ضرورت بنیان یا میل خوری میں جن کی | سوال (۱۰) بنیان یا میل خوری جن کی آستینیں آستینیں مرفقین تک ہوں نماز پڑھنا مکروہ ہے | مرفقین تک ہو یا اس سے کچھ اور پر فقط اس کو پہن کر نماز ادا کرنا مکروہ ہے یا نہیں؟

الجواب: مکروہ ہے، جبکہ اس کے پاس اور کپڑے بھی ہوں، کیونکہ اس کو پہن کر آدمی محافل و سوق میں نہیں جاسکتا، عادۃً، نیز مرفقین کا کھولنا خود مکروہ ہے، ۱۸ رجب ۱۳۴۴ھ بخوبی طوالت رکعت ثانی امام کو رکوع میں لیجانے کیلئے | سوال (۱۱) سامع کا اللہ اکبر کہنا مفسد نماز ہے یا نہیں؟

..... ایک شخص تراویح میں قرآن عظیم سنا رہا ہے، دوسرا سماعت کرتا ہے، جبکہ سماعت کرنے والا یہ خیال کرے کہ پہلی رکعت سے دوسری بڑھی جاتی ہے، یا ایسا بھول گیا ہے کہ دونوں سے نہیں نکلتا، یا اس سامع کا منشاء آگے پڑھنا نہیں ہے، ان صورتوں میں امام کو رکوع میں لانے کے واسطے سماعت کرنا اللہ اکبر کہہ کر رکوع میں لے آئے تو نماز ہو جاوے گی یا نہیں؟ اور سامع پر کوئی مواخذہ تو نہیں ہوگی | الجواب: اگر سامع کا اللہ اکبر کہتے ہی امام نے رکوع کر دیا، یعنی محض اس کے حکم کی تعمیل کی تو نماز فاسد ہو گئی، اور اگر امام نے اس کے اللہ اکبر سے متنبہ ہو کر اپنے اختیار سے اور اپنی رائے سے رکوع کیا، تو نماز صحیح ہو گئی، بہر حال سامع کا امام کو اللہ اکبر کہہ کر رکوع کی طرف لانا سخت خطرناک بات ہے، ایسا کبھی نہ کرنا چاہیے، واللہ اعلم، قال فی المدار حتی لو امتثل امر غیرہ فقیل لہ تقدم فتقدم او دخل فرجة الصفت فوسع لہ

فسدت بل يمكث ساعة ثم يتنضم برأيه قهستاني ام قال الشافعي هذا امتثال
بالفعل ومثل ما لو امتثل بالقول كما اذا امر رجل المؤذن ان يجهر بالتكبير فحذر
المؤذن ان قصد جوابه فسدت صلاته (ص ۵۰ ج ۱) ۱۹ رمضان ۱۲۸۴ھ

سوال (۱۲) نمازی نے مغرب کی نماز فرض میں
تو نماز ادا ہو جائیگی یا ایسی نماز واجب الاعادہ ہے؟ تیسری رکعت میں الحمد کے بعد سہو سے قل ہو اللہ

کی سورۃ تمام یا اور کوئی سورۃ پڑھ لی اور لاعلمی سے یہ سمجھا کہ تیسری رکعت فرض میں سورت
طلب سے سجدہ سہول لازم ہو گیا، اور قعدۃ اخیرہ میں تہجد پڑھ کر سجدہ سہو کر کے پھر تہجد اور
درود و دعا ماثورہ پڑھ کر نماز کو ختم کر دیا، چونکہ فرض نماز کی تیسری رکعت میں سورت ملائی
سے سجدہ سہول لازم نہیں ہوتا، اور اس نے بغیر سجدہ سہول لازم ہونے کے نماز میں سجدہ سہو کیا تو
اس کی نماز درست ہوئی یا نہیں، اور اگر درست ہوئی تو کیسی ہوئی، مکروہ تحریمی ہوئی یا تنزیہی ہوئی
اور اس نماز کا اعادہ لازم ہے یا نہیں، یا اعادہ بہتر ہے؟ تحریر فرمائیے گا،

الجواب؛ قال فی الخلاصۃ اذا ظن الامام ان علیہ السہو فسد للسهو و
تابعہ المسبوق فی ذلک ثم علم ان الامام لم یکن علیہ سہو فیہ روایتان شہرہا
ان صلوۃ المسبوق تفسد وقال الامام ابو حفص الکبیر لا تفسد والصدرا والشہید
اخذ به فی واقعاتہ وان لم یعلم الامام ان لیس علیہ سہو لم یفسد صلوۃ
المسبوق عنہم جمیعاً (ص ۱۶۲ ج ۱) وفی رد المحتار عن الفیض قیل لا تفسد
به یفتی وعن البحر قال الفقیہ ابواللیث فی زماننا لا تفسد لان الجہل فی القلاء
غالب والله اعلم (ص ۶۲۶ ج ۱)

اس سے معلوم ہوا کہ امام اگر یہ سمجھ کر سجدہ کرے کہ میرے اوپر سجدہ سہو ہے، پھر بعد میں
معلوم ہوا کہ سجدہ سہو نہ تھا تو امام کی اور مدد رکین کی نماز تو صحیح ہو جائے گی، البتہ مسبوق کی نماز میں
اختلاف ہے کہ مسبوق کی نماز صحیح ہوگی یا نہیں، مشہور روایت یہ ہے کہ فاسد ہو جائے گی، اور
ایک روایت یہ ہے کہ اس کی بھی صحیح ہے، پس مسبوق کے لئے احوط اعادہ ہے، اور گنجائش اس
کی بھی ہے، کہ اعادہ نہ کرے، کیونکہ فتویٰ اس پر ہے کہ مسبوق کی نماز بھی صحیح ہے، ۵ شوال ۱۲۸۴ھ
چارپائی پر نماز پڑھنے کا حکم | سوال (۱۳) چارپائی پر نماز کا جواز بکراہت ہے یا بلا کراہت،
اور کراہت تنزیہی ہے یا تحریمی؟ اس کے متعلق جو تفصیل ہو اس سے مطلع فرمائیں،

الجواب؛ چارپائی پر نماز پڑھنا خلافِ ادلی ہے فان الافضل ان یصلی علی مایشابه الارض
یہ اس وقت ہے جبکہ پلنگ خوب کسا ہوا ہو ورنہ نماز کی صحت میں ہی شبہ رہیگا، واللہ تعالیٰ اعلم
۲۰ ردی الحجہ مسئلہ ۴۴

سوال (۱۴) کراہت، عقص شعر نماز پڑھنے
کراہت عقص شعر نماز میں مرد و عورت کے لئے
عام ہے یا صرف مردوں کے لئے خاص ہے؟ کے وقت، مرد و عورت کے لئے عام ہے، یا فقط
مردوں کے لئے خاص ہے، اور عورتوں کو عقص شعر نماز پڑھنا جائز ہے یا نہ؟ ہمارے ہاں عقص
عورتوں کے لئے نہایت ہی پردہ ہے،

الجواب؛ قال العراقي وهو ای الكراهة مختص بالرجال دون النساء
لان شعرهن عورة يجب استرة فی الصلوة فاذا نقضنه ربما استرسل و
تعذر استرة فبطل صلوتهما وایضا فيه مشقة علیها فی نقضه للصلوة و
قد رخص لهن النبي صلی الله علیه وسلم فی ان لا ینقضن ضفائرهن
فی الغسل مع الحاجة الی بل جميع الشعراء (ص ۲۳۵ ج ۲ نیل الاوطار) اس
سے معلوم ہوا کہ کراہت عقص شعر عورتوں کے لئے نہیں بلکہ مردوں سے مخصوص ہے
فان قواعدنا تؤید ما قاله العراقي ولا تباہ ، ۲۴ محرم ۱۲۸۸ھ

نیم آستین واسکت میں نماز پڑھنا | سوال (۱۵) آدمی بائیں ہاتھ کی واسکت سے بھی نماز
ہو سکتی ہے یا مکروہ ہے،

الجواب؛ فقط نیم آستین پہن کر یعنی جب اس کے ساتھ کمرہ وغیرہ نہ ہو تو نماز
مکروہ ہے، البتہ اگر کسی عذر سے ایسا کیا ہو تو پھر کچھ مضائقہ نہیں ہے، واللہ اعلم،
احقر عبد الکریم عفی عنہ ۱۴ رجب ۱۲۸۵ھ ، الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ ۲ ج ۲۸۴ھ
سوال (۱۶) امام نے بجائے دو کے تین سجدے کیے، اتفاقاً سجدہ
ثانیہ میں شرکت کا حکم سہو بھی ترک کر دیا، بعد میں نماز کا اعادہ کیا، اب کچھ مقتدری
لیے شریک ہوئے جو پہلے نہ تھے، ایسی صورت میں نو وارد مقتدیوں کا فرض ادا ہو گا یا نہیں
جناب نے تتمہ امداد الفتاویٰ صفحہ ۲۱ میں تحریر فرمایا ہے کہ ”نو وارد کا فرض شریک ہونے میں
ادا ہو جائے گا“ لیکن غایۃ الاوطار جلد اول ص ۲۱۱ میں مترجم نے وکن اکل صلوة اذیت
مع کراهة التحريم تجب اعادتها والمختار انه جابر للاول لان الفرض لا يتكرر

کے تحت میں لکھا ہے کہ اس کلیہ سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی نیا مقتدی دوسری بار میں شریک ہوگا تو اس کی نماز نہ ہوگی کیونکہ جب امام کی نماز فرض نہیں تو اقتداء سے فرض والے کا اس کے پیچھے درست نہ ہوگا، بظاہر دونوں متعارض معلوم ہوتے ہیں، دفع تعارض کی کیا صورت ہوگی؟

الجواب؛ اس مسئلہ میں اختلاف ہے، راجح یہی ہے کہ نو وارد جماعت میں شریک نہ ہو، حضرت مولانا صاحب مدنیو ضمیمہ العالی نے بھی اب اسی کو راجح فرمایا ہے، واللہ اعلم بالصواب، احقر عبدالکریم عفی عنہ ۳ رجب ۱۳۸۶ھ، الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ

مسئلہ تخفیف صلوٰۃ | سوال (۱۷)..... زید عمر کا

مزاج شناس ہے، اس کا ملازم ہے، اس کے حکم سے نماز پڑھتا ہے، اپنے اندر اہلیت امت نہیں پاتا، محض ہستال امر کرتا ہے، عمر کے ضعف کی بناء پر نماز میں تخفیف کرتا ہے، بلکہ صلوٰۃ فجر میں قرأت مسنونہ بھی نہیں پڑھتا ہے، باوجود اس اختصار اور رعایت کے عمر چاہتا ہے کہ اور تخفیف کی جائے، اڈل تو زید کی نمازوں میں اخلاص نہیں ہوتا، اگر قدرے قلیل برائے نام ہوا بھی تو اندیشہ ہے کہ عمر کی اس قدر رعایت اور خاطر داری سے نماز بھی عمر کی نذر نہ ہو جائے کہ قیام و قعود ارکان میں اس کی گرانی کا خیال رہے، اب بحال ادب زید عرض کرتا ہے کہ تخفیف نماز کا انتہائی درجہ جس کی رعایت بروئے حدیث شریف امام کو ضروری ہے، کیا ہے، اطلاع فرمانے پر اس کی پابندی کرے گا،

الجواب؛ فی الدار المختار ویکما تحریر ما تطویل الصلوٰۃ علی القوم زائد علی قدر السنۃ الخ، اس سے معلوم ہوا کہ تخفیف مامور بہ تو یہی ہے کہ مقدار مسنونہ سے زیادتی نہ کرے، البتہ ضرورت شدیدہ کے وقت تخفیف کے جواز کی حد یہ ہے کہ مقدار جواز ادا ہو جائے، کما ذکر فی البحر معزیٰ الی المجتبیٰ ان الحسن روی عن الامام انہ اذا قرأ فی المکتوبۃ بعد الفاتحۃ ثلاث آیات فقد احسن ولم یستیٰ ام (شامی ص ۵۹۰ ج ۱)

پس نمازیوں کی رعایت سے اگر قدر مسنون سے بھی کمی کرنا پڑے تو یہ بھی جائز ہے کیونکہ امام کو اضعف قوم کی رعایت کا امر ہے، پس یہ رعایت خلوص کے منافی نہ ہوگی، جبکہ نیت اتباع سنت کی ہو، فقط واللہ اعلم، کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ ۲۲ رجب ۱۳۸۶ھ، الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ

لنگوٹ پر تہ بند یا پانچامہ پہن کر نماز پڑھنا | سوال (۱۸) لنگوٹ نیچے بندھا ہوا ہوا پر پاک

پانجام پہن کر یا تہبند باندھ کر نماز پڑھیں ادا ہو جائے گی یا نہ، بصورت عذریہ بلا عذر کے،
الجواب: نماز ہو جاوے گی، لعدم ما يدل على الحرمة وفساد الصلوٰۃ، اور لوگوں میں جو اس کی
مانعت مشہور ہے وہ بے سند بات ہے، واللہ اعلم، عبدالکریم عفا عنہ ۳۰ رجب ۱۲۸۸ھ
الجواب صحیح، ظفر احمد، یکم رجب ۱۲۸۸ھ

معذور کی نماز کی ایک صورت | سوال (۱۹) ایک شخص کے

ہاتھ پر چوٹ لگی، سال بھر اس نے سخت تکلیف پائی، علاج معالجہ بہت کچھ کیا، اب
اس کا ہاتھ کھلائی کے جوڑے خشک ہو گیا ہے، دایاں ہاتھ ہے، یہ بھی تکلیف سے خالی
نہیں، کسی نے بتایا ہے کہ گدھے کی لید پانی میں پکا کر اس جگہ باندھی جائے اور دس دن تک
کھولی نہ جائے، بندھی ہی رہے، کیا اس صورت میں نماز پنجگانہ صحیح ہو جائے گی؟ اگر نہیں
ہو تو بعد ازاں قصا کرے گا، لیکن اگر اس ایشیاء میں مرگیا تو وارثوں پر اس کی فوت شدہ
نمازوں کا فدیہ واجب ہوگا؟ کتنا واجب ہوگا؟

الجواب: صورت مسئلہ میں باوجود اس ناپاک چیز باندھنے کے بھی بصورت
نماز صحیح ہو جاوے گی، ونظیرہ ما فی الدرر لمن تحت ثیاب نجسہ وکلبا بسط شیتا نجس من ساعۃ
صلی علی حالہ وکذا ولم یتنجس الا انہ یلحقہ مشقۃ بتریکہ اھ (شامی ص ۴۹۹ ج ۱) واللہ اعلم
بالصواب، ۳ رذی الحجہ ۱۲۸۵ھ، کتبہ عبدالکریم عفی عنہ

نماز میں پانجام ٹخنوں سے نیچے رکھنا | سوال (۲۰)
..... زید امامت کرتا ہے، اور اس کا پانجام ٹخنوں سے نیچا رہتا ہے، عمرو

نے کہا ٹخنوں سے نیچا پانجام رکھنا غیر مشروع ہے اور سخت گناہ ہے، اس سے نماز مکروہ
ہوتی ہے، تو زید نے یہ کہا کہ غیر مشروع اور سخت گناہ بھی ہے، مگر نماز مکروہ نہیں ہوتی ہے
اب سوال یہ ہے کہ نماز مکروہ نہیں ہوتی ہے، یہ صحیح ہے یا غلط ہے، بینوا و توجروا؟

الجواب: زید کا قول غلط ہے، عمرو کا صحیح ہے، یہ صورت سدل میں تو داخل نہیں
مگر جس طرح سدل نماز میں مکروہ ہو اسی طرح غیر مشروع لباس میں بھی نماز مکروہ ہے
صرح بہ الفقہاء ومنہ کراہۃ الصلوٰۃ فی ثوب الحریر، قال العینی قال تاج
الشیعۃ الإصحح التفصیل لوصلی فی ثوب حریر او ثوب مغصوب لم تصح صلوٰۃ
فی احدی الروایتین عن احمد بن حنبل و فی اخروی تصح مع التحريم وعندنا

تصح ویکوہ کذا فی مطالب المؤمنین ام من نفع المفتی والسائل (ص ۳۸) قلت
وکذا کلباس غیر مشروع فهو فی حکم ثوب الحریر والثوب المفصوب لان
الکراہۃ بہما لیس للنیاسۃ ولا لقلۃ الستریل لتعلق النہی بلبسہما فکذا
کل لباس تعلق بہ النہی، واللہ اعلم، ثم رأیت البیہقی قد عتد باب کراہیۃ
اسبال الانار فی الصلوٰۃ واخرج فیہ حدیث ابی ہریرۃ مرفوعا ان اللہ عزو
جل لا یقبل صلوٰۃ رجل مسبل ازارہ ام (ص ۲۲۱ ج ۲) وهذا یدل علی نقصان
الصلوٰۃ بہذا الفعل صلحۃ وای نقصان اعظم من عدم القبول، ۱۰ رذیقہ
ساڑی میں نماز پڑھنے کا حکم | سوال (۲۱) اس ملک میں عورتیں جو ایک کپڑا تمام بدن میں
دے کر نماز پڑھتی ہیں، جس کو ہمارے ملک میں ساڑھی بولتے ہیں، تھوڑی پہنتی ہیں، اور
تھوڑی بدن میں ڈالتی ہیں، یا دھوٹی بولتے ہیں،

الجواب؛ ساڑی میں نماز جائز تو ہے بشرطیکہ عورت کا تمام جسم مخفی رہے، مگر
بدن کرتے کے نماز مکروہ ہے، جس کے پاس کرتہ ہو، پس عورتوں کو ساڑی کے نیچے کرتہ ضرور
پہننا چاہیے، کہ بغیر اس کے ستر کھلنے کا بھی اندیشہ ہے، ۲۸ رزی الحج ۱۴۲۸ھ

فصل فی القراءة ومسائل زلة القاری

فاتحہ خلف الامام | سوال (۱) حافظ صاحب نے یہ ایجاد کیا ہے کہ بلا سورۃ فاتحہ کے نماز نہ ہوگی
نماز سری ہو یا جہری، کُل مسلکی سخت پریشان ہیں، اس کے بارہ میں جو ثبوت ہو مدلل ارقام فرمائیے
اور جو کتاب دربارہ مسئلہ ہذا میں ہو اطلاع فرمادیں؟

الجواب؛ حنفیہ کے مذہب میں بدون سورۃ فاتحہ پڑھنے کے مقتدی کی نماز درست
ہے، بلکہ حنفیہ کے نزدیک مقتدی کو امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنا مکروہ ہے، خواہ نماز سری
ہو یا جہری، اس شخص نے جو مسئلہ بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیر مفتلہ ہے،
مسلمانوں کو اس کے پیچھے نماز پڑھنے سے احتراز کرنا چاہیے، ۲۴ رجب ۱۴۲۸ھ

ضاد صحیح ادا کرنے والے کی ضاد غلط | سوال (۲) پیشتر جو کارڈ بندہ نے راولپنڈی سے خدمت
پڑھنے والے کے پیچھے اقتدار کا حکم | عالیہ میں روانہ کیا تھا، اس میں ضاد معجم کے متعلق استفتاء تھا
اس کا جواب ملا تسلی ہو گئی، اب بندہ بغرض تعلیم وارد امر ہے، اسی کے متعلق

تھوڑی سی بات دریافت طلب ہے، لہذا جوابی کارڈ تحریر ہے، اگرچہ یہاں بھی مفتی صاحب د
 دیگر علماء موجود ہیں، لیکن وہ ایسی باتوں کو چنداں اہم نہیں سمجھتے، اور ان کے عمل درآمد سے
 بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ضاد معجم کو مشابہ وال مہملہ پڑھنے کو اصح قرار دیتے ہیں، اس لئے ذیل
 کا سوال ان سے نہیں کیا گیا ہے، سوال صرف یہ ہے کہ جو شخص ضاد معجم کو اپنے مخرج سے
 کماحقہ بلحاظ صفات ادا کر سکتا ہو یا کماحقہ نہ ادا کر سکتا ہو، لیکن متوسط درجہ کا ضعیف
 جیسا اس کے اپنے مخرج ہی سے ادا کرتا ہو، تو اس کی نماز ایسے شخص کے پیچھے جو ضاد معجم کو
 خالص وال مہملہ یا طباق دے کر پڑھتا ہو صحیح ہے یا نہ؟ مثلاً امام ماہر تجوید نہ ہو عامی ہو یا ماہر
 تجوید۔ سند یافتہ ہو لیکن غیر پانی پتی ہو، یعنی مشابہ وال پڑھنے والا ہو، پیچھے مقتدی جو ہو وہ
 پانی پتی ہو سند یافتہ ہو، یا صرف مخارج کا جاننے والا ہو بے سند ہو، لیکن ضاد معجم کو اپنے مخرج
 سے متوسط یا ضعیف جیسا پڑھ سکتا ہو، ان جملہ صورتوں کا کیا حکم ہے، ضاد معجم کو اپنے مخرج سے
 ادا کرنے والا اگر معذور کے پیچھے اقتدار کرے تو اس کو نماز کا اعادہ واجب ہے یا نہ، اگر اعادہ
 ضروری ہے تو نماز جمعہ کا بھی اعادہ ہو سکتا ہے یا نہ، چونکہ اس کا اعادہ تو کرنا ہی ہوتا ہے تو
 توجہ امت سے قبل پڑھ کر پھر شامل جماعت ہو جایا کرے یا نہ، اگر بایں خیال اکثر جماعت
 چھوڑ دیا کرے کہ میری اقتدار کسی کے پیچھے صحیح نہیں تو کس حد تک گناہگار ہوتا ہے، درنح
 کہ وہ امام نہ بن سکتا ہو، جواب مختصر ہو، دلائل کی کوئی ضرورت نہیں ہے، صرف قلم مبارک
 سے لکھ دینا ہی دلیل ہے، والسلام،

الجواب: قال فی مراۃ العیال والشم بالشاء الثلثة والتعریک وهو
 واللغة بضم اللام وسكون الشاء تحرك اللسان من السين الى الشاء ومن ثلثه
 الى الغین ونحوه لا یكون اماما لغيره واذا لم یجن فی القرآن شیئا خالیا عن
 لثغه وعجز عن اصلاح لسانه اناء الیل والطراف النهار فصوله جائزۃ لنفسه
 واذا ترک التصحیح والجهد فصلاته فاسدة ام قال الطحطاوی قوله لا یكون
 اماما لغيره الامثلة وفي الغانية ذکر الشیخ ابوبکر محمد الفضل انها تصح
 امامته لغيره لان ما یقولہ صار لفته واختاره ابن امیر حاج وحمل قولہم لا
 یؤم اعلیٰ منه علی الاولویۃ خروجاً من الخلاف وقولہ ام قال فی الخلاصة اذا
 کان یجتهد اناء اللیل والنهار فی تصحیحه ولا یقدر علی ذلک فصوله جائزۃ

وان تترك جهده فصلاته فاسدة الا ان يجعل العسر في تصحيحه ولا ان يترك جهده في باقى عمره ام قال صاحب الذخيرة وهذا الشق الثانى مشكل لان ما كان خلقه لا يقدر العبد على تغييره ام وكذا اذا كان لعارض ليس مما يزول عادة واذا كان كذلك فلا يعول في الفتوى على مقتضى هذا الشرط ومن شبه ذكر في خزنة الاكمل عن فتاوى ابى الليث لو قال الهسد لله بالهاء بدل الحاء او كل هو الله احد بال كاف بدل ال الفات جازاذا لم يقدر على غير ذلك على لسانه لا تفسده فلم يذ هذا الشرط او يسأله قال الفقيه وان لم يكن بلسانه ولكن جرى ذلك على لسانه لا تفسده فلم يذ هذا الشرط الى ان قال قلت كلامه يفيد ان هذا الشرط فيه خلاف والاكثر لم يذ كقولان فيه حرجا عظيما ام رثا، اكرام ان تصح حررت في سعى كامل كي هو پھر ضا صبح نہ نکال سکتا ہو یا اس کی زبان میں علت ہو جسکی وجہ سے وہ صحیح مخرج سے ادا کرنے سے بالکل عاجز ہو، اس کے پیچھے صحیح پڑھنے والے کی نماز درست ہو جائے گی، اور اگر باوجود قدرت کے بھی تصحیح حررت کی امام نے سعى نہ کی ہو تو اس کے پیچھے ماہر ضا و کی نماز درست نہ ہوگی، واللہ اعلم،

(۲) جمعہ کی قضا طر ہے، (۳) جماعت میں شرکت کر کے بعد میں اعادہ کر لیا جاوے، اور یہ بات جواب اول سے معلوم ہو جائے گی کہ اعادہ کب ضروری ہے، کب نہیں واللہ اعلم فرض نمازوں میں دو سورتیں کامل سوال (۳) فرض نمازوں میں دو سورتیں کامل یا دو یا ان کے کچھ حصے پڑھنے کا حکم سورتوں کے کچھ حصے پڑھ سکتے ہیں؟

الجواب، یہ سوال سمجھ میں نہیں آیا، کیا یہ مطلب ہو کہ ایک رکعت میں دو سورتیں کامل یا دو سورتیں کے کچھ حصے پڑھے، یا دو رکعتوں میں ایسا کرے کہ پہلی صورت میں فرض نمازوں میں مکروہ ہے، اور دو رکعتوں میں دو سورتیں کامل پڑھتے میں شبہ ہی کیا ہے، ایسا ہی کرنا چاہئے کہ ہر رکعت میں ایک سورۃ کامل پڑھے، اور اگر ایک رکعت میں ایک سورۃ کا کچھ حصہ اور دوسری میں دوسری سورۃ کا کچھ حصہ پڑھ دیا تو یہ بھی جائز ہے مگر خلاف اولیٰ ہے، اس لئے گاہے تو مضائقہ نہیں مگر عادی نہ ہونا چاہئے، ۲۴ شعبان ۱۳۲۸ھ نوافل میں جہر کا حکم جبکہ انھیں سوال (۴) جس شخص نے نماز نفل آہستہ پڑھنی مشروع کی سرآشروع کیا ہو، پھر زور سے پڑھنے کو جی چاہتا ہے تو درمیان نماز سے زور سے

پڑھنا درست ہو گیا یا نہیں؟ والسلام

الجواب: اگر نفلیں دن میں پڑھ رہا ہے تو جہر نہ کرے، اور اگر رات میں پڑھ رہا ہے تو جہر جائز ہے، خواہ ابتداء سے جہر کر رہا ہو یا وسط میں شروع کر دے، ہر طرح اجازت ہے، قال فی مراقی الفلاح والمنفرد بفضل الخیر فیما یجہی الامام فیہ کمتنفل باللیل فانہ مخیر ویکتفی بادی الجہر والجمع افضل ما لم یؤذنا ثم انصوہ کمریض ومن ینظر فی العلم اور اس کا قیاس اس صورت پر صحیح نہیں کہ نفل کو قیام کے ساتھ شروع کرنے سے پھر قعود جائز نہیں رہتا، کیونکہ وہاں قیام رکن صلوٰۃ ہے اور قعود سے اقویٰ ہے، اور قعود قائم مقام قیام کے رخصت ہے نوافل میں، اور یہاں نوافل لیل میں ہر یا جہر کوئی واجب نہیں، بلکہ دونوں مجتہدین اور مساوی ہیں، اور نہ ہر اقویٰ ہے جہر بلکہ بعض دلائل سے نوافل لیل میں جہر کی افضلیت معلوم ہوتی ہے، لہذا انتقال من الاقویٰ الی الادنی نہ ہوگا، بلکہ انتقال مساوی کی طرف یا غیر افضل سے افضل کی طرف ہوگا، پس صحت میں کیا شبہ ہے، اور ہدایہ وغیرہ میں جو یہ جزئیہ ہے تو ترک سورۃ اولی العشاء قرأہا وجوباً مع الفاتحہ جہراً فی الاخرین لان الجمع بین جہر ومخافتۃ فی رکعۃ شنیع، یہ جزئیہ جماعت امام کیساتھ مخصوص ہے، کیونکہ جہر اسی پر واجب ہے نہ منفرد پر، خصوصاً منفرد فی النوافل پر تو جہر واجب ہے ہی نہیں، وصرح فی الہدایۃ فی باب سجود السہوبان الجہر والمخافۃ من خصائص الجماعۃ پس جماعت میں جمع بین الجہر والسر فی رکعۃ مکروہ ہو نہ افراد میں، واللہ اعلم، ۸ اردو لقمہ

ضاد کو دو اد پڑھنا یا ظاہر پڑھنا اور صحیح خوان کا سوال (۵)

غلط خوان کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم، اس امر میں تو شک ہی نہیں معلوم ہوتا

کہ حرف ضاد کو جو آجکل عوام دو اد پڑھتے ہیں وہ بالکل غلط ہے، البتہ دریافت طلب یہ امر ہے کہ اس حرف کو جبکہ اس کے مخرج اور جمیع صفات کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے تو اشتباہ بالظاہر ہوتا ہے اور اس پر عوام شور مچاتے ہیں، پس ایسی حالت میں اس کو کسی کے کہنے سے دو اد پڑھنا درست ہے یا نہیں، اگر درست نہیں تو جو اشخاص اس کو دو اد پڑھتے ہیں ان کی اقتدار کرنا درست ہے یا نہیں، بندہ کے جو دو چار رسائل اور فتاویٰ اس کے بارے میں نظر سے گزرے ہیں یہ فہم ناقص میں آیا کہ نماز نہیں ہوتی، اور وہ یہ ہیں، مجموعۃ الفتاویٰ مولانا عبدالحی لکھنوی یوسفی استفقا، نمبر ۱۱ جلد اول اور استفقا، نمبر ۱۲ جلد دوم میں

نہایت قوی سے دلائل سے ثابت کیا ہے اور قریب ۳۶ کتابوں کے حوالہ دیا ہے۔ اور رسالہ مرصاد فی قرۃ الضاد میں تراشی کتابوں اور چھپائی فتاویٰ سے ثابت کیا ہے کہ نماز نہیں ہوتی، جو مؤلف ہی مولوی محمد حسین تہنما مراد آبادی کی مطبوعہ نیر اعظم پریس مراد آباد اور تفسیر اکسیر اعظم جلد اول میں بعد ختم ہونے تفسیر سورۃ فاتحہ کے دلائل قویہ سے ثابت کیا ہے، اور ان سب کا خلاصہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ فقہ کا قاعدہ ہے کہ جن دو حرفوں میں فرق بآسانی ممکن ہو وہاں تبدیل حرف بحرف سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، اور جن میں فرق بمشقت ہو تو وہاں فاسد نہیں ہوتی، اور اسی قاعدہ کو مختار لکھا ہے، پس یہ تو جملہ کتب فقہ و تجوید و صرف و تفسیر سے ثابت ہے کہ ض اور ظ میں فرق بمشقت ہے، اور دو آد کا کہیں ذکر نہیں کیا، اور یہ ذکر نہ کرنا قرینہ ہے اس کا کہ ان دونوں میں تباہی ہے، پس جب تباہی ہو تو بقاعدہ مذکورہ بالا فاسد ہونا چاہئے، اور اگر ضاد کی جگہ ظ نکل گیا، تو وہاں فاسد نہیں ہونی چاہئے، کیونکہ وہاں تشابہ ہی، اور اس کا بھی بندہ کو تجربہ ہو گیا ہے کہ جو علماء اس کو دو آد پڑھتے ہیں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں اور محض ضد ہے، میں چند علماء کے پاس استفتاء لیکر گیا، لیکن جواب دیا تو یہ دیا کہ اس کو قاری جانیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب یہ حضرات نہیں جانتے تو پھر مداخلت کیوں کرتے ہیں جب زیادہ کہا گیا تو فرمانے لگے کہ ہم نے تو ایسا ہی پڑھا ہے، اور اپنے باپ بھائی سے ایسا ہی سنا ہے (کتابی دلیل کوئی نہ دے سکے) نوبت بایںجا رسید کہ فرمانے لگے کہ تم تمام جہان سے فتویٰ منگالو، اگر میری طبیعت کے موافق ہوگا تو دستخط کروں گا ورنہ پھینک دوں گا رگو یا دین کے خود تالیف نہیں بلکہ دین کو اپنا تابع بنا چاہتے ہیں، تو اب دو وجہ ہو گئیں ایک غلط خوانی، دوسری ضد خلاف وجہ شرعیہ،

اب جبکہ غور کرتا ہوں کہ رسائل مذکورہ کی طرف تو فسادِ صلوٰۃ لازم آتا ہی، پھر دل میں خیال آتا ہے کہ ترک جماعت ہوتی ہے تو پھر اس کا بھی جواب فوراً دل میں یہ گذرتا ہے کہ جب اول سے نماز ہی نہیں ہوتی تو جماعت کس کام کی، اور اگر کہا جائے کہ عموم بلوئی کی وجہ سے نماز فاسد نہ ہوگی تو حکیم رحیم اللہ صاحب بجنوری نے رسالہ الاقتصار فی الضاد میں لکھا ہے کہ یہاں پر عموم بلوئی معتبر نہیں، اور تمام مشکوک جو اس حرف کے متعلق ہیں ان کا بھی جواب دیا ہے، (جو دراصل قائلینِ دو آد کے نزدیک دلائل قویہ ہیں)،

امید کرتا ہوں کہ جملہ امور مذکورہ بالا کا جواب شافی مرحمت فرمائیں گے،

الجراسی: آپ نے جو کچھ سمجھا ہے سب صحیح ہے، مگر ظ سے فاسد نہ ہونا علی الاطلاق صحیح نہیں اور دو آد سے فاسد ہونا بھی محل تامل ہے،

ضاد کو دال یا مشابہ دال یا شایہ ظار سوال (۶).....
پڑھنے والے کی اقتدار

آیا کوئی شخص سب حروف صحیح پڑھتا ہو یا قریب صحیح کے پڑھتا ہو، مگر صرف اس حرف ضاد کو دال یا مشابہ دال کے پڑھتا ہے تو اس کے پیچھے بھی ایسے شخص کو جو اس حرف ضاد کو مشابہ بالظار پڑھتا ہو اقتدار کر لینے سے اعادۃ صلوة تو واجب نہیں، اور اگر نہ لوٹاؤں تو کوئی حرج تو نہیں متاخرین کے قول پر، اور اگر ایسا شخص نماز پڑھائے جو اور حروف میں بھی تبدیلیاں کرتا ہے مثلاً قات کو چھوٹا کات بڑے شین کو سین، جیم کو زے اور حروف بھی گھٹا بڑھا دیتا ہو جس سے بالکل معنی بدل جاتے ہوں، ایسے ائمہ کے پیچھے اگر اعادۃ صلوة کی دقت سے بچنے کی غرض سے تنہا خفیہ نماز پڑھ لیا کروں تو ترک جماعت کی معصیت تو میرے اوپر نہ ہوگی، اس میں شرعی حکم حضور والا سے معلوم کرنا چاہتا ہوں؟

الجواب واللہ الموفق للتواب: قال فی الدرر لا غیر الا لثغیرہ ای بالاثغ علی الاصح کہا فی البحر عن المجتبی وحررہ الحلبي وابن الشحنة انه بعد بذل جهدہ دائماً كما لا ہی فلا یثم الا مثله۔ الى ان قال هذا هو الصحيح المختار فی حکم الا لثغ وکذا من لا یقدر علی التلفظ بحرف من الحروف ام رطنا و ملج مع الشامی، وفي رد المحتار تحت قوله علی الاصح، ای خلافا لما فی الخلاصة عن الفضلی من انها جائزۃ لان ما یقول صار لغة له ومثله فی التتارخانیہ وفي الظہیریہ وامامة الا لثغ لغيره تجوز وقیل لا ونحوه فی الخانیة عن الفضلی وظاهر اعتمادهم الصحة وكذا اعتمد صاحب الحلية قال لما اطلقه غیر واحد من المشایخ من انه ینبغی له ان لا یؤم غیره ولما فی خزانة الاكمل وتکرر امامة الفافا ولكن الاحوط عدم الصحة اه ص ۶۰۸ ج ۱)

ان عبارات کے امور ذیل مستفاد ہوئے: (۱) الشیخ کی امامت کے جواز میں اختلاف ہے،

(۲) الشخ صرف وہی نہیں جس میں صحیح پڑھنے کی قابلیت ہی نہ ہو، کیونکہ حلی و ابن شحنے نے اس پر بذل جہد واجب کیا ہے، اور وجوب جہد فرع ہے قدرت کی، پس الشخ سے مراد وہ الشخ ہے جو اس حالت موجودہ میں صحیح پڑھنے پر قادر نہیں (۳) جو شخص الشخ نہ ہو لیکن اس وقت کسی حرف کے صحیح تلفظ پر قادر نہ ہو وہ بھی بحکم الشخ ہے، پس ہر چند کہ صحیح مختار قول یہ ہے کہ الشخ کی امامت غیر الشخ کی لئے درست نہیں، اور اس کا مقتضاء یہ ہے کہ صحیح خواں کی اقتداء ایسے شخص کے پیچھے جائز نہ ہو جو حروف کو صحیح ادا نہیں کرتا، مگر اس وقت ضرورت کی وجہ سے امام فضلی کے قول پر فتویٰ دینے کو جی چاہتا ہے، خصوصاً حرف ضاد کے مسئلہ میں کیونکہ عام طور پر ترا تک اس کو غلط پڑھتے ہیں، لہذا قاری کی اقتداء کرنا غیر قاری کے پیچھے صحیح ہے، البتہ ایسے شخص کے پیچھے صحیح نہیں، جو بحالت موجودہ صحیح حروف پر قادر ہے، مگر غفلت یا بے توجہی یا رعایت عوام کی وجہ سے کسی حرف کو مثلاً ضاد کو اصلی مخرج سے نہیں نکالتا، کیونکہ وہ بحکم الشخ نہیں بلکہ عمداً غلط پڑھنے والا ہے، واللہ اعلم، ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۹ راج ۱۳۳۸ھ، صحیح الجواب، اشرف علی ۹ راج ۱۳۳۸ھ ولا الضالین میں ضاد کے بجائے سوال (۷) اگر نماز کے اندر ختم تمام الحمد شریف میں تجا ذال پڑھ لیا تو نماز ہو جائے گی، ولا الضالین کے اگر ذال کے ساتھ تلفظ ادا کیا جائے تو درست ہے یا نہیں اور نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟

الجواب؛ نماز درست ہوگئی، لکونہ من الذلۃ فلم یفسد المعنی، باقی جو شخص صحیح تلفظ پر قادر ہو اس کو ذال پڑھنا عمداً جائز نہیں، ۸ ربیع الاول ۱۳۳۸ھ تحقیق حرف ضاد سوال (۸) یہ جو حرف ضاد مشابہ ظار کے پڑھتے ہیں صحیح نہیں ہے بلکہ ضاد کو مشابہ ذال کے پڑھنا چاہئے، کیونکہ ذال بہ نسبت ظار کے ضاد کے ساتھ قریب تر ہے، جیسا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے بھی امداد الفتاویٰ جلد اول ص ۱۴۳ سطر ۳ میں فرمایا ہے کہ ”اسی طرح ضاد و ذال میں تقارب بلیغ ہے،“ اور سطر نمبر ۶ میں فرماتے ہیں ”بلکہ باعتبار مخرج کے ضاد کو ذال کے ساتھ زیادہ قرب ہے بہ نسبت ظار کے، الجواب؛ حضرت مرشدنا سلمہ نے جو فرمایا ہے حق و صواب ہی، لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ ضاد کو ذال کے مشابہ پڑھنا چاہئے نہ ظار کے، دیکھو اس صفحہ کے حاشیہ پر مرقوم ہے ۷۵ یعنی باعتبار قربیت مخرج کے نہ کہ صفات و صوت کے، للہ مشاہد

مع تبدیل مخرج ہے ورنہ مخرج سے ادا ہونے سے مشابہت صورت لازم ہے ۱۲ منہ
 دیکھو حضرت سلمہ صوت کا تشابہ تو ظاہر کے ساتھ ثابت فرمایا باقی باعتبار قربت مخرج
 کے دال کو ضاد کے ساتھ زیادہ قریب لکھا بہ نسبت ظاہر کے، کیونکہ جب سائل نے حضرت
 سلمہ کی خدمت میں یہ سوال کیا کہ ضاد کو اس کے مخرج سے ادا کرنے پر قدرت نہ ہو تو وہ شخص
 حرف مذکور کو بصوت ظاہر منقوطہ کہ دونوں حروف مفہم اور متشابہ الصوت ہیں پڑھے یا بصوت
 دال مہملہ جو کہ مرقق و غیر متشابہ الصوت ہی پڑھے، تو حضرت سلمہ نے سائل کو جواب میں فرمایا،
 کہ ضاد کو ظاہر یا دال پڑھنا ایسا ہے جیسے بار کو تار، تار کو جیم، حاء کو خا و ہذا باطل بالاجماع،
 پس اگر ضاد کی جگہ ظاہر کو پڑھنا بسبب اتحاد صفات اور تشابہ صوت کے جائز ہے، تو ضاد
 کی جگہ دال پڑھنا بھی جائز ہو، کیونکہ بہ نسبت ظاہر کے دال قریب ہی باعتبار مخرج کے، اس لئے
 حضرت سلمہ نے قربت مخرج ثابت فرمائی اور باعتبار ادا تہم کے دونوں یعنی ظاہر اور دال
 کو ضاد کی جگہ جواز عدم جواز میں متساوی الاقدام فرمایا ہے، مطلب یہ ہوا کہ حضرت سلمہ
 کی اس تحریر سے یہ ثابت نہیں ہے کہ ضاد متشابہ الصوت بدل ہے، بلکہ حضرت سلمہ نے
 الزام فرمایا کہ اگر عدا ظاہر کو ضاد کی جگہ پڑھنا بسبب تشابہ صوت و اتحاد صفت استعلاء
 کے جائز ہو تو ضاد کی جگہ دال پڑھنا بھی بسبب اتحاد صفت جہر و قربت مخرج کے جائز ہونا
 چاہئے، حالانکہ دونوں ناجائز ہیں باقی یہ الگ بات ہے کہ ضاد کو اگر اپنے مخرج اور صفات کے
 صحیح طور سے ادا کیا جاوے تو اس کا صوت دال سے مشابہ ہو گا یا ظاہر کے، اس کے متعلق
 حضرت سلمہ کی تحریریں اسی جلد میں موجود ہیں، اور اسی تحریر کے حاشیہ پر بھی موجود ہے،
 کہ ضاد کا صوت ظاہر سے متشابہ ہے نہ دال سے، اور یہ شبہ کرنا کہ جب ضاد اور ظاہر میں
 تشابہ صوت پایا جاتا ہے اور ضاد کی ادا پر قدرت نہیں ہے، تو پھر اس کی جگہ وہی حرف
 پڑھنا چاہئے، کہ جو اس کی صورت جیسی سنائی دے یا جو باعتبار مخرج کے قریب ہو مثل
 دال کے، تو میں پوچھتا ہوں کہ ایسا تو ع اور ع، اور ح اور ح اور ص اور ص اور ث اور ث
 اور ت اور ط اور کاف اور قاف میں بھی تشابہ صوت پایا جاتا ہے، اگرچہ ہر متشابہ
 الصوت حرف میں میسر موجود ہے، پھر بھی اتنا امتیاز نہیں ہے کہ عوام فرق سمجھ سکیں
 تو چاہئے کہ بسبب عدم قدرت کے یہ ہر متشابہ الصوت حروف بھی ایک دوسرے کی
 جگہ پڑھے جاویں، یعنی عین کی جگہ ح اور ح کی جگہ ع اور ع کی جگہ س و امثالہا، بسبب

قربت مخرج کے آپس میں ایک دوسرے کی جگہ پڑے جاویں جیسے ء کی جگہ ؤ اور ع کی جگہ
خ اور ث کی جگہ ذ اور ت کی جگہ ذ ہرگز جائز نہیں،

صاحب! سچی بات یہ ہے کہ غیر ماہرین فن تجوید کو ذال ظار، زار اور س، ص، ث اور
ط کے تشابہ سے تو کیا بلکہ عمداً ایک کو دوسرے کی جگہ پڑھ دینے سے بھی اتنے قدر و حش
و نفرت نہیں ہوتی۔ ہے کہ جس قدر ظار و ضار کے خفیف تشابہ سے ہوتی ہے، اس کی وجہ
یہ ہے کہ ضار چونکہ بمشکل ادا ہوتا ہے، اس لئے عرصہ بعیدہ سے بہ سبب عدم توجہی علم تجوید
کے لگنے دانتوں کے مسوڑھوں سے دال کے مخرج کے پاس سے ادا کرتے ہیں، اس لئے دال
کی طرح صوت شدیدہ مسموع ہوتا ہے، اس لئے اس سے مانوس ہو گئے ہیں، اور اگر صحیح طور
نکالا جاتا ہے تو وہ ظار کی صوت سے متشابہ ہو کر رخوہ ادا ہوتا ہے، اس لئے اس سے متوحش
ہوتے ہیں، اب ایک بات اور ضروری عرض کرتا ہوں وہ یہ کہ قرب و اتحاد مخارج کی وجہ
تشابہ فی الصوت پیدا نہیں ہوتا، اگر ایسا ہوتا تو ذال و تار میں اور ثار و ذال میں اور زار
و سین اور ء وہ میں ہوتا، باقی یہ بات مسلم ہے کہ قرب و اتحاد مخارج کی وجہ سے وہ حرف
آپس میں متقاربین و متجانسین کہلاتے ہیں، اگرچہ صوت میں بین امتیاز ہوتا ہے پس
قرب و اتحاد مخرج ہی کی وجہ سے وہ آپس میں ادغام ہوتے ہیں، نہ تشابہ صوت کی وجہ
سے، اور بُعد مخرج کی وجہ سے وہ متقارب نہ رہیں گے، اگرچہ صوت میں متشابہ ہوں،
پس جب متقارب نہ رہے تو ادغام بھی نہ کئے جاویں گے، اس سے معلوم ہوا کہ متجانسین
و متقاربین بھی ایک دوسرے کی جگہ جب کہ قاعدہ ادغام پایا جاوے تو ہر دو کو متماثل بنا کر
آپس میں ادغام کر دیئے جاویں گے، تو یہ بھی گویا ایک دوسرے کی جگہ پڑنے کا جواز
ثابت ہوا، باقی بادر بعد مخرج کے اور نہ پایا۔ جانے قواعد ادغام کے محض تشابہ صوت کی
وجہ سے وہ آپس میں ایک دوسرے کی جگہ کبھی نہ پڑھے جاویں گے، باقی یہ شبہ کرنا کہ جب
تشابہ صوت موجب اتحاد و قربت نہیں ہے تو پھر یہ تشابہ صوتی کیونکر پیدا ہوتا ہے، اس
کا جواب یہ ہے کہ تشابہ صوتی کا اصلی سبب یہ ہے کہ خاص کسی مخرج سے خاص کسی صفت ایک
یا چند کے ادا ہونے سے پیدا ہوتا ہے، پس بتیس دانتوں کا مخرج عام ہے، یعنی بتیس دانتوں
میں جتنے مخرج ہیں ان میں سے جو حرف صفت ہمس اور رخوہ سے موصوف ہو کر ادا ہونگے
تو ان کا صوت متشابہ ہوگا مثل س، ص، ث کے، پس اس تشابہ کو یہ لازم نہیں ہے کہ یہ

تینوں ایک ہیں، یا یہ اعتراف کرنا کہ س، ص، ث آپس میں متشابه ہیں، ایسا ہی مخرج حلق کو دیکھئے کہ جتنے مخرج حلق ہیں ان میں سے جو حروف صفت جہر و شدت سے موصوف ہو کر ادا ہوں گے، تو وہ آپس میں متشابه الصوت ہوں گے، جیسا کہ ع اور عین اگرچہ بینہ و لیقین بینیت، شدۃ اور رخوة کے ملنے سے پیدا ہوتی ہے، اور عین میں حصۃ شدۃ نے بالحاق صفت جہر کے حلق میں یہ اثر پیدا کیا، یعنی یہ سمجھو کہ جہر و شدۃ اگر ایک جگہ جمع ہو کر حلق سے ادا ہوں گی تو ایسی صوت پیدا ہوگی، حالانکہ ہمزہ کے قریب، تو یہ تھی، لیکن چونکہ وہ صفت ہمس سے متصف ہے، اس لئے متشابه ہمزہ نہ ہوئی، اور جو حروف صفت ہمس اور رخوة سے متصف ہو کر حلق سے ادا ہوں گے تو وہ بھی آپس میں متشابه صوت ہوں گے جیسا کہ ع اور ح اور اسی طرح جو حروف صفت رخوة اور جہر سے موصوف ہو کر حلق سے ادا ہوں گے تو وہ بھی آپس میں متشابه ہوں گے، جیسا کہ ع اور غ، عین میں جب کہ صفت رخوة کے حصہ کو کچھ زور دے کر ادا کیا جاوے گا تو عین مشابہ عین کے ہو جاوے گی، اور ازاں سوار عین چونکہ مفخم بھی ہے، اس لئے بتین فرق ہے، اور ایسا ہی ح اور خ میں تغخم حمیز ہے، پس عین اور حاء میں گلا نہ گھونٹنا چاہئے، ورنہ ع اور خ اور ح اور خ متشابه الصوت ہو جاویں گے، یہاں فقط یہ بتلانا منظور تھا کہ حلق میں سے جب صفت رخوة اور جہر مل کر ادا ہوں گی تو تشابہ پیدا ہوگا اگرچہ ادنیٰ ہی ہے، اسی طرح مخرج لعات میں سے جو حروف صفت شدت سے موصوف ہو کر ادا ہوں گے تو وہ بھی متشابه الصوت ہوں گے، جیسا کہ ق اور ک اور ک کو رخوة پڑھا جاوے گا، جیسا کہ بعض کی رائے ہے۔ تو پھر یہ تشابہ نہ رہے گا، ک نبطی اسی کو کہتے ہیں جو کہ کہہ سے متشابه ہوتا ہے، اسی طرح پڑھنا صحیح نہیں ہے بلکہ ک کو شدیدہ اور پست کر کے ہموسہ پڑھنا چاہئے تاکہ مجبور نہ ہو جاوے، جیسا کہ اکثر پڑھتی ہے، اب دانتوں کے مخرج میں سے اگر صفت جہر و استعلاء اور طباق کے ساتھ جب صفت شدۃ ملتی ہو کر ادا ہونے سے جو صوت پیدا ہوگی اس کے ساتھ وہ صوت بھی متشابه ہوگی جو کہ صفت ہمس اور شدۃ کے الحاق سے پیدا ہوگی، جیسا کہ طاء اور تاء اور جو حروف صفت جہر اور شدۃ سے بغیر استعلاء و طباق کے یا بغیر ہمس و شدت کے ادا ہوگا تو وہ طاء و تاء سے متشابه نہ ہوگا، جیسا کہ دال، اب دیکھنا چاہئے کہ طاء سے دال صفت جہر اور شدت اور اصمات اور قلقلہ میں متفق ہے، اور طاء سے تاء نفطاشہ

اور اصمات اور ان دونوں صفتوں میں متفق ہے، اور تاء دال سے صفت شرت اور استقال اور افتاح اور اصمات میں متفق ہے، چاہئے تھا کہ تاء دال سے متشابه ہوتی، لیکن چونکہ اوپر بتایا گیا ہے کہ خاص دانتوں میں سے جس حرف میں صفت جہر و شدۃ واستعلاء و اطباء کے اجتماع سے جو صوت پیدا ہوگی اس کے ساتھ اس حرف کی صوت بھی متشابه ہوگی، جو کہ صفت ہمن اور شرت سے متصف ہو کر دانتوں سے ادا ہوگی، اب دیکھو کہ اگر صوت کو قربت میں دخل ہوتا تو طاء اور تاء قریب تر ہوتیں، بہ نسبت تاء اور دال کے اگرچہ یہ تینوں آپس میں متجانس ہیں، لیکن قربت صفائی کی وجہ سے دال تاء میں ادغام ہوتی ہے، نہ طاء میں، اس سے معلوم ہوا کہ دال اور تاء آپس میں زیادہ تر متقارب ہیں بہ نسبت تاء اور طاء کے، پھر بھی سابق کلیہ کی وجہ سے طاء اور تاء میں تشابه صوت پایا گیا، اور باوجود قربت صفائی کے دال اور تاء میں بہ سبب نہ پائے جانے کلیہ سابقہ کے تشابه نہ رہا، روسکر یہ کہ اگر مخرج دانتوں میں سے جو حرف صفت ہمن اور رخوة سے موصوف ہو کر ادا ہوں گے وہ سب آپس میں متشابه الصوت ہوں گے، مثل ث، س، ص کے جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں، حالانکہ ث اور ذ متجانس ہیں، پھر بھی بہ سبب نہ پائے جانے کلیہ مذکورہ کے ان میں تشابه صوتی نہ رہا،

ایسے ہی اگر صفت جہر سے اور رخوة سے جو حرف موصوف ہو کر دانتوں سے ادا ہوں گے وہ سب آپس میں متشابه الصوت ہوں گے جیسے زاء، ذال، ظاء ضاد، حالانکہ زاء بہ نسبت ذال کے سین سے قریب تر ہے، لیکن چونکہ سین میں جہر نہیں ہے اس لئے تشابه نہ رہا، اسی طرح ضاد باعتبار مخرج کے دال کی نسبت قریب ہی، بہ نسبت ظاء کے، اسی وجہ سے بعض قراء نے ہر دو کو متقاربین قرار دے کر قد ضلوا میں ادغام کیا ہے، پھر بھی بسبب سابق کلیہ کے ضاد اور ظاء اور ذال اور زاء میں تشابه ہی، نہ ضاد اور ذال میں، پس اگر محض تشابه سے وحشت ہوتی ہے تو پھر طاء اور تاء سے بھی متوحش ہوں، اور اگر ضاد اور دال کے تشابه کو پسند کرتے ہو بسبب قربت کے تو پھر تاء اور دال کو بھی متشابه پڑھو، بسبب قربت بلیغ کے،

میرے اس سارے معروض کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ خاص مخارج میں اثر رکھا گیا ہے، کہ اگر فلاں صفت مفردہ یا بالحق فلاں صفت کے خاص فلاں مخرج سے ادا ہوگی تو

اس قسم کی صوت پیدا ہوگی، یہی وجہ ہے تشابہ صوتی کی، پس جب دانتوں سے صفت رخوة دہر سے جو حروف ادا ہوں گے تو وہ آپس میں متشابہ ہوں گے، اگرچہ سب میں تمیز بین موجود ہوتی ہے، گویا یہ سمجھو کہ ہر حرف پست کلام ہوگا بسبب صفت ہمس کے یا بلند کلام ہوگا بسبب صفت جہر کے، پھر اس کی پست کلامی اور بلند کلامی جاری ہوگی بسبب صفت رخوة کے یا بلند ہوگی بسبب صفت ثبوت کے پس خاص دانتوں کے مخرج میں یہ خاصیت رکھی گئی ہے کہ اگر اس سے جو حرف پست کلام بسبب ہمس کے اور اس کی ہمس جاری ہو کر نکلے گی بسبب رخوة کے تو ان کی صوت سا، سا، سا، کی طرح مسموع ہوگی، یہی وجہ ہے ث، س، ص کے متشابہ الصوت ہونے کی، اور اگر دانتوں کے مخرج سے جو حروف بلند کلام بسبب صفت جہر کے اور اس کی جہر جاری ہو کر نکلے گی بسبب رخوة کے تو اس کی صوت زا، زا، زا کی طرح سنائی دے گی، یہی وجہ ہے کہ جو حروف صفت جہر اور رخوة سے موصوف ہو کر دانتوں کے مخرج سے ادا ہوتے ہیں تو وہ آپس میں متشابہ الصوت ہوتے ہیں جیسے زار، ذال، ظار، ضار، پس جس طرح اور حروف متشابہ الصوت کا امتیاز مانتے ہو جیسے س، ص، ث کا ایسا ہی ضار، اور ظار، ذال اور زار کا تصور فرمائیے، واللہ اعلم،

کتبہ شیر محمد

حضرت مرشدی سلمہ کی خدمت میں ملاحظہ کے لئے بھیجا گیا تو یہ الفاظ ارقام فرماؤ
 خوب تحقیق اور نہایت مفید ہے۔ اشرف علی
 اور استادی قاری صاحب کی خدمت میں بھیجا گیا تو یہ ارقام فرمایا: ”مضمون متعلق
 تشابہ ضار و ظار دیکھ کر محظوظ ہوا ماشاء اللہ خوب لکھا ہے“ محمد یامین
 نفل کی سب رکعتوں اور فرضوں کی سوال (۹) نفل نماز میں سب رکعتوں میں سورت
 دو رکعتوں میں قرأت فرض ہے، پڑھنا فرض ہے، اور فرض نماز میں فقط دو رکعت
 اس کا کیا سبب ہے؟ میں سورت پڑھنا فرض ہے، اس کا کیا سبب ہے؟

الجواب؛ فرضیت قرأت آیت فَاَقْرَأْ وَاَمَّا تَتَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ سے ثابت ہے
 اور فرض کی تیسری اور چوتھی رکعت میں فرض فرض نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ سے روایا
 عدم وجوب قرینہ ہیں کہ یہ امر رکعت ثالثہ رابعہ کی بابت وجوب کے لئے نہیں، کما فی بحر الرقائق
 (ص ۵۶ ج ۲) وَاِنَّمَا لَمْ تَكُنِ الْقُرْآنُ فِي الْاٰخِرِيْنَ وَاجِبَةً فِي الْفَرْضِ كَمَا هُوَ

الصحيح من المذهب مع وجود الامر المذکور المقتضى للوجوب موجود صارف له عنه وهو قول الصحابة على خلافه كما رواه ابن ابى شيبه عن علي وابن مسعود قال اقرأ في الاوليين وسبح في الاخرين لكن ذكر المحقق في فتح القدير انه لا يصلح صارفا الا اذا لم يرد عن غيرهما من الصحابة خلاف والا فاختلاف في الوجوب لا يصرف دليل الوجوب عنه فالاحوط رواية الحسن رحمه الله بالوجوب في الاخرين انتهى وقد يقال ان مقتضاه لزوم قراءة ما تيسر في الاخرين وجوفاً لا تعيين الفاتحة كما هو رواية الحسن فليس موافقا لكل من الروایتين اذ قلت مقتضى الامر الوارد في الآية وجوب قراءة ما تيسر في الصلوة مطلقا ولا تعرض له بالركعة ولا الركعتين ولا الاوليين ولا الاخرين وانما قلنا بفرضية القراءة في الركعتين من الفرض لقيام الاجماع عليه ولا اجماع في الاخرين واما تعيين الاوليين للقراءة فواجب لا فرض بدليل قضاءها في الاخرين اذا تركها في الاوليين و دليل الوجوب في ذلك مواظبة النبي صلى الله عليه وسلم على ذلك من غير ترك، والله تعالى اعلم، ۲۶ رذيقه ۳۳

سوال (۱۰) مسئلہ: بہشتی گوہر (جدید) ص ۳۶، فجر، مغرب، عشاء کے وقت پہلی دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ اور دوسری سورۃ اور سمح اللہ لمن حمدہ اور سب تکبیریں امام بلند آواز سے کہے، اور منفرد کو قرأت میں تو اختیار ہے، مگر سمح اللہ لمن حمدہ اور تکبیریں آہستہ کہے، اور ظہر کے وقت امام صرف سمح اللہ لمن حمدہ اور سب تکبیریں بلند آواز سے کہے اور منفرد آہستہ اور مقتدی ہر وقت تکبیریں وغیرہ آہستہ کہے (ص ۲۹۵ ج ۱ شامی) اس مسئلہ میں منفرد کو قرأت میں سر اور جہر کرنے کا اختیار دیا گیا ہے، تین وقتوں میں (یعنی فجر، مغرب، عشاء) مگر سمح اللہ لمن حمدہ اور سب تکبیریں آہستہ کہنے کو لکھا ہے، شبہ یہ ہے کہ پرانے بہشتی گوہر میں تکبیر وغیرہ کا اختیاء مطلقاً لکھا ہے خواہ آہستہ ہو یا جہراً کہے، اور چونکہ اس مسئلہ کے الفاظ تغیر و تبدل کیا گیا، مگر حاشیہ میں کچھ نہیں لکھا کہ فلاں عبارت بڑھائی گئی ہے جیسا کہ شروع میں ہدایت کی گئی ہے کہ جو عبارت جدید بڑھائی جاوے گی اس کو حاشیہ میں تحریر کر کے

بتلا و یا جاوے گا کہ فلاں عبارت بڑھائی ہے، اس لئے تحقیق طلب ہے، فقط
الجواب: ہاں اس مسئلہ میں بہشتی گوہر سابق سے کچھ عبارت بدلی ہوئی ہے،
اور اس کی اطلاع حاشیہ میں اس لئے نہیں دی گئی کہ اس اطلاع کا التزام صرف
بہشتی زیور میں کیا گیا ہے، بہشتی گوہر میں اس کا التزام نہیں کیا گیا، ملاحظہ ہو دیباچہ
جدید بہشتی گوہر ص ۳۴، بہشتی گوہر قدیم میں صرف اتنی عبارت تھی کہ منفرد کو اختیار
ہے جس سے جہر تکبیر و تسمیع و تحمید میں بھی اختیار کا ایہام ہوتا تھا، حالانکہ منفرد
کو صرف جہر قرأت کا اختیار ہے، تکبیرات و تسمیع وغیرہ کا جہر اس کے لئے مشروع
نہیں، اس لئے اس مرتبہ عبارت میں ترمیم کر دی گئی، اور دلیل اس ترمیم کی درمختار
مع الشامی بیان سنن الصلوٰۃ ص ۲۹۵ ج ۲ مطبوعہ ۱۳۹۲ھ میں مذکور ہے و نصہ و
جہر الامام بالتکبیر یقیناً حاجتہ للاعلام بالمدخول والانتقال و کذا
بالتسمیع والسلام و اما المؤتم و المنفرد فیسبح نفسه ام، اس میں صراحت
جہر و تکبیرات و تسمیع و سلام کو امام کے ساتھ خاص کیا گیا ہے، اور منفرد کو اس بارے
میں مقتدری کی طرح اخفاء کا حکم کیا گیا ہے، اور فصل قرأت جو کہا گیا ہے و یخیر
المنفرد فی الجہر و هو افضل ان ادى الخ وہاں صرف جہر بالقرأت میں تخییر مراد ہے
جیسا کہ سیاق سے ظاہر ہے فافہم، یکم محرم الحرام ۱۳۹۲ھ

قرأت خفی کی حالت میں سانس | سوال (۱۱) اثناء نماز قرأت خفی کی حالت میں سانس
لیتے ہوئے قرأت جاری رکھنا | لیتے ہوئے قرأت کا جاری رکھنا جبکہ کوئی فتور قرأت میں

نہ پڑے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر قرأت میں فتور نہ آئے تو جائز ہے ورنہ مکروہ ہے، ۲۶ شعبان ۱۳۹۲ھ
قرأت فاتحہ کے بعد نماز میں سجدہ کسی اور سورۃ | سوال (۱۲) نماز میں سورۃ فاتحہ کی قرأت کے
کے خود سورۃ فاتحہ کا قصد یا سہواً ضم کرنے کا حکم | بعد بجائے کسی اور سورۃ کے ضم کرنے کے خود
سورۃ فاتحہ ہی ضم کرنا عمدتاً یا سہواً کیسا ہے،

الجواب: قال فی شرح المنیۃ ولو کسر الفاتحة فی رکعة من الاولین
متوالیا و قرأ القرآن فی رکوعه اوفی سجوده اوفی موضع التشهّد یجب
علیه سجود السہول للتمام تاخیر الواجب و هو السورۃ فی الصورة الاولى

والقراءة فیما لم یشرع فیہ فیما بعدہ والتحرز عن کل ذلک واجب ولو قرأ الفاتحة ثم السورة ثم الفاتحة لا یلزمہ السهو وقیل یلزمہ ام (ص ۲۳۳) وفي الدر فی واجبات الصلوة ویجب تقدیم الفاتحة علی کل السورة وکن اترك تکریرها قبل سورة (الركعتین) الاولین ام (ص ۱۳۰۹) وفيه ایضا وحفظ فاتحة الكتاب وسورة واجب علی کل مسلم ام قال الشافعی ای اقصر سورة او ما یقوم مقامها من ثلاث آیات قصار ام (ص ۱۳۰۹) قلت فلو كان إعادة الفاتحة بنية الضم تنوب عن وجوب السورة لم یکن حفظ سورة ماعدا الفاتحة واجبا و قال الطحاوی فی حاشیة علی مرقی الفلاح ولو قرأ الفاتحة علی قصد الدعاء تنوب عن القراءة كما فی الفتاوی الصغری (ص ۱۲۲) وفيه اشعار بان النية لا اثر لها، پس جس شخص کو فاتحہ کے علاوہ سورة یا آیات یاد نہ ہوں اس کو فاتحہ کا بنیت حکم پڑھنا مکروہ ہے، اس سے واجب ادا نہ ہوگا، کیونکہ ضم سورة علاوہ فاتحہ کے واجب ہے، اور جب کو یاد نہ ہو وہ بعد فاتحہ کے تسبیح پڑھے، تکرار فاتحہ سے سحرة ہو لازم ہوگا، واللہ اعلم، ۱۳ اشوال مسکلم

تراویح میں ختم قرآن کے موقع | سوال (۱۳) تراویح میں ختم قرآن میں تین بار قل هو اللہ کا پرتکرار قل هو اللہ کیسا ہے، پڑھنا کیسا ہے، پورے قرآن کو ایک مرتبہ اور قل هو اللہ کو تین بار پڑھنا اس امر کی بین دلیل ہے کہ قاری اس سورة کو دوسرے قرآن پر فضیلت دیتا ہے،

الجواب؛ قال فی شرح المنیة وقراءة قل هو اللہ احد ثلث مرات عند ختم القرآن لم یستحسنها بعض المشایخ وقال الفقیہ ابوالمیث هذا شیء استحسنه اهل القرآن وائمة الامصار فلا بأس به الا ان یكون الختم فی المکتوبة فلا یزید علی مرة ام (ص ۲۶۳) لیکن اگر تکرار کا التزام ایسا ہو گیا ہے کہ اس کے ترک پر ملامت ہوتی ہے تو اس کا ترک کرنا ضروری ہے، کما ہو مقتضی التزام المباح والمستحب، ۱۳ اشوال مسکلم

دوسورتوں کے درمیان | سوال (۱۴) پہلی رکعت میں ایک سورة پڑھی، جیسے ترک سورة مکروہ ہے | لم یکن الذین اور دوسری رکعت میں درمیان میں سے ایک

سورۃ جیسے اذالزلت الارض چھوڑ کر اور ایک سورۃ جیسے العادیا پڑھو تو اس صورت میں نماز مکروہ ہوگی یا نہیں اور زیچ میں کتنی چھوٹی سورۃ چھوڑنے سے نماز مکروہ ہوتی ہے، اور اس کی مقدار کیا ہوتی ہے؟ تحریر فرمائیے الجواب: یہ صورت اگر قصد کی جائے تو مکروہ ہے، سہواً ہو جائے تو کراہت نہیں، درمیان میں ایک سورۃ کا چھوڑنا اس وقت جائز ہے جبکہ وہ اتنی بڑی سورۃ ہو کہ اس کے پڑھنے سے رکعت ثانیہ رکعت اولیٰ سے بہت لمبی ہو جائے، اور قدرے طول کا مسانقہ نہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولیٰ میں سبح اسم ربک اور ثانیہ میں سورۃ الفاشیہ پڑھی ہے، اور وہ سبح اسم ربک سے طویل ہے مگر اطول نہیں، پس ایسی صورت میں ترک مکروہ ہے، پس سورۃ القدر پڑھ کر سورۃ الزلزال پڑھنا جائز ہے، کیونکہ کلمات و حروف میں سورۃ لم یکن الذین کفرو ان دونوں کے برابر ہے، اس کے عدم ترک سے رکعت ثانیہ بہت طویل ہو جائے گی، پس اس کا ترک مکروہ نہیں، اور سورۃ لم یکن پڑھ کر والحدیث پڑھنا مکروہ ہے، کیونکہ سورۃ الزلزال اتنی لمبی نہیں کہ رکعت ثانیہ طویل ہو جائے، پس اس کا ترک مکروہ ہے، قال فی مل فی الفلاح مع الطحطاوی

ویکیرہ فصل بسورۃ بین سورتین قرأھما فی رکعتین لما فیہ من شبهة التفضیل والہجرو قال بعضهم لا یکرہ اذا کانت السورۃ طویلة لانھا بمنزلة سورتین قصیرتین (کما لو کان بینھما سورتان قصیرتان ام، وفي الشامی ص ۱۰۰) او یکرہ الفصل بسورۃ قصیرۃ اما بسورۃ طویلة حیث یلزم منه الحالة الركعة الثانیہ اطالة کثیرۃ فلا یکرہ شرح المنیۃ ام قلت وهذا هو الذی قالہ سیدی حکیم الامتہ بنوقہ وحاصلہ ان القاری معذور فی ترک مثل هذه السورۃ الطویلة شرعاً و لیس بمعذور فی ترک القصیر فافہم، واللہ تعالیٰ اعلم، ۲۲ رجب سنہ ۱۲۸۵ھ

سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ”سنة من قدارسلنا“ سوال (۱۵) ایک شخص نے سورۃ بنی اسرائیل سے قرأت کی ابتداء کرنا خلافت اولیٰ ہے، سے قرأت اس طرح کی کہ سنة من قدارسلنا قبلک من رسلنا سے ابتداء کی، اور اس کے بعد ختم رکوع تک پڑھتا چلا گیا، نماز کے بعد زید نے کہا کہ نماز فاسد ہو گئی، کیونکہ معنی متغیر ہو گئے، اگر وہ ان کا دوا لیستغفرونک سے ابتداء کی جاتی تو نماز درست ہو جاتی، عمرو نے کہا کہ نماز اب بھی درست ہو گئی ہے،

اعادہ واجب نہیں پس فیصلہ فرمایا جائے کہ ان دونوں میں صحیح قول کس کا ہے ؟
الجواب ؛ اس طرح قرأت کرنا خلافت اولیٰ ضرورت تھا لکن الوصل بین الحال و
 ذی الحال احسن مگر نماز صحیح ہو گئی، اعادہ کی ضرورت نہیں، لکن فوصل الاکافی انفسہما مقاطع
 فاذا جاز الوقت علی قوله الا قلیلا جاز الابداع بقوله سنة من قد ارسلنا ایضا
 لجواز الفصل بین الحال و ذی الحال کقولہ تعالیٰ صبغة الله و هو حال من قوله
 بل ملة ابراهيم حنیفاد علی قول و هو کما تری منصوص (والله تعالیٰ اعلم)
 ۱۸ رجب سنہ ۱۳۲۷ھ

قرآن میں قصار و ساط اور طوال کی رعایت | سوال (۱۶) فجر و ظہر میں طوال عصر و عشاء میں ساط
 مسنون ہے یا مستحب اور ان کی تفصیل کیا ہے ! اور مغرب میں قصار کی قرأت مستحب یا مسنون ہے ؟
 مگر کہاں سے کہاں تک طوال اور کہاں سے کہاں تک و ساط اور کہاں سے کہاں تک
 قصار ہے ؟

الجواب ؛ یہ رعایت مسنون ہے، کیونکہ حضرت عمرؓ نے اپنے عمال کو بذریعہ خطوط
 کے اس کی تاکید فرمائی ہے، اور احادیث مرفوعہ سے بھی اس کی تائید ملتی ہے؛

والطوال من قی الی البروج والاساط منها الی لم یکن والقصار منها
 الی اخر القرائن ان هذا هو المشهور بین الحنفیة وفيه اقوال اخر ایضا، ۲۰ شعبان
 نماز میں سورۃ الشقاق پڑھنے کا حکم | سوال (۱۷) فرضوں میں اقرآن سورۃ الشقاق، یعنی

سجدہ والی سورۃ ارادہ پڑھنی کیسی ہیں، اور ان کے پڑھنے سے نماز ہو جاتی ہے یا نہیں ؟
الجواب ؛ اگر مقتدری زیادہ نہ ہوں تو سورۃ الشقاق پڑھنے میں کچھ کراہت نہیں
 اور اگر زیادہ ہوں (جن کے اشتباہ میں پڑنے کا اندیشہ ہو) تو سورۃ الشقاق (اور اسی
 طرح وہ سورتیں جن میں آیت سجدہ کے بعد تین آیتیں ہوں ان کا) پڑھنا مکروہ ہے،

حکم قرآن بسم اللہ بین الفاتحة والسورة | سوال (۱۸) قرآن بسم اللہ بین الفاتحة والسورة کو
 علامہ شامیؒ نے حسن کہا ہے، (وقوله ولا تکره اتفاقا) ولہذا اسریم فی الذخیرۃ
 والمجتبیٰ بانہ ان سہی بین الفاتحة والسورة المقرؤة سراً و جہراً کان
 حسناً عند الی حنیفة و رجحہ المحقق ابن الہمام و قلمیذہ العلیٰ بشمہ
 الاختلاف فی کونہا آیت من کل سورة، بحر (شامی ص ۳۶۲ ج ۳، مصری)

لیکن اسی کے اوپر جو عبارت ہو وہ یہ ہے کہ (قولہ لا تسن) مقتضی کلام المتن ان يقال لا یستی لکنہ عدل عنہ لایہامہ الکراہۃ بخلاف نفی السنیۃ ثم ان ہذا قولہما وصحہ فی البدائع قال محمد تسن ان خافت لان جہر جرو نسب ابن الضیاء فی شرح الغر نویۃ الاول الی ابی یوسف فقط فقال وھذا قول ابی یوسف و ذکر فی المصنف اور الفتوی علی قول ابی یوسف انہ یسمی فی اول کل رکعة ویخفیہا و ذکر فی المحيط المختار قول محمد وھو ان یسمی قبل الفاتحة وقبل کل سورة فی کل رکعة وفی رواية الحسن ابن زیاد انہ یسمی فی الركعة الاولى لا غیر وانما اختیار قول ابی یوسف لان لفظۃ الفتوی اکد وابلغ من لفظۃ المختار ولان قول ابی یوسف وسط وخیر الامور اوسطھا کذا فی شرح عمدة المصلی ۱۱ شامی جلد ۱ ص ۳۱۲ مصری اور عالمگیری کتاب الصلوة باب چہارم صفت نماز کی فصل نماز کی سنتوں اور اس کے آداب کے بیان میں ہے ”تعوذ کے بعد آہستہ بسم اللہ پڑھے اور بسم اللہ قرآن کی ایک آیت ہے“ سورتوں میں فصل کے واسطے اُتری ہے، یہ ظہیر یہ میں مکروہاتِ صلوة کے بیان میں لکھا ہے؛ صرف بسم اللہ سے فرض قرأت ادا نہیں ہوتا، یہ جوہرۃ النیرۃ میں لکھا ہے؛ بسم اللہ ہر رکعت کے اول میں پڑھے، یہ امام ابو یوسف کا قول ہے، یہ محیط میں ہے، اور حجتہ میں ہے کہ اسی پر فتویٰ ہے، یہ تاتارخانیہ میں ہے، فاتحہ اور سورۃ کے درمیان میں بسم اللہ نہ پڑھے، یہ وقایہ میں اور نقایہ میں لکھا ہے، یہی صحیح ہے، یہ بدائع اور جوہرۃ نیرہ میں لکھا ہے، فتاویٰ ہندیہ ترجمہ فتاویٰ عالمگیریہ صفحہ ۹۹ جلد ۱ مطبوعہ نوکشمورشہ ۱۳۲۵ھ،

افسوس ہے کہ فتاویٰ عالمگیریہ اصل عربی میں یہاں موجود نہیں ہے، میں نے حوالہ میں کتاب الصلوة اور باب اور فصل درج کردی، حضور اصل عربی میں ملاحظہ فرمائیں، عبارت عالمگیریہ سے صاف واضح ہے کہ بین الفاتحہ والسورة بسم اللہ نہ پڑھے، اور لفظ فتویٰ اور لفظ صحیح کافی دوانی طور پر اس کے دلائل ہیں، اور عبارت شامی میں وانما اختیار سے خط کشیدہ عبارت بین الفاتحہ والسورة بسم اللہ نہ پڑھنے کے اوپر دلالت صریحہ کر رہی ہے،

اس کے باوجود کہ لفظ لفظۃ الفتوی اکد وابلغ کے مقابلہ میں قول مختار امام محمد کا بھی چھوڑ دیا گیا، اور امام ابو یوسف کا قول اختیار کیا گیا، بہشتی زیور میں بسم اللہ پڑھنا لکھا ہے

”بسم اللہ پڑھ کر الحمد پڑھے اور ولا الضالین کے بعد آمین کہے، پھر بسم اللہ پڑھ کے کوئی سورۃ پڑھے، بہشتی زیور مدلل و مکمل حصہ دوم ص ۲۲) تو کیا فتویٰ کے مقابلہ پر حسن پر عمل کیا جائیگا۔ حالانکہ نہ پڑھنے کو صحیح کہا گیا ہے ”عالمگیری“ تو سوال یہ ہے کہ اول تو بہشتی زیور سے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ بسم اللہ کا پڑھنا بطور مباح کے ہے یا بطور سنت کے پڑھنے کو لکھا ہے لیکن پھر بھی فتویٰ آکد و بالغ کے مقابلہ پر حسن کا اختیار کرنا سمجھ میں نہ آیا، حضور والا تسلی و تشفی فرما کر احسانِ عظیم فرمادیں، اب تک میرا عمل نہ پڑھنے پر ہے، اور یوں ہی دوسروں کو مسئلہ بتاتا ہوں، ہاں البتہ جب میں تراویح میں ختم کرتا ہوں تو بسم اللہ بین السورتین کر لیتا ہوں بسبب تصادم روایت عامہ کے کہ بروایت اُن کے ہر سورۃ کے شروع میں بسم اللہ سنت ہے، و بسم بین السورتین سنتہ و درایتہ و تخملاً، تاکہ قرآن کے نقص کا احتمال نہ رہے، اور ایسا ہی آپ نے فتاویٰ امدادیہ میں جواب دیا ہے اسی قسم کے ایک سوال کا، لیکن یہ بات عام نمازوں میں تو نہیں، پھر بھی فتویٰ کو چھوڑ دینا کیسا، بینوایانِ دلائل تو جروا با الفضائل الجواب، قول ابی یوسفؒ پر فتویٰ ہے، نے کا یہ مطلب کہ تسمیہ قبل سورۃ کو مسنون نہ کہا جاوے گا، لیکن بنا بر مزید احتیاط اس کو حسن سمجھ کر پڑھ لیا جاوے تو اس فتوے کے خلاف نہیں ہے، کمالاً بخفی،

اور بہشتی زیور میں جو ترکیب نماز کی بیان کی ہے، اس میں دوسرے افعال کے مسنون وغیرہ ہونے سے بھی تعرض نہیں جو ان میں تصریح کی حاجت ہوتی، وفي الطحاوی علی المراقی الفلاح (ص ۱۵۱) عن الکمال و تلمیذہ ابن امیر حاج ان الخلاف فی السنۃ فلا خلاف انه لو سمی لکان حسناً لشبهة الخلاف فی کون ایتہ من کل سورۃ الخ، باقی رہا سوال تراویح میں ہر سورۃ کے شروع پر بسم اللہ پڑھنے کا، اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ مولانا مدنی و ضہم و نیز دیگر اکابر کا یہی معمول ہے کہ ہر سورۃ پر بسم اللہ نہیں پڑھتے، بلکہ تمام قرآن میں فقط ایک سورۃ کے شروع میں پڑھتے ہیں، کیونکہ تسمیہ آیت من القرآن ہے، نہ کہ آیت من کل السورۃ، اور احکام نماز میں ائمۃ الفقہ کے قول پر عمل کرنا چاہئے، اور امام عاصمؒ کا قول خارج صلوٰۃ قابل عمل ہے، و نیز امام عاصمؒ کی روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بسم اللہ کو بحیثیت جزء القرآن ہونے پڑھتے تھے، لہذا ختم قرآن میں مشبہ نہ کیا جاسے، بیش بریں نیست کہ ان کے نزدیک جو چیز مسنون تھی وہ ترک ہو گئی،

عہ اور امداد الفتاویٰ میں،

سواس کا مضائقہ نہیں، کیونکہ ہم فقہ میں اُن کے مقلد نہیں ہیں، اور نماز چہرہ میں امام محمدؒ بھی تسمیہ کے قائل نہیں، اس لئے تسمیہ بین السورتین کو جو حسن کہتے ہیں اُن کے نزدیک بھی تراویح میں ہر سورۃ پر بسم اللہ پڑھنے کی گنجائش نہیں ہے، واللہ اعلم بالصواب،

احقر عبد الکریم عفی عنہ | الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ ۲۰ رمضان ۱۳۸۸ھ

سوال (۱۹) اکثر لوگ ضاد کی جگہ دال پڑھتے ہیں، اور ضاد کی جگہ کی اقتداء کا حکم، اور ثاء کی جگہ سین اور ظاء کی جگہ ذال اور زاء پڑھ لیتے ہیں، اور فقہاء

کی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو حرف مشتبہ الصوت ہیں اور ان میں فرق بلا مشقت کے حاصل نہیں ہوتا ہے تو متاخرین کے نزدیک نماز ہو جاتی ہے، تو کیا ضاد اور دال میں بھی فرق مشکل ہے، بلا مشقت اس میں امتیاز نہیں ہو سکتا ہے، جو اکثر لوگ ایسا ہی پڑھتے ہیں، اس میں فرق نہ کرنے سے نماز ہو جائے گی، احقر اس میں بہت متردد رہتا ہے، کہ غیر المغدوب اور ولا الدالین پڑھتے ہیں، یعنی ض کو دال کے مخرج سے ادا کرتے ہیں تو اس صورت میں قاضی خاں فرماتے ہیں ولو ترا الدالین بالدال تفسد صلوٰۃ، اور کبیری میں ہے لا تفسد صلوٰۃ، اور یہی تردد کا باعث ہے، تو کس کا قول معتبر مانا جائے البتہ شامی میں اس کی تصریح کر دی ہے، کہ متاخرین کا مذہب اوسع ہے اور متقدمین کا قول احوط ہے، اور اسی بناء پر جب مجھ کو تحقیق تمام ہو جاتی ہے کہ دال ہی پڑھا گیا ہو تو نماز کو لوٹا لیا کرتا ہوں، پس امید ہے کہ اس تردد سے احقر کی رہائی فرمادیں گے،

الجواب: اس مسئلہ میں احوط متقدمین کا قول ہے، مگر ابتلاء عام کی وجہ سے فتویٰ اس پر دیا جاتا ہے کہ ضاد کو دال پڑھنے والے کے پیچھے نماز صحیح ہو جاتی ہے، بشرطیکہ وہ اس وقت صحیح مخرج ادا کرنے پر قادر نہ ہو، اور اگر قادر ہو اور محض سستی کی وجہ سے غلط پڑھتا ہے تو نماز فاسد ہے، یہ تو نماز کا حکم ہے، اور خود اس شخص کے لئے یہ حکم ہے کہ اس پر تصحیح مخرج واجب ہے، اگر اس کی کوشش نہ کر گیا گنہگار ہوگا، واللہ اعلم، شوال ۱۴۱۰ھ

سوال (۲۰) امام سے قرأت میں حسب ذیل غلطیاں ہوں تو فاسد ہوگی یا نہیں؟ بصورت اولیٰ نماز دہرانا ضروری ہے یا نہیں؟

(۱) اگر ماوِز عاک کو ماوِز عاک پڑھے تو نماز فاسد ہوگی یا نہیں؟

(۲) مَنْ عَمِيَ بَحْتِي مِنْ مَنْ تَابَتْ بَحْتِي پڑھنا موجب فساد ہے کہ نہیں؟
 (۳) اتما یحشی اللہ من عبادہ العلماء میں لفظ "اللہ" کو پیش سے پڑھنے سے فساد ہوگا کہ نہیں؟
 (۴) عصفی فرعون الرسول میں فرعون کو زبرد اور الرسول کو پیش سے پڑھے تو نماز ہوگی یا نہیں؟
 (۵) وَلَا الضَّالِّینَ کو وَلَا الضَّالِّینَ، ض کے پیش اور ض کے بعد ۶ (ہمزہ) اور مد کیساتھ پڑھنا مفسد نماز ہے کہ نہیں؟

یہ آخری غلطی نام ہے، کیا اس صورت میں نماز دہراتا پڑے گی؟
الجواب؛ (۱) دال پر ضمیمہ پڑھنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی، کما فی رد المحتار تحت قول الدر (فلو فی اعراب الی قولہ لم تفسد) ککسر قوا مکان فتحا وفتح بار نعبدہ، لیکن عین کے بعد الف کے اسانہ میں تغیر فاحش پیدا کرتا ہے، یعنی مفرد کو تشنیہ بنا دیتا ہے، اور تشنیہ کا استعمال حق تعالیٰ شانہ کے حق میں کسی طرح جائز نہیں، اور اشباع کا یہ موقع نہیں اور فقہاء نے اس کی تصریح کی ہے کہ کسی حرف کے بڑھا دینے سے اگر معنی میں تغیر ہو جائے تو نماز فاسد ہو جاتی ہے، لہذا یہ غلطی فسادِ صلوٰۃ کا موجب ہے، البتہ اگر بکثرت اس قسم کی غلطی واقع ہوتی ہو تو عموم بلوئی کے سبب فساد کا حکم نہ دیا جاوے گا، اور صلوٰۃ فاسدہ کا اٹھا ضروری ہونا محتاج بیان نہیں،

(۲) یہ غلطی بھی فی نفسہ موجب فساد ہے، لتغیر المعنی، ولیکن عموم باری کے سبب عدم فساد کا فتویٰ دیا جاوے گا،

(۳) اس غلطی کو شامی نے متقدمین کے نزدیک مفسدِ صلوٰۃ فرمایا ہے، جبکہ ہمزہ علماء کو مفتوح بھی پڑھا ہو اور اگر مفتوح نہ پڑھا ہو بلکہ مضموم یا موقوف پڑھا ہو تو مفسد نہیں، کیونکہ اس کا مفعول ہونا مشتبہ ہو گیا، ولیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تغیر کو فاحش کہنا یعنی الذی یكون اعتقاده کفرًا صحیح نہیں، کیونکہ خشیت صرف خوف کے معنی میں منحصر نہیں، بلکہ دوسرے معانی میں بھی مستعمل ہے، چنانچہ قول خداوندی فحشینا ان یرہقہما میں اصل معنی مراد نہیں، بعض نے علمنا سے اس کی تفسیر اور بعض نے کرہنا سے، اسی طرح یحشی اللہ میں زحشری وغیرہ نے رفع کی قرأت (شاذہ) نقل کی ہے، اور صاحب روح المعانی نے خشیتہ کو تعظیم پر محمول کیا ہے، و نیز ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ خشیت کے معنی اختیار (یعنی اجتناب) کے بھی آتے ہیں، پس جب اس غلطی کے

ہوتے ہوئے ایک صحیح معنی ہو سکتے ہیں تو متقدمین کے قول پر بھی نماز فاسد نہ ہوگی واللہ اعلم
اور متاخرین کے قول میں تو بہت گنجائش ہے، کہ باوجود تغیر فاحش کے بھی فساد صلوٰۃ کا حکم
نہیں کرتے، حاصل یہ کہ اس غلطی سے نہ متقدمین کے قول پر نماز فاسد ہوگی نہ متاخرین کے
قول پر، واللہ اعلم بالصواب،

(۴) یہ غلطی متقدمین کے قول پر موجب فساد ہی، لیکن متاخرین کے نزدیک موجب
فساد نہیں، اور قول متاخرین پر فتویٰ ہونا خلاصہ میں نوازل سے منقول ہے، لہذا عوام کے
واسطے اسی میں سہولت ہے، لیکن اگر اس قسم کی غلطی بکثرت واقع نہ ہوتی ہو تو عادیہ نماز
کا کر لیا جاوے، لیکن قول متقدمین احوط و اوفق بالقیاس ہے،
(۵) اس سے بھی نماز فاسد نہیں ہوتی، کیونکہ اس سے معنی متغیر نہیں ہوتے،

کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ ۲۱ محرم ۱۳۵۲ھ

حکم چہر بسم اللہ در سورۃ اقرأ | سوال (۲۱)

..... زید نے رمضان شریف میں نماز تراویح میں بروز ختم قرآن شریف سورۃ
اقرأ شروع کرتے وقت زور سے بسم اللہ الرحمن پڑھی تو عمر نے اس پر اعتراض کیا کہ نہ پڑھنا
چاہئے، اور کہتا ہے کہ قرآن شریف تسلسل کے ساتھ پڑھا جا رہا تھا، بسم اللہ کو درمیان
میں کیوں حائل کیا، زید کہتا ہے کہ بسم اللہ جزو قرآن ہے، اگر میں بسم اللہ جہر کے ساتھ
نہ پڑھتا تو ایک جزو قرآن شریف کا رہ جاتا، لیکن عمر زید کی اس گفتگو پر یقین نہیں کرتا
اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ زید کا یہ فعل کس حد تک صحیح ہے اور کس کی بات تسلیم کیجئے
اگر دونوں راہ حق پر نہیں ہیں تو براہ شرع شریف جو حکم ہو اس سے آگاہی فرما کر طمانیت
بخشی جائے،

الجواب: زید کا قول صحیح ہے، تمام قرآن میں ایک جگہ کسی سورۃ پر بسم اللہ کا
جہر لازم ہے تاکہ ختم پورا ہو جائے، اور سورۃ اقرأ پر جہر کرنا ہمارے اکابر کا مختار ہے، کیونکہ
یہ سورۃ نزول میں مقدم ہے، اور عمرو کا یہ کہنا کہ اس سے تسلسل قرآن جاتا رہا بالکل
غلط ہے، کیونکہ بسم اللہ بھی تو قرآن ہی ہے، پس قرآن کی آیت سے تسلسل قرآن میں
کیوں کمی آجائے گی، ۲، ذیقعدہ ۱۳۵۲ھ

دور کعتوں میں ایک چھوٹی سورۃ پڑھنا | سوال (۲۲) زید نے نماز تراویح میں آریٰ الذی

ہیں دو رکعت اس طور پر کہ پہلی رکعت میں لفظ ”مسکین“ تک اور دوسری رکعت میں ختم تک آیا یہ دو رکعتیں ہونیں یا نہیں، اگر نہیں ہونیں تو اب اس کی مکافات کیا ہو سکتی ہو؟
الجواب: یہ دونوں رکعتیں صحیح ہو گئیں، مگر ایسا کرنا مناسب نہ تھا، ایسی چھوٹی سورتوں میں دو رکعتیں ایک سورۃ کے اندر نہ کرنا چاہئے، کہ اس صورت ہر رکعت میں تین آیات نہیں ہوں
حکم تکرار قل ہواللہ احد | سوال (۲۳) قل ہواللہ کے بارے میں مشہور ہے کہ تین مرتبہ پڑھنا مسنون ہے، اگر کوئی شخص صرف ایک مرتبہ تلاوت کرتا ہے تو اس پر اعتراض کیا جاتا ہے، اس بارہ میں جو شرع شریف کا حکم ہو اس سے آگاہی بخشی جاوے۔

الجواب: تکرار قل ہواللہ فی نفسہ مباح ہے، مگر جہاں ترک تکرار اعتراض ہوتا ہو وہاں ترک لازم ہے، تاکہ لوگ اس کو واجب نہ سمجھ لیں، واللہ اعلم، ۲ رذیقہ درس ۲۵
مسئلہ قرآن | سوال (۲۴) زید نے

مغرب کی نماز میں امام بن کر دوسری رکعت میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کے بعد سورۃ مزمل کی آخر کی آیتوں میں سے واقموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ واذروا اللہ قرآنًا حسناً واما تقدوا لانفسکم من خبر نجد وہ عند اللہ ہو خیر او اعظم اجراء واستغفروا اللہ، ان اللہ غفور الرحیم تک جہاں تین جگہ ط اور اخیر میں ہ علامت آیت موجود ہے، پڑھی، اور باقی رکعت کو حسب دستور ادا کیا، فاتحہ کے بعد اسی قدر آیت قرآنی پڑھنے سے اس کی نماز صحیح ہوئی یا نہیں، بینوا توحیدوا،

ہو المصوب، صورت مسئلہ عنہا میں زید کی نماز مع الکرہتہ صحیح ہوئی، کیونکہ اس کو پہلی دو رکعت میں فاتحہ کے بعد ایک سورۃ یا چھوٹی تین آیتیں یا بڑی ایک آیت پڑھنا واجب تھا، لیکن اس نے قصداً ایک آیت سے بھی کم پڑھ کر واجب کو ترک کیا، اس لئے اس پر نماز پھر پڑھنی واجب ہے، اور نماز کو اعادہ نہ کرنے سے وہ فاسق اور گنہگار ہوا، چنانچہ فتاویٰ عالمگیری وغیرہ کی عبارت اس پر شاہد ہے، عالمگیری میں ہے
ویجب قراءة الفاتحة وسورة السورة او ما يقوم مقامها من ثلاث ايات قصار او اية طويلة في الاوليين بعد الفاتحة كذا في التمهيد الفائق انتهى، اور در مختار میں ہے، ولها واجبات لا تقصد بتركها وتعاد وجوباً في العمد والسهو وان لم يسجد له وان لم يعدها يكون فاسقاً اشأ انتهى، اور شامی میں ہے تحت

قلہ۔ وتعاد وجوباً ای بترك هذه الواجبات او واحد منهما انتهى، اور ہدایہ کے مکرراً
 الصلوة میں ہے والصلوة جائزۃ فی جمیع ذلك للاستجماع شل لظہا وتعاد علی وجہ
 غیر مکررہ وهو الحکم فی کل صلوة ادیت مع الکراہۃ کما اذا ترك واجبا من
 واجبات الصلوة انتهى، اور جامع الرموز میں ہے وواجبها قراءة خصوص الفاتحة
 وضم مقدار سورة من آية طويلة او ثلث قصار، وفي الكلام اشارة الى انه
 يجب تاخير السورة عن الفاتحة والى انه يجب ان يقرأ مرة كما في المحيط،
 والى انها واجبة ولذا كان تاركها يؤمر بالاعادة كما في الفتنية والى ان
 نفس السورة واجبة ايضا كما قال القاضی فی الجامع راس کے بعد محیب نے اوقات
 قرآن کی بحث طرڈا بھی ہے ہم نے اختصاراً حذت کر دیا، اس لئے صورت مستول عنہا میں
 امام مذکور کی قراءت میں بعد فاتحہ کے ایک آیت بھی نہیں پائی گئی، کیونکہ وہاں تین جگہ ط
 اور اخیر میں ہ علامت آیت موجود ہے، اسی سبب وہ تارک واجب ہوا، اور پھر نماز کو
 اعادہ نہ کرنے کی وجہ سے شرعاً فاسق اور گنہگار بھی ہوا، لہذا حکم الكتاب واللہ اعلم بالصواب
 والیہ المرجع والمآب، حورہ الراجی رحمۃ ربہ الولی محمد مصطفیٰ علی لکوشا کالوی
 اقول وبالله التوفیق وبینہ ازمة التحقيق، الجواب جواب لا یمثل جواباً
 والمنکر علی خلاف الصواب، لان البعض قد استشكل بعبارۃ الہندیہ والشامی
 حیث حررت فی مقامہنا انہ لو قرأ بعض آية الكرسي فی ركعة والبعض فی
 ركعة اخرى لا يجوز عند الامام وعند العامة يجوز ويكتفى فلا تثبت من قول
 الجواز والكفاية الصحة الكاملة لترك الواجب وهو قراءة الآية التامة
 فی ركعة واحدة فعليه ان يعيد وجوباً فی العمد والسهوان لم يسجد له و
 ان لم يعدها يكون فاسقاً لئلا كما فی الوقایہ فرض القراءة آية و
 المكفی بہا مسمی لترك الواجب وفي القدوري يقرأ فاتحة الكتاب وسورة
 او ثلاث آيات من أي سورة شاء، وفي الذخيرة قراءة ثلاث آيات قصاراً
 او آية طويلة من واجبات الصلوة بالاجماع فلو قرأ مع الفاتحة آية قصير
 سهواً فعليه السهو وفي الہندیۃ لو قرأ اقل من آية وان كان حرفاً يكره وفي
 الدر المختار كل صلوة ادیت مع كراہۃ التحريم تجلبدتها واللہ اعلم، محمد تبارک

البَیِّنَاتُ؛ حقیقت یہ ہے کہ جو مفرد قرأت کی فرض ہے وہی مقدار سورۃ فاتحہ کے بعد واجب ہے، کیونکہ فقہائے کرام جو الفاظ یعنی سورۃ اوما یقوم مقاہم وغیرہ فرض قرأت میں ذکر کرتے ہیں وہی الفاظ واجبات میں ذکر کرتے ہیں، کما لا یخفی، بس اب یہ دیکھنا باقی ہے کہ آیت طویلہ کا حصہ جو تین چھوٹی آیتوں کے برابر ہو وہ تین آیتوں کے قائم مقام ہے یا نہیں، سو عالمگیری شامی وغیرہ کتب فقہ میں مصرح ہے اذ اقراء آیت طویلہ فی الرکعتین نحو آیت الكرسي وآية المداينة البعض فی رکعة والبعض فی اخرى عامتهم علی انه يجوز کذا فی المعیط، اس سے ثابت ہوا کہ آیت طویلہ کا جزو مطلقاً کافی ہے، یعنی بدون فاتحہ کافی عن الفرض ہے، اور مع الفاتحہ کافی عن الواجب ہے، پس جواب مرسل کی تصدیق میں جو لکھا ہے فی الوقایة فرض القراءة آیت والمکتفی بہا مستی لترك الواجب، اس میں اکتفاء علی الآیة بدون الفاتحہ کا ذکر ہے، اور ہندیہ سے جو لو قرأ قل من آیت وان کان حرفاً لیکرہ نقل کیا ہے وہ عبارت اس وقت ملی نہیں، اگر اس میں ہو تو مراد کراہت تنزیہیہ لی جاوے گی، للجمع بین الروایات، اور عبارات فقہیہ جو واجبات صلوٰۃ میں ہیں کہ وضم السورۃ اوما یقوم مقاہم من ثلاث آیات قصار او آیت طویلہ یہ بر سبیل تمثیل ہے، آیت طویلہ کے حصہ کا اس میں ذکر نہیں نفیانہ اثباتاً، اور دوسری جگہ آیت کے جزو کا کافی ہونا مصرح ہے، تو اس محکم کو مقدم رکھنا ضروری ہے، اس تمثیل کی بنا پر اس محکم حزنہ میں کلام نہیں ہو سکتا، لہذا صورت سوال میں نماز بالکل درست ہو گئی، ترک واجب نہیں ہوا، البتہ عالمگیریہ کی روایت جس کے متعلق گذر چکا ہے کہ ہمیں نہیں ملی اس کی بنا پر خلاف اولیٰ کا حکم ضرور کیا جاوے گا لترك السنة، کتبہ عبد الکرم ۲۳ رجب ۱۳۳۵ھ

فصل فی الوتر ودر عار القنوت

نماز فجر میں دعاء قنوت پڑھنے کا حکم [سوال (۱) موجودہ زمانہ میں نماز فجر میں دعاء قنوت پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب؛ جائز ہے، واللہ اعلم، بلکہ ایک قول پر مستحب ہے، فافہم، ۳ رمضان ۱۳۳۵ھ

نماز وتر کے لئے مطلق وتر کی نیت | سوال (۲) صلوٰۃ وتر میں مطلق وتر کی نیت کرنا چاہتے یا وتر واجب کہنا ضروری ہے؟

جانتے یا واجب و ترک، عالمگیرہ فتویٰ ہندیہ میں باب نیت میں مطلق و ترک نیت کو لکھا ہے... وجوب کی بناء پر اختلاف روایت کے اور علامہ شامیؒ نے خلاف اس کے درجہ وتر والنوافل میں لکھا قولہ لا الوتر الواجب الذی ینبغی ان یفہم من قولہ انہ لاینبغی انہ واجب لایلزم تعین الواجب.... لا منعه من ذلک لانه ان کان حنفیاً ینبغی ان ینویہ لیطابق اعتقاده وان کان غیرہ فلا تضرہ تلک النیتہ (بحر) لکھا ہے کہ اب قول فیصل در باب نیت اور علامہ شامیؒ کی اس عبارت کا مطلب بیان فرما کر ہدایت فرما دیں، کیونکہ یہاں کے علماء میں بہت اختلاف ہو رہا ہے،

الجواب؛ علامہ شامیؒ کی یہ عبارت اقتدار و تر خلف الشافعی کے متعلق ہے، کیونکہ در مختار کی عبارت بھی اس کے متعلق ہے کہ اقتدار بالشافعی کے وقت وتر واجب کی نیت نہ کرے، بلکہ سرت و ترک کی نیت کرے، تاکہ دونوں کی نیت یعنی امام اور مقتدی کی متحد رہے، اختلاف نہ ہو، علامہ شامیؒ کہتے ہیں کہ اگر اس وقت بھی وتر واجب کی نیت کرے تو مضر نہیں، جائز ہے، باقی منفرد کے لئے ادا و ترک کے واسطے مطلق نیت وتر بھی کافی ہے، اور نیت وتر واجب بھی کافی ہے، اس میں یہی قول فیصل ہے کہ ہر دو طرح نیت وتر درست ہے، اس میں اختلاف کرنا محض ایک لایعنی دلائل امری، واللہ اعلم ۲۲ ربیع ۴۲۳

وتر کا قعدہ اولیٰ فرض ہے یا واجب | سوال (۳) وتر کا قعدہ اولیٰ فرض ہے یا واجب، اس کے اور اس کے ترک نماز ہو سکتی ہو نہیں؟ ترک سے نماز ہو سکتی ہے؟

الجواب؛ قعدہ اولیٰ واجب ہے، اگر سہواً ترک ہو جائے تو سجدہ سہو سے نماز وتر درست ہو جائے گی، قال فی الدر وہو ثلاث رکعات بتسلیمۃ کاملہ بحتی لونی لقعود لا یعود ولو عاد ینبغی الفساد کما سیحی ام والراجح عدم الفساد و نقل عن البحر انہ الحق ۱۲ شامی) فقط، ۲۴ ربیع الاول ۱۳۵۳ھ

حکم اقتدار حنفی بالشافعی | سوال (۴) ماہ رمضان میں بعد تراویح کے وتر کی نماز باجماعت در وتر و شرائط آں، ادا کرتے ہیں، اس وتر میں دو جماعت ہوتی ہیں، ایک امام حنفی، دوسرے شافعی....، الگ الگ اپنے اپنے امام سے پڑھتے ہیں، دوسری صف میں ایک ہی ساتھ ہوتے ہیں، اور اسی وتر میں الگ پڑھنا میرے خیال میں نہیں آتا، غرض کہ ہمارے مرشد نے بھی تاکید کی کہ ایک ہی جماعت سے پڑھ لیا کریں، ہمارے پیر بھائی تو پڑھتے ہیں

آئندہ بھی پڑھیں گے، کتاب شہابیہ مذہب شافعی کی اور شرائط المذہب میں بھی پڑھیں
 کا طریقہ لکھا ہوا ہے، ان کتابوں کو دکھانے سے بھی نہ حنفی نہ شافعی کوئی نہیں مانتا اس لئے
 اس وتر کی نماز کو ایک ہی جماعت سے پڑھیں یا نہ پڑھیں، حکم شرعی صادر فرماویں،
 الجواب؛ حنفی کو وتر میں شافعی المذہب کی اقتدار قول اصح کی بناء پر جائز ہر
 بشرطیکہ وہ تین رکعت بدون فصل بالسلام کے پڑھے، اور بشرطیکہ امام نیت مطلق
 وتر کی کرے، وتر تطوع یا وتر مسنون کی نیت نہ کرے قال فی الدرر صم الاقتداء فیہ
 بشافعی لم یفصلہ بسلام لان فصلہ علی الاصح فیہما للاتحاد وان اختلف
 الاعتقاد ام قال الشامی بخلاف المافی الارشاد من انه لا یجوز اصلا باجماع
 اصحابنا لانه اقتداء المفترض بالمتنفل ام ثم قال تحت قوله للاتحاد و
 واستشکلہ فی الفتح بانه اقتداء المفترض بالمتنفل وان لم یخطر بخاطره
 عند النية صفة السنية او غیرها بل مجرد الوتر لتقرر التقلية فی اعتقاده
 ردہ فی البحر بما صرح فی التجنیس ایضا من ان الامام ان نوى الوتر وهو يراه
 سنة جازا لا اقتداء کم صلی الظهر خلف من یری ان الركوع سنة وان
 نواه بنية التطوع لا یصح الا اقتداء لانه یصیر اقتداء المفترض بالمتنفل
 ام (ص ۶۹۹ ج ۱) ہر چند کہ حنفی کی اقتدار شافعی کے ساتھ وتر میں قول اصح پر جائز ہی،
 مگر مشائخ کا اس میں اختلاف ہی بعض مشائخ نے اجاز نہیں دی اور جو تکرر ہیں وہ بھی اس شرط سے جائز کرتے ہیں کہ
 کہ شافعی امام وتر مطلق کی نیت کرے، وتر تطوع یا مسنون کی نیت نہ کرے، اور اس کی
 رعایت کا علم قدسے دشوار ہی، اس لئے جو حنفی جماعت وتر حنفی امام کے ساتھ شافعی سے
 الگ کرتے ہیں ان پر ملامت نہیں کی جاسکتی، ۱۲ شعبان ۱۳۳۴ھ

حکم قنوت نازلہ بزبان عربی | سوال (۵) ما قولکم یرحمکم اللہ فی القنوت النازل
 کیف ہو هل قبل الركوع ام بعده وهل یرفع ید یہ ویکبر لہ ام لا، وهل
 یضع فیہ ید یہ ام یرسلہما وهل یخافت بہ ام یجہر؟

الجواب؛ قال... الطحطاوی فی حاشیئہ علی مل فی الفلاح (رض)؛
 تحت قول الماتن ولین وضع الرجل یدہ الیمنی علی الیسری ما نصہ ولا ید
 فی ذلک القیام ان یكون فیہ ذکر مسنون وما لا فلا ما لا یطل فحینئذ

يضع كما في السجل ج وغيره وقال محمد لا يضع حتى يشرع في القراءة فهو عندهما
 رأي الشيخين ۱۲ منه سنة قيام فيه ذكر مشرع وعند سنة للقراءة فيرسل
 عنده حالة الشناء والقنوت وفي صلوة الجنازة وعندهما يعتمد في الكل و
 اجمعوا على انه يرسل في القومة بين الركوع والسجود وبين تكبيرات العيدين
 بعدم الذكر والقراءة في هذه المواضع فان قيل في القومة من الركوع ذكر مشرع
 وهو التسبيح والتحميد فينبغي ان يضع فيها على قولها اجيب بان المراد قيام
 له قرار وهذا لا قرار له ام وهل يضع فيها في صلوة التسبيح لكون القيام
 له قرار فيه ذكر مشرع ام وراجع ام وقال الشامي ومقتضاه ان يعتمد بيده
 (في القومة) في النافلة ولم ار من صرح به تأمل لكنه مقتضى اطلاق الاصلين
 المارين ومقتضاه ان يعتمد في صلوة التسبيح ايضا ام (ص ۵۰۹ ج ۱) قلت وقد
 مرتصريح الطحاوي بالاعتماد في القنوت عند الشيخين فينبغي ان
 يعتمد بيده في قنوت النافلة سواء قبل الركوع او بعد واما ان قبل الركوع او بعد فقال الطحاوي
 في حاشية مراقي الفلاح واما القنوت في الصلوات كلها عند النوازل فلم
 يقل به الا الشافعي وليس من ههنا قال الحموي وينبغي ان يكون القنوت
 قبل الركوع في الركعة الاخيرة ويكبر له ام (ص ۲۲۰) قلت اراد الحموي
 قنوت النافلة لذكره ذلك تحت قول الاشباة اذا نزل بالمسلمين نافلة
 قنوت الامام في صلوة الفجر ام (ص ۳۹۹) وقال الشامي وهل القنوت هنا قبل
 الركوع ام بعده لم اراه والذي يظهر لي ان المقتدى يتابع امامه الا اذا جهر
 فيؤمن وانه يقنن بعد الركوع لا قبله بدليل ان ما يستدل به الشافعي على
 قنوت الفجر وفيه التصريح بالقنوت بعد الركوع حملة علمائنا على القنوت
 للنافلة ثم رأيت الشربلالي في مراقي الفلاح صرح بانه بعده واستظهر
 الحموي انه قبله والظاهر ما قلناه والله اعلم ام (ص ۴۰۲ ج ۱) قلت ولكن
 الآثار تشهد لما قاله الحموي ايضا فعن طارق بن شهاب قال صليت
 خلف عمر صلوة الصبح فلما فرغ من القراءة في الركعة الثانية كبر ثم
 قنن ثم كبر فركع رواه الطحاوي واسناده صحيح وعن ابي عبد الرحمن

عن علی انه كان یقنت فی صلوة الصبح قبل الركوع رواه الطحاوی ایضا وسند حسن وعن ابی رجاء عن ابن عباس قال صلیت معه الفجر فقتت قبل الركعة رواه الطحاوی ایضا واسناده صحیح کذا فی اثار السنن رض ۱۹ ج ۲ فلا وجه لرد قول الحموی فكان الشافعی لم یزید قبل الركوع محلا للقنوت فلم یقل به فی الفجر ولا فی الوتر ورأه الحنفیة محلا له فقالوا به فی الوتر فکذا فی قنوت النازلة ولكن الا فضل هنا بعد الركوع لانه هو الثابت مرفوعا، ولما انه یرفع له ام لا فالدلیل الذی استدل به الحنفیة للرفع فی قنوت الوتر لا یعم غیره بل یختص به وهو اثر ابراهیم النخعی عند الطحاوی بسند صحیح قال ترفع الایدی فی سبعم مواطن فی افتتاح الصلوة وفي التكبير للقنوت فی الوتر وعن الاسود عن عبد الله كان یقرأ فی آخر رکعة من الوتر قل هو الله ثم یرفع یدیه فیقنت قبل الركعة رواه البخاری فی جزء رفع الیدین واسناده صحیح ام اثار السنن رض ۱۸ ج ۲ ولما رمن صرح بالرفع فی قنوت النوازل وفي رحمة الامة والسنة ان یقنت فی الصبح رواه الشافعی عن الخلفاء الراشدين الاربعة وهو قول مالک وقال ابو حنیفة لا یسن فی الصبح قنوت وكان مالک لا یرفع یدیه فی القنوت واستحبه الشافعی ومحله عند الشافعی بعد الركوع وقال مالک قبل الركوع ام رض ۱۹ قلت وفي المدونة قال مالک فی القنوت فی الصبح کل ذلك واسع قبل الركوع و بعد الركوع قال مالک والذی اخذ فی خاصة نفسی قبل الركوع رض ۱۰۰ ج ۱ قلت وقد صرح علماء نابان یؤخذ بقول مالک فیما لا نص فیه فی المذهب لكون مذهبه اقرب المذاهب الینا کما فی رد المحتار ولم یظهر بموضعه الآن، فینبغي ان لا ترفع الایدی فی قنوت النوازل نعم اذا قنت قبل الركوع فلا یدع التكبير له، لقول الحموی ویکبر له ولثبوته فی الآثار واذا قنت بعد الركوع فلم نر التصريح بالتكبير له فی قول فقیه فاما ان یقاس علی القنوت قبل الركوع واما ان یتروک علی الاصل ولكن التروک

هو الذي ينبغي لكون القياس فيهما مع الفارق فان التكبير للفتوت قبل الركوع
لعله للفصل عن القراءة وانتقال من حال الى حال ولا كذلك بعد الركوع فان
التسميع هناك كاف للفصل والله تعالى اعلم، واما الجهر والاختفاء فلم
يتعرض فقهاءنا بالبحث عنهما في فتوت النوازل ايضا واختلفوا في فتوت
الوتر فقال في الدرر وقت فيه مغا فتا على الاصح ولو اما ما الحديث خير
الدعاء الخفي ام قال الشامي وفصل بعضهم بين ان يعلمه القوم فالأفضل
للامام الاختفاء والا فالجهر ام وفي المنية من اختار الجهر اختاره دون
جهر القراءة ام (ص ۱۳۶۹۸) وقد تقدم قول الشامي في فتوت النوازل و
الذي يظهر لي ان المقتدى يتابع امامه راى يقرأ الفتوت اذا قنت الا اذا
جهر فيؤمن ام وفي المدونة لما لك قلت لابن القاسم فهل يجهر بالدعاء
في الفتوت اما ما كان او غير امام قال لا يجهر قلت وهو قول مالك قال هو
راى ام (ص ۱۰۰ ج ۱) وفي الوجيز للغزالي الشافعي ثم الجهر بالفتوت
مشرود على الظاهر والمأموم يؤمن فان لم يسمع صوته قنت على احد
الوجهين ام (ص ۲۶ ج ۱) قلت ولكن العوام لا يعلمون فتوت النوازل
فالأفضل الجهر به كما هو مقتضى تفصيل بعضهم وهو تفصيل حسن و
والله تعالى اعلم، ۲۲ رذيقه سلكه

وترين شافعيہ کی اقتداء سوال (۶) یہاں زمانہ دراز سے حنفی شافعی
درست ہے یا نہیں؟

رہتے ہیں، تقریباً پچیس تیس سال کے آگے حنفی امام مقرر تھے، کل حنفی و شافعی اس امام کے
اتباع میں نماز پنجگانہ و وتر و تراویح و جمعہ و عیدین وغیرہ ادا کرتے تھے، اب تقریباً
پچیس سال سے دوسرے شہر کے حافظ شافعی امام مقرر ہیں، کل حنفی و شافعی ایک ہی
امام کے پیچھے ایک ہی جماعت سے نماز پنجگانہ و وتر و تراویح و جمعہ و عیدین باتفاق تمام
ادا کرتے آئے ہیں، وقت عصر و عشاء و صبح میں شافعی امام حنفی مسئلہ کی رعایت سے تاخیر سے
ادا کرتے آئے ہیں، رمضان شریف میں وتر بھی حسب عادت قدیم شافعی و حنفی علماء
کی صلاح پر ایک ہی سلام سے شافعی امام پڑھاتے ہیں، یک بیک ایک صاحب

کہیں سے آکر شافعی و حنفی میں پھوٹ ڈالنے کے قصد کیا کہ نماز وتر بہ مذہب شافعی ایک سلام سے جائز نہیں، حنفی و شافعی جدا جدا دو جماعت سے ہی پڑھنا جائز ہوگا، اہل عجمت سے ایک دو صاحب ان کی بات کا اتباع کر کے وتر دو سلام سے پڑھنا چاہتے ہیں، مگر باقی اہل جماعت حسبِ عادت قدیم ایک ہی سلام سے پڑھنا چاہتے ہیں، کیونکہ دو سلام کے پڑھنے سے حنفیوں کی دوسری جماعت کرنی ہوگی، یہی افراق آئندہ دوسرے اوقات میں بھی دو جماعت کا باعث ہوگا، پس ایک ہی مسجد میں دو جماعت ہونے سے ضرور فتنہ و فساد کا اندیشہ ہے، اسی لئے اتفاق کو بحال رکھنے کے لئے اکثر اراۃ مصمم ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق شرائط المذاہب اردو باب الوتر والنوافل میں ہے یعنی اور افضل ہے نزدیک ائمہ ثلاثہ کے وتر فصل سے پڑھنا لیکن مقتدی حنفی ہوں تو وصل سے پڑھے نہیں تو اقتداء حنفی کی درست نہ ہوگی، انتہی، چونکہ یہ عبارت اردو ہے، اس کی اصل عبارت کس کتاب میں ہے، معلوم نہیں، اور کتاب الاوطار ترجمہ در مختار میں ہے وصح الاقتداء فیہ ففی غیرہ اولیٰ ان لم یتحقق منہ ما یفسد فی اعتقادہ فی الاصح کما بسط فی البحر شافعی مثلاً لم یفصلہ بسلام لان فصلہ علی الاصح فیہا للاتحاد وان اختلف الاعتقاد، اور درست ہے وتر میں اقتداء حنفی کا پیچھے شافعی کے مثلاً جو وتر کو سلام سے جدا نہ کرے، یعنی دو رکعت پر سلام نہ پھیرے تو وتر کے غیر میں اقتداء بطریق اولیٰ درست ہے، بشرطیکہ امام سے کوئی ایسا امر متحقق نہ ہو جو نماز کا مفسد ہو، انتہی، باقی کتاب میں دیکھ لیں،

اور عمدة الرعاۃ حاشیہ شرح وقایہ مؤلفہ حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی مرحوم میں ہے قوله خلافاً للشافعی ای فی احد اقوله الثلاثة احدہا قولنا وثانیہا یوتر ثلاثاً بتسلیمتین بان یشہد علی راس الركعتین ویسلم ثم یصلی رکعة واحدة وثالثہا انه من غیر بین ان یوتر بثلاث بتسلیمتہ انتہی، اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ بمذہب امام شافعی وتر کے بارے میں تین روایت ہیں، جن میں ایک روایت موافق حنفیہ ایک ہی سلام سے تین رکعت، اور ایک روایت میں تین رکعت یا تین رکعت بیک سلام، ان روایات کی تفصیل سے اطلاع فرمادیں، اس مسئلہ کے متعلق مقام واقعہ یعنی کثر مور۔ اولڈ، لون کے مذکورہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے قول فیصل

کیا ہو سکتا ہے بحوالہ کتب مع عبارت عربی تحریر فرما کر اہل جماعت کو ممنون فرما دیں، کیونکہ
افتراق کا سخت اندیشہ ہے، مذکور نماز وتر شافعی کے پیچھے حنفی کو حنفی کے پیچھے شافعی کو جائز
نہ ہو تو کتنے سال کی نماز قضا کرنی چاہئے، صاف صاف مع حوالہ کتب و مزین مہر و دستخط
سرفراز فرما دیں؟

الجواب؛ قال فی رحمة الامة و اقل الوتر رکعة و اکثرہ احدى عشر
رکعة و ادى الکمال ثلاث رکعات عند الشافعی و احمد و قال ابو حنیفة الوتر
ثلاث رکعات بتسلیمة واحدة لا یزاد ولا ینقص و قال مالک الوتر رکعة قبلها
شفع منفصل عنہا ۱۴ (ص ۲۳) اس سے معلوم ہوا کہ امام شافعیؒ کے نزدیک و ترکی ایک
رکعت جائز ہے، مگر کامل نہیں، و تر کامل ان کے نزدیک بھی تین رکعات ایک سلام کے ساتھ
ہیں، کما هو مفہوم قولہ و ادى الکمال ثلاث رکعات الخ و لیس محملہ ثلاث بفصل
بالسلام بینہن لکن کبرہ ذلک فیما بعد منہا مالک و اللہ اعلم، اور زیادہ تحقیق
مذہب شافعی کی علماء شافعیہ سے کی جاوے،

رہا یہ کہ حنفی کو شافعی کی اقتداء و تر میں جائز ہے یا نہیں، تو اصح قول حنفیہ یہ ہے کہ
چند شرائط سے جائز ہے (۱) یہ کہ وہ تین رکعات بدون فصل بالسلام کے پڑھے اور
درمیان دو رکعت پر قعدہ کرے (۲) یہ کہ وہ مطلق و ترکی نیت کرے، و ترکی نیت کرے
و تر تطوع یا و تر مسنون کی نیت نہ کرے، صرح بہ فی الشامیہ (ص ۶۹۹ ج ۱) واللہ اعلم
۲۱ شعبان ۱۴۲۵ھ

رمضان میں و تر باجماعت افضل | سوال (۴)
ہے یا بغیر جماعت بعد تہجد؟ تہجد گزار کے لئے غیر رمضان میں افضل ہے
کہ و تر بعد تہجد کے پڑھے، بشرطیکہ جاگنے پر اعتماد ہو، مگر رمضان میں و تر باجماعت افضل ہے
یا بعد تہجد، جواب مع نقل عبارات و حوالہ کتب معتبرہ ارقام فرما کر عند اللہ باجور و عند
الناس مشکور ہوں،

الجواب من بعض العلماء؛ تہجد گزار کو رمضان میں بھی افضل ہے کہ و تر تہجد
کے بعد پڑھے، جبکہ جاگنے پر اعتماد ہو، و تر اخیر شب میں پڑھنے کے متعلق حدیث میں فضیلت
آئی ہے، عن جابر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ایکم خاف ان لا یقوم

من آخر الليل فليوتر ثم ليرقد ومن ثمة بقيام من آخر الليل فليوتر من آخره فان قرأه آخر الليل لم يضره ذلك
افضل (رحمہ اللہ) احمد مسلم والترمذی ابن حاتم یہ حکم عام ہر رمضان اور غیر رمضان دونوں کو شامل ہے اور یہ عمومیست درج ذیل
اقوال مستفاد ہے: فلعل من تأخر عن الجماعة فيه واحب ان يصلي آخر الليل فانه افضل كما قال عمرو بن دينار
عنها افضل وعلم من لم عليه السلام اجعلوا اخر صلواتكم بالليل وترا فاعرفوا لذلك فلا يدل ذلك على ان الافضل فيه
ترك الجماعة احب ان يوتر اول الليل كما يعطيه اطلاق جواب قول انتهي (كبیر شرح منہ ص ۱۲۰۱) والصاحبا في شرح
المنية انه بناء على استحباب تأخير مطلقا لمن يامن فواته واستحباب جعله آخر صلوة الليل الخ (ص ۱۲۸۵) وان من
تأخر عن الجماعة فيه واحب ان يصلي آخر الليل فافضل كما قال والقي ينامونها افضل وعلم من قوله عليه السلام
اجعلوا اخر صلواتكم بالليل وترا فاعرفوا لذلك والجماعة اذ كان متعذرا فلا يدل ذلك على ان الافضل فيه ترك
الجماعة احب ان يوتر اول الليل كما يفهم من اطلاق اختيارهم (شرح مختصر لوقاية للعلاء القاري ص ۱۹۶) البتہ جو شخص تراویح شب میں پڑھنا چاہے اس کیلئے رمضان المبارک میں جماعت پڑھنا افضل ہے، اگر تہجد گزار رمضان میں
وتر تہجد پڑھنا چاہے تو اسکو چاہے کہ اپنی مقام پر چلا جاوے، وتر کی جماعت کچھ الگ بیٹھ کر پڑھنا مذموم ہے، بوجہ مشابہت و اعراض
عن الجماعة کے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ سید عبد الرحیم ۲۳ رمضان المبارک ۱۴۲۶ھ

الجواب من جامع امداد الاحکام :- جواب مذکور ایک روایت کے موافق صحیح ہے، مگر دوسری روایت یہ ہے کہ رمضان
میں تر جماعت مسجد میں پڑھنا افضل ہے تنہا گھر میں پڑھنا افضل نہیں، خواہ اول لیل میں پڑھے یا آخر لیل میں، قال الشافعی
رحمہ اللہ لجماعته بانہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اوتر بهم ثم بین العذر فی تأخره مثل ما صنع فی التراويح فالوتر
كالترويح فكما ان الجماعة فيها سنته فكذلك الوتر، بعروفي شرح المنية والصحيح ان الجماعة اراى في الوتر
افضل للان سنية ما ليست كسنة جماعة التراويح ام قال لخيار الرملي وهذا الذي عليه عمل ما في الناس اليوم
ام وقواه المحشي ايضا بانہ مقتضى ما مران كل ما شرع بجماعته فالمسجد فيه افضل (ص ۲۲) واللہ اعلم
اور دلیل سے بظاہر یہی دوسری روایت قوی ہے، اور اسی پر اُمت کا عمل ہے، فقط
حرره الاحقر ظفر احمد عفا عنه از تھانہ بھون خالقہ امدادیہ ۱۲ ذیقعدہ ۱۴۲۶ھ

فضیلت تأخیر وتر آخر شب | سوال (۸) افضل
وقت وتر را چیست و آنکہ عادت گذاردن وتر را در آخر شب دارد اگر اوقبل ادايش در خوا
بمیرد گناه ترک واجب بر ولازم آید یا نہ؟

الجواب: تأخير الوتر الى آخر الليل افضل لمن يشق بالانتباه ولمن لم يشق
ان يوتر قبل ان ينام هكذا في العالم كيريه ولا يلزمه بشي من الاثم ان مات
قبل الصبح لان الوقت في حقه باق والمعتبر في الوقت والقضاء هو ما خسر

الوقت فمن لم يدرك آخره لم يكن فائتاً للواجب الجواب صحيح، ظفر احمد عفا عنه ۲ صفر ۱۳۸۵
الجواب صحيح، اشرف علی، ۲ صفر ۱۳۸۵

..... سوال (۹)
..... تو وتر جماعت سے پڑھے یا تنہا؟

ایک مسئلہ میں اشکال پیدا ہو گیا، امید ہے کہ جواب با صواب ارشاد فرما کر عند اللہ
ما جو رہوں گے، وہ یہ ہے کہ بہشتی گوہرین ہی صفحہ ۲۰ مسئلہ ۱ اگر کوئی شخص مسجد میں اس
وقت پہنچے کہ عشاء کی نماز ہو چکے تو اسے چاہئے کہ پہلے عشاء کی نماز پڑھے پھر تراویح میں
شریک ہو، اور اگر اس درمیان میں تراویح کی کچھ رکعتیں ہو جاویں تو ان کو بعد وتر پڑھنے
کے پڑھے، اور یہ شخص وتر جماعت سے پڑھے (ص ۳۷ ج ۱ شامی)

اور غایۃ الاوطار میں ہے ولو لم یصلہای التراويح بالامام او صلہامع غیرہ
لہ ان یصلیٰ الوقت معہ، بعد ترجمہ کے تحریر فرماتے ہیں ۴ مراد اس سے یہ ہے کہ فرض
کو جماعت کے ساتھ پڑھا اور تراویح کو جماعت کے ساتھ نہیں پڑھا تو وتر جماعت
پڑھ سکتا ہے، لیکن اگر فرض تنہا پڑھے ہوں تو وتر کو جماعت سے نہ پڑھے، کذا فی الشامی
موجب اشکال یہ ہے کہ شامی اور غایۃ الاوطار کی عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ
جس شخص نے جماعت سے فرض نہ پڑھے ہوں وہ وتر جماعت سے نہ پڑھے، اور بہشتی گوہر
سے معلوم ہوتا ہے کہ پڑھ سکتا ہے، اگر شامی میں کسی جگہ یہ مسئلہ نہ تو تحریر فرمائیے
بہت بڑا اشکال ہو رہا ہے، اور اکثر معمول بھی یہی ہے کہ اکثر نمازی دیر میں آتے ہیں،
اور فرض جماعت سے نہیں پڑھتے ہیں، اور وتر پڑھ لیتے ہیں، لیکن شامی اور غایۃ الاوطار
کی عبارت کچھ اور کہہ رہی ہے، ضرورتاً محض بغرض تحقیق تکلیف دی گئی ہے، امید
کہ ازراہ کرم جواب جلد مرحمت ہوگا،

دیگر امر ضروری العرض یہ بھی ہے کہ احقر کو یہ مسئلہ اُسی طرح معلوم تھا جو بہشتی گوہر
میں ہے، اسی طرح لوگوں کو بتلادیتا تھا، مگر مولوی حبیب اللہ صاحب مدرس مدرسہ قومیہ
میرٹھ جو بریلوی خیال کے ہیں، انھوں نے آج میرے پاس شامی بھیجی ہے، اور کہلا کر بھیجا
ہے کہ یہ مسئلہ اس طرح نہیں ہے، لہذا مکرر عرض ہے کہ بہشتی گوہر کے مطابق عبارت شامی
کی ہو تو ضرور ارشاد فرمائی جائے،

الجواب؛ بہشتی گوہر کا مسئلہ اس صورت میں ہے جبکہ مسجد میں فرض نماز اور تراویح کی جماعت محلہ والوں نے کی ہو، مگر کسی ایک دو آدمی کو جماعت نہ ملی ہو تو ان بعد میں آنے والوں کے لئے وہی حکم ہے جو بہشتی گوہر میں ہے، اور عامۃ کتب فقہ میں اس کے موافق ہی ذکر ہے، درمختار میں ہے وقتہا ای وقت التراويح بعد صلوٰۃ العشاء الی الفجر قبل التراويح معہ ثم صلی ما فاتہ ام، قال الشامی بعد ذکرہ قولین مقابل الاصح الثالث، مشی علیہ المصنف تبعاً للکنز وعزاً فی الکافی الی الجہود وصحہ فی الہدایۃ والخانیۃ والمحیط والبحرام (ص ۳، ج ۱) اس سے معلوم ہوا کہ بہشتی گوہر میں جس طرح مسئلہ مذکور وہی جمہور کا قول ہے، اور وہی اصح ہے، اسی کو ہدایہ، خانیہ، محیط وغیرہ میں صحیح کہل ہے، اور فایۃ الاوطار کی جس عبارت سے سائل کو دھوکہ ہوا ہے وہ اس صورت میں ہے جبکہ مسجد میں کسی نے بھی فرض نماز یا تراویح کی نماز عشاء سے نہ پڑھی ہو تو اس صورت میں اگر وتر جماعت سے پڑھنا چاہیں تو بیشک ایک صورت میں مکروہ ہے (جبکہ فرض میں جماعت ترک کی گئی ہو) اور دوسری صورت میں محل تامل ہے (جبکہ فرض تو سب نے جماعت سے پڑھے ہوں مگر تراویح کی جماعت کسی نے مسجد میں نہ کی ہو) درمختار میں ہے ولو ترکوا الجماعۃ فی الفرض لم یصلوا التراويح جماعۃ لانہا تبع فمصلیہ وحدۃ یصلیہا معہ ولو لم یصلہا ای التراويح مع الامام او صلہا مع غیرہ لہ ان یصلی الوتر معہ بقی لو ترکھا کلہا کل یصلون الوتر جماعۃ فلیؤا ام، اور گوشامی نے اس مقام پر دو سکرانفاظ بھی نقل کئے ہیں، مگر صاحب درمختار اور اکثر اہل متون کا مختار وہ ہی ہے جو مسئلہ جماعت و منفرد کے بارے میں درمختار میں مذکور ہے

واللہ تعالیٰ اعلم، ۲۵ رمضان ۱۳۸۴ھ

صلوٰۃ وتر سے قبل آیت ربنا ما خلقت هذا سوا (۱) صلوٰۃ وتر سے قبل اکثر مصلین آیت ربنا کا پڑھنا ثابت ہے یا نہیں؟ ما خلقت هذا باطلا الخ پڑھا کرتے ہیں،

الجواب؛ اس کی کوئی اصل ہماری نظر سے نہیں گذری، ۱۱ رمضان ۱۳۸۴ھ

سوال (۱۱)..... کل بعد عشاء و تراویح مسئلہ بیان کیا گیا وتر جماعت سے ادا کرے یا تنہا، کہ جس شخص نے فرض نماز عشاء جماعت سے نہ پڑھی ہو

(یعنی منفرداً پڑھی ہو) وہ وتر بھی منفرداً پڑھے، اور جماعت کی شرکت سلام سے پہلے امام

سے مشارکت ہو جانے سے ثابت ہو جاوے گی، اس کے بعد بعض لوگوں نے بیان کیا کہ بہشتی زیور میں لکھا ہے کہ اگرچہ جماعت سے فرض عشاء نہ پڑھے ہوں تب بھی جماعت وتر میں شامل ہو اور وتر جماعت سے ادا کرے، اس کے بعد بہشتی زیور دیکھا گیا تو اس میں اس کے حصہ بہشتی گوہر میں مسئلہ عبارت ذیل درج ہے؛

تراویح کا بیان؛ مسئلہ؛ اگر کوئی شخص مسجد میں ایسے وقت پہنچے کہ عشاء کی نماز ہو چکی ہو تو اسے چاہئے کہ پہلے عشاء کی نماز پڑھے پھر تراویح میں شریک ہو، اور اگر اس درمیان میں تراویح کی کچھ رکعتیں ہو جاویں تو ان کو بعد وتر پڑھنے کے پڑھے، اور یہ شخص وتر جماعت سے پڑھے (شامی، ص ۳۷، ج ۱) مکمل و مدلل بہشتی گوہر، ص ۴۰

اس مسئلہ سے معلوم ہوا کہ منفرداً فرض عشاء پڑھنے پر بھی وتر جماعت سے پڑھے، بہشتی زیور میں حوالہ مذکور شامی مطبوعہ سندھ ۱۳۹۲ھ سے ہے، مگر یہاں وہ شامی نہیں بلکہ مطبوعہ مصر ہے، اس میں جب (مبحث صلوٰۃ التراویح) ص ۵۲۳ و ۵۲۴ میں دیکھا گیا تو مندرجہ ذیل عبارت ملی (و تروکوا الجماعة فی الفرض لم یصلوا التراویح جماعاً) لانہا تبع فمصلیہ و حدة یصلیہا معہ در مختار بقولہ لانہا تبع ای لان جماعتہا تبع لجماعة الفرض فانہا لم تقم الا بجماعة الفرض فلو اقيمت بجماعة و حدة كانت مخالفة للوارد فيها فلم تكن مشروعة اما لو صليت بجماعة الفرض وكان رجل قد صلى الفرض و حدة فله ان یصلیہا مع ذلك الامام لان جماعتہم مشروعة فله الدخول فیہا معهم لعدم المعذور هذا ما ظہر لی فی وجه و بہ ظہر ان التعلیل المذکور لا یشمل المصلی و حدة فظہر صحة التفریع بقولہ فمصلیہ و حدة الخ فافہم رشامی ص ۵۲۳ ج ۱ مصری عبارت محررہ سے واضح ہوا کہ اگر فرض با جماعت نہ پڑھے ہوں تب بھی تراویح کی جماعت میں شرکت کرے، جیسا کہ خط شیدہ عبارت..... اس کو واضح کر رہی ہے، اب آگے یہ عبارت ہے (و لو لم یصلہا ای التراویح رباً الامام) او صلاً مع غیرہ (ان یصلی الوتر معہ) در مختار بقولہ لو لم یصلہا الخ، ذکر ہذا الفرع والذی قبلہ فی البحر عن الفنیة و کذا فی متن الدر لکن فی التاخر عن عن الثقة انه مثل علی بن احمد عن علی الفرض و التراویح و حدة

اول التراويح فقط هل یصلی الوتر مع الامام فقال لا اہ ثم رأیت القہستانی ذکر
تصحیح ما ذکرہ المصنف ثم قال لکنہ اذا لم یصلی الفرض معہ لا یتبعہ
فی الوتر اہ فقوله ولولم یصلہا ای وقد صلی الفرض معہ لکن ینبغی ان یکن
قول القہستانی معہ احترازاً عن صلاتہا منفرداً اما لو صلاھا جماعة مع
غیرہ ثم صلی الوتر معہ لا کراہۃ کامل (ص ۵۲۲ ج ۱ شامی مصری)

اس عبارت مسطورہ سے صاف صاف واضح ہے کہ تراویح چاہے منفرداً پڑھی ہو
چاہے اس امام جس کے پیچھے وتر پڑھنا ہے، کے سوا دوسرے امام کے ساتھ پڑھی ہو، وتر
اس امام کے پیچھے پڑھے، ہاں اگر فرض عشاء منفرداً پڑھے ہوں تو البتہ وتر امام کے ساتھ
نہ پڑھے، یعنی جماعت سے نہ پڑھے،

باقی رہا یہ کہ ”بقی الوتر کہا اکل یصلون الوتر الخ در مختار (قولہ بقی الخ) الذی یظہر ان
جماعۃ الوتر الخ (شامی ص ۵۲۲ ج ۱ مطبوعہ مصر) اس کو اس جسزئیہ سے تعلق نہیں،
اب معروض یہ ہے کہ اگر اس وضاحت میں بھی احقر سے غلط فہمی ہوئی ہے اور مسئلہ
اس طرح صحیح ہے جس طرح بہشتی گوہر (بحوالہ مذکور) میں ہے کہ اگر نماز عشاء منفرداً پڑھی
تب بھی وتر جماعت سے پڑھے تو نہایت ادب سے عرض ہے کہ اس کی تصریح اور وضاحت
فرمادی جاوے کہ احقر کے لئے شرح صدر کا باعث ہو، اور اس سے رجوع کر کے مصلیوں کو
مسئلہ سنایا جاوے، یہ جو کچھ عرض کیا گیا محض رفع اشتباہ اور تحقیق حق کے لئے ہے نہ
حضور والا کے انتباہ کے لئے، پس سوال یہ ہے کہ اگر فرض عشاء اور تراویح دونوں گھر پڑھے
ہوں یا اکیلے کہیں اور پڑھے ہوں، اور وہ شخص ایسی جگہ مسجد یا اور کسی مقام پر حاضر ہوا
کہ وہاں وتر جماعت سے شروع ہوئی، تو یہ شخص وتر جماعت سے پڑھے یا نہیں؟

الجواب: شامی ص ۳، ج ۱ مطبوعہ سندھ میں اس مسئلہ کا جزو اول، یعنی
”ان کو بعد وتر پڑھے“ تک ہوا، اور جزو دوم یعنی ”یہ شخص وتر جماعت سے پڑھے“ اس جگہ
اس کا ذکر نہیں، بلکہ اس کا ذکر اسی عبارت میں ہے، جو سوال میں درج ہے، اور مطبوعہ
سندھ کے ص ۴۱ پر درج ہے، مگر شامی میں صفحہ مذکور پر جو عبارت مندرجہ فی سوال
ہے، اسی سے بہشتی گوہر کی تائید نہیں ہو سکتی، ولولم یصلہا الخ کا خلاصہ ہونا تو ظاہر ہے ہی
لیکن لانه تبع فصلیہ الخ سے بھی تائید نہیں ہوتی، کیونکہ اس سے فاقد الفرض کے لئے جماعت

تراویح میں جواز شرکت ثابت ہوتی ہے، نہ کہ جماعت وتر میں، لکھا نظر یاد فی التامل،
پس سائل کا استدلال صحیح ہے، مگر یہ ضرور نہیں کہ شامی اور درمختار میں عدم جواز شرکت
ہو تو مسئلہ بہشتی زیور یعنی جواز شرکت فی الوتر صحیح نہ ہو اب رہی یہ بات کہ جواز شرکت
کہاں سے ثابت ہے، سو اس کے متعلق عرض ہے کہ فتاویٰ عبدالحی میں بعد نقل روایات
عدم جواز لکھا ہی، لیکن کراچی وجہ قوی معتد بہ عدم جواز معلوم نئی شود حق جواز معلوم میشود
واللہ اعلم، حررہ الراحمی عفور بہ القوی ابوالحسنات محمد عبدالحی تجاویز اللہ عن ذنبہ الجلی والحفی،
بعد ازاں مولوی محمد نعیم صاحب کی تصدیق اس طرح درج ہے، فی غنیۃ المستملی
فی شرح منیۃ المصلیٰ واذا لم یصل الفرض مع الامام فعن عین الائمة الکرایمی
انہ لا یتبعہ فی الوتر ولا فی التراویح وکن اذا المیتابعہ فی التراویح لیتابعہ
فی الوتر وقال ابو یوسف اذا صلی مع الامام شیئاً من التراویح یصلی معہ
الوتر وکن اذا المیدرک شیئاً وکن اذا صلی التراویح مع غیرہ لہ ان یصلی
الوتر معہ وهو الصحیح ذکرہ ابواللیث ام فی مختصر (ای الصغیری)
واذا لم یصلی الفرض مع الامام قیل لا یتبعہ فی التراویح ولا فی الوتر
کن اذا لم یصل معہ التراویح لا یتبعہ فی الوتر والصحیح انہ یجوز ان
یتبعہ فی ذلك کلام واللہ علیم بالصواب وعندہ علم الکتاب،

کتبہ ابوالاحیاء محمد نعیم، عفی عنہ ذنبہ العظیم،

اب ایک خلجان اور باقی رہا وہ یہ کہ پھر بہشتی گوہر میں اس کو اس کو درمختار کی طرف
کیوں منسوب کیا گیا جس میں بجائے موافقت کے مخالفت موجود ہے، سواصل واقعہ بعد
کاوش بسیار یو معلوم ہوا کہ علم الفقہ جو اصل ماخذ ہے گوہر کا اس میں جزو اول کا حوالہ
درمختار موجود ہے، اور گوہر میں جزو دوم کا اضافہ کر کے صغیری کا حوالہ بڑھا دیا گیا تھا،
جو مطبوعہ قریم میں موجود ہے، اور مکمل مدلل میں صغیری کا نام غلطی کا تب کے باعث
رہ گیا، واللہ اعلم، ۲۰ رمضان ۱۲۸۵ھ، کتبہ عبد الکریم عفی عنہ، الجواب صحیح، ظفر احمد عفا اللہ عنہ
وتر وہی شخص پڑھائے جن نے فرض عشاء سوال (۱۲) اگر فرض نماز عشاء ایک شخص نے پڑھائی
پڑھائی ہو یا دوسرا شخص بھی پڑھا سکتا ہے؟ تو کیا وتر بھی وہی شخص ضرور پڑھائے، کیا دوسرے

شخص کے وتر کا امام بننے میں کچھ کراہت ہے یا خلاف اولیٰ؟

الجواب: بظاہر قواعد سے اس میں کچھ حرج نہیں معلوم ہوتا، لیکن کوئی جسزنیہ نظر سے نہیں گذرا، البتہ عالمگیریہ میں سراج و ہاج سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ فرض اور وتر خود پڑھاتے تھے اور تراویح حضرت ابی ثبیبؓ سے پڑھواتے تھے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام فرض کو امام و تربیانا بہتر ہے، ہاں اگر امام فرض و ترکی جماعت میں شریک ہی نہ ہو (خواہ کسی عذر کے باعث یا خود قرآن شریف دوسری جگہ پڑھنے وغیرہ کے سبب) تو پھر کسی دوسرے کو امام و تربیانا خلاف اولیٰ بھی نہیں ہرود اللہ اعلم، کتبہ عبد الکریم عفی عنہ، الجواب صحیح، ظفر احمد عفا اللہ عنہ

نماز وتر میں شوافع کی اقتدار کا حکم [سوال (۱۹۱۳) شافعی مذہب کے امام.....

رمضان میں وتر دو سلام سے ادا کرتے ہیں، پہلے دو رکعت کی نیت کر کے سلام پھیرتے ہیں اس کے بعد ایک رکعت کی نیت کر کے سلام پھیرتے ہیں، اکثر مقتدی حنفی المذہب بھی شریک تراویح ہوتے ہیں، امام صاحب شافعی کا یہ کہنا ہے کہ تم لوگ بھی شریک و تر ہو جاؤ، جب ہم دو رکعت پر سلام پھیریں تم فوراً کھڑے ہو جاؤ، اور اپنی ایک رکعت پوری کر لو، حنفی المذہب مقتدی ایسا نہیں کرتے بلکہ اپنا دوسرا امام مقرر کر کے یہ جماعت و تر تین رکعت ادا کر لیتے ہیں،

الجواب: ایسی حالت میں اس کی اقتدار جائز نہیں ہے، اس طریقہ سے وتر صحیح نہیں ہو سکتے، کما فی الدر المختار (وصح الاقتداء فیہ بشافعی لم یفصلہ بسلام) لا ان فصلہ (علی الاصح) فیہما وقال الشافعی قولہ علی الاصح فیہما ای فی جواز اجل الاقتداء فیہ بشافعی وفي اشتراط عدم فصلہ الخ فقط واللہ اعلم، احقر عبد الکریم عفی عنہ، ۸، سوال ۴۸، الجواب صحیح، ظفر احمد عفا اللہ عنہ، ۱۰، سوال ۴۸

فصل فی سنن و النوافل

سنن مؤکدہ کا ثبوت [سوال (۱) ہر پنج وقتی نماز فرض کے بعد جو نفل یا سنت زوائد پڑھی جاتی ہیں خاص کر ظہر میں دو رکعت اور مغرب اور عشاء میں دو رکعت سنت کے بعد یہ سب کسی صحیح حدیث سے ثابت ہے نہیں؟

الجواب: نماز فرائض کے قبل و بعد جو سنن زوائد ہیں، امام ابو حنیفہؒ نے ان کو سنت فرمایا ہے، اور سنت وہی ہے جو حدیث سے ثابت ہو، امام صاحب ہم سے زیادہ حدیث کو

جانتے تھے، انھوں نے کسی حدیث سے ان کا سنت ہونا معلوم کیا ہوگا، ہم کو حدیث ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ہم مقلد ہیں، لیکن اس وقت محض تبرعاً حدیث صحیح لکھے دیتا ہوں، آئندہ ایسے سوالات کا جواب وہی ہوگا جو اوپر لکھا گیا ہے، اخراج البخاری عن نافع عن ابن عمر قال حفظت من النبی صلی اللہ علیہ وسلم عشر رکعات رکعتین قبل الظهر و رکعتین بعدھا و رکعتین بعد المغرب فی بیتہ و رکعتین بعد العشاء فی بیتہ و رکعتین قبل صلوٰۃ الصبح و كانت ساعة لا یدخل علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیما حدثنی حفصة انه کان اذا اذن المؤذن و طلع الفجر صلی رکعتین و اخرج عن عائشة رضی اللہ عنہا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان لا یدع اربعاً قبل الظهر و رکعتین قبل الغداة، ان حدیثوں سے بارہ سنن مؤکدہ کا ثبوت کافی طور پر ہو رہا ہے، اور اگر سنن زوائد سے سنن مؤکدہ کے علاوہ مراد ہیں تو دربارہ سوال کیا جاوے،

نماز تہجد سنت مؤکدہ ہی یا مستحب | سوال (۲) ایک لڑکا نام حبیب اللہ، مالائمنہ اردو پڑھتا تھا، ایک جگہ لکھا ہے کہ نماز تہجد سنت مؤکدہ ہے، اسی درمیان میں ایک حافظ صاحب تشریف لائے، اور کہنے لگے کہ سنت مؤکدہ نہیں بلکہ نفل ہے، اور تم کو معلوم نہیں، لڑکے نے کہا کہ جناب حافظ صاحب ہم نے تنبیہ الغافلین میں بھی یہی پڑھا ہے کہ نماز تہجد سنت مؤکدہ ہے، اور مالائمنہ میں بھی موجود ہے، بس جناب حافظ صاحب بہت غصہ ہو کر بولے کہ تم کو کیا معلوم، اور کون شخص ہمارے میں اتنا مسئلہ جانتا ہے اس بستی میں، تو لڑکے نے کہا کہ ہم کو تو یہی کتاب بس ہے، تو فوراً حافظ صاحب نے کہا کہ ہم اس کتاب پر وڑی کو نہیں مانتے،

الجواب: نماز تہجد کے بارہ میں علماء کا اختلاف ہے، بعض کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے، بذیل مواظبت صلی اللہ علیہ وسلم علیہا من غیر افتراض علیہ، قال فی رد المحتار و مفادۃ اعتماد السنیۃ فی حقنا لانہ صلی اللہ علیہ وسلم و اظہر علیہ بعد نسخ فرضیتہ و کذا قال فی العلیۃ الاشبه انہ سنۃ ام ص ۶۱۶ ج ۱، اور بعض کے نزدیک مستحب ہی، و حملوا مواظبتہ صلی اللہ علیہ وسلم علی کو نہا فریضۃ مختصۃ بہ، اور اکثر علماء کا قول یہی ہے کہ امت کے حق میں صلوٰۃ تہجد مستحب ہے،

سنت مؤکدہ نہیں قال فی مراقی الفلاح و اکثر المثلون علیہ و ندب صلوٰۃ اللیل خصوصاً آخرہ کما ذکرناہ، اور اس عبد ضعیف کا خیال یہ ہے کہ ابتداء تو صلوٰۃ تہجد مستحب ہی ہے، لیکن بعد شروع کر دینے کے اور عادی ہو جانے کے اس پر مواظبت کرنا سنت مؤکدہ ہے، و دلیل قولہ صلی اللہ علیہ وسلم لابن عمر یا عبد اللہ لا تکن مثل فلان کان یقوم اللیل ثم ترک رواہ البخاری فی کتاب صلوٰۃ التہجد، چونکہ اس مسئلہ میں اختلاف ہی، اس لئے قاضی ثناء اللہ صاحب نے جو بہت بڑے محقق و محدث و عالم ہیں سنت مؤکدہ ہونے کو اختیار فرمایا، لقوة و لیسئلہ اس بناء پر ان پر اعتراض کرنا ہرگز جائز نہیں، اور کتاب مالا بدمنہ کو پید وڑی کتاب کہنا نہایت سخت کلمہ ہے، جس سے سلب ایمان کا اندیشہ ہی، جس نے یہ لفظ زبان سے نکالا ہو اسے فوراً توبہ و استغفار و تجدید ایمان کرنا چاہئے، اور احتیاطاً تجدید نکاح کر لینا بھی ضروری ہے، قال فی العالمگیریہ رجل عرض علیہ خصمہ فتویٰ الائمة فردھا وقال چہ بارنامہ فتویٰ آوردہ قیل یکفر لانه رد حکم الشرع ۱ھ ج ۳ ص ۱۶۲، ۲۴ رجب ۱۲۸۱ھ

سنن مؤکدہ کے تارک کا حکم [سوال (۳)]

..... اکثر لوگ جمعہ کی فرض نماز کے بعد بغیر سنت پڑھے..... چلے جاتے ہیں نہ اپنے مکانوں میں جا کر پڑھتے ہیں، بازاروں میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں، کتنا بھی تاکید کرو نہیں سنتے ہیں، نہ پسند و نصیحت قبول کرتے ہیں، ایسے لوگوں کے لئے کیا وعید آئی ہے، او مذکورہ لوگوں کے لئے کیا عذاب ہے، شرعاً بالتفصیل بیان فرما کر عند اللہ ماجور ہوں؟
الجواب، یہ لوگ تارک سنت مؤکدہ ہیں، اور ترک سنت مؤکدہ گناہ ہے بلا عذر ہو جائے تو صغیرہ ہے اور اس پر مداومت کرنا کبیرہ ہے، جس سے علاوہ سخت گناہ کے حرمان شفاعت نبویؐ کا اندیشہ ہی، رجل ترک سنن الصلوٰۃ ان لم یزال سنن حقاً فقد کفر لانه ترکها استخفافاً وان راها حقاً فالصحيح انه یأثم لانه جاء الوعد بالترک عالمگیریہ واللہ اعلم قلت و مخافة حرمان الشفاعة رأیتہ فی مقام لا احفظ الآن موضعه واللہ اعلم ۲۵ شعبان ۱۲۸۲ھ
صلوٰۃ التسبیح میں سمع اللہ من حمدہ کے بعد [سوال (۴)] مکمل و مدلل بہشتی زیور مطبوعہ قیام طویل میں ہاتھ باندھے یا کھلے رکھے اشرف المطابع ۱۳۲۲ھ درود سہرا حصہ ۲۲ پر

عہ ذکرہ فی الآلی المصنوعۃ للسیوطی ۱۲ منہ

صلوة التسبیح پڑھنے کا طریقہ درج ہے ”رکوع سے اٹھے اور سمیع اللہ لمن حمدہ کے بعد پھر دس دفعہ پڑھے، حضرت صاحب اُس وقت ہاتھ باندھ کر تسبیح پڑھنی چاہتے یا کہ کھلے ہی رکھے جائیں، مطلع فرمائیں،

الجواب؛ قال الطحاوی فی حاشیة علی مراقی الفلاح (ص ۱۵۰) تحت قول المصنف ولین وضع الرجل یدہ الیمنی علی اليسری ما نصہ ولا بد فی ذلک القیام ان یکون فیہ ذکر مسنون وما لا فلا مال لم یطل فحینئذ یضع کما فی السراج وغیرہ فان قیل فی القومة من الركوع ذکر مشروع وهو التسبیح والتعمید فینبغی ان یضع فیہا علی قولہما اجیب بان المراد قیام له قرار وهذا لا قرار له ام وهل یضع فیہا فی صلوة التسبیح لكون القیام له قرار فیہ ذکر مشروع یراجع ام قال الشامی ومقتضاه ان یعتمد بید یہ (فی القومة) فی النافلة ولما رمن صرح به تامل لکنہ مقتضی اطلاق الاصلین المارین ومقتضاه ان یعتمد فی صلوة التسبیح ام (ج ۵۰۹) ان عبارات سے معلوم ہوا کہ صلوة التسبیح میں قومہ کے وقت ہاتھ باندھ کر تسبیح پڑھی جائے، فقط واللہ اعلم، ۱۴ صفر ۱۴۲۵ھ

سوال (۵) تحیۃ الوضوء تحیۃ المسجد یہ سنت ہے اور اس کے متعلق چند سوال کے جوابات یا مستحب، ایک روز میں ان نمازوں کو کتنی بار اور کس وقت پڑھنا چاہئے، مسجد کو نماز کے وقت جاتے ہیں، ظہر کے وقت ظہر کو، عصر کے وقت عصر کو، ایسا ہی سب نمازوں کو کبھی اذان کے قریب اور کبھی اذان کے بعد اور کبھی نماز کے قریب جیسا اتفاق ہوا، اب ان نمازوں کو کیسے ادا کرنا چاہئے، اور انہیں کونسی سورتیں پڑھنا مناسب ہے، ازراہ ہر بانی و بندہ پروری مفصل ترکیب اور اوقات سے مطلع فرما کر ممنون اور مشکور فرمادیں،

الجواب؛ تحیۃ الوضوء مستحب ہے، اور تحیۃ المسجد سنت ہے، مگر مؤکدہ نہیں، تحیۃ الوضوء ہر وضو کے بعد مستحب ہے، دن میں جتنی بار بھی وضو کیا جاوے، اور تحیۃ المسجد مسجد میں داخل ہونے کے وقت سنت ہی، جتنی بار بھی داخل ہو، لیکن جس کی آمد و رفت زیادہ رہتی ہو اس کو دن رات میں ایک بار تحیۃ المسجد پڑھنا بھی کافی ہے، اور تحیۃ المسجد

وتحیة الوضو سنن مؤکدہ اور فرائض سے بھی ادا ہو جاتی ہے، جبکہ وضو کے بعد فوراً یا مسجد میں جانے ہی سنت اور فرض میں معاً مشغول ہو جاوے اور بعد طلوع فجر کے طلوع آفتاب تک اور بعد عصر کے غروب تک مستقلاً اور عین طلوع شمس وغروب اور استواء شمس کے وقت مطلقاً تحیة الوضو اور تحیة المسجد پڑھنا جائز نہیں، باقی اوقات میں جس طرح چاہے پڑھے، خواہ مستقلاً خواہ سنت مؤکدہ وغیرہ کے ضمن میں، اور ان کے لئے کوئی سورت خاص نہیں جو سورۃ چاہے پڑھے، ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۵۴ھ

سوال (۶) بہشتی زبیر دوسرا حصہ بیان نفل پڑھنے کے ایک مسئلہ پر شبہ کا جواب، میں لکھا ہے کہ نفل کھڑے ہو کر پڑھنا بیٹھ کر پڑھنے سے بہتر ہے، اور اس میں وتر کے بعد کی نفل بھی آگئی، مگر مجموعہ فتاویٰ عبدالحی جلد سوم صفحہ ۵۰ میں ہے کہ وتر کے بعد نفل بیٹھ کر پڑھنا چاہئے، ان دونوں مسائل کو کیسا سمجھنا چاہئے، جواباً بصواب سے مشرف فرماویں، دیگر جائے مجموعہ فتاویٰ جلد اول صفحہ ۱۵۲ میں بھی بیٹھ کر پڑھنا بتلایا ہے، فقط

الجواب؛ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے فاذا اوتوا احدکم فلیرکم رکعتین (رواہ الدارمی عن ثوبان) ونیز ارشاد فرمایا ہے من صلی قاعداً فله نصف اجر القائم (رواہ البخاری عن عمران بن حصین) جو اپنے عموم کی وجہ سے نوافل بعد الوتر کو بھی شامل ہے، اور ابن ماجہ اور امام احمد کان یصلیہا وہو جالس جو روایت کی ہے ہمارے نزدیک یہ جلوس تعبدانہ تھا، بلکہ بوجہ مکان وغیرہ کے تھا، اور کان ہمیشہ استمرار کے لئے نہیں ہوتا جو دوام ثابت ہو، واللہ اعلم، احقر عبدالکریم، عفی عنہ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ ۹، سوال ۱۳۳۴ھ

سوال (۷) جب ہر رکعت میں بعد الحمد شریف کے دوسری سورۃ نوافل میں مکروہ نہیں، سورۃ ملائے کی ضرورت ہو تو کیا اس میں دو یا تین رکعت کے بعد بھی بیچ میں ایک سورۃ چھوڑنا منع ہے؟

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو نمازیں اس وقت میں پڑھنا جائز ہیں ان کے ضمن میں یہ بھی درست ہے ۱۲ حضرت مولاناؒ،

الجواب؛ نوافل میں امر مذکور مکرر نہیں ہے، کما فی ہر اقی الفلاح و فی الخلاصة لا یکرہ هذا فی النفل قال الطحطاوی یعنی القراءة متکوسا و الفصل، والجمع کما هو مفاد عبارة الخلاصة حيث قال بعد ذکر المسائل الثلاث وهذا کلام فی الفرائض اما فی النوافل لا یکرہ (۱) ام، کتبہ الاحقر عبد الکرم عفی عنہ، الجواب صحیح، طفاہ عفا ۱۲ رذیقہ سنہ ۱۲۰۰ سنن رواتب کے ترک کرنیو کا حکم | سوال (۸) سوال اول این کہ شخص در اوقات خمس سنن رواتب علی سبیل التہاون والتکاسل نمی خواند فقط برخواندن نماز ہائے فریضہ اکتفا می کند در حق آن شخص شرعاً چه حکم است، و در آخرت بوجه ترک سنن رواتب معذور و ماخوذ خواهد شد یا نہ، و باین سبب در زمرہ بے نمازاں محشور شود یا نہ؟

سوال دوم اینکه شخصی نماز ہائے پنجگانہ بجماعت میخواند بدین طور کہ ہر گاہ بجماعت شریک شود اقتدایت بہذا الامام اللہ اکبر گفتہ با امام اقتدار کند، و پسترد عار ثناء و تسبیح رکوع و سجود و تکبیرات انتقالات و تشہد وغیرہ صحیح نمی خواند و بعد تکبیر تحریمہ تا آخر نماز بالکل ساکت می ماند اما در افعال دیگر یعنی قیام و قعود و رکوع و سجود و قیومہ و جلسہ با امام متابعت کرد و چوں نماز تمام شد با امام لفظات سلام علیکم و رحمۃ اللہ بہر دو جانب گفتہ از نماز بیرون شد، پس نماز این شخص کہ بطور مذکور فرائض بجماعت میگذارد صحیح شود یا نہ و از فرائض بری الذمہ گردید یا نہ،

الجواب؛ (۱) ترک سنن مؤکدہ بلا عذر بطریق اصرار و استمرار موجب عتاب و قدرے گناہ ہی، لیکن تارک سنن بے نمازی شمار نہ ہوگا، قال الشامی عن الکشف الکبیر معنی یا الی اصول ابی الیسر حکم السنۃ ان یندب الی تحصیلها ویلام علی ترکها مع لحوق اثم یسیرام وعن هذا قال فی البحران الظاہ من کلامہم ان الاثم منوط بتروک الواجب او السنۃ المؤکدۃ لتصریحہم باثم من ترک سنن الصلوات الخمس علی الصحیح وتصریحہم باثم من ترک الجماعۃ مع انها سنۃ علی الصحیح ولا شک ان الاثم وبعضہ اشد من بعض فالاثم لتارک السنۃ المؤکدۃ لاخف منه لتارک الواجب وظاہرہ حصول الاثم بالترک مرۃ و یخالفہ ما فی شرح التحریر ان المراد التروک بلا عذر علی سبیل الاصرار و قال محمد فی المصرین علی ترک السنۃ

بالقتال و ابو یوسف بالتادیب ام فیتعین حمل الترتک فیما مر عن البحر
على الترتک على سبیل الاصرار توفیقاً بین کلاهم ام (ص ۴۹۳ ج ۱) اور اگر
احیاناً ترک ہو جائے یا عذر سے ترک ہو مثلاً سفر یا مرض یا تعب شدید کی وجہ سے تو موجب
عتاب و ملامت و گناہ نہیں،

(۲) اس شخص کے ذمہ سے فرض تو ساقط ہو جائے گا، لیکن ترک واجبات و ترک
سنن مؤکدہ کا گناہ ہو گا و ہوظاہر، ۲۲ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ

طالب علم، قاضی یا مفتی کو درس، فتویٰ اور
قضاء میں مشغول رہنے کی وجہ سے ترک سنن
رواتب جائز ہے یا نہیں؟

سوال (۹) طالب علم بوجہ قلت فرصت
بسبب کثرت اشتغال بمطالعہ کتب دینیہ
اگر برخواندن فرائض فقط اکتفا کند و سنن

رواتب ترک سازد، اس چنیں عمل کردن بعلمت مذکور در حق او شرعاً روا باشد یا نہ ؟
الجواب: طالب علم یا قاضی یا مفتی کو سنت فجر کے سوا دیگر سنن رواتب کا
ترک وقت اشتغال بالعلم یا بالقضاء و الفتویٰ جائز ہے، لیکن اگر وقت صلوة پیش
فتویٰ و قضاء سے فارغ ہو جائے تو سنن کا بجالانا ضروری ہے و لا یجوز ترکہا ای سنتہ
الفجر لعل صار مرجعاً فی الفتویٰ بخلاف باقی السنن فلو ترکہا لی الحاجة الناس
الی فتواه ام قال الشامی معناه انه یتروک وقت اشتغاله بالافتاء لاجل
حاجة الناس المجتمعین علیہ و یشغی انه یصلیہا اذا فرغ فی الوقت و
ظاهر التفرقة بین سنة الفجر و غیرہا انه لیس له ترک الجماعة
لانہما من الشعائر فہی اکد من سنة الفجر و لذا جاز ترکہا لو خاف فوت
الجماعة و افاد طائفة من القاضی و طالب العلم كذلك لا سیما المدرس اقول فی
المدرس نظر بخلاف الطالب العلم اذا خاف فوت الدرس او بعضہ ام
رص ۴۰۸ ج ۱) میں کہتا ہوں کہ شامی نے جو مدرس و طالب علم میں فرق کیا ہے اس کا
مقتضایہ ہے کہ طالب علم کو خوف فوت درس کے وقت تو ترک سنن غیر سنت
فجر و جماعت جائز ہو، لیکن معالیم کی وجہ سے اُن کا ترک جائز نہ ہو، کیونکہ درس
کے فوت کا قیدل نہیں اور وہ دوسرے کے قبضہ میں ہے، اور مطالعہ اپنی قبضہ

یعنی عند المدرس کما سیأتی، ۱۲

میں ہے، دوسرے وقت بھی کر سکتا ہے، لیکن اگر ان لوگوں کے ترک سنن سے عوام الناس کو دینی ضرر ہو تو پھر اس کی اجازت نہیں، واللہ اعلم، ۲۴ رزی الحجہ ۱۳۴۳ھ

قبل عشاء چار رکعت کے قعدہ اولیٰ میں درود شریف | سوال (۱۰) عشاء کی چار رکعت سنت میں اور تیسری رکعت میں شمار و تعویذ پڑھنا جائز ہے، جب دو رکعت پڑھ کر قعدہ اولیٰ سے قیام میں کھڑا ہو تب شمار و تعویذ پڑھ کر قرأت شروع کرے، نیز قعدہ اولیٰ میں درود شریف و دعا پڑھے آیا یہ درست ہے؟

الجواب؛ قبل عشاء چار رکعت کے قعدہ اولیٰ میں درود شریف اور تیسری میں شمار و تعویذ پڑھنا جائز ہے، فی العالمگیریہ و فی الاربع قبل الظهر والجمعة وبعدہا لا یصلی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی القعدۃ الاولیٰ ولا یستفتح اذا قام الی الثالثۃ بخلاف سائر ذوات الاربع من النوافل (ص ۲، ج ۱) وھکذا فی الدر وقال ایضا ویتعوذ (ص ۱۰، ج ۱ مع الشامی) کتبہ عبد الکریم عفی عنہ ۱۳ صفر ۱۳۴۳ھ

نفل کی جماعت جیکہ مقتدی تین | سوال (۱۱) دو تین آدمیوں کی اقتدار بلاملائے نفل نماز سے زائد ہوں مکروہ ہے، میں درست ہے مگر جماعت کا ثواب نہیں ملتا، اور جب جماعت کا ثواب نہیں ملتا تو دو تین آدمیوں کی جماعت بلاملائے بے سود ہے؟

الجواب؛ نفل کی جماعت کرنا جبکہ چار مقتدی ہوں تو اتفاقاً مکروہ ہے، اور تین مقتدی ہوں تو کراہت میں اختلاف ہے، اور جس صورت میں مکروہ نہیں اس میں ثواب نہ ملنے کی تصریح تو نہیں ہے، شامی نے قول بدائع ان الجماعۃ فی التطوع لیست بسنة سے استنباط کیا ہے، اور اس میں تامل بھی ظاہر کیا ہے رشامی ص ۱۲، ج ۱ بہر حال اہتمام جماعت نفل میں نہ کرنا چاہئے،

..... سوال (۱۲) عشاء و عصر کی چار سنت میں قعدہ اولیٰ پر درود شریف اور تیسری رکعت میں شمار و تعویذ پڑھنا جائز ہے،

اور دعا اور تیسری رکعت سبحانک اللہ سے شروع کرنی چاہئے؟

الجواب؛ فی الدر المختار و لا یزید، فی الفرض علی التثبوت فی القعدۃ الاولیٰ اجماعاً وقال الشامی (رقولہ فی الفرض) ای وما الحق بہ کالوتر

والسنن الرواتب وان نظر صاحب البحر فيهما ص ۵۳۲ ج ۱ اس سے معلوم ہوا کہ اس حکم میں عشاء و عصر کی چار سنتیں نوافل مطلقہ میں داخل ہیں، عبدالکریم عفی عنہ ۵، محرم ۱۲۵۸ھ، الجواب صحیح : ظفر احمد عفی عنہ ۶، محرم ۱۲۵۸ھ

سوال (۱۳)..... چھوٹی مسجد جو صرف ایک مکان پر مشتمل ہو

جماعت فجر کھڑی ہونے کے بعد اس میں سنت فجر ادا کرے یا ترک کر دے؟

مکانیت پر مشتمل ہو اس میں نہ صحن نہ حجرہ نہ برآمدہ

نہ ستون نہ جگہ صیفی نہ شتوی، تو قیام جماعت مکتوبہ کی حالت میں سنتوں کا خصوصاً فجر کی سنت

کا ترک کرنا ضروری ہے اور جماعت میں ملنا چاہئے، اور ادنیٰ و افضل سنن کے لئے مکان ہی ہر

گھر سے سنت پڑھ کر آنا افضل ہے کیونکہ مسجد صلوٰۃ مکتوبہ کے لئے ہے نہ کہ سنت کے واسطے،

اور افضلیت سنن و نوافل پڑھنے کی مکان میں مسجد سے حدیث سے ثابت ہے، خواہ سنت

فجر ہو یا غیر، وعلیکم بالصلوة فی بیوتکم فان خیر صلوٰۃ المر فی بیتہ الا المکتوبہ، اور ترک کرنا اس

وجہ سے بھی چاہئے کہ جب جماعت مکتوبہ قائم ہو جاوے تو اس وقت دوسری نماز پڑھنا

مکروہ تحریمی ہے، چونکہ یہ مسجد ایک ہی مکانیت پر مشتمل ہے، اس میں کوئی گوشہ یا دوسری

جگہ نہیں ہے، لہذا بر بناء عبارات فقہیہ کے بھی ترک سنت فجر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے،

چنانچہ مجمع الانہر میں ہے ذکرہ خلف الصف بلا حائل، اور فتاویٰ امدادیہ جلد اول صفحہ ۳۵ کی اس

عبارت سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے، فی رد المحتار باب ادراك الفريضة الحاصل ان السنة

فی سنة الفجر ان یاتی بہا فی بیتہ والا فان کان عند باب المسجد مکان صلاحا

فیہ والا صلاحا فی الشتوی او الصیفی ان کان للمسجد موضعان والا ف خلف

الصف عند سارية الخ، یہ قول زید کلہ ہے،

عمر کہتا ہے کہ سنت فجر کی قیام جماعت مکتوبہ کی حالت میں پڑھے، جبکہ تیقن ہو کہ

رکعت ثانیہ قطعی فوت نہ ہوگی اور وقت میں بھی گنجائش ہو، البتہ صفوف سے ہٹ کر رُبع

اختیار کرے، جس قدر ممکن ہو والا ف خلف الصف عند ساریۃ، عند ساریۃ سے مسجد کی جگہوں میں

خواہ گوشہ ہو، خواہ محاذی صف یا خلف صف ہو بعد ہی مطلوب ہے، بحالت قیام جماعت

فجر کی سنت کا ادا کرنا تعامل سے ہے، اور سنت فجر اثر سنت مؤکدہ ہے، اور جماعت

سنت مؤکدہ ہی، سنن کا ادا کرنا مکان میں مخصوص خواص کو ہے، عوام کے واسطے مسجد ہی

افضل ہے، بر بناء فضل حدیث ثواب کے مکان سے مسجد میں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سنت پڑھنا مسجد میں وارد و ثابت ہے، ترمذی شریف کی حدیثوں سے، اب حضرت والا ہم لوگوں کو کیا حکم فرماتے ہیں کہ کس کا قول صحیح اور کس پر عمل کیا جاوے، بالدلیل جو آپ کلی عطا فرمایا جاوے، بینوا بالکتاب وتوجروا یوم الحساب،

الجواب، قال الشامی بعد العبارة المذكورة في الفتاوى الامدادية التي نقلها السائل مانصه لكن اذا كان للمسجد موضعان والامام في احدهما ذكر في المحيط انه قيل لا يكره لعدم مخالفة القوم وقيل يكره لانهما مكان واحد قال فاذا اختلف المشايخ فيه فالافضل ان لا يفعل قال في الزهري في افادة انها تنزيهية اهرص (ص ۴۹، ج ۱) قلت هذا فيما اذا كان للمسجد موضعان واذا لم يكن سوى موضع واحد فالظاهر كراهة الاشتغال بالسنة هناك تحريماً الا اذا صلاها بعيداً عن الصفوف منعت لا عن القوم في جانب منه والله اعلم صورت مذکوره میں کہ مسجد میں بجز مکان واحد کے کچھ نہیں ہے، اقامت للمکتوبہ کے بعد مسجد کے اندر سنتیں فجر کی پڑھنا مکروہ ہے، بلکہ مسجد سے باہر دروازہ کے متصل پڑھنا چاہئے، یا اگر مسجد بڑی ہو اور جماعت قائم ہونے کے بعد ایک جانب گوشے میں سنتیں پڑھیں ہوئے صفوف سے بعد کافی ہو جاتا ہو تو یہ بعد بھی قائم مقام حائل کے ہو جائے گا، کما یظهر من قول الطحاوی وغیرہ من مشایخ الحنفیة وقد ذکرته فی اعلاء السنن بالبط من ذلک واللہ اعلم، اور نوافل و سنن مؤکدہ کا گھر میں پڑھنا فی نفسہ افضل ہے، مگر چونکہ عوام نے اس فضیلت کو ترک سنن کا وسیلہ بنا لیا ہے اب سنن مؤکدہ کا مسجد میں پڑھنا افضل ہے، ورنہ ترک سنن کے ساتھ مہتمم ہوگا، اور تہمت سے بچنا لازم ہے، لما فی الحدیث من قوله صلی اللہ علیہ وسلم اتقوا مواضع التہم والامر للوجوب، واللہ تعالیٰ اعلم، ۸ رجب ۱۴۲۶ھ

سوال (۱۳) ہمارے یہاں مسجد میں تراویح کے قاری کے جو حافظ صاحب سامع ہیں وہ قبل تراویح دو رکعت نفل میں اپنا قرآن شریف قاری کو سنا دیتے ہیں، مگر ان کے سنلنے کے نفل میں شرکت کا حکم

وقت عشاء کا وقت بھی ہو جاتا ہے اور لوگ کچھ انکی جماعت میں شامل ہو جاتے ہیں کچھ علاحدہ اور سنن میں مشغول ہو جاتے ہیں

پھر یہ حافظ صاحب جو نفل میں قرآن شریف سناتے ہیں بالکل اسی جگہ کھڑے ہو کر سناتے ہیں جو تراویح و فرض کے ام کی جگہ ہے، بظاہر مجھے یہ صورت پسندیدہ نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ اس میں مشغولین یا سنن سے تراجم ہوتا ہے، اور ایسے وقت یا تو حافظ صاحب کے نفل موقوف ہوں یا سنن متروک، کیونکہ اذا قرأ القرآن فاستمعوا له وانصتوا للآیۃ کا عموم موجودہ صورت کو جائز نہیں ٹھہراتا، پھر مجھے یاد ہے کہ مدینہ طیبہ میں میرے سامنے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے قاضی بلد سے یہ فرمایا تھا کہ لوگ مسجد نبویؐ میں تلاوت کرتے رہتے ہیں جس سے مصلّین کو تشویش ہوتی ہے، اس لئے اس کی ممانعت ہونی چاہئے تو قاضی صاحب نے وعدہ کیا تھا وہاں بھی تلاوت کرنے والے فرض نماز کی جماعت کے وقت نہیں کرتے تھے، کیونکہ اس وقت تو وہ بھی جماعت میں شامل ہو جاتے تھے، البتہ قبل جماعت و بعد اذان تلاوت بلند آواز سے کرتے تھے جس سے آدھے سنن و رواتب میں تراجم ہوتا تھا،

الجواب: آپ کا خیال صحیح ہے، اس حافظ سامع کو ایسا جہر نہ کرنا چاہئے جس سے مصلّین کو تشویش ہو، بلکہ کسی الگ جگہ پڑھا کریں، اور اس کے ساتھ دوسرے لوگوں کو اقتدار بھی نہ کرنا چاہئے، کیونکہ نوافل مطلقہ کی جماعت میں تین چار سے زیادہ آدمی ہونا مکروہ ہیں، ۱۶ رمضان ۱۳۸۷ھ

اضطجاع بعد قیام اللیل | سوال (۱۵) میرا معمول یہ ہے کہ اگر کبھی تہجد کو اٹھ بیٹھا تو پھر سنت ہے یا نہیں؟ بغیر نماز فجر پڑھے نہیں لیٹتا، ایک صاحب نے جنھیں میں معتبر نہیں سمجھتا یہ کہا کہ تہجد کے بعد سو رہنا مسنون ہے اور فجر کے لئے پھر اٹھنا مسنون ہے

الجواب: اس قائل کا قول صحیح ہے مگر حنفیہ نے اضطجاع بعد قیام اللیل کی سنت عادت پر محمول کیا ہے، جس کا منشاء یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم طول قیام لیل کے تعب رفع کرنے کے لئے اضطجاع فرماتے تھے، اور اگر یہ سنت مقصودہ بھی ہو تو اس پر عمل اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ قوت جماعت فجر کا اندیشہ نہ ہو ورنہ واجب فرض کا اہتمام ایسی سنت کے اہتمام سے مقدم ہے جس کا سنت مقصودہ ہونا ہی..... مختلف فیہ ہے، ۶ رمضان ۱۳۸۷ھ

خطبہ جمعہ شروع ہونے کے بعد آنے والا پہلی چار سنتیں ادا کرے، اور کب؟ یا یہ سنتیں ساقط ہو جاتی ہیں؟

سوال (۱۶) مسئلہ یہ ہے کہ جو شخص ایسے وقت

آکر کے شریک ہو کہ خطبہ جمعہ کا ہو رہا ہے تو فرضوں سے پہلی چار سنت ہیں ان کو کب ادا کرے یا

نہ کرے، یہاں پر لوگ اصرار کرتے ہیں کہ وہ سنت خطبہ ہونے سے پہلے پڑھے تو پڑھ لے اور بعد جمعہ کے وہ نہیں پڑھی جاتی ہیں، وہ معاف ہو جاتی ہیں،

الجواب؛ جمعہ کے بعد والی سنت مؤکدہ ادا کرنے کے بعد ان سنتوں کو پڑھو

جو جمعہ سے قبل والی فوت ہو گئی ہیں کما فی الدار المختار (بخلاف سنة الظهر)

وكن الجمعة (فانه) ان خاف فوت ركعة ريت ركها، ويقتدى رشم

يا تى بها، على انها سنة (في وقته) اى الظهر (قبل شفعه) عند محمد

وبه يفتى وقال الشامي تحت (قوله وبه يفتى) اقول وعليه المتون

لكن رجح في الفتح تقديم الركعتين قال في الامداد وفي فتاوى العتبات

انه المختار وفي مبسوط شيخ الاسلام انه الاصح لحديث عائشة انه

عليه السلام كان اذا فاتته الرابع قبل الظهر يصليهن بعد الركعتين

وهو قول ابى حنيفة وكذا فى جامع قاضى خان ام والحديث قال المتروك

حسن غريب فتم (شامى ص ۵۲، ج ۱)

اور بعض کتابوں میں ان سنتوں کا ساقط ہو جانا لکھا ہے، مگر شامی نے ان کے

ایک استدلال کا جواب دیدیا ہے، اور دوسرے استدلال کے بعد قائل فرمایا ہے،

اس سے معلوم ہوا کہ جمعہ کی پہلی سنتوں کا ظہر کی پہلی سنتوں کے.....

برابر ہونا رائج ہے، واللہ اعلم بالصواب، اور اگر بالفرض ان کے سقوط کو رائج

کہا جاوے تب بھی قصا سے اصرار کے ساتھ منع کرنا ٹھیک نہیں، کوئی شخص احتیاط

کی بنا پر پڑھے تو اس کے روکنے کے کیا معنی، سنت نہ ہوں گی تو نفل کا ثواب

مل جاوے گا، کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ، ۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۵ھ

الجواب صحیح ظفر احسن، ۲۶ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۵ھ

سوال (۱۷) کسی خاص رسم کے معاملہ میں استخارہ کرنے کے

ہوں تو کیا کرنا چاہئے؟ لئے دو رکعت نماز پڑھ کر دعا، اللہم انی استخیرک الخ پڑھنا

لہ وقد صرح بہ ابن نجیم فی البحر، النظر الرائق باب الجمعة،

اس کے بعد دل میں غور کرتا پھر جس طرف ارادہ پختہ ہو جاوے اسے حکم سمجھنا اور اس پر کاربند ہونا لکھا ہے، مگر مجھ گنہگار شخص کی یہ حالت ہے کہ غور کرنے میں دونوں جانب خیال کی حالت یکساں رہتی ہے،

الجواب؛ دونوں میں خیر ہے جس پر چاہے عمل کرے، بشرطیکہ وہ دونوں شقیں جائز ہوں، اور اگر ان میں سے ایک شق ناجائز ہو تو استخارہ جائز نہیں ہے، کیونکہ استخارہ اسی وقت مشروع ہو جبکہ دونوں صلیتیں جائز ہوں، کتبہ العبد المکریم عفی عنہ، الجواب صحیح ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۱۵ رمضان ۱۴۲۸ھ

تہجد کی کتنی رکعتیں ہیں | سوال (۱۸) تہجد کی نماز کے متعلق مختلف روایتیں ہیں، کتنی رکعتیں پڑھنی چاہئے، اور دو رکعت کی نیت باندھنی چاہئے یا چار چار کی؟
الجواب؛ آٹھ رکعتیں مختار ہیں، اور دو رکعت پڑھنا افضل ہے،

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ عبد الکریم عفا عنہ ۸ رمضان ۱۴۲۸ھ

سوال (۱۹) صلوٰۃ التبیح کے بارے میں ترمذی شریف کے صفحہ ۶۳ پر ابو زافع کی حدیث اور مشکوٰۃ کے صفحہ ۱۱ پر ابن عباسؓ کی روایت

صلوٰۃ التبیح کی دوسری رکعت کی تسبیحات میں راجح قول کونسا ہے، اور اس سے متعلق ایک ضمنی سوال،

سے دوسری رکعت کے ختم کی تسبیحات بعد تشہد پڑھی جاسکتی ہیں، کیونکہ ان کی روایتوں میں پہلی کے ختم کی بھی جلسہ استراحت میں ہیں، مگر کہتے ہیں کہ حنفیہ کے نزدیک یہ صورت مرجوح ہے، راجح عبد اللہ بن المبارک الیٰہی، جو ترمذی کے صفحہ ۶۲ پر ہے، اور اس میں جلسہ استراحت کی ضرورت نہیں، کیونکہ قیام ہی میں پچیس ہو جاتی ہیں، تو اس راجح صورت عند الحنفیہ پر دوسری رکعت کی تسبیحات کی کیا صورت ہوگی، یا جو عبد اللہ بن المبارکؓ نے یسیر الخ سے بیان فرمایا ہے یہی ہے، اور آنجناب کی معمول پہا کونسی صورت ہے؟

الجواب؛ ابن عباسؓ کی روایت میں اس کا کوئی ذکر ہی نہیں، کہ تسبیحات تشہد سے پیشتر پڑھی جاویں یا بعد تشہد، اور سوال میں بعد تشہد ہونے پر جو استدلال کیا گیا ہے اس سے مدعی ثابت نہیں ہوتا، پہلی اور تیسری رکعت کے جلسہ استراحت

سے حکم کا مطلب یہ ہے کہ ایک جانب رجحان ہو نیکی کے بعد اس پر عمل کرنا بہتر ہے، لیکن اگر دوسری مروجہ شق پر بھی عمل کر لیا جاوے تو جائز ہے، ۱۲ عبد الکریم عفی عنہ

میں تسبیحات ہونے سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ دوسری اور چوتھی رکعت میں بعد تشهد ہو، البتہ اگر قرأت پر قیاس کیا جاوے تو ممکن ہے، یعنی یوں کہا جاوے کہ جس طرح قیام میں قرأت کے بعد تسبیحات ہیں اسی طرح قعود میں تشهد کے بعد پڑھی جاویں، لیکن ایک روایت میں قبل تشهد پڑھنے کی تصریح وارد ہوئی ہے، اس واسطے اس قیاس پر عمل نہ ہوگا، بلکہ روایت پر عمل کیا جاوے گا، والروایۃ قبل اخرجہا الدارقطنی عن ابن عباس ہر فوعاً وفيہا انتک اذا جلس للتشہد قلت ذلک عشر ہرات قبل التشہد راللائی المصنوعۃ ص ۲۰ وقال العلامة السیوطی رجالہ ثقات الا صدقۃ وهو الدمشقی کما نسب فی روایۃ ابی نعیم وابن شاہین وهو ابن عبد اللہ ويعرف بالسمین ضعیف من قبل حفظہ ووثقہ جماعة (ص ۲۲)۔

اور ابن المبارک کی روایت میں سجدہ ثانیہ کے بعد تسبیحات ہی نہیں جو ان کے محل کا سوال ہو، فافہم، اور عبد اللہ بن المبارک سے ترمذی نے جو روایت کی ہے وہ مرفوعاً بھی مروی ہے، رواہ البیہقی من حدیث ابی خباب الکلبی عن ابی الجوزاء عن عبد اللہ بن عمرو عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم (ص ۳۷۵۲) والکلبی مختلف فیہ ضعفہ کثیرون و ذکرہ ابن حبان فی الثقات وقال ابن نمیر صدوق کان صاحب تدلیس قال الفلابی قال ابو نعیم لم یکن بابی خباب بأس الا انه کان یدلس وکن اقال احمد وابن معین وابوداؤد عن ابی نعیم وقال احمد بن سلیمان البرہاوی عن ابی نعیم مثل ذلک وزاد ما سمعت منہ شیئاً الا شیئاً قال فیہ حدثننا (تہذیب التہذیب) اور الالائی المصنوعۃ (ص ۲۲۳) میں ہے قال الحاکم ولا یتہم بعبد اللہ انه یعلم ما لم یصح عنده سندہ وایضافیہ (ص ۲۳) وقال البیہقی بعد تخریجہ کان عبد اللہ بن المبارک یصلیہا وتداولہ الصالحون بعضہم بعضا وفي ذلک تقویۃ للحدیث المرقوم، پس یہ روایت بھی ثابت ہے، اور جب دونوں طریق ثابت ہیں تو دونوں طرح پڑھنا جائز ہے، جس طریق سے چاہیں پڑھیں اور حنفیہ اگر طریق اول پڑھیں، یعنی جلسۂ استراحت کریں تو ان پر کوئی اعتراض نہیں

کیونکہ یہ ایک جداگانہ نماز ایک خاص طریق سے وارد ہوتی ہے، پس جس طرح اس میں تسبیح کا اضافہ ہے اسی طرح جلسہ استراحت کا اضافہ ہے، اس سے تمام نمازوں میں جلسہ استراحت ہونا لازم نہیں آتا، اور حنفیہ میں سے بعض نے دونوں طریق نقل کئے ہیں، اور بعض نے طریق اول پر اقتصار کیا، اور بعض نے طریق ثانی پر اور علامہ شامی نے کہا ہے: ”الذی ينبغي فعل هذه مرة وهذه مرة“ اور ملا علی قاریؒ نے بھی مرقات میں فرمایا ہے ”وینبغي للمتعب ان يعمل بحديث ابن عباس منارة وعمل بحديث ابن المبارك اخرى“ ولکن قنیہ میں روایت ابن المبارک کے متعلق ہے ”انہما المختار من الروایتین“ (شامی ص ۱۹، ج ۱) و نیز علامہ نوویؒ نے اذکار میں اس کی موافقت کی ہے (بذل المجہد، ص ۶، ج ۲) اور امام غزالی رحمہ اللہ نے احیاء العلوم میں فرمایا ہے ”ہذا هو الاحسن وهو اختیار ابن المبارک (ص ۱۸۶ ج ۱) اس سے معلوم ہوا کہ راجح طریق ابن المبارک کا ہی، اور نوویؒ و غزالیؒ کی موافقت سے معلوم ہوا کہ حنفیہ میں سے جن حضرات نے اس کو اختیار کیا ہے، ان کا مطمح نظر موافقت حنفیہ فی عدم الجلسۃ للاستراحتہ نہیں ہے، بلکہ کوئی اور وجہ ہے، اور اگر کوئی حنفی یہ بھی کہے کہ جب دونوں طریق ثابت ہیں تو ہمارے لئے وہ طریق اختیار کرنا بہتر ہے، جو اقرب الی المذہب ہو تو اس میں کچھ حرج بھی نہیں، ان پر اعتراض تو جب ہوتا.... جب غیر ثابت کو صرف موافقت مذہب کی بنا پر ترجیح دیتے، واللہ اعلم،
، ارشوال رحمہ کتبہ عبدالکریم عفی عنہ

فصل فی التراویح

تراویح کی چار رکعت میں اگر سوال (۱) امداد الفتاویٰ جلد اول صفحہ ۹۳ میں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ تراویح میں قعدۃ اولیٰ کو سہواً ترک پر سجدۃ سہو کے بعد چار ہی محسوب ہوں گی، اور قاضی خاں کی عبارت سے استدلال کیا ہے، حالانکہ کبیری ہندوستانی مطبع ص ۳۹۰ میں ہے ”ان صلی اربع رکعات بتسلیمۃ واحدة ولم یقعد علی رکعتین تجزی عن تسلیمۃ واحدة“ و ہوا المختار قال قاضی خاں و ہوا صحیح و قال ابواللیث تنوب عن تسلیمتین و الصبح الاول انتہی مختصراً، اور طحاوی مراقی الفلاح ص ۲۲ میں ہے ”و یسلم علی کل رکعتین فاذا وصلها وجلس علی کل شفیع فالاصح انہ ان تعمد ذلک

کرہ وصحت واجزآء عن کلہا واذا لم یجلس الا فی آخر اربع نابت عن تسلیمۃ ، اس پر طحاوی نے ایک خلجان بھی کیا ہے ، مگر کچھ دقیق نہیں ، بالجملہ اس کی تحقیق حضرت مولانا سے مراجعت کے بعد فرمادیں ، انتظار ہے ، اب تک کبیری وغیرہ ہی پر عامل تھا ، مگر فتاویٰ کی عبارت سے تردد میں پڑ گیا ، السائل محمد زکریا کاندھلوی ،

الجواب ؛ مکرمی المحترم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ،۔ بجواب مسئلہ عرض ہے کہ فتاویٰ قاضی خاں کی عبارت میں نے دیکھی ، اس میں بھی آگے چل کر دوسرے ہی قول کو صحیح لکھا ہے ، جیسا کہ کبیری و طحاوی حاشیہ مرافی الفلاح میں ہے ، قال قاضی خان وقال الفقیہ ابو جعفر والشیخ الامام ابو بکر محمد بن الفضل فی التراویح ینوب الاربع عن تسلیمۃ واحدة وهو الصحیح لان القعدة علی رأس الثانیۃ فرض فی التطوع فاذا ترکہا کان ینبغی ان تفسد صلوٰتہ اصلا کما هو وجه القیاس وانما جاز استحسنانا فاخذنا بالقیاس وقلنا بفساد الشفع الاول واخذنا بالاستحسان فی حق بقاء التحریمة واذا بقیت التحریمة صح شروعه فی الشفع الثانی وقد اتمہا بالقعدة فجاز عن تسلیمۃ واحدة وعن ابی بکر الاسکاف الخ فذکر نحوه ، ص ۱۱۵ ، میں نے یہ عبارت حضرت مولانا کو بھی دکھلائی فرمایا کہ میرا معمول تو عرصے دوسرے ہی قول پر فتویٰ دینے کا ہے ، کہ یہ چار قائم مقام دو کے ہوں گی ، جیسا کہ کلام مشائخ سے اس کی ترجیح ظاہر ہوتی ہے ، لیکن امداد الفتاویٰ کا جواب غالباً اس بنا پر ہے کہ آجکل طبائع میں کسل غالب ہے ، اگر چار کو قائم مقام تسلیمۃ واحدة کے مان کر دو رکعت کا اعادہ کیا جائے گا تو وہ اعادہ مع اس مقدار قرآن کے ہوگا ، جو ان رکعتوں میں پڑھا گیا ہے ، اور بعض دفعہ ان دو رکعتوں میں بہت زیادہ مقدار تلاوت کی جا چکتی ہے ، ان کا اعادہ مع مقدار تلاوت نمازیوں پر بہت گراں ہوتا ہے حتیٰ کہ فرماتے تھے کہ میں نے بعض جگہ اس پر لڑائی ہوتے ہوئے دیکھا ہے ، اس لئے تسہیل عوام کے لحاظ سے امداد الفتاویٰ میں فقیہ ابواللیث کے قول پر میں نے اکتفاء کیا ، کہ جب مسئلہ میں دو قول موجود ہیں ، اور ایک قول میں عوام کو سہولت ہے تو اس کو اس جہت سے ترجیح ہے ، وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم یسر ولا تعسر ولا تشرا ولا تنفرا ، گو قواعد کے لحاظ سے دوسرا ہی قول صحیح ہے ، مہذا واللہ اعلم ، پس جس جگہ دوسرے قول پر فتویٰ دینے سے لوگوں میں توحش اور تنگی کا

اندیشہ ہو وہاں میرے نزدیک پہلے ہی قول پر فتویٰ دینا چاہیے، واللہ اعلم، ۲۲ رمضان ۱۴۲۸ھ
 حروف کاٹ کر تیز پڑھنے والے | سوال (۲) ایسا حافظ جو سال بھر قرآن مجید کی تلاوت نہ
 حافظ کے پیچھے نماز مکروہ ہے کرتا ہو، اور حافظ بھی پختہ نہیں ہے، دنیا دار ایسا کہ تین چار قسم
 کا روزگار کئے ہوئے ہے، مگر اتنا چاہتا ہے کہ سال بھر میں بذریعہ تراویح قرآن سنا دوں، انداز
 اس کے سامنے کیا ہے کہ صاف لفظ نہیں ادا کرتا، کسی لفظ کا کوئی جزو پڑھا اور تیزی میں
 اس لفظ کا کوئی جزو چھوڑ دیا، اور اسی تیزی میں کہی بلکہ آیت یا دو آیت یا کئی آیتیں چھوڑ گیا
 تو ایسے حافظ کے پیچھے نماز تراویح درست ہے یا نہیں؟

الجواب؛ ایسے حافظ کے پیچھے تراویح پڑھنا مکروہ ہے، سوال نمبر ۲۲
 ایک حافظ کا ایک رمضان میں | سوال (۳) ایک حافظ ایک رمضان میں مثلاً تین عشر
 تین چار جگہ قرآن حتم کرنا، میں تین جگہ تراویح میں قرآن ختم کرتے ہیں اور ہر ایک جگہ مقتدی
 غیر ہوتے ہیں، اب سوال ہے کہ ایسے ختم و تراویح جائز ہے یا نہیں، اگر اس کے جواز کی
 ایک دلیل مرقوم ہو تو بہتر ہے؟

الجواب؛ جائز ہے قال فی نور الايضاح و شرحه و سن ختم القرآن
 فیہا ای مرقۃ فی الشہر علی الصحیح و هو قول الاکثر قال الطحطاوی و مرتین
 فضیلۃ و ثلاثا فی کل عشر مرقۃ افضل ام ص ۲۴۱، قلت والاطلاق یدل علی
 افضلیۃ الختم ثلاثا مطلقا سواء کان فی مسجد واحد او فی ثلاث مساجد
 فی کل مسجد مرقۃ، اور فتاویٰ قاضی خان میں جس صورت کو مکروہ لکھا ہے اس کا مطلب
 یہ ہے کہ روزانہ ایک مسجد میں پوری تراویح پڑھاے اور پھر وہی امام دوسری مسجد میں جا کر
 تراویح پڑھاے یہ مکروہ ہے، قال فی صفحہ ۱۱۲ ج ۱ اول وصلی امام واحد التراويح
 فی مسجدین کل مسجد علی وجہ الکمال اختلف المشایخ فیہ حکى عن ابی بکر
 الاسکاف رۃ انه لا يجوز وقال ابو بکر سمعت ابا نصر انه قال يجوز لاهل المسجد
 جمیعاً کما لو اذن المؤذن و اقام و صلی ثم اتی مسجد اخر فاذن و اقام و صلی
 معهم فانه لا یکرہ و انما یکرہ اذا اذن و اقام و لا یصلی معهم کذلک فی
 التراويح الی ان قال هذا اذا اتم للناس مرتین فان لم یکن اماما و صلی
 التراويح فی مسجد بجماعة ثم ادرك جماعة اخرى فی مسجد اخر

فصلی لا بأس بہ، اھ، اور وجہ کراہت یہ ہے کہ جب ایک باریہ شخص تراویح پڑھ چکا ہے، تو دوبارہ اس کی نماز نفل ہوگی اور مقتدیوں کی تراویح ہوگی تو امام کی نماز مقتدی سے ضعیف ہوگی، وذا لا يجوز بخلاف اس کے ایک مسجد میں ختم کر کے دوسری مسجدوں میں ختم کرے، اور ہر جگہ امام و مقتدی کی نماز تراویح کی ہو اس میں کوئی حرج نہیں، واللہ اعلم، ۳ شعبان روزہ اور تراویح لازم و ملزوم ہیں یا نہیں | سوال (۴) نماز تراویح اور روزہ لازم و ملزوم ہیں یا نہیں، بے روزہ نماز تراویح ہرگز نہ پڑھے یا پڑھ لے؟

الجواب؛ روزہ اور تراویح لازم و ملزوم نہیں ہیں، اگر کوئی شخص عذر کی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکے لیکن وہ تراویح پڑھ سکتا ہے تو اس کو تراویح پڑھنا چاہئے، ۱۲ رمضان ۱۴۲۸ھ فصل کی کٹائی کی وجہ سے روزہ افطار | سوال (۵) فصل کٹائی یا کسی ایسے ہی سخت مشقت کرنے والے کی اقتدار کا حکم، والے کام کے لئے روزہ کا افطار جائز ہے یا نہیں؟

الجواب؛ اگر فصل کاٹنے میں تاخیر کرنے سے زراعت کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہ ہو تب تو کاشتکار کو لازم ہے کہ فصل کو بعد رمضان کے کاٹے، اور اگر تاخیر سے زراعت کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو اس لئے رمضان ہی میں کاٹنا پڑے، اور کٹائی کی حالت میں روزہ دشوار ہو تو کاشتکار کو اس حالت میں افطار جائز اور درست ہے، بعد رمضان کے ان ایام کی قضا کر کے، کفارہ نہ ہوگا، قال فی الفتاوی الکاملیۃ سئل عن حصاد لم یقذ علی حصاد زرعه مع الصوم واذا اخره یهلك هل یجوز له الافطار حیث یصلح الجواب نعم یجوز له ذلك حیث یصلح فقد نقل المحقق ابن عابد بن رحمہ اللہ فی حواشیہ علی الدر من الخیر الرملی مانصہ وعلی هذا الحصاد واذا لم یقذ علیہ مع الصوم ویهلك الزرع بالتأخیر لا شک فی جواز الفطر والقضاء اھ وایضہ اعلم، ص ۱۶، ۱۷، ۲۱ رمضان ۱۴۲۸ھ

نماز تراویح میں قرآن کی | سوال (۶) ایک شخص نماز تراویح کی چار رکعت کی نیت کرتا ہے سورتوں کی ترتیب حکم | اول رکعت میں سورۃ والعصر پڑھتا ہے، دوسری میں سورۃ اخلاص پڑھتا ہے، تیسری میں سورۃ البقرہ اور چوتھی میں پھر سورۃ اخلاص پڑھتا ہے، اس صورت میں نماز تراویح ہوگی کہ نہیں، اگر ہوگی تو حوالہ کتاب اور استدلال حدیث کی ضرورت ہے اور اگر نہیں ہوگی تو بھی دلائل کی ضرورت ہے، بہر حال ہر حالت میں ثبوت اور حوالہ

کتاب کی ضرورت ہے، ایسا کرنے والے کو کیا کرنا چاہیے، اور اس کے لئے کیا حکم ہے، میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ نماز نہیں ہوگی، کیونکہ ترتیب قرآن ٹھیک نہیں، اور ہر نماز کے لئے ترتیب قرآن کا ہونا ضروری ہے، بہر حال اس مسئلہ کے لئے جو کچھ ضروری ہو تحریر فرمائیے،

(۲) ایک شخص دو رکعت نماز تراویح کی نیت کرتا ہے پہلی رکعت میں سورۃ والعصر پڑھتا ہے دوسری میں سورۃ الاخلاص اسی طرح وہ نماز تراویح کی بست رکعتیں ختم کرتا ہے یا یہ طریقہ جائز ہے یا نہیں؟ دونوں صورتوں کے لئے دلائل کی ضرورت ہے،

الجواب؛ قال فی الخلاصہ رجل یصلی اربع رکعات بتسلیمہ وقعد فی الثانیۃ قدر التثبید اختلف المشائخ فیہ اکثرہم علی ان یجزی عن تسلیمتین اھ ص ۶۵ ج ۱، صورت مذکورہ میں نماز درست ہو جاوے گی، مگر تراویح میں چار رکعتیں ایک سلام سے پڑھنا خلاف سنت ہے، قال فی الخلاصہ وان قرأ فی رکعة سورۃ وفی رکعة اخری فوق تلك السورة او فعل ذلك فی رکعة مکروهه وان وقع هن امن غیر قصدہ بان قرأ فی الركعة الاولی قل عوذ برب الناس یقرأ فی الركعة الثانیۃ هذه السورة ایضا وهذه کلہا فی الفرائض اما فی النوافل لایکون اھ ص ۹۷ ج ۱، اس سے معلوم ہوا کہ سورتوں کی ترتیب فرائض میں ضروری ہے، غیر ترتیب سے پڑھنے میں کراہت ہوگی، لیکن نوافل میں ہر طرح اختیار ہو گو..... نوافل میں بھی ترتیب کی رعایت افضل ہے، لیکن جو صورت سائل نے لکھی ہے اس میں تو کچھ بھی حرج نہیں، کیونکہ نوافل و تراویح کا ہر شفعہ صلوٰۃ مستقلہ ہے، اور ہر شفعہ کی قرأت میں الگ الگ رعایت ترتیب کی ہے، گو مجموعہ شفعتین میں ترتیب نہ رہی ہو اس کا مضائقہ نہیں، ۲۳ رمضان ۱۳۸۵ھ

سوال (۷) نماز تراویح میں ہر چار رکعت کے بعد دعا مانگنے کا حکم..... یہاں کی مسجدوں میں دستور یہ تھا کہ رمضان المبارک

میں نماز تراویح کی ہر چار رکعت کے بعد امام و مقتدی کچھ وظیفہ پڑھتے تھے، پھر وظیفہ کے بعد امام ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتا تھا، اور جملہ مقتدی آمین کہتے تھے، اس سال اتفاق سے مدینہ طیبہ زادہ اللہ شرفاً و تعظیماً سے خطیب مسجد نبویؐ ایک مسجد میں تشریف لائے، اور وہ اس مسجد موصوف کے امام مقرر ہوئے، یہ مدنی امام حافظ قرآن بھی تھے، لہذا اس سال رمضان المبارک میں آپ نے تراویح میں قرآن پاک پڑھا، لیکن ہمیشہ کے دستور کے خلاف ہر چار رکعت

تراویح کے بعد صرف ذکر و وظیفہ پر قناعت کی دعا نہیں مانگی، البتہ بیس رکعت تراویح کے ختم پر ذکر کر کے دعا مانگی، دو سکر و زجب اس واقعہ کی اطلاع دوسری مسجدوں میں ہوئی تو ایک مسجد میں اُس پر سخت اعتراضات کئے گئے، جب امام صاحب مدنی سے اس کی بابت دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ ہمارے یہاں مسجد نبویؐ میں جس طریقہ سے تراویح پڑھی جاتی ہیں میں نے اسی طریقہ پر پڑھیں، چونکہ مدینہ پاک میں ہر چار رکعت کے بعد دعا نہیں مانگی جاتی ہے، لہذا اسی کے مطابق میں نے بھی کیا، مجھے یہاں کا دستور نہ تو معلوم تھا، اور نہ یہاں کے رواج کی تقلید میرے ذمہ ضروری تھی، اُس دوسری مسجد والوں نے نفسانیت کی بناء پر ایک صاحب سے اپنی مسجد میں وعظ کہلایا، واعظ صاحب نے کھلم کھلا ہر چار رکعت پر دعا نہ مانگنے پر بہت کچھ اعتراضات کئے، اور اپنے نزدیک یہاں کے اعتبار سے اس جدید فعل کی پوری تردید کر دی،

پس اب سوال یہ ہو کہ ہر چار رکعت تراویح کے بعد صحابہ کرام رضوانمہ مجتہدین خصوصاً امام اعظم ابو حنیفہؒ کا عمل درآمد دعا کے متعلق کیا تھا، اور اگر ان کا دستور العمل نہیں تھا، تو آیا یہ دعا مانگنا بلا کراہت جائز ہے یا نہیں، اور یہ کہ محض جائز ہی ہے یا مستحب یا سنت اور امام کو اس دعا پر مجبور کرنا اور نہ کرنے پر شور و شر بھیلانا شرعاً درست ہے یا نہیں، در صورت جواز جب عوام کا اس قدر اصرار ہو کہ تارک کو موجب ملامت قرار دیں تو عوام کے عقیدے کی درستی کے لئے اس کا ترک کر دینا بہتر ہی یا نہیں؟

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر ہر چار رکعت کے بعد دعا مانگنا جائز بھی ہو تو بھی موجودہ حالات میں اس کا ترک کر دینا ضروری ہوگا، اس لئے کہ فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ جب کسی غیر ضروری فعل پر مداومت عقیدۂ عوام کے فساد کا باعث ہو تو خواص پر واجب ہے کہ عقیدۂ عوام کی درستی کے لئے اس کو ترک کر دیں، پس سوال مذکور کا مفصل جواب ارشاد فرمائیں،

الجواب واللہ الموفق للصواب؛ قال فی الدرر یجلس ندباً بین کل اربعة بقدرها وکذا بین الخامسة والوتر وخیرون بین تسبیح وقراءة وسکوت وصلوة فرادی الخ قال العلامة الشامی تحت قوله بین تسبیح قال القمستانی فیقال ثلث مرات سبعمائة ذی المملک والمملکوت سبعمائة ذی العرة والجبروت

القول لا اله الا الله نستغفر الله نسألك الجنة ونعوذ بك من النار كما في منہم العباد
 ام ص ۳۹، ۱۱، قلت وفي البدائع ومنها ان الامام كلما صلى ترويحاً قعد بين الترويحيتين
 قدر ترويحاً يسبم ويكبر ويصلي على النبي صلى الله عليه وسلم ويدعو وينتظر
 ايضا بعد الخامسة قدر ترويحاً لانه متوارث من السلف ام ص ۲۶۰، ۱، ولعل
 المراد بقوله يدعون يأتي بالادعية الماثورة لا الدعاء برفع اليدين لان المتوارث
 من السلف في هذا الموضع انما هو مطلق الانتظار سواء كان بالجلوس او بالقيام او
 بالسكوت او بالذكر ونحوه قال في شرح المنية وليس المراد حقيقة الجلوس بل
 المراد الانتظار وهو مخير فيه ان شاء جلس ساكتا وان شاء هلّل او سبّم او قرأ
 او صلى نافلة منفردا وهذا الانتظار مستحب لعادة اهل الحرمين فان عادة اهل
 مكة ان يطوفوا بعد كل اربع اسبوعاً ويصلّوا ركعتي الطواف وعادة اهل المدينة
 ان يصلّوا اربع ركعات، وقد روى البيهقي باسناد صحيح انهم كانوا يقومون
 على عهد عمرؓ يعني بين كل ترويحيتين ام (ص ۳۸۶)

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ ہر ترویحہ کے بعد مستحب مطلق انتظار ہے جس میں امام و مقتدی
 کو اختیار ہے کہ خواہ خاموش بیٹھے رہیں یا اذکار وغیرہ میں مشغول رہیں، اور دعاء بہیت
 متعارفہ خصوصیت کے ساتھ نہ درمیانی ترویحوں میں مسنون ہے نہ آخری ترویجہ میں، لیکن
 اس میں شک نہیں کہ مطلق سکوت سے ذکر و ادعیہ میں مشغول ہونا بہتر ہے، پس اگر جائز و
 اختیاری سمجھ کر تمام ترویحوں میں ہاتھ اٹھا کر دعاء کی جائے تو اس کا بھی مضائقہ نہیں، اور اگر
 صرف ترویجہ خامسہ میں دعاء کی جائے تو اس کا بھی مضائقہ نہیں، اور اگر کسی ترویجہ میں بھی دعاء
 نہ کریں یہ بھی جائز ہے، یہ تو اصل حکم ہے، لیکن ایک عارض پر نظر کر کے اولیٰ یہ ہے کہ درمیانی ترویحوں
 میں دعاء نہ کی جائے، وہ یہ کہ ہر ترویجہ کے بعد بطریق متعارف دعاء کرنا موجب ثقل علی القوم ہوتا ہے
 اگر تسبیحات و تہلیلات کے بعد خشوع کے ساتھ دعاء کی جائے گی تو اس میں ضرور کچھ دیر ہوگی،
 اور اگر بدون خشوع و حضور قلب کے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر منہ کو مل لئے تو ایسی دعاء سے دعاء
 نہ کرنا بہتر ہے، ان شاء اللہ لا یقبل الدعاء من قلب لاه، اور فقہاء نے امام تراویح کو تعلیم فرمائی ہے
 کہ صلوٰۃ تراویح میں بعد تشہد کے صرف اللہم صل علی محمد کہہ کر سلام پھیر دیا کرے، ادعیہ ماثورہ نہ
 پڑھے، مخافۃ الثقل علی القوم، توجب دعاء مسنون کو فقہاء نے ترک کرنے کی تعلیم کی ہے تاکہ قوماً

پر ثقل نہ ہو تو دعا، ترویج جو کہ مسنون بھی نہیں بلکہ جائز اور غایت سے غایت مستحب ہر اس کو ترک کرنا ثقل سے بچنے کے لئے کیوں افضل و اولیٰ نہ ہوگا، و یاتی القوم والامام بالثناء فی کل شفیع ویزید الامام علی التشهد الا ان یمل القوم فیاتی بالصلوات ویکتفی باللہم صل محمد لانه الفرض عند الشافعی ویتروک الی عوات و یجتنب المنکرات اہم کہ فی الدرع علی الشامیۃ (ص ۲۰، ج ۱) اور ہر چند کہ اصل حکم تخییر پر نظر کرتے ہوئے ترویج خامسہ میں بھی دعا بطریق متعارف کو کچھ ترجیح معلوم نہیں ہوتی مگر ایک علت پر نظر کر کے ترویج خامسہ میں دعا کرنا مستحب و اولیٰ ہو جاتا ہے، وہ یہ کہ ترویج خامسہ میں حزب قرآن پورا ہو جاتا ہے، اور بعد تلاوت حزب قرآن کے دعا کرنا مستحب ہے، اور وہ وقت اجابت دعا کا ہے، قال فی الاحیاء فی بیان اداب التلاوة الثامن ان یقول فی مبتدأ قراءته اعوذ باللہ السميع العليم من الشیطان الرجیم، الی ان قال ولیقل عند فراغه من القراءة صدق اللہ تعالیٰ وبلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہم انفعنا بہ وبارک لنا فیہ الحمد للہ رب العالمین استغفر اللہ الھی الیقوم اہ (ص ۲۹، ج ۲) وقال فی الحصن فی احوال اجابة الدعاء مانصہ وعقوب تلاوة القرآن ولا سيما الختم طموس خصوصاً من القاری ت ط اہ (ص ۳۰ و ۳۱) وفي الالتقان للسيوطی ناقلاً عن الشعب من حدیث انس مرفوعاً من قرأ القرآن وحمد الرب وصلی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم واستغفر ربہ فقد طلب الخیر مکانہ اہ (ص ۱۱۶، ج ۱)، غرض تلاوت قرآن سے فارغ ہو کر دعا کرنا مستحب، اور یہ وقت قبول دعا کا ہے، اس لئے ترویج خامسہ میں دعا کرنا مستحب و افضل و اولیٰ ہوگا، اور ہر ترویج میں دعا کرنا ایسا ہوگا، جیسے کوئی شخص تلاوت قرآن کے وقت ہر رکوع یا ہر ربع پر ہاتھ اٹھا کر دعا کیا کرے، اور یقیناً یہ صورت مستحذ ہے، سلف صالحین ضرر فراعنت عن الحرب کے وقت دعا کیا کرتے تھے، اور یہی منصوص بھی ہے، وسط قرأت یا تلاوت میں دعا کرنا ثابت نہیں، لہذا گاہے گاہے تو مضائقہ نہیں، مگر اس پر مواظبت بدعت ہے، اور اگر مواظبت سے گذر کر اس کے خلاف سے مزاحمت ہونے لگے تو یقیناً یہ فعل ممنوع ہوگا، کیونکہ اصول شرع میں یہ بات منع ہو چکی ہے کہ امر مباح و مستحب بلکہ

سنت کو بھی اگر اس کی حد سے بڑھا دیا جائے اور اس کے تارک پر ملامت ہونے لگے تو ایسے وقت میں اس مباح یا مستحب یا سنت کا ترک عوام و خواص سب پر ضروری ہو جائے گا،
بِذَا دَانَ الْعِلْمُ وَالْعِلْمُ وَاعْلَمَ وَاعْلَمَ ۱۸ رزی قعدہ ۱۲۸۵ھ

ایک مسجد میں قرآن ختم کرنے کے بعد سوال (۸) اس مسئلہ میں مدت سے شبہ ہے لہذا حضرت والا
دوسری مسجد میں قرآن مجید سنانے سے استفتاء کرتا ہوں، امید ہے کہ جواب سے تشفی خاطر فرما دیجئے
کا حکم اور اس پر ایک شبہ کا جواب ایک حافظ قرآن نے رمضان کے عشرہ اولیٰ میں ایک مسجد میں چند مقتدیوں

کو ایک نغمہ لوجہ اللہ سنایا، پھر عشرہ ثانیہ میں دوسری مسجد میں دوسرے مقتدیوں کو جنہوں
نے نغمہ سنا نہیں ان کو دوسرا نغمہ سنایا، اب سوال یہ ہے کہ اس صورت میں بناء قوی علی
الضعیف لازم آتا ہے، کیونکہ دوسرے مقتدیوں کو ایک نغمہ سنانا سنت مؤکدہ ہے، اور حافظ
صاحب کو دوسرا نغمہ سنانا مستحب ہی یہ تو بندہ کا شبہ ہے، باقی جو حضرت کی مرضی ہو وہی
صواب ہے؟

الجواب: بناء القوی علی الضعیف یہ ہے کہ امام کی نماز مقتدی کی نماز سے اضعف
ہو اور یہاں ایسا نہیں، کیونکہ عشرہ ثانیہ میں تراویح کی نماز امام و مقتدی دونوں پر علی السواء
سنت مؤکدہ ہے، اس لئے یہ صورت جائز ہے، دوسرے یہ بھی مسلم نہیں ہے کہ امام کی قرأت
مقتدیوں کی قرأت سے اس صورت میں اضعف ہے، کیونکہ گو نماز شروع کرنے سے پہلے تو
امام پر قرأت واجب و سنت نہ تھی، بلکہ نفل تھی، لیکن نیت و افتتاح صلوٰۃ کے بعد
اس پر قرأت بقدر صحت صلوٰۃ فرض ہو گئی، اور اب وہ جتنی بھی قرأت کرے گا، سب فرض
میں داخل ہوگی، اگرچہ سارا قرآن ہی ایک نماز میں پڑھ جائے سب فیض ہی میں داخل ہوگی، و شعبان ۱۲۸۵ھ
فاسق امام کے پیچھے نماز تراویح سوال (۹)

پڑھنے کا حکم اور اس کی تفصیل بعض بعض حفاظ قرآن مجید بعد گزر جانے ماہ

رمضان المبارک کے تارک الصلوٰۃ ہو جاتے ہیں، اور بعض بیخوفۃ نماز میں سے ایک دو وقت
کی نماز گاہے بگاہے ادا کرتے ہیں، یا ڈاڑھی بالکل منڈواتے ہیں، یا نہایت مبالغہ کے ساتھ
کترواتے ہیں کہ ایک انگشت کے برابر بھی نہیں چھوڑتے، جب ماہ مبارک آئے تو ایسے
حافظ نماز تراویح میں امام بن کر کلام پاک سناتے ہیں تو ایسے حفاظ کے پیچھے نہلوں۔ یا تراویح
... پڑھنا مکروہ ہے یا نہیں، اور اگر مکروہ ہے تو تنزیہی ہے یا تحریمی، اور مکروہ تحریمی کی

کسی آیت قرآنی یا حدیث صحیح سے تشریح فرما دیجئے، اور نیز مکرر یہ ہے کہ مرتکب مکروہ تحریمی کا گنہگار ہوتا ہے یا نہیں، اور نماز بکراہت تحریمی ادا کی ہوئی واجب الاعادہ ہوتی ہے یا نہیں؟ بنیوا توجروا،

الجواب؛ اگر یہ لوگ رمضان میں گزشتہ گناہوں سے توبہ کر لیں اور نماز بخیر وقت کی پابندی شروع کر دیں، اور ڈاڑھی منڈانا یا کترانا چھوڑ دیں تب تو ان کے پیچھے تراویح مکروہ نہیں، اور اگر رمضان میں بھی وہ اپنے افعال فسقیہ پر باقی ہوں تو ان کے پیچھے نماز مکروہ ہے، اور اس میں اختلاف ہے کہ کراہت تنزیہی ہے یا تحریمی، شرب نلالی اور زلیعی نے کراہت تحریمیہ کو ترجیح دی ہے، اور طحاوی بھی اسی طرف مائل ہیں، باقی علماء نے تنزیہی کہا ہے، مگر یہ کراہت اُس وقت تک ہو جبکہ کوئی امام نیک دستیاب ہو سکے، اور اگر بجز فاسق کے کوئی حافظ نہیں ملتا، تو اہل محلہ کو چاہئے کہ اس صورت میں ختم قرآن کی طبع نہ کریں، کسی ناظرہ خواں نیک آدمی کو امام بنا کر الم ترکیف سے تراویح ادا کر لیں، اگر اہل محلہ ایسا نہ کریں اور حافظ فاسق ہی کو امام بنا دیں تو پھر جو کچھ گناہ ہوگا، اول امام بنانے والوں کو ہوں گا، دوسرے لوگوں کو بلا کراہت اس کے پیچھے تراویح پڑھنا جائز ہے، مگر اپنے افعال و اقوال سے اس امام کی عظمت و تعظیم نہ کریں، اور اگر محلہ میں کوئی دوسری مسجد ایسی ہو جہاں نیک امام تراویح پڑھاتا ہو تو وہاں جا کر تراویح پڑھنا چاہئے، فاسق کے پیچھے نہ پڑھنا چاہئے، اور اگر نیک امام کوئی نہیں ملتا، نہ حفظ نہ ناظرہ خواں تو پھر فاسق کی اقتداء بلا کراہت جائز ہے، قال فی نور الایضاح وکرة امامة العبد الی قوله وکرة امامة الفاسق اه قال الطحاوی افاد الخوی ان کراهة الاقتداء بالعبد وما عطف علیه تنزیہیة ان وجد غیرهم والافلام وسیاتی ما یفید ان امامة الفاسق مکروهة تحریمًا ص ۱۵۵، قال فی نور الایضاح وکرة امامة الفاسق العالم لعدم اهتمامه بالدين فتجب اهانته شرعًا فلا یعظم بتقدیمه للامامة (قال الطحاوی قوله فتجب الخ تبع فيه الزلیعی ومفادہ کون الکراهة فی الفاسق تحریمیة ام) واذا تعذر منعه ینقل عنه الی غیر مسجدہ للجمعة وغیرها وان لم یقم

عہ قلت فامامة الفاسق الجاهل بالاولی الوجود السببین للنج فيه ۱۲ منہ

الجمعة الاھوتصلی معہ ام قال الطحاوی فی السراج هل الافضل ان یصلی خلف هؤلاء ام الانفراد قیل اما فی الفاسق فالصلوۃ خلفہ اولی وھذا انما ینظر علی ان امامتہ مکروہۃ تنزیہا اما علی القول بکراہۃ التحریم فلا واما الآخرون فیمکن ان یقال الانفراد اولی لجهلہم بشروط الصلوۃ ویمکن اجراءہم علی قیاس الصلوۃ خلف الفاسق وجزم فی البحر بان الاقتداء بہم افضل من الانفراد (ص ۱۷۶) قلت بشرط ان لا یكون الامام لھنا ینفسد الصلوۃ بلحنہ والا فالانفراد اولی بل هو المتعین اذ المرید انما ما غیرہ ، والله اعلم

تنبیہ: چونکہ فاسق کے پیچھے نماز مکروہ ہونے میں دو قول ہیں، ایک قول میں کراہت تنزیہی ہے دوسرے تحریمی ہے، اس لئے اس میں شر و فساد نہ بڑھانا چاہئے، اگر سہولت کے ساتھ ایسے امام سے علیحدگی ممکن ہو تو خیر ورنہ اگر فتنہ یا عداوت کا اندیشہ ہو تو اسی کے پیچھے نماز پڑھتے رہیں، دوسرا امام کی طرف منتقل ہونے کی سعی نہ کریں، البتہ اگر امام فاسق ہونے کے ساتھ جاہل بھی ہو اور قرآن بھی غلط سلط پڑھتا ہو جس سے فساد نماز کا احتمال قوی ہو تو پھر اس کے پیچھے نماز نہ پڑھنا چاہئے، واللہ اعلم، ۶ رمضان ۱۴۲۲ھ

نابالغ بچے کے پیچھے تراویح کا حکم | سوال (۱۰)
اور اس سلسلہ میں ایک حدیث کا بخوانا ... ایک لڑکا نابالغ حافظ قرآن تراویح میں قرآن سناوے، اور پیش امام مقرر شدہ الم ترکیف سے پڑھانے والا حاضر ہے تو آیا امام مقرر شدہ کی حاضری میں لڑکے نابالغ حافظ کے پیچھے اقتدار بالغ مقتدیوں کی جائز ہے یا نہیں، حالانکہ پیش امام مقرر شدہ کی ناراضگی بھی نہ ہو، اور نابالغ لڑکے کے پیچھے قرآن سنانے کی حالت میں تراویح بہتر ہے یا کہ پیش امام مقرر شدہ کے پیچھے الم ترکیف سے بہتر ہے، مفصل جواب آنا چاہئے، بالغ حافظ نہ ہونے کی وجہ سے ضرورتاً بھی نابالغ حافظ کے پیچھے تراویح جائز ہے یا نہیں، ایک مولوی صاحب نے فتویٰ دیلے اور حدیث شریف کا حوالہ دیا ہے، وہ پرچہ بھی ہمراہ اس سوال کے ہے، آیا یہ حدیث اس موقع پر ہے یا کہ اور موقع پر، اس کا خلاصہ مندر ما کر ارسال فرماویں،

(نقل فتویٰ) نابالغ لڑکے کے پیچھے تراویح ہوتی ہے، جیسے حدیث محمد بن مقاتل

سے واضح ہوتا ہے، حدیث ہکذا ان امامۃ الصبی فی التراويح تجوز لان الحسن بن علی رضی اللہ عنہما کان یؤم عائشۃ رضی اللہ عنہا وکان صبیاً حدیث کو ترجیح ہوتی ہے فقہ پر اگر نفل نابالغ کے پیچھے ضعیف ہوتی تو عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کے پیچھے کیوں تراویح پڑھتیں، باقی غایۃ الاوطار والے کو حدیث مذکور نہیں ملی، اگر ملتی تو اختلاف بیان نہ کرتا، قاعدہ بنائے قوی علی الضعیف یہاں پر معتبر نہیں، دیکھو تراویح میں اگر پیش امام باوجود قدرت کھڑے ہونے کے بیٹھا ہو اور مقتدی کھڑے ہوں تو ثواب تراویح میں کچھ فرق نہیں آتا، حالانکہ بنا بر قوی علی الضعیف پائی جاتی ہے، قاعدہ کا ثواب نصف ہی قائم ہے،

الجواب: نابالغ کی اقتدار نہ فرض میں جائز ہے نہ نفل میں، نہ تراویح میں، پس مقتدیوں کو لازم ہے کہ جب بالغ حافظ نہ ہو تو الم ترکیف ہی سے تراویح کسی ناظرہ خواں بالغ کے پیچھے پڑھ لیں نابالغ حافظ کے پیچھے نہ پڑھیں، ہذا ہو الصیح المفتی بہ وما جوزہ مشایخ بلخ ضعیف لا یلتفت الیہ واللہ اعلم، اور ایک جواب جو در سکر پرچہ پر لکھا ہوا ہے، جس میں محدث محمد بن قاتل سے نابالغ کی امامت کو جائز کیا گیا ہے تو اس کے متعلق یہ سوال ہے کہ یہ محدث محمد بن قاتل کس کتاب میں ہے اور اس کی سند کیسی ہے، جب تک سند حدیث معلوم نہ ہو جائے اس وقت تک یہ قابل احتجاج نہیں، اور امامت نابالغ کی مانعت نصوص صریحہ سے ثابت ہے، قال صلی اللہ علیہ وسلم الامام ضامن والمؤذن مؤتمن اخرجہ البزار ورجالہ موثقون واخرجہ الطبرانی الامام ضامن فما صنع فاصنعوا واسنادہ حسن (اعلاء السنن ج ۲ ص ۱۳۲) وظاہر ان الضامن لابد ان یكون اقوی من المضمون وقال صلی اللہ علیہ وسلم ولیؤمکمما اکبرکمما اخرجہ الشیخان وعن ابن مسعود قال لا یؤم الغلام حتی تجب علیہ الحدود وعن ابن عباس قال لا یؤم الغلام حتی یحتمل رواہما الاثرم فی سننہ کذا فی النیل (ص ۳۳ ج ۳) والاشران لیسابانزل من الحسن والا لما سکت عنہما الشوکانی واللہ اعلم پس ان نصوص کے ہوتے ہوئے نابالغ کی امامت جائز نہیں ہو سکتی، ۱۹ رمضان ۱۲۲۵ھ

سوال (۱۱)..... تراویح میں ہر سورۃ پر بسم اللہ پڑھنے یا نہ پڑھنے میں امام عام کی تقلید کی جائے یا امام ابو حنیفہ کی؟

..... نماز تراویح میں بسم اللہ شریف امام ابو حنیفہ کے نزدیک سرّاً یا جہراً ہر سورۃ

کے شروع میں پڑھنا جائز ہے یا ناجائز، یا تمام قرآن شریف میں امام موصوف کے نزدیک صرف ایک ہی مرتبہ پڑھنا ستر یا جہراً کافی ہے، پھر ان میں کونسا عمل امام موصوف کے نزدیک اولیٰ ہے، اور نماز تراویح میں قاری کو کس امام یا راوی کی تقلید ضروری ہے، اور اگر نماز تراویح میں قرآن کے اندر قاری امام ابو حنیفہ صاحب کی تقلید کرے تو مشبہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن تو پڑھا جاتا ہی راوی حفص کی روایت میں پھر امام موصوف کی تقلید کس طرح کرے گا، اور کیونکہ امام صاحب کی تقلید کے موافق یعنی ہر سورۃ کے شروع میں بسم اللہ شریف نہ پڑھی جائے تو حفص کی روایت کے مطابق قرآن مجید پورا نہیں ہوتا، کیونکہ بسم اللہ شریف کو آپ نے ہر سورۃ کا جزء فرمایا ہے، لہذا نماز تراویح میں قاری کو ان میں سے کونسا طریقہ اختیار کرنا چاہئے، اور کس کی تقلید ضروری ہوگی؟ بیوا تو جروا،

الجواب: امام عام یا حفص کی تقلید صرف قرآن کی تلاوت اور وجوہ قرأت میں کی جاتی ہے، باقی احکام صلوٰۃ میں ان کی تقلید نہ ہوگی، بلکہ اس میں فقہاء کی تقلید ہوگی، سو ابو حنیفہ کے نزدیک بسم اللہ صرف ایک مرتبہ پڑھنا ختم قرآن کے لئے ضروری ہے اگر ایک دفعہ کسی سورۃ پر بسم اللہ پڑھ دی گئی تو قرآن پورا ہو گیا، اور بہتر یہ ہے کہ ایک دفعہ تراویح میں اس آیت کو چہرہ پڑھا جائے، جیسا کہ تراویح میں سارا قرآن چہرے سے پڑھا جاتا ہے، اگر امام کسی جگہ بھی بسم اللہ کو چہرے سے نہ پڑھے، بلکہ کسی ایک جگہ ستر پڑھ لے تو امام کا ختم تو پورا ہو جائے گا، لیکن سامعین کے ختم میں ایک آیت کی کمی رہے گی، باقی سب سورتوں کے اول میں بسم اللہ کو چہرے سے پڑھنا امام صاحب کے نزدیک مکروہ ہے، اور ہر سورۃ کے اول میں ستر پڑھنا جائز ہے، بلکہ اگر مقتدیوں پر تطویل کا خوف نہ ہو تو مستحب ہے، واللہ اعلم، ۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ

تراویح کے تردیح میں تمام جماعت کو سوال (۱۲)

چاک وغیرہ پلوانا خلاف سنت بدعت ہے..... یہاں کے پیش امام نماز تراویح میں

چار رکعت و دس رکعت کے بعد تمام جماعت کو مع امام مسجد کے برآمدے میں بلا کر چاکے پلاتے ہیں، اور جب ان کو کہا گیا کہ یہ فعل اچھا نہیں ہے تو یہ جواب دیتے ہیں کہ مکہ شریف اور مدینہ شریف میں ایسا ہی ہوتا ہے، اور کتاب شامی اور درمختار میں یہ مسئلہ موجود ہے، علمائے کرام سے ہم مسلمانوں کی التجا ہے کہ اگر یہ فعل واقعی جائز ہے تو بھی اور اگر ناجائز

ہو تو بھی صحیح سند و مہر کے فی سبیل اللہ لکھ کر روانہ فرماؤں نماز تراویح سے چھوٹی چھوٹی
سورۃ سے پڑھی جاتی تھی،

الجواب؛ قال فی الدرر جلس ندباً بین کل اربعة رالاً وضم قول اکثر بعد
کل اربعة ۱۲ ش) بقدرها وکذا بین الخامسة والوتر والاستراحة علی خمس
تسلیمات مختلف المشایخ فیہ واكثرهم علی انه لا یتحب وهو الصحیح اه
مراده بخمس تسلیمات خمس اشفاع ای علی الركعة العاشرة كما فسر به
فی شرح المنیة ۱۲ ش) ویخیرون بین تسبیح وقراءة وسکوت وصلوة فرائی
رونی النهر واما الصلوٰۃ فقیل مکروهة وقیل سنة وهو ظاهر ما فی السراج
واهل مکة یطوفون واهل المدینة یصلون اربعاً ۱۲ ش) ص ۲۸، و ۳۹ ج ۱
ان عبارات سے معلوم ہوا کہ چار رکعت کے بعد تراویح میں قدرے استراحت و انتظار
مستحب ہے جس میں تسبیح و قراءت و سکوت کا اختیار دیا گیا ہے، اور بعض نے منفرد نماز پڑھنے
کی بھی اجازت دی ہے، اور بعض نے اس سے منع کیا ہے، لیکن کھانے پینے کا اختیار کسی نے
نہیں دیا، اس لئے اکل و شرب کو اس جلسہ میں معمول قرار دے لینا یقیناً بدعت ہے، ہاں اس کا
مضائقہ نہیں کہ کسی نمازی کو پیاس لگے تو وہ بوقت جلسہ پانی پی لے یا کوئی شخص کبھی ضرورت
کی وجہ سے چائے پی لے، لیکن اس جلسہ کو چاء نوشی کا جلسہ قرار دے لینا کہ سب نمازی صحیح
امام کے چاء نوشی میں مشغول ہو جائیں، خلاف سنت اور طریقہ بدعت ہے، اور اہل مکہ و مدینہ
کا فعل زمانہ خیریت میں تو بوقت جلسہ ترویج طواف و صلوٰۃ تھا، اگر اس زمانہ شریعت میں معمول
بدل گیا ہو تو ہمیں اس کا علم نہیں، اور نہ اُن کا یہ فعل حجت ہے، واللہ اعلم، ۲۲ سوال مشکوٰۃ
نماز تراویح میں ہر چار رکعت کے بعد سوال (۱۳) تراویح میں جبکہ ہر چار رکعت کے بعد آرام
امام کس ہیئت سے بیٹھے؟، کے لئے بیٹھتے ہیں امام کو کس ہیئت سے بیٹھنا چاہئے، یعنی
امام کو قبلہ رخ بیٹھ کر آرام لینا چاہئے، یا کہ فجر عصر کی فرض نماز کے بعد امام مقتدیوں کی طرف منہ
کر کے بیٹھتا ہے اس ہیئت سے بیٹھنا چاہئے، سنت کے مطابق بہتر طریقہ ارشاد فرماؤں،
الجواب؛ تراویح کے درمیان بیٹھنے کی کوئی خاص کیفیت منقول نہیں ہے، مگر
فقہاء کے قول سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اگر امام کو تھوڑی دیر بیٹھنا ہو جتنی دیر بعد نماز کے دعا
کرتے ہیں عموماً ہوتی ہے تو اتنی دیر نمازیوں کی طرف پشت کر کے بیٹھنے کا مضائقہ نہیں،

اور اگر اس سے زیادہ دربر بیٹھنا ہو تو دائیں یا بائیں انحراف کر کے بیٹھنا چاہئے، واللہ اعلم
قال الحافظ ويحتمل ان قصر زمان ذلك ان يستمر مستقبلا للقبلة من اجل
انما اليق بالدعاء ويحتمل الاول على ما لو طال الذكر والدعاء، والله اعلم
(ص ۲۸۸ ج ۲ فتح الباری) قلت وقواعدنا لا تباہ فقط
الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ ۵/ ذی القعدہ ۱۳۳۷ھ، عبد الکبیر عفی عنہ من تصبیحہ

سوال (۱۴) حضور نے بہشتی زیور کے دو سکر حصہ میں
افضل ہی یا چار چار رکعت، تحریر فرمایا ہے کہ تراویح کی نماز اگر دو دو رکعت یا چار چار

رکعت کی نیت باندھے دونوں طرح جائز ہے، لیکن کوئی عالم کہتا ہے کہ عربی عجم تک
کوئی دیار میں نہیں دیکھا جاتا ہے، لہذا چار رکعت کی نیت ترک کر کے دو دو رکعت کی
نیت کرنا افضل ہے اور چار رکعت کی نیت کرنا مکروہ کس کتاب میں اس کی دلیل ہے، اطلاع فرماویں؟

الجواب: فی البدائع (ص ۲۸۹ ج ۱) ومنها رای من السنن، یصلی کل
رکعتین بتسلیمة علیہما ووصلی ترویجیہ بتسلیمة واحدة وقعدا الثانية قد را التثمہد لاشک انه يجوز
على اصل اصحابنا ان صلوات كثيرة تتأدى بتحریمية واحدة بناء على ان التخریمية
شرط وليست بركن عندنا خلافا للشافعی لكن اختلف المشايخ انه هل
يجوز عن تسليمتين اولا يجوز الا عن تسليمة واحدة قال بعضهم لا يجوز
الا عن تسليمة واحدة لانه خالف سنته المتوارثة بترك التسليمة
والتحریمية والثناء والقعود والتسمية فلا يجوز الا عن تسليمة واحدة
وقال عامتهم انه يجوز عن تسليمتين وهو الصحيح اهـ،

وفی نور الايضاح وتویر الابصار وہی عشرون رکعة بعشر تسليمة
فی السراجیة کل ترویجیة اربع رکعات بتسليمتين وفی الوقایة والقدری
لکل ترویجیة تسليمتان وفی بحر الرائق (ص ۶۷ ج ۲) مثل ما فی البدائع
وفی البحر ایضا (ص ۵۲ ج ۲) وفی المحيط وانما اخترنا فی التراویح مشنی
مشنی لانها توعی بالجماعة وادأوها على الناس مشنی مشنی اخف وليس
وفی فتح القدیر تحت قول الهدایة رولهما الاعتبار بالتراویح
فان الاجماع على الفضل فيها وفی العناية تحت قول الهدایة (والتراویح

تودی بجماعة) جواب عن اعتبارهما بالتراویح فیراعی فیہا جهة التیسیر
بالقطع بالتسليم عن رأس الركعتین لان ما كان اذوم تحریمه كان اشق
على الناس اھ فتح القدیر (ص ۹۲ ج ۱)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ تراویح میں دو رکعت پڑھنا سنت ہے، لیکن
چار چار پڑھنا بھی بنا بر مذہب صحیح جائز ہے، گو خلاف متواتر ہونے کی وجہ سے
مکروہ تنزیہی ہو، البتہ بحر الرائق و ہدایہ کی تعلیل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم یعنی دو دو
کا افضل ہونا جماعت کے ساتھ خاص ہے، پس ممکن ہے کہ منفرد کے لئے اصل قاعدہ
یعنی امام صاحب کے نزدیک چار چار نوافل افضل ہونے کی بنا پر تراویح بھی چار چار
افضل یا کم از کم مساوی ہوں (وفیہ ان الحكم لا ینتفی بالتقارر التعلیل فابقار الروایة علی
العموم اولی للتواتر و یمکن ان یجاب بان التواتر ثابت فی الجماعة و اما اذا صلی
منفرداً فلا دلیل علی توارثہ فافہم) اور بہشتی زیور کی مخاطب مستورات ہیں، جو نماز تنہا
پڑھتی ہیں، اس لئے بہشتی زیور پر شبہ نہ کیا جاوے، و نیز بہشتی زیور کی عبارت
یہ ہے (چاہے دو دو رکعت کی نیت باندھے چاہے چار چار رکعت کی) اور اس میں یہ
تصریح نہیں کہ دونوں فضل میں مساوی ہیں، بلکہ دونوں کے جواز پر بھی یہ عبارت
محمول ہو سکتی ہے، فلا اشکال علیہ باقی حال،

جماعت ثانیہ تراویح کی ایک صورت | سوال (۱۵) ہمارے یہاں رمضان المبارک کے
شروع سے یہ طریقہ ہو رہا ہے کہ ایک قرآن شریف بعد نماز عشاء تراویح میں سنایا جا رہا
ہے، اور سامع جو کلام مجید سنتا ہے اپنی چار رکعت تراویح باقی رکھ لیتا ہے، یعنی امام کے
ساتھ سولہ رکعت تراویح پڑھتا ہے، بقیہ چار رکعت تراویح اسی مسجد میں امام ہو کر
جس میں ایک یا دو پارہ سناتا ہے پوری کرتے ہیں، مقتدی کل تراویح بعد نماز عشاء ختم
کر لیتے ہیں، جو مقتدی سننے کے شائق ہیں ان کو گھر جا کر جگنہ کا اہتمام بھی ہوتا ہے، جو
قریب ۱۲، ۵ کے ہو جاتے ہیں، ان مقتدیوں میں بعض کی نیت نفل نماز کی اور بعض کی

عہ اشارۃ الی ان لقائل ان یقول ان الثابت امر ان ادار التراویح بالجماعة و ادارہ مثنی امثنی ولا یترک

سنیۃ احدہما علی الآخر ۱۲ منہ

تہجد کی ہوتی ہے، ایسی صورت میں یہ جماعت بلا کراہت جائز ہے یا نہیں، اگر نہیں تو اور کوئی صورت درست ہونے کی ہو سکتی ہے؟

الجواب؛ جیسا کہ وہ حافظ صاحب چار رکعت تراویح میں شامل نہیں ہوتے اسی طرح وہ مقتدی بھی چار رکعت میں شامل نہ ہو کریں، اور پھر چار رکعت جماعت سے پڑھ لیں، کما ہوا ظاہر، لیکن احتیاطاً جگہ بدل دیں، یعنی جہاں پہلی جماعت ہوئی تھی اس جگہ سے الگ پڑھ لیں، کما سیاتی، اور پھر اس تراویح کی جماعت میں کچھ مقتدی نفل پڑھنے والے بھی شامل ہو جائیں، تو مضائقہ نہیں، لکن اقتدار المتطور بمن لیسلی السنۃ وانہ جائز الخ، بدائع ص ۲۹۹، کیا ایک مسجد میں دو مرتبہ سوال (۱۶) ایک مسجد میں دو مرتبہ تراویح کی جماعت مکروہ ہے؟

الجواب؛ تراویح کے تکرار فی المسجد کے متعلق کوئی چیز تہم نہیں ملتا، تراویح کی جماعت مکروہ؟

دوسری جگہ تحقیق کر لیا جاوے، محض رکن الدین پر اعتماد نہ کیا جاوے، البتہ مزید احتیاط کی بناء پر جگہ بدل لیا کریں، تاکہ تکرار مکروہ ہونے کی صورت میں بھی کراہت مرتفع ہو جاوے، اور باوجود تبدیل ہیئت تکرار جماعت فرض تو مکروہ ہے، لیکن تراویح میں بناء بر قول ابو یوسف تبدیل ہیئت سے تکرار مکروہ نہ رہے گا، عن ابی یوسفؒ انہ اذا لم تکن الجماعۃ علی الہیئۃ الاولی لا تکرہ والا تکرہ وهو الصحیح وبالعدل عن المحراب تختلف الہیئۃ کذا فی البزازیۃ ام (شامی ص ۱۷۵، ۱۷۶) اور امام ابو یوسفؒ کا قول مذکور گو عام ہے، لیکن فرائض میں اس پر فتویٰ نہیں دیا جاتا، اور تراویح میں فرائض سے توسع ہے اس لئے تراویح میں اس پر عمل کی گنجائش ہے، اور یہ کلام اس تکرار میں ہے جو امام آخر اور مقتدین آخرین کے ساتھ ہو، اور اگر پہلا امام اور پہلے مقتدی ہی تکرار کریں تو وہ مطلقاً مکروہ ہے، خواہ مسجد میں ہو یا غیر مسجد میں، ہو صرح فی البدائع ص ۲۹۹، عبد الکریم عفی عنہ، رمضان، الجوامع خلا احمد عفی عنہ

سوال (۱۷) بہشتی گوہر ص ۳۹ میں تراویح کا بیان بہشتی گوہر کے ایک مسئلہ متعلق تقدیم وتر علی التراویح پر شبہ کا جواب، مطالعہ کر رہا تھا، وقت تراویح کے متعلق یہ عبارت

دیکھی گئی کہ وتر کا بعد تراویح کے پڑھنا بہتر ہے، اگر پہلے پڑھ لے تب بھی درست ہے (مراتی الفلاح ص ۲۴۰) اس سے مجھے شبہ پیدا ہوا، اس لئے کہ میرے علم میں اس کے برعکس ہے، یعنی وتر کا پہلے تراویح سے پڑھنا بہتر ہے، اگر بعد کو پڑھے تب بھی درست ہے، لیکن چونکہ حوالہ موجود تھا، خیال ہوا ممکن ہے کہ میری ہی معلومات غلط ہو دفع شبہ کے لئے مراتی الفلاح

محال گئی اس میں یہ عبارت ملی ہے کہ (وقتہا) ما (بعد صلوٰۃ العشاء) علی الصحیح الی طلوع الفجر (و) لتبیعتهما للعشاء (یصح تقدیم الوتر علی التراویح و تاخیرہ عنہا) وہو افضل الخ پھر حاشیہ طحاوی میں لکھتے ہیں کہ (وقوله ویصح تقدیم الوتر علی التراویح الخ) وقیل وقتہا بعد العشاء وقبل الوتر وہ قال عائشا مشایخ بخاری، اس سے میری معلومات کی تائید ہوتی ہے، تاہم چونکہ میں ایک ادنیٰ طالب العلم ہوں کہ ارجاع ضمیر میں غلطی ہو، بنا بریں آپ سے درخواست ہے کہ مراقی الفلاح کی عبارت کا وہی مطلب ہے جو بہشتی گوہر میں مندرج ہے، یا نہیں، اگر نہیں تو معلوم کروں گا کہ یہ کاتب ہی کی غلطی ہے، صحیح کر لیا جائے گا، انشاء اللہ، اور اگر بہشتی گوہر کی عبارت کی تائید کرتا ہو، تو میں اپنے کو اس شبہ سے بچا لوں گا،

الجواب: بہشتی گوہر کا مسئلہ درست ہے، مراقی الفلاح میں وہو افضل کا مرجع تاخیرہ عنہا ہے، اور طحاوی میں قول مشایخ بخاری بعد العشاء وقبل الوتر کو قیل سے تعبیر کرنا خود اس کے ضعف کی علامت ہے، فافہم، ۲۷ رجب ۱۳۸۶ھ

جماعت ثانیہ تراویح کی | سوال (۱۷) یہاں پر تین چار سال سے متواتر رمضان شریف ایک صورت کا حکم میں بعد نصف شب کے اس طرح سے قرآن شریف پڑھا جاتا ہے کہ امام جو بعد نصف شب کے قرآن شریف سنانا ہے، اول شب کی تراویح میں بجائے بیس رکعت کے ۱۶ رکعت پڑھتا ہے، چار رکعت تراویح میں بعد نصف شب قرآن شریف سنانا ہے، لیکن کُل مقتدی تہجد کی نیت باندھتے ہیں، جن کی تعداد دس پندرہ کے قریب ہوتی ہے، اور ان میں سے بعض بعض کو بلانا اور جگانا بھی پڑتا ہے، کیونکہ اس جماعت میں جواز کی صورت تھی، اس لئے یہ عمل دوسرے قرآن شریف کا ثواب حاصل کرنے کے واسطے کیا جاتا تھا، کیونکہ تنہا پڑھا نہیں جاتا، اگر ایسا نہ کیا تو اس ثواب کے محروم رہیں گے، لیکن اس کے ساتھ حسب ذیل مفسدات بھی نظر آتے ہیں، یہ جماعت اس نام سے موسوم ہے کہ (تہجد میں قرآن شریف ہوتا ہے) دوسری مسجد والوں نے ہماری جماعت دیکھ کر تہجد کی نوافل میں جماعت شروع کر دی، جو مکروہ تحریمی ہے، یہ غلط فہمی جماعت مذکورہ بالا کی وجہ سے ہوئی، دوم ایک ہی مسجد میں ایک پوری جماعت تراویح کی ہو کر دوسری جماعت تراویح کی ہوئی، اور مقتدیوں میں کوئی تراویح پڑھنے والا نہیں ہوتا جو امور مختلف فیہ میں ہے،

توسیم جو مقتدی اخیر شب کو قرآن شریف سنتے ہیں، اور رات کو زیادہ جاگنے کے عادی نہیں ہیں ان کو حکایا جاتا ہے، بعض کی صبح کی نماز یا صرف جماعت جاتی رہتی ہے، ممکن ہے اس جماعت کی وجہ سے صبح کی نماز یا جماعت فوت ہوئی ہو، چہارم قصداً بیس رکعت ایک ساتھ نہیں پڑھی بلکہ سولہ رکعت اور چار رکعت کے درمیان وقفہ دیا گیا، پنجم جہاں تک خیال ہے سلف میں بھی ایسا عمل نہ ہوا ہوگا، ایسی صورتوں کا خیال کرتے ہوئے کہ مفسدات بھی نظر آتے ہیں اور پابندی کے ساتھ کئی سال سے جماعت ہو رہی ہے، جناب والا سے گزارش ہے کہ جناب ایسی جماعت کے واسطے اجازت دیتے ہیں یا نہیں؟

الجواب؛ قال الطحاوی فی حاشیته علی مروی الفلاح وکبرہ ان یؤم فی التراويح مرتین فی لیلۃ واحدة وعلیہ الفتوی لان السنة لا تتكرر فی الوقت الواحد فتقع الثانية نفلاً مضمراً بخلاف ما لو صلاها ما موما مرتین حیث لا یکرہ كما لو ام فیہا ثم اقتدی بآخر فی تلك الصلوة وکما لو صلی العشاء اماماً او مقتدیاً ثم اقامت ثانیاً فانه لا یکرہ له ان یدخل فیہا ثانیاً بل یمتثل به ام (ص ۲۳۹) یہ صورت عمل فی نفسہ تو جائز تھی، جیسا کہ عبارت مذکورہ سے معلوم ہوا، مگر ان مفسد کے انضمام سے جو سوال میں ہیں کہ عوام اس کو جماعت تراویح نہیں بلکہ جماعت ہتجد سمجھتے ہیں اور دوسکڑوگوں نے اس کو دیکھ کر جماعت نواقل محضہ بھی شروع کر دی، یہ قابل ترک بلکہ واجب ترک ہے، فان المباح والمستحب اذا دلی الی مفسدة یجب ترکہ صریح بہ الفقہاء قاطبہ، والذاعلم، غرہ رمضان ۱۴۵۸ھ

تراویح کی بیس رکعت ہونے کے دلائل | سوال (۱۹) رمضان کی بیس تراویح کی اصل حدیث سے تحریر فرمائیں، اور ایک حدیث سے نہیں بلکہ کئی ایک حدیثیں تحریر فرماویں، کیونکہ اس جگہ پر آٹھ تراویح پڑھی جاتی ہیں، ان کو بیس تراویح کا ثبوت اور یقین دلانا بھی ضروری ہے اور اس کے اندر اور بات خیال نہ فرماویں،

الجواب؛ عن یزید بن حنیفہ عن النساب بن یزید رضی اللہ عنہ قال کانوا یقومون علی عهد عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فی شہر رمضان بعشرین رکعة، رواہ البیہقی واسنادہ صحیح، وعن یزید بن اومان انه قال کان الناس یقومون فی زمان عمر بن الخطاب فی رمضان بثلاث وعشرین رکعة رواہ النسائی رواہ

مالک و اسنادہ مرسل قوی، وعن عبد العزیز بن رفیع قال کان ابی بن کعب یصلی بالناس فی رمضان بالمدينة عشرة عشرین رکعة ویوتر بثلاث اخرجہ ابوبکر بن ابی شیبہ فی مصنفہ و اسنادہ مرسل قوی ام من اثار السنن للنیہوی ص ۵۵ ج ۲، ان سب احادیث سے تراویح کی بیس رکعات کا ثبوت ظاہری اور آثار السنن میں ان کے علاوہ اور بھی بہت احادیث مذکور ہیں، اور اگر ان احادیث میں حضور کا عمل مذکور نہیں بلکہ صحابہ کا عمل مذکور ہے، مگر ظاہر ہے کہ حضرات صحابہ اپنے عمل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے متبع تھے، پس ان کا ایسا عمل جس پر بعد میں سب نے اتفاق کر لیا ہو یقیناً حجت ہے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ان کے پاس اس عمل کی کوئی دلیل ضرور موجود تھی، قال بن قدامة فی المغنی ولنا ان عمر لما جمع الناس علی ابی بن کعب کان یصلی لہم عشرین رکعة وعن علی انه امر رجلاً یصلی بہم فی رمضان عشرین رکعة و هذا کالاجماع الی ان قال ما فعل عمر و اجمع علیہ الصحابة فی عصرہ اولی بالاتباع ام (فتاویٰ) پس ان آثار موقوفہ سے اس حدیث مرفوعہ کی تقویت ہو گئی جس کو ابی شیبہ نے مصنف میں روایت کیا ہے، حد ثنائیز بن ہارون قال انا ابراہیم بن عثمان عن الحكم عن مقسم عن ابن عباس ان رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کان یصلی فی رمضان عشرین رکعة والوتر ام من اثار السنن ص ۵۶ ج ۲) و ابراہیم بن عثمان حد الثمام ابی بکر بن ابی شیبہ ضعیف، اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہ نفس نفیس بیس رکعت پڑھنا معلوم ہوا، مگر اس میں صرف ایک راوی ضعیف ہے جس کا ضعف آثار قویہ مذکورہ سابقہ سے منجر ہو گیا، واللہ اعلم، ۲۲ رمضان شریف ۱۳۵۵ھ

المفاتیح لا بواب التراويح سوال (۲۰) بعد الحمد والصلوة، غیر مقلدین کی طرف سے ایک اشتہار شائع ہوا ہے، جس میں تراویح کی گیارہ بجواب اشتہار التحقیق فی اعداد التراويح رکعت کے سنت ہونے پر زور دیا گیا ہے، اور بیس رکعات کی سنیت سے انکار کیا گیا ہے، اور ستم ظریفی دیکھو کہ حاشیہ اشتہار میں حنفیہ کو

عہ اشتہار کا عنوان "التحقیق فی اعداد التراويح" تھا، اور اشتہار کا نام حافظ محمد عمر ٹھیکہ دار روہانڈی اکبر کو لکھا ہوا تھا، یہ بواجبی دیکھئے کہ ٹھیکہ دار بھی مجتہد بننے کا دعویٰ کرتے ہیں، کیونکہ حدیث سے ایک مسئلہ کو ثابت کرنا اور دوسرے عالموں کے مسئلہ کو رد کرنا مجتہد ہی کا تو کام ہے ۱۲ منہ

اعلا دیا ہو کہ جو کوئی حدیث صحیح جو اپنے معنی میں صریح ہو پیش کر دے اس کو دس روپیہ انعام فی حدیث دیا جائے گا۔

اس کے جواب میں مجھے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ پہلے جماعت غیر مقلدین حدیث صحیح کی تعریف کسی حدیث ہی سے بیان کر دیں، اور حدیث رسول ہی سے یہ ثابت کریں کہ حدیث حسن اور ضعیف و مرسل و معضل و شاذ و منکر و مدلس وغیرہ کی یہ تعریف ہے، اور ان میں سے فلاں قابل قبول ہے اور فلاں قابل قبول نہیں، بلکہ قابل رد ہے، تو ہم اُن کو فی حدیث مرفوع بجائے دس کے دہ چند دینے کو تیار ہیں، اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول صریح سے ان امور کو ثابت نہ کر سکیں تو پھر وہ ہم کو بتلائیں کہ حدیث صحیح کے معنی جو کچھ بھی اُن کے نزدیک ہیں انھوں نے کہاں سے اخذ کئے، کتاب اللہ اور سنت رسول سے تو یقیناً ماخوذ نہیں، پھر کہیں قیاس و اجماع سے تو ماخوذ نہیں، جس سے غیر مقلدین کو سوں دور بھاگتے ہیں، اگر قیاس و اجماع سے ماخوذ ہو تو براہ کرم یہ بھی بتلا دیں کہ قیاس و اجماع صحابہ کا ہے یا تابعین کا، اور تابعین میں سے فقہاء کا ہے یا محدثین کا یا دونوں کا، اور یہ کہ فقہاء یا محدثین کا قیاس و اجماع غیر مقلدوں کے نزدیک اس بارے میں حجت کیونکر ہو گیا، جن کے یہاں تقلید علماء شرک ہے، کیا براہ عنایت وہ کسی آیت یا حدیث سے یہ ثابت کریں گے کہ حدیث کی تعریف و تصحیح تضعیف وغیرہ میں فقہاء یا محدثین کا قیاس و اجماع حجت ہے، اور اس کی تقلید حنفیہ اور غیر مقلدین سب پر فرض ہے، اور باقی مسائل میں تقلید حرام اور شرک ہے، جب تک جماعت غیر مقلدین ان سب مسائل کو حدیث ہی سے ثابت نہ کر دیں اُس وقت تک اُن کو کسی مسئلہ میں نہ خود حدیث صحیح پیش کرنے کا حق ہے نہ حنفیہ سے مطالبہ کا حق ہے، کیوں کہ جو حدیث وہ پیش کریں گے ہم کو ان سے اس سوال کا حق ہے کہ اس حدیث کا صحیح ہونا ... کتاب اللہ سے معلوم ہوا یا سنت رسول سے یا قیاس سے یا اجماع سے، الی آخر سوالات الہی ذکرناہا،

نیز ہم کو یہ بھی سوال کرنے کا حق ہے کہ اس کی کیا وجہ کہ قبول حدیث و رد حدیث میں بخاری و مسلم و ترمذی و احمد وغیرہ کی تقلید تو حجت اور واجب یا جائز ہو، اور فہم معانی حدیث میں ابو حنیفہ و مالک و شافعی رحمہم اللہ کی تقلید ناجائز و حرام ہو، کما ہو زعم الطائفۃ

الغیر المقلدین،

اس کے بعد میں کہتا ہوں کہ غیر مقلد مشہر نے جس قدر حدیثیں اپنے اشتہار میں
 گیارہ رکعت تراویح کے متعلق درج کی ہیں، اور ان کی صحت کا دعویٰ کیا ہے اس نے اپنے
 اس دعوے کی صحت پر کوئی دلیل کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ سے قائم نہیں کی، پھر
 وہ کیونکر ان کو صحیح کہتا اور ان کے تسلیم کو ہم پر لازم بتاتا ہے، اور اگر اقوال علماء ان کی صحت
 ثابت کرنے کا مدعی ہی، تو وہ ان علماء کا نام لے جنہوں نے ان کو صحیح کہا ہے، اور بتلائے کہ
 اس معاملہ میں وہ ان کی تقلید کیوں کرنے لگا، نیز ہم کو ان کی تقلید پر کس دلیل سے مجبور کر سکتا
 آپ میں اس کی پیش کردہ احادیث کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں، اس نے سب سے پہلے
 بخاری و مسلم کے حوالہ سے حضرت عائشہ رضی کی یہ حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم رمضان و غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہ پڑھتے تھے اھ
 اس کا جواب یہ ہے کہ غیر مقلد کو صلوٰۃ اللیل کی کیفیت و کمیت کے متعلق حضرت
 عائشہ رضی کی تمام روایات کو دیکھنا چاہئے تھا، جو بخاری و مسلم و سنن اربعہ میں مذکور ہیں،
 اگر وہ سب روایتوں کو دیکھ لیتا تو ہرگز اس کو دلیل میں پیش کرنے کی جرأت نہ کرتا، کیونکہ
 حضرت عائشہ رضی سے کسی روایت میں تو یہ منقول ہے کہ آپ گیارہ رکعت سے زیادہ نہ پڑھتے
 تھے، نہ رمضان میں نہ رمضان کے علاوہ، اور بعض روایات میں بخاری کی یہ ہے کہ آپ تیرہ
 رکعتیں پڑھتے تھے، اور بعض روایات مسلم میں یہ ہے کہ آپ وتر کے بعد دو رکعتیں بیٹھ کر
 بھی پڑھتے تھے، تو کل مقدار رکعات پندرہ ہوں گی، اور بعض روایات سے سترہ رکعتوں کا
 ثبوت ہوتا ہے، اسی لئے امام قرطبی شاح مسلم نے فرمایا ہے کہ حضرت عائشہ رضی کی روایات
 میں بہت سے اہل علم کو اشکال و خلیجان ہی، حتیٰ کہ بعض علماء نے ان کی حدیث کو مضطرب
 کہا ہے، دیکھو فتح الباری (ص ۳، ج ۳) قال القرطبی اشکلت روایات عائشہ
 علی کثیر من اهل العلم حتی نسب بعضهم حدیثها الی الاضطراب اب اھ
 اور جس نے اصول حدیث پڑھا ہے، وہ جانتا ہے کہ حدیث مضطرب کے استدلال و احتجاج
 صحیح نہیں، جب تک اضطراب رفع نہ ہو، پس اول غیر مقلد مشہر اس حدیث کے
 اضطراب کو رفع کرے، اس کے بعد اس سے احتجاج کرے اور اضطراب کو رفع کرتے
 ہوئے یہ بھی سوچ لے کہ حنفیہ پر اس کی بیان کردہ تاویل و تقریر حجت نہ ہوگی، ممکن ہی

کہ وہ کسی دوسری تقریر سے اضطراب کو رفع کریں، نیز یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ حضرت عائشہؓ کی دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں اور دنوں سے زیادہ عبادت کرتے تھے، پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ آپ رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ ہی رکعتیں پڑھتے ہوں، اور یہ احادیث ہم آئندہ بیان کریں گے،

اس کے بعد اس نے صحیح ابن خزمیہ وابن حبان کے حوالہ سے حضرت جابرؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم لوگوں کو رمضان میں آٹھ رکعت نماز اور وتر پڑھائی اھ اس حدیث کو بیان کرتے ہوئے غیر مقلد کو شرمانا چاہئے، کیونکہ اب تک لوگ تراویح کی جماعت کو سنت نبویہ نہ کہتے تھے، بلکہ الگ الگ تراویح پڑھنے کو سنت نبویہ اور جماعت تراویح کو سنت عمریہ کہتے تھے، اب وہ وقت آگیا کہ غیر مقلدین بھی جماعت تراویح کو سنت نبویہ ماننے لگے، صرف عدد میں اختلاف رہ گیا، سو انشاء اللہ کچھ دنوں میں یہ اختلاف بھی رفع ہو جائے گا،

اب سنئے کہ اس حدیث سے غیر مقلد نے بیس رکعت تراویح کی نفی پر استدلال کیا ہے، حالانکہ اس سے بینہ کی نفی کسی طرح بھی نہیں ہوتی، کیونکہ ایک عدد کا ثبوت دوسرے کی نفی کو مستلزم نہیں، البتہ اگر غیر مقلد اس بات کو ثابت کر دے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کی ہر رات میں تراویح کی جماعت کا اہتمام کرتے تھے، اور صحابہ کو عام طور پر اس کی اطلاع تھی، اور حضرت جابرؓ تراویح کی جماعت میں شروع سے آخر تک شریک تھے، تو بیشک اس سے بیس رکعت کی نفی ہو جائے گی، ورنہ یہ احتمال باقی رہے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز تراویح آٹھ رکعت سے زیادہ پڑھی ہوگی، اور صحابہ کو بوجہ خوف فرضیت کے جمع نہیں کیا، اور اس لئے عام طور پر سب کو اطلاع نہیں کی، پھر کیفما اتفق جس کو جس وقت خبر ملی آکر شریک ہو گیا، منجملہ ان کے حضرت جابرؓ بھی تھے جن کو آٹھ رکعت ملی، اور اس احتمال کی تائید حضرت عائشہؓ کی اُس حدیث سے ہوتی ہے جو بخاری (صفحہ ۱۵۲ ج ۱) میں مذکور ہے، ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلی ذات لیلۃ فی المسجد فصلی بصلوۃ ناس ثم صلی القابلۃ فکثر الناس ثم اجتمعوا من الثالثۃ فلم یخرج الیہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقال لم یمنعنی من الخروج الیکم الا انی خشیت ان یفرض علیکم الحدیث

اس کے بعد غیر مقلد مشہر نے امام محمد مروزی کے قیام اللیل سے حضرت جابرؓ کی یہ حدیث بلا سند نقل کی ہے کہ حضرت ابی بن کعبؓ صحابی رمضان میں آپ کے پاس آئے اور کہا یا رسول اللہ! آج رات مجھ سے کچھ ہو گیا ہے، فرمایا بیان کرو، کہا میرے محلہ کی عورتوں نے کہا کہ ہم قرآن نہیں پڑھ سکتے ہیں، ہم تمہارے پیچھے نماز پڑھیں گے، تو میں نے ان کو آٹھ رکعت نماز پڑھائی، اور وتر پڑھا ہے، آپ سن کر خاموش ہو گئے، الخ

اس کے متعلق عرض ہے کہ غیر مقلد نے اس حدیث کی سند نقل نہیں کی، اور نہ کسی امام کے قول سے اس کی تصحیح بیان کی، اور بدون اس کے اس کو استدلال کا کیا حق ہے، افسوس! غیر مقلد ہم سے تو حدیث صحیح و نص صریح کا مطالبہ کرتے ہیں اور خود مطلق العنان ہو کر احادیث نقل کرتے ہیں، گویا حدیث کے صحیح کرنے کی باگ اُن کے ہاتھ میں ہے کہ جس کو چاہیں گے صحیح کر دیں گے، پس اول غیر مقلد اس حدیث کی صحت ثابت کرے، اور اس کے بعد یہ بتلائے کہ اس سے بین کی نفی کیونکر ہوئی، کیا یہ احتمال نہیں کہ حضرت ابی بن کعبؓ نے بارہ رکعت تراویح حضور کے پیچھے مسجد میں یا تنہا پڑھ لی ہوں، اس کے بعد گھر پہنچے اور عورتوں کے اصرار پر آٹھ رکعت اُن کو پڑھا دی ہوں!

اس کے بعد مشہر نے موطا امام مالکؒ و مصنف ابن ابی شیبہؒ و سنن سعید بن منصورؒ سے سائب بن یزید کا یہ اثر بیان کیا ہے کہ امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب و یمیم داری رضی اللہ عنہما کو فرمایا کہ لوگوں کو گیارہ رکعت پڑھایا کرتے ہو، مشہر کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ اثر صحیح نہیں ہے، گویا سب ثقہ ہیں، مگر یہ مضطرب المتن ہے، محمد بن یوسف راوی پر اس میں اختلاف ہوا ہے، مالک اور یحییٰ قطان اور عبدالعزیز بن محمد نے محمد بن یوسف سے گیارہ رکعت روایت کی ہیں، اور قیام اللیل مروزی میں محمد بن اسحق نے محمد بن یوسف سے تیرہ رکعت روایت کی ہیں، اول مصنف عبدالرزاق میں داؤد بن قیس وغیرہ نے انہی محمد بن یوسف کے واسطے سے سائب بن یزید سے اکیس رکعت بیان کی ہیں، دیکھو فتح الباری (ص ۲۱۹ ج ۲) و (عمدة القاری ص ۳۵ ج ۵) اور حافظ ابن عبد البرؒ نے گیارہ رکعت کی روایت کو راوی کا وہم بتلایا ہے، دیکھو زرقانی شرح موطا (ص ۲۱۵ ج ۱) اور سائب بن یزید سے محفوظ اور صحیح روایت وہ ہے جس کو مالک اور یحییٰ نے یزید بن خصیفہ کے واسطے سے

سائب بن یزید سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بیس رکعت (تراویح) اور وتر کے ساتھ قیام رمضان ہوتا تھا، دیکھو (التعلیق الحسن ص ۵، ج ۲) اور (فتح الباری ص ۲۱۹ ج ۲) اور اس کے محفوظ اور صحیح ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے الفاظ میں راویوں نے اختلاف نہیں کیا، دوسرے اس کے مؤیدات بہت زیادہ ہیں، منجمان کے وہ ہے جو مالک نے موطا میں یزید بن رومان سے روایت کیا ہے، کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں لوگ رمضان میں تیس رکعت کے ساتھ قیام کرتے تھے، (مراد تراویح) اور ابن ابی شیبہؒ نے اپنے مسنف میں بھی بن سعیدؒ سے روایت کیا ہے، کہ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ لوگوں کو بیس رکعت پڑھائے، اور ابن ابی شیبہؒ نے عبدالعزیز بن رفیع سے روایت کیا ہے کہ ابن کعبؒ رمضان میں مدینے کے لوگوں کو بیس رکعت (تراویح) اور تین رکعت وتر پڑھاتے تھے، اور ان تینوں کی سند صحیح ہے، (دیکھو موطا اور تعلیق حسن) البتہ یہ مؤیدات مرسل ہیں، مگر مرسل کے سب راوی ثقہ ہوں تو وہ ہمارے نزدیک مثل موصول کے ہے، اگر غیر معتدل اس کے ضعیف ہونے کا دعویٰ کریں تو کتاب و سنت سے دلیل لائیں، کسی عالم کا قول بیان نہ کریں، کیونکہ کسی عالم کا قول جب خود ان کے اوپر حجت نہیں تو دوسروں پر اس سے حجت قائم کرنے کا ان کو کیا حق ہے، دوسرے اگر وہ دو عالموں کا قول اپنی تائید میں لائیں گے تو ہم دن کا قول اس کے خلاف دکھلا سکتے ہیں،

مشہر نے حافظ ابن حجرؒ کا قول نقل کیا ہے کہ پہلا عدد گیارہ رکعت کا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کے موافق ہے، اہم، اس کے متعلق صرف ہم یہ چاہتے ہیں کہ اول مشہر یہ بتلائے کہ کیا وہ حافظ ابن حجرؒ کا مقلد ہے، یا ان کی تقلید کو دوسروں پر واجب سمجھتا ہے، دوسرے فتح الباری کی عبارت بعینہ مع حوالہ صفحہ وسط کے شائع کرے، کیونکہ ہم کو مشہر کی فہم کا چند مواقع کے مطالعہ سے انداز ہو گیا ہے کہ وہ کچھ کا کچھ سمجھ جاتا ہے، یا مخلوق کو دھوکہ دینا چاہتا ہے ہم اس کو متنبہ کرتے ہیں کہ یہ قول حافظ ابن حجرؒ کا نہیں، بلکہ ابن اسحاق صاحب مغازی کا ہے، اور گیارہ کے متعلق نہیں بلکہ تیرہ کے متعلق ہے، اس کے بعد اس نے علامہ جلال الدین سیوطیؒ کے رسائل تسعہ کے حوالہ سے امام مالک کا یہ قول نقل کیا ہے کہ انھوں نے گیارہ رکعت کو زیادہ محبوب بتلایا ہے، اور یہ کہ یہی معتد ر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی تھی، اور فرمایا کہ میں اسکی وجہ نہیں جانتا کہ یہ زیادہ رکعتیں کہاں سے اور کیوں پیدا ہو گئیں اہم ملخصاً،

اس کے متعلق بھی ہم سوالات مذکورہ کا اعادہ کر کے یہ کہتے ہیں کہ بالفرض اگر یہ قول امام مالکؒ سے کسی نے نقل بھی کیا ہو تو اس کی سند دیکھنا ضروری ہے، ورنہ امام مالکؒ کی طرف اس کی نسبت جائز نہیں ہو سکتی، کیونکہ مدونہ مالک میں جو محضون مالکی ثقہ کی روایت ابن القاسم مالکی ثقہ سے ہے، اور ابن قاسم بلا واسطہ امام مالکؒ کے شاگرد ہیں اس کے خلاف یہ قوم ہے، قال مالک بعث الی الامیر وادان ینقص من قیام رمضان الذی کان یقومہ الناس بالمدينة قال ابن القاسم وهو تسعة وثلاثون رکعة مت وثلاثون رکعة والوتر ثلاث قال مالک فنیہتہ ان ینقص من ذلك شیئا وقلت له هذا ما ادرکت الناس علیہ وهذا الاثر القدیم الذی لم تنزل الناس علیہ (ص ۱۹۳) ، جس میں صاف تصریح ہے کہ امام مالک کے نزدیک تراویح چھتیس رکعت ہی، اور وہ اس سے کم کرنے کو منع کرتے ہیں اور اس کو عمل قدیم سمجھتے ہیں، پھر یہ کیسے ممکن ہو کہ امام مالک گیارہ رکعت سے زیادہ پر تعجب ظاہر کرتے ہوں، اور یوں کہیں کہ میں اس کی وجہ نہیں جانتا کہ یہ زیادہ رکعتیں کہاں سے پیدا ہو گئیں،

اس کے بعد مدونہ میں نافع اور حضرت عمر بن عبدالعزیز سے چھتیس رکعت کی روایت نقل کی گئی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ امام مالکؒ کے پاس عمل اہل مدینہ کے علاوہ روایت بھی گیارہ رکعت سے زیادہ کے ثبوت میں موجود ہے،

اس کے بعد مشہر نے علامہ عینی حنفی کی شرح بخاری سے یہ نقل کیا ہے کہ بعض ائمہ کا مذہب گیارہ رکعت تراویح کا ہے، اور اسی کو امام مالک نے اپنے نفس کے لئے پسند فرمایا الخ آس کے متعلق ہم کو مشہر کے انصاف کی داد دینا ضروری ہے، کہ علامہ عینی حنفی نے جس عدد کو جمہور صحابہ اور جمہور علماء سے نقل کیا تھا، اور جس کی تائید میں بہت آثار نقل کئے تھے اس کو تو چھوڑ دیا اور جس قول کو سب اخیر میں تضعیف کے صیغہ سے نقل کیا تھا اس پر زور دینے لگا، دوسرے ہم اس کے متعلق بھی تصحیح سند کا مطالبہ کرتے ہیں، کیونکہ امام مالکؒ کا قول مدونہ میں اس کے خلاف مذکور ہے، اور مدونہ فقہ مالکی کا فتاویٰ معتبر ہے، اس کے مقابلہ میں کوئی روایت امام مالک کی طرف، منسوب نہیں کی جاسکتی، اگر امام مالکؒ کے نزدیک گیارہ رکعت مختار تھیں تو مدونہ میں ضرور اس کا ذکر ہوتا، قاضی ابن رشد نے بھی ہدایۃ المجتہد میں امام مالکؒ سے ایک روایت تو بیس رکعت کی جمہور کے موافق نقل کی ہے، اور دوسری روایت چھتیس رکعت

کی نقل کی ہے گیارہ کا کوئی ذکر نہیں، پس گیارہ کی روایت مالک سے یقیناً ضعیف ہے،
اور شیخ ابوبکر بن اعرابی ائمہ مجتہدین میں سے نہیں ہیں، بلکہ خود مقلد ہیں، ان کا قول مقلدین
پر حجت ہے، اور غیر مقلدین سے حجت ہے کہ وہ امام ابو حنیفہ و شافعی و مالک و احمد کی تقلید سے تو
عار کرتے ہیں اور ان کے مقلدوں کی تقلید کو تیار ہیں، کہیں حافظ ابن حجر کا نام لیتے ہیں کہیں
حافظ ابوبکر بن عربی کا،

اس کے بعد مشہور نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی مابثت بالسنة اور شرح مشکوٰۃ وغیرہ
کے حوالے سے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ صحیح روایت وہ ہے جسکو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے
روایت کیا ہے کہ آپ نے گیارہ رکعتیں پڑھیں، جیسا کہ آپ کی قیام اللیل میں عادت تھی
اور نقل کیا گیا ہے کہ بعض سلف امیر المؤمنین عمر بن عبد العزیز کی خلافت میں گیارہ رکعت
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشابہت کی نیت سے پڑھتے ہیں، اور،

اس عبارت کے نقل کرنے میں مشہور نے بڑی چالاکی سے کام لیا ہے، کیونکہ اس نے اس
قول کو جو شیخ عبدالحق نے محدثین سے نقل کیا تھا خود شیخ کا قول بتا کر حنفیہ کو دھوکا دیا
ہے کہ دیکھو شیخ عبدالحق حنفی بھی گیارہ رکعت کے قائل ہیں، حالانکہ شیخ کی عبارت اس
طرح ہے فعندنا ہی عشر و رکعة لماروی البیهقی باسناد صحیح الی ان قال
وروی ابن عباس عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشرین رکعة فی رمضان و او تر بعدھا
بثلث لکن المحدثین قالوا ان هذا الحديث ضعيف والصحيح ما وrote عائشة
انه صلی اللہ علیہ وسلم رکعة الخ جس کو ذرا بھی عربی سے مس ہوگا وہ سمجھ جائے گا کہ گیارہ
رکعت کے عدد کو ترجیح شیخ عبدالحق خود نہیں دے رہے، بلکہ محدثین کا قول نقل کر رہے ہیں،
اور خود شیخ کے نزدیک تو رائج بیس ہی کا عدد ہے، جسکو سب سے اول بیہقی کی سند صحیح کے حوالے
سے لکھا ہے، اور خلافت عمر بن عبد العزیز جن بعض سلف کا فعل بیان کیا جاتا ہے اس کی
کوئی سند نہیں، نہ یہ معلوم کہ یہ بعض سلف کون ہیں، کہیں محمد بن اسحق صمغانی اور واقفی
تو نہیں؟ اور ایسی بے سند بات سے استدلال کرنا غیر مقلد کی اتباع حدیث صحیح کی کافی دلیل
ہے، اس کے بعد مشہور نے حضرت محمد دالوف ثانی کا قول مبداء و معاد سے نقل کیا ہے کہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے ساتھ مشابہت کرنا چاہتے، اگرچہ بحسب ظاہر
کیوں نہ ہو، الخ یہی کہتا ہوں کہ یہ تو ہر حنفی کا ایمان ہے، اور تمام مقلدین خواہ حنفی ہوں

یا شافعی تراویح کی بیس رکعتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سنت کا اتباع کر کے پڑھتے ہیں، اور ہم اور محمد ثنیں ہی کے قول سے بتلا چکے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی وہ روایت جس میں گیارہ کا ذکر ہے مضطرب ہی اور جب تک اضطراب رفع نہ ہو اس وقت تک وہ حدیث حجت نہیں،

اس کے بعد مشہور نے علامہ ابن ہمام کا قول فتح القدیر سے نقل کیا ہے کہ حاصل احادیث و آثار صحابہ سے از روئے دلیل یہ ہے کہ تراویح سنت گیارہ رکعت مع وتر عجا ہیں الخ مشہور نے علامہ ابن ہمام کی عبارت میں ایسی کانٹ چھانٹ کی ہے، جس نے اس کی دیانت کی قلعی کھول دی، علامہ ابن ہمام کی عبارت سے یہ مطلب ہرگز نہیں نکلتا، کہ تراویح بیس رکعت سنت نبویہ نہیں، بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ بیس رکعت تراویح اور وتر میں سے گیارہ رکعت تو سنت نبویہ ہے، اور باقی بارہ رکعتیں سنت خلفاء راشدین ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو سنت خلفاء کے اتباع کی بھی دعوت دی ہے، اپنے ارشاد علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدين راخرجه الترمذی قال حسن صحیح (اھ میں،

بتلاتے اس سے یہ مطلب کیونکر نکلا کہ تراویح بیس نہ پڑھنا چاہئے بلکہ گیارہ پڑھنا چاہئے یا یہ کہ بیس رکعت سنت نہیں، بلکہ علامہ تو بیس کو سنت مان کر یہ تفصیل کرتے ہیں، کہ ان میں سے گیارہ رکعت سنت نبویہ ہے، اور باقی سنت خلفاء ہے، جس کا حاصل یہ ہوا کہ ان بیس سنتوں میں سے گیارہ بہت زیادہ مؤکد ہیں، اور باقی ان کے برابر مؤکد نہیں اور سنن مؤکدہ میں باہم فرق مراتب ہو سکتا ہے، جیسا کہ سنت فجر تمام سنن مؤکدہ آکر اگر کسی کے نزدیک علامہ ابن ہمام کی عبارت کا یہ مطلب نہیں تو ہمارے اور غیر مقلدین کی فہم حجت نہیں، کیونکہ علماء حنفیہ کے اقوال کا مطلب وہ ہم سب زیادہ نہیں سمجھ سکتے، اور بعد تسلیم کے ہم کو یہ بھی کہنے کا حق ہے کہ امام ابن ہمام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ سے زیادہ سنت نبویہ کو نہیں سمجھ سکتے تو جب امام ابو حنیفہ نے بیس رکعات کو سنت مؤکدہ فرمایا ہے، ان کے مقابلہ میں ابن ہمام کا قول کوئی چیز نہیں، حنفیہ نے امام ابو حنیفہؒ اور صاحبینؒ کی تقلید کا التزام کیا ہے، ابن ہمام کی تقلید کا التزام نہیں کیا، پس اگر غیر مقلد کو اقول علماء بیان کرنے سے حنفیہ پر الزام قائم کرنا مقصود ہے تو وہ امام ابو حنیفہؒ یا صاحبینؒ کا کوئی

قول پیش کریں، جن میں انھوں نے صرف گیارہ رکعت کو سنت فرمایا ہو اور بیس کو خلاف سنت کہا ہو، کیونکہ اصلی اکابر حنفیہ ہی حضرات ہیں، ان کے مقابلہ میں سب اکابر مشائخ اصاغر ہیں اور ہم عنقریب احادیث و آثار صحابہ ہی سے بیس رکعات تراویح کی مسنونیت کا ثبوت دینے والے ہیں، ناظرین منتظر رہیں،

اس کے بعد مشہر نے بحر الرائق و موطاوی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ تحقیق ثابت ہوئی ہے تعداد گیارہ رکعات مع وتر صحیح بخاری و صحیح مسلم میں تو اس صورت میں ہمارے مشائخ حنفیہ کے اصول پر از روئے دلیل آٹھ ہی رکعت ہیں، اھ

یہاں بھی مشہر نے دھوکا دیا ہے، کیونکہ بحر الرائق و موطاوی وغیرہ نے علامہ ابن ہمام ہی کا قول فتح القدیر سے نقل کیا ہے، خود صاحب بحر و موطاوی نے اپنی ذاتی رائے بیان نہیں کی، پس اس کو صاحب بحر و موطاوی کا قول بتا کر نقل کرنا عجیب حرکت ہے، نیز مشہر نے بحر و موطاوی کی عبارت کا ترجمہ بھی غلط کیا ہے اس کو لازم ہے کہ اصل عبارت پیش کرے، اور علامہ ابن ہمام کا مطلب ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، اسی جواب کا یہاں بھی اعادہ کر لیا جائے،

اس کے مشہر نے فتح المعین شرح کنز کی ایک عبارت نقل کی ہے، چونکہ فتح المعین میرے پاس نہیں ہے، اس کے متعلق میں تفصیل کے ساتھ مشہر کی دیانت کو ظاہر نہیں کر سکتا ہاں اجمالاً اتنا کہتا ہوں کہ یہ قول شایع کنز کا نہیں ہے، بلکہ غالباً اس نے محدثین کا قول نقل کیا ہے، اور مشہر کی عادت ہے کہ وہ ہر منقول کو ناقل کا قول بنا دیتا ہے، جیسا کہ شیخ عبدالحق کی عبارت میں وہ ایسا کر چکا ہے،

اس کے بعد مشہر نے مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ حق الصریح کے حوالہ سے علامہ قدوری حنفی کا قول نقل کیا ہے کہ تراویح آٹھ رکعت سنت مؤکدہ، اس کے بعد خود مولانا گنگوہی کا قول نقل کیا ہے کہ گیارہ رکعت تراویح ثابت اور مؤکد تر ہے، الخ،

سو ہم نے مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کا رسالہ حق الصریح اب تک نہیں سنا، شاید اس نام کا کوئی رسالہ مشہر کے گھر بیٹھ کر مولانا نے تصنیف کیا ہو، ہاں الراجی الخج فی عدد رکعات التراویح مولانا کا رسالہ ہم نے ضرور دیکھا ہے، اس میں تو ان باتوں میں سے

ایک کا بھی پتہ نہیں جو مشہر نے نقل کی ہیں، نہ اس میں علامہ قدوری کا قول مذکور ہے، نہ خود مولانا گنگوہی کا یہ قول ہے کہ گیارہ رکعت تراویح ثابت اور مؤکدہ تر ہیں، بلکہ اس میں تو مشہر کے خلاف مولانا نے یہ فرمایا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی وہ حدیث جس میں فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گیارہ رکعت سے زیادہ رمضان وغیر رمضان میں نہیں پڑھتے تھے، الخ تراویح کے متعلق نہیں بلکہ صرف تہجد کے متعلق ہے، یعنی آپ تہجد میں اس سے زیادہ غالب اوقات میں نہ پڑھتے تھے، کیونکہ تہجد میں بھی یہ حدیث کلی نہیں بلکہ اکثری ہے، خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی دوسری روایات سے گیارہ پر زیادہ اور عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ کی روایات سے اس سے زیادہ رکعات تہجد میں ثابت ہیں، ملاحظہ ہو (ص ۸ و ۹)

اس کے بعد مشہر نے سیدی مرشدی مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ جہاں مدنی کا یہ قول براہین قاطعہ سے نقل کیا ہے کہ سنت مؤکدہ ہونا آٹھ رکعت تراویح کا تو بالاتفاق ہے، انتہی،

واقعی مشہر کو عبارت کی قطع و برید اور مبتدا کو خبر سے جدا کر دینا خوب آتا ہے، کیوں نہ ہو، دھوکا دہی کا فن اسی طرح سیکھا جاتا ہے، اب سنئے مولانا رحمۃ اللہ علیہ اس مقلد پر انوار ساطعہ کے اس قول کو رد کر رہے ہیں کہ وہ تراویح کو جبر ہی سے بدعت کہہ رہا تھا، اور اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول نعم البدعۃ ہذہ سے استدلال کیا تھا اس کے جواب میں مولانا فرماتے ہیں کہ فخر عالم خود فرما چکے ہیں، سنت لکھ قیامہ الحدیث من قام رمضان ایمانا واحتساباً، اور اس کا فعل ابتدائی کر دکھایا تو اب فعل اور مطلق قول سے جس قدر امور صلوٰۃ تراویح کے متعلق ہیں، سب ثابت ہو گئے، اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اور سنت مؤکدہ ہونا آٹھ رکعت تراویح کا تو بالاتفاق ہے، اگر خلاف ہے تو بیس میں ہے الخ یعنی پھر تمہارا اصل تراویح کو بدعت کہنا خلاف اجماع ہے، کیونکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں، نہ مقلد نہ غیر مقلد، نہ سنی نہ وہابی، یہ تم نے تیسری شاخ کہاں سے نکالی، کہ تراویح اصل ہی سے بدعت ہے، یہ مطلب تھا مولانا کا جس پر نہ معلوم..... غیر مقلد کیوں اچھل رہا ہے، مولانا نے اس میں یہ کہاں فرمایا ہے کہ بیس رکعت کے سنت ہونے میں حنفیہ کو بھی اختلاف ہے، بلکہ صرف مؤلف انوار ساطعہ کی حماقت ظاہر

کرنا مقصود ہے کہ اگر کسی فرقہ مبتدعہ کو تراویح کی سنتِ موکدہ ہونے میں اختلاف ہے تو وہ گیارہ سے زیادہ میں ہے، ورنہ اصل تراویح کو سب کے سب بالاتفاق سنت مانتے ہیں، اسکو کوئی بدعت نہیں کہتا،

یہ تو مشہور کے دلائل کا جواب تھا، جس سے ناظرین کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ مشہور اور اس کی جماعت غیر مقلدین کے پاس کوئی دلیل صحیحہ اور صریح ایسی نہیں جس سے بیئیں رکعت تراویح کی نفی ہوتی ہو، بلکہ جو حدیث مرفوعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اور جو اثر سائب بن یزید کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے گیارہ رکعت تراویح کے متعلق وہ پیش کرتے ہیں وہ دونوں مضطرب ہیں، اور دلالتِ معنویہ بھی اُن کی صریح نہیں،

اس کے بعد میں جمہور علماء مجتہدین و فقہاء حنفیہ وغیرہ کے دلائل بیان کرتا ہوں جن سے بیئیں رکعت تراویح کا سنت ہونا معلوم ہوگا،

حدیث اول: اخراج ابن ابی شیبہ فی مصنفہ حدیث یزید بن ہارون قال اخبرنا ابراہیم بن عثمان عن الحكم عن مقسم عن ابن عباس ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يصلي في رمضان عشرين ركعة والوتر واخرجه الكشي في مسنده والبغوي في معجمه والطبرانی في الكبير والبيهقي في سننه ۱۴ التعلیق الحسن (ص ۵۶ ج ۲)

(ترجمہ) ”عبداللہ بن عباس (صحابی رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں بیئیں رکعت اور وتر پڑھا کرتے تھے، اس کو ابن ابی شیبہ و بیہقی وغیرہ نے روایت کیا ہے، اور اس کی سند میں تمام راوی ثقہ ہیں، مگر شاید کوئی غیر مقلد ابراہیم بن عثمان کی وجہ سے سند پر کچھ کلام کرے تو اس کو تہذیب الہتذیب میں حافظ ابن عدی کا یہ قول دیکھ لینا چاہئے، لہ احادیث صالحہ و هو خیر من ابراہیم بن ابی حنیہ ام، اس کی یعنی ابراہیم بن عثمان کی احادیث عمدہ ہیں، اور وہ ابراہیم بن حنیہ سے بہتر ہے اب ذرا ابراہیم بن ابی حنیہ کو بھی لسان المیزان میں دیکھ لو تو اس کے متعلق یحییٰ بن معین امام جرح و تعدیل کا یہ قول ہے، نقل عثمان الدارمی عن یحییٰ بن معین انه قال شیخ ثقہ کبیر، یعنی عثمان دارمی نے یحییٰ بن معین سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے ابراہیم بن ابی حنیہ کی نسبت فرمایا ہے کہ وہ شیخ ثقہ ہے بزرگ ہے، اب بتلاؤ جو شخص ایسے ثقہ

شیخ کبیر سے بھی بہتر ہو وہ کیا کچھ ہوگا، پھر ابراہیم بن عثمان کی عدالت وغیرہ کی تعریف امام یزید بن ہارون، محدث حنفی نے کی ہے جو ابراہیم مذکور کے کاتب و منشی زمانہ قضاہ میں رہ چکے ہیں، اس لئے ہم اس کو ضعیف ماننے کے لئے تیار نہیں، کیونکہ اس کی تعریف ایک حنفی محدث اور حافظ ابن عدی نے کی ہے، ہمارے لئے تو ایک محدث حنفی کی تعریف ہی راوی کے معتبر ہونے کو کافی تھی، خواہ سارے محدثین اس کو ضعیف کہتے ہو، چہ جائیکہ اس کے ساتھ ابن عدی جیسا امام جرح و تعدیل مسلم فریقین بھی اس کی احادیث کو عمدہ کہتا ہے، تو اب کوئی وجہ نہیں کہ ہم ابراہیم بن عثمان کی حدیث کو ضعیف مانیں، اور اگر غیر مقلد اس حدیث کو ضعیف ہونے کا دعویٰ کرے تو وہ اول حدیث کے رد و قبول کے اصول کتاب و سنت سے بیان کرے، پھر اس حدیث کو ضعیف ثابت کرے، اور جو چاہے انعام ہم سے لے لے بخاری و مسلم و ترمذی وغیرہ کی تقلید نہ کرے، کیونکہ تقلید اسکے نزدیک جائز نہیں، اور اگر وہ بخاری و مسلم وغیرہ کی تقلید کر کے ایک حدیث کو ضعیف کہے گا تو یاد رکھے کہ حدیث کے رد و قبول کے اصول و قواعد فقہاء حنفیہ نے بھی بیان کئے ہیں ہم ان کے مقابلہ میں یہ اصول پیش کر کے غیر مقلد سے سوال کریں گے کہ تم کتاب و سنت سے اس کا ثبوت دو کہ حدیث کے رد و قبول میں بخاری و مسلم کی تقلید واجب ہو اور ابو حنیفہ کی جائز نہیں،

نیز غیر مقلد کو معلوم ہونا چاہئے کہ کسی راوی میں کسی محدث کے طعن و جرح سے اگر وہ راوی ضعیف یا اس کی احادیث ضعیف ہو جائیں تو خود امام بخاری بھی ضعیف اور انکی احادیث بھی ضعیف ہو جائیں گی، کیونکہ امام بخاری پر بھی امام محمد بن یحییٰ ذہبی نے جرح کیا ہے، دیکھو مقدمہ فتح الباری، نیز بخاری کے بہت سے راویوں پر بعض محدثین نے جرح و طعن کیا ہے، جیسا کہ مقدمہ فتح الباری کے مطالعہ سے واضح ہوگا، پس اگر بعض محدثین کا طعن بوجہ دوسرے محدثین کی توثیق و تعدیل کے امام بخاری میں اور انکی احادیث میں موثر نہیں ہو سکتا تو ابراہیم بن عثمان میں بھی کسی کا طعن حافظ ابن عدی کی تعدیل اور یزید بن ہارون کی تعریف کے بعد موثر نہ ہونا چاہئے، لہذا کسی کا منہ نہیں جو اس حدیث کو ضعیف کہہ سکے، اور اگر علماء حنفیہ میں سے بھی کسی نے بعض محدثین کی تقلید کر کے اس کو ضعیف کہہ دیا ہو تو ان کا قول ہم پر حجت نہیں، کیونکہ اس وقت اصولی گفتگو ہو رہی ہے، تقلیدی گفتگو نہیں ہے،

دوسری حدیث قالت عائشہ رضی اللہ عنہا قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
يجتهد في رمضان ما لا يجتهد في غيره رواه مسلم في صحيحه ،

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں (عبادت کے لئے)
زیادہ مشقت کرتے تھے کہ غیر رمضان میں اس قدر مشقت نہ کرتے تھے، اس کو مسلم نے اپنی
صحیح میں روایت کیا ہے،

وعنها قالت كان النبي صلى الله عليه وسلم اذا دخل العشر الاخير من شهر
شوال منزلة واحب ليلىه وايقظ اهله ، اخرجہ البخاری

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب رمضان کا اخیر عشرہ آتا تو رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم اپنی کمر کس لیتے اور رات بھر جاگتے اور گھروالوں کو جگاتے تھے، اس کو بخاری نے
روایت کیا ہے،

وعنها مرفوعا كان اذا دخل شهر رمضان شد منزه ثم لم يأت فراشه
حتى ينسلخ واسناد حسن رواه البيهقي في شعب الایمان قاله العزیزی فی
شرح الجامع الصغير للسيوطی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب
رمضان آتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمر کس لیتے اور بستر پر نہ لیٹتے تھے یہاں تک کہ رمضان
ختم ہو جاتا، اس کو بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے، اور اس کی سند حسن ہے (عزیزی)،

وعنها مرفوعا قالت كان اذا دخل رمضان تغير لونه وكثرت صلواته و
ابتدل في الدعاء واشفق لونه اخرجہ البيهقي في الشعب (عزیزی) حضرت عائشہ
رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب رمضان داخل ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ
بدل جاتا اور آپ کی نماز (پہلے سے) زیادہ ہو جاتی اور دعاء میں زیادہ عاجزی کرنے لگتے، اور آپ کا
رنگ سُرخ ہو جاتا، اس کو بھی بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے،

یہ چار احادیث صاف طور سے اس بات کو بتلاتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
رمضان کی راتوں میں اور راتوں سے زیادہ عبادت کرتے اور زیادہ نماز پڑھتے تھے، گواہیں
بیشک رکعات تراویح کا صاف ذکر نہیں، مگر یقیناً ان سے اتنا ضرور معلوم ہوا کہ حضرت
عائشہ رضی اللہ عنہا کی وہ حدیث جو بواسطہ ابوسلمہ کے شیخین نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے اہم اس کا وہ

مطلب نہیں جو غیر مقلدوں نے سمجھا ہے کہ حضور رمضان کی راتوں میں بھی تہجد وغیرہ ملا کر صرف گیارہ ہی رکعت پڑھتے تھے، کیونکہ یہ مطلب حضرت عائشہ رضی کی دوسری روایات کے بالکل خلاف ہے، بلکہ تمام روایات کو ملا کر اس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ تہجد میں آپ کا معمول غالب گیارہ رکعت ہی کا تھا، رمضان میں بھی تہجد کی مقدار اکثر یہی تھی، باقی یہ کہ تہجد کے علاوہ بھی آپ رمضان کی راتوں میں کچھ نماز نہ پڑھتے تھے، اس سے یہ گیارہ والی روایت ساکت ہے، اور حضرت عائشہ رضی کی دوسری روایات بتلاتی ہیں کہ آپ تہجد کے علاوہ رمضان میں اور نماز بھی پڑھتے تھے جسکو ابن عباسؓ کی روایت نے صاف طور پر واضح کر دیا کہ کہ آپ رمضان میں بنیں رکعت اور وتر پڑھا کرتے تھے، پس یہ چار احادیث بالا اجمال حدیث ابن عباس کی مؤید ہیں،

اور اگر غیر مقلد ہماری اس تقریر کو تسلیم نہ کرے تو ہم کہیں گے کہ اچھا تم کسی دوسری تقریر سے حضرت عائشہ رضی کی روایات کا اختلاف رفع کر دو، مگر اختلاف رفع کرنے سے پہلے تم کو گیارہ رکعت والی حدیث سے استدلال کا کیا حق تھا؟

عن السائب بن یزید الصحابی قال کانوا یقومون علی عهد عمر رضی اللہ عنہ بعشرین وعلی عهد عثمان وعلی رضی اللہ تعالیٰ عنہما مثلاً رواہ البیہقی باسناد صحیح (یعنی شرح بخاری، ص ۵۹۸ ج ۳) سائب بن یزید صحابیؓ سے روایت ہو وہ فرماتے ہیں کہ صحابہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان و حضرت علی رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں تیس رکعات (تراویح) پڑھا کرتے تھے،

قال الحافظ ابن عبد البر وروی الحارث بن عبد الرحمن بن ابی ذباب عن السائب بن یزید قال کان القیام علی عهد عمر ثلاث وعشرین رکعة قال ابن عبد البر والثلاث للوتر (یعنی شرح بخاری، ص ۵۹۸ ج ۳) حافظ ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ حارث بن عبد الرحمن نے سائب بن یزید سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں قیام رمضان (تراویح) تیس رکعت تھا، حافظ ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ تین رکعت وتر کی ہیں،

وکیع عن حسن بن صالح عن عمرو بن قیس عن ابی الحسنات عن علی رضی اللہ عنہ انه امر رجلاً یصلی بہم رمضان عشرین رکعة اخرجہ فی مسند (یعنی ج ۲)

حضرت علیؑ سے مروی ہے کہ انھوں نے ایک شخص کو حکم دیا کہ لوگوں کو رمضان میں بیس رکعت (تراویح) پڑھا دیا کریں، اس کو وکیع نے روایت کیا ہے، میں کہتا ہوں کہ اسکی سند حسن ہو،
 اخبرنا یحییٰ بن یحییٰ اخبرنا حفص بن غیاث عن الاعمش عن زید بن وهب قال کان عبد اللہ بن مسعود یصلیٰ لنا فی شہر رمضان فیتصرف وعلیہ لیل قال الاعمش کان یصلیٰ عشرين رکعة ویوتر بثلاث، رواہ محمد بن نصر المروزی (یعنی صفحہ مذکور) زید بن وهب کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن مسعود رمضان کے مہینہ میں ہم کو نماز پڑھاتے اور ایسے وقت فارغ ہوتے کہ کچھ رات باقی رہتی، اعمش راوی کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن مسعود بیس رکعت اور وتر کی تین رکعت پڑھایا کرتے تھے اس کو محمد بن نصر مروزی نے روایت کیا ہے، میں کہتا ہوں کہ یہ سند صحیح ہے، اور تین راتیں اکثر ہم ادھر بیان کر چکے ہیں، جن میں حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بیس رکعت تراویح پڑھے جانے کا ثبوت ہے،

اب ان سب احادیث کو ملاؤ تو معلوم ہوگا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رمضان میں بیس رکعت اور وتر پڑھنا ثابت ہے، اور حضورؐ کے بعد حضرت عمرؓ و حضرت عثمانؓ و حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت میں عام طور پر صحابہ بیس رکعت اور تین وتر پڑھتے تھے، اور حضرت علیؓ نے بھی اسی کا حکم دیا ہے، اور عبد اللہ بن مسعودؓ بھی بیس رکعت اور تین رکعت وتر پڑھتے تھے، اور اس کے خلاف کسی صحابی سے ثابت نہیں، اور جو روایت موطا کی گیارہ رکعت کی مشہور ہے بیان کی تھی ہم کہہ چکے ہیں کہ وہ مضطرب ہی، اس سے استدلال ہرگز صحیح نہیں،

ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ جمہور علماء کا یہی قول ہے، اور کوفہ والے اور امام شافعیؒ اور اکثر فقہاء اسی کے قائل ہیں، اور ابی بن کعب سے بھی صحیح طور پر یہی ثابت ہے، اور اس کا خلاف صحابہ سے ثابت نہیں، دیکھو (یعنی، ص ۳۵ ج ۵)

اور حافظ ابن قدامہ مغنی میں فرماتے ہیں کہ احمد بن حنبل کے نزدیک (جو محدثین کے امام ہیں) تراویح میں بیس رکعت ہی مختار ہیں، اور سفیان ثوری والو حنیفہ اور شافعی بھی اسی کے قائل ہیں، ہماری دلیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب سب آدمیوں کو ابی بن کعب کے پیچھے جمع کیا ہے، تو وہ اُن کو بیس رکعت ہی پڑھاتے تھے، اس کو ابو داؤد نے روایت کیا ہے،

اور سائب بن یزید نے بھی ایسے ہی روایت کیا ہے، جو متعدد طرق سے اُن سے مروی ہے، اور امام مالک نے یزید بن رومان سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں صحابہ رمضان میں تیس رکعت سے قیام کرتے (یعنی تراویح پڑھتے تھے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ایک شخص کو رمضان میں بیس رکعت پڑھانے کا حکم کیا، اور یہ اجماع کے مثل ہے، آگے چل کر فرماتے ہیں کہ جو کچھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیا جس پر ان کے زمانہ میں حضرات صحابہ نے اجماع کر لیا ہے وہی اتباع کے زیادہ لائق ہے، ام (ص ۸۰۳ ج ۱)

اب غیر مقلد بتلائیں کہ وہ اس اجماع کی مخالفت کر کے کہاں رہیں گے، اخیر میں ہم اتنا اور بتلائے دیتے ہیں کہ حضرات صحابہ کے یہ تمام آثار اور ان کا بیس رکعات تراویح پر اجماع و اتفاق کرنا یہ سب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کی تائید کر رہا ہے جو ابن ابی شیبہ نے مرفوعاً ان سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں بیس رکعت اور وتر پڑھا کرتے تھے،

اب اس حدیث کے صحیح ہونے میں کچھ شک نہیں، کیونکہ حدیث کی صحت کی یہ بھی دلیل ہے کہ امت نے اس کی تلقی بالقبول کی ہو، قاضی شوکانی نے نیل الاوطار میں منتقی کی پہلی ہی حدیث کی شرح میں یہ قاعدہ بیان کیا ہے (ص ۱۵ ج ۱) اور اس سے بڑھ کر تلقی کیا ہوگی کہ خلفائے ثلاثہ کے عہد میں صحابہ نے بیس رکعت تراویح پر اجماع و اتفاق کیا، اور ان کے بعد سے اب تک تمام امت کا اس پر اتفاق چلا آ رہا ہے، اگر کسی نے بیس پر زیادتی کی ہو تو کی ہو بیس سے کمی کسی نے نہیں کی، سوائے غیر مقلدوں کے اور ہم ان کے تمام دلائل کا ضعیف ہونا اور بظاہر کرچے پس حدیث مرفوع صحیح بالتلقی و حسن باسناد اور آثار کثیرہ و اجماع صحابہ کے ہوتے ہوئے کسی مسلمان کو جس کے دل میں خدا کا خوف ہو یہ حق نہیں کہ وہ بیس رکعات تراویح کا انکار کرے، یا اس کو خلاف سنت کہے، اور گیارہ رکعت کا رواج دے، خدا ایسی سستی اور کاہلی سے مسلمانوں کو محفوظ رکھے، آمین، و صلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا محمد و علی آلہ و اصحابہ اجمعین، ۱۹ رمضان ۱۴۲۸ھ

سوال (۲۱) کیا کسی سورۃ کے اذل میں ایک مرتبہ نماز تراویح میں کسی بھی ایک سورۃ کی ابتداء میں بسم اللہ پڑھنا آواز بلند علاوہ سورۃ نمل مستون ہی یا واجب؟ یا واجب ہی؟ یعنی علاوہ سورۃ نمل کے (وانہ بسم اللہ

الرحمن الرحیم)۔

الجواب؛ ہاں ختم تشرآن تراویح میں کسی ایک سورۃ کے شروع میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کا جہر کرنا چاہئے، ورنہ ختم ناقص رہے گا، قال فی نور الانوار والاصح انہما ای التسمیۃ من القرآن الخ قال المحشی فالقرآن عبارة عن مائة وأربعة عشرة سورة وایة وهي التسمیۃ فلا بد فی ختم القرآن من قراءة التسمیۃ مرة (ای جہرا) علی صدق آیتہ سورۃ كانت وهذا کلمہ عندنا علی المختار وعند الامام الشافعی فی جزء من کل سورة سورۃ براءة فلو ترکت فی صدر سورة ما حصل الختم ثم هذا الاختلاف فی غیر السملۃ التي فی النمل فی بعض آیتہ اتفاقا (ص ۹) وانا قیدنا قراءتہما بالجہر لان الامام لو قرأها سراً لم یتم ختمہ دون ختم السامین والله اعلم، ۳ اشوال ۱۴۲۶ھ

نابالغ بچے اور اجرت پر قرآن پاک سنانے سوال (۲۲)
دلے کے پیچھے نماز تراویح کا حکم،

..... ہمارے
محلہ میں تین حافظ ہیں، جو محلہ کی مسجد میں نماز پڑھتے ہیں، ایک صاحب بوجہ ضعف عمری تراویح میں کلام پاک سنانے سے معذوری ظاہر فرماتے ہیں، اور شاید کسی وجہ معذور ہوں، دوسرے صاحب بوجہ کریمہ الصوت کہے جانے کے سنانا نہیں چاہتے، البتہ ایک حافظ جو ہنوز بالغ نہیں ہوئے، مگر قریب البلوغ کے ہے، یعنی جس کی عمر بارہ تیرہ سال کی ہے وہ سنا سکتا ہے اور شہر میں کوئی حافظ نہیں ہے، ایسی صورت میں دوسرے شہر سے مثلاً لکھنؤ، سندیلہ یا بریلی سے اجرت پر حافظ بلوا کر تراویح سنی جاوے یا اس نابالغ کے پیچھے سنانا مناسب ہے، شریعت کا جو حکم ہو اس سے اطلاع بخشی جائے جو لوگ نابالغ کے اقتدار کے قائل نہیں وہ احادیث پیش کرتے ہیں، ایک بخاری ثریف میں دوسری مشکوٰۃ میں، ان احادیث کا جواب کیا ہے، اشعة الملعات میں حضرت شیخ دہلوی فرماتے ہیں کہ حضرت ابن سلمہ کی حدیث پر شافعیہ کا عمل راکد ہے، ایسی حالت میں جبکہ فرض پر استدلال ہے تو نفل اور سنت مؤکدہ پر عدم وجہ بھی رستم فرماتے جاتیں، نابالغ حفاظ کے پیچھے کوئی تراویح نہیں سنتا ہے، اس سے وہ کلام پاک

بھولتے جا رہے ہیں، اور لوگوں میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ بچوں کے حفظ قرآن کرنا ایک فضول چیز ہے، کیا کیا جاوے، اللہ کے واسطے معہ دلائل مرحمت فرمائیں، سننے میں آیا ہے کہ علماء فرنگی محل اور علماء ماوراء النہر نے جواز کا فتویٰ دیا ہے، اس کے موافقین قول امام یا حدیث جو اس کے خلاف ہو طلب فرماتے ہیں، اگر ممکن ہو تو بہت ہی اچھا ہے، دُرّ ہم کو تو صرف آپ کا فتویٰ درکار ہے،

الجواب: اس صورت میں یا تو حافظ کریم الصوت کا قرآن نماز میں سن لیا جاوے بشرطیکہ سب اس پر آمادہ ہوں، اور اس حافظ کی خوشامد کر لی جاتے، ورنہ حافظ ضعیف العمر کے پیچھے الم ترکیف سے تراویح پڑھ لی جاتے، اُجرت پر اور نابالغ حافظ کے پیچھے بھی تراویح نہ پڑھی جائیں گو امام شافعی کے مذہب میں جائز ہے، مگر امام مالک اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک جائز نہیں، نہ فرائض میں نہ نوافل میں، اور تراویح سالکوں میں ایک دفعہ نصیب ہوتی ہے، ایسی عبادت کو اختلاف ڈالنا سخت محرومی کی بات ہے اور حدیثوں سے شوافع نے استدلال کیا ہے، حنفیہ اور مالکیہ نے ان کے شافی کافی جواب دیدیئے جو مطولات فقہ میں مذکور ہیں، مقلد کو ان کے معلوم کرنے کی ضرورت نہیں اور محققین کے نزدیک مانعین کے دلائل مجوزین کے دلائل سے اقویٰ ہیں، کما ذکر فی الاعلام اور نابالغ حافظوں کے قرآن پختہ کرنے کی یہ صورت ہے کہ نوافل میں مغرب کے بعد یا بعد تراویح کے اس نابالغ حافظ کو امام اور دوسرے نابالغ حافظوں کو مقتدی بنا کر اس کا قرآن سن لیا جائے، اگر سامع نابالغ نہ ملے تو دو چار رکعت میں کوئی بالغ حافظ ہی اس نابالغ کا مقتدی کا بن کر قرآن سن لیں، اور گو اس صورت میں بھی ان نوافل کی صحت مقتدی بالغ کے حق میں مختلف فیہ ہوگی، مگر چونکہ یہ رکعتیں سنت مؤکدہ نہیں ہوں گی، بلکہ زائد نفلیں ہوں گی، ان کو اختلاف کی صورت سے ادا کرنے میں بضرورت حفظ قرآن مضائقہ نہیں، لیکن تراویح جو سنت مؤکدہ ہے اور سال بھر میں ایک دفعہ رمضان میں ہی نصیب ہوتی ہے، اختلاف میں ڈالنا سخت بُری بات ہے، علماء ماوراء النہر نے جواز کا فتویٰ نہیں دیا، اور علماء فرنگی محل اور علماء بلخ نے اس نکتہ پر غور نہیں کیا کہ خروج من الخلاف عبادت میں اہم ہے، واللہ تعالیٰ اعلم،

، ارشعبان ۱۳۸۴ھ

دو مسجدوں میں جماعت سوال (۲۳) تراویح کرانے کا حکم،

..... زید ایک مسجد میں بیس رکعت تراویح پڑھانے کے بعد دوسری مسجد میں بھی بیس رکعت پڑھاتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ اس دوسری مسجد میں مقتدیوں کی نماز درست ہو یا نہیں، اگر نہیں ہے تو کوئی صورت جواز کی ہو سکتی ہے؟

الجواب: ہمارے نزدیک دوسری مسجد کے مقتدیوں کی تراویح درست نہیں ہوتی، اور صورت جواز نکالنے کی ضرورت کیا ہے، ۱۲ رمضان ۱۴۲۸ھ

چار رکعت تراویح کی نیت باندھی سوال (۲۴) اور چوتھی رکعت پر بیٹھنا یاد نہ رہا

تو اس کو کیا کرنا چاہئے؟ اگر تراویح چار رکعت شروع کی جاویں، اور چوتھی رکعت پر بیٹھنا یاد نہ رہے، تو اب کیا صورت کی جاوے گی؟

الجواب: تراویح دو دو رکعت ہی سنت ہے، اس کے خلاف کرنا اور چار چار رکعت پڑھنا مکروہ ہے، اور جو شخص چار چار پڑھتا ہو وہ اگر چوتھی رکعت پر بیٹھنا بھول جاتا تو اس کو پانچویں کے سجدہ کے پہلے قعد کی طرف لوٹ آنا اور سجدہ سہو کر لینا چاہئے، اور قعدہ کر کے کھڑا ہوا ہو تو چھ رکعت پوری کر کے سلام پھیر دے، قال فی مراقی الفلاح وہی عشرون بعشر تسلیمات یسلم علی رأس رکعتین فاذا وصلها وجلس علی کل شفیع فالاصح انہ ان تعدد ذلك کبرۃ صحیحۃ اجزأتہ عن کلہا م فی ۱۲ رمضان ۱۴۲۸ھ

دو مسجدوں میں جماعت تراویح سوال (۲۵) کرانے کا حکم،

..... قصہ

ہذا میں کئی مسجدوں پر بوجہ عدم موجودگی حفاظ کسی سال سے ختم قرآن مجید نہیں ہوتا تھا اور وہاں کے مصلیان اس کے ثواب سے محروم رہتے تھے، امسال ایک حافظ صاحب نے قبل رمضان شریف یہاں کی یہ حالت سن کر یہ نیت کیا تھا کہ اگر میں یہاں رمضان شریف میں رہا تو جو مسجدیں خالی رہیں گی اگر وہاں کے مصلیٰ سنیں گے تو بلا معاوضہ ختم سناؤں گا، چنانچہ چند رات ہی سے دو مسجدوں پر وہاں کے مصلیان کی خواہش سے تراویح بحالہ (یعنی بست رکعت ہر دو مسجد) پڑھانا شروع کر دیا، بعض لوگوں نے حافظ صاحب کے اس طرز عمل پر اعتراض کیا، حافظ صاحب نے اپنے عمل کے ثبوت جواز

میں فتاویٰ مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی کی اس تحریر کو پیش کیا، اور خود کو ناذر قرار دیا
والتحریر هذا، جواز التراویح بنية مطلقة ونية النفل كما حققه ابن المأ
وفي الثاني هو اداء التراویح من المقتدى خلف من يصلي المتطوع الا انه
لا يخلو عن كراهة لمخالفة السلف والمخلص في هذا ان يندل الا ما
الذي صلى التراویح ويوجب على نفسه قدر ما يريد ان يؤديه مع الجماعة
الثانية فيكون ذلك عليه واجبا ويخرج عن شبهته الخ ص ۲۵۲ جلد ۱
مطبوعه يوسفی، طبع شده ۱۳۲۱ھ

(ثبوت ۲) وقال قاضي خان وقال ابو بكر سمعت ابا نصر انه قال
يجوز لاهل المسجد من جميعا الخ ص ۱۱۲ ج اول باب التراویح،

(ثبوت ۳) (حدیث مشکوٰۃ) عن جابر قال كان معاذ بن جبل يصلي مع النبي
صلى الله عليه وسلم ثم يأتي قومه فيصلي بهم متفق عليه وعنه قال كان
معاذ يصلي مع النبي صلى الله عليه وسلم العشاء ثم يرجع الى قومه فيصلي
بهم العشاء وهي نافلة، ص ۱۰۳ باب من صلى صلوة مرتين،

(۱) اب سوال یہ ہے کہ ان مقتدیوں کی اقتداء امام ناذر مذکورہ صحیح ہوتی یا نہیں
اور تراویح دوسری مسجد والے مصلیوں کی ادا ہوتی؟ اور سورۃ تراویح سے یہ صورت
ان کے لئے افضل ہے یا نہیں؟

(۲) جناب نے استفتاء سابق میں مولانا عبدالحی صاحب کے فتویٰ مجولہ کو تسلیم
کرتے ہوئے عند الضرورة کی قید لگائی ہے، یہ قید ان کی کس عبارت سے مفہوم ہوتی ہے،
براہ کرم نقل فرماویں، اور لفظ ضرورت سے جناب کی کس قسم کی ضرورت مراد ہے،
کیا حالات موجودہ مذکورہ بالا ضرورت کے لئے کافی ہو سکتے ہیں؟.....
بینوا تو جروا و برہنوا علی اقوالکم،

الجواب؛ جن معترضوں نے حافظ صاحب موصوف کے طرز عمل پر اعتراض
کیا ہے، ان کا اعتراض غلط نہیں، کیونکہ مولانا عبدالحی صاحب نے اس کے متعلق
قاضی خاں کا قول نقل فرمایا ہے، "الاصح انه لا يجوز" اور صدر شہید سے نقل کیا ہے،
امام یصلی التراویح فی مسجدین علی الکمال لا يجوز، اور امام قاسم بن قطلوبغا محدث و فقیہ

الحقیقہ کا قول نقل فرمایا ہے، الاصح انہ لا یصح وهو مکروہ، اور نصاب الفقہ سے نقل کیا ہے لا یجوز لہ ان یفعل لان التراويح سنۃ والسنن لایستکر فی الوقت الواحد فاذا فعل ذلك لا یكون سنۃ والفتویٰ علی ذلك اھ، اور یہ الفاظ وہ ہیں جو لفظ فتویٰ اور اصح سے مؤید ہیں، ان کے خلاف جو قول ہو گا وہ ضعیف ہے، جیسا کہ لفظ قیل، وقال بعضہم وینبغی ان یقول کے عنوانات اس کے ضعف پر دال ہیں اور ضعیف روایت پر فتویٰ نہیں دیا جاسکتا، مگر سخت ضرورت کے وقت مثلاً صورت مسئلہ میں کوئی حاکم مسلم اس حافظ کو یہ حکم کرتا کہ دو تین مسجدوں میں علی الکمال تراویح پڑھاؤ، اور مقتدیوں کو سننے کا امر کرتا، اور تخلف میں خطرہ ہوتا تو ہم اس وقت ضعیف روایت کو اخذ کر کے فتویٰ جواز کا دیدیتے، کیونکہ جب تک شریعت میں کچھ بھی وسعت ہو تو مسلمانوں کو خطرہ میں ڈالنا مناسب نہیں، ہاں وسعت نہ ہو تو گنجائش نہ دی جائے گی، بلکہ اس وقت حاکم کو دوبارہ ایسا جائے گا، ونحو ذلک من الضرورات التي یعرفها العلماء، اور ایسی ہی ضرورت کے وقت اس مخلص سے کام لیا جائے گا، جو مولانا عبدالحی صاحب نے والمخلص فی ہذا ان ینذر الامام میں بیان کیا ہے، اور گو مولانا عبدالحی صاحب نے اُنکو ضرورت سے مقید نہیں کیا، مگر ہم نے اُن کے کلام کو صحیح کرنے کے لئے یہ محمل بیان کر دیا، ورنہ بظاہر ان کا قول صحیح نہیں، کیونکہ وہ خود اوپر عالمگیریہ سے نقل کر چکے ہیں، کہ تراویح مفترض کے پیچھے صحیح نہیں، بوجہ مخالفت سلف کے (حالانکہ نافلہ مطلقہ خلف المفترض صحیح ہے) پھر وہ ناذر کے پیچھے کس دلیل سے تراویح کو جائز کرتے ہیں، کیا اس میں سلف کی مخالفت نہیں ہے، کیا سلف نے کبھی نذر کر کے ایسا کیا ہے، اور اگر ناذر کے پیچھے تراویح بلا کراہت جائز ہے تو مفترض کے پیچھے بھی جائز ہونا چاہئے، غرض مخلص مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے محض اپنی رائے سے بیان فرمایا ہے، جو عالمگیریہ کے جسزئیہ کے مصادم ہے، لہذا اگر اس کو کوئی رد کرے تو اس کو حق ہے مگر ہم نے ادباً یہ لکھ دیا تھا کہ وہ ضرورت کے وقت پر محمول ہے، اور صورت مسئلہ میں کوئی ضرورت نہیں، اس لئے حافظ صاحب موصوف کو اپنے طرز عمل کو اس طرح بدل دینا چاہئے، کہ ایک مسجد میں آٹھ رکعتوں میں یا دس میں سید پارہ سنادیں، بقیہ کو وہ لوگ الم ترکیف سے پورا کر لیں، اور دوسری مسجد میں اُن کے جلنے تک دس یا آٹھ رکعتیں الم ترکیف سے

پڑھی جائیں، بقیہ کو مع وتر کے سیپارہ کے ساتھ حافظ صاحب پڑھاویں، بلکہ اس طرح حافظ صاحب چاہیں تو پانچ مسجدوں میں ایک ساتھ ختم سنا سکتے ہیں، کہ ایک ایک مسجد میں چار چار رکعتوں میں سیپارہ سنا دیا کریں، اور بقیہ رکعتیں دوسرا شخص چھوٹی چھوٹی سورتوں سے پڑھاوے، اور اگر مولانا عبدالحی صاحب کے مخلص کو ضرورت کے ساتھ مقید نہ کیا گیا بلکہ مطلق رکھا گیا تو اس سے وہ حفاظ بہت زیادہ کام لیلیں گے جو بمعاوضہ ختم سناتے پھرتے ہیں کہ وہ چالیس رکعتوں میں دن جگہ دن قرآن شروع کر کے معقول رقم جمع کر لیا کریں گے، اس کو مولانا عبدالحی صاحب بھی کبھی جائز نہیں کہہ سکتے تھے معلوم ہوا کہ یہ مخلص عام نہیں،

اور اس کے بعد جو حافظ صاحب نے دوسرا ثبوت قاضی خاں سے دیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ قاضی خاں ہی میں اس سے پہلے ابو بکر اسکان کا قول لایا جو مذکور ہے، اس کے بعد ابو بکر کے واسطے سے ابو نصر کا قول نقل کیا گیا ہے، يجوز لاهل المسجدین جمیعا اور قاعدة اصولیہ یہ ہے کہ جس روایت کی مخالفت خود راوی کرے وہ روایت قابل احتجاج نہیں رہتی، پس ابو نصر کا قول قابل اخذ نہ رہا، کیونکہ اس کے راوی ابو بکر نے خود اس کی مخالفت کی ہے، (وهذا فيما اذا كان ثبوت قول المروي عنه موقوفا على رواية الراوي بخلاف ما اذا اشتبه عنه ولم يكن موقوفا على رواية الراوي كذا في حنفية فانه معترف بوقوع الموافقة والمخالفة في اكثر المسائل فلا يقدح فيه مخالفة الرواية عنه في بعض المسائل) (۱۲) اور اگر ابو نصر سے اس قول کی روایت کو صحیح مان بھی لیا جائے تو خود اس روایت کو بوجہ ضعف دلیل کے ضعیف کہا جائے گا، کیونکہ اس کے خلاف جو اقوال ہیں وہ لفظ فتویٰ وغیرہ سے مؤکد و مؤید ہیں، جو ان کی قوت دلیل پر دال ہے،

اور حدیث معاذ کو جو ثبوت میں پیش کیا گیا ہے، یہ نہایت ہی عجیب ہے، کیونکہ حدیث معاذ تکرار و تراویح کے متعلق نہیں، بلکہ اگر اس کا مطلب وہی مان لیا جائے، جو حافظ موصوف سمجھے ہیں تو اس سے تکرار فرض لازم آئے گا، کہ ایک شخص فرض نماز پڑھ کر وہ ہی فرض دوسری جگہ جا کر مقتدیوں کو پڑھاوے، اور اس کو حنفیہ میں سے کسی نے بھی جائز نہیں کیا، نہ متقدمین میں سے نہ متاخرین میں سے، نہ مولانا عبدالحی صاحب نے، پس اس حنفیہ کے نزدیک وہ مطلب نہیں جو ظاہر المفہوم ہوتا ہے، بلکہ اس کا

مطلب یہ ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے پیچھے نفل کی نیت کرتے اور اپنی مسجد میں فرض کی نیت کرتے تھے اور دوسری روایت جو بھی لہ ناخذہ آیا ہے اس میں تصریح نہیں کہ یہ قول کس کا ہے، حضرت جابرؓ کا ہے یا ان کے نیچے کے راوی کا، اگر نیچے کا راوی کا ہے تو حجت نہیں، اور حضرت جابرؓ کا ہے تو اس حالت میں حجت ہے کہ انہوں نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اگر ایسا فرمایا ہو محض ظن اور تخمین سے نہ فرمایا ہو، اور اس میں اس قدر احتمالات ہیں تو احتمالات کے ساتھ استدلال ساقط ہے، اور بعد تسلیم کے یہ اُس وقت پر محمول ہے جبکہ تکرار فرض و وتر جائز تھا، بعد میں جب حضورؐ نے لا تصلوا بعد صلوٰۃ مثیلھا ولا وتوان فی لیلة فرما کر اس سے منع فرما دیا تو اب یہ صورت ممنوع ہو گئی،

یہ تو دلائل خصم کا جواب ہے، اور حنفیہ کی اصل دلیل جس کی بناء پر وہ بناء قوی علی الضعیف کو جائز نہیں کہتے حدیث الامام ضامن ہے، جو صحیح حدیث ہے، جس سے معلوم ہوا کہ امام مقتدی سے کم نہ ہونا چاہئے، کیونکہ ادنیٰ اعلیٰ کا ضامن نہیں ہو سکتا، واللہ تعالیٰ اعلم، ظفر احمد عفاعنہ ۱۴ رمضان ۱۳۸۷ھ، الجواب صحیح، اشرف علی

تتمہ سوال و جواب مندرجہ بالا، (۱)، آپ نے فتویٰ نمبر ۶ میں جس کے سائل احمد مکرم صاحب ہیں اور جس کی نقل ارسال خدمت ہو فرمایا ہے کہ اگر جواز سے مراد صحتِ صلوٰۃ ہے تو مسلم اور اگر صحت بلا کراہت ہے تو مسلم نہیں، للذلائل التي قد ذکرناہا اولاً، اور اسی فتویٰ کے سوال نمبر ۳ میں لکھتے ہیں کہ صحتِ صلوٰۃ میں کلام نہیں، بلکہ اس میں کلام ہے کہ صحت مع الکراہت ہے یا بلا کراہت، تو اس سے صحتِ صلوٰۃ تراویح متنازعہ فیہ مراد ہے یا نفل، اگر تراویح مراد ہے تو کراہت تحریمی ہے یا تنزیہی اور اس مکروہ صورت پر عمل کی اجازت دی جاسکتی ہے یا نہیں..... ہر جزو کا جواب صاف اور صریح قابل عمل دیا جاوے،

(۲) اور اسی فتوے کے سوال نمبر ۶ کے جواب میں آپ نے قاسم بن قطلوبغا کی عبارت کا جو مطلب بیان کیا ہے اسے مدلل ارشاد فرماتے، مجوزین فریق کا خیال ہے کہ یہ جواب بغیر دلیل قابل وقعت نہیں، اس لئے اسے جواز ہی پر محمول کیا جاتا ہے، ضرورت اس کی ہے کہ آپ با دلیل اور بالتشریح صحیح مطلب بیان فرمائیں، اور جائز مع الکراہت کی صورت میں افضلیت ختم قرآن فی التراویح متنازعہ پر ہے

یا صورت تراویح کو، اسے بھی ضرور ارقام فرمائیے، اور اس میں قابل عمل طریقہ کو نسا ہے، یا بالکل اس پر عمل کی اجازت ہی نہیں، ہو سکتی،

(۳) اور آپ نے فتویٰ نمبر ۷ پر سائل محمد ایوب اسروی کے جواب میں تحریر فرمایا، ہر کہ ”ہمارے نزدیک دوسری مسجد میں مقتدیوں کی تراویح درست نہیں ہوتی“، اور دوسرا فتویٰ نمبر ۱۰ (جس کا سائل بھی محمد ایوب اسروی ہی ہے) اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ ”اور مولانا عبدالحی صاحب نے اس صورت کو مکروہ لکھا ہے وہی صحیح ہے“ فتویٰ نمبر ۷ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ تراویح درست ہی نہیں، اور فتویٰ نمبر ۱۰ سے ظاہر ہے کہ جائز مع الکراہتہ ہے، لہذا اس تعارض کو رفع فرما کر صحیح اور قابل عمل جواب ارقام فرمائیے؛

الجواب؛ (۱) صحت سے مراد صحت صلوٰۃ بطور نفل محض ہے، اور تراویح اس صورت سے ارادہ ہوگی،

(۲) دلیل اس کی یہ ہے کہ قاضی خاں کا اس صورت (تکرار تراویح) کے متعلق قول یہ ہے، ”الاصح انہ لا یجوز“ اور صدر شہید کا قول ہے ”امام یصلی التراویح فی مسجدین علی اکمال لا یجوز“ اور نصاب الفقہ میں ہے ”لا یجوز لہ ان لیفعل لان التراویح سنتہ و سنن لا یتکرر فی الوقت الواحد فاذا فعل ذلک لایکون سنتہ و الفتویٰ علی ذلک ام“ اور عالمگیری میں ہے ”یوصلی التراویح مقتدیا بمن یصلی مکتوبہ او تراو نافلۃ الاصح انہ لا یصلح الاقتداء بہ لانه مکروہ و مخالف لعمل السلف ذکر العبارات کلہا مولانا عبدالحی فی فتاوا صفحہ ۱۱۱۱ اما صلیٰ مع الخلاصہ“

ان عبارات میں تکرار تراویح بمسجدین کا عدم جواز عدم صحت مصرح ہے، اور علامہ قاسم بن قطلوبغا نے بھی اختلاف نقل کرنے کے بعد یہی فرمایا ہے ”والاصح انہ لا یصلح و مکروہ“ پس اس میں لا یصلح کے معنی وہی ہیں جو عالمگیری اور نصاب الفقہ اور قاضی خاں وغیرہ کی عبارات میں لا یجوز کے معنی ہیں، یعنی کہ تراویح مسنونہ کے طور پر یہ نماز درست اور صحیح نہ ہوگی، ہاں نقلاً صحیح ہے، اور نفل جماعت سے مکروہ ہے، اس لئے یہ نماز نفلاً مکروہ بھی ہے، قال فی جامع المضررات قوم صلوا التراویح ثم ارادوا ان یصلوها بعد ذلک یصلون فرادی لانہ تطوع و صلوٰۃ التطوع بجماعۃ لیست مستحبۃ

فتاویٰ عبدالحی قلت وهو یعم الامام والمقتدی جمیعاً فان الجماعة فی التطوع
یکره مطلقاً للامام والمقتدی قاضیہم،

(۳) میں نے مولانا عبدالحی صاحب کے قول کو غیر مقلدوں کے قول کے مقابلہ میں صحیح
کہا ہے، اور اس کے اوّل و آخر میں تصریح کر دی ہے کہ مولانا کا قول بھی سلف کے خلاف
ہے، سلف نے اس صورت کو غیر جائز اور غیر صحیح لکھتے ہوئے مکروہ فرمایا ہے جس کے معنی
وہی ہیں جو اوپر مذکور ہوئے، کہ تراویح تو درست و صحیح نہیں، ہاں نفل بکراہت صحیح ہے،
میرے سب اقوال کو جمع کرنے اور غور کرنے کے بعد یہ مراد واضح ہے محقق نہیں، اور اس
باب میں نصاب الفقہ کا یہ قول اَنَّ التَّراویح سنۃ والسنن لا یتکرر فی الوقت الواحد فاذا
فعل ذلک لا یكون سنۃ "سب اقویٰ ہے، تمام فقہاء اس پر متفق ہیں، کہ اگر کوئی شخص
سنت فجر کو دو بارہ پڑھے یا سنت ظہر و مغرب و عشاء کو مکرر پڑھے تو سنت صرف
اوّل ہے ثانی سنت نہیں، بلکہ نفل محض ہے، اور سنت مؤکدہ واجب کے قریب ہے
تو جب امام تراویح کا تکرار کر رہا ہے اور ثانی سنت مؤکدہ نہیں تو اس کے پیچھے قوم کی
تراویح ادا نہ ہوگی، ہمارے نزدیک یہی رائج اور صحیح ہے، گو مسئلہ مختلف فیہ ہے، مگر
فتویٰ اسی پر ہے اور اصح یہی ہے، اور جن فقہاء نے اسی صورت میں تراویح کو مع الکراہۃ
جائز کہا ہے، ان کی مراد کراہت تحریمیہ ہے، کیونکہ اطلاق کراہتہ بلا قید اسی کو مقتضی ہے
واللہ اعلم، ۲۱ ذیقعدہ ۱۳۸۴ھ

تراویح میں ختم قرآن کا ثبوت | سوال (۲۶) ختم قرآن تراویح رمضان میں یا غیر اس کے
نبی آخر الزمان یا زمان شیخان ضر علیہم الصلوٰۃ والرضوان میں ثابت ہے یا نہیں؟ اگر ہر
تو ترتیب عثمانی پر یا کسی اور طرح پر؟

الجواب، تراویح میں ختم قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صراحۃً ثابت
نہیں، اور نہ حضرت صدیقؓ سے صراحۃً ثابت ہے، ہاں حضرت عمرؓ سے ثابت ہے،
کہ انھوں نے حضرت ابی بن کعبؓ کو بلایا کہ سب لوگ قرآن نہیں پڑھ سکتے، میں چاہتا
ہوں کہ تم سب کو رمضان کی راتوں میں نماز پڑھا دیا کرو، اور ظاہر ہے کہ صحابہ میں کوئی شخص
بھی قدر قلیل قرآن سے عاری نہ تھا، پس اس کے معنی سوا اس کے کچھ نہیں کہ حضرت عمرؓ
کی مراد یہ تھی کہ لوگ پورا قرآن نہیں پڑھ سکتے، نیز حضرت عمرؓ و حضرت عثمانؓ کے

زمانہ میں تراویح اتنی دیر میں ختم ہوتی تھی کہ بعض لوگ لائچی پر سہارا لیتے اور سحری کے وقت ہو جانے کا اندیشہ کرتے تھے، اور بجاوت غالبہ اتنی دیر جب ہی ہو سکتی ہے کہ امام قرآن ختم کرنا چاہتا ہو، اور حضرت عائشہؓ کا غلام رمضان کی راتوں میں قرآن دیکھ کر نماز پڑھاتا تھا، (یعنی نماز سے پہلے یا نماز کے بعد قرآن دیکھ لیا کرتا تا کہ نماز میں بھول نہ ہو) اور یہ بھی جب ہی ہو سکتا ہے جبکہ ختم قرآن کا اہتمام ہو، ورنہ وہی سورتیں پڑھتا جو خوب یاد تھیں، یہ تمام دلائل اس امر کے ہیں کہ صحابہ کو تراویح رمضان میں ختم قرآن کا اہتمام تھا صحابہ کے اس اہتمام سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی رمضان میں قرآن ختم کرتے ہوں گے، گو صراحۃً حدیثوں میں اس کا ذکر نہیں، بہر حال مسئلہ ظنیہ میں دلائل ظنیہ بھی کافی ہے، گو معارض پر حجت نہ ہو، خصوص جبکہ اس کے پاس بھی دلائل ہوں، پھر امام ابو حنیفہؒ نے ایک ختم کو سنت فرمایا ہے، اور وہ تابعی ہیں، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سلف کو اس کا اہتمام کرتے دیکھا اور سنا ہوگا، واللہ تعالیٰ اعلم،
والبسوطی رسالتنا اعلیٰ السنن، ۵۔ رسوال مشکوٰۃ

تراویح کی بیس رکعت کا ثبوت [سوال (۲۷) تراویح میں حضورؐ کا ایک دو دفعہ مسجد میں آنا معلوم ہے، اور آٹھ تراویح پڑھانا، آیا باقی تمام رمضان گھر میں گزارا تھا؟ اور بیس کا ثبوت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہے یا نہیں؟

الجواب؛ ہاں حضورؐ نے جماعت کے ساتھ صلوٰۃ تراویح بجز معدودے چند راتوں کے نہیں پڑھیں، اور اس کی وجہ بھی بتلا دی کہ یہ نماز اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہی، مجھے اس کا التزام کرنے میں اندیشہ ہے کہ یہ فرض نہ ہو جائے، پس ہر شخص اپنے گھر میں پڑھ لیا کرے، اس سے ظاہر یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی گھر میں ضرور پڑھتے ہوں گے، اول ابن عباسؓ سے صاف طور سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کی راتوں میں بیس رکعات پڑھتے تھے، رواہ ابن ابی شیبہ و سندہ حسن کما ذکرہ فی الاعلاء واللہ تعالیٰ اعلم
۵۔ رسوال مشکوٰۃ

نماز تراویح میں ایک غلطی کا حکم [سوال (۲۸) اگر کوئی شخص دو رکعت نماز تراویح کی نیت باندھے اور بھول کر تین رکعت پڑھ گیا تو اس کو نماز دہرائی چاہئے؟ ایسی حالت میں کہ سجدہ پہنچا ہو یا نہ کیا ہو اور تین رکعت پڑھ کر سلام پھیر دیا، اور اول ارادہ کیا تھا کہ دو پڑھوں گا،

(۲) اگر تین پڑھنے کے بعد یاد آیا کہ پڑھنی تھی دو اور تین پڑھ چکا اور پھر وہ چار پوری کرے تو اس کی چار رکعتیں ہوتیں یا نہیں، مفصل طریق سے آگاہی بخشیں۔۔۔۔۔

الجواب؛ (۱) جو شخص تراویح میں بھول کر تین رکعت پڑھ جاوے، اور سجدہ ہو نہ کرے اس کو دوبارہ دو رکعت تراویح کا اعادہ کر لینا چاہئے؟

(۲) اگر دوسری رکعت پر قعدہ کیا تھا تب تو یہ چاروں رکعت تراویح شمار ہوں گی، اور اگر دو رکعت پر قعدہ نہیں تو یہ چاروں رکعت فقط دو رکعت کے قائم مقام ہوں گی، کما فی العالمگیریہ (ص ۵، ج ۱) فان اضاف الیہا رکعة اخرى کانت هذه الاربعة عن تسلیمة واحدة وان قعد فی الثانية قدر التشهد اختلفوا فیہ فعلى قول العامة يجوز عن تسلیمتین وهو الصحيح هکذا فی فتاویٰ قاضی خان، احقر عبد الکریم عفی عنہ ۱۰ رمضان المبارک ۱۴۲۵ھ

بشرط ختم قرآن ماہ رمضان میں نماز پنجگانہ | سوال (۲۹) ایک صاحب نے ایک مستند عالم سے پڑھانے کے لئے امام کے مقرر کا حکم، بذریعہ تحریر دریافت کیا کہ تراویح ماہ رمضان میں قرآن باجرت پڑھوانا اور سماعت کرنا ایسے قرآن کے متعلق علماء کا کیا حکم ہے، عالم موصوف نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا کہ اجرت پر تراویح میں قرآن پڑھوانا اور سماعت کرنا ناجائز ہے، مگر امام مسجد اجرت پر مقرر کر کے اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے، اب اُن صاحب نے جنھوں نے یہ فتویٰ حاصل کیا تھا بمشورہ دو تین اصحاب کے جن میں سے کوئی شخص عالم نہیں ہے، اپنی رائے سے حسب فتویٰ آخر الذکر یعنی تقرامام کے ایک حافظ کو پچیس روپے اجرت پر صرف ماہ مبارک کے واسطے یعنی رویت ہلال ماہ رمضان سے رویت ہلال ماہ شوال تک بہ حیثیت امام مقرر کیا کہ وہ پانچوں وقت کی نماز بہ حیثیت امام مسجد پڑھایا کریں، لیکن نماز تراویح میں ایک یا سوا پارہ پڑھا کریں حافظ نے اس شرط کو منظور کر لیا، یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب؛ جب تراویح میں قرآن شریف پڑھانا مشروع ہے تو جواز کی گنجائش کس طرح ہو سکتی ہے، اگر یہ شرط نہ ہوتی بلکہ فقط امام مسجد مقرر کرتے اور قرآن شریف اپنی خوشی سے بلا کسی معاوضہ کے پڑھا تو جائز ہو سکتا تھا، احقر عبد الکریم عفی عنہ

نوٹ: یہ جواب اس وقت ہو کہ یہ شرط صلب عقد جاریہ میں ہو، اور اگر خارج عقد محض وعدہ ہے تو مضائقہ نہیں، فقط الجواب صحیح ظفر احمد عفاعنہ ۵، ۲۸ رمضان ۱۴۲۸ھ

ترادیح میں تکرار قل ہو اللہ الخ | سوال (۳۰) ترادیح میں ایک رکعت میں تین مرتبہ سورہ قل ہو اللہ احد مع بسم اللہ ختم قرآن شریف پر پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: تکرار قل ہو اللہ ختم کے وقت فی نفسہ تو مباح ہے، مگر جہاں اس کو لازم سمجھتے ہوں کہ اس کے بغیر ختم کو ناقص سمجھتے ہوں وہاں نہ کرنا چاہئے، ۲۸ رمضان ۱۴۲۸ھ

فصل فی ادراک الفریضۃ

ادراک فریضہ کے متعلق بہشتی گوہر | سوال (۱) بہشتی گوہر میں جماعت میں شامل ہونے کے ایک مسئلہ پر شبہ کا جواب

کے مسائل ہیں، اس میں مغرب کے وقت دوسری رکعت کا سجدہ کر لیا ہو تو دوسری رکعت پہ سلام پھیر دے، مگر عالمگیریہ و در مختار میں لکھا ہے کہ نماز کو پوری کر لے؟

الجواب: صحیح یہی ہے کہ اگر مغرب کی دوسری رکعت کا سجدہ کر چکا ہو تو سلام نہ پھیرے، بلکہ نماز تہنہا ہی پوری کرے، اور جماعت میں شامل نہ ہو کما فی الشامی ص ۲۵ ج ۲ وان فی غیر رباعی قطع و اقلی ما لم یسجد للثانیۃ فان سجد انتم ولم یقتل وہکذا فی العالمگیریۃ، اور بہشتی گوہر میں جو اس کے خلاف ہے وہ دراصل اس کے ماخذ یعنی علم الفقہ کی غلطی ہے، اور سوال میں جو عبارت بہشتی گوہر کی طرف منسوب کی ہو وہ عبارت اس کی نہیں ہے، نقل میں احتیاط لازم ہے، فقط احقر عبدالکریم عفی عنہ

الجواب صحیح ظفر احمد عفاعنہ، ۹، ۲۸ رمضان ۱۴۲۸ھ

فصل فی قضاء الفرائض

ایک دن رات اگر بیہوش رہے | سوال (۱) زید اگر اچھا خاصا کسی وجہ سے ایک دن رات تو نمازوں کی قضا واجب نہیں سے زیادہ بیہوش ہو جاوے تو نماز قضا پڑھنا واجب ہے یا نہیں، اور اس بیہوشی کی حالت میں کوئی کام خلاف شریعت ہو جاوے تو زید کو ایسی حالت میں گناہ ہوا یا نہیں؟

الجواب؛ اگر ایک دن رات سے زیادہ بیہوش رہے تو ان نمازوں کی قضا واجب نہ ہوگی اور بیہوشی کی حالت میں اگر کوئی کام خلاف شرع ہو جاوے گناہ بھی نہ ہوگا، واللہ اعلم، ۲۶ رجب
حکم قضا نماز سد سالہ بطریقہ خاص | سوال (۲) ایک رسالہ میں لکھا ہے جس کی سو سال کی نمازیں
 قضا ہو گئی ہوں تو پانچ رکعت پڑھے، بعد سورۃ فاتحہ کے سورۃ اخلاص سات بار پڑھے تو
 نماز اس کی سو سال کی ادا ہو جائے گی، یہ صحیح ہے یا کہ نہیں؟

الجواب، بالکل غلط ہے، ۲۷، ۲۸ سوال مسئلہ

سوال (۳) میت کے بغیر وصیت اگر کوئی وارث
 بغیر وصیت کے کوئی وارث اپنے مال سے قضا
 نمازوں کا فدیہ ادا کرے تو میت کے ذمہ سے نماز یا
 اپنے مال سے اس کے روزے اور نمازوں کا فدیہ
 ساقط ہو جاوے گی یا نہیں؟

الجواب؛ ہاں اللہ تعالیٰ سے امید یہی ہے کہ معاف فرما دیں گے، ۲۲ رجب ۱۳۸۷ھ
استفتاء متعلق فدیہ نماز | سوال (۴) زید کا لڑکا عمر و انتقال کر گیا، جس کے ذمہ کچھ نمازیں
 قضا تھیں، اب زید پچیس روپے ان نمازوں کے فدیہ میں دینا چاہتا ہے فدیہ ادا ہو جاوے گا
 یا نہیں، اور اس فدیہ کے دینے کا کیا طریقہ ہوگا، یعنی ایک محتاج کو اگر کل پچیس روپے دیدے
 جاوے جس کو سخت حاجت ہے، تو فدیہ ادا ہو جاوے گا یا نہیں، یا ضروری ہے کہ ایک صاع
 گہوں کی قیمت روزانہ ایک فقیر کو یا پچیس روپے میں جتنے صاع بن سکیں، اتنے فقروں
 کو ایک ہی روز میں دیا جاوے، غرض کہ ادائیگی کی کیا صورتیں ہوں گی، اور کونسی بہترین
 صورت ہوگی، بینوا تو حیرا؟

الجواب؛ اگر پچیس روپے کی رقم کفارہ کی صلوات کے لئے کافی ہے تو اس رقم کو
 فقراء میں تقسیم کر دیا جاوے، جس میں روایات مختلف ہیں، ایک یہ کہ ایک مسکین کو سب
 دیدینا بھی جائز اور ایک یہ کہ ایک مسکین کو نصف صاع سے زائد دینا جائز نہیں، اسی لایحزریہ
 الا عن صوم او صلوٰۃ وحدہما، اسی طرح ایک مسکین کو نصف صاع سے کم دے تو جائز ہے یا نہیں
 اس میں بھی اختلاف ہے، پس احوط تفریق ہے اور تفریق میں بھی احوط یہ ہے کہ ایک مسکین کو
 نصف صاع سے کم نہ دے نہ زائد دے، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ایک مسکین کو روزانہ ایک
 صلوٰۃ یا ایک صوم کا فدیہ دیتا رہے، اس طرح وہ مسکین واحد حکم متعدد ہو جاوے گا،
 قال ابن عابدین فی رسائلہ قولہ وبلا تعدد فقیرای بخلاف نحو کفارة الیمین

للنص فيها على التقدر فلو اعطى هنا مسكينا صاعا عن يومين جاز لكن في البحر عن القذية ان عن ابى يوسف فيه روايتين وعند ابى حنيفة لا يجزيه كما في كفارة اليامين وعن ابى يوسف لو اعطى نصف صاع من بر عن يوم واحد لمساكين يجوز قال الحسن وبه فاختاراه ومثله في الفهستانى (ص ۲۱۷)

اور اگر چھپس روپے کفارہ کو کافی نہیں تو اس کی صورت یہ ہے کہ ایک مسکین سے کہا جائے کہ اس رقم میں سے کچھ تم کو بھی دیا جائے گا بشرطیکہ تم اس کل روپے کو فدیہ میں لے کر پھر ہم کو مہربہ کر دو، اور اسی طرح بار بار فدیہ میں لیتے رہو، اور مہربہ کرتے رہو، مگر اس کے لئے فہم شخص کی ضرورت ہے، جو فدیہ میں لے کر اپنے کو مالک صحیح سمجھ لے، پھر خوشی سے مہربہ کر دے اسی طرح جب وہ مہربہ کرتا ہے اور آپ فدیہ میں دیتے رہیں تو شمار کثیر کے بعد دیکھ لیا جائے کہ مسکین کے پاس بقدر کفارہ رقم پہنچ گئی یا نہیں، جب پہنچ جائے تو پھر اخیر میں اس بطور مہربہ کے یہ رقم لے کر بطریق مذکور تقسیم کر دی جائے، فعلنا بالضرورة علی احوال الروایتین و علی الثانیۃ فیما لا ضرورة فیہ الی اعطاء الواحد کلمہ، واللہ تعالیٰ اعلم، ۲/ رزی قعدہ شمس

سوال (۵) اگر کسی نماز یکماہ یا زیادہ فوت جس کے ذمہ چھ یا اس سے زائد نمازیں ہوں تو اس پر ترتیب واجب نہیں،

شود ترتیب در فوائت ساقط شود یا نہ، یعنی ایں قضاء فوائت در وقت معین نیست بجز اوقات مکروہہ ہر گاہ خواہد در یک روز یا چند روز از ذمہ خود فوائت را قضا کند بلا رعایت تقدیم و تاخیر در فوائت، چنانچہ نوشتہ لیس للقضاء وقت معین بل جمیع اوقات العز وقت لہ، وبعض گویند از فوائت مذکورہ اولاً فجر یکماہ پس ظہر پس عصر پس مغرب پس عشاء، و اگر نہ ادا نہ خواہد شد و بعض گویند ہر یکے را از فوائت بوقت ادا کردہ باشد تا دشوار نگردد، حکمش چیست؟

الجواب؛ صحیح یہی ہے کہ جس کے ذمہ چھ نمازیں یا اس سے زائد قضا ہوں اس کو ان کی قضا میں تقدیم و تاخیر وغیرہ کا اختیار حاصل ہے، ہاں بہتر یہ ہے کہ ترتیب کے ادا کرے باقی یہ ضرور نہیں کہ ہر نماز کے ساتھ ایک ہی نماز پڑھے، بلکہ اگر سب ایک ہی وقت یا ایک ہی دن میں پڑھ سکے، تو جتنی جلدی فارغ ہو جائے وہی اچھا ہے، ۲/ رمضان شمس

سوال (۶) میت نے وصیت کی ہے کہ روزہ اور قضا نماز روزہ کا کفارہ اور فوت شدہ نمازوں کی تعیین کا حکم جبکہ صحیح تعداد معلوم نہ ہو نماز کا کفارہ دیدیا جاوے، مگر تعداد روزہ تو تو معلوم

ہے، قضا نمازوں کی تعداد یاد نہیں، میت کا بیٹوں پر تبرعاً کفارہ دینا چاہئے اور اپنے پاس سے نہ کہ ترکہ متوفی سے کہ ضرورت اجازت و ژمار ہو، عمر میت ۲۵ سال تھی، اب یہ دریافت طلب ہے کہ کس قدر غلہ یا نقد کفارہ میں مساکن کو دیا جاوے، واضح بادکہ متاثر نماز نہیں تھی مگر کبھی قضا ہو جاتی تھی

الجواب: میت نے وصیت کی ہے تو میت کے مال میں سے کفارہ ادا کیا جاوے ترکہ کی ہتائی تک تو کفارہ میں بدون کسی وارث کی اجازت کے دے سکتے ہیں، اور ہتائی ترکہ میں ادا نہ ہو سکے، تو اس سے زائد بالغ ورثہ کی اجازت سے اُن کے مال میں سے دیوں، نابالغ وارث کے مال میں سے ہرگز نہ دیں، اور مقدار کفارہ کی ہر روزہ کے عوض صدقہ فطر کے برابر ہے، اور اسی طرح ہر نماز کے لئے صدقہ فطر کے برابر غلہ وغیرہ دیا جاوے، اور ہر روز کی چھ نمازیں شمار کی جاویں، پانچ فرض اور ایک وتر، اور نمازوں کی تعداد میں ظن غالب کا اعتبار نہیں

احقر عبد الکریم عفی عنہ، الجواب صحیح، ظفر احمد عفی عنہ ۱۲ صفر ۱۳۵۷ھ

سوال (۷): ایک شخص نے ایک بیٹا چھوڑ کر انتقال کیا، اور دس وقت نماز قضا کیں، اب یہ بیٹا نماز پڑھ کر ادا کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: نمازیں قضا کر دینے سے فرض نمازیں میت کے سر سے نہ اتریں گی البتہ فدیہ دیدیا جاوے، یعنی ہر روز کی پانچ نمازوں اور ایک وتر کی بابت تین صاع فدیہ دیدیا تو امید ہے کہ قبول ہو جاوے گا، اور اگر فدیہ کی میت نے وصیت کی ہو تو ثلث ترکہ میں سے جس قدر فدیہ نکل سکے اس کا نکالنا واجب ہے، والسلام کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ

الجواب صحیح ظفر احمد عفی عنہ ۵ ارج ۲۵ ۱۳۵۷ھ

سوال (۸): اگر چند شخصوں کی کوئی نماز قضا ہو جائے تو جماعت سے پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: قضا میں بھی جماعت ہو سکتی ہے، اور یہ قضا نماز جہریہ کی ہے تو جہر کرنا ضروری ہے، اور ستر یہ کی ہے تو قرأت ستر پڑھنا لازم ہے، مثلاً عشاء کی نماز اگر دن کو قضا پڑھے تب بھی امام کو جہر کرنا چاہئے، کمافی العالمگیریہ (ص ۱۲۵ ج ۱) اذا ترک صلوٰۃ اللیل ناسیاً فقضاها فی النهار وام فیما وخافت کان علیہ السہو وان ام لیلانی صلوٰۃ النهار یخاف ولا یجہر فان جہر ساہیاً کان علیہ السہو کذا فی فتاویٰ قاضی خاں فی سجود السہو، اگر قصداً اس کے خلاف کیا تو نماز کا اعادہ واجب ہے، اور

سہو کیا تو سجدہ سہو واجب ہے، احقر عبدالکریم عفی عنہ ۳ شعبان ۱۳۸۵ھ

فصل فی سجود السہو

سوال (۱) ایک شخص کی نماز میں سہو واقع ہوا، اور اُسے سلام پھیر دینے کے بعد سجدہ سہو یاد آیا تو کیا کرے؟ پھر اُس کا خیال نہ رہا اور سلام پھیر دیا، سلام کے بعد ہی پھر اُسے خیال آیا تو اس نے سجدہ سہو کا اعادہ کیا، اس صورت میں اس کی نماز درست ہوئی یا نہیں، اور نیز اس کا سجدہ سہو؟

الجواب: اگر سلام کے بعد بات چیت کرنے اور مسجد سے نکلنے سے پہلے سجدہ سہو کر لیا تو نماز درست ہو گئی، اور اگر مسجد سے نکل کر یا طلام کر کے سجدہ سہو کیا، تو نماز دوبارہ پڑھنی چاہئے، قال فی الخلاصة وان سلم وهو لا يريد ان يسجد لسهو لم يكن تسليمه ذلك قطعاً حتى لو بدأ..... بل ان يسجد وهو في مجلسه ذلك قبل ان يقوم وقبل ان يتكلم فانه يسجد سجدته السهو فان تكلم او خرج من المسجد لا ياتي بهما (ص ۳، ۱ ج ۱) والله اعلم، ارجاوى الاولى سلم

سوال (۲) ان حکمکم بعدم وجوب سجود رہشی زیور کے ایک مسئلہ پر اشکال کا جواب القول الحری فی مسئلۃ السجود والتحری المسہو علی من تحری عند کثرة شک فی تعداد الركعات فعمل بما یوافقہ التحری من الصواب قد اشتبه علینا امره فان هذا الحكم مخالف للكتب الموجودة عند الفقیر كما لمعتصم الضرری حاشیة القدوری وكنوز الحقائق شرح كنز الدقائق وشرح منية المصلی المسمی بأكبیری وكتاب الآثار وعبارته هكذا محمد قال اخبرنا ابو حنیفة عن حماد عن ابراهيم فيمن نسي الفريضة فلا يدري اربعاً صلى أم ثلاثاً قال ان كان اول نسيانه اعادة الصلوة وان كان يكثر نسيان يتحري الصلوة وان كان أكبر رايه انه اتم الصلوة سجد سجدتي السهو وان كان أكبر رايه انه صلى ثلاثاً اضاف اليها واحدة ثم سجد سجدتي السهو قال محمد وبه نأخذ وهو قول ابی حنیفة وهكذا عبارة بنزل المجهود فی حل البدایة وناطقة بوجوب السجود علی من يعمل بالظن ولما نقل عبارة لضيق

المقام ومعنى ان العمل بالظن عند عروض الشك انقص من العمل باليقين عند عدم عروضه والنقصان في الظن ثلث والواجبات موجب لسجود السهو فان الواجب علينا ان نخرج عن عمدة الفرض والواجب على سبيل التيقن حق الامكان والا مصيرنا الى جاير يمكن فما وجه قولكم بعدم وجوب السجود على من يعمل بالظن في بهشتی زیور و عبارتہ هکذا، اگر شک کرنے کی عادت ہو اور اکثر ایسا شبہ پڑ جاتا ہے تو دل میں سوچ کر دیکھے کہ دل زیادہ کدھر جاتا ہے، اگر زیادہ گمان تین رکعات پڑھنے کا ہو تو ایک اور پڑھ لے اور سجدہ سہو واجب نہیں، الی آخر فالمرجو من المحضرة العالیة ان تمن بالجواب الثاني والوجه الكافي،

الجواب المجمل: بہشتی زیور میں جو عمل بالتحری کی حالت میں عدم وجوب سجدہ سہو مذکور ہے، اس کی دلیل شامی (ص ۹۰، ج ۱) باب سجود السہو کے اخیر میں اور بدائع (ص ۱۶۲ و ۱۶۵ ج ۱) و (بحر (ص ۱۱۱ ج ۲) اور عالمگیری مصطفائی (ص ۸۴ ج ۱) سطر ۶) میں مسطور ہے، اس صورت میں اس کو حکم سے تعبیر کرنا جو محض ہے جس سے احتیاط لازم ہے، ان عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ عمل بالتحری مطلقاً موجب سجود سہو نہیں بلکہ جب بقدر اداء رکن تاخیر کو مستلزم ہو جائے، اُس وقت موجب سہو ہے اور اس قدر تاخیر کی صورت میں سجدہ سہو کا واجب ہونا بحالت تحری بہشتی زیور میں بھی باب سجدہ سہو مسئلہ عاشرہ میں مذکور ہے، اور بذل الجہود میں بھی (ص ۱۴۹ ج ۲) کے اندر بدائع سے یہی نقل کیا ہے، گو اولاً نووی وغیرہ اطلاق نقل کیا ہے، اور کبیری و کتاب الآثار میں جو عمل بالتحری کو مطلقاً موجب سہو لکھا ہے، اس کا مبنی یہ ہے کہ عروض شک کے بعد تحری کرنا عادتاً تاخیر قدر رکن کو موجب ہو ہی جاتا ہے، یہ مطلب نہیں کہ اگر تاخیر نہ ہو جب بھی سجدہ سہو واجب ہی، کیونکہ فکر قلیل سے احتراز غیر ممکن ہے، تو دفع حرج کے لئے فکر قلیل کا عفو ہونا لازم ہے، ۲۹ ربیع الاول ۱۲۵۴ھ

الجواب المفصل: (اقول وبالله التوفیق) قال فی الدرر العلم انه اذا شغل ذلك الشك فتفكر قد راداء ركن ولم يشتغل حالة الشك بقراءة ولا تسبیح وجب علیه سجود السهو فی جميع صور الشك سواء عمل بالتحری

اوبنی علی الاقل فتح لکن فی السراج انه یسجد للسهو فی اخذ الاقل مطلقاً
 رای سواء تفکر قد رکن اولاً ۲ شامی) وفی غلبته الظن ان تفکر قد رکن اھ، قال
 الشامی قوله لکن فی السراج الخ استدراك علی ما فی الفتح من لزوم السجود فی
 الصورتین وهذا التفصیل هو الظاهر لان غلبة الظن بمنزلة الیقین
 فاذا تحری..... وغلب علی ظنه شیء لزمه الاخذ
 ولا یتھرجه لا یجاب السجود علیه الا اذا طال تفکره علی التفصیل المار
 بخلاف ما اذا بنی علی الاقل لان فیہ احتمال الزیادة كما افاده فی البحر اھ رض
 ۱۱) وتعقب علیه فی التحریر المختار بان کلام الفتح فی وجوب سجود السهو للتفکر
 قد راد اھ رکن ولا شک انه فی جمیع صور الشک، وان کان یجب السجود اذا
 بنی علی الاقل مطلقاً لا لخصوص الشغل بل له ان وجد ولا احتمال الزیادة
 اھ (ص ۱۰۳ ج ۱) قلت کون کلام الفتح مقید بقید التفکر قد راد اھ رکن انما
 یتھرج من کلام الدرر واما کلامه فی فتح القدیر فمطلق عنه ونصه قالوا
 اذا شک فی الفجر ان التی هو فیها اولی اوثانیتہ تحری فان وقع تحریرہ
 علی شیء اتم الصلوة علیه وسجد للسهو کذا فی جمیع صور الشک اذا عمل
 بالتحریر اوبنی علی الاقل یسجد اھ (ص ۲۵۳ ج ۱) ولذا قال فی البحر ولم یکن
 المصنف سجود السهو فی مسائل الشک تبعاً لما فی الھدایة وهو ما لا ینبغی
 اغفاله فانه یجب السجود فی جمیع صور الشک سواء عمل بالتحریر اوبنی
 علی الاقل کذا فی فتح القدیر وترك المحقق قیداً لا بد منه مما لا ینبغی
 اغفاله وهو ان یشغله الشک قد راد اھ رکن ولم یشغل حالۃ الشک
 بقراءة ولا تسبیح کما قد مناه اول الباب لکن ذکر فی السراج ان فی
 فصل البناء علی الاقل یسجد للسهو مطلقاً، وکانہ فی فصل البناء علی الاقل
 حصل النقص مطلقاً باحتمال الزیادة فلا بد من جابرو فی الفصل الثانی
 النقصان بطول التفکر لا بطلقه اھ ملخصاً (ص ۱۱۱ ج ۲) والعجب من
 مؤلف العالم کیریۃ انه کیف نقل عن البحر کلام الفتح وترك القید
 الذی نبه علیه مؤلف البحر وزادہ علی کلام الفتح مع انه نقل عن

المحيط بعد ذلك ما يفيد اعتبار هذا القيد ونصه واذا شك في صلواته فلم يدل
 اثلاثاً صلى ام اربعاً وتفكر في ذلك كثيراً ثم استيقن انه صلى ثلاث ركعات
 فان لم يكن تفكيره شغل عن اداء ركن بان يصلي ويتفكر فليس عليه سجود السهو
 وان طال تفكيره حتى شغله عن ركعة او سجدة او يكون في ركوع وسجود فيطول تفكيره
 في ذلك وتغير عن حاله بالتفكير فعليه سجود السهو استحساناً هكذا في المحيط اهـ
 (ص ۸۲ ج ۱) وهذا كله يدل على ان التحري لا يوجب السجود ما لم يطل التفكير،
 فان التحري اى غلبة الظن له حكيم اليقين في العمليات وعليه بناء وجوب
 العمل بخبر الواحد المفيد للظن وبالقياص فيما لا نص فيه وهذا ظاهر للنظر
 في الاصول فانه حص به قول السائل ان العمل بالظن عند عروض الشك
 انقص من العمل باليقين عند عدم عروضه والنقصان في الفرائض والواجبات
 موجب لسجود السهو الخ فانا لانسلم ان مطلق النقصان موجب لسجود السهو
 والا فلا شك ان الصلوة الخالية عن الوسواس والخطرات اكمل مما
 اشتمل عليها فهل يجب سجود السهو من عروض الوسوسة والخطرة في الصلوة
 تكونها انقص مما لا تشتمل عليها كلاً بل النقصان الموجب له ما كان من جنس
 ترك الواجب او تاخير عن محله وليس في العمل بالظن ترك الواجب ولا
 تاخير ولا يجب علينا ان نخرج عن عهدة الفرض والواجب على سبيل التيقن
 فانه لا سبيل الى ذلك اصلاً بل غلبة الظن به كاف فان التيقن بطهارة
 الماء الذي يتوضأ به والمكان الذي يصلي فيه والثوب الذي يستر به
 البدن متعذر عسير جداً وكذا التيقن بصحة صلوة ادبناها قبل الصلوة
 التي نحن فيها الا يتسيرا صلاً وصحة البعدية متوقفة على صحة القبليّة
 فلو كان الخروج عن عهدة الفرض على سبيل التيقن واجباً لم نقد رعلى
 اداء صلوة اصلاً فالواجب انها هو الخروج عن العهدة على سبيل الظن
 الراجح لا غير

وبعد ذلك فنقول ان مسألة هبشتي زير مآيدة بقول الدر والشامى
 (ص ۹۰، ۱۷) وبقول البحر (ص ۱۱۳ ج ۲) وبما ذكر في العالم الكبيرة عن المحيط

(ص ۸۴ ج ۱) ففي هذه الاقوال كلها تصريح بعدم ايجاب التحري السجود الا اذا
 طال التفكير فيه وقد صرح بذلك اسي وجوب السجود في التحري اذا طال لتفكر
 في بهشتي زيور الصافي المسئلة العاشرة من باب سجود السهو ونصته،
 اگر بالکل اخیر رکعت میں التحیات اور درود پڑھنے کے بعد شبہ ہوا کہ میں نے تین رکعتیں
 پڑھی یا چار اسی سوچ میں خاموش بیٹھی رہی اور سلام پھرنے میں اتنی دیر لگ گئی کہ اتنی
 دیر میں تین دفعہ سبحان اللہ کہہ سکتی ہے پھر یاد آ گیا کہ میں نے چاروں رکعتیں پڑھ لی ہیں،
 تو اس صورت میں بھی سجدہ سہو کرنا واجب ہے (ص ۵، ۶ مطاوی علی مراقی الفلاح)
 ومعنی قول بہشتی زیور فی مسئلہ الحادیۃ والعشرین، اگر زیادہ گمان تین رکعت پڑھنے کا ہو
 تو ایک رکعت اور پڑھ لے اور سجدہ سہو واجب نہیں ہے، اور اگر زیادہ گمان یہی ہے کہ
 میں نے چاروں رکعتیں پڑھ لی ہیں تو اور رکعت نہ پڑھے اور سجدہ سہو بھی نہ کرے، اھ
 یعنی جبکہ اس سوچنے میں بقدر تین مرتبہ سبحان اللہ کے دیر نہ ہو، جس کی دلیل مسئلہ عاشر ہے کہ وہاں
 اتنی مقدار تفکر کو موجب سجدہ سہو صراحتہ کہہ دیا گیا ہے، تو مسئلہ نمبر ۲۱ میں سجدہ سہو کا واجب
 نہ ہونا اس قید کے ساتھ مقید ہے کہ تفکر میں بقدر تین مرتبہ سبحان اللہ کے دیر نہ ہو، اور اس صورت
 میں تحری کا موجب سجود نہ ہونا، درمختار و شامی و تحریر مختار و بحر و عالمگیری کی تصریح سے
 ثابت ہو چکا، کما مر و هذا القدر کاف لصحة المسئلة المذكورة فيه لان المؤلف
 انما التزم فيه كون المسئلة منقولة عن كتاب معتبر من كتب الفقه لا غير، واما
 ان ذلك معارض بما في المعاصر الضمري حاشية القدوري وكنوز الحقائق
 شرح كنز الدقائق وبذل المجهود فالجواب عنه ان هذه ليست من كتب
 الفتاوى المعول عليها في الافتاء كما لا يخفى مع ان بذل المجهود فيه تصريح
 بعدم ايجاب التحري سجود السهو الا اذا طال التفكير فيه ونقل عن البدائع
 (ص ۱۴۹ ج ۲) ونص البدائع واما بيان سبب الوجوب فسبب وجوب ترك
 الواجب الاصلی فی الصلوة او تغیر او تغیر فرض منها عن محل الاصلی ساهیا
 لان كل ذلك يوجب نقصانا في الصلوة فيجب جبره بالسجود ويخرج على
 هذا الاصل مسائل الى ان قال وعلى هذا اذا شك في شي من صلواته فتفكر
 في ذلك حتى استيقن وهو على وجهين اما ان طال تفكره بان كان مقدار

ما يمكنه ان يؤدي فيه ركنا من اركان الصلوة كالركوع والسجود ولم يطل فان لم يطل تفكره فلا سهو عليه لانه اذا لم يطل لم يوجد سبب الوجوب الاصلى وهو ترك الواجب او تغيير فرض او واجب عن وقته الاصلى ولان الفكر القليل مما لا يمكن الاحتراز عنه فكان عقودا فعلا للحرج وان طال تفكره فكذلك في القياس وفي الاستحسان عليه السهو وجه القياس ان الموجب للسهو يمكن النقصان في الصلوة ولم يوجد لان الكلام فيما اذا تذكر انه اذا بقي مجرد الفكر وانه لا يوجب السهو كما لفكر القليل وجه الاستحسان ان الفكر الطويل مما يؤخر الامكان عن اوقاتها فيوجب تسكن النقصان في الصلوة فلا بد من جيرة بسجدة في السهو بخلاف الفكر القصير اهم ملخصا (ص ۱۶۵ و ۱۶۶) قلت وهذا نص صريح في ان التفكير والعمل بالظن الغالب لا يوجب سجود السهو كما في بهشتي زيور الا اذا طال التفكير وما يمكن فيه اداء ركن قال سيد الخليل دام علاه في بذل المجهود والحديث (اي حديث ابى سعيد وابن مسعود عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال اذا كنت في صلوة فشككت في ثلاث اواربع واكبر ظنك على اربع تشهدت ثم سجدت سجدتين وانت جالس قبل ان تسلم ثم تشهدت ايضا ثم تسلم) وان كان مطلقا لكنه مخصوص ببعض الصور وقد ثبت عنه صلى الله عليه وسلم انه لبس الخميصة التي لها اعلام فقال اذهبوا بها الى ابي جهنم اتوني بافجانيته فانها الهتني وفي بعض الروايات شغلتي عن صلوتي وروى عن عمر بن الخطاب عن ابي هريرة عن النبي صلى الله عليه وسلم انما سجدت في الصلوة روعا علق عنه البخاري اجهن جيشي وانا في الصلوة (۱۲) فوق التفكير في هذه الصور ولم يثبت انها سجد افضل ذلك على ان مطلق التفكير لا يوجب السجود اهم بمعناه (ص ۱۶۹) وحاصله ان ما ورد في الحديث من الامر بسجود السهو عند العمل باكبر رايه مطلقا ليس على اطلاقه بل مقيد بطول التفكير فيه لتعذر الاحتراز عن قليله والحرج مدفوع بالنص ولعل وجه ورود الحديث على صيغة الاطلاق ان عروض الشك في مقدار الركعات وتحري الصواب فيه

لا یخلو فی العادة الغالبة عن طول التفكير قد یرما یؤدی فیہ رکن وقصر نادر و
النادر كما لم یعد فبنی الکلام علی العادة الغالبة وامر بالسجود وعند التحری مطلقا
لا سيما اذ انظرنا الی الاختلاف الواقع بین الائمة فی تحدید ادنی زمان یمکن
فیہ اداء رکن فعند الامام مقدربسبحان الله مرة لکونه قد رایة قصیرة وهی
ثم نظر قال الطحاوی علی الدر قوله قد راداء رکن ظاهر ولو بلا سنة وهو مقدرب
بسبحان الله ام (ص ۵۰۲ ج ۱)

وقال الطحاوی الصافی حاشيته علی مراقی الفلاح قوله زمن یسم اداء رکن
والمراد انه یسعه بسنته وهو قدر ثلث تسبیحات وهذا مذهب الثاني و
هو المختار كما فی الدر ام (ص ۱۹۶) ولا یخفی ان الشک وتحری الصواب فیہ
لا یخلو عن التفكير بقدر سبحان الله مرة غالباً فیجب السجود عند الامام و
علیه یحمل ما فی کتاب الآثار والطحاوی والکبیری من اجاب السجود عند
العسل بالتحری مطلقا لکونه لا یخلو عن التفكير والاشتغال بقدر سبحان الله
ولکن لما کان هذا القدر قليلا لا یمکن التحرز عنه عادة والخرج مدفوع
بالنص لیریاخذ به المشایخ واختاروا فی تقدیر الرکن قول ابی یوسف وهو
قدر ثلث تسبیحات وتفصیل ذلك فی الضميمة الثالثة للجلد الثاني

لهشتی زیور المطبوعة اخرا فلیراجع والله اعلم، ۲۹ ربيع الاول ۱۲۵۵ھ

سجدہ سہو میں بیچ پڑھنے | سوال (۳) سجدہ سہو میں تسبیح سبحان ربی الاعلیٰ پڑھنے کی ضرورت
کی ضرورت ہے یا نہیں؟ ہے یا نہیں؟ برائے کرم جواب صاف طور سے تحریر فرمادیں،

الجواب: سجدہ سہو میں بھی سبحان ربی الاعلیٰ پڑھنا چاہئے، اور سجدوں کی طرح
اس میں بھی تسبیح مذکور سنت ہے، واللہ اعلم، ۵ ربيع الثاني ۱۲۵۵ھ

قعدة اخیره میں تکرار تشہد اور رکعت اولیٰ وثالثہ | سوال (۴) تکرار تشہد فی القعدة الاخيرة
میں جلسہ تخفیف سے سجدہ سہو واجب ہوتا ہے یا نہیں؟ کا مسئلہ مزید اطمینان کے لئے منوجا کر دوسری

کتابوں میں دیکھا، عالمگیری میں تبیین سے منقول ہے، لا سہو علیہ بحر الرائق میں بھی تصریح
موجود ہے کہ سجدہ سہو واجب نہیں، ونیز بحر میں لکھا ہے کہ طحاوی کے نزدیک دونوں قعدہ
میں تکرار تشہد موجب سہو نہیں، مگر قعدة اولیٰ کے باب میں طحاوی کے قول پر اعتماد نہیں

نہ فتویٰ ہی، فتویٰ وجوب پر ہے، اور قعدہ ثانیہ کے باب میں اختلاف منقول نہیں، اور اگر ہوا بھی تو اس پر اعتماد نہیں، احقر نے اور برادر مولوی عبدالغفار صاحب نے بھی تحقیق کی، مسئلہ عدم سہو صحیح تھا، احقر کو بھی اطمینان ہو گیا، محض اطلافاً گزارش کیا گیا، حضور نے تو پہلے ہی اطمینان فرمایا، اور جلوس بمقدار جلسہ استراحت فی الركعة الاولى او الثالثة کے باب میں حضور نے تحریر فرمایا "میں بجز جلوس سجدہ سہو کرتا ہوں، لالانہ ترک السنہ بل لان فیہ التاخر من القيام" اس میں غور کیجئے، غور کرنے سے قلب میں یہ بات آتی کہ حضرت امام ابو حنیفہ قعدہ اولیٰ میں درود شریف بمقدار اللہ صل علی محمد کو موجب سہو فرماتے ہیں، اس کی وجہ بھی یہی معلوم ہوتی ہے، یعنی لالان الصلوة علی النبی یوجب السہو بل لان فیہ التاخر من القيام واقعی فرق تو معلوم ہوتا ہے، لیکن غالباً صاحب رد المحتار نے تاخیر کے دو درجہ قائم کئے، ایک بمقدار جلسہ استراحت اتنی تاخیر عند الحنفیہ خلاف سنہ ہے، نہ خلاف واجب، اور دوسرا درجہ بمقدار اللہ صل علی محمد اتنی تاخیر خلاف واجب اور موجب سہو ہی، یا یوں کہا جاوے کہ نہوض علی القدرین عند الحنفیہ سنت ہے، نہ واجب فمن جلس مقدار جلسة الاستراحة ولم ينهض علی قدمیه خالف السنۃ عندنا ولا سہو علی من ترک السنۃ، اب کی مرتبہ انشاء اللہ متوجہ کر فتح القدیر اور بحر الرائق وغیرہ کیونکہ جو کچھ انشاء اللہ عرض خدمت عالی کروں گا، پھر جو حضور فرمادیں گے اس پر عمل کروں گا، یوں تو تقلیداً اب بھی عمل کر سکتا ہوں، لیکن تحقیق کے بعد اور اچھا ہو گا غالباً،

الجواب؛ اقول وبالله التوفیق، رکعت اول وثالثہ میں شامی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بجز جلوس بمقدار جلسہ خفیفہ سجدہ سہو لازم نہیں ہوتا، بلکہ جلسہ طویل سے جب ہوتا ہے، ونصہ۔ وکذا القعدۃ فی اخر الركعة الاولى او الثالثة فيجبته کہا ويلزم من فعلها ايضاً تاخير القيام الى الثانية او الرابعة عن محله وهذا اذا كانت القعدة طويلة اما الجلسة الخفيفة التي استحبها الشافعي فتركها غير واجب عندنا بل هو الافضل كما سيأتي اه (ص ۴۸۹ ج ۱) وقال في الدرر ويكبر للنهوض على صدره وقدميه بلا اعتماد وقعود استراحة ولو فعل لا بأس به اه قال الشامي قال في الكفاية اشار به الى خلاف الشافعي في موضعين احدهما يعتمد بيد يده على ركبتيه عندنا وعندنا على الارض والثاني الجلسة

الخفيفة قال شمس الائمة الحلواني الخلاف في الافضل حتى لو فعل كما هو
مذهبنا لا بأس به عند الشافعي ولو فعل كما هو مذهبنا لا بأس به عندنا
كذا في المحيط قال في الحلية والاشبه انه سنة او مستحب عندنا
العدو فيكرة فعله تنزيها لمن ليس به عذر اياه وتبعه في البحر واليه يشير
قولهم لا بأس فانه يغلب فيما تركه او في اقول ولا ينافي هذا اما قدمه الشافعي
في الواجبات حيث ذكر منها تركه تعود قبل ثمانية ورابعة لان ذلك محمول
على القعود الطويل ولذا اقيدت الجلسة هنا بالخفيفة تامل اه (ص ۵۳۸)
هذا والله تعالى اعلم، ۲۳ شعبان ۱۲۳۳ھ

واما مسألة تكرار التشهد فتحقيق السائل فيه صحيح انه يجب
السهو لو كرر في القعدة الاولى ولا تجب لو في الاخيرة قال في شرح المنية
لو قرأ التشهد مرتين في القعدة الاخيرة او تشهد قاضا راى في الاخيرين
او في الاول قبل الفاتحة (۱۲) اورا كذا وساجدا لا سهو عليه كذا في المختار
ولو زاد في التشهد في القعدة الاولى على التشهد شيئا يجب عليه سجود
السهو وان اعتبر مقلد ما يؤدي فيه ركن اه ملخصا (ص ۱۲۲) والله اعلم
۲۸ شعبان ۱۲۳۳ھ

سوال (۵)
مغرب کی نماز میں امام کا بھول کر امام نے مغرب کی تیئوں
چوتھی رکعت کے لئے قیام کرنا، امام نے مغرب کی تیئوں
رکعتیں پڑھیں، اور قعدة اخیرہ بھی کر لیا، مگر بھول کر کے امام نے یہ سمجھا کہ دو رکعتیں ہوئی
ہیں، اب امام پھر چوتھی رکعت کے لئے کھڑا ہو گیا، اور نہ کسی مقتدی نے بتلایا، اور سب
مقتدی بھی امام کے ہمراہ کھڑے ہو گئے، مگر ایک مقتدی امام کے ساتھ نہیں کھڑا ہوا بلکہ قعدہ
ہی میں بیٹھا رہا، جب امام نے چوتھی پڑھ لی اور سجدہ سہو بھی کر لیا، اب امام کے ساتھ اس آدمی
نے بھی سلام پھیرا، جو چوتھی رکعت کے واسطے نہیں کھڑا ہوا تھا، اب اس صورت میں اس
آدمی کی نماز ہو جاوے گی یا نہیں؟ کیونکہ اس نے امام کے ساتھ چوتھی رکعت میں اتباع نہیں
کی ہے، فقط بینوا توجروا؟

الجواب، فی الدر المختار (وان فقد فی الرابعة) مثلاً قد والتشہد

(ثم قام عاد وسلم) ولو سلم قائما صح ثم الاصح ان القوم ينتظرونه فان عاد تبعوه (وان سجد للخامسة سجدوا) لانه ثم فرضه اذ لم يبق عليه الا السلام وقال الشامي (قوله مثلا) اي بعد في الثالثة الثلاثي اوفي ثمانية الثاني (قوله ثم الاصح الخ) لانه لا اتباع في البدعة وقيل يتبعونه مطلقا عاد اول (قوله فان عاد) اي قبل ان يقيد الخامسة بسجدة تبعوه اي في السلام (ص ۸۲، ج ۱) وهكذا في مراقي الفلاح مع الطحطاوي (ص ۲۷۲)

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ حالت مذکورہ فی السؤال میں اصح یہی ہے کہ امام کی اتباع چوتھی رکعت میں نہ کی جاوے، بلکہ منتظر بیٹھا رہے، اگر امام چوتھی رکعت کا سجدہ کرنے سے پیشتر بیٹھ کر سلام پھیرے تو مقتدی اس کے ہمراہ سلام پھیرے ورنہ جب امام چوتھی رکعت کا سجدہ کرے اس وقت مقتدی خود سلام پھیرے، پس اس بیٹھنے والے شخص نے یہ تو ٹھیک کیا کہ چوتھی رکعت میں امام کے ساتھ کھڑا نہیں ہوا، لیکن چوتھی رکعت میں سجدہ کرنے کے بعد امام کے سلام کا انتظار نہ کرنا چاہئے تھا، لیکن اس تاخیر سے نماز فاسد نہیں ہوئی، غایت مافی الباب قول اصح پر تاخیر سے سجدہ سہو آتا، مگر چونکہ اس نے بعد میں سلام میں امام کا اتباع کیا ہے اس لئے اس کا وہی حکم ہے جو وجوب سجدہ سہو پر مقتدی حکم ہے، اور جن لوگوں نے امام کے ساتھ چوتھی رکعت پڑھی ان کی نماز قول ثانی پر جواصح کا مقابل ہے صحیح ہوگئی بشرطیکہ امام نے سجدہ سہو کر لیا ہو، اور گویہ روایت اصح نہیں مگر اس وقت عموم جہل و بلوی کی وجہ سے اسی پر فتویٰ دینا مناسب ہے، ورنہ بہت لوگوں کی نمازیں باطل ہوں گی، واللہ اعلم، ۲۲ جمادی الثانی ۱۳۸۷ھ

امام نے بدون وجوب کے سجدہ سہو کیا | سوال (۶) جس حالت میں سجدہ سہو لازم نہ آوے تو نماز فاسد ہو جائے گی یا نہیں، اور سجدہ سہو کر لیا گیا تو پھر نماز میں کچھ غلطی تو نہیں آتا

الجواب: نماز ہو جاتی ہے، لیکن اگر امام ایسا کیا کہ وجوب سجدہ سہو کے گمان پر سجدہ سہو کر لیا اور بعد میں معلوم ہو گیا، کہ سجدہ سہو واجب نہ تھا، تو اس صورت میں مسبوق کی نماز میں اختلاف ہے، بعض کے نزدیک مسبوق پر اعادہ ہے، جبکہ اُس نے سجدہ سہو میں متابعت کی ہو، اور بعض کے نزدیک اعادہ نہیں، اور اعادہ واجب نہ ہونے پر فتویٰ ہے، اذا ظن الامام ان عليه سهوا فسجد للسهو وتابعه المسبوق في ذلك

ثم علمان الامام لم يكن عليه - هو فيه روايتان واختلف المشايخ لاختلاف
الروايتين واشهرهما ان صلوٰۃ المسبوق يفسد وقال الامام ابو حفص الكبير
لا يفسد والصد والشهيد اخذ به في واقعاته وان لم يعلم ان ليس عليه
لم يفسد صلوٰۃ المسبوق عند هم جميعا خلاصة الفتاوى (ص ۱۲۱۲ ج ۱)

الجواب صحيح ، ظفر احمد عفا عنه ۱۲ رذيقہ ۲۲۷ کتبہ الاحقر عبد الکريم عفی عنه
تشہد میں سہوا بسم اللہ پڑھ لی سوال (۷) مغرب کی دوسری رکعت میں التحیات سے
توجہ سہو واجب نہ ہوگا پہلے بسم اللہ شریف سہوا پڑھ جانے سے سجدہ سہو واجب

ہے یا نہیں؟

الجواب: تشہد ابن مسعود واجب نہیں بلکہ اولیٰ ہے، پس اگر تشہد دوسرے
طرق مرویہ کے موافق پڑھ لے تو یہ بھی جائز ہے، اور بعض طرق میں بسم اللہ کی زیادت
بھی ہے، لہذا سجدہ سہو تو نہ ہوگا، مگر ایسا کرنا اچھا نہیں، اب اگر محض بسم اللہ زیادہ کیا
تو یہ توجہ جائز ہے، ”لکونہ وارد“ اور اگر بسم اللہ الرحمن الرحیم زیادہ کیا تو اس میں کراہت
تیزی ہوگی، ”لکونہ غیر وارد“ اور سجدہ سہو نہ ہوگا، لکونہ زیادتہ فی التشہد لا علی التشہد
واللہ اعلم، احقر عبد الکريم عفی عنه الجواب صحيح ، ظفر احمد عفا عنه ۱۲ رذی الحجہ ۱۲۷۷

تکرار اکثر فاتحہ اور اعادہ تشہد سوال (۸) نماز میں اول یا ثانی رکعت میں سورۃ فاتحہ
سے سجدہ سہو کا واجب ہونا میں کوئی کلمہ غلطی سے پڑھا گیا یا شک ہوا اس کلمہ میں غلط
پڑھنے کے بعد قرأت کثیر سورۃ فاتحہ کا اعادہ کیا، قرأت کے ماقبل کلمہ مذکورہ واسطے
تصحیح کلمہ مذکورہ کے جس سے تکرار کثیر سورۃ فاتحہ کا لازم آیا کیا یہ تکرار جو واسطے تصحیح
کلمہ مذکورہ کے ہے عذر واسطے رفع کراہت تکرار کثیر سورۃ فاتحہ کے ہو سکتا ہے یا نہیں
اگر نہیں ہو سکتا تو ہر نماز کا اعادہ واجب ہوگا یا سجدہ سہو کا؟

اسی طرح قعدۃ اولیٰ میں تشہد کا کوئی کلمہ غیر صحیح پڑھا گیا یا شک ہوا کہ غیر صحیح
پڑھا گیا، پھر چند کلمات کے ساتھ اس کلمہ کو تصحیح کے لئے اعادہ کیا، ماقبل اس کلمہ کے کیا
یہ اعادہ زیادتی فی التشہد کے حکم میں ہے یا نہیں، اگر ہے تو پھر اعادہ نماز ہوگا یا سجدہ سہو؟
الجواب: فی العالمگیریۃ (ص ۸۰ ج ۱) ولو کورہا فی الاولین يجب
علیہ سجود السہو بخلاف ما لو اعادہا بعد السورۃ او کورہا فی الاخرین

کذا فی التبيين، ولو قرأ الفاتحة الاحرفاً او قرأ أكثرها ثم أعادها ساهياً فهو بمنزلة ما لو قرأها مرتين كذا فی الظهيرية (۲) وفي الطحاوی علی المراقی ص ۵، ۲ ولو شك فی تكبيرة الافتتاح فاعاد التكبیر والشاء ثم تذكراً كان عليه السهو ولا يكون الثانية استقباليًا وقطعاً لا ولى، (۳) وفي العالم كبرية (ص ۸۱ ج) ولو كرر التشهد فى القعدة الاولى فعليه السهو،

روایت اولی سے معلوم ہوا کہ اگر سورۃ سے قبل فاتحہ کا تکرار کیا جاوے تو موجب سہو ہے، اور بعد سورۃ کے اعادہ فاتحہ کا موجب سہو نہیں، و نیز یہ معلوم ہوا کہ اگر اکثر فاتحہ پڑھ کر اعادہ کیا تو سجدہ سہو واجب ہوگا، اور اگر اکثر حصہ نہیں پڑھا تھا تو اعادہ سے سجدہ سہو واجب نہ ہوگا، باقی رہی یہ بات کہ سورۃ فاتحہ کل یا اکثر پڑھنے کے بعد کتنی فاتحہ کے اعادہ سے سجدہ سہو لازم ہوتا ہے، سو اس کی تصریح نہیں ملی، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے بعض اقل فاتحہ پڑھ کر اس کا اعادہ موجب سہو نہیں، اسی طرح اکثر یا کل پڑھ کر بھی اقل کا اعادہ موجب سہو نہ ہوگا، لیکن جزئیہ نہیں ملا، لیکن طحاوی علی مراقی الفلاح کی اس عبارت سے متبادر یہ ہے کہ مطلقاً بعض فاتحہ کا تکرار بھی مثل کل فاتحہ کے تکرار کے موجب سہو ہے، لیکن اس بعض مطلق کو آیت واحدہ کے ساتھ مقید کیا جاوے گا، کیونکہ اس سے قیل تو غیر معتبر ہے قال ولو كرر الفاتحة او بعضها فى احدى الاوليين قبل السورة تسجد للسهو ام (ص ۲۶۱ ج ۱) وفى الدرر فى بيان واجبات الصلوة وهى قراءة فاتحة الكتاب فيسجد للسهو بترك اكثرها الا اقلها لكن فى المجتبى يسجد بترك آية منها وهو اولى قلت وعليه فكل آية واجبة ككل تكبيرة عيد واتيان كل وترك تكبير كل ام (ص ۲۶۱ ج ۱) قلت فلما كان كل آية منها واجبا فترك آية منها يوجب سجود السهو لكونه تاخيراً فى الواجب الثانى امى تاخير اللآية الثانية عن محلهما والله اعلم وفى شرح المنية وكذا لو قرأ الفاتحة الاحرفاً ثم أعادها لا سهو عليه كذا فى الخلاصة ص ۳۳۳ قال الشيخ وهذا راجع عندى ويمكن ارجاع كلام الطحاوى اليه قلت ولكن لم ينشرح به صدرى بعد ولعل الله يحدث بعد ذلك أمراً والله اعلم ۱۲ ظ

عہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ،

اور روایت ثانیہ سے معلوم ہوا کہ شک کی وجہ سے اعادہ کی صورت میں یہ تفصیل ہے کہ اگر یاد آجاوے کہ پہلے صحیح پڑھا تھا تو وہ تکرار موجب سہو ہے ورنہ نہیں، اور روایت ثالثہ سے تشہد کے اعادہ کا بھی موجب سہو ہونا معلوم ہوا، اور فاتحہ پر قیاس کر کے یہاں تفصیل مذکور ہوگی، ہر حال میں اعادہ موجب سہو نہ ہوگا، بلکہ ظاہر یہ ہے کہ جب مقدار رکن کا اعادہ ہو جائے تو سجدہ سہو ہوگا، واللہ اعلم، عبدالکریم عفی عنہ
الجواب صحیح ظفر احمد، عفا عنہ ۱۲ رمضان ۱۴۲۲ھ

منفرد سجدہ سہو کے لئے ایک طرف سوال (۹) سلام پھرے یا دونوں طرف؟
..... منفرد کو سجدہ سہو لازم ہوا، تو ایک طرف سلام پھر کر سجدہ سہو کرے یا دونوں طرف سلام پھر کر سجدہ سہو کرے، اس میں صحیح قول کونسا ہے، معلوم کرادیں، کیونکہ درمختار کی عبارت سے دو سکر سلام کے بعد سجدہ سہو کرنے معلوم ہوتا ہے کہ دو سلام پھرنے کے بعد سجدہ سہو ساقط ہو جاتا ہے، نماز پھر پڑھنے کو کہا جاتا ہے، اس واسطے آپکو تکلیف دی جا رہی ہے، برائے کرم مہربانی فرما کر جواب جلد عنایت فرمائیے گا،

الجواب؛ درمختار میں ایک قول کی بنا پر یہ کہا ہے، کہ سجدہ سہو کے لئے اگر دونوں طرف سلام پھیرے تو پھر سجدہ سہو ساقط ہے، مگر فتویٰ اس پر نہیں، بلکہ فتویٰ اس پر ہے کہ سجدہ سہو کے لئے سلام تو ایک ہی طرف پھیرے، لیکن اگر دونوں طرف سلام پھیرے تب بھی سجدہ سہو ساقط نہیں ہوا بلکہ وہ سجدہ سہو دونوں طرف

لاحاشیہ صفحہ گذشتہ) وجہ عدم الانشراح کون مافی النظریۃ مخالفہ صریحا کما ذکرہ فانہ واجب السہو فی اعادۃ الفاتحۃ بغیر قرآۃ اکثرہا و شارح المنیۃ لایوجبہ ولو قرأ کلہا الا حرقا ولا شک ان الاحتیاط فی ایجاب السہو الذی یظہر لی ان مافی النظریۃ ایضا لایوافق قول الامام بل ہو منبئی علی قولہما فان لولایہ عندہما اکثر الفاتحۃ وعند الامام کل آیت مہنا واجبہ کما ذکرہ فی الدر منبئی ایجاب السہو بتکرار آیت مہنا کما یدل علیہ کلام الطحاوی المار قد جعلت الشافعیۃ ترتیب آیات الفاتحۃ والموالاة مہنا شرطاً وعدوا کل آیت مہنا رکناً فالاحوط ما قالہ فی الدر ان کل آیت مہنا واجبہ واذا کان كذلك فتکرار آیت مہنا یوجب التأخیر فی الثانیۃ وہی واجبہ فیجب السہو لتأخیر الواجب ۱۲ ظ

سلام کے بعد بھی کر سکتا ہے اور اعادہ واجب نہیں، وجہہ ما فی رد المحتار
وقیل یأتی بتسلیمتین وهو اختیار شمس الائمة وصدرا الاسلام اخی
فخر الاسلام وصححه فی الہدایة والظہیریة والمفید والینابیع
وکذا فی شرح المنیة قال فی البحر وعزاه ای الثانی فی البدائع ای
عامتهم فقد تعارض النقل عن الجبہور ام (ص ۲، ج ۱) فاذا کان
مختارہو لاعلام ان یأتی بسجود السہول بعد تسلیمتین لزم عدم سقوط
السجود بہما ولكن الاحوط الاحتراز عن التسلیمتین خروجاً من الخلاف
فقد قال بعض من قال بتسلیمة واحدة فقط بسقوطہ بہما قال الشامی
قلت وعلیہ فیجب ترک التسلیمة الثانية ام (ص مذکور) قلت وجہ
جواز التسلیمتین اطلاق قولہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدتا السہول بعد
السلام وهو حسن واطلاق ما فی الصحیح انه صلی اللہ علیہ وسلم سجدتا
فلما قضی صلوٰتہ سلم ثم سجد وسلم والمطلق ینصرف الی المعہود
منہ والبسط فی الاعلاء، واللہ اعلم، ۳ رجمادی الثانی ۱۳۶۴ھ

سوال (۱۰) نماز میں ترک واجب کے مشبہ پر ترک
شبه ترک واجب پر سجدة سہو واجب ہے یا نہیں؟
واجب نہ ہونے کا ظن غالب ہوتے ہوئے احتیاطاً

سجدة سہو کر لینا جائز ہے یا نہیں، جبکہ ایسے شبہات اکثر ہوتے ہوں؟
الجواب: جب ظن غالب عدم ترک واجب کا ہے تو سجدة سہو کی ضرورت
نہیں، لیکن اگر احتیاطاً کر لے تو منفرد کے لئے تو حرج نہیں، لیکن امام کو بلا ضرورت
احتیاطی سجدة نہ کرنا چاہئے، کیونکہ اس سے مسبوق کی نماز پر فساد لازم آئے گا، علی
قول البعض والخروج من الخلاف سلم، ۲۶ شعبان ۱۳۶۴ھ

سوال (۱۱) الامداد بابت ذی الحجہ ۱۳۳۳ھ
کے صفحہ ۴ میں بعنوان تصحیح مسئلہ حاشیہ پر
یوں درج ہے، "الامداد بابت ذیقعدہ
صفحہ ۱۸، س ۱۱ تا ۱۸ میں جو ایک سوال کے
اختلاف کی تطبیق

جواب میں لکھا ہوا ہے کہ التحیات کے مکرر پڑھنے سے سجدة سہو لازم ہوگا، طحاوی

شرح مراقی الفلاح سے یہ جواب غلط ثابت ہوا ہے، اس جواب سے رجوع کرتا ہوں، صحیح جواب یہ ہے ”قعدۃ اولیٰ میں التحیات مکرر پڑھنے سے سجدۃ سہو لازم ہے، اور قعدۃ اخیرہ میں التحیات مکرر پڑھنے سے سجدۃ سہو لازم نہیں،“ تمام ہوئی یہ عبارت، بہشتی زیور جدید حصہ دوم صفحہ ۵۴ میں آخری مسئلہ ہے، نفل نماز میں دو رکعت نماز پڑھ کر التحیات کے ساتھ درود شریف بھی پڑھنا جائز ہے، اس لئے کہ نفل ہے، درود شریف کے پڑھنے سے سجدۃ سہو نہیں ہوتا، البتہ اگر دو دفعہ التحیات پڑھ جاوے تو نفل میں بھی سجدۃ سہو واجب ہے، تمام ہوئی عبارت بہشتی زیور کی،

وجہ تطبیق دونوں مسئلوں کی کس طرح ہے، وجہ اشتباہ یوں ہے کہ بہشتی زیور کی عبارت سے قویوں معلوم ہوتا ہے کہ دو رکعت کے بعد التحیات کو مکرر پڑھ جانے سے سجدۃ سہو لازم ہوتا ہے، اور نفل کی ہر دو رکعت کا قعدہ حکم میں مثل آخری قعدہ کے ہے اور الٰہداد کی عبارت سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ قعدۃ اخیرہ میں التحیات مکرر پڑھنے سے سجدۃ سہو لازم نہیں، حالانکہ تاخیر سلام سے بھی سہو کا سجدہ واجب ہے، اس لئے دونوں کی وجہ تحریر فرمائی جاوے، تاکہ مسئلہ خوب ذہن نشین ہو جاوے، ...

الجواب: قعدۃ اخیرہ میں مکرر تشہد سے سجدۃ سہو واجب نہ ہونا، جیسا کہ حاشیہ الٰہداد میں طحاوی سے لکھا ہے، عالمگیر یہ اور منیہ میں بھی موجود ہے، بلکہ طحاوی نے منیہ ہی سے نقل کیا ہے، باقی رہا یہ شبہ کہ تاخیر سلام سے سجدۃ سہو واجب کیوں نہیں ہوا اس کا جواب بھی طحاوی سے معلوم ہوتا ہے، ونصہ هكذا وان قرأ بعد التشهد فان كان في الاول فعليه السهو لما خيرا الواجب وهو وصل القيام بالفراغ من التشهد وان كان في الاخير فلا سهو عليه لعدم ترك واجب لانه موم له في الدعاء والثناء بعده فيه والقراءة تشتمل عليهما ولو قرأ التشهد مرتين في القعدة الاخير او تشهد قائما او راكعا او ساجدا لا سهو عليه، منية المصلي طحاوی (ص ۲۶۷)، اس سے معلوم ہوا کہ قعدۃ اخیرہ میں تشہد کے بعد قرأت سے سجدۃ سہو واجب نہ ہونے کی وجہ قرأت کا شمار و دعاء پر مشتمل ہونا ہے، اور تشہد ثناء و دعاء پر مشتمل ہی، اس لئے اس سے بھی سجدۃ سہو واجب نہ ہوگا، چنانچہ منیہ کی عبارت مذکور

قراۃ التہجد الخ کے تحت میں شارح منیہ کبیری میں لکھتے ہیں واما التہجد فلانہ تناء والقیام والركوع والسجود محل التناء، پس تاخیر سلام موجب سہو وہ ہو جو بغیر الدعاء والتناء ہو، سوال کے ایک جزو کا جواب تو ہو چکا، اب دوسرے جزو کا جواب معروض ہے، وہ یہ کہ بہشتی زیور میں جو نفل کے قعدہ اولیٰ میں تکرار تہجد سے وجوب سجدہ سہو لکھا ہے، اس کو خاکسار نے بہت تلاش کیا، مطبوعہ جدید میں جو حوالہ لکھا گیا ہے اس کو بھی دیکھا، اس جزو کے متعلق اس مقام پر کچھ نہیں ملا، غالباً فرض پر قیاس کر کے اس کو لکھ دیا گیا اور اس پر جو آپ نے محذور بیان فرمایا ہے، وہ تو متوجہ نہیں ہوتا، کیونکہ نفل میں قعدہ فرض ہے، جس پر نماز ختم کی جاوے، جیسا کہ در مختار میں ہے (او) صلیٰ اربعاً فاکثرو ولم یقعن بدینما) استحساناً لانه بقیامہ جعلها صلوٰۃ واحدة فتبقى واجبة والخاتمة هی الفریضة (شامی، ص ۲۸، ج ۱) لیکن یہ شبہ ہو کہ نفل کے قعدہ اولیٰ میں جب درود شریف کی اجازت ہے، تو تکرار تہجد کو فرض پر قیاس کر کے وجوب سجدہ کس طرح ہوگا، اس لئے جب تک کوئی صریح جزئیہ نہ مل جاوے تکرار تہجد سے نوافل کے قعدہ اولیٰ میں سجدہ سہو کو ذاتہ کہا جاوے گا واللہ اعلم، کتبہ احقر عبدالکریم عفی عنہ ۱۹ صفر ۱۳۵۸م

احقر ظفر احمد عرض کرتا ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق جو حوالہ جات میں نے لکھے ہیں اپنے مسودہ کو اس مقام پر میں نے دیکھا تو وہاں تصریح موجود ہے، کہ نفل کے قعدہ اولیٰ میں تکرار تہجد سے وجوب سجدہ سہو کا جزئیہ ہماری نظر سے نہیں گذرا، اور بظاہر یہ قواعد کے بھی خلاف ہے، کیونکہ نوافل میں ہر شفعہ مستقل نماز ہے، اور اس کا قعدہ اولیٰ بحکم قعدہ اخیرہ ہے، البتہ سنن مؤکدہ اور وتر کا حکم مثل فرائض کے ہے نہ معلوم کیا غلطی ہوئی کہ میری اس تحریر کے بعد بھی بہشتی زیور کے مسئلہ میں ترمیم نہ ہوئی نہ میری عبارت لکھی گئی، صرف حوالہ جات ہی لکھ دیئے گئے، انور میں اس غلطی کی اطلاع کر دی جاوے گی، اور آئندہ طبع میں انشاء اللہ اصلاح بھی ہو جاوے گی، تقیہ ۱۹ صفر ۱۳۵۸م از تھانہ بھون،

مسبوق نے نماز مغرب میں درمیان قعدہ | سوال (۱۲) مغرب کی ایک رکعت امام کے ساتھ ترک کر دیا تو اس پر سجدہ سہو ہے یا نہیں؟ | علی، دو رکعت پوری کرنے میں درمیان کا قعدہ رہ گیا، تو سجدہ سہو کہے یا نہیں، اگر قصداً قعدہ چھوڑ دے تو کچھ حرج ہے یا نہیں؟

الجواب، یہ قدرہ قول معتمد پر واجب ہی اس کو قصد ترک نہ کیا جاوے، البتہ اگر سہوارہ گیا تو سجدہ سہو واجب نہیں، فی الشامی (ص ۶۲۴ ج ۱) قال فی شرح المنیۃ ولو لم یقعہ جازا ستحسانا لا قیاسا ولم یلزمہ سجود السہو لکون المرکعة اولی من وجہ ۱۵۰، رمعنان مشکم

سوال (۱۳) اگر وتر کی جماعت میں امام بجائے تکبیر کے رکوع کو جگہ تو اس کو کیا کرنا چاہئے؟ میں چلا جائے یعنی دعاء قنوت سے قبل والی تکبیر اور دعاء قنوت دونوں بھول گیا، رکوع میں چلا گیا، تو امام کو ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے؟

الجواب، اس وقت رکوع کو پورا کرے، اور پھر سجدہ وغیرہ کر کے بعد سجدہ سہو کرے، رکوع سے کھڑا ہو کر قنوت نہ پڑھے، احقر عبد الکریم عفی عنہ
الجواب صحیح، ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۵، سوال مشکم

سوال (۱۴) نماز وتر میں ایک دفعہ اس طرح سہو ہوا کہ دو رکعت کے بعد قعدہ میں خیال ہوا کہ شاید تیسری رکعت کے قیام میں دعاء قنوت نہیں پڑھی تھی، اس لئے سجدہ سہو کر لیا، مگر پھر یاد آ گیا کہ ابھی تک ایک رکعت باقی ہے، پھر سلام پھیرنے سے پہلے تیسری رکعت پوری کر لی، اور دو سجدہ سہو کر کے سلام پھیرا، کیا اس طرح یہ نماز درست ہو گئی، کیا سجدہ سہو کے بعد پھر سہو ہو جاوے تو اس کے لئے دوسرا سجدہ سہو کر لینا درست ہے،

الجواب، ہاں نماز درست ہو گئی، اور اس حالت میں سجدہ سہو دوبارہ کرنا ضروری ہے، پہلا سجدہ جو کیا تھا وہ بے موقع تھا، فی الدر المختار روادا صلی رکعتین وسما فیہما فسجد لہ بعد السلام ثم اراد بناء شفیع علیہ لم یکن لہ ذلک البناء ای لہ تحریما لئلا یبطل سجودہ بلا ضررۃ (بخلاف المسافر) اذ انوی الاقامة لانه لو لم یبن بطلت (ولو فعل ما لیس لہ) من البناء (صح) بناء لبقاء التعریمة (و یعید) هو والمسافر سجود السہو علی المختار (بطلانہ) بوقوعہ فی خلال الصلوة (فی الشامی) (قوله بخلاف المسافر الخ) ای لو کان مسافرا فسجد للسهو ثم نوى الإقامة فله ذلک لانه لو لم یبن وقد لزم الاتمام بنية الاقامة بطلت صلاؤہ فی البناء ففعل لئلا یدفع الی فی عمل دفعا لا علی (بحرہ) قلت والصورة

المسئولة نظير صلوة المساکین لا تخفى وفي الشامية (يضار مئة) عن التارخانية ان السهوان وقع في اصل الصلوة
 اوجب فسادها وان في وصفها فلا فالاول كما اذا سلم على الركعتين على ظن
 انه في الفجر او الجمعة او السفر والثاني اذا سلم عليهما على ظن انها رابعة
 اه، والله اعلم احقر عبد الكريم عفى عنه **السؤال** (۱۵) اگر قعدة اولی یا ثانیہ میں
 قعدة اولی یا ثانیہ میں قبل تشهد یا اس کے بعد تہجد؟ **سوال** (۱۵) اگر قعدة اولی یا ثانیہ میں
 وغیرہ پڑھنے سے سجدہ سہول لازم آئے گا یا نہیں؟ **تہجد سے پہلے یا بعد میں فاتحہ قرآن کی ایک آیت**

یاد و آیت پڑھ جائے تو سجدہ سہول لازم ہے یا نہیں؟

الجواب؛ قعدة اولیٰ میں بہر حال لازم ہے، اور ثانیہ میں تشهد سے پہلے پڑھے
 تو واجب ہے ورنہ نہیں، قال الطحطاوی فی حاشیة مراقی الفلاس ولو قرأ
 آية فی الركوع او السجود او القومة فعليه السهو (وفي البحر عن المبداء ثم
 لا سجود عليه قال صاحب البحر ولكن ما فی الظهيرية ان عليه السهو اولی)
 ولو قرأ فی القعود ان قرأ قبل التشهد فعليه السهو لترك الواجب وهو
 الابتداء بالتشهد اول الجلوس وان قرأ بعد التشهد فان كان فی الاول
 فعليه السهو لتاخير الواجب وهو وصل القيام بالفراغ من التشهد وان
 كان فی الاخير فلا سهو عليه لعدم ترك واجب لانه موسم له فی الدعاء
 والثناء بعده فيه والقراءة تشتمل عليهما اه ص ۲۶، والله اعلم **السؤال**

فصل فی سجود التلاوة

نماز میں سجدہ تلاوت کے بجائے رکوع کا **سوال** (۱) سجدہ تلاوت کی بجائے نماز میں رکوع
 کافی ہو جاتا اور اس کی شرائط، کافی ہیں؟ اور سجدہ تلاوت کرنے کے بعد بلا کچھ آگے قرأت
 کئے ہوئے رکوع جائز ہے؟

الجواب؛ نماز میں سجدہ تلاوت کے بجائے رکوع کافی ہے بشرطیکہ رکوع میں
 سجدہ تلاوت کی نیت بھی کر لے، اور سجدہ نماز میں بدن نیت کے بھی کافی ہے، مگر رکوع و
 سجود صلوٰۃ اسی وقت سجدہ تلاوت کے بجائے کافی ہیں جبکہ آیت سجدہ کے بعد فوراً یا ایک
 دو آیت پڑھ کر رکوع کر لے، اگر سجدہ کی آیت کے بعد تین آیتیں پڑھ کر رکوع کیا تو سجدہ

تلاوت ادا نہ ہوگا، اور سجدۂ تلاوت کرنے کے بعد بدو نہ کچھ آگے قرأت کئے رکوع کر دینا مکروہ ہے، اور ظاہر کراہت تحریمیہ ہے، قال فی مراقی الفلاح ویجوز عنہا ای عن سجدۃ التلاوة رکوع الصلوٰۃ ان نواھا ای توئی اداءھا فیہ نص علیہ محمد بن رای علی اشتراط النیۃ ظ) ویجوز عنہا ایضا سجودھا ای سجود الصلوٰۃ وان لم ینوھا ای التلاویۃ اذا لم ینقطع فور التلاوة (مرتبط فی الركوع والسجود جمیعاً ظ) والنقطاع بان یقرأ اکثر من ایتین بعد ایتۃ سجدۃ التلاوة بالاجماع وقال شمس الاثمة الحلوانی لا ینقطع الفور ما لم یقرأ اکثر من ثلاث آیات قال الکمال ان قول شمس الاثمة هو الروایۃ (و قال ط والا ول اصح من جهة الدراية لانه احوط كما ذكره المؤلف ۱۲) ۵۱ وفیہ ایضا واذا كانت (ایۃ السجدۃ) آخر تلاوته ینبغی ان یقرأ اول سورۃ ایتین، من سورۃ اخری بعد قیامہ منہا حتی لا یصیر بانیا الركوع علی السجود ولورکع بمجرد قیامہ منہا کرہ ام قال ط اطلق فی الکراہۃ وظاہر التحريم ویجوز ام (ص ۲۸۲ مع الطحطاوی) ۲۳ شعبان ۱۳۸۴

تحقیق محل سجدہ | سوال (۲) سورۃ ص میں سجدہ آئب پر ہے یا ماب پر؟
سورۃ ص | الجواب؛ سورۃ ص میں سجدہ حسن ماب پر ہے، کذا فی مراقی الفلاح
وقال هو الاولیٰ ما قالہ الزیلعی یجب عند قوله تعالى وَخَرَّ رَاكِعًا وَاَنْاب، الخ (ص ۲۷۹ مع الطحطاوی)

نماز میں سجدۂ تلاوت کو | سوال (۳) اگر نماز میں آیت سجدہ پڑھ کر سجدہ نہ کرے، بلکہ مقام سے مؤخر کر نیک حکم | ایک دو آیت بعد کرے تو نماز میں نقصان آئے گا یا نہیں؟
الجواب؛ نماز میں سجدۂ تلاوت کو مقام تلاوت سے مؤخر کرنے میں اقوال مختلف ہیں، بعض نے مکروہ لکھا ہے، اور بعض نے بلا کراہت جائز کہا ہے، بشرطیکہ نماز ہی میں سجدہ ادا کر دے، اور شہرہ بالصواب احقر کے نزدیک یہ ہے کہ جتنی تاخیر سے فوریت منقطع نہ ہو (وہو قدر آیتین او ثلاث کما سیاتی) اتنی تاخیر کامضائقہ نہیں، اور جس تاخیر سے فوریت منقطع ہو جائے وہ مکروہ ہے، قال فی نور الایضاح وشرحہ وهو واجب علی التراخی ان لم تکن وجبت بتلاوته فی الصلاة لانها صار ت جزءاً من

الصلوة لا یقتضی خارجها فتجب فوریه فیہا وفي غیرہا تجب موسعاً ^{۲۸۲} (ص) قال الطحاوی حتی لو اطلال التلاوة تصیر قضاء ویاثم فیکره تحریمها تاخیر الصلوة عن وقت القراءة افادة فی الشرح وهذا ینافی ما ابداه فی حاشیة الدر من قوله ویجوز ان یقال تجب الصلوة موسعاً بالنسبة لمعلمها کما لو تلاها فی اول صلوته وسجدها فی اخرها ^{۲۸۳} (ص)،

وفي نور الايضاح الصنا مع الشرح ویجزی عنہا ای عن سجدة التلاوة رکوع الصلوة ان نواها وسجودها وان لم ینوها اذا لم ینقطع فور التلاوة وانقطاعه بان یقرأ اکثر من ایتین بعد آية السجدة بالاجماع وقال شمس الائمة العلواني لا ینقطع الفور ما لم یقرأ اکثر من ثلث آیات وقال الکمال قول شمس الائمة العلواني هو الروایة ^{۲۸۴} (ص) قال الطحاوی والحاصل ان الفور لا ینقطع بآية وایتین اتفاقاً وینقطع بربع اتفاقاً واختلف فی الثلاث فقل ینقطع واختاره خواهر زاده وقیل لا واختاره العلواني وهو اصح من جهة الروایة كما فی الحلبي والاول اصح من جهة الدراية لانه احوط ^{۲۸۵} (ص) قلت وانما کان التأخیر مکروها لوجوب السجدة فوریه فیہا فاذا لم ینقطع الفور بآية وایتین اتفاقاً وبثلث اختلافاً لم یوجد علّة انکراہة والله اعلم ثم رأیت الشامی صرح بما فهمتہ نقلاً عن الحلبي بما لفظه فان كانت صلوته فعلی الفور، ثم تفسیر الفور عدم طول المتکلمین التلاوة والسجدة بقراءة اکثر من ایتین او ثلث كما سیأتی حلّیة ^{۲۸۶} (ص) ۸۰۶ ج ۱ پس سجدہ تلاوت کو قیام سجدہ سے بقدر ایک دو آیت کے مؤخر کرنے سے نماز میں نقصان نہ آئے گا، اور بقدر تین آیت کے مؤخر کرنے کی بھی گنجائش ہے گو خلاف احتیاط ہے، اور بقدر چار آیت یا زائد کے مؤخر کر دیا، تو اگر عمداً کیا تو اس سے توبہ کرے اور نماز میں نقصان رہا اور نماز کا اعادہ اس لئے واجب نہیں، کہ اس واجب فوت شرہ کی تلافی نہیں ہو سکتی، اور اگر سہواً اتنی تاخیر ہوئی تو اخیر میں سجدہ سہو لازم ہے، صرح بوجوبہا الشامی فی (ص ۴۷۴ ج ۱، باب سجود السہو) نقلاً عن الخلاصة قال وصحہ فی الاولیٰ الحجۃ ایضاً، ۸/ رمضان ۱۲۴۴ھ،

سوال (۴) نماز تراویح میں اقرب للناس کے دو سجدے تلاوت پر سجدہ کرنے کا حکم
جواب سجدہ تلاوت پر جو امام شافعی رحمۃ اللہ کے نزدیک واجب ہے سجدہ کیا تو نماز میں کوئی نقص تو نہیں آیا،

الجواب؛ کچھ نقص نہیں آیا، اگر یہ سجدہ کرنے والا عالم ہو اور اس کو دلیل سے امام شافعی کے قول کی قوت معلوم ہو گئی ہو، اور اگر یہ بات نہ ہو تو پھر اس سجدہ سے اس شخص پر سجدہ سہول لازم آوے گا، کیونکہ اس کے امام کے نزدیک اس جگہ سجدہ نہیں تو اس نے نماز میں بلا ضرورت ایک سجدہ بڑھا دیا، جس سے تاخیر رکن لازم آئی، جو موجب سجدہ سہو ہے، ۱۸، ۱۹ ذیقعدہ ۱۲۵۵ھ

سوال (۵) نماز تراویح میں سورۃ الشقاق شروع کی حکم سجدہ تلاوت بغیر تلاوت
جواب اور فہم لایؤمنون پر ختم کر کے سجدہ کر لیا، پھر سجدے سے اٹھ کر سجدہ کی آیت چھوڑ کر بقیہ سورۃ ختم کر کے رکعت پوری کر لی، یعنی سجدہ تلاوت ہوا اور سجدہ کی آیت تلاوت نہیں ہوئی، ایسی حالت میں نماز صحیح رہی یا نہیں، یہ غلطی سہو ہوتی ہے؟

الجواب؛ اس صورت میں سجدہ سہو لازم تھا، سجدہ تلاوت جو بدون آیت سجدہ کے کیا گیا ہے، عمل زائد ہوا جس سے واجب میں تاخیر ہوئی، ۱۸، ۱۹ ذیقعدہ ۱۲۵۵ھ
سوال (۶) سجدہ تلاوت صلاتیہ کا مسئلہ
جواب ہدایہ میں تو ہے نہیں، مگر مجھے یہ یاد ہے کہ ختم آیت سجدہ پر اگر نیت کرے تو رکوع میں تداخل ہو جاتا ہے، اور بلا نیت کے سجدہ صلوٰۃ میں تداخل ہو جاتا ہے، لیکن اس کے لئے یہ شرط ہے کہ آیت

سجدہ کے متصل ہی رکوع کر لے، اگر آیت سجدہ کے بعد کچھ اور پڑھ گیا، تو تداخل درست نہ ہوگا، بلکہ سجدہ تلاوت علیحدہ ادا کرنا ہوگا، اس میں یہ دریافت طلب ہے کہ صلوٰۃ عیدین میں اگر رکعت ثانیہ میں آیت سجدہ پر قرأت ختم کر لے تو سجدہ کا تداخل (بنیت) رکوع میں اور (بلا نیت) سجدہ صلوٰۃ میں ہو جائے گا یا نہیں؟ وجہ شبہ یہ ہے کہ آیت سجدہ اور رکوع میں تکبیرات زوائد نے فاصلہ کر دیا ہے،

الجواب؛ قال فی مواقى الفلاح ویجزئ عنہا رکوع الصلوٰۃ ان نواھا وینبغى ذلك للامام حال كثرة القوم ویجزئ عنہا سجودھا ایضا وان لمینوھا اذا لم یقطع فور التلاوة وانقطاعه بان یقرأ أكثر من ایتین وقال الحلوانی ما لم یقرأ أكثر من ثلاث آیات قال الکمال وهو الروایۃ ۱۵ (ص ۲۸۲ ملخصا) اس سے معلوم ہوا کہ بقدر آیتین یا ثلاث آیات کے ... فصل سے فور منقطع نہیں ہوتا، اور تکبیرات ثلاث عید آیتین کے برابر اور تین آیات سے کم ہیں، اس لئے صلوٰۃ عید کی رکعت ثانیہ میں بھی آیت سجدہ پر قرأت ختم کر کے رکوع یا سجدہ میں سجدہ تلاوت ادا ہو جائیگا، ۲۲ شعبان ۱۴۱۸م احکام سجدہ تلاوت برتالی و سامع | سوال (۱) ایک طالب علم بغرض حفظ آیت سجدہ کو ایک ہی جلسہ میں بار بار تلاوت کرتا ہے، اس کا استاد جو اسی مجلس میں بیٹھا سنتا ہے اس پر ایک ہی سجدہ ہوگا یا متعدد؟

(۲) قرأت سکھانے میں ایک مرتبہ قاری آیت سجدہ پڑھتا ہے اور دوبارہ متعلم بغرض مشق اس کا اعادہ کرتا ہے، جلسہ ایک ہی رہتا ہے تو ایک سجدہ کرنا ہوگا یا دو؟ (۳) تالی بغرض حفظ ایک ہی مجلس میں بار بار ایک ہی آیت سجدہ پڑھتا ہے، اور سامع اسے دور سے دوسری مجلس میں سن رہا ہے تو اس سامع پر کتنے سجدہ واجب ہونگے؟ (۴) تالی تو ایک ہی مجلس میں اعادہ و تکرار آیت سجدہ کر رہا ہے، مگر سامع کی مجلس بدلتی رہی تو اسے کتنے سجدے کرنے ہوں گے؟

(۵) دو یا چند طالب علم ہم سبق ایک ہی آیت سجدہ کو پڑھتے ہیں تو سامع کو ایک سجدہ کرنا ہوگا یا دو، مجلس ایک ہی رہی؟

الجواب (۱) ان صورتوں میں طالب علم اور استاد دونوں پر ایک ہی سجدہ واجب ہے،

(۲) سامع کی مجلس اگرچہ مجلس تالی سے متحدہ ہو مگر جب کہ سامع کا سماع متحد ہی بوجہ اتحاد آیت و اتحاد مکان سماع کے تو اس پر ایک ہی سجدہ واجب ہوگا،

(۳) اس صورت میں قول مفتی بہ پر سامع کے ذمہ سجدات متعدد ہوں گے،

(۴) اس صورت میں سامع پر ایک ہی سجدہ ہوگا،

الدلائل؛ قال فی الدرر لو کثرہا فی مجلسین تکررت فی مجلس واحد لکن لکن واحدۃ

والاصل ان بناها على التناخل دفعا للخرج بشرط اتحاد المكان والآية اه
 قال الشامي اي بان يكون المكراية واحدة في مجلس واحد فلو تلايئين
 في مجلس واحد او اية واحدة في مجلسين فلا تد اخل، ولم يشترط اتحاد
 السماع لانه انما يكون باتحاد المسموع فيغني عنه اشتراط اتحاد الآية
 وأشار الى انه متى اتحدت الآية والمجلس لا يتكرر الوجوب وان اجتمع
 التلاوة والسماع ولو من جماعة ففي البدائع لا يتكرر ولو اجتمع سببا
 للوجوب وهما التلاوة والسماع بان تلاها ثم سمعها او بالعكس او تكرر
 احدهما وفي البرازية سمعها من آخر ومن آخر ايضا وقرأها ايضا
 كفت سجدة واحدة في الاصح لاتحاد الآية والمكان اه وفيه ايضا
 قبله لو تلا سجدات انقر ان كلها او سمعها في مجلس او يجاش وجبت
 كلها اه (ص ۸۱ و ۸۱۲ ج ۱) اي لاختلاف التلاوة والسماع باختلاف
 المتلو والمسموع، قال في الدرر كما تتكرر لو تبدل مجلس سماع دون قال
 كما لو كررها ركبا يصلي وغلظه يمشي تتكرر على الغلام لا الركاب ولا
 تتكرر اي على السامع ۱۲ شامى في عكسه وهو تبدل مجلس التالى دون السامع
 على المفتى به اه (ص ۸۱۲)

تشبيه، يختلف المكان حقيقة بالانتقال منه الى آخر باكثر
 من خطوتين كما في كثير من الكتب او باكثر من ثلاث كما في المحيط ما
 لم يكن للمكانين حكم الواحد كالمسجد والبيت والسفينة ولوجارية
 والصحراء بالنسبة للتالى في الصلوة راكبا فان الصلاة تجمع المتفرق
 فكان الصحراء كله مكانا واحدا للمصلي راكبا، وحكما وذلك بمباشرة عمل
 يعد في العرف قطعاً لما قبله والمسجد ولو بغير مكان واحد وكن البيت
 الا اذا كانت الدار كبيرة كدار السلطان اه حلية وظاهرة ان الدار
 التي دونها لها حكم البيت وان اشتملت على بيوت ثم قال في الحلية
 ثم الاصل على ما في الغانية والخلاصة ان كل موضع يصح الاقتداء
 فيه بمن يصلي في طرف منه يجعل كمكان واحد ولا يتكرر الوجوب

فید وما لا فلا ام شامی (ص ۸۱۳ ج ۱) قلت فلینظر السائل فی الجواب الرابع هل
اختلف مجلسه بمثل هذا الاختلاف الذي لا یصح فيه الاقتداء بمن یسني فی طر
منه ام لا والله اعلم، ۲۶ محرم ۱۳۸۵ھ

سوال (۸) رسالہ النور بابت ماہ جمادی الاول صفحہ ۴۴ ومن آیاتہ للسلو
سے وجوب سجد کا ترجمہ پڑھنے پر سرخی دے کر حاشیہ میں لکھا ہے، یہ سجدہ کی آیت ہے، اس کو پڑھ کر
ناظرین پر سجدہ واجب ہو جائے گا، بشرطیکہ آیت یا ترجمہ کو زبان سے پڑھیں، اور صرف
دیکھ لینے سے سجدہ واجب نہ ہوگا ۱۲ مدیر (سوال) آیت سجدہ کا ترجمہ زبان سے پڑھنے سے
سجدہ واجب ہو گیا یا نہیں، محقق قول کو نسا ہے؟

الجواب: جو التور میں لکھا ہے کہ آیت ترجمہ کو زبان سے پڑھیں تو سجدہ تلاوت
واجب ہے، یہ صحیح ہے کما فی العالمگیریہ (ص ۸۵ ج ۱) واذا قرأ آية السجدة بالفارسية
فعليه وعلى من سمعها السجدة فهم السامع اولاً اذا اخبر السامع انه قرأ آية السجدة
وعندها ان كان السامع يعلم انه يقرأ القرآن يلزمه ولا فلا كن في الخلاصة
وقيل تجب بالاجماع وهو الصحيح، كذا في محيط السرخسي، كتبه الاحقر عبد الكريم عفی
۸ صفر ۱۳۸۵ھ، الجواب صحیح ظفر احمد عفاعنہ ۹ صفر ۱۳۸۵ھ

سوال (۹) فرضوں میں سورۃ اقرآن سورۃ انشقاق یعنی سجد
تو سجدہ تلاوت ضروری ہے یا نہیں؟ والی سورۃ ارادہ پڑھنی کیسی ہو اور انکے پڑھنے سے نماز ہو جاتی ہو یا نہیں،

الجواب: سورۃ انشقاق میں آیت سجدہ پڑھنے کے بعد سجدہ کیا جاوے اور بعد
سجدہ کے سورۃ پوری کر کے رکوع کریں، البتہ اگر آیت سجدہ پر قرآن ختم کر دی جاوے تو تلاوت
کا سجدہ مستقلاً کرنا ضروری نہیں، بلکہ نماز کا سجدہ ہی اس کی طرف سے کافی ہو جاوے گا، مگر
ایسا کرنا بہتر نہیں ہے، کیونکہ سورۃ کو درمیان میں چھوڑ دینا خلاف اولیٰ ہے، ہاں اگر سورۃ
علن وغیرہ (جن کے بالکل اخیر میں آیت سجدہ ہے یا آیت سجدہ کے بعد ایک یا دو ہی آیت ہو)
پڑھ کر اگر سجدہ تلاوت نہ کیا جاوے تو کچھ مضائقہ نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں نماز کا
سجدہ کرنے سے سجدہ تلاوت خود بخود ادا ہو جاوے گا،

تنبیہ: اس صورت اخیرہ میں اگر رکوع میں سجدہ تلاوت کی نیت کر لے کہ اس سجدہ تلاوت
کی طرف بھی یہ رکوع کرتا ہوں، تب بھی سجدہ تلاوت ادا ہو جاتا ہے، لیکن امام کو ایسا نہ کرنا

کیونکہ اگر اس نے رکوع میں نیت کر لی اور مقتدیوں کو پتہ نہ لگا، اس واسطے انھوں نے نیت نہ کی تو ان کے ذمہ سجدہ تلاوت باقی رہ جاوے گا، واللہ اعلم احقر عبدالکریم، ۱۲ ربیع ۱۳۸۸ھ
الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ

فصل فی صلوٰۃ المریض والمسافر

دوجہ کے وطن میں قصر کرے یا نہیں؟ سوال (۱)..... زید مع اہل دعیال
سسرال میں آیا جو مقدار مسافت قصر پر ہے، زید اور اس کی بیوی قصر کرے یا نہیں؟
دیگر زید نے وطن اصلی چھوڑ کر دوسرا وطن اصلی بنالیا ہے، جہاں پر اس کی زمینات ہیں
اور اس کی نگرانی دوسرے قرابت داروں کے ماتحت کیا ہے، کیا قدیم وطن اصلی کو جہاں زمینا
اور دیگر قرابت دار ہیں جیسے ہمیشہ وراخ و بہنوئی آوے تو قصر پڑھے یا نہیں؟
الجواب؛ جس شہر میں انسان اپنا نکاح کرے وہ بھی مثل وطن کے ہو جائے، لہذا
شوہر کو سسرال میں قصر نہ کرنا چاہئے، نماز پوری پڑھے، اسی طرح عورت بھی، قال فی
الدر الوطن الاصلی هو موطن ولادته او تاهله او توطنه ام ص ۸۲۹ ج ۱ قلت و هذا
لا یعم مطلقاً بل فیہ تفصیل کماسیاتی،

۱۲ دوسری صورت میں دونوں وطن اصلی ہیں، قدیم وطن میں جب جاوے نماز
پوری پڑھے، قال فی العالمگیویۃ ولو انتقل باھلہ و متاعہ الی بلد و بقی لہ دور و عتقاً
فی الاول قبل بقی الاول و طناله والیہ اشار محمد فی الکتاب کذا فی الزاھدی
ص ۹۱ ج ۱، واللہ اعلم، ۲۲ ربیع الاول ۱۳۸۸ھ

۵۹۲
دوطن اصلی کے متعدد ہونے اور وطن زوج کا سوال (۲) کبیری شرح میں ہے، لو تزوج
دوطن اصلی ہونے کی تحقیق،،، المسافر ببلد ولم یبق الاقامة به قبل لا یصیر مقيماً

وقیل یصیر مقيماً و هو الوجه لما مر من حدیث عثمان بن عفان روى الامام احمد وابو یوسف
بن ابی شیبۃ وابو عمر بن عبد البر والطحاوی ان عثمان بن عفان صلی علیہ وسلم کان
فانکر الناس علیہ فقال ایما الناس انی تاهلت بمکة منذ قدمت وانی سمعت
رسول الله صلی الله علیہ وسلم یقول من تاهل فی بلد فلیصل صلوٰۃ المقیم، ولو
کان له اهل ببلدین فایتھما دخلها صار مقيماً وان ماتت زوجته فی احدیھما

و بقی له فیہا دور و عقار قیل لا تبقی و طناله اذالمعتبر الالہل دون الدار کمالو
 تاهل ببلدۃ و استقرت سکنی له و لیس له فیہا دور و قیل تبقی ام،
 حافظ عبداللطیف صاحب نے فرمایا ہے کہ اگر زوجہ مستقل قیام (جیسا کہ نکاح سے پیشتر
 تھا) اپنے والدین کے وطن میں رکھے، جب تو خاوند کے لئے سسرالی وطن بن جاوے گا اور اگر
 (ہماری دیار کی طرح) مستقل قیام خاوند کے وطن میں کر لیوے، اور والدین کے ہاں محض
 ملاقات کو آیا کرے تو خاوند سسرال میں مسافر رہے گا، بلکہ عورت بھی اس حالت میں قصر
 کرے گی، مگر ہومصرح فی بہشتی زیور) احقر کی فہم ناقص میں یہ آتا ہے کہ عورت کا جس جگہ
 مستقل قیام ہو وہ خاوند کا وطن اصلی قرار دیا جاوے گا، اور اذالمعتبر الالہل دون الدار الخ
 سے یہی مفہوم ہوتا ہے، اور اس توجیہ پر خاوند کا تاج للزوجہ ہونے کا اشکال بھی نہیں ہوتا،
 البتہ یہ سوال ہوگا کہ وطن قدیم وطن رہے گا یا نہیں، اگر نہیں جب تو کچھ اشکال نہیں، اور
 اگر وہ بھی وطن رہے گا تو دور وطن ہو جائیں گے، حالانکہ الوطن الاصلی بطل بمثلہ کے موافق وطن
 اصلی متعدد نہیں ہو سکتے، اور متعدد دلیلیہ ہونے کی صورت میں بھی یہی اشکال ہے مسئلہ کی
 تحقیق فرما کر حدیث کا محل بھی بیان فرما دیجئے، یعنی اگر قصر در سسرال علی الاطلاق نہیں تو
 حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا استدلال کس طرح صحیح ہوگا؟ عبدالکریم گمٹھلوی

الجواب؛ قال فی البحر و الوطن الاصلی هو وطن الانسان فی بلد متہ
 او بلدة اخرى اتخذها داراً ووطن بہما مع اہلہ وولده و لیس من قصد الارتحال
 عنہا بل التعلش بہا و هذا الوطن یبطل بمثلہ لا غیر و هو ان یتوطن فی بلدة اخرى
 وینقل الالہل الیہا فیخرج الاول من ان یکون و طنہا اصلیا حتی لو دخلہ مسافرا
 لا یتیم قیدنا بكونہ انتقل عن الاول باہلہ لانہ لو لم ینتقل بہم و لکنہ
 استحدث اہلا فی بلدة اخرى فان الاول لم یبطل و یتیم فیہما، و فی المحيط
 ولو کان لہ اہل بالکوفۃ و اہل بالبصرۃ فمات اہلہ بالبصرۃ و بقی لہ دور و
 عقار بالبصرۃ قیل البصرۃ لا تبقی و طناله لانہا انما کانت و طنہا بالالہل لا بالعقار
 الا ترى انہ لو تاهل ببلدۃ لم یکن لہ فیہا عقار صارت و طناله و قیل تبقی و طنہا
 لہ لانہا کانت و طناله بالالہل و الدار جمیعاً فبزوال احدہما لا یرتفع الوطن
 کوطن الاقامۃ یبقی ببقاء الثقل وان اقام بموضع اخر ام رص ۱۶۳ ج ۱ ص ۱۲

وفي المجتبى نقل القولين فيما اذا نقل اهل ومتاعه ونقلى له دور وعقار ثم قال
وهذا جواب واقعة ابتلينا بهما وكثير من المسلمين المتوطنين في البلاد ولهم دور
وعقار في القرى البعيدة منها يصيفون بها باهلهم ومتاعهم فلا بد من حفظها
انهما وطنان له لا يبطل احدهما بالآخر اه بحر، ص ۱۳۶ ج ۲ وفي البدائع ثم
الوطن الاصلى يجوز ان يكون واحد او اكثر من ذلك بان كان له اهل ودار في
بلدين او اكثر ولم يكن من نية اهل الخروج منها وان كان هو ينتقل من
اهل الى اهل في السنة حتى انه لو خرج مسافرا من بلدة فيها اهل ودخل في
اى بلدة من البلاد التي فيها اهل فيصير مقيما من غير نية الاقامة اه، ص ۱۰۴ ج ۱
وفي سراقى الفلاح واذا لم ينقل اهل بل استحدث اهلا ايضا ببلدة اخرى
فلا يبطل وطنه الاول وكل منهما وطن اصيل له اه قال الطحاوى وكذا لو
استحدث اهلا في ثلاث مواضع فالحكم واحد فيما يظهر اه، ص ۲۴۹ ج ۲ وفي
فتح القدير وطن اصيل وهو مولد الانسان او موضع تاهل به ومن قصده
التعيش به لا الارتمال ولو تزوج المسافر في بلد لم ينو الاقامة فيه قيل
يصير مقيما وقيل لا اه، ص ۱۶ ج ۲ وفي الكفاية ولو كان له اهل ببلدة واستحدث
في بلدة اخرى اهلا اخر كان كل واحد منهما وطن اصيل له روى انه كان لعثمان
اهل ببلدة واهل بالمدينة وكان يتمر النسلۃ بهما جميعا اه، ص ۱ ج ۲
وفي الخلاصة المسافر اذا جاوز عمران مصره فلما سار بعض الطريق
تذكر شيئا في وطنه فعزم الرجوع الى الوطن لذلك ان كان ذلك وطن اصيل
بان كان مولدا فيه او لم يكن مولدا لكن تاهل فيه وجعله دارا يصير مقيما
ببجرد العزم الى الوطن اه، ص ۱۹۸ ج ۱ وفيه ايضا ص ۱۹۹ ج ۱ ما نصه وانما يصير
المسافر مقيما اما بدخوله مصر الى فيه اهل او بان بداله لغيره الى فيه الخ وفي
الفتاوى السلجوية اذا دخل المسافر بلدة له فيها اهل صار مقيما نوى الاقامة
اولا اه، ص ۶۲ ج ۱

ان نصوص فقہیہ ہے چند امور مستنبط ہوئے :- (۱) وطن اصل وہ ہے جس میں تعیش
مع الابل ہو، اور وہاں سے ارتحال و نقل اہل کا قصد نہ ہو (۲) جب کسی دوسرے مقام میں

توطن کا ارادہ ہو تو بدوین نقل اہل کے پہلا وطن باطل نہ ہوگا، (۳) وطن اصلی متعدد ہو سکتے ہیں حتیٰ کہ اگر کوئی شخص چار نکاح چار شہروں میں کرے اور ہر بیوی کو اسی کے شہر میں رکھے تو اس شخص کے چار وطن اصلی ہو جائیں گے، (۴) جس شہر میں کسی شخص کے اہل و عیال کا مستقل قیام ہو خواہ کرایہ کے مکان میں یا ذاتی مکان میں وہاں جب مسافر ہو کر پہنچے گا تو قصر باقی نہ رہے گا، بلکہ اتمام ضروری ہوگا جیسا کہ بعض ملازمان سرکاری اپنے اہل و عیال کو جائے ملازمت میں مستقل طور پر رکھتے ہیں، پھر وہاں سے مختلف مقامات کا دورہ کرتے ہیں، یہ لوگ جب اپنے اہل و عیال کی قیام گاہ پر پہنچیں گے مقیم ہو جائیں گے، بدل علیہ جزئیۃ السراجیۃ والجبتی، (۵) کسی شہر میں محض نکاح کر لینے سے وہ وطن اصلی نہیں ہو جاتا، بلکہ اہل کا وہاں رکھنا، اور وہاں سے منتقل نہ کرنا شرط ہے، چنانچہ عبارت بحر میں دوطن بہامع اہلہ ولیس من قصد الارتحال عنہا بل العیش بہا، اور عبارت فتح میں او موضع تابل بہ ومن قصده العیش بہ لا الارتحال، اور عبارت خلاصہ میں اولم یکن مولد و لکن تابل فیہ وجعلہ دارا، تابل کے ساتھ قصد عیش وجعل دار کی قید صاف مذکور ہے، اور حضرت عثمانؓ کے قصہ میں بھی اُن کے اتمام کا سبب محض تزوج نہ تھا، بلکہ تزوج کے بعد اہل کا مکہ میں رکھنا اس کا سبب تھا، چنانچہ کفایہ کی عبارت میں اس کی تصریح ہے روی انہ کان لعثمان اہل بالمدرینۃ و اہل بکۃ و کان تم بہما جمیعاً ام، اور حدیث من تابل ببلدۃ فلیصل فیہا صلوٰۃ المقیم کا بھی یہی محل ہے، یعنی من تابل ببلدۃ وانسکن اہلہ فیہا ولم ینقلہا عنہا، کیونکہ اگر مطلق تزوج ببلدۃ موجب قصر ہو جاوے خواہ زوجہ کو وہاں رکھے یا نہ رکھے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں قصر نہ کرنا چاہئے تھا، کیونکہ آپؐ نے حضرت سودہ بنت زمعہؓ سے مکہ میں نکاح کیا تھا، اور حضرت سودہ کے باپ کا گھر وہاں موجود تھا، اُن کے بھائی وغیرہ بھی وہاں موجود تھے، نیز حضرت میمونہؓ نے آپؐ سے مکہ ہی میں نکاح کیا تھا، اور ان کا خاندان مکہ میں تھا، مگر صحیحین سے ثابت ہے کہ آپؐ نے مکہ میں قصر کیا ہے، اور بعد نماز کے فرماتے تھے یا اھل مکۃ اتموا صلوٰۃکم فانما قوم سفر، وفي الفتح ص ۴۰ ج ۲ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یسا فریز وجاتہ قصر، اور یہ بھی صحاح میں ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع میں تمام ازواج کو ساتھ لائے تھے جن میں بعض کا پہلا وطن مکہ میں تھا، لیکن بالہنمہ حضورؐ نے قصر کیا ہے، پس صورت مسئلہ کا حکم یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی شہر میں نکاح کر کے زوجہ کو وہاں

نہ رکھے بلکہ اپنے شہر میں لے آئے تو زوجہ کا وطن شوہر کا وطن اصلی نہ ہوگا، شوہر جب وہاں مسافر ہو کر گزریے تو قصر کرے گا، اور اگر زوجہ کو اسی کے وطن میں رکھے تو اس کا وطن زوج کا وطن ہو جائے گا، خواہ زوج کا مستقل قیام اپنے وطن میں رہتا ہو یا دونوں جگہ رہتا ہو، اس پر غالباً سائل کو کبیری کے اس جزئیہ سے اشکال پیش آئے گا، تو تزوج المسافر ببلد ولم ينو الإقامة فقل لا يصير مقیمًا وقل يصير مقیمًا وهو الاوجه لما مر من حدیث عثمان ام یہی جزئیہ فتح القدیر میں بھی ہے کما مر، مگر موجب اشکال کچھ نہیں، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسافر نے ایک شہر میں نکاح کیا، اور اس کا ارادہ بنفسہ وہاں قیام کرنے کا نہیں (لیکن زوجہ کو وہیں رکھنے کا ارادہ ہے) تو اوجہ یہ ہے کہ وہ مقیم ہو جائے گا، جیسا کہ حدیث عثمان سے معلوم ہوتا ہے، کہ حضرت عثمانؓ باوجودیکہ مکہ میں مقیم نہ تھے، اور نہ اُن کو مکہ میں اقامت جائز تھی، قال فی الفتح ان الإقامة بمكة علی المهاجرین حرام کما سیأتی، اور ص ۲۰، ج ۲، لیکن پھر بھی انھوں نے قصر نہ کیا، کیونکہ ان کی ایک اصل مستقل طور پر مکہ میں مقیم تھی، اس سے معلوم ہوا کہ شوہر کا مستقل قیام گواہ اپنے وطن میں ہو، لیکن جب اس کی بیوی کا مستقل قیام دوسری جگہ ہوگا تو شوہر وہاں جا کر مقیم ہو جائے گا، کما مر عن السراجیة اذا دخل المسافر بلدة له فيها اهل (اسی مقیمہ) صار مقیمًا نوى الإقامة اولًا، اور جن قائلین نے اس صورت میں شوہر کو مقیم نہیں مانا، جیسا کہ کبیری میں دوسرا قول مذکور ہے، انھوں نے اس پر نظر کی ہے، کہ جب شوہر کا قیام زوجہ کے بلد میں نہیں رہتا اور نہ وہ اقامت کا وہاں قصد کرتا ہے تو پھر اس کو مقیم نہ کہنا چاہئے مسافر ہی ماننا چاہئے، اور حدیث عثمانؓ کو نیت اقامت پر حمل کرتے ہیں، مگر اس کا جواب یہ ہے کہ مرد کا زوجہ کو مستقل کسی مقام پر رکھنا یہ عملاً اقامت ہے، لہذا لا یخلو عن نوع تعیش بہ و تاهل، لہذا اس صورت میں نیت عدم اقامت کا اعتبار نہ ہوگا، لایستأ وقد تأید بحديث عثمان وانه اتم بمكة مستدلاً به مع انه لم یقیم بها البتہ فافهم، فائدة، حدیث عثمانؓ جس سے کبیری میں احتجاج کیا ہے محدثین کے نزدیک ضعیف ہے، قال الحافظ فی الفتح والاول وان كان نقل واخرجه احمد والبيهقي من حدیث عثمان انه لما صلى بمكة اربع ركعات انكر الناس عليه فقال انى تاهلت بمكة لما قدمت واني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول من تاهل ببلدة فانه يصلي صلوة مقيم فلهذا الحديث لا يصح لانه منقطع

وفی روایۃ من لا یحتج بہ ام ص ۴۰ ج ۲ وفی عمدۃ القاری قلت هذا منقطع اخر
البیہقی من حدیث عکرمۃ بن ابراہیم وهو ضعیف عن ابن ابی ذباب عن ابيه ام
ص ۵۳۳ ج ۳ قلت لم یسبہ احد الی الکذب قال النسائی ضعیف وقال العقیلی
فی حدیثہ اضطراب وقال النسائی فی التمییز لیس بثقة وقال یعقوب بن سفیان
منکر الحدیث وقال البزار لیس الحدیث وقال ابو حامد الحاكم لیس بالقوی ام
لسان المیزان ص ۱۸۱ و ۱۸۲ ج ۳ ویظهر من التقریب وشرحہ التدريب ان قولہ
لیس الحدیث من ادنی مراتب الجرح وهو قریب من التعدیل وقولہم لیس
بالقوی یشیء ایضاً ولا یطرح بل یعتبر بہ ص ۱۲۶ و ۱۲۷ فعکرمۃ هذا لیس
من یتروک حدیثہ وقال السیوطی فی خطبۃ کنز العمال وکل ما کان فی مسند احمد
فہو مقبول فان الضعیف الذی فیہ یقرب من الحسن ام والحدیث رواہ احمد
فی مسندہ ص ۶۲ ج ۱ دعلۃ الانقطاع لا تصر عندنا والله اعلم ص ۲۷ ج ۲

معذوریۃ استقبال قبلہ | سوال (۳)
کی شرط کا ساقط ہو جانا جو شخص ایسا مجبور ہو کہ رو بہ قبلہ ہو کر نماز ادا نہیں کر سکتا، نہ اس طریق
سے نماز پڑھ سکا جو طریق صاحب فراش کے لئے فقہاء نے تحریر فرمایا ہے ایسی مجبوری میں
جس طریق سے اور جس پہلو سے نماز ادا ہو سکے پڑھ لی، اکثر نمازیں مجبوراً مشرق کو منہ کر کے چاہی
پر پڑے پڑے ادا کی گئی ہیں، ایسا یہ نمازیں صحیح اور درست ہیں یا قابل اعادہ ہیں، اور جو شخص
مجبوری قبلہ کو منہ کر کے نماز نہ پڑھ سکے، اس کو غیر قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا چاہئے،
یا وقت مجبوری تک نماز موقوف رکھنا چاہئے یا اس کو مجبوری کی حالت میں جس طرح بن پڑے
ادا کرے، پھر بعد مجبوری ان نمازوں کو ادا کریں، مسئلہ شرعی بیان فرما کر اجر اللہ سبحانہ
سے حاصل فرماویں،

الجواب؛ قال فی مراقی الفلاح وقد مناجاز التوجہ لما قدر علیہ بلا
وسقوط التوجہ الی القبلة بعد المرض ونحوہ ام ص ۲۵۱ وفی العالمگیریۃ فان
کان یعرف القبلة ولكن لا یستطیع ان یتوجہ الی القبلة ولم یجد احد یحولہ
الی القبلة فی ظاہر الروایۃ انه یصلی کذلک ولا یعید فان وجد احد یحولہ
الی القبلة یتنبی ان یا مرہ حتی یحولہ فان لم یأمرہ وصلى علی غیر القبلة لا یجوز

۱۴ ص ۸۸ ج ۱، اس سے معلوم ہوا کہ جب مریض استقبال قبلہ پر قادر نہ ہوا اور نہ کوئی قبلہ کی طرف متوجہ کرنے والا موجود ہو تو اس کو غیر قبلہ ہی کی طرف نماز پڑھنی چاہئے اور نماز کو مؤخر نہ کرے، اور ان نمازوں کا اعادہ بھی نہیں، لیکن اگر قبلہ کی طرف متوجہ کرنے والا موجود تھا اور اس سے بدون کہے غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھ لی، تو نماز صحیح نہ ہوگی، اور اگر کہا لیکن اس نے کہنے پر عمل نہ کیا تو نماز درست ہوگئی، واللہ اعلم، ۲۲ رجب المرجب ۱۴۳۵ھ

اس سفر کا حکم جس کے درمیان سوال (۴) ایک شخص تھانہ بھون میں مقیم ہے اور سہارنپور میں وطن اقامت واقع ہو، کسی غرض سے آیا، اور سہارنپور سے دہلی جانے کا قصد کر کے

تھانہ بھون سے گذرا، اور اسباب وغیرہ اس کا تھانہ بھون ہی میں موجود ہے، پس ایسی حالت میں وہ تھانہ بھون میں قصر کرے گا یا اتمام اور اسباب عام ہے، یا ضروریہ کی تخصیص؟
الجواب؛ صورت مذکورہ میں یہ شخص جب سہارنپور سے نیت سفر دہلی چل کر تھانہ بھون میں داخل ہوگا تو تھانہ بھون میں اتمام کرے گا، کیونکہ اس صورت میں انشاء سفر من وطن الاقامت نہیں ہوا، بلکہ انشاء سفر من موضع غیرہ ہوا ہے، اور جب انشاء سفر موضع اقامت سے نہ ہو، بلکہ دوسرے موضع سے ہو تو وطن اقامت کے باطل ہونے کی شرط یہ ہے، کہ انشاء سفر میں اس پر مرور نہ ہو، یا اگر مرور ہو تو بعد مسافت ثلثہ ایام قطع کر چکنے کے بعد مرور، اگر مسافت ثلثہ ایام قطع کرنے سے پہلے وطن اقامت پر گذر ہوا (یعنی اس میں داخل ہوا) تو اتمام کرے گا بلکہ اس صورت میں وہ سہارنپور سے چل کر مسافر ہی نہیں ہوا جبکہ اس کا ارادہ درمیان میں وطن اقامت میں داخل ہونے کا ہے، قال العلامة الشامی والحاصل ان انشاء السفر يبطل وطن الإقامة اذا كان منه اما لو انشاء من غير فان لم يكن فيه مرور على وطن الإقامة او كان ولكن بعد سير ثلثة ايام فكن ذلك ولو قبله لم يبطل الوطن بل يبطل السفر لان قيام الوطن مانع من صحته والله اعلم اه وفيه ايضا قال في الفتح ان السفر الناقض لوطن الإقامة ما ليس فيه مرور على وطن الإقامة او ما يكون فيه المرور بعد سير منة السفر اه، ص ۸۳۰ ج ۱،

اب یہ صورت باقی رہی کہ اگر کوئی شخص مسافت ثلثہ ایام قطع کرنے کے بعد وطن اقامت پر گذرا، مگر وہاں قیام کا ارادہ نہیں، بلکہ آگے جانے کا ارادہ ہے، اور وطن اقامت میں اس کا اسباب وغیرہ موجود ہے، اس صورت میں یہ شخص وطن اقامت میں قصر کرے یا اتمام؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جب مسافت سفر قطع کرنے کے بعد وہ وطن اقامت میں داخل ہوا، اور اس کے بعد بھی مسافت سفر کا ارادہ ہے تو اب یہ اس کا وطن اقامت باقی نہیں رہا، سفر سے اس کی وطنیت باطل ہوگئی، اور اسباب کا باقی رہنا بطلان وطنیت با سفر کو مانع نہیں، ہاں اگر وطن اقامت سے منتقل ہو کر دوسری جگہ وطن اقامت بنانا چاہے اور ان دونوں کے درمیان سفر نہ ہو تو پہلا وطن محض انتقال سے باطل نہ ہوگا، بلکہ انتقال بنفسہ و انتقال بالمتاع کے مجموعہ سے باطل ہوگا، حتیٰ کہ اگر دوسرے موضع میں نیت اقامت کرے اور موضع اول میں اس کا اسباب باقی ہے اور متاع سے مراد متاع ضروری ہے، الذی یعد الرجل ببقائه مقيماً عرفاً کائناتاً البیت الذی لا بد منه والدار والعقار، پس بقار متاع انشاء سفر کی صورت میں مانع بطلان وطنیت نہیں بلکہ نیت اقامت بموضع آخر کی صورت میں بقار متاع بطلان وطنیت موضع اول کے لئے مانع ہے قال فی البحر کوطن الإقامة یعنی بقاء الثقل وان اقام بموضع اخرام ص ۱۳۶ ج ۲ فی العالمگیریہ ووطن الإقامة ووطن الإقامة یبطل بوطن الإقامة ویانشاء السفر وبالوطن الاصلی هكذا فی التبيين وفي الكفاية ومن حکم وطن السفر انه ینتقص بالوطن الاصلی لانه فوقه وینتقص بوطن الإقامة لانه مثله وینتقص بانشاء السفر لانه ضده ام ص ۱۴۰ ج ۲) البتہ اگر وطن اقامت میں اس شخص کے اہل و عیال کا مستقل قیام ہو تو وہاں جا کر یہ شخص معاً مقیم ہو جاوے گا، گو نیت اقامت نہ ہو، کما قد مرنا فی السؤال السابق عن السراجیة مسافر دخل بلدة فيها اهل یصیر مقیماً وان لم یؤا الإقامة ام

ایک صورت اور باقی ہے وہ یہ کہ کسی شخص نے وطن اقامت سے سفر کا قصد نہیں کیا، بلکہ وہاں سے کسی دوسری جگہ گیا، اور وہاں سے سفر کا قصد کیا، اور مسافت سفر قطع کر کے وطن اقامت میں داخل ہوا مگر نیت قیام نہیں، آگے جانے کا ارادہ ہے، لیکن آگے جس جگہ جانے کا ارادہ ہے وہ موضع وطن اقامت سے مدت سفر پر نہیں ہے، اس صورت میں وطن اقامت پر پہنچ کر اس شخص کو اتمام کرنا چاہئے، فی حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح وبقی ما اذا خرج منه علی نية السفر الاولى ثم جاوزه بمدة سفر منه او من الاصلی ولم یقیم فی غیرہ ثم مر به هل یتیم وظاهر کلاهم نعم لانه لم یخل الاصلی ولم یقیم فی غیرہ ولم ینشئ سفراً بعده وحرره ام ص ۲۲۹،

خلاصہ یہ ہوا کہ وطن اقامت سے اگر انشاء سفر کا قصد کیا جاوے، اس صورت میں تو خروج من العمان کے بعد ہی وطن اقامت باطل ہو جائے گا، قال الشامی وافلا قوله واما المکی الخ ان انشاء السفر من وطن الإقامة مبطل له وان عاد الیہ ولذا قال فی البدائع لو اقام خراسانی بالکوفة نصف شهر ثم خرج منها الی مکة، فقبل ان يسير ثلاثة ايام عاد الی الکوفة لحاجة فانه يقصر لان وطنه قد بطل بالسفر اه ص ۸۳۰ ج ۱، اور اگر انشاء سفر وطن اقامت سے نہ ہو تو بطلان وطن اقامت کی شرط یہ ہے کہ انشاء سفر میں وطن اقامت میں دخول نہ ہو، یا اگر دخول ہو تو بعد قطع مسافت ثلاثہ ايام ہو اور آگے جس جگہ کا ارادہ ہے وہ بھی وطن اقامت سے مسافت سفر پر ہو، اگر قطع مسافت سفر کے بعد وطن اقامت میں داخل ہو اور آگے جہاں جانے کا قصد ہے وہ وطن اقامت سے مسافت قصر پر نہیں تو وطن اقامت باطل نہ ہوگا، اور اس شخص کو اتمام کرنا لازم ہوگا، واللہ اعلم، ۲ شعبان ۱۴۲۸ھ

سوال (۵) اگر آدمی معذور ہو اور بیٹھ کر نماز پڑھے تو رکوع بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کے لئے رکوع کرنے کا طریقہ کے وقت سرین اٹھائے یا نہیں؟

الجواب؛ قال فی مرقی الفلاح فی الحموی فان رکع جالساً ينبغي ان تعاذی جهته رکبته ليحصل الركوع اه ولعل مراده ان حناء الظهر عملاً بالحقيقة لانه يبالغ فيه حتى يكون قريباً من السجود اه، ص ۱۳۲، اس سے معلوم ہوا کہ بحالت جلوس رکوع کرتے ہوئے صرف اتنا ضروری ہے کہ پیشانی کو گھٹنوں کے مقابل کر دیا جائے، اس سے زیادہ جھکنے کی ضرورت نہیں، نہ سرین اٹھانے کی ضرورت ہے، واللہ اعلم، ۸ اشوال ۱۴۲۸ھ

سوال (۶) تہمید مسائل ذیل؛ کشتی اور جہاز کے ملاحوں کے لئے نماز قصر پڑھنے کی تحقیق، نیز فناء مصر کی تعریف، اور بندر گاہ پر نیست اقامت کا حکم

محمد اشرف علی صاحب دام مجید ہم، متعلق مسافر سفینہ کے شائع ہوا تھا، ایک صاحب نے رنگون سے اس پر کچھ شبہات معہ اپنی تحقیق کے لکھ کر بھیجے، یہاں سے ان شبہات کا جواب اور اس تحقیق پر تنقید لکھی گئی، جو ذیل میں اس ترتیب سے منقول ہیں، اول خط، ثانیاً

وہ تحقیق بصورت فتویٰ ثالثاً وہ تنقید،

خط آمدہ از رنگون؛

..... حضرت والا آپ کا فتویٰ مندرجہ رسالہ الامداد ماہ

جمادی الاول مسئلہ ماحقر کی نظر سے گذرا، آپ نے جو جواب ارقام فرمایا ہے اس کے متعلق عاجز کے ذہن میں چند شبہات پیدا ہو گئے ہیں، امید کہ آپ تشفی فرما کر ممنون فرمائیں گے، آپ تحریر فرماتے ہیں کہ خلاصہ جواب یہ ہوا کہ کشتی و جہاز میں اقامت کی نیت معتبر نہیں ہے، جب تک کہ اس کے کھڑے ہونے کی جگہ موقع آبادی سے متصل نہ ہو، یہ تو آپ بھی تسلیم فرماتے ہیں کہ کشتی و جہاز میں اقامت کی نیت معتبر نہیں ہے، لیکن جب کشتی آبادی کے متصل کھڑی ہو تو نیت اقامت درست فرماتے ہیں، اب گزارش یہ ہے کہ آپ نے یہ حکم کہاں سے اخذ کیا ہے، (۱) اگر آپ نے فنائ مصر پر قیاس کیا ہے تو قیاس مع الفارق معلوم ہوتا ہے، کیونکہ فنائ مصر محل اقامت ہے، لہذا اس کو مصر کے ساتھ ملحق کر دیا گیا، لیکن جب کشتی و جہاز اقامت کی صلاحیت نہیں رکھتے، اور دریا محل اقامت نہیں ہے تو آبادی کے قرب کی وجہ سے ان میں کیونکر صلاحیت پیدا ہوگی؟

(۲) اگر آپ نے فقہاء کی تصریح اس بارہ میں دیکھی ہے تو اس سے مطلع فرمائیے تاکہ دفع خلیجان ہو،

(۳) اس بارے میں آپ نے جو عبارات فقہیہ تحریر فرمائی ہیں ان سے یہ مستنبط نہیں ہوتا کہ جب کشتی آبادی کے متصل ہو تو نیت اقامت درست ہے، ان سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ دریا کا کنارہ جبکہ سلسلہ آبادی کا وہاں تک متصل چلا گیا ہو فنائ مصر میں داخل ہے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ دریا بھی فنائ مصر میں داخل ہے،

(۴) جب مصر اور فنائ مصر کے درمیان کوئی باغ یا بڑا میدان یا جنگل حائل ہو اس وقت وہ مصر کے حکم سے خارج ہو جاتا ہے، تو جہاز اور کشتی جو دریا میں لنگر انداز ہوتی ہے اس میں بہ تبعیت مصر کیونکر اقامت درست ہو سکتی ہے، حالانکہ فنائ مصر اور باغ اور میدان و جنگل کے درمیان قطع مسافت ہو، کوئی شئی مانع نہیں ہے، اور جہاز اور خشکی کے مابین پانی کا حصہ آمد و رفت سے مانع ہے، اور بغیر حیلہ و علاج کے عبور عادی ناممکن ہے،

(۵) جب یہ قاعدہ کلیہ ہو کہ بحر و کشتی محل اقامت نہیں ہو تو جب تک اس کے خلاف فقہاء کی کوئی تصریح نہ ملے اس کے خلاف حکم دینا کیسے درست ہو سکتا ہے؟

(۶) عالمگیری سے بحوالہ عتابیہ آپ نے جو عبارت نقل کی ہے وہ تو اس شخص کے حق میں ہے کہ جو اپنے وطن اصلی سے سفر کرتا ہو، ظاہر ہے کہ کشتی لوٹنے کے بعد وہ اپنے وطن اصلی میں پہنچ گیا ہے، پس اس کی اقامت بسبب وطن اصلی کے ہی فقط، فی الحقیقت یہاں ان لوگوں کے متعلق بحث ہو جو مسافت بعیدہ سے آکر یہاں کام کرتے ہیں، جو دریا کے متصل کسی قریہ یا آبادی میں مقیم نہ ہوں ان لوگوں کے متعلق نہیں ہے، جو کسی مصر یا قریہ میں مقیم ہونے کے بعد جہاز میں ملازم ہوئے ہوں، کیونکہ ان کی اقامت کی صحت وطن اصلی یا وطن اقامت کی وجہ سے ہے جس کی تفصیل فتویٰ میں جو اس کے ساتھ منسلک ہے موجود ہے،

(۷) دریا فنار مصر میں شامل ہے کہ نہیں؟

(۸) بحر الرائق کی اس عبارت دلان نیتہ الاقامة لا تصح فی غیرہا فلا تصح فی مفازہ ولا جزیرۃ ولا سفینۃ (ام) سے معلوم ہوتا ہے کہ سمندر اور کشتی محل اقامت نہیں، شامی وغیرہ کی عبارت میں بھی بحر کو سفینہ پر عطف کیا گیا ہے جس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ کشتی اگرچہ کنارہ پر آبادی کے متصل کھڑی ہو تو بھی اس میں اقامت درست نہیں ہے، بحر پر سفینہ کا عطف اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ دونوں سے دو چیزیں مراد ہوں، کیونکہ بحر میں بحر کشتی کے اقامت کی کوئی صورت نہیں، پس اس پر سفینہ کو عطف کرنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ سفینہ سے یہ مراد ہو کہ جب وہ کنارہ پر آبادی کے متصل کھڑی ہو تو بھی اس میں اقامت درست نہیں ہے، حقیقت سے مجاز کی طرف رجوع کرنا بدوین قرینہ صارفہ کے صحیح نہیں ہے، فی الجملہ فقہاء کی تصریحات مترشح ہوتا ہے کہ بحر اور سفینہ محل اقامت نہیں ہے، پس اس کے حکم کے خلاف حکم دینے کے لئے صریح دلیل کی ضرورت ہے، دست بستہ عرض ہے کہ ان شبہات کے دفع کی طرف توجہ مبذول فرمادیں، جناب کا وہ فتویٰ جو رسالہ الامداد ماہ جمادی الاول ۱۳۳۸ھ میں مندرج ہے دستیاب ہونے سے قبل میں نے یہ فتویٰ لکھا تھا، اگر قبل اس کے آپ کا فتویٰ ملتا تو بغیر جواب تحریر کے محض شبہات کو آپ کی خدمت میں بھیج دیتا، اب گزارش ہو کہ ازراہ نوازش جواب تحریر فرما کر تسکین فرمائیں،

تحقیق صاحب خط کیا فرماتے ہیں علمائے دین رحمہ اللہ تعالیٰ، ان جہاز رانوں اور کشتی بانوں کے حق میں کہ جن کے جہاز اور کشتی اپنے بنا اور اوراق قرار گاہوں سے کہیں دور دراز فاصلہ اور مسافت طویلہ میں جا چکے ہیں جس سے مقدار مدت سفر قائم نہیں ہوتی، بلکہ اکثر مقامات قریبہ و مصافات غیر بعیدہ میں روزانہ دورہ کرتے رہتے ہیں، اور عموماً رات کو بعد اختتام کام حسب معمول اپنی اپنی قرار گاہ میں آکر لنگر انداز ہوتے ہیں، مندرجہ بالا جہاز اور کشتی کے ملازمین و اہل کار جو غیر مالک کے باشندے ہوتے ہیں انھیں جہاز اور کشتیوں میں رہتے ہیں، ان کا کھانا پینا، سونا و دیگر حوائج ضروریہ کے لئے پورا انتظام جہاز اور کشتی ہی میں ہوتا ہے، نتیجہ و استقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ سابق الذکر جہاز اور کشتی کے ملازمین و اہل کار تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں، ایک وہ کہ اپنے وطن سے آکر شہر یا گاؤں میں اولاً کوئی جگہ اقامت کی نیت کر کے مقیم ہو جاتے ہیں، پھر کچھ دنوں کوشش و تلاش کے بعد کسی جہاز یا کشتی میں ملازم ہو جاتے ہیں، دوسرے وہ کہ وطن سے آکر بحیثیت ملازم قدیم براہ راست اپنی منصب پر مامور ہو جاتے ہیں اور انھیں کسی غیر جگہ پر اقامت کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی، تیسرے وہ کہ جستجو سے ملازمت کسی شہر یا گاؤں پر بلا نیت اقامت تا حصول ملازمت ٹھہر جاتے ہیں اور بعد ملازم ہو کر کسی جہاز یا کشتی میں جا کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں، پس ایسے لوگوں کو پوری نماز پڑھنی چاہیے یا قصر؟ اس بارے میں حکم شرع کیا ہے؟

الجواب اللہ الموفق للصواب اول الذکر لوگوں کو پوری نماز ادا کرنی ہوگی، کیونکہ بوجہ نیت اقامت و عدم موانع حکم سفر ان کا باطل ہو گیا، اور وہ لوگ

مقیم ہو گئے لہذا فی الکبیری ثم لا یزال المسافر علی حکم السفر حتی یدخل وطنہ او ینوی اقامة خمسة عشر یوماً بموضع واحد من مصر او قرية وفي البحر عن المجتبی لا یبطل السفر الابنیة الاقامة اور دخول الوطن او الرجوع قبل الثلاثة اھ، اگرچہ یہ لوگ جہاز ہی میں رہتے ہیں اور دوسرے کسی مسکن سے تعلق نہیں رکھتے ہیں، مگر یہ سبب اس کے کہ اقامت ان کی صحیح اور ثابت ہو گئی ہے، تا وقتیکہ مدت سفر کی مسافت میں نہ جائیں اقامت ان کی باطل نہ ہوگی وہ ہمیشہ مقیم کہلائیں گے، ہاں اگر کبھی تین دن یا اس سے زیادہ کی مسافت میں سفر کریں تو وطن اقامت ان کا باطل ہو جائیگا پھر بعد مراجعت بدون نیت اقامت کے مقیم نہیں ہو سکتے ہیں، عالمگیری میں ہے ووطن الاقامة

یبتل بوطن الاقامة بانشاء السفر وبالموطن الاصلی الخ، وفي شرح الوقاية واما
 وطن الاقامة فانه یبتل بوطن الاقامة الى قوله لم یبق الموضع الاقل ووطن
 الاقامة حتى لو دخله لا یصیر مقیماً الا بالنیة وكذا ان سافر عنه الخ فی الجملة ان
 ما یمیم کهلانا از غیبت صحت اقامت فی السفن کے نہیں ہے بلکہ بسبب اس اقامت ثابتہ
 کے ہے جو قبل ملازمت کسی شہر یا گاؤں میں جولیا آباد ہیں، وقوع میں آئی ہے، کما
 یدل علیہ ما فی العالمگیرية ولا یصیر مقیماً بنية الاقامة فیہا وكذلك صاحب
 السفينة والملاح الا ان تكون السفينة بقرب من بلدته او قریته فم یكون مقیماً
 باقامته الاصلية، اه،

دوسرے اور تیسرے قسم کے لوگوں کو تا بقائے قیام فی السفن نماز قصر کرنی ہوگی، کیونکہ
 قبل اس کے کہ وہ لوگ کسی جہاز یا کشتی میں ملازم ہوں شہر یا گاؤں میں کسی جگہ مقیم نہیں ہوئے
 اس لئے مسافرت ان کی باطل نہیں ہوتی، جب تک نیت اقامت بحال صالح اقامت ان سے
 وقوع میں نہ آئے، حکم سفر ان پر ہمیشہ جاری رہے گا، کما فی الوقایة ولورخص تدوم وان کان
 عاصیاً فی سفر حتى یدخل بلدة او ینوی اقامة نصف شهر ببلدة او قرية اه وفي
 الهدایة ولا یزال علی حکم السفر حتى ینوی الاقامة فی بلدة او قرية خمسة عشر
 یوماً الخ، جہاز اور کشتی موضع صالح اقامت نہیں ہے جو شرط ہے صحت اقامت کے لئے،
 لہذا اس میں نیت اقامت کرنے سے بھی اقامت شرعی ثابت نہیں ہوتی،

بنابرین متذکرہ بالاتین قسم کے لوگوں میں سے قسم دوم و سوم کے ملازمین کا شمار ہمیشہ
 مسافرت ہی میں رہے گا، اس لئے ان کے حق میں صلوٰۃ رابعیہ میں قصر واجب ہے، درمختار میں
 والحاصل ان شروط الاتمام ستة، النية والمدة واستقلال الراعی وترك
 السیر واتحاد الموضع وصلاحيته اه، وفي العالمگیرية ونية الاقامة انما
 تو شر بخمس شرط ترك السیر حتى لو نوى الاقامة وهو یسیر لم تصح وصلا
 الموضع حتى لو نوى الاقامة فی برا وبحرا وجزيرة لم تصح والمدة اتحاد الموضع
 والاستقلال بالراعی اه

مندرجہ بالا دلائل سے ثابت و روشن ہے کہ جہاز اور کشتی قابل اقامت اور صالح
 سکونت نہیں ہے، اس لئے نیت اقامت شرعاً اس میں صحیح نہیں ہے، پس اگر کوئی شخص

معہ اپنے اثاث البیت اور اہل و عیال کے جہاز یا کشتی میں سکونت اختیار کرے تو بھی وہ شخص شرعاً مقیم نہیں ہو سکتا ہے بہ نسبت اقامت کے کما فی الطحاوی علی مرقی الفلاح
 (قوله لا تصح نية الإقامة في مفازة) مثلها الجزيرة والبحر والسفينة والملاک
 مسافر وسفینته لیست بوطن الا عند الحسن الخ وکما فی رد المحتار قال فی
 المجتبی والملاح مسافر الا عند الحسن وسفینته ایضاً لیست بوطن ام بحر وظا
 ولو کان ماله واهله معه فیها ثم رأیتہ صریحاً فی المعراج ام فی البحر وقید
 بالبدن والقریة لان نية الإقامة لا تصح فی مفازة ولا جزيرة ولا بحر
 ولا سفينة ام

نوٹ؛ وہ لوگ جو قبل ملازمت جہاز کے کسی گاؤں یا شہر میں مقیم ہو جاتے ہیں اور
 اقامت کی نیت کر لیتے ہیں، اور بعد قیام ملازمت جہاز اختیار کر کے تین روز سے کم کی مسافت
 میں سفر کرتے رہتے ہیں، ایسے لوگوں کو نماز پوری پڑھنی ہوگی، خواہ وہ جہاز ہی میں رہتے ہو
 البتہ اگر کبھی تین روز یا اس سے زیادہ کی مسافت میں سفر کریں تو وطن اقامت ان کا باطل
 ہو جائے گا، بعد مراجعت بدون نیت اقامت کے مقیم نہیں ہو سکتے، جب تک جہاز میں رہیں
 نماز... قصر کرنی ہوگی، جو لوگ وطن سے آکر سیدھے جہاز میں قیام کرتے ہوں یا پندرہ یوم سے
 کم کسی گاؤں یا شہر میں بغیر نیت اقامت پھر کر جہاز میں نوکری اختیار کر لیتے ہیں، ایسے
 لوگوں کے لئے قصر واجب ہے، واللہ اعلم وعلم احکم، منقہ محمد یعقوب غفرلہ

الکلام علی الجواب لمذکور اجمالاً من جامع امداد الاحکام

سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ ان جہاز رانوں اور ملاحوں کے لئے بنادر اور قرارگا ہیں
 متعین ہیں، جہاں وہ رات کو عموماً دورہ ختم کر کے نگر انداز ہوتے ہیں، پس یہ بنادر ان لوگوں
 کے حق میں ایسے ہیں جیسے ملازمان ریلوے کے لئے اسٹیشن، تو اگر یہ بنادر کسی شہر یا قریہ کے
 متصل ہیں، یا متصل نہیں، مگر حواجج بلد یا قریہ کا تعلق اس سے ہے تب تو یہ بمنزلہ فناء
 مصر یا متعلقات قریہ ہونے کے موضع اقامت ہونے کے قابل ہیں، اور اگر کسی مصر یا
 قریہ کے متصل نہیں نہ اُن کے حواجج کا بنادر کا تعلق ہے، تو چونکہ اہل جہاز کے مصالح ان
 بنادر سے متعلق ہیں، اس لئے یہ اُن کے حق بمنزلہ صحراء کے ہیں رعاۃ کے لئے، لہذا بنادر

کوان کے لئے موضع اقامت کہنا صحیح ہے، بشرطیکہ بنادر پر انھوں نے خیمے اور چھونپڑے وغیرہ قائم کر لئے ہوں، یا کوئی عمارت اُن کی ضروریات کے واسطے بنی ہوئی ہو، پس یہ جہاز ران اور ملاح جس وقت بنادر پر پہنچیں گے مقیم ہوں گے، اور جب بنادر سے انتقال کریں گے تو اگر تین دن کی مسافت یا زیادہ کا قصد کریں تو وقت سیر سے مسافر ہو جائیں گے، (یعنی جبکہ اپنے بندر کی حد سے نکل جائیں)، اور جب بندر پر واپس ہونگے مقیم ہو جائیں گے، اس حکم میں تینوں قسم کے آدمی برابر ہیں جن کا ذکر سوال میں ہے، اور ان لوگوں کا کشتی میں رہنا مانع عن الإقامة نہیں، کیونکہ فقہاء کے کلام سے یہ بات صراحتاً مفہوم ہوتی ہے کہ سفینہ جب موضع اقامت میں پہنچے تو راکب سفینہ مقیم ہو جاتا گا، اور یہ جو فقہاء نے فرمایا ہے کہ سفینہ صالح للإقامة نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ سفینہ سائرہ محل اقامت نہیں، یعنی سفینہ سائرہ میں ۱۵، ۲۰ دن یا زیادہ قیام کی نیت سے راکب مقیم نہ ہوگا، قال فی العالمگیریۃ ولا یصیر مقیمًا بنية الإقامة فیہا وکذلک صاحب السفینۃ والملاح الا ان تكون السفینۃ بقرب من بلدته او قریبہ فم یكون مقیمًا باقامة الاصلیۃ کذا فی المحيط و فی الولا الجیۃ افتتح الصلوة فی السفینۃ حال اقامتہ فی طرف البحر فتقلما الريح وهو فی السفینۃ فتوی السفیر تیمر صلوة المقیم عند ابي یوسف و فی الحجۃ الفتوی علی قولہ احتیاطاً و فی العنابیۃ ولو کان مسافراً و شرع فی الصلوة فی السفینۃ خارج المصر فجرت السفینۃ حتی دخل المصر تیماربعاً ۹۲، واللہ اعلم، الرجب ۲۲ھ

الکلام علیہ تفصیلاً

تنبیہ: اس جگہ چند امور محتاج دلیل ہیں:۔ (۱) یہ کہ جب بندر و ساحل بحر متصل کسی شہر یا قریہ کے ہو تو وہاں نیت اقامت جائز ہے یا نہیں؟ اور وہ موضع صالح للإقامة ہے یا نہیں؟ (۲) کشتی اور جہاز جب بندر پر کھڑا ہو اور بندر قریب شہر یا قریہ کے ہے تو اس حالت میں خود کشتی یا جہاز موضع اقامت ہے یا نہیں؟ (۳) اگر بندر متصل شہر و قریہ کے نہیں اس حالت میں اس کا صالح للإقامة ہونا کس دلیل سے ثابت ہے، اور کیا وہ مطلقاً صالح للإقامة ہو یا بندر پر خیمے اور چھونپڑے

وغیرہ نصب کرنا بھی شرط ہے،

جواب اول؛ بندر جب متصل شہر و قریہ کے ہو اس طرح کہ آبادی کا سلسلہ وہاں تک
متدرج ہو یا متصل نہ ہو مگر آبادی والے وہاں کپڑے وغیرہ دھوتے ہوں یا ان کے اور حوائج بندر
سے متعلق ہوں اس صورت میں وہ حکم فناء مصر و فناء قریہ کے ہے، اور فناء مصر و فناء قریہ
کا حکم وہی ہے جو خود مصر و قریہ کا حکم ہے، اس لئے وہاں اقامت کی نیت درست ہوگی،
قال فی الدواوقاۃ وھو ما حولہ اتصل بہ اولاً لاجل مصالحہ ام قال الشامی
نص الاثمة علی ان الفناء ما عد لدفن الموتی وحوایج المصن کرکض الخیل و
الدواب وجمع المساکرو الخرج للرحی وغیر ذلک وای موضع یحد ببسافة یسم
عساکر مصر ویصلح مید انا للخیل والفرسان ورمی السبل والبندق والبارود
واختبار المدافع وھذا یشی علی فراستہ ام وفيہ ایضا اعتبار بعضهم ر فی تعریف
الفناء) الاتصال وقد خطاہ صاحب الذخیرۃ قائلاً فعلى قول هذا القائل
لا تجوز اقامة الجمعة ببغاری فی مصلی العید لان بین المصلی و بین المصر مزارع
ووقعت هذه المسئلة مرة وافتی بعض مشایخ زماننا بعدم الجواز ولكن هذا
لیس بصواب فان احد المریئین کجواز صلوة العید فی مصلی العید ببغاری لا
من المتقدمين لان المتأخرين كما ان المصر وفناء شرط لجواز الجمعة فهو شرط جواز صلوة العید ام،
(ص، ۸۳ ج ۱) غرض فناء کے لئے اتصال آبادی بھی شرط نہیں، بلکہ اس کے متعلقات بلد
و جبانہ مصر ہونا کافی ہے، اسی طرح قریہ کے متعلقات میں شمار ہونا بس ہر، اور یقیناً جب فناء
بحکم مصر و قریہ ہے تو ان کی طرح یہ بھی ضرور صالح للاقامت ہوگا، کیونکہ جمعہ اسی موضع میں
جائز ہے، جو صالح للاقامت ہو، مفازہ و بریہ میں اتفاقاً جمعہ صحیح نہیں باقی جواز قصر کے لئے
مجاذرت فناء کا شرط نہ ہونا دوسری وجہ سے ہے، اس کا مبنی یہ نہیں کہ فناء صالح للاقامت
نہیں، قال فی الکفایۃ فان قیل فناء المصر فی حکم المصر فی حق صلوة الجمعة و
العیدین حتی جائزت الصلوة فیہ مع کون المصر شرطاً لجواز هذه الصلوة
فکیف اعطى الفناء حکم غیر المصر فی حق القصر للسافر قلنا فناء المصر انما
یلحق بالمصر فیما کان من حوائج اهل المصر صلوة الجمعة العیدین من
حوائج اهل المصر فاما قصر الصلوة فلیس من حوائج اهل المصر فلا یلحق

الفناء بالمصر فی حق هذا الحكم (ص ۱۹۵ ج ۱)

پس صلاحیت نیت اقامت کے لئے فناء کی وہ تعریف لی جائے گی، جو صحت صلوٰۃ جمعہ کے لئے فناء مصر کی تعریف عند الحنفیہ ہو، یا فناء تشریہ کی تعریف عند الشافعیہ ہو کیونکہ دونوں کے نزدیک صحت جمعہ کے لئے اس کا موضع صالح للاقامت ہونا شرط ہے، اور وہ معنی فناء کے نہ لئے جائیں گے جس کی مجاوزت سے قصر صحیح ہو جاتا ہے، فافہم،

وفی الاملاء عن ابی یوسف ان نزلوا رعدا مسلما (بساتینہم واکن فہم رای البغاة) وللمسلمین منعة صحت اقامتہم ولا یصح اذا نزلوا علیہم فی خیاءہم (بنایہ ص ۹۶۸ ج ۱) اس سے معلوم ہوا کہ بساتین بلد و جوانب بلد محل اقامت ہیں حالانکہ مسافر کو قصر کے لئے مجاوزت بساتین شرط نہیں، پس جب بندر سے مصلح مصر و قریہ کا تعلق ہو گا اتصال نہ ہو وہ موضع صالح للاقامت ضرور ہوگا،

جواب شق دوم: جب کشتی یا جہاز بندر پر کھڑا ہو، اور بندر فناء یا قریہ ہو تو اس صورت میں کشتی یا جہاز کا بھی وہی حکم ہے جو ساحل بحر کا حکم ہے، جس طرح ساحل بحر موضع صالح للاقامت ہے اسی طرح کشتی یا جہاز واقف و مشدود بال ساحل بھی صالح للاقامت ہے، قال فی الدر والمروطة فی الشط كالشط فی الاصح اھ قال الشامی و ان کان الامام فی سفینة واقفة والمقتدون علی الشط فان بینہما طریق او قدر نفس عظیم لم یصح بحراھ (ص ۹۸ ج ۱) اس سے معلوم ہوا کہ اگر درمیان میں طریق و قدر نہر عظیم نہ ہو تو اقتدار صحیح ہے، اور لقیئاً اقتدار کے لئے اتحاد موضع امام و مقتدی شرط ہے، معلوم ہوا کہ سفینہ واقفہ کا حکم مثل ساحل کے ہے، لہذا اگر ساحل موضع صالح للاقامت ہو تو سفینہ واقفہ مشدودہ بھی محل اقامت ضرور ہے، لاتحادہ بال ساحل فافہم، وفی العتابیة ولو کان مسافراً شرع فی الصلوة فی السفینة خارج المصر فجرت السفینة حتی دخل المصر تیمار بجا اھ عالمگیری (ص ۹۲ ج ۱) قلت ومعناه فجرت السفینة حتی دخل المصر وهو فیہا، کیونکہ صورت مفروضہ یہ ہے کہ وہ شخص نماز شروع کرنے کے وقت مسافر تھا، اور نماز شروع کرنے کے بعد اثنا صلوٰۃ میں کشتی مصر میں پہنچ گئی، تو یہ شخص کشتی کے اندر ہی مقیم ہو گیا، پس یہ احتمال نہیں ہو سکتا کہ وہ کشتی سے اتر کر شہر میں داخل ہو جائے تو مقیم ہوگا، کیونکہ اثنا صلوٰۃ میں اس عمل کثیر کی

کوئی گنجائش نہیں، پس ثابت ہوا کہ دریا کا وہ حصہ جو متصل بلدیہ یا داخل بلدیہ ہو وہ حکم بلد میں ہے، اور کشتی کا اس موضع میں پہنچ جانا اقامت کے لئے سبب ہو سکتا ہے، پس ایسی طرح جو لوگ بندر پر مقیم ہیں اور بندر بوجہ فناء یا فناء قریہ ہونے کے صالح للاقامت ہو تو جب وہ لوگ کشتی کے اندر بیٹھے ہوئے بندر پر پہنچ جائیں اور کشتی یا جہاز بندر پر لنگر انداز ہو جائے تو یہ لوگ مقیم ہو جائیں گے، کیونکہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ سفینہ مشرودہ بالشط بحکم شط ہے، قال فی العالمگیریۃ واذا وقف علی الاطلال یقتدی بالامان فی السفینۃ صح اقتداءہ الا ان یكون امام الامام کنانی المحيط اھ (ص ۱۹۲ ج ۱)

الغرض سفینہ کی چار حالتیں ہیں، واقف علی الشط، واقف فی لجة البحر، سائر بقرب الشط، سائر فی لجة البحر (یعنی بعید عن الشط) پس واقف علی الشط بحکم شط ہے، اور جب شط صالح للاقامت ہو سفینہ بھی صالح للاقامت ہے، اور واقف فی لجة البحر بحکم بحر ہے، وہ صالح لنیۃ الاقامت نہیں، یعنی انشاء اقامت کا محل نہیں، گو بقائے اقامت کا محل ہو سکتا ہے مثلاً پہلے سے شہر یا قریہ میں مقیم ہے، اور کشتی میں سوار ہو کر نہ سفر کی نیت کی، نہ تین دن کی مسافت قطع کی، یہ شخص سفینہ واقف فی لجة البحر باقامت سابقہ مقیم رہے گا، اور سائر بقرب الشط یا بعیداً عن الشط بھی موضع انشاء اقامت نہیں، البتہ جو شخص پہلے سے مقیم علی الشط ہو وہ کشتی میں یہ نیت سفر سوار ہو کر اس وقت مسافر ہو گا جبکہ سفینہ اس کے بندر کی حد سے نکل جاوے، قال فی البناہ وان کان فی سفینۃ فحین یرکبہا رای یصیر مسافراً یرکبہا، الا ان یكون فی وسط المصر فیعتبر ان یجاوز البیوت اھ (ص ۱۹۳ ج ۱) قلت فلما کان سیر السفینۃ فی المصر لایکفی لابتناء سفر اھلہ بدون المجاوزۃ عن البیوت فکذا سیرھا علی الشط لایکفی لابتناء السفر لاهل الشط حتی یجاوز حد ودہ فافہم ۱۴

پس فقہار کا یہ قول فلا تصح نیت الاقامت فی مفارۃ ولا بحر ولا سفینۃ اھ اس میں اقامت فی البحر سے اقامت فی السفینۃ الواقفۃ فی لجة البحر مراد ہے، اگر یہ مان لیا جائے کہ بحر میں بحر سفینہ کے اقامت ممکن نہیں اور اقامت فی السفینہ سے مراد اقامت فی السفینۃ السائرہ ہے، کیونکہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ سفینہ واقف علی الشط فقہار کے نزدیک بحکم الشط ہے، پس اس سے مطلقاً یہ سمجھنا کہ سفینہ کسی حال میں محل اقامت نہیں، غلط ہے،

علاوہ ازیں ہم کو یہ بھی تسلیم نہیں کہ اقامت فی البحر بدون اقامت فی السفینہ کے مقصود نہیں بلکہ کرامت کے طور پر اقامت فی البحر بدون سفینہ کے ہو سکتی ہے، لان بعض الاولیاء ہمیشی علی وجہ الماء ولقیہم فی البحر ایاماً، اور فقہاء صور بعیدہ کا حکم بھی بیان فرمادیا کرتے ہیں، کمالا یخفی، پس مجیب سلمہ کا یہ استدلال کہ عطف بحر علی السفینۃ تغاثر پر دلالت کرتا ہے، اور بحر میں بحیر سفینہ کے اقامت کی کوئی صورت نہیں، پس سفینہ سے مراد یہ ہی کہ جب وہ کنارے پر آبادی کے متصل کھڑی ہو تب بھی اس میں اقامت درست نہیں الخ بناء الفاسد علی الفاسد ہے، دوسرے سفینہ سے سفینہ واقفہ علی الشط مراد لینا کیا یہ حقیقت کے موافق ہے، یقیناً یہ بھی مجاز ہے، تو اس مجاز کا کیا قرینہ ہے، بخلاف اس کے کہ سفینہ سے سفینہ سائرہ اگر مراد لیا جائے تو یہ حقیقت کے قریب ہی، کیونکہ متبادر اطلاق لفظ سفینہ سے باب مسافر میں یہی ہے، فافہم حق الفہم،

جواب متیق سوم؛ اگر بندر فنا، شہر و قریہ نہیں ہے اس صورت میں ظاہر روایت پر وہ صالح للاقامۃ نہیں، مگر ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک صالح للاقامۃ ان لوگوں کے حق میں معلوم ہوتا ہے جن کے حوائج و کاروبار بندر سے متعلق ہیں، پس اگر جہاز راں و ملاح وغیرہ کسی ایسے بندر پر جو فنا، شہر و قریہ نہیں ہے خیمے یا جھونپڑے ڈال لیں، اور اس کو اپنی قرار گاہ و مرکز متعین کر لیں تو وہ ان کے لئے محل اقامت ہو جائے گا، اور اگر خیمے و جھونپڑے کچھ نہیں ڈالے، اس صورت میں کسی کے نزدیک انشاء اقامت کے لئے صالح نہ ہوگا، یعنی جو سفر کر کے وہاں پہنچے وہ اس حالت میں نیت اقامت سے مقیم نہ ہوگا، اور جو پہلے سے مقیم ہو وہ باقامت سابقہ مقیم رہے گا جب تک نیت سفر یا قطع مسافت سفر سے اقامت سابقہ باطل نہ ہو قال فی الکفاۃ قولہ حتی ینوی الاقامۃ فی بلدۃ او قریۃ الی قولہ وهو الظاہر ای الظاہر من الروایۃ وهذا احتراز عماروی عن ابی یوسف ان الرعاة اذا نزلوا مواضع کثیرا لکلاء و الماء واتخذوا المخابز والمعالف والاداری وضربوا الخيام ونزلوا الاقامۃ خمسة عشر يوماً لکلاء و الماء ینفہم لتلك المدة صاروا مقیمین و کذا التراکمة و الاعراب اھ (ص ۱۹۵ ج ۱) تراکمة و اعراب جو کہ اہل خبار ہیں جن کا مسکن کوئی متعین ہی نہیں ہوتا، ان کا حکم تو ظاہر ہے، مگر ابو یوسف کے نزدیک رعاة کا بھی یہی حکم ہے، اگر وہ جنگل میں خیمے ڈال کر قیام کر لیں، اور ظاہر ہے کہ رعاة کا مسکن کسی بلد یا قریہ میں متعین ہوتا ہے، مگر چونکہ بوجہ شغل رعی کے ان کے حوائج صحرا سے بہت متعلق ہوتے ہیں اس لئے

ان کے حق میں بھی نیت اقامت فی الصحراء وہی حکم رکھتی ہے جو اہل خباء کے حق میں، پس اسی طرح گو وہ بندر جو فنا مصر و قریہ نہ ہو، عام لوگوں کے لئے محل اقامت نہیں، مگر ملازمان جہاز و سفینہ و ملاحین کے لئے محل اقامت ہوگا، اگر وہ وہاں خیمے وغیرہ قائم کر لیں ورنہ نہیں، اور چونکہ اہل خباء کے مسئلہ میں قول ابو یوسف مفتی ہے پس احوط یہ ہے کہ مسئلہ رعاۃ میں بھی ان کا ہی قول لیا جائے مگر ایسے ملازمان جہاز و ملاح جو ان بندروں پر مدت سے آئے ہیں، اور یہاں نیت اقامت کرنے سے مقیم ہوئے ہیں، ایسے لوگوں کے امام نہ بنیں جو اقامت سابقہ فی بلد یا اقامتہ فی قریہ کی وجہ سے مقیم ہیں، (یا بندر ہی پر مقیم ہیں) مگر ان کا وطن اصلی وہاں سے نزدیک ہے، مدت سفر کی مسافت پر نہیں، کیونکہ یہ خلاف حسیطہ ہے، واللہ اعلم وعلما اتم واحکم، ۴۴ رجب ۱۳۸۵ شمس

کشتی میں نماز پڑھنے کے متعلق عربی زبان میں ایک سوال اور اس کا جواب

سوال (۷) ما یقول العلماء الکرام والفضلاء العظام فی الصلوة فی السفینۃ هل یجوز مطلقاً فیہ

تفصیل بینوا توجروا ؟

الجواب؛ اقول ان هذه المسئلة علی وجہ فند کرکھا مع احکامہ، الوجه الاول ان تكون السفينة مربوطة فی الشط فان كانت مستقرة علی الارض بحيث اتصل اسفلها بها فالصلوة فیها جائزة قائماً لا قاعداً لانها فی حکم السریر علی هذا التقدير والصلوة علی السریر انما تجوز قائماً لا قاعداً فكذا هذا وان كانت غیر مستقرة علی الارض فان امکنه الخروج منها یجب علیه الخروج للصلوة لكونها فی حکم الدابة علی هذا التقدير وان لم یکن الخروج یصلی فیها قائماً لان الصلوة فیها علی هذا التقدير كالصلوة علی الشط والصلوة علی الشط لا بد لها من القيام فكذا هذا، الوجه الثاني ان تكون مربوطة فی الوسط فان استقرت علی الارض فمن فی حکم السریر یصلی فیها قائماً وان لم تستقر فان امکنه الخروج وهي ساکنة غیر متحركة بالريح یصلی فیها قائماً لانها فی هذه الصورة كالواقفة علی الشط وقد مر حکمها وان كانت متحركة بالريح حركة شديدة تجوز الصلوة فیها قاعداً ایضاً وان لم یحصل دوران الرأس بالقيام عند ابی حنیفة، لكن علی الاساءة وعندهما لا یجوز قاعداً وان حصل دوران الرأس فیجوز قاعداً بالاتفاق من غیر اساءة لانها فی

هذه الصورة في حكم السفينة السائرة التي حكمها، والوجه الثالث ان
ان تكون سائرة في البحر فان امكنه الخروج منها بوجه يجب عليه الخروج
وان لم يمكنه الخروج تجوز فيها الصلوة فان حصل له دوران الرأس عند
القيام يجوز قاعد ابا لا تفارق من غير ساعة وان لم يحصل دون الرأس فعند
يجب عليه القيام وعند يجوز مع القعود ايضا مع الساعة، في الدر المختار
صلى الفرض في قللك جارقاعد ابلعذر صرح لغلبة العجز واساء وقال لا يصح
الابعد وهو الاظهر برهان والمربوطة في الشط كالشط في الاصح والمربوطة
بلجة البحر ان كان الريح يحركها شديد افك السائرة والافكا الواقعة ويلزم
استقبال القبلة عند الافتتاح وكلما دارت انتهى بلفظه قال في رد المحتار
قوله والمربوطة في الشط كالشط قد تجوز الصلوة فيها قاعد اتفاقا وظاهرا
ما في الهداية وغيرها الجواز قائما مطلقا اي استقرت على الارض اولا
وصرح في الايضاح بسنعه في الثاني حيث امكنه الخروج العاقل لها بالذات
فهر واختاره في المحيط والبدائع، بحر وكن في الامداد ايضا الى مجمع الروايات
عن المصنف وجزم به في نور الايضاح وعلى هذا ينبغي ان لا تجوز الصلوة فيها
مع امكان الخروج الى البر وهذه المسئلة الناس عنها غافلون شرح المنية
انتهى بعبارته فقد علم بذلك ان ما يفعله كثير من الناس حتى بعض الخوا
ايضا من ينتسبون الى العلم انهم يصلون في السفن المربوطة في الشط مع
انها غير مستقرة على الارض وهم قادرون على الخروج منها وكذا يصلون
في السفن الجارية حالة السير وهم يستطيعون الخروج منها غلط عظيم
نشاء من عدم تتبع كتب الفقه لابد لهم ان يخرجوا منها وان استثقلوا
الخروج فعليه ان يوفقوها في موضع تستقر على الارض ثم يصلون
قاسمين فقط، والله اعلم بالصواب واليه المرجع والمآب، حرره العبد
الضعيف فيض الله عفي عنه، الجواب صحيح عزيز الرحمن مفتي دار العلوم ديوبند ۱۶ شعبان
الجواب صحيح محمد اعزاز علي غفر له، الجواب صحيح ظفر احمد عفا الله عنه از خالقه امداديه تعالى بهون
قلت اتصال مقلها بالارض فليس بشرط اتصال طرف منها بما يكفي كما يظهر من نور الايضاح

وحاشیة للطحاوی ونصہ فان صلی فی المربوطۃ بالشط قائما وکان شیء من السفینۃ علی قراب الارض صحت الصلوٰۃ بمنزلۃ الصلوٰۃ علی السیر (۳۸) فقولہ شیء من السفینۃ یعمل الاسفل والمقدم وغیرہا سواء کان قلیلا وکثیرا هذا والله اعلم، احقر ظفر احمد، ۱۹ صفر ۱۳۳۳ھ

سوال (۸) جہاز کے ملازمین کے لئے قصر کا حکم سے بہت سے لوگ نماز قصر پڑھتے ہیں، اور وہ یہ اعتراض پیش کرتے ہیں کہ ہم لوگ جسکی نوکری کرتے ہیں نہ معلوم کب اس کی طرف سے ایسی خبر آجائے جس سے مسافت کی راہ کوچ کرنا پڑے، اور ہمارے جہاز کا پیندا یعنی نیچے کا حصہ مٹی سے یعنی کنارے سے ٹیک لگی نہیں ہوتی، اگر جہاز کا حصہ کنارے سے لگا ہو تو پوری نماز پڑھنی ہوگی،

اور دوسری بات یہ کہ اپنی کمپنی سے خبر کب صادر ہوگی اس سے بھی واقف نہیں، اور نہ کمپنی نے ایسا کہا کہ فلاں تاریخ کو تمہیں فلاں جگہ جانا ہوگا، اور کمپنی کے دل میں کوئی بات گذرئی ہے اور کوئی بات گذرے گی، اس کا علم تو اللہ تعالیٰ کو ہے، اور اگر ایسا خیال ہے کہ ہر وقت آمد و رفت ہوتی ہو تو بلا تردد نماز قصر پڑھنی چاہئے، اب یہ لوگ کہتے ہیں ہماری کمپنی کے اس رنگون کے علاوہ اور بھی بہت سی جگہ کارخانہ ہے، اس جگہ ایک دو بار گیا بھی تھا، اب کوئی متعین وقت جانے کے لئے نہیں اور نہ جانے کا ارادہ ہے، لیکن مالک کی کوئی خبر آئے گی کہ نہیں اس کا علم تو خدا کو ہے،

اب تیسری گزارش یہ ہے کہ ہم لوگ جہاز میں شب در در رہتے ہیں، اور اسی میں خورد و نوش کا بھی انتظام ہے، بلکہ جہاز میں ہماری قیام گاہ ہے، اب اگر مالک کی طرف سے کوئی آرڈر ایسا آ پڑے جس سے مسافت کی راہ طے کرنی پڑے، تو اس حالت میں ہم لوگوں پر نماز قصر پڑھنی چاہئے یا نہیں، بشرطیکہ جہاز ہماری قیام گاہ ہے، اور مع جہاز کے جگہ میں پہنچ جاؤں گا، سو اس پر آپ کی کیا رائے ہے، اس مضمون پر خیال فرما کر نور ضیاء بخشے، اور کتاب کا حوالہ بھی ضرور دیجئے، اور جو مضمون عربی زبان میں ہو اس کا ترجمہ اردو زبان میں تحریر کیجئے، اس مسئلہ کے بارے میں جہازی آدمیوں میں بڑا فساد برپا ہو رہا ہے، کوئی عالم کہتے ہیں کہ نماز قصر پڑھنی چاہئے، اور کوئی اس کے برخلاف، اب ہم لوگ حیران ہو کر آپ کی طرف متوجہ ہیں،

الجواب: جو لوگ رنگون میں رہ کر قصر کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہم کو خبر نہیں کہ

مالک جہاز کی طرف سے کب حکم آجاوے اس کا حکم یہ ہے کہ شرع میں وہم و خیال کا اعتبار نہیں، وطن غالب کا اعتبار ہے، اگر ان کو کمپنی کی طرف سے حکم سفر آنے کا وطن غالب ہو، جس کا معیار یہ ہے کہ اکثر ہر مہینے میں ان کو حکم سفر آتا رہتا ہے، جس کی وجہ سے یہ ایسا موقع نہیں ملتا، کہ اپنے ارادہ و اختیار سے دس پندرہ دن قیام کر سکیں، یہ حالت ہو تو ان کا رنگون میں قصر کرنا درست ہے، بشرطیکہ وہ ان کا وطن اصلی نہ ہو، اور اگر وطن غالب نہیں محض خیال و وہم ہی ہے کہ شاید حکم سفر آجائے تو اس کا اعتبار نہیں، اس صورت میں اگر یہ لوگ رنگون میں نیت اقامت کر لیں، یا وطن غالب سے کبھی یہ معلوم ہو کہ پندرہ دن تک ابھی کہیں دور جانا نہیں ہے تو مقیم ہو جائیں گے، اور نماز پوری پڑھنا چاہئے، اور گزشتہ ایام میں اگر کبھی ایسا ہوا ہو کہ وطن غالب سے پندرہ دن تک کہیں جانا ان کو متحقق نہ تھا، یا پندرہ دن ٹھیرنے کی نیت کر لی تھی اور وطن غالب سے نیت کے پورا ہونے کی امید تھی اور اس وقت میں غلطی سے یہ لوگ قصر کرتے رہے تو ان ایام کی نماز کا اعادہ ضروری ہے، قال فی الدرود دخل بلدة ولم ينوها ای مدة الإقامة بل ترقب السفر غدا أو بعده ولو بقي على ذلك سنين (يقصر)، الا ان يعلم تاخر القافلة نصف شهر كما مر اه، قلت اشارة الى قوله سابقا وینوی اقامة نصف شهر حقيقة او حکماً كما فی البزازیة لو دخل الحاج الشام و علم انه لا يخرج الا مع القافلة فی نصف شوال اتم لانه كنوى الإقامة ط (ص ۸۲۳ ج ۱) قلت وقد تقران غلبة الظن فی حکم العلم شرعاً، والله اعلم

سورجہادی الاول ۱۴۲۲ھ

سوال (۹)..... بندہ کے کمر میں بہت حکم سیلان زخمیکہ از خود پیدا کردہ شود یا مثل زخمی ہست کہ بآفت سماویہ پیدا شود؛ در دہے، اور درد کی وجہ سے پیٹھ میں پیٹھ کی ہموار سطح سے چار انگشت چوڑا ایک انگشت ادنچا بڑی انگلی سے ہو گیا ہے، حالانکہ وہ کھنسی بھی نہیں ہے، اور نہ پکتا ہے، اور کمر کے درد کی وجہ سے ایک بھرا ہوا لوطا بھی اٹھانے میں سخت تکلیف ہوتی ہے، لہذا ہمالے یہاں کے لوگ مرض درد کے واسطے یہ علاج کرتے ہیں کہ نیم کے درخت کی ایک گولی لے کر گھٹنے کے تین انگشت نیچے یعنی پنڈلی کے اعلیٰ حصہ میں کاٹ کر زخم کر کے اس میں نیم کا درخت کی گولی رکھ دی جاتی ہے، اس کے اوپر تین انگشت چوڑا اور دو ہاتھ لمبا ایک کپڑا پیٹ کر باندھ دیتے ہیں، نیم کی گولی کم از کم ڈیڑھ سال تک رکھی جاتی ہے

اس سے زیادہ بھی رکھتے ہیں، اس زخم سے ہمیشہ پیپ پانی اور خراب چیزیں نکلتی ہیں بعضوں کے بہت بدبو ہوتی ہے، اور بعضوں کے بدبو کم ہوتی ہے، بعضے احتیاطاً دھو دیتے ہیں اور بعض نہیں دھوتے، مگر بندہ کے بدبو کم ہے، پس ہمارے پڑوسیوں کو دو تین آدمیوں کے استعمال سے مرض درد میں شفا ہو گئی ہے،

خدا کے حکم سے اگر کہیں بدن میں زخم ہو گیا ہے اس سے پیپ خون پانی وغیرہ نکلنے سے صحت صلوٰۃ کے لئے قدر درہم تک معاف ہے، اگر بعد وضو بھی وہ خون پیپ وغیرہ نکلے، نماز کے پورے وقت تک وضو باقی رہتا ہے، پس اس صورت بالا میں یعنی خود کردہ زخم کے پیپ پانی وغیرہ کا کیا حکم ہوگا؟ بندہ نے چار ماہ ہونے استعمال کیا ہے، درد میں کچھ تخفیف معلوم ہوتی ہے،

الجواب؛ اگر اس زخم میں روئی رکھنے یا اوپر سے پٹی باندھنے یا اور کسی طرح وقت صلوٰۃ میں سیلان بند ہو سکے، اور سہولت کے ساتھ بند ہو سکے تو ان طرق سے نماز کے وقت سیلان کو روکنا چاہئے، اور اگر سہولت سیلان کو نہ روک سکے تو پھر یہ شخص معذور ہے اور اس کے لئے معذورین کا حکم ہے، اس میں خود کردہ اور خدا کردہ زخم برابر ہے، خود کردہ زخم بھی خدا ہی کا کیا ہوا ہے، خصوصاً جب کہ بضرورت علاج کیا گیا ہے، قال فی نور الایضاً وجرح لا یوقا ولا یمن حبسہ بحشو من غیر مشقۃ ولا یجلوس اہ اما اذا کان یمن ردہ وجب ردہ وخرج عن ان یکون صاحب عذر اھط،

اور اس زخم سے جو ناپاکی نکلتی ہے، اگر وہ قدر درہم یا اس سے کم ہو تب تو عفو ہے، اور زائد ہو تو دھونا واجب ہے، بشرطیکہ دھونا مفید ہو کہ دھونے کے بعد دیر تک ناپاکی نہ لگتی ہو، اور اگر دھونا مفید نہ ہو تو پھر جب تک عذر باقی رہے اس کا دھونا بھی عفو ہے، قال فی حاشیۃ مراقی الفلاح فی البدائع یجب غسل المزاحم عن الدہم ان کان مفیداً بان لا یصیبہ مرة اخرى حتی یتولم لغسل و صلی لا یجزیہ وان لم یکن مفیداً لا یجب مادام العذر قائماً و هو اختیار مشایخنا اھ (۲۳ ج ۲)

رسالہ احکام القصر فی بعض احکام السفر | سوال (۱۰) ملا جائے ملازمت کو وطن تو نہیں ہے
یعنی بعض مسائل متعلق نماز قصر | لیکن وہاں پر اہل و عیال مقیم رہتے ہیں، تو کیا محض
اہل و عیال کے مقیم ہونے کی بناء پر وہاں ہر حال میں نماز کا اتمام کیا جائے گا، خواہ مسافر ہی ہو

اور اگر بوجہ مسئلہ اس کے خلاف جاننے کے ایسے مقام پر قصر ہی پڑھتا رہا تو کیا اعادہ ضروری ہوگا حالانکہ یاد نہیں کہ کتنی نمازیں ایسی پڑھی گئیں؟

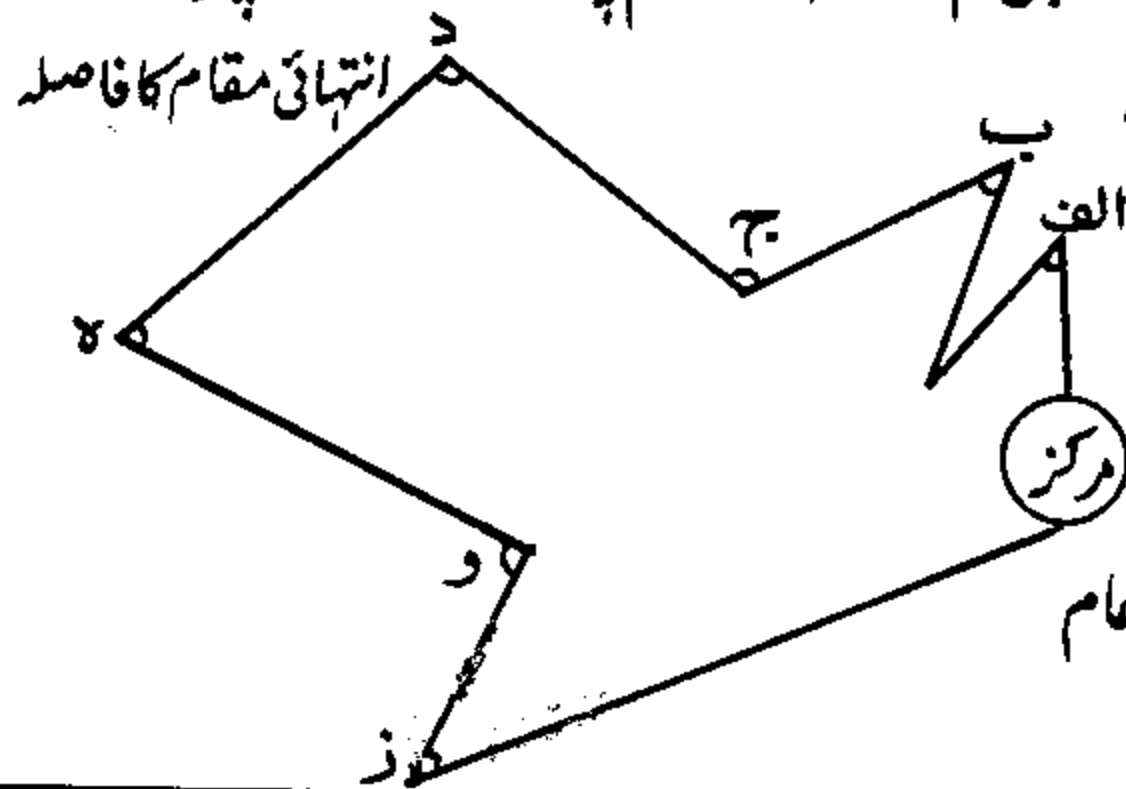
(۲) اگر زوجہ کسی ایسے مقام پر مقیم ہو جو نہ اس کا وطن ہو نہ اس کے شوہر کی جائے ملازمت ہو تو اس جگہ کا کیا حکم ہے؟

(۳) اگر زوجہ اپنے ماں باپ کے پاس گئی، اور وہ مقام ماں باپ کا وطن نہیں ہے، مگر ماں باپ وہاں مقیم ہیں تو اگر شوہر وہاں عارضی طور پر بحیثیت مسافر کے جائے تو وہ قصر کرے یا نہیں، اور اگر وہاں زوجہ بھی موجود ہو مگر وہاں اس کا مستقل قیام نہیں بلکہ بطور مہمان کے گئی ہے تو اس صورت میں شوہر مسافر قصر کرے یا اتمام؟

(۴) کیا زوجہ کے وطن میں بحالت عدم موجودگی زوجہ بھی یا بحالت موجودگی زوجہ جبکہ خود اس کا قیام مسافرانہ ہو مسافر شوہر اتمام کرے؟

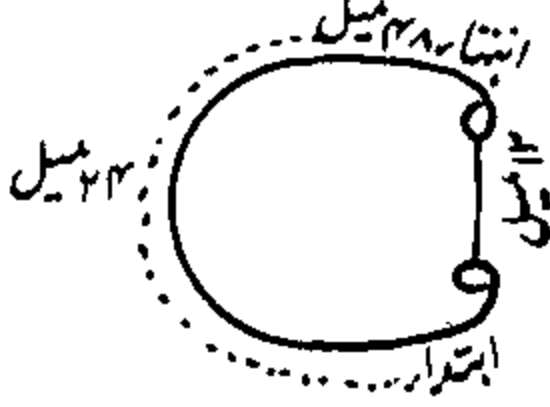
(۵) دورہ میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر مقامات دورہ تجویز کئے جاتے ہیں، اس صورت میں مجموعی مسافت کا اعتبار ہوگا یا صرف اس مقام کو جہاں کا فاصلہ مرکز سے بہ نسبت دیگر مقامات دورہ کے سب سے زیادہ ہو منتهی سفر کا سمجھا جائے گا، اور جہاں سے فاصلہ کم ہوتا شروع ہو جائے وہ سفر واپسی سمجھا جائے گا، اور اس کا اعتبار نہ کیا جائے، نیز اگر صورت دورہ اس طرح ہو جس میں مرکز سے چل کر مرکز ہی پر ٹوٹنے کا ارادہ ہے، اور کل مجموعہ مسافت مرکز سے مرکز تک ۲۸ میل ہو، اور درمیان میں جتنے مقامات ہیں وہ سب مقصود ہیں، قریب کا بھی ارادہ ہے بعید کا بھی تو اس صورت میں قصر ہوگا یا نہیں؟

(۶) صورت مذکورہ نمبرہ میں اگر اس طرح مقامات دورہ تجویز کئے جائیں کہ کبھی تو مرکز سے زیادہ فاصلہ کے مقام پر پہنچے، اور کبھی کم فاصلہ کے مقام پر اور اس کے بعد پھر دور کے فاصلہ پر جس طرح کہ حسب ذیل نقشہ



میں دکھلایا گیا ہے اس کا کیا حکم ہے؟ اور آیا مرکز سے کسی مقام کی مسافت بخط مستقیم محسوب کی جائے گی، خواہ راستہ عام بخط مستقیم نہ ہو، بہر صورت؟

(۷) اگر ایک مقام براہ راست توجہ مسافت پر نہیں ہے مگر پھر کھا کر جاتا ہے، اور جس رستہ سے جاتا ہے اس سے مقدار مسافت قصر پر ہے تو کیا حکم ہے، مثلاً یہ صورت ہے جو ذیل میں دکھلائی گئی، یعنی براہ راست تو صرف بارہ میل اور چکر کھا کر $۲۲ + ۲۲ = ۴۴$ میل (۸) امام مسافر ہے، لیکن مسافر مقتدی کو امام کا مسافر ہونا نہیں معلوم تھا، اس لئے اس نے چار کی تو کیا وہ پوری چار پڑھے یا امام کے ساتھ دو رکعت ہی پر سلام پھیر دے؟



الجواب؛ قال فی البحر عن المحيط لو کان له اهل بانکوفة واهل بالبصرة ولقی له دور وعقار بالبصرة قبل البصرة لا تبقى له وطناً لانها انما كانت وطناً بالاهل لا بالعقار الا ترى انه لو تاهل ببلدة لم یکن له فیها عقار صارت وطناً له وقیل تبقى وطناً لانها كانت وطناً بالاهل والدار جمیعاً فبزوال احدهما لا یرتفع الوطن کوطن الاقامة یبقى ببقاء الثقل وان اقام بموضع اخر (ص ۱۳۲) الى ان قال وفي المجتبى نقل القولین فیما اذا نقل اهلہ ومتاعه ولقی له دور وعقار ثم قال وھذا جواب واقعة ابتلینا بہا وکثیر من المسلمین المتوطنین بالبلاد ولھم دور وعقار فی القرى البعیدة یصیفون بہا باھلھم ومتاعھم فلا بد من حفظھما انھما وطنان له لا یبطل احدهما بالآخر اھو فی السراجیة اذا دخل المسافر بلدة له فیھا اهل صار مقيماً نوى الاقامة اولاً (ص ۱۳۲ ج ۱)

ان جزئیات سے خصوصاً مجتبى کے جزئیہ سے معلوم ہوا کہ جس مقام پر انسان مع اہل و عیال کے مقیم ہو گو قیام عارضی ہو کہ زمانہ صیفت ہی میں وہاں قیام کرتا ہو وہ اس کا وطن ہو جاتا ہے، اور جب تک وہاں اہل و عیال مقیم رہیں گے وطن رہے گا، تنہا اس کے سفر سے وہ وطن باطل نہ ہوگا، جب تک وہاں سے اہل و عیال کو منتقل نہ کرے، پس صورت مسئلہ میں جائے ملازمت پر جب اہل و عیال مقیم ہیں وہاں نماز کامل پڑھنا چاہئے، اور چونکہ مسئلہ مجتہد فیہا ہے، اس لئے اس سے پہلے جن نمازوں میں فتویٰ آخر کی وجہ سے قصر کیا گیا ہے اُن نمازوں کا اعادہ واجب نہیں، فان العامی مکلف بما افتاء بہ عالم و طاعاۃ علی قولہ صحیحہ کما ہوا الظاہر،

(۲) شوہر اس حالت میں قصر کرے، کیونکہ مجرد اقامت اہل توطن کو مستلزم نہیں بلکہ

یا تو رہ جگہ بیوی کا وطن ہو اور بیوی وہیں رہتی ہو، یا شوہر نے مع اہل و عیال وہاں اقامت کر رکھی ہو اور اس کو اپنے اہل و عیال کا مسکن بنایا ہو خواہ عارضی ہی ہو، صرف بیوی کے عارضی قیام سے وہ جگہ شوہر مسافر کے لئے موجب اتمام نہ ہوگی و دلیل الاول ثانی شرح المنیۃ لوتزوج المسافر ببلد ولم یزوالا قامتہ بہ فقیل یصیر مقيماً و هو الاوجه لما مر من حدیث عثمان انی تاهلت بمكة منذ قدمت وانی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من تاهل ببلد فلیصل صلوۃ المقيم ام ای من تاهل ببلد وافر اهلہ لا بدلیل قصرہ صلی اللہ علیہ وسلم وازواجه بمكة مع انه تزوج بمكة ولكن لم یقر اهلہ بہ واما عثمان فقد کان له اهل بمكة مقيم لها فصار بہما مقيماً بمكة كلما اتی بہما وان لم یزوالا قامتہ بنفسہ بل كانت الاقامة له بہما حواماً لكونہ مہاجرًا،

(۳) اگر بیوی اپنے وطن میں نہیں رہتی بلکہ شوہر کے پاس رہتی ہے تو شوہر اور بیوی دونوں بحالت سفر وہاں قصر کریں گے، بدلیل قصرہ صلی اللہ علیہ وسلم و اہلہ بمكة،

(۴) اس کا جواب وہی ہے جو اوپر گزرا، قال فی شرح المنیۃ ولو کان له اهل ببلد تین فایتھما دخلھا صار مقيماً وان ماتت زوجته فی احدھا وبقی له فیھا دور و عقار قیل لا تبقی و طنا اذ المعتبر الا اهل دون الدار كما لو تاهل ببلدة واستقرت سکنی له و لیس له فیھا دور و قیل تبقی ام، اس سے معلوم ہوا کہ محض تزوج ببلدة یا اقامت اہل ببلدة موجب اتمام نہیں، بلکہ اس کے ساتھ استقرار سکونت زوجین بہا یا استقرار زوجہ و حد ہا شرط ہے، اور صورت مسئلہ میں استقرار سکونت نہیں ہے، نہ زوج کے لئے نہ زوجہ کے لئے، بخلاف جائے ملازمت کے کہ وہاں استقرار سکونت ہے، کیونکہ وہاں زوج مکان کرایہ پر لیتا اور اسباب تعیش خانہ داری کے لئے ہیا کرتا ہے، پس وہ نظیر اس جزئیہ کی ہے، جو مجتبیٰ سے اوپر نقل کی گئی ہے، وہاں پہنچ کر زوج مسافر مقيم ہو جائے گا، جبکہ وہاں شوہر کے اہل و عیال مقيم ہیں، اور اس مسئلہ میں مالکیہ بھی ہمارے موافق ہیں، اور حضرت عثمانؓ کے واقعہ سے وہ بھی احتجاج کرتے ہیں، قال سحنون فی المدونة وقال مالک فی من خرج من ارضیۃ یریب بمكة وله بمصر اهل فاقام عند ہم صلوۃ واحدة انه یتمھا قال ابن القاسم قلت لما لک الرجل

المسافر یبرقریۃ من قراۃ فی سفرۃ وهو لا یرید ان یتیم بقریۃ یتہ تلك الا یومہ
ولیلته وفيہا عبیدۃ وبقریۃ وجواریہ ولس لہ بہا اهل ولا ولد قال یقطع الصلوٰۃ
الا ان یكون نوى ان یتیم بہا او یكون فیہا اهل وولد فان کان فیہا اهل وولد
اتم الصلوٰۃ، قلت ارایت ان كانت هذه القریۃ التي فیہا اهل وولد مرفی سفر وقد
هلك اهلہ وبقی فیہا ولدۃ اتیم الصلوٰۃ ام یقصر قال یقصر قال انما حمل
هذا رای القصر بعد هلاك الالہ عند ما لك اذا كانت رالقریۃ بعد هلاكها
مستأله اتم الصلوٰۃ وان لم تكن مستأله اتم الصلوٰۃ ام یقصر، واما قبل هلاكها ففی مستأله البتہ
فان مسكن المرأة مسكن لہ كما دل علیہ حدیث عثمان واتمامہ بمعنی والله
تعالی اعلم

(۶۵) قصر میں اعتبار اس مقام کا ہے جس کی نیت سے اس نے جائے اقامت خارج
کیا ہے، پس صورت مسئلہ میں جو شکل بنائی گئی ہے اگر سائل نے مرکز سے سفر کرتے ہوئے
یہ نیت کی ہے کہ وہ مقام نہ پر جائے گا، مگر اپنی سہولت کے لئے اُس نے مقام نہ کا راستہ
اختیار کیا کہ مقام الف و ب و ج و د و ہ و و پر گزرتا ہو جائے، اور اس رستہ سے مقام نہ
مرکز سے مسافت قصر ۴۸ میل یا تین دن کی مسافت پر ہی، تو اس کو نماز قصر کرنا چاہئے بشرطیکہ
تین دن کی مسافت طے کرنے سے پہلے مرکز پر درمیان میں ٹوٹنے کا ارادہ نہ ہو، پس اب اس شخص
پر خروج من عمارۃ موضع اقامتہ قاصداً ميسرة ثلاثۃ ايام صادق آگیا، اور یہی مدار ہے تحقق
سفر کا اور چونکہ اس کا ارادہ ابتداء ہی سے مقام نہ پر پہنچنے کا ہے، اس طرح کہ الف، ب،
ج، د، ہ، و، کو اس کے لئے طریق بنائے تو یہ کہنا مشکل ہے کہ منہتائے سفر وہ مقام ہے
جس کا فاصلہ مرکز سے سب سے زیادہ ہے، یعنی مثلاً د اور اس کے بعد ہ اور و کو سفر
والپی کا سفر بنایا جائے، بلکہ سفر والپی اس وقت شروع ہوگا جبکہ وہ نہ سے مرکز کا ارادہ
کرے گا، جو اس کے ارادہ میں منہتائے سفر ہے، البتہ اگر یہ شخص مرکز سے چلتے ہوئے مقام نہ
کا براہ الف و ب و ج و د و ہ و و قصد نہ کرے، بلکہ مقام د کا قصد کرے جو کہ ۱۸ میل نہیں ہو
اور وہاں سے براہ ہ و و نہ مرکز پر ٹوٹنے کا قصد کرے، تو چونکہ مرکز سے چلتے ہوئے اس نے

عہ و ہوں لاف لما قال فی شرح المنیۃ اولاً ان المحتر الاہل دون الدار و ہوا لوجہ ۱۲ منہ

مسافر کا ارادہ نہیں کیا، اس لئے مسافر نہ ہوگا، پس اس کو یہ مسافر خود دیکھ لے کہ اس کی نیت مرکز سے چلتے ہوئے مقام تک پہنچنے کی ہے، اور وہاں سے عود الی مرکز کا قصد ہے، یا مقام تک پہنچنے کی ہے اور وہاں سے عود الی مرکز کا قصد ہے،

صورت اولیٰ میں جو جواب یہاں دیا گیا ہے، وہی امداد الفتاویٰ ص ۸۵ ج ۱ میں مرقوم ہے۔
قال فی الدرر المسافر من خرج من عمارۃ موضع اقامتہ قاصداً سیرۃ ثلاثۃ ايام ولیا لیہا بالسیر الوسط مع الاستراحات المعتادۃ ولو لموضع طریقان احد ہما مدۃ السفر والاخر اقل قصر فی الاول دون الثاني ام (ص ۸۲ و ۸۳)
قلت فمن خرج من مرکزہ قاصداً موضع نزجیث یجعل مواضع الا لفت و الباء والجیم والدال والهاء والواو طریقاً لہ فقد صدق علیہ انه خرج من موضع اقامتہ قاصداً سیرۃ ثلاثۃ ايام ولا یجعل راجعاً الی المکن قبل بلوغہ موضع نز لکونہ منتمی سفرہ فی قصدہ وانما یجعل راجعاً اذا خرج من موضع نز فان رجع من طریق التي جاء منها قصر حتماً وان رجع من طریق اقل قصر ایضاً حتی یدخل عمران مرکزہ هذا ما علمتہ واللہ تعالیٰ اعلم، اور نیت واپسی کی تحقیق بظاہر یہ ہے کہ جو مقام ارادۃ مسافر میں منتهی سفر ہے وہاں سے وطن یا مرکز اقامت کا قصد کرنا نیت واپسی ہے، پس جب تک منتهی سفر سے بارادۃ وطن یا مقام اقامت نہ لوٹے اس وقت تک رجوع کا تحقق نہ ہوگا نہ اس کو راجع کہا جاسکا،
ہذا ما فہمہ ولم ارہ صریحاً ولا رجوعاً وجران التصریح بہ،

(۲) اس صورت میں بھی قصر لازم ہوگا، فان العبۃ للطریق التي سلکها ولو کان اختار السلوک فیہ بلا غرض صحیح خلافاً للشافعی کما فی البدائع شامی (ص ۸۲ ج ۱)
وقد مرقول الدرر ولو لموضع طریقان احد ہما مدۃ السفر والاخر اقل قصر فی الاول دون الثاني ام، اس کی مثال یہ ہے کہ تھانہ بھون سے دیوبند براہ راست ۲۱ کوس ہے اور براہ ریل مسافت قصر ہے، پس براہ ریل تھانہ بھون سے دیوبند جانے والا قصر کرے گا، اور یہ نہ کہا جائے گا کہ سہارنپور سے چل کر اب سفر واپسی شروع ہو گیا، کیونکہ سہارنپور انتہائی فاصلہ کا مقام ہے، اور اب سہارنپور سے دیوبند کی طرف جوں جوں قریب ہوں گے تھانہ بھون سے قرب ہوتا جائے گا، مثلاً ناگل جو درمیان دیوبند و سہارنپور ہے تھانہ بھون سے براہ راست

۵ اکوس ہے، سو اس کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ سہارنپور سے دیوبند جاتے ہوئے بھی یہ سفر ہی کر رہا ہے، واپسی نہیں کر رہا، گو اس کا قصد دیوبند سے تھانہ بھون براہ راست ہی آنے کا کیوں نہ ہو، اس مثال سے صورت سابقہ (نمبر ۵ د) کی بھی وضاحت ہوگئی، کہ جو شخص مرکز سے مقام تہ کا قصد کر کے چلا ہے وہ مقام تہ پر پہنچنے سے پہلے راجح نہیں ہے گو مسافت مقام ۵ سے چل کر کم ہوتی جائے، اور اگر کوئی شخص تھانہ بھون سے سہارنپور کا قصد کر کے چلا، اور اس کا ارادہ یہ ہے کہ سہارنپور سے واپس تھانہ بھون اس طرح ہوگا کہ سہارنپور سے دیوبند جا کر دیوبند سے براہ راست براہ پیادہ آئے تو یہ شخص مسافر نہیں کیونکہ تھانہ بھون سے سہارنپور مسافت قصر نہیں، اور سہارنپور سے براہ دیوبند جو واپسی ہے وہ بھی مسافت قصر نہیں، اس لئے اتمام کرے گا، یہ اس کی مثال ہے جو جواب سابق میں مرکز سے بقصد چلنے کی اور وہاں سے براہ کا دو دوتا مرکز پر واپس ہونے کے مرکوز ہے، فافہم، رہی یہ صورت کہ کوئی شخص مرکز سے مرکز ہی کی طرف خود کرنے کے ارادہ سے سفر شروع کرے، اور بصورت دائرہ سفر کرے، مثلاً  مرکز، اور درمیان میں جتنے مواضع ہیں وہ سب مقصود ہیں اور مرکز سے مرکز تک ۴۸ میل کی مسافت ہے، تو اس صورت میں یہ شخص مسافر نہ ہوگا، کیونکہ یہ خروج من عمارۃ البلد کے وقت مسافت قصر کا قاصد نہیں، اس لئے کہ مسافت قصر کا تحقق مرکز سے علاوہ نہیں، بلکہ مرکز کو داخل مسافت کر کے مسافت قصر کا تحقق ہوگا اور اس سے سفر کا وجود نہیں ہو سکتا، بلکہ وجود سفر کے لئے یہ لازم ہے کہ مقام اقامت سے نکل کر اس کے علاوہ کسی ایسے مقام کا قصد ہو کہ اس میں اور مقام اقامت میں مسافت ۴۸ میل کی ہو، اس رستہ سے جس کو اس نے اختیار کیا ہے، گود و سرے رستہ سے مسافت کم ہو، اب اگر مقام اقامت سے علاوہ مسافت قصر نہیں تو یہ مقیم ہوگا اور اس سے علاوہ ۴۸ میل ہو تو مسافر ہوگا، قال مالک فی الرجل ینور فی القری ولیس بین منزله و بین اقصاھا اربعۃ برد و فیما یدور من دورۃ اربعۃ برد و اکثر قال اذا کان فیما یدور فیہ ما یكون اربعۃ برد قصر للصلوٰۃ اھ مد ونہ مالک (ص ۱۱۳) قلت وقواعدنا توافقہ کمالا یخفی،

(۸) جس وقت امام نے خود در رکعت پر سلام پھیرا اگر مسافر مقتدی کو معایہ خیال آگیا کہ امام مسافر ہے اور اس کے مقیم ہونے کا اور سہواً دو رکعت پر سلام پھیرنے کا شبہ نہیں ہوا

جب تک کسی خاص گاؤں یا قصبہ میں اقامت کی نیت نہ کرے اس طرح کہ رات کو وہیں ٹوٹ آؤ گودن میں اور جگہ پھرتا رہے،

فصل فی الجمعة والعیدین

سوال (۱) ایک موضع ہے جس میں چار مسجدیں ہیں اور اس میں بہت سے گاؤں میں جمعہ کا حکم قسم کے لوگ آباد ہیں، اور بعض ضرورت کی چیزوں کی دکانیں بھی ہیں مگر ترتیب بازار اور شہر کی نہیں، جیسا دیہاتوں میں دکان رکھنے کا دستور ہے، موضع خود ایک بڑا موضع ہے، اس کے علاوہ چھ موضع اور چھوٹے چھوٹے موضع مذکور کے متعلق ہیں، سب موضعوں کی جمعہ اس بڑے موضع کے مردم شماری غالباً دو ہزار کی ہے، آیا ایسی جگہ یعنی اس بڑے موضع میں باعتبار مذہب حنفیہ جمعہ ہو سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب؛ اس موضع میں بحالت مذکورہ جمعہ صحیح نہیں ہو سکتا،

غیر عربی میں خطبہ دینے کے مسئلے میں امداد الفتاویٰ سوال (۲) بہشتی گوہر میں ہے کہ خطبہ علاوہ اور بہشتی گوہر کی عبارتوں میں تطبیق ؛ ؛ ؛ خطبہ عربی کے پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اور فتاویٰ اشرفیہ حصہ اول میں ہے کہ عربی کے علاوہ دوسری زبانیں بھی جائز ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے، صحیح کونسی عبارت ہے؟

الجواب؛ قال فی الدرکما صح لوشرع بغیر عربیۃ ای لسان کان الی ان قال وشرطا عجزہ وعلی هذا الخلاف الخطبة وجميع اذکار الصلوٰۃ اھ یعنی غیر القراءۃ فان العجز شرط فیہما اجما کما نص علیہ فی الدر فیما بعد قال الشامی قوله وشرطا عجزہ ای عن التکبیر بالعربیۃ والمعتمد قوله طاه وفيہ ایضا لکن سیاتی کراہۃ الدعاء بالاعجمیۃ اھ (ص ۵۰۴ ج ۱) وفيہ (ص ۵۲۲ ج ۱) والظاهر ان الصلۃ عندہ لا تنفی الکراہۃ اھ،

اس سے معلوم ہوا کہ امام صاحب کے نزدیک قرآن کے علاوہ بقیہ اذکار جن میں خطبہ بھی داخل ہے بلا عجز کے بھی جائز ہیں، اور صاحبین کے نزدیک اگر عربی سے عاجز ہو تو جائز ورنہ نہیں، اور طحاوی نے امام صاحب کے قول کو معتمد قرار دیا ہے، مگر فصل دعاء میں علامہ شامی نے تصریح کی ہے کہ امام صاحب کے نزدیک جواز وصحت کراہت کے منافی نہیں

پس قادر بالعربی کے لئے خطبہ عجمی میں جائز مگر مکروہ ہی یہی صحیح ہے، پس بہشتی گوہر اور فتاویٰ اشرفیہ کی عبارت میں منافات نہیں، فتاویٰ میں جواز سے مراد صحت ہی، وہو المعتمد کما قالہ الامام، مگر صحت کراہت کے منافی نہیں، ۲۷ ربیع الثانی مسئلہ ۴

جمعہ کی نماز کے بعد احتیاط النظر | سوال (۳) بہشتی گوہر میں مسئلہ ہے کہ بعض لوگ جمعہ کے پڑھنے کا حکم بعد نظر احتیاطی پڑھا کرتے ہیں، ان کو منع کرنا چاہئے، یہ

کس حالت میں شرائط صحیح ہونے کی صورت میں یا عدم شرائط کی صورت میں؟

الجواب: اگر شرائط صحت موجود ہیں تب تو نظر احتیاطی کی ضرورت نہیں اور اگر شرائط صحت موجود نہیں تو جمعہ پڑھنا جائز نہیں نظر ہی پڑھنا جماعت کے ساتھ واجب ہے، اس لئے نظر احتیاطی سے ہر حال میں منع کیا جاوے، واللہ اعلم، ۳ رمضان مسئلہ ۴

گاہوں میں جمعہ صحیح | سوال (۴) چند مسئلے حسب ذیل ہیں امید کہ جواب باصواب فرمایا جائے، انہ ہونے کا بیان

اولاً یہ کہ وہ کون سی دلیل دربارہ جواز جمعہ فی القرئی حضرات شوافع و حنابلہ وغیرہم کی ہے، جس کی وجہ سے بجز امام ابو حنیفہ کے یہاں تک کہ غالباً ان کے شاگردوں کا بھی یہی مذہب ہی، کہ ہر قریہ صغیرہ و کبیرہ میں جمعہ بلا غدغہ و خرنخشہ ہو سکتا ہے، اور

شرائط جو جماعت کے شافعیہ اور مالکیہ وغیرہ کے نزدیک لگائی گئی ہیں، کہ چالیس پچاس کم اگر آدمی ہوں تو جمعہ نہیں ہو سکتا، یہ تعداد کس حدیث سے ثابت کرتے ہیں، اور اگر کوئی

حنفی المذہب علی الخصوص مسئلہ جمعہ میں شافعیہ وغیرہ کے مسئلہ پر متفق ہو کر وجوب جمعہ فی القرئی کا عام اس سے کہ صغیرہ ہو یا کبیرہ قائل ہو اور ادا بھی کرے تو کیا عند اللہ ماخوذ و آثم ہو گا یا نہیں

اور حنفیہ کے نزدیک کوئی ایسی دلیل دیکھی نہیں جاتی جس سے صریح مانعت ادا سے جمعہ فی القرئی کی پائی جائے، اور ادھر ایک حدیث غالباً صحیح بخاری کی ہے مجھے بخوبی یاد نہیں

وہ یہ کہ ”الجمعة علی کل مسلم و قریۃ“ ہر حال آپ تو ضرور واقف ہوں گے، شاہ ولی اللہ صاحب حجة اللہ البالغہ میں اپنی دلیل میں اسی کو پیش فرما کر فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک جس جگہ جماعت

کثیر ہو جمعہ پڑھنا چاہئے، اگرچہ حدیث ضعیف ہی کیوں نہ ہو، اور دوسرے اس وقت دور آخر میں جناب مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے اپنی رسالہ فیوض قاسمیہ میں بہت بسط کے ساتھ

غالباً تین ورق تک ایک خط کے جواب میں عبارت فارسی جمعہ کی ادائیگی کے لئے ایک پُر زور تقریر تحریر فرمائی ہے، جس میں حنفیہ کو متعصب کا لفظ بھی فرمایا ہے، اور انھوں نے

گاؤں کے لوگوں کی رائے سے امام بنا کر جمعہ پڑھتے اور ادا ہونے کے لئے فرمایا ہے، آپ کے علوم ظاہری و باطنی سے غالباً ہر کس و ناکس اور نہ کہ ذی علم واقف نہ ہو، ملاحظہ فرمائیے فیضِ قافی اور ایسی ہی تقریر مولانا مولوی بحر العلوم صاحب لکھنوی نے بھی ایک چھوٹے سے رسالہ غالباً ارکانِ اربعہ میں عربی الفاظ کے ساتھ تحریر فرمایا ہے، مجھے عبارت بخوبی یاد نہیں، غرض کہ بہت سے احناف کا یہ مذہب ہے کہ جمعہ دیہات میں ہونا چاہئے، اور پڑھتے بھی ہیں، ان علماء کو میں کہتا ہوں جن کی گنتی اہل علم کے نزدیک بڑے ہونے کی کی جاتی ہے، اور پھر بھی تعریفِ مصر میں بہت بڑا اختلاف ہے، اور اس وقت بعض شرائط بھی نہیں پائے جاتے، تو جب چھ شرائط میں سے کوئی مفقود ہو تو پھر جمعہ کا وجوب اور ادائے جمعہ کے کیا معنی، چنانچہ بادشاہ یا نائب بادشاہ کا منجملہ شرائط میں سے ایک شرط وجوب ادا کے لئے ضروری ہے، مگر ہندوستان بھر میں بالکل یہ شرط عنقا صفت ہے، پھر اس کے نہ پائے جانے پر جمعہ جو لوگ شہروں میں ادا کرتے ہیں تو کیا جمعہ ادا ہوتا ہے، غالباً اسی وجہ سے لوگوں نے احتیاطِ الظہر کے مسئلہ کے جواز کا فتویٰ دیا ہے، مگر قریب قریب ہر ایک میں خدشہ لازم آتا ہے، اور دلائل ایک نہ ایک وجہ سے جرح پذیر ہیں، بہر حال لٹفلہ دربارہ تحقیق جمعہ فی القرنی و تحقیق شرائط و تعریفِ مصر کسی براہین قاطعہ و ساطعہ کے ساتھ تحریر فرمائیے تاکہ چاہِ شکوک سے نکل کر کنارہ یقین پر فائز المرام ہوں، بینوا تو جسروا،

الجواب؛ حنفیہ کے نزدیک صحتِ جمعہ کے لئے مصر شرط ہے، امام صاحب اور ضیاء سب اس میں متفق ہیں، باقی ائمہ کا اختلاف ہے، پس سائل کا یہ کہنا ”یہاں تک کہ غالباً اُن کے شاگردوں کا بھی یہی مذہب ہے کہ ہر قریہ صغیرہ و کبیرہ میں جمعہ بلا دغدغہ و خرخشہ ہو سکتا ہے“ الخ بالکل غلط ہے، صاحبینِ قریہ صغیرہ میں جمعہ کو ہرگز جائز نہیں کہتے، حنفیہ کی دلیل یہ حدیث ہے: *روی عبد الرزاق فی مصنفہ أخبرنا معمر عن ابی اسحق عن العاصم عن علی رضی اللہ عنہ قال لا جمعة ولا تشریق الا فی مصر جامع عمدة القاری (ص ۲۶۲ ج ۳) فان قلت فیہ العارث الاعور وقد کذب الشیخی وغیرہ قلت قد وثقه ابن معین وغیرہ، ففی تمذیب لہمذیب ج ۲ ص ۱۲۶ و قال الاوری عن ابن معین العارث قد سمع من ابن مسعود و لیس بہ باس و قال عثمان الدارمی عن ابن معین ثقة ام و فیہ ایضاً ص ۱۲ ج ۲ و قال*

ابن ابی خنیسہ قیل لیجی محتج بالحارث فقال ما زال المحدثون یقبلون حدیثه
وقال ابن عبد البر فی کتاب العلم له لما حکى عن ابراهيم انه کذب الحارث
اظن الشعبي عوقب بقوله فی الحارث کذاب ولم یبین من الحارث کذب به
وانما انتقم علیه افراطه فی حب علی وقال ابن شاهین فی الثقات قال احمد
بن صالح المصری الحارث الاعور ثقة ما حفظه وما احسن ما روى عن علی و
اشنی علیه قیل له فقد قال الشعبي کان یکنب قال لم یکن یکنب فی الحدیث
انما کان کذب به فی رایه وقرأت بخط الذهبی فی المیزان والنسائی مع تعنته فی
فی الرجال قد احتج به والجمهور علی توهینه مع روایتهم لحدیثه فی الآباء
وهذا الشعبي یکنب به ثم یروی عنه والتظاهر انه یکنب حکایاته لانی الحدیث
اه فظهر بذلك ان الحارث لیس من اجمع علی ضعفه بل هو مختلف فیه ثقة
بعضهم والاختلاف فی التوثیق لایضر فان رجال الصحیحین ایضاً لا یخلون من
کلام، قال فی عمدة القاری وروی ایضاً بسند صحیح حدثننا جریر عن منصور عن طلحة
عن سعد بن عبیدة عن ابی عبد الرحمن انه قال قال علی رضی الله عنه لا جمعة
ولا تشریق الا فی مصر جامع ام ص ۲۶۲ ج ۳ وفی الدراية لابن حجر وروی
عبد الرزاق عن علی موقوفا لا تشریق ولا جمعة الا فی مصر جامع واستادهم ام ص ۱۳
اس تحقیق سے یہ امر واضح ہو گیا کہ اس حدیث کے دو طریق صحیح ہیں، اور ایک طریق میں حارث اعور
ہے، وہ بھی اگر صحیح نہیں تو حسن ضروری، اور ایک طریق ابن ابی شیبہ کے نزدیک اور ہے؛
حدثننا عباد بن العوام عن حجاج عن ابی اسحق عن الحارث عن علی قال لا جمعة
ولا تشریق ولا صلوة فطر ولا اضحی الا فی مصر جامع او مدينة عظيمة ام
نصب الراية ج ۱ ص ۳۱۳، وفیه الحجاج بن ارطاة مختلف فیه وثقة الثوری
وقال البوطالب عن احمد کان من الحفاظ وقال البزار کان حافظاً مدلساً وکان
معجباً بنفسه وکان شعبة یثنی علیه ولا اعلم احداً المیر وعنه یعنی من
لقیه الا عبد الله بن ادريس ام کذا فی تہذیب التہذیب ص ۱۹۶ و ۱۹۷ و ۱۹۸ ج ۲
وقال ابن القیم فی زاد المعاد وحدیثه لا ینزل عن درجة الحسن ما لم یتفرد بشیء
او یخالف الثقات ام قلت وهذا لیس بما تفرد به واقفه الثقات فی معنی

مارواه فهو حسن وفي عمدة الرعاية وصححه ابن حزم في المحلى ۱۵، رہا یہ اعتراض کہ یہ حدیث موقوف ہو مرفوع نہیں، اس کا جواب اصول حدیث جاننے والے پر ظاہر ہے کہ قول صحابی مالا یدرک بالقیاس میں حکماً مرفوع ہوتا ہے قال السیوطی فی تدْرِیب الراوی ص ۶۳ ومن المرفوع ایضاً ما جاء عن الصحابی ومثله لا یقال من قبل الراعی ولا مجال للاجتهاد فیہ فیحصل علی السماع جزم بہ الرازی فی المحصول وغیرہ واحد من اثمۃ الحدیث ۱۵، اور ظاہر ہے کہ صحت جمعہ و فطر واضحی کے لئے حضرت علیؑ کا ایک ایسی شرط لگانا جو دوسری نمازوں کے لئے نہیں ہے، محض رائے اور قیاس سے ممکن نہیں، پس یہ بھی قاعدہ محدثین پر مرفوع میں داخل ہے، دوسری دلیل حنفیہ کی یہ ہے کہ خروج البخاری عن عروۃ عن عائشۃ رضی اللہ عنہا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قالت کان الناس یتتابون الجمعة ویروى یتناوبون، من منازلهم والعوالی فیأتون فی الغبار یصیبهم الغبار والعرق فیخرج منهم العرق فأتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسان منهم وهو عندی فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لو انکم تطہرتم لیومکم هذا الحدیث، اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا نماز جمعہ کے لئے عوالی وغیرہ سے نوبت بہ نوبت آنا ثابت ہوا جس سے صاف ظاہر ہے کہ گاؤں والوں پر جمعہ واجب نہیں ہے اور نہ گاؤں میں جمعہ ادا ہوتا ہے ورنہ جو لوگ عوالی میں رہتے تھے ان کو وہیں ادا سے جمعہ کا حکم ہوتا یا ان سب کو مدینہ آنا واجب ہوتا، حالانکہ عوالی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کسی وقت کسی جگہ کبھی جمعہ ہونا ثابت نہیں ہوتا،

اور تیسری دلیل حنفیہ کی یہ ہے کہ حضرات صحابہ نے فتح و بلاد کے ساتھ منابر اور مناسک جامعہ کی تعمیر امصار میں ہی کی تھی، کسی گاؤں میں ہرگز صحابہؓ نے منبر اور جامع مسجد تعمیر نہیں کی، اگر ایسا ہوتا تو اس کی ضرورت احادیث میں کوئی اصل ملتی، ومن ادعی فعلیہ البیان قال المحقق ابن الہمام فی الفتح انه لم یقل عن الصحابة انهم حين فتحوا البلاد واشتغلوا بنصب المنابر والجمع الا فی الاملاک والقری ولو کان لنقل ولو احاداً ۱۵، لہذا ان دلائل سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ حنفیہ کے پاس اس مسئلہ میں دلیل نقلی صحیح و عقلی قوی موجود ہے، پس کسی حنفی المذہب کو چھوٹے گاؤں میں جمعہ کی نماز پڑھنا جائز نہ ہوگا، اور یہ جو سائل نے لکھا ہے کہ ادرہ یعنی امام شافعی وغیرہ کی نظر

... ایک حدیث غالباً صحیح بخاری کی ہے مجھے بخوبی یاد نہیں وہ یہ ہے "الجمعة علی کل مسلم وقریۃ" سو یہ الفاظ کسی حدیث کے نہیں، سائل کو حدیث نبوی کی نقل میں اٹکل پتھر لکھنے سے احتراز واجب تھا، بدون خود الفاظ دیکھے ہوئے یا کسی عالم سے پوچھے ہوئے غلط سلاط الفاظ لکھنا اس کو جائز نہ تھا، بخاری میں جو حدیث شافعیہ وغیرہ کی دلیل ہے وہ یہ ہے عن ابن عباسؓ قال ان اول جمعة جمعت بعد جمعة فی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مسجد عبد القیس بجواتی من البحرین، اس سے بعض ائمہ نے جوازِ جمعہ فی القریۃ پر استدلال کیا ہے، مگر اس استدلال کا تمام ہونا اس پر موقوف ہے کہ پہلے جواتی کا گاؤں ہونا ثابت کیا ہو، حالانکہ اب تک یہ بات ثابت نہیں ہو سکی، جن لوگوں نے جواتی کو گاؤں کہلایا ہے ان کی دلیل صرف یہ ہے کہ بعض روایات میں اس کی نسبت قریۃ من البحرین کا لفظ آیا ہے لیکن یہ دلیل کافی نہیں، کیونکہ اول تو لفظ قریۃ کا اطلاق لغت عرب میں عام ہے، شہر کو بھی قریۃ کہہ دیتے ہیں، چنانچہ خود قرآن میں ہے وقالوا لولا نزل هذا القرآن علی رجل من القریۃین عظیم، مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس آیت میں قریۃین سے مکہ و طائف مراد ہیں، پس ممکن ہے کہ جواتی شہر ہو جس کو معنی لغوی عام کی بناء پر قریۃ کہہ دیا گیا ہو، اور اس احتمال کی تائید ان اقوال سے ہوتی ہے، بحلی ابن التین عن الشیخ ابی الحسن انما مدینة و فی الصحاح للجوهری والبلدان لنا فخری جواتی حصن من البحرین وقال ابو عبید البکری ہی مدینة بالبحرین لعبد القیس، ص ۲۶۳، عینی علی البخاری، ان اقوال سے جواتی کا شہر ہونا معلوم ہوتا ہے، پس دیگر ائمہ کا استدلال ساقط ہے، اور اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ جواتی گاؤں ہی تھا، اور وہاں صحابہؓ نے جمعہ پڑھا تو پھر بھی اس حدیث سے استدلال کرنا اس پر موقوف ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کے اس فعل کی اطلاع بھی ہوئی اور آپؐ نے سکوت فرمایا، حالانکہ اطلاع نبویؐ کا ثبوت اب تک کوئی نہیں ملا، پس ایسی کمزور دلیل سے جمعہ کا جواز گاؤں میں ثابت نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس پر سب ائمہ کا اتفاق ہے کہ جمعہ کی نماز پنجوقتہ نماز کی طرح ہر جگہ جائز نہیں چنانچہ جنگل بیابان میں جواز جمعہ کا کوئی قائل نہیں، بلکہ ہر ایک امام نے کچھ نہ کچھ شرط جواز جمعہ کیلئے ضرور لگائی ہے، شہر میں جواز جمعہ پر سب کا اجماع ہے، اور گاؤں میں جائز ہونے کے لئے کوئی شافی دلیل ان کے پاس نہیں ہے، اس لئے محض مشکوک دلائل سے

کاؤں میں جمعہ جائز نہیں ہو سکتا، باقی سائل حجۃ اللہ البالغہ اور فیوض قاسمیہ وارکان اربعہ کی عبارات کا جو حوالہ دیا ہے، سوان کتابوں کی عبارات اس کو نقل کرنا چاہئے تھیں، یہ کتابیں میرے پاس موجود نہیں ہیں، باقی محض سائل کا لکھ دینا کافی نہیں، کیونکہ ممکن ہے کہ اس نے سمجھنے میں غلطی کی ہو، جیسا کہ حدیث بخاری کی نقل میں اس نے پہلے غلطی کی ہے، اور بعد تسلیم کے جواب یہ ہے کہ سائل کو معلوم ہونا چاہئے کہ شاہ ولی اللہ صاحب و مولانا محمد قاسم صاحب و مولانا بحر العلوم کو ہم امام شافعی و امام مالک و امام احمد بن حنبل کی خاک پا کے برابر بھی نہیں سمجھتے، تو جب ہم نے اس مسئلہ میں ان ائمہ ثلاثہ کے قول کے خلاف ابو حنیفہ کا قول اختیار کیا ہے، کیونکہ روایت و درایت ان کا قول ہمارے نزدیک صحیح ہے تو ہم ان متاخرین کے قول کو اس کے مقابلہ میں کب تسلیم کر سکتے ہیں، اُن کے اقوال کو ائمہ اربعہ کے اقوال سے کیا نسبت ہے؟ کچھ نہیں، اگر ان کی تحقیق امام ابو حنیفہ کے خلاف ہے تو اسے ہم نے اُن کی تقلید کا التزام نہیں کیا، بعد میں فیوض قاسمیہ کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ سائل نے مولانا قاسم العلوم کا مطلب بالکل نہیں سمجھا، مولانا قاسم العلوم کی عبارت کا مطلب سمجھنے کے لئے بڑی عقل کی ضرورت ہے، میں نہیں سمجھ سکتا کہ سائل نے مولانا کی کس عبارت سے یہ مطلب سمجھا ہے، کہ جمعہ کے لئے مصر و اذن سلطان وغیرہ شرط نہیں، وہ اس عبارت کو پھر کچھ پھر جو آدیا جائے گا، رہا مصر کی تعریف میں فقہاء کا اختلاف ہونا، سو یہ اختلاف عنوان کا ہے حقیقت کا اختلاف نہیں، مراد سب کی ایک ہے، یعنی اتنی بڑی بستی جہاں انسانی تمام ضروریات مل جاتی ہوں، لیکن ہر زمانے میں ایسی بستیوں کی مختلف علامتیں رہی ہیں، اس لئے فقہاء کی عبارات میں مختلف الفاظ وارد ہو گئے، جیسے ہم کسی سے یوں کہیں کہ مسلمانوں کی علامت یہ ہے کہ اُن کی داڑھی لمبی اور مونچھیں کتری ہوتی ہوں، اور نماز پڑھتے ہوں، ایک زمانہ ایسا آیا کہ مسلمانوں نے ان کاموں کو مستحق کر دی، پھر کسی نے یہ تعریف کی کہ جن کے کرتے لمبے پانچاھے ٹخنوں سے اوپر ہوں، کچھ دنوں کے بعد مسلمانوں نے یہ وضع بھی ترک کر دی، تو اب یہ تعریف کی کہ جو ٹر کی ٹوپی پہنتے ہوں، تو اب ان مختلف تعبیروں کے بدلنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مسلمانوں کی حقیقت بدل گئی ہے، حقیقت ایک ہی ہے، لیکن ہر زمانہ کے اعتبار سے ان کی علامت جدا ہو گئی، اسی طرح شہر کے معنی سب لوگ جانتے ہیں گو اس کی علامتیں ہر زمانہ میں جدا ہوں،

رہا اذن سلطان یا سلطان کا شرط ہونا سو اس کے متعلق حنفیہ نے تصریح کی ہے کہ اذن

سلطان اگر متعذر ہو تو عام مسلمان جس کو امام و خطیب مقرر کر لیں جائز ہے، قال فی الدر
 ونصب العامة الخطیب غیر معتبر مع وجود من ذکر امام مع عدم مہم فیجوز للضرور
 ۸۲۲ھ ج ۱ ص ۸۲۲ قال الشامی تحتہ فلو الولاية كفارة يجوز للمسلمين اقامة الجمعة
 وصيدا القاضی قاضیا بتراحق المسلمین وحب علیہم ان یلتمسوا والیاً مسلماً، ۸۲
 اس سے صاف ظاہر ہے کہ حنفیہ کے نزدیک اذن سلطان کی شرط موجودگی سلطان
 میں ہے، اور اگر سلطان نہ ہو تو یہ شرط نہیں، اور درحقیقت اذن سلطان کی شرط بھی
 شرط مصر کے تابع ہے، اصل شرط مصر ہے، لیکن چونکہ سلطان کو یہ اختیار ہے کہ اگر وہ
 چاہے تو کسی مصلحت کی وجہ سے گاؤں کو شہر بنا دے، یا شہر کو گاؤں بنا دے، تو سلطان
 کے ہوتے ہوئے اس کے اذن کی ضرورت اس لئے ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ سلطان
 کا ارادہ اس شہر کو شہر باقی رکھنے کا، یا گاؤں بنانے کا ارادہ نہیں ہے، فافہم، باقی تفصیل
 اس مسئلہ کی رسالہ "القول البدر" مؤلفہ حکیم الامت و "احسن القرطی" مؤلفہ شیخ العالم
 دیوبندی قدس سرہ میں ملے گی، اس فتویٰ میں زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں،
 غیر عربی زبان میں خطبہ کے متعلق سوال (۵) کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع
 بعض فقہاء کی عبارات کا مطلب اس بارہ میں کہ عبارتوں میں درجہ ذیل سے فقہاء کرام کی کیا
 غرضیں ہیں، اور کیا مطلب ہے، علامہ عظیم من اللہ حسن شربنلالی مراقی الفلاح شرح
 نور الایضاح میں تحریر فرماتے ہیں: فینبغی للخطیب التنبیہ علیہا فی خطبۃ
 الجمعة التي يليها العيد اه، علامہ فقیہ العصر ابن نجیم تخریر الرائق شرح کنز الدقائق
 میں زیر قول صاحب کنز و لعل الاضیحة الخ تحریر فرماتے ہیں فینبغی للخطیب ان يعلم
 احکامہ فی الجمعة قبل عید الاضحیٰ کما انه ینبغی ان يعلمہم احکام صدقة
 الفطر فی الجمعة التي قبل عید الفطر ليتعلموها ويخرجوها قبل الخروج
 الى المصلى ولم امره منقولا والعلم امانة في عنق العلماء ويستفاد من كلامهم
 ان الخطيب اذا راى بهم حاجة الى معرفة بعض الاحكام فان
 يعلمهم اياها في خطبة الجمعة خصوصاً في زماننا من كثرة الجهلة وقلة
 العلم فینبغی ان يعلمہم احکام الصلوة کما لا ینحی ۸۲، اسی طرح درمختار و شامی
 مطبوعہ مصر، ص ۸۲۲ و ۸۲۵ ج ۱ میں بھی ہے، علامہ ابن عابدین نے ماتن کے کلام کا

تمتہ بحر الرائق ہی سے نقل کیا ہے، یہ تعلیم خطبہ جمعہ میں کس طرح کی جاوے، اس تعلیم میں سامعین کو فائدہ پہنچانا ہے یا صرف خطیب کا ہی سمجھنا مقصود ہے، اور بقول ابن نجیم وابن عابدین نماز وغیرہ کے احکام کی تعلیم کس طور ہو، ہمارے ائمہ کے فرمان تو صاف ہیں، مگر آپ جیسے ہمارے پیشواؤں سے حل عقد کرنا اندھیرے میں چراغ یا چراغ کو سلائی لگا دینا ہے، بلا سلائی لگا کر چراغ سے غیر ممکن ہے، بینوا تو جسروا؟

الجواب؛ خطیب کو چاہئے کہ خطبہ عربیہ مختصر پڑھ کر ضروری احکام مناسب وقت میں اپنی زبان میں بیان کر دیا کرے، باقی تمام خطبہ کا عربی میں نہ ہونا خلاف سنت ہے، حضرات صحابہؓ بلا دِ عجم میں بھی عربی ہی میں خطبہ پڑھا ہے، لیکن اس وقت اسلامی حکومت تھی تمام قضایا اور فیصلے عربی زبان میں لکھے جاتے تھے، اس لئے اہل عجم عموماً عربی زبان سیکھنے کی کوشش کرتے تھے، اس وقت بھی مسلمانوں کو عربی زبان سیکھنا چاہئے تاکہ دین کی حفاظت رہے، خطبہ عربی کو عوام کی سستی کی وجہ سے ترک نہیں کیا جاسکتا، ہاں اس کا مضائقہ نہیں کہ بعد خطبہ عربیہ کے اردو وغیرہ میں مسائل ضروریہ بیان کر دیئے جاویں،

سوال (۶) نماز عیدین مسجد میں ہی پڑھنی چاہئے یا جنگل میں صل پڑھنا سنت ہے، شرعی حکم کیا ہے؟ جو لوگ اپنی ضد نفسانیت سے عناداً جنگل میں نہ جاتیں اور مسجد ہی میں پڑھیں، اور خطیب جامع مسجد دوسرے لوگوں کے ہمراہ جنگل میں پڑھتا ہو، اور تھوڑے اپنی نفسانیت سے نہ جاتیں، اور کوئی عذر شرعی بھی نہ ہو، تو ان کا کیا حکم ہے؟ بینوا تو جسروا

الجواب؛ نماز عیدین کا عید گاہ میں پڑھنا سنت ہے، بلا وجہ اس سنت کا چھوڑنا بُرا ہے، لیکن اگر کوئی جماعت شہر ہی میں عید کی نماز بلا عذر پڑھ لے تو اس کو بھی ملامت نہ کرنا چاہئے، کیونکہ صلوٰۃ عید کا متعدد مواقع پڑھنا بالاتفاق جائز ہے، اور اگر کوئی جماعت بستی میں عید کی نماز اس لئے پڑھے کہ مثلاً عید گاہ کا امام جاہل یا فاسق ہے تو یہ عجت اس فعل میں معذور ہے قال فی الدر والخروج الیہا ای الی الجبانة لصلاة العيد سنة وان وسعهم المسجد الجامع هو الصحيح ام قال الشامي قوله وهو الصحيح قال فی الظہیریۃ وقال بعضهم لیس بسنة وتعارف الناس ذلك لضيق المسجد وكثرة ازدحام والصحيح هو الاول ام وفي الخلاصة والمغنی

السنة ان يخرج الامام الى الجيابة ويستخلف غيره ليصلي في المصرا بالضعفاء بناء على ان صلوة العيدين في موضعين جائزة بالاتفاق وان لم يستخلف فله ذلك ام
 فوح ص ۸۶، والدليل على الجزء الاخير كراهة الصلوة خلف الفاسق اتفاقاً
 ليكن ديني كامول میں صد اور نفسانیت کو کام میں لانا گناہ ہے، اگر کوئی غرض محمود ہو تو بستی
 میں بھی عید کی نماز جائز ہے،

عید گاہ کو پختہ تعمیر کرنا جائز ہے | سوال (۷) عید گاہ پختہ بنانا شرع شریف میں درست ہے
 یا نہیں؟ علامہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی حنفی رحمہ اللہ ”جذب القلوب الی دیار المحبوب“
 میں جو زیریں بیان مصلی عید تحریر فرماتے ہیں، ”مصلی عید در زمان آن سرور بنا داشت، بلکہ
 از بنا سے آں نہی فرمود، علامہ سمہودی وفاء الوفا باخبار دار المصطفیٰ صفحہ ۶ میں لکھتے ہیں :-
 ولم يكن المصلي في زمن النبي صلى الله عليه وسلم مسجد ابل كانت صحراء لا بناء
 بها ونهى صلى الله عليه وسلم عن البناء بها ام، نیز صفحہ ۱۱ میں ہے، روی ابن شيبه
 عن انس بن مالك ان رسول الله صلى الله عليه وسلم خرج الى المصلي يستسقي
 فبدأ بالخطبة ثم صلى وكبر واحدة افتتح بها الصلوة وقال هذا مجمعنا ومستطنا
 ومدعانا العیدنا ونفطرنا واضعنا فلا يبنى فيه لبنة على لبنة الاخيمه اسی طرح
 خلاصۃ الوفاء میں بھی ہے، اُن کی کیا غرض ہے؟ بینوا تو جروا،

الجواب؛ عید گاہ پختہ تعمیر کرنا جائز ہے، قال الشامي وفي الخلاصة عن
 خواهر زاده هذا اي بناء حسن في زماننا ص ۸۶۸ او في البخاري عن
 ابی سعيد وفيه فلما اتينا المصلي اذا منبر بناه كثير من الصلوات ام قلت ولم
 عليه الصحابة واستمر ذلك بعده فكان اجماعا على جوازها قال الحافظ في الفتح
 وقد وقع في المدونة لما لك رواه عمر بن شيبه عن ابی عسان عنه قال
 اول من خطب الناس في المصلي على المنبر عثمان بن عفان كلهم على منبر من
 طين بناه كثير من الصلوات ام وقال ايضا وفي هذا الحديث من الفوائد ببيان
 المنبر قال الزين بن المنير وانما اختار وان يكون بالبن لا من الخشب لكونه
 يترك بالصحر في غير حرز فيؤمن عليه النقل ام قلت فلو احيط المنبر
 بالاسوار من الجدران لاجل صيانتها وبقاءه فلا بأس به لانه ادخل في

الامن من النقل اه،

اور جو احادیث سائل نے حزب القلوب اور سمہودی سے نقل کی ہیں جن میں مذکور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مصلیٰ میں عمارت بنانے سے منع فرمایا ہے، ان کا مطلب بتقدیم صحت یہ ہے کہ میدان مصلیٰ میں کوئی شخص اپنا گھر نہ بناوے، بلکہ اس کو نماز عید کے واسطے وقف کر دینا ضروری ہے، کسی کو خاص اپنا قبضہ اس پر جانا جائز نہیں، میں کہتا ہوں کہ اس مصلحت کے لئے بھی عید گاہ کا پختہ بنا دینا ادلیٰ ہے، تاکہ خالی زمین دیکھ کر کوئی شخص اس پر قبضہ نہ کر بیٹھے، کیونکہ آجکل زراعت کرنے والے وقف کی زمین کو بھی تھوڑی بہت اپنی زراعت میں داخل کر لیں گے، پھر ان سے مقدمہ لڑنا اور زمین عید گاہ کو ان کے قبضہ سے نکالنا درودری ہے، غالباً اپنی مصلحتوں پر نظر کر کے متقدمین نے بنا، عید گاہ کو پسند کیا ہے، واللہ اعلم، ۲۱ ذی الحجہ ۱۴۲۸ھ

سوال (۸) عید الاضحیٰ کی نماز کے بعد تکبیر تشریق کی جائے یا نہ، عید الاضحیٰ کی نماز کے بعد تکبیر کہنے کا حکم کیونکہ بعض علماء کو دیکھا ہے کہ نماز کے بعد فی الفور ہی تکبیر کہہ لیتے ہیں، جب خطبہ شروع کرتے ہیں، اور بعضوں کو دیکھا ہے کہ نماز پڑھتے ہی تکبیر نہیں کہتی بلکہ ممبر پر چلے جاتے ہیں اور خطبہ شروع کر دیتے ہیں، تو آیا ان دونوں صورتوں میں بہتر و فتویٰ کس پر ہے؟ بینوا توجسروا،

الجواب: قال فی الدرر لا بأس بہ (رای التکبیر ۱۲) عقب العید لان المسلمین توارثوا فوجب اتباعهم وعلیہ المبلغیون اه قال الشاہی قولہ فوجب الظاہر ان المراد بالوجوب الثبوت لا الوجوب المصطلح و فی البحر عن المجتبیٰ والمبلغیون یکیدون عقب صلوٰۃ العید لا نماز وادی بجماعة فاشبهت الجمعة اه وهو ینفذ الوجوب المصطلح علیہ ط اه ص ۸۷۹ ج ۱،

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ عید الاضحیٰ کی نماز کے بعد تکبیر تشریق باواز بلند کہنا چاہئے واللہ اعلم، ۲۱ ذی الحجہ ۱۴۲۸ھ

سوال (۹) جمعہ میں ایک آدمی کو خطبہ اور دوسرے کو نماز پڑھانا نماز جمعہ میں ایک آدمی کا خطبہ پڑھنا اور دوسرے کا نماز پڑھانا شرع شریف میں درست ہے یا نہ، اگر درست

ہے تو مع الکرہیت ہی یا بلا کر اہت، اگر مکروہ ہے تو تحریم ہے یا تنزیہی،

(۲) پیچھے تہنا ایک آدمی کھڑا ہو، نیت کرنے سے قبل آگے کی صف سے ایک آدمی کو کھینچ لے

یا بعد نیت، از تحریر جواب سرفراز فرمائیں،

الجواب؛ جمعہ میں ایک آدمی کا خطبہ پڑھنا اور دوسرے کا اجازت خطیب سے نماز پڑھانا جائز ہے، مگر اس مسئلہ میں مشائخ کا اختلاف ہے، کہ بلا ضرورت ایسا کرنے کو بعض نے منع کیا ہے، لہذا اس سے احتراز اولیٰ ہے، وفي السراجیۃ لوصلیٰ احد بغیر اذن الخطیب الا اذا اقتدی بہ من لہ ولایۃ الجمعیۃ (کن فی الدر) وفي الشامیۃ شمل الخطیب الماذون وذلك لان الاقتداء به اذن دلالتہ بخلاف ما لوحضروا ولم یقتدو علیہ تحمل عبارة الخانیۃ السابقة ثم اذا كان حضورہ بدون اقتداء لم یعتبر اذا تأیہم منه انه لا یجوز خطبۃ غیرہ بلا اذن بالاولیٰ الخ لمن فہم منه الجواز افادہ ط (ص ۸۴۱)

(۲) پیچھے صف کے جو آدمی کھڑا ہو وہ تہنا کھڑا ہو جاوے اگلی صف میں سے کسی کو نہ کھینچے نہ بعد نیت کے نہ قبل نیت کے، قال الطحطاوی فی حاشیۃ مراۃ الفلاح والاولیٰ فی زمانہ عدم الجذب والقیام وحدہ، واللہ اعلم ۲۴ صفر ۱۳۸۴ھ

سوال (۱۰)..... نماز عیدین کے بعد رفع یدین کے ساتھ مناجات کا حکم تو کرنے والوں پر ثواب و برکات دارین کی امید ہی یا نہیں اور اس کے منکر یعنی نہ کرنی والوں پر، اور دوسرے کو کرنے میں منع کرنے والوں پر شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب؛ نماز کے بعد دعا کرنا مطلقاً جائز ہے، اور رفع یدین آداب دعا ہے، لہذا بعد نماز عیدین کے دعا، رفع یدین جائز ہے، اور ثواب کی بھی امید ہے، مگر اس کو ضروری نہ سمجھا جاوے اور جو لوگ اس سے منع کرتے ہیں، اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت دعا کرنا جائز ہی نہیں تب تو وہ غلط کہتے ہیں، اور مباح سے روکنے کے سبب لم تحرم ما احل اللہ لک کے مخاطب ہیں، اور اگر یہ مطلب ہے کہ اس وقت دعا، رفع یدین ضروری نہیں تو ان کا قول بھی صحیح ہے، اُن سے جھگڑنے کی ضرورت نہیں، قال فی الحصن فی آداب الدعاء والصلوٰۃ عہ رحب مسنی وفي الحرزای ذات

الركوع والسجود والمراد ان يقع الداء المطلوب بعد ما فعي من باب تقدير العمل
الصالح والتوسل به ام اس سے معلوم ہوا کہ ہر نماز ذات رکوع وسجود کے بعد دعا جائز ہے،
وفيه ايضا وبسط الیہین ت مس ورفہماع، والشراعلم،
خطبہ کے وقت ہاتھ میں عصا لینا **سوال (۱۱)** بوقت نماز جمعہ بوقت خطبہ عصا لینا جائز ہے
یا نہیں؟

الجواب: عصا لینا بوقت خطبہ سنت ہے، مگر سنت مقصودہ نہ سمجھے گا ہے
ترک بھی کر دے، قال فی الدرر ویکراہ ان یتکی علی عصا او قوس ام فی الشامیۃ
استشکلہ فی الحلیہ بانہ فی روایۃ ابی داؤد انہ صلی اللہ علیہ وسلم قام ای
فی الخطبۃ متوکا علی عصا او قوس ام ونقل الفہستانی عن عید المہیط ان اخذ
العصا سنۃ کالقیام ام قلت وحمل الکراہۃ اعتقادہ سنۃ مقصودۃ، واللہ اعلم
ضد دعاوت دوسری مسجدیں **سوال (۱۲)**
اقامت جمعہ کرنے کا حکم،
جبکہ مسجد قدیم کو نقصان بھی پہنچتا ہے

..... بیرونجات شہر یعنی دیہات میں ادائے نماز جمعہ کا کیا حکم ہے،
خصوصاً بستی سورۃ میانی جو بقدر دو میل کے فاصلہ پر ملتان شریف کے غرب کی طرف ہے
اس بستی میں عرصہ دراز سے کہنہ وجامع مسجد موسومہ مولوی گل محمد صاحب مرحوم والی جو
مشہور و معروف اور موجود ہے، اور آج تک بفضل خداوند اکبر آباد ہے، جس کی نو تعمیر
کسی شخص کو خواہ طویل العمر اور سن رسیدہ بھی ہو کوئی حال معلوم نہیں کہ کس تاریخ
یا کس زمانہ میں اس مسجد شریف کی تعمیر شروع ہوئی ہے، ہاں البتہ کچھ عرصہ دراز سے مرمت
کی تیاری اس مسجد شریف مذکور کی محراب پر لکھی ہوئی ہے، جس مرمت کو عرصہ ایک سو تیس
سال کا گزر چکا ہے، شروع بنیاد کا کوئی حال معلوم نہیں، اور یہ بھی معلوم نہیں کہ اس
مسجد شریف مذکور کو تیار ہوتے ہی نماز جمعہ جاری یا کوئی زمانہ پیچھے شروع ہوئی ہے

..... جس میں تقریباً دو سو مکانات ہیں جن میں سے تھینا ۵۰ مکانات اہل ہنود ہیں اور تھینا ایک سو مکانات
اہل شیعہ ہیں اور تھینا ۵۰ مکانات اہل سنت ہیں اور متفرق تین جگہ پر بیس دو مکانات بھی ہیں ۱۲

ہاں البتہ اپنے بزرگان سے یہ سنا گیا ہے کہ بادشاہ نواب صاحب نے اپنی عہداری میں باتفاق تمام مسلمانان اس مسجد شریف مذکورہ میں نماز جمعہ ادا کی ہے، علیٰ ہذا القیاس آباء و اجداد سے یعنی قدیم الایام سے تاحال کے زمانہ تک نماز جمعہ جاری ہے، الحمد للہ، و نیز اس مسجد شریف کے گرد و نواح کی متفرق بستیوں میں بہت سی مساجد نو و کہنہ موجود ہیں، جنہوں نے آج تک ایسا کوئی موقع نہیں گذرا کہ ان مساجد میں بھی نماز جمعہ ادا کی گئی ہو، کیونکہ یہ مسجد شریف مذکورہ تمام گرد و نواح کی مسجد سے بڑی مسجد ہے، اور جامع مسجد ہے، اور تمام مساجد اس مسجد شریف سے چھوٹی ہیں، بلکہ چند مساجد غیر آباد بھی ہیں، تمام لوگ گرد و نواح کے باہمیں اتفاق سے جمع ہو کر اسی مسجد شریف مذکورہ میں نماز جمعہ ادا کرتے چلے آتے ہیں، بلکہ بہت علماء عظام و اعظین وغیرہ خواہ ملتان شریف کے ہوں یا بیرونجات ہوں جو متفرق بستیوں میں وعظ و سرمانے کو تشریف لاتے ہیں اور روز جمعہ کا ہوتا تھا، تو پہلے اسی مسجد شریف مذکورہ میں نماز جمعہ ادا کر کے پھر متفرق بستیوں کی مساجد میں وعظ بیان فرماتے چلے آتے ہیں، آج تک کسی عالم نے متفرق بستیوں کی مساجد میں نماز جمعہ ادا نہیں کی، خصوصاً اس مسجد شریف مذکورہ میں کوئی ایسا امر شرعیہ مانع نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے گرد و نواح کی مساجد متفرقہ میں بھی نماز جمعہ ادا کی جاوے،

جناب من آج عرصہ ڈیڑھ سال کا گذر چکا ہے کہ اقوام شیخان نے بسبب عداوت اور ضد کے اور واسطے آزار دینے اور بیرونق کرنے اس مسجد شریف مذکورہ کے اپنی مسجد کو جو ہر فاصلہ ۵۰ یا ۶۰ قدم پر ہے خوب سنوا کر اور آراستہ کر کے بلکہ بعض بعض مردمان نماز خوانندگان کو رستہ سے روک کر اپنی مسجد شریف کی ترغیب دے کر ایک ملا لوتعلیم فیتہ غیر علاقہ کا بلا کر فی نماز جمعہ مبلغ ع یا عہم نقد دے کر نماز جمعہ جاری کر دی ہے، کیونکہ ان کی مسجد شریف کا خاص امام مقرر نہیں ہے، جو آگیا اس نے نماز پڑھا دی، بعض اوقات کوئی شخص نماز پڑھانے والا جو نہیں ہوتا، اکیلے نماز بھی پڑھی جاتی ہے، چند دفع لوگوں نے کہا ہے کہ تم ضد اور عداوت کو چھوڑ دو، اور آپس میں اتفاق رکھ کر جس مسجد میں نماز ہوتی رہتی ہے وہاں پڑھو، ہرگز نہیں مانتے، بلکہ یہ جواب دیتے ہیں کہ ہماری مسجد شریف بھی جامع مسجد ہے، اور یہ بھی کہتے ہیں کہ جس نے نماز جمعہ پہلے ادا کر لی اس کی نماز جمعہ درست ہے، اور جس نے پیچھے ادا کی اس کی نماز جمعہ ناجائز ہے، اس واسطے ہم

ان سے پہلے نماز جمعہ ادا کر لیتے ہیں، تاکہ ہماری نماز درست ہو جائے اور ان کی نماز ناجائز نہ ہو
ایا شرعاً اس مسئلہ کے بارے میں کیا حکم ہے، بینوا و توجروا، جواب بمجموع نقول کتب فتویٰ علیہ
و بمجموع ہوا میری دستخط خود تحریر فرماویں، کہ عند اللہ ماجور و عند الناس مشکور ہوں گے،

الجواب؛ صورت مسئلہ میں جن لوگوں نے محض عناد اور ضد کی وجہ سے دوسری
مسجد میں جمعہ قائم کیا ہے وہ گنہگار ہیں قال العلامة عبدالحی فی فتاواہ قال البغوی وقال
عطاء لما فتح الله على امراء مصر من المسلمين ان ينوا المساجد وامرهم ان لا يبناوا
في مدینتہم مسجدین یضار احدھا الاخر ام ص ۲۰۶ پس اس صورت میں کہ سب
لوگ مسجد قدیم میں جمعہ پڑھنے پر راضی ہیں اور وہاں جمعہ کا انتظام بھی ہمیشہ سے ہے، بلا ضرورت
بلا وجہ محض ضد و نفسانیت سے دوسری جگہ جمعہ قائم کرنا اور اس مسجد قدیم کے درپے تخریب
ہونا سبب گناہ عظیم ہے، گو دوسری مسجد میں بھی جمعہ درست ہو جائے گا، مگر جو لوگ ضد و
نفسانیت کی وجہ سے وہاں جمعہ پڑھیں گے ان کو گناہ بھی ہوگا، اور جو لوگ خالی الذہن ہو کر
وہاں جمعہ پڑھیں گے ان کو گناہ تو نہ ہوگا، مگر مسجد قدیم کے برابر ثواب نہ ملے گا، کیونکہ مسجد قدیم
میں جدید سے زیادہ فصیلت و ثواب ہے، قال فی رد المحتار فی مسئلۃ تعدد الجمعة فی
بلدة واحدة مانصہ لان جواز التعدد وان كان ارجح واقوی دلیلا لکن فیہ شبهة
قویة لان خلافہ مروی عن ابی حنیفة واختارہ الطحاوی والمترتاشی وصاحب
المختار وجعلہ العتابی اظهر وهو من ذهب الشافعی والمشہر عن مالک واحدی
الروایتین عن احمد کما ذکر المقدسی فی رسالۃ نور الشمعة فی ظہر الجمعة
بل قال السبکی من الشافعیہ انه قول اکثر العلماء ولا یحفظہ عن صحابی
ولا تابعی تجویز تعددھا ام وقد علمت قول البدائع انه ظاہر الروایۃ وفی
شرح المنیۃ عن جوامع الفقه انه اظهر الروایتین عن الامام قال فی النہر
وفی الحاوی القدسی وعلیہ الفتویٰ وفی التکملة للرازی وبہ ناخذ اھ فہو
حیث عن قول معتمد فی المذہب لا قول ضعیف ولذا قال فی شرح المنیۃ هو
الاحتیاط لان الخلاف فی جواز التعدد وعدمہ قوی وکون الصحیح لجواز
الضرورة للفتویٰ لا ینع شریعة الاحتیاط للفتویٰ ام ص ۸۲۲ ج ۱ قلت و
قد علمت من السؤال ان لاضرورة الى تعدد الجمعة فی الصورة الحاضرة

وانما هو ببعض العناد والحسد وذكر قاضي خان وصاحب منية المفتي وغيرهما
ان الاقدم افضل وان استويا في القدم فالاقرب افضل ام (ص ۲۰۶ جلد ۱)
فتاویٰ مولانا عبدالحی - ۱۲ جمادی الاولیٰ مسند

سوال (۱۳) جس دفتر میں خادم کام کرتا ہے وہ شہر سے قریباً
اس میں نماز جمعہ کا حکم، تین میل کے فاصلہ پر ہے، اور اس علاقہ کو مغلیہ کہتے ہیں اس کا
ڈاکخانہ و تھانہ اور پولیس بھی شہر سے علیحدہ ہے، اور چنگی کی حد سے بھی باہر ہے، اور نہ ہی یہ
گاؤں کی صورت میں ہے، بلکہ یہ ایک بڑا دفتر ہے اور اس کے ساتھ ہی جو کارخانے بنے ہوئے
ہیں، جہاں دن کو بائیس تیس ہزار آدمی کام کرتے ہیں، اور رات کو سوائے اُن جو کیداروں کے
جو پہرہ پر مقرر ہیں، اور کوئی نہیں ہوتا، دفتر کے ادھر ادھر جگہ بجگہ انگریزوں کی کوٹھیاں
بنی ہوئی ہیں جو اس دفتر اور کارخانوں میں ملازم ہیں، کوٹھیاں بھی ایک جگہ نہیں بلکہ تھوڑی
تھوڑی (دس پانچ) کئی جگہ بنی ہوئی ہیں، گویا کہ دفتر شہر کے حکم میں ہے، اور نہ گاؤں کے
یہاں کے ملازمین جمعہ کے دن کسی ایک کو مقرر کر کے دفتر میں ہی جمعہ پڑھ لیتے ہیں، آیا یہ
جمعہ ہو جاتا ہے، یا نہیں، اگر نہیں تو خادم کو قریباً عرصہ تین سال کا ہو گیا ہے کہ انہی میں
شامل ہو کر جمعہ پڑھ لیتا ہے اتنے عرصہ کی ظہر کی نمازیں قضاء پڑھ لے یا نہیں، اور چونکہ
خادم گاؤں سے آتا ہے اس لئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خادم پر جمعہ واجب نہیں ہے کہ
دفتر کو ہر حال میں چھوڑ کر شہر میں جا کر جمعہ پڑھے،

الجواب :- قال فی الدر او فناء بکسر الفاء وهو ما حوله اتصل به اولاً
حرره ابن الکمال وغیره لاجل مصالحه کد فن المونی و رکض الخیل والمختار
للفتوی تقدیرہ بفرسخ ام قال الشامی اقول وبه ظہر صحتها فی تکیة السلطان
سلیم بمسجدة دمشق وکن فی مسجدة بصالحية دمشق فانها من فناء
دمشق بما فیها من التربة بسفح الجبل وان انفصلت عنه بمزارع لکنها
قریبة لانها علی ثلث فرسخ من البلد وان اعتبرت قرية مستقلة فهي مصر
علی تعریف المصنف ام، ص ۸۳، ۱۳۰،

قواعدے مغلیہ لاہور کا فناء معلوم ہوتا ہے، اس لئے جو لوگ مغلیہ میں رہتے ہیں
اُن پر عجمہ فرض ہے، لہذا آپ نے جس قدر جمعہ وہاں پڑھے ہیں وہ صحیح ہیں، آئندہ بھی

پڑھتے رہنا چاہئے، لیکن مزید احتیاط کے لئے جمعہ کے بعد چار سنتوں میں سنتوں کی نیت کے بجائے چار رکعت فرض ظہر کی نیت کر لی جائے، تاکہ فرض بالیقین ذمہ سے ادا ہو جائے، مگر جہلاً، کو اس کی تعلیم نہ کی جائے وہ اس میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں، واللہ اعلم،

جزو سوال؛ اور حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ کا فتویٰ متعلق ظہر احتیاطی دیکھ کر ایک اور بھی شبہ پڑ گیا ہے کہ اس صورت میں لاہور میں کہیں بھی جمعہ صبح نہیں ہوتا کہ کیونکہ یہاں گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں علیحدہ جمعہ پڑھا جاتا ہے، اور کسی ایک بڑی مسجدوں میں بھی علیحدہ پڑھا جاتا ہے، حالانکہ اگر بادشاہی مسجد میں تمام شہر کے لوگ آکر جمعہ پڑھیں تب بھی سماجیادیں اور فتویٰ اس پر ہے کہ شہر میں ایک ہی جگہ جمعہ پڑھا جاوے،

جواب؛ نہیں فتویٰ اس پر ہے کہ ایک شہر میں متعدد جگہ جمعہ جائز ہے، لہذا لاہور شہر کے سب جمعے صحیح ہیں،

جزو سوال (۲) کیا کتاب تنبیہ الغافلین کوئی معتبر کتاب ہے، اور اگر خادم اس کا مطالعہ کرے تو اجازت ہے؟

جواب؛ اس کتاب کا مصنف کون ہے، مصنف کا نام معلوم ہونے پر جواب دیا جاسکتا ہے،

سوال (۱۴) نماز عید کے بعد دعا مانگنے کا حکم.....

..... عیدین میں ہاتھ اٹھا کر مناجات کرنا کیسا ہے، ایک مقام پر مدت سے لوگ ایک امام کے پیچھے عیدین کی نماز پڑھتے آئے ہیں، اب عرصہ دو سال سے سابق امام نے بوجہ کبر سنی کے اپنے لڑکے کو جو کہ حافظ اور عالم ہیں اپنی جگہ پر امام مقرر کیا، اور لوگ اُن کے پیچھے عیدین کی نمازیں پڑھنے لگے، حال کے امام نے عید کی نماز کے بعد مناجات نہیں کی، عام لوگ امام سے معترض ہوئے اور کہا کہ آپ کے باپ ہمیشہ سے مناجات کرتے آئے ہیں آپ کیوں ترک کرتے ہیں، امام صاحب نے جواب دیا کہ ہمارے باپ نے حدیث نہیں پڑھی ہے، اس لئے وہ اس مسئلے سے ناواقف ہیں، میں نے حدیث میں اس کی دلیل کہیں نہیں پائی، اس لئے میں ترک کرتا ہوں، اس پر جو عوام نے اصرار کیا کہ مناجات کرنا تو اچھا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں عاجزی پسندی، علاوہ اس کے ہمیشہ سے ہم لوگ کرتے آئے ہیں، یکایک ہم لوگوں کے لئے یہ ایک نئی بات معلوم ہوتی ہے، اس لئے بہت سے لوگ ہماری عید گاہ میں آنا چھوڑ دیں گے۔

اور جماعت کو نقصان پہنچے گا، امام صاحب نے فرمایا کہ میں خود یہاں کی امامت چھوڑ دوں گا مگر مناجات کر کے گہنگار نہ ہوں گا، اور اس کے بعد امام صاحب اور چند لوگوں نے مشورہ کر کے تمام بازار میں ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ جو شخص مناجات کرے گہنگار ہے، اس کے پیچھے نماز پڑھنی درست نہیں، اس بات سے عوام میں ایک ہنایت بے قراری پھیل گئی ہے، اور وہ جماعت ہو گئی ہیں، اور ان لوگوں کا ارادہ ہے کہ عید کے موقع پر ایک بڑا ہنگامہ برپا کریں گے چونکہ لوگ ہمیشہ سے مناجات کرتے آئے ہیں، اس لئے تین حصہ سے زائد لوگوں نے مناجات کرنے والوں کی طرف ہیں، اور ایک حصہ سے کم لوگ نہ کرنے والوں کی طرف ہیں، اس لئے عند اللہ وعند الرسول آپ اس کا فیصلہ بحوالہ کتب کر دیجئے، بینوا بالدلیل تو جروا بالجزیل،

الجواب، طریقہ متعارفہ کے طور پر نماز عیدین کے بعد دعاء مانگنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صراحۃً واضحاً ثابت نہیں، ہوا، یہی وجہ ہے کہ بعض نسخ بخاری میں جو باب الدعاء فی العیدین وارد ہوا ہے، تو شارحین کو اس کے اثبات کے لئے تکلف و تحتم کرنا پڑا، قال العلامة العینی فی العمدة مطابقة للترجمة المروية عن الحموی فی قوله یخطب فان الخطبة مشتملة علی الدعاء كما انها تشتمل علی غیرہ ام من ۳۶ وقال الحافظ فی الفتح ویمثل ان یوجه بان الدعاء بعد صلوٰۃ العید یؤخذ حکمہ من جواز اللعب بعدھا بطریق الاولی وقد روی ابن عدی من حدیث واثلة انه لقی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوم عید فقال تقبل اللہ منا ومنک فقال نعم تقبل اللہ منا ومنک وفي اسنادہ محمد بن ابراہیم الشامی وهو ضعیف وقد تفرّد به مرفوعاً وخولف فیہ فروی البیہقی من حدیث عبادة بن الصامت انه سأل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن ذلك فقال ذلك فعل اهل الکتابین واسنادہ ضعیف ایضاً وکانہ اراد لم یصح فیہ شیء وروینا فی المعاملات باسناد حسن عن جبیر بن نصیر قال کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا التقوا یوم العید یقول بعضهم لبعض تقبل اللہ منا ومنک ام من ۱ ج ۲، ۲

پس حافظ کا حدیث تقبل اللہ منا ومنک سے اثبات ترجمہ کی طرف اشارہ کرنا بتلارہا ہے کہ دعاء فی العیدین کے متعلق کوئی حدیث صریح نہیں ہے، اسی لئے بعض لوگوں نے

ان نمازوں کے بعد دعا بطریق متعارف کو سنت نہیں سمجھا، لیکن کسی خاص قضیہ کا حکم ثابت کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ احادیث میں اس کا نام بھی بالتعین وارد ہو، بلکہ عموماً حدیث سے بھی احکام بکثرت ثابت کئے جاتے ہیں، اگر عموماً سے حکم ثابت نہ ہو سکے تو پھر دنیا کی بہت سی چیزوں کا جواز و استحباب ثابت ہو چکا، مثلاً مدارس کا قائم کرنا تعلیم دین کے لئے مستحب ہے، حدیث میں اس کا نام کہاں وارد ہوا؟ ریل میں سفر کرنا جائز ہے، حدیث میں اس کا نام کہاں وارد ہوا ہے، علیٰ ہذا، پس بعد عیدین کے ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا گو صراحۃً احادیث میں نظر سے نہیں گذرا مگر بعض احادیث سے ہر نماز کے بعد دعا کا مستحب ہونا ثابت ہے، نیز احادیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ اٹھا کر دعا کیا کرتے تھے، عن علیؓ قال حدثنی ابوبکرؓ وصدق ابوبکرؓ انه قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ما من عبد ینبئ نبیا فیحسن الطہور ثم یقول فیصلی رکعتین ثم یتغفر اللہ الا غفر اللہ له ثم قرأ هذه الآية والذین اذا فعلوا فاحشة او ظلموا انفسہم الم سواہ ابوداؤد وسکت عنه (ص ۲۲۰ ج ۱) ولذا قال صاحب الحصن الحصین من اداب الدعاء استقبال القبلة والصلاة والجثو علی الרכب ولبط الیدین ورفعہما (ص ۲۲ و ۲۳) وحدیث رفع الیدین فی الدعاء متواتر کذا فی تدریب الراوی (ص ۱۹۱)

پس عیدین کی نماز کے بعد مناجات و دعا کرنا عموماً حدیث سے مستحب ہے، بلکہ ہر نماز کے بعد دعا کرنا مستحب ہے، واللہ اعلم، ۲۱ رمضان ۱۴۳۸ھ

بعد تحریر جواب ہذا خاص مناجات بعد صلوٰۃ العید کے بارے میں روایات دستیاب ہو گئیں، وہی ہذہ عن أم عطیة قالت کنا نویمان نخرج یوم العید حتی تخرج البکر من خدرها حتی تخرج الحیض فیکن خلف الناس فیکبرن بتکبیرہم ویدعون بدعائهم یرجون بركة ذلك الیوم وطهرته ام اخرجہ البخاری فی صحیحہ کذا فی فتح الباری، ص ۳۸۶ ج ۲ واخرج الترمذی عن أم عطیة ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یمشی فی البکاء والعواقق وذوات الخدور والحیض فی العیدین فاما الحیض فیمتزلن المصلی ویشهدن دعوة المسالین الحدیث، ص ۱۸۱

قال الترمذی حدیث ام عطیة حدیث حسن صحیح، اس حدیث میں دعا سے دعا خطبہ مراد نہیں ہو سکتی، کیونکہ خطبہ میں صرف امام دعا کرتا ہے، سامعین دعا نہیں کر سکتے اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حائض عورتیں عیدین میں مردوں کے پیچھے کھڑی رہتیں، اور مردوں کی تکبیر کے ساتھ تکبیر کہتیں، اور انکی نماز کے ساتھ دعا کرتیں، اور اس سے مردوں اور عورتوں سب کا دعا کرنا ثابت ہوتا ہے، اور یقیناً نماز سے پہلے تکبیر و دعا کا وقت نہیں، یقیناً نماز کے بعد ہی دعا کی جاتی تھی، اور ترمذی میں اسی حدیث کے اندر یہ الفاظ ہیں یشہد دعوة المسلمین کہ عورتیں مسلمانوں کی دعا میں شریک ہوتی تھیں، اس لئے عیدین کی نماز کے بعد دعا کرنا جائز و مستحب لقیسنا ہے، استحباب و جواز کا انکار نہیں ہو سکتا، لیکن اگر کوئی شخص جائز و مستحب فعل کو ترک کر دے، تو اس پر ملامت و طعن اور اس سے ترک موالات ہرگز جائز نہیں کیونکہ یہ شان ترک فرائض و واجبات کی ہے نہ کہ مستحبات کی، اور اگر کسی وقت کسی مستحب و سنت کے ترک پر ملامت و طعن ہونے لگے، اور اس مستحب و سنت کے ساتھ واجب و فرض کا معاملہ ہونے لگے تو اس وقت اصلاح عقیدہ عوام کے لئے اس مستحب کا ترک کر دینا ضروری ہو جاتا ہے، تو جو لوگ بعد صلوٰۃ عیدین کے دعا کو مستحب سمجھتے ہیں وہ تارکین پر ملامت و طعن کرنے کی وجہ سے خود ہی اس مستحب کو ممنوع بنانا چاہتے ہیں، قال فی البحر لوقرأ فی الاولی بسوۃ الجمعة و فی الثانیة بسوۃ المنافقین فحسن تبرکاً بفعله صلی اللہ علیہ وسلم و لکن لا یؤاخذ علی ذلك بل یقرأ غیرہا فی بعض الاوقات لا یؤدی الی ہجر الباقی ولا یظنہ العامة حتماً (ص ۱۵ ج ۲) واللہ اعلم

ایک عید گاہ میں عید کی سوال (۱۵) ایک عید گاہ کے اندر دو نمازیں عید کی یکے بعد دیگرے شرعاً دو جماعت کرنا، جائز ہیں یا نہیں؟ بینوا تو جبروراً؟

الجواب؛ قال فی الخلاصة والسنة ان یرجع الامام الی الجبانة یتخلف غیرہ یتصلی فی المص بالصنعفاء والمرضى، بناء علی ان صلوٰۃ العبد فی موضعین جائزۃ بالاتفاق فی وان لم یتخلف له ذلك ام ص ۲۱۳ ج ۱، و فی الدرر ولا یصلیہما وحده ان فانت مع الامام ولو امکنہ الذہاب الی امام اخر فعل لانہا تؤدی بمصر واحد بہ مواضع كثيرة اتفاقاً ص ۸۵ ج ۱ (مع الشامیة) قلت قوله لو امکنہ

الذہاب الی امام آخر شیخ الی انه لا یصلی فی موضع واحد مرتین وکذا افتتھا الفقہاء علی بیان الجواز فی مواضع عدیدة و سکوتہم عن ادائہا فی موضع واحد مرتین یدل علی ذلک فافہم،

ان عبارات فقہیہ سے یہ معلوم ہوا کہ نماز عید ایک موضع میں مکرر پڑھنا درست نہیں ہاں چند مواضع میں جائز ہے، جیسا کہ جمعہ چند مسجدوں میں جائز ہے، ایک موضع میں دو مرتبہ نماز عید ادا کرنے کی شریعت میں کوئی اصل ہماری نظر سے نہیں گذری، لہذا اس ابتداء کے پچنا چاہئے، خصوصاً جبکہ اس کا منشاء محض نزع و خلاف و تفریق ہو، واللہ اعلم، ۸ سوال نماز عید ایسی جگہ ادا کرنا جہاں سوال (۱۶) ہمارے دیار میں ایک عید گاہ ہے، اس کے مغرب سامنے قبرستان ہو، میں ایک قبرستان ہے، جہاں امام کھڑا ہوتا ہے اس کے دو تین ہاتھ کے فاصلہ پر بیچ میں کوئی آڑ نہیں، اور درمیان میں ایک مزار بھی ہے، اس کے گرد اگر آدمی نماز پڑھتے ہیں، اس میں نماز عید میں جائز ہو گا یا نہ؟ اگر بیچ میں کوئی آڑ نہ ہو تو قبر سے کتنے فاصلہ پر نماز جائز ہے، اور اگر آڑ ہو تو ایسا ہونا چاہئے کہ قبر بالکل نہ دکھائی دے یا کیسا، بعض آدمی مسجد کے مغرب جانب تبرکاً قبر بناتے ہیں وہ کیسا ہے؟

الجواب؛ قال فی مراقی الفلاح وتکرہ الصلوٰۃ فی المقبرۃ ام قال الطحطاوی فی زاد الفقیر وتکرہ الصلوٰۃ فی المقبرۃ الا ان یكون فیہا موضع اعد للصلوٰۃ لا نجاسة فیہ ولا قدر فیہ ام قال الحلبي لان الکراهۃ معللة بالتشبیہ وهو منتفع حیث ان فی القبرستان من جنات المفمرات لا تکرہ الصلوٰۃ الی جہتہ القبر الا اذا کان بین ید ید یہ بحيث لو صلی صلوٰۃ الخاشعین وقع بصرہ علیہ ام فتراقی الفلاح صورت مسئلہ میں اگر قبر نمازیوں کے اتنے نزدیک نہیں ہوتی کہ خشوع کے ساتھ موضع سجدہ پر نظر رکھنے سے قبر پر نظر پڑتی ہو تو نماز جائز ہے، اور اس سے زیادہ نزدیک ہو تو مکروہ ہے، اور جس مزار کے گرد اگر دو گ نماز پڑھتے ہیں، اگر قبر کے گرد اتنی اونچی عمارت ہو جس کے قبر پوشیدہ ہو گئی ہو نظر نہ آتی ہو، تو نماز درست ہے ورنہ مکروہ ہو، اور ہر حالت میں مسلمانوں کو چاہئے کہ عید گاہ کی مغربی جانب میں ایک دیوار بنا دیں، جس سے قبروں اور نمازیوں میں آڑ ہو جائے مسجد کی مغربی جانب کو تبرک سمجھنا اور وہاں قبریں بنانا بے اصل بات ہے، اس سے احتراز چاہئے، واللہ اعلم، ذی الحجہ ۱۴۳۸ھ

..... سوال (۱۷) امام کالوگوں کے بیچ میں کھڑے ہو کر خطبہ دینے کا حکم

..... بڑی عید گاہ میں چونکہ امام کی آواز سارے مقتدیوں کو نہیں پہنچ سکتی، اس لئے بعض جگہ آٹھ آٹھ دس دس صفوں کے بعد تھوڑے تھوڑے فاصلے سے آواز بلند تکبیر کہنے کے واسطے پختہ یا لکڑی کے اونچے اونچے مکتبے بنادیے جاتے ہیں، پس اگر امام اپنی امامت کے پاس والی جگہ یعنی ممبر کو چھوڑ کر حاضرین کی زیادہ تعداد کو خطبہ سنائی دینے کے خیال سے عیدین کا خطبہ وسط حاضرین میں کسی درمیانی اونچے بکھرے پر کھڑے ہو کر پڑھے تو ایسا کرنا شرعاً جائز ہو گا یا ناجائز، اور اگر جائز ہو گا تو بکراہت یا بے کراہت؟

الجواب: امام کا وسط قوم میں کھڑے ہو کر خطبہ پڑھنا مکروہ ہے، لیکن اگر ایسا کیا تو خطبہ صحیح ہو جائے گا، گو خلاف سنت ہونے کی وجہ سے کراہت ہوگی، قال فی مرقا الفلاح ولین استقبال القوم بوجهہ کما استقبل الصحابة النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الطحاوی فان ولاہم ظہرہ کما قال شمس لائمہ من کان امام الامام استقبل بوجهہ ومن کان عن یمن الامام او یسارہ انصرف الیہ ام (ص ۲۹۹) قلت ولا یخفی ان فی قیامہ علی المکبرۃ یلزم تولیۃ الظہر الی بعض السامعین فیکرہ، ۲ رذی العجہ سنکسہ

سوال (۱۸) عید الفطر میں تکبیر تشریف پہلے ایک شخص آواز بلند تکبیر کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے، اس کے سب حاضرین متفقہ طور پر آواز بلند تکبیر کہتے ہیں، ان سب کے خاموش ہو جانے کے بعد پھر وہی پہلا شخص تنہا آواز بلند مثل سابق تکبیر کہتا ہے، اور اس کے خاموش ہونے پر حملہ حاضرین مثل سابق آواز ملا کر تکبیر کہتے ہیں، یہ سلسلہ اسی طرح نماز عید شروع ہونے تک جاری رہتا ہے پس ارشاد ہو کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک عید الفطر میں آواز بلند تکبیر کہنا اور اس کے ساتھ ہی ہیئت متعارفہ مذکورہ کو اختیار کرنا کیسا ہے، آیا مباح ہے یا مستحب یا سنت یا واجب یا مکروہ یا حرام، امام اعظمؒ کے علاوہ ائمہ مجتہدین میں سے کسی نزدیک اس کا ثبوت ہے یا نہیں؟ تکبیر یہ ہے، اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر واللہ اکبر واللہ الحمد،

الجواب؛ قال فی مراقی الفلاح ثم یتوجه الی المصلی ما شیئاً مکبیراً
 ستر ا قال علیہ السلام خیر الذکر الخفی وعندہما جہراً و هو رواية عن
 الامام وکان ابن عمر یرفع صوته بالتکبیر ویقطعہ ای التکبیر اذا انتہی
 الی المصلی فی رواية جزم بہا فی الدراية و فی رواية اذا افتتح الصلوٰۃ کذا
 فی الکافی و علیہ عمل الناس قال ابو جعفر و بہ اخذہم قال الطحاوی فی
 حاشیئہ قال الطحاوی ذکر ابن ابی عمران عن اصحابنا جميعاً ان السنة
 عندهم يوم القطر ان یکبر فی طریق المصلی و هو الصحيح (۳۰۸) و فی رد المحتار
 و جزم فی البدائع بالاولی و عمل الناس فی المساجد علی الروایة الثانية (۳۰۸)
 (ص ۵، ۸، ۱۷) قال الطحاوی فی حاشیئہ مراقی الفلاح قوله وعندہما جہراً
 قال الحلبي الذي ينبغي ان يكون الخلاف في استحباب الجهر و عدمہ
 لانی کراہتہ و عدمہا فعندہما یتعجب الجہر و عندہ الاخفاء افضل و
 ذلك لان الجهر قد نقل عن كثير من السلف (۳۰۸) و کان ابن عمر یرفع
 صوته بالتکبیر اوجب عنہ من طرف الامام بانه قول صحابی فلا يعارض
 به عموم الآية القطعية اعنی قوله و اذ کررتک فی نفسك الی قوله و ان الجہراً
 (ص ۳۰۹) اصل مذہب امام ابو حنیفہ رکایہ ہے کہ عید الفطر میں تکبیر آہستہ کہی جائے اور عید گاہ
 میں پہونچکر ختم کر دی جائے، ظاہر روایت راجح یہی ہے، اب اگر کوئی شخص تکبیر جہر سے کہے اور
 عید گاہ پہونچکر شروع صلوٰۃ تک اس کو مستمر رکھے تو بعض روایات پر اس کی گنجائش تو ہے،
 مگر آواز ملا کر تکبیر کہنا جس سے عادتہ غیر معمولی شور پیدا ہو جاتا ہے خلاف سنت ہے اور بدعت
 ہے، اور قابل ترک ہے، قال صلی اللہ علیہ وسلم ارجعوا علی انفسکم فانکم لاتدعون
 احدکم ولا غائباً، اگر جہر ہی کرنا ہو اور نماز تک تکبیر کو مستمر رکھنا ہو تو ہر شخص کیف ما اتفق
 الگ الگ تکبیر کہتا رہے، اور اتنا جہر کرے کہ دو تین آدمی آس پاس والے سن لیں، نہ زیادہ جہر
 کرے نہ آواز ملانے کا اہتمام کرے، واللہ اعلم، ۲/ ذی الحجہ ۱۴۲۸ھ

نماز عیدین کے بعد سوال (۱۹) صلوٰۃ عیدین اور ان کے خطبہ کے بعد دعاء مانگنا بہتر ہے
 دعاء مانگنے کا حکم یا نہ مانگنا، سلف کا کیا معمول ہے؟

الجواب؛ احادیث سے دعاء کا ثبوت ہوتا ہے، مگر ضروری نہیں، بہتر یہ ہے کہ

دعا کر لیا کریں، اجتماع مسلمین کے وقت دعا قبول ہوتی ہے، ۲ ذی الحجہ ۱۴۲۸ھ

نماز جمعہ اور تعدد جمعہ کی تحقیق | سوال (۲۰)
.....

..... ایک چھوٹے گاؤں میں تقریباً ۵۰۰ گھر ہیں، اور اس گاؤں میں چار مسجدیں ہیں اور چاروں مسجدوں میں جمعہ ہوتا ہے جس کو عرصہ پانچ چھ سال کے قریب ہو گیا ہے، اور اس سے پیشتر دو جمعہ ہوتے تھے، اب یہ جو کہ دو جمعہ ہوتے ہیں، یہ جائز ہیں یا کہ نہیں، اور اس گاؤں میں احتیاط ظہر پڑھنا چاہئے یا کہ نہیں؟

الجواب؛ جس جگہ شرعی قاعدہ سے جمعہ جائز ہے وہاں دو چار جگہ بلکہ دس پانچ جگہ بھی جائز ہے، اب دیکھ لیا جائے کہ اس گاؤں میں صحت جمعہ کے شرائط موجود ہیں یا نہیں جس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ کسی محقق عالم کو یہ گاؤں دکھلا کر پھر مسئلہ دریافت کیا جاوے اور جب تک صحت جمعہ کا یقین نہ ہو جائے اس وقت تک وہاں جمعہ نہ پڑھا جائے، صرف ظہر پڑھنی چاہئے، ۱۹ رمضان ۱۴۲۸ھ

گاؤں میں جمعہ کا حکم | سوال (۲۱) ایک چھوٹا سا گاؤں تقریباً ۱۰۰ یا ۲۰۰ گھروں کی آبادی ہے اور اس گاؤں کی جو مسجد ہے اس کے اندر جمعہ کے روز اس قدر آدمی آتے ہیں کہ تمام مسجد بھر کر اور آدمی باہر باقی رہ جاتے ہیں، آیا اس گاؤں میں جمعہ ہوتا ہے یا کہ نہیں اور اگر جمعہ ہو جاتا ہے تو پھر احتیاط الظہران کو پڑھنا چاہئے یا نہیں، اور اسی طرح ایک گاؤں کل ۱۵ گھروں کی آبادی ہے، اس میں بھی جمعہ ہو گیا یا نہیں، بینوا تو توجروا،

الجواب؛ دوسرے گاؤں میں جمعہ جائز نہیں معلوم ہوتا، صرف ظہر پڑھنی چاہئے، اور پوری تحقیق کسی محقق عالم کو گاؤں دکھلانے سے ہو سکتی ہے، ۱۹ رمضان ۱۴۲۸ھ

اس جزیرہ میں جمعہ کا حکم جو | سوال (۲۲) اس احقر کا وطن ایک جزیرہ میں ہے، جس کا نام متعدد مواضع پر مشتمل ہو ہانیہ ہے، اور اس کے چاروں طرف دریا ہے، موسم سرما میں

وہ جزیرہ خشک رہتا ہے، اور برسات میں دریا اور بارش کے پانی سے اکثر جزیرہ غرقاب ہو جاتا ہے، اس میں ایک سرکاری رہستہ ہے، جو جانب شمال میں لب دریا سے جنوب کی طرف قریب بیس میل تک گیا ہے، جو برسات میں اکثر وہ رہستہ کیچڑ اور پانی سے بھرا رہتا ہے، لوگوں کی آمد و رفت برسات اسی رہستہ پر سے ہوتی ہے، اس میں لوگوں کے مکانات علیحدہ علیحدہ ہیں، بعض جگہ دو تین مکانات ایک دوسرے سے متصل ہیں اور

متصل بھی اس طرح پر کہ ایک مکان سے دوسرے مکان تک باپچہ کا فاصلہ ہوتا ہے، ہندوستان کے قصبہ اور گاؤں کے گھر جو ایک دوسرے متصل ہیں ایسا نہیں ہے، ہاں ایک جگہ کے دو تین گھر البتہ ایک دوسرے متصل ہیں، اور بعض جگہ ایک مکان سے دوسرے مکان تک ایک کافی دو تین چار دس پندرہ کافی تک کا فاصلہ ہوتا ہے، اور یہ بھی واضح ہے کہ اس جزیرہ کی آبادی طولاً قریب پچیس میل اور عرضاً قریب پندرہ میل کے ہوگی، اور بعض نہریں اس طرح پر ہیں کہ دریا کے ایک طرف سے نکال کر دوسری طرف پہنچایا ہے، اور ان نہروں کے ایک طرف سے دوسری طرف پار ہونے کے لئے پل موجود ہیں، اور یہ بھی واضح ہو کہ اس جزیرہ میں مختلف مواضع ہیں، ان مواضع میں متعدد مسجدیں ہیں، مجموعہ مسجدیں اس جزیرہ کے قریب تین سو کے ہوں گی، اس میں لوگ جمعہ پڑھتے ہیں، اور بعض مسجدیں مصلیٰ تیس، بعض میں پچاس اور بعض میں ایک سو ہوتے ہیں، اور بعض مسجدیں جانے کے لئے برسات میں کپڑے بھیسگے کی نوبت پہنچتی ہے، اور ایک مسجد کا فاصلہ دوسری مسجد سے اس قدر ہے کہ اگر ایک مسجد میں اذان دی جاتی ہے تو دوسری مسجد تک بجنی سنی جاتی ہے، اور یہ بھی واضح ہو کہ ان مسجدوں میں فقط جمعہ کے دن گرام کے لوگ جمع ہوتے ہیں، اور پنجگانہ نماز کی جماعت بعض مسجدیں ہوتی ہی نہیں، اور بعض مسجدیں ہوتی بھی ہے، تو جس جس دروازے پر مسجد ہے اس مکان کے چار پانچ آدمی حاضر ہوتے ہیں اور بس،

اور یہ بھی معلوم رہے کہ اس جزیرہ میں ہندو مسلمان، عورت مرد لڑکا قریب ایک لاکھ کے رہتے ہیں، اس میں ایک آفس ہے، جس میں دیوان عدالت اور فوجداری موجود ہے، اور گرام میں اس آفس سے بہت دور دور ہیں، اب دریافت طلب حضور معدن النور سے یہ ہے کہ آیا اس جزیرہ میں حنفی مذہب کے موافق جمعہ پڑھنا درست ہے یا نہیں، جو لوگ اس میں جمعہ پڑھتے ہیں احتیاط ظہران پر پڑھنا لازم ہے یا نہیں؟ اگر کوئی شخص اس میں جمعہ نہ پڑھے تو موافق مذہب حنفی کے عند اللہ اس کا مواخذہ ہو گا یا نہیں، اور اس جگہ میں جو شخص جمعہ نہیں پڑھتا ہے اس کو سب و شتم کرنا اور اس پر لعن طعن کرنا اور مواکلت و مجالست اس سے نہ کرنا اور اس کو جہنمی وغیرہ کہنا شرعاً کیسا ہے، احقر مذمت سے اس مسئلہ میں مترددہ حضور اذروئے ہر بانی جو کچھ رائے عالی اس باب میں ہو تحریر فرما کر کمترین کو سرفراز فرمائیں اور عند اللہ ماجور ہوں،

تنقیح؛ ہر موضع کے جدا جدا حالات نہیں لکھے کہ آبادی کتنی ہے اور بازار مستقل ہے یا نہیں؟

جواب تنقیح؛ واضح رہے کہ بعض موضع کی آبادی قریب ایک میل اور بعض قریب نصف میل کے ہوتی ہے، اور یہ موضع ایک دوسرے متصل ہوتے ہیں، حد فاصل بعض جگہ راستے ہوتے ہیں اور بعض جگہ چھوٹی چھوٹی نہریں ہوتی ہیں، اور موسم سرما میں وہ نہریں خشک رہتی ہیں، اور برسات میں پانی رہتا ہے، ایک طرف سے دوسری طرف جانے کے لئے پل ہوتے ہیں، اور چھوٹی کشتیوں کی آمد و رفت بھی ہوتی ہے، اور بعض موضع میں مکانات تیس چالیس پچاس سو تک یا اس سے کچھ کم و بیش ہوتے ہیں، اور مکانات ان موضع کے فراڈی فراڈی ہوتے ہیں، اور ان موضع میں بعض جگہ ایک بازار ہوتا ہے، ہفتہ میں ان موضع کے لوگ جمع ہو جاتے ہیں، تین چار بجے سے لوگوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے، اور رات کے آٹھ سات بجے تک رہتے ہیں، اور ہر موضع میں دو تین مسجدیں ہوتی ہیں، کہ لوگ اس میں جمعہ پڑھتے ہیں، ایسی جگہوں میں جمعہ پڑھنا موافق مذہب حنفی کے کیسا ہے، اور نہ پڑھنے والے کے لئے کیا حکم ہو سکتا ہے، اس احقر کو فقط رائے عالی معلوم کرنا مقصود ہے، کسی سے لڑنا جھگڑنا ہرگز مقصود نہیں، جو کچھ رائے عالی ہو تحریر فرما کر اپنے خاص خط سے سرفراز فرمائیں، اور یہ بھی واضح رہے کہ دو مکانات کے درمیان جو زمین ہوتی ہے اس میں زراعت کرتے ہیں،

الجواب؛ سارے جزیرے کو تو ایک شہر نہیں کہا جاسکتا، بلکہ یہ ایک پرگنہ ہے، جو متعدد موضع پر مشتمل ہے، پس ان موضع میں سے جس موضع کی شان یہ ہو کہ اس میں تین چار بازار یا اس سے زیادہ کی آبادی ہو اور بازار بھی روزانہ لگتا ہو جس میں ضرورت کی سب چیزیں ملتی ہوں جیسا کپڑا، جوتا، غلہ، گوشت، ترکاری، دوا، دودھ وغیرہ اس میں تو جمعہ جائز ہے اور جس کی آبادی تو اس مقدار کو پہنچتی ہو مگر ضروریات سب وہاں نہ ملتی ہوں نہ بازار روزانہ لگتا ہو وہاں جمعہ جائز نہیں، اور جس جگہ جو از جمعہ میں تردد ہو وہاں جمعہ نہ پڑھیں صرف ظہر پڑھیں، واللہ اعلم، ۳۲ ذی الحجہ ۱۲۸۵ھ

اس شخص کے ثواب کے بارے میں جو اذان کے بعد مسجد سوال (۲۳) جمعہ کے دن بعد اذان کے باہر سے باہر ہو اور وقت خطبہ مسجد میں آئے، بیٹھ رہنا اور جب خطبہ شروع ہو جاوے،

تب آنا کیسا ہی، اور کتنے ثواب کا مستحق ہوگا؟

الجواب؛ باہر بیٹھنے سے کیا مراد ہے، آیا مسجد کی فناء سے بھی باہر یا مسجد کی حد باہر اور فناء مسجد کے اندر، جزیریہ صریح تو نہیں ملا، البتہ فقہار نے فناء مسجد کو حکم مسجد فرمایا ہے اس کا مقتضایہ ہے کہ جو شخص فناء مسجد میں بہ نیت صلوٰۃ جمعہ سویرے داخل ہو جائے گا وہ بھی سویرے آنے والوں میں شمار ہوگا، گو مسجد کی حد میں دیر سے آئے، اور فناء مسجد وہ احاطہ ہے جو مسجد کے متعلق ہے اور داخل باب مسجد ہے، جیسے حوض و حجرات وغیرہ، قلت و فی الحدیث الصحیح تفعد الملائکۃ علی ابواب المسجدين فیکتبون الاول فالاول الحدیث وھذا یفید ان من دخل من باب المسجن فی السابقین یکتب فی السابقین وان لم یدخل فی المسجن بل بقی جالساً فی الاحاطۃ المتعلقة بہ واللہ تعالیٰ اعلم، اور اگر مسجد کے احاطہ سے بھی باہر رہا یعنی دروازہ مسجد میں بھی داخل نہیں ہوا وہ دیر سے آنے والوں میں شمار ہوگا، پس جو شخص عین خطبہ کے وقت آئے گا اس کو حد کے موافق تصدق بیضہ کا ثواب ملے گا، اور جو خطبہ شروع ہونے کے بعد آئے گا وہ جمعہ میں سویرے آنے والوں کے اندر لکھا ہی نہیں جائے گا، لما فی الحدیث فاذا خرج الامام طوا للصحت وجاءوا یستمعون الذکر واللہ اعلم، ۳۰ محرم ۱۳۸۵ھ

سوال (۲۴) جمعہ کی بابت جو لکھا ہے قلعہ کی تفصیل یہ ہے قلعہ کے اندر کوئی غیر آدمی کسی وجہ سے بھی نہیں آسکتا، نہ جمعہ کے واسطے آسکے نہ اور کسی کام کے واسطے، اگر کسی کو کوئی ضرورت ہوتی ہے تو اجازت سے کمان افسر صاحب کی آسکتا ہے، اور ہمارے پیش امام صاحب نے تو نماز عید بھی اسی جگہ پڑھائی تھی حضرت اس مسئلہ کو صاف صاف لکھیں، اگر نماز کے واسطے ممانعت ہو تو کیا حکم ہے، اگر بالکل اجازت نہ ہو تو کیا حکم ہے، اکثر کھلی ہوئی چھاؤنی میں بھی آنے کی ممانعت ہوتی ہے چاروں طرف سنتری لگ جاتے ہیں، وہاں کی بابت بھی تحریر کر دیں تو عین مہربانی کا باعث ہوگا، کیونکہ ایسا موقع ہمارے ساتھ اکثر گذرتا ہے تو فرض نماز نہ رہ جاوے، اور اب ٹریننگ (تعلیم فوج) بھی شروع ہے، جنگل میں جمعہ ہو سکتا ہے یا نہیں، کیونکہ وہاں بھی غیر آدمیوں کے آنے جانے کی ممانعت ہوتی ہے،

الجواب؛ قال فی الدر والاذن العام من الامام وهو یحصل بفتح

الباب الجامع للواردین کافی فلا یضرب باب القلعة لعد واولعادة قديمة
لان الاذن لتمام مقر لاهله وعلقه لمنع العد ولا المصلی نعم لولم یغلق لکان احسن
۱۵ (ص ۸۵، ج ۱ مع الشامی) اس سے معلوم ہوا کہ جس شہر میں جامع مسجد وغیرہ نماز جمعہ
کے لئے موجود ہو اور ان میں نمازیوں میں رکاوٹ نہ ہو، وہاں اگر چھاؤنی یا قلعہ میں جمعہ ادا
کیا جائے تو جائز ہے، گو چھاؤنی اور قلعہ میں دوسرے لوگ نہ آسکتے ہوں، کیونکہ مقصود نماز
سے روکنا نہیں ہے، بلکہ انتظام مقصود ہے، پس قلعہ اور چھاؤنی والے اس حالت میں
جمعہ وعید کر سکتے ہیں بشرطیکہ چھاؤنی یا قلعہ شہر میں یا قنارہ شہر میں اس کے متصل ہو، باقی
جنگل میں جمعہ جائز نہیں، جبکہ وہ جنگل قنارہ شہر میں داخل نہیں، اور قنارہ شہر وہ ہے جس سے
شہر کا تعلق ہو، خواہ قبرستان ہو یا گھوڑ دوڑ کا میدان ہو یا عید گاہ کا موقع ہو وغیرہ
واللہ اعلم، ۱۲ صفر ۱۲۵۴ھ

خطبہ جمعہ میں غیر عربی میں | سوال (۲۵) درمیان خطبہ جمعہ بزبان بنگلہ یا اردو وعظ و تعلیم
مسائل کی تعلیم درست ہے | امور دین درست است یا نہ ؟

الجواب؛ درمیان خطبہ عربیہ بزبان دیگر قدرے تعلیم مسائل رواست،
الدلیل؛ قال فی الدرر ویکرة تکلمه فیہا ای فی الخطبة الا لامر
بمعروف ولا نه منہا ۱۵ (ص ۸۲، ج ۱ مع الشامی) یکم ربيع الاول ۱۲۵۴ھ

نثر یا نظم میں ترجمہ خطبہ سنانے | سوال (۲۶) جمعہ کے پہلے خطبہ میں ترجمہ نثر ہو یا نظم،
کے بعد عربی میں خطبہ پڑھنا | پہلے پڑھ کر بعد عربی میں خطبہ پڑھنا کیسا ہے ؟

الجواب؛ خطبہ میں عربی کے ساتھ اگر کسی وقت کسی خاص ضرورت سے نصیحت
کے طور پر اردو میں بھی کچھ بیان کر دیا جائے تو جائز ہے، لیکن اردو یا فارسی یا عربی نظم
پڑھنا مکروہ ہے، کیونکہ سلف سے خطبہ میں نظم کا پڑھنا منقول نہیں، پس یہ بدعت ہے،
اسی طرح سارا خطبہ اردو میں ہونا یعنی عربی بالکل نہ ہو، یہ بھی بدعت ہے، واللہ اعلم، ۱۲ ربيع
قال العلامة عبد الحی فی فتاویٰ لکن بجہت آنکہ مخالف سنت متواترہ است
(خطبہ بنظم خواندن) خالی از کراہت تزیینی نیست و صاحب نصاب الاحتساب بحرمہ
اور فتہ (ص ۱۴۱ ج ۱ مع الخلاصہ) وقال شیخنا فی امداد الفتاویٰ فقط خطبہ عربی پر
اكتفاء کرنا چاہئے، ترجمہ وغیرہ کرنا بہتر نہیں ہے، ہاں اگر کوئی نصیحت مناسب وقت

کسی واقعہ میں کر دی جائے تو جائز ہے، یکرہ للخطیب ان یکلم فی حال الخطبۃ الا ان یکون امر ابصر وف کذا فی الفتح عالمگیری (ص ۱۲۵ ج ۱) ویروی رجوعہ فی اصل المسئلة الی قولہما وعلیہ الاعتماد والخطبۃ والتشہد علی هذا الاختلاف ۱۲ ہدایۃ، قال الشیخ فلما ثبت الرجوع عنہ فی القراءۃ ثبت فی الخطبۃ بالفارسیۃ ایضاً (ص ۱۰۳ ج ۱) فقط،

خطبہ کے وقت ہاتھ میں عصا | سوال (۲۷) عصا گرفتن در خطبہ جمعہ مستحب است، لینا خلاف سنت نہیں، | یا نہ، آنچہ در بحر الرائق وعالمگیری آورده کہ ہر شہر کہ فتح آن بغلبہ شدہ باشد در آن شہر سیف گرفتہ خطبہ گوید و ہر شہر کہ برضار و رغبت اسلام آورده باشد بلا سیف خطبہ گوید، این منسرق صحیح است یا نہ، بنیوا و توجروا؟

الجواب؛ اخذ عصا در خطبہ خلاف سنت نیست، و آنچہ در کتب حنفیہ قول بکراہت وعدم سنیت مذکور است، مراد بآں کراہت اعتقاد سنت مقصودہ است، و اما نفس این فعل بدون اعتقاد مذکور خلاف سنت نیست صراح بہ فی رد المحتار و فی الطحطاوی علی مراآقی الفلاح (ص ۲۹۹ ج ۱) و در بحر الرائق وعالمگیری فریقہ میان بلد مفتوح بالغلبہ و بغیر غلبہ نوشتہ اند صحیح است، واللہ اعلم، ۵ ج ۲ ص ۲۳۳

مسجد واحد میں تعدد | سوال (۲۸) شہر مولین کے اطراف میں ایک جگہ کے لوگوں میں کسی وجہ سے تفرقہ جمعہ جائز نہیں، شہر مولین کے اطراف میں ایک جگہ کے لوگوں میں کسی وجہ سے تفرقہ پیدا ہوا، ایک فریق کے لوگ بروز جمعہ مسجد کے امام کے ساتھ نماز جمعہ ادا کرتے وقت دوسرے فریق کے لوگ اقتدار نہ کر کے الگ رہتے ہیں، فریق اول کے لوگ نماز جمعہ ہونے کے بعد فوراً دوسرے فریق کے لوگ دوسرا ایک امام کھڑا کر کے نماز جمعہ ادا کرتے ہیں، پس سوال یہ ہے کہ اس طور سے ایک مسجد میں دو مرتبہ نماز جمعہ ادا کرنا درست ہو یا نہیں، اور فریق اول کی نماز جمعہ صحیح ہے یا نہیں، اور فریق ثانی کی نماز جمعہ کا کیا حکم ہے، بنیوا بالدلیل توجروا بالاجرا الجزیل،

الجواب؛ تعدد جمعہ مسجد واحد میں جائز نہیں، اور اسی صورت میں جماعت اولیٰ کی نماز تو صحیح ہو جائے گی، دوسری جماعت کی صحیح نہ ہوگی، قال فی الدرر توذی فی مصر واحد بمواضع کثیرۃ مطلقاً علی المنہب ام قال الشامی فقد ذکر السرخسی ان الصحیح من منہب ابی حنیفہ جواز اقامتها فی مصر واحد فی مسجدین و اکثر

وبہ ناخذ اہم (ص ۸۴۳ ج ۱) قلت و قیوداً لفقہ احترازیة وقد قیل و اجوازاها
بمواضع كثيرة و بمسجدین فصاعداً فمفادہ عدم جواز التعدد فی مسجد واحد
کیف لا و جواز التعدد فی مسجدین مختلف فیہ ایضاً و عدم الجواز هو الظاہ
ولکنہم جوزوه للضرورة ففی رد المحتار بل قال السبکی من الشافعية انه رای
عدم جواز التعدد (د) قول اکثر العلماء ولا یحفظ عن صحابی ولا تابعی تجویز
تعددہا اہم الی ان قال ولذا قال فی شرح المنیۃ الاولی هو الاحتیاط لان
الخلافا فی جواز التعدد و عدمہ قوی و کون الصحیح الجواز للضرورة و رد للفتو
لا یمنع شریعۃ الاحتیاط للفقہی اہم (ص ۸۴۴ ج ۱) قلت فلما کان هذا
حال التعدد فی موضعین فکیف بہ فی موضع واحد لعدم الضرورة فیہ
اصلاً و عدم تجویزہ عن احد من الائمة فیمنع کل المنع واللہ اعلم ۱۲ رجب
احکام خطبہ عید | سوال (۲۹) مسئلہ: عیدین کی نماز کے بعد خطبہ پڑھنا سنت مؤکدہ
ہے، (شامی، ص ۸۶۵ ج ۱)

مسئلہ: جب تک امام خطبہ پڑھے اس وقت تک سب نمازیوں کا بیٹھا رہنا بھی
سنت ہے، امام کی فراغت سے پہلے مقتدیوں کا چلا جانا مکروہ ہی، جس سے گناہ ہوتا ہے،
(در مختار مع الشامی، ص ۸۷۴ ج ۱) اور اس کراہت پر مالکیہ و شافعیہ کا بھی اتفاق ہے
(المدونة لما لک، ص ۱۵۵ ج ۱ و کتاب الامم للشافعی، ص ۲۱۲ ج ۱)

مسئلہ: اور جو لوگ خطبہ کے وقت عید گاہ میں موجود ہوں، ان کو خطبہ ہوتے ہوئے
بات چیت کرنا جائز نہیں، خطبہ چھوڑ کر چلا جانا تو مکروہ ہی ہے، اور خطبہ ہوتے ہوئے عید گاہ
میں رہ کر بات چیت کرنا حرام ہے (شامی و در مختار، ص ۸۵۸ ج ۱) پس یہ جو دستور ہے
کہ لوگ نماز عید کے ختم ہوتے عید گاہ ہی میں بات چیت کرنے اور معانقہ وغیرہ کرنے لگتے
ہیں، حالانکہ اس وقت امام خطبہ پڑھنے میں مشغول ہوتا ہے، یہ فعل ناجائز ہے،

مسئلہ: خطبہ عیدین میں امام کو پہلے خطبہ میں کھڑے ہوتے ہی اول تو دفعۃً تکبیر
اللہ اکبر اللہ اکبر کہہ کر خطبہ شروع کرنا چاہئے، اور دوسرے خطبہ میں اول سات تکبیریں کہہ کر
خطبہ شروع کرنا چاہئے، یہ سنت ہی، اکثر لوگ اس سنت پر عمل نہیں کرتے، اس کو زندہ کرنا
چاہئے، (شامی ۸۷۴ ج ۱) اس سنت کی دلیل حدیث سے کتاب الامم للشافعی (ص ۲۱۱ ج ۱)

میں موجود ہے، واللہ اعلم، ۲/ ذی الحجہ ۱۳۳۳ھ
سوال (۳۰) جمعہ کے دونوں خطبوں کے بعد امام منبر
 اختتام خطبہ کے بعد متصل اقامت شروع ہو تو امام سماع اقامت کے لئے بیٹھے یا نہیں
 یا حتی علی الصلوة پر مع مقتدی کھڑے ہوں یا شروع تکبیر اولی اللہ اکبر پر مع مقتدی کھڑے
 ہو کر سنے،

الجواب؛ جمعہ کے دونوں خطبوں کے بعد بالاتفاق تکبیر کے شروع ہی سے کھڑے
 ہوں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور صحابہ سے کہیں سے ثابت نہیں، کہ وہ خطبہ
 پڑھ کر بیٹھے ہوں، وفي باب الجمعة واذا التم اقيمت ويكره الفصل ۱۸، قال الشافعي
 بحيث يتصل اول الاقامة باخر الخطبة وينتهي الاقامة بقيام الخطيب
 مقام الصلوة ۱۸ (ص ۸۶۱ ج ۱) فيه دلالة على ان الخطيب لا يجلس بعد الخطبة
 بل يقوم في موضع الصلوة فلو كان القيام عند حتى على الصلوة مند وبافي الجمعة
 لندب للخطيب ايضا لكون الامام والمقتدى في هذا الحكم سواء ولان الجماعة
 كثيرة يتعسر بهما تسوية الصفوف بالعجلة فينبغي لهم القيام بعد الخطبة
 مع الاقامة كما قالوا ان التحليق هو الافضل لسماع الخطبة ولكن الرسم
 الان انهم يستقبلون القبلة للخرج في تسوية الصف لكثرة الزحام كذا
 في شرح الهداية للسروجي قال في شرح المنية واذا فرغ من الخطبة اقاموا
 الصلوة ۱۸ (ص ۵۲۰) واقاموا امر لكل، واللہ تعالیٰ اعلم، ۲۰ رجب ۱۳۳۳ھ

سوال (۳۱) جو لوگ جنگل میں کھیت وغیرہ پر رہتے ہیں
 اور بعض کے وہاں سے آنے میں نقصان مال کا خوف ہے، اور بعض کے آنے میں کچھ نقصان
 بھی نہیں، تو ان میں سے ترک جمعہ سے کون فریق گنہگار اور کون نہیں، اور جبکہ اذان جمعہ
 کی آواز بعض کو آتی ہے اور بعض کو نہیں آتی، فقط والسلام

الجواب؛ جس کو جمعہ اور جماعت کی نماز میں شریک ہونے سے کھیت یا مال کے
 نقصان کا خوف ہو مثلاً غلہ کاٹ کر کھلیان میں ڈال رکھا ہے، اور چوری ہو جانے کا
 اندیشہ ہو تو اس صورت میں جمعہ و جماعت کے ترک سے گناہ نہ ہوگا، قال فی الدرر او
 خوف علی مالہ قال الشافعی ای من نص ونحوہ اذا لم یکنہ غلق الدکان او البیت

مثلاً ومنه خوفه علی تلف طعام فی قدر او خبز فی تنور تا مل ام (ص ۵۸ ج ۱)
 اور جس کو کھیت سے مسجد تک آنے میں نقصان کا اندیشہ نہیں اس کو جمعہ کا ترک کرنا
 جائز نہیں، گناہ ہوگا، باقی اوقات کی جماعت کا ترک کھیت پر رہنے والوں کو اس وقت
 ناجائز ہے جبکہ کھیت آبادی سے متصل ہو، اور جو آبادی سے اتنا دور ہو کہ اذان کی آواز
 وہاں تک نہ پہنچتی ہو، نیز وہاں سے آبادی میں آنا اور واپس جانا موجب کلفت و
 حرج ہو تو اس صورت میں کھیت والوں پر مسجد میں آنا واجب نہیں، کھیت ہی پر
 جماعت کر لیں، اور جماعت نہ کر سکیں تو تنہا پڑھ لینا ہی جائز ہے، عن ابی ہریرۃ
 مرفوعاً لیلتنہن الرجال من حول المسجد لا یشہد ون العشاء الاخرة فی
 الجیمع اولاً حرقن بیوتہم رواہ احمد و رجالہ موثقون و جمع الزوائد
 ص ۵۸ ج ۱) وعن صفوان بن امیۃ قال سئلت عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ
 وسلم فقام عرفطۃ بن نہیک فقال یا رسول اللہ انی و اہل بیتی مرزوقون
 من هذا الصید و هو مشغلة عن ذکر اللہ و عن الصلوة فی جماعۃ و بنا الیہ
 حاجۃ افتعلہ ام تحرمہ قال احلہ لان اللہ عزوجل قد احلہ و یکفیک
 من الصلوة فی جماعۃ اذ رغبت عنہا فی طلب الرزق حبک للجماعۃ و اہلہا
 و حبک لذلک اللہ و اہلہ رواہ الطبرانی فی الکبیر و فیہ بشر بن نسیر
 متروک ام (ص ۱۶۱ ج ۱) قلت و لکنہ مؤید بالنصوص المصرحة بنفی
 العرج عن الامۃ، واللہ اعلم، ۵ اشعبان ۱۲۲ھ

چر دا ہے پر نماز جمعہ فرض ہی یا نہیں | سوال (۳۲) ایک شخص اپنا ریوڑ بھیڑ بکری چرا رہا
 ہے، اور جمعہ کا روز ہے تو فرمائیے کہ اس پر نماز جمعہ کی فرض ہے یا کہ ظہر کی؟
 الجواب: اگر یہ شخص فنا بمصر میں بکریاں چرا رہا ہے تو اس پر جمعہ میں آنا
 واجب ہے، اور بکریوں کو اپنے ساتھ واپس لے آئے، بعد جمعہ کے پھر لے جائے، اور
 اگر فنا بمصر سے اتنا دور ہے کہ شہر سے میل بھر کا فاصلہ ہو جائے تو اس صورت میں
 اس سے جمعہ ساقط ہے، ظہر کی نماز پڑھ لے، بشرطیکہ وہ شہر سے قبل زوال کے نکل گیا ہو
 قیاساً علی التیمم قال فی نورا لا یضاح ادا لاقامۃ فیما ای فی ہود اخل
 فی حد الاقامۃ بما ای بالمصر فی الاصح کریم المصر و فناء

الذی لم یفصل عنه بغلوة ولا یجب علی من کان خارجہ ولو سمع النداء من المصلي
(ص ۲۹۲) واللہ اعلم ، ۲۷ سوال ۲۲۴

گاؤں اور قصبہ کی تعریف | سوال (۳۳) حنفیہ کے

نزدیک ایسے گاؤں میں جمعہ جائز ہے یا نہیں جس کی تعریف حسب ذیل ہے :-

آبادی ۱۹۴۸ ہے، جس میں مسلمان مختلف قومیں آباد ہیں شیخ، مغل، پٹھان، زمیندار
راجپوت نو مسلم، لوہار، بڑھتی، نائی، دھوبی، قصائی تیلی، منہیار، درزی، تیرگر، ڈوم، خراڈ
نڈاف، جولاہا، سقہ، عطار، پنساری، بزاز وغیرہ وغیرہ، وسط گاؤں میں مسلسل دو طرفہ
تقریباً چالیس دکانیں، ایک ڈاک خانہ ہے، ایک ہی مسجد ہے، مح حوض نہایت عالیشان
ہے پہلے سے جمعہ ہوتا آیا ہے، اب اختلاف ہوا ہے،

الجواب: اصل یہ ہے کہ گاؤں میں جمعہ صحیح نہیں اور شہر و قصبہ میں صحیح ہے
قصبہ کی تعریف ہمارے عرف میں یہ ہے کہ جہاں آبادی چار ہزار کے قریب یا اس سے زیادہ
ہو، اور ایسا بازار موجود ہو جس میں دکانیں چالیس پچاس متصل ہوں، اور بازار روزانہ لگتا
ہو، اور اس بازار میں ضروریات روزمرہ کی ملتی ہوں، مثلاً جوتہ کی دکان بھی ہو، اور کپڑے
کی بھی، عطار کی بھی ہو بزاز کی بھی، غلہ کی بھی اور دودھ گھی کی بھی، اور وہاں ڈاکٹر چکنیم
بھی ہوں معمار و ستری بھی ہوں وغیرہ وغیرہ اور وہاں ڈاکخانہ بھی ہو، اور پولیس کا تھانہ یا چوکی
بھی ہو، اور اس میں مختلف محلے مختلف ناموں سے موسوم ہوں،

پس جس بستی میں یہ شرائط موجود ہوں گے وہاں جمعہ صحیح ہوگا، در نہ صحیح نہ ہوگا، قال
فی رد المحتار عن ابی حنیفہ انه بلدة کبيرة فیہا سکک واسواق ولہا رساتین
وفیہا وال یقدر علی انصاف المظلوم من الظالم بحشمتہ وعلیہ او علم غیرہ یرج
الناس الیہ فیما یقع من الحوادث وهذا هو الاصح اھ (ص ۸۳۵ ج ۱) قلت
اقتنا البولیس وقیامہ مقام الوالی لرجوع الناس الیہ فی الحوادث والرساتین
المحلات والقری التابعة لہا، وقال فی الغنیۃ المستملی والفصل فی ذلک ان
مکة والمدینہ مصران تقام بہما الجمعة من زمانہ علیہ الصلوة والسلام
الی الیوم فکل موضع کان مثل احد ہما فہو مصر فکل تفسیر لا یرد علی احد
فہو غیر معتبر ثم صح الروایۃ التي ذکرناھا عن الامام وقال قال قاضی خان

والاعتقاد علی مارونی عن ابی حنیفة کل موضع بلغت ابنته ابنة منی
وفیه مفتی وقاصین فهو مصر جامع وعن محمد ان کل موضع مصر الامام
فهو مصر حتی انه لو بعث الی قرية نائبا لاقامة الحدود والقیاس تصیر
مصر فاذا عزله تلحق بالقریة ووجه ذلك ما صح انه كان لعثمان عبداً
اسود امیرا علی الربذة یصلی خلفه ابو ذر وعشرة من الصحابة الجمعة
وغیرها، ذکره ابن حزم فی المحلی ام (ص ۵۱۱ و ۵۱۲)

وفی الخلاصة الامام اذا منع اهل المصر ان یجمعوا لم یجمعوا کما ان له
ان یمصر موضعاً کان له ان ینهاهم (ای اذا لم یکن منعه تعنتاً واضلاً
بل اراد ان یمصر ذلك الموضع من ان یمصر مصر اقاله الفقیه ابو جعفر ۱۲)
ولو ان اماماً مصر مصر ثم نفى الناس عنه لخوف عدو ما شبه ذلك ثم
عادوا الیه فانهم لا یجمعون الا باذن مستانف من الامام اه (۲۰۸ ج ۱)
ان عبارات سے معلوم ہوا کہ مصر مصر ہونے کے بعد جب تک کہ امام اس کو مصریت سے
نہ نکالے، مصر باقی رہتا ہے، مگر یہ کہ اس کے کل باشندے وہاں سے بھاگ جائیں تو از سر نو
اذن امام کی ضرورت ہی، اور جہاں امام نہ ہو وہاں عامۃ الناس بجائے
امام کے ہیں، پس جو بستی ایک دفعہ قصبہ ہو چکی اور وہاں جمعہ قائم ہو چکا، تو جب تک ...
وہاں پر آثار قصبہ کے مثلاً بازار اور عمارات کی ہیئت باقی ہوگی وہ قصبہ رہے گا جب تک
کہ عرف عام اس کو قصبہ ہونے سے نہ نکالے،

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ قصبہ ہونے کے لئے ابنیہ و عمارات کی خاص ہیئت کو بھی دخل
ہے، واللہ اعلم، ۲۶، زیقعدہ ص ۳۸

جیل میں نماز جمعہ کا حکم | سوال (۳۴) اگر کسی شہر کے جیل خانے میں کثرت سے مسلمان
قیدی ہوں، اور گورنمنٹ کی طرف سے جیل کے اندر کسی مقرر جگہ میں نماز پڑھنے کی اجازت
مل جائے، اور باہر کے کسی مولوی صاحب کو جمعہ پڑھانے کی اجازت ملے تو اس صورت میں
قید خانہ میں جمعہ جائز ہے یا کہ نہیں؟

الجواب: صحت صلوة جمعہ کے شرائط میں سے اذن عام بھی ہے، اور صورت مذکورہ
فی السؤال میں وہ مفقود ہے، لہذا جمعہ صحیح نہ ہوگا، فی الدر المختار فلا یضر غلق باب

القلعة لعدو أو لعادة قديمة لأن الأذن العام مقر لاهله وغلقه لمنع العدو ولا المصلي نعم لو لم يغلق لكان أحسن كما في مجمع الأنهر معني يا شرح عيون المذهب قال وهذا أولى مما في البحر والمنع فليحفظ وقال الشامي ر قوله لأن الأذن العام مقر لاهله) أي لاهل القلعة لأنها في معنى الحصن والاحسن عود الضمير إلى المضمرة المفهوم عن المقام لأنه لا يكفي الأذن لاهل الحصن فقط بل الشرط الأذن للجماعات كلها كما مر عن البدائع (قوله وغلقه لمنع العدو والخ) أي أن الأذن هنا موجود قبل غلق الباب لكل من أراد الصلوة والذي يضرب أنها هو منع المصلين لا منع العدو وقوله لكان أحسن) لأنه إبعاد عن الشبهة لأن الظاهر اشتراط الأذن وقت الصلوة لا قبلها لأن النداء للاشتهاار كما مروهم يغلقون الباب وقت النداء أو قبيله الخ (ص ۸۵ ج ۱)

اور شامی میں کافی کی عبارت ہے (لأن اشتراط السلطان للحرز عن تقوية الناس وذا لا يحصل إلا بآذن العام) کے بعد جو کہا ہے، قلت وینبغي ان يكون محل النزاع ما اذا كان لا تقام الا في محل واحد اما لو تعددت فلا لأنه لا يتحقق التقوية كما افاده التعليل تأمل، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شامی کے نزدیک جیل خانہ میں جمعہ جائز ہے، جب کہ اس شہر میں دوسری جگہ بھی جمعہ ہوتا ہو، لیکن تحریر مختار میں قول مذکور پر لکھتے ہیں لا يلزم من انتفاء العلة انتفاء المعلول فالعق ابقاء الكلام على عمومها وان انتفت هذه العلة التي ذكرها لاحتمال علة اخرى اقتضت العموم على ان ما تقدم عن البدائع من التعليل يقتضي عموم الحكم وقد قالوا لا يلزم من بطلان الدليل المعين بطلان المدلول (ص ۱۱۲ ج ۱)

ونیز بحر الرائق (ص ۵۱ ج ۲) میں ہے (فلو امر انسانا بجمع بهم في الجامع وهو في مسجد اخر جاز لاهل الجامع دون اهل المسجد الا اذا علم الناس ذلك) اس سے بھی ظاہر ایسی معلوم ہوا کہ بدون اذن عام کسی حال میں جمعہ صحیح نہیں، پس جلیانہ میں جمعہ نہ پڑھنا چاہیے، اور اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بھی چونکہ نمازیوں کو عام اجازت نہیں، اس لئے اسٹیشن پر بھی باوجود مصر یا فناء مصر ہونے کے جمعہ صحیح نہ ہوگا، واللہ اعلم، احقر عبد الکریم عفی عنہ، الجواب صحیح، انشاء اللہ تعالیٰ ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۲۱/۲/۱۴۳۵ھ

مصر کی تعریف | سوال (۳۵) قریہ کبیرہ کی کیا تحدید ہے، کہ وہاں صلوٰۃ جمعہ واجب ہے،

قریہ صغیرہ و کبیرہ میں نہایت اشتباہ ہے، تشفی بخشنے؟

الجواب؛ مصر کی علامات ہر زمانہ میں مختلف ہوتی ہیں، آج کل علامات یہ ہیں کہ تین چار ہزار کی آبادی ہو، بازار ہو، جس میں سب ضروریات ملتی ہوں اور وہ بازار مستقل ہو، ہفتہ وار بازار لگنا کافی نہیں، اور ڈاک خانہ وغیرہ ہو، ۸ ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ

خطبہ کے وقت ہاتھ میں عصا لینا | سوال (۳۶) جمعہ کو خطبہ سے قبل خادم مسجد آن کر

منبر پر جانا نماز پچھا جاتا ہے، اور کتاب خطبہ رکھ جاتا ہے، اور ایک چھڑی پتلی سی بانس کی جو نہایت صاف ستھری ہوتی ہے منبر پر رکھ جاتا ہے، چنانچہ جب امام صاحب منبر پر خطبہ سننے کے واسطے کھڑے ہوتے ہیں تو اسی چھڑی کو ہاتھ میں لے لیتے ہیں اس بابے میں ناواقف لوگوں نے امام صاحب سے دریافت کیا تو فرمایا کہ جناب رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم جب خطبہ پڑھتے تھے تو کسی وقت آپ نے ہاتھ میں تلوار لی ہے اور کبھی کمان اور کبھی نیزہ اور لکڑی، چنانچہ بطریق سنت ایسا کیا جاتا ہے، اور مشکوٰۃ شریف میں لکھا ہے، چنانچہ جناب سے دریافت طلب ہے کہ اس کی کیا صورت ہے؟ امید ہے کہ جواب سے آگاہی فرمائی جائے گی؟

الجواب؛ عصا لینا مستحب ہے، لیکن اگر اس کو ضروری سمجھا جاوے اور تارک پر ملامت کی جائے تو التزام بالایلزم کی وجہ سے منع کیا جائے گا، فی الدرر ویکرہ ان یتکی علی قوس او عصاء و فی الشامی لقل القہستانی عن عین المحيط ان اخذ عصا سنۃ کالقیام (ص ۸۶۲ ج ۱) وقال شیخنا مدظلہم العالی ان الکراہۃ محمولۃ علی مقصودہ، واللہ اعلم کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ ۸ ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ، الجواب صحیح ظواہر عفا اللہ عنہ

جمعہ کی دونوں اذانوں کے درمیان کھانا پینا اور خطبہ | سوال (۳۷) جمعہ کی اول اذان کے بعد نیت باندھنے سے قبل باتیں کرنے کا حکم، لے کر خطبہ کی اذان تک اور ایسے ہی

خطبہ کی اذان سے نماز کے ختم تک کھانا پینا کیسا ہے، کیونکہ اکثر لوگ مسجد میں آکر خطبہ شروع ہونے سے پہلے بھی اور پیچھے بھی پانی پیتے رہتے ہیں، خطبہ ختم ہونے کے بعد نیت باندھنے تک بول چال کرنی مثلاً نمازیوں کو پیچھے سے

آگے بلانا یا صفت سیدھی کرنے کے لئے بول چال کرنا کیسا ہے ؟

الجواب، دونوں اذانوں کے درمیان کھانا جائز ہے، بشرطیکہ جمعہ فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو، اگر فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو کھانا جائز نہیں فی الدر المختار مع النہاء وهو یاکل ترکہ ان خاف فوت جمعة او مكتوبة لاجماعة (شامی، ص ۸۶۲ ج ۱) اور خطبہ کے وقت کھانا پینا کلام کرنا حرام ہے، کما فی الدر ایضاً وکل ما حرم فی الصلوٰۃ حرم فیہا ای فی الخطبة خلاصة وغیرہا فی حرم اکل وشرب وكلام الخ ص ۸۵ اور خطبہ واقامت کے درمیان بھی امام صاحب کے نزدیک کسی قسم کا کلام جائز نہیں البتہ صاحبین کے قول پر فقط دنیوی کلام ناجائز ہے، اور تسویۃ صفوف کے لئے کلام کی گنجائش ہے، کما فی الدر المختار وقال لا بأس بالكلام قبل الخطبة وبعدھا واذا جلس عند الثاني والخلاف فی کلام یعلق بالآخرة اما غیرہ فیکره اجماعاً، کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ، الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ

کیا نابینا پر نماز جمعہ واجب ہے؟ **سوال** (۳۸) ایسے اندھے پر جمعہ واجب ہے یا نہیں کہ جو شہر کے اندر رہتا ہو، مکان متصل جامع مسجد ہو اور اندھا آسانی مسجد میں یا اس سے بھی دو چند چار چند فاصلہ کے سفر کو روزانہ طے کیا کرتا ہو، اور بلا کسی دوسرے آدمی کے مدد کے سارے شہر میں گھوم آتا ہے، لیکن سڑکوں اور جامع مسجد لب سڑک ہے، اور پانی کنویں میں سے خود کھینچ کر بھر لیتا ہے، کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی، کبھی کبھی خفیف سی چوٹ دیوار وغیرہ کے ٹکرا جانے سے آجاتی ہے،

الجواب، جو نابینا بدون دوسرے شخص کے ہمراہ ہوئے بھی پھرتا ہے اور اس کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی اس کے ذمہ جمعہ واجب ہے کما فی الشامی (ص ۸۵) واقول بل ینظر لی وجوبہا علی بعض العیامان الذی یشی فی الاسواق ویعرف الطرق بلا قائد ولا کلفة ویعرف ای مسجد ارادة بلا سوال احد لانه حیذ عن کالمریض القادر علی الخروج بنفسه بل ربما یلحقه مشقة اکثر من هذا فتامل، فقط، کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ، یکم محرم الحرام یوم شنبہ الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ

سوال (۳۹) جو دیہات شہر یا قصبہ سے اتنی دور ہوں کہ اہل دیہات جمعہ کی نماز پڑھ کر

شہر یا قصبہ سے اپنے مکان پر شام تک واپس چلے جاویں تو ان اہل دیہات پر جمعہ فرض ہے یا نہیں؟

الجواب؛ اس قصبہ اور گاؤں میں کھیتوں وغیرہ کا فصل ہو اور وہ قصبہ سے جدا سمجھا جاتا ہو، تو اس گاؤں کے باشندوں پر جمعہ فرض نہیں، گو ایک دو ہی میل کا فصل ہو، اور اگر فصل درمیان میں نہیں بلکہ قصبہ کی آبادی گاؤں تک متصل چلی گئی ہو تو گاؤں والوں پر جمعہ فرض ہوگا، ۲۳ رجب ۱۲۵۵ھ

حضرت تھانویؒ کے قول اور احسن القرنیؒ کی عبارت دربارہ تعریف مصر میں رفع اختلاف کے متعلق ایک سوال کا جواب

سوال (۴۰) جناب کی اکثر تصانیف سے ثابت ہوتا ہے کہ مصر کی تعریف میں جو اقوال منقول ہیں وہ تحدید حقیقی کے لئے

نہیں بلکہ رسم ناقص ہیں، اور احسن القرنی ص ۶۳ و ۲۰۷ میں اس کے خلاف مصرح ہے نیز اگر درحقیقت یہ رسوم ہوں تو فقہاء کے بعض تعریفوں کو مزلیف اور بعض کو صحیح و مرجع قرار دینے کا کیا مطلب ہوگا؟ مثلاً علامہ حلبی کبیری ص ۵۰۷ پر مالایسح اکبر مساجدہ الخ کو غیر صحیح فرماتے ہیں، لعدم صدقہ علی الحرمین، اگر رسم مراد ہوتی تو اس تعلیل کی کیا توجیہ، طحاوی ص ۲۳۹ میں اس تعریف کو غیر صحیح کہا ہے، درمختار و شرح وقایہ میں اسی تعریف کو مفتی بہ ٹھہرایا ہے، لظہور التوالی، اور نشانی میں اس کی تائید میں چند اقوال نقل کئے ہیں، ہدایہ میں امام صاحب سے مصر کی تعریف فیہ سلک واسواق ووال الخ منقول ہے، اور یہی ظاہر المذہب ہی، کبیری ص ۵۰۷ میں اسی کو ترجیح دی ہے، اور ظاہر الروایت کہا، اور شامی ص ۵۳ میں بھی ظاہر الروایت کو ترجیح دی ہے، نیز اسی میں یہ بھی لکھا ہے کہ تعریف مالایسح الخ اکبر قرنی پر بھی صادق آجاتی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں تعریفوں کا مال ایک نہیں، ورنہ اس تعریف کے صدق کی تخصیص چہ معنی؟

(۲) والی جس تریہ میں چلا جائے وہ مصر ہو جاتا ہے، کما ہو مصرح فی الفقہ، یہ قریہ کس تعریف کے بموجب مصر کہلائے گی؟

(۳) اگر سب تعریفیں عرفی ہیں تو موجودہ عرف میں مصر کی جامع مانع تعریف کیا ہوگی، بعض اطراف میں تو چھوٹی چھوٹی بستیوں کو بھی شہر کہتے ہیں، ان کا عرف معتبر ہو گا یا نہیں، ایسی تحدید فرمائیں کہ محل تجمع و تقید عند اختلاف صاحب مختار ہو جائے

الجواب؛ (۱) مولانا دام محمد رحمہ اللہ کا مطلب اس سے یہ ہے کہ جمعہ کی حد حقیقی موافق اصطلاح میزانیین مراد فقہاء نہیں، بلکہ وہ جو کچھ بیان فرما رہے ہیں رسوم ہیں، جن کا بنی یہ ہے کہ وہ اس موضع میں جمعہ کی اجازت دینا چاہتے ہیں، چونکہ اور مدینہ کی اُس حالت کے موافق ہو جس حالت پر یہ دونوں بلدان کرمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے، اور ظاہر ہے کہ اس معیار کو حد حقیقی کے ساتھ بیان کرنا دشوار ہے، کیونکہ اختلاف امصار سے اس معیار کا مصداق مختلف ہوتا رہتا ہے، دوسرے مفہوم بھی فی نفسہ کلی نہیں جس کو حد کلی سے بیان کر دیا جاتے، بلکہ جزئی ہے، اور مفہوم جزئی کو جب کلی کیا جاتے گا تو لا محالہ وہ رسم ہی ہوگی، لیکن رسم سے رسم فقہی مراد ہے، نہ کہ رسم عرفی محض پس اب مولانا کے ارشاد اور حسن القرنی کی عبارت میں کوئی مخالفت نہیں، قال ابن الجلبی فی شرح المنیۃ والفصل فی ذلک ان مکة والمدینۃ مصران تقام بہما الجمعة من زمانہ صلی اللہ علیہ وسلم الی الیوم فکل موضع کان مثل احد ہما مفہوم مصر، فکل تفسیر لا یرد علی احد ہما مفہوم غیر معتبراہ (ص ۵۱۱) اور فقہاء کا بعض رسوم کو مزین و مرجح کرنا اسی پر مبنی ہے کہ بعض اس معیار میں جامع اور مانع ہیں اور بعض نہیں،

(۲) یہ تریہ بموجب تعریف منقول از امام ابو حنیفہ مصر ہو جائے گا، عن ابی حنیفۃؒ انہ بلدۃ کبیرۃ فیہا سکک واسواق واساتیق فیہا وال یقدر علی الانصاف الخ کیونکہ جب وہاں والی ہوگا تو اس کا علم و محکمہ و عدالت و فوج بھی ساتھ ہوگا، جس سے اسواق و اساتیق کا تحقق خود بخود ہو جائے گا، اور ان کا تحقق نہ بھی ہوگا تو یقیناً اس وقت امصار کبیرہ قریبہ اس قریہ کے تابع ہو جائیں گے جہاں والی موجود ہے، کہ اوامر و نواہی میں اہل امصار اُس قریہ کی طرف رجوع کریں گے، اور جب چند قریہ کی تبعیت سے مصر ہو جاتا ہے، تو امصار کی تبعیت سے قریہ مصر کیوں نہ ہوگا، اس صورت میں اس گاؤں کو اقرب مصر الیہا کا جزو اعظم اور اس مصر کو اس کے تابع ماننے کی وجہ سے مصر کہا جائے گا، اور نزول والی فی القریہ کے وقت اقرب مصر کا اس قریہ کا تابع ہو جانا مشاہدہ بشرطیکہ والی من حیث الولاية نزول کرے، کہ یہی مراد فقہاء ہے، خفیہ گشت و جاسوسی کے طور پر نزول کرے،

یہ تو ادا پر معلوم ہو چکا کہ فقہاء کا یہ مطلب نہیں کہ مصریت و قرویت کا مدار محض عرف عام و رائے اہل عرف پر ہے، بلکہ اس کے لئے اُن کے نزدیک معیار شرعی ضرور ہے، جس کو وہ مختلف عبارات سے اس لئے بیان کرتے ہیں کہ اختلافِ زمان سے اس معیار کا مصداق مختلف ہو جاتا ہے،

پس اس بنا پر ہم کہتے ہیں کہ اصل معیار مصر تو مکہ و مدینہ کی حالت موجودہ فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے، اور اس معیار کی احسن تفسیر وہ ہے جو امام صاحب سے خود منقول ہے، اور آجکل اس تعریف کا مصداق ہندوستان میں ہمارے نزدیک ہر وہ موضع ہے جس کی آبادی قریب چار ہزار کے ہو یا اس سے زیادہ اور وہاں ایسا بازار موجود ہو جس میں تیس چالیس دوکانیں متصل یک جا ہوں کہ بازار اسی کا نام ہے، متفرق دکانوں کو جن میں فصل کثیر ہو بازار نہیں کہا جاتا، اور اس بازار میں ضروریات روزمرہ دستیاب ہوتی ہوں کہ پارچہ کی دکان بھی ہو، جوتہ کی بھی، عطارہ کی بھی، دودھ، گھی، غلہ وغیرہ کی بھی اور وہاں ڈاکٹر یا حکیم بھی ہو، معمار و مستی بھی ہو اور وہاں ڈاک خانہ بھی ہو اور پولیس کا تھانہ یا چوکی بھی ہو، اور اس میں مختلف محلے مختلف ناموں سے موسوم ہوں، جس میں یہ شرائط موجود ہوں وہاں جمعہ صبح ہو گا ورنہ نہیں، قلت اقامت البولیس مقام الوالی الرجوع الناس الیہ فی الحوادث، واللہ اعلم، ۸ رمضان ۱۳۵۵ھ

تکبیرات ایام تشریق کن پر واجب ہے، سوال (۳۱)..... تکبیرات ایام تشریق مفتی بہ قول امام ابو حنیفہ کا ہے یا صاحبین کا؟

کن پر واجب ہے، چونکہ امام صاحب اور صاحبین کے درمیان اختلاف ہے، امام صاحب نے جماعت مستحبہ و مصر و رجال وغیرہ کو شرط قرار دیا، اور صاحبین فرماتے ہیں مطلقاً جن پر نماز فرض ہے انہی پر تکبیرات تشریق بھی واجب ہے، اب سوال یہ ہے کہ فتویٰ امام صاحب یا صاحبین کے قول پر ہے، بحوالہ کتب مستندہ و معتبرہ مع صفحہ واضح طور پر بیان فرماویں عند اللہ ماجور ہوں گے،

الجواب؛ قال يجب التكبير فور كل فرض على من صلاه ولو كان منفردا او مسافرا او قرويا لانه تبع للمكتوبات وبه اى بقولهما يعمل عليه الفتوى طحطاوى ص ۳۱، مولانا عبد الشکور صاحب اپنے علم الفقہ کے حاشیہ پر

تحریر فرماتے ہیں کہ صاحبین کے نزدیک یہ کوئی شرط نہیں، عورت و مسافر اور منفرد اور قریہ میں تکبیر واجب ہے، صاحب بحر الرائق نے سراج و ہاج وغیرہ سے نقل کیا ہے، کہ فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے، جلد دوم علم الفقہ، ص ۱۱۲،

وقالاهو علی کل من صلی المكتوبة مصریا او قرویا او مسافرا او منفردا او امرأة لانه شرع تبعاً للمكتوبة فيؤديه كل من يؤديهها والفتوى علی قولیهما (کنز الدقائق، ص ۷۴، حاشیہ)؛ سوال؛ تکبیرات تشریق کن پر واجب ہے، جواب؛ جن پر نماز فرض ہے انہی پر تکبیر بھی واجب ہے، بموجب مذہب صاحبین کے، اور اسی قول پر فتویٰ ہے، تو اب مسافر اور تنہا پڑھنے والے پر بھی تکبیر واجب ہوئی، رکن دین ص ۲۵ اور مختار کبیری و عندہما یجب علی کل من یصلی المكتوبة وابتداء من فجر عرفة عندنا الخ والعمل علی قولہما، صغیری ص ۲۸۵ وقال ہو علی کل من یصلی المكتوبة لانه تبع المكتوبة ہدایہ، ص ۱۵۵ ج ۱، و حاشیہ مالا بد منه فارسی و نزد صاحبین جماعت شرط نیست پس واجب است بر منفرد وزن و مسافر، در مختار، صفحہ ۶۵ میں مذکور ہے وقال ابو یوسف و محمد علی کل من یؤدی المكتوبة فی هذه الايام علی ای وصف کان فی ای مکان کان وهو قول ابراہیم النخعی، بدائع الصنائع جلد اول صفحہ ۶۹، و نزد صاحبین بر منفرد وزن و مسافر، ہم واجب است، مفتاح الصلوٰۃ ۱۲ نیز صفحہ ۱۲ کے حاشیہ میں مرقوم ہے کہ گفت در بحر الرائق وغیرہ والعمل و فتویٰ بر قول صاحبین ست در ہمہ شہرہا و زمانہا قال فی بحر الرائق وغیرہ والعمل و الفتویٰ علی قولہما فی عامۃ الامصار و کافۃ الاعصار، و بقول ابو یوسف و محمد تکبیرات تشریق واجب است بر ہر کہ فرض بگذارد و ختم تکبیرات بر قول ایشان عصر آخر ایام تشریق است و آن بست نماز است و علیہ الفتویٰ، در کنز فارسی صفحہ ۲، و نزدیک صاحبین اقامت و ذکر و صحت و منفرد جماعت شرط نہ پس واجب باشد بر ہر مصلی بعد فرض این ایام از فجر عرفہ تا عصر پس ایام تشریق ہو المعمول و علیہ الفتویٰ، فتویٰ بر ہانیہ کما فی الترغیب و قال ابو جوبہ فور کل فرض مطلقا ولو کان منفردا او مسافرا او امرأة لانه تبع للمكتوبة الی عصر الیوم الخامس اخر ایام التشریق و علیہ الاعتماد والعمل و الفتویٰ فی عامۃ الامصار و کافۃ الاعصار، در مختار، قال ابو یوسف و محمد التکبیر

تبع الفریضہ فکل من اذی فی ریضة فعلیہ التکبیر الفتویٰ علی قولیہما
من تکبیر المسافر و اهل القری جوہرۃ النیرۃ، ص ۹۲ و نزدیک ابولوسف
و محمد ہر کہ نماز بکنید بروئے واجب آید کہ تکبیر گوید (قدوری فاوی، ص ۲۸) و عندہما یجب
التکبیر علی کل من یصلی المکتوبۃ، کنز الدقائق نو لکثوری، ص ۲۲ کے حاشیہ نمبر ۶ میں مذکور
ہے، لیکن اگر منفرد اور عورت اور مسافر بھی کہہ لے تو بہتر ہے، کہ صاحبین کے نزدیک
ان سب پر واجب ہے، بہشتی گوہر ص ۹۹ حوالہ در مختار، و عندہما کل من صلی المکتوبۃ
فی ہذہ الایام فعلیہ التکبیر مقیماً کان مسافراً رجلاً کان امرأة فی المصر او فی غیرہ فی الحجۃ
او وحدہ، خلاصۃ الفتویٰ، ص ۲۱۶ ج ۱، المستفی بندہ ادریس سلطی

صحیح

الجواب صحیح

عبد اللطیف عفا اللہ عنہ، مدرسہ مظاہر علوم

بندہ منظور احمد، عفی عنہ

الجواب صحیح

جواب صحیح ہے

محمد زکریا، قدوسی، مدرس مدرسہ مظاہر علوم،

صدیق احمد عفا اللہ عنہ مدرس مدرسہ مظاہر علوم

صحیح ہے

الجواب صحیح

بندہ عبد الرحمن غفرلہ مدرس

بندہ محمد ظہور الحق عفی عنہ مدرس مدرسہ مظاہر علوم ہزارہ

ان کان کذلک فکذلک جواب صحیح ہے

جواب صحیح ہے

عبد القیوم عفی عنہ

بندہ ارشد علی عفی عنہ

بندہ عبد القیوم

جواب درست ہے

الجواب الجواب

بندہ اخلاق احمد مدرس مدرسہ مظاہر علوم سہاوردپور

محمد امیر سلطی عفا اللہ عنہ

چہ می فرمایند علمائے دین و شرع متین در بارہ جواب سوال مرقوم الصدر صحیح است
یا غلط، بر تقدیر ثانی عبارتہائے کہ علیہ الفتویٰ والعمل بقولہما فی الامصار وغیرہ را چہ جواب
بنویا بالتفصیل و توجہ و اباجرا الجزیل،

الجواب، سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم،

جواب سوال مرقوم الصدر از تتبع کتب فقہاء حنفیہ غلط معلوم می شود علی الاطلاق کہ
واجب نیست بلکہ بر ہر مقیمیکہ نماز با جماعت مستحبہ گزاردہ باشد، چنانکہ در فتویٰ تکبیر
مرقوم است، اما شرطہ فاقامۃ و مصر مکتوبۃ و جماعۃ مستحبۃ ہکذا

فی التبيين، وايضاً در بديه متنا عقيب الصلوات المفروضة على مقيمين
 في الامصار في الجماعة المستحبة عند ابی حنيفة وليس على جماعات النساء
 اذ لم يكن معهن رجل ولا على جماعة المسافرين اذ لم يكن معهن مقيم
 وشرعاً والشرع ورد عند استجماع هذه الشرائط الا انه يجب على النساء
 اذا اقتدين بالرجال وعلى المسافرين عند انهم بالمقيم بطريق التبعية
 آمده است وایں قول نیز در مختصر الوقایة آمده است من فجر عرفة عقيب كل فرض
 ادى بجماعة مستحبة على المقيم بالمصر ومقتديه برجل ومساقر مقتد
 بمقيم الى عصر لعید وقالوا عصر اخرایام التشریق وبه يعمل، وکذا در مالک
 مسطور است "تکبیرات تشریق بعد هر نماز که بجماعت گذارده بر مقيم بمصر واجب است از صبح
 روز عرفة تا عصر روز عید نزد امام اعظم و تا عصر تا یخ سیزدهم نزد صاحبین و فتوی بر آن
 و اگر مسافر اقتداء بمقیم کند بر آنها نیز تکبیر واجب شود" هر کس و ناکس غبی و ذکی اظهر من الشمس
 ظاهر است که مختار قول ابی حنيفة است، در مذهب احناف اکنون باقی ماند جواب علیه الفتوی
 والعمل بقولهما فی الامصار، جوابش آنست که مرجح ضمیر علیه فقط قول صاحبین که تا عصر
 روز سیزدهم هست، و مراد از قولها قول تار و سیزدهم هست در آن شک نیست که مختار
 و معمول به در مذهب احناف فی عامة الامصار و كافة الاعصار همین است، چنانکه در عالمگیری
 منقوش است و اما وقته فاوله عقيب صلوة الفجر من يوم عرفة و اخره فی
 قول صاحبین عقيب صلوة العصر الى اخرایام التشریق هکذا فی التبيين
 الفتوی فی عامة الامصار و كافة الاعصار علی قولها کذا فی الزاهدی و
 هکذا در مختصر الوقایة و قالوا الى عصر اخرایام التشریق وبه يعمل و
 ایضاً در مالک بمنه "تار و عصر روز عید نزد امام اعظم و تار و عصر تا یخ سیزدهم نزد صاحبین
 و فتوی بر آن است" هر که بر عبارت مرقومة الصدر بارے نظر سطحی می اندازد هرگز فتوی
 ندهد که فتوی بر آنست که بر هر دو مرد و زن خواه مسافر باشد خواه مقيم بمصر یا قریه منفرد
 باشد یا بجماعت گزاردن تکبیر تشریق واجب است عاذاً و کلاً هرگز این خیال صحیح
 نیست و عبارت های که مفتی صاحب نقل فرموده اند هر چه را نقل کردن و تطبیق دادن
 بنهایت مشکل است و چندان ضرورت هم نیست لیکن عبارتے که در آن مدار فتوی است

و بارہا بزبان فارسی و عربی وارد و نقل کرده اند آن عبارت در مختار است و علی مقتد
 مسافر و قروی او امرأۃ بالتبعیۃ لکن المرأة تخافت و یجب علی مقیم اقتل
 بمسافر و قال لوجوبہ فور کل فرض مطلقاً ولو منفرداً او مسافر او امرأۃ
 لانه تبع للمکتوبۃ الی عصر الیوم الخامس آخر ایام التشریق و علیہ الاعتما
 و العمل و الفتوی فی العامة الامصار و كافة الاعصار، عبارت عالمگیری و مختصر
 الوقایۃ و مالاید منہ را اگر بدین عبارت ملاحظہ کردہ شود معلوم گردد کہ علیہ الاعتماد و العمل
 و الفتوی الخ را تعلق فقط الی آخر ایام التشریق است چونکہ در اکثر جا عبارت فقہاء
 مختلط ہودہ است بناءً علیہ صاحب ہدایہ بوقت شرح علیہ بیان فرمودہ و صاحب
 عالمگیری علیہ باچنان وضاحت بیان فرمودہ اند کہ در ان هیچ خفا نماندہ کہ علیہ را
 تعلق الی آخر ایام التشریق است، ناکہ با قول مفتی صاحب، کما لا یخفی علی المتامل، نیز
 سخن تعجب خیز است کہ جناب مفتی صاحب عبارتیکہ نقل فرمودہ اند ہرچہ کہ از ان
 حق ظاہر گردد نقل نہ فرمودہ اند، چنانکہ در عبارت بہشتی گوہر نظر فرمائید ہمہ عبارت
 اینست "تبعیر تشریق یعنی ہر نماز کے بعد ایک مرتبہ اللہ اکبر الخ کہنا واجب ہے، بشرطیکہ
 وہ فرض جماعت سے پڑھا گیا ہو اور وہ مقیم مصر ہو، یہ تبعیر عورت اور مسافر پر واجب
 نہیں، اگر یہ لوگ کسی ایسے شخص کے مقتدی ہوں جس پر تبعیر واجب ہے، تو ان پر بھی تکبیر
 واجب ہو جائے گی، (در مختار) لیکن اگر مسافر اور عورت بھی کہے تو بہتر ہے کہ صاحبین
 کے نزدیک ان سب پر واجب ہے، ہر کہ عبارت گوہر را ملاحظہ نمایند، ہرگز غمی گوید کہ
 فتویٰ بر قول صاحبین است کہ ہر مصلیٰ مکتوبات تبعیر واجب است معہذا بندہ می گوید
 از لفظ بہتر واجب چگونہ ثابت گردد ہرگز نہ بل استحباب مستفاد گردد ہمیں عرض است
 کجا کہ فقہاء نقل قول صاحبین کردہ اند، لا یخفی ہذا من طالع کتب الفقہیہ و ہر گاہ
 ثابت شد عمل در امصار حسب قول امام ابو حنیفہؒ است، ہر چند کہ جناب مفتی صاحب
 قول صاحبینؒ کہ مثبت و جوب است نقل کردہ اند اثر فائدہ نمی بخشد زیرا کہ قول صاحبین
 را کہ منکر نیست لیکن عمل بدراں و مفتی بہ نیست، کما علمت بل در مذہب ما از ان استحباب
 ثابت کردہ شود کما لا یخفی علی المتدبر، حررہ احقر الناس محمد مظہر علی غفر اللہ عنہ

الجواب صحیح، محی الدین احمد عفی اللہ عنہ مدرس مدرستہ باغیاطیہ، الجواب صحیح محمد غلام غفرلہ ولوالدیہ

محمد بن محمد بن عیسیٰ مدبر باغبان، الجواب هو الجواب کم بر منفرد و مسافر تکبیر تشریق بزم واجب
واجب نیست، کما فی الصغیر تکریر التشریق عقب الصلوة فریضة بجماعة مستحبة فلا يجب
على المسافر ولا على المنفرد، انتهى وفي فتاوى السراجية لا تكبیر على المنفرد عند أبي حنيفة انتهى،

اقول وبالله التوفيق الصحيح عندنا | **الجواب مرجع امداد الاحكام** | الجواب الثاني دون الاول ودليله

ما في رد المختار تحت قول الدرر عليه الاعتماد والعمل والفتوى في عامة
الامصار ونصه هذا بناء على انه اذا اختلف الامام وصاحباة فالعبرة بقوة
الدليل وهو الاصح كما في اخر الحاوي القدسي او على ان قولهما في كل مسألة
مرى عنه ايضا الى انه قال وبه اندفع ما في الفتح من ترجيح قوله هنا
ورد فتوى المشائخ بقولهما بحرام (ص ۸، ۹ ج ۱) فهذه ايدل على ان ابن الهمام
قد رد فتوى المشائخ في هذه المسئلة التي اعتمدوا فيها على قول الصاحبين
وافتاوبه فلونظر المجيب الاول فتح القدیر وراجع كلام المحقق لعلم
ان المسئلة التي رجعت المشائخ فيها قول الصاحبين انما هي مسئلة انتهاء
وقت التكبير لا غير وفيها بسط المحقق الكلام وورد على المشائخ الاعلام كما
ذكر في (ص ۲۹ ج ۲) واما مسئلة من يجب عليه التكبير فلم يرجح المشائخ فيها
قولهما على قوله ولم يرد المحقق فيها على احد من المشائخ فظهر من مجموع
الكلام الشامي وكلام المحقق ان الذي عليه الاعتماد والعمل والفتوى هو
الذي رد فيه المحقق على المشائخ ورجح فيه قول الامام وليس ذلك
الامسئلة انتهاء وقت التكبير هذا وقد علم من عادة صاحب الهداية
انه يؤخر دليل المذهب الذي هو المختار عنده وفي نتائج الافكار من
عادة المصنف المستمرة ان يؤخر القوي عند ذكر الادلة على الاقوال
المختلفة ليقع المؤخر بمنزلة الجواب عن المقدم وان كان قدم القوي
في الاكثر عند نقل الاقوال ام من مقدمة الهداية (ص ۳ ج ۲) و
في مسئلة من يجب عليه التكبير قدم صاحب الهداية قول الامام
عند نقل الاقوال واخر دليله عن دليلهما وهذا يدل على ان قول

الامام هو الراجح فيها عندنا، وفي الخلاصة في تكبيرات ايام التشريق ما نصه
 كبار الصحابة رضي الله عنهم يقولون بان يبدأ بالتكبير من صلوة الغداة
 يوم عرفة وبه اخذ علماءنا رحمهم الله واختلفوا في القطع قال ابن مسعود
 يكبر الى صلوة العصر من اول يوم النحر وهو ثمانى تكبيرات وبه اخذ ابو حنيفة
 وقال على الى صلوة العصر من اخر ايام التشريق وهو ثلث وعشرون تكبيرة وبه
 اخذ ابو يوسف ومحمد رحمهما الله وعليه الفتوى وعليه عمل الناس اليوم،
 ثم هذا التكبير على اهل الامصار في الصلوات المكتوبات المؤديات بجماعة
 مستحبة حتى لا يجب على النسوان وان صليين بجماعة وعند هاكل من صلي
 المكتوبة في هذه الايام فعليه التكبير مقيما كان او مسافرا رجلا كان او امرأة
 في المصر او في غير المصر في الجماعات او وحده ومن دخل في الجماعة من
 المسافرين والنساء فعليهم التكبير تبعاً للرجال كما في الجماعة المفردة
 اذا صلوا جماعة في المصر فيه روايتان والاصح انه ليس عليهم التكبير اه
 (ص ۲۱۵ و ۲۱۶ ج ۱) وهذا صريح في ان الفتوى على قولهما انها هوى وقت قطع
 التكبير واما في حكم من يجب عليه فالراجح قول الامام لان صاحب الخلاصة
 وانما ذكر لفتوى على قولهما في الاول دون الثاني بل صرح في حكم المسافرين
 اذا صلوا جماعة في المصر بان الاصح انه ليس عليهم التكبير مع انهما
 قائلان بوجوب التكبير على المسافر المنفرد ايضا ولو كان في قرية فعلى المسافر
 اذا صلوا جماعة في المصر اولى ولكن صاحب الخلاصة صرح بتصحيح
 ما يخالف قولهما ثم راجعت البدائع فرأيتها قد رجح قول الامام
 على قولهما في الفصلين واجاب عن كل ما استدلال به (ص ۱۹۸ ج ۱) و
 كذا راجح ابن امير حاج في شرح المنية قول الامام على قولهما في الفصلين
 ايضا (ص ۵۳) نعم ذكر في البحر عن السراج الوهاج والجوهرية والفتوى
 على قولهما في هذا ايضا اى في وجوب التكبير على كل من صلي المكتوبة
 في هذه الايام، فالحاصل ان الفتوى على قولهما في اخر وقته وفيمن يجب
 عليه ام (ص ۱۶۶ ج ۲) ولكن هذا معارض لترجيح صاحب الهداية وتصحيح

صاحب الخلاصۃ وتحقیق صاحب البدائع وتصویب ابن امیر حاج وبعارض
الحديث الذي استدل به الحنفية على اختصاص الجمعة والعیدین
بالمصر وهو ما رواه ابن ابی شیبۃ فی مصنفه حدیثا عباد بن العوام عن
حجاج عن ابی اسحق عن العاصی عن علی بن ابي طالب قال لا الجمعة ولا التشريق ولا صلوة
فطر ولا اضحی الا فی مصر جامع او مدينة عظيمة کذا فی نصب الراية (۳۱۳)
وسنده حسن کما ذکرته فی اعلاء السنن وبه احتج ابو حنیفة علی اختصاص
وجوب التكبير باهل المصر دون القرى کما صرح به فی البحر والبدائع
والتشريق رفع الصوت بالتكبير قاله النضر بن شميل وهو من ائمة اللغة
قاله صاحب البدائع فقول ابو حنیفة قوی رواية ودراية واكثر المصنفین
على ترجیح قوله علی قولها فی من يجب علیه التكبير فلا عبرة بنقل المساجد
الوہاج والجمہرۃ ، واللہ اعلم ، حورۃ ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۲۲ رجب ۱۴۲۶ھ

تعریف مصر | سوال (۴۲) آجکل کے زمانہ میں کس قسم کی جگہ شرعاً شہر کہلائے گی؟

الجواب: جہاں تین چار ہزار کی آبادی ہو، اور بازار متصل ہو، جس میں ضروریات روزمرہ
سب دستیاب ہوتی ہوں، اور اس آبادی کے متعلق اس کے توابع میں کچھ دیہات بھی ہوں
۱۰۔ سوال ۴۶ھ

سوال (۴۳) شرعاً صحرا کس کو کہتے ہیں؟ جہاں عیدین کی نمازیں پڑھنا سنت ہو کہہ ہے؟

الجواب: جہاں مکانات نہ بنے ہوئے ہوں، مکانات آبادی سے باہر جو میدان ہو
وہ عید گاہ کا محل مسنون ہے،

سوال: کس قسم کے میدان میں عیدین کی نمازیں پڑھنا چاہئے؟ کیا عید گاہ کا
شہر سے باہر ہونا شرط ہے؟ اگر شرط ہے تو یہاں شہر سے کیا میونسپلٹی حدود مراد ہے یا بازار
اور بستی وغیرہ؟

جواب: حدود میونسپلٹی سے باہر ہونا مراد نہیں، بلکہ مکانات و آبادی سے باہر
ہونا مراد ہے،

سوال: شہر کی میونسپلٹی کے اندر مگر بازار وغیرہ کے باہر کوئی کھلی ہوئی جگہ

(میدان) ملے تو اسی کو عید گاہ بنانے میں شرعاً کوئی مضائقہ ہے یا نہیں؟

الجواب؛ اوپر کے جواب سے معلوم ہو چکا،

سوال؛ میونسپلٹی کی حدود کے اندر عید گاہ ہونے سے اگر تین ہزار لوگ جمع ہوں اور باہر ہونے سے تین سو ہوں تو کہاں عید گاہ بنانا افضل ہوگا؟

الجواب؛ اوپر گزر چکا کہ حدود میونسپلٹی سے باہر ہونا عید گاہ کا ضروری نہیں، صرف آبادی سے باہر ہونا چاہئے، اور زیادہ دور بھی ہونا ضروری نہیں،

سوال؛ اگر شہر کے لئے اندر یا باہر کوئی عید گاہ نہ ہو، مگر شہر کے اندر سرکاری یا غیر سرکاری ایسے وسیع میدان ہوں (مدرسہ، سکول، کالج کے میدان) جہاں باجائز مالک شہر کے لوگ ایک جا ہو کر بہت بڑی جماعت کے ساتھ عیدین کی نماز ادا کر سکتے ہیں وہاں عیدین کی نمازیں میدان میں پڑھنا بہتر ہوگا یا مختلف مساجد میں چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں ادا کرنا بہتر ہوگا؟

الجواب؛ نماز عید تو اس صورت میں صحیح ہو جائے گی مگر سنت ادا نہ ہوگی بہت ہی ہی کہ شہر کی آبادی سے باہر عید گاہ ہو،

سوال؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مدینہ شہر کے چاروں طرف شہر پناہ دیوار تھی یا نہیں؟ بر تقدیر اول آپ کی عید گاہ اندر تھی یا باہر؟

الجواب؛ ہاں مدینہ کی شہر پناہ تھی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عید گاہ شہر پناہ سے باہر تھی، مگر ظاہر یہ ہے کہ شہر پناہ حضور کے زمانے کے بعد بنائی گئی ہے، حضور کے زمانہ میں نہیں بنائی گئی، حضور کے زمانے میں مدینہ کی تین جوانب تو کجور کے درختوں اور عمارتوں سے محفوظ تھیں، اور ایک جانب کھلی ہوئی تھی، اُدھر غزوہ احزاب میں خندق بنائی گئی، اور عید گاہ خندق سے باہر فاصلہ پر تھی یا خندق کے اندر تھی اس کی تحقیق نہیں ہو سکی، ہاں خلاصۃ الوفاء میں امام مالک سے نقل کیا ہے کہ مسجد نبوی اور عید گاہ میں ہزار ذراع کا فاصلہ تھا، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ کی شہر پناہ جو حضور کے بعد بنی ہے عید گاہ اس شہر پناہ کے باہر تھی، (۱۷۸ و ۱۷۹) واللہ اعلم،

سوال؛ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عید گاہ شہر کے باہر تھی یہاں شہر سے کیا مراد ہے، اور شہر کے باہر عید گاہ ہونے میں کیا حکمت ہے، خاص کر

اس طرف عید گاہ کرنے کی کوئی وجہ ترجیح بھی تھی یا یہ ایک اتفاقی بات تھی،
الجواب؛ شہر سے مراد مکانات آبادی ہے، اور شہر کے باہر عید گاہ ہونے میں اس سے
زیادہ اور کیا حکمت مسلمان کو چاہئے کہ حضورؐ نے شہر کے باہر عیدین کی نماز پڑھی ہے،
سوال؛ شہر کے اندر عید گاہ بنانے میں کوئی مضائقہ ہے یا نہیں؟

الجواب؛ ہاں مضائقہ نہیں مگر سنت کے خلاف ہے، واللہ اعلم۔ ارشادِ رسالہ
خطبہ سے پہلے وعظ کہنے کا حکم [سوال (۲۳)]

..... منہج ہر دوری میں انجمن تبلیغ و حفاظت اسلام قائم ہے، اور فی زمانہ اس کام
کی جس قدر اہمیت ظاہر ہے، مسلمانوں کی بے بسی بھی واقع ہے، چنانچہ مسلمانوں کو حالت
حاضرہ سے آگاہ کرنے کے لئے اور انجمن کی مالی کے واسطے زید ہر جمعہ کو خطبہ سے قبل کچھ وعظ
کہہ کر چندہ طلب کیا کرتا تھا، عمر جو مسجد کا امام ہے اس بات سے مانع ہوا کہ وعظ کہنے اور
چندہ طلب کرنے میں ان لوگوں کی سنتوں میں خلل پڑتا ہے، جو خطبہ سے پہلے سنتیں پڑھتے ہیں
اور اس نے یہ بھی کہا کہ خطبہ سے پہلے مسجد میں کسی قسم کا بھی وعظ ہو ممنوع ہے، اس لئے زید
اپنے فعل سے باز رہا، اور اس سلسلہ میں شعبہ تبلیغ کو جو کچھ چندہ مل جایا کرتا تھا وہ بند ہو گیا
نماز جمعہ کے بعد لوگ منتشر ہو جاتے ہیں، اس لئے پھر اس کا موقع نہیں ملتا، کہ وعظ کہا جا سکے
یا چندہ فراہم کیا جائے، لہذا جبکہ شعبہ تبلیغ کی اس قدر اہمیت ہے، اور اس کے لئے نماز
جمعہ سے پہلے چندہ فراہم کرنے کی بھی سخت ضرورت ہے، تو ایسی صورت میں شرع کا کیا
مسئلہ ہے، آیا قبل خطبہ کوئی وعظ کہا جاسکتا ہے یا نہیں، اور امام مسجد کا اس میں مانع
ہونا کہاں تک بجا ہو، بینوا تو جسردا؟

الجواب؛ خطبہ سے پہلے وعظ کہنا جائز ہے، البتہ اس میں یہ رعایت کی جائے
کہ جو وقت خطبہ شروع ہونے کے لئے مقرر ہے اس وقت وعظ شروع کیا جائے تاکہ
لوگ سنتوں سے فارغ ہو جائیں، اور جو شخص اس وقت تک بھی سنتوں سے فارغ
نہ ہو گا وہ خود کوتاہی کرتا ہے، کیونکہ اب اس کی سنتوں میں خطبہ سے خلل پڑتا جبکہ
خطبہ کا وقت آگیا، البتہ اس صورت میں نماز دیر سے ختم ہوگی، جس میں نمازیوں پر
گرانی ہونا محتمل ہے، اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ کسی جمعہ میں عام نمازیوں سے اس کی
اجازت لی جائے کہ اگر آپ صاحبوں پر گرانی نہ ہو تو خطبہ سے پہلے خطبہ کے وقت تھوڑی

دیر اس کام کے لئے آپ کا وقت لے لیا جائے، اگر سب یا اکثر اس پر راضی ہوں تو پھر مضائقہ نہیں، حائل یہ ہے کہ خطبہ سے پہلے وعظ کہنا فی نفسہ ممنوع نہیں، اگر کوئی مانع خارجی پیش آجائے اس کا انسداد کر دے خواہ اس طریق سے جو اس جواب میں مذکور ہے خواہ کسی دوسری طریق سے، واللہ اعلم، ظفر احمد عفا عنہ ۱۱ شوال ۱۴۲۶ھ اشرف علی

المنبر اذا بنی فی المحراب هل يجوز الخطبة عليه ام لا، المصری فی صفحہ ۳۵۵ دخل المحراب له حكم المسجد فلو بنی المنبر فی المحراب ویخطب علیه يوم الجمعة هل يجوز ذلك ام لا، بینوا توجروا؟

الجواب: نعم يجوز فان المنبر للخطبة وهي كالصلوة فليس فی بناءه شغل البقعة بغير الصلوة وقد وضع منبر المسجد النبوی فی المسجد بعد ما بنی المسجد بتمامه وقد كان موضعه قبل موضع الصلوة وصار مشغولا بالمنبر بعد وضعه فيه ولكنه جاز لكون الخطبة من الصلوة، قال الشافعی المنبر بكسر الميم من المنبر وهو الارتفاع ومن السنة ان یخطب علیه اقتداء به صلى الله علیه وسلم، یجوز ان یكون علی يسار المحراب قهستانی (ص ۸۶۰ ج ۱) قلت ویسار المحراب اعم من ان یكون داخله او خارجه فافهم، واللہ تعالی اعلم، ۲۹ شوال ۱۴۲۶ھ

خطیب خطبہ جمعہ شروع کرنے سے قبل سوال (۲۶).....

اعوذ باللہ لبسم اللہ جہراً پڑھے یا آہستہ..... جمعہ کا خطبہ شروع کرنے سے پہلے خطیب کو بسم اللہ اور اعوذ باللہ بلند آواز پڑھنا چاہئے یا آہستہ سے پڑھنا چاہئے، بینوا توجروا؟

الجواب: پہلا خطبہ شروع کرنے سے صرف اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم آہستہ پڑھ لے، جہر نہ کرے، اور لبسم اللہ کا پڑھنا منقول نہیں، قال فی الدرر ویبدأ بالتعوذ سرّاً الا قال الشافعی ویبدأ قبل الخطبة الاولى بالتعوذ سراً ثم یحمد الله تعالى والثناء علیه والشهادتین والصلوة علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم والتذکیر العظمتہ والقراءة قال فی التنجیس والثانیة كالاولی الا ان

یوں عولسائین مکان الوعظ قال فی البحر و ظاہرہ انہ لیسن قراءۃ ایتہ فیہا
کالا ولی اہ قلت وکن اظاہرہ ان یبدأ بالتعوذ قبل الثانیۃ ایضاً سئل بعدم
استثناجہ سوی الوعظ واللہ اعلم،

اس عبارت کے اخیر جز سے قیاساً حیث قال والثانیۃ کالاولی، معلوم ہوا کہ دوسرے
خطبہ کو بھی اعوذ باللہ الخ آہستہ پڑھ کر شروع کیا جائے، باقی اعوذ باللہ یا بسم اللہ قبل
خطبہ کے یا قبل اذان و اقامت کے نماز کے زور سے پڑھنا جیسا کہ آجکل بعض مقامات
میں رواج ہے بدعت ہے، واللہ اعلم، ۱۶ ذیقعدہ ۱۳۶۷ھ

جمعہ کے دن آخر ظہر پڑھنے کا حکم | سوال (۴۷) اس ملک سندھ میں جو جو بڑے شہر ہیں
ان شہروں میں آخر ظہر پڑھی جائے یا نہ؟ بینوا و تو جزوا اجر عظیم،
الجواب: بڑے شہروں اور قصبات میں آخر ظہر پڑھنا مکروہ ہے، اور جس جگہ
جمعہ کی صحت میں شبہ ہو وہاں جمعہ پڑھنا مکروہ ہے، بلکہ ظہر ہی پڑھنا چاہئے، واللہ اعلم
۲ صفر ۱۳۶۷ھ

اذان جمعہ سے قبل وعظ کی | سوال (۴۸) ایک مسئلہ میں اور مولانا کی ڈھیل معلوم
ایک صورت کا حکم، ہوئی، وہ مسئلہ یہ ہے جو آجکل تمام عالم اسلام ترکی افغانستان
وغیرہ میں معرکہ الارابنا ہوا ہے، یعنی خطبہ جمعہ زبان مادری میں ہونا چاہئے، اسی تبلیغی
کافرنس میں علی گڑھ کالج کے تین طلبہ آئے ہوئے تھے، انھوں نے ایک روز جس دن
مولانا حسین احمد صاحب دہلی گئے ہوئے تھے، ایک سبکیٹ کمیٹی (باصطلاح جدید)
یعنی وہ اشخاص نامزد شدہ جو تجاویز اول تیار کرتے ہیں میں پیش کی، یہ کہتے ہوئے کہ
مولانا حسین احمد صاحب نے اس کو منظور کر لیا ہے، تجویز کے الفاظ یہ تھے کہ امام مساجد
کو ضروری ہے کہ خطبہ اول حالات حاضرہ پر مادری زبان میں پڑھے، اور بعد اسی کا
ترجمہ عربی زبان میں پڑھے، مگر اس کو مولوی عبدالرحمن خان صاحب نے نامنظور کیا کہ یہ
نا جائز ہے، طالب علم مولانا حسین احمد صاحب کا حوالہ دیتے رہے، مولوی صاحب نے
فرمایا کہ اس مسئلہ کو مولانا آجائیں تو کل پیش کرنا، دوسرے روز مولانا کے روپر تجویز
پیش ہوئی، مولانا نے اس کو منظور کر لیا اس پر مولوی صاحب بولے کہ حضرت یہ تو ناجائز
ہے، اس میں گفتگو ہوئی، مولوی صاحب نے فرمایا کہ لزوم مایلزم کے تحت میں

آتا ہے اگر مفسدہ حال نہیں تو مفسدہ مال ضرور ہے، جملہ بدعات اسی طرح شروع ہوتیں، اس میں ترمیم کی گئی کہ ہمیشہ نہیں بلکہ گاہ گاہ جبکہ ضرورت ہو، اس پر مولوی صاحب تو خاموش ہوئے مگر اور صاحبوں نے اعتراض کئے کہ مصطفیٰ سنتوں کی نیت کہاں باندھے، جب امام تقریر اردو میں کر رہا ہو آیا اس کو ترک کر دے، اگر ترک کرتا ہے تو اس کا جزیہ دکھایا جائے اور اگر ٹپتا ہے تو نماز پر خلل پڑتا ہے، اس کا کچھ جواب نہیں دیا گیا کہ خطبہ کے آداب و سنن ہیں، مثلاً خلفاء راشدین کا ذکر وغیرہ ترک ہوں گے، اس پر ترمیم ہوتی آج چونکہ مولانا حسین احمد صاحب موجود تھے تو مولوی صاحب وغیرہ تو خاموش اور دیگر اصحاب انجمن مولانا کے مؤید سوا عبداللہ خان گنج والے اور عبدالرحیم خان کے یہ دو صاحب اڑے رہے، اور بہت دیر تک مولانا سے بحث کی مگر نہ چلی، اور تجویز بالفاظ ذیل منظور ہوئی، تجویز نمبر ۳ منجانب ینگ مسلم ایسوسی ایشن علیگڑھ "اس کانفرنس کی رائے میں اشد ضروری ہے کہ کسی نئی ضرورتوں کے پیش آنے پر خطبہ جمعہ کے مواعظ و نصائح کم از کم دس پندرہ منٹ قبل اذان جمعہ پابندی احکام شرعی و محتاطین کی زبان میں بیان کئے جائیں، اس میں اُن مضامین کی تصریح بھی شامل ہو کرے جو خطبہ عربیہ میں ہوں۔"

اس تجویز کو مولانا حسین احمد صاحب نے کثرت رائے سے منظور کر لیا، اور طے ہوا کہ جلسہ عام میں اس کو منظور کرایا جائے، چونکہ سبکدستی میں بندہ کو بولنے کا حق نہ تھا، اس واسطے کہ بندہ اس کا باضابطہ ممبر نہ تھا، اس لئے وہاں سے اُٹھ کر مشورہ ہوا کہ اس تجویز کو جلسہ عام سے رد کرانی چاہئے، مجبوراً ہم نے چالیس پچاس اپنے ہم خیال بنائے اور جلسہ عام میں، ان کو مختلف جگہوں پر متعین کر دیا، کہ جس وقت یہ تجویز پیش ہو اس کی زبرد مخالفت کی جائے، غالباً ہمارے پر و پیگنڈے کا پتہ ان طلباء کو ہو گیا، جو سمجھ گئے کہ ہماری تجویز کی مخالفت ہوگی اور ہم کو جلسہ عام میں رک ملے گی، اس لئے انھوں نے تجویز واپس لے لی، اور فوراً جلسہ سے اُٹھ کر چلے گئے اور کہنے لگے کہ ہم تو مولانا حسین احمد صاحب کا نام دیکھ کر آئے تھے کہ خطبہ کو اردو میں کرالیں گے، مگر ان لوگوں نے چلنے نہ دی یہ اُن طلبہ کی نیچریت تھی، اور دیگر تاویلین محض حیلہ حوالہ کے واسطے تھیں، ورنہ ان کا منشاء اُن نیچریوں کی اتباع کرنا تھا، کہ جنھوں نے مادری زبان میں خطبہ جاری کر دیا ہے، مگر اللہ کا شکر ہے کہ خورجہ سے منظور نہ کرا سکے،

الجواب: جن الفاظ سے تجویز نمبر ۳ (خط کشیدہ) کو مولانا نے منظور فرمایا ہے، فی نفسہ اس کے جائز ہونے میں شبہ نہیں، کیونکہ قبل اذان جمعہ کے جو بیان اردو میں ہوگا وہ خطبہ سے خارج ہے، مگر جس صورت سے اس کو منظور کیا گیا ہے اس میں ایک مباح کو شد ضروری قرار دیا گیا ہے، اور اس کو پاس کر کے گویا اتمہ مساجد کو اس پر مجبور کیا جائے گا اور مباح میں جبر غیر امام کو جائز نہیں، ولا امام لنا، اور اگر اتمہ مساجد کو مجبور کرنا مقصود نہیں تو پھر قانون بنانے اور اس کو پاس کرنے سے کیا فائدہ، بلا جبر کے تو علماء قبل خطبہ و بعد جمعہ وعظ کہتے ہی ہیں، ۲۲ جمادی الثانی ۱۳۸۴ھ

گاذ میں نماز جمعہ وعیدین درست نہیں | سوال (۴۹)

..... ہمارے علاقہ میں قدیم سے رواج چلا آتا ہے کہ عیدین کے دن ہر گاؤں میں خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا نماز عیدین بہ نیت نفل باجماعت ادا کرتے ہیں اور جس گاؤں میں کوئی عالم ہو تو وہاں کچھ وعظ و نصیحت و شوکت اسلام کی اچھی رونق ہو جاتی ہے، اب یہاں بعض علماء نے آکر عیدین فی القترنی کو منع فرمایا ہے، اور کہا، تم تمام حنفی المذہب ہو اور عند الاحناف جہاں جمعہ ہے وہاں عید بھی ہے، اور تم جمعہ نہیں پڑھتے ہو اور عیدین (ضرور) ادا کرتے ہو یہ کیا وجہ ہے؟ جب علماء نے یوں کہا تو عوام کا لانعام نے شور و غل مچا دیا، جب عید نہیں تو قربانی و فطر کیسا؟ حتیٰ کہ بعضوں نے فطرہ اور قربانی کو ترک کر دیا ہے، اسی موضع میں میرے دادا صاحب اور والد صاحب اور ماموں صاحب جو کہ اچھے عالم ہیں بحسب رواج قدیم کے عیدین ادا کرتے چلے آئے ہیں اب میرے ماموں صاحب یہاں کے امام مسجد ہیں، اور احقر بھی انہی کے ساتھ شامل ہے، جب علماء نے جماعت نوافل و عیدین کو منع کیا، تو مجھ سے بھی مسئلہ پوچھا گیا میں نے بھی منع کیا چنانچہ کتب فقہ حنفیہ میں ہے، مگر بوجہ کمال خوشی اُس دن کے اُن لوگوں نے کچھ توجہ نہ کی، چونکہ میں بحمد اللہ و فضلہ تعالیٰ کچھ طالب علم ہوں میرا عیدین میں شامل ہونا ضروری سمجھتے ہیں اور وعظ وغیرہ کا اشتیاق رکھتے ہیں، اور میری عدم شمولیت اپنی سخت ناگوار گذرتی ہے، اب گزارش یہ ہے کہ اس پر آشوب زمانہ میں اس رواج کے متعلق کیا ارشاد ہے، آیا اس کو برقرار رکھا جائے یا اس سے حتیٰ الوسع برکنار ہو جائے اور اس کے ادا کرنے میں عند الشرع کوئی جرم ہے یا نہیں، اب تو پنجاب کا شاید کوئی ہی موضع ایسا ہوگا کہ

عیدین اس میں نہ پڑھی جاتی ہوں حتیٰ کہ اب جمعہ کا رواج بھی اکثر مقاموں میں بہت پھیل رہا ہے، پس اگر جمعہ کو بھی بغرض تبلیغ احکام کے پڑھا جائے تو جائز ہو گا یا نہیں حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ مصنفی شرح موطائے امام مالک رحمہ اللہ میں فرماتے ہیں ”پس ظاہر آنست کہ در وہ اگر دون از اربعین جمعہ خوانند نماز ایشان صحیح باشد و متخلفان آئتم باشند انتہی (ص ۱۵۲)

۲، اگر نماز عیدین کو جماعت کے ساتھ نہ پڑھا جاوے تو کیا فرادی فرادی ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟ ۳، نفلوں کی جماعت تو احادیث سے ثابت ہے، چنانچہ صحیح بخاری کی شرح تیسیر القاری باب صلوٰۃ النفل بجماعة درجوا باؤ نفل باجماعت اور فتح الباری باب صلوٰۃ النفل جماعة قیل مرادہ النفل المطلق و محتمل ما هو آ..... من ذلك، اور شرح الیاس میں ہے، ویصلی التطوع بجماعة خارج رمضان نیز صحیح بخاری میں ہر لقول النبی صلی اللہ علیہ وسلم هذا عیدنا یا اهل الاسلام وامرانس بن مالک بن ابی عتبہ بالزاویة فجمع اهلہ وبنیہ وصلی کصلوٰۃ المصر و تکبیرہم وقال عکرمة اهل السلد یجتمعون فی العید ویصلون رکعتین کما یصنع الامم وقال عطاء اذا قاتہ العید صلی رکعتین“ انتہی تو اب عرض ہے کہ فقہاء اس کو مکروہ کیوں لکھتے ہیں، اور اگر مکروہ ہے تو تحریمیہ یا تنزیہیہ، اگر تحریمیہ ہو تو شرعاً اس کا کیا نتیجہ اور سزا و جزا ہے مفصل مسجل ہو،

الجواب؛ قال علی رضی اللہ لا جمعة ولا تشریع ولا فطر ولا اضحی الا فی مصر جامع او مدینة عظيمة رواه ابن ابی شیبہ فی المصنف بسند حسن کما حققته فی اعلام السنن ولله الحمد، وهو موقوف فی حکم المرفوع لکونه واسدا علی خلاف القیاس المستمر فی الصلوات من عدم تقيدها بمكان دون مكان قال تعالى وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم جعلت لی الارض کلها مسجداً طهوراً، اثر مذکور کی بنا پر حنفیہ کے نزدیک دیہات میں جمعہ و عیدین کی نماز درست نہیں، بلکہ ان کے لئے قصبات یا شہر ہی محل ہیں، اور عوام کا الانعام کی ضد سے احکام شرعیہ نہیں بدل سکتے، اور نفل نماز کی جماعت بالتداعی مکروہ تحریمی ہے،

خطبہ کے وقت ہاتھ میں عصا لینا | سوال (۵۰) یہاں مدراس میں ہر جگہ عصا ہاتھ میں لیکر خطیب خطبہ جمعہ پڑھتا ہے، اس میں شریک ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ امام کی عدم موجودگی میں لوگوں نے اصرار کیا کہ میں خطبہ جمعہ پڑھوں اور نماز بھی پڑھاؤں، میں نے عصا لینے سے انکار کیا، اور بغیر عصا لٹ پڑنے کو بخوشی تیار ہوں، تو یہاں کے لوگ کہتے ہیں کہ یہاں کے علماء کہتے ہیں کہ عصا ہاتھ میں لے کر پڑھنا سنت ہے،

الجواب، اخذ عصا فی الخطبة کی مسنونیت میں حنفیہ نے اختلاف کیا ہے، خلاصہ میں مکروہ کہا ہے، اور قہستانی نے محیط سے اخذ عصا کی مسنونیت نقل کی ہے، شامی ص ۸۶۲ ج باب الجمعہ، دونوں میں تطبیق یہ ہے کہ اخذ عصا سنت مقصودہ نہیں، بلکہ سنت مقصودہ اخذ سیف ہے، اس مقام پر جو سیف سے مفتوح ہوا ہو، اور اگر سیف نہ لے تو عصا کا لینا بالقصد مسنون نہیں، بلکہ محض اعتماد اور سہولت قیام کے لئے اخذ عصا جائز ہے، وہو محل ماروی ابو داؤد انہ صلی اللہ علیہ وسلم قام ای فی الخطبة متوکلًا علی عصا او قوس ام ای اتکاء علی احدہما للاعتماد والیسر لا تعبداً، پھر جب عوام نے اخذ عصا کو مثل اخذ سیف کے سنت مقصودہ سمجھ لیا تو بعض فقہار نے اس کو مکروہ کہہ دیا، کیونکہ مباح کو مسنون سمجھ لینا مکروہ ہے، پس اخذ عصا فی نفسہ جائز ہے، مگر اس کا التزام نہ کیا جا سکتا تھا، احياناً ترک بھی کر دیا جائے، واللہ اعلم، ۱۳ ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ

سوال (۵) عید جب جمعہ روز ہو تو جمعہ اور عید دونوں واجب ہیں۔ عید اور جمعہ دونوں ایک دن میں ہو جائیں تو کیا دونوں

فرض ہیں یا دونوں واجب یا دونوں سنت، یا ان میں تفصیل ہے، یعنی بعض فرض اور بعض واجب یا سنت، مدلل تحریر فرمائیں، اور دلیل اگر حدیث ہو تو بہتر ہے،

الجواب، قال فی الدر لو اجتمعای العید والجمعة لم يلزم الا احدهما
کذا فی الفہستانی عن التمر تاشی قلت وقد راجعت التمر تاشی فرأیتہ حکاہ
عن من ذهب الغیر وبصیغة التمر یض فتنہ ام قال فی رد المحتار اما مذہبنا
فلزوم کل منهما قال فی الہدایة ناقلا عن الجامع الصغیر عیدان اجتماع فی
یوم واحد فالاول سنتہ والثانی فریضة ولا یتروک واحد منهما قال فی المعراج
قال عبد البر سقوط الجمعة بالعید مہجور وعن علی ان ذلک فی اهل البادية ومن
لا تجب علیہم الجمعة ام وسماہا فی الجامع الصغیر سنتہ لان وجوبہا
ثبت بالسنة حلیہ قال فی البحر والظاهر انه لا خلاف فی الحقیقہ لان
المراد من السنة المؤکدة بدلیل قوله لا یتروک واحد منهما وکما صرح به
فی المبسوط وقد ذکرنا مراراً انها بمنزلة الواجب عندنا ام (ص ۶۸۵ ج ۱)
اس سے معلوم ہوا کہ عید اور جمعہ مجتمع ہو جائیں تو پہلی نماز واجب ہی، یعنی عید کی،
اور دوسری یعنی جمعہ کی نماز فرض ہے، اور شہر والوں کو کسی کا ترک بھی جائز نہیں، ہاں
دیہات والوں کو جن پر جمعہ وعید واجب نہیں، گنجائش ہے کہ عید پڑھ کر اپنے گاؤں کو
واپس ہو جائیں، اور جمعہ نہ پڑھیں، کیونکہ دیہاتی اگر شہر میں آجائے تو جب تک زوال
کے وقت تک شہر میں نہ رہے اُس پر جمعہ فرض نہیں ہوتا، زوال سے پہلے اس کو واپس
ہو جانا جائز ہے، کما فی الدر والشامی (ص ۸۶۱ ج ۱) مع ذکر الاختلاف فیہ
واللہ تعالیٰ اعلم، ۲۰ رذی الحجہ ۱۳۸۵ھ

تکبیرات ایام تشریق جماعت سے نماز پڑھنے والوں کیساتھ خاص ہو یا یہ حکم عام ہے، سوال (۵۲) تکبیر تشریق جماعت سے نماز پڑھنے والوں کے ساتھ خاص ہے یا منفرد

وغیر ہم کے لئے بھی عام ہے؟

الجواب، بحر میں مجتبیٰ وجوہ سے نقل کیا ہے کہ اس مسئلہ میں فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے کہ ہر فرض نماز پڑھنے والے کے ذمہ تکبیر تشریق واجب ہے، خواہ جماعت ہو یا منفرد مرد ہو یا عورت، شہری ہو یا دیہاتی، اس لئے اسی پر عمل احوط ہے، قال فی

الشرعية والدر المختار وقال لا بوجوبه فور كل فرض مطلقاً ولو منفراً أو مشركاً
 أو امرأة لأنه تبع للمكتوبة إلى عصر اليوم الخامس أخيراً التشریق وعليه
 الاعتماد والعمل والفتوى في عامة الامصار وكافة الاعصار اهـ وتوهم منه
 رجوع قوله وعليه الاعتماد إلى مجمع قولهما من بيان الوقت ومن يجب عليه
 وعندى ذلك راجع إلى بيان الوقت فقط بدليل ما في متن الوقاية وتجب
 تكبيرات التشریق من فجر عرفة عقيب كل فرض أدى بجماعة مستحبة
 على المقيم بالمصر ومقتدية برجل ومسا فرمقتد بمقيم إلى عصر العيد وقال
 إلى عصر أخيراً التشریق وبه يعمل اهـ (ص ۲۲۸ ج ۱) وبها في الدر وقال لا فور
 كل فرض مطلقاً سواء أدى بالجماعة أو لا وسواء كان المصلی رجلاً أو امرأة
 مسافراً أو مقيماً في المصر أو في القرى إلى عصر الخامس من يوم عرفة وبه أي
 بالتكبير إلى هذا الوقت وعدم الاقتصار إلى عصر العيد يعمل الآن احتياطاً
 في باب العبادات اهـ (ص ۱۲۶ ج ۱) وبها في الخلاصة قال ابن مسعود يكبر
 إلى صلوة العصر من اول يوم النحر وبه اخذ ابو حنيفة وروى عن علي بن ابي
 صلوة العصر من أخيراً أيام التشریق وهو ثلاث وعشرون تكبيرة وبه
 اخذ ابو يوسف ومحمد وعليه الفتوى وعليه عمل الناس اليوم ثم
 هذا التكبير على أهل الامصار في الصلوات المكتوبات المؤديات وبالجماعة
 مستحبة حتى لا يجب على النساء وإن صلتين بجماعة وعندهما على كل من
 صلوة المكتوبة في هذه الأيام فعليه التكبير اهـ (ص ۲۱۵ ج ۱) ولم يذكر
 الفتوى على قولهما في ذلك ومثله في العالم كبرى أيضاً وصنع صاحب الهداية
 يدل على ترجيح قول الامام في بيان من يجب عليه لأنه قدم قول الامام
 واخر دليله والله تعالى اعلم واصحاب المتون كالكنز والقدرى اقتصر
 على ذكر قول الامام في بيان من يجب عليه فهو المذهب ولو كان الراجح
 قولهما في ذلك لذكره كما ذكرنا قولهما في الوقت نعم نقل في البحر عن
 المجتبى والجوهرية ان الفتوى على قولهما في من يجب عليه أيضاً في حروب الجبل
 الاحوط العمل بقولهما والله اعلم ۲۲ محرم ۱۲۸۸

سوال (۵۳) ایک امام صاف کھلم کھلا کہتا ہے کہ یہاں جمعہ ادا نہیں ہوتا اس لئے ہم ظہر احتیاطی ادا کرتے ہیں اس کے پیچھے نماز جمعہ جائز ہی یا نہیں

جواب: یہ کہتا ہو کہ یہاں ر ہندوستان میں، جمعہ ادا نہیں ہوتا اس لئے ہم ظہر احتیاطی ادا کرتے ہیں اس کے پیچھے نماز جمعہ جائز ہی یا نہیں

ہے یا نہیں؟ الجواب: یہ مسئلہ اقتدار الشافعی فی الوتر کی نظیر ہے، اور اس میں اختلاف ہے،

..... قال فی الارشاد انه لا يجوز اصلا باجماع اصحابنا لانه اقتداء

مفترض بالمتنفل ۱۲ شامی وواقفہ ابن الہمام فی الفتح، مگر صرح یہ ہے کہ اقتداء صحیح ہے

بشرطیکہ امام نے صرف وتر کی نیت کی ہو، سنت و تطوع بالوتر کی نیت نہ کی ہو، صرح

فی التحنيس ان الامام ان نوى الوتر وهو يراه سنة جاز الاقتداء بمن صلى

الظهر خلف من يرى الركوع سنة وان نواه بنية التطوع لا يصح لانه

اقتداء المفترض بالمتنفل ام شامی ص ۶۹۹ فی التتویر صرح الاقتداء

فیه بشافعی لم یفصلہ بسلام علی الاصح للاتحاد وان اختلف الاعتقاد،

اس جزئیہ کا مقتضایہ ہے کہ قول اصح پر اس شخص کے پیچھے نماز جمعہ صحیح ہے، جبکہ وہ جمعہ

کی نیت کرتا ہو، نفل جمعہ کی نیت نہ کرتا ہو، اور ظاہر یہی ہے کہ جو امام ہندوستان میں جمعہ

کو صحیح نہیں مانتا وہ نماز جمعہ پڑھنے کے وقت تنفل بالجمعہ کا قصد نہیں کرتا، بلکہ فرض جمعہ

یا مطلق جمعہ کی نیت کرتا ہے، اس لئے اس کے پیچھے جو جمعہ پڑھے گئے ہوں ان کی قضا،

لازم نہیں ہاں جو تصریح کر دے کہ میں تنفل بالجمعہ کی نیت کرتا ہوں اس کے پیچھے نماز جمعہ

صحیح نہیں، واللہ تعالیٰ اعلم، ۱۲ صفر ۱۳۸۵ھ

سوال (۵۴) مسجد محلہ میں بانی یا کسی دوسرے شخص کا

نماز جمعہ ادا کرنے سے منع کرنے کی متعلق

اذن عام کے فوت ہونے پر شبہ کا جواب،

..... ایک محلہ میں قریب ستر برس سے ایک پختہ

مسجد واقع ہے، جس میں قریب ستر آدمی اس محلہ

کے اور سات آٹھ آدمی دوسرے محلہ کے جمعہ کے دن نماز جمعہ ادا کرتے ہیں، گزشتہ

رمضان شریف کے بعد ایک دن اکثر کی رائے سے کسی طالب علم کی امداد کے لئے حسب

توفیق دو چار آنے پیسے لانے کے لئے مصلیوں کو کہدیا گیا تھا، دوسرے جمعہ کو بعد ادا سے

نماز جمعہ کے چندہ مذکورہ وصول ہونے لگا، لیکن دوسرے محلہ کے سات آٹھ آدمیوں نے

کہا کہ ہمارے گھر جانے سے ہم دیں گے، ورنہ نہیں، اس بات پر بانی مسجد کے دو پوتوں

میں سے..... صاحب نے (جو چھوٹے ہیں اور متولی مسجد مذکور بھی نہیں ہیں، مگر دنیوی سرداروں میں سے ایک سردار تھے) زجر اور تنبیہا کہا، تم لوگ ہمیشہ امر خیر میں ہمارے ساتھ شرکت نہیں کرتے ہو، اس مسجد میں نماز پڑھنے مت آؤ، لیکن اس کے بعد کے جمعہ میں ان ممنوعین سے دو تین آدمی اس مسجد میں نماز پڑھنے آئے، اور بلا روک ٹوک بدستور سابق نماز جمعہ پڑھی اور اس منع کا تذکرہ تک نہ ہوا، اور باقی تین چار آدمی اس مسجد میں نہ آئے، دوسری مسجد میں جا کر نماز جمعہ ادا کی اور اس بات پر اڑے رہے کہ جب تک مانع ہم لوگوں کو بلا کر نہ لے جائے ہم لوگ اس مسجد میں نہیں جاتے، اب ویسا ہی کیا گیا،

لیکن دریافت طلب امر یہ ہے کہ گزشتہ سات آٹھ ہمدینہ تک جو ممنوعین اس مسجد میں نہیں آئے اس سے بوجہ فوت ہونے شرط اذن عام باقی مصلیوں کی نماز جمعہ شرعاً درست ہوئی یا نہیں، اور اس قسم کے منع سے اذن عام مرتفع ہو گیا تھا یا نہیں؟ اس میں حق کیا ہے، اور اذن عام وقت جمعہ کے مشروط ہے یا قبل جمعہ کے، بینوا تو جبروا؟ صورت مسئلہ میں صرف..... صاحب کے

الجواب من جامع امداد الاحکام منع کرنے سے اذن عام فوت نہیں ہوا، اذن عام ایسے شخص کی ممانعت سے فوت ہوتا ہے جس کی مخالفت پر عوام قادر نہ ہوں مثلاً حاکم وقت منع کرے، اور حاکم وقت کی ممانعت سے بھی اذن عام اس وقت فوت ہوتا ہے جبکہ کسی بستی میں مطلقاً جمعہ پڑھنے سے منع کر دے، اور اگر کسی ایک جگہ سے منع کرے اور دوسری جگہ سے منع نہ کرے تو اذن عام فوت نہیں ہوتا، نماز جمعہ اس بستی کی ہر مسجد میں صحیح ہوگی اور..... صاحب کی یہ حرکت خلاف شرع تھی، کہ ان سے چندہ وصول کرنے پر ایسا جبر کیا، اور نمازیوں کو نماز سے روکا، اس کو علانیہ اپنی حرکت سے توبہ کرنی چاہئے، اور خدا تعالیٰ سے استغفار کرے، واللہ اعلم بالصواب، ظفر احمد عفا عنہ

الجواب من جامع تمت امداد الاحکام ظاہر یہی ہے کہ صرف زبان سے کہہ دینے کی وجہ سے اذن عام مرتفع نہیں ہوتا، الا آنکہ کہنے والا صاحب حکومت ہو، اور فعلاً منع کرنا حاکم وغیر حاکم ہر دو کی جانب سے ہو سکتا ہے، یعنی اگر غیر حاکم بھی مسجد کا دروازہ بند کر دے، یا پہرہ زبردست دروازہ پر لگا دے تو اذن عام فوت ہو جائے گا، اور یہ سب تفصیل جب ہی جبکہ وہاں

ایک ہی جمعہ ہوتا ہو، اور اگر دوسری جگہ بھی جمعہ ہوتا ہو تو بہر حال جمعہ جائز ہو جائے گا،
 فی الشامی قلت وینبغي ان يكون محل النزاع ما اذا كانت لا تقام الا في محل
 واحد اما لو تعددت فلا لانه لا يتحقق التقويت كما افاده التعليل بل
 پس صورت مسئلہ میں جمعہ صبح ہوتا رہا، واللہ اعلم، احقر عبدالکریم عفی عنہ ۱۰ رجب ۱۳۹۰ھ
 جہاں ایک ہی جگہ نماز جمعہ ہوتی ہو **سوال (۵۵)** یہاں جمعہ کی نماز ایک ہی جامع مسجد میں
 وہاں بعض افراد سے نماز جمعہ فوت ہوتی ہے، گاہ گاہ بعض بعض نمازیوں کے پہنچنے سے
 ہو جاتا تو ان کو کیا کرنا چاہئے؟ قبل ہی نماز جمعہ ختم ہو جاتی ہے، اب وہ لوگ دوسری مسجد
 میں جا کر اذان و اقامت کے ساتھ ظہر کی نماز ادا کر سکتے ہیں یا نہیں، یا جمعہ کی نماز ادا کریں
 یا فردی فردی ظہر کی نماز پڑھیں، جو کچھ شریعت کا حکم ہو اس سے اطلاع دیجئے،

الجواب: فی الدر المختار (وکن اهل مصر فاتهم الجمعة) فانهم
 يصلون الظهر بغیر اذان ولا اقامة ولا جماعة وقال الشامی الظاهر ان
 الكراهة هنا تنزيهية لعدم التقليل والمعارضة المذکورین ویؤیدہ ما فی
 القهستانی عن المضمرات يصلون وحداناً استحباباً ام ص ۸۵۶ ج ۱ و فی
 البحر الرائق (ص ۱۵۲ ج ۲) قال فی الظهيرية جماعة فاتهم الجمعة
 فی المصر فانهم يصلون الظهر بغیر اذان ولا اقامة ولا جماعة ام وهكذا
 فی الخلاصة، ص ۲۱۱ ج ۱)

قواعد سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر مصر میں کم از کم چار شخص جمعہ سے رہ جاویں تو وہ جمعہ
 کی نماز دوسری مسجد میں پڑھ لیں اور ان سب میں وجوب جمعہ کی شرطیں پائی جاتی ہوں تو
 جمعہ واجب ہو، اور اگر فقط صحت کی شرطیں ہوں تو واجب نہ کہا جاوے، لیکن پڑھیں
 تو صحیح ہو، مگر حزیئہ کوئی نہیں ملا، بلکہ روایات مذکورہ بالا سے بظاہر اس کے خلاف
 معلوم ہوتا ہے کہ ہر حال میں تنہا تنہا ظہر پڑھیں، لیکن خلاف قواعد ہونے کی وجہ سے ان
 روایتوں میں تاویل کی جاوے گی، اور میرے نزدیک ان روایتوں میں کئی تاویلیں ہو سکتی ہیں
 اول تو یہ کہ ان روایتوں کو بنی کہا جاوے تعدد جمعہ کے عدم جواز پر اور جب مفتی بہ جواز
 تعدد ہے تو یہ روایت بھی مفتی بہ نہ رہے گی، و ہذا ما قالہ سیری و ہر وجہ وجہ، دوسرے یہ کہ
 جماعت کے لفظ کو محمول کیا جاوے جارے کم پر، یعنی دو یا تین آدمی رہ جاویں تو وہ جمعہ نہیں

پڑھ سکتے بوجہ فوت ہونے شرط جماعت کے بلکہ تہناتہنا ظہر پڑھیں، کیونکہ جمعہ کے دن مصر میں ظہر کی جماعت مکروہ ہے، اور یہ تاویل گو خلافت ظاہر ہے لیکن زیادہ بعید بھی نہیں، تطبیق روایا میں اس سے زیادہ بعید کا تحمل کر لیا جاتا ہے، اول یہ دو تاویلیں لکھنے کا ارادہ تھا، کیونکہ اور کوئی تاویل ذہن میں نہ تھی، لیکن عین لکھنے کے وقت ایک تیسری تاویل سمجھ میں آئی، احقر کے نزدیک وہ تہنا کافی داتی ہے، اس لئے اسی پر اکتفاء کا ارادہ ہوا تھا، لیکن تنہیم فائدے کے واسطے یہ دونوں بھی درج کر دیں، ممکن ہے کسی اہل علم کے نزدیک ان میں سے کسی کو ترجیح ہو وہ یہ ہے کہ یہ روایت محمول ہے اس جگہ پر جہاں حکومت اسلامیہ کی طرف سے قاضی وغیرہ مقرر ہو اگر وہاں جمعہ فوت ہو جاوے تو بدرون اذن حاکم دوسرا جمعہ نہیں ہو سکتا، باقی ہمارے ملک میں چونکہ تقریر امام کا مدار تراضی مسلمان پر ہے، اس لئے یہ باقی ماندہ لوگ کسی کو امام بنا سکتے ہیں، اور جمعہ پڑھ سکتے ہیں، کما قال صاحب الخلاصہ (ص ۲۰۸) ولو اجتمعت العامة علی تقدیر رجل لم یامروہ القاضی لم یجز ولم یکن جمعة وان لم یکن ثمہ قاضی ولا خلیفة المیت فاجتمعت العامة علی تقدیر رجل للضرورة وفي الدر المختار (ونصب العامة) الخطیب (غیر معتبر مع وجود من ذکر) اما مع عدمہم فیجوز للضرورة وفيہ ایضا وفي النعجة فی تعدد الجمعة لابن حجر باش انما یشرط الاذن لاقامة ما عند بناء المسجد ثم لا یشرط بعد ذلك، غرضیکہ اہل مصر کو تہناتہنا ظہر کا حکم جب ہے کہ جمعہ سے کوئی مانع ہو، ویؤید ہذا ما فی العالمگیریہ ونصہ وکرہ جماعة النظر لاهل المصر اذا لم یجئوا المانع (ص ۹۵ ج ۱) اب اس بحر وغیرہ کی روایت متقدمہ کی وجہ سے تو کوئی خلجان نہیں، والحمد للہ علی ذلک، الا ان وجوب الجمعة فی ہذا الصورة فی دیارنا، یقتضی وجوب طلب الاذن فی دار الاسلام وهو غیر منصوص فی کتب الفقة ایضا ویکن الفرق بالتعذر فی طلب الاذن من السلطان وغیرہ دون نصب امام الجمعة فلیتم، لیکن حالت مسئلہ کے متعلق جزئیہ نہ ملنے کے باعث بہتر ہے کہ دوسری جگہ بھی تحقیق کر لیا جاوے اور اس جواب کو بھی وہاں بھیج دیا تاکہ کسی قدر سہولت کا باعث ہو سکے، یہ دوسری مسجد میں جمعہ پڑھنا تو جب کہ چار آدمی جمعہ سے رہ جاویں، اور اگر چار سے کم یعنی دو تین آدمی رہ جاویں تو وہ ظہر پڑھیں اور الگ الگ پڑھیں جماعت نہ کریں، اس کے بعد مجموعۃ الفتاویٰ میں مولانا عبدالحی

گھوڑے دالوں کے سوا بھی ہوتے ہیں، اسی طرح غلہ کاٹنے کے وقت کاشتکاروں زمینداروں کو مزدوروں کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور مزدوری پیشہ لوگ ہر شہر میں زیادہ ہوتے ہیں، اس لئے ان کو بھی فقہاء نے مصالح عامہ میں داخل کر لیا ہے، اسی لئے میرے نزدیک اینٹوں اور چونہ کے بھٹوں کو بھی مصالح اہل بلد میں داخل سمجھنا چاہئے، گو بظاہر ان سے تعلق بھٹہ لگانے والوں ہی کو ہے، مگر درحقیقت مزدوری پیشہ لوگوں کو بھی تعلق ہے، اس لئے میں اس کو بھی قنار مصر کے حکم میں سمجھتا ہوں، مگر چونکہ یہ میرا قیاس ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اس مسئلہ میں تحقیق تھانہ بھون سے بھی کر لی جائے،

(۳) ہاں، المجیب نطفہ احمد عفا اللہ عنہ از رنگون، ۵ ارجادی الاول ۱۳۵۸ھ

الجواب من الخانقاہ الامدادیۃ (۱) جواب سوال اول صحیح ہے، کہا ہوا مصر میں توابع مصر فی حق وجوب الجمعة علی اہلہ فاختر فی الخلاصۃ والخانیۃ انہ الموضع المعد لمصالح المصر متصل بہ ومن کان مقيما فی عمران المصر واطرافہ وليس بین ذلك الموضع وبين عمران المصر فرجة فعليه الجمعة ولو كان بین ذلك الموضع وبين عمران المصر فرجة من مزارع او مراع كالقلاع ببخارى لاجمعة علی اهل ذلك الموضع وان سمعوا النداء لم یجب (۲) سوال دوم کے جواب میں غور کیا گیا اور حضرت مدظلہ العالی سے بھی دریافت کیا یہی طے ہوا کہ محض بھٹوں کی وجہ سے کوئی جگہ قنار مصر نہیں بن سکتی، بھٹے زائد سے نظیر میں کھیتی کی اور کھیتی قنار میں داخل نہیں، جیسا کہ روایت مذکورہ بالا سے واضح ہے، و نیز علامہ شامی نے فرمایا ہے (تحت قول الدر والمختار للفتاویٰ تقدیرہ بفسرخ) اقول وبہ ظہر صحتہا فی تکیۃ السلطان سلیم بمرجہ دمشق وکذا فی مسجدہ بصالحیۃ دمشق فاہنا من قنار دمشق بما فیہا من التربة بسفح الجبل وان انفصلت عن دمشق بمزارع لکنہا تریبۃ لاہنا علی ثلث فرسخ من البلدة (ص ۸۳ ج ۱)

اور کما حررہ ابن الکمال کے تحت میں تحریر فرمایا ہے؛ حیث قال واعتبر بعضهم فیہ الاتصال وقد خطاہ صاحب الذخیرۃ قائلًا فعلى قول هذا التاعل لا تجوز اقامة الجمعة ببخارى فی مصلی العيد لان بین المصلی وبلد المصر

مزارع و وقعت هذه المسئلة مرة وافتي بعض مشائخ زماننا بعدم الجواز ولكن هذا ليس بصواب فان احل لم ينكر جواز الصلوة العيد في مصلی العيد بخاری لا من المتقدم من ولا من المتأخرين و كما ان المصرا او قنائة شرط جواز الجمعة فهو شرط جواز صلوة العيد اهـ (صفحہ من کوئے بالا) ان دونوں عبارتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کھیتی فناء میں داخل نہیں، کمالا یحقی، دراصل فناء وہ ہے جو آبادی یعنی سکونت کی ضروریات سے ہو، کیونکہ کچھ ضروریات اہل بلد کی بلد میں پوری نہیں ہو سکتیں وسعت نہ ہونے وغیرہ کی وجہ سے، اس لئے آبادی سے باہر ان ضروریات کے لئے جگہ مقرر کی جاتی ہے اور اس جگہ کو ایک قسم کی آبادی سمجھا جاتا ہے، لہذا وہ ملحق بالبلد ہو کر اقامت جمعہ کا محل ہو جاتی ہے، پس ضروریات سے خاص وہ ضروریات مراد ہیں جو متعلق بالاسکنی ہوں سب ضروریات مراد نہیں، ورنہ تمام کھیت، باغات اور لکڑیوں کے جنگل وغیرہ کا فناء میں داخل ہونا لازم آتا ہے، ولا قابل بہ،

(۳) تیسرا نمبر متفرع ہے، بمردوم پر اس لئے اس میں بھی ہمیں اختلاف ہے، واللہ اعلم بالصواب، کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ تھابثہ ارجادی الاخری شہد

سوال (۵۷) آبادی سے باہر عید گاہ تعمیر کی گئی، پھر وسعت آبادی کے سبب آبادی میں آجائے تو اسکی صحرا باطل ہوگئی یا نہیں

عصرہ چالیس پچاس سال کا گذرا کہ مسلمانوں نے قصبہ کے باہر ایک عید گاہ تعمیر کی اور چہار دیواری تعمیر کر کے محفوظ کر دی، اور آج تک تمام مسلمان اس میں بلا اختلاف نماز عیدین ادا کرتے رہے، کچھ عصرہ سے اس کے تین اطراف میں مکانات تعمیر ہو گئے، (جس میں بعض ابھی احاطہ ہی ہیں اور بعض مکانات ہیں، اب کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ نماز عیدین صحرا میں پڑھنی افضل ہے، اور مکانات تعمیر ہونے سے صحرائیت باطل ہوگئی، لہذا اس عید گاہ کو چھوڑ کر صحرا میں نماز پڑھنی چاہئے، اور کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب یہ عید گاہ تعمیر ہوئی تھی تو اس وقت صحرا میں تھی وہی حکم باقی رہے گا اور تعمیر مکان کی وجہ سے اس عید گاہ کو معطل نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ مصلی نبوی کے پاس کثیر بن الصلت کا مکان اور حضرت معاویہ رحمہ کا مکان تعمیر ہو گیا تھا، لیکن صحابہ کرام اس میں نماز عیدین برابر ادا کرتے رہے، نیز کہ معظمہ میں باوجود بستی ہو جانے اب تک نماز

مسجد ہی میں ہوتی ہے، بواہر غیری ذرع کا حکم اب تک باقی ہے، اب سوال یہ ہے کہ اس میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

تنقیحات؛ (۱) کیا صحراء میں جانے کا حکم ہر حال میں ہے، (۲) اس عید گاہ موجود کو کس کام میں لانا چاہتے ہیں، (۳) کیونکہ مصلیٰ نبویؐ کے پاس الخ کا حوالہ مع عبارت کتاب درج کیا جاوے؟

جواب تنقیحات؛ (۱) کہتے ہیں کہ اگر عذر شرعی (بارش وغیرہ) نہ ہو تو صحراء میں جانا چاہتے، (۲) عید کی نماز صحراء میں پڑھی جائے، اس کے بعد اگر ضرورت ہوگی تو مجبور یا بیمار لوگ اس میں نماز پڑھیں گے یا جو مصرف نکل آوے، (۳) کتاب الامم میں امام شافعیؒ نے لکھا کہ مکہ والے برابر اسی مسجد میں عیدین کی نماز پڑھتے تھے، اور صحراء کے بعد سبکی کا ہونا آیت سے معلوم ہوتا ہے، ویزیشخ عبدالحی محدث دہلوی مدارج النبوة میں تحریر فرماتے ہیں واہل مکہ کہ ہم ازمن اول عادت برس دارند کہ در مسجد گزارند و بھراء بیرون نروند الا ان خود اہل مدینہ نیز در مسجد می گزارند و در مفارقت از مشرف و برکت راضی نمیشوند و وسعت مسجد شریف الا ان بروج کفایت است بآبادانی اس بلده شریفہ بخلاف زمان مبارک وے صلی اللہ علیہ وسلم کہ وسعت مسجد کمتر بود و آبادانی شہر بیشتر انتہی، مدارج النبوة جلد اول، صفحہ ۴۲۸،

الجواب؛ اس کے متعلق کہیں تصریح تو ملی نہیں، مگر قواعد کا مقتضایہ ہے کہ اگر نماز نماز عید کسی ایسے میدان میں ہوتی ہو جو بالخصوص نماز عید کے لئے وقف نہ ہو، بلکہ مصالح عامہ کے واسطے ہو، اور وہ آبادی میں شامل ہو جاوے، تب تو اس جگہ کو ترک کر کے کسی دوسری میدان میں جو آبادی سے خارج ہو، نماز عیدین ادا کرنا سنت ہے، اور اگر خاص نماز عید کے لئے کوئی جگہ وقف ہو، جیسا کہ سوال میں درج ہے، اور اکثر شہروں میں دستور ہے تو عید گاہ آبادی میں آجانے سے ترک نہ کی جاوے گی، کیونکہ مصالح وقف کی رعایت ضروری ہے گو اس کو صحراء نہیں کہہ سکتے، مگر سنت اصلیه کو حفاظت وقف کی وجہ سے ترک کیا جاوے گا لان تحفظ الوقت واجب وایمان الواجب اہم من فعل السنۃ، واللہ اعلم،

اور سوال میں جو دو دلیلیں لکھی ہیں ان میں سے دلیل اول تو ناکافی ہے، اور دلیل دوم بالکل ہی ناقابل ذکر ہے، دلیل اول اس واسطے ناکافی ہے کہ کثیر بن الصلت اور حضرت معاویہؓ

سے سائل نے جو حوالہ دریافت کیا تھا جواب تیقہ میں اس سے تعرض نہیں کیا گیا، مگر فتح الباری میں؟

دیکھا تو کثیر بن صلت کا مکان ہونا تو مذکور ہی مگر حضرت معاویہؓ کے مکان کا اس میں کوئی تذکرہ نہیں ۱۲ منہ

کے ایک دو مکان بن جانے سے اُس جگہ کو آبادی قرار نہیں دے سکتے، بلکہ چند مکان بننے کو تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ مکان جنگل میں ہیں، آبادی اُس وقت ہوتی ہے جبکہ تمام اطراف میں مکانات ہو جائیں کمالا یحقی، اور مدارج النبوة کی عبارت کو صورت مبحث جہنا سے کوئی تعلق نہیں وہ صرف اہل مدینہ کے فعل کی ایک تاویل ہے، ورنہ اس سے ایک سطر قبل شیخ خود مدارج النبوة میں تحریر فرما چکے ہیں ”و در بعضی امصار کہ در مساجد میگذارد خلاف سنت است مگر آنکہ عذرے باشد“ علاوہ ازیں یہ خرابی ہے کہ اگر شیخ کی توجیہ مذکور فی السؤال کو تسلیم کیا جادے تو سنیت صحراء بالکل اڑ جاتی ہے، دلائل قائل بہ من الفرقین بلکہ صحراء میں نماز عید کی سنیت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ اختلاف ہو کہ صورت مسئلہ میں یہ جگہ صحراء کے حکم میں ہے یا نہیں، و نیز یہ کہ اگر صحراء نہیں تو قابل ترک ہے یا نہیں، خلاصہ جواب کا یہ ہوا کہ حالت موجودہ میں عید گاہ کو ترک کرنے کی ہمارے نزدیک گنجائش نہیں ہے، فقط کتبہ الاحقر عبد اللہ کریم عنہ

الجواب صحیح اشرف علی ۲ ذیحجہ ۱۳۵۷ھ
۲ ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ

جمعة فی القری کے متعلق مذہب امام اعظم کی تحقیق؛ از حبیب احمد کیرانوی

سوال (۵۸) فافہم غیر مقلدین اور انکے متبعین نے جمعہ فی القری کے باب میں امام المجتہدین کو نشانہ ملامت بنا رکھا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس باب میں امام صاحب کے اجتہاد کی حقیقت اختیار تو کیا خود ان کے اتباع بھی کما حقہ نہیں سمجھے، سوان کے اجتہاد کی حقیقت جہاں تک میں سمجھتا ہوں اور انشاء اللہ صحیح بھی ہوگی یہ ہے: ”کہ جمعہ کے روزا صالۃ ظہر فرض ہی، اور جمعہ اس کا قائم مقام بس جس صورت میں جمعہ کی صحت یقینی ہے اس صورت میں وہ قائم مقام ظہر ہو کر مسقط فرض ظہر ہو کر یقیناً ہو سکے گا، اور جس صورت میں اس کی صحت مشتبہ ہو اس صورت میں وہ قائم مقام ظہر اور مسقط فرض ظہر نہ ہوگا“ اب امام صاحب نے دیکھا کہ صحت جمعہ فی المدین مع وجود الامام اونیائہ مجمع علیہ ہے، اس لئے یہ جمعہ ضرور قائم مقام فرض ظہر اور مسقط ظہر ہی اور صحت جمعہ فی القری یا فی المدین بلا امام یا نائب امام مشتبہ ہے، اس لئے انہوں نے فرمایا کہ یہ جمعہ مسقط فرض ظہر نہیں ہے، اور جب وہ مسقط فرض ظہر نہیں تو جائز بھی نہیں، لان الجمعۃ الغیر المسقطۃ للظہر لم یعرف مشروعیتہا، پس یہ مبنی ہے ان کے اس حکم کا کہ گاؤں میں جمعہ جائز نہیں، اور نہ اُن شہروں میں جن میں امام یا نائب امام نہ ہو، سو یہ بات ایسی نہ تھی کہ امام الائمہ کو نشانہ ملامت بنایا جاتا، بلکہ درحقیقت اپنی اس وقت فہم اور کمال توسع

واحقیاط پر آفرین کے مستحق تھے، مگر خدا برابر کرے جہالت اور تعصب کا کہ انھوں نے امام صاحب کے کمالات کو عیوب بنادیا، لیکن اگر ہم اس وقت ہم سے بھی قطع نظر کریں اور صرف آثار ہی کو پیش نظر رکھیں تب بھی امام صاحب ہی کا پہلہ بھاری نظر آتا ہے، کیونکہ حضرت علیؑ اور حضرت حذیفہؓ کی روایات سے نہایت صحت اور صفائی کے ساتھ اشتراط امصار و مدن ظاہر ہے، برخلاف اس کے جو آثار ان کے مقابلہ میں پیش کئے جلتے ہیں، ان سے عدم اشتراط اس صفائی کے ساتھ ظاہر نہیں ہوتا، مثلاً وہ جو انی والی روایت سے استدلال کرتے ہیں، لیکن اس میں تشریہ کا لفظ محل کلام ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد گاؤں ہے ہم کہتے ہیں کہ اس سے مراد مطلق بستی ہے، چنانچہ تمام قرآن میں یہ لفظ مطلق بستی کے معنی میں مستعمل ہوا ہے، لہذا یہ روایت و حدیث میں حضرت علیؑ و حذیفہؓ کے برابر نہیں،

اسی طرح وہ الحجۃ واجب علی کل مسلم سے استدلال کرتے ہیں، مگر ہم کہتے ہیں کہ اس کے معنی واجب بشرائط ہیں، لہذا یہ روایت بھی مفید مدعا نہیں، نیز وہ حضرت عمرؓ کے قول جموا حیثما کنتم سے استدلال کرتے ہیں، مگر ہم کہتے ہیں کہ اس میں خطاب ولایۃ کو ہے نہ کہ عوام کو، نیز اس میں اتنا عموم مراد نہیں جتنا کہ وہ مراد لیتے ہیں، کیونکہ مجتہدین کے نزدیک صحابی و بخار و غیرہ مستثنیٰ ہیں اور غیر مقلدین کے نزدیک اراضی مغصوبہ و مقامات بخ و غیرہ مستثنیٰ ہیں، پس جبکہ یہ لفظ اپنے عموم پر باقی نہیں ہے، تو اس کے عموم سے استدلال صحیح نہیں، پس جبکہ یہ اور اسی قسم کی روایات و ضاحت میں حضرت علیؑ و حذیفہؓ کی روایات کو ترجیح ہوگی، کیونکہ جو لوگ اشتراط مصر کے قائل ہیں ان کے قول کا مبنیٰ علم بالدلیل ہے، اور جو لوگ اشتراط کے قائل نہیں ان کے قول کا مبنیٰ عدم علم بالدلیل ہے، وہل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون، اور اگر ترجیح بھی نہایت نہ ہو تو غایت درجہ مساوی ہوں گی، اور مساوات کی صورت میں صحت و عدم صحت جمع مشکوک ہو جائے گی، اور اس سے فرض ظہر ساقط نہ ہوگا، اور جب فرض ظہر ساقط نہ ہو تو یہ جمع مشرف نہ ہوگا، لان الحجۃ ما شرعت الا مسقطۃ لفرض الظہر، و ہذہ لیست بمسقطۃ فلا تکن مشروطۃ، اور اگر بالفرض مخالفین ہی کے دلائل کو ترجیح ہو حالانکہ ایسا نہیں ہے تو غایت مافی الباب یہ کہ گاؤں میں جمع فرض ظہر ہوگا اور اس لئے وہ فرض قطعی یعنی ظہر کے قائم مقام نہ ہو سکے گا، وہو المدعی،

پس اس مقدمہ میں تو فیصلہ امام صاحب کے موافق رہا، اب رہا دوسرا مقدمہ یعنی

اشتراط امام یا نائب امام کا مسئلہ، سوا ابو سعید خدریؓ کی حدیث مرفوعہ اور ابو ہریرہؓ و حضرت عمرؓ کا سوال و جواب اور مولیٰ سعید بن العاصؓ اور ابن عمرؓ کے سوال و جواب اور عمر بن عبد العزیزؓ کا عدی بن عدی کو حکم یہ تمام امور دلیل اشتراط ہیں، اور نافین اشتراط کے پاس کوئی دلیل نفی اشتراط پر نہیں، اور اگر ہو بھی تو پھر اس میں یہی بحث ہے کہ اشتراط مبنیٰ ہے علم بدلیل الاشتراط پر اور نفی کا مبنیٰ عدم علم بالاشتراط ہے، وہل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون اور اگر ہم تعارض بھی مان لیں تو زیادہ سے زیادہ یہ کہ عدم امام یا نائب کی صورت میں صحت جمعہ مشکوک ہوگی اور بصورت رجحان دلائل مخالفین جمعہ بدون امام فرض ظنی ہوگا جسکو واجب کہتے ہیں، اور واجب فرض قطعی کے قائم مقام نہ ہو سکے گا، پس یہ مقدمہ بھی امام صاحبؒ کے موافق طے ہوا اور ثابت ہوا کہ امام صاحبؒ کا مسلک ہر طرح صحیح ہے، اور ہرگز قابل اعتراض نہیں،

یہ گفتگو تو اغیار سے متعلق تھی، اب ہم کچھ اتباع امام صاحبؒ کے متعلق لکھنا چاہتے ہیں، اچھا سنتے، امام صاحبؒ نے دلائل کے ذریعہ سے جیسا کہ اوپر معلوم ہوا صحت جمعہ کے لئے دو شرطیں لگائی تھیں؛ اول مصر، اور دوسری امام یا نائب امام، اور یہ دونوں مستقل اور علیحدہ شرطیں تھیں، لیکن مقلدین نے اپنے اجتہاد سے دونوں شرطوں کو حذف کر دیا، کیونکہ انھوں نے کہا کہ امام یا نائب امام کی شرط محض انتظامی ہے، اور یہ شرط صرف اس لئے لگائی گئی ہے تاکہ تقدیم و تقدم میں تنازع نہ ہو، اب اگر یہ مقصد کسی اور طریق سے پورا ہو جائے تو پھر امام یا نائب امام کی ضرورت نہیں،

نیز انھوں نے کہا کہ اگر امام کسی گاؤں میں موجود ہو تو وہاں وہ اقامت جمعہ کر سکتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ مصر کی شرط فی نفسہ ضروری نہیں، بلکہ اس لئے ہے کہ عادتاً امام یا نائب امام شہر ہی میں موجود ہوتا ہے، پس اگر امام کسی گاؤں میں موجود ہو تو وہ بھی حکماً شہر ہی، پس جبکہ نہ مصر مقصود بالذات ہوا اور نہ امام یا نائب امام، بلکہ شہر مطلوب ہوا امام یا نائب امام کے لئے اور امام مطلوب ہوا انتظام کے لئے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر گاؤں میں تنازع کا اندیشہ نہ ہو جیسا کہ آجکل ہے تو اس میں جمعہ جائز ہے، اور اگر کسی شہر میں اندیشہ فساد ہو جیسا کہ اُس وقت ہوتا ہے جبکہ شہروں میں ہندو مسلم فساد یا کوئی دوسرا ہڑ لونگ ہو تو وہاں جمعہ جائز نہیں، لفوات الشرط و ہوا انتظام، لیکن غور کرنے کا مقام ہے کہ اگر امام کا یہی مطلب

ہوتا جو یہ معتقدین بیان کرتے ہیں تو ان کو مصر اور امام یا نائب امام کی علیحدہ علیحدہ شرطیں لگانے کی ضرورت نہ تھی، بلکہ صرف بشرط امن عن التنازع کافی تھی، اور جبکہ انھوں نے یہ شرط نہیں کی بلکہ مصر کو علیحدہ شرط کیا اور امام یا نائب امام کو الگ تو معلوم ہوا کہ یہ دونوں شرطیں فی نفسہ مطلوب ہیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر شہر میں امام یا نائب امام نہ ہو جیسا کہ ہندوستان میں تو جمعہ جائز نہیں، لفوات الشرط الثانی، اور اگر گاؤں میں امام ہو تو وہاں بھی جمعہ جائز نہیں لفوات شرط الاول، اور اگر گاؤں میں امام یا نائب امام نہ ہو تب بھی جمعہ جائز نہیں لفوات الشرطین، پس ثابت ہوا کہ امام صاحب کے مذہب کو غیر مقلدین تو کیا خود مقلدین بھی نہیں سمجھے، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ امام صاحب کے مذہب کے موافق ہندوستان میں شہروں میں جمعہ صحیح ہے اور نہ گاؤں میں، اور دوسرے ائمہ کے نزدیک شہروں میں بھی صحیح ہے، اور گاؤں میں بھی اور چونکہ اس وقت رواج عام کی وجہ سے امام صاحب کے مذہب پر عمل ناممکن ہے اور اس کی دعوت دینے میں شدید فتنہ کا اندیشہ ہے، اس لئے موجودہ رواج کو جائز قرار دیا جاوے گا اور یوں کہا جاوے گا کہ ہم بضرورت دوسرے ائمہ مجتہدین کے مذہب پر جمعہ پڑھتے ہیں، اور جبکہ مقلدین خود دوسرے ائمہ کے مذہب پر عمل کر رہے ہیں، تو جو لوگ دوسرے ائمہ کے مذہب کے موافق گاؤں میں جمعہ پڑھتے ہیں اُن پر تشدد نہ کرنا چاہیے، ہاں اگر کوئی امام صاحب پر طعن کرے اس کا جواب ضرور دیا جاوے،

نیز چونکہ موجودہ جمعے دوسرے ائمہ کے مذہب پر صحیح ہیں، اس لئے ظہر احتیاطی کی ضرورت نہیں، ہاں اگر کوئی امام صاحب کے خلاف سے بچنے کے لئے پڑھ لے تو مضائقہ نہیں، لیکن اس پر زور دینے کی ضرورت نہیں، اور غیر مقلدین کا فرض ہے کہ وہ امام صاحب کے مقلدوں کو اپنے مسلک کے اختیار کرنے پر مجبور نہ کریں، کیونکہ اگر اُن کے حق اجتہاد تسلیم کر لیا جاوے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ اُن کو کسی امام کی تقلید کے لئے مجبور نہ کیا جاسکے گا، لیکن اُن کو یہ حق کسی طرح نہیں کہ وہ دوسروں کو اپنی تقلید پر مجبور کریں، سلف کا طریقہ یہ تھا کہ فتنہ کے موقع پر خود اپنے اجتہاد کو چھوڑ دیتے تھے نہ یہ کہ وہ اپنے اجتہاد کی اس طرح تبلیغ کریں جس سے شدید فتن کا صرف خطرہ ہی نہ ہو، بلکہ ان کا مشاہدہ ہو رہا ہو، خدا کے لئے اُمت مرحومہ پر رحم کرو اور اپنے اجتہادات کو (بشرطیکہ ان کو اجتہادات کہا جائے) اجتہادات ہی کی حد میں رکھو اور ان کو وحی قطعی کا مرتبہ نہ دو، امید ہے کہ آپ میرے

مخلصانہ مشورہ پر غور کر کے اس کی قدر کریں گے، دما یرید الاصلاح ما استطعت وما توفیقی
 اللہ باللہ

جواباً خاتماً اُملاً دئیہ ملاحظہ فرمودہ حضرت اقدس امجدیہ،
 اقول وباللہ التوفیق، اشتراط مصر و سلطان پر جو استدلال کیا ہے وہ بظاہر بہت عمدہ ہے
 اور احقر نے بہت روز ہوئے کسی کے کلام میں دیکھا بھی ہے، مگر غور کے بعد معلوم ہوا کہ اس
 کے دونوں مقدموں پر کلام ہو سکتا ہے، پہلا مقدمہ یعنی جمعہ کے روزا صالۃ ظہر فرض ہی
 اور جمعہ اس کا قائم مقام، یہ امام صاحب اور امام ابی یوسف کے قول پر تو صحیح ہے، مگر امام زفر
 اور امام شافعی کے نزدیک جمعہ اصل ہے، اور ظہر بدل، اور امام محمد نے فرمایا ہے، لا ادری
 ما اصل فرض الوقت فی ہذا الیوم ولكن یسقط الفرض عنه بازاء الظہر والجمعة قال شمس الائمۃ
 فی المبسوط یرید بہ ان اصل الفرض احدہما لا بعینہ یتخین لفعلة (ص ۳۳ ج ۲) اور مختلف
 مقدمہ سے خصم پر حجت قائم نہیں ہو سکتی، البتہ فی نفسہ اثبات مذہب کے لئے یہ مقدمہ کارآمد
 تھا، اگر دوسرا مقدمہ مخدوش نہ ہوتا، لیکن دوسرے مقدمہ میں یہ شبہ ہے کہ کچھ شرائط جمعہ ایسے
 بھی ہیں جو دیگر ائمہ نے لئے ہیں، مگر امام صاحب نے نہیں لئے، مثلاً تعداد جماعت میں
 اختلاف ہے، امام صاحب نے تین مقتدی ہونا کافی سمجھا ہے، حالانکہ دوسرے ائمہ اس
 پر متفق نہیں، پس اس تقریر سے لازم آتا ہے کہ امام صاحب کا قول تعداد جماعت کے بارے
 میں معتبر نہ ہو، کیونکہ وہ مجمع علیہ نہیں، اسی طرح تعدد جمعہ مختلف فیہ ہے، اس تقریر پر تعدد
 جمعہ کو شرط کہنا ضروری ہے، حالانکہ امام صاحب علیہ الرحمۃ کا مذہب صحیح جو متون معتبرہ
 میں موجود ہے، اس کی بناء پر تعدد جمعہ علی الاطلاق درست ہے،

اس کے بعد آثار میں سے اثر علی وحذیقہ رضی اللہ عنہما کو ترجیح کی وجہ جو بیان کی ہے وہ
 بالکل صحیح ہے، مگر معارضہ تسلیم کرنے کی صورت میں جو یہ لکھا ہے ”جو لوگ اشتراط کے
 قائل ہیں اُن کے قول کا مبنی علم باللیل ہے اور جو لوگ قائل نہیں ان کے قول کا مبنی
 عدم علم باللیل ہے“ یہ محل تامل ہے، کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ ہر مسئلہ میں مثبت
 شرطیت و قائل فرضیت کا قول معتبر ہو، حالانکہ ایسا نہیں، مثلاً فاتحہ خلف الامام کو جو
 حضرات فرض کہتے ہیں اس تقریر پر ان کے قول کو تسلیم کرنا ضروری ہے، درحقیقت ہر دو
 فریق علم رکھتے ہیں تمام دلائل کا مگر ایک فریق اس دلیل کو کافی خیال کرتا ہے دوسرا کسی چیز

سے اس کو ناکافی قرار دیتا ہے، واللہ اعلم،

اور بعد ازاں جمعہ ظنی الثبوت کو اس بنا پر جو رد کیا ہے کہ وہ فرض قطعی یعنی ظہر کے قائم مقام نہ ہو سکے گا اس میں بھی کلام ہے، اول تو اس لئے کہ یوم جمعہ میں ظہر کا اصل ہونا قطعی نہیں لکنہ مختلفاً فیہ، دوسرے اس لئے کہ امام صاحب کے قول پر بھی تو بعض جگہ ظنی جمعہ جائز ہے جس کی دو مثالیں اوپر گزر چکیں، پھر وہ مسقط و قائم مقام ظہر کیسے ہو جاتا ہے،

یہ گفتگو تو تقریر استدلال کے متعلق تھی، اب دوسرے جزو کی بابت عرض ہے وہ یہ کہ وہ فقہاء مقلدین پر جو ترک تقلید کا شبہ کیا گیا ہے وہ مبنی ہے اس پر کہ متصرف یہ بوجود الامام اونیہ اور نیز نصب الخطیب من العامہ للضرورة کو تخریج فقہاء سمجھا گیا ہے، حالانکہ ایسا نہیں بلکہ پہلا مسئلہ خود جامع صغیر میں موجود ہے، ونصب ہذا فی الجمعة بمنان کان الامام امیر الحجاز او کان الخلیفہ مسافر اجمع وان کان غیر الخلیفہ وغیر امیر الحجاز وہو مسافر فلا جمعة فیہا وقال محمد لا جمعة بمناء ولا جمعة بعرفات فی قولہم جمیعاً اھ

اور دوسرا مسئلہ امام محمد سے منقول ہے کما صرح بہ فی المبسوط (ص ۳۴ ج ۲) اور شیخین کا اس میں کسی نے اختلاف بیان نہیں کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اتفاق ہو گا یا کم از کم اختلاف کی نوبت نہ آئی ہوگی، یعنی امام صاحب کے وقت میں یہ مسئلہ مسکوت عنہ رہا ہو، بعد میں بوقت ضرورت امام محمد رحمہ اللہ نے ظاہر فرمایا ہوگا، اور شیخین سے جو امام یا اس کے نائب کی ضرورت اقامت جمعہ کے لئے اطلاق کے ساتھ مروی ہو وہ اطلاق اس روایت محمد کے معارض نہیں، کیونکہ اطلاق کو بلا ضرورت کے ساتھ مقید کر سکتے ہیں، اور جہاں کوئی والی نہیں وہاں ضرورت ہے اس لئے اس کا حکم جدا ہو جائے بعید نہیں، اسی واسطے درمختار نے کہا ہے نصب العامۃ الخطیب غیر معتبر مع وجود من ذکر امام مع عدم فحوز للضرورة، اس میں دونوں روایتوں کی رعایت موجود ہے، اور یہی تفصیل قرین قیاس ہے، کیونکہ حکام و ولایہ کی موجودگی میں عوام کو اس قسم کا اختیار دینا بالکل نامناسب ہو، اور جب حکام نہیں تو ان کو خود اپنا انتظام کرنا لازمی ہے، کما لا یخفی بعد ادنی تأمل،

بہر حال یہ مسئلہ بھی مشائخ و فقہائے متاخرین کی تخریج نہیں پس اُن پر اجتہاد و ترک تقلید کا الزام نہیں ہو سکتا، البتہ نفس مسئلہ پر اشکال متوجہ رہا جو باعث ہوا تھا الزام کا

سو اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے مسئلہ کو یعنی تمصر قریہ بالام کو عام سمجھ کر یہ اشکال پیش آیا، حالانکہ فقہ کرام کے کلام سے صاف ظاہر ہے کہ ہر قریہ اس حکم میں نہیں بلکہ وہی قریہ ہے جس میں دوسری اوصاف شہریت بھی موجود ہوں، چنانچہ درمختار میں ہے وجازت الجمعۃ بمبنی فی الموسم فقط لوجود الخلیفۃ ادا میر الحجاز وال عراق ادمکۃ ووجود الاسواق والسک وکذا کل البنیۃ نزل بہا الخلیفۃ، اس میں صرف خلیفہ وغیرہ کے وجود کو کافی نہیں کہا بلکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وجود اسواق و سک کو بھی اس میں دخل ہے، اور اس سے زیادہ صریح فتح القدیر میں ہے ثبوت ولایۃ الاقامۃ للجمعۃ ہوا لمصح بعد کون المحل صالحاً للتمصیر (الی قولہ) بخلاف ما اذا کان المحل غیر صالح للتمصیر فلذا قالوا اذا سافر الخلیفۃ فلیس لہ ان یصح فی القریٰ کا لبراری اور (طہ ۲۱۱) اور تمصر قریہ کے لئے وجود سلطان کے ساتھ قابل تمصیر کی قید معلوم ہونے کے بعد وہ اشکال کسی طرح واقع نہیں ہو سکتا جو اس تحقیق میں فاضل محقق دام فضہم نے وارد کیا ہے، اس مختصر عرض سے واضح ہو گیا کہ بلاد ہند وغیرہ کے شہروں میں جمعہ پڑھنا عین مذہب احناف کے مطابق ہے، اس میں دوسرے ائمہ کا مذہب حنفیہ نے ہرگز اختیار نہیں کیا، ورنہ دوسرے شرائط ضروریہ کی رعایت کا حکم بھی دیا جاتا، مثلاً چالیس مقتدی کا قابل امامت ہونا، کیونکہ مذہب غیر اختیار کرنے کے واسطے استتباع شرائط لازم ہے، اور جب یہ واضح ہو گیا تو معلوم ہو گیا کہ جمعہ فی القریٰ کی ممانعت میں ڈھیلا ہونے کا مشورہ قابل قبول نہیں، ایک بات قابل گزارش یہ بھی ہے کہ ترک جمعہ میں کوئی تکلیف اور حرج پیش نہیں آیا جو مسوغ ہے خروج عن المذہب کا، اس لئے اگر مذہب حنفیہ میں امصار ہند محل جمعہ نہ ہوتے تو اس باب میں دیگر ائمہ کا مذہب اختیار کرنے کی گنجائش نہ ہوتی، پس اس کہنے کی بھی گنجائش نہیں کہ گو امصار ہند میں مذہب غیر لینے کی نوبت نہ آتی ہو مگر جمعہ فی القریٰ میں لیلیا جائے واللہ اعلم، احقر عبدالکریم ازخلفاء امدادیہ تھانہ بھون ۱۰/ربیع الثانی ۱۳۵۴ھ

آبادی متفرقہ فیصلہ کے مجموعہ میں سوال (۵۶).....

وجوب جمعہ کی ایک صورت حکم موضع بسی ایسی بستی ہے کہ جو قریباً ساڑھے تین سو برس سے آباد ہے، اور پٹھانوں کی آبادی ہے، بفضلہ اس بستی نے اتنی ترقی کی ہے کہ اس کے اندر سے گیارہ موضع اور جداگانہ پٹھانوں نے آباد کئے جسکو قریباً تین سو برس کا زمانہ ہو چکا ہے، اور ان مواضع کے اسماء جداگانہ کاغذات سرکاری میں درج ہیں اور

عوام الناس میں مشہور ہیں، اور موضع بسی سے مواضع پلڑہ و پلڑی قریب قریب ایک ایک فرلانگ کے فاصلہ پر آباد ہیں، اور یہ ہر دو مواضع بسی ہی میں سے جدا ہو کر آباد ہوئے ہیں، بلکہ پلڑی میں دو ہزار کی مردم شماری خود ہے، اور اس میں سے ایک اور گاؤں تھوڑی عرصہ سے جدا ہو کر آباد ہوا ہے، جو نیا گاؤں کے نام سے مشہور ہے، جس کی مردم شماری پانچسو کی ہے، و نیز دیگر مواضع آدم پور و کمال پور قریب ایک ایک میل کے فاصلہ سے موضع بسی کے آباد ہیں، اور یہ بھی ۳ و ۴ اسی موضع بسی کے اندر سے نکل کر آباد ہوئے ہیں، موضع بسی میں مستقل بازار دکان پرچون و حلوائی و بزاز و قصائی و لوہار بھی موجود ہیں، اور جس وقت یہاں بسی میں اذان ہوتی ہے تو مواضع پلڑہ و پلڑی میں بخوبی آواز پہنچتی ہے اور اس بسی میں ایک بازار ہفتہ وار بھی لگتا ہے، جس میں مویشیاں اور دکان قرب و جوار کی آتی ہیں، مثلاً حلوائی، بزاز، قصاب جو لحم فروخت کرتے ہیں اور بکر قصاب و سبزی و پنساری لوہے کی چیزیں، لکڑی کی چیزیں، بسائی، جوتوں والے، تیل، غلہ، گھی، برتن، رنگی ہوئی کھلیں و پلارنگی ہوئی، مسلمان بھٹیاری کی دکان، ہندوؤں کا کھانا، پان والوں کی دکانیں، سوت، ستاروں کی دکانیں، جن پر بنا بنایا زیور ملتا ہے، پتھروں یعنی زیور بننے والوں کی دکانیں اور اس موضع میں ایک سرخ منجانب گورنمنٹ اہل ہنود بھی مقرر ہے، جو مقدمہ طے کرتا ہے، اور مردم شماری اس وقت سات سو کے قریب ہے، البتہ موضع پلڑی کی مردم شماری دو ہزار ہے، اور پلڑہ کی مردم شماری پانچسو ہے،

اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ جیسے اس موضع بسی میں قدیم الایام سے جمعہ و نماز عیدین ہوتی چلی آرہی ہیں کیا یہ جائز ہیں؟ اور یہ بھی دریافت طلب ہے کہ قصبہ شاہ پور موضع بسی کے ایک میل کے فاصلہ پر آباد ہے اور وہاں جمعہ ہوتا ہے، مردم شماری قصبہ قریب چار ہزار کی ہے، بمقابلہ قصبہ مذکور موضع بسی میں نماز عیدین و جمعہ ہو سکتی ہے یا نہیں؟ ۱۸ سوال مشکہم تنقیح؛ (۱) مجھ سے جس وقت میں بسی گیا تھا، زبانی یہ بھی کہا گیا تھا کہ موضع بسی کے حدود میں پلڑی کے مکانات کا سلسلہ آگیا ہے، اسی طرح بسی کے مکانات سے ایک جانب میں پلڑہ کے مکانات کا سلسلہ مل گیا ہے، سوال میں یہ بات ظاہر نہیں کی گئی، اگر یہ صحیح ہے تو اس کو ظاہر کرنا چاہئے؟

(۲) مجھ سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ جس جگہ بسی کا مدرسہ ہے وہ موضع ہے پلڑی کا حصہ ہے؟

اور اس کو بھی عرفاً پلڑی میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور سرکاری کاغذات میں مدرسہ لسی کا کہلاتا ہے، اس کو بھی سوال میں ظاہر نہیں کیا گیا، فقط ظفر احمد عفاعنہ ۲۴، سوال ۳۳۷۔

جواب تنقیح: حضرت مفتی دین شرع متین گزارش بابت تنقیح یہ ہے کہ فی الواقع موضع بسی کے حدود میں پلڑی کی آبادی کئی بیگہ بڑھ گئی ہے، اور اب بوجہ اس کے بڑھتی بند ہو گئی ہے کہ بسی کی جانب اب تالاب ہے، اور وہ رکاوٹ تعمیر مکانات پیدا کر رہا ہے، یہ تالاب بسی کی آبادی کے پچاس قدم فاصلہ پر پلڑی کی جانب واقع ہے اور پلڑہ کی آبادی بسی سے نہیں ملی، بلکہ خود بسی کی آبادی پلڑہ کے گوڑہ سے اور کچھ صحرا پلڑہ سے مل گئی ہے، اور گوڑہ کا بھی آبادی کے کاغذات سے تعلق ہوتا ہے،

۲، موضع بسی میں کوئی مدرسہ سرکاری اسلامیہ نہیں ہے، البتہ پہلے جس کو عرصہ پانچ ماہ کا ہوا، اسلامی تعلیم ایک معلم بچوں کو..... دیا کرتے تھے، باقی موضع پلڑہ میں مدرسہ سرکاری درجہ تین تک مقرر ہے، اور موضع پلڑی میں سے جو مزرعہ نکل کر آباد ہوا ہے جس کا نام نیا گاؤں عرف گوکل گڈھ ہے اس میں ایک مدرسہ میڈل جماعت تک سرکاری کھلا ہوا ہے، اور خود پلڑی میں مدرسہ امدادی قائم تھا، مگر اب نہیں ہے، اور نیا گاؤں پلڑی ہی کا مزرعہ ہے، باقی نئے گاؤں کے نام کوئی صحرائی نہیں ہے، نیا گاؤں جو ہے اس میں ایک کارخانہ کوٹھوا یکھ پڑنے کا بھی ہے، جہاں پر چرخیاں کثرت سے ملتی ہیں اور دیگر حلوائی اور پنساری دلوہے کی دکان بھی ہے، پلڑے میں بھی مستقل بازار ہے، پنساری، بزازہ و پرچون دلوہا و اناج و غلہ و جولاہے کی دکان جو کہ کپڑا بنتا ہے موجود ہیں،

الجواب: میرے نزدیک بسی اور پلڑہ پلڑی کا مجموعہ ایک ہی بستی ہے بوجہ اتصال حسی کے، گو کسی وجہ سے نام الگ الگ ہوں، اس لئے میں ان تینوں کو ایک گاؤں قرار دیکر ان میں جمعہ جائز سمجھتا ہوں، واللہ تعالیٰ اعلم، ۵، ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ

سوال (۵۷) زید ایک گاؤں کا باشندہ ہے، گاؤں کے دیگر مسلمان اس کی دینی معلومات اور علمی قابلیت کی وجہ سے اس کو اپنے مقابلہ میں بمنزلہ عالم کے سمجھتے ہیں اور وہ حضرت والا کا معتقد ہے، اس کئے گاؤں میں نماز جمعہ وعیدین ہوا کرتی ہے، زید کبھی گاؤں میں حاضر رہتا تو وہی نماز جمعہ وعیدین پڑھایا کرتا تھا، کچھ عرصہ سے زید نے حضرت والا کا یہ فتویٰ دیکھ کر کہ گاؤں میں نماز جمعہ وعیدین درست نہیں، نماز جمعہ وعیدین پڑھنا پڑھا

چھوڑ دیا ہے، مگر بحیالِ فتنہ دوسروں کو پڑھنے سے منع نہیں کرتا ہے، اور وہ لوگ برابر پڑھا کرتے ہیں، مگر ان کو یہ امر ناگوار گذرتا ہے کہ زید سا شخص جو علمِ دین سے نسبتاً زیادہ واقفیت رکھتا ہے نمازِ جمعہ و عیدین کیوں نہیں پڑھتا دپڑھاتا ہے، بعض لوگ زید کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ نماز پڑھائے، کیونکہ قرب و جوار کے دیہات کے لوگ بھی نمازِ عیدین کو اس کے گاؤں میں آیا کرتے ہیں، ورنہ یہ لوگ آنا بند کر دیں گے، اور دوسرے بھی جو کم از کم جمعہ یا عیدین کی نماز پڑھا کرتے ہیں وہ بھی چھوڑ دیں گے، پس ایسی صورت میں نمازِ جمعہ یا عیدین زید کا نہ پڑھنا اور نہ پڑھانا شرعاً کیسا ہی، کیونکہ زید اپنے پیشوا (یعنی حضرت والا کے) کے فتوے کے خلاف عمل کرنا نہیں چاہتا ہے،

(۲) یا لوگوں کے اصرار یا انتشار کے خیال سے زید کو بھی نمازِ جمعہ و عیدین پڑھنا

دپڑھانا چاہیے ؟

الجواب؛ اگر اس گاؤں کی آبادی تین چار ہزار سے کم ہے اور وہاں تمام ضرورتی معاش نہیں ملتیں تو وہاں جمعہ و عیدین کی نماز درست نہیں، پس اس صورت میں زید کو وہاں جمعہ و عیدین نہ پڑھنا چاہیے، اور جو لوگ پڑھتے ہیں اُن سے منازعت اور جھگڑا بھی نہ کرنا چاہیے، ہاں نرمی سے عقلا کو سمجھا دیا جائے کہ مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ گاؤں میں جمعہ و عیدین کی نماز درست نہیں اس لئے میں نہیں پڑھ سکتا، اور میری خواہش یہ ہے کہ آپ لوگ بھی نہ پڑھیں، تاکہ گناہ سے بچ جائیں، آئندہ تم کو اپنے فعل کا اختیار اور اگر نرمی سے کہنے میں بھی فتنہ کا اندیشہ ہو، تو اُس سے بھی احتراز کیا جائے، صرف اپنے عمل کو درست کر لیا جائے، واللہ اعلم، ۲۶ رذیقہ ۱۳۸۸ھ

سوال (۵۸) حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ
 جوازِ جمعہ فی القریٰ کے مشبہ کا ازالہ
 اور شہروں میں احتیاطِ ظہر کا حکم

کا ایک فتویٰ فیوضِ قاسمی میں درج ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ جمعہ حتیٰ الوسع ہشروں میں قائم کرنا چاہیے، اور ظہر بھی ضرور پڑھنا چاہیے، اور اگر کوئی شخص گاؤں میں جمعہ قائم کرے اس سے دست و گریبان نہ ہونا چاہیے، اس سے جوازِ جمعہ فی القریٰ ثابت ہوتا ہے، احناف کو اس پر عمل کرنا چاہیے یا نہیں، علماء احناف کی جوازِ جمعہ فی القریٰ مع التزام احتیاطِ ظہر کیا راۓ ہے؟

الجواب؛ حضرت مولانا مولوی محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس ارشاد کا

حاصل صرف یہ ہے کہ چونکہ دیہات میں جمعہ کا صحیح ہونا نہ ہونا ائمہ میں مختلف فیہ ہے، اس لئے حنفیہ کو اس میں دوسرے مذاہب کے لوگوں سے جھگڑنا نہ چاہئے، اور واقعی مسائل مجتہد فیہا میں جھگڑنا مناسب نہیں، مگر مولانا کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حنفیہ کو دیہات میں جمعہ قائم کرنا جائز ہی، کیونکہ جب اُن کے مذہب میں جمعہ فی القری صحیح نہیں تو اُن کو ایسا کرنا کب جائز ہے،

رہا شہروں میں جمعہ کے ساتھ ظہر پڑھنے کا حکم یہ اس وقت کا ہے جبکہ ہندوستان میں شرط سلطان فوت ہونے کی وجہ سے صحت جمعہ میں علماء کو اختلاف تھا، کہ یہاں کے شہروں میں بھی جمعہ صحیح ہے یا نہیں، بعض لوگ اس وجہ سے شہر میں بھی جمعہ کو صحیح نہ مانتے تھے، اور بعض شہر میں بھی جمعہ کے ساتھ احتیاط ظہر پڑھتے تھے، ہمارے اکابر نے اس کو رد کیا، اور عام اہل اسلام کو قائم مقام سلطان کے فرمایا، مگر مولانا محمد قاسم صاحب جمعہ کے ساتھ احتیاط ظہر کو بہتر سمجھتے تھے، اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فساد عقیدہ عوام کی وجہ سے اس کو منع کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ جب اصرار میں جمعہ دلیل سے صحیح ہے تو ہندوستان کے شہروں میں جمعہ وعیدین درست ہیں احتیاط ظہر کی ضرورت نہیں، بلکہ فساد عقیدہ عوام کے انسداد کے لئے احتیاط ظہر سے شہروں میں اور جمعہ قائم کرنے سے دیہات میں سختی کے ساتھ منع کیا جاتا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی یہ تحریر بطور فتوے کے نہیں، بلکہ علل احکام سے بحث کے طور پر ہے، جیسا کہ اس کے مطالعہ سے واضح ہے، اور عام کا فتویٰ تو عوام کے حق میں حجت ہو سکتا ہے، نہ کہ اس کی بحث اور تدقیق رد المحتار میں تصریح ہے کہ ابن الہمام کی اباحت حجت نہیں، کیونکہ وہ عالمانہ گفتگو ہوتی ہے، نہ کہ فتویٰ اور فیصلہ، مگر اذن الحاكم بالجمعة سبقی بحدوث او عولام لا | سوال (۵۹) ایک موضع میں صحت جمعہ کے متعلق اختلاف ہو رہا ہے، مگر اس موضع میں قدیم زمانہ کی شاہی جامع مسجد موجود ہے، جس کے لئے شاہی فرمان سے خطیب و امام کا تقرر بھی ہوا ہے، اس صورت میں یہ موضع جمعہ کے لئے صالح ہے یا نہیں؟ اس جگہ جمعہ اب تک ہو رہا ہے، کبھی منقطع نہیں ہوا، آبادی دو ہزار سے زیادہ ہے، بازار باقاعدہ متصل نہیں؟

الجواب: فی الدر عن القہستانی اذن الحاكم ببناء الجامع فی الرستاق اذن بالجمعة اتفاقا علی ما قالہ الشیخی واذا اتصل بہ الحکم صار مجعاً علیہ فلیحفظ ام قال الشامی عن قتاوی الدیناری اذا بنی مسجد (ای جامع)

فی الرستاق بامر الامام فهو امر بالجمعة اتفاقا على ما قال السرخسى ام والرستاق
القرى كما فى القاموس وظاهر ما مر عن القهستانی ان مجرد امر السلطان او القاضی
ببناء المسجد واداعیها فيه حکم رافع للخلاف بلاد عوی وحارثة، وفى قضاء
الاشباه امر القاضی حکم وافق ابن نجیم بان تزویج القاضی الصغيرة حکم
رافع للخلاف ليس لغیره نقضه امر رص ۸۳۶ ج ۸ قلت ومثل هذا الحكم
الذى لا يجوز لغیره نقضه لا يبطل بموت الحاكم كما لا يخفى فلما كان
حكم الحاكم رافعا للخلاف الذى كان بين الحنفية والشافعية فى صلاحية
الموضع للجمعة وصار الموضع بحكمه صالحا للجمعة اتفاقا يصح ادعاء الجمعة
فيه والله تعالى اعلم، صورت مستوله من اس موضع من جمعه درست، بلكه لازم ہے
قلت وقد تردد سيدى حكيم الامة فى بقاء مثل هذا الحكم بعد موت الحاكم
فليتأمل ولعل الله يحدث بعد ذلك أمراً، ظفر احمد عفاعنه ۲۳ ر ج ۵۵
نوٹ؛ پھر یہ فتویٰ تحقیق کے لئے مدرسہ مظاہر علوم بہار پور میں بھی بھیجا گیا تو
حسب ذیل جواب آیا اور وہی جواب صحیح ہے، میں اپنے پہلے قول سے رجوع کرتا ہوں، ظفر احمد
قال العلامة ابن عابدین على قول الدر المختار "اذن عام" اى لكل خطيب
ان يتنيب لكل شخص ان يخطب فى اى مسجد اراد (ح) اقول لكن لا يبقى
الى اليوم الاذن بعد موت السلطان الاذن بذلك الا اذا اذن به ايضا
سلطان زمان نصره الله تعالى كما بينته فى تنقيح العامدية وسند كره
فى باب العيدين عن شرح المنية ما يدل عليه ايضا فتنبه رد المحتار ۸۴
باب الجمعة وقال فى باب العيدين وما ذكرنا من عمل العامة بقول ابن عباس
لامر اولادهم من الخلفاء به كان فى زمنهم اما فى زماننا فقد زال فالعمل بما
هو المذهب عندنا كذا فى شرح المنية وذكر فى البحر ان الخلاف فى الاولوية
ونحوه فى الحلية،

عہ لم اجده فى المبسوط فى باب الجمعة وقال الطحاوى على هذا القول ما الذى فى القهستانی ابو القاسم ام فالظاهر
انه تصحيح من الكاتب ثم رأيت القهستانی ففیه فى آخر عبارة فتاوى الديار على ما قال السرخسى كما
نقله الشامى ۱۲ سعيده احمد غفر له

(تنبیہ) یؤخذ من قول شرح المنیة كان في زمنهم الخ ان امر الخليفة لا يبقى بعد موته او عزله كما صرح به في الفتاوى الخيرية وبني عليه انه لو نفى عن سماع الدعوى بعد خمس عشرة سنة لا يبقى فيه بعد موته، والله تعالى اعلم، ص ۸۷، ج ۱ فی تنقیح المعامد ص ۲۰۶ و ص ۱۰۷، ج ۱

ان عبارات اور جزئیات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایسے امور میں حکم حاکم کی موت کے بعد باقی نہیں رہتا، اور حضرت اقدس کی رائے کی تائید ظاہر ہوتی ہے، بقاء حکم کی کوئی صریح دلیل نہ اپنے لکھی اور نہ ہم کو ملی، اور آپ نے صرف اس سے استدلال کیا ہے، کہ حاکم جو حکم کرے اس کے نقص کا کسی کو حق نہیں، یہ نقص نہ کرنا اس کی زندگی میں تو مسلم ہے، اور ہر حکم جو قواعد شرعیہ کے مطابق ہو اس کا بھی یہی حکم ہے، بالخصوص مجتہدین میں، الثالثہ اذا قضی فی مجتہد فی مخالفت لمدہ یہ فہ نقضہ دون غیرہ اشباہ، ص ۳۲۱، لیکن جو احکام محض اطاعت خلیفہ کی وجہ سے قابل تسلیم ہوں، ان کا بقاء بعد الموت مسلم نہیں بلکہ حاکم جدید کو اس کے نقص کا حق ہے، جیسا کہ عبارت بالا سے ظاہر ہے، اور تنقیح حامد ص ۲۲ پر اس کی مفصل بحث موجود ہے، اور خصوصیت سے جمعہ کے متعلق بھی فقہاء تصریح کرتے ہیں الاما اذا منع اهل المصر ان يجمعوا لم يجمعوا كما ان له ان يصير موضعا فان له ان ينهاهم قال الفقيه ابو جعفر هذا اذا نهاهم مجتهد بسبب من الاسباب واراد ان يخرج ذلك المصر من ان يكون مصرا اما اذا نهاهم متعنتا او اضرا تا بهم فلم ان يجمعوا على رجل ان يصلي بهم الجمعة (بحر ملہ ص ۱۲۶)

یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ اس جگہ کے لئے جب حکم شاہی جمعہ کے لئے ہوا تھا تو کیا اس وقت بھی یہی حالت تھی، سوال میں اس کی تصریح نہیں، اگر یہی حالت تھی تب تو حکم شاہی سے استدلال بصورت بقاء حکم بعد الموت صحیح ہو سکتا ہے، اور اگر اُس وقت اُس میں مصریت کی شان تھی، اس کے بعد ویران ہو گیا، تو کیا پھر بھی حکم شاہی سے اس جگہ جواز جمعہ کا حکم دیا جائے گا؟ بظاہر فقہاء کے کلام سے اس کی تردید معلوم ہوتی ہے، ولوان اما مصر مصر اثم نفر الناس عنه بغوت اوعدا وما يشبه ذلك ثم عادوا اليه فانهم لا يعجبون الا باذن متانف من الامام، بحر ملہ ص ۱۲۶ عن الخلاصة ص ۲۰۶، والله اعلم

حررہ سعید احمد غفرلہ دارالافتاء مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور،

صبح، عبد اللطیف، ناظم مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، ۹ جمادی الثانی ۱۴۲۵ھ

نوٹ: پھر یہ سوال دوسری صورت سے آیا تو جواب دوسرا دیا گیا، جو آئندہ فتاویٰ رمضان ۱۴۲۵ھ میں نقل ہے، دونوں سوالوں میں یہ فرق ہے کہ پہلے میں آبادی کو دو ہزار اور بازار کو غیر متصل ظاہر کیا گیا، اور دوسرے سوال میں آبادی تین ہزار اور بازار کو متصل ظاہر کیا گیا، اور بازار میں ضروریات کے ملنے کی تصریح کی ہے، اور دونوں جوابوں میں یہ فرق ہے کہ پہلے جواب میں صرف اذنِ حاکم بینا، الجامع پر اس قریہ کو بحکم مصرمان کر جواز جمعہ کا فتویٰ دیا گیا تھا، مگر یہ بنا، صبح نہ تھی، اور دوسرے جواب میں قریہ کی حالت موجودہ کو قریہ کبیرہ میں داخل مان کر فتویٰ دیا گیا ہے، اور یہ بنا، صبح ہے، پس دونوں میں تعارض کا شبہ نہ کیا جاوے،

سوال (۶۰) میرے موضع چاتل کی مردم شماری ۲۶۹۷ ہے جس جگہ کی آبادی تین ہزار سے زائد ہو اور ضروریات زندگی اس میں دستیاب ہوں، اس میں جمعہ کا حکم، آدمیوں کی ہے، ہفتہ میں دو مرتبہ بازار لگتا ہے، پندرہ سولہ دوکانیں مستقل طور سے بازار میں روزمرہ رہتی ہیں، اور یہ

سب ایک ہی لائن میں ہیں، دس بارہ ایک طرف جو ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں، اور پانچ چھ دوسری طرف جو ایک دوسری سے ملی ہوئی ہیں، بیچ میں دس بارہ قدم کا فرق اس وجہ سے ہو گیا ہے کہ ایک مکان کا پچھواڑہ پڑتا ہے، اور آگے سڑک ہو ورنہ یہ سب مل جاتیں، یہ سب دوکانیں بازار کے نام سے موسوم ہیں، ضروریات کی ساری چیزیں مثل غلہ، کپڑا، جوتہ، لکڑی، تیل، تمباکو، چینی، گوشت وغیرہ بلا تکلف ملتی ہیں، حتیٰ کہ دوا وغیرہ بھی مل جاتی ہیں، دو طبیب مستقل طور سے گاؤں رہتے ہیں، ڈاک خانہ، سرکاری بڑا اسکول ہے، جس میں انگریزی وغیرہ بھی پڑھائی جاتی ہے، ہمیشہ سے جمعہ ہوتا چلا آیا ہے، شاہی زمانہ میں قلعہ بھی تھا، جس کے نشانات اب تک موجود ہیں، اور وہ زمین مع ایک تالاب کے شاہی نام سے مشہور ہے، جمعہ کے متعلق شاہی اسناد بھی ایک شخص کے پاس ہیں، انگریزوں کے شروع زمانہ میں تحصیل تھی، جب وہ الہ آباد چلی گئی، تو اسی عمارت میں تھانہ ہو گیا، بعد میں تھانہ اٹھ کر دوسری جگہ چلا گیا، تو اس میں اسکول ہو گیا، گاؤں کے اندر سات مسجدیں ایک دوسرے سے فاصلہ پر مختلف محلات میں واقع ہیں، اور سبہوں میں

نماز ہوتی ہے، گاہوں کے باہر بہت بڑی پختہ عید گاہ ہے، اس کے علاوہ چار پورہ جات جن کی تفصیل حسب ذیل ہے، اسی موضع کی زمین میں واقع ہیں، ان سب کا نقشہ خسره ایک ہی ہے، مجموعی مردم شماری موضع کی مع پورہ جات متعلقہ کے ۳۱۰۳ آدمیوں کی ہے، لہذا اس میں جمعہ جائز ہے یا نہیں؟

تفصیل پورہ جات

نام پورہ	مردم شماری	اصلی موضع سے ان کا فاصلہ	نوٹ
پورہ محمد نعیم	۲۱۹	تخمیناً ۳ فرلانگ	۸ فرلانگ کا ایک میل ہوتا ہے،
دریا پور	۳۳	تخمیناً ۳ فرلانگ	
ڈھپا	۸۲	۶ فرلانگ	
سرائے امام قلی	۷۱	۱ میل	

الجواب؛ صورت مسئلہ میں چائل و تریہ صغیرہ نہیں، بلکہ قریہ کبیرہ ہے جس میں جمعہ بالاتفاق جائز بلکہ واجب ہے، واللہ تعالیٰ اعلم، حرر الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۲۰ رمضان میری رائے میں بھی یہ موضع اقامت جمعہ کا محل ہے، اشرف علی، ۲۱ رمضان ۱۳۵۵ھ خطبہ جمعہ میں تطویل مکروہ ہے [سوال (۶۱)] بعض لوگ خطبہ کو نماز جمعہ سے طویل کرتے ہیں، اس کے متعلق شرعی حکم سے مطلع فرمایا جائے؟

الجواب؛ عن ابی وائل عن عمار قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان طول صلوة الرجل وقصر خطبته من ثلثة من فقهہ فاطیلوا الصلوة واقصر والخطبة الحدیث رواہ مسلم ص ۱۶۱، وفي الدرر لیس خطبتان خفیفتان وتکرر زیاد تمہا علی قدر سورۃ من طوال المفصل وعبارۃ الفہستانی و زیادۃ التطویل مکروہۃ (ص ۸۲۷ ج ۱) وفي مراقی الفلاح و لیس تخفیف الخطبتین قال ابن مسعود رضی اللہ عنہ طول الصلوة وقصر الخطبة من فقه الرجل قال المحقق فی الفتح من الفقه والسنة تقصیر الخطبة و تطویل الصلوة بقدر سورۃ من طوال المفصل و لکن یراعی الحال بما ہودون ذلك و یکرر التطویل من غیر قید بزمن ففی الشتاء

لقصر الزمان وفي الصيف للصبر والنجاح والحوار (ص ۲۹۹) احادیث نبویہ اور
تصریحات فقہاء اس پر متفق ہیں کہ خطبہ کو نماز سے طویل نہ کرنا چاہئے، اور یہ کہ خطبہ میں تطویل
مکروہ ہے، پس اگر گاہے ایسا ہو جائے تو مضائقہ نہیں، مگر اس کا عادی ہونا مکروہ ہے،
واللہ تعالیٰ اعلم، ظواہر ۲۳ رجب ۱۲۵۶ھ، نعم الجواب ہو عین الصواب، کتبہ اشرف علی، ۲۳ رجب ۱۲۵۶ھ
تحقیق کراہتہ الخطبۃ یوم الجمعۃ بغیر العربیۃ | (۶۲) ہر چند کہ خطبہ جمعہ میں مضامین تذکیر

کا ہونا متواتر ہے، جیسا حمد و تشہد و صلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم و ترضی عن الخلفاء
واہل البیت واستغفار للمؤمنین والمؤمنات کا اس میں ہونا متواتر ہے، مگر مقصود محض
تذکیر نہیں، بلکہ خطبہ جمعہ میں شانِ تعبد غالب ہے جس کی ایک دلیل حضرت عمر بن مسعود
رضی اللہ عنہما کا یہ ارشاد ہے، انما جعلت الخطبۃ موضع الركعتین من فاتتہ الخطبۃ صلی
اربعا (اعلاء السنن، ص ۳۷ ج ۸) و ذکر تہنک معنی فوت الخطبۃ فلیراجح

دوسری یہ کہ باتفاق علماء آیت اذ قرئی القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلمکم ترحمونہ کا
نزول ترک قرأت خلف الامام و انصات فی خطبۃ الجمعۃ کے متعلق ہوا ہے، جس سے خطبہ
جمعہ کا مثل صلوٰۃ ہونا ظاہر ہے،

اگر خطبہ جمعہ سے مقصود تذکیر محض ہوتی تو بحالت خطبہ کسی کو بات کرنے سے روکنا
اور "انصت" کہنا ممنوع نہ ہوتا، کیونکہ یہ بھی تذکیر ہی کی تکمیل تھی، مگر بخاری و مسلم وغیرہ
نے حدیث صحیح میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے، اذا قلت لصاحبک
یوم الجمعۃ انصت والامام یخطب فقد لغوت، امام طحاویؒ نے اس حدیث کو متواتر کہا ہے،
(اعلاء السنن، ص ۶۰ ج ۲)

اور نماز میں غیر عربی میں ذکر و دعا، مکروہ ہے ممنوع ہے، در مختار میں ہے و دعا بالغرہ
و حرم بغیرہ (نہر، ص ۵۴۳ ج ۱) یعنی درود و شریف کے بعد نماز میں جو دعا کی جائے، وہ
عربی میں کی جائے غیر عربی میں دعا (نماز کے اندر) حرام ہے، علامہ شامی نے لکھا ہے کہ
منقول مذہب میں کراہت ہے، پھر کراہت میں تفصیل کی ہے، مگر تحقیق یہ ہے کہ نماز کے
اندر تو غیر عربی میں دعا، مکروہ تحریمی ہے اور نماز کے علاوہ مکروہ تنزیہی معنی خلاف اولیٰ ہے،
اور جن لوگوں نے امام! الو حنیفہ رحمہ اللہ کے قول جواز قرأت بالفارسیہ سے جواز خطبہ بالجمعیۃ
پر استدلال کیا ہے، ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ امام صاحب اس قول سے رجوع فرما چکے ہیں

اور قول مرجوع عنہ حکم منسوخ ہوتا ہے، جس سے استدلال باطل ہے، ملاحظہ ہو شامی ص ۲۵۱
واعلام السنن، ص ۱۳۷ ج ۲

بہر حال خطبہ جمعہ عربی زبان میں ہونا چاہیے، مقامی زبان میں ہرگز نہ ہونا چاہیے، رہا
یہ کہ جب سامعین نہیں سمجھتے تو فائدہ کیا ہوا؟ اس کا جواب دینے کی ہم کو ضرورت نہیں
اگر سمجھنا ضروری ہے تو چاہیے کہ جب تک نماز کے اذکار و ادعیہ کا مطلب معلوم نہ ہو اس
وقت تک نماز بھی لغو ہو، کیونکہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ خطبہ جمعہ مثل نماز کے ہے، دوسرے
یہ سوال وہاں نہیں کیا جاتا، جب کوئی دوسرے انگریزی زبان میں شاہی پیغام سناتا ہو
اور سننے والوں میں ہزاروں اور لاکھوں آدمی انگریزی سے ناواقف ہوتے ہیں، مگر وہاں
اہل دنیا کی عقل خود جواب دے لیتی ہے کہ شاہی پیغام شاہی زبان میں ہی ہونا چاہیے،
رعایا کی زبان میں نہ ہونا چاہیے، یہی جواب یہاں کیوں نہیں دیا جاتا، شریعت مقرر نے
نماز اذان اور خطبہ جمعہ کو عربی میں اس واسطے رکھا ہے تاکہ مسلمانوں کو عربی زبان سیکھنے
کی طرف توجہ ہو جس کا سیکھنا فرض کفایہ ہے، اور تاکہ مسلمانوں کو قرآن کریم سے مناسبت
فی الجملہ حاصل رہے، اجنبیت محض نہ ہو جائے، اگر خدا نخواستہ یہ شعائر اسلام بھی مقامی
زبانوں میں ہونے لگے تو مسلمانوں کو قرآن و حدیث سے بہت بعد ہو جائے گا، جس کا دین
کے لئے خطرناک ہونا ظاہر ہے، پس اس رواج کو بند کرنا چاہیے، جو بعض شہروں میں ہونے
لگا ہے، کہ خطبہ جمعہ اردو میں دیا جاتا ہے، واللہ اعلم بالصواب، ۳ رمضان ۱۳۵۸ھ

فصل فی صلوٰۃ الکسوف والاستسقاء ومتعلقاتہما

کسوف اور خسوف کے وقت | سوال (۱) چاند گرہن یا سورج گرہن کے وقت کھانا کھانا
کھانے پینے کا حکم، یا کوئی اور کام سوائے نماز وغیرہ کے کرنا جائز ہے یا نہیں؟
اذا راٰ یم شینا من ہذہ الاہوال فافزعوا الی الصلوٰۃ میں امر وجوب کے لئے ہے یا
ندب کے واسطے؟ بینوا توحسروا؟ ۲۵ رجب ۱۲۲۸ھ

الجواب؛ فافزعوا الی الصلوٰۃ میں امر ندب کے لئے ہے، اکل و شرب بحالت
کسوف مباح ہے، البتہ بہت بھوکا نہ ہو تو ترک اکل اولیٰ ہے، لانہ ینافی الفزع
المندوب، واللہ اعلم فقط،

حکم استسقاء بحالت قلت مطر | سوال (۲) السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ، اس وقت عریضہ ہذا کے ارسال کا منشاء یہ ہے کہ عرصہ سے یہاں اور قرب وجوار میں امساکِ باراں ہے، اگرچہ خاص بہارِ نپور اور اس کے نواح میں اوائلِ موسم میں خاصی بارش ہو چکی تھی، مگر اب تقریباً تیس روز سے بارش نہیں ہوئی، علاوہ بہارِ نپور کے دیگر اضلاع کے قربِ جوار میں مظفر نگر، میرٹھ، دہلی، انبالہ میں یا بالکل بارش نہیں ہوئی یا بقدرِ ضرورت نہیں ہوئی، اس بناء پر دہلی میں ۲۷ ماہ رواں کو صلوٰۃ استسقاء پڑھی گئی ہے، اب آپ سے یہ استفسار ہے کہ بہارِ نپور اور تھانہ بھون کے حالات میں جزوی فرق ہے، حالاتِ موجودہ اور فقہاء کے اقوال پر نظر کرتے ہوئے یہ تحریر فرمائیں کہ بحالتِ موجودہ صلوٰۃ استسقاء کی ضرورت ہے یا نہیں، خطبوں کے اندر یہاں دعاء ہو چکی ہے اور ہوتی رہتی ہے، حضرت سلمہ کی رائے اور جواب جو کچھ عنایت ہو مفصل تحریر فرمائیں، اور فقہاء جو تین دن کے خرچ کو لکھتے ہیں آیا صلوٰۃ استسقاء تین دن تک کا کسی روایت سے ثبوت ہے؟ اگر کوئی تصریح

بل جاوے تو حوالہ تحریر فرمائیں، مولانا عبداللطیف صاحب، ناظم مدرسہ مظاہر علوم بہارِ نپور

الجواب؛ السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ ومغفرۃ۔ قال العافظ فی التلخیص الجیری فی قول الرافی ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یصل صلوٰۃ الاستسقاء الا عند الحاجة ما نصہ لما جدہ صریحا لکن بالاستسقاء یتبین صحۃ ذلك امام (ص ۱۲۹ ج ۱) نعم قد ثبت انه صلی اللہ علیہ وسلم استسقی من غیر صلوٰۃ لقحوظ المطر عن البلاد البعیدۃ ایضا کما فی حدیث ابن عباس عند ابن ماجہ، قال جاء اعرابی الى النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ لقد جئتک من عند قوم ما یتزود لهم راع ولا یحطرون لهم فحل فصعد المنبر فحمد المنبر ثم قال اللهم اسقنا غيثا مغيثا من وسندہ صحیح ومن ہنا واللہ تعالیٰ اعلم قال فقہاءنا ان صلوٰۃ الاستسقاء مسنونة عند الحاجة الیہ فی موضع لا یكون لاهلہ اودیۃ وانہا راع وبارش یون منها ویسقون مواشیہم وذرعیہم او کان ذلك لکن لا یکفیہم فان کان کافیا لا یسقون کذا فی حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح (ص ۳۱۸) وامادعاء اهل الخصب لاهل الجن فیستحب مطلقا کما فی الشامی (ص ۸۸۵) لحدیث خیر الدعاء ان تدعو لاختیک

یظهر الغیب استحب الشافعی ان یتسقی امام الناحیة المنخبة لاهل الناحیة المجتبیة
ولجماعة المسلمين ویسأل الله الزیادة لمن انصب مع استسقاء من احب كما فی الام
(ص ۱۳۰۸) وعزاه الشرح فی کشف الغتہ الی الصحابة انهم كانوا یتسقون
لنواحي الاراضی والطرقات المداشر اذا بلغهم قحط بلادهم (ص ۱۳۸ ج ۱)
ولعل ذلك محمول عند علمائنا علی الاستسقاء بالدعاء فقط بدون الصلوة،
وتفسیر الحاجة عندی ان یخاف من قلة المطر غلاء السعیر بحيث یضطرب
به فقراء الناس وعامتهم ولا عبرة بامر انهم وظنی ان مثل تلك الحاجة
قد تحققت فی بلادنا هذه فقد تشوشت العباد واضطربت الزراع وبلغت
قلوب الفقراء الحناجر من مخافة الغلاء الشدید ان لم یطروا فی المدة
القریبة والله المستعان فقد هلكت الزروع او کادت تمهلك لقلة المطر و
هبوب الصبا فیتحب لائمة البلاد ان یتسقوا ولا مشک فی الجواز والله تعالی اعلم
(تیمم) واما انهم یخرجون ثلاثا متتابعات فقد صرح الشافعی باستحبها
فی الام وقال الشربینالی فی نور الايضاح وشرحه ان اکثر من ذلك لم یقل
ولم یرد ذلك فی الحدیث لانه صلی الله علیه وسلم اذا استسقی سقی او لا
وكذا القیامة ایضا والله اعلم حرره ظفر احمد عفی عنه ۲۹ صفر ۱۴۲۵
الجواب صحیح ، اشرف علی ۲۹ صفر ۱۴۲۵

مسائل متفرقة کتاب الصلوة

نمازی کے آگے سے گزرنا سوال (۱) زید کو یہ معلوم نہیں کہ نماز پڑھنے والے کے سامنے سے
گزرنے والے کو عذاب ہوگا اور آگے زید گزر گیا تو زید کو عذاب ہوگا یا نہیں ہوگا؟

عہ ای عن السلف ولعل وجه ذلك ان الدعاء یتحب فیہ التکریر وقله التثلیث كما
فی الحصن الحصین وعزاه الی ابی داؤد فلم یتجاوزوا فی الاستسقاء اقل عدد التکریر لکونه
دعاء مخصوصا علی هیئة خاصة خلاف القیاس فلا یکرر الا بدلیل وقد ثبت عنده صلی
الله علیه وسلم تثلیث الدعاء صلحة فی غیر الاستسقاء فلا یزاد علیه ۱۲ منہ

الجواب؛ مسئلہ کے نہ جاننے کا زید کو گناہ ہوگا، شعبان ۱۴۲۵ھ

حالت رکوع میں الصاق کعب کی تحقیق | سوال (۲) الصاق کعب بالکعب فی الصلوٰۃ عند الركوع والسجود للرجل ثمانیۃ لکھتے ہیں، حاشیہ طحاوی (ص ۳۱۳ ج ۱) شامی (ص ۳۳۲ ج ۱) مبسوط (ص ۹، ج ۱) بحر الرائق (ص ۳۱۵ ج ۱) ملتقى الابحر مع مجمع الاکف (ص ۹۶ ج ۱) کبیری (ص ۳۰۷) در مختار (ص ۳۰۷) حاشیہ مالکین اور جناب نے بہشتی زیور میں الصاق کو عورتوں کے لئے تحریر فرمایا ہے، اور ہمارے بزرگوں کا عمل در اند بھی اسی پر ہے، مگر کتب مذکورہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جناب کی تحقیق کے خلاف ہے، اس کی حقیقت کیا ہے اور صحیح کیا ہے؟

الجواب؛ الصاق الکعب بالکعب فی الركوع کا رجال کے لئے مسنون ہونا تو محل کلام ہے، یہ صرف زاہدی کی روایت ہے، اور وہ نقل میں ضعیف ہے، بحالت تفرد اس کی روایت معتبر نہیں اور سب متون و مشروح میں زاہدی ہی کی اتباع سے اس الصاق کو مسنون کہا گیا ہے، صرح بہ شیخ مظہ فی ترجیح الرائج المطبوعہ مسلسلانی رستہ النور، ص ۱۶ شعبان ۱۴۲۵ھ، بلکہ طحاوی کی معانی الآثار، ص ۱۳۲ سے رکوع و سجود میں تجانی کا مسنون ہونا اور الصاق کا مسنون نہ ہونا مصرح ہے، باقی عورتوں کے لئے بلحاظ ستر بہشتی زیور میں اس الصاق کو باقی رکھا گیا، ودلیلہ ما فی الاشباہ من احکام الانثی و تضم فی رکوعها و سجودها ولا تفرج اصابعها فی الركوع ام (ص ۳۲۶) اس میں تضم رکوعها و سجودها، مطلق ضم کی مطلوبیت پر دل ہے، جس میں الصاق الکعب بالکعب بھی داخل ہے، واللہ اعلم، ۵ ربیع الاول ۱۴۲۵ھ

اندھیرے میں تہجد پڑھنے کا حکم | سوال (۳) نماز تہجد روشنی میں پڑھنا اولیٰ ہے، یا اندھیرے میں، دونوں میں کونسی صورت بہتر ہے؟

الجواب؛ جہاں قبلہ مشتبہ ہونے کا اندیشہ ہو وہاں رات کی نماز اندھیرے میں مکروہ ہے، اور جہاں یہ اندیشہ نہ ہو وہاں بلا کراہت جائز ہے، البتہ عدم اشتباہ کی صورت میں بھی اگر اندھیرے سے قلب کو تشویش ہوتی ہو تو روشنی میں نماز پڑھنا اولیٰ ہے، ۲۳ جمادی الثانی ۱۴۲۵ھ

سوال (۴) احقر نے غایۃ الاوطار میں دیکھا ہے کہ کسی کے پیچھے اگر کوئی نماز پڑھ رہا ہو تو اس کو داہنی یا بائیں طرف سرک جانا جائز ہے، کیونکہ وعید جو آتی ہے تو ایک طرف سے دوسری طرف گزرنے پر آتی ہے، اور اس میں وہ ہوتا نہیں، یہ مسئلہ ٹھیک ہے یا نہیں؟ اور نمازی کے آگے سے داہنی طرف سے یا بائیں طرف سے ہاتھ بڑھا کر کوئی چیز اٹھا سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب؛ فی الشامی (ص ۶۶۵ ج ۱) اراد المرور بین یدی المصلی فان كان معه شیء یضعه بین یدیہ ثم یمر ویأخذہ ولو مر اثنان یقوم احدهما امامه ویمر الآخر ویفعل الآخر هکذا ویمران وان معه دابة فمر راکباً اثم وان نزل وتستر بالدابة ومر لم یأثم ولو مر رجلان متعاضدين فالذی یلی المصلی هو الاثم قنیه وایضاً فی العالمگیریہ ولو مر اثنان یقوم احدهما امامه ویمر الآخر ویفعل الآخر هکذا ویمران کذا فی القنیۃ (ص ۶۶۱ ج ۱)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ غایۃ الاوطار کا مسئلہ صحیح ہے، اور نمازی کے سامنے سے چیز اٹھانا جائز ہے، رکما علم من قول الشامی ویأخذہ) احقر عبد الکریم عفی عنہ
الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ ۵/ رذی الحجۃ ۱۳۳۴ھ

سوال (۵) اگر کوئی شخص پیچھے بالکل محاذات میں نماز پڑھ رہا ہو تو اس صورت میں وہاں سے الگ ہو جانا مرد بین المصلی میں داخل ہے یا نہیں، ہر دو صورتوں کا مع الدلیل جواب تحریر کیا جائے؟ ممتاز احمد گیلانی مقیم خانقاہ

الجواب؛ فی العالمگیریہ (ص ۶۶۱ ج ۱) ولو مر اثنان یقوم احدهما امامه ویمر الآخر ویفعل الآخر هکذا ویمران کذا فی القنیۃ، اس روایت فقہیہ سے معلوم ہوا کہ محاذۃ مصلی سے ہٹ جانا مرد نہیں، لیکن ایسے فعل سے عوام کو مرد کی جرات ہو جاتی ہے، اس لئے بہتر ہے کہ آگے سے نہ ہٹے بالخصوص جبکہ کوئی ضرورت ہٹنے کی نہ ہو، واللہ اعلم، احقر عبد الکریم عفی عنہ ۶/ راج ۱۳۳۴ھ الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ ۶/ راج ۱۳۳۴ھ

سوال (۶) قادیانی کہتے ہیں کہ کما صلیت علی ابراہیم درود ابراہیمی میں کما صلیت علی ابراہیم میں تشبیہ کی تحقیق میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح حضرت ابراہیم

علیہ وعلی نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذریت میں نبوت دی گئی، اسی طرح ہمارے حضرت کی اُمت میں بھی دی جائے، اس تشبیہ کے متعلق کیا منقول و معقول ہے؟

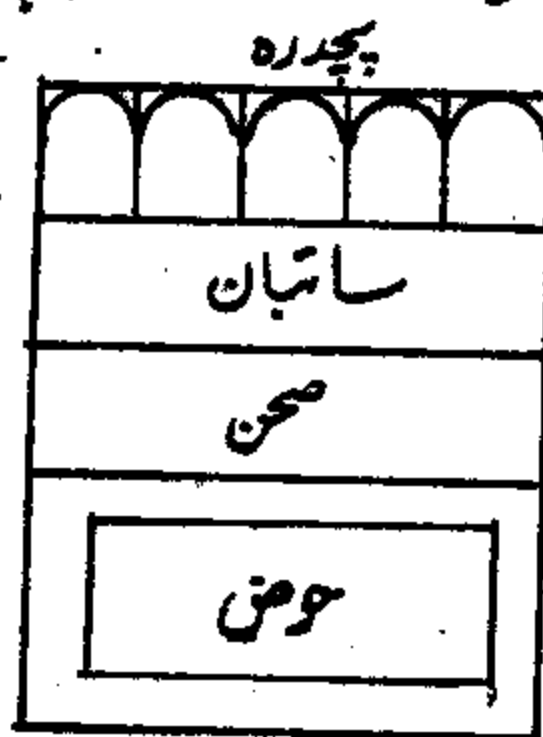
الجواب؛ قال فی الدرر وخص ابراہیم راى التشبيه بابراهيم دون غيره من الرسل الكرام عليهم السلام (۱۲) سلامہ علینا راى لانه مسلم علينا ليلة المعراج حيث قال ابلغ امتك السلام منى (۱۲) شامی) اولانه سمانا المسلمين كما اخبر عنه تعالى بقوله هو سماءكم المسلمين من قبل (۱۲) شامی) اولان المطلوب صلوٰۃ يتخذها بها خليلاً وعلى الاخير فالتشبيه ظاهراً قال الشامی واجب راى عن التشبيه) باجوبة اخر من احسنها ان التشبيه فى اصل الصلوٰۃ لا فى القدركما فى قوله تعالى انا اوحينا اليك كما اوحينا الى نوح وكتب عليكم الصيام كما فى كتب على الذين من قبلكم و احسن كما احسن الله اليك وفائدة التشبيه تأكيد الطلب اى كما صليت على ابراهيم فصل على محمد الذى هو افضل منه ام (ص ۵۳ ج ۳)

اور قادیانیوں نے جو وجہ بیان کی ہے وہ صحیح نہیں، کیونکہ ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں نبوت دی گئی تھی، نہ کہ امت میں، اگر اس سے بقاء امت کی طرف اشارہ ہوگا تو بہت سے بہت مثل ابراہیم علیہ السلام کے حضور کی ذریت میں اس کے بقاء کی طرف اشارہ ہوگا، امت میں نبوت باقی رہنے کی طرف اشارہ کی کیا دلیل ہے؟
دوسرے اگر ابراہیم علیہ السلام کی تخصیص اس اشارہ کی وجہ سے کی گئی ہے تو نوح علیہ السلام کا نام بھی درود میں ہونا چاہئے تھا، کیونکہ بقاء نبوت فی الذریت کا شرف ان کو بھی حاصل ہے، بلکہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے اُن کو یہ شرف حاصل ہوا، قال تعالى وان من شيعته (اى نوح ۱۲) لابراهيم (سورة الصفات) وقال تعالى ولقد ارسلنا نوحاً وابراهيم وجعلنا فى ذريتهما النبوة والكتب (سورة الحديد) پس یہ وجہ غلط ہے، اور كما صليت على ابراهيم میں بقاء نبوت کی طرف اشارہ نہیں، بلکہ اشارہ خلت کی طرف ہے، وقد استجاب الله دعاء عباده فاتخذ الله خليلاً اي وخلصه بيننا اكل وافضل كما دلت عليه الآيات والآثار والله اعلم، ۱۳ شوال ۱۴۲۶ھ

سوال (۷) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک نماز باجماعت کے لئے لوگوں کی حاضری لینے کا حکم، موضع کے محل لوگوں کا نام رجسٹر میں درج ہے، اور نماز کے وقت مسجد کے اندر ہر شخص کا نام بنام پکار کر حاضری لی جاتی ہے، تاکہ لوگ جماعت سے نماز پڑھیں اور سستی نہ کریں، لہذا از روئے شرع کے اس قسم کی حاضری مسجد کے اندر لی جاتی ہے یا نہیں، بحوالہ کتب مع عبارت کے ارقام فرمادیں، بینوا بالکتاب توجروا بالافواء الجواب؛ اس قسم کی حاضری لینا جائز نہیں، کیونکہ جماعت کا وجوب بعض اعذار شرعیہ سے ساقط ہو جاتا ہے، اور بعض اعذار مخفی ہوتے ہیں جن کا علم بجز مبتلی بہ کے کسی کو نہیں ہو سکتا، اور نام بنام حاضری لینے میں مختلف عن الجماعة کی بابت لوگوں کو ناحق بدگمانی پیدا ہوگی وقد قال تعالیٰ یا ایہا الذین امنوا اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم ولا تجسسوا الا یہ و هذا داخل فی التجسس المنہی عنہ وانما جاز مثل ذلك للترکی لمصلحة شرعیة وہی تعدیل الشہود وجہم ولا مصلحة فی ذلك الان لعدم وجود الام والفتنة، نیز یہ طریقہ سلف صالح ثابت نہیں، وکاتوا سابقین الی الخیرات، واللہ تعالیٰ اعلم، ۲۰ شعبان ۱۳۸۵ھ

سوال (۸) خانقاہ امدادیہ کے حوض پر بلاسترہ نماز پڑھنے والوں کے آگے سے گزرنے کے متعلق حکم، میں بعض لوگ حوض کے اوپر نفلیں پڑھتے ہیں، اور سترہ سامنے نہیں ہوتا، ان نمازیوں کے سامنے سے پچرہ میں چلنا اور گزرنا جائز ہے یا نہیں؟ صورت یہ ہے:-

حوض پٹا ہوا ہو، ایک جانب منو کیلئے کھلی ہو، لوگ حوض کے اوپر بلاسترہ نماز پڑھتے ہیں،



الجواب؛ قال فی الفنیۃ شرح المنیۃ ثم انکر یکۃ المرور بین ید یہ عند عدم الحائل اذا کان فی موضع سجودہ فی الاصح قال فی الکافی، فی النہایۃ الام

ان کان بحال لوصلی صلوة الخاشعین بان یکون بصرہ حال قیامہ الی موضع سجودہ لا یقع بصرہ علی الماء لا یکرمہ ہذا اذا کان یصلی فی الصحراء اما ان یصلی فی المسجد ولم یکن حائل فان کان المسجد صغیرا کرم المرور مطلقاً

وان كان كبيراً فقل كالصغير لا يتر بينه وبين حائط القبلة وقيل كالصغير وير
 فيساوياً موضع السجود وقيل يسرفيماً وراء خمسين ذراعاً وقيل قد رما بين الصف
 الاول وحائط القبلة قال الشيخ ابن الهمام ومنشاء هذه الاختلاف ما يفهم من لفظ
 بين يدي مصلّي (الوارد في الحديث) فمن فهم ان ما بين يديه يخص ما بينه وبين
 محل سجوده قال به ومن فهم انه يصدق مع اكثر من ذلك نفاه وعين ما وقع عنده
 والذي يظهر ترجيح ما اختاره في النهاية من مختار فخر الاسلام وكونه من غير
 تفصيل بين المسجد وغيره فان المؤتمل للمرورين يديه، وكون ذلك البيت بمرته
 اعتبار بقعة واحدة في حق بعض الاحكام ركضة الاقتداء ونحوها لا يستلزم تغيير
 الاموال من المورور من بعيد فيجعل البعيد قريباً انتهى ملخصاً ص ۳۵۲

قلت فما ظنك بدار لم تعتبر بقعة واحدة في حق صحة الاقتداء من
 غير اتصال الصفوف فيها، صورت مسئلة من پچدره کے اندر سے یا مسجد کے اندر سے ہو کر ان
 نمازیوں کے سامنے سے گزرنا جو حوض پر یا حوض کے متصل نماز پڑھ رہے ہیں جائز ہے، کیونکہ
 پچدرہ اور حوض مکان واحد نہیں اور فصل بھی زیادہ ہے، کہ نمازی کی نظر گزرنے والے پر نہیں
 پڑ سکتی، پس وہاں سے گزرنے والے کو ان نمازیوں کے سامنے سے گزرنے والا نہ کہا جاتے گا،
 واللہ تعالیٰ اعلم، ظفر احمد عفا عنہ ۲۳ رجب ۱۴۲۵ھ، محب النور اشرف علی ۲۲ رجب ۱۴۲۵ھ

کتاب الجنائز

فصل فی احوال موتی والقبور

عورتوں کے لئے زیارت قبور کا حکم | سوال (۱) اگر عورت ضعیفہ یا جوان پردہ کے ساتھ قبرستان
 جاوے اور اس جگہ کوئی خلاف شرع کوئی کام نہ کرے تو اس کا جانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب؛ قال فی الطحطاوی حاشیة مراقی الفلاح ص ۳۶۲ وان كان
 للاعتبار والتوحم والتبرک بزيارة قبور الصالحين من غير ما يخالف الشرع فلا بأس
 به اذا كن عجائز وكره ذلك للمشابات كحضورهن في المساجد للجماعات ام
 اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی کام خلاف شرع نہ کیا جاوے تو بوطرحی عورتوں کو زیارت قبور

جائز ہے، جو ان کو نہ چاہتے کہ اس میں فتنہ ہے،

قبر پر کتبہ لگانا مکروہ ہے | سوال (۲) کیا قبر کا گردا پتھر یا اینٹ سے ایک بالشت تک اونچا

اس غرض سے بنانا کہ نشان قائم رہے اور اوپر سے کھلی رہے جائز ہے یا نہ، اور کتبہ کندہ شدہ

نام متوفی بمعہ تاریخ وغیرہ لگانا جائز یا نہ؟

الجواب: علامت باقی رکھنے کے لئے گردا بنانا یا کتبہ لگانا قبر پر مکروہ ہے قال

فی العالمگیریۃ ویکس: ان یبقی علی القبر ویعلم بعلامۃ من کتابۃ ونحوہ کذا

فی التبیین ۱۵ ملخصاً ص ۱۰۰ ج ۱ ۱) ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۸۸ھ

میت کی بعض رسومات حکم اور غسل | سوال (۳) یہاں

اور کفن دفن کا طریقہ، کی قدیمی رسم در و راج یہ ہے کہ جب کوئی مر جاتا ہے

بغیر دم نکل جانے کے لاش کو اتر سرہانے قبلہ رخ غسل دینے تک جیسے قبر میں رکھتے ہیں

ویسے ہی رکھتے ہیں، اور چلیا قوم جو کہ اکثر شافعی مذہب والے اور نیشاپوری لوگ جو کہ اکثر

حنفی مذہب والے ہیں، یہ لوگ دم نکلتے ہی قصداً مردے کو پورب سرہانا اور قبلہ رخ

پاؤں لاش اٹھنے تک رکھتے ہیں، اور دم نکلتے ہی پچبار غسل اور کفنانے کے وقت تک

غسل دلاتے ہیں اور لاش کو اونچے پلنگ یا تخت پر رکھتے ہیں، حالانکہ رنگوں میں سب

پہی عمارت یا تختے کے گھر ہیں، کہیں مٹی کے مکان نہیں ہیں، فی الحال آج جو تھا دن ہے،

کہ ایک شخص ہمارے محلہ میں فوت ہوا، تو فرقہ اول یعنی محلہ والوں نے جن میں دو پیش امام

مسجد کے اور تین مولوی بھی ہیں اپنے قدیمی رواج کے مطابق مردے کو اتر سرہانے قبلہ رخ

لٹائے رکھا تھا، اتنے میں فرقہ ثانی کے لوگ نے آکر جبراً میت کو غسل دلایا پھر پلنگ یا تختے

منگاکر اونچے پر قبلہ رخ پاؤں اور پورب کی طرف سرہانا کر کے رات بھر لاش صبح اٹھنے

تک رکھا، اور بہت کچھ گفت و شنید ہوئی، اور کہتے ہیں صبح و صبح طریق یہ ہے،

ہزاروں دلیلیں ہم نے بتائی اور ثبوت دیا کہ میت کو اس رسم سے اٹھنے تک رکھنا ام

اب پیش امام و مولوی لوگ فرقہ ثانی سے عاجز ہیں کہ فضول بحث چہ کار آید، اب محلہ والے

حضور سے دست بستہ خدمت عالی میں عرض کرتے ہیں کہ فرقہ ثانی کی کارروائی سے فساد

ہونے کا اندیشہ ہی، آپ برائے خدا ان شقوں سے نجات دلاتے :-

اول یہ کہ بلا ضرورت میت کو پورب سرہانے لاش اٹھنے تک لٹائے رکھنا،

دوسرے بلا ضرورت دم توڑتے ہی غسل دینا پھر کھٹانے کے وقت بلا ضرورت غسل دینا
سوم بلا عذر میت کو اونچے تخت پر رکھنا،

چہارم، جنازہ پر لے جلتے وقت مرد میت پر پھول کا ہار چڑھاتے ہیں، میت پر نہیں
جنازہ پر لیجاتے ہیں، یہ سب رسم درست ہیں یا نہیں، برائے خدا و برائے کرم نوازی غریب
مسلمانوں پر نظر شفقت ڈال کر آنجناب ہر ثبوت کے ساتھ مدلل جواب ارسال فرما کر سب
مسلمانوں کو مشکور و ممنون فرمائیے، یہی یہاں کے مسلمانوں کی دست بستہ عرض ہے،

پنجم، جب میت کو جنازہ پر رکھتے ہیں ایک مرتبہ فاتحہ پڑھتے ہیں پھر قبرستان پہنچ کر نماز پڑھنے کے بعد ایک بار فاتحہ پڑھتے ہیں
پھر دفن کے بعد لڑنے وقت دروازہ قبرستان پر کھڑی ہو کر ایک بار فاتحہ پڑھتے ہیں اب ضریح کو کیا اتنی مرتبہ فاتحہ دینا درست ہے یا نہیں؟

الاجوبۃ، قال فی الدرر یوجہ المحتضر لقبلۃ علی یمینہ ہوا السنۃ وجا
الاستلقاء علی ظہرہ وقد ماہ الیہا و ہوا المعتاد فی زماننا ہ قال الشامی ناقلا
عن البحر اختارہ مشائخنا ہما وراء النہر لانہ الیسر لخروج الروح و یلقیہ
فی الفتح وغیرہ بانہ لا یعرف الانقلا واللہ اعلم بالالیس منہما ولکنہ
الیسر لتغیضتہ وشد لعیبہ ومن امنع من تقوس اعضائہ ام رضحہ
وفی حاشیۃ الطحاوی علی المراقی الفلاح قولہ و جاز الاستلقاء ویوضع ہکذا
فی الغسل والصلوۃ قال فی شرح الطحاوی و ہوا العرف بین الناس قال فی الزاد
والاول افضل لانہ السنۃ کذا فی المفضلات ام (ص ۳۲۵)

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ قبلہ کی طرف پیر کر کے میت کو لٹا کر خروج روح سے پہلے
بعض مشائخ نے مستحسن سمجھا ہے، کیونکہ اس میں ان کے نزدیک خروج روح میں سہولت ہے،
مگر زاد فیر اور مضمرات میں تصریح ہے کہ افضل طریقہ موافق سنت ہے کہ میت کو دائیں کروٹ
پر قبلہ رخ کیا جائے، اس کی یہی صورت ہے کہ سر جانب شمال ہو اور پیر سمت جنوب، اور آہنی
کروٹ دے کر قبلہ رخ کر دیا جائے، پھر یہ اختلاف تو خروج روح کے وقت ہے، اور
خروج روح کے بعد قبلہ رخ پیر کر کے لٹانا یہ تو محض لغو حرکت ہے، کیونکہ اب اس میں کوئی
بھی فائدہ نہیں اور جب وقت فائدہ کے بھی یہ صورت خلاف سنت اور غیر افضل تھی، تو
اب بدرجہ اولیٰ خلاف سنت وغیر افضل ہوگی، فافہم،

(۲) قال فی مراقی الفلاح واذا تیقن بموتہ یجعی بتجهیزہ اگر مالہ لما فی

الحديث وعجلوا به لانه لا ينبغي لجيفة مسلم ان تعبس بين ظهراني اهلها
والصارف عن الوجوب الاحتياط قال بعض الاطباء ان كثيرين ممن يموت
باسكتة ظاهرة ايد فنون احياء لانه يعسر ادراك الموت الحقيقي بها الا على
افضل الاطباء فيتعين التأخير فيها الى ظهور اليقين بنحو من التغير وقد مات
النبي صلى الله عليه وسلم يوم الاثنين منحة ودفن في جوف الليل من ليلة
الاربعاء اه قال الطحاوي وظاهر كلامهم ان التأخير مطلوب مطلقا لما
رواه من الحديث راى مارواه من التأخير في دفنه عليه افضل الصلوة
والسلام والمراد التأخير الى تيقن الموت فانه ربما عرض عليه هذه الداء
اه (ص ۳۲۹) ان عبارات سے معلوم ہوا کہ مردہ کے غسل وغیرہ میں دم توڑتے ہی جلدی
نہ کی جائے بلکہ کسی قدر تاخیر اتنی دیر تک کی جائے کہ موت کا یقین پختہ ہو جائے، اور سکتہ
وغیرہ کا وہم نہ رہے، اور یقین موت کے بعد پھر دیر نہ کی جائے، پس دم ٹوٹتے ہی فوراً میت
کو غسل دینا اور کفن کے وقت دوبارہ غسل دینا لغو حرکت ہے، بلکہ محض کفنانے کے
وقت غسل دینا چاہئے، اور بعض متون میں جو یہ الفاظ ہیں فیوضع کلمات علی سریر محر
الح جس سے متبادریہ ہوتا ہے کہ پس مرتے ہی فوراً تختے پر رکھ دیا جائے، اس کا مطلب
یہ نہیں بلکہ مطلب وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ تيقن موت کے بعد جب غسل وکفن کا
ارادہ کریں تب تختہ پر رکھیں، صرح فی مرقی الفلاح وحاشیۃ للطحاوی (ص ۳۳۰)
وفیه لا باس بالتأخیر لحارص کما فی ابن امیر حاج،

(۳) قال الطحاوی فی حاشیۃ علی مرقی الفلاح روی انه صلى الله عليه
عليه وسلم لما غسل وکفن ووضع علی السریر دخل ابو بکر وعمر و وهما
فی الصف حیال رسول الله صلى الله عليه وسلم اه (ص ۳۳۰) اس سے معلوم
ہوا کہ میت کو غسل وکفن کے بعد تخت یا پلنگ پر رکھنا سنت ہے، حضرات صحابہ نے
حضرت علی رضی اللہ عنہ وسلم کو غسل وکفن کے بعد تخت پر رکھا تھا، اور بظاہر اس میں اگر
میت بھی ہے اس فعل میں کوئی حرج نہیں، البتہ یہ ضرور نہیں کہ پلنگ اور تخت
معمول معیار سے اونچا ہو، تھوڑی سی بلندی سطح ارض سے کافی ہے، واللہ اعلم
قال فی الہندیۃ اذا حملوا علی سریر اخذوا بقوائمہ الاربع بہ ورفق

السنة (ص ۱۰۳ ج ۱)

(۴) جنازہ پر پھول چڑھا مکروہ ہے قال فی الہندیہ ویکوہ عند القبر ما لم یعہد من السنہ ۱۰۷۰ ج ۱) قلت والکفن والدفن کذلک فیکوہ فیہما ما لم یعہد من السنہ ووضیع الوباحین علی الکفن لم یعہد منها، علاوہ ازیں یہ ہندوؤ کا طریقہ ہے، اس لئے تشبہ میں داخل ہے،

(۵) یہ تین بار میت پر فاتحہ پڑھنا خلاف سنت ہے، سنت یہ ہے کہ وقت نزع روح کے سورۃ یس پڑھیں، اور بعد موت کے اس کے پاس قرآن پڑھنا بعض علماء کے نزدیک مستحب ہے، اور بعض نے غسل سے پہلے منع کیا ہے، بعد غسل کے ہر شخص آہستہ آہستہ جو توفیق ہو قرآن پڑھ کر میت کو بخش دے، اور بعد دفن کے تھوڑی دیر قبر پر ٹھہر کر کچھ قرآن پڑھ کر بخش دیں اور میت کے لئے دعا کریں، باقی جس صورت سے بمبئی وغیرہ میں فاتحہ دیجاتی ہے یہ صورت بدعت ہے، ۹ جمادی الاخریٰ ۱۲۲۲ھ

سوال (۴) هل یحل للزوج ان یقبل امرأته التي ماتت وكفنت بلا واسطة الثوب وغیره وهولیس ہاتھ لگانا جائز نہیں،

من قرابتہا ایضاً؟

الجواب؛ لا یجوز لہ مسہا بغیر حائل ولو کان من قرابتہا لعدم المعرۃ وبطلان النکاح بالموت قال فی الدرر یمنع زوجها من غسلها ومسہا لا من النظر الیہا علی الاصح قال الشامی عن الخانیۃ اذا کان للمرأة محرم یسہا بیدہ واما الاجنبی فیحرقہ علی یدہ ویغض بصرہ عن ذراعہا وکذا الرجل فی امرأته الا فی غص البصر ام قال ولعل وجهہ ان النظر اخف من المس فجاز یشبہتہ الخلاف ام (ص ۸۹ ج ۱) قلت وجواز یمسہ ایاہا بخرقۃ یدل علی جواز مسہ ایاہا بحائل ولكنه مقید ایضاً بالضرۃ فلا ینبغی المس بدونہا ولو بحائل ہذا والله تعالیٰ اعلم، ۲۷ صفر ۱۲۵۴ھ

سوال (۵) یہاں ہمارے علاقہ میں اکثر لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ارواح جمعرات یا جمعہ کو مکانات میں آتی ہیں، اور شب برأت میں تمام مردوں کی روہیں ضرور اپنے قرابت داروں کے یہاں

آیا کرتی ہیں، چونکہ چھوٹی چھوٹی کتابوں میں لکھا ہوا ہے، اس لئے ان کا عقیدہ راسخ ہے، مگر آپ نے بہشتی زیور و نیر و سر رسالوں میں لکھا ہے کہ روحیں مقید ہیں گھروں میں نہیں آتیں، اس لئے گزارش ہے کہ برائے ہر بانی مطلع کریں، کہ آیا ارواح گھروں میں آتی ہیں یا نہیں، اور ایسا عقیدہ رکھنا از روئے شرع شریف کیسا ہے؟ برائے ہر بانی کتابوں کا حوالہ بھی دیں،

الجواب: مقرر ارواح کے متعلق علماء میں بہت اختلاف ہے، انبیاء اور شہداء کے متعلق تو اتفاق ہے کہ وہ بعد وفات کے جنت میں رہتے ہیں، اور جسد عنصری سے بھی اُن کو تعلق قوی رہتا ہے، اور غیر شہداء یعنی عامہ مؤمنین کے متعلق اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں وہ بھی جنت میں رہتے ہیں، بعض کہتے ہیں جنت سے باہر رہتے ہیں، بعض کا قول ہے کہ قبر کے پاس رہتی ہیں اور جہاں چاہیں چلتی پھرتی ہیں، اور بعض کا قول ہے کہ ارواح مؤمنین برزخ مزمل یا جابہ میں رہتی ہیں (جو شام کا ایک شہر ہے) اور ارواح کفار حضرموت میں ایک کنواں برہوت ہے ان میں رہتی ہیں، اور بعض کا قول ہے کہ ارواح مؤمنین علیین میں رہتی ہیں اور ارواح کفار سجین میں رہتی ہیں، اور قبر جسد عنصری سے بھی ان کو تعلق رہتا ہے، اور ممکن ہے کہ جابہ و زمزم سے بھی کچھ تعلق ارواح مؤمنین کو اور برزخ برہوت سے ارواح کفار کو بعد فوت کا ہوتا ہو، ذکر کل ذلك السيوطي في شرح الصدور في احوال الموتي والقبور (ص ۹۱ تا ص ۱۰۳) وفيه ايضا قال العافظ ابن حجر في فتاوه ارواح المؤمنین فی علیین و ارواح الکفار فی سجین و لكل روح بجسدھا اتصال معنوی لا یشبه الاتصال فی الحیوة الدنیا بل یشبه شیء به حال النائم اتصالا قال ولہذا یجمع بین ما ورد ان مقرھا فی علیین و سجین و بین ما نقلہ ابن عبد البر عن الجدهو ایضا انھا عند افنیۃ القبور قال ومع ذلك فہی مادون لہا فی التصرف و تاوی الی محلہا من علیین او سجین ام ثم ایدہ السيوطی بما اخرجہ الحاکم عن ابن عباس قال بیئنا النبی صلی اللہ علیہ وسلم جالسا و اسماء بنت عمیس قریبا منه اذ رد السلام وقال یا اسماء ہذا جعفر بن ابی طالب مع جبرئیل و میکائیل مروا سلموا علینا و اخبیرنی

انه لقی المشکین يوم کذا وکذا الخ (ص ۹۶)

اور نصوص صحیحہ شرانیہ وحدیثیہ سے حافظ ابن حجر کا قول زیادہ قوی ہے کہ معتبر ارواح مؤمنین علیین ہے جو ایک مقام سماء صالح میں ہے، اور مقرر ارواح کفار سجدین ہے، جو ارض سابعہ کے نیچے ہے، لیکن ان مقامات میں ارواح مقید نہیں ہیں، بلکہ ان کو اپنے جسداول سے اور قبر سے بھی تعلق رہتا ہے، اور بعض کوزمین میں تصرف و سیر کا بھی اختیار دیا جاتا ہے، جس کے بعد وہ پھر اپنی مقر پر پہنچ جاتی ہیں،

باقی اس پر کوئی دلیل قائم نہیں کہ سب ارواح جمعرات یا جمعہ کو یا پندرہ شعبان کو اپنے گھر آتی ہیں، کیونکہ اول توزمین میں تصرف کی سب ارواح کو نہیں ہوتی، بلکہ خاص خاص کو ہوتی ہے، دوسر جن کو تصرف و سیر فی الارض کا اختیار بھی دیا جاتا ہے یہ ضرور نہیں کہ وہ جمعرات یا جمعہ ہی کوزمین میں تصرف و سیر کریں، اور تصرف و سیر میں اپنے گھر بھی ضرور آئیں، پس یہ عقیدہ بلا دلیل جو جس کا احتراز لازم ہے، حرز الاحقر ظفر احمد عفا عنہ اشرف علی عرض کرتا ہے کہ جب اس عقیدہ کا بے دلیل ہونا ثابت ہو گیا، اور عقیدہ

بے دلیل کے باب میں حکم شرع ہے لا تقف مالیس لک بہ علم، پس بناء براس آیت کے ایسا عقیدہ رکھنے سے عاصی و مبتدع ہوگا، اس سے تو بہ واجب ہے، اور کسی کتاب میں کوئی مضمون ہونا حجۃ شرعیہ نہیں تا وقتیکہ اس پر کوئی دلیل نہ ہو، اور یہ چونکہ یہ امر متعلق نقل کے ہے اس لئے دلیل نقلی ہونا شرط ہے، جو اصول شرعیہ کی رُو سے قابل استدلال ہو اور ایسی دلیل مفقود ہے، اس لئے ایسی کتاب کافی نہیں،

اشرف علی، یکم ربیع الثانی ۱۳۸۵ھ

حالت نزع میں محضر کو سوال (۶) پانی پلانا مستحب ہے

بعض جگہ دستور ہے کہ بحالت نزع اس کے حلق میں شہد پانی میں ملا کر پلایا جاتا ہے، کیا اس کا شرعاً ثبوت ہے؟ اور اگر نہیں ہے تو کیا پلانا مفید ہے یا مضر؟

الجواب؛ حالت نزع میں محضر کو پانی پلانا مستحب ہے، فقہاء حنفیہ نے اس کا استحباب ذکر کیا ہے، کیونکہ نزع کے وقت پیاس کا غلبہ اور شدت ہوتی ہے، اور حضرات صحابہ سے بھی ثابت ہے کہ وہ معسرۃ قتال میں محضرین کو پانی پلایا کرتے تھے،

قال فی نور الايضاح وشرحه ويستحب لا قرباء المحتضر واحد قائمه وجيرانه الذخول عليه للقيام بحقه وتنظيفه وتجريعه وسقيه الماء لان العطش يغلب لشدة الترع ولذلك يأتي الشيطان كما ورد بماء زلال (ای بارد) ويقول قل لا اله غيري حتى اسقيك فعوذ بالله منه ام (ص ۳۲۷) پس یہ دستور خلاف شرع نہیں، بلکہ مستحسن ہے، ۱۹ رجب ۱۲۵۵ھ

سوال (۷) یہاں پر ایک قبر ایک شخص کے مکان میں برآمد ہوتی جو بہت سی صدیوں کی معلوم ہوتی ہے، اور ہڈیاں اُن صاحب کی بدستور باقی تھیں، فتویٰ دیا گیا کہ اگر ان کو دوسرے قبرستان میں دفن کر دیں تو جائز ہے، بندہ عرض رسا ہے کہ یہ فعل مطابق شرع شریف کے ہوا یا کیا؟ آیا اسی جگہ رہنا چاہتے تھے، یا ہٹانے کے سبب کچھ گناہ ہوا اور خلاف شرع ہوا دوسری جگہ جو دفن ہوئے تو کفن نیا دینا چاہتے تھے یا نہیں اور ان کے نماز جنازہ پڑھنی چاہتے تھے یا نہیں، اب یہ ہوا کہ وہ مکان جو بنایا گیا، اور فتویٰ دہندگان کے لڑکے کا انتقال ہو گیا،

الجواب: مسلمان کی لاش اگر کسی جگہ زمین کھودنے سے نکل آوے تو اس کو اسی جگہ دفن کر دینا لازم ہے وہاں سے منتقل کرنا اور دوسرے قبرستان میں یا کسی اور جگہ دفن کرنا جائز نہیں، فقہاء نے اس سے منع کیا ہے، اور اس میں مسلمان میت کی بے حرمتی بھی ہے، جس شخص نے جواز نقل کا فتویٰ دیا اس نے بہت بُرا کیا، کہ قول فقہاء کو دیکھ کر فتویٰ نہ دیا، لیکن اگر وہ مفتی اپنی غلطی کا اقرار کر لیں اور آئندہ اپنی رائے سے فتویٰ نہ دینے کا وعدہ کر لیں تو پھر اُن پر ملامت کرنا ایذا پہنچانا جائز نہیں، اور اس صورت میں نماز جنازہ دوبارہ نہیں پڑھی جاسکتی، کیونکہ نماز جنازہ کی صحت کے لئے جسم شرط ہے، اور ڈھانچ جسم نہیں، نیز تکرارِ صلوٰۃ جنازہ غیر مشروع ہے، واللہ بنی صلی اللہ علیہ وسلم عین وفاء صلوٰۃ علیہ مرۃ و آخری فرادی وکان ذلک خاصاً بہ، اور ظاہر یہ ہے کہ جس مسلمان کی لاش نکلتی ہے وہ نماز پڑھ کر دفن کیا گیا، قال فی مراقی الفلاح ولو بلی المیت وصارت راباً جاز دفن غیرہ فی قبرہ ولا يجوز کسر عظامہ ولا تحویلہا ولو کان ذمیاً ولا ینبش وان طال الزمان ام و ذکر الطحطاوی فی حاشیتہ نحوه وانکر علی فعل لحفاز

نحوہ فی حکم الذمی کما سیأتی ۱۲ منہ

من نقل عظام الموتی او طمسها او جمعها فی حفیرة فلا یقال تضمن او تجتمع عظام الاول فی موضع دفن للضرر عن موتی المسلمین وقال قبلہ ان ضم عظام المسلم یحصل بہ اخلال ولا تخلویہ عن کسر بسبب التحویل ولو شیئا م (ص ۳۵) واللہ اعلم

قبرستان میں لوہان سلگانا سوال (۸) خیال ناقص خاکسار میں لوہان و خوشبو وغیرہ قبرستان جاتے ہیں یا نہیں؟ میں سلگانا جائز معلوم ہوتا ہے، اکثر لوگ یہاں پر اس وجہ سے کہ آگ دوزخ کی ہوتی ہے منع کرتے ہیں لہذا جو حکم ہو، زیادہ حد ادب،

الجواب: عن عمرو بن العاص قال لا یبینه وھو فی سیاق الموت اذا مات فلا تصحبنی نائحة ولا نار الحد قال فی المرقاة ای المباحاة والریاء کما کان عادة الجاہلیة قال ابن حجر ولا یمنہا من التقاؤل القبیح وفیہ انما سبب التقاؤل القبیح لانہا بعضہ کما ھو ظاہر (ص ۳۸۱ ج ۲) وفی حاشیة العلامة الطحطاوی علی المرقاة فی علة کراهة الاجر فی القبر ما نصہ و بان الاجر بہ اثر النار فیکره فی القبر للتشاؤم بخلاف الغسل بالماء الحار فانہ یقع فی البیت فلا یکرہ الاجمار فیہ بخلاف القبر (ص ۳۵۶)

اگر قبرستان میں خوشبو، لوہان وغیرہ سلگانا بغرض فخر دریا ہے تب تو کراہت ظاہر ہے، اور اگر یہ غرض نہیں جب بھی یہ فعل اچھا نہیں، کیونکہ اس میں قبر کے پاس آگ جلانا ہے، جو تقاؤل قبیح کا سبب ہے، اور گھر میں گرم پانی سے غسل دینا اور تختہ کو اور کفن کو دھونی دینا بضرورت ہی، نیز وہ گھر میں ہوتا ہے اس میں یہ محذور نہیں اس لئے اس کو اس پر قیاس نہ کیا جاوے، فقط، ۱۹ شعبان ۱۳۶۷ھ

مختصر کے لٹنے کا سوال (۹)

مسنون طریقہ کیا ہے؟ جب کوئی مرنے لگتا ہے یا مر گیا، تو یہاں یعنی دکن میں سر اس کا مشرق کی طرف اور پاؤں مغرب کی طرف کر دیا جاتا ہے، اور سر تھوڑا اٹھا دیا جاتا ہے، تاکہ قبلہ کی طرف منہ اچھی طرح ہو جائے، مالک شمالی میں اس کے برعکس سر اس کا بجانب شمال اور پاؤں بجانب جنوب کر کے پہلوئے راست پر رو قبلہ لٹا دیا جاتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں طریقوں میں مشروع و مسنون طریقہ کون سا ہے، نیز

اس کے متعلق علماء ایں طرف نے مختلف رائے قائم کی ہے، جس سے از روئے شرع و احادیث معتبرہ نہیں معلوم ہوتا کہ کون طریقہ معتبر ہے، لہذا آنجناب معلی القاب سے التجا ہے کہ براہ کرم متنازعہ فیہ مسئلہ پر اپنی خاصی رائے نیز بحوالہ کتب معتبرہ حنفیہ مدلل و مبرہن ثبوت سنیت کس طریقہ میں ہے، تحریر جواب سے ہم راہ روان دین کی رہبری فرمادیں، مکرر آنکہ مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب مرحوم کا جواب مندرجہ ذیل تھا، مگر اس پر یہاں کے لوگ حوالہ کتب نہ ہونے سے معترض ہیں،

الجواب من المولوی مفتی عزیز الرحمن صاحب دیوبندی،
پہلا طریقہ سر بجانب شمال و پیر نیچا جنوب اور منہ قبلہ کی طرف کر دینا یہی سنون ہو
کتبہ عزیز الرحمن مفتی مدرسہ دیوبند، ۲۶ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۴ھ

الجواب صحیح، قال فی مراقی الفلاح لیسن توجیہ المحتضرائی من قرب من الموت علی یمینہ لانہ السنۃ و جاز الاستلقاء علی ظہرہ الخ قال الطحطاوی فی یوضع ہکذا فی الفسل والصلوۃ قال فی شرح الطحاوی وهو العرف بین الناس قال فی الزاد والاول افضل لانہ السنۃ کذا فی المصنعات ۵ ص ۳۶۵، حررہ الاحقر طفل احمد عفاعنہ از تھا بھون ۱۶ شعبان ۱۳۸۵ھ

کیا باپ کی موجودگی میں شوہر | سوال (۱۰) میت کے باپ کی موجودگی میں شوہر اس کا میت کا ولی ہو سکتا ہے؟ ولی ہو سکتا ہے یا نہیں؟ بیٹا تو حبروا،

الجواب؛ زوج کو ولایت حاصل نہیں، ولایت عصبات کے لئے ہے، البتہ اگر میت کا کوئی ولی موجود نہ ہو تو زوج لوگوں سے مقدم ہے، پس صورت مسئلہ میں ولایت باپ کو حاصل ہے، اور اس باب میں وہ سب سے مقدم ہے، مکافی العالمگیریۃ (ص ۱۰۳ ج ۱) والاولیاء علی ترتیب عصبات الاقرب فالاقرب الا الاب فانہ یقدم علی الابن کذا فی خزائنہ المفتیین قیل ہو قول محمد وعندہما الابن اولی والصحیح انہ قول الكل کذا فی التبین و ہکذا فی العنايۃ فتح القدیر فی الصفحۃ الاتیۃ ولاولایۃ للزوج عندنا لانقطاع الوصلۃ بالموت کذا فی الجامع الصغیر لقاضی خاں فان لم یکن للمیت ولی فالزوج اولی ثم الجیران من الاجنبی، کذا فی التبین، الاحقر عبدالکریم عفی عنہ ۲۸ صفر ۱۳۸۵ھ

مرنے کے بعد بیوی کو دیکھنا اور ہاتھ لگانا ... سوال (۱۱) در مسئلہ مرقومہ علماء محققین چہ می فرمایند، بعد مرگ زوجہ جائز است یا نہ ؟

الجواب: اگر عورت کا انتقال ہو جاوے تو شوہر کو اس کی طرف دیکھنا تو جائز ہے لیکن اس کو چھونا جائز نہیں، اور اس کو غسل بھی نہ دیوے، اور اگر مرد مر جاوے تو بیوی کو چھونا اور غسل دینا بھی جائز ہے، کذا فی الدر وغیرہ

فصل فی الغسل والکفن

میت کو غسل دیتے وقت کس طرح لٹایا جلتے سوال (۱۲) میت کو اتر دھن لٹا کے غسل دینا چاہئے یا کہ پورب پچیم، کسی کتاب میں بلکہ بہشتی زیور میں بھی اس کی تصریح نہیں ملی، امید کہ جواب باصواب مع حوالہ کتب تحریر فرمایا جاوے، فقط

الجواب: فی مراقی الفلاح فیوض کلمات علی سریر مجمر و تراویض المیت کیف اتفق علی الاصح، قالہ شمس الائمة السرخسی وقیل عرضا وقیل الی القبلة ام فی الطحطاوی (رقولہ وقیل عرضا) ای کیا موضع فی القبر (رقولہ وقیل الی القبلة) فتكون رجلاہ الیہا کالمريض اذا اراد الصلوة بایماء و فی القمستانی عن المحيط وغیرہ انه السنة ام ص ۳۳۰، خلاصہ یہ کہ غسل کے وقت جس طرح چاہیں میت کو لٹا دیں یہ اصح ہے، اور بعض نے یہ کہا ہے کہ قبلہ کی طرف منہ کر کے عرضاً لٹا دیں، جیسا کہ قبر میں رکھا جاتا ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ قبلہ کی طرف طولاً لٹا دیں، اس صورت میں پیر اور میتہ دونوں قبلہ کی طرف ہوں گے، محیط وغیرہ میں اس طریقہ کو سنت بتلایا ہے، والامرا وسع، واللہ اعلم، احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

جنازے کا کپڑا پھاڑ دینے سے متعلق فتاویٰ مالگیری سوال (۱) فتاویٰ ہندیہ ترجمہ عالمگیری کی ایک عبارت کا صحیح مطلب کتاب الکراہتہ باب شانزدہم زیارت قبور

کے بالکل آخر میں ہے، جنازے کا کپڑا پھاڑ دیا جاوے اس طرح کہ جس کام میں پہلے استعمال کیا جاتا تھا اس کام میں مستعمل نہ ہو سکے، اور متولی کو اس کا صدقہ کرنا جائز نہیں ہے

لیکن اس کو فروخت کر کے اس کے داموں میں کچھ مال زیادہ ملا کر دوسرا کپڑا خریدے، کذا فی جوہر الفتاویٰ، حضرت! اس کا کیا مطلب ہے؟ پورا پورا مطلب و مفہومات ارقام فرماویں، جنازے کے کون سے کپڑے پھاڑ دیتے جاویں، یعنی پیراہن پانجامہ گکڑی وغیرہ یا فقط پیراہن، ہمارے یہاں تو فقط پیراہن پھاڑ کر اُتارتے ہیں، کیونکہ میت کے عضو تنگ ہو جاتے ہیں، اس لئے پیراہن اتارنا مشکل ہو جاتا ہے، اس لئے پھاڑ دیا جاتا ہے، باقی یہ قید کہ اس طرح پھاڑیں کہ پہلی طرح استعمال نہ آسکے اس کی کیا وجہ، غرض کہ بخوبی ارقام فرماویں، اور اصل کپڑا پھاڑ کر بچھا اور نیا کپڑا خرید کر ناکیا ضروری ہے، سمجھ میں نہیں آتا؟

الجواب؛ فتاویٰ ہندیہ میں عالمگیریہ کی عبارت کا ترجمہ اس جگہ بالکل غلط کیا ہے عبارت عالمگیریہ یہ ہے ثوب الجنائزۃ تخرق بجیث لا یستعمل فیما کان یستعمل فیہ لا یجوز للمتولی ان یتصدق بہ و لکن یدبغہ بثمان و ہشتوی بہ و بزیادۃ مال ثوباً اخر کذا فی جوہر الفتاویٰ واللہ اعلم

(ترجمہ) جنازہ کا کپڑا پھٹ گیا، اس طرح کہ اب اس کام میں نہیں آسکتا جس میں استعمال کیا جاتا ہے تو متولی (وقف) کو یہ جائز نہیں کہ اس کو صدقہ کر دے (کیونکہ اس میں وقف کو غیر مصرف میں صرف کرنا لازم آتا ہے) اور لیکن اس کو کسی قیمت پر فروخت کر دے، اور اس قیمت میں کچھ اور ملا کر اس سے دوسرا کپڑا خرید لے الخ " اور جنازہ کے کپڑے سے مراد اس عبارت میں وہ کپڑا ہے جو کفن کے اوپر چادر کے طور پر ڈالا جاتا ہے، بعض لوگ جنازہ کی چار پائی اور اس کے اوپر کی چادر عام مسلمانوں کے لئے وقف کر دیا کرتے ہیں، تاکہ ہر میت کے اوپر وہ چادر ڈالی جاوے، پس وہ چادر اگر پھٹ جاوے اور کام میں نہ آسکے تو اس کا حکم اس عبارت میں مذکور ہے واللہ اعلم

۱۱ رمضان ۱۳۸۵ھ

سوال (۳) اگر عورت مر جاوے تو اس کا خاوند اس کے جنازہ کا پایا پچڑ سکتا ہے یا نہیں، اور وہ اپنی بیوی کو اپنے ہاتھ سے قبر میں اتار بھی سکتا ہے یا نہیں، اور اگر کوئی عورت نہلانے والی موجود نہ ہو تو وہ اپنی بیوی کو اپنے ہاتھ سے نہلا سکتا ہے یا نہیں، اور اگر خاوند مر جاوے تو وہ عورت اپنے

خاوند کو نہلا سکتی ہو یا نہیں؟ اور اگر کوئی مسلمان کا مردہ مردہ مر جاوے تو اس کے جنازہ کی نماز پڑھنی چاہئے یا نہیں، جس نے کبھی نماز نہ پڑھی ہو، اس کے واسطے کیا حکم ہے؟

الجواب؛ مرد اپنی بیوی کے جنازہ کو ہاتھ لگا سکتا ہے لیکن اگر اس کے محرم موجود ہوں تو قبر میں نہ آتا ہے، اور جو سب غیر محرم ہی ہوں تو شوہر بھی اس کو قبر میں آتا رہتا ہے، اور اگر کوئی عورت نہلانے والی موجود نہ ہو تو عورت کو مرد غسل نہیں دے سکتا، نہ شوہر اور نہ محرم بلکہ شوہر اس کو تیمم کر دے، اور شوہر کو تیمم کرانے کے لئے اس کے ہاتھ کو اور منہ کو دیکھنا جائز ہے، مگر چھوئے نہیں، بلکہ ہاتھ کو کپڑا الپیٹ کر تیمم کراتے، اور بیوی اپنے مرد کو غسل دے سکتی ہے، جبکہ کوئی مرد غسل دینے والا موجود نہ ہو،

مسلمان بے نمازی کے جنازہ کی نماز پڑھنا بھی ضروری ہے، بدون نماز کے دفن نہیں ہو سکتا، اگر بدون نماز کے دفن کیا گیا سب گنہگار ہوں گے، قال فی مراقی الفلاح والمرأة تغسل زوجها بخلافه ای الرجل فانه لا يغسل زوجته لا نقطاع النكاح واذا لم توجد امرأة يغسلها تیممها (ای زوجہا، ظ) وليس عليه غرض بصره عن ذراعيها بخلاف الاجنبی ام فانه يلف يده بخرقه وتیممها مع غرض بصره عن ذراعيها الا ان تكون امة فلا تحتلج الي حائل ام، ر ۳۳۳ والله اعلم، ۲۳ ر ذی الحجہ ۱۴۲۷ھ

سوال (۴) کوئی عورت فاسلہ موجود نہ ہو تو بیٹامیت کو بہ نیت غسل تیمم کر دے، بیٹے کو غسل دینا جائز نہیں

اس کا خاوند اور اس کا لڑکا دونوں موجود ہوں، اب میت کے غسل کے لئے کوئی عورت نہیں ملتی ہے، اور عنقریب دس میل یا پندرہ میل کے فاصلے پر نہ کوئی شہر ایسا ہے کہ جہاں مسلمانوں کے گھر ہوں، میت والوں کا شہر تین سو میل کے فاصلے پر ہو اور میت کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو، حالانکہ جس جگہ میت ہو وہاں نمازی موجود ہیں، لیکن غسل میت کے واسطے تلاش کرنے سے بھی عورتیں نہیں ملتیں یہ حادثہ دھرم پور میں فی الحال درپیش ہوا ہے، اس لئے آپ کو تکلیف دی جاتی ہے،

الجواب؛ ایسی حالت میں میت عورت کا محرم یعنی لڑکا میت کو بہ نیت غسل کے تیمم کر دے، یعنی دو مرتبہ مٹی پاک پر ہاتھ مار کر ایک بار تو میت کے منہ کو مل دے،

اور اس کے بعد ایک بار مٹی پر ہاتھ مار کر ہاتھوں کو کہنیوں تک مل دے، غسل نہ دیا جائے، کیونکہ اس میں بدن کھولنا اور جسم مستور کو ہاتھ لگانا پڑے گا، ولا يجوز ذلك للرجال مع النساء قال في مراقي الفلاح ولو ماتت امرأة مع الرجال المحارم وغيرهم يمسوها كعكسه وهو موت رجل بين النساء وكن محارمة يمينه بخرقه تلف على يد الميمم الاجنبى حتى لا يمس الجسم يفض بصره عن ذراعى المرأة ولو عجزا فان وجب ذورحهم محرم يمين الميمم ذكرا كان او انثى بلا خرقه لجواز مس اعضاء التيمم للمحرم بلا شهوة كالنظر اليها منها له ام، ص ۳۳۳ مع الطحاوى والله تعالى اعلم

۳ ربيع الاول ۱۲۶۴ھ

سوال (۵) بہشتی زیور مدلل مکمل طبع ثانی اشرف المطابع حصہ
 غسل میت کے متعلق بہشتی زیور کی ایک عبارت پر شبہ کا جواب
 دوم، ص ۷۷، میں اول مسئلہ یہ درج ہے ”مسئلہ: اگر کوئی مرد مر گیا اور مردوں میں سے کوئی نہلانے والا نہیں ہے تو جو عورت اس کی محرم ہو وہی نہلاؤ غیر محرم کو ہاتھ لگانا درست نہیں، اور اگر کوئی محرم عورت نہ ہو تو اس کو تیمم کرادو“ الخ اس کے متعلق دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ یہ مسئلہ کہاں سے اخذ کیا گیا ہے، بظاہر جہاں تک کتب فقہیہ کو دیکھا گیا، اس کے خلاف ہی ملا، فی البدائع وان لم یکن معین ذلک فانہن لا یغسلنہ سواء کن ذوات رحم محرم اولاً لان المحرم فی حکم النظر الى العورة والاجنبیة سواء قلنا لا لغسله الاجنبیة فکذا ذوات محارمه ولكن یمسونه (ص ۳۰۵ ج ۱)، وفي العالمگیریة (ص ۱۰۲ ج ۱) والاصل فيه ان کل من یحل له وطئها لو کان حیا بالنکاح یحل لها ان تغتسله والا فلا و مثله فی نور الايضاح، امید کہ حضرت اپنی رائے عالی سے مطلع فرما کر اس اشتباہ کو دور فرمائیں گے،

الجواب، عبارات فقہ تمام کتابوں میں قریباً وہی ہیں جو بدائع وعالمگیری میں ہیں جن کو آپ نے نقل کیا ہے، اس لحاظ سے نقلاً بہشتی زیور کا مسئلہ واقعی مخدوش ہے، مگر درایت اس کے غلط ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، کیونکہ دو قاعدے کتاب الکرامۃ در مختار میں ہے مصرح ہیں، تنظر المرأة من الرجل كنظر الرجل عليه وما جازا النظر اليه جازمہ..... اس مجموعہ کا حاصل یہ ہے کہ ماسوی السرة الى الركبة کا تو عورت محرم مس ہے

عہ البتہ طحاوی کتاب الرضاع میں ہر ذیل تغسل فی شایہا ۱۲ عبد الکرم عفی عنہ

کر سکتی ہے، اور ماتحت السرة الی الرکبة کا عدم مس جیسا عورت محرم کے لئے ممنوع ہے چل کے لئے بھی ممنوع ہے، اور جس حیلہ خرقة سے مرد غسل دیتا ہے عورت بھی غسل دے سکتی ہے۔
 اللهم ان ینال ان حکم غسل المیت مفترق عن حکم النظر والمس في الحياة كما یدل علیه قول البذلح الجنس یغسل الجنس ولا یغسل الجنس خلافات الجنس
 والله اعلم ولعل الله یحدث بعد ذلك امراً، ۲۰ صفر ۱۳۸۷ھ

میت پھول جائے اور ہاتھ لگانے کے قابل | سوال (۶) بحوالہ کشف الغطاء ایک کتاب میں نہ رہے تو اس کو کس طرح غسل دیا جائے؟ یہ لکھا دیکھا ہے کہ اگر مردہ پھول گیا ہو اور اس کو غسل نہ دے سکیں تو پیٹ پر مسح کرنا کفایت کرتا ہے، انتہی، مگر اس میں مسح کا کوئی طریقہ تحریر نہیں ہے، اگر یہ مسئلہ صحیح ہے تو طریقہ مسح تحریر فرمائیے، اور مقدار بھی واضح ہو،
 الجواب: فی العالمگیریۃ ولو كانت المیت متفسخاً یعتذر مسحہ کفی صب الماء علیہ کذا فی التاتارخانیۃ ناقلاً عن العتابیۃ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر میت پھولنے کی وجہ سے ہاتھ لگانے کے قابل نہ ہو، یعنی ہاتھ لگانے سے پھٹ جانے کا اندیشہ ہو تو صرف پانی بہا دینا کافی ہے، کیونکہ ملنا وغیرہ ضروری نہیں، یہ روایت تو قواعد کے موافق ہے باقی جو روایت سوال میں درج ہے، اس کا اگر یہ مطلب ہے کہ پیٹ اتنا پھول گیا ہے کہ اس پر پانی بہانا بھی ممکن نہیں تو باقی بدن کو دھو کر یعنی اس پر پانی بہا کر پیٹ پر صرف مسح کر دیا جاوے جیسا کہ زندہ کے لئے غسل و وضو میں حکم ہے تب تو صحیح ہے اور اگر یہ مطلب لیا جاوے کہ غسل کی جگہ صرف پیٹ پر مسح کافی ہے تو بالکل غلط ہے،
 ۱، رذیقہ ۱۳۸۷ھ

فصل فی الصلوة علی المیت

سوال (۱) نماز جنازہ میں قصداً یا سہواً آگے درود پڑھے نماز جنازہ کے اندر ثناء، درود اور دعا میں تقدیم و تاخیر کرنا | ثناء یا اول دعا، تب درود پڑھے، عرض ایسی کچھ تقدیم یا

عہ اور اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مظنہ شہوت کو بمنزلہ شہوت قرار دیا گیا، اور ضرورت شدید نہیں ہے، کیونکہ غسل کا خلیفہ تیمم موجود ہے، ۱۲ عبد الکریم عفا عنہ

لہ فیہ ان المس یجوز بلا ضرورة فی الحیاة فباتی وجہ لا یجوز بعد الموت ۱۲ عبد الکریم عفی عنہ

تاخیر سے نماز درست ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب، نماز درست ہے، ۲۲ جمادی الثانیہ ۱۴۲۸ھ

سوال (۲) نماز جنازہ کو نماز جمعہ سے اگر جمعہ کی نماز کے کچھ قبل مسجد میں جنازہ آگیا، لوگ زیادہ ہونے کے واسطے اور سنتو آدمی لے کر جنازہ پڑھنے کے واسطے بعد نماز جمعہ کے جنازہ پڑھنا کیسا ہے، اگر امام کسی مصلحت سے جمعہ کی نماز کو جمعہ سنت پڑھ کر بعد اس کے نماز جنازہ پڑھے تو درست ہے یا نہیں، بینو التوجروا؟

الجواب؛ قال فی رد المحتار و تقدیم صلوة العید علی صلوة الجنائز والجنائز علی الخطبة والقیاس تقدیمہا علی العید لکنہ قدم مخافة التشویش کی لا یظنہما من فی اخریات الصفوف انہما صلوة العید، بحر، ومفادہ تقدیم الجمعة علی الجنائز للعلۃ المذكورة ولا یفرض عین بل الفتوی علی تقدیم سنتہما علیہما ومرتبہما فی اول باب صلوة العید ام (ص ۹۳۱ ج ۱)

اس سے معلوم ہوا کہ فتویٰ اسی پر ہے کہ نماز جنازہ کو نماز جمعہ اور اس کی سنتوں کے بعد پڑھا جائے، البتہ اگر جنازہ خطبہ سے پہلے آجائے، اور خطبہ سے پہلے جنازہ کی نماز پڑھنے میں نمازیوں کو انتشار و تشویش نہ ہو تو پہلے جنازہ کی نماز پڑھ دی جائے، اور اگر انتشار و تشویش کا احتمال ہو تو جنازہ کو نماز جمعہ اور سنت جمعہ کے بعد پڑھا جائے، واللہ اعلم، ۱۰ رجب ۱۴۲۲ھ

سوال (۳) نماز جنازہ کی تکرار بدعت اور مکروہ تحریمی ہے، معروض اینکه مسئلہ تکرار جنازہ میان علماء ایں دیار اختلاف عظیم واقع گشتہ، فلہذا امید تمام از تلمطع عام ہی دارد کہ مجرد وصول نیازنامہ ہذا تحقیق تکرار جنازہ اگرچہ چار دفعہ باشد جائز و رواست یا چہ، بر تقدیر اول بلا کراہت است یا با کراہت،

واگر کراہت باشد تحریمہ بود یا تنزیہیم بزیر قلم فیض رقم مع حوالہ کتب معتبرہ تحریر فرمایند،

الجواب؛ نماز جنازہ مکرر نہیں ہو سکتی، اس کا تکرار بدعت ہے، اور مکروہ تحریمی ہے، قال فی مرقاۃ الفلاح فان صلی غیرہ ای غیر من لہ حق التقدم بلا اذن ولم یقدم اعادہا ہوان شاء لعدم سقوطہ حقہ وان تأدی الفرض بہا ولا یعین معہ ای مع من لہ حق التقدم من صلی مع غیرہ لان التفضل بہا غیر مشروع کما

لا یصلی احد علیہا بعدہ وان صلی وحدہ ام قال الطحاوی اما اذا اذن اولم یا اذن
ولکن صلی خلفہ فلیس لہ ان یعین لانه سقط حقہ بالاذن او بالصلوة مرة
وهی لا تتکرر ولو صلی علیہ ولی ولیمیت اولیاء اخرون بمنزلتہ لیس لہم
ان یعین والان ولایة الذی صلی متکاملة ام (ص ۳۲۳) البتہ ایک صورت
میں تکرار نماز جنازہ جائز ہے، جبکہ اس شخص کے جواحق بالتقدم ہو بلا اذن کوئی دوسرا
نماز پڑھاوے، اور احق بالتقدم نے اس کے پیچھے نماز نہ پڑھی ہو تو یہ احق بالتقدم اعادۃ
نماز کر سکتا ہے، واللہ اعلم، ۲ ربيع الاول ۱۳۵۵ھ

سوال (۴) احقر کی نظر میں حضرت کے تتمہ فتاویٰ امدادیہ
ہاتھ چھوڑے یا پہلے، گذرا کہ صلوٰۃ جنازہ میں سلام پھیرنے سے آگے ہاتھ چھوڑنا،
احقر کو خلجان ہوا کہ علماء دیوبند وغیرہ کے عمل اس کے خلاف دیکھا گیا، اور یہ مسئلہ لے کر
اس دیار میں بہت ہی بحث و تکرار شروع ہو گیا، اور عوام میں فتنہ جگہ جگہ برپا ہو رہا ہے،
اب دریافت طلب یہ ہے کہ ایسے وقت میں عمل کس پر ہونا چاہئے، للہ رفع خلجان فرمادیں
زیادہ والسلام مع الکرام،

الجواب: اس مسئلہ میں اس سے زیادہ کچھ تحقیق نہیں ہو سکا جو تتمہ امداد الفتاویٰ
میں ہے کہ یہ قول صحیح ہے، کہ دعائیں پڑھ کر ہاتھ چھوڑ دیئے جائیں، اور سلام بعد ہاتھ چھوڑنے
کے کیا جاتے، کیونکہ وقت سلام کے نہ کوئی دعا ہے نہ تحریمہ کا بقاء ہے، بلکہ سلام خروج
من الصلوٰۃ کے لئے ہے، پس اس وقت نہ قیام نہ قراریہ ذکر مسنون کا تحقق ہے نہ حرمت
صلوٰۃ باقی ہے، پھر ہاتھ باندھ کر سلام پھیرنے کی کیا وجہ ہے، مگر اس وقت تک علماء
دیار کا معمول یہی دیکھا ہے کہ بعد تسلیم کے ہاتھ چھوڑتے ہیں، اور اس میں یہ تاویل ہو سکتی
ہے کہ سلام تکبیر رابع کے بعد معاً ہوتا ہے، اور سلام بھی دعا ہے، اس لئے سلام کے
وقت بھی وضع یدین بھی باقی رکھا گیا، لیکن ابھی تک شرح صدر نہیں ہوا، ولعل اللہ تعالیٰ
بعد ذلک امراً، واللہ اعلم، بہر حال یہ امر ایسا نہیں ہے جس میں نزاع و تکرار کیا جاوے کہ کلام
مختص اولویت میں ہے نہ کہ اباحت و حرمت میں، فقط ۳ ربيع الثاني ۱۳۵۵ھ

سوال (۵) محلہ میں گاہ گاہ اموات ہو جاتی ہیں جن کا جنازہ
مجھے پڑھنا ہوتا ہے، ان دنوں میں ایک شخص عبدالرحیم نامی اہل قرآن و فرقہ معروفہ،

زمانہ حال جس کا بانی مولوی عبداللہ چکڑالوی ہوئے ہیں) کا انتقال ہوا، یہ شخص مجمع احباب میں یہ الفاظ کہتا تھا کہ صحاح ستہ محض خرافات ہیں، قرآن کے بعد کسی دوسری وحی کو ماننا صریح شرک ہے، اور ان احادیث کے ماننے والے اکفر ہیں، عوام میں تقیہ کرتا تھا، احقر نے مندرجہ بالا الفاظ چار پانچ مرتبہ اس کی زبان سے سنا تھا، چونکہ میرے محلہ کا تھا لوگوں نے نماز جنازہ پڑھنے کے لئے مجھ سے کہا، میں کنارہ کش ہو گیا، کیونکہ مجھ میں مخا کی جرأت نہ تھی، اب دریافت طلب یہ ہے کہ میں گنہگار تو نہیں ہوا؟ کیا مجھے جنازہ پڑھنا چاہئے تھا، لوگ کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ اُس نے توبہ کر لی ہو، تم نے اچھا نہیں کیا، آحشر جماعت مسلمین میں شامل تھا؟

الجواب: قرآن کی طرح حدیث کا حجت شرعیہ ہونا اجماعی اور قطعی مسئلہ ہے، اور یہ فرقہ حجت حدیث کا منکر ہے، خصوصاً جو شخص حدیث کو خرافات کہے اور قرآن کے بعد وحی حدیث کے ماننے کو شرک کہے وہ تو قطعاً کافر ہے، ایسے شخص کی نماز جنازہ پڑھنا آپ کو جائز نہیں تھا، اچھا کیا کہ ٹل گئے، فی العالمگیریۃ عن صدق الاسلام سئل عن من قرأ حدیثاً من احادیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال رجل ہمدہ روز خلتہا خواند قال ان اضاف ذلك الى القاری دون النبی صلی اللہ علیہ وسلم ینظر ان کان حدیثاً یتعلق بالدين واحکام الشرع یکفر وان کان حدیثاً لا یتعلق به لا یکفر ویحمل مقالته علی ان ارادته قراءۃ غیرہ اولی ام (ص ۱۶۱ ج ۳) ومثلہ فی (ص ۱۶۳ ج ۳) والصحاح شاملۃ علی الاحکام وغیرہا فقط، ۱ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۸ھ

متعدد جنازوں پر ایک سوال (۶) اگر چند جنازے موجود ہوں تو نماز ایک ہی کافی ہے نماز بھی کافی ہے، یا متعدد؟ امید ہو مدلل و مشرح صاف صاف بیان فرما کر مشکور فرمائیں گے

الجواب: چند جنازوں کی نماز ایک ساتھ بھی ہو سکتی ہے، اگر مردوں اور عورتوں کے جنازے مختلط ہوں تو امام کے قریب مردوں کے جنازے ہوں اور عورتوں کے اُن کے پیچھے ہوں اور بچوں کے عورتوں اور مردوں کے بچے میں ہوں، اور دیندار کو غیر دیندار سے مقدم کیا جاوے، واللہ اعلم، ۲۶ ذیقعدہ ۱۳۵۸ھ

دریا میں غرق ہو کر ایسی حالت میں | سوال (۷) ایک دن دو عورتیں دریا میں ڈوب گئیں اور لاش برآمد ہوئی کہ جسم کی صرف ہڈیاں باقی ہوں تو اپنا جنازہ پڑھی جائے یا نہیں

ایک جڑی ہوئی نکلیں، تو اب اس کا جنازہ مثل اور مردوں کے پڑھنا چاہئے یا نہیں یہاں تو اس کو صرف ایک کپڑے میں لپیٹ کر نماز جنازہ پڑھ کر دفن کر دیا گیا تو کیا کرنا چاہئے؟

الجواب: قال الطحاوی تحت قول مراقی الفلاح صلی علی قبرہ ما لم یفسخ ما نصنہ ای تتفرق اعضاءه فان تفسخ لا یصلی علیہ مطلقاً لانها شرعت علی البدن ولا وجود له بعد التفسخ ام (ص ۳۲۵) وفی مراقی الفلاح فی شرائط الصلوة علی المیت والرابع حضوره او حضور اکثر بدنہ او نصفه مع رأسه ام (ص ۲۳۹) قلت والظاهر ان البدن یطلق علی مجموع اللحم والعظام لا علی العظام وحدها، صورت مسئلہ میں ان ہڈیوں پر نماز پڑھنا نہ چاہئے تھا، بلکہ ویسے ہی کسی پاک کپڑے میں لپیٹ کر دفن کر دینا چاہئے تھا، واللہ تعالیٰ اعلم، ۵/ ذی الحجہ ۱۴۲۸ھ

سوال (۸) میت کا جسم پھول اور پھٹ جائے | حافظ محمد اسماعیل صاحب کے نماز جنازہ میں متعلق عوام تو نماز جنازہ ساقط ہو جاتی ہے؟

کایہ خیال ہے کہ چھ روز کے بعد پانی میں لاش ملی، اور لاش نکالنے کے بعد پانی کے باہر اُن کا پیٹ پھوٹ گیا، آیا اُن کی نماز جنازہ پڑھی گئی درست ہے یا نہیں؟ اس کا خلاصہ عنایت فرمائیے، باقی والسلام

الجواب: اس حالت میں نماز ساقط ہو جاتی ہے، کما یدل علیہ قول البحر (ص ۱۸۲ ج ۲) قول الکفر صلی علی قبرہ ما لم یفسخ لان الصلوة بدون الغسل لیست بمشروعة لایؤمر بالغسل لتضمنہ امرأ حراماً وھو نبش القبر فسقطت الصلوة ام وقید بعدم التفسخ لانه لا یصلی علیہ بعد التفسخ لان الصلوة شرعت علی بدن المیت فاذا تفسخ لم یبق بدن قائماً واللہ اعلم، کتبہ الاحقر عبد الکریم الحرم ۱۴۲۸ھ یوم جمعہ الجواب صحیح ظفر احمد عفا اللہ عنہ اگر میت کے جسم سے نجاست نکلنا بند نہ ہو تو اس پر نماز پڑھی جائے یا نہیں؟

سوال (۹) ایک مردہ کا پاخانہ بند نہیں ہوتا،

آیا اس کی نماز پڑھائی جاوے یا نہیں؟

الجواب، کفن دینے کے بعد اگر میت سے نجاست نکلے تو اس کو دھونے کی ضرورت نہیں اور اس پر اسی طرح نماز درست ہے، فی الشامی (ص ۱۰۷ ج ۱)، قوله وما خرج منه يغسله، ای تنظیفاً بحرقاں الرملی ای لاش طاحی لوصلی علیہ من غیر غسلہ جاز و هذا مما لا يتوقف فيه اه وفي الاحکام عن المحيط بیسم ما سال و یکفن وفي کتاب الصلوة للحسن اذا سال قبل ان یکفن غسل و بعدة لا قلت و سیأتی تمامہ فی بحث الصلوة علیہ (ای ص ۹۰۷) ۲۲

کتبہ احقر عبد الکریم عفی عنہ ۲ ربیع الاول ۱۲۲۲ھ، صحیح نظراً احمد عفا عنہ ۲۰ ر ۱ جنازہ شرقاً و غرباً رکھ کر **سوال** (۱۰) میت کا جنازہ پڑھا گیا اور اس کی چار پائی شرقاً نماز جنازہ پڑھنا کیسا ہے، غرباً رکھی گئی، گویا پاؤں مغرب کی طرف اور سر مشرق کی طرف تھا ایسا کرنے میں شرع محمدی مانع ہے یا نہیں؟

الجواب، سنت یہ ہے کہ امام کے سامنے جنازہ اس طرح رکھا جاوے کہ میت کا سر امام کے دائیں جانب ہو اور پاؤں بائیں جانب، اس کے خلاف کرنا برا ہے کافی الشامی و افادان السنة وضع رأسه مایل یبین الامام کما هو المعروف الآن ولهذا علل فی البدائع الاساءة بقوله لتغیرهم السنة المتوارثة و یوافقہ قول الحاوی القدسی (ص ۹۰۸ ج ۱) احقر عبد الکریم عفی عنہ ۵ محرم ۱۲۲۵ھ، الجواب صحیح، نظراً احمد عفا عنہ، ۶ محرم ۱۲۲۵ھ

سوال (۱۱)..... غیر نمازی بے نمازی پر نماز جنازہ پڑھائی جائے یا نہیں، اشخاص کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے، اُن کی نماز جنازہ پڑھائی جائے یا نہیں، قرآن خوانی کی جائے یا نہیں، محض اُن کو خوف دلانے کے لئے ہم ایسا کر سکتے ہیں یا نہیں، قبر میں دفن کر دینے کے بعد دوسرے یا تیسرے دن چند لوگ خفیہ طریقہ سے کسی وقت جا کر نماز جنازہ پڑھ لیا کریں، تاکہ غیر نمازیوں کو یہ راز نہ معلوم ہو، اور غیر نمازی سے کیا مراد ہے، بعض لوگ دور دراز پڑھ کر دس روز غائب ہو جاتے ہیں اور پھر ایک روز پڑھ کر ایک ماہ غائب ہو جاتے ہیں، اگر ایسے غائب کردہ وقت میں فوت ہو گئے تو کیا حشر کیا جاوے، کیا غیر نمازی کی میت چالیس قدم گھسیٹنے کا حکم

بھی محمد رسول اللہ ص نے فرمایا ہے، بہر کیفیت جو کچھ حضور تحریر فرمادیں، غلام جواب کا دل و جان سے منتظر ہے،

الجواب؛ بے نمازی جو زیادہ تر نمازیں نہ پڑھتا ہو اس کے جنازہ کی نما پڑھنا عام مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے، بدون نماز کے دفن کرنا حرام ہے، زجر کے لئے اتنا کافی ہے کہ بستی کا عالم اُس کی نماز نہ پڑھے، باقی اور لوگوں کو پڑھنا ضروری ہے ورنہ سب گنہگار ہوں گے، اور قبر پر پڑھ لینا اس گناہ سے سبکدوش نہیں کر سکتا، لہٰذا جو زلضرورۃ اللہ علیہ ۲۲ شعبان ۱۳۵۴ھ

جو توں کے ساتھ نماز جنازہ | سوال (۱۲) اکثر لوگ جنازہ کی نماز جو تہ پہنے ہوئے پڑھتے پڑھنا کیسا ہے؟ ہیں، اور امام بھی، اور کوئی اور جو تہ کے پیر رکھ لیتا ہے اور نماز پڑھتا ہے، اور بارش کے موسم میں جبکہ جوتے تمام ناپاکی سے اوپر تلے سنے رہتے ہوں، اور سب مٹی سے ٹھسے رہتے ہوں اس امام کے پیچھے جنازہ کی نماز پڑھے یا نہ پڑھے، اور میت کی نماز ہو گئی یا نہیں، جواز کی صورت کس طرح ہے،

الجواب؛ قال فی العالمگیریۃ ولوقام علی النجاسة فی رجلیہ نعلان او جوریان لم یجز صلواتہ کذا فی المحيط السرخسی ولو خلع نعلیہ وقام علیہما جاز سواء کان مایلی الارض منہ نجسا او طاهرا اذا کان مایلی القدم طاهرا (ص ۳۸ ج ۱) وفيہ ایضا الخف اذا اصابته النجاسة ان كانت متجسدة كالعدرة والروث والمنی یطهر بالعت اذا یست وان كانت رطبة فی ظاہر الروایة لا یطهر الا بال غسل وعند ابی یوسف اذا مسح علی وجهه المبالغة بحيث لا یبقی لها اثر یطهر وعلیہ الفتویٰ لعموم البیوی کذا فی قاضی خان ام وفيہ ایضا والارض تطهر بالجفاف وزوال الاثر للصلوة لا التیمم کذا فی کافی ام (ص ۱۲ ج ۱)

(۱) اور جوتوں میں سے پیر نکال کر اوپر رکھ لئے تو یہ ضروری ہے کہ جوتوں کا اوپر کا حصہ جو پیر سے متصل ہے پاک ہو گویا نیچے کا ناپاک ہو (۲) اگر جوتے پہنے پہنے نماز پڑھے تو یہ ضروری ہے کہ زمین اور جوتے کے اندر اور نیچے کی دونوں جانبیں پاک ہوں، لیکن نیچے کی جانب کو پاک کرنے کے لئے دھونے کی ضرورت نہیں، بلکہ زمین سے خوب اچھی طرح

رگڑ دینا بھی کافی ہے، اور اس صورت میں زمین کا پاک ہونا بھی شرط ہے،
(۳) اگر جو تہ نکال کر زمین پر کھڑے ہوں تو زمین کا پاک ہونا شرط ہے، اور زمین خشک
ہو کر پاک ہو جاتی ہے، جبکہ ناپاکی کا اثر باقی نہ رہے، اس تفصیل سے تمام شقوق کے حکم
معلوم ہو جائیں گے، واللہ اعلم ۲۳ رمضان المبارک ۱۴۲۵ھ

سوال (۱۳) نماز جنازہ نماز عیدین سے مؤخر اور خطبہ عید مقدم کرنا چاہیے
..... میت کی نماز عیدین پر مقدم ہونی چاہیے یا مؤخر

الجواب؛ قال فی الدرر وتقدم صلاتها ای العید علی صلوٰۃ الجنائزۃ
اذا اجتماعا وتقدم صلوٰۃ الجنائزۃ علی الخطبۃ وعلی سنۃ المغرب وغیرھا
رکسنۃ الظهر والجمعة والعشاء ۱۲ شامی، والعید علی الکسوف ام قال
الشامی الاولی التعلیل بخوف التشویش علی الجماعة بان یظنوها صلوٰۃ العید
ثم رأیتہ كذلك فی جنائز البحر عن القنیۃ ام ر ص ۸۶۵ ج ۱ باب العیدین،
اس سے معلوم ہوا کہ نماز جنازہ کو نماز عید سے مؤخر اور خطبہ عید سے مقدم کرنا چاہیے،
اور گو صاحب شہاب نے نماز عید سے جنازہ کو مقدم کیا ہے مگر راجح وہی
ہے جو درمختار میں ہے، واللہ اعلم، قال فی الدرر بعد العبارة المذكورة سابقا لکن
فی البحر قبیل الاذان عن الحلبي الفتوی علی تاخیر الجنائزۃ عن السنۃ وافرہ
لمصنف کانه الحاقا لہا بالصلوٰۃ ام ر ص ۸۶۶ ج ۱ قلت ویبغی بناء علیہ،
تاخیر الجنائزۃ عن خطبۃ العید لكونها ملحقة بالصلوٰۃ العید وهو لا یفوق
بالناس لما فی اجتماع الناس بعد الجنائزۃ للخطبۃ من خشية الانتشار و
الفرار واللہ اعلم، اس روایت کا مقتضی یہ ہے کہ نماز جنازہ کو خطبہ عید سے بھی مؤخر
کیا جائے، اور یہی سہل ہے ورنہ لوگ نماز جنازہ کے بعد خطبہ نہ سنیں گے، واللہ اعلم،
۸ شوال ۱۴۲۵ھ

سوال (۱۴) جس کی ختم نہ ہوتی ہو... مگر دیگر دلائل
..... ایک شخص مسمی بھورے شاہ عرف موتی شاہ
جو کہ مجذوب تھا اور ایک عرصہ دراز سے منصوری
میں رہتا تھا، اور وہ قوم کا مسلمان تھا، جس گاؤں میں وہ رہتا تھا، ان سے تصدیق

ہو گیا کہ وہ مسلمان تھا، اور کم عمری میں دہلی کی طرف چلا گیا تھا، اور اب ایک عرصہ دراز سے منصوری میں رہتا تھا، اور اس کا انتقال یہاں پر ہو گیا، اس کی ہم مسلمانانِ منصوری نے تجہیز و تکفین کرنا چاہی، اور نعش کو جامع مسجد منصوری میں لائے، تو ایک شخص کا بلی جو کہ منصوری میں رہتا ہے، اور دوکانداری بساطخانہ وغیرہ کرتا ہے، اس نے کچھ مسلمانان یعنی قوم قصابان کو جو کہ وہاں پر موجود تھے بہکا دیا، اور کہہ دیا کہ یہ شخص مسلمان نہیں ہے ہندو ہے، کیونکہ اس کی ختنہ نہیں ہوئی تھی، جبکہ وہ اس مکان سے نابالغی کی حالت میں نکل گیا تھا اس وجہ سے اس کی ختنہ نہیں ہوئی، تو کیا اس سے یہ تصور کر لیا جاوے کہ وہ ہندو تھا، جبکہ تصدیق پیشتر ہی سے ہو چکی تھی کہ وہ مسلمان ہے، خیر یہ سب قصہ اس کا بلی شخص نے کیا، اور کچھ مسلمانانِ منصوری علیحدہ ہو گئے، اور شریک جنازہ نہ ہوئے، پھر ایک شخص مرزا صاحب جو کہ محلہ راجمندی کی مسجد میں پیش امام ہیں انھوں نے اس کی تجہیز و تکفین کی، اور ان کو بھی یہ کا بلی شخص ہر قسم کی دھمکیاں دیتا رہا، کہ تم نے کافر کی تجہیز و تکفین کی ہے ہم تم کو جان سے مار دیں گے، اب اس قدر التجا ہے کہ اس مجزوب کی بابت جو کام ہم نے کیا وہ کس حد تک صحیح تھا؟

الجواب؛ جس شخص کے والدین مسلمان ہیں اور وہ نابالغی میں مجزوب یا مجنون ہو گیا، تو وہ مسلمان ہی مانا جائے گا، اور اس کے جنازہ کی نماز پڑھنی واجب تھی، ختنہ کے ہونے یا نہ ہونے سے اسلام و کفر کا حکم وہاں لگایا جاسکتا ہے جہاں اور کوئی صورت تحقیق اسلام و کفر کی نہ ہو، اور جہاں دوسرے دلائل موجود ہوں، وہاں صرف ختنہ کا نہ ہونے سے حکم کفر نہیں ہو سکتا، بس جن مسلمانوں نے اس میت کے جنازہ کی نماز پڑھی انھوں نے ٹھیک کیا، ایسا ہی کرنا چاہئے تھا، جو لوگ اس فعل پر انکار کرتے ہیں وہ احکام شرعیہ سے جاہل ہیں یا متجاہل، واللہ اعلم، ۱۷ رمضان ۱۳۸۵ھ

غائبانہ نماز جنازہ کا حکم | سوال (۱۵) میت موجود ہوتے ہوئے باوجود قدرت شرکت

نماز ایک قصبہ میں نماز غائبانہ ادا کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب؛ میت سامنے رکھے بغیر نماز جنازہ صحیح نہیں چاہیے اس قصبہ وغیرہ میں پڑھی جاوے جس میں میت ہو، یا کسی دوسرے مقام میں دونوں کا ایک حکم ہے، فی العالمگیری (ص ۱۰۵ ج ۱) ومن الشرط حضور المیت ووضعه وكونه امام المصلی فلا یصح

علی غائب ولا علی محمول علی دابة ولا علی موضوع خلفه کذا فی المغنی عن الفقهاء، احتقر عبد الکریم عفی عنہ
 نماز جنازہ میں کون شخص ولی | سوال (۱۶) کرام شخص برائے نماز جنازہ لائق تر از ولی است
 سے احق بالامامت ہے، بحوالہ کتب توجہ فرمائیے،

الجواب؛ ولی سے مقدم سلطان وقاضی وغیرہ ولایہ مسلمین ہیں، اور ان کی تقدیم
 والی پر واجب ہے اور امام محلہ و امام جمعہ کی تقدیم ولی پر مستحب ہے، فقط کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ ۲۹ ج ۱
 الجواب صحیح، ظہر احمد

شوافع بلا عذر مسجد میں نماز جنازہ پڑھائیں | سوال (۱۷) میت کا ولی شافعی ہے، اور امام بھی
 توحفیوں کو ان کی اتباع کرنی چاہتے یا نہیں | انھوں نے نماز جنازہ مسجد میں بلا عذر پڑھی تو حنفیوں
 کو بحالت موجودگی اتباع کرنی چاہتے یا نہیں، نیز صورت مذکورہ میں موجود ہوتے ہوئے
 نماز ترک کرنے میں گناہ گار ہو گا یا نہیں؟ بینا توجروا عند اللہ،

الجواب؛ جب جماعت میں حنفی بھی ہوں اس وقت شافعی حضرات کو ان کی
 رعایت کر کے خارج مسجد انتظام کرنا چاہتے، لیکن اگر وہ ایسا نہ کریں تو ایسے موقع پر مجبوراً
 حنفیہ کو شامل نماز ہو جانا چاہئے، اور عذر کی وجہ سے امید ہے کہ ان پر مواخذہ نہ ہو گا، کما
 فی الفتاویٰ الشامیة ص ۹۲۶ ج ۱ تحت قول الدرر فلا صلوة لہ، تمہ انما
 تکرہ فی المسجد بلا عذر فان کان فلا ومن الاعذار المطر کما فی الخانیة
 والاعتکاف کما فی المبسوط کذا فی الحلیة وغیرہا واللہ اعلم اور جو شخص احتیاطاً
 شرکت سے پرہیز کرتا ہے اس کے لئے بھی گناہ نش ہے، کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ ۲۹ ج ۱

غیر ملحق التقدیم نماز جنازہ پڑھائی، | سوال (۱۸) سیدی المحترم ادام اللہ تلال فیہ وظلم،
 ولی اگر اعادہ کرے تو ولی کی نماز فرض | بعد سلام مستنون معروض خدمت عالی اینکہ مسئلہ مندرجہ
 ادا ہوگی یا نفل اور جو لوگ سابق عجت | ذیل میں چند اشکال درپیش ہیں، امید ہے کہ ان کو حل
 میں شریک نہ ہو سکے تھے اس میں | فرما کر تسکین فرمائیں گے، وہ مسئلہ یہ ہے کہ غیر ملحق حق
 شریک ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ | المقدم نے اگر میت کی نماز پڑھائی تو ولی اعادہ کر سکتا ہے؟

اول اشکال یہ ہے کہ فرض جماعت اولی سے ساقط ہو گیا، اب ولی کی نماز فرض ادا ہوگی یا
 نفل، دوسرے یہ کہ ولی کے ساتھ وہ لوگ جنہوں نے اب تک نماز نہیں پڑھی شریک
 ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شریک نہیں ہو سکتے، اور ولی تنہا

نماز پڑھے، اس لئے کہ ولی کو اجازت اس لئے دیجی ہے کہ اس کا حق باقی رہ گیا ہے، اور دوسرے لوگوں کا کوئی حق باقی نہیں رہا، لہذا جماعت ثانیہ ولی کے ساتھ نہیں ہو سکتی، اسی کی تائید اس مسئلہ سے ہوتی ہے، جو تیمم کے باب میں ہے، کہ ولی کے علاوہ اور لوگوں کو اگر فوتِ صلوٰۃ کا خوف ہو تو تیمم کر لیں اور ولی وضو کرے، اور لوگوں کو اگر ولی کے ساتھ نماز پڑھنے کی اجازت ہوتی تو یہ چاہئے تھا کہ اگر ولی کو وضو کرتے دیکھیں تو یہ بھی وضو کر لیں، اور ولی کے ساتھ شریک ہو جائیں اور جماعت ثانیہ کر لیں، اور تیمم نہ کریں، حالانکہ یہ کہیں نہیں ملتا، ادھر اس صلوٰۃ کا فرض کفایہ ہونا یہ بتلاتا ہے کہ فرض تو تھی ہر ایک پر مگر بعض کے ادا کرنے سے اوروں سے ساقط ہو جاتی ہے، اور اگر دوسرے بنفسہ ادا کریں تو ہر ایک سے فرض ہی ادا ہوگا، لہذا بعد میں ولی کی اور اس کے ساتھیوں کی نماز فرض ادا ہونی چاہئے، جیسا کہ ایک شہر میں اگر کئی شخص اعتکاف کریں تو ہر ایک کی سنت ادا ہوگی، غرضیکہ بہت تردد ہے، بدائع و فتح القدیر و شامی وغیرہ بہت دیکھیں، جزئیہ مرقومہ کہیں نہیں ملتا، کہ تعددِ صلوٰۃ جنازہ اس طریقہ پر جائز ہو یا نہیں؟

الجواب؛ قال فی رد المحتار فالاحسن الجواب عما قالہ المقدسی بان
 إعادة الاولى لیست نفلاً لان صلوٰۃ غیرہ وان تأدی بہما الفرض وهو حق لمیت
 لكنها ناقصة لبقاء حق الاولى فیہا فاذا اعادها وقعت فرضاً مکملًا للفرض
 الاول فلیس لمن صلی اولاً ان یعید ہامع الاولى لان اعادة تکون نفلاً
 من کل وجه بخلاف الاولى لانه صاحب الحق اھ (ص ۹۲۳ ج ۱)

اس عبارت سے امور ذیل مستفاد ہوئے :- (۱) ولی کا اعادہ بطور نفل کے نہیں
 (۲) جو لوگ پہلی جماعت میں شریک ہو چکے ہیں، اُن کو ولی کے ساتھ اعادہ مکروہ ہو
 (۳) جو لوگ پہلے شریک نہ ہوئے ہوں ان کو ولی کے ساتھ نماز ادا کرنا جائز ہے، افادہ
 قید لمن صلی اولاً و قیود الفقہ احترامیہ، اور تیمم کے مسئلہ پر قیاس درست نہیں، کیونکہ
 جو لوگ جماعتِ اولیٰ کے وقت حاضر ہیں اور تیمم کر کے جماعتِ اولیٰ کو پاسکتے ہیں،
 ان کو جماعتِ ثانیہ کا انتظار مکروہ ہے، اس لئے وہ مأمور بالتیمم ہیں، کیونکہ انتظارِ جماعتِ
 ثانیہ میں جماعتِ ثانیہ کا گونہ اہتمام ہے، حالانکہ بعد ازاں فرض کے دوسری جماعت قابلِ
 اہتمام نہیں ہے، اور ولی کو تیمم کی اجازت اس لئے نہیں کہ وہ صرف اپنے حق کی وجہ سے

تہا بھی نماز جنازہ پڑھ سکتا ہی اس کو انتظار جماعت کی ضرورت نہیں،

ایک ہی مکان میں مسلمانوں کے ساتھ سوال (۱۸) ایک گھر کے اندر کتنے مسلمان و ہندو رہ سکتے تھے، اتفاق سے وہ گھر مع جملہ اشخاص جل گیا، ابھی مسلمان ہندو جل کر مر جائیں اور تمیز ممکن نہ ہو تو ہندو کا تمیز کرنا دشوار ہی اس وقت میں نماز جنازہ کس طرح پڑھی جائیگی

پڑھی جاوے؟

الجواب؛ سب پر نماز پڑھ لی جائے مگر نیت مسلمانوں پر نماز پڑھنے کی کی جائے، کذا فی الشامیۃ، ص ۹۰۰ ج ۱ ورجع الصلوۃ فی الاحوال الثالث سواء کان الکفار اکثر او اقل او کانوا سواء، واللہ اعلم، ۲۸، رزی الحجۃ شمس

فصل فی حمل الجنازۃ ودفنہا

تختہ رکھ دینے کے بعد قبر پر مٹی ڈالنا سوال (۱) میت کو قبر میں دفنانے کے بعد قبر میں مٹی

ڈالنا اندر کیسا ہے؟

الجواب؛ جب میت پر تختہ وغیرہ رکھ دیے جاویں، اس کے بعد تین مٹی سے مٹی ڈالنا ہر شخص کو مستحب ہے، قال فی المراقی الفلاح و یہاں التراب مستوالہ و مستحب ان یحشی ثلاثا ۵، اور اگر تختہ وغیرہ ابھی تک نہ رکھے گئے ہوں تو مٹی ڈالنا قبر کے اندر مکروہ ہے، کیونکہ اس میں تلویث میت ہے،

سوال (۲) ما قولکم علماء نارحمکم اللہ، اس مسئلہ میں کہ بعد دفن میت کے جو دعاء ایصالِ ثواب کے لئے پڑھنا ثابت ہے اس دعاء میں رفع یدین کو مثل اور دعاؤں کے آداب سمجھنا اور عوام کا اسکو مثل واجب جانتا اور تارک کو قابلِ ملامت سمجھنا، اور دعاء میں اگر رفع یدین کو قبولیت میں منحصر کر لینا جائز ہے یا نہیں، اور بوجہ فساد عقیدہ عوام کے اس رفع یدین کو ترک کرنا ضروری ہے یا نہیں بلینا توجروا، بحوالہ الکتب المعترۃ؟

الجواب؛ بعد دفن میت کے دعاء بدون رفع یدین کے کرنی چاہتے، میں نے فقہ کی کسی کتاب میں اس موقع پر غیر ارفع یدین کی قید دیکھی ہے، مگر اس وقت باوجود تلاش

سندوقی قبر کی گہرائی کتنی ہونی چاہئے؟ | سوال (۴) سندوقی قبر کی گہرائی زمین کی سمواری سے میت کی نصف قد گہرائی ہو یا جہاں بانس قبر کا پاؤ بند کرنے کے لئے جس جگہ پر رکھا جاتا ہے وہاں سے میت کی نصف قد گہرائی مراد ہے؟

الجواب؛ فقہاء نے جہاں گہرائی کا ذکر کیا ہے اس سے مراد زمین کی ہمواری سے ہے، گہرائی کا بیان کرنا ہے، لیکن گہرائی کا انحصار نصف قامت پر نہیں ہے، بعض نے نصف قامت لکھا ہے، اور بعض نے الی الصدر لکھا ہے، پس ہر جگہ کے مناسب جتنی گہرائی ہو اتنی گہرائی رکھنی چاہئے، قال فی نور الایضاح ویحضر القبر نصف قامۃ اولی الصدر وان یزدکان حسنا لانه ابلغ فی الحفظ (ص ۲۵۳) ۲/ صفر ۱۳۸۴ھ

سوال (۵) قبر میں مردہ کے پاس رومان فرشتہ آ کے سے قبر کو گہرا کرنے کا حکم،،،

مردہ کو بٹھاتا ہے، اس بٹھانے پر گمان کر کے قبر کی پاٹ کا بانس کے نیچے دو ہاتھ یا ڈھائی ہاتھ گہرائی کھودتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ مردہ بیٹھنے میں پاٹ کے بانس سر میں نہ لگ جاتے، یہ گمان گناہ میں داخل ہی یا نہیں؟

الجواب؛ قبر کا قاعدہ یہ ہے کہ اول تو بغلی قبر افضل ہے، اگر بغلی نہ ہو صندوق ہو تو بانس یا تختے وغیرہ میت کے جسم سے متصل ہونے چاہئیں، اور جس حصہ میں مٹی بھری جاتی ہے وہ زیادہ گہرا ہونا چاہئے، تاکہ جانوروں سے خوب حفاظت رہے، باقی میت جو قبر میں اٹھ کر بیٹھتی ہو وہ بیٹھنا برزخی ہے، جو اس جسم سے نہیں ہوتا، بلکہ جسم مثالی سے ہوتا ہے اس لئے اس بیٹھنے میں بانس وغیرہ اس کے سر میں نہیں لگتے، میں خواہ وہ کتنے ہی اس کے جسم سے قریب ہوں، باقی عذاب قبر جسم عنصری و جسم مثالی دونوں پر ہوتا ہے، اور میت کے پاس رومان فرشتہ کوئی نہیں آتا بلکہ دو فرشتے آتے ہیں، جن کو منکر نکیر کہتے ہیں ہذا واللہ اعلم بالصواب، ۲، صفر ۱۳۸۵ھ

میت کو قبر میں رکھنے کا سوال (۶) کوئی کہتا ہے کہ مردہ کو قبر میں چت کر کے رکھا جاوے مسنون طریقہ، اور منہ قبلہ کی طرف، کیا معنی؟ بلکہ اتمام وجود راہنی کروٹ کر کے قبلہ کی طرف کر دیا جاوے، اب کون بات صحیح ہے؟

الجواب؛ قال فی مرقی الفلاح ویوجہ الی القبلة علی جنبہ الایمن بذلک امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم علیاً لما مات رجل من بنی عبد المطلب فقال یا علی استقبل بالقبلة استقبالاً وقلوا جميعاً باسم الله وعلى ملّة رسول الله وضعوه لجنبه ولا تکبوه علی وجهه ولا تلقوه علی ظهره کذا فی الجوہرۃ فی الحلبي ویسند المیت من وراءہ بنحو اس سے معلوم ہوا کہ میت کو قبر میں راہنے پہلو پر قبلہ کی طرف کروٹ دے کر رکھنا چاہئے، چت نہ لٹایا جائے اور اس کی مکر کے نیچے سہارے کے لئے مٹی یا کچی اینٹ رکھ دی جائے تاکہ چت نہ ہو جائے اور استقبال قبلہ قوت نہ ہو جائے، واللہ اعلم، ۲، رجب ۱۳۸۵ھ

میت کو قبر میں رکھنے کے بعد سوال (۷) سب بند کھولنے چاہئیں، مردہ کو غسل دے کر کفن پہنا کر ایک بند پیروں پر اور ایک کمر پر اور ایک سر پر باندھ دیتے ہیں، تو قبر میں رکھ کر یہ تینوں بند کھول دیئے جاتیں یا کوئی سا بند نہ کھولا جائے، بعض صاحبوں کا یہ فرمان ہے کہ کمر کا بند نہ کھولا جلتے، کیونکہ جب فرشتے مردے کو حساب کے واسطے بٹھائیں گے تو مردہ برہنہ ہو جائے گا،

الجواب؛ قبر میں مردہ کو رکھ کر سب بند کھول دیئے جائیں مگر کا بھی اور سر و

کا بھی اور برہنگی کا شبہ غلط ہے، مردہ کا قبر میں بیٹھنا جسم مثالی سے ہوتا ہے، یہ جسم تو اگر کوئی پہرہ دے برسوں تک اسی طرح پڑا رہے گا، ۲۹ ربیع الثانی ۱۲۸۶ھ

فصل فی الشہید

سوال (۱) کسی شخص کو مرض ربوہ ہو، جس کو ہندی میں جس شخص نے مرض ضیق النفس میں وفات پائی ہو وہ شہید کہلے گا یا نہیں اور وہ شہید کامل ہی یا ناقص، آدمی لیٹ نہیں سکتا، اور کھڑا بھی نہیں ہو سکتا، کہ سانس کی بیماری بھی کہتے ہیں، اس بیماری میں سوائے بیٹھنے کے اور کوئی چارہ نہیں ہوتا اس مرض کی بابت کیسی ماہر حکیم سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ بیماری کس قدر تکلیف دہ ہے، اس کی بابت یہ دریافت کرنا ہے کہ جو شخص اس مرض میں مر جائے تو آیا شہید مرنے سے یا نہیں، شہید ناقص ہے یا کہ شہید اصلی ہے؟ یا کہ شہید نہیں ہے؟ کیونکہ ایک کتاب رسالہ رکن الدین مولوی رکن الدین صاحب کا ہے، اس رسالہ میں بہت سی ناقص شہید کی قسمیں بیان کی ہیں، یہ قسم نہیں ہے، اس لئے دریافت کرتا ہوں کہ شاید اس مرض والا بوجہ زیادہ تکلیف ہونے کے ناقص شہید کی قسم میں نکل آوے، اس کا جواب بہت ہی غور سے مطلع فرمائیں، آیا کوئی مستند حدیث ہے یا کوئی ضعیف حدیث ہے، یا کسی حدیث سے ثابت بھی ہوتا ہے یا کسی حدیث سے بھی ثابت نہیں ہوتا، اس کی بابت کوئی کتاب دیکھ کر پوری پوری طرح سے تحقیق فرماویں؟

الجواب؛ علامہ سیوطیؒ نے احادیث مختلفہ کو جمع کر کے جو شہداء آخرت کو شمار کیا ہے تو ان میں من مات بالستل او بالصرع او بالحمی اور اس کے بعد من مات بالشرق کو بھی لیا ہے، کذا فی الطحاوی علی المراقی، (ص ۳۶) تو مر لیضیٰ کی کیفیت موت شرق کے مشابہ ہے، بلکہ اشد ہے، اس لئے وہ بھی شہداء آخرت ہر الشاء اللہ تعالیٰ، ولا یصح الجزم فی مثله الا جنس صریح ولم یوجد اور سوائے مقتول فی سبیل اللہ فی المعرکہ کے اور سب اموات امراض شدیدہ شہداء ناقص ہیں، شہید کامل صرف مقتول فی معرکہ القتال ہے، کہ وہ شہید دنیا و آخرت ہے، اور باقی شہداء صرف شہداء آخرت ہیں،